بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

واما بنعمۃ ربک فحدث

تحدیثِ نعمت

خاکساریم وسخن از رہِ غربت گوئیم
یعلم اللہ کہ بہ کس نیست غبارے مارا

محمد ظفر اللہ خاں

چند معروضات

محترم چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب نے بعض احباب کے اصرار پر اپنے حالاتِ زندگی قلمبند فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں انہیں اور بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں حافظہ کی نعمت بھی وافر عطا فرمائی ہے چنانچہ اس کتاب کا مسودہ چودھری صاحب نے صرف اپنی یاد داشت سے قلم برداشتہ تحریر فرمایا۔ اشاعت کے لئے چودھری صاحب نے یہ پابندی عاید کی تھی کہ کتاب صرف ایک جلد تک محدود رہے۔ اس ارشاد کی تعمیل میں مسوّدہ کا معتدبہ حصہ حذف کرنا پڑا۔ اس کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ممکن ہے چودھری صاحب کے اسلوبِ بیان اور اس کی روانی میں کہیں کچھ فرق محسوس ہو۔ اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

محترم چودھری صاحب نے اس کتاب کے جملہ حقوقِ تصنیف ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن (DACCA BENEVOLENT ASSOCIATION) کو جو ایک فلاحی ادارہ ہے عطا فرما دیئے ہیں۔ فجزاہُ اللہ احسن الجزاء۔

کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں محترم سید بابر علی صاحب مینجنگ ڈائرکٹر پیکیجز لمیٹڈ (PACKAGES LTD) لاہور نے فلاحی ادارہ مذکورہ بالا کی ہر طرح اعانت فرمائی ہے۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اعجاز احمد، بشیر احمد

۱۶ ستمبر ۱۹۷۱ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ اوّل

الہ العالمین ۔ میں تیرا نہایت عاجز اور پُرخطا بندہ ہوں تو میری ہر کمزوری ہر لغزش اور اور تقصیر کو خوب جانتا ہے ۔ میں تیرے بے پایاں احسانات اور اپنی لاتعداد تقصیروں اور خطاؤں کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوں ۔ تیری رحمت کی انتہا نہیں اور میری کمزوریوں کا شمار نہیں ۔

ساقیا شرمندہ ام از لطفِ بے پایان تو ٭ تو مرا پُر می دہی من بازہ خالی می دہم

تو جانتا ہے کتنی بار مجھ سے کہا گیا کہ میں تیرے انعامات ۔ تیری پردہ پوشیوں تیری ذرہ نوازیوں کا کچھ ذکر ضبطِ تحریر میں لے آؤں اور ہر بار میری کمزوریوں کا احساس اور یہ خوف کہ میں تیری نظروں میں کہیں بے جا نمائش کا مرتکب نہ ٹھہروں میرے رستے میں روک بنتا رہا ۔ تیرے فضلوں اور احسانوں کو میں شمار میں نہیں لا سکتا ۔ تو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے کرم نے مجھے بخشا وہ خالص تیری عطا ہے میرا اس میں کچھ بھی دخل نہیں ۔ ذہن تو نے عطا کیا ۔ حافظہ تو نے دیا ۔ قویٰ سب تیری عنایت ہیں ۔ وسائل سب تیری بخشش ہیں ۔ خدمت کے موقعے تو نے پیدا کئے ۔ خدمت کی توفیق تو نے عطا فرمائی ۔ شفیق، ہمدرد، بہت محبت کرنیوالے ۔ مخلص منکسر مزاج ۔ تجھ پر پختہ ایمان رکھنے والے اور توکل کرنے والے ۔ بڑی خوبیوں والے والدین کو میری تربیت کی توفیق تو نے عطا کی ۔ ہدایت کا رستہ تو نے دکھایا ۔ اس پر لڑکھڑاتے ہوئے ہی سہی لیکن تاہم چلنے اور بڑھنے کی توفیق تجھی سے پائی ۔ اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت تو نے ہی دل میں ڈالی۔ ان کے غلام مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شناخت اور حضور کے دستِ مبارک پر بیعت کی سعادت تو نے ہی نصیب کی۔ غرض تیرے فضلوں اور احسانوں کا شمار نہیں۔ تو اپنے خاص فضل وکرم سے اس عاجز کو توفیق عطا فرما کہ تیرے فضلوں کے ذکر میں خالص تیری رضا مقصود رہے۔ تو میرے قلم کی نگرانی فرما کہ وہ راہِ حق و انصاف پر قائم رہے اور بھٹکنے نہ پائے۔ حق کی تائید اور باطل کی تردید میں چلے۔ تیرے بندوں میں سے کسی کی دل آزاری کا موجب نہ بنے بلکہ ان کی دلجوئی اور ہدایت کا باعث ہو۔ میرے ذہن کو روشن فرما اور حافظے کو تازہ کر تاکہ جو کچھ تحریر میں آئے اس کی صحت میں شک کی گنجائش نہ ہو۔ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اس مہم کو جو میں نے تیری رضا کے حصول کی خاطر شروع کی ہے تکمیل تک پہنچا سکوں۔ میری سعی میں برکت دے اور اسے اپنی ذرّہ نوازی سے قبول فرما۔ آمین یا ارحم الراحمین

محمد ظفر اللہ خاں

خاندانی حالات

میرا آبائی مسکن ڈسکہ ضلع سیالکوٹ ہے۔ ہماری قوم ساہی کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی وقت اس قوم کی پنجاب کے ایک علاقہ پر حکومت تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ قوم زیادہ تر ساہیوال (سابق منٹگمری) کے علاقہ میں آباد تھی۔ ہمارے خاندان کی دو شاخیں اب تک ہندو ہیں۔ باقی یا سکھ ہیں یا مسلم۔ ہماری شاخ بارہ تیرہ پشت سے مسلمان ہے۔

میرے دادا چودھری سکندر خاں صاحب مرحوم اپنے علاقے کے بڑے بارسوخ زمیندار تھے۔ ان کے والد چودھری فتح دین صاحب عین جوانی میں فوت ہوگئے تھے۔ اس وقت میرے دادا ابھی کم سن تھے۔ ان کی کم عمری اور شرکاء کے مخالفانہ منصوبوں کے نتیجے میں خاندان کی تنگی سے گذر ہوتی تھی۔ ان کی پرورش نامساعد حالات میں ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت میں حزم و دانش ودیعت کی تھی۔ اس لئے باوجود شرکاء کی مخالفت اور معاندانہ منصوبوں کے انہوں نے اپنا زمانہ نہایت خوش اسلوبی سے گذارا۔ اگرچہ وہ زمانہ ہر رنگ میں تاریکی اور جہالت کا زمانہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیوی عقل و دانش کے علاوہ دین کا علم و فہم بھی عطا فرمایا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا ہے وہ اہلِ حدیث فرقے سے تعلق رکھتے تھے احکامِ شریعت کی سختی سے پابندی کرتے اور کرواتے تھے۔ شرک سے انہیں خصوصیت سے نفرت تھی ہر قسم کی بدعات سے احتراز کرتے تھے۔ مہمان نوازی اور غریب پروری ان کا شعار تھا۔ اگرچہ خود تنگی سے گذر ہوتی تھی لیکن اس کا اثر مہمانوں کی تواضع پر نہیں پڑنے دیتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد رات کے کپڑے پہن کر مہمان خانے میں چلے جاتے اور ایک خادم کے طور پر مسافروں اور مہمانوں کی خدمت کرتے۔ تہجد کی نماز کے بعد بھی مہمانوں کی خبرگیری کے لئے مہمان خانے میں جو مسجد کے ملحق تھا چلے جاتے تھے۔

ایک دن فجر کے وقت مہمان خانے کے خادم نے اطلاع دی کہ ایک مسافر جس نے رات مہمان خانے میں بسر کی تھی غائب ہے اور جو بستر اسے رات بسر کرنے کیلئے دیا گیا تھا اس کا لحاف بھی موجود نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار اور دو ایک آدمی جو اس کی تلاش میں گئے ہوئے تھے مسافر کو لحاف سمیت پکڑے ہوئے میرے دادا صاحب کے پاس لے آئے۔ انہوں نے دریافت کیا میاں! تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ مسافر نے جواب دیا ہم گھر میں بچوں سمیت چار نفوس ہیں۔ سردی کا موسم ہے اور گھر میں صرف ایک لحاف ہے۔ میرے دادا صاحب نے وہ لحاف اور تین روپے نقد دیکر اسے رخصت کر دیا۔ ان کی مہمان نوازی اور سخاوت کی وجہ سے تمام علاقے میں بلکہ ارد گرد

کے اضلاع میں بھی لوگ ان کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کا برتاؤ تواضع لیکن وقار کا ہوا کرتا تھا۔ اور حکام بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ انہیں اس زمانہ میں جب حجاز کا سفر نہایت دشوار ہوتا تھا حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

میری پیدائش | میں ۶ رفروری ۱۸۹۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے پہلے میرے والدین کے تین چار بچے کم عمری میں فوت ہو چکے تھے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میری والدہؓ مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ میرے والد چودھری نصر اللہ خاں صاحبؓ اس وقت سیالکوٹ میں وکالت کرتے تھے۔ میری پیدائش کے وقت میرے والدین کی عمر تیس سال کو پہنچ چکی تھی۔ میرے ننھیال کا خاندان نسبتاً خوش حال تھا۔ لیکن میرے والد صاحب نے اپنی طالب علمی کا زمانہ بہت تنگی میں گذارا تھا۔ میری پیدائش سے دو تین سال قبل بفضل تعالیٰ فراخی اور کشائش کا دور شروع ہو چکا تھا۔

ابتدائی تعلیم | میری والدہ بتاتی تھیں کہ میں چار سال چار مہینے اور چار دن کا تھا جب مجھے مدرسہ میں داخل کرایا گیا۔ پہلے چھ سال میں نے میونسپل بورڈ سکول میں تعلیم حاصل کی۔ ساتویں سال میں میرے والد صاحبؓ نے مجھے امریکن مشن ہائی سکول میں داخل کرادیا۔ اس تبدیلی کی غالباً ایک وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک میرے والد صاحبؓ کو سلسلہ احمدیہ کی نسبت حسنِ ظن پیدا ہو چکا تھا۔ اور امریکن مشن سکول میں اس وقت تین چار اساتذہ احمدی تھے۔

آشوب چشم کا عارضہ | مدرسے کی تبدیلی کے جلد بعد مجھے آشوب چشم کا عارضہ لاحق ہو گیا اور یہ تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ ہر سال گرمیوں کا اکثر حصہ مجھے اندھیرے کمرے میں گذارنا پڑتا تھا۔ یہ عارضہ میرے لئے تو باعث الم تھا ہی لیکن میری والدہ کیلئے مجھ سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ میرا جتنا وقت اندھیرے کمرے میں گذرتا اس کا اکثر حصہ وہ بھی میرے ساتھ وہیں گذارتی تھیں۔ اس رفاقت نے ہمارے دلوں میں پیوند محبت کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے آخری دم تک میری جدائی ان کے لئے سخت کرب اور بے چینی کا موجب بن جاتی تھی اور ان کی جدائی میں میرے دل کی کیفیت بھی ویسی ہی ہوتی تھی۔ میرے والد صاحب کو بھی میرے ساتھ بہت محبت تھی۔ لیکن ان کی طبیعت بہت سنجیدہ تھی اور وہ اپنے جذبات کو بہت کم ظاہر ہونے دیتے تھے۔ ان کے مجھ پر لاانتہا احسانات ہیں اور انہوں نے میری خاطر بہت قربانیاں کیں۔ جزاھما اللہ فی الدارین خیراً یغفر اللہ لھما ویجعل الجنۃ العلیا مثواھما

والدین کا دین کی طرف رجحان اور سلسلہ احمدیہ میں بیعت | میری والدہ کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحم سے سچے خوابوں اور بشارتوں سے نوازتا تھا۔ بہت سا حصہ ان کی روحانی تربیت کا خوابوں کے

ذریعے عمل میں آیا۔ انہیں شروع سے ہی دعا پر بہت اعتماد تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا تھا۔ ان کی وجہ سے ہمارے گھر میں روحانی اقدار کا اکثر ذکر رہتا تھا۔ اس ذریعے سے میں نے ان سے بہت کچھ پایا۔ اور بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت بھی اپنے خوابوں کی بنا پر کی اور ایسے وقت میں کی جب میرے والد صاحب سلسلہ کی طرف مائل تو ہو چکے تھے لیکن ابھی بیعت کرنے کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ والدہ صاحبہ کے بیعت کرنے کے چند دن بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ یہ وہ دن تھے جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام آخیر ستمبر اور شروع اکتوبر ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ میں جلوہ افروز تھے۔ والدہ صاحبہ کی بیعت کے وقت میں ان کے ہمراہ تھا۔ اور والد صاحب کی بیعت کے وقت بھی میں موجود تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہونا

مجھے حضور علیہ السلام کی زیارت کی سعادت پہلی مرتبہ ۳ ستمبر ۱۹۰۴ء کو نصیب ہوئی تھی۔ جس دن حضورؑ کی موجودگی میں حضورؑ کا لیکچر حضرت مولوی عبدالکریم صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لاہور میلارام کے منڈوے میں پڑھ کر سنایا تھا اس موقعہ پر میرے والد صاحب لیکچر سننے کیلئے سیالکوٹ سے لاہور گئے تھے۔ اور میری خوش نصیبی سے مجھے بھی ساتھ لیگئے تھے۔ میری نشست پلیٹ فارم پر حضورؑ کے قدموں کے قریب ہی تھی۔ اور میں سارا وقت حضورؑ کے مبارک چہرے پر ٹکٹکی لگائے رہا تھا مجھے اس دن سے حضورؑ کے جملہ دعاوی پر پختہ ایمان ہے، اور حضورؑ کے دعاوی کی نسبت کبھی کسی قسم کی الجھن میرے دلمیں پیدا نہیں ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حضورؑ کے قیام سیالکوٹ کے دوران میں مجھے کئی بار حضورؑ کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہی دنوں مجھے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعودؓ کی زیارت بھی پہلی بار نصیب ہوئی۔

امریکن مشن سکول سیالکوٹ میں تعلیم

امریکن مشن سکول کے سب اساتذہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ جب میں نویں جماعت میں داخل ہوا تو ریاضی سائنس اور عربی کے استاد ماسٹر غلام محمد صاحب مرحوم تھے۔ سکول کے سب طلبا ان سے بہت ڈرتے تھے کیونکہ ان کی طبیعت سخت گیر تھی۔ میری تعلیم کی طرف وہ خاص توجہ دیتے اور میری حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ ان کے اکلوتے صاحبزادے عبدالحمید بٹ صاحب میرے ہم جماعت تھے۔ لیکن آٹھویں جماعت میں وہ لمبا عرصہ بیمار رہے اور ان کے والد صاحب نے خود ہی انہیں ایک سال کیلئے اسی جماعت میں روک لیا اور اس طرح وہ مجھ سے ایک سال پیچھے رہ گئے۔ جب میٹرکولیشن امتحان کے لئے داخلہ بھیجنے کا وقت قریب آیا تو میرے والد صاحب نے

ماسٹر غلام محمد صاحب سے کہا کہ اسے ایک سال کیلئے روک لیا جائے کیونکہ یہ آشوب چشم کی وجہ سے پڑھائی کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا والد صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ مجھے کچھ وقت کیلئے پڑھائی سے کامل فراغت مل جائے۔ ماسٹر صاحب نے کہا کہ اس کا ذہن صاف ہے۔ اور باوجود اس کے کہ گرمیوں میں یہ پڑھ نہیں سکتا جماعت میں اچھا چلتا ہے۔ آپ اسے امتحان میں بیٹھنے دیں۔ اگر پاس ہو جائے تو پھر آپ چاہیں تو اسے ایک سال فارغ رہنے دیں۔ اگر پاس نہ ہوا تو بہر حال اسے آئندہ سال ہی امتحان میں بیٹھنا ہو گا۔ چنانچہ میرا داخلہ بھیج دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ میں اوّل درجہ میں پاس ہو گیا۔ اور اپنے مدرسے میں اول رہا۔ نتیجہ معلوم ہونے کے بعد نہ مجھے خیال آیا کہ ایک سال فارغ رہا جائے اور نہ میرے والد صاحب نے کوئی ایسا خیال ظاہر کیا۔ میٹرکولیشن کے امتحان کے وقت میری عمر ۱۴ سال تھی۔

والد صاحب کی خواہش پر قرآن کریم کا ترجمہ سیکھنا

والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ مجھے قرآن کریم کا ترجمہ آجائے چنانچہ انکی ہدایت کے ماتحت میں قرآن کریم کا ترجمہ سیکھنے کیلئے مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جو کچی مسجد کے امام تھے۔ سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے کے بعد والد صاحب نے فرمایا کہ اب تم قرآن کریم کا ترجمہ سیکھنے کے لئے جناب مولوی فیض الدین صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں کبوتراں والی مسجد میں حاضر ہوا کرو۔ مولوی صاحب موصوف بھی انہی ایام میں بیعت ہوئے تھے وہ مجھے بڑی شفقت سے پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن میں آشوب چشم کی وجہ سے باقاعدہ حاضر نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میری ترجمہ سیکھنے کی رفتار سست تھی۔ جب میٹرکولیشن کے امتحان میں قریباً چھ مہینے باقی رہ گئے تو والد صاحب نے دریافت فرمایا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کہاں تک پڑھ لیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ ساڑھے سات پارے ختم کئے ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اس رفتار سے تو تم کالج جانے تک شاید دس پارے بھی ختم نہ کر سکو اور میری بڑی خواہش ہے کہ کالج جانے سے پہلے تم سارے قرآن کریم کا کم سے کم سادہ ترجمہ ضرور سیکھ لو۔ اس سے آگے تمہارے اپنے ذوق اور اخلاص پر منحصر ہے لیکن اس قدر سکھا دینا میرا فرض ہے۔ اب وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ تم دن میں فراغت کے وقت دو تین رکوع کا ترجمہ دیکھ لیا کرو اور شام کو مجھے سنا دیا کرو۔ چنانچہ اس طریق سے انہوں نے امتحان تک مجھ سے قرآن کریم کا ترجمہ سن لیا۔ جہاں تلفظ یا ترجمے میں مجھ سے غلطی ہوتی آپ مجھے بتا دیتے۔ اولاد پر ماں باپ کے احسانات کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ مجھ پر میرے والد صاحب کے بے پایاں احسانات میں سے ایک احسان عظیم یہ تھا کہ انہوں نے مسلسل توجہ فرما کر مجھے قرآن کریم کے سادہ ترجمے سے شناسا کرا دیا۔ اور اس کے نتیجہ میں قرآن کریم کے ساتھ میری اجنبیت دور ہو گئی اور میرے دل میں قرآن کریم کا احترام اور عظمت قائم ہو گئے۔ اور مجھے قرآن کریم سے محبت ہو گئی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ۔ میٹرکولیشن میں کامیاب ہونے پر مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کرا دیا گیا۔ لاہور میں پہلے چند دن میں چودھری شہاب الدین صاحب کے ہاں ان کے مکان واقعہ بازار جج محمد لطیف میں ٹھہرا۔ کالج میں داخل ہو جانے کے ایک دو دن بعد میں کالج کے ہوسٹل میں چلا گیا۔ اور مجھے ڈارمیٹری ۵ میں جگہ مل گئی۔ مجھ سے جدائی والدہ صاحبہ پر بہت شاق تھی اور ان کے اصرار پر میں ہر دوسرے ہفتے اتوار کا دن ان کے ساتھ گذارنے کیلئے سیالکوٹ چلا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے دونوں سال گرمیوں میں مجھے آشوب چشم کی وجہ سے بہت تکلیف رہی۔ اس دوران میں پانچ آزمائشی امتحانات ہوئے جن میں سے دو میں تو بیٹھ ہی نہ سکا۔ باقی تین میں میں انگریزی اور عربی میں تو پاس ہوتا رہا (گو میرے نمبر پاس کے درجے سے تین چار ہی زائد ہوا کرتے تھے) لیکن ایک میں میں ریاضی میں فیل ہو گیا۔ دوسرے میں سائنس میں اور آخری امتحان میں ان دونوں مضامین میں فیل ہو گیا۔ یونیورسٹی کے امتحان کی تیاری کے لئے مجھے سردیوں کے تین چار مہینے میسر آگئے۔ ان آخری مہینوں میں میں اوسطاً دس بارہ گھنٹے روزانہ توجہ کے ساتھ مطالعہ کر لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل اور رحم سے مجھے یونیورسٹی کے امتحان میں کامیابی عطاء فرمائی میں دوسرے درجے میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔

اس زمانہ میں سلسلہ احمدیہ کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ ڈارمیٹری میں میں اکیلا احمدی تھا۔ ہم کل آٹھ طالبعلم اس کمرے میں تھے۔ دو تین ان میں سے کبھی شرارت پر آتے تو مجھے دق کرتے۔ پہلے سال گرمی کی تعطیلوں میں جب میں گھر گیا تو میں نے والد صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ میری رہائش کا انتظام ہوسٹل سے باہر کر دیا جائے۔ وجہ معلوم ہونے پر انہوں نے فرمایا تم ابھی سے گھبرا گئے ہو زندگی میں تو تمہیں اس سے بہت بڑی مشکلوں کا سامنا ہو گا۔ اگر ابھی سے برداشت کی عادت نہیں ڈالو گے تو آگے چل کر کیا کرو گے۔ میں خاموش ہو گیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بیعت کا شرف اسی سال گرمی کی تعطیلوں میں والد صاحب کے نام حضرت خلیفہ اوّل مولوی نور الدین صاحب رضی اللہ عنہ کا خط آیا جس کا مضمون فقط اتنا تھا کہ اب آپ اپنے بیٹے کی بیعت کرا دیں۔ میں نے بھی وہ خط پڑھ لیا۔ میں صدق دل سے حضور علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا۔ بیعت کرنے میں مجھے کسی قسم کا تامل نہیں تھا۔ میں تو اپنے تئیں اس وقت سے ہی احمدی سمجھتا تھا جب میرے والدین نے ۱۹۰۴ء میں بیعت کی تھی۔ حضرت مولوی صاحب کے خط سے البتہ یہ معلوم ہوا کہ مجھے خود بھی بیعت کرنی چاہیئے۔ ضلع کی عدالتوں میں ستمبر کا مہینہ تعطیل کا مہینہ ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب ہر سال ستمبر میں قادیان حاضر ہوا کرتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ حضرت مولوی صاحب کا

خط آنے پر میں نے ارادہ کر لیا کہ ستمبر میں جب والد صاحب کے ہمراہ حاضر ہوں گا تو والد صاحب کے فرمانے پر میں بیعت کر لوں گا۔ لیکن قادیان پہنچنے کے بعد نصف ستمبر گذر گیا اور والد صاحب نے مجھے اس بارے میں کوئی ارشاد نہ کیا۔ چنانچہ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں خود ہی حضرت مولوی صاحبؓ کے ارشاد کی تعمیل میں بیعت کر لیتا ہوں۔ حضور علیہ السلام صبح سیر کیلئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی خدام کو حضور کی خدمت میں حاضر رہنے اور حضور کے کلماتِ طیبہ سے مستفید ہونے کا موقعہ میسر آ جاتا تھا۔ پھر ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد بھی حضور کچھ وقت کیلئے مسجد مبارک میں تشریف فرما رہتے تھے۔ اس وقت بیعت بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۰۷ء کو بعد نماز ظہر مسجد مبارک میں حضور کی خدمت میں گذارش کی کہ میری بیعت قبول فرمائی جائے۔ حضورؑ نے اجازت بخشی اور میں حضورؑ کے دستِ مبارک پر بیعت ہوا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ

حضرت مولوی نورالدین صاحب کے بیشمار احسانات میں سے جن کا یہ عاجز مورد ہوا یہ ایک بہت بڑا احسان تھا کہ آپ نے والد صاحب کو یہ تحریک فرمائی اور اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے کی سعادت حاصل کی۔ کان ذالک فضل اللہ علیّ فسبحان اللہ والحمد للہ۔

ان ایام میں میرے ایک ہم مدرسہ دوست نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ اگر تم نے سلسلہ احمدیہ میں بیعت کی تو میرا تمہارا دوستانہ ختم ہو جائے گا۔ حضورؑ کی بیعت کرنے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ انہیں خط لکھا کہ آج میں نے حضور علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کر لی ہے۔ لہٰذا آپ کے کہنے کے مطابق اب ہمارا دوستانہ ختم ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خود انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ لیکن عملاً جماعت کے ساتھ منسلک نہ ہوئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کا سانحہ

مئی ۱۹۰۸ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام لاہور تشریف لائے اور احمدیہ بلڈنگس میں قیام فرمایا۔ کچھ عرصہ پہلے سے حضور علیہ السلام کے الہامات میں متواتر آپ کی وفات کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔ لیکن طبعاً آپ کے خدام میں سے کسی کا ذہن اس دردناک تصور کا متحمل نہ ہوتا تھا کہ حضورؑ کے وصال کا وقت قریب ہے۔ حتیٰ کہ اَلرَّحِیْلُ ثُمَّ الرَّحِیْلُ وَالْمَوْتُ قَرِیْبٌ جیسے چونکا دینے والے الفاظ سے بھی اکثر اذہان نے یہی مراد اخذ کی کہ اس میں ہر انسان کو انجام سے متنبہ کرنا مقصود ہے۔ حضورؑ نے بھی کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ فرمایا اور متواتر اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں بشاشت اور اطمینان کے ساتھ مصروف رہے۔ گورنمنٹ کالج میں ہم پانچ چھ احمدی طالب علم تھے۔ شیخ محمد تیمور صاحب، چودھری فتح محمد سیال صاحب، چودھری ضیاء الدین صاحب، میرے استاد زادے عبدالحمید بٹ صاحب وغیرہم اور ہم سب بالالتزام حضور علیہ السلام کی قیام گاہ پر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ۲۶ رمئی کو میں حسب معمول دوپہر کا کھانا اول وقت میں ہی کھا کر لیٹ گیا تھا۔ دفعتہً شیخ تیمور صاحب نے میرا پاؤں ہلایا اور پریشانی کی

حالت میں کہا فوراً میرے کمرے میں آو۔ میں جلدی میں اٹھ کر ان کے پیچھے ہو لیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے بتایا کہ حضرت مسیح موعودؑ فوت ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون باقی احمدی دوست بھی ان کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔

یہ دل ہلا دینے والی خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ دل مانتا ہی نہ تھا کہ یہ صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن شک کی گنجائش بھی نظر نہ آتی تھی۔ جب ہوش ٹھکانے آئے تو ہم سب جلدی میں ہراساں اور پریشاں احمدیہ بلڈنگس پہنچے۔ وہاں مکان کے اندر تو وہی سماں تھا جس کی توقع کی جا سکتی تھی اور جس کا اندازہ ہر مخلص اور دردمند دل کر سکتا ہے۔ لیکن مکان سے باہر سڑک پر مخالفین سلسلہ جس قسم کے مظاہروں سے اپنے اخلاقی فقدان کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ نہایت اندوہناک اور قابلِ افسوس تھا۔ نمازِ جنازہ کے بعد ہم میں سے اکثر قادیان جانے کیلئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور جو گاڑی عصر کے وقت لاہور سے بٹالہ جاتی تھی اور جس کے ساتھ ایک خاص ڈبے میں حضور علیہ السلام کی نعشِ مبارک کو لے جانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میں سوار ہو گئے۔ دوسرے بزرگوں کے متعلق تو مجھے پوری طرح یاد نہیں، لیکن حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ کے متعلق یاد پڑتا ہے کہ آپ تیسرے درجے کے ڈبے میں ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہے تھے۔ گفتگو کا تو کوئی موقع نہیں تھا سب لوگ دعا اور درود شریف کے ورد میں مصروف تھے۔ حضرت مولوی صاحبؓ سارا وقت سر جھکائے مراقبے کی حالت میں نظر آتے تھے۔

امرتسر پہنچنے تک مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ پلیٹ فارم کے اس حصے میں جہاں اوپر چھت نہیں تھی اور پلیٹ فارم بھی کچھ کھلا تھا حضرت مولوی صاحبؓ نے نماز پڑھائی۔ امرتسر کی جماعت کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ کچھ رات گئے گاڑی بٹالہ پہنچی۔ یہاں جہاں کہیں کسی سے ہو سکا ایک دو گھنٹے سستا لیا۔ آدھی رات کے کچھ بعد یہ محزون قافلہ پاپیادہ قادیان روانہ ہو گیا۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اور ہجوم کی کثرت سے گرد اڑتی تھی اسلئے رفتار بہت دھیمی تھی تاکہ احباب کو تکلیف نہ ہو۔ اور نعشِ مبارک کو کندھا دینے والے آرام اور سہولت سے سفر طے کر سکیں۔ قادیان کی سڑک پر احباب ٹولیوں میں بکھر گئے تھے اور قافلہ اندازاً دو میل تک پھیل گیا تھا۔ راستے میں جہاں فجر کا وقت ہوا اور وضو کے لئے پانی میسر آ سکا احباب نے باجماعت نماز ادا کرنے کا انتظام کر لیا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت قافلہ قادیان پہنچا وہاں پہنچ کر نعشِ مبارک کو حضورؑ کے باغ والے مکان کے دالان میں رکھ دیا گیا۔

جوں جوں باہر کی جماعتوں کو حضورؑ کے وصال کی اطلاع ملتی گئی، احباب دُور و نزدیک سے قادیان جمع ہوتے گئے۔ اور خاموشی سے زیرِ لب درود شریف پڑھتے ہوئے اور دعائیں کرتے ہوئے حضورؑ کے چہرہ مبارک کی زیارت کرتے رہے۔

حضرت مولانا مولوی نور الدین صاحبؓ خلیفۃ المسیح اوّلؓ کا انتخاب بعد مشورہ جس میں اراکین صدر انجمن شامل تھے۔ یہ طے پایا کہ حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ حضور علیہ السلام کے خلیفہ ہوں اور آپ کی اطاعت جماعت پر ایسے ہی واجب ہوگی جیسے حضور علیہ السلام کی واجب تھی۔ حضرت مولوی صاحبؓ نے یہ درخواست منظور فرمائی اور ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں جماعت کو نئے حالات میں اپنے فرائض کی طرف توجہ دلائی اور پھر جماعت کی بیعت لی۔ اور باغ کے اس حصہ میں جو آموں والا باغ کہلاتا تھا حضورؑ کا جنازہ پڑھایا۔ اور حضورؑ کی تدفین مقبرہ بہشتی میں عمل میں آئی۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی سَیِّدِہٖ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَخُلَفَائِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ ۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کی رات قادیان ٹھہر کر ۲۸ مئی کو میں لاہور واپس آگیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیات میں حضورؑ کی مجالس میں حاضری ستمبر ۱۹۰۴ء سے لیکر حضور علیہ السلام کے وصال تک خاکسار کو کئی دفعہ حضور علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ستمبر کی تعطیلات میں اور سالانہ جلسے کے ایام میں مَیں اپنے والد صاحب کے ہمراہ قادیان حاضر ہوا کرتا تھا حضور علیہ السلام جب سیر کو تشریف لے جاتے تو خاکسار بھی خدام کے زمرے میں رہا کرتا۔ اور ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد مسجد مبارک میں بھی حضورؑ کی مجلس میں حاضر رہتا۔ کسی خاص مہمان کے آنے یا رخصت ہونے پر بھی بعض دفعہ حضورؑ باہر تشریف لاتے یا مسجد مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو زیارت کا شرف حاصل ہو جاتا۔ جب میاں فضل حسین صاحب انگلستان سے تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس اپنے وطن بٹالہ تشریف لائے تو ان کے والد صاحب جن کے حضور علیہ السلام کے ساتھ خاندانی مراسم تھے۔ انہیں ساتھ لیکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے لئے دعا کی درخواست کی۔ خاکسار اس موقعہ پر بھی حاضر تھا۔ میاں فضل حسین صاحب نے آریہ سماج کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی نسبت کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ جس پر حضورؑ نے فرمایا۔ "آریہ سماج مذہبی جماعت کی حیثیت سے زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے گا کیونکہ اس کی بنیاد روحانیت پر نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر عطاء فرمائے تو آپ اپنی زندگی میں ہی آریہ سماج کا بطور مذہبی جماعت کے زوال دیکھ لیں گے۔" چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ میاں صاحب کی وفات ۱۹۳۶ء میں ہوئی، اس وقت تک آریہ سماج کی مذہبی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔

صاحبزادہ میاں مبارک احمد صاحب کی وفات کے وقت بھی خاکسار قادیان میں حاضر تھا۔ اس وقت مہمان خانے سے جو رستہ ڈھاب کے بند پر سے حضورؑ کے باغ اور بہشتی مقبرے کو جاتا ہے اس کے درمیانی حصے میں ڈھاب پر پل نہیں تھا۔ صاحبزادہ مبارک احمد کا جنازہ مقبرے تک لیجانے کیلئے ایک عارضی پل کی ضرورت پیش آئی جو جلدی میں سکول کے بنچوں اور میزوں کے ساتھ تیار کیا گیا۔ خاکسار نے بھی اس کی تیاری میں حصہ لیا۔ جنازے کے بعد تدفین میں کچھ وقفہ تھا کیونکہ قبر ابھی تیار نہ ہوئی تھی۔ اس عرصے میں حضورؑ اس قطعے میں جو بعد میں خاص

صحابہ کیلئے مخصوص کر دیا گیا تھا تشریف فرما رہے۔ اور خدام کو وعظ و نصیحت فرماتے رہے۔ آپ کے چہرۂ مبارک پر غم کے کوئی آثار نہ تھے۔ اور نہ آپ کے کلام کے انداز سے یا آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ اپنے فرزند ارجمند کے جنازے کے بعد اس کی تدفین پر دعاء کے انتظار میں تشریف فرما ہیں۔ آپ کے کلام کا انداز بالکل وہی تھا جو روزمرہ کی مجلس میں ہوا کرتا تھا۔ حضور علیہ السلام صبر جمیل کا کامل نمونہ تھے۔

مسجد مبارک کی توسیع سے پہلے کا واقعہ ہے۔ چند مہمان جن میں حضرت سید حامد شاہ صاحب، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب اور والد صاحب شامل تھے، مسجد مبارک میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے خاکسار بھی کھانے میں شامل تھا۔ میری نشست اس دروازے کے عین سامنے تھی۔ جس سے حضورؑ اپنے مکان سے مسجد میں داخل ہوا کرتے تھے۔ دروازے کی زنجیر مسجد کی طرف سے لگی ہوئی تھی۔ حضورؑ کے مکان کی طرف سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو میں نے زنجیر کھول دی۔ دروازہ کھلنے پر دیکھا کہ حضورؑ دستِ مبارک میں ایک طشتری لئے کھڑے ہیں جس میں گوشت کی بریاں ران رکھی ہوئی ہے۔ حضورؑ نے السلام وعلیکم فرما کر طشتری خاکسار کو دیدی اور حضورؑ واپس تشریف لے گئے۔ حضورؑ کی مشفقانہ مہمان نوازی اور خدام پروری اور اس بریاں گوشت کی لذت زائد از ساٹھ سال کے بعد بھی خاکسار کی یاد میں ایسی ہی تازہ ہیں کہ گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

حضورؑ کا لباس سادہ ہوا کرتا تھا۔ عمامے کے اندر حضورؑ نرم رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ کرتا جو عموماً ململ کا ہوتا تھا صدری اور لمبا کوٹ اور ملکی تنگ موری کی شلوار، گرم موسم میں بھی صدری اور کوٹ عموماً گرم کپڑے کے ہوا کرتے تھے۔ جب حضور باہر تشریف لیجاتے تو ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ستمبر کے مہینہ میں خاکسار نے دیکھا کہ دوپہر کے وقت کھانے کے بعد اور ظہر سے پہلے حضورؑ صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب والے مکان کے دروازے سے جو مسقّف گلی میں کھلتا تھا باہر تشریف لائے اور گلی میں سے ہو کر اس زیر تعمیر مکان کے صحن میں تشریف لے گئے جس میں بعد میں سیدہ اُمّ طاہر احمد صاحبہ کی رہائش رہی۔ اس وقت معمار اور مزدور کھانے کیلئے گئے ہوئے تھے اور کام بند تھا۔ حضورؑ تھوڑی دیر تک عمارت کو دیکھتے رہے اور پھر اسی راستے واپس تشریف لے گئے۔ خاکسار نے حضورؑ کو گلی میں تشریف لاتے وقت سے لیکر واپس تشریف لیجاتے وقت تک دیکھا۔ حضورؑ اس وقت صرف رومی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور صدری زیب تن تھی۔ حضورؑ نے کوٹ نہیں پہنا ہوا تھا۔ دستِ مبارک میں چھڑی تھی۔ خاکسار کچھ فاصلے پر حضورؑ کے پیچھے پیچھے رہا مخل نہیں ہوا۔

حضورؑ کے چچا مرزا نظام الدین صاحب حضورؑ کے سخت مخالف اور معاند تھے۔ انہوں نے طرح طرح کی تحقیر اور ایذادہی کو اپنا مسلک بنا رکھا تھا۔ حضورؑ کا ایک الہام تھا يَنْقَطِعُ مِنْ اٰبَائِكَ وَيُبْدَءُ مِنْكَ۔ ان کا ایک بچہ بیمار ہوا اور بیماری زور پکڑ گئی۔ حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ معالج تھے۔ حضور جب مسجد مبارک

میں رونق افروز ہوتے تو بعض دفعہ حضرت مولوی صاحبؓ سے اس بچے کی صحت کے متعلق بھی دریافت فرماتے۔ ایک دفعہ جب حضرت مولوی صاحبؓ نے بچے کی حالت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تو حضورؓ نے فرمایا۔ "مولوی صاحب اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو خود جانتا ہے۔ ہمارے لئے ہمدردی اور خدمت لازم ہے آپ پوری توجہ سے علاج جاری رکھیں اور جو کچھ بھی ضروری ہو عمل میں لائیں۔

صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کا گورنمنٹ کالج میں داخلہ اور ان سے تعلق اخوت مئی ۱۹۱۰ء میں صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ سکول کی تعلیم ختم کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوگئے اس طرح خاکسار کو کالج کے آخری سال میں آپ کی رفاقت کی سعادت حاصل ہوگئی۔ اور یہ تعلق ایسا محکم اور مضبوط ہوتا چلا گیا کہ کامل یگانگت کا رنگ پکڑ گیا۔ یہ تعلق نصف صدی سے زائد عرصہ تک آپ کے وصال تک قائم رہا۔ آپ کالج میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک باوقار تقویٰ شعار راضی برضا شخصیت بن چکے تھے۔ کالج کی زندگی کے ہر شعبے میں آپ کو ایک امتیاز حاصل ہوا۔ طلباء اور اساتذہ سب آپؓ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خاکسار کے ساتھ آپؓ نے ہمیشہ مشفقانہ اور کریمانہ اخوت کا سلوک روا رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپؓ نہایت اعلیٰ خلق کے مالک تھے۔ اور جس کسی کو بھی آپؓ کے ساتھ کسی رنگ میں سابقہ پڑا وہ ضرور آپؓ کی عنایات کا مورد ہوا۔ فجزاء اللہ خیراً و یغفر اللہ لہ و یجعل اللہ الجنۃ العلیاء مثواہ

چودھری شمشاد علی صاحب مرحوم کا گورنمنٹ کالج میں داخلہ اسی سال چودھری شمشاد علی خاں صاحب مرحوم بھی گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگئے اور صاحبزادہ صاحبؓ موصوف کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل کیا۔ چونکہ دونوں اصحاب کی رہائش بھی کالج کے پہلے سال کے دوران میں ایک ہی بڑے کمرے میں تھی اس لئے دونوں کے درمیان گہرا رابطہ قائم ہوگیا۔ اور یہ تعلق بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اور چودھری شمشاد علی خانصاحب کی وفات ۱۶ر جنوری ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔

چودھری سردار محمد صاحب صاحبزادہ صاحبؓ اور چودھری شمشاد علی خاں صاحب کے دوستوں میں سے ایک چودھری سردار محمد صاحب بھی تھے۔ جو میرے بھی مخلص اور گہرے دوست تھے وہ مجھ سے دو سال بعد اور صاحبزادہ صاحبؓ سے ایک سال پیشتر کالج میں داخل ہوئے۔ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے تو تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن طبیعت کے نہایت شریف اور بہت با اخلاق انسان تھے۔ کالج سے کیمیا (کیمسٹری) میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پشاور کالج میں کیمیا کے پروفیسر ہوئے اور چند سال بعد زراعتی کالج لائل پور میں منتقل ہوگئے۔ وہ جناب صاحبزادہ صاحبؓ کے حسن اخلاق کے گرویدہ تھے۔ انہوں نے آخر تک عہد وفا نبھایا، تقسیم کے بعد جب ربوہ میں سلسلہ کا مرکز قائم ہوا تو سال میں ایک دو بار ضرور صاحبزادہ صاحبؓ

کی زیارت کیلئے ربوہ حاضر ہوتے رہے۔

جناب صاحبزادہ صاحب اور چودھری شمشاد علی خاں صاحب دونوں فٹ بال کے کھلاڑی بھی تھے۔ چودھری شمشاد علی خاں صاحب تو جلدی ہی کالج کی فٹ بال کی ٹیم میں شامل کر لئے گئے تھے اور بعد میں ٹیم کے سیکرٹری اور کپتان بھی ہوئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ میرے طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر رابسن MR. ROBSON اور وائس پرنسپل مسٹر ہیمی MR HEMMY تھے۔ اوّل الذکر انگریزی اور موخر الذکر طبیعات پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ قابلِ ذکر اساتذہ میں لفٹنٹ کرنل سٹیفنسن (LIEUT: COL: STEPHENSON)۔ مسٹر بریٹ (MR: BRET) مسٹر وادن (MR: WATHEN) مسٹر جونز (MR: JONES) مسٹر گولک ناتھ چیٹرجی، لالہ جیارام شیخ نور الٰہی، مرزا محمد سعید، لالہ رچی رام، مسٹر چاولہ، مسٹر مکند لعل، لالہ چیتن انند، مسٹر لینگ ہارن (MR: LANGHORN) مسٹر رام پرشاد کھوسلہ، مسٹر تاج محمد خاں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام یاد ہیں۔ مسٹر بریٹ کے کالج چھوڑنے کے بعد ان کی جگہ ڈاکٹر سر محمد اقبال فلسفے اور انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ وہ بیرسٹری کی پریکٹس بھی کرتے تھے اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک کالج میں بھی پڑھاتے تھے۔ فلسفہ تو میرے مضامین میں شامل نہ تھا لیکن دو سال مجھے ڈاکٹر صاحب سے انگریزی پڑھنے کا فخر حاصل ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں انگریزی نظم پڑھاتے تھے۔ اور بہت محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ مشکل مقامات کو اچھی طرح واضح فرما دیتے تھے۔

میں پروفیسر جونز کے ٹیوٹوریل گروپ میں تھا۔ ۱۹۰۹ء کے تعلیمی سال کے پہلے سہ ماہی امتحان میں میں عربی اور تاریخ میں بفضل اللہ اول رہا اور انگریزی میں بھی میں نے اچھے نمبر لئے اس سہ ماہی کی رپورٹ کے نیچے میرے ٹیوٹر پروفیسر جونز نے لکھا کہ پڑھائی میں اچھا چلتا ہے لیکن کھیلوں اور ورزش میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ رپورٹ ملنے پر والد صاحب نے مجھے طلب فرمایا۔ رپورٹ مجھے پڑھنے کو دی اور دریافت فرمایا کہ تم کھیلوں میں کیوں حصہ نہیں لیتے؟ میں نے کمال ادب سے لیکن ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ یہ سوال مجھ سے نہیں ہونا چاہیئے۔ فرمایا۔ کس سے ہونا چاہیئے؟ میں نے عرض کیا ان سے ہونا چاہیئے جن کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق مدرسے کے ابتدائی درجوں میں ہی ملازم صبح ہوتے ہی مجھے ٹیوٹر کے پاس چھوڑ آتا، وہیں سے میں مدرسے چلے جاتا، میرا کھانا مدرسے بھیج دیا جاتا، مدرسے سے میں پھر ٹیوٹر کے پاس چلا جاتا، وہیں میرے لئے گھر سے دودھ آجاتا، شام کو میں کھانے کے لئے گھر آتا، کھانا ختم ہوتے

ہی ملازم مجھے ٹیوٹر کے پاس چھوڑ آتا اور رات کو مجھے واپس گھر لے آتا۔ کھیل کود کے زمانہ میں میرا یہ معمول رہا بعد میں میری آنکھیں دکھنا شروع ہو گئیں۔ یہ پہلا سال ہے کہ مجھے آشوبِ چشم کی تکلیف نہیں ہوئی، میں کھیلوں میں حصہ لینا کب سیکھتا ؟ والد صاحب میری جرأت پر حیران تو ضرور ہوئے ہوں گے لیکن چونکہ خود وکیل تھے میری دلیل شاید انہیں معقول معلوم ہوئی، خاموشی سے سن لی اور جب میں نے بات ختم کی تو فرمایا اچھا جاؤ۔ میں نے خیال کیا کہ میں نے اپنا پہلا کیس جیت لیا ہے۔

جب میں انگلستان جانے کو تھا تو مسٹر جونز نے مجھے چند ہدایات لکھ کر بھیجیں جن کے آخر میں یہ فقرہ تھا۔

IN SHORT AVOID WINE AND WOMEN AND WORK HARD AND YOU WILL NEVER REGRET HAVING GONE TO ENGLAND

ان کی یہ ہدایت اسلامی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ اور میری طبیعت کی افتاد کے بھی موافق تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے مجھے اس پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق بخشی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

گورنمنٹ کالج کے بعض ہم عصر طلبا

میں جب کالج میں داخل ہوا تو سنیئر مسلمان طلبا میں دو نام ممتاز تھے ایک ڈاکٹر ولی محمد صاحب جو کیمیا میں ایم ایس سی کی تیاری کر رہے تھے اور دوسرے شیخ فیروز دین مراد صاحب جو طبیعات میں ایم ایس سی کی تیاری کر رہے تھے۔ جالندھر کے خان احمد حسین خاں صاحب میرے داخل ہونے سے عین پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے کالج چھوڑ چکے تھے۔ کالج میں ان کے حسنِ کردار کا عام شہرہ تھا۔ اس وقت بی اے کلاسز میں چودھری غلام رسول صاحب (مریدوالہ ضلع گجرات) پسرِ اکبر چودھری سلطان احمد صاحب، چودھری غلام قادر صاحب (پسرِ اکبر جناب چودھری سردار خاں صاحب فیروزوالہ ضلع گجرانوالہ) شیخ غلام دستگیر صاحب (جالندھر) مسلمان طلبا میں پیش پیش تھے۔ چودھری غلام رسول صاحب کے منجھلے بھائی چودھری ذکاء اللہ صاحب کیمیا میں بہت قابل شمار کئے جاتے تھے لیکن قضائے الٰہی سے جلد فوت ہو گئے۔ احمدی طلبا میں شیخ محمد تیمور صاحب، چودھری فتح محمد سیال صاحب اور چودھری ضیاء الدین صاحب میرے سنیئر تھے۔ میں ان سب کی شفقت کا مورد رہا۔ فجزاء اللہ احسن الجزاء

ان دنوں غیر مسلم اور مسلم طلبا کے درمیان زیادہ مراسم نہ تھے۔ میرے ہم جماعتوں میں ایک مسٹر پرشوتم لال ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے نہایت شریف کم گو اور قابل طالب علم تھے۔ آخری سال انگریزی کے مضمون میں اوّل انعام کے لئے میرا اور ان کا مقابلہ ہو گیا۔ پہلے دو امتحانوں میں ہمارے مجموعی نمبر برابر تھے۔ تیسرے امتحان کے نمبروں پر انعام کا فیصلہ ہونا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ انگریزی مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ان کا خط بہت ہی صاف تھا اور یہ آسانی پڑھا جا سکتا تھا۔ ممتحن پروفیسر وادن تھے۔ جن کی رائے میری نسبت اچھی تھی۔ نتیجہ

نکلنے کا وقت قریب تھا۔ میں فٹ بال گراؤنڈ کی جانب کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا کہ میں نے پروفیسر وادن کو اپنے بنگلے سے ہوسٹل کی طرف آتے دیکھا۔ جب قریب پہنچے تو میں تعظیماً کھڑا ہو گیا سلام کیا اور دریافت کیا۔ آپ نے پرچے دیکھ لئے۔ انہوں کہا دیکھ لئے ہیں اور میں حیران ہوں کہ میں نے تمہیں اتنے نمبر کیسے دیدیئے! میں نے دریافت کیا مجھے کتنے نمبر ملے ہیں؟ انہوں نے کہا یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن تم اوّل ہو۔ پرشوتم لال کے متعلق دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ تم سے اس کے پانچ نمبر کم ہیں۔ اگرچہ ہمارے کمرے بالمقابل تھے لیکن اس وقت تک ہمارے درمیان بات چیت کا کوئی موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن انعام کا مقابلہ ختم ہو جانے پر ایسا معلوم ہوا جیسے ایک روک دور ہو گئی ہو۔ اور ہر روز کوئی نہ کوئی موقعہ بات چیت کا پیدا ہونے لگا۔
یونیورسٹی کا امتحان ختم ہونے پر ہم گھر چلے گئے۔ برسوں بعد ایک دفعہ ان سے ملاقات ہوئی وہ اس وقت سیشن جج تھے اور میں دِلّی میں فیڈرل کورٹ کا جج تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ فوت ہو گئے۔ زندہ رہتے تو قوی امکان تھا کہ ہائی کورٹ کے جج ہو جاتے۔

انہی انعامات کی تقسیم کے تعلق میں میری واقفیت مسٹر پدم سین سے ہوئی جو مجھ سے جونیئر تھے اور قابل طالب علم تھے۔ کچھ عرصہ انگلستان سے میری ان کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی۔ وہ اقتصادیات میں ایم اے کرنے کے بعد پوسٹل سروس میں لے لئے گئے اور محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں مجھے الہ آباد میں ان کا مہمان ہونے کا اتفاق بھی ہوا۔ چند سالوں سے پنشن یافتہ ہیں اور میرٹھ میں مقیم ہیں۔
ان کے ساتھ تو ۱۹۱۶ء کے بعد ملاقات کا موقعہ میسر نہیں آیا۔ لیکن نومبر ۱۹۶۹ء میں ان کے صاحبزادے جو بنگ کاک میں بین الاقوامی ادارۂ عمال کے نمائندے ہیں۔ ادارہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل مسٹر جنکس کے ہمراہ لاہور تشریف لائے اور ان سے ان کے والد محترم کی خیریت معلوم ہو گئی۔

تقسیم انعامات کے موقعہ پر لفٹیننٹ گورنر سر لوئی ڈین نے اپنی تقریر میں میرا نام لیکر مجھے ہر مضمون میں اوّل انعام حاصل کرنے پر مبارکباد دی اور مزید تعریفی الفاظ فرمائے۔ ان کی تقریر کالج میگزین راوی میں چھپی ”راوی“ کے ایڈیٹر مسٹر گورودت سوندھی تھے۔ جو بعد میں کالج کے پرنسپل بھی ہوئے۔ ”راوی“ میں جو تقریر شائع کی گئی اس میں وہ الفاظ حذف شدہ تھے جو لفٹیننٹ گورنر نے میرے متعلق فرمائے تھے۔ صرف اتنا لکھا گیا کہ سر آنر نے ایک طالب علم کو بہت سے انعام حاصل کرنے پر مبارکباد دی۔

پروفیسر وادن کی مشفقانہ رہنمائی۔ پروفیسر وادن میری بہت حوصلہ افزائی فرماتے تھے بی اے کے امتحان کے بعد میں نے ان سے مشورہ کیا کہ اگر پاس ہو جاؤں تو ایم اے میں داخل ہونے کی صورت میں کونسا مضمون انتخاب کروں۔ انگریزی کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ تمہاری ضروریات

کے لیئے خفی درکار ہوگی اتنی تم نے سیکھ لی ہے۔ البتہ اگر انگریزی پڑھانے کا ارادہ ہو تو انگریزی میں ایم اے کر لو ورنہ اقتصادیات کا مضمون زیادہ مفید رہے گا۔ میں نے دریافت کیا کہ ایک سال میں اقتصادیات میں اوّل درجہ حاصل کر سکوں گا؟ انہوں نے کہا کہ ایک سال میں سات ہی مہینے پڑھائی کے ہوں گے اتنے تھوڑے عرصہ میں پاس ہونا تو ممکن ہے۔ لیکن اوّل درجہ میں پاس ہونے کی امید میں ظفر اللہ خاں کو بھی نہیں دلا سکتا البتہ دو سال کے بعد اوّل درجہ حاصل ہونے کی امید دلا سکتا ہوں۔ عربی کے متعلق کہا کہ اگر تم آنرز میں اوّل آجاؤ اور عربی میں ایم اے کر لو تو کالج میں عربی کے پروفیسر ہو سکتے ہو۔ (اس وقت تک عربی، فارسی، سنسکرت پڑھانے کے لئے اساتذہ اورینٹل کالج سے مستعار لیئے جاتے تھے۔ لیکن آئندہ ان مضامین کے لئے باقاعدہ پروفیسر مقرر کرنیکا فیصلہ ہو چکا تھا) جب میرے انگلستان جانے کا فیصلہ ہو گیا تو پروفیسر وادن نے مجھے کیمبرج کے دو پروفیسروں کے نام تعارفی خط دیئے جن میں میرے متعلق بہت تعریفی الفاظ استعمال کئے۔ بعد میں وادن صاحب خالصہ کالج امرتسر کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں سروس ختم کرنے کے بعد انہوں نے لنڈن میں ایک سکول کھولا۔ میں جب لنڈن جاتا انہیں ضرور ملتا۔ ۱۹۳۴ء میں جب میرا تقرر وائسرائے کی کونسل کے رکن کے طور پر ہوا۔ تو میں لنڈن ہی میں تھا۔ اعلان کے چند روز بعد میں ان کے مکان کے قریب سے گذر رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے بلند آواز میں شاباش شاباش کے الفاظ سنے۔ مڑ کر دیکھا تو مسٹر وادن جلد جلد آرہے تھے۔ میں رک گیا اور کہا۔ آپ کی چھٹی مبارکباد کی ملی تھی۔ میں نے شکریہ کا خط بھیجا تھا۔ کہا شکریہ کا خط مجھے مل گیا تھا لیکن اس موقع پر میں اپنی خوشی کے اظہار کو روک نہ سکا۔ آخر تمہاری کامیابی میں میرا بھی تو کچھ حصہ ہے۔ میں نے کہا کیوں نہیں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی خدمت میں حاضری کی سعادت۔ اوائل ۱۹۱۱ء میں حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہٗ کو گھوڑے سے گرنے کا حادثہ پیش آیا۔ جس سے آپ کی دائیں کنپٹی پر زخم ہو گیا جو بعد میں ناسور کی شکل اختیار کر گیا۔ حادثے کے صدمے سے فوری طور پر ان کی طبیعت بہت کمزور ہو گئی۔ آپؓ نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھا اور اسے ایک لفافے میں بند کر کے لفافے پر کچھ لکھا اور اسے دوسرے لفافے میں بند کر کے یہ لفافہ شیخ محمد تیمور صاحب کے سپرد کر دیا۔ اور فرمایا یہ میری وصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپؓ کو شفا دیدی بعد میں جب آپؓ کے وصال کا وقت قریب آیا۔ تو آپؓ نے اپنی وفات سے دو تین دن قبل ایک باقاعدہ وصیت لکھ کر مولوی محمد علی صاحب ایم اے کو دی۔ اور فرمایا یہ پڑھ لیں اور پڑھ کر سنا دیں۔ یہ وصیت شائع بھی ہو گئی۔ اندریں حالات اس لفافے کے کھولنے

کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جو آپؓ نے ۱۹۱۱ء میں گھوڑے سے گرنے کے حادثے کے بعد شیخ محمد تیمور صاحب کے سپرد کیا تھا۔ لیکن آپؓ کے وصال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے وہ لفافہ کھولا۔ اندر کے لفافے پر لکھا تھا کہ جس شخص کا نام اس لفافے کے اندر ہے۔ اس کی بیعت کرنا۔ اور لفافے کے اندر کاغذ کے پرزے پر "محمود" لکھا تھا۔ ۱۹۱۱ء کے حادثے کے وقت میں لاہور تھا قادیان میں نہ تھا۔ اور حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ کے وصال کے وقت لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مندرجہ بالا روایت پختہ سماعی شہادتوں کی بنا پر درج کی گئی ہے۔ اس بات کی شہادت خود مولوی محمد علی کی تحریروں میں بھی موجود ہے کہ ۱۹۱۱ء میں حضرت خلیفۃ المسیح اوّل نے صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کی بیعت کی وصیت کی تھی۔

مارچ، اپریل ۱۹۱۱ء میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر اور چند دن سیالکوٹ ٹھہر کر میں قادیان حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ابھی حضورؓ حادثے کے اثرات سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہو پائے تھے اور آپ کا وقت زیادہ تر اپنے رہائشی مکان کے مردانہ دالان میں گذرتا تھا۔ نمازیں بھی آپ وہیں ادا فرماتے تھے۔ اور وہیں درس و تدریس اور صدور احکام کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خاکسار بھی دن کا اکثر حصہ وہیں آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ مغرب کے وقت حضور دالان سے صحن میں تشریف لے جاتے تھے اور مغرب کی نماز صحن میں ادا فرماتے تھے، ظہر اور عصر کی نمازوں کے وقت حضور پلنگ کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور بیٹھے ہوئے ہی نماز ادا فرماتے تھے۔ عموماً شیخ محمد تیمور صاحب کو ارشاد ہوتا کہ نماز پڑھائیں اگر شیخ صاحب موجود نہ ہوتے تو اپنے کسی اور شاگرد کو نماز پڑھانے کے لئے فرماتے۔ پہلے دن جب خاکسار حاضر ہوا اور ظہر کی نماز کی اذان ہونے پر آپؓ نے حاضرین کو ارشاد فرمایا۔ "جائیں نماز پڑھیں"۔ تو خاکسار بھی تعمیل ارشاد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؓ نے خاکسار کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "میاں تم یہیں نماز پڑھ لیا کرو"۔ چنانچہ عرصہ قیام قادیان میں خاکسار ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں آپؓ کے ساتھ ہی ادا کرتا رہا۔ ظہر و عصر کی نمازوں میں آپ کی بائیں طرف تو پلنگ ہوا کرتا تھا اور دائیں طرف خاکسار کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور بوجہ ادب اور اسلئے بھی کہ زیادہ قریب کھڑا ہونا آپؓ کیلئے تکلیف کا باعث نہ ہو، ذرا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہوتا تھا۔ لیکن آپؓ خاکسار کو اپنے قریب کھڑا کر لیا کرتے تھے۔ مقتدیوں کی تعداد چھ سات ہوا کرتی تھی۔ ایک روز عصر کی نماز کے وقت شیخ محمد تیمور صاحب موجود نہ تھے آپ نے نظر اٹھا کر حاضرین کا جائزہ لیا اور خاکسار کو فرمایا۔ "میاں تم نے قرآن پڑھا ہے تم نماز پڑھاؤ"۔

ان ایام میں آپؓ شیخ محمد تیمور صاحب کو صحیح بخاری پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ صاحب ایک حدیث پڑھتے اور اگر کسی بات کو وضاحت طلب سمجھتے تو آپؓ سے استصواب کرتے یا اگر آپ خود کچھ بیان فرمانا چاہتے تو بیان فرما

دیتے۔ لیکن آپ کا دربار تو ہر وقت ہر کس وناکس کیلئے کھلا ہوتا تھا۔ درمیان میں کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو اس کی طرف توجہ فرماتے۔ اگر دفتر سے کوئی کاغذ آجاتا تو اس پر حکم صادر فرماتے۔ غرض ایک سلسلہ تمام وقت جاری رہتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ شیخ صاحب نے ایک حدیث پڑھی اور اس کے متعلق کوئی سوال کیا۔ اتنے میں حضور رضی کی توجہ کسی اور طرف ہو گئی تھی۔ آپ نے وہ سوال نہ سنا۔ جب آپ فارغ ہوئے اور شیخ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تو شیخ صاحب نے اگلی حدیث پڑھ دی۔ آپ نے فرمایا پچھلی حدیث میں فلاں بات قابلِ غور تھی۔ شیخ صاحب نے کچھ شکوے کے رنگ میں کہا میں نے دریافت تو کیا تھا آپ نے جواب نہ دیا میں نے خیال کیا آپ بتانا نہیں چاہتے۔ خاکسار کو شیخ صاحب کی اس حرکت پر تعجب ہوا۔ لیکن حضور مسکرا دیئے اور کہا۔ شیخ خفا ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ جو بالکل اس واقعہ کی ضد اور کمال ادب کی مثال تھا۔ مولوی غلام نبی مصری صاحب جو آپ رضی کے ایک ممتاز شاگرد تھے دالان کے بائیں میں صحن کی جانب سے داخل ہوئے اور السلام علیکم کہہ کر سامنے کی دیوار میں جو الماری تھی اس کی طرف بڑھے۔ الماری سے کوئی کتاب لیکر جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اس کی طرف لوٹے۔ دروازے کے قریب پہنچے تو حضرت خلیفۃ المسیح نے آپ کو دیکھ کر فرمایا۔ "مولوی صاحب السلام علیکم"۔ مولوی صاحب نے "حضور وعلیکم السلام" کہہ کر کمال انکسار کے لہجے میں عرض کی۔ "خاکسار نے السلام علیکم کہا تھا لیکن حضور تک پہنچا نہ سکا"

برسوں بعد مولانا روم کا یہ شعر نظر سے گذرا۔

از خدا جوئیم توفیقِ ادب ❊ بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

آنکھیں نم ہوئیں اور دل حسرت سے بھر گیا کہ معلوم نہیں غفلت اور نادانی میں کتنے مواقع جذبِ فضل کے گنوا دیئے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔

دوپہر کے وقت ڈاکٹر صاحبان آپ کے زخم پر مرہم پٹی کیلئے حاضر ہوتے اور مجلس برخاست ہو جاتی۔ ڈاکٹر صاحبان کے رخصت ہو جانے کے بعد آپ رضی کچھ دیر استراحت فرماتے۔ اس وقت آپ رضی کے شاگردوں میں سے کوئی ایک آپ کی پیٹھ کی طرف پلنگ پر بیٹھ جاتا اور آہستہ آہستہ آپ کا بدن دباتا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ڈاکٹر صاحبان کے رخصت ہو جانے پر صرف خاکسار ہی دالان میں حاضر رہ گیا۔ شوق اور اخلاص کہتا تھا کہ یہ موقع خدمت کا غنیمت ہے۔ حجاب اور ادب روک رہے تھے۔ خاکسار کو کبھی بدن دبانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ خوف تھا کہ بجائے حضور کیلئے آرام کا موجب بننے کے بیزاری کا باعث نہ بنوں۔ آخر جرأت کر کے حصول ثواب کی نیت سے خاکسار نے حضور رضی کا بدن دبانا شروع کیا۔ چند منٹوں کے بعد خیال آیا کہ شاید حضور رضی کی آنکھ لگ گئی ہے اور میرا بدن دباتے رہنا حضور رضی کے آرام میں مخل ہو گا۔ اس خیال سے خاکسار نے دبانا بند کر دیا۔ ابھی خاکسار نے پلنگ سے

ہٹنے کے لئے کوئی حرکت نہیں کی تھی کہ حضورؓ نے کروٹ پر لیٹے لیٹے ہی اپنا بازو اٹھا کر خاکسار کے چہرے کو اپنے مبارک چہرے کے قریب کر لیا اور دو تین منٹ تک اسی حالت میں رکھا۔ پھر اپنا بازو ہٹا لیا اور فرمایا۔ "میاں ہم نے تمہارے لئے بہت بہت دعائیں کی ہیں۔"

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کی خدمت میں مزید تعلیم کیلئے انگلستان جانیکی اجازت کی درخواست۔

انہی دنوں میں میرے والد صاحب نے اپنے خط میں مجھے ارشاد فرمایا کہ حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی خدمت میں گذارش کرو کہ مجھے بفضل اللہ امتحان میں کامیابی کی امید ہے اور کامیابی کی صورت میں میرے والد صاحب کی خواہش ہے کہ اگر حضورؓ اجازت عطا فرمائیں تو مجھے مزید تعلیم کیلئے انگلستان بھیج دیں اسلئے حضورؓ کی خدمت میں اجازت کی اور دعا کی درخواست ہے۔ میں نے یہ عرض داشت لکھ کر حضورؓ کی خدمت میں پیش کر دی۔ آپؓ نے مزید تعلیم کیلئے انگلستان جانے کے متعلق فرمایا۔ "آپ بھی اور آپ کے والد صاحب بھی استخارہ کریں۔ پھر اگر اطمینان ہو تو اجازت ہے۔" انہیں ایام میں سیالکوٹ کے دو اور طلبا نے بھی حضورؓ سے انگلستان جانے کی اجازت چاہی۔ لیکن حضورؓ نے پسند نہ فرمایا۔ میں نے قادیان ہی میں استخارہ شروع کر دیا دوسری یا تیسری رات کو ابھی سویا ہی تھا کہ ایسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میری چارپائی کے پاس کھڑا ہے۔ اور مجھے مخاطب کر کے اس نے کوئی بات کہی ہے جس کا پہلا حصہ تو میں سن نہیں سکا لیکن آخری الفاظ جو سنے وہ تھے۔ "تو پھر انگلستان جاؤ۔" اس سے مجھے تو اطمینان ہو گیا کہ بفضل اللہ میرا انگلستان جانا فائدہ مند ہو گا۔ اس بات میں میری اپنی خواہش کا چنداں دخل نہیں تھا کیونکہ مجھے انگلستان جانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ بلکہ میں والدہ محترمہ کی پریشانی کا خیال کر کے انگلستان جانے سے کچھ گھبراتا تھا۔ ایک بالکل نئے ماحول اور نئی معاشرت کے خیال سے بھی طبیعت میں پریشانی ہوتی تھی۔

بی اے کے امتحان میں اوّل درجے میں کامیابی۔ میں ابھی قادیان ہی میں تھا کہ ایک روز حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کی مجلس سے دوپہر کے کھانے کیلئے صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے مکان پر (جہاں میرا قیام تھا) پہنچتے ہی مجھے شیخ مبارک اسمٰعیل صاحب کا خط ملا جو انہوں نے لاہور سے لکھا تھا کہ امتحان کا نتیجہ نکل گیا ہے اور تم پاس ہو گئے ہو۔ خط میں انہوں نے میرے نمبر بھی درج کئے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ میں بفضل اللہ اوّل درجے میں پاس ہوا تھا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ میں خط پڑھتے ہی الٹے پاؤں حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی فرودگاہ پر حاضر ہوا اور خط حضورؓ کی خدمت میں پیش کر دیا حضورؓ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔ اس دن سہ پہر کی مجلس میں جو کوئی بھی حاضر ہوتا حضورؓ اسے فرماتے۔ "آج ہم بہت خوش ہیں یہ امتحان میں پاس ہو گئے ہیں اور تعجب ہے کہ انہیں پہلے ہی معلوم تھا کہ پاس ہو جائیں گے۔" بعد میں

یہ بھی معلوم ہوا کہ خاکسار عربی آنرز میں بھی پاس ہوگیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے عربی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جب میٹریکولیشن کا نتیجہ نکلا تو مجھے نتیجہ کی اطلاع میرے ایک دوست نے دی جن کا نام غلام قادر تھا۔ والد صاحب تو امتحان کے لئے اس سال میرا نام بھی بھیجنے میں متامل تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل اور اپنی "قدرت" سے کامیابی بخشی۔ اوّل درجہ بھی عطا فرمایا اور اپنے سکول میں اوّل رہنے کا اعزاز بھی۔ ایف اے کے دو سالوں میں پانچ آزمائشی امتحان ہوئے۔ دو میں تو میں آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے شامل ہی نہ ہو سکا۔ ایک میں ریاضی میں فیل ہوگیا، ایک میں سائنس میں فیل ہوگیا اور تیسرے میں ان دونوں میں فیل ہوگیا۔ یونیورسٹی کے امتحان کی تیاری کیلئے مجھے اتنا تھوڑا وقت میسر آیا کہ میں نے ریاضی، سائنس میں بعض حصوں کی تیاری کی کوشش بھی نہ کی۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے "فضل و کرم" سے دوسرے درجے میں اچھے نمبروں سے کامیابی عطا فرمائی۔ ایف اے کے امتحان کے نتیجے کی اطلاع میرے ایک دوست نے دی جن کا نام "فضل کریم" تھا۔ جس میں یہ اشارہ بھی تھا کہ امتحان کیلئے تیاری کا حال تو تم جانتے ہو لیکن ہم نے اپنے "فضل و کرم" سے تمہیں کامیابی عطا فرمائی ہے۔ بی اے کے امتحان کے نتیجے کی اطلاع شیخ مبارک اسمٰعیل صاحب نے دی۔ جن کے نام میں مبارکبادی اور آئندہ کی ترقیات کے متعلق دعاؤں کی قبولیت کی طرف اشارہ تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

عصر کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح صحن میں رونق افروز تھے۔ باہر سے ایندھن کی لکڑی ڈیوڑھی تک پہنچائی گئی۔ ایک دو نوجوان شاگردوں نے لکڑی کو ڈیوڑھی سے اٹھاکر باورچی خانے میں لانا شروع کیا باورچی خانہ صحن کے دوسری طرف تھا۔ میں بھی ان شاگردوں میں شامل ہوگیا۔ ایک دو لکڑیاں اٹھائے باورچی خانے کی طرف جارہا تھا کہ حضورؓ کی نگاہ پڑ گئی فرمایا۔ "میاں یہ تمہارا کام نہیں تم چھوڑ دو۔"

ایک روز مغرب کی نماز میں تھے کہ حضورؓ کے بچوں میں سے ایک آکر گود میں بیٹھ گیا۔ جب حضور نماز سے فارغ ہوئے اور بچے کی طرف شفقت سے متوجہ ہوئے تو بچے نے جوش کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی اپنے ننھے سے ہاتھ کو زور سے حضورؓ کے رخسار پر مارنا شروع کیا۔ حضور ہنستے بھی جاتے تھے اور بچے کی تسکین کی کوشش بھی کرتے جاتے تھے۔ بچے کی طبیعت دیر کے بعد سنبھلی لیکن حضورؓ کی شفقت میں فرق نہ آیا

ایک روز مجلس میں حضورؓ نے ذکر فرمایا کہ ہمیں پیاس کی تکلیف رہتی ہے۔ حضور خود اعلیٰ درجے کے طبیب تھے اور حضورؓ کے مشیروں میں ڈاکٹروں اور اطباء کی کمی نہ تھی۔ خاکسار ایک نادان نوعمر تھا۔ وفورِ اخلاص میں سادگی سے عرض کر دیا کہ اگر حضورؓ چائے میں الائچی اور دانہ چینی استعمال فرمائیں تو

ممکن ہے فائدہ ہو مسکرا کر فرمایا۔ "میاں میں اگر دودھ یا دودھ ملی ہوئی کسی شے کا استعمال کروں تو مجھے تکلیف ہو جاتی ہے۔" اور ساتھ ہی کسی خادم کو ارشاد فرمایا۔ "اندر کہہ دو ہمارے لئے چائے تیار کر کے بھیج دیں جس میں الائچی اور دار چینی ہو۔"

بی اے کا نتیجہ معلوم ہونے کے بعد چند دن ٹھہر کر میں نے سیالکوٹ واپس جانے کی اجازت چاہی۔ آپؓ نے اجازت دی اور میں سیالکوٹ چلا گیا۔ میری واپسی سے ایک دو دن قبل ایک روز آپ نے مغرب کے وقت فرمایا۔ "میاں تم تمام دن یہاں بیٹھے ہو شام کے وقت سب لڑکے کھیل اور ورزش کیلئے باہر میدان میں چلے جاتے ہیں۔ تمہارا دل کھیلنے کو نہیں چاہتا؟" خاکسار نے گذارش کی "حضور مجھے کھیل کود کا شوق نہیں"

سیالکوٹ واپسی پر میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں ذکر کر دیا کہ میں نے والد صاحب کی ہدایت کے ماتحت حضرت خلیفۃ المسیحؓ سے انگلستان تعلیم کیلئے جانے کی اجازت چاہی تھی۔ حضور نے استخارہ کرنے کا ارشاد فرمایا تھا اور استخارہ کرنے پر مجھے انگلستان جانے کی تحریک ہوئی ہے۔ لیکن والدہ صاحبہ کی طبیعت تین سال کی لمبی جدائی کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔

مزید تعلیم کیلئے انگلستان جانے کا فیصلہ۔ واپسی کے چند دن بعد والد صاحب نے مجھے طلب فرمایا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حاجی چوہدری سلطان محمد خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لاء اور چوہدری محمد امین صاحب وکیل آپؓ کے پاس تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے بیٹھنے کا ارشاد ہوا اور چوہدری سلطان محمد خاں صاحب نے دریافت فرمایا۔ کیوں عزیز! تم انگلستان کیوں نہیں جاتے؟ میں نے عرض کیا کہ جیسے والد صاحب فرمائیں۔ اس پر انہوں نے ککس ٹریولر گزٹ کا پرچہ نکالا جو وہ ساتھ لائے تھے اور تینوں صاحبان نے مشورہ کر کے طے کیا کہ میں آسٹرین لائیڈ کے جہاز کوربیر پر جو بمبئی سے یکم ستمبر کو روانہ ہو کر ٹریسٹ جانے والا تھا۔ انگلستان کا سفر شروع کروں۔ میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں اس فیصلے کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ بعض اشیاء کی خرید کیلئے مجھے لاہور جانا پڑا جہاں والد صاحب کی ہدایت کے تحت میں انگلش ویئر ہاؤس لاہور میں شیخ رحمت اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انہوں نے کمال شفقت سے میرے لئے خود مناسب اشیاء کا انتخاب کیا اور سفر اور قیام انگلستان کے متعلق مناسب ہدایات دیں۔ اور مشورہ دیا۔ **فجزاء اللہ احسن الجزاء۔**

جب سفر کے شروع ہونے کا وقت قریب آیا تو یہ طے پایا کہ والد صاحب، والدہ صاحبہ، میرے ماموں چوہدری عبد اللہ خاں صاحب، میاں حمّاں صاحب (جو ہمارے دادا صاحب کے وقت سے ہماری ڈسکہ کی اراضیات کی کاشت وغیرہ کا انتظام کرتے تھے) اور میں قادیان حاضر ہوں۔ اور وہاں سے واپسی پر

والد صاحب اور میں تو امرتسر سے بمبئی چلے جائیں اور والدہ صاحبہ، ماموں صاحب اور میاں حمان سیالکوٹ لوٹ آئیں۔ والد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ سفر کا پروگرام ایسا ہونا چاہیئے کہ امرتسر سے سیالکوٹ کی طرف جانے والی گاڑی بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی سے پہلے روانہ ہو۔ اور ہم دونوں والدہ صاحبہ کو امرتسر سے رخصت کریں وہ ہمیں بمبئی کی طرف روانہ ہوتے نہ دیکھیں۔ چنانچہ اسی کے مطابق پروگرام بنایا گیا

سفرِ انگلستان پر روانہ ہونے سے پہلے حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی ہدایات ۔ اس موقعہ پر قادیان میں ہمارا قیام صرف ایک دن رہا۔ رخصت ہوتے وقت حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ نے جو ہدایات خاکسار کو دیں ان میں سے جو خاکسار کو یاد رہ گئی ہیں درج ذیل ہیں۔ فرمایا:۔

۱۔ اس دعاء کا ورد رکھنا۔ اللھمّ ارزقنی جلیساً صالحاً۔ ۲۔ جب کسی سفر کے آخر میں منزلِ مقصود کے قریب پہنچو اور شہر یا بستی کی آبادی نظر آنا شروع ہو تو یہ دعاء کیا کرو۔ اللھمّ ربّ السمٰوٰت السّبع وما اظللن وربّ الارضین السّبع وما اقللن وربّ الرّیاح وما ذرین وربّ الشیاطین وما اضللن انّی اسألک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا وخیر ما فیھا و أعوذبک من شر ھذہ القریۃ وشر اھلھا و شر ما فیھا اللّھم ارزقنا حیاھا و اعذنا من وباھا اللّھم حبّبنا اِلیٰ اھلھا وحبّب صالحی اھلھا الینا۔ اے اللہ جو رب ہے ساتوں آسمانوں کا اور اس کا بھی جو کچھ ان کے سائے میں ہے۔ اور رب ہے ساتوں زمینوں کا اور ہر اس چیز کا جو اس پر قائم ہے اور رب ہے ہواؤں کا اور ہر اس چیز کا جسے وہ لئے پھرتی ہیں۔ اور رب ہے سب سرکشوں کا اور ان کا جنہیں وہ گمراہ کرتے ہیں۔ میں طالب ہوں تجھ سے اس آبادی کی ہر بھلائی کا اور اس میں رہنے والوں کی طرف سے ہر بھلائی کا۔ اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس کی طرف سے ہر بھلائی کا۔ اور تیری حفاظت کا طالب ہوں اس بستی کے ہر شر سے اور اس میں رہنے والوں کے ہر شر سے اور جو کچھ بھی اس کے اندر ہے اس کے ہر شر سے۔ یا اللہ تو اس کی ہر خوشگوار چیز ہمیں عطا فرما۔ اور اس کی ہر ضرر رساں چیز سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ تو اس میں رہنے والوں کے دلوں میں ہماری محبت ڈال دے اور اس میں رہنے والوں میں سے نیک بندوں کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان چونکہ ایک سرد ملک ہے۔ اسلئے وہاں سردی کے دفاع کیلئے شراب کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم طبیب ہیں اور ہم جانتے ہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ اگر تمہیں سردی کی مدافعت کی ضرورت محسوس ہو تو کوکو استعمال کریں۔ اس میں غور اکیت بھی ہے اور سردی کے اثر کو بھی زائل کرتی ہے

۴۔ ہمیں خط لکھتے رہنا ہم تمہارے لئے دعا کریں گے۔

۵۔ انگلستان میں ہندوستانی طلبا سے زیادہ میل جول نہ بڑھانا وہاں کے شریف طبقہ سے میل جول رکھنا

خاکسار نے حتی الامکان آپ کی فرمودہ ہدایات کی پابندی کی اور بفضل اللہ ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔
میاں محمّاں صاحب اس وقت تک سلسلہ احمدیہ میں بیعت نہیں ہوئے تھے۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر انہوں نے حضورؓ کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی۔ حضورؓ نے فرمایا "آپ ابھی چند دن یہاں ٹھہریں"۔ انہوں نے اپنی دیہاتی سادگی سے عرض کیا۔ حضورؓ مجھے تو کل چودھری صاحب (والد صاحب) کے ساتھ واپس جانا ہے۔ آپؓ نے مسکرا کر فرمایا۔ "تو پھر آپ بیعت بھی چودھری صاحب کی کریں ہماری کیوں کرتے ہیں"

روانگی سے قبل صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کی خدمت میں حاضری

صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر دعاء کیلئے گذارش کروں۔ چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعاء کی درخواست کی۔ آپؓ نے بھی خاکسار کو نصائح فرمائیں۔ دوسرے دن دوپہر کا کھانا ہمارے لئے حضرت ام المومنینؓ نے کمال شفقت سے اپنے مبارک ہاتھوں سے تیار فرمایا۔ فجزاھا اللہ فی الدارین خیراً وجعل اللہ الجنۃ العلیاً ثواھا۔ والدؓ صاحب کا یہ قادیان کا پہلا سفر تھا۔

انگلستان کا سفر، امرتسر سے بمبئی تک پہلا سفر بذریعہ ریل۔ امرتسر کے اسٹیشن پر والدہ صاحبہؓ کو رخصت کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی وہ بیہوش ہو گئیں اور چند گھنٹے اس حالت میں گذرے۔ ان کی محبت اور شفقت کا سمندر بے پایاں اور عمیق تھا۔ میں نے اس سے قبل لاہور اور امرتسر سے آگے ریل کا سفر بٹالے تک تو کیا تھا لیکن امرتسر سے آگے جالندھر کی طرف یہ میرا پہلا سفر تھا۔ پھلور لدھیانہ، انبالہ، سہارنپور، غازی آباد، دلی وغیرہ سب میرے لئے نئے مقام تھے۔ دلی کے اسٹیشن پر چودھری شمشاد علی خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دلی سے آگے بمبئی کا لمبا سفر جی آئی پی ریلوے کے رستے شروع ہو گیا۔ والد صاحب کی معیت میرے لئے بہت تسکین کا موجب تھی لیکن دوران سفر وہ بھی خاموش تھے اور میں بھی خاموش تھا۔ امرتسر سے روانہ ہو کر دوسری صبح ہم دلی پہنچے اور اس کے دوسرے دن سہ پہر کو بمبئی پہنچ گئے۔ کلیان کے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر آیا اور مجھ سے ٹکٹ لیکر چلا گیا۔ گاڑی چل پڑی تو میں کچھ [illegible]شان ہوا کہ ٹکٹ کلکٹر نے ٹکٹ واپس نہیں کئے۔ میں نے والد صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا لیکن انہوں نے کچھ نہ فرمایا۔ ان کے لئے بھی سفر کا یہ حصہ ویسا ہی نیا اور غیر معروف تھا جیسا میرے لئے وکٹوریہ ٹرمینس پہنچ کر ٹکٹوں کا عقدہ حل ہو گیا۔ گاڑی جہاں رکی وہاں سے اتر کر مسافر پیدل یا وکٹوریہ وغیرہ میں سوار ہو کر اپنی اپنی جگہ کو روانہ ہو گئے کسی پھاٹک سے گذرنے کی ضرورت پیش نہ آئی اور نہ کہیں ٹکٹ دکھانا پڑا۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ان ایام میں ہندوستان سے باہر جانا ایک نئی

دنیا میں داخل ہونا تھا۔ جس کے متعلق مجھے کچھ بھی علم نہ تھا۔ انگریزی لکھنے پڑھنے کی کسی قدر مہارت تو سکول اور کالج میں حاصل ہوگئی تھی لیکن بولنے کی بہت کم مشق تھی۔ یورپ کے تمدن اور معاشرت سے دُور کی آشنائی بھی نہ تھی یہاں تک کہ میں نے کبھی چھری کانٹے کا استعمال بھی نہیں کیا تھا اور نہ کسی کو استعمال کرتے دیکھا تھا ان دنوں تو ہمارے نوجوان طالب علم خصوصاً بڑے شہروں میں رہنے والے بہت حد تک مغربی تمدن اور معاشرت کے طور طریقوں سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں ہم ان کوچوں سے قطعاً نا آشنا تھے۔

ہم بمبئی میں ایک مسلم ہوٹل میں ٹھہرے جس کا نام "شاہجہاں پیلیس ہوٹل" تھا۔ اس کے مالک اور منیجر لدھیانے کے ایک خواجہ صاحب تھے۔ اس زمانے کے اندازے کے مطابق یہ ایک صاف ستھری آرام دہ قیام گاہ تھی بمبئی پہنچنے کے دوسرے دن ٹامس کک کے دفتر جا کر ٹکٹ وغیرہ کے انتظامات جو پہلے سے طے شدہ تھے مکمل کئے اور جہاز کے اور سفر کے متعلق ضروری معلومات حاصل کیں۔ پہلی عالمی جنگ سے پہلے یورپ کے صرف دو ممالک ترکی اور روس کیلئے پاسپورٹ درکار ہوتا تھا۔ باقی ممالک کیلئے پاسپورٹ کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ بنک وغیرہ میں شناخت کیلئے حاکم ضلع کا دستخطی ایک سرٹیفکیٹ احتیاطاً لے لیا جاتا تھا۔ جہاز کی روانگی کا وقت بارہ بجے دوپہر تھا اور مسافروں کو ہدایت تھی کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ قبل پہنچ جائیں۔ اس جہاز نے الگزینڈرا ڈاکس سے روانہ ہونا تھا۔ ہم بروقت پہنچ گئے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافروں کیلئے تختۂ جہاز پر پہنچنے کیلئے جو جگہ مقرر تھی وہاں پہنچ کر والد صاحب نے اسلام علیکم کہہ کر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی میں مصافحہ کیا اور وہ رخصت ہو گئے۔ مصافحہ کرتے وقت میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ میری طرف نہیں تھا۔ انہوں نے عمداً اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا شاید انہیں اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے میری طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر جدائی کے احساس کے اثرات نظر آئیں گے جن سے میری طبیعت افسردہ ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب یہ مجھے علم تھا کہ میری جدائی ان پر شاق ہوگی۔ سیالکوٹ سے روانہ ہونے سے پہلے بھی کبھی کبھی ایسے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے۔

جہاز کا پہلا سفر ۔ جہاز میرے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ میرے کمرے کے دوسرے مکین میرے ایک ہم جماعت ہی تھے۔ یعنی مولوی محمد علی صاحب جو مولوی عبدالقادر صاحب قصوری کے صاحبزادے تھے۔ میرے ایک اور ہم جماعت بھی ہمارے ہمسفر تھے۔ شیخ محمد سعید صاحب (یہ بھی قصور کے رہنے والے تھے) مسٹر گوردت سوندھی ایم اے بھی اسی جہاز پر سفر کر رہے تھے لیکن وہ اوّل درجے میں تھے۔ کوئی ساڑھے چار ہزار ٹن کا جہاز تھا اور اسکی رفتار بھی اسی کے مطابق تھی۔ جب جہاز روانہ ہوا تو ہم عرشے کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر بمبئی کا نظارہ کرنے لگے۔ ابھی یہ نظارہ سامنے ہی تھا کہ جہاز

نے طول و عرض دونوں سمتوں میں حرکت شروع کر دی۔ چند منٹ تو ہم نے اسے قابل توجہ نہ سمجھا اور اس انتظار میں رہے کہ بمبئی کا منظر نظروں سے اوجھل ہو تو کھانے کے کمرے میں جا کر دوپہر کا کھانا کھائیں لیکن جلد ہی اس حرکت سے سر چکرانے لگا اور طبیعت میں امتلا شروع ہوا۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو طبیعت کھانے کی طرف بالکل راغب نہ تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس بات کا اثر ہے۔ میں نے مرض البحر کا نام تک نہ سنا تھا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ نہایت ہی تکلیف دہ کیفیت ہے۔ تفاصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں متواتر چار دن نہایت کرب میں گذرے ایک لحظہ کیلئے بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ چلنے پھرنے یا اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کھانے پینے کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی سموکنگ سالون میں پڑے ہوئے ایک ایک منٹ گذارنا مشکل تھا۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کی ہمت نہ پڑی کہ وہاں پہنچ کر بستر پر لیٹ ہی جائیں جس لباس میں جہاز پر آئے تھے اسی میں یہ چار دن کسے کسائے گذرے۔ میں انگریزی لباس کا عادی بھی نہ تھا۔ اڑھائی انچ چوڑا سخت (ہارڈ) کالر پہنے تھا جو گلے کا طوق بن رہا تھا۔ پیاس کی شدت ہر لحظہ بے قرار رکھتی تھی اور کچھ پینے کی جرأت اختیار سے باہر معلوم ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے دن گذرتے تا تورات کے تصور سے وحشت ہوتی۔ مولوی محمدؐ علی صاحب کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔ ایک دو بار انہوں نے کہا کہ عدن سے واپس چلے جائیں گے۔ میں نے کہا یہی مصیبت واپسی کے سفر میں بھی برداشت کرنا ہوگی۔ ابھی عدن پہنچنے میں ڈیڑھ دن باقی تھا کہ طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی۔ جیسے جیسے سمندر کے تلاطم میں تخفیف ہوتی گئی جہاز کی حرکت کم ہوتی گئی۔ اور طبیعت اعتدال پر آتی گئی۔ تین چار گھنٹوں کے عرصے میں مرض البحر کے سب آثار رفع ہو کر طبیعت صاف ہو گئی اور جہاز کی زندگی بہت خوشگوار معلوم ہونے لگی۔ پورٹ سعید سے لیکر ٹری ایسٹ تک کا سفر بہت پر لطف رہا۔

ٹری ایسٹ اس زمانہ میں مملکتِ آسٹریا میں شامل تھا۔ جہاز بعد دوپہر ٹری ایسٹ پہنچا۔ شہر کا اکثر حصہ بلندی پر واقع ہے۔ بندرگاہ سے شہر کا نظارہ بہت خوشنما ہے۔

یورپ میں ریل کا پہلا سفر۔ ریل کا اسٹیشن بندرگاہ کے قریب ہی تھا۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو میونخ جانے والی گاڑی چھوٹنے کا وقت قریب تھا۔ مولوی محمد علی صاحب، شیخ محمدؐ سعید صاحب اور میں دوسرے درجے کے ایک ہی خانے میں سوار ہو گئے۔ چونکہ مولوی محمد علی صاحب ہم تینوں میں سے ہوشیار ترین تھے اسلئے ہم دونوں نے خاموشی سے ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ اور لندن پہنچنے تک ان کی ہدایات پر بلا چون و چرا عمل پیرا رہے۔ اس جذبۂ اطاعت کا پہلا اجر تو ہمیں یہ ملا کہ اس رات ہمیں فاقہ کرنا پڑا، مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہمیں یورپ کی ریلوں میں سفر کا تجربہ نہیں واللہ اعلم ان پر کھانے کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ پھر حرام و حلال کی تمیز بھی ابھی پختہ طور پر معلوم نہیں بہتر ہے آج یونہی گذارا کر لیا جائے۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔ جب تک

دن کی روشنی نے ساتھ دیا ہم یورپ کے خوشنما مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے اور اسے کھانے کا بدل شمار کر لیا

۱۵ ستمبر کو صبح ۶ بجے ریل گاڑی میونخ پہنچی۔ یہاں گاڑی بدلی اور ہم آسٹنڈ جانے والے ڈبوں میں سے ایک میں سوار ہو گئے۔ ساڑھے سات بجے صبح میونخ سے روانہ ہو کر رات کے دس بجے آسٹینڈ پہنچے۔ گاڑی ڈوور جانیوالے جہاز کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ہم گاڑی سے اتر کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ ۱۶ ستمبر صبح ۴ بجے کے قریب ڈوور پہنچے۔ ابھی اندھیرا تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سامان کے معائنے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم لنڈن جانے والی گاڑی کے دوسرے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ اس ڈبے میں ایک انگریز میاں بیوی پہلے سے بیٹھے تھے۔ جب ہم اطمینان سے بیٹھ گئے تو مولوی محمد علی صاحب نے فرمایا۔ ڈبے میں ایک خاتون بھی بیٹھی ہیں اسلئے اپنی ٹوپیاں سروں سے اتار لو۔ میں نے کہا۔ جو مرد ان کے ساتھ بیٹھا ہے وہ تو ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا وہ آداب نہیں جانتا۔ ہم نے مولوی صاحب کی ہدایت کی تعمیل میں ٹوپیاں اتار دیں۔ ریل کے تمام سفر میں ہم نے ڈبل روٹی اور پھل پر گذارہ کیا۔ کیونکہ کھانے کی گاڑی میں جانے کے خلاف مولوی محمد علی صاحب کا رولنگ قائم رہا۔ ڈوور سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد ہم لنڈن چیرنگ کراس اسٹیشن پہنچ گئے۔

لنڈن میں ورود - فیروزپور کے چودھری عبدالحق صاحب جو گورنمنٹ کالج کے طالب علم رہے تھے اور مجھے بھی جانتے تھے۔ مولوی محمد علی صاحب اور شیخ محمد سعید صاحب کے استقبال کیلئے اسٹیشن پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا "آپ کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا میرے پاس سر ٹامس آرنلڈ کے نام کی چھٹیاں ہیں پہلے تو میں ۲۱ کرومویل روڈ پر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ پھر جہاں وہ فرمائیں گے چلا جاؤں گا۔ چودھری صاحب مسکرائے اور فرمایا۔ یہ تو ان کے دفتر کا پتہ ہے اور دفتر کے کھلنے میں تو ابھی دیر ہے آپ ہمارے ساتھ ہی آجائیں۔ میں بخوشی ان کے ساتھ ہو لیا اور اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل و رحم سے خود ہی میرے لئے سامان مہیا فرما دیا۔ کیونکہ میں دل میں کچھ پریشان ہو رہا تھا کہ لنڈن تو پہنچ گئے اب آگے کیا ہو گا!

چودھری عبدالحق صاحب ہم سب کو ٹیکسی میں بٹھا کر اپنی جائے قیام پر (۱۷۵ دی گروو ہیمرسمتھ) لے گئے جہاں ہم سب کیلئے رہنے کی گنجائش ہو گئی۔ وہاں پہنچے تو ناشتے کا وقت قریب تھا۔ ہم ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کیلئے تیار ہو گئے۔ ۳۶ گھنٹے سے زائد ریل کے سفر کے بعد جس کے دوران ہم نے مولوی محمد علی صاحب کی ہدایت کے ماتحت ڈبل روٹی اور پھل پر گذارہ کیا تھا۔ یہ ناشتہ ہمیں نہایت لذیذ معلوم ہوا اگرچہ جہاز کے بہت متنوع کھانوں کے مقابلے میں یہ بالکل سادہ تھا۔

۲۱ کرامویل روڈ لندن میں ۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ملتان کے رہنے والے شیخ عبدالرزاق صاحب جو قریب ہی رہتے تھے ہمیں ۲۱ کرامویل روڈ لے گئے۔ یہ عمارت لندن میں ہندوستانی طلباء کا مرکز تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ تمام ادارے جن کے دفاتر اس عمارت میں تھے انڈیا آفس کی زیر نگرانی کام کرتے تھے غالباً یہ وجہ تھی کہ جو ہندوستانی طلباء سیاسیات میں عملی دلچسپی رکھتے تھے وہ ان اداروں اور ان کی سرگرمیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے دور دور رہتے تھے۔ چودھری عبدالحق صاحب غالباً اسی گروہ میں سے تھے اس لئے انہوں نے یہاں جانے کیلئے ہمیں شیخ عبدالرزاق صاحب کے سپرد کیا۔

سر ٹامس آرنلڈ کی شخصیت ۔ ہندوستانی طلبا کے مشیر سر ٹامس آرنلڈ کا دفتر اسی عمارت میں تھا۔ سر ٹامس یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں مولانا شبلی کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ انہیں اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت ادا کرنے کی توفیق ملی تھی جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ انہوں نے تبلیغ اسلام پر ایک مستند کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "دی پریچنگ آف اسلام" ہے اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلانے کا الزام نہ صرف واقعات کے ہی خلاف ہے بلکہ اسلام کی تعلیم کے بھی خلاف ہے یہ تصنیف اس لحاظ سے بھی بہت قابل قدر ہے کہ یہ ایسے زمانے میں لکھی اور شائع کی گئی جب کسی انگریز کے قلم سے کلمۂ حق لکھا جانا ایک استثنائی امر تھا۔ فجزاہ احسن الجزاء

مس بیک ۔ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کا دفتر بھی اسی عمارت میں تھا۔ اس ایسوسی ایشن کی سکرٹری مس بیک تھیں جن کے بھائی مسٹر بیک ایم اے او کالج علی گڑھ کے بہت ہردلعزیز پرنسپل رہ چکے تھے۔ یہ خاتون نہایت حلیم طبع مشفق اور ہمدرد تھیں۔ بہت سے ہندوستانی طلبا ایسوسی ایشن کے ممبر تھے چندہ سالانہ پانچ شلنگ تھا مہینے میں دو ایک بار ایسوسی ایشن کی طرف سے کوئی نہ کوئی تقریب ایسی منعقد کی جاتی تھی جس میں ہمیں ایک دوسرے سے اور ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والے انگریز شرفاء سے ملنے کا موقعہ میسر آجاتا تھا۔

نارتھ بروک سوسائٹی کا دفتر بھی اسی عمارت میں تھا۔ کبھی کبھی یہ سوسائٹی بھی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ساتھ ملکر مشترکہ تقریب کا انتظام کرتی تھی۔ بعد میں ہماری تحریک پر طلبا کی سہولت کیلئے یہاں ایک مختصر سی لائبریری کا انتظام بھی ہو گیا۔ جس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ قانون کے طلباء کی مساعی سے کبھی کبھی کسی قانونی مسئلہ پر موٹ (مجلس مباحثہ) کا انتظام بھی ہو جاتا تھا۔ ایک مختصر سا مطعم بھی قائم ہو گیا جہاں مناسب قیمت پر لنچ اور چائے میسر آجاتے تھے۔

سر ٹامس آرنلڈ سے پہلی ملاقات۔ شیخ عبد الرزاق صاحب ہمیں ساتھ لئے فراخ خوبصورت سیڑھیاں چڑھ کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے اور ہم سب وہاں بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ کے اندر ایک دراز قامت باوقار خاتون اپنا چشمہ دائیں ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوئیں اور شیخ عبد الرزاق صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ شیخ صاحب نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہیں مس بیک کہہ کر خطاب کیا۔ جس سے مجھے حیرت ہوئی کہ شیخ صاحب نے انہیں فوراً کیسے شناخت کر لیا۔ اس وقت مجھے تو سب انگریزی چہرے ایک جیسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ شیخ صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہم تینوں اسی صبح ہندوستان سے لندن پہنچے ہیں اور سر ٹامس آرنلڈ سے ملنے کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔ اتنے میں سر ٹامس نے ہمیں بلا لیا اور ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہم تینوں اپنے اپنے کورس کیلئے کیمبرج جانا چاہتے تھے۔ مولوی محمد علی صاحب کی اور میری نسبت تو سر ٹامس نے فرمایا کہ داخلے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ ہم دونوں نے بی اے اوّل درجے میں پاس کیا تھا۔ شیخ محمد سعید صاحب کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ یقین تو نہیں لیکن امید کی جا سکتی ہے کہ داخلہ مل جائے گا۔ چنانچہ انہیں بھی داخلہ مل گیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں کیمبرج میں تاریخ اور قانون میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد انڈین سول سروس کے امتحان میں بیٹھنا چاہتا ہوں لیکن میری دائیں آنکھ کی بینائی کمزور ہے۔ اگر میں سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بفضل اللہ کامیاب ہو جاؤں تو ایسا نہ ہو کہ طبی معائنے میں رد کر دیا جاؤں اور میری محنت بیکار جائے۔ سر ٹامس نے فرمایا ہم تمہیں ایک خط دیدیتے ہیں جسے تم انڈیا آفس لے جاؤ۔ وہ میڈیکل بورڈ کا انتظام کر دینگے اس بورڈ کی رائے کسی بعد کے بورڈ پر قابل پابندی تو نہیں ہوگی لیکن اس سے تمہاری بینائی کی حالت معلوم ہو جائے گی اور آئندہ کے متعلق اندازہ ہو سکے گا۔ چنانچہ سر ٹامس آرنلڈ نے مجھے خط دیدیا اور ان کے اسسٹنٹ نے مجھے انڈیا آفس پہنچنے کا رستہ بتا دیا۔ اور میں فوراً انڈیا آفس روانہ ہو گیا۔

انڈیا آفس۔ لندن میں یہ میرا پہلا دن تھا اور لندن پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی عطا کردہ فراست پر بھروسہ کرتے ہوئے زبانی حاصل کردہ ہدایات کے مطابق ۲۱ کرامویل روڈ سے انڈیا آفس پہنچنا تھا۔ ساؤتھ کنسنگٹن اسٹیشن قریب ہی تھا۔ وہیں سے اتر کر ہم کرومویل روڈ گئے تھے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے ویسٹ منسٹر کا ٹکٹ لیا اور ڈسٹرکٹ ریلوے لائن کی مشرق کو جاتی ہوئی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ بجلی سے چلنے والی زیر زمین گاڑیاں میرے لئے اچنبھا تھیں۔ میں نے ہیمرسمتھ سے ساؤتھ کنسنگٹن تک آتے ہوئے پہلی بار ایسا عجوبہ دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ساتھ تین ہمراہی تھے۔ جن میں سے شیخ عبد الرزاق صاحب ان سب باتوں کا خوب تجربہ رکھتے تھے اور اب میں اکیلا تھا۔ اور مجھے

کسی اجنبی انگریز کے ساتھ بات کرنے کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ بہر حال ترساں و لرزاں لیکن بفضل اللہ بغیر کسی چوک کے اور بغیر کسی تضیع اوقات کے میں ریل پر دلیسٹ منسٹر اور وہاں سے پیدل انڈیا آفس پہنچ گیا۔ جب میں نے انڈیا آفس کو وہیں پایا جہاں میں اپنے اندازے سے قیاس کر چکا تھا تو مجھے ایسا اطمینان ہوا کہ گویا میں نے انگلستان میں اپنا پہلا امتحان پاس کر لیا ہے۔ سر ٹامس آرنلڈ کی چھٹی چپڑاسی کے حوالے کی اور میں انتظار کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہاں تین سکھ صاحبان دیہاتی لباس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب آئے اور ان سے انگریزی میں بات کرنے لگے۔ انہوں نے عذر کیا کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتے۔ وہ صاحب کچھ پریشان ہوئے اور میری طرف دیکھ کر کہا شاید تم ان صاحبان کی زبان سمجھتے ہو میرا اثباتی جواب سنکر کہا کیا تم مہربانی سے انہیں میری بات سمجھا دوگے؟ میری ترجمانی سے جو بات واضح ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ صاحبان لدھیانے کے ضلع کے کاشتکار تھے۔ ان دنوں پنجاب کی نوآبادیات میں زمین تقسیم ہو رہی تھی۔ انہوں نے بھی درخواست دی مگر انہیں زمین نہ ملی۔ گاؤں میں سے کسی نے ہمدردی یا عناد سے انہیں مشورہ دیا کہ لندن جا کر وزیر ہند سے شکایت کرو وہ تمہیں زمین دیئے جانے کا حکم دیدینگے یہ لوگ بھولے پن میں اپنی اراضیات گروی رکھ کر یا بیع کر کے اور اس طرح لندن پہنچنے کا خرچ مہیا کر کے لندن چلے آئے اور یہاں پہنچ کر وزیر ہند کی خدمت میں درخواست گذار دی۔ یہ صاحب انہیں سمجھانا چاہتے تھے کہ وزیر ہند اس معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے۔ اتنے میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے معائنہ کیلئے سرجن جنرل ہربن فٹ کی صدارت میں تین بجے بعد دوپہر بورڈ منعقد ہو گا۔ اس وقت قریباً بارہ بجے تھے۔ اگر مجھے لندن کے گلی کوچوں اور راہ و رسم سے کچھ واقفیت ہوتی تو میں کہیں قریب ہی دوپہر کا کھانا کھا لیتا اور پارک میں چل پھر کر بقیہ درمیانی وقت گذار لیتا۔ لیکن مجھے ان امور کی کچھ بھی واقفیت نہیں تھی۔ ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ مالکہ مکان اور میرے ساتھی انتظار میں ہونگے اور میرے وقت پر نہ پہنچنے سے پریشان ہونگے۔ میں نے پھر ویسٹ منسٹر سٹیشن کا رستہ لیا وہاں سے ہیمرسمتھ براڈوے تک ریل میں آیا اور وہاں سے پیدل مکان تک پہنچا۔ مکان سے سٹیشن تک تیز تیز چلنے والے کے لئے دس منٹ کا وقت درکار تھا۔ میرے مکان پہنچنے تک کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور کھانا شروع ہو گیا تھا۔ مالکہ مکان مسز فائسن نے مجھے مشفقانہ تنبیہ کی اور میں مناسب معذرت کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

بینائی کے لئے طبی بورڈ کا معائنہ ۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں واپس انڈیا آفس پہنچا۔ ابھی تین بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ پورے تین بجے مجھے بورڈ کے کمرے میں بلایا گیا اور معائنہ ہوا۔ آخر میں مجھے بتایا گیا کہ ایک تو تمہارا وزن کم ہے اور عام صحت بھی کچھ کمزور ہے لیکن یہ کوئی فکر کی بات نہیں تم اپنے گھر

سے متواتر تین ہفتے سفر کے بعد آج ہی یہاں پہنچے ہو کچھ تو اس کا بھی اثر ہے۔ اب تم تین چار سال یہاں رہو گے اس آب و ہوا میں مناسب خوراک سے کمزوری رفع ہو جائے گی۔ لیکن تمہاری دائیں آنکھ کی بینائی اس قدر کمزور ہے کہ کوئی میڈیکل بورڈ تمہیں پاس نہیں کرے گا۔ اس لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ تم کوئی ایسی لائن اختیار نہ کرو جس میں کامیابی کیلئے میڈیکل بورڈ کے معائنہ میں پاس ہونا لازمی ہو۔ میں نے بورڈ کا شکریہ ادا کیا اور واپس مکان پر آگیا۔ والد صاحب کی خدمت میں خط لکھا اور بورڈ کی رائے ان کی خدمت میں ارسال کر دی۔ ان کا نہایت مشفقانہ جواب آیا۔ تم بالکل پریشان نہ ہونا۔ یونیورسٹی میں قانون کی ڈگری کے لئے اور انز آف کورٹ میں سے کسی میں بیرسٹری کیلئے داخلہ لے لو یہی کافی ہے۔

تعلیم کے لئے انگلستان میں قیام

قاضی ظہور حسین صاحب کا مشورہ اور امداد اور قانون کی تعلیم کیلئے کنگز کالج میں داخلہ۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے قاضی ظہور حسین صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے دو سال سینئر تھے اور اس وقت لندن میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے مکان پر مسلمان طلباء کا آنا جانا رہتا تھا۔ ظہور حسین صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ بجائے کیمبرج جانے کے میں لندن یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کروں۔ قاضی صاحب نے میرے ساتھ جا کر مجھے کنگز کالج میں داخل کرا دیا۔ ایک نووارد کو جن ہدایات اور مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی کمال شفقت سے دیئے اور بعض چھوٹے چھوٹے کام جن کے سرانجام دینے کیلئے لوکل واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اپنے ذمے لے لئے۔ مثلاً میرے نام کے ملاقاتی کارڈ چھپوانے کا خود ہی انتظام کیا اور ان پر میرے نام کے ساتھ نہایت ہی محبوب اور مبارک نام "محمد" کا اضافہ کر دیا جو میرے لئے بڑی برکت کا موجب ہے۔ قاضی صاحب تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس آئے تو ریلوے کے انجینئرنگ کے محکمے سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں جب میں حکومت ہند میں تجارت اور ریلوے کا وزیر ہوا تو اس زمانے میں قاضی صاحب آسام بنگال ریلوے کے چیف انجینئر مقرر ہوئے۔ قاضی صاحب کے صاحبزادے قاضی افضل حسین صاحب پاکستان انٹرنیشنل ایرویز میں ایک بڑے عہدے پر ہیں اور میرے ساتھ ویسی ہی محبت سے پیش آتے ہیں جیسی ان کے والد بزرگوار میری طالب علمی کے زمانے میں میرے ساتھ پیش آتے رہے ہیں۔ فجزاھم اللہ خیراً فی الدنیا والآخرۃ۔ میں نے سر ٹامس آرنلڈ کو اطلاع

کر دی کہ میں نے لندن میں داخلہ لے لیا ہے اور اب کیمبرج جانے کی ضرورت نہ ہو گی۔

بیرسٹری کیلئے لنکنز ان میں داخلہ - بیرسٹری کیلئے میں نے لنکنز ان میں داخلہ لے لیا اور اس طرح میری قانون کی تعلیم کا دور شروع ہو گیا۔ کنگنز کالج میں داخلے کے بعد مجھے قانون کی ڈگری کے کورس کے لئے علاوہ اس کالج کے یونیورسٹی کالج اور لندن سکول آف اکنامکس میں بھی لیکچروں کے لئے جانا ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں نے کیمبرج میں داخلہ نہ لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ چھبیس سال بعد ۱۹۳۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے مجھے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اسی سال کنگنز کالج لندن نے مجھے اپنی مجلس عاملہ کا ممبر یعنی فیلو بنایا۔ اور ۱۹۴۵ء میں لنکنز ان نے مجھے اپنا آنریری بینچر بنایا۔

چونکہ لندن میں داخلہ لے لینے کی وجہ سے کیمبرج جانے کی ضرورت نہ رہی۔ اسلئے طالب علمی کے زمانے میں میری مستقل رہائش لندن میں رہی۔ لندن پہنچنے پر چوہدری عبدالحق صاحب مجھے جس مکان میں لیگئے تھے وہی میری مستقل جائے قیام بن گیا۔ اس مکان کے مالک تو ایک یونانی صاحب تھے۔ ان سے مسز فائزن نے مکان کرائے پر لے رکھا تھا اور وہ اسے بطور بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھیں۔ وہ ایک پادری کی بیٹی تھیں اور ان کے میاں لندن یونیورسٹی کے ایم اے تھے۔ دونوں میاں بیوی ایک پرائیویٹ سکول چلایا کرتے تھے جب مسٹر فائزن فوت ہو گئے تو ناچار سکول بند کرنا پڑا اور مسز فائزن نے مکان کو بورڈنگ ہاؤس بنا لیا۔ ہمارے لندن پہنچنے کے چند دن بعد مولوی محمدؐ علی صاحب اور شیخ محمد سعید صاحب تو کیمبرج چلے گئے اور چوہدری عبدالحق صاحب نے بھی مکان بدل لیا۔ پہلے مجھے مکان کا سب سے چھوٹا کمرہ ملا تھا۔ کیونکہ صرف وہی کمرہ خالی تھا۔ لیکن ان صاحبان کے چلے جانے کے بعد مجھے ایک بڑا کمرہ مل گیا اور جتنا عرصہ میں اس مکان میں رہا میں اسی کمرے میں مقیم رہا۔ میرے قیام کے عرصے میں بہت کم وقت کیلئے کوئی دوسرا ہندوستانی اس مکان میں آکر ٹھہرا اور اس لحاظ سے میرے لئے حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی اس ہدایت پر عمل آسان ہو گیا کہ انگلستان کے قیام کے دوران انگریز شرفا کے ساتھ میل جول رکھنا۔ مکان بہت صاف تھا۔ کھانا اچھا تھا، کرایہ واجبی تھا، سڑک پر دو رویہ درخت تھے جس کی وجہ سے سڑک خوشنما معلوم ہوتی تھی، زیر زمین ریل کے اسٹیشن گو بہت قریب نہیں تھے لیکن زیادہ دور بھی نہیں تھے، بسیں گولڈ ہاک روڈ پر بہت قریب سے گذرتی تھیں۔

ہمارے یونیورسٹی کے اکثر لیکچر شام کو ہوا کرتے تھے چونکہ یونیورسٹی کے لیکچروں میں حاضری لازم تھی اور انز آف کورٹ کے لیکچروں میں لازم نہ تھی اور میں ایک وقت میں ایک ہی جگہ حاضر ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں یونیورسٹی کے لیکچروں میں تو بڑی باقاعدگی اور پابندی سے حاضر ہوتا رہا۔ لیکن انز آف کورٹ

کے لیکچروں میں جا سکا۔ انز میں ہر ایک ٹرم میں شام کے تین کھانوں میں شمولیت لازم تھی ان میں شامل شامل ہونے میں مینے کبھی کوتاہی نہ کی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد ایل ایل بی کا کورس مزید دو سال کا تھا۔ ان سالوں میں کامن لاء کے پروفیسر مسٹر گرنتھ تھے۔ ان کا طریق تھا کہ جب کوئی مسئلہ واضح فرما دیتے تو اس کے متعلق فوراً سوال کرتے تاکہ معلوم ہو جائے کہ مسئلہ طلباء کے ذہن نشین ہو گیا یا نہیں۔ ان کے سوال کرنے پر میں ہمیشہ ہاتھ کھڑا کر دیتا اور وہ اکثر مجھ سے ہی جواب پوچھ لیتے۔ میرا جواب بفضل اللہ ہمیشہ صحیح ہوتا۔ جس پر خوش ہو کر میری حوصلہ افزائی فرماتے۔ میں اور توجہ سے انکی بات سنتا۔ کبھی کبھی تحریری سوال جواب بھی ہوتے۔ میرے جواب پر ہمیشہ کوئی خوشنودی کا جملہ لکھتے۔ ایکویٹی کے پروفیسر مسٹر ہرسٹ تھے۔ اپنے مضمون میں بڑے طاق تھے اور بڑی توجہ سے پڑھاتے تھے۔ درمیانی سال کے دوران ہی میں مجھے فرمایا۔ بار کا آخری امتحان جلدی ختم کر لو تاکہ یونیورسٹی کے آخری امتحان کی طرف زیادہ توجہ کر سکو اور کوشش کرو کہ آنرز میں اوّل درجہ حاصل کر سکو تمہارے لیئے یہ بڑا امتیاز ہوگا۔ میں نے ان کے مشورے کے مطابق اپنا پروگرام بنا لیا۔ آخری سال میں انہوں نے میرے ہم جماعت مسٹر محمد حسن سے اور مجھے فرمایا کہ اگر تم تین چار دفعہ میرے چیمبرز میں آسکو تو میں تمہیں کچھ مزید ہدایات بھی دوں اور بعض مقامات کے متعلق مزید وضاحت بھی کر دوں۔ یہ انکی حد درجہ کی عنایت تھی کیونکہ وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ پروفیسری کے کام کے علاوہ ان کے پاس بہت قانونی کام ہوتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے دو غیر ملکی طالب علموں کیلیئے اپنے نہایت قیمتی وقت میں سے کئی گھنٹے نکال کر ہمیں امتحان کی تیاری میں بہت قیمتی مدد دی۔ کسی فیس وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا محض ہماری ہمت افزائی کی خاطر انہوں نے یہ تکلیف گوارا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ ہمارے ایل ایل بی کے امتحان کے نو پرچے تھے۔ پانچ مضامین کا ایک ایک پرچہ اور چار مضامین میں آنرز کا ایک ایک زائد پرچہ پروفیسر ہرسٹ ان نو پرچوں میں سے چار پرچوں (دو پاس اور دو آنرز) کے جائنٹ ممتحن تھے۔ ان کی توجہ سے مجھے تو بہت ہی فائدہ پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے ان کی توقع بھی میرے متعلق پوری کر دی۔ ایل ایل بی کے امتحان میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی ذرہ نوازی سے میں اوّل درجہ کی آنرز میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ یہ اعزاز مجھ سے پہلے کسی ہندوستانی طالب علم کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ بعد کا حال میں نہیں جانتا۔ ''ریئل پراپرٹی'' مضمون کے پروفیسر مسٹر میکے تھے۔ جو بہت قابل تھے لیکچر بہت محنت سے تیار کرتے تھے۔ جماعت میں داخل ہوتے ہی اپنی نوٹ بک کھول کر لکھوانا شروع کر دیتے تھے اور پیریڈ ختم ہونے تک ایک ہی رفتار سے لکھواتے چلے جاتے تھے۔ میں جلدی جلدی پنسل سے پوری

عبارت جیسے بن پڑتا نوٹ کر لیتا۔ دوسری صبح صاف کر کے اور پوری طرح سمجھ کر نقل کر لیتا۔ ایک گھنٹے کے لیکچر کو صاف کرنے اور لکھنے پر دو اڑھائی گھنٹے صرف ہوتے لیکن اس کے بعد کسی اور مطالعہ کی حاجت نہ رہتی۔ وہی صاف کردہ نوٹ توجہ سے پڑھ لینا کافی ہوتا۔ جُورس پُرُوڈنس۔ ضابطۂ دیوانی اور شہادت کے مضامین کے پروفیسر ڈاکٹر ہل برٹ تھے۔ وہ بھی نوٹ لکھوانے پر ہی اکتفا کرتے۔ ان کے اوّل الذکر مضمون کے نوٹ تو میرے بہت کام آئے۔ شہادت اور ضابطۂ دیوانی پر ان کے لیکچر میں محض بار کے امتحان کی خاطر سنتا رہا۔ ورنہ یہ ایل ایل بی کورس میں میرے مضامین میں شامل نہیں تھے۔ کمرشل لاء میں سے السالونسی کے پروفیسر سر آرتھر پیج تھے۔ اور بقیہ حصے کے پروفیسر مسٹر رائٹ تھے۔ بعد میں وہ لارڈ آف اپیل ہوئے اور مجھے پریوی کونسل میں ان کے سامنے پیش ہونے کا اتفاق بھی ہوا۔ ایک دفعہ تعطیل میں تفریح کے لئے پاکستان بھی تشریف لائے۔ لمبی عمر پائی فوت ہوئے چند سال ہی گذرے ہیں۔ کورس کے آخر میں مجھے جو سرٹیفکیٹ دیا اس میں بڑے تعریفی الفاظ استعمال فرمائے۔ شرع محمدی کے پروفیسر مسٹر نیل تھے۔ جو ہندوستان کے صوبہ متوسط میں جوڈیشنل کمشنر رہ چکے تھے۔ طبیعت کے حلیم تھے مزاج بہت شریفانہ تھا نوٹ لکھوانے پر اکتفا کرتے تھے۔ بار کے امتحانوں کے لئے میں نے شروع میں ہی ایک پروگرام تجویز کر لیا تھا اس کے مطابق بفضل اللہ میں نے ستمبر ۱۹۱۲ء تک بار کے امتحانوں کا پہلا حصہ مکمل کر لیا۔ صرف آخری امتحان رہ گیا جو میں نے بفضل اللہ ستمبر ۱۹۱۳ء میں پاس کر لیا۔ یونیورسٹی کے امتحانوں میں سے انٹرمیڈیٹ جولائی ۱۹۱۲ء میں اور فائنل اکتوبر ۱۹۱۴ء میں پاس کیا۔ یونیورسٹی کے لیکچروں کی تقسیم اس طور پر تھی کہ فائنل امتحان کے اکثر مضامین کی تیاری ۱۹۱۳ء کے اکتوبر تک مکمل ہو سکتی تھی۔ اور کچھ مزید کوشش سے باقی مضامین بھی اس وقت تک مکمل کئے جا سکتے تھے۔ اس اندازے کے مطابق میرے ہم جماعت مسٹر محمد حسن صاحب (امرتسر) نے اور میں نے یونیورسٹی میں درخواست دی کہ ہمیں اکتوبر ۱۹۱۳ء میں فائنل امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے لیکن درخواست منظور نہ ہوئی۔ جون ۱۹۱۴ء میں مجھے بیرسٹری کی سند مل گئی۔ لیکن ایل ایل بی کے فائنل امتحان کے لئے مجھے اکتوبر تک لندن میں ٹھہرنا تھا۔ اس اثنا میں اگست کے شروع میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ وسائل آمد و رفت پر بہت سی پابندیاں عائد ہو گئیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں واپسی کے سفر کے دوران میں فریضۂ حج ادا کروں اور روضۂ نبوی پر حاضر ہو کر دعا کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اس نیت سے میں نے جون ۱۹۱۴ء میں ہی جدے تک سفر کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اور ٹکٹ بھی خرید لئے تھے۔ امتحان ۱۰ اکتوبر کو ختم ہونے والا تھا۔ اور اس سال حج کی تاریخیں ۳۱ اکتوبر، یکم نومبر اور ۲ نومبر تھیں۔ انہی کے مطابق میں نے سفر کا انتظام کیا تھا۔ لیکن جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے لندن سے مارسیلز تک ریل کا سفر بند ہو گیا

اور جہازی سفر پر بھی پابندیاں عاید ہوگئیں۔ اگر مارسیلز سے پورٹ سعید اور پھر وہاں سے جدّے تک کے سفر کے انتظامات قائم بھی رہ سکتے تو بھی لندن سے مارسیلز تک بحری سفر کے لئے چھ سات دن مزید درکار ہوتے اور میں بروقت حجاز نہ پہنچ سکتا۔ اسلئے ناچار مجھے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا اور ٹکٹ واپس کر دیئے۔

سراپا شفقت خاتون مسز فائنر ن | شرع محمدی کے علاوہ ہمارے باقی سب مضامین کے لیکچر شام کے چھ بجے شروع ہوتے تھے۔ میں چائے کے بعد چھ بجکر ۲۰ منٹ پر گھر سے روانہ ہوتا تھا۔ اور جس کالج میں پہنچنا ہوتا وقت سے کچھ پہلے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ واپسی کبھی آٹھ بجے سے پہلے ہوتی کبھی نو بجے کے بعد۔ کوئی شام درمیان میں خالی بھی ہوتی جب کالج میں حاضری نہ ہوتی۔ جسدن مجھے کالج جانا ہوتا اس دن میری واپسی تک شام کا کھانا ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن مسز فائنر ن کمال شفقت سے میرے لئے کھانا گرم رکھتیں اور میرے گھر پہنچنے پر مجھے کھانا دے دیتیں۔ اور جب تک میں کھانا ختم کرتا کھانے کے کمرے میں میرے ساتھ بیٹھتیں۔ عموماً تو کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہوتیں۔ سوئی دھاگے وغیرہ کا بکس سامنے ہوتا، عینک چڑھائے ہوتیں۔ کام بھی کرتی جاتیں اور میرے ساتھ باتیں بھی جاری رہتیں۔ مجھے کسی امر کے متعلق کچھ معلوم کرنا ہوتا تو میں ان سے پوچھ لیتا۔ انہیں خود احساس ہوتا کہ مجھے کچھ بتانا چاہیئے یا کسی امر کے متعلق آگاہ کرنا چاہیئے تو بتا دیتیں۔ حالات حاضرہ کے متعلق کچھ تذکرہ ہو جاتا۔ میرے وطن کے اور گھر کے حالات دریافت کرتیں، اسلامی معاشرت یا تعلیم کا ذکر چھڑ جاتا۔ غرض یہ آدھ پون گھنٹہ میرے لئے بڑی دلچسپی کا وقت ہوتا۔ میری تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ شریف طبقے کی خاتون تھیں، خیالات سلجھے ہوئے تھے، ان کا اپنا نمونہ ایک دیانتدار محنت کرنے والی خوددار خاتون کا تھا جنہیں میں احترام کی نگہ سے دیکھتا تھا۔ میں ایک اجنبی نووارد نوجوان تھا جو ملک کے رسم و رواج سے ناواقف تھا۔ ان کا ہر مشورہ میرے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ پردیس میں ان کی ہمدردی میرے لئے تسکین کا موجب تھی۔ میرے ساتھ ان کی غیر معمولی شفقت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو عمر میں مجھ سے ایک مہینہ چھوٹا تھا۔ وہ میرے لندن پہنچنے سے تھوڑا عرصہ پہلے روڈیسیا چلا گیا تھا۔ ماں کو اکلوتے بچے کی جدائی کا طبعاً احساس تھا۔ ان کی مامتا نے یہ بھی محسوس کر لیا ہو گا کہ مجھے اپنے وطن اپنے والدین سے جدائی کا شدید احساس ہے۔ اس حالت نے ہمارے درمیان ایک ہمدردی کا رشتہ قائم کر دیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ تیسرے چوتھے مہینے کبھی انہیں اپنے بیٹے کا خط آتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ وقفہ اور لمبا ہوتا چلا گیا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد تو بند ہی ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء کے موسم سرما میں مسز فائنر ن اپنی بڑی ہمشیرہ کو ملنے کیلئے ایبرڈین گئیں وہاں سے واپسی کے سفر میں انہیں سردی لگ گئی جو لندن پہنچتے پہنچتے نمونیہ کی شکل اختیار کر گئی اور اس سے ان کی موت واقع ہوئی۔ میرے لندن

کے قیام کے دوران ان کی والدہ زندہ تھیں گو بہت ضعیف تھیں ان کی عمر نوّے سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ بستر ہی میں گذارتی تھیں۔ مسز فائزن کی بڑی بہن مس ونٹر اور ایک چھوٹی بہن مس نیلی ونٹر اپنی والدہ کی خبرگیری کرتی تھیں۔ ان کی ایک اور بہن مسز لاسن برائیٹین کے قریب رہتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے جب لندن آتے تو کبھی کبھی اپنی خالہ کو ملنے بھی آتے ان میں سے ایک کے ساتھ میری اچھی واقفیت ہو گئی تھی اور کبھی کبھی میں انہیں خط بھی لکھا کرتا تھا۔ مسز فائزن مہینہ میں ایک بار اپنی والدہ سے ملنے جایا کرتی تھیں۔ ایک بار مجھے بھی ساتھ لے گئی تھیں ان کی والدہ بالکل ایک گڑیا معلوم ہوتی تھیں چہرہ بالکل بچوں کی طرح معصومانہ تھا۔ مس نیلی ونٹر کبھی کبھی اپنی ہمشیرہ سے ملنے آتی تھیں۔ وہ ادبی مذاق رکھتی تھیں ان کے ساتھ بھی میری خط و کتابت رہی۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۷ء میں جب میں انگلستان گیا تو ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ مسز فائزن کے ایک ہی بھائی فریڈ۔ جی۔ ونٹر تھے۔ وہ ادبی اور شاعرانہ مذاق رکھتے تھے۔ ایک لحاظ سے انکی زندگی بڑی افسردہ تھی۔ آغاز شباب میں انہیں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی وہ بھی انہیں عزیز رکھتی تھیں۔ نسبت بھی ہو گئی لیکن شادی سے پہلے انہیں کوئی اعصابی عارضہ لاحق ہو گیا جو لاعلاج قرار دیا گیا اور وہ مستقل طور پر پٹنی کے لاعلاج مریضوں کے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ شادی کا تو اب کوئی سوال ہی نہ تھا لہٰذا نسبت منسوخ ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد ان کی منسوبہ نے ایک اور صاحب مسٹر فیلڈ سے شادی کر لی اور اپنے میاں کے ساتھ جنوبی افریقہ چلی گئیں۔ فریڈ چلنے پھرنے کے قابل تھے انہیں اتوار کو ہسپتال سے باہر جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ہمشیرہ کو ملنے آتے تھے اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ جب مسز فیلڈ انگلستان آئی ہوئی تھیں تو انہیں بھی ہمارے ہاں ساتھ لائے اور مجھے بھی ان سے ملنے کا موقع مل گیا۔ فریڈ نے اپنی محبت کی ناکامی پر اپنے احساسات کا اظہار ایک بڑی درد انگیز نظم میں کیا تھا۔ اس نے ابھی اس نظم کو شائع نہیں کیا تھا اور ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے بٹوے میں رکھا ہوا تھا۔ ایک دن وہ پیکاڈلی سرکس کے مشہور مطعم لائنز یا پولیرا میں دوپہر کا کھانا کھانے گئے کھانا ختم کرنے پر بل کی ادائیگی کے لئے بٹوہ جیب سے نکالا اور کھانے کی قیمت ادا کر کے چلدیئے بٹوہ میز پر رکھا رہ گیا۔ مطعم سے کچھ فاصلے پر یاد آیا تو واپس گئے بٹوہ تو مل گیا لیکن نظم والا کاغذ غائب تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ نظم کسی اور شخص کے نام سے چھپ گئی اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ نظم کا عنوان "دی روزری" تھا۔ بعد میں اس نظم کے نام پر ہی فلارنس بارکلے نے ایک ناول بھی شائع کیا۔ فریڈ کی ایک اور نظم ایک ادبی رسالے میں چھپی تھی اسکی ایک چھپی ہوئی نقل انہوں نے مجھے بھی بھیجی اس نظم کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ "دی روزری" بھی انہیں کی تصنیف

ہے۔ پاکیزگی سلاست، نزاکت اور شفقت دونوں نظموں کا خاصہ تھے۔

چونکہ مسز فائزن کے میاں لندن یونیورسٹی کے طالبعلم رہ چکے تھے۔ اس لئے جب انکی وفات کے بعد مسز فائزن نے اپنے مکان میں بورڈنگ ہاؤس جاری کیا تو ان کی خواہش پر یونیورسٹی نے اپنے طلبا کی اطلاع کیلئے ان کے مکان کو بھی ان مکانوں کی فہرست میں شامل کر لیا جس میں طلبا کی رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔ اس ذریعے سے بھی بعض دفعہ غیر ملکی طلبا ان کے مکان میں رہائش کے لئے آجاتے تھے۔ انکے ہاں ملازم کا کام ایک جرمن نوجوان کرتا تھا۔ جو زبان سیکھنے کی خاطر انگلستان محنت مزدوری کرنے آیا ہوا تھا۔

مس لائیزا پارسنز | میرے قیام کے دوران میں جو لوگ کچھ عرصہ کیلئے اس مکان میں ٹھہرے ان میں سے سب سے لمبا عرصہ ٹھہرنے والی ایک خاتون مس لائیزا پارسنز تھیں۔ ان کے والد کیمبرج میں سکونت پذیر تھے وہ خود ہیمرسمتھ کے علاقہ کی تبلیغ انجیل کی ایک سوسائٹی کی سکریٹری تھیں۔ بہت نیک خاتون تھیں۔ مسز فائزن کی طرح میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ معاشرتی طور طریق اور رسم و رواج کے متعلق ان کی رائے بہت صائب تھی اور ان کا مشورہ میرے لئے بہت مفید ہوتا تھا۔ ان کی ایک چھوٹی بہن مس ایمی پارسنز ایسٹ لندن ہسپتال میں نرس تھیں۔ یہ بہت بڑا ہسپتال تھا اور وہاں کی نرسوں کی میٹرن ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کی دُور کی رشتہ دار تھیں۔ مس ایمی پارسنز نے دو ایک بار ہمیں ہسپتال میں چائے کی دعوت دی اور میٹرن کے ساتھ ہمارا تعارف بھی کرایا۔ ہم نے ہسپتال کے مختلف وارڈ دیکھے آنکھوں کے وارڈ میں ایک بڑی طاقت کا مقناطیس تھا۔ اگر کسی شخص کی آنکھوں میں لوہے کا ریزہ پڑ جائے تو اس مقناطیس کی کشش سے اسے آنکھ سے نکالا جا سکتا تھا۔ جب مس پارسنز نے اس مقناطیس کا بٹن دبایا تو میں بالکل قریب کھڑا تھا۔ اتفاق سے میں نے اپنی گھڑی جیب سے نکالی جس کا کیس گن میٹل کا تھا۔ اگرچہ گھڑی چمڑے کے تسمے کے ساتھ میری واسکٹ کے بٹن سے بندھی ہوئی تھی۔ پھر بھی ایک جھٹکے کے ساتھ اچک کر مقناطیس کے ساتھ چمٹ گئی۔ مقناطیس کا بٹن بند کرنے پر آزاد تو ہوگئی لیکن اس پر کچھ ایسا مقناطیسی اثر ہو گیا کہ تیسرے چوتھے مہینے اس پر گویا دیوانگی کا دورہ پڑتا اور یکایک اس کی رفتار دو تین گنا تیز ہو جاتی۔ دو تین دن بعد پھر ہوش میں آجاتی اور اپنی اصل رفتار پر قائم ہو جاتی۔ یہ گھڑی میں نے ہال پاٹیک جیولر کے ہاں سے خریدی تھی جن کی دوکان سنٹرل لندن ریلوے کے اسٹیشن کے بالکل سامنے تھی۔ میں گھڑی ان کے پاس لے گیا کہ وہ اس مرض کا کچھ مداوا کریں۔ انہوں نے بعد تشخیص کہا کہ مقناطیسی اثر آہستہ آہستہ رفع ہوگا اور مجھے صبر کا مشورہ دیا۔ وہ گھڑی مجھے عزیز تھی اسے چھوڑ کر نئی گھڑی خرید کرنا مجھے دوبھر تھا۔

اسلئے ناچار ان کے مشورے پر عمل پیرا ہونا پڑا اور وہ مشورہ صحیح ثابت ہوا۔

مسز ایملی بین برج | مس پارسنز کی ایک اور بہن تھیں ان کی داستان حیات ایک افسانۂ الم تھی۔ وہ خوش شکل خنک مزاج، ہمدرد، شفیق اور شرافت کی پتلی تھیں۔ کرنل فرینک بین برج سے شادی ہوئی جو ڈرہم کے علاقے کے ایک شریف زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بظاہر تمام حالات نہایت خوش آئند تھے۔ شادی کے جلد بعد مسز بین برج کو اپنے میاں کے بعض اطوار سے شبہ ہونے لگا کہ ان کا دماغی توازن درست نہیں۔ مثلاً مس لائنرا پارسنز نے مجھے بتایا کہ وہ ایملی کی شادی کے چند مہینے بعد ان کے یہاں مہمان ٹھہری ہوئی تھیں۔ ایک دن فرینک دونوں بہنوں کو گھوڑا گاڑی میں سیر کے لئے لے گئے۔ واپسی کے دوران گھوڑے کو روک کر خود گاڑی سے اتر گئے۔ راسیں انکی طرف پھینک دیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر ایک ہنٹر رسید کیا جس کی ضرب سے وہ بے تحاشا گاڑی کو لیکر بھاگا۔ دونوں بہنیں دہشت سے ایک دوسری سے لپٹ گئیں۔ خیر ہوئی کہ گھوڑا گاڑی سمیت بغیر کسی حادثے کے گھر پہنچ گیا۔ آخر کرنل بین برج کا مرض آشکارا ہوگیا اور انہیں برٹش کولمبیا (کینیڈا) کے ساحل کے قریب ایک جزیرے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ ایک چینی خادم کی نگرانی میں بظاہر آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ انہیں موسیقی کا شوق تھا۔ ایک عمدہ پیانو باجہ ان کے لئے مہیا کر دیا گیا۔ ایملی اگر چاہتیں تو ان سے طلاق حاصل کر کے دوسری شادی کر لیتیں۔ لیکن انہیں یہ گوارا نہ ہوا۔ برسوں بعد کبھی مجھ سے ذکر آتا تو کہتیں فرینک کے عزیز تو اسے بھول گئے لیکن میں نہیں بھولی مجھے وہ عزیز تھے۔ ان کی یاد مجھے اب بھی عزیز ہے مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں۔ اگر مجھے کوئی شکوہ ہو سکتا ہے تو ان کے عزیزوں سے جنہیں علم تھا کہ ان کا دماغی توازن درست نہیں اور انہوں نے مجھے نہ بتایا۔ لیکن مجھے ان سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ شادی کے وقت جو انتظام ایملی کے لئے ہوا تھا اس میں ان کا گذارہ بڑی اچھی طرح ہوتا تھا۔ وہ خود بھی آرام سے بسر کرتی تھیں اور دوسروں کی مدد کے لئے بھی ان کا ہاتھ کھلا رہتا تھا۔ ان کی رہائش میدہ ویل میں تھی جو ان ایام میں لندن کا ایک خوشگوار علاقہ خیال کیا جاتا تھا۔ میرے قیام کے دوران میں وہ پہلی بار جب اپنی ہمشیرہ سے ملنے ہمارے ہاں آئیں تو میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ جلد بعد انہوں نے اپنی ہمشیرہ کے ساتھ مسز فائزن کو اور مجھے بھی اپنے ہاں چائے کی دعوت دی۔ بہت تواضع سے پیش آئیں۔ شروع مئی ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا سٹرابریز کے موسم کا آغاز تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹوکری ایک گنی میں آتی تھی اور گنی ان دنوں آج کے چار پونڈ کے برابر تھی۔ علاوہ کیک مٹھائی وغیرہ کے انہوں نے ہمارے لئے سٹرابریز بھی مہیا کی تھیں۔ کچھ دن بعد ایک اتوار

کی صبح وہ ہمارے ہاں آئیں۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر کھانے کے کمرے میں بیٹھے تھے متفرق بات چیت ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھ سے پوچھا تم آج فارغ ہو؟ میں نے کہا فارغ ہی ہوں۔ کہنے لگیں تو پھر اگر میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں لندن کی کچھ سیر کرا دوں۔ میرا یہ معمول تھا کہ میں سوموار کی صبح سے جمعہ کی شام تک تو کالج کا کام کرتا، ہفتے کے دن بار کے امتحان کی تیاری کرتا، اتوار کا سارا دن تفریح کیلئے فارغ رکھتا یا اگر کام کا کچھ بقایا رہ گیا ہوتا تو ناشتے اور دوپہر کے درمیان کام کرتا۔ لیکن سہ پہر اور شام لازماً فارغ رکھتا۔ میں جلد تیار ہو کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ پہلے ہم کنسنگٹن گارڈنز گئے اور قصر کنسنگٹن کے اس حصے کے کمرے دیکھے جن میں پبلک کو جانے کی اجازت تھی اور جو بطور عجائب گھر کے سجائے ہوئے تھے۔ بادشاہ، ملکہ اور شاہی خاندان کے شہزادوں شہزادیوں اور دیگر افراد کے تاجپوشی شادی وغیرہ کے فاخرہ لباس وہاں رکھے ہوئے تھے۔ بچپن کے لباس اور پاؤں کے جوڑے بھی تھے اور بہت سی اشیاء تھیں جو مختلف اوقات میں ان کے استعمال میں رہ چکی تھیں۔ وہاں سے ہم ہائڈ پارک گئے ادھر جاتے ہوئے البرٹ میموریل بھی ایک نظر دیکھ لیا۔ ان دنوں مئی، جون اور جولائی کے مہینوں میں (جو لندن کا سیزن کہلاتا ہے) ہائڈ پارک امراء اور شریف طبقے کی سیرگاہ تھا اور اتوار کے دن تو وہاں خوب رونق ہوتی تھی شاہ جارج پنجم اپنی بیٹی شہزادی میری کے ساتھ اکثر پارک میں سواری کرتے تھے۔ اور ان کے علاوہ امیر طبقے کے اکثر نواب بیگمات اور شرفا سوار یا پیدل پارک میں سیر کیلئے آتے تھے۔ ہائڈ پارک سے ہوتے ہوئے مسز بین برج کی کلب میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ وہیں میں نے نماز ادا کی۔ اس کے بعد مجھے البرٹ ہال میں کانسرٹ سننے کیلئے لے گئیں۔ اس ہال میں دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوگی۔ لیکن اس کی ترکیب تعمیر ایسی مناسب ہے کہ اتنے بڑے ہجوم کو اندر جانے، اپنی اپنی نشستوں تک پہنچنے اور پروگرام کے ختم ہونے پر باہر آنے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہوتا۔ یہ کانسرٹ "لندن فل ہارمونک آرکسٹرا" کی طرف سے تھا۔ جس کے کنڈکٹر موسیقی کے ماہر سر ٹامس بوکن تھے۔ میرے لئے مغربی موسیقی سننے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ ہمارے مکان میں کبھی کبھی کسی دعوت کے موقعہ پر پیانو بجتا تھا اور گانا بھی سنایا جاتا تھا۔ گانے سے تو مجھے کبھی دلچسپی نہ ہوئی۔ نہ گھر میں نہ گھر سے باہر۔ موسیقی میں کبھی کبھار کوئی حصہ ایسا ہوتا جو کانوں کو خوشگوار معلوم ہوتا اس کانسرٹ کے موقعہ پر میں تمام پروگرام کسی قدر دلچسپی سے سن سکا۔ بعد کے تجربے سے معلوم ہوا کہ کلاسیکل موسیقی تو کچھ میری توجہ کا باعث ہوتی لیکن باقی تمام مغربی موسیقی مجھے بالکل شور معلوم ہوتی۔ اپرا میں ایک بار گول میز کانفرنس کے ایام میں جانے کا اتفاق ہوا اور میرے لئے وہاں ہنسی روکنا مشکل ہو گیا طبیعت اسقدر دق ہوئی کہ میں درمیان میں ہی اٹھ کر چلا آیا۔ تھیئٹر کے کھیلوں میں سے مجھے صرف ڈراما کبھی پسند آتا اور کچھ

سمجھ بھی آتی منتفرق کھیل تماشہ مجھے پسند آتا۔ اس کی غرض ہی ہنسی مذاق ہوتی۔ سینما پہلے سال میں تو میں نے دیکھا ہی نہیں اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ سینما ہے کیا شے۔ شیخ خورشید حق صاحب نے جو مجھے گورنمنٹ کالج کے دنوں سے جانتے تھے مجھے ایک روز شام کے کھانے پر بلایا اور کھانے کے بعد کہا چلو تصویریں دیکھیں۔ میں نے کہا مجھے تو نہیں معلوم تصویریں کیسے دیکھی جاتی ہیں وہ ہنسے اور کہا وہاں کچھ بھی کرنا نہیں ہوتا۔ سب کچھ خود بخود صفائی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ تم چلو اگر کچھ بتانے کی ضرورت ہوئی تو میں بتا دوں گا لیکن میں اپنے عذر پر قائم رہا اور نہ گیا۔ آخر ستمبر ۱۹۱۲ء میں جب میں رومن لاء کا بار کا امتحان دے چکا اور امتحانوں میں سے صرف فائنل امتحان باقی رہ گئے تو ایک سوس ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر جو ہمارے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے میں ان کے ساتھ اپنی زندگی میں پہلی بار سینما دیکھنے گیا۔ طالب علمی کے تین سال کے عرصہ میں میرا اندازہ ہے کہ میں شاید دس بارہ دفعہ سینما، تھیئٹر وغیرہ گیا ہوں گا۔ اس زمانے میں امام جماعت کی طرف سے سینما، تھیئٹر جانے پر کوئی بندش نہیں تھی۔ لیکن مجھے طبعاً ہی ایسے کھیل تماشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ میں ہارس شو اور رائل نیول اینڈ ملٹری ٹورنامنٹ دیکھنے ہر سال شوق سے جایا کرتا تھا۔ فروری ۱۹۱۲ء میں میں ایک مرتبہ اپنے عزیز دوست آسکر بزلر کو ساتھ لیکر "دی مرے کال" دیکھنے اولمپیا گیا۔ یہ تمام کھیل خاموشی سے کھیلا جاتا تھا۔ البرٹ ہال کے کانسرٹ کے بعد مسز بین برنج مجھے ایک کیفے لے گئیں جہاں ہم نے چائے پی اور پھر مجھے مکان پر واپس لے آئیں۔ یہ سارے دن کا پروگرام ان کی طرف سے ایسی شفقت کا اظہار تھا کہ اس نے میرے دل پر گہرا نقش چھوڑا۔ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً میرے عرصۂ قیام میں تشریف لاتیں اور کبھی کسی باغ میں کبھی کسی پارک میں سیر کیلئے لے جاتیں۔ یا کوئی محل یا عجائب گھر دکھانے کیلئے لے جاتیں۔ ان کی گفتگو نہایت شستہ اور میرے لئے دلچسپی اور معلومات کے بڑھانے کا موجب ہوتی تھی برطانوی رسم و رواج اور طریق و اطوار کے متعلق مجھے ان سے بہت کچھ معلوم ہوا جو میرے لئے دلچسپی کا موجب بھی ہوا اور مفید بھی ثابت ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کا ان کی مالی حالت پر یہ اثر ہوا کہ پہلے سی فراخی کی حالت جاتی رہی۔ کہا کرتی تھیں کہ میری ضروریات کیلئے تو میرے پاس کافی ہے اور شکر ہے کہ مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب میں پہلے کی طرح دوسروں کی مدد نہیں کر سکتی اور نہ مہمان نوازی کے فرائض دل کھول کر ادا کر سکتی ہوں۔

مجھے جب بھی بعد میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوتا میں انہیں ضرور ملتا۔ درمیان میں خط و کتابت بھی رہتی۔ میری بیٹی عزیزہ امتہ الحی کی پیدائش ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوئی۔ کسی مغربی خاتون کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایملی کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی ان کی عمر ۳۵

پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس اندازے کے مطابق ۵۵ - ۵۶ سال کی عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جو کچھ اثر ان کے چہرے اور ایک آنکھ پر چھوڑ گیا۔ اس وجہ سے انہوں نے لندن کی رہائش ترک کر دی اور وردنگ میں ساحل سمندر کے بالکل قریب ایک مختصر سا فلیٹ اپنی ضروریات کے مطابق کرائے پر لے لیا اور وہاں رہائش اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی بڑی بہن مس لائیزا پارسنز نے بھی وہیں ان کے قریب ہی ایک کمرہ لے لیا۔ مس ایمی پارسنز نے کئی سال قبل الیبٹ لندن ہاسپٹل کو چھوڑ کر ناٹی گیٹ کے علاقہ میں اپنا نرسنگ ہوم چیلسے پارک نرسنگ ہوم کے نام سے جاری کر لیا تھا۔ جسے وہ کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں۔ مسز بین برج کے ورڈنگ منتقل ہو جانے کے بعد جب میں لندن جاتا تو انہیں ورڈنگ جا کر ضرور ملتا جب مجھے کار میسر ہوتی میں کار میں جاتا اور دونوں بہنوں کو گھنٹے دو گھنٹے کیلئے کار میں سیر کے لئے لے جاتا جو ان کے لئے بہت فرحت کا موجب ہوتا۔ اگر کار میسر نہ ہوتی تو میں ریل میں جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ ٹھہر کر چلا آتا۔ مسز بین برج مطعم میں کھانے کے لئے جانا پسند نہیں کرتی تھیں اور میں انہیں اس تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا کہ میرے لئے کھانا تیار کرنے کی زحمت اٹھائیں اسلئے میں عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد لندن سے روانہ ہوتا اور شام کے کھانے تک واپس پہنچ جاتا۔ لیکن کبھی ان کا اصرار ہوتا کہ کھانا میرے ساتھ کھاؤ تو میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوپہر کے کھانے کے وقت پہنچ جاتا۔ ۱۹۴۹ء کے نومبر میں جب میں ڈومینینز کے وزراء کی کانفرنس میں ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے لندن گیا تو عزیزہ انور احمد بطور سکریٹری میرے ساتھ تھے۔ میں انہیں ورڈنگ لے گیا۔ مسز بین برج کی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ موسم کے لحاظ سے بھی دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے لندن سے سویرے روانگی مناسب تھی۔ گو میری طبیعت میں تامل بھی تھا کہ ہم دو شخص مسز بین برج کے مہمان ہوں۔ کیونکہ راشن بندی کی وجہ سے ان پر تنگی ہونا لازم تھا۔ بہر حال ان کی خواہش کا احترام فرض تھا۔ کھانے کے دوران میں نے عزیزہ انور احمد سے کہا آپ کو اپنی ٹریننگ کیلئے ایک سال لندن ٹھہرنا ہوگا۔ جنگ کا زمانہ ہے ادھر اُدھر آنا جانا آسان نہ ہوگا ایک طریق یہ ہو سکتا ہے کہ اتوار یا کسی اور چھٹی کے دن جب چاہو یہاں آجاؤ۔ دوپہر کے کھانے کیلئے کچھ ساتھ لے آیا کرو اور یہاں مسز بین برج کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیا کرو۔ چائے یا کافی یہ تیار کر دیا کریں گی۔ جب میں ذرا کمرے سے باہر گیا تو مسز بین برج نے عزیزہ انور سے کہا۔ "تم جب جی چاہے آجایا کرنا میں کہیں باہر تو جاتی نہیں لیکن ساتھ کچھ لانے کی ضرورت نہیں میں تمہارے لنچ کا خود انتظام کیا کروں گی۔" یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ان کی صحت اس وقت بھی کمزور ہو رہی تھی بعد میں اپریشن کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اپریشن کے چند دن بعد ہسپتال سے ہی بستر میں بیٹھے بیٹھے پنسل سے مجھے خط لکھا، اپریشن کا

ذکر کیا اور لکھا کہ میں اچھی ہو رہی ہوں لیکن اچھا ہونا مقدر نہیں تھا۔ ان کی بڑی بہن ان کی زندگی میں فوت ہو چکی تھیں۔ جب لندن سے نقل مکان کر کے وررڈنگ گئی تھیں تو پایہ چاٹ وغیرہ اور ذاتی استعمال کی چیزوں کے علاوہ بہت تھوڑی اشیاء ساتھ لے گئی تھیں۔ ان میں ایک میری والدہ کی تصویر تھی کہا کرتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے بڑا حوصلہ ہوتا ہے اور ہمت بڑھتی ہے۔ ایک رنگین کارٹون ان کا اور ان کے شوہر فرینک بین برج کا تھا۔ جو اس زمانے کی یادگار تھا جب زندگی کی امنگیں ابھی افسردگی کی قباء میں ملبوس نہ ہوئی تھیں۔ ایک چاندی کا چائے کا سٹ تھا اور ایسی ہی متفرق اشیاء جو یادگار کے طور پر تھیں۔ مجھے کہہ رکھا تھا کہ میں ہدایت چھوڑ جاؤں گی کہ تمہاری والدہ کی تصویر، فرینک کا اور میرا کارٹون چائے کے سٹ میں سے دودھ دان امۃ الحی کیلئے تمہیں بھیج دیئے جائیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بہن ایمی کا خط میرے نام آیا جس میں ان کی وفات کا ذکر تھا اور لکھا تھا۔ ایملی کی ہدایت تھی کہ یہ اشیاء تمہیں بھیج دی جائیں۔ تم جیسے لکھو میں بھیج دوں۔ میں نے انہیں افسوس اور ہمدردی کا خط لکھا اور لکھ دیا کہ میرے پتے پر اپنی بہن کی نشانی مجھے بھیج دیں۔ جنگ کا زمانہ تھا معلوم نہیں میرا خط انہیں ملا یا نہیں۔ اگر ملا اور انہوں نے وہ اشیاء روانہ کر دیں جیسے کہ توقع ہے کہ انہوں نے ضرور روانہ کر دی ہوں گی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ رستے میں تلف ہو گئیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن میرے دل میں ایملی بین برج کی یاد تازہ رکھنے کیلئے کسی تصویر یا کارٹون کی حاجت نہ تھی میرے ان کے درمیان سوائے ہماری مشترک انسانیت کے اور کوئی رشتہ واسطہ نہیں تھا۔ مجھے کسی نے ان کے نام کوئی تعارفی خط نہیں دیا تھا۔ بیشک ان کے بڑے بھائی فرینک پارسنز مدراس میں انڈین سول سروس میں تھے اور پنشن پر جانے سے پہلے مدراس کے گورنر کی کونسل کے رکن رہ چکے تھے لیکن کجا مدراس اور کجا پنجاب۔ نہ وہ مجھے جانتے تھے نہ میں انہیں جانتا تھا۔ ان کا نام بھی میں نے انکی بہنوں ہی سے سنا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نارفوک میں سولسٹر تھے اور قانون پیشہ تھے۔ میں قانون کا طالبعلم تھا اور ان سے بھی میرا تعارف نہیں ہوا۔ میرے ساتھ جو ایملی بین برج تعارف کے وقت سے اپنے آخری سانس تک قریباً تینتیس سال کے عرصے میں کمال شفقت اور اخلاص سے پیش آتی رہیں اس کا موجب انکی ذاتی شرافت اور حسن اخلاق تھے وہ بہت خوش شکل اور بڑی باوقار خاتون تھیں لیکن اس سے بہت بڑھ کر خوش خلق تھیں۔ اور یہ زیور انہیں بہت ہی سجتا تھا۔

میرے ایک ہندوستانی رفیق کو ہمارے مکان میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے کھانے کی دعوت دی۔ ایملی نے قبول کر لی یہ جانتے ہوئے کہ مسز بین برج اچھے طبقے میں میل جول رکھتی ہیں میرے

رفیق انہیں کسی اعلیٰ درجے کے مطعم میں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن مسز بین برج نے ایک درمیانی درجے کے مطعم کا انتخاب کیا اور کھانے کے آخر میں جب خادمہ بل لائی تو بڑے اصرار سے خود بل ادا کیا اور ان سے مسکرا کر کہا تم ظفراللہ کے دوست ہو اسلئے میرے بھی دوست ہو لیکن تم طالب علم ہو اور اپنے وطن سے باہر ہو مناسب نہیں کہ تم میری خاطر کچھ خرچ اپنے ذمے لو۔ میں اس بات کی قدر کرتی ہوں کہ تم نے مجھے دعوت دی اور تمہاری ممنون ہوں کہ اپنے قیمتی وقت میں سے تم نے ایک شام میرے لئے صرف کی جو میری خوشی کا باعث ہے۔ تمہاری اسقدر تواضع ہی کافی ہے۔ میرے رفیق نے واپسی پر یہ بات مجھے سنائی اور باقی گفتگو کا بھی کچھ ذکر کیا لیکن بار بار یہ کہتے کہ میں تم سے پہلے کا اس ملک میں آیا ہوں اور میری واقفیت کا حلقہ خاصا وسیع ہے۔ لیکن میں نے ایسی شریف اور خوش اخلاق خاتون یہاں نہیں دیکھی۔ انہوں نے اپنی جو تصویر مجھے دی تھی اس سے ہر دیکھنے والا یہی قیاس کرتا کہ یہ کسی ملکہ یا شہزادی کی تصویر ہے۔ بایں ہمہ صفات نہایت منکسرمزاج تھیں۔ میں نے انہیں کبھی بلند آواز سے کلام کرتے نہیں سنا۔ نہ کبھی کوئی لفظ کسی کی تحقیر یا مخالفت کا ان کے منہ سے نکلا۔ آغاز شباب میں خاوند سے علیحدگی ہو گئی۔ ہمہ صفت موصوف اور صاحب ثروت تھیں۔ چاہنے والوں کی کمی نہ ہوگی۔ چالیس سال سے زائد عرصہ عملاً بیوگی میں گذارا۔ کوئی حرکت اعلیٰ درجہ کی شرافت اور کامل عفت اور عصمت کے متضاد بھولے سے بھی سرزد نہ ہوئی۔ زندگی افسردہ لیکن چہرہ ہر لحظہ بشاش، ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ، میں انکی نظر میں کیا حیثیت رکھتا تھا؟ پنجاب کے زمیندار طبقے سے لندن جیسے شہر میں جو اس وقت تہذیب، علوم اور ثروت کا مرکز شمار ہوتا تھا بالکل نووارد۔ وہاں کے طور طریق اور آداب تک سے ناواقف۔ میری عمر ان سے نصف، میرا تجربہ ان کے مقابل میں صفر، میری گفتگو ان کے لئے پھیکی اور بے مزہ، انہیں یہی خیال آتا ہوگا کہ یہ نوجوان اپنے وطن اور عزیزوں سے دور اکیلا ہونے کی وجہ سے ضرور افسردہ رہتا ہوگا۔ میں جو اکیلے پن کا ذاتی تجربہ رکھتی ہوں اور افسردگی سے واقف ہوں کسی حد تک اپنی شفقت سے اس کی اداسی کو ہلکا کر سکتی ہوں۔ اور کچھ ایک مجھ پر ہی موقوف نہ تھا۔ ایملی بین برج نے دوسروں کی دلجوئی اور غمخواری کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اور اس طرح اپنی افسردگی پر دوسروں کی خوشی اور بشاشت کا غلاف چڑھا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جو بہت ہی قدردان آقا ہے اور اپنے ہر بندے کے دل کی گہرائیوں پر نظر رکھتا ہے اور انہیں خوب پہچانتا ہے۔ ایملی بین برج کے ساتھ اس سے بہت بڑھ کر رحمت اور شفقت کا سلوک فرمائے جو انہوں نے اس کے بندوں کے ساتھ روا رکھا کہ اس الرحم الراحمین کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ آمین

کرنل و مسز باورڈ | کچھ عرصہ کیلئے کرنل اور مسز باورڈ بھی جو کینیڈا سے سیر کیلئے آئے تھے اس مکان میں ٹھہرے۔ وہ برانٹ فورڈ انٹاریو کے رہنے والے تھے۔ یہ شہر آبشار نیاگرا سے قریب ہے۔ چونکہ انہیں لندن کی سیر

مقصود تھی اسلئے دن بھر تو وہ سیرگاہوں اور عجائب خانوں میں صرف کرتے۔ شام کے وقت عموماً گھر پر رہتے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ شام کو کرنل ہاورڈ کو کہیں باہر جانا ہوتا اور مسز ہاورڈ گھر پر ہی ٹھہرتیں وہ اپنے تین بیٹے گائی، والٹر اور جیک پیچھے چھوڑ کر آئی تھیں۔ شام کا وقت ہوتا تو بچوں کی جدائی کے احساس سے اداس ہو جاتیں۔ ان کے بیٹوں میں سے منجھلا یعنی والٹر میرا ہم عمر تھا۔ شام کے وقت جب بھی مجھے فراغت ہوتی وہ میرے ساتھ بات چیت میں وقت صرف کرنا پسند کرتیں۔ کبھی اپنے وطن شہر اور گھر کا ذکر کرتیں کبھی اپنے بچوں کا اور کبھی مجھ سے میرے گھر کا اور میرے والدین کا ذکر سنتیں۔ اپنے بیٹوں کو بھی میرے متعلق لکھا۔ اور انہوں نے مجھے تصویری کارڈ بھیجنا شروع کر دیئے۔ والٹر کے ساتھ تو میری باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی جو کرنل اور مسز ہاورڈ کے کینیڈا واپس جانے کے بعد اور پھر میرے وطن واپس آنے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ نیاگرا کے علاقے میں پھل بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ مسز ہاورڈ مجھے کہا کرتیں ظفراللہ تم ہمارے ہاں آؤ تو تمہیں اتنے بڑے بڑے آڑو کھلاؤں کہ ہر آڑو ایک کھلے منہ والے گلاس کا ڈھکنا بن سکے ۱۹۳۳ء میں جب میں کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس کے سلسلے میں ٹورنٹو گیا تو ہمارا قیام وہاں کی یونیورسٹی کے رہائشی حصے میں ہوا۔ کالجوں میں تعطیل تھی لیکن بعض طالب علم رضاکارانہ طور پر کانفرنس کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ ایک شام کھانے کے بعد مجھے پیغام ملا کہ کوئی صاحب ٹیلیفون پر مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں گیا تو ٹیلیفون پر یہ گفتگو ہوئی:۔

THIS IS HOWARD SPEAKING

WHICH OF THEM ? GUY, WALTER OR JACK ?

AS A MATTER OF FACT IT IS WALTER BUT HOW DID YOU KNOW?

THOSE ARE THE ONLY THREE HOWARDS, ONE OF WHOM COULD HAVE WISHED TO SPEAK TO ME

THEN YOU <u>ARE</u> THE ZAFRULLA WHOM MY PARENTS MET IN LONDON ?

AND WHO CORRESPONDED WITH YOU HOW ARE YOUR PARENTS ?

FATHER DIED SOME TIME BACK BUT MOTHER LIVES ON IN BRANTFORD. IN FACT SHE READ YOUR NAME IN THE LIST OF DELEGATES TO THIS CONFERENCE AND CALLED ME UP AND ASKED ME TO MAKE SURE. MAY I COME ROUND ?

SURELY. DO COME AT ONCE.

"میں ہاورڈ بول رہا ہوں"۔ "کونسا ہاورڈ؟ گائی، والٹر یا جیک؟"۔ "میں والٹر ہاورڈ ہوں لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"۔ "یہاں صرف یہی تین ہاورڈ ہیں جن میں سے کوئی ایک مجھے ٹیلیفون کر سکتا تھا۔"

"پھر تو آپ وہی ظفر اللہ ہیں جو میرے والدین سے لندن میں ملے تھے۔" "اور جو آپ کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا۔ آپ کے والدین خیریت سے ہیں؟" "والد صاحب کچھ عرصہ ہوا فوت ہو گئے، والدہ برینٹ فورڈ میں رہتی ہیں۔ انہوں نے کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں کی فہرست میں آپ کا نام پڑھا اور مجھے کہا کہ میں پتہ لگاؤں کہ کیا یہ وہی ظفر اللہ ہے جو انہیں لندن میں ملا تھا۔ کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟" "ضرور ضرور جلدی تشریف لائیں۔"

اس طرح اکیس سال بعد میری ملاقات والٹر سے ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں ٹورنٹو گیا تو ایمپائر پارلیمنٹری ایسوسی ایشن کی وہاں کی شاخ نے مجھے شام کے کھانے کی دعوت دی۔ میرے بائیں طرف ایک مسٹر میکڈانلڈ بیٹھے تھے جو برانٹ فورڈ کے حلقے سے کنیڈا کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ میں نے ان سے مسز ہاورڈ کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا وہ میرے قریب ہی رہتی ہیں میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ ان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ حال ہی میں انہوں نے آنکھوں کا اپریشن کرایا ہے جو کامیاب رہا ہے۔ میں نے ان کے ذریعے اپنا سلام مسز ہاورڈ کو بھیج دیا۔ اس وقت ہماری لندن کی ملاقات پر تئیس برس گذر چکے تھے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۴۶ء میں پھر ٹورنٹو جانے کا اتفاق ہوا۔ رات کے وقت وہاں پہنچے۔ دوسری شام بعض دوست مجھے کھانے اور سیر کیلئے نیاگرا لے گئے راستے میں میں نے ان سے مسز ہاورڈ کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا برانٹ فورڈ ہمارے راستے سے تھوڑا ہی ہٹ کر ہے واپسی پر ہم وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ کھانا ہم نے جنرل براک ہوٹل میں کھایا۔ وہاں کھانے کا کمرہ سب سے اوپر کی منزل پر ہے اور وہاں سے آبشار کا رنگین نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے میزبانوں میں سے ایک نے ٹیلیفون والی خاتون کو ہدایت دی کہ وہ برانٹ فورڈ کی ٹیلیفون ڈائرکٹری دیکھ کر ہر مسز ہاورڈ نام کی خاتون سے دریافت کرے کہ ان میں سے کونسی خاتون تین بیٹوں کی ماں ہے جن کے نام گائی، والٹر اور جیک ہیں۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو چکے تو معلوم ہوا کہ ٹیلیفون کی کتاب میں دس اندراج مسز ہاورڈ کے نام کے ہیں۔ تین کی طرف سے تو کوئی جواب نہیں ملا اور جن سات کے ساتھ بات ہوئی ان میں سے کسی کے تین بیٹے ان ناموں والے نہیں۔ دوسری صبح میرا نام اخبار میں دیکھ کر والٹر نے مجھے ٹیلیفون کیا اور میں نے اسے بتایا کہ کیسے ہم نے مسز ہاورڈ کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ والٹر نے کہا کہ میری والدہ تو دو سال ہوئے فوت ہو گئیں۔ والٹر مجھے ملنے آیا۔ تھوڑا عرصہ پہلے اس کی شادی ہو چکی تھی اپنی بیوی ایولین کو بھی ساتھ لایا۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں برانٹ فورڈ میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جلد وہاں منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد والٹر کی اور میری خط و کتابت پھر شروع ہو گئی اور چونکہ ۱۹۴۷ء سے مجھے

سال میں اوسطاً دو بار نیویارک جانے کا اتفاق ہوتا رہا اور ٹورنٹو جانے کی بھی کوئی نہ کوئی تقریب پیدا ہو جاتی تھی ان مواقع پر والٹر اور اس کی بیوی سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میاں بیوی دونوں بہت تواضع سے پیش آتے۔ ایک بار عزیزہ امۃ الحی میرے ساتھ امریکہ گئیں اور میں انہیں آبشار دکھانے نیاگرا لے گیا۔ نیویارک سے ٹورنٹو تو ہم ریل میں گئے۔ وہاں سے میرے ایک دوست ہو واکر ہمیں اپنی کار میں نیاگرا لے گئے دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا۔ دن خاصا گرم تھا اور امۃ الحی برقعہ پہنے تھیں۔ واپس روانہ ہوئے تو عزیزہ امۃ الحی کو سر درد کی شکایت ہو گئی اور اعضاء شکنی محسوس ہونے لگی۔ برانٹ فورڈ بالکل قریب تھا۔ ہم والٹر کے مکان پر چلے گئے۔ ایولین نے بڑی شفقت سے عزیزہ کے آرام کرنے کا سامان کر دیا اور عزیزہ اسپرین کی ٹکیہ کھا کر سو گئی۔ دو گھنٹے بعد بیدار ہوئی تو طبیعت بفضل اللہ بالکل صاف تھی۔ ہم بخیریت ٹورنٹو واپس پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ عزیزہ چوہدری نبی احمد صاحب بھی اس علاقے کی سیر میں میرے ساتھ تھے۔ آبشار سے ہو کر ہمارا پروگرام رات برانٹ فورڈ ٹھہرنے کا تھا۔ پھل کا موسم تھا اور سڑک کے دونوں طرف پھل کے بڑے بڑے ڈھیر فروخت کیلئے لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ٹھہر کر ہم نے آڑوں کی ایک ٹوکری خریدنے کیلئے منتخب کی۔ قیمت دریافت کرنے پر فروخت کرنے والی لڑکی نے کہا ایک ڈالر۔ میں تو سمجھ گیا لیکن چوہدری نبی احمد صاحب نے حیرت سے دریافت کیا "ایک ڈالر فی آڑو؟ یہاں تو پھل بہت مہنگا ہے"۔ لڑکی نے مسکرا کر کہا ایک ڈالر ساری ٹوکری کی قیمت ہے۔ اس پر انہیں حیرت ہوئی کہ یہاں پھل اسقدر سستا ہے۔ برانٹ فورڈ پہنچ کر ہوٹل سے میں نے والٹر کو ٹیلیفون کیا۔ میاں بیوی نے اصرار کیا کہ ابھی آجاؤ اور شام کا کھانا ہمارے ہاں کھاؤ۔ ہم نے پھل کی ٹوکری انہیں پیش کر دی ایولین نے اس کا کچھ حصہ ہمارے لئے کھانا تیار کرنے میں استعمال کیا۔

خواجہ کمال الدین صاحب کی لندن تشریف آوری۔

۱۹۱۲ء میں خواجہ کمال الدین صاحب لندن تشریف لائے ان دنوں ڈاکٹر عباد اللہ صاحب امرتسر والے بھی لندن میں تشریف فرما تھے۔ خواجہ صاحب کے لندن پہنچنے پر وہ انہیں اس مکان پر لے گئے جہاں وہ خود رہتے تھے۔ چونکہ اس وقت اس مکان میں کوئی خالی کمرہ نہ مل سکا انہوں نے اپنا کمرہ خواجہ صاحب کو دے دیا اور جب تک دوسرا کمرہ نہ ملا وہ خود زمین پر سوتے رہے۔ تھوڑے عرصے بعد خواجہ صاحب اس مکان میں آگئے جس میں میں رہتا تھا اور مجھے روزانہ کچھ وقت انکی صحبت میں گذارنے کا موقعہ مل گیا۔ دوران گفتگو سلسلہ احمدیہ کا ذکر بھی آتا تھا۔ ایک دفعہ ہم دونوں سیر کیلئے جا رہے تھے کہ فرمایا "نورالدین کے بعد خلافت کے متعلق بھی رولا ہی پڑے گا"۔ گفتگو پنجابی زبان میں تھی اور محبت کے رنگ میں خواجہ صاحب اکثر خلیفۃ المسیح الاوّل

رضی اللہ عنہ کا نام اکثر اسی بے تکلفی سے لیتے تھے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر بعض دفعہ صرف "مرزا" کہہ کر کرتے تھے) میاں محمود ابھی بچہ ہے۔ محمد علی بہت حساس ہے۔ بات بات پر رو پڑتا ہے اور میں ہوں لیکن مجھ میں یہ نقص ہے کہ میں سچی بات منہ پر کہہ دیتا ہوں۔ مجھ سے لوگ خفا ہو جاتے ہیں۔" میں نے عرض کیا "خواجہ صاحب خلافت کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح اپنی لاہور کی تقریروں میں بہت کچھ وضاحت فرما چکے ہیں آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ وقت آنے پر اللہ تعالیٰ جسے پسند فرمائے گا کھڑا کر دے گا۔" اس پر فرمایا "یہ مفتی صادق کمبخت ہمارے خلاف سب کچھ شائع کر دیتا ہے ہمارے حق کی کوئی بات نہیں لکھتا۔"

خواجہ صاحب ابھی ہمارے مکان میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے کہ بہائی لیڈر عبد البہاء صاحب لنڈن تشریف لائے اور میں نے سنا کہ وہ اتوار کے دن ووکنگ کی مسجد کا افتتاح کریں گے۔ اس مسجد کی تعمیر اس طرح ہوئی تھی کہ جب ڈاکٹر ہنری لائٹنر جو لاہور میں اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے فارغ ہو کر واپس انگلستان جانے لگے تو انہوں نے انگلستان میں ایک مسجد کی تعمیر کے متعلق تحریک کی اور مسلمان رؤساء اور ذی استطاعت اصحاب سے اس کار خیر میں حصہ لینے کی اپیل کی۔ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب سر سالار جنگ صاحب حیدر آباد نے اس غرض کے لئے معقول رقوم عنایت فرمائیں اور غالب قیاس ہے کہ اور بہت سے ذی استطاعت مسلمانوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا ہوگا۔ ڈاکٹر لائیٹنر نے انگلستان واپسی پر ایک وسیع قطعہ زمین ووکنگ میں خریدا جو لنڈن سے ۲۴ میل دور مغرب کی طرف ہے۔ ووکنگ ایک بڑی ریلوے لائن پر واقعہ ہے اسلئے لنڈن سے ووکنگ آنے جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس قطعۂ زمین پر ڈاکٹر لائٹنر نے تین عمارتیں تعمیر کروائیں ایک مسجد جس کا نام علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کے اسم گرامی پر مسجد شاہجہان رکھا۔ ایک رہائشی مکان جس کا نام سر سالار جنگ میموریل ہاؤس رکھا اور ایک عالیشان عمارت جس میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کی۔ مسجد اور میموریل ہاؤس تو پاس پاس ہیں اور ان کا ایک مشترکہ باغیچہ بھی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے گرد بہت سی کھلی زمین باغ کے طور پر ہے۔ ڈاکٹر لائیٹنر کی وفات کے بعد ان کے ورثاء نے اس تمام جائیداد پر اپنا تصرف جما لیا اور اسے اپنی ذاتی ملکیت ظاہر کرنا شروع کیا۔ جب رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب پریوی کونسل کی ججی پر تعینات ہو کر لنڈن پہنچے تو انہوں نے اس معاملے میں دلچسپی لینا شروع کی اور کچھ دیگر سر کردہ مسلمانوں مثلاً ہز ہائی نس آغا خان اور مرزا عباس علی بیگ (جو وزیر ہند کی مشاورتی کونسل کے رکن تھے) کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا اور اس تمام جائیداد کو واگذار کرانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ آخر بعض شرفاء کے بیچ بچاؤ سے یہ فیصلہ ہوا کہ مسجد، میموریل ہاؤس اور ان کے سامنے اور ارد گرد باغ کا حصہ واگذار کر دیا جائے اور انسٹی ٹیوٹ اور اس کے ارد گرد کی زمین ڈاکٹر لائیٹنر کے ورثاء کے تصرف میں رہے۔

مسجدِ ووکنگ جب واگذار ہو چکی تو اب اسے آباد کرنے کا بھی سوال اٹھا۔ اس اثناء میں عبدالبہاء صاحب امریکہ سے واپسی پر انگلستان تشریف لائے۔ ان کے دوستوں اور ہم خیالوں نے ان کے اعزاز میں مسجد ووکنگ میں ایک تقریب منعقد کی جسکو انہوں نے افتتاحِ مسجد کا نام دے لیا۔ لیکن دعوت ناموں کو بہائی اور بہائیت کے ہمدرد اصحاب تک محدود رکھا۔ تقریب کا علم ہونے پر مسجد کے تعلق کی وجہ سے چند مسلمان طلباء اور دوسرے مسلمان افراد بھی ووکنگ پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب بھی تشریف لے گئے اور میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ دوسرے طلباء میں سے جو اس موقعہ پر ووکنگ گئے مجھے شیخ محمد صادق صاحب (امرتسر) اور خان محمد نواز خاں صاحب فیروز پور کے نام یاد ہیں۔ سر سالار جنگ میموریل ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ لیکن کھانے میں جناب عبدالبہا صاحب کے ساتھ وہی اصحاب شریک تھے جنہیں منتظمین کی طرف سے دعوت تھی۔ باقی جو لوگ گئے ہوئے تھے انہوں نے سٹیشن پر ہی جو کچھ میسر آسکا کھا لیا یا اگر کوئی صاحب اپنے ساتھ کھانے کو کچھ لے آئے تھے تو اسی پر گذارہ کر لیا۔ جو اصحاب دعوت پر آئے تھے اور جو اپنے شوق سے آگئے تھے سب کی مجموعی تعداد چالیس پچاس کے قریب تھی۔ ہم سب جو شوق سے آگئے تھے وضو کر کے مسجد میں جمع ہو گئے۔ جب اندازہ ہوا کہ مہمان اصحاب کھانے سے فارغ ہو چکے ہوں گے تو خواجہ صاحب نے عبدالبہا صاحب کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ نماز ظہر کا وقت ہے آپ نماز کیلئے مسجد میں تشریف لائیں۔ انہوں نے کہلا بھیجا میں اپنی جائے قیام پر نماز ادا کر کے آیا ہوں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے خواجہ صاحب کی امامت میں ظہر کی نماز ادا کی۔ سردیوں کا موسم تھا دن بہت چھوٹا تھا۔ جلد عصر کا وقت ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے پھر عبدالبہاء صاحب کی خدمت میں پیغام بھیجا۔ نمازِ عصر کا وقت ہے تشریف لائیں۔ اسکی بار وہ تشریف لے آئے اور خواجہ صاحب کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو کر انہوں نے نہایت صاف، سلیس اور سادہ فارسی میں مختصر سی تقریر کی۔ میں ان کے عین پیچھے کھڑا تھا اور گو میں فارسی زبان بہت کم جانتا ہوں۔ مجھے ان کی تقریر کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ ایرانی لباس پہنے تھے، قد درمیانہ، کھلا چہرہ، سفید ریش، بزرگ صورت، کلام میں کوئی تصنع نہیں تھا، خلاصہ تقریر یہ تھا۔ ہمارا مسلک صلح کل ہے کسی سے پرخاش نہیں۔ امن کے حامی ہیں۔ میں ابھی امریکہ سے ہو کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں عیسائی گرجوں میں اور یہودی معبدوں میں بھی عبادت کی ہے اور ہر جگہ یہی پیغام دیا ہے۔

ووکنگ مشن کا قیام | اس کے بعد خواجہ صاحب نے کوشش شروع کر دی کہ ووکنگ کی مسجد کا انتظام ان کے سپرد ہو جائے۔ اسی اثناء میں نقل مکان کر کے آپ اپنے نسبتی بھائی کے پاس رچمنڈ میں کیو گارڈنز

روڈ تشریف لے گئے۔ مسلم انڈیا اور اسلامک ریویو جاری کیا اور جب ووکنگ مسجد کا انتظام آپ کے سپرد کرنے کا فیصلہ ہو گیا تو آپ نے سر سالار جنگ میموریل ہاؤس میں رہائش اختیار کر لی اور ووکنگ مشن کا قیام عمل میں آیا۔ جمعہ کی نماز کے لئے لندن سے آنے جانے میں چونکہ وقت صرف ہوتا تھا اسلئے جمعہ کی نماز کیلئے نوٹنگ ہل میں ایک ہال کرائے پر لینے کا بھی انتظام ہو گیا۔

خواجہ کمال الدین صاحب کے بیان کردہ ان کے دو خواب۔ سارہ برن ہارٹ ایک مشہور فرانسیسی ایکٹرس تھی اور گو خاصی معمر ہو چکی تھی لیکن اپنے فن کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتی تھی۔ ملکہ اوّل الزبتھ کے ڈرامے میں اس نے ملکہ کا پارٹ ادا کیا۔ اس ڈرامے کی فلم بھی تیار کی گئی۔ اس فلم کی بھی بہت شہرت ہوئی۔ خواجہ صاحب ابھی اسی مکان میں اقامت پذیر تھے جہاں میں رہتا تھا کہ ایک دن ہمارے گھر میں ذکر ہوا کہ یہ فلم ایک قریب کے سینما میں دکھائی جا رہی ہے اور قابل دید ہے۔ خواجہ صاحب نے اسے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور ہم دونوں اسے دیکھنے گئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اور وہ شام خاصی سرد تھی۔ میں تو اپنا اوور کوٹ پہن کر گیا لیکن خواجہ صاحب نے اوور کوٹ نہ پہنا۔ فرمایا کرتے تھے مجھے یہاں کی سردی تکلیف دہ محسوس نہیں ہوتی۔ فلم کے ایک حصّہ میں وہ منظر آتا تھا جس میں ارل آف ایسکس جو آئرلینڈ کا وائسرائے رہ چکا تھا اور وہاں سے واپسی پر بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہو کر موت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا کو اس کا سر قلم کرنے کیلئے مقتل میں لایا جاتا ہے۔ جب یہ منظر سامنے آیا اور ارل آف ایسکس نے اپنا سر بلاک پر رکھ دیا اور جلاد نے اپنا کلہاڑا اٹھایا تو خواجہ صاحب کی طبیعت یکایک سخت پریشان ہو گئی اور مجھ سے یہ کہہ کر کہ اٹھو اٹھو فوراً چلو خود سراسیمگی میں لاحول پڑھتے اور استغفار کرتے باہر کو چل دیئے۔ میں بھی ان کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوا اور گھبراہٹ میں ان کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ خواجہ صاحب کو سردی لگ گئی ہے اور فوراً تکلیف بڑھ گئی ہے۔ یہ سینما ہیمرسمتھ براڈوے کے پاس ہی تھا۔ ہم براڈوے سے گذر کر بجائے اپنے گھر کی طرف جانے کے ہیمرسمتھ برج روڈ پر ہوئے اور دریا کے پل کی طرف چل پڑے۔ خواجہ صاحب بہت تیزی سے چل رہے تھے اور استغفار اور دعاؤں میں مصروف تھے اسلئے میں کچھ پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پل پر پہنچ کر ان کی طبیعت میں کچھ سکون ہوا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کو کچھ سردی محسوس ہو رہی ہے فرمایا نہیں مجھے تو سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی پسینہ آ رہا ہے۔ اسلئے میں کھلی ہوا کی طرف نکل آیا ہوں۔ تھوڑی دور جا کر خواجہ صاحب نے اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ مجھے اپنے دو خواب یاد آ گئے تھے۔ جن میں سے ایک میں مجھ پر وہی کیفیت وارد ہوئی تھی جو فلم کے اس منظر میں ارل ایسکس پر وارد ہونے والی تھی۔

جیسی دہشت خواب میں مجھ پر طاری ہوئی تھی ویسی ہی اس منظر کے سامنے آنے پر میں نے محسوس کی اور میں اسے برداشت نہ کر سکا اور اسی گھبراہٹ میں اٹھ کر چلا آیا۔ فرمایا پہلا خواب میں نے ان ایام میں دیکھا تھا جب حضرت صاحبؑ (حضرت مسیح موعود علیہ السلام) آخری بار لاہور تشریف لائے تھے اور ہمارے مکانات واقعہ احمدیہ بلڈنگس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور مولوی محمد علی صاحب اور تین چار اور افراد (اگر خواجہ صاحب نے کوئی نام لئے تو مجھے وہ یاد نہیں رہے) گرفتار کر لئے گئے ہیں اور ہم سے کہا گیا کہ تم نے بغاوت کی ہے تمہیں بادشاہ کے حضور پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ ہمیں پیش کیا گیا۔ کمرہ ایسا تھا جیسا لاہور چیف کورٹ میں فرسٹ بنچ کے اجلاس کا کمرہ ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ چوکور چھتری (خواجہ صاحب نے لفظ CANOPY کہا تھا) کے نیچے جہاں جج بیٹھتے ہیں تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر مولوی صاحب (حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ) تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا، تم نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے بتاؤ تمہیں کیا سزا دی جائے؟ میں نے کہا اب آپ کا راج ہے آپ جو چاہیں حکم دیں۔ مولوی صاحب نے کہا ہم تمہیں ملک بدر کرتے ہیں۔ میں نے خواب حضرت صاحب (حضرت مسیح موعود علیہ السلام) کو سنایا۔ جس خواب میں انسان کی اپنی موت کی طرف اشارہ ہو بعض دفعہ اس کی تعبیر ذہن میں نہیں آتی (یہ خواجہ صاحب کے الفاظ تھے معلوم نہیں خواجہ صاحب نے یہ قیاس کیوں نہ کیا کہ حضور علیہ السلام تعبیر تو خوب سمجھ گئے ہوں گے لیکن مصلحتاً بیان کرنا مناسب خیال نہ فرمایا) آپ نے کہا مبارک ہو شاہی قیدی ہونا کوئی بری بات نہیں۔ اس کے بعد میں مولوی صاحب کے پاس گیا اور انہیں وہ خواب سنایا۔ انہوں نے سنکر کچھ دیر تو سر جھکائے رکھا اور پھر سر اٹھا کر کہا۔ "کسی سے کہنا نہیں"۔ اس کے دو چار دن بعد حضرت صاحب کی وفات ہو گئی۔ میں مولوی صاحبؓ کے پاس گیا اور کہا حضرت میرا خواب پورا ہو گیا، اور اپنے ہاتھ کو بڑھا کر کہا کہ بیعت لیجئے۔ مولوی صاحبؓ نے کہا نہیں۔ نہیں انتظار کرو۔ قادیان چلو۔ ام المومنینؓ سے پوچھو۔ نواب محمد علی سے پوچھو۔ محمود سے پوچھو۔ ناصر نواب سے پوچھو۔

دوسرا خواب میں نے کچھ عرصہ بعد دیکھا کہ ہم پھر پکڑے گئے ہیں اور مولوی صاحبؓ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ مولوی صاحبؓ نے کہا تم نے پھر ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تمہارا سر قلم کیا جائے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ میں مقتل میں لے جایا گیا ہوں اور عین اسی طرح جیسے اس فلم کے منظر میں ایکس کے ساتھ ہوا میں نے اپنا سر بلاک پر رکھ دیا اور جلاد نے کلہاڑے کا وار میری گردن پر کیا جس سے مجھ پر سخت دہشت طاری ہوئی اور میری نیند کھل گئی۔ ویسی ہی حالت میری اب ہوئی

قیام لندن کے دوران سیر و سیاحت | جیسے میں ذکر کر چکا ہوں میں بفضل اللہ بڑی باقاعدگی سے اور توجہ سے اپنے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا لیکن تعطیلوں کے ایام کا اکثر حصہ میں لندن سے باہر گذارتا تھا۔ کبھی انگلستان میں کبھی انگلستان سے باہر۔ میں ۱۶ ستمبر ۱۹۱۱ء کو لندن پہنچا تھا۔ شروع اکتوبر میں باقاعدہ پڑھائی شروع ہو گئی۔ دسمبر کا آخری عشرہ کرسمس کی تعطیل تھی۔ مسز فائزن اور گھر میں دوسرے لوگوں سے مشورہ کرکے میں نے تعطیل کے دنوں میں ٹارکی جانے کا فیصلہ کیا جو جنوبی ڈیون شائر میں ساحل سمندر پر ایک خوشنما مقام ہے۔ مسٹر ہرمن فاسٹن میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ٹارکی کی ہوا بہت صاف اور معتدل تھی، سماں بہت خوشگوار تھا، اگرچہ موسم سرما کا وسط تھا لیکن ہر طرف سبزہ تھا ٹارکی کا پہلا نظارہ ہی مجھے بہت دلکش معلوم ہوا۔ اس تاثر کی وجہ سے یہ شہر مجھے آجتک بہت بھلا معلوم دیتا ہے۔ مجھے کئی مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر بار میں وہاں سے خوش لوٹا ہوں۔ ٹارکی میں اور اس کے ارد گرد بہت سے سیر کے مقامات ہیں۔ چلسٹن کے ساتھ ملتے ہوئے حصے میں ہی کاکنگٹن کورٹ۔ اس کا باغ اور تالاب وغیرہ ہیں۔ باغ کے ایک کونے میں چھوٹا سا نارمن وقتوں کا گرجا ہے۔ گاؤں کے چوراہے میں پرانے وقتوں کی لوہار کی بھٹی ہے۔ جو آجتک امریکن زائرین کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ اب تو پاس ہی ایک کیفے اور مطعم اور کار پارک بھی مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں سب ماحول ایک گاؤں کا تھا۔ سیر کیلئے شہر کے مشرقی حصے میں لب ساحل دو بہت خوشنما مقام تھے۔ ایک میرین ڈرائیو اور دوسرا انسٹپ واک۔ اول الذکر کے آس پاس تو اب خوشنما مکانات اور بنگلے بن گئے ہیں اور یہ حصہ نمائشی لحاظ سے ایک چھوٹے پیمانے پر فرانس کے جنوبی ساحل کا مقابلہ کرتا ہے۔ موخر الذکر ابھی تک اپنے نام کے مطابق خاموش طبع افراد کیلئے چلنے پھرنے اور مناظر قدرت پر غور و فکر کرنے کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے تمام عرصہ قیام میں موسم بہت خوشگوار رہا۔ بارش بالکل نہیں ہوئی نہ سردی کا کوئی احساس ہوا اور ہم جی بھر کر چل پھر سکے۔ فالحمدللہ۔ ٹارکی سے لندن واپسی کا سفر دن کے وقت ہوا اور ہم انگلستان کے دیہاتی مناظر کا خوب لطف اٹھا سکے۔ دو عالمی جنگوں کی وجہ سے انگلستان کی معاشرت اور بود و باش میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا ہے۔ اور جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے بعض خوشگوار پہلو بھی ہیں۔ لیکن دیہاتی مناظر آج بھی ویسے ہی دلکش ہیں اور میرا دل ان سے لطف اندوز ہونے سے کبھی نہیں بھرتا۔

لندن چونکہ انگلستان کا تجارتی اور مالی مرکز تھا بعد میں برطانیہ کا۔ پھر تمام برطانوی مملکت کا اور انیسویں صدی میں ساری دنیا کا مرکز بنا۔ اور ۱۹۱۴ء تک اس حیثیت کا مالک رہا) اسلئے اپنی اس حیثیت کی حفاظت کی خاطر قرون وسطی اسے شاہی اقتدار اور اختیارات کو محدود اور پابند کرنا پڑا

ان حد بندیوں کی جھلک ابتک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ چنانچہ ابتک یہ رسم ہے کہ جب بادشاہ یا ملکہ اپنی تخت نشینی کے بعد پہلی مرتبہ شہر کے اندر جائیں تو ٹمپل بار پر جو ابتدائی ایام میں لندن شہر کی حدِ فاصل تھی لارڈ میئر ان کا استقبال کرتے ہیں اور بادشاہ یا ملکہ اپنی طرف سے شہر کے حقوق اور مراعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد لارڈ میئر انہیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ رسم ان دنوں کی یادگار ہے جب بادشاہ یا ملکہ لارڈ میئر کی دعوت کے بغیر شہر میں داخل نہیں ہوسکتے تھے

آسکر برنلر سے پہلی ملاقات | ہر سال نو نومبر کے دن لارڈ میئر کا جلوس شہر کی طرف نکلتا ہے جو واپسی پر کنگز کالج کے قریب سے گذرتا ہے۔ کالج کی عمارت سمرسٹ ہاؤس کا ہی حصہ ہے جو کسی زمانے میں شاہ ایڈورڈ ششم کے ماموں ڈیوک آف سمرسٹ کا محل تھا۔ کالج کا جو پھاٹک اب استعمال ہوتا ہے وہ تو سٹرینڈ میں ہے لیکن اس کا ایک پرانا پھاٹک دریا کی طرف بھی ہے۔ کالج کے پرنسپل صاحب کے رہائشی حصے کا رخ بھی دریا کی طرف ہے۔ اس چبوترے کے عین نیچے سے لارڈ میئر کا جلوس گذرتا ہے ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء کے دن کنگز کالج کے پرنسپل صاحب ریورنڈ آرتھر ہیڈلم نے جو بعد میں بشپ آف گلوسٹر ہوئے چند طلباء کو اپنے مکان کے چبوترے سے لارڈ میئر کا جلوس دیکھنے کی دعوت دی جلوس کے گذر جانے کے بعد پرنسپل صاحب نے مہمانوں کی جن میں یہ طلباء بھی شامل تھے مکان کے اندر چائے، کافی، کیک وغیرہ سے تواضع کی۔ مجھے بھی پرنسپل صاحب کی طرف سے دعوت تھی۔ جلوس دیکھنے اور چائے وغیرہ سے پانچ بجے تک فراغت ہوگئی۔ میں پرنسپل صاحب کے مکان سے نکل کر کالج کی طرف جارہا تھا کہ میری ملاقات ایک سیلون کے رہنے والے طالب علم سے ہوگئی جن کے ساتھ میری شناسائی ہوچکی تھی۔ ان کا نام مسٹر ارونا چالم تھا وہ انجنیئرنگ کے آخری سال میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ وہ بھی پرنسپل صاحب کے مکان سے نکلے تھے انہوں نے دریافت کیا تمہاری آج کسی لیکچر میں حاضری ہے ؟ میں نے کہا چھ بجے ایک لیکچر میں جانا ہے۔ انہوں نے کہا ابھی کچھ دیر تو تم فارغ ہو قریب ہی انڈیا کلب ہے ہم وہاں جارہے ہیں تم ہمارے ساتھ چلو چھ بجے کالج واپس آجانا۔ ان کے ساتھ دو اور یورپین طالب علم تھے۔ ایک ان کے ہم جماعت تھے جو انگریز تھے اور دوسرے ایک جرمن جو انجنیئرنگ کے پہلے سال میں تھے۔ میں ان کے ساتھ ہولیا اور ہم کلب چلے گئے جو دراصل ایک عیسائی مشنری سوسائٹی کا ادارہ تھا۔ لیکن طلبا کو یہاں کچھ سہولتیں میسر تھیں ہماری غرض وہاں صرف فارغ وقت کا کچھ حصہ گذارنے کی تھی۔ چنانچہ ہم نے نصف گھنٹہ یہاں گذارا۔ اس اثناء میں دونوں سنیئر طالب علم تو آپس میں باتیں کرتے رہے اور میں اور جرمن طالب علم خاموش بیٹھے رہے۔ شاید اس وجہ سے مجھے اپنے خاموش ساتھی سے کچھ ہمدردی محسوس ہوئی یا یہ وجہ ہو کہ وہ بھی

لندن میں نووارد تھے اور میں بھی نووارد تھا اور ہم دونوں غیر ملکی تھے۔ جب ہم کلب سے نکل کر کالج کے پھاٹک پر واپس پہنچے اور ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو میں نے ان کا نام اور پتہ دریافت کر لیا۔ دوسرے دن میں نے انہیں خط لکھا اور آئندہ بدھ یا جمعہ یا ہفتہ کے دن اپنے ہاں چائے نوشی کی دعوت دی۔ ان تین دنوں میں مجھے لیکچروں سے فراغت تھی بدھ اور جمعہ گذر گئے نہ وہ تشریف لائے نہ انکی طرف سے کوئی اطلاع ہی ملی۔ میں نے خیال کیا شاید خط پر نام یا پتہ ٹھیک نہ لکھا گیا ہو اور میرا خط انہیں نہ ملا ہو۔ ہفتے کے دن تک یہ بات میرے ذہن سے بھی نکل چکی تھی۔ اس دن سہ پہر کو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور میں اپنے کمرے میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ خادم نے دروازے پر دستک دیکر دروازہ کھولا اور کہا ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے ٹوپی سے جو ان کے ہاتھ میں تھی اور اوورکوٹ سے جو وہ پہنے ہوئے تھے پانی گر رہا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا کوٹ اور ٹوپی ان سے لیکر لٹکا دیئے اور میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے ۔ "مجھے تو آج آپ کے آنے کی توقع نہیں تھی" جب وہ آرام سے بیٹھ گئے تو انہوں نے بتایا کہ انہیں میرا خط مل گیا تھا گو اس پر ان کا نام صحیح نہیں لکھا ہوا تھا۔ بدھ اور جمعہ کے دن تو وہ نہ آسکتے تھے کیونکہ انہیں لیکچر میں جانا ہوتا ہے۔ ہفتے کی سہ پہر ان کا ارادہ تھیٹر جانے کا تھا۔ انہوں نے ٹکٹوں کے لئے کہا ہوا تھا اور توقع تھی کہ اگر کسی نے پہلے سے خریدے ہوئے ٹکٹ واپس کر دیئے تو انہیں مل جائیں گے۔ لیکن انہیں اطلاع ملی کہ ٹکٹ ملنے کی کوئی امید نہیں لہٰذا ہفتہ کی سہ پہر فارغ ہو گئی۔ مگر مجھے اطلاع دینے کا وقت نہیں رہا تھا (ان ایام میں بہت شاذ کسی پرائیویٹ مکان میں ٹیلیفون ہوا کرتا تھا) کہنے لگے مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ دعوت کس کی طرف سے آئی ہے۔ اگرچہ خط میں تم نے اپنا نام اور پتہ تو لکھ دیا تھا لیکن جب ہماری ملاقات ہوئی تھی اس دن تم نے میرا نام اور پتہ تو دریافت کر لیا تھا لیکن اپنا نام مجھے نہیں بتایا تھا۔ میرا ذہن تو تمہارا خط پڑھنے پر اس طرف جاتا تھا کہ یہ خط تمہاری طرف سے ہوگا۔ لیکن یہ محض قیاس تھا۔ آخر میں نے خیال کیا کہ چل کر دیکھیں کون صاحب ہیں۔ ان کے اپنے کوائف یہ معلوم ہوئے۔ پورا نام آسکر برنلر فرائی ہر فان آلسن ان کے والد میکسیکو میں جرمنی کے سفیر رہ چکے تھے۔ خاندانی وطن جرمنی کے شمالی صوبے میں تھا۔ اپنے صوبے کے موروثی شرفاء میں سے تھے۔ باپ کے اکلوتے بیٹے تھے لیکن چار بہنیں تھیں، والدہ فرانسیسی نژاد تھیں اسلیئے مادری زبان فرانسیسی تھی اور گھر میں فرانسیسی ہی بولی جاتی تھی۔ اسلئے بھی کہ ان دنوں رہائش برسلز میں تھی جہاں ان کے والد کا صنعتی اور حرفتی کاروبار تھا۔ جرمنی میں انجنیرنگ کی تعلیم کے لئے اس لئے نہیں گئے تھے کہ وہاں داخلے کے لئے جو امتحان پاس کرنا ضروری تھے وہ انہوں نے جرمنی

سے باہر رہائش ہونے کی وجہ سے پاس نہیں کئے تھے۔ لندن داخلہ مل سکتا تھا اسلئے یہاں آگئے اور لندن پرسلیبز سے کچھ دور بھی نہیں تھا۔ یہ سب تفاصیل بیک وقت نہیں بلکہ دو تین ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوئیں۔ انہوں نے اپنے خاندانی رتبے کا خود کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور مجھے بھی کوئی ایسی دلچسپی ان امور سے نہیں تھی۔ ہماری واقفیت کو شروع ہوئے چار پانچ مہینے ہو چکے تھے اور ملاقاتوں اور خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا کہ ایک صبح ڈاک آنے پر مسٹر باؤشر (جو اس وقت تک مسز فائٹرن کے ہاں آکر مقیم ہو چکے تھے) نے جاکر ڈاک دیکھی اور میرے خط لاکر مجھے دیدیئے۔ ان میں ایک خط آسکر کا بھی تھا۔ جب میں وہ خط پڑھ چکا تو مسٹر باؤشر نے کہا یہ لفافہ مجھے دکھاؤ۔ میں نے انہیں لفافہ دیدیا۔ اس کی پشت پر ایک کرسٹ تھی اور اس کے نیچے حروف وی لے تھے۔ مسٹر باوشر نے کچھ حیرانی سے پوچھا تمہیں معلوم ہے کہ مسٹر ٹیرنلر فرائی ہرہیں؟ میں نے پوچھا وہ کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا جرمن نوبلٹی کا ایک درجہ ہے جیسے انگلستان میں وائی کونٹ۔

پہلے دن جب آسکر ہمارے ہاں آئے اور دراصل یہی ہماری پہلی ملاقات تھی تو انہوں نے میرے حالات بھی دریافت کئے۔ اور یہ بھی دریافت کیا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ میں نے بتلایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جواب سے انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ بعد میں میں نے ان سے اس سوال کی وجہ معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ میں یہودیوں کا مداح نہیں اور میں اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ تم مذہباً یہودی تو نہیں۔ وہ قریباً دو گھنٹے ٹھہرے اور یہ معلوم کر کے کہ منگل اور جمعرات کو میرے لیکچر کنگنز کالج میں چھ بجے شام شروع ہوتے ہیں انہوں نے کہا میرا آخری لیکچر پانچ بجے ختم ہوتا ہے۔ اور مجھے کچھ دیر لائبریری میں کام کرنا ہوتا ہے۔ تم چھ بجے سے کچھ پہلے پہنچ جایا کرو اس طرح ہمیں ہفتے میں دو بار چند منٹوں کے لئے کالج میں ملنے کا موقعہ مل جایا کریگا۔ ہفتے یا اتوار کے دن اور بعض دفعہ دونوں دن وہ مجھے ملنے کیلئے ہمارے مکان پر آجاتے۔ ان کی دوستی اور رفاقت میرے لئے ایک نعمت تھی۔ وہ میرے قیام انگلستان کے عرصہ میں میرے لئے ایک نہایت شفیق بھائی ثابت ہوئے۔ بخزاء الله فی الدّارین خیرا وہ اللهم ارزقنی جلیساً صالحاً (اے اللہ مجھے صالح ہمنشیں عطا فرما) کی قبولیت کا عملی ثبوت تھے۔ دوستی کا جو عہد انہوں نے ۱۹۱۱ء میں باندھا اسے آخر تک نبھایا۔ یہ عرصہ چالیس سال سے کچھ اوپر تھا۔

چودھری شمشاد علی صاحب کے متعلق میرا ایک خواب

شروع جنوری ۱۹۱۲ء میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ کسی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ دیا ہے۔ جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ شمشاد علی خاں جس کی ذات کے ساتھ اتنی امیدیں وابستہ تھیں ۱۶ رماہ حال کو چل بسا۔ اسے نوٹ کرلیں

اس میں بہت سے نشان ہیں"۔ چنانچہ میں نے یہ خواب ایک نوٹ بک میں درج کر لیا۔ چودھری شمشاد علی خاں صاحب کا خط مجھے ہر دوسرے ہفتے باقاعدہ آیا کرتا تھا۔ اب کچھ پریشانی کے ساتھ ان کے خط کا انتظار رہنے لگا۔ جب ان کا ۱۶ ؍جنوری کے بعد کا لکھا ہوا خط مجھے مل گیا (ان دنوں لاہور سے لندن ڈاک ۱۶-۱۷ دن میں پہنچتی تھی) تو کچھ اطمینان ہوا۔

بورنمتھ کی سیر | اپریل ۱۹۱۲ء میں ایسٹر کی تعطیلات میں مسٹر باڈش اور میں بورنمتھ گئے جو جنوبی ساحل پر ایک بہت خوشنما شہر ہے۔ لندن سے بورنمتھ تک قریب ایک سو میل کا فاصلہ ہے۔ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اپنے ٹھہرنے کا انتظام ایک بورڈنگ ہاؤس میں کر لیا تھا جس کا نام سلور ہو تھا اور جو ویسٹ کلف گارڈنز میں واقعہ تھا۔ دو بڑے مکانوں کو اندر سے ملا کر ایک مکان بنا لیا گیا تھا۔ قریب چالیس۴۰ افراد کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ مجھے اور مسٹر باڈش کو ایک بڑا کمرہ مل گیا تھا جو خاصہ فراخ تھا اور جس میں ہم بہت آرام سے رہے۔ یہ کمرہ تیسری منزل پر سامنے کی طرف تھا اور گو مکان لب ساحل نہیں تھا لیکن ہمارے کمرے سے سمندر کا نظارہ صاف نظر آتا تھا۔ بلکہ میرے پلنگ سے لیٹے لیٹے بھی سمندر نظر آتا تھا۔ بورنمتھ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت پسندیدہ مقام سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو فاصلہ لندن سے زیادہ نہیں۔ واٹرلو سٹیشن سے ریل دو گھنٹوں میں بورنمتھ پہنچا دیتی تھی۔ دوسرے سمندر کی جانب ایک سلسلہ ٹیلوں کا ہے جن کے نیچے رتیلا ساحل ہے۔ ٹیلوں پر اور ساحل کے ساتھ ساتھ سیر کے لئے کھلی جگہ ہے۔ جس کی وجہ سے سیر کیلئے آنیوالوں کی کثرت کے اوقات میں بھی بھیڑ کا احساس نہیں ہوتا۔ تیسرے شہر کے بیچوں بیچ خاصے فاصلے تک باغات کا ایک سلسلہ چلا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سیر کے مقامات میں ایک قسم کا تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے سردیوں میں موسم اعتدال پر رہتا ہے اور دھوپ کے اوقات کی اوسط دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ ہے۔

ہمارے قیام کے دوران موسم یہاں بھی خوشگوار رہا۔ دو تین بار مسٹر باڈش اور میں بائیسکل کرائے پر لیکر نیو فارسٹ کی سیر کو گئے۔ ایک دن ہم نے ناشتے کے بعد اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک ۴۴ میل سفر بائیسکلوں پر کیا۔ واپسی پر میں نے مسٹر باڈش سے کہا مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پیا تو ہے لیکن پیاس بجھی نہیں وہ باورچی خانے سے ایک پلیٹ میں دو ٹماٹر لے آئے اور کہا یہ کھالو۔ ان کے کہنے پر پہلی بار میں نے کچا ٹماٹر کھایا جس سے میری پیاس جاتی رہی۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کی گھنٹی ہوئی اور ہم کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ کھانا ختم ہونے کے قریب آیا لیکن میں ابھی سیر نہ ہوا تھا۔ مسٹر باڈش کی نشست میرے ساتھ ہی تھی میں نے آہستہ سے انہیں کہا میں تو ابھی سیر نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا سامنے پنیر مکھن اور روٹی رکھے ہیں جسقدر چاہو کھاؤ

میں نے پہلی بار پنیر اسدن کھایا۔ اس کے بعد تو جب موقعہ ہوتا اور اشتہا ہوتی خوب شوق سے کھاتا۔ ایک دن ہم دوپہر کے کھانے کے بعد بائیسکلوں پر سیر کیلئے نکلے نیو فارسٹ میں چائے کا وقت ہوگیا۔ ایک جھونپڑا نظر آیا جو سڑک سے کچھ فاصلے پر تھا۔ ہم وہاں چلے گئے۔ کھڑکی کے اندر "چائے مل سکتی ہے" کا اعلان لٹک رہا تھا چائے کے ساتھ کھانے کیلئے مکھن روٹی اور گھر کا بنا ہوا سٹابری جیم تھا۔ شاید کیک بھی ہوگا۔ لیکن اس مکھن روٹی اور سٹابری جیم کا مزہ میں اب تک نہیں بھولا۔ بھوک اور پھر صحت کے زمانے کی بھوک ہر شے کو لذیذ بنا دیتی ہے۔ میری عمر اسوقت ۱۹ سال تھی اور ذیابیطس کے ساتھ میرا التعارف ربع صدی بعد ہوا۔ جب ذیابیطس کے پرہیز عاید ہوگئے تو اس کے بعد میری طبیعت کبھی ان چیزوں کیلئے نہیں للچائی جن کا کھانا پینا میرے لئے ممنوع اور غیر طیب ہوگیا۔ بلکہ کبھی انکی طرف مائل بھی نہیں ہوئی۔ فالحمدللہ۔ اب تو پرہیز کا دائرہ اور بھی وسیع اور طیبات کا حلقہ اور بھی محدود ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی اتنا وسیع ہے اور اتنی نعمتیں میسر ہیں کہ کبھی محرومی کا احساس نہیں ہوا اور ہر لقمے کے ساتھ شکر و امتنان کے جذبات کا ہجوم ہوتا ہے۔

جہاز ٹائی ٹینک کی تباہی | ہم ابھی بورنمتھ میں ہی مقیم تھے کہ ٹائی ٹینک جہاز کے پہلے سفر پر روانگی کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ اس جہاز کی بہت شہرت ہوچکی تھی یہ جہاز اس وقت دنیا کا سب سے بڑا جہاز تھا۔ ہر قسم کے آرام بلکہ تعیش کے سامانوں سے آراستہ تھا۔ اس کے متعلق دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس کی ساخت میں ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کی گئیں ہیں کہ یہ غرق ہونے سے محفوظ رہے گا۔ یہ بھی توقع تھی کہ ساؤتھمپٹن اور نیویارک کے درمیان تیز رفتاری کا سہرا بھی اس کے سر رہے گا۔ بعد میں اندازہ کیا گیا کہ یہی ہوس غالباً اس کے غرق ہونے کا باعث ہوئی۔ بہت سے مشاہیر امراء، شرفاء اور فضلاء اسکے مسافروں میں شامل تھے۔ اس کے سب سے نچلے حصے کو جو پانی کے اندر تھا اس طور پر علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا کہ اگر کسی ایک حصے کو کوئی نقصان پہنچے تو اسے فوراً باقی حصوں سے علیحدہ سر بمہر کر دیا جائے۔ تا کہ بغیر کسی دوسرے حصے پر اثر پڑنے کے اس حصے کی مناسب مرمت کرائی جاسکے اور اس اثناء میں جہاز کے بقیہ حصوں اور اس کی رفتار پر کوئی مخالف اثر نہ پڑے۔ بورنمتھ سے تماشائیوں کا ایک جہاز ساؤتھمپٹن اس جہاز کی روانگی کا منظر دیکھنے گیا۔ اس دن کے اخبارات اس جہاز کے مختلف عرشوں اور ان پر مہیا شدہ آسائشوں کی عکسی اور لفظی تصاویر سے پر تھے۔ مسٹر باؤش اور میں ساؤتھمپٹن تو نہ گئے۔ لیکن جو کچھ اخباروں میں چھپا ہم نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔ ٹائی ٹینک پر سفر کرنے والے مسافر تو انگلستان کے سب علاقوں سے تھے۔ "وائٹ سٹار لائن" یعنی جہاز کی مالک کمپنی کے ایک ڈائرکٹر مسٹر ایمری بھی ان میں شامل تھے۔ لیکن عملے میں کثرت بورنمتھ

سوتھیمپٹن اور پورٹ سمتھ کے قریب کے شہروں اور علاقے کے لوگوں کی تھی جو سینکڑوں کی تعداد میں تھے ٹائی ٹینک نے لنگر اٹھایا اور سوتھیمپٹن کی بندرگاہ میں جتنے جہاز اس وقت لنگر ڈالے تھے سب نے سلامی کے بگل بجائے۔ اور نعروں اور شادیانوں کے فلک شگاف شور میں یہ بدقسمت جہاز اپنے پہلے اور آخری سفر پر روانہ ہوا۔ اس شام اور دوسری صبح کے اخبار اس کی روانگی کی خبروں اور تصویروں سے پُر تھے۔ صبح کی اخباروں میں اس کی رفتار اور مختلف مقامات سے گذرنے کی خبریں تھیں۔ تین دن تک ہر اخبار میں اس عروس البحر کے سمندر کی لہروں پر خرام ناز کی خبریں متواتر چھپتی رہیں۔ اور دنیا اسکی ہر حرکت سے مطلع ہوتی رہی۔ نصف سے زیادہ سفر طے ہو چکا تھا اور ٹائی ٹینک ہر ساعت امریکہ کے ساحل کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ موسم بہار تھا۔ اس موسم میں شمالی برفانی سمندروں سے برف کے پہاڑ کے پہاڑ گرم پانیوں کی طرف بہتے آتے ہیں۔ اس لئے یورپ سے شمالی امریکہ جانے والے جہاز بجائے سیدھے کینیڈا یا نیویارک کا رخ کرنے کے جنوب کی طرف حلقہ ڈال کر اپنی مقصود بندرگاہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ بعد میں جو تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا وہ اس امر کے متعلق کسی پختہ فیصلے پر نہ پہنچ سکا کہ ٹائی ٹینک نے جنوبی حلقے کا رستہ کیوں نہ لیا۔ اور کیوں نسبتاً سیدھی سمت میں نیویارک کی طرف بڑھتا گیا۔ غرض تو واضح تھی کہ سفر کو لمبا نہ کیا جائے اور ٹائی ٹینک تیز رفتاری کا سہرا جیت لے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سیدھا شمالی رستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کپتان سمتھ نے اپنی ذمہ داری پر کیا تھا یا مسٹر امیری کی ہدایت پر کپتان سمتھ نے تو ٹائی ٹینک کی گود میں ہی سمندر میں دفن ہونا پسند کیا۔ اسلئے وہ تو کمیشن کے رُوبرو آئے نہیں۔ مسٹر امیری کو سمندر کی لہروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ شہادت میں پیش ہوئے۔ اتنا تو انہوں نے تسلیم کیا کہ ان کی خواہش تھی کہ ٹائی ٹینک تیز رفتاری کا سہرا جیت لے اور انہوں نے کپتان سمتھ سے اس خواہش کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن شمالی رستے کے اختیار کرنے کے متعلق انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چوتھے روز دفعتاً یہ خبر سنی گئی کہ رات کے پچھلے پہر میں ٹائی ٹینک ایک برف کے ٹیلے کے ساتھ ٹکرا کر نصف گھنٹے کے اندر غرق ہو گیا۔ جلد ہی اس دہشتناک خبر کی تصدیق ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت ٹکر ہوئی جہاز پوری رفتار پر جا رہا تھا برفانی ٹیلے کے بالکل قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹکر ناگزیر ہے۔ اس وقت کوئی حیلہ کارگر نہ ہو سکتا تھا جب ٹکر ہوئی تو برفانی ٹیلے کی نوک نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاز کا پیٹ چاک کر دیا۔ تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جان بچانے والی کشتیوں کی جتنی تعداد قانوناً لازم تھی اس سے بہت کم کشتیاں جہاز پر موجود تھیں۔ اور رات کے اندھیرے اور اچانک آفت میں گرفتار ہو جانے سے جو سراسیمگی پھیل گئی اس میں کئی کشتیاں غرق ہو گئیں۔ غرض یکایک ایک قیامت برپا ہو گئی

جہاز کے بینڈ والوں نے جب دیکھا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تو بینڈ پر "NEARER MY GOD TO THEE" کی دھن بجانا شروع کر دی اور اسے بجاتے بجاتے جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہ میں چلے گئے۔ ٹائی ٹینک کے غرق ہونے کی خبر پہنچتے ہی پورٹسمتھ میں ایک کہرام مچ گیا۔ پورٹسمتھ سے پورٹ سمتھ تک کے سب شہروں قصبوں اور دیہات میں بیشمار گھروں میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ اتوار کے دن سب گرجوں میں اسی موضوع پر وعظ ہوئے۔ یہ حادثہ ایسا المناک تھا کہ سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہمارے لندن واپس آنے کے بعد بھی چند دن یہی تذکرہ رہا کرتا تھا۔ مس پارسنز نے ذکر کیا کہ جب ان کے والد نے یہ خبر سنی تو کہا "ہوں یہ دعویٰ کہ ایسا جہاز کبھی غرق نہیں ہو سکتا! یہ تو خدا کو آزمانا ہوا بھلا خدا بھی آزمایا جا سکتا ہے"۔ بعد میں کئی بار مجھے پورٹسمتھ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ گو پھر کبھی سلور ہو میں ٹھہرنے کا موقعہ نہیں ہوا۔ اکثر "چائن ہوٹل" میں ٹھہرتا رہا ہوں جو PIER سے کچھ ہٹ کر بلندی پر واقع ہے جس کے کھانے کے کمرے اور لونج سے سمندر کا نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے آخر یا نومبر کے شروع میں مَیں دہلی میں تھا کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ نظارہ ایک جھلک کی طرح ذہن سے گذرا گویا عزیز انور احمد اور میں چائن ہوٹل کے لانج میں سمندر کی جانب کھڑکی کے پاس بیٹھے ہیں اور دوپہر کے کھانے کے بعد قہوہ پی رہے ہیں اور سمندر کا نظارہ بھی کر رہے ہیں۔ سمندر بالکل ساکن معلوم ہوتا ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ اور سورج کی روشنی کا عکس سمندر پر بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ میں نے عزیز انور احمد سے اس عجیب واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ جنگ کا زمانہ ہے اور بظاہر کوئی ایسا امکان تو نظر نہیں آتا کہ مستقبل قریب میں ہمیں اس ہوٹل میں جانے کا اتفاق ہو لیکن اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ قریباً ایک ماہ بعد یعنی ۳ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو عین ایسا ہی ہوا۔ ہم دونوں چائن ہوٹل پورٹسمتھ میں لنچ کے بعد لونج میں سمندر کی جانب کھڑکی کے پاس بیٹھے قہوہ پی رہے تھے اور سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ سمندر بالکل ساکن نظر آتا تھا۔ سورج چمک رہا تھا اور روشنی کا عکس پانی پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ فسبحان اللہ العلی العظیم۔

مسٹر جان لیوئیس جلینز سے پہلی ملاقات | مجھے ابھی لندن پہنچے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ اوائل اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ایک سہ پہر جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مکان کے باہر والی گھنٹی بجی اتفاق سے میں نے ہی دروازہ کھولا۔ ایک صاحب جو عمر میں مجھ سے ۵ - ۶ سال بڑے معلوم ہوتے تھے بائیسکل سنبھالے کھڑے تھے۔ مجھ سے پوچھا مسٹر خان گھر پر ہیں؟ میں نے کہا میں ہی ہوں آپ اندر تشریف لایئے ان کا نام جان لیوئیس جلینز تھا اور وہ ویزلین کالج رچمنڈ میں میتھوڈیسٹ فرقے کا پادری بننے کیلئے

تعلیم پا رہے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ میرا نام اور پتہ انہیں ۲۱ کرومویل روڈ سے بھیجا گیا تھا اور خواہش کی گئی تھی کہ وہ وقت نکال کر مجھ سے ملیں کیونکہ میں انگلستان میں ایک نووارد ہندوستانی طالب علم ہوں جس کی ابھی یہاں کسی سے واقفیت نہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری خاطر اس قدر تکلیف خصوصاً ایسے موسم میں گوارا فرمائی۔ چائے کا وقت قریب تھا۔ انہوں نے چائے کیلئے ٹھہرنا منظور کیا۔ ان سے معلوم ہوا ان کے والدین لندن کے شمال کی طرف بارنٹ میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے کالج کا پتہ اور مقام بتایا اور مجھے چائے کی دعوت دی۔ تاریخ مقررہ پر میں رچمنڈ گیا۔ مسٹر جلینز مجھے اسٹیشن پر مل گئے۔ اسٹیشن سے ان کے کالج کا فاصلہ ایک میل سے زائد تھا اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ ان دنوں چھتری کا بہت کم رواج تھا۔ شہر میں کام کرنے والے چھتری استعمال کرتے تھے۔ باقی لوگ سردیوں میں اوور کوٹ تو اوڑھتے ہی تھے سر پر بولر ٹوپی پہننے کا رواج تھا۔ اس ٹوپی پر چھ مہینے بارش پڑتی رہے تو بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ گرمیوں میں ہر شخص (واٹر پروف) کوٹ اپنے بازو پر ڈالے گھر سے نکلتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے کوٹ کے بٹن گلے تک بند کر لیئے اور چھڑیاں ہاتھ میں لئے کالج کی طرف چل پڑے آخری نصف میل رچمنڈ ہل کی چڑھائی تھی اور بارش کی شدت تیز چلنے پر مجبور کرتی تھی۔ ہم نے یہ سارا فاصلہ گویا ڈبل مارچ کر کے طے کیا۔ ان کا کمرہ خاصا آرام دہ تھا انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی کوٹ تو ہم نے لٹکا دیئے اور کرسیاں آگ کے سامنے کھینچ کر آرام سے بیٹھ گئے۔ چائے کے ساتھ ان کے گھر سے آیا ہوا کیک بھی تھا۔ باوجود بارش میں مارچ کرنے کے ہمارا وقت بہت دلچسپی میں گذرا۔ چائے کے بعد مسٹر جلینز نے مجھے کالج کے بعض حصے دکھائے۔ میری واپسی کے وقت تک بارش تھم گئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور جب تک مسٹر جلینز کالج میں رہے دو تین بار سال میں ہمارے ہاں آتے رہے اور میں ان کے کالج میں جا کر انہیں ملتا رہا۔ مجھے جب بلاتے تو لکھتے کہ گھر سے کیک آیا ہے تم فلاں دن آجاؤ تو خوب ہو۔ مجھے کیک کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ لیکن وہ اکرام ضیف کے طور پر ایسا لکھ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں اور ۱۹۱۳ء کی گرمیوں میں میں ان کے ہاں بارنٹ بھی گیا۔ ان کے والدین اور بہنیں بہت تپاک اور تواضع سے پیش آتے رہے۔ ان دنوں ابھی بجلی کی ریل بارنٹ تک نہیں جاتی تھی۔ گولڈرز گرین سٹیشن سے بس پر جانا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ تیز بارش ہو رہی تھی (شائد مسٹر جلینز کے ساتھ بارش کو خاص رابطہ تھا) بس کے اوپر کے عرشے پر چھت نہیں ہوا کرتی تھی۔ دستور تھا کہ بارش کے وقت خواتین نیچے بیٹھیں تا کہ بارش

سے محفوظ رہیں اور مرد اوپر بیٹھیں اور بارش کا لطف اٹھائیں۔ اوپر بارش سے حفاظت کا صرف اتنا سامان ہوا کرتا تھا کہ بدن کے نچلے حصے کو ڈھانکنے کیلئے چمڑے کے ایپرن ہوا کرتے تھے۔ اوپر کے حصے کی حفاظت اور کوٹ اور لولر ٹوپی کیا کرتے تھے۔ ہمارا سفر ایک گھنٹے کے قریب تھا۔ سارا وقت تیز بارش ہوتی رہی۔ ان کے گھر پہنچنے پر ہمیں اپنے کپڑے جو بھیگ چکے تھے اتار کر مطبخ میں لٹکانے پڑے ایک دن ہم بارنٹ سے سینٹ البنز گئے وہاں ایک مشہور ایبے ہے۔ اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہم ان کے ہاں سے دوپہر کا کھانا کھا کر روانہ ہوئے۔ میں نے وضو کر لیا تھا۔ ہم لبس پر اوپر کے عرشے کی دائیں طرف کی سب سے اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ جب نماز کا وقت ہوا تو میں نے جیک سے کہا میں اب نماز پڑھوں گا اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے نماز ادا کی۔ کئی سال بعد انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ اس بات سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ۱۹۱۳ء کے آخری مہینوں میں انہیں "ماراز یون" (کارنوال) میں بطور میتھوڈسٹ پادری مقرر کیا گیا۔ اس سال کرسمس کی تعطیلات میں میں فالموتھ (کارنوال) گیا۔ جیک نے لکھا تم فالموتھ کے قیام کے بعد دو تین دن میرے پاس بھی ٹھہرو۔ چنانچہ فالموتھ سے میں ان کے پاس چلا گیا "ماراز یون" سے سب سے قریب کا ریلوے اسٹیشن تین میل کے فاصلے پر تھا۔ لندن واپسی کیلئے مجھے بہت سویرے ریل پر سوار ہونا تھا۔ پہلی رات ہم نے پروگرام طے کیا کہ صبح فلاں وقت تک تیار ہو کر ناشتہ کرینگے اور پھر پیدل روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے کہا میرا بیگ اٹھانے کیلئے ایک آدمی کی ضرورت ہوگی ابھی سے انتظام کر دینا چاہیئے۔ جیک نے کہا انتظام کر دیا ہے سال کا آخر تھا دن بہت چھوٹے تھے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہو گئے۔ میں نے جیک سے پوچھا آدمی آگیا ہے۔ انہوں نے کہا حاضر ہے اور میرا بیگ اٹھا لیا۔ میں نے خیال کیا مزدور دروازے کے باہر منتظر ہوگا۔ باہر آئے تو جیک نے اپنی موٹی چھڑی بیگ کے ہینڈل میں سے نکال کر بیگ کو اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ بیگ خاصا بوجھل تھا۔ میں نے اصرار کیا کہ یہی صورت ہے تو ہم باری باری بیگ کو اٹھانے چلیں لیکن انہوں نے ایک نہ مانی اور اسٹیشن تک اسی طرح بیگ کو اٹھائے چلے گئے۔ بعد میں جب کبھی مجھے انگلستان جانے کا اتفاق ہوتا میں جہاں کہیں ان کی تعیناتی ہوتی ان کے پاس جاتا۔ ان کی بیوی اپنی نہایت خلیق اور متواضع تھیں اور ہمیشہ بہت تپاک سے پیش آتی تھیں۔ جیک کو ہندوستان دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ اس سفر کے لئے موسم سرما موزوں ہوتا ہے لیکن ان کے فرائض کے مدنظر انہیں اس موسم میں رخصت ملنے کا امکان نہ تھا۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے رخصت کا انتظام کیا۔ پی اینڈ او جہاز کی کمپنی نے رعائتی شرح کرائے پر ان کے واپسی ٹکٹ کا انتظام کر دیا۔ ان کے عرصۂ قیام ہندوستان میں میں نے

ہر جگہ یہ انتظام کیا کہ انہیں کہیں بھی ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور میرے کسی دوست کے ہاں مہمان ہوں تاکہ وہ ہندوستان میں اسلامی معاشرے سے بھی کسی قدر واقف ہو جائیں۔ مسٹر جلینیز جب جنوبی اور وسطی ہند کی سیر کر چکے تو ہمارے پاس شملے آ گئے۔ کچھ دن وہاں ٹھہرنے کے بعد میں انہیں اپنے ساتھ پنجاب کشمیر اور صوبہ سرحد کی سیر کیلئے لے گیا۔ ان کی خواہش خالص دیہاتی علاقہ دیکھنے کی بھی تھی۔ چنانچہ میں انہیں اپنے ننہیال داتہ زید کا سیالکوٹ لے گیا۔ جمعہ کا دن تھا چونکہ بہت سے احباب ارد گرد کے مواضعات کے نماز جمعہ کیلئے تشریف لے آئے تھے اسلئے نماز کا انتظام بجائے مسجد کے درختوں کے سائے میں ایک کھلی جگہ میں کیا گیا۔ جیک کیلئے ایک طرف کرسی رکھدی گئی۔ نماز کے بعد انہوں نے کہا آج میں نے پہلی بار انسانوں کو اپنے رب کے حضور رکوع اور سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ ہماری عبادت میں تو سر جھکانا زیادہ سے زیادہ گھٹنے ٹیک دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔

کشمیر سے لوٹتے ہوئے ہم ایک رات اوڑی کے بنگلے میں ٹھہرے۔ شام کا کھانا کچھ تکلّف سے تیار کیا گیا تھا۔ شائد خانساماں کو اپنے فن کی نمائش منظور تھی۔ زردے میں زعفران تو استعمال کیا ہی گیا تھا اوپر سونے کے ورق بھی لگا دیئے گئے تھے۔ پادری صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ سونا بھی کھایا جاتا ہے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ ان کا قیاس تھا کہ یہ زردے کی طشتریاں سجاوٹ کیلئے میز پر رکھی گئی ہیں۔ لیکن جب ہم سب ساتھیوں کو کھاتے دیکھا تو خود بھی کھا لیا۔ کشمیر کے سفر میں کشمیری چائے بھی ان کے لئے ایک عجوبہ تھی۔ ایک دو گھونٹ پی لیتے تھے لیکن انہیں مرغوب نہیں تھی۔ دس ہفتے ہندوستان میں گذار کر واپس گئے۔ کیمرہ ساتھ لائے تھے پرانی عمارتیں اور باغات وغیرہ ان کے لئے بڑی دلچسپی کا موجب تھے۔ دلی اور آگرے کی شاہی عمارتیں تو ان کے لئے تعجب اور دلچسپی کا باعث ہوئیں۔ جو تصویریں انہوں نے اتاریں ان کے سلائڈ تیار کروائے۔ جہاں جہاں ان کی تعیناتی ہوتی سلائڈوں کے ذریعے اپنے حلقۂ احباب میں ہندوستان کے تمدن اور معاشرت میں دلچسپی پیدا کرتے۔ ان کی آخری تعیناتی نارتھمپٹن میں تھی۔ ریٹائر ہو کر وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی اور وہیں فوت ہوئے۔

ناروے کی سیر | ۱۹۱۲ء کی گرمیوں کی تعطیلات کے پہلے حصے میں میں ناروے گیا یہ سفر دس گیارہ دن کا تھا۔ میں ٹامس کک کی ایک زائرین کی پارٹی میں شامل تھا۔ ولسن لائن کے ایک جہاز پر سوار ہو کر برگن پہنچے اور وہاں گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرے۔ جہاز پر میری شناسائی مسٹر ڈابسن اور ڈاکٹر کورٹ سے ہو گئی تھی۔ اول الذکر ایک سولسٹر تھے مؤخر الذکر یارک شائر کے رہنے والے تھے اور ڈاکٹری

کی پریکٹس کرتے تھے۔ شام کے کھانے کے بعد ہم تینوں سیر کیلئے نکلے اور شہر سے باہر ایک جھیل کے کنارے بیٹھے کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ مجھے اس سے پہلے اتنی دور شمال کی طرف آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا یہ تو معلوم تھا کہ خطِ استوا سے شمالاً جنوباً جسقدر دور ہوتے جائیں اسی قدر گرمیوں میں دن لمبے اور سردیوں میں دن چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا کچھ تجربہ انگلستان میں ہو چکا تھا۔ ناروے میں دن انگلستان سے بھی لمبا تھا۔ اگرچہ ہم ناروے کے جنوبی حصے میں تھے اور یہ زمانہ پہلی عالمی جنگ سے پہلے کا تھا جب گرمیوں میں گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کر دینے کی رسم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی جولائی کے وسط میں رات کے وقت اندھیرا نہیں ہوتا تھا اور رات کی نیم روشنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا احساس جو مجھے اس شام ہوا یہ تھا کہ اگرچہ اندھیرا تو نہیں ہوتا لیکن شام کے بعد بالکل خاموشی ہو جاتی ہے۔ روشنی کے لحاظ سے طبیعت میں احساس ہوتا ہے کہ ابھی دن کا ہی عمل ہے اور خاموشی رات کی یاد دلاتی ہے۔ اس حالت میں آواز بہت دور دور تک سنائی دیتی ہے اور اس سے طبیعت میں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے معمول کے ماحول سے نکل کر ایک اجنبی ماحول میں آگئے ہیں

پردیس میں علالت | دوسرے دن فجر سے کچھ پہلے ہی مجھے طبیعت میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔ نیند کھلنے پر یہ بھی احساس ہوا کہ شاید بخار بھی ہے۔ میں نے اپنے آپکو بستر سے اٹھنے کے قابل نہ پاکر تھوڑی دیر تو انتظار کیا کہ عارضی تکلیف ہے تو شاید کچھ افاقہ محسوس ہونے لگے۔ لیکن بے چینی اور درجہ حرارت دونوں بڑھتے محسوس ہوئے۔ اس پر میں نے خادمہ کیلئے گھنٹی بجائی اور اس کے آنے پر اس سے کہا کہ میری طبیعت ناساز ہے۔ مہربانی سے مینیجر صاحب سے کہیں کہ وہ مجھ سے آکر مل لیں۔ وہ جلد آگئے اور میں نے اپنی کیفیت بیان کی۔ انہوں نے کہا ہوٹل میں ڈاکٹر موجود ہے۔ میں اسے فوراً بھیجتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب تھے تو نوجوان لیکن انہوں نے توجہ اور ہمدردی سے میرا معائنہ کیا اور نسخہ لکھا اور کہا میں دوائی بھجوا دوں گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور فیس ان کے حوالے کی۔ دوائی آنے پر میں نے حسب ہدایت دوائی کا استعمال شروع کر دیا۔ کچھ دیر تو مجھے بے چینی اور حرارت میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا بلکہ کچھ زیادتی ہی محسوس ہوئی۔ اس اثنا میں مسٹر ڈابسن اور ڈاکٹر کورٹ مجھے دیکھنے آئے اور ڈاکٹر کورٹ نے میرا معائنہ بھی کیا اور تسلی کے الفاظ کہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد علاوہ بے چینی اور بخار کی تکلیف کے مجھے شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا اور میرے خیالات کی رو کچھ یوں چلنے لگی:-

"پچھلے سال میں اپنے ماں باپ بہن بھائیوں دوستوں رفیقوں سے جدا ہو کر انگلستان آیا۔ بیشک وطن اور عزیزوں سے جدائی کا احساس تھا لیکن بفضل اللہ مجھے کوئی ایسی مشکل پیش نہ آئی جس سے میں

پریشان ہونا۔ فالحمدللہ۔ اپنے مطالعہ کے لحاظ سے میری رفتار تسلی بخش رہی ہے۔ سر ٹامس آرنلڈ میرے متعلق میرے والد صاحب کو ابھی رپورٹ بھیجتے رہے ہیں۔ والد صاحب ضرور مجھ سے خوش ہوں گے کہ میں اپنے وقت کا ٹھیک استعمال کر رہا ہوں۔ والدہ صاحبہ اپنی بے اندازہ محبت کی وجہ سے میرے لئے بہت دعائیں کرتی ہوں گی۔ حضرت خلیفۃ المسیحؓ میرے عریضوں کے جواب سے مجھ ناچیز کو نوازتے ہیں اور بہت ہی شفقت کے والا نامے ارسال فرماتے ہیں۔ اب میں انگلستان سے بھی آگے ایک اور ملک میں آگیا ہوں۔ میں نے ابتک حتی الوسع اسلام کے احکام کی پابندی کی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح کی ہدایات پر عمل پیرا رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ مجھے جہاز پر سردی لگ گئی ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ یا کل شام جھیل کے کنارے سردی لگ گئی ہو۔ لیکن میری طبیعت بہت بے چین ہے۔ معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ بخار تو مجھے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے لیکن یہ حالت تو کبھی نہیں ہوئی۔ سردی لگجانے سے نمونیہ کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے یہاں چند دن پڑے رہنا ہوگا اور میں آج شام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناروے کے فورڈز کی سیر کیلئے زائرین کے جہاز مائرا پر نہیں جاسکوں گا۔ پھر بیماری پر خرچ بھی ہوگا۔ ہوٹل کا، ڈاکٹر کا، دوائیوں کا، میرے پاس زیادہ روپیہ بھی نہیں پھر میں اکیلا ہوں۔ کوئی ہمدرد ساتھی نہیں۔ نمونیہ سے لوگ مرتے بھی ہیں، گھر بار، وطن، عزیزوں سے بہت دور کس مپرسی اور بیکسی کی موت ہوگی، ایک بھی تو جاننے والا پاس نہیں ہوگا، جہاں چاہیں گے اٹھا کر پھینک دینگے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی، میری ماں کو معلوم ہوگا تو ان کا کیا حال ہوگا، میں نے تو کبھی گھر خط لکھنے میں ناغہ نہیں کیا، اب خط نہ ملے گا تو پریشان ہونگی۔ میرے بیٹے نے پردیس جاکر اتنی جلدی مجھے بھلا دیا، وہ ایسا تو نہیں تھا معلوم نہیں کس مشکل میں پھنس گیا ہے، دعائیں کرینگی یا اللہ میرے معصوم پردیسی کی حفاظت کیجیو، پھر جب اطلاع ملے گی تو غم و اندوہ کے درمیان ایک گونہ حیرت بھی ہوگی، بھلا ولایت تو میں نے سنا ہوا ہے انگریزوں کا ملک ہے، یہ ناروے کیا ہے اور میرا بیٹا وہاں کیا کرنے گیا تھا، معلوم نہیں کسی نے اسے کیا کر دیا، آخر صبر کرکے بیٹھ جائیں گی۔ مجھ سے پہلے بچوں کی وفات پر صبر کیا تھا۔ اب اس پر بھی اللہ تعالیٰ صبر دیگا، ہاں مغفرت کی دعا کرتی رہیں گی اور درمیانی عرصہ خواہ کتنا لمبا ہو جائے آخر ملاقات ہوگی اور اس کے بعد جدائی نہ ہوگی، یہی حال میرے باپ کا ہوگا، منہ سے تو کچھ نہ کہیں گے لیکن حیران وہ بھی ہوں گے کہ ناروے جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی، خدا کی رضا کو وہ بھی صبر سے قبول کریں گے۔ بھائی ابھی چھوٹے ہیں اس خبر سے انہیں صدمہ تو ہوگا لیکن جلد بھول جائیں گے، اتنا یاد رہ جائے گا کہ ہمارا بڑا بھائی تعلیم کیلئے انگلستان گیا تھا ادھر ہی کہیں فوت ہو گیا، بہن اٹھارہ سال کی ہیں، وہ شائد زیادہ عرصہ یاد کرتی رہیں، شمشاد علی خان کو غم ہوگا، ایک باوفا دوست جدا

جدا ہوگیا۔ آسکر کو افسوس ہوگا ایک ایشیائی جو دوستی کے قابل تھا رخصت ہوگیا۔ میں گھر سے تعلیم کیلئے انگلستان آیا تھا ایک سال بھی پورا نہ کرنے پایا، تعلیم پوری کر لینا، واپس جانا، کامیاب بیرسٹر ہونا، شادی کرنا، بچے ہوتے، ان کی اچھی پرورش کرنا، نیک نام ہونا، پھر بوڑھا ہونا، پھر کیا؟ پھر بھی یہی ہونا جو آج سامنے نظر آرہا ہے، کوئی اتنا بڑا فرق تو نظر نہیں آتا کہ جو ایک دن ہو کر ہی رہنا ہے، وہ آج ہو یا پچاس سال بعد، بس اتنی ہی حقیقت ہے نا زندگی کی! تو اے اللہ میں تیری رضا پر راضی ہوں، ہاں تجھ سے اتنی عاجزانہ التجا ہے کہ تو میرے ماں باپ کے دل کی ڈھارس ہو جائیو، ان کی باقی اولاد کو ان کیلئے خوشیوں کا موجب بنائیو، اے اللہ میں تجھ سے راضی ہوں تو مجھ سے راضی ہو جائیو۔" جوں جوں میں اپنے تخیل میں اپنی عزیز ترین ہستیوں سے رخصت ہوتا گیا زندگی اور موت کی حقیقت اور قدر مجھ پر کھلتی گئی۔ میری بے چینی سکون سے بدلتی گئی۔ اس دو تین گھنٹوں کے عرصے میں جب یہ خیالات میرے دل و دماغ سے آہستہ آہستہ گذرتے رہے مجھے اپنی حالت پر ترس آیا نہ میرے دل میں کوئی حسرت پیدا ہوئی نہ کوئی آخری تمنا میرے دل میں اٹھی نہ ماں باپ اور عزیزوں کی یاد سے میری آنکھ تر ہوئی۔ میں ایک ایک سے رخصت ہوا اور جس جس سے رخصت ہوتا گیا پھر میرا خیال اس کی طرف نہیں لوٹا۔ آخر میں میں تنہا بے یار و مددگار بے کس اور بے بس اپنے رب کے حضور کھڑا ہو گیا اور میرے دل نے بغیر کسی تامل کے کہا۔ اے اللہ میں حاضر ہوں اور میں تیری رضا پر راضی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں آرام کی نیند سو گیا۔ شاید میں گھنٹہ بھر سویا ہوں گا۔ بیدار ہوا تو میں نہایت نحیف ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے بے چینی کا احساس تھا نہ بخار کا۔ میں آہستہ آہستہ بستر سے اٹھا منہ ہاتھ دھویا وضو کیا۔ نماز ادا کی پھر لیٹ گیا۔ پھر اٹھا اور سامان باندھنا شروع کیا۔ تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اسلئے تمام حرکات نہایت آہستہ اور حد درجہ کمزوری کی تھیں۔ سامان درست ہوا تو شام کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ نیچے گیا۔ لونج میں مسٹر ڈاپسن اور ڈاکٹر کورٹ مل گئے۔ تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھا۔ دونوں نے بہت اطمینان کا اظہار کیا کہ میں ان کے ساتھ سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر کورٹ نے کہا میں تمہارے متعلق متفکر تھا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تمہاری حالت اچھی نہ تھی۔ درجہ حرارت تو کچھ ایسا پریشان کن نہ تھا۔ لیکن تمہاری نبض بے تحاشا تیز اور موجب تشویش تھی۔ ہم تینوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ انہوں نے تو پورا کھانا کھایا اور میں نے شوربے اور پھل پر اکتفا کیا۔ ۹ بجے شب ہم جہاز پر پہنچ گئے اور میں نماز سے فارغ ہو کر آرام کی نیند سو گیا۔ فجر کو بیدار ہوا تو بفضل اللہ بیماری کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ جہاز "ناڈنگر فورڈ" میں لنگر ڈالے تھا۔ ناشتے کے بعد ہم اڈے کے قریب ایک آبشار دیکھنے گئے۔ جہاز پر واپس آنے تک میں بفضل اللہ اپنے آپ کو بالکل توانا اور تندرست محسوس کرتا تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

میری بیماری کا باعث سردی لگنا ہو یا کچھ اور۔ میری صحت کی بحالی کے مادی اسباب ڈاکٹر کی توجہ، انکی تجویز کردہ دوائی کی مناسبت اور نارفے کی ہوا کی صفائی ضرور ہوں گے۔ لیکن جیسے ہر بات کے روحانی اسباب بھی ہوتے ہیں میری بیماری اور بحالی صحت کے روحانی اسباب بھی تھے۔ اس واقعہ کو ۵۸ سال ہونے آئے اس لمبے عرصہ میں مجھے ان تمام مراحل سے گذرنا پڑا ہے جو انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ لیکن موت اور حیات کے مسئلے کے متعلق مجھے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی نہ میرا دل کبھی موت کے خوف سے ہراساں ہوا ہے۔ ہاں بعد میں جب خطاؤں اور تقصیروں کا بوجھ بڑھنے لگا تو کبھی کبھی حسرت کے ساتھ ذہن میں آتا کہ اسوقت حساب شاید آسان رہتا لیکن ساتھ ہی دل میں آتا کہ تم کون ہو اللہ تعالیٰ کے غفران اور رحمت کی حد بندی کرنے والے۔ جس کے ہاتھ میں فیصلہ ہے اس کا اختیار ہے۔ جب چاہے جسکو چاہے طلب فرمائے۔ اسکی بخشش اسکی پردہ پوشیاں۔ اسکی ذرہ نوازیاں اس کے انعام و افضال کیا یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ [1] کا ثبوت نہیں ہیں؟ اس کی بخشش اور رحمت پر نظر رکھو۔ جب تک وہ یہاں رکھنا چاہے اس کا فضل ہے۔ جب وہ بلائے اسکی رحمت ہے۔ نہ تو جانے میں عجلت چاہو کہ آخر تمہارے پاس کونسی پونجی ہے جس کے برتے پر تم حاضری کی خواہش کرو اور سرخروئی کے ساتھ باریابی کی امید رکھو۔ نہ ہی یہاں دل لگاؤ کہ اس کے بلانے پر تامل، ملال یا حسرت کا شائبہ بھی پیدا ہو لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک لبیک کہتے ہوئے اور اس کی رحمت پر یقین واثق رکھتے ہوئے حاضر ہو جاؤ۔ اے رب العالمین اے ارحم الراحمین میرا ہر ذرہ تیری بخشش اور تیرے احسانوں کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ میں تجھ سے بہت بہت راضی ہوں تو اپنی لا انتہا بخشش اور رحمت سے مجھے ایسی گھڑی میں بلائیو جب تو بھی مجھ سے راضی ہو اور مجھے اپنی بارگاہ میں رسوا نہ کیجیو آمین۔

گیارہ سال بعد مجھے ایک کسی قدر لمبے اپریشن کے لئے کلوروفارم دیا گیا جس کا اثر اعصاب پر پڑتا ہے اور کچھ دیر کیلئے اعصاب پر ضبط ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ طبیعت آہستہ آہستہ ہوش کی طرف لوٹ رہی تھی۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ دو تین دوست جو میرے کمرے میں موجود تھے ان میں سے ایک نے پوچھا کیا درد ہو رہا ہے؟ میں نے سر ہلا دیا کہ نہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ کیا بیہوشی میں روتے ہو

---

[1] اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے۔ وہ بہت ہی بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

میں نے کہا نہیں ہوش میں آنے پہ رو رہا ہوں اور یہ شعر پڑھا۔

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذتِ شُربِ مدامِ ما

اس نیم بیہوشی میں بھی یہی احساس تھا کہ زندگی کی قید سے نکل گئے تھے پھر واپس آگئے۔

بعد دوپہر جہاز نے لنگر اٹھایا اور فورڈ کی دوسری طرف کو روانہ ہوا۔ فورڈ کا نظارہ بہت ہی پُر لطف تھا۔ یہ فورڈز سمندر ہی کی شاخیں ہیں جو دُور تک خشکی کے اندر پہاڑوں کے بیچوں بیچ چلی جاتی ہیں۔ ان کے اندر سمندر کے جوار بھاٹے کا اثر تو پہنچتا نہیں اسلئے جہاز میں کوئی حرکت محسوس نہیں ہوتی اور پہاڑوں اور درمیان کی وادیوں کے مناظر بہت دلفریب ہوتے ہیں تین چار گھنٹوں کے بعد ہم فورڈ کی ایک اور شاخ میں عیڈ کے مقام پہ پہنچے اور یہاں جہاز سے اتر کر ایک یک منزلہ ہوٹل میں چلے گئے۔ یہ وادی بہت خوبصورت تھی۔ اور ہوٹل کے اردگرد کا منظر بہت دلکش تھا۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد ہم گھوڑا گاڑیوں پہ وادی سے پہاڑ کی طرف چڑھنا شروع ہوئے۔ یہ گاڑیاں ہمارے ملک کے پرانے بمبو کارٹ کی طرح کی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ علاوہ دو سواریوں کے جو گھوڑے کی طرف منہ کرکے بیٹھتی تھیں۔ ایک سیٹ ان کی سیٹ کے پیچھے کوچوان کیلئے بھی تھی۔ گھوڑے کی راسیں کوچوان کے ہاتھ میں ہوتیں اور وہ اپنی سیٹ سے بیٹھے بیٹھے گاڑی ہانکتا۔ راسیں دونوں سواریوں کے درمیان سے گذرتیں۔ صبح کے وقت ہوا میں کچھ خنکی تھی لیکن ہوا نہایت لطیف اور صاف تھی۔ سڑک بل کھاتی ہوئی جنگل میں سے بلندی کی طرف جارہی تھی اور سارا سماں بہت ہی پُر لطف تھا۔ دوپہر کے وقت ہم "واس" پہنچے۔ لب سڑک ایک ہوٹل تھا۔ جس کی عمارت لکڑی کی بنی ہوئی تھی، چاروں طرف جنگل کا سبزہ اور درخت تھے۔ کوئی اور آبادی یہاں سے نظر نہیں آتی تھی۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر دوپہر کے کھانے کیلئے تیار ہوگئے۔ کھانا تو بالکل سادہ (ابلی ہوئی مچھلی، گرم کئے ہوئے مکھن کی ساس، اُبلے ہوئے آلو، تازہ سٹابری اور کریم) لیکن ہر شے نہایت لذیذ تھی۔ جسے بھوک نے لذیذ تر بنا دیا تھا۔ کھانے کی افراط تھی۔ ہوٹل والوں کو ضرور علم ہوگا کہ جنگل کی صاف ہوا اور پہاڑ کا منظر بھوک کو بہت تیز کر دیتے ہیں۔ اس احساس کے ماتحت سٹابری کیلئے چپٹی تشتریاں نہیں بلکہ گہری تشتریاں مہیا کی گئی تھیں۔ مہمانوں نے بھی میزبانوں کی تواضع کی خوب داد دی۔ معلوم ہوا اس ہوٹل کے کھانے کی بڑی شہرت ہے۔ دیواروں پہ جابجا بادشاہوں، شاہی خاندانوں کے افراد اور مشاہیر کے تعریفی خطوط آویزاں تھے جن میں بہت پسندیدگی

کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہاں کچھ سستا لینے کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ کی مزید چڑھائی کے بعد ہم ایک نہایت خوشنما وادی میں پہنچے جو ایک میدان کی مانند کشادہ اور ہموار تھی۔ اس وادی کے وسط میں ایک قصبہ "فرامونس" تھا جہاں ہم چائے کیلئے ٹھہرے۔ اور گھنٹہ بھر کے مزید سفر کے بعد ہم وادی کے دوسرے سرے پر جو کسی قدر بلندی پر تھا "سٹال ہیم" پہنچے اور اسی نام کے ہوٹل میں اتر پڑے۔ اسوقت یہ ہوٹل بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ چند سال ہوئے میں نے اخبار میں ہوٹل کی عمارت کے جل جانے کی خبر پڑھی۔ اب اس کی نئی عمارت غالباً پتھر کی ہے۔ پھر بھی بہت سا حصہ لکڑی کا ضرور ہوگا۔ کیونکہ ناروے کے مضافات میں اکثر عمارتیں ابھی تک لکڑی کی ہیں۔ اس ہوٹل کے چاروں طرف نظارہ نہایت پُر فضا تھا۔ ہم کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بہت دیر تک اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے اور میرے دل سے صانع قدرت کی تسبیح اور حمد بلند ہوتی رہی

سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے بعد "گڈوانجن" جانے کیلئے روانہ ہو گئے۔ سڑک اتنی ڈھلوان تھی کہ جلد ہی ہم گاڑیوں سے اتر گئے اور پیدل چلنا پسند کیا۔ ڈھلوان کے ختم ہونے پر گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور گڈوانجن پہنچ کر پھر اپنے جہاز پر سوار ہو گئے۔ اب ہم سوگن فورڈ میں سے جا رہے تھے۔ اس فورڈ کے نظارے ہارڈنگر فورڈ کے نظاروں سے مختلف تھے۔ اردگرد کے پہاڑ زیادہ بلند تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بلندی سے گرتی ہوئی آبشاریں سامنے آتیں اور غائب ہو جاتی تھیں۔ شام کے کھانے سے پہلے ہم "بل ہولمن" پہنچ گئے۔ ہوٹل کے سامنے کچھ فاصلے پر فورڈ میں جرمنی کے قیصر ولیم ثانی کا YACHT لنگر ڈالے تھا۔ قیصر خود اس میں فروکش تھے۔ دوسرے دن سہ پہر کو ہم تینوں سیر سے ہوٹل کی طرف واپس آرہے تھے کہ سامنے سے بحری وردیوں میں پانچ چھ افراد آتے دکھائی دیئے تین آگے تھے اور دو یا تین پیچھے تھے۔ راستہ تنگ تھا اور صرف تین آدمی ایک قطار میں سہولت سے چل سکتے تھے۔ اگلی قطار کے وسط میں جو صاحب تھے وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے نصف قدم آگے آگے تھے۔ قریب پہنچنے پر ہم نے پہچان لیا کہ قیصر ولیم ہیں۔ جب ہم بالکل قریب آگئے تو ان کے ساتھیوں میں سے ایک جو قیصر کی بائیں طرف چل رہے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہو گئے اور اس طرح سہولت سے دونوں پارٹیاں ایکدوسرے کے پاس سے گذر گئیں۔ جرمن پارٹی کی آواز وں سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آپس کی گفتگو بے تکلفانہ تھی۔ اس ہوٹل کے باغیچے میں بڑے خوبصورت سفید گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اتنے بڑے گلاب کے پھول پہلے نہیں دیکھے تھے۔ ان میں

مہک تو بالکل نہیں تھی لیکن رنگ بہت خوشنما تھا۔ دو رات اور ایک دن یہاں گذار کر ہم عام مسافروں کے جہاز سے "برگن" واپس آگئے۔ یہاں سے پارٹی کے بعض افراد ریل پر "آسلو" چلے گئے اور باقی جس رستے سے آئے تھے انگلستان واپس ہو گئے۔ میں ہل سے بذریعہ ریل لیک ڈسٹرکٹ کے علاقے میں کانسٹن چلا گیا اور مسٹر اور مسز کوورڈ کے ہاں ٹھہرا۔ چند دنوں کے بعد مسٹر محمد حسن بھی لندن سے آکر میرے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ ہم ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا درمیانی وقت تو مطالعہ میں صرف کرتے اور دوپہر کے کھانے کے جلد بعد سیر کے لئے نکلتے۔ آٹھ دس میل تیز چلنے کے بعد کہیں چائے کے لئے ٹھہرتے اور وہاں سے واپس آجاتے۔ شام کا کھانا گھر پہنچ کر کھاتے۔ انگلستان کے مشہور فلاسفر رسکن کا مکان جھیل کانسٹن کے کنارے پر واقعہ ہے۔ ایک دن ہم نے سٹیمر پر جھیل کی سیر کی اور اس مکان کے قریب سے گذرے جب کانسٹن میں ٹھہرے ہوئے ہم قریب کے مکانات دیکھ چکے تو ہم نے اپنی جائے رہائش گراس میئر میں منتقل کر لی۔ یہ جگہ لیک ڈسٹرکٹ کے وسط میں ہے اور ایک خوبصورت وادی میں واقعہ ہے۔ مشہور شاعر ولیم ورڈسورتھ یہیں رہا کرتے تھے۔ ہمارا مکان ان کی جائے رہائش روز کاٹج کے بالکل قریب تھا جسے ورڈسورتھ کے مداح بڑی تعداد میں ہر روز دیکھنے آتے تھے۔ گراس میئر تک ریل نہیں آتی تھی۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہمارے مکان میں ایک خادمہ ایسی بھی تھی جس نے ابھی تک ریل نہیں دیکھی تھی۔ اگرچہ بائیسکل اس کے پاس تھی اور اگر چاہتی تو اتوار کے دن آسانی سے سہ پہر کے دوران میں اس کمی کو پورا کر سکتی تھی۔ لیکن ایک لحاظ سے خوش بخت تھی کہ اس کی تمام دلچسپیاں اس کے گاؤں تک محدود تھیں اور وہ اپنے حال میں خوش تھی۔ بڑی بشاشت سے اپنے فرائض کو سرانجام دیتی تھی ہم نے کبھی اس کے چہرے پر ملال یا افسردگی کے آثار نہ دیکھے۔

گراس میئر سے تین چار میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑ ہے۔ ہم نے سر ہیوگیو گ کا واقعہ سنا ہوا تھا۔ اور نظم میں بھی پڑھا تھا کہ ایک سہ پہر وہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے شوق میں نکلے۔ ان کا کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ چوٹی پر پہنچے تو یکایک ایک برفانی بادل نمودار ہوا۔ برف گرنا شروع ہوئی اور راستہ دیکھنا دشوار ہو گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر کسی قسم کی اوٹ یا جائے پناہ نہ تھی۔ برفباری بڑھتی گئی اور ساتھ ہی سردی کی شدت بھی بڑھتی گئی اور اندھیرا ہونا شروع ہو گیا۔ سر ہیو لیٹ گئے اور ان کا کتا ان کے اوپر لیٹ گیا کہ اپنے جسم کی حرارت سے اپنے آقا کے جسم کو گرمی پہنچا سکے لیکن برفباری تمام رات جاری رہی اور صبح ہونے تک آقا اور کتا دونوں مر چکے تھے۔ سال بھر میں متعدد

ایسے واقعات اس پہاڑ کی چوٹی پر یا اس کے آس پاس ہوتے رہتے تھے۔ لیکن نہ زیادہ تر سردیوں کے موسم میں ہمارا قیام گراسمیئر میں آخر اگست شروع ستمبر میں تھا۔ ہمیں بھی شوق ہوا کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر جائیں۔ ایک سہ پہر جب مطلع بالکل صاف تھا۔ بادل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ درجہ حرارت تسلی بخش تھا اور سب حالات موافق نظر آتے تھے۔ ہم نے بھی پہاڑ کی چوٹی کا قصد کیا اس خیال سے کہ جب چڑھائی شروع ہو گی تو گرمی سے طبیعت پریشان ہو گی ہم نے چاہا کہ اپنے بارش والے کوٹ ساتھ نہ لے جائیں۔ لیکن عادت کی پابندی نے ساتھ دیا اور ہم انہیں پہنے گئے۔ سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی پر ہو لئے اور چڑھائی شروع ہو گئی۔ راستہ کوئی ایسا دشوار گذار نہیں تھا لیکن چڑھائی خاصی تھی۔ پسینہ آنا شروع ہوا اور کوٹ کا اٹھانا زحمت معلوم ہونے لگا۔ لیکن اب انہیں کہیں چھوڑنے کی صورت نہ تھی۔ ہم چوٹی پر پہنچے۔ ہوا میں کچھ خنکی تھی لیکن سورج چمک رہا تھا۔ اور ارد گرد کا نظارہ دلفریب تھا۔ ہمیں چوٹی پر پہنچے چند منٹ ہی ہوئے تھے اور ابھی ہم پوری طرح اِدھر اُدھر دیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ یکایک ایک بادل اٹھا اور تیزی سے چوٹی کی جانب بڑھ کر اس کے اوپر چھا گیا اور اولوں کی سخت بوچھاڑ ہونے لگی۔ ہم نے جلدی سے کوٹ پہن لئے۔ ہوا اسقدر تیز تھی کہ ہم کھڑے نہ رہ سکتے تھے۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہ جگہ چٹیل تھی کوئی اوٹ میسر نہ تھی۔ ناچار ہم پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور پیٹھ ہوا کی طرف کر دی۔ اولوں کی بوچھاڑ میں اسقدر شدت تھی کہ دو تین منٹ بعد جب میں نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھا تو نہ ہاتھ میں کوئی حس تھی نہ چہرے میں۔ یہ کیفیت کوئی چار پانچ منٹ ہی رہی پھر دفعتاً بدل گئی۔ اولوں کی بوچھاڑ ختم ہو گئی، بادل غائب ہو گیا سورج چمکنے لگا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم نے پہاڑ کی کافی سیر کر لی ہے۔ اب جلد سے جلد نیچے اترنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے سیدھے سڑک کی طرف اترنا شروع کیا۔ پگڈنڈی کو الگ چھوڑ دیا۔ اولوں کی وجہ سے سردی کی ایسی شدت ہو گئی تھی کہ ہمارے ہاتھ اور چہرے شل ہو گئے محسوس ہوتے تھے۔ اور ہماری ایک ہی خواہش تھی کہ ہم جلد نسبتاً گرم ہوا میں پہنچ جائیں۔ سیدھے اترنے کا کوئی راستہ تو تھا نہیں۔ ہم کودتے پھاندتے پھسلتے چٹانوں کے گرد ہو کر تیزی سے نیچے آ گئے۔ دو تین منٹوں میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے چہرے سے شعلے نکل رہے ہیں۔ کچھ تو ہوا کی خنکی کم ہو رہی تھی۔ کچھ تیزی سے اترنے سے خون کا دورہ تیز ہو رہا تھا۔ اور کچھ اولوں کے تھپیڑوں کا ردعمل تھا۔ تخمیناً دس پندرہ منٹ کے اندر ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ اور تیزی سے گراسمیئر کی طرف مارچ کرنا شروع کر دیا۔ ابھی ایک میل نہ چلے ہوں گے کہ سڑک کی بائیں جانب سڑک سے تین چار فرلانگ ہٹ کر ایک کاٹج نظر آئی۔ مسٹر محمد حسن نے کہا امید ہے یہاں چائے مل سکے گی۔ میری طبیعت نڈھال ہو رہی ہے گرم چائے سے بحال ہو جائے گی اور کچھ سستا بھی لیں گے۔ میں نے

کہا آپ بیشک جائیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ جلد مکان پر پہنچ کر گرم پانی سے غسل کروں اور کپڑے بدل لوں میری جرابیں اور جوتا بھیگ گئے ہیں۔ انہیں بہت جلد اتار دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے کالج کا رخ کیا اور میں اور بھی تیزی سے گراسمیئر کی طرف بڑھتا گیا۔ مکان پر پہنچ کر غسل کیا کپڑے بدلے اور چائے منگائی۔ میں بڑے آرام سے بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ مسٹر محمد حسن بھی پہنچ گئے۔ چہرے پر شگفتگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں نے دریافت کیا چائے مل گئی تھی؟ کہا وہاں تو وقت ہی ضائع ہوا وہ ایک دہقان کا جھونپڑا تھا۔ چائے تو مل جاتی لیکن دہقان کی بیوی حالت نزع میں تھی اور وہ لوگ معذور تھے میری طرف توجہ کرنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔ اب سامنے چائے دیکھ کر مطمئن ہوئے ـــ اور میرے ساتھ شامل ہو گئے۔

گراسمیئر کے گردونواح میں جو مقامات دیکھنے یا سیر کے تھے جب ہم دیکھ چکے۔ تو ہم کانسٹن واپس چلے گئے۔ ایک رات ٹھہر کر مسٹر محمد حسن تو واپس لندن چلے گئے اور میں ڈگلس (آئل آف مین) چلا گیا جہاں میں مسز کرسچاین کے ہاں ٹھہرا۔ اس سارے جزیرے میں آبادی کے کم سے کم ایک چوتھائی حصے کا نام کرسچاین تھا۔ ان ایام میں مسٹر ہال کین ناولسٹ کی اچھی شہرت تھی اور وہ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ان کا مکان ڈگلس سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اندر سے دیکھنے کا تو مجھے موقعہ نہیں ملا صرف باہر سے ہی دیکھ سکا۔ کوچ اور بجلی کی ریل سے میں نے اس جزیرے کے سب قابل دید مقامات دیکھ لئے اور بحری جہاز سے جزیرے کے گرد بھی ہو آیا۔ گرمیوں میں مانچسٹر اور لورپول کے علاقے سے بڑی کثرت سے لوگ یہاں آتے ہیں اور جزیرے کی آبادی میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس بات کا جزیرے کی خوشحالی میں بہت دخل ہے۔ میں شاید چند دن اور یہاں ٹھہرتا لیکن مس پارسنز نے لندن سے لکھا کہ تمہیں گئے دو مہینے ہو گئے۔ تم نے بہت لمبی چھٹی منالی ہے اب واپس لندن آجاؤ اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ اب ہم تمہاری ڈاک تمہیں نہیں بھیجیں گے میں ان کا خط ملنے کے دوسرے دن ہی واپس لندن روانہ ہو گیا۔ چند دن بعد میں بار کے رومن لاء کے امتحان میں شامل ہوا اور بفضل اللہ پاس ہو گیا اور اس طرح انگلستان میں میری تعلیم کا پہلا سال مکمل ہو گیا۔

سردار محمد اکبر خاں صاحب | سردار محمد اکبر خاں صاحب نے بیرسٹری کا کورس مجھ سے ایک سال پہلے شروع کیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی محمد صدیق بابر صاحب بھی ان کے ساتھ ہی بیرسٹری کیلئے انگلستان گئے تھے۔ یہ دونوں شیخ اصغر علی صاحب آئی سی ایس کے بھانجے تھے۔ سردار محمد اکبر صاحب خوش شکل اور وجیہہ جوان تھے۔ نہایت خوش خلق تھے۔ اور میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنے لباس

اور وضع قطع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مطالعہ کی طرف اسقدر توجہ نہیں تھی بار کے ایک امتحان کی تیاری کیلئے انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہمارے مکان میں آجائیں تو انہیں کچھ سہولت ہو جائیگی۔ انہوں نے مسز فائزن سے دریافت کیا۔ کوئی کمرہ خالی ہے یا جلد خالی ہونیوالا ہے؟ مسز فائزن نے کہا کمرہ تو ایک خالی ہونے والا ہے لیکن میں نے ظفر اللہ سے کہہ رکھا ہے کہ میں اس سے پوچھے بغیر کسی ہندوستانی طالب علم کو اپنے ہاں نہیں رکھوں گی۔ اسلئے اگر تم یہاں آنا چاہتے ہو تو میں اس سے دریافت کردوں گی۔ مسز فائزن نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے انگلستان آئے ایک سال سے زائد ہو گیا تھا۔ کچھ نیک و بد کی تمیز بھی ہو گئی تھی۔ انگریز شرفاء سے میرا میل جول تھا۔ ہندوستانی طلباء سے زیادہ تعلقات نہیں تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح کی نصیحت پر کاربند تھا۔ سردار محمد اکبر خانصاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ شریف گھرانے کے خوش اخلاق نوجوان تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کا کاروبار مسز فائزن کا ذریعہ معاش تھا۔ مناسب نہ تھا کہ میں ان پر کوئی بے جا پابندی عاید کرتا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ بڑی خوشی سے سردار صاحب کو کمرہ دیدیں۔ چند دن بعد وہ نقل مکان کرکے ہمارے ہاں آگئے۔

سردار محمد اکبر خاں صاحب کی معیت میں ایسٹ بورن کی سیر

کرسمس ۱۹۱۲ء کی تعطیلات کے دن قریب آئے تو سردار صاحب نے مجھ سے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ بہتر ہو اکٹھے کہیں چلیں۔ میں نے کہا میں تو کارنوال جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ غالباً فالموتھ جاؤنگا اگر آپ بھی پسند کریں تو بڑی خوشی سے میرے ہمراہ چلیں۔ انہوں نے کچھ تامل کیا اور کہا کارنوال بہت دور ہے کوئی قریب کا مقام انتخاب کرو۔ دو تین دن یہ تذکرہ ہمارے درمیان ہوتا رہا۔ ان کی خواہش ایسٹ بورن جانے کی تھی اور میری طبیعت وہاں جانے پر مائل نہ تھی۔ آخر انہوں نے کہا چلو ہیسٹنگز چلے چلیں۔ میں مان گیا۔ جونہی میں نے ہیسٹنگز کے متعلق رضامندی ظاہر کی تو مسکرا کر کہنے لگے اب تم نے فالموتھ جانے پر تو اصرار چھوڑ دیا پھر وہیں کیوں نہ چلیں جہاں میں جانا چاہتا ہوں۔ کیوں ایک تیسری جگہ جائیں جو نہ تمہیں پسند تھی نہ مجھے پسند ہے۔ مجھے ان کی اس چالاکی پر ہنسی آئی اور میں نے کہہ دیا اچھا ایسٹ بورن ہی چلے چلتے ہیں۔ ایسٹ بورن میں ہم ساحل سمندر پر ایک پرائیویٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہم دو ہفتے ٹھہرنے کے ارادہ سے گئے تھے۔ لیکن میری طبیعت جلد اکتا گئی اور میں ایک ہفتہ ٹھہر کر واپس لندن چلا گیا۔ دو تین دن بعد سردار صاحب بھی واپس آگئے۔ امتحان کرسمس سے پہلے دے چکے تھے۔ کامیاب نہ ہوئے۔ مجھے پوچھا تمہیں معلوم ہے میں کیوں پاس نہیں ہوا؟ میں نے کہا آپ ہی بتائیے۔ کہنے لگے وجہ تو ظاہر ہے اس مکان کا نمبر ۷۵ ہے۔ میں نے دریافت کیا اس کا امتحان کے نتیجہ کے ساتھ کیا تعلق ہوا؟ کہا صاف تعلق ہے ۵+۷ اکٹھے

تیرہ ہوئے جو منحوس نمبر ہے! میں نے کہا میں نے تو ایک سال کے دوران اس مکان میں رہتے ہوئے پانچ امتحان پاس کئے ہیں۔ چار بار کے پہلے حصے کے اور ایک انٹرمیڈیٹ ایل ایل بی کا۔ جب بھی امتحان میں بیٹھتا ہوں بفضل اللہ پاس ہوتا رہا ہوں۔ ایک بار بھی فیل نہیں ہوا، کہنے لگے تم ان باتوں کو مانتے نہیں ہو اسلئے تم پر اثر نہیں ہوتا۔ میں نے کہا تو آپ بھی نہ مانا کریں۔ اس پر سر ہلا کر خاموش ہو گئے لیکن مکان بدل لیا تاہم ہماری رفاقت جاری رہی۔

سوئٹزرلینڈ اور شمالی اٹلی کی سیر | ۱۹۱۳ء کی ایسٹر کی تعطیلات میں میں ٹامس کک کے ایک زائرین کے قافلہ کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ اور شمالی اٹلی کی سیر کو گیا۔ لندن سے ایک شام روانہ ہو کر ہم دوسری صبح BASLE پہنچے۔ یہاں ناشتہ کیا جو انگلستان کے ناشتے سے ہلکا تھا۔ صرف قہوہ، رولز، مکھن، شہد یا مربہ۔ یہاں کے رولز انگلستان کے ٹوسٹ کی نسبت زیادہ لذیذ تھے۔ ناشتے کے بعد ہم شہر کی سیر کو گئے۔ بلندی سے دریائے رائین کا نظارہ بہت بھلا معلوم دیتا تھا اور پانی بہت شفاف تھا۔

جنووا - دوپہر کو ہم پھر ریل پر سوار ہو گئے اور جنووا (اٹلی) گئے یہ شہر کرسٹوفر کولمبس کا مولد ہے۔ ریل کے اسٹیشن کے باہر کولمبس کا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب ہے۔ یہاں ہوٹل میں ہمارا قیام ہوا۔ دوسرے دن شہر کے قابل دید مقامات دیکھے۔ قصر ابیض، قصر احمر، ولانا ڈی نیگری، میدان مقدس یعنی قبرستان جس میں سنگِ مرمر کی بہت سی خوبصورت اور قابلِ دید یادگاریں ہیں۔ یہ شہر اٹلی کی مشہور بندرگاہ بھی ہے۔ بعد میں مجھے موٹر پر اس شہر سے گذرنے کا اتفاق تو ہوا ہے لیکن پھر یہاں ٹھہرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

پیزا - جنووا میں دو رات اور ایک دن ٹھہرنے کے بعد ہم پھر روانہ ہوئے اور پیزا ٹھہرے۔ یہ بہت پرانا شہر ہے۔ صرف گرجا اور LEANING TOWER قابل دید آثار ہیں۔ اس ٹاور کے متعلق اب خدشہ ہے کہ گرنے کو ہے۔ اسے مضبوط کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ مجھے بعد میں کبھی پیزا جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

فلورنس - پیزا سے ہم اسی دوپہر فلورنس پہنچ گئے اور ہوٹل میٹروپول میں قیام ہوا۔ یہ شہر شائقینِ فنونِ لطیفہ کیلئے بہشت سے کم نہیں۔ فلورنس میڈیچی خاندان کی فیاضی اور عظمت کی یادگار ہے یہ خاندان صرافے کے پیشے سے DUCAL رتبے تک پہنچا۔ فلورنس کی حکومت سنبھالی۔ اس کے افراد کلیسا کے سردار ہوئے اور بعض ان میں سے پاپائے اعظم کے تخت پر بھی متمکن ہوئے۔ شاہی خاندانوں

کے ساتھ رشتے داریاں ہوئیں۔ کیتھرین ڈی میڈیچی کے چچا پاپائے اعظم تھے۔ اس کی شادی فرانس کے شاہی خاندان میں ہوئی۔ خاوند اور تین بیٹے یکے بعد دیگرے فرانس کے تخت پر بیٹھے۔ داماد بعد میں فرانس کا مشہور شاہ ہنری چہارم ہوا۔ جس سے بوربون خاندان کی ابتداء ہوئی۔ اگرچہ ہنری چہارم کی نسل کیتھرین کی بیٹی شہزادی مارگریٹ سے نہیں چلی بلکہ اسکی دوسری بیوی میری ڈی میڈیچی سے چلی۔ کیتھرین ایک بد طالع عورت ثابت ہوئی۔ اس کے ہاتھوں بہت ظلم ہوئے اور اسے بہت سے صدمات اٹھانے پڑے۔ وہ نہایت سخت دل اور متعصب خاتون تھی۔ یوم سینٹ بارتھلمیو پر پیرس اور فرانس کے چند اور شہروں میں ہیوجنو فرقے کے عیسائیوں کا قتل عام ہوا وہ اسی کے سیاہ کارناموں میں سے ہے۔ تاریخ میں اس نے اچھا نام نہیں چھوڑا۔ فلورنس کے شہر میں قدم قدم پر میڈیچی خاندان کی فنونِ لطیفہ کی فیاضانہ سرپرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ مصوری کے دل لبھانے والے نمونوں سے محلات یوفیزی اور پیٹی کی کئی منزلیں اٹی پڑی ہیں۔ فن سنگتراشی میں "پیازا سگنوریا" کا ثانی دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتا۔ فنِ تعمیر میں شہر کا گرجا اور دوسرے محلات توجہ کے جاذب بنتے ہیں۔ دریائے آرنو کے پل بھی اپنی نوع کے عمدہ نمونے ہیں۔ پیٹی اور یوفیزی محلات کے درمیان کا دو منزلہ پل ایک عجوبہ ہے۔ "شارع کورلی" کے مختلف مقامات سے شہر کے پر لطف مناظر نظر آتے ہیں۔ "پیازا مائیکل انجلو" جنت نگاہ ہے۔ اس کے پاس ہی مائیکل انجلو کے فنِ سنگ تراشی کے مشہورِ عالم شاہکار "ڈیوڈ" کا مثنیٰ بار بار توجہ کو اپنی طرف کھینچ کر محوِ حیرت کرتا ہے۔ فلورنس کے مضافات میں "فائی سولی" بھی ایک قابلِ دید مقام ہے۔ یہاں پرانے رومن وقتوں کے تھیٹر اور دیگر عمارتوں کے آثار موجود ہیں۔ اور یہاں سے بھی خوبصورت مناظر نظر آتے ہیں۔ "پیازا سگنوریا" شہر کے بالکل وسط میں ہے اور شہر میں پھرتے ہوئے بار بار یہاں سے گذرنا ہوتا ہے۔ اور ہر بار نگاہ یہاں کسی نئے حسن سے دوچار ہوتی ہے۔ بعض دفعہ روشنی کا زاویہ بدلنے سے ہی ایک نیا حسن ظاہر ہو جاتا ہے۔ فلورنس کا وسطی حصہ زمانہ حال کی جدت طرازیوں کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ اور امید کی جا سکتی ہے کہ محفوظ ہی رہے گا۔ سوائے اس کے کہ ایٹمی طاقت کی بے پناہ یورش اسے اور اس کی تمام مادی زینتوں کو کسی وقت صعیداً جرزاً (چٹیل میدان) بنا کر رکھدے۔ موجودہ حالت میں اس کا ہر پتھر اور اسکی ہر اینٹ فلورنس کی تاریخ کے شاہد ہیں۔ اور فلورنس کی تاریخ قرونِ وسطیٰ کی اطالوی تاریخ کا مرقع اور خلاصہ ہے۔ انسانی طبیعت کی ادنیٰ سے ادنیٰ میں سے ہر ایک اور اعلیٰ میں سے بعض کی جولانیوں کے حیرت انگیز کرشموں کی یادگار ان اینٹوں اور پتھروں پر ثبت اور ان میں مرکوز ہے۔ دیدۂ عبرت نگاہ کے

لئے یہاں کا ہر پتھر سبق آموز ہے۔ اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے فلورنس کے رہنے والے تھے۔ شہر کے گرجا کے گنبد کی بلندی سے بھی شہر کا اور مضافات کا بہت عمدہ اور وسیع منظر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے گو وہاں تک پہنچنے کے لئے صبر اور ہمت درکار ہے۔ گنبد کی گولائی کے حصے کے اندر کی سیڑھیوں میں روشنی بھی کم ہے اور یہاں چوڑائی اور اونچائی بھی کم ہے تاہم میں آخر تک گیا اور اردگرد کے پُر تنوع منظر سے بہت محظوظ ہوا۔ جہاں تک میں شمار کر سکا فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک ۳۶۱ سیڑھیاں تھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اطالوی زبان یورپ کی زبانوں میں سے سہل ترین اور نہایت شیریں زبان ہے۔ تلفظ اور گرامر دونوں آسان ہیں۔ انگریزی یا فرانسیسی جاننے والا اسے آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کے قریب بلکہ اس کے ایک حصہ میں ہی سینما تھا۔ میں ایک بار وہاں تصویر دیکھنے گیا۔ وہ زمانہ خاموش تصویروں کا تھا۔ تصویر کے نیچے وضاحتی عبارت اطالوی میں تھی۔ مجھے مطلب اخذ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی ناموں میں اور تلفظ میں انگریزی کی نسبت کچھ فرق ہے۔ لیکن جو قاعدے اطالوی زبان میں تلفظ کیلئے مقرر ہیں ان سے تفاوت نہیں ہوتا بخلاف انگریزی زبان کے کہ تلفظ کے لئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں جو رواج پا گیا وہی صحیح ہے ایک غیر ملکی کو اس سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔

وینس VENICE | فلورنس سے ہم وینس گئے۔ یہ شہر ایک عجوبہ روزگار ہے۔ اٹلی کے شمال مشرق میں بحیرہ ایڈریاٹک کے شمال مغربی کونے میں واقع ہے۔ سمندر کے اور اس شہر کے درمیان جزیروں کی ایک قطار حائل ہے اور سمندر کی لہروں کو روک دیتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے جہاز ان جزیروں کے گرد ہو کر اس وسیع سمندری جھیل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جس میں یہ شہر واقع ہے۔ اس سمندری جھیل لیگون کی گہرائی کافی ہے۔ جہازوں کے نکلنے اور داخل ہونے کے لئے راستے بنے ہوئے ہیں۔ یہ راستے ان نشانوں سے جو پانی ہی میں لہرا رہے ہیں پہچانے جاتے ہیں۔ شہر وینس اسی جھیل میں بنا ہوا ہے۔ خشکی سے شہر کا فاصلہ میل ڈیڑھ میل ہو گا۔ ریل اور سڑک دونوں ایک محراب دار بند کے اوپر سے گذر کر وینس کے عقب تک پہنچ جاتے ہیں۔ "پیازا روما" میں ایک کھلی اور ایک مسقف سات منزلہ کار پارک ہے۔ موٹریں اس سے آگے نہیں جاسکتیں۔ البتہ کار فیری پر سوار کر کے اور وینس کے گرد ہو کر "لیڈو" جزیرے پر لیجائی جاسکتی ہیں۔ یہ جزیرہ تین چار میل لمبا اور اوسطاً میل بھر یا اس سے کچھ کم چوڑا ہے۔ اور خوب آباد ہے۔ یہاں ہوٹل بڑی کثرت سے ہیں۔ پرائیویٹ مکان کم ہیں۔ سڑکیں بھی ہیں جن پر موٹریں، گھوڑا گاڑیاں، بائیسکل اور ٹریم چلتے ہیں۔ اس جزیرے کے کھلے سمندر والے حصے کی طرف نہانے کے مقامات بھی ہیں۔ لیگون والی

طرف پانی میں حرکت نہیں۔ سمندر والی طرف لہریں ساحل کے ساتھ آکر زور سے ٹکراتی ہیں۔ وینس محلات کا شہر کہلاتا ہے اور عروس البحر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی بندرگاہ بھی ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام عمارتیں پانی میں بنی ہوئی ہیں۔ جہاں عمارت گلی یا چوک نہیں وہاں پانی ہی پانی ہے۔ اس طرح شہر کے بیچوں بیچ سینکڑوں نہریں گلی کوچوں کا کام دیتی ہیں۔ ان میں سے سب سے فراخ جو شہر کے وسط سے گذرتی ہے گرینڈ کنال کہلاتی ہے اس کے علاوہ بڑی چھوٹی سینکڑوں نہریں شہر کے ہر حصے سے گذرتی ہیں۔ محلوں اور مکانوں کے درمیان یا ساتھ ساتھ فرشی گلی کوچے بھی ہیں۔ اور چوک اور بازار بھی ہیں سب سے بڑا چوک سینٹ مارک کا چوک ہے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے خوبصورت چوک ہے۔ اس کے تین طرف وینس کی بہترین دوکانیں ہیں۔ وینس شیشے، چمڑے اور ریشم کی دستکاری اور صنعت کیلئے مشہور ہے اور اس صنعت کا نہایت نفیس سامان یہاں تیار ہوتا ہے۔ سینٹ مارک کا چوک وینس کی سب سے بارونق سیر گاہ بھی ہے۔ وینس میں چونکہ موٹر، گھوڑا گاڑی، بائیسکل، گھوڑا، خچر، گدھا وغیرہ کچھ نہیں ہوتا اس کے بازاروں کی سیر اور چوکوں کے میلوں میں یہ چیزیں مخل نہیں ہوتیں لوگ اطمینان سے چلتے پھرتے ہیں اور وینس کی زیب و زینت سے محظوظ ہوتے ہیں۔ سینٹ مارک کے گرجے کے پہلو میں "ڈوجی" کا محل ہے۔ قرون وسطیٰ میں ڈوجی یہاں کا حاکم اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ اور وینس کی ریپبلک یورپ کی طاقتوں میں سے شمار ہوتی تھی۔ خشکی کا بہت سا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کا بہت بڑا حصہ وینس کی معرفت سرانجام پاتا تھا۔ ڈوجی اپنے انتخاب کے بعد کشتیوں کے ایک پرشوکت جلوس کے ساتھ سمندر کی جانب نکلتا اور اپنی انگوٹھی سمندر میں پھینک کر سمندر کو وینس کی زوجیت میں لانے کی رسم ادا کرتا۔ ڈوجی کے محل کا بڑا دروازہ سینٹ مارک کے چوک میں کھلتا ہے۔ لیکن اسکی دوسری منزل کے ایوانوں کے دروازے گرینڈ کینال کی طرف کھلتے ہیں۔ گرینڈ کینال کا یہ حصہ بہت فراخ اور نہایت پر رونق ہے۔ یہ منظر وینس کا سب سے دلچسپ منظر ہے۔ شام کے وقت سینٹ مارک کے چوک میں اور اس کے قریب کے گرینڈ کینال کے کنارے پر بہت چہل پہل ہوتی ہے۔ وینس کے لوگ زائرین کا تماشا کرتے ہیں اور زائرین وینس کے ساکن اور متحرک مناظر اور حسن سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ وینس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شہر کے ہر حصے سے ہر دوسرے حصے تک پیدل بھی جاسکتے ہیں۔ اس کی سینکڑوں چھوٹی بڑی نہروں پر ہزاروں پل بنے ہوئے ہیں اور گلی کوچوں میں تمام وقت پاپیادہ سالکین اور زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ گرینڈ کینال کے دونوں

طرف محلات، گرجوں، اور بڑے بڑے ہوٹلوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے ۔ ان میں سے اکثر رنگا رنگ سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں ۔ کینال کے تخمیناً وسط میں مشہور "ریالٹو" پل ہے ۔ اس پل پہ دو رویہ دو کانیں ہیں جن کی کل تعداد چوبیس ہے ۔ چونکہ پل کے نیچے سے دخانی جہازوں اور دیگر آبی ذرائع آمد و رفت نے گذرنا ہوتا ہے اس لئے اس پل کی (اور وینس کے تمام پلوں کی) ساخت محراب دار ہوتی ہے ۔ گذرنے والے ایک طرف سے سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور دوسری طرف اتر جاتے ہیں ۔

سینٹ مارک کے علاوہ وینس میں کئی اور گرجے دیکھنے کے قابل ہیں ۔ پھر اکیڈمی ہے سینٹ مارک کا چوک ہے ، شیشے کی صنعت کے کارخانے ہیں ، ڈوجی کا محل ہے ، دراصل وینس سارے کا سارا ایک عجائب گھر ہے جہاں ہر چیز نرالی اور ہر چیز دیکھنے کے لائق ہے ۔ وینس چونکہ لیگون میں بنا ہوا ہے اسلئے سمندر کی لہروں کی یورش سے محفوظ ہے ۔ سمندر کے جوار بھاٹے جزیرہ دن تک پہنچ کر رک جاتے ہیں ۔ لیگون کا پانی ساکن ہے ۔ اسلئے وینس کی تنگ نہروں میں سے گذرنا فرحت بخش ثابت نہیں ہوتا بڑی نہروں میں تو جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت سے کچھ نہ کچھ حرکت ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن چھوٹی نہروں میں جو کچھ اردگرد کے مکانوں سے پھینکا جائے پانی کی سطح پر پڑا رہتا ہے ۔ جب تک محکمہ صفائی کی کشتی دورے پر آئے اور اٹھا کر لے جائے ۔ وینس کی سیر کیلئے اپریل مئی کے مہینے یا ستمبر اکتوبر کے مہینے موزوں ہیں ۔ سردیوں میں دھند اور گرمیوں میں حبس کی شکایت ہو جاتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وینس کے محلات اور بڑی بڑی عمارتیں آہستہ آہستہ پانی میں دھنس رہی ہیں ۔ اندازہ ہے کہ سو سال میں انچ ڈیڑھ انچ کا فرق پڑتا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

میلان MILAN | وینس سے ہم میلان گئے ۔ یہ شمالی اٹلی کا سب سے بڑا شہر ہے اور تجارتی لحاظ سے اٹلی کے تمام شہروں میں اوّل نمبر پر ہے ۔ میلان جاتے ہوئے ریل میں میرے کمرے میں دو امریکن خواتین تھیں ۔ انہوں نے مجھے اجنبی دیکھ کر ہمدردانہ رنگ میں گفتگو شروع کر دی ۔ ذاتی اور ملکی کوائف کی دریافت کے بعد انہوں نے مذہب کے متعلق سوال کرنا شروع کئے ۔ آخر پوچھا تمہارے مذہب میں کونسی دعا زیادہ رائج ہے ۔ میں نے الحمد شریف پڑھ کر سنائی اور انگریزی میں ترجمہ اور مفہوم بتایا سنکر ان میں سے بڑی نے کہا ۔ "ایسی دعاء کا تو ضرور جواب ملنا چاہئے ۔" اس خاتون کو اسلام کے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے پوچھا اسلام کے متعلق کوئی کتاب انگریزی میں مل سکتی ہے ۔ میں نے "ٹیچنگز آف اسلام" کا ذکر کیا اور لندن میں ملنے کا پتہ انہیں لکھدیا ۔ انہوں نے کہا وہ ضرور منگوا کر پڑھیں گی ۔ میلان کی سب سے مشہور عمارت وہاں کا گرجا ہے ۔ جو سنگِ سرخ کی نہایت شاندار

عمارت ہے۔ اب تو گرجے کی چھت تک جانے کیلئے بجلی کا لفٹ لگا دیا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں جب میں پہلی بار گیا تو اوپر جانے کا راستہ سیڑھیوں کے ذریعے ہی تھا۔ پھر چھت سے اوپر بھی کچھ بلندی تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ میں جہاں تک سیڑھیاں جاتی تھیں چڑھتا گیا میرا اندازہ ہے کہ ۴۰۰ سیڑھیاں تھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس گرجے کے پہلو میں ایک بہت بلند خوشنما آرکیڈ ہے۔ جس کے وسطی حصے میں ایک عمدہ مطعم اور کیفے ہے اور دونوں طرف بہت سجی ہوئی دوکانیں ہیں۔ میلان کے سینٹ میریا کے گرجے کی ایک دیوار پر مشہور مصور لیونارڈو ڈا ونچی کا شہرہ آفاق شاہکار عشائے ربانی نقش کیا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لیونارڈو نے کئی سالوں میں اسے مکمل کیا۔ جب جوش آتا کئی کئی گھنٹے اس پر برابر محنت کرتے چلے جاتے۔ جب یہ حالت نہ رہتی ہفتوں بلکہ مہینوں توجہ نہ کرتے۔ جب تصویر مکمل ہوگئی تو معلوم ہوا کہ دیوار کے مسامے میں نقص کی وجہ سے زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے گی۔ لیکن تھوڑی سی بہت کوشش کے ساتھ اب تک قائم چلی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ تصویر نقش کی گئی ان دنوں یہ گرجا ایک کانونٹ کا حصہ تھا اور یہ کمرہ کھانے کا دالان تھا۔ بعد میں ایک دفعہ میں میلان کا قبرستان بھی دیکھنے گیا تھا۔ میلان کے قبرستان میں میں نے ایک نئی چیز دیکھی وہ ایک بالکل جدید طرز کا کریماٹوریم (مردوں کے جلانے کی جگہ ہے) وہاں مرنے والے یا اس کے ورثاء کی خواہش کے مطابق جلانے کیلئے آگ، بجلی یا گیس تینوں میسر ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ موت میں بھی اسقدر تکلف اور تنوع۔

لگانو LUGANO | میلان سے ہم لگانو گئے۔ یہ کوہ الپس کے جنوب کی جانب سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر ہے جو اسی نام کی جھیل کے کنارے واقعہ ہے۔ ہمارا قیام ہوٹل وکٹوریہ اولاک میں ہوا جو اپنے نام کے مطابق لب آب واقعہ ہے۔ لگانو اپنے مقام وقوع کے لحاظ سے ایک نہایت خوشگوار اور پُر فضا جگہ ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا حصہ ہونے کی وجہ سے سیاسی لحاظ سے پُرامن ہے۔ اٹلی کی حد پر ہونے کی وجہ سے طعام اور کلام اور تمدن میں اطالوی رنگ رکھتا ہے۔ گلی کوچے بہت صاف ہیں۔ شہر کی آبادی پہاڑی اونچ نیچ کی بدولت اور جھیل کا کنارہ میسر ہونے کی وجہ سے دلفریب نظر آتی ہے۔ جھیل کے گرد پہاڑوں کا حلقہ ہے اور بہت سے مقامات سیر کے ہیں۔ پہاڑ کا عکس جھیل کے پانیوں کے اندر ایک دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ لگانو کے شمال کی طرف جاتے ہوئے ریل "سینٹ گوتھارڈ" نام کی سرنگ سے گذرتی ہے جو یورپ میں ریل کی سب سے لمبی سرنگ ہے سرنگ پار کرنے میں قریباً آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ ان دنوں ریل کے انجنوں میں کوئلہ جلتا تھا۔ ساری سرنگ دھوئیں سے بھر جاتی تھی۔ اگر کہیں ریل کی کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی تو ریل

کے اندر بھی دھواں بھر جاتا تھا جو بہت تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔ اب سارے سوئٹزرلینڈ میں ریلیں بجلی سے چلتی ہیں اور دھوئیں کی اذیت سے مخلصی ہو گئی ہے۔ ہم چند گھنٹے لوزان میں ٹھہرے یہ بھی اپنے نام کی جھیل کے کنارے ایک بہت پُر فضا مقام ہے۔ اس جھیل کے ارد گرد بہت سے مقامات سیر کے ہیں جنہیں دیکھنے کا بعد میں اتفاق ہوتا رہا ہے۔

اس سفر کے دوران میں ایک خاتون بنام مسز ویٹ سے تعارف ہوا جو یارک شائر انگلستان کے علاقے میں لیڈز کے مضافات کی رہنے والی تھیں وہ بیوہ تھیں اور متوسط درجہ خوشحال تھیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں گرمی کی تعطیلوں میں ایک دو دن کیلئے ان کے ہاں آؤں گا۔ میں وعدہ کے مطابق ان کے ہاں گیا۔ بہت تواضع سے پیش آئیں۔ ان کے ملنے والوں میں سے ایک ڈاکٹر لائیڈ تھے میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں کچھ عقائد کا ذکر بھی آ گیا۔ میں نے تثلیث کے عقیدے پر کچھ تنقید کی تو انہوں نے مسکرا کر کہا میں تو پہلے ہی اس عقیدے کو خلاف عقل سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ سنکر حیرت ہوئی کیونکہ اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ ہر یورپین عیسائی عقائد میں پختگی سے تثلیث اور کفارے اور الوہیت مسیح پر قائم ہے۔

لندن میں ہمارے گھر میں بھی بعض دفعہ عقائد اور دینی اور روحانی اقدار پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ مجھے مسز فائزن اور مس پارسنز کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تھیں تو میرے کمرے سے ایک منزل نیچے لیکن کمرے کے اندر نہیں تھیں۔ اور ان کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ شائد انہیں یہ خیال بھی نہ ہو کہ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ میں نے مسز فائزن کا یہ فقرہ سنا "جو کچھ یہ کہتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم عیسائیت کی تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ معقول ہے"۔ مس پارسنز نے جواباً کچھ کہا لیکن میں اسے سن نہ سکا۔ میری طبیعت پر فقط اتنا اثر رہ گیا کہ انہیں مسز فائزن کے ساتھ اتفاق نہیں تھا۔ ایک دن کھانے کے کمرے میں کسی دینی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مس پارسنز کو مسئلہ زیر بحث پر کوئی جواب تو بن نہ آیا لیکن کہا۔ "میں اپنے عقائد کو دلائل سے ثابت کر سکوں یا نہ لیکن میں ان کے لئے جان دینے کو تیار ہوں"۔ مجھے ان کے اخلاص کی یہ کیفیت بہت پسند آئی اکثر لوگ عقائد پر بحث کرنے میں تو بہت تیز ہوتے ہیں لیکن ان کا عمل ان کے دعاوی کی تصدیق نہیں کرتا۔ مس پارسنز سے یہ فقرہ سن لینے کے بعد میں اس بات کی بہت احتیاط کرتا تھا کہ مذہبی امور پر گفتگو میں کوئی بات ایسے الفاظ میں اور ایسے طریق پر نہ کی جائے جو ان کے احساسات پر گراں ہو۔

سردار محمد اکبر خانصاحب کی معیت میں سویڈن، فنلینڈ اور روس کا سفر

۱۹۱۳ئہ کی گرمیوں کی تعطیلات قریب آئیں تو میرا ارادہ ہوا کہ میں سویڈن اور فنلینڈ جاؤں اور سینٹ پیٹرز برگ (جو ان دنوں مملکتِ روس کا دارالحکومت تھا) سے بھی ہوتا آؤں۔ اس سفر کیلئے مجھے ایک ساتھی کی تلاش تھی۔ میں نے سردار محمد اکبر خاں صاحب سے ذکر کیا اور وہ رضامند ہو گئے۔ لیکن وہ اتنی جلدی روانہ ہونے پر آمادہ نہیں تھے جتنی جلدی میں سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ میں سویڈن سے ہوتا ہوا ہیلسنگ فورس پہنچوں اور وہ تین چار دن بعد روانہ ہو کر سیدھے وہاں آکر میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔

اس زمانے میں فنلینڈ ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ گو اسے خاص آئینی مراعات حاصل تھیں لیکن پھر بھی مملکت روس میں شامل تھا۔ فنلینڈ کی علیحدہ پارلیمنٹ تھی۔ اور اس زمانے میں بھی ۱۹ خواتین پارلیمنٹ کی رکن تھیں۔ ملک کے سارے باشندے مرد و زن خواندہ تھے۔ فنش قانون کے مطابق کوئی شادی نہیں ہو سکتی تھی جب تک دولہا دلہن یہ ثبوت نہ پیش کریں کہ دونوں خواندہ ہیں۔ تمدن اور معاشرت میں فنلینڈ روس کی نسبت ہر شعبے میں بہت آگے تھا لیکن سیاسی لحاظ سے روس کے زیر اقتدار تھا۔ روس جانے کیلئے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن پاسپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ کسی دن وزارت خارجہ کے محکمہ میں جاکر درخواست دیدی جاتی اور دوسرے دن وزیر خارجہ کے نام سے جاری کردہ پاسپورٹ مل جاتا۔ ان دنوں پاسپورٹ کتاب کی شکل میں نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک فل سکیپ سائز کا دوہرا ورق ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے اور سردار محمد اکبر خاں صاحب نے پاسپورٹ حاصل کر لئے۔ اور میں پوری ہدایات حاصل کرنے کے بعد تاریخ مجوزہ پر روانہ ہو گیا۔ میں لندن سے ریل پر "نارفچ" گیا اور وہاں سے بحری جہاز پر گوتھن برگ پہنچ گیا جو سویڈن کے مغربی ساحل پر ایک بندرگاہ اور مشہور تجارتی مرکز ہے۔ سردار محمد اکبر خانصاحب لندن سے "ہل" تک ریل میں سفر کرنے والے تھے اور وہاں سے بحری جہاز پر ہیلسنگ فورس آنے والے تھے۔

سویڈن SWEDEN

ان دنوں گوتھن برگ سے سٹاک ہوم جانے کا ایک آبی راستہ ملک کے بیچوں بیچ بھی تھا اور یہی راستہ میں نے انتخاب کیا تھا۔ جب میں بحری جہاز سے گوتھن برگ پہنچا تو دریافت پر معلوم ہوا کہ دریائی جہاز کے روانہ ہونے کا مقام شہر سے باہر کچھ فاصلے پر ہے۔ چونکہ میں بالکل اجنبی تھا اسلئے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ اور ٹیکسی والے سے کہا مجھے دریائی جہاز کے روانہ ہونے کے مقام پر لے چلو مجھے انگلستان آئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اپنی ضرورت کیلئے ٹیکسی کرائے پر لی کیونکہ اور کوئی وسیلہ میسر نہ تھا۔ جب دریائی جہاز تک پہنچ گئے تو مجھے کچھ پریشانی ہوئی کہ شاید

ٹیکسی والے کو میں اپنا مفہوم نہیں سمجھا سکا اور وہ مجھے صحیح مقام تک نہیں لایا۔ جہاز تو ایک موجود تھا۔ چھوٹا سا اور کھلونے کی مانند خوبصورت۔ اور چونکہ جہاز تھا اس لئے قیاس تھا کہ پانی میں ہی کھڑا ہوگا۔ لیکن اس کے اردگرد تمام سبز کائی تھی۔ دریا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ قریب کوئی عمارت تھی نہ کسی دفتر کا نشان تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ادھر ادھر نظر دوڑانے کے بعد ایک چھوٹی سی سیڑھی کے ذریعے عرشے پر پہنچا یہاں کچھ چہل پہل اور رونق تھی۔ ایک دو بار گھنٹی کی آواز بھی سنائی دی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کھلونا جہاز حرکت کرنے کو ہے۔ میرے پاس ٹامس کک کے لندن کے دفتر سے خریدا ہوا ٹکٹ تو تھا لیکن انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ تعطیلات کا موسم ہے اور ان جہازوں پر بھیڑ ہوتی ہے ممکن ہے تمہیں علیحدہ کیبن یا کیبن میں جگہ تو نہ مل سکے لیکن کچھ نہ کچھ انتظام وہ کر دینگے آخر میں کپتان تک پہنچا۔ انہوں نے کہا اچھا ہوا تم بروقت پہنچ گئے ہم تو بس اب چلنے والے ہی ہیں کمرہ تو کوئی خالی نہیں۔ لیکن میں اپنے چیف انجینئر سے کہہ دیتا ہوں وہ اپنی کیبن تمہیں خالی کر دیگا۔ عام طور پر تو ہر کیبن میں دو مسافر سفر کرتے ہیں تمہیں اکیلے ہی کیبن مل جائے گی۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دریا کا پاٹ تو خاصا چوڑا ہے لیکن سارا نظر نہیں آتا کیونکہ بہت سے حصے میں لمبی کائی اگی ہوئی ہے۔ اور اس حصے میں سے جو پانی گذرتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ جیسے جیسے جہاز پانی کی رو کے خلاف اوپر کی طرف حرکت کرتا گیا کائی غائب ہوتی گئی اور دریا کا پورا پاٹ نظر آنے لگا۔ مجھے بعد میں بھی گوٹن برگ جانے کا اتفاق تو ہوا ہے لیکن اس رستے سفر کرنے کا اتفاق پھر نہیں ہوا۔ گوٹن برگ کے شہر اور بندرگاہ دونوں میں اب بہت وسعت ہو چکی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دریائی جہازوں کیلئے بھی ٹھہرنے کا مقام بن چکا ہوگا۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز ایک کائی کے کھیت میں لنگر ڈالے ہے۔ اگرچہ جہاز میں سب کمرے رکے ہوئے تھے لیکن مسافروں کی کل تعداد بیس پچیس سے زائد نہیں تھی۔ ان دنوں جہاز ہفتے میں تین بار گوٹن برگ سے روانہ ہوتا تھا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو مجھے دو رات گوٹن برگ میں دوسرے جہاز کا انتظار کرنا پڑتا۔ ایک دو گھنٹے کے اندر ہی سب مسافر ایک دوسرے سے شناسا ہو گئے اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔ جہاز کا سفر نہایت خوشگوار تھا کھانا نہایت لذیذ اور با افراط تھا۔ ہوا لطیف اور فرحت افزا تھی۔ اگرچہ ہماری سواری پانی پر چلتی تھی لیکن ہمیں احساس یہی تھا کہ ہم ایک ہموار سطح پر خشکی میں سفر کر رہے ہیں کیونکہ دونوں طرف دیہاتی زندگی کے مناظر اور سرگرمیاں نظر کے سامنے تھیں۔

دو تین گھنٹوں میں ہم آبشار کے نیچے پہنچ گئے۔ جہاز یہاں سے LOCKS کے ایک لمبے سلسلے میں سے گذر کر آبشار سے اوپر کے حصے میں پہنچتا تھا۔ غالباً اٹھارہ یا بیس LOCKS ہوں گے اور جہاز کو ان سے گذرنے میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ اس عرصے میں مسافر جہاز سے اُتر کر آبشار کا نظارہ کرتے اور جہاز کے LOCKS سے گذرنے کے عمل کا مشاہدہ کرتے۔ اور ساتھ ہی پیدل بلندی کی طرف بڑھتے بھی جاتے۔ آبشار کے پانی کے گرنے کی طاقت کو بجلی میں بدلنے کا کارخانہ بھی دریا کی ایک جانب تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اب اس کارخانے کو اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ دریا کا بہت کم پانی آبشار میں سے ہو کر گرتا ہے۔ گویا آبشار اب غائب ہو گیا ہے۔ صنعت اور سائنس کے مقابلے میں قدرتی منظر اور قدرت کی بوقلمونیاں پسپا ہو رہی ہیں۔

جب جہاز آبشار کے اوپر پہنچ گیا تو ہم پھر سوار ہو گئے۔ نظارہ دریا کے نچلے حصے کی نسبت زیادہ دلفریب معلوم ہونے لگا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سورج کے غروب ہونے کا وقت قریب آرہا تھا اور قدرت کے چہرے پر کچھ افسردگی سی چھا رہی تھی۔ شام کے کھانے کے بعد کچھ اندھیرا ہونے لگا لیکن رات چاندنی تھی۔ دریا کے قریب شہر تو الگ کوئی بستی یا آبادی بھی نہیں تھی۔ بالکل خاموشی کا سماں تھا۔ جہاز ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں دریا ایک چکر کاٹتا تھا۔ کپتان نے کہا کہ اگر تم لوگ چاندنی میں سیر کا لطف اٹھانا چاہو تو یہاں اتر کر پیدل سیر کرتے ہوئے چکر کے آخر میں پھر جہاز کو آملو۔ ہم سب نے ان کی تجویز کے ساتھ اتفاق کیا اور اتر کر چل پڑے۔ باتوں میں مشغول ہم دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آگے پیچھے پگ ڈنڈیوں پر جا رہے تھے کوئی سڑک تو تھی نہیں۔ جہاز چکر کاٹنے میں ہم سے دُور ہوتا گیا اور جہاز کی سرچ لائیٹ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چاندنی کا سماں تو بیشک دلفریب تھا لیکن ہم میں سے کسی کو پختہ طور پر معلوم نہیں تھا کہ کونسی پگڈنڈی ہمیں اس مقام تک پہنچائے گی جہاں دریا کا چکر ختم ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ اندیشہ ہونے لگا کہ اگر ہم زیادہ دُور ہو گئے تو جہاز پر واپس پہنچنے میں شاید کچھ مشکل پیش آئے۔ گو ہمیں یہ تو اطمینان تھا کہ اگر ہم وقت پر مقررہ مقام پر نہ پہنچے تو جہاز کی سیٹی ہماری رہنمائی کے لئے بجائی جائے گی اور سرچ لائیٹ بھی اردگرد گھمائی جائے گی۔ پھر بھی ہم نے مناسب سمجھا کہ ہمیں صحیح راستہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ اگر کسی مکان یا جھونپڑے کا سراغ مل جائے تو ہم راستہ دریافت کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک روشنی نظر آئی اور ہم نے اسکی طرف بڑھنا شروع کیا۔ چند منٹوں میں ہم ایک فارم ہاؤس پر پہنچ گئے۔ جس کی ایک کھڑکی سے روشنی آرہی تھی کھڑکی کے

پیچھے ایک صاحب بیٹھے کچھ پڑھ یا لکھ رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے کھڑکی کے شیشے پر انگلیوں سے ان صاحب کو متوجہ کیا اور وہ باہر آئے۔ چہرے اور لباس سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی تو نہیں جانتے تھے لیکن ہم نے ان پر اپنی مشکل واضح کر دی۔ وہ ہنسے، سر ہلایا، اندر واپس جاکر اپنی ٹوپی اور چھڑی لے آئے اور ہمارے ساتھ ہو لیئے۔ ہم لوگ مقام اتصال پر جہاز کے پہنچنے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ جہاز کے پہنچنے پر جہاز کے عملے نے اس مشفق رہنما کی بیئر وغیرہ سے تواضع کی اور فریقین خوشی خوشی ایکدوسرے سے رخصت ہوئے۔

سٹاک ہولم | اس موقعہ پر میں سٹاک ہولم صرف دو دن ہی ٹھہر سکا۔ بہت خوشنما شہر ہے اور شمال کا وینیس کہلاتا ہے۔ ارد گرد کے جزیروں کی سیر بہت دلچسپ رہتی ہے۔ میں جہاز پر "سٹالٹسجو بیڈن" گیا۔ وہاں گرینڈ ہوٹل میں لنچ کھایا اور بجلی کی ریل میں واپس آیا۔ شام کو "سکان سین" گیا جو یہاں کا نیشنل پارک ہے۔ اس کے ایک حصے میں یہاں کے قومی لباس کی ایک قسم کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ ایک بعد کے موقعہ پر میں "اپسلا" یونیورسٹی دیکھنے گیا۔ وہاں کے عربی کے پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ ٹریم پر گیا اور جہاز سے واپس آیا۔ یہاں کا محل اور اس کا باغ سیر کے مقامات ہیں۔ یہاں کے گرجا میں ڈیزیری کی قبر ہے۔ جو موجودہ شاہی خاندان کے مورث اعلیٰ فرانسیسی جنرل برناڈوٹ کی اہلیہ تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جب سویڈن کا تخت خالی ہوا اور ملک کو ایک بادشاہ کی ضرورت ہوئی تو نگہ انتخاب نپولین کے ایک جرنیل برناڈوٹ پر پڑی جو فرانس کے مارشل بھی تھے۔ جب سویڈش وفد نے سویڈن کا تخت جنرل برناڈوٹ کو پیش کیا تو انہوں نے نپولین سے اس پیشکش کے متعلق استصواب کیا۔ نپولین نے انہیں قبول کرنے سے منع تو نہ کیا لیکن اتنا اظہار ضرور کر دیا کہ ان کے نزدیک فرانس کے ایک مارشل کیلیئے سویڈن کا تخت کوئی بڑا اعزاز نہیں جب باوجود اس کے جنرل برناڈوٹ نے سویڈش پیشکش منظور کر لی تو نپولین آزردہ ہوا۔ چند سال بعد نپولین تو سینٹ ہیلینا میں عمر بھر کیلیئے نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بھائیوں کو اس کے عطا کردہ تخت جلدی میں چھوڑنے پڑے۔ لیکن جنرل برناڈوٹ کا پڑپوتا آج بھی سویڈن کا بادشاہ ہے۔ ڈیزیری جنرل برناڈوٹ کی رفیقہ حیات تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بہن اور غالباً وہ خود بھی ایک وقت نپولین کی منظور نظر رہی تھیں۔ جنرل برناڈوٹ کے ساتھ شادی ہو جانے کے بعد ان کے متعلق اس قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا گیا۔ جنرل برناڈوٹ کے سویڈن کا بادشاہ بن جانیکے بعد وہ زیادہ عرصہ فرانس ہی میں رہیں۔ آخر عمر میں کچھ عرصہ سویڈن میں مقیم ہوئیں ورنہ تھوڑے عرصہ کیلیئے آتیں اور واپس چلی جاتیں

وہ خاوند کی تاجپوشی میں شریک نہیں تھیں اسلئے کبھی سویڈن کی ملکہ نہ کہلائیں۔ قبر کے تعویذ پر صرف ایک لفظ "ڈیزیرے ری" ہی سنہری حروف میں کندہ ہے۔ سٹاک ہولم پہنچنے کے دوسرے دن صبح کے وقت میں متعلقہ جہازی کمپنی کے دفتر گیا تاکہ "ہیلسنگ فورس" جانیوالے جہاز پر کیبن کا بندوبست ہو جائے لیکن نہ ہو سکا۔ اسدن شام کے چھ بجے جہاز کی روانگی تھی۔ مسافروں کو ایک گھنٹہ قبل جہاز پر پہنچنے کی ہدایت تھی۔ جہاز پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جن مسافروں کو کیبن میں جگہ نہیں مل سکی ان کے لئے کھانے کے سیلون میں بستر بنا دیئے جائیں گے۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا بستر کھانے کے سیلون میں ہوگا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے | جہاز پر ایک روسی صاحب سے واقفیت ہوگئی جو پیٹرز برگ (حال لینن گراڈ) میں جواہرات کی تجارت کرتے تھے۔ ان کا نام نکولا دسالیوچ "ڈیگلنگ" تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ اس سفر میں میرا اور میرے ایک دوست کا ارادہ پیٹرز برگ جانے کا بھی ہے تو مجھے اپنا پتہ دیا اور تاکید کی کہ ان سے ضرور ملوں۔ جب سردار محمد اکبر خان اور میں پیٹرز برگ گئے تو ان سے ملے۔ انہوں نے ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ کھانا ہمارے مزاج کے بالکل موافق تھا سردار صاحب نے کہا آج تین سال بعد گوشت میں کریلے پکے کھائے ہیں۔ وطن یاد آگیا۔ کھانے کے بعد ہمارے میزبان ہمیں موٹر میں سیر کے لئے لے گئے۔ دریائی جہاز پر دریائے "نیوا" کے جزیروں کی سیر کرائی۔ بڑی تواضع اور شفقت سے پیش آئے۔ بس وہی جہاز پر کی واقفیت تھی۔ ہم دونوں طالب علم تھے ہمارے ساتھ انہیں کوئی غرض نہ تھی اور نہ انہیں ہم سے کسی قسم کا نفع پہنچ سکتا تھا۔ وہ ایک معمر خوشحال تاجر تھے۔ ہمارے ساتھ مسافر نوازی کا سلوک ان کی شرافت اور اعلٰے خلق کی وجہ سے تھا۔ بحمد اللہ پچاس سال بعد جب میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کے صدر کی حیثیت میں روس کے وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو کی دعوت پر روس گیا تو گو لینن گراڈ (سابق پیٹرز برگ) میں میرا قیام صرف ایک دن رہا پھر بھی میں اس شریف جوہری "نکولا دسالیوچ" کی شرافت، تواضع اور مہمان نوازی کی یاد میں "نمبر ۲۶ نوسکی پراسپکٹ" جہاں پچاس سال پہلے ان کا کاروبار تھا کو پھر دیکھ آیا۔

ہیلسنگ فورس (فنلینڈ) | جہاز ہیلسنگ فورس شام کے چھ بجے پہنچا۔ سورج ابھی نصف النہار سے کچھ ہی نیچے معلوم ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں گرمیوں میں دن بہت لمبا ہوتا ہے اور جنوبی فنلینڈ میں بھی سورج سولہ [۱۶] سے بیس گھنٹے چمکتا ہے۔ میں نے ہوٹل فینیا میں ایک کمرہ لے لیا۔ دوسرے دن صبح سیر کیلئے نکلا اسپلینیڈ سے ہوتے ہوئے اندرونی بندرگاہ کی طرف گیا مارکیٹ کی رونق دیکھی جہاں کھلی ہوا میں سبزی اور دیہات میں پیدا ہونے والی خوردنی اشیاء کی خرید و فروخت ہو رہی تھی

وہاں سے رصد گاہ کی پہاڑی پر گیا جہاں سے شہر کے قریب کے حصوں۔ بندرگاہ اور سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں سیاہ سنگِ مرمر کا سنگ سازی کا ایک شاہکار نصب ہے جو THE SHIPWRECKED کے نام سے موسوم ہے۔ درمیان میں خاوند کھڑا ہے جو عزم مستعدی اور ذمہ داری کی تصویر نظر آتا ہے اس کے اردگرد اس کے بیوی بچے اس سے چمٹے ہوئے ہیں جن کے چہروں پر سخت خوفزدہ اور ہراساں ہونے کے آثار ہیں۔ بیرونی بندرگاہ میں خوب رونق تھی۔ یہاں سے چھوٹے چھوٹے جہاز ہر سمت کو جاتے تھے۔ "ہیلسنگ فورس" کے اردگرد بھی سٹاک ہالم کی طرح بہت سے چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ گرمیوں میں بہت سے لوگ ان جزیروں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ جہاز شہر اور جزیروں کے درمیان چکر لگاتے اور اس طرح ایک قسم کی بس سروس مہیا کرتے تھے۔ میں بھی ایک جہاز پر سوار ہوا جو قریب کے جزیرے کو جاتا تھا۔ اس جزیرے میں ایک پارک تھی جس کے اندر چڑیا گھر اور مطعم وغیرہ بھی تھے

ہیلسنگ فورس میں قیام کے دوران موسم خوشگوار تھا۔ میں سیر کو نکل جاتا اور جو مقام پسند ہوتا وہاں بیٹھ کر گھنٹہ دو گھنٹے مکالے کی ایک کتاب جو میں ساتھ لے گیا ہوا تھا پڑھ کر مکالے کی تحریر سے لطف اٹھاتا۔ کبھی کتاب بند کر دیتا اور پیشِ نظر منظر سے لطف اندوز ہوتا۔

تیسرے دن سردار محمد اکبر صاحب تشریف لے آئے اس وقت تک میں اس قابل ہو گیا تھا کہ قابلِ دید مقامات کی جانب ان کی رہبری کر سکوں علاوہ ان مقامات کے جن کا ذکر آ چکا ہے ہم نے طالب علموں کی کلب کی عمارت دیکھی اس عمارت کے دروازے پر لاطینی میں یہ عبارت کندہ تھی:-

"SPEI SUAC PATRIA DEDIT HELSINGFORS"

(GIVEN BY FATHERLAND TO ITS HOPE)

وہ دن اور دوسرا دن ٹھہر کر ہم دوپہر کو بذریعہ ریل ہیلسنگ فورس سے پیٹرز برگ روانہ ہو گئے سابق پیٹرز برگ حال لینن گراڈ ہم کوئی دس بجے رات پیٹرز برگ پہنچے۔ سٹیشن سے ہم نے ایک دروزکی (گھوڑا گاڑی) کرایہ پر لی اور کوچوان سے کہا کہ ہمیں "سینٹ آئزک سکوئر" میں ہوٹل "انگلیٹیر" پہنچا دے۔ وہ انگریزی تو جانتا نہ تھا لیکن اس نے سینٹ آئزک کے الفاظ سے شاید کچھ اخذ کر لیا۔ وہ چہرے سے تو نوجوان معلوم ہوتا تھا لیکن باوجود گرمی کے موسم کے اس نے کپڑے اتنے پہن رکھے تھے اور وہ بھی روئی بھرے لحاف کے بنے ہوئے کہ وہ خود بھی روئی کا ایک بڑا تھیلہ نظر آتا تھا۔ یہ لباس کوئی اس کی خصوصیت نہیں تھا۔ وہاں سب کوچوان ویسے ہی لباس میں روئی کے تھیلے نظر آتے تھے۔ اس لباس کے پہننے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ موسم سرما میں پیٹرز برگ میں بڑی شدت کی سردی

پڑتی ہے۔ کوچوان کی نشست کھلی ہوتی ہے اور اسے سردی سے بچنے کیلئے روئی سے بھرے ہوئے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ وہ اس لباس کا اس حد تک عادی ہو جاتا ہے کہ گرمیوں میں بھی وہی لباس پہنے رکھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں وہ گرمیوں اور سردیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ لباس بنوانے کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو۔ جب ہم نے ہوٹل کا نام اور پتہ بتایا تو کوچوان نے اپنی نشست پہ بیٹھے بیٹھے ہماری طرف دیکھ کر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ مسکراہٹ سے اس کی باچھیں کھلیں اور اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر ایک چابک رسید کی۔ گھوڑا اچھل پڑا اور درونہ کی حرکت میں آئی۔ یہ وکٹوریہ کی شکل کی گاڑی تھی جس کے پہیئے چھوٹے چھوٹے تھے۔ سردیوں میں جب زمین پر برف جم جاتی ہے تو یہ پہیئے اتار دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ سکینز لگا دی جاتی ہیں۔ جن سے یہ وکٹوریہ گاڑی ایک سلیج بن جاتی ہے جسے گھوڑا بڑی آسانی سے کھینچ لیتا ہے۔ ان دنوں پیٹرز برگ کے عام بازاروں اور سڑکوں پر رات کے وقت مدھم سی روشنی ہوا کرتی تھی۔ لیمپ دُور دُور نصب تھے اور ان کی روشنی تیز نہیں تھی۔ کوچوان شاید فاصلہ کم کرنے کی خاطر ہمیں غیر معروف اور تنگ سڑکوں پر سے لئے جا رہا تھا۔ پیٹرز برگ کی شہرت اچھی نہ تھی اور رات کا اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہمیں کچھ فکر ہوئی کہ یہ ہمیں کہاں لئے جا رہا ہے۔ سردار صاحب کسی وقت اسے پنجابی میں گالی دیکر پوچھتے تم ہمیں کہاں لئے جا رہے ہو؟ اس کے کان پنجابی اور انگریزی دونوں سے ناآشنا تھے۔ لیکن سردار صاحب کی بلند آواز اور استفہامیہ لہجے سے وہ اتنا سمجھ جاتا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔ وہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا، مسکراتا سر ہلاتا اور ہوٹل کا نام لیکر "بول شائیا مورس کائیا" الفاظ دہرا دیتا۔ جس سے اسوقت نہ تو کچھ ہمارے پلے پڑتا نہ ہماری تسلی ہوتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بول شائیا مورس کائیا بڑی نہر کو کہتے ہیں جس کے قریب ہمارا ہوٹل تھا سردار صاحب اسے مسکراتے ہوئے دو تین اردو گالیاں سنا دیتے اور اپنا موٹا بید کا ڈنڈا جس کا ہینڈل چاندی کا تھا اور جو انگلستان کیلئے روانہ ہوتے وقت ان کے ماموں شیخ اصغر علی صاحب نے انہیں بطور تحفہ دیا تھا اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے ہلا دیتے۔ آخر ہم ایک نیم اندھیری سڑک سے نکل کر ایک روشن چوک میں داخل ہوئے اور ہماری وکٹوریہ ہوٹل انگلے ٹیر کے سامنے آکر رک گئی۔ کوچوان اور سردار محمد اکبر خانصاحب ہنستے ہنستے ایکدوسرے سے رخصت ہوئے۔

ہم پیٹرز برگ میں ڈرتے ڈرتے آئے تھے کیونکہ زار کی خفیہ پولیس کے کئی قصے سنے اور

پڑھے ہوئے تھے لیکن ہم نے اسے ایک دلچسپ شہر پایا۔ جس میں جگہ جگہ پہ مشرق و مغرب کے امتزاج کی بہت دلفریب جھلک نظر آتی تھی۔ "نوسکی پراسپکٹ" کے عین وسط میں زار سکندر ثالث کا یادگار زنگار رنگ گنبدوں والا گرجا تھا۔ دریائے نیوا کے اس پار پطرس اور پولوس کے قلعے کے بالمقابل ایک عالیشان مسجد نئی تعمیر ہوئی تھی۔ گو اس کی اندرونی تکمیل ابھی باقی تھی ہم اسے دیکھنے گئے۔ ایک مزدور مسجد کے احاطے میں کام کر رہا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا:۔ "مسلمان؟" اس کا چہرہ کھل گیا اور زور سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "دا۔ دا۔ الحمدللہ" میں نے کلمہ شریف پڑھا۔ اس نے دہرایا۔ جانبین نے پہچان لیا ہم بھائی بھائی ہیں۔ سینٹ آئزک کا گرجا تو ہمارے ہوٹل کے سامنے ہی تھا اس کی عمارت تو مغربی طرز کی ہے۔ لیکن اندر مغربی ممالک کے گرجوں کی طرح نشستوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ لوگ دورانِ عبادت کھڑے رہتے۔ اور یا پھر گھٹنوں کے بل ہو جاتے۔ نشستیں نہ ہونے کی وجہ سے روسی گرجے اندر سے اسلامی مساجد سے کچھ مشابہت رکھتے لیکن یہ مشابہت یہیں پہ ختم ہو جاتی تھی۔ کیونکہ روسی گرجوں میں دیواروں اور چھت پہ مذہبی مقدس تصاویر بنی ہوتی تھیں اور جابجا "آئی کانز" رکھے ہوتے تھے۔ ہم نے گرجے میں کئی "آئی کانز" دیکھے جن کی قیمت کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل تھا۔ ایک میں حضرت مریم کے دل کی جگہ ایک بڑا لعل جڑا ہوا تھا آنکھیں بڑے بڑے سبزے یا زمرد کی تھیں بعض چوکھٹے سونے کے معلوم ہوتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۹۱۳ء میں پیٹرزبرگ (حال لینن گراڈ) میں مسلمانوں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی ان میں سے اکثر تاتاری تھے جو روسی امراء کے محلات میں پہرے اور نگرانی پہ متعین تھے۔ اکی یہ وجہ بتائی جاتی تھی کہ چونکہ وہ شراب نہیں پیتے اسلئے پہرے اور نگرانی کے فرائض بہت اچھی طرح نبھا سکتے ہیں۔ پچاس سال بعد جب میں اس شہر میں دوسری دفعہ گیا تو اگرچہ میرا قیام ایک ہی دن کا تھا لیکن میں مسجد کو بھی دیکھنے گیا۔ مسجد آباد اور زیر استعمال تھی۔ مسجد اندر سے تو اچھی حالت میں تھی لیکن احاطے میں نشیب و فراز تھے اور مرمت کی ضرورت تھی۔ امام صاحب اس وقت کہیں باہر تشریف لیگئے ہوئے تھے اسلئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

پیٹرزبرگ (حال لینن گراڈ) میں سب سے بڑھ کر قابلِ دید مقامات ونٹر پیلس (سرمائی محل) اور ہرمیٹج ہیں یہ دونوں محلات دریائے نیوا کے کنارے ایک دوسرے سے ملحق واقعہ ہیں اور کیتھرائن اعظم کی یادگار ہیں۔ اب تو یہ دونوں عمارات عجائب گھر ہیں اور عجائبات سے بھری پڑی ہیں۔ ۱۹۱۳ء

ہیں سمرمائی محل زار کی قیام گاہ تھا۔ یہ محل اتنا وسیع ہے کہ جب یہ زار کی قیام گاہ تھا تو سب سے اوپر کی منزل پر جہاں خدام شاہی رہا کرتے تھے چھت پر انہوں نے گائے اور دیگر پالتو جانور رکھے ہوئے تھے۔ ان محلات کے عجائبات میں سے سب سے قیمتی شاہی خاندان کے جواہرات اور زیورات ہیں ان محلات میں اب تو زائرین کا ہر وقت خوب جمگھٹا رہتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں زائرین کا اسقدر ہجوم نہیں ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ونیٹر پیلیس اور ہرمیٹیج کا باہر کا پلستر گہرے سرخ رنگ کا ہوا کرتا تھا اب سفید اور ہلکا سبز ہے جو نسبتاً بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ گرجے اور محلات کے درمیان زار پطرس اعظم کا ایک مجسمہ ہے جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے۔ مجسمے کا رخ دریائے نیوا کی طرف ہے۔ ماہرین فن اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ گھوڑا اور سوار دونوں تیز حرکت کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں زمین سے اٹھے ہوئے ہیں اور گھوڑے اور سوار دونوں کا سارا بوجھ گھوڑے کے پچھلے دو پاؤں اور دم پر ہے۔ دم بہت بھاری بنائی گئی ہے۔ اور پچھلے دونوں پاؤں کی مانند زمین پر لگی ہوئی ہے۔ اس طرح پچھلے دونوں پاؤں اور دم کا ایک تکونہ بن گیا ہے۔ جو مجسمے کا سارا بوجھ سہارے ہوئے ہے۔ سردار محمد اکبر خالصاحب اور میں پیٹرزبرگ سے باہر پیٹرہاف میں زار کا محل دیکھنے بھی گئے۔ یہ محل بھی خلیج فنلینڈ کے کنارے پر ہے اور اس کے باغات اور فواروں کا نظارہ بہت دلفزا ہے۔ پیٹرزبرگ سے ہم ریل پر گئے۔ یہ ریل بالٹک ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی۔ اسٹیشن پر گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے ایک فوجی افسر کو اپنے دو ساتھی افسروں کے روبرو ایک سپاہی سے جو ان کے لئے کوئی پارسل لایا تھا نہایت ہتک آمیز سلوک کرتے دیکھا۔ سپاہی کے رویئے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس سے بہتر سلوک کی توقع نہیں تھی۔ ہمیں اس سے تعجب ہوا۔ اور ہم نے یہ اثر لیا کہ ان دنوں روسی فوج میں افسران اور سپاہیوں کے درمیان اخلاص اور احترام کے جذبات کی فراوانی نہیں تھی۔ ہم پیٹرہاف کے محل کے اندر تو نہ گئے کیونکہ وہاں پہرے وغیرہ کے انتظام سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زار اور شاہی خاندان کے افراد وہاں سکونت پذیر ہیں۔ باغ کی سیر سے ضرور لطف اندوز ہوئے اسٹیشن پر واپس آنے تک شام کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے چاہا کہ کھانا اسٹیشن پر ہی کھالیں۔ پیٹرزبرگ واپس پہنچنے کا انتظار نہ کریں۔ ہم کھانے کے کمرے میں چلے گئے لیکن وہاں انگریزی کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ مینجر نے ہمیں اشارے سے سمجھایا کہ ذرا انتظار کرو۔ وہ جا کر ایک افسر کو لے آیا جو انگریزی سمجھتا تھا۔ اس نے ہماری ترجمانی کی۔ جلد ہمارا مطلوبہ کھانا مل گیا۔ جو ہم نے بہت پسند کیا قیمت بھی مناسب تھی۔ کھانا ختم کرنے کے جلد بعد ہماری گاڑی آگئی اور ہم آرام سے واپس پیٹرزبرگ پہنچ گئے۔

فنلینڈ | پیٹرز برگ سے ہم "وائی بورگ" ہوتے ہوئے "نشلاٹ" گئے۔ فنلینڈ میں ان دنوں رواج تھا کہ گرمی کی تعطیلات میں جب زائرین کے آنے کا موسم ہوتا تو سیر کے مقامات پر زائرین کی سہولت کیلئے دفاتر کھول دیئے جاتے پڑھے لکھے نوجوان اور خواتین رضا کارانہ طور پر ان میں مختلف خدمات بجالاتے۔ جس سے زائرین کو بہت مدد ملتی اور ہر قسم کی سہولت میسر آجاتی۔ ان دنوں "نشلاٹ" میں اس دفتر کی انچارج ایک نہایت سلجھی ہوئی طبیعت کی خاتون مس نینا تھیں۔ جو ہمارے ساتھ بہت خوش خلقی سے پیش آئیں اور ہمیں اپنا پروگرام بنانے کیلئے جن معلومات کی ضرورت تھی بہم پہنچائیں۔ "نشلاٹ" سے ہم "اماترا" گئے یہاں کا ہوٹل نہایت خوشنما جگہ پر واقعہ ہے۔ ہوٹل کے عین نیچے دریا بہتا ہے۔ میرے کمرے سے اماترا کی آبشار کا نظارہ بڑا دلفریب تھا۔ ہوٹل سے دریا تک اترنے کیلئے راستہ بنا ہوا تھا۔ اگرچہ اس مقام پر بھی پانی زور سے اور بڑی بڑی چٹانوں کے گرد ہوکر بہتا تھا پھر بھی وہاں ایک محتاط آدمی کیلئے نہانے میں کوئی ایسا خطرہ نہیں تھا۔ ہم دو رات اس ہوٹل میں ٹھہرے اور دونوں صبح دریا میں نہانے کا لطف اٹھایا۔ پانی یخ کی مانند ٹھنڈا تھا اور ہم ایک وقت میں چند لحظوں سے زیادہ پانی کے اندر ٹھہرنا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ اب "اماترا" میں کوئی آبشار نہیں۔ کیونکہ دریا کا پانی بجلی پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو ٹربائینز میں سے ہوکر بہ جاتا ہے۔ ترقی کے معبد پر ایک اور بھینٹ!

اماترا سے ہم پھر "ولمن سٹرینڈ" گئے اور وہاں سے جہاز پر "کوپیو" گئے۔ یہ تمام سفر جھیل میں سے تھا اور نہایت پُر لطف رہا۔ فنلینڈ میں ایک لمبا سلسلہ جھیلوں، جزیروں اور جنگلات کا چلا جاتا ہے۔ جہاز کے اس سفر کے کسی حصے میں بھی ایک وقت نصف بلکہ چوتھائی میل سے زیادہ پانی کی سطح نظر نہیں آتی۔ جہاز چاروں طرف سبز جزیروں سے گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جزیروں کے بیچوں بیچ اپنا رستہ تلاش کرتا ہے۔ کوپیو سے ہم ریل پر "کجانا" گئے۔ ریل کی یہ شاخ یہاں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ شہر اسی نام کی وسیع جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر واقعہ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے تو اس وقت اس کی حیثیت ایک بڑے گاؤں یا ایک چھوٹے قصبے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ لیکن فنلینڈ کے شمالی حصے کی جنگلاتی پیداوار کا مخرج ہونے کی وجہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سب عمارتیں لکڑی کی تھیں ہمارا مختصر سا ہوٹل بھی سب لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ہوا چیڑ اور سپروس قسم کے درختوں کی خوشبو سے لدی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ہوٹل جھیل کے کنارے پر تھا۔ اور اس کے عین نیچے جھیل کے جہازوں کے مسافروں کے اترنے اور چڑھنے کی جگہ تھی۔ ہم چار بجے بعد دوپہر پہنچے تھے۔ آرام سے بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کر

رہے تھے کہ سردار صاحب نے دریافت کیا کل کا کیا پروگرام ہے۔ انہیں ایک دن سے زیادہ کا پروگرام ذہن میں رکھنے کی زحمت گوارا نہ تھی۔ ہر روز اس دن کا پروگرام ختم ہونے پر دوسرے دن کا پروگرام دریافت فرما لیتے تھے۔ اور اس کے مطابق ہر صبح تیار ہو جاتے تھے۔ میں نے بتایا کل کا پروگرام ہے تو لمبا لیکن ہے بہت دلچسپ۔ کل صبح ہمیں چھ بجے روانہ ہونا ہے۔ کہا اتنی جلدی کیا ہے؟ میں نے کہا جہاز کی روانگی کا وقت چھ بجے ہے اتنی سہولت ہے کہ جہاز اس ہوٹل کے نیچے سے روانہ ہوگا۔ اور ناشتہ جہاز پر ہوگا۔ دریافت کیا ہم کہاں جائیں گے؟ میں نے بتلایا کہ جہاز پر تو صرف جھیل کی دوسری جانب جائیں گے جس میں چار گھنٹے صرف ہوں گے۔ وہاں سے کشتی میں بیٹھ کر دریائے "الیا" میں ساحل کی طرف سفر کریں گے۔ تین مقامات پر تیز پانیوں میں سے گذر کر جب شام کے قریب دریا کے ہموار حصے میں پہنچیں گے تو وہاں سے دخانی جہاز پر "لولیابورگ" چلے جائیں گے۔ کہنے لگے اس میں خاص دلچسپی کیا ہوئی؟ میں نے کہا دریا کے RAPIDS میں سے کشتی بہت تیز گذرتی ہے اور وہ حصے خطرے سے بھی خالی نہیں۔ بہت لطف کا سفر ہے۔ پوچھا خطرہ کیا ہے؟ میں نے کہا خطرہ دو قسم کا ہے ایک تو ان شمالی علاقوں میں دھند بہت جلد چھا جاتی ہے۔ اگر دھند اس وقت پھیل جائے جب کشتی RAPID میں سے گذر رہی ہو تو کنارے سے یا درمیان میں کسی چٹان سے ٹکرا کر کشتی کے ڈوب جانے کا شدید اندیشہ ہوتا ہے۔ دوسرے آخری RAPID کے اختتام پر دریا ایک پہاڑ سے ٹکرا کر اس کے گرد چکر لگاتا ہے اور اس تصادم کی وجہ سے دریا میں بہت زور کے بھنور پڑتے ہیں۔ یہ مقام بہت خطرے کا ہے اگر کشتی کو عین وقت پر چکر نہ دیا جائے اور ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جائے تو کشتی پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور اگر ایک لحظہ قبل از وقت چکر دیدیا جائے تو بھنور میں الجھ کر غرق ہو جائے۔ کہنے لگے تو لطف کس بات کا ہوا؟ میں نے کہا یہی تو لطف ہے کہ ایسے پر خطر مقامات میں سے انسان اتنی تیزی سے صحیح سلامت گذر جائے۔ اس پر سردار صاحب خوب قہقہہ مار کر ہنسے اور کہا آپ بھائی ایسے خطرے میں ہم پڑیں ہی کیوں؟ میری بیوہ ماں نے مجھے پڑھنے کیلئے بھیجا ہے اس قسم کی شعبدہ بازیوں کے لئے نہیں بھیجا ہمیں کیا مجبوری ہے کہ ہم اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ پہاڑی برف پر پھسلنے اور اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کی طرح SHOOTING THE RAPIDS بھی ایک قسم کا کھیل ہے۔ لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر پوچھا اس کھیل میں خطرے کے عنصر کا کچھ اندازہ بھی ہے۔ میں نے بتایا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ملین سے لیکر تین

فیصدی تک کشتیاں تلف ہو جاتی ہیں۔ سنتے ہی کہا پھر تو اس مہم پہ جانا خالص دیوانگی ہے میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا اور تمہیں بھی نہیں جانا چاہیئے۔ لیکن اگر تمہیں اصرار ہے تو تم جاؤ اور میری واپسی کا کوئی اور انتظام کرو۔ ہم ریلوے اسٹیشن پہ گئے تاکہ ان کے واپسی کے سفر کا کوئی اور رستہ معلوم کریں لیکن اسٹیشن کی عمارت پہ قفل لگا ہوا تھا۔ یہ بات بھی ان کی ہنسی کا موجب ہوئی۔ ایک ملازم اسٹیشن کی عمارت کے سامنے جھاڑو دے رہا تھا۔ وہ ہماری بات نہ سمجھ سکا۔ ہم اس کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ صرف اشاروں اور چند جرمن الفاظ کی مدد سے اتنا معلوم ہو سکا کہ دن بھر میں ایک ہی گاڑی جس پہ ہم آئے تھے یہاں تک آتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے۔ ناچار ہم ہوٹل واپس چلے آئے اور سردار صاحب نے کہا اچھا بھائی اب جو قسمت ہے۔

SHOOTING THE RAPIDS دوسری صبح ہم چھ بجے جھیل کے جہاز پہ سوار ہوئے اور دس بجے دریائے "الیا" کے منبع پہ پہنچے جہاز نے جھیل کے درمیان ہی لنگر ڈال دیا اور ایک کشتی جو جہاز کے انتظار میں تھی جہاز کے ساتھ آ لگی۔ اندازاً چار فٹ چوڑی اور بیس فٹ لمبی ہوگی۔ کشتی کے ایک سرے پہ ملاح بیٹھا تھا۔ دوسرے پہ ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا جو اس کا بیٹا یا شاگرد تھا۔ اور اس کا معاون بھی تھا۔ مسافر دو دو کی قطار میں کشتی میں بیٹھ گئے ہمارے منہ کشتی کے اس سرے کی طرف تھے۔ جہاں لڑکا بیٹھا تھا۔ ہمارے بیگ ہمارے پاؤں میں رکھ دیئے گئے۔ اور ملاح نے ایک چھوٹے سے چپو کی مدد سے کشتی کو پانی کی اس رو کی طرف لیجانا شروع کیا جو جھیل میں سے ایک جانب بہتی نظر آ رہی تھی آہستہ آہستہ یہ رو تیز ہوتی گئی اور کشتی نے اس میں تیزی سے بہنا شروع کر دیا۔ چار پانچ منٹ نہ گذرے ہوں گے کہ سامنے ایک پتھر کا بلند کٹہرا نظر آنے لگا۔ جس کی طرف کشتی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس کٹہرے کے اندر جو خلا تھے ان میں سے پانی بڑی سرعت کے ساتھ جھیل سے خارج ہو رہا تھا۔ سب سے بڑے خلا کی چوڑائی پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اس میں سے کشتی تیر کی طرح نکل کر دریا میں داخل ہو گئی۔ یہ پہلے RAPID کی ابتدا تھی جو چھ میل لمبا تھا۔ پانی کی رفتار نہایت تیز تھی اور کشتی اس کی ناہموار سطح پہ رقص کرتی جا رہی تھی۔ دریا کے کنارے اونچے تھے اور تیز رفتار سے مخالف سمت بھاگتے نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کشتی تو پانی کی سطح پہ ایک ہی مقام پہ رقصاں ہے اور دریا کے کنارے بھاگتے جا رہے ہیں۔ یہ چھ میل کا فاصلہ چند منٹوں میں طے ہو گیا۔ کشتی دریا کے ہموار حصے میں پہنچ گئی۔ ایک منتظر دخانی کشتی نے رسی پھینک دی جسے ہمارے ملاح نے کشتی کے سرے سے باندھ لیا اور دخانی کشتی

نے ہماری کشتی کو کھینچنا شروع کر دیا۔ یہاں دریا کا پاٹ چوڑا ہو گیا اور کنارے بھی نیچے ہو گئے اردگرد کا علاقہ بالکل سنسان تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آبادی بہت ہی کم ہے کسی قسم کی آمدورفت کا سلسلہ دریا کے کناروں پر نظر نہ آتا تھا۔ دخانی کشتی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ RAPID کے مقابلے میں سفر کا یہ حصہ بہت سست رفتاری سے طے ہوا اور کوئی امر دلچسپی کا نہ تھا۔

RAPID میں سے گذرتے ہوئے ہماری تمام تر توجہ اس عجیب کیفیت کی طرف تھی جس میں سے ہم گذر رہے تھے اور جس کا ہمیں پہلے تجربہ تھا نہ صحیح اندازہ۔ بات چیت کا نہ موقع تھا نہ طبیعت بات چیت پر مائل تھی یوں بھی ہدایت تھی کہ RAPID میں سے گذرنے کے دوران کوئی مسافر ملاح سے کوئی بات نہ کرے۔ ملاح کی ساری توجہ کشتی کی طرف تھی۔ وہ اپنے چپو کی خفیف سی حرکت سے کشتی کو چٹانوں اور بھنوروں کی زد سے بچاتے ہوئے نسبتاً گہرے پانی کی رو میں سے لئے جاتا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ اور جسم تشنج کی حالت میں ہیں۔ آنکھیں پانی کی رو پر جمی ہوئی تھیں اور پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ ہماری پیٹھ اس کی طرف تھی اور اگرچہ ہم اس طور پر بھنچ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ زیادہ ہلنے جلنے کی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی گردن موڑ کر ہم اسے دیکھ لیتے تھے کیونکہ یہاں تک انسانی ہنر اور احتیاط کا تعلق تھا ہماری سلامتی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ سردار صاحب اور میں کبھی کبھی آپس میں بات چیت کر لیتے تھے۔ اگرچہ وہ اس حصۂ سفر کے متعلق مطمئن نہ تھے اور حالات سے مجبور ہو کر رضامند ہوئے تھے۔ لیکن جب سفر شروع ہو گیا تو انہوں نے کسی مرحلے پر بھی پریشانی کا اظہار کیا نہ بے آرامی کی شکایت کی بلکہ جیسے ان کی عادت تھی ہر بات پر ہنستے رہے اور خطرے کے پہلو کو مذاق میں ٹالتے رہے۔ ہمارے آگے جو دو مسافر بیٹھے تھے ان میں سے ایک تجارتی گماشتہ تھا۔ وہ انگریزی سے تھوڑی سی واقفیت رکھتا تھا۔ نوجوان تھا اور ہلکے جسم کا تھا۔ جب ہمیں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ خود ہمیں بتا دیتا یا ہم اس سے دریافت کر لیتے۔ دوسرا ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم لانبے قد کا تھا۔ سردار صاحب اکثر وقت پنجابی میں اس کا مذاق اڑاتے چلے گئے۔ یہاں ذرا خطرے کا احساس ہوتا کہتے خدا خیر کرے یہ برہمن ہمیں لے ڈوبے گا۔

دوپہر کے وقت دریا کے ہموار حصے میں کشتی تھوڑی دیر کے لئے کنارے لگی۔ کنارہ اونچا تھا کشتی میں ہلنے جلنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم نے یہ موقعہ غنیمت جانا کشتی سے اتر کر اوپر چڑھ گئے اور چند منٹ کنارے کے قریب گھوم لئے۔ کنارے کے قریب ہی ایک بڑھیا سیاہ قہوہ اور باسی پیسٹری بیچ رہی تھی۔ قہوے کیلئے تو چینی میسر نہ تھی لیکن خلاف توقع دودھ بھی نہ تھا۔ حالانکہ فنلینڈ میں دودھ عام

ملتا ہے اور چھوٹے قصبات اور دیہات میں تو کھانے کے ساتھ دودھ اور لسّی پانی کی طرح پیئے جاتے ہیں اور ان کی قیمت نہیں لی جاتی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کا دن بھر میں کوئی موقعہ نہیں ہوگا۔ جھیل کے جہاز پر ہمنے سیر ہوکر ناشتہ کر لیا تھا۔ اب دوپہر کے کھانے کی جگہ کڑوے سیاہ قہوے اور باسی پیسٹری پر اکتفا کیا۔ جب ہم دوسرے RAPID کے قریب پہنچے تو ہمارے ملاح نے دخانی کشتی والی رسّی کھول دی اور ہماری کشتی پانی کے بہاؤ کے ساتھ RAPID کی طرف بڑھنا شروع ہوئی اور جلد ہی اس کی تیز ناہموار سطح پر محو رقص ہوگئی یہ RAPID نو میل لمبا تھا اور یہاں بھی وہی کیفیت رہی جو پہلے RAPID میں پیش آئی تھی۔ یہ نو میل کا فاصلہ بہت جلد طے ہو گیا اور RAPID سے نکلنے پر پھر ہماری کشتی ایک دخانی کشتی کے ساتھ باندھ دی گئی۔ آخر کار ہم تیسرے اور آخری RAPID میں داخل ہو گئے۔ اس کے اختتام پر ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دریا چاروں طرف سے پہاڑ کے اندر گھر کر اس کے نیچے غائب ہو جاتا ہے۔ کشتی بہت تیزی سے پہاڑ کی طرف بڑھتی گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ پہاڑ کے ساتھ ٹکراؤ میں کوئی مفر نہیں۔ یکایک ہمارے بائیں ہاتھ کے کنارے اور پہاڑ کے درمیان ایک پاٹ نظر آیا اور کشتی جو پہلے ہی مجنونانہ رقص کر رہی تھی نہایت تیزی سے چکر کھانے لگی۔ بعض مسافروں کی تو بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ملاح کے چپو کی کسی حرکت کے نتیجے میں دونوں کنارے اور سامنے کا پہاڑ تیزی سے کشتی کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ یہ کیفیت چند سیکنڈ رہی اور دفعتاً کنارے اور پہاڑ سب غائب ہو گئے اور کشتی ہموار سطح پر کسی قدر تیزی سے بڑھتی معلوم ہوئی۔ یہاں دریا کا پاٹ پھر چوڑا ہو گیا تھا۔ اور کنارے اگرچہ اب بھی اونچے تھے لیکن کچھ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے دریا ان میں گھرا ہوا نہیں تھا۔ اور پتھریلی چٹانوں کی جگہ مٹی نے لے لی تھی۔ کشتی ایک دخانی جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی جو کنارے کے قریب لنگر ڈالے تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہم اس جہاز پر "الیا بورگ" جائیں گے لیکن ہماری کشتی کے مسافروں کی حرکات اور دفعتاً گفتگو کا سلسلہ تیز ہو جانے سے ہم نے قیاس کیا کہ کوئی خلاف توقع بات ہو گئی ہے۔ ہمارے تاجر ہمسفر نے بتایا کہ ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ "الیا بورگ" جانیوالا جہاز جا چکا ہے۔ اور یہ جہاز جو کھڑا ہے کل صبح جائیگا ہم نے دریافت کیا کہ رات بسر کرنے کا کوئی سامان ہو گا۔ اس نے کہا قریب ہی ایک فارم میں جگہ مل جائے گی۔ اتنے میں کشتی کنارے آلگی اور ہم اپنے سامان سمیت اتر آئے۔ ہمارے ہمسفر نے ادھر ادھر نگہ دوڑائی اور ہمیں ذرا ٹھہرو کہہ کر وہ پھرتی سے دائیں طرف لپکے اور چند گز جا کر ایک سہ پہیہ ریڑی کو جو الٹی پڑی ہوئی تھی سیدھا کیا اور اسے دھکیلتے ہوئے لے آئے۔ کوئی لفظ کہے بغیر اپنا اور ہمارے دونوں

بیگ اس میں لاد لئے۔ اور اسے کنارے کے اوپر کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ باقی مسافر اپنا اپنا سامان اٹھائے اسی طرف جا رہے تھے۔ کنارے پر چڑھ کر دیکھا کہ علاقہ سرسبز ہے اور کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان کاشتکاروں کے مکان نظر آتے ہیں۔ ہم سب نے ایک مکان کا رخ کیا جو بڑا بھی نظر آتا تھا اور حیثیت میں بھی ممتاز معلوم ہوتا تھا۔ مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پہلے سے ہی یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ کمرے کشادہ ہوادار اور نہایت صاف تھے۔ سامان سادہ تھا۔ لیکن ہر ضروری چیز مہیا تھی۔ معلوم ہوا کہ "الیابورگ" آنے جانے والے جہاز چونکہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور کئی دفعہ مسافروں کو یہاں رات بسر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس لئے اس مکان والوں نے انہیں ٹھہرانے کا انتظام کیا ہوا ہے۔

جب ہم منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئے تو ہمارے ہمسفر نے کہا کھانے کا انتظام ایک قریب کے فارم ہاؤس میں ہے چلو وہاں چلیں۔ ہم کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے وہاں گئے کوئی نصف میل کا فاصلہ تھا۔ دن کا اکثر حصہ ایک تنگ کشتی میں جکڑے ہوئے گذارنے کے بعد یہ مختصر سی سیر بہت خوشگوار معلوم ہوئی۔ یہ مکان بھی نہایت صاف ستھرا تھا۔ سب سے بڑے کمرے میں کھانے کا میز ہر قسم کے ٹھنڈے اور گرم کھانوں سے لدا ہوا تھا۔ انڈے، مچھلی، گوشت، ترکاری، سلاد، قسم قسم کی روٹی، دودھ لسی سب بافراط موجود تھے، شیریں پھل، چائے، قہوہ کی کمی نہ تھی۔ ہم سب دن بھر کے بھوکے تھے۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔ گھر کی دو خواتین بطور میزبان کمرے میں موجود تھیں۔ وہ آرام سے کرسیوں پر بیٹھی سلائی یا کشیدے کے شغل میں مصروف تھیں اور ساتھ ساتھ مہمانوں کے ساتھ بات چیت بھی جاری تھی۔ سارا ماحول گھریلو تھا۔ کسی قسم کا اجنبیت کا احساس نہیں تھا۔ شام بہت آرام اور دلچسپی میں گذری۔ کھانے کے دام اسقدر کم تھے کہ مجھے اس سے پہلے کبھی اتنا عمدہ کھانا اتنے سستے داموں کھانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہم سب سے بلا امتیاز صرف ایک ایک فنش مارک طلب کیا گیا جس کی اسوقت کی قیمت انگریزی سکے میں دس پنس تھی۔ ان دنوں فنلینڈ میں ہر چیز بہت واجبی قیمت پر مل جاتی تھی اور بلجیم اور فنلینڈ یورپ کے ممالک میں سب سے سستے سمجھے جاتے تھے۔

دوسری صبح ہم دخانی جہاز پر "الیابورگ" پہنچ گئے۔ ہمارے اس سفر میں یہ سب سے شمالی مقام تھا۔ ہمارے پہلے پروگرام کے مطابق تو ہمیں یہاں سے شمال کو جانا تھا اور خلیج بوتھنیا کے گرد ہو کر سویڈن میں سے ہوتے ہوئے انگلستان واپس لوٹنا تھا۔ لیکن بعد میں ہم نے یہ پروگرام بدل دیا اور ایک دن "الیابورگ" ٹھہر کر بذریعہ ریل واپس جنوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ "الیابورگ" میں ہمیں دو تین لیپ لینڈ

کے رہنے والے بھی نظر آئے۔ ایک ان میں سے کوچوان تھا۔ دونین شائد اپنی ضرورت کی بات خریدنے شہر میں آئے ہوئے تھے۔ ہمارا ریل کا سفر لمبا تھا لیکن سفر کے دوران میں ہمیں ملک کے دیکھنے اور لوگوں کے طور طریق ملاحظہ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ان دنوں فنلینڈ میں ریل کے انجنوں میں زیادہ تر لکڑی بطور ایندھن استعمال ہوتی تھی۔ کوئلہ بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ فائرمین کا کام کرنے کیلئے کسی رضا کار مسافر کو انجن میں سوار کر لیا جاتا تھا۔ اسے کرایہ بچ جاتا تھا۔ اور ریل کے محکمے کو اس کی مزدوری بچ جاتی تھی۔ اس سفر میں ریل کے ساتھ کھانے کی گاڑی نہیں تھی۔ لیکن کھانے کے اوقات پر ریل کسی ایسے سٹیشن پر رک جاتی تھی جہاں کھانا میسر ہوتا تھا۔ مسافر آرام سے کھانا کھا لیتے تو ریل پھر روانہ ہو جاتی ان اسٹیشنوں پر کھانا عمدہ ملتا رہا اور قیمت سب جگہ نہایت واجبی تھی ہم دوسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کے ڈبے میں سفر کرنیوالے ایک صاحب ہمیں اجنبی دیکھ کر جہاں گاڑی کھڑی ہوتی ہمارے ساتھ ہو جاتے اور اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہماری ہر ضرورت کا قیاس کر کے اسے پورا کرنے میں ہماری مدد کرتے۔ کھانے کے کمرے میں بھی ہمارے ساتھ رہتے کھانے کے انتخاب اور قیمت ادا کرنے میں ہماری مدد کرتے اور ہر طرح سے ہمارے آرام کا خیال رکھتے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ شام کے کھانے کیلئے جب گاڑی کھڑی ہوئی اور ہم کھانا کھا کر اپنے کمرہ میں واپس آئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرے کے نچلے اور اوپر والے دونوں بنچوں پر بستر لگا دیئے گئے ہیں جس سے ہمیں بہت اطمینان ہوا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہمیں رات بیٹھ کر یا بغیر بستر کے گدوں پر لیٹے گذارنا ہو گی۔ معلوم ہوا کہ بغیر زائد کرایہ وصول کئے رات کے سفر کے لئے بستر مہیا کر دیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ مجھے صرف فنلینڈ میں ہوا۔ بستر بہت صاف ستھرے تھے اور ہر ضروری چیز مہیا تھی۔ ہماری رات نہایت آرام سے کٹی۔ فالحمدللہ ہمارا یہ سفر بڑا دلچسپ رہا اور ہم بخیریت لندن واپس آگئے۔

مسز می | اس سال گرمیوں کے شروع میں میرے ہم جماعت مسٹر محمد حسن نے تحریک کی تھی کہ میں ان کے ساتھ نمبر سہ لان کریسنٹ کیو گارڈنز میں رہائش منتقل کر لوں۔ مجھے اس میں کچھ تامل تھا۔ وہ علاقہ تو مجھے بہت پسند تھا اور میں کئی دفعہ اس باغ کی سیر کے لئے جاتا بھی رہا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں تو اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن مسز فائرن کے ہاں میری رہائش کا انتظام تسلی بخش تھا اور میری طبیعت بے سبب رہائش تبدیل کرنے پر مائل نہ تھی۔ مسٹر محمد حسن نے اصرار کیا کہ ایک شام ہمارے ہاں کھانے پر تو آؤ۔ میں گیا تو مکان مجھے بہت پسند آیا۔ کھانا بھی بہت عمدہ تھا مکان کی مالکہ مسز می بہت تواضع سے پیش آئیں۔ مکان ان کی اپنی ملکیت تھا۔ اور ساتھ کے مکان کی بھی وہی مالک تھیں

ان کے میاں کسی بنک کی ایک لوکل شاخ کے منیجر تھے اور اپنی وفات پر انہیں خاصا خوشحال چھوڑ گئے تھے۔ ان کی کوئی اور اولاد نہیں تھی ان کی طبیعت بہت بشاش اور متواضع تھی۔ مکان کا ماحول بورڈنگ ہاؤس کا سا نہیں تھا۔ بالکل ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں ہیں۔ مکان کا ساز و سامان بھی نہایت عمدہ تھا۔ ان دنوں اکثر مکانوں میں گیس کی روشنی ہوا کرتی تھی۔ مسز می کے ہاں بجلی کی روشنی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ آرام تھا کہ دو کمرے میسر تھے ایک سونے کا دوسرا بیٹھنے اور پڑھنے کا۔ اور بھی بعض سہولتیں تھیں گرمیوں کے موسم کا آغاز تھا۔ کیو گارڈنز کا قرب بھی کشش کا موجب تھا۔ میں نقل مکان پر رضامند ہو گیا اور ہفتہ دس دن بعد مسز فائزن کے ہاں سے مسز می کے ہاں اٹھ آیا۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد مسٹر محمد حسن وہاں سے کسی نجی مصلحت کی وجہ سے نقل مکان کر گئے۔ مسز می کسی لحاظ سے بھی لندن کی لینڈ لیڈی ثابت نہ ہوئیں۔ لینڈ لیڈی ایک کاروباری خاتون ہوتی ہے۔ جس کا فرض اولین اپنی روزی کمانا ہوتا ہے۔ مسز فائزن اپنے حسنِ انتظام، دیانت، محنت، توجہ، اخلاق اور تواضع کے لحاظ سے اپنی صنف کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ میں جتنا عرصہ ان کے ہاں رہا (کیو گارڈنز چلے جانے سے پہلے بھی اور وہاں سے واپسی پر بھی) ان کی شفقت کا مورد رہا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء وہ اپنا وقار بھی قائم رکھتی تھیں اور مکان کا انتظام بھی خوبی اور توجہ سے کرتی تھیں۔ طبعاً انہیں پیسے پیسے کا حساب بھی رکھنا ہوتا تھا۔ اور خیال بھی رکھنا پڑتا تھا۔ ورنہ ان کا ذریعہ معاش مخدوش ہو جاتا مسز می اس قید سے آزاد تھیں۔ علاوہ دو مکانوں کے ان کے میاں اور بھی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ وہ اپنے گھر میں کرایہ دار مہمان رکھنے پر مجبور نہ تھیں۔ اور یہ کرایہ ان کا ذریعہ معاش نہ تھا۔ دو عمدہ سجے ہوئے کمروں کا کرایہ ان کے ہاں مسز فائزن کے ہاں کے ایک کمرہ کے کرایہ سے بھی کم تھا۔ کھانا بھی مسز فائزن کے ہاں کے کھانے سے اعلیٰ معیار کا تھا۔ خط و کتابت کیلئے وہ نہایت عمدہ سٹیشنری مہیا کرتی تھیں۔ جس پر مکان کا پتہ خوشنما چھپا ہوا تھا۔ کرایہ بجائے ہفتہ وار ادا ہونے کے ماہوار ادا ہوتا تھا۔ جب پہلے مہینے کے کرایہ کی ادائیگی کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ بل میں صرف کرائے کی مقررہ رقم درج تھی۔ متفرقات میں سے کچھ بھی درج نہیں تھا۔ میں نے کہا آپ بعض رقوم بل میں درج کرنا بھول گئی ہیں۔ کہا کونسی رقوم! میں نے کہا میرے دوست مسٹر برنلر ہفتہ یا اتوار کے دن آتے رہے ہیں اور کبھی دونوں دن بھی آتے ہیں۔ دوپہر یا شام کا یا دونوں وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھاتے رہے ہیں اور سہ پہر کا ناشتہ یہاں کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اس مہمان نوازی کی رقم بل میں درج نہیں کی۔ اس پر کچھ حیرانی سے کہا میں نے تو آپ لوگوں کی باتوں سے یہی اخذ کیا ہے کہ اپنے ملک میں تم لوگ مہمانوں

کی تواضع کرتے ہو اور اس تواضع کی کوئی قیمت نہیں لیتے۔ تم یہاں میرے ہاں مقیم ہو۔ تمہارے مہمان میرے بھی مہمان ہیں میں ان کی مہمان نوازی کی قیمت کیوں لوں۔ میں نے فرق بتانے کی کوشش کی اور اصرار بھی کیا لیکن وہ نہ مانیں۔ میں جب "لنکنز ان" میں کھانا کھانے جاتا یا کسی دوست کے ہاں دعوت پر جاتا تو واپسی پر کھانے کے کمرے میں پورا ٹھنڈا کھانا چنا ہوا پاتا۔ مجھے اشتہا نہ ہوتی اسلئے وہ کھانا ویسے ہی پڑا رہتا۔ دوسری صبح مسز می رنجیدہ نظر آتیں۔ دریافت کرنے پر جواب ملتا تمہیں میرا کھانا پسند نہیں میں کہتا آپکو یہ وہم کیوں ہوا؟ فرماتیں رات جو کچھ میں نے میز پر رکھ دیا تھا اس میں سے کسی چیز کو بھی تم نے پسند نہیں کیا۔ میں بہتیرا کہتا۔ میں کھانا کھانے ہی تو باہر گیا تھا۔ مزید کھانے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ میری عادت ہے۔ لیکن ان کا شکوہ قائم رہتا۔ کہتیں تم لوگ اپنے وطنوں سے دور غیر ممالک میں رہتے ہو تمہاری مائیں ضرور پریشان ہوں گی کہ ان کے بیٹوں کو پورا کھانا بھی ملتا ہے یا نہیں۔ میں ان کے ہاں بہت آرام سے تھا اور وہیں سے سویڈن اور فنلینڈ کے سفر پر گیا تھا۔ اور وہیں واپس لوٹا۔

چودھری فتح محمد صاحب سیال کی انگلستان تشریف آوری

سفر سے واپس آنے پر معلوم ہوا کہ محترم چودھری فتح محمد سیال صاحب ووکنگ پہنچ چکے ہیں۔ میں ان سے ملا تو انہیں بہت ملول پایا۔ ایک تو انہیں آشوب چشم کی تکلیف تھی دوسرے کھانے کا انتظام خاطر خواہ نہ تھا۔ اور ماحول بھی موافق نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ خواجہ کمال الدین صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ تو لکھ دیا کہ وہ کام کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ہو گا بھی درست لیکن ایسا لکھنے سے ان کی غرض یہ نہیں تھی کہ حضور رضی اللہ عنہ ان کیلئے کوئی مددگار بھیج دیں اور مددگار بھی چودھری فتح محمد سیال صاحب جیسا مخلص خادم سلسلہ۔ انہیں اگر ضرورت تھی تو ایسے معاون کی تھی جو ان کا مخلص خادم ہو۔ چنانچہ انہوں نے لاہور سے اپنے منشی صاحب شیخ نور احمد صاحب کو بلوا لیا تھا جو بہت نیک سیرت بزرگ تھے۔ اور گو انگریزی کی مہارت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن خواجہ صاحب کی ذاتی خدمت شوق سے ادا فرماتے تھے اور ان کے لئے بہت سہولت کا موجب تھے۔ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ دودھ ڈبل روٹی پر گذارہ کر لیتے تھے۔ جو لباس وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہی انہیں کفایت کرتا رہا۔ چونکہ انہیں کہیں ملاقات وغیرہ کے لئے جانا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے انگریزی لباس کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔ اور وہ یورپین لباس اور وضع قطع سے مانوس بھی نہیں تھے۔ چودھری فتح محمد صاحب سے خواجہ صاحب کو توقع تھی کہ وہ شیخ نور احمد صاحب کے نائب کے طور پر کام کریں گے اور انہی کی طرح بودوباش رکھیں گے۔ یہ صورت چودھری صاحب کو بہت ناگوار تھی۔ لیکن اس کی اصلاح کا بھی

کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ خواجہ صاحب سے انگریزی لباس کیلئے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا آپکو کہیں باہر تو جانا نہیں اسلئے سوٹ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ کھانے کے متعلق توجہ دلائی تو فرمایا شیخ نور احمد صاحب باوجود پیرانہ سالی اور ضعف کے جس خوراک کو کافی سمجھتے ہیں وہ آپ کے لئے بھی کافی ہونی چاہیئے۔

میں اپنے لاہور کے طالب علمی کے زمانے سے چودھری صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کالج کے زمانے میں بھی وہ اچھی غذا کے عادی تھے۔ کچن کے دو وقت کے کھانے کے علاوہ دودھ اور پھل وغیرہ باقاعدہ استعمال کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں شوقینی نہیں تھی۔ بہت سادہ مزاج تھے لیکن زمیندار طبقہ میں سے تھے۔ اور ہاتھ کھلا تھا۔ سب سے بڑھ کر ان کیلئے یہ امر پریشانی کا موجب تھا کہ خواجہ صاحب انہیں تبلیغی کام میں شامل نہیں کرتے تھے بلکہ احتیاط کرتے تھے کہ انہیں اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ خواجہ صاحب مغربی ممالک میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذکر کو سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ اور چودھری صاحب کے نزدیک بغیر حضور علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی تعلیم کو پیش کرنے کے اور کوئی ذریعہ تبلیغ اسلام کا نہیں تھا۔ ان حالات میں دونوں اصحاب کے درمیان تعاون اور اتحادِ عمل کی بہت کم گنجائش تھی۔

خواجہ صاحب نے ووکنگ میں مشن تو قائم کیا۔ لیکن اس کے کرتا دھرتا وہ خود ہی تھے۔ چودھری صاحب کی معروضات پر وہ کوئی توجہ نہیں فرماتے تھے۔ اور چودھری صاحب حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ حالات گذارش کرکے حضور کی پریشانی کا موجب ہونے سے گھبراتے تھے۔ ان حالات میں میں نے ان کی خدمت میں گذارش کی کہ وہ دو تین ہفتے لندن میں میرے پاس گذاریں۔ وہ رضامند ہو گئے اور خواجہ صاحب سے اجازت لیکر میرے پاس آگئے۔ میں نے ان کے لئے کمرے اور کھانے کا انتظام کر دیا۔ اور مناسب پارچات بنوانے کا بھی۔ کھانا مسز می کے ہاں بہت عمدہ ملتا تھا پھل وغیرہ بھی میسر تھے۔ مکان کے باغ میں عمدہ ناشپاتی اور سیب کے درخت بھی تھے۔ اگست، ستمبر کا موسم پھل کا تھا۔ یہاں ان کی طبیعت بہت شگفتہ رہی۔ کچھ لندن آنے جانے سے شہر اور سوسائٹی کے حالات کا بھی اندازہ ہو گیا۔ ہندوستانی مسلمان طلباء سے ملاقات اور واقفیت ہوئی۔ اُن میں سے بعض کو وہ پہلے سے ہی گورنمنٹ کالج میں جانتے تھے۔ مرزا بدرالدین صاحب امریکن مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں استاد تھے میں ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ بعد میں وہ سیالکوٹ میونسپلٹی کے افسر صفائی ہوئے اور پھر میونسپلٹی کے سکرٹری ہو گئے چند سال بعد انگلستان بیرسٹری کی تعلیم کیلئے تشریف لائے

جب حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضؓ کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح ثانی رضؓ کی ہدایت کے ماتحت چودھری فتح محمد سیال صاحب ووکنگ سے لندن آگئے تو مرزا بدرالدین صاحب سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ مرزا صاحب جماعت احمدیہ میں تو شامل نہیں تھے لیکن حسنِ ظن رکھتے تھے۔ چودھری صاحب کے بڑے مداح تھے۔ میں نے کئی دفعہ ان سے چودھری صاحب کی نسبت سنا کہ یہ شخص انسان نہیں فرشتہ ہے۔

ستمبر ۱۹۱۳ء میں میں نے بیرسٹری کا آخری امتحان دیا اور بفضل اللہ کامیاب ہو گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اکتوبر میں میں نے محسوس کیا کہ مسز می کے ہاں رہتے ہوئے میری طبیعت بہت زیادہ آرام کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ممکن ہے یہ بات میرے لئے بعد میں تکلیف کا باعث ہو۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ ایک طالب علم کی زندگی بہت سادہ ہونی چاہیئے۔ مالی لحاظ سے تو مسز می کے ہاں رہتے ہوئے میرا خرچ مسز فائزن کے ہاں سے کم تھا۔ لیکن ان کے ہاں کی بالانشینی میری طبیعت پر دوبھر ہونے لگی تھی۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے مسز فائزن کے ہاں واپس چلے جانا چاہیئے۔ میں مسز می کا نہایت ممنون تھا۔ ان سے نقل مکان کی وجہ بیان کرنا مشکل تھا اگر میں بیان کرتا تو وہ ضرور خیال کرتیں کہ میں اصل بات ان سے چھپاتا ہوں۔ جس سے ممکن ہے کہ انہیں رنج ہوتا۔ اور پریشانی تو ضرور ہوتی وہ غالباً یہی سمجھتیں کہ مجھے ان کے ہاں پورا آرام نہیں ملا۔ حالانکہ میں حد سے زیادہ آرام سے ہی بھاگ رہا تھا۔ میں نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ان کے ہاں بہت آرام سے رہا ہوں۔ عذر کیا کہ سرما کے موسم میں شہر کے قریب رہائش میرے لئے سہولت کا موجب ہوگی (یہ عذر واقعہ میں بھی صحیح تھا) اور ان سے اجازت چاہی انہوں نے بغیر کسی شکوے کے اجازت دی اور میں مسز فائزن کے ہاں واپس چلا آیا۔ کرسمس ۱۹۱۳ء کی تعطیلات میں نے "فالمتوتھ" اور "مارازیون" (کارنوال) میں گذاریں۔ فروری ۱۹۱۴ء میں میں نے اپنے دستور کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ خاکسار کو ایسٹر کی تعطیلات میں فرانس، بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کے دریائے رائین کے علاقے میں سیر کیلئے جانے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔ حضور رضؓ کی اجازت آنے پر میں نے اس سفر کی تیاری کر لی۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضؓ کی وفات کا سانحہ

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے چودھری فتح محمد صاحب سیال نے ایک خواب کا ذکر کیا جو شیخ نور احمد صاحب نے دیکھا اور خواجہ صاحب کی خدمت میں بیان کیا۔ شیخ صاحب نے خود ہی اپنے خواب کی تعبیر بھی بیان کی کہ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ کے وصال کا وقت قریب ہے اور صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب

آپ کے بعد خلیفہ ہوں گے۔ دو چار دن کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کے وصال کی خبر بذریعہ تار خواجہ صاحب کو پہنچ گئی انا للہ وانا الیہ راجعون میں نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کیا خبر آئی ہے؟ انہوں نے فرمایا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک تار آیا ہے مولوی صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ دوسرا تار آیا ہے میاں صاحب (حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد) خلیفہ ہوئے ہیں۔ تیسرا تار آیا ہے اختلاف ہو گیا ہے۔

مسٹر یوسف امام کی معیت میں فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اور جرمنی کی سیر | میری تعطیلات شروع ہو گئیں۔ اور میں سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں میرے رفیق مسٹر یوسف امام تھے جو آکسفورڈ میں پڑھتے تھے اور ساتھ بیرسٹری کے امتحان کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ مرزا پور (یو۔پی) کے رہنے والے تھے۔ نہایت شریف طبع تھے مزاج کسی قدر امیرانہ تھا۔ ہندوستان واپسی پر انہیں سیاست سے گہری دلچسپی ہو گئی۔ قوم پرستی شعار ہوا اور کھدر پوشی اختیار کر لی۔ مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی چند سال بعد فوت ہو گئے۔

پیرس | ہم لندن سے براستہ سوتھمپٹن، ہاور پیرس گئے۔ شانز الیزے کے قریب ہوٹل بالزاک میں قیام ہوا۔ ہفتہ بھر ٹھہرے اور سب قابل دید مقامات دیکھے۔

برسلز | پیرس سے برسلز گئے۔ یہاں ہمارا قیام سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ہوا۔ جس چوک میں یہ ہوٹل واقعہ ہے وہ بہت قابلِ دید عمارتوں کا مجموعہ ہے۔ جو پرانے فلیمش طرز تعمیر کے دلکش نمونے ہیں۔ قریب ہی وہاں کا بڑا گرجا ہے۔ شاہ رائل سارا قابل سیر ہے۔ ہمارے قیام کے دوران میں پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ہم دیکھنے گئے۔ ہماری کسی رکن کے ساتھ شناسائی تو تھی نہیں پارلیمنٹ کے ایک کارکن نے ہمارے نام پارلیمنٹ کے ایک رکن کو بھجوا دیئے۔ ان کا اسم گرامی مسٹر ڈیمبلان تھا اور وہ سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ وہ تشریف لے آئے اور ہمارے داخلے کے ٹکٹ بنوا کر ہمیں خود ساتھ لیکر مناسب جگہ پر بٹھا دیا۔ ہم کوئی آدھ گھنٹہ ٹھہرے۔ اس دوران میں مسٹر ڈیمبلان نے بھی تقریر کی۔ وہ اچھے مقرر تھے اور جوش سے بولتے تھے۔ ان کی تقریر توجہ سے سنی گئی۔

شہر سے چند میل باہر WATER LOO کی لڑائی کا میدان بھی دیکھا۔ میدانِ جنگ تو ان دنوں زیر کاشت تھا۔ اس کے وسط میں لڑائی کی یادگار ہے جس کے سر پر بیلجین شیر ہے۔ برطانوی زائرین اسے برطانوی شیر تصور کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ میرے دوست آسکر برنلر اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ دیہات میں تھے لیکن ہمیں ملنے کیلئے شہر آئے اور چند گھنٹے ہمارے ساتھ گذارے۔ جب ہم

برسلز اور مضافات کی سیر کر چکے تو ہم نے بیلجیین ریلویز کا ایک ہفتے کا ٹکٹ خرید لیا اور "آسٹنڈ"، "برو گس" اور "گھینٹ" کی سیر کو گئے۔ ہم صبح برسلز سے روانہ ہو جاتے اور شام کو واپس آجاتے۔ اس کے بعد ہم برسلز سے براستہ "نامور" ایک نہایت خوشنما مقام "ڈینانٹ" پر دو دن کیلئے جا ٹھہرے۔ یہ جگہ "آرڈینز" کے علاقے میں ہے۔ ان دنوں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ میوز دریا کے دائیں کنارے پر تھا۔ اب اچھا خاصا شہر ہے اور دریا کے دونوں طرف پھیل گیا ہے۔ اور اسکی تمام دلکشی جاتی رہی ہے۔ البتہ "نامور" سے اوپر "ڈینانٹ" تک دریا کا منظر اب بھی دلفریب ہے۔ ڈینانٹ سے پھر "نامور" اور "لیج" وغیرہ ہوتے ہوئے ہم "کولون" پہنچے۔

جرمنی | کولون دریائے RHINE کے بائیں کنارے پر واقعہ ہے۔ اور شام کے وقت دریا کا منظر بہت دلفریب ہوتا ہے۔ ہم دریا کے کنارے جا رہے تھے اور بجلی کی روشنی میں دریا کے منظر کا لطف اٹھا رہے تھے کہ مسٹر یوسف امام یک لخت رک گئے اور کہا بھائی کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا کہیں خاص تو نہیں بس دریا کی سیر ہی مقصود ہے۔ کہنے لگے سیر تو ہو گئی۔ بس دیکھ لیا۔ پانی ہے۔ بہہ رہا ہے۔ اب واپس چلیں! اسی طرح جب ہم دو تین دن بعد وائز بیڈن میں شہر سے باہر سیر کر رہے تھے تو رک کر پوچھا بھائی کہاں جاتے ہو؟ کہا سیر کو جا رہے ہیں۔ کہنے لگے سیر تو ہو گئی۔ بس درخت ہیں اور سبزہ ہے اب واپس چلیں۔ دراصل انہیں پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی۔ تھوڑی دور چل کر تھک جاتے تھے۔ اور پریشان ہونے لگتے تھے۔ کولون سے ہم ریل پر "بون" گئے جو اس زمانے میں اپنی یونیورسٹی کی وجہ سے مشہور تھا۔ شام کو واپس کولون چلے آئے۔ پھر وہاں سے دخانی جہاز پر رائین دریا کے اوپر کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سیر کا حصہ بہت پر لطف رہا۔ جہاز کے کیبن آرام دہ تھے۔ کھانا بھی عمدہ تھا۔ گویا جہاز ایک رواں ہوٹل تھا۔ جہاں جہاں جہاز ٹھہرتا ہم اتر کر سیر کو چلے جاتے۔ کہیں زیادہ وقت ملتا کہیں کم۔ "بون" سے گزرنے کے بعد بڑا شہر "کوبلنز" آیا۔ یہاں دریائے موزیل آکر رائین میں شامل ہو جاتا ہے۔ عین مقام اتصال پر قیصر ولیم کا مجسمہ نصب تھا۔ موزیل کی وادی بہت خوشنما اور قابل دید ہے۔ بعد میں دو تین بار مجھے اس وادی میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور ہر بار یہ سفر بہت پر لطف رہا۔

یورپ کے سب دریاؤں کے کناروں پر عموماً متواتر آبادی چلی جاتی ہے۔ دریائے رائین جو یورپ کی تاریخی اور بہت بارونق آبی شاہراہ ہے اسکی تو سطح پر بھی جہازوں اور کشتیوں کا آمد و رفت کا سلسلہ بنا ہے۔ اور دونوں کناروں پر بھی سڑکوں اور ریلوں پر ہر وقت کثرت سے آمد و رفت رہتی ہے۔ "کوبلنز" اور "مینز" کے درمیان دریا کے کنارے پہاڑی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور منظر اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔

پہاڑی چوٹیوں پر جا بجا پرانے امراء کے قلعہ نما محل کھڑے ہیں۔ ان میں سب سے خوشنما اور تاریخی حیثیت رکھنے والا "سٹولزن فیلز" ہے۔ انگریز شاعر "بائرن" کی مشہور نظم "چائلڈ ہیرلڈ" میں رائین کے اس حصے کا بہت پُرلطف بیان ہے۔ واپسی کے دوران میں میں نے اس نظم کا وہ حصہ نکال کر سامنے رکھ لیا اور ہر مقام کو جس کا نظم میں ذکر تھا شناخت کرتا گیا۔ اس طرح سیر کا لطف اور دلچسپی دوبالا ہو گئے۔

ہائیڈل برگ | مینز سے جہاز مین ہیم گیا۔ ہم نے شہر کی سیر بھی کی اور اسے بہت خوشنما پایا اور یہاں سے سٹیم سے چلنے والی ٹریم پر ہم ہائیڈل برگ بھی گئے جو ہمارے اس دریائی سفر کا دلچسپ ترین مقام ثابت ہوا۔ یہ شہر دریائے نیکر کے دونوں طرف واقع ہے۔ یہ دریا چند میل نیچے مَین ہیم کے قریب جا کر رائین میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہائیڈل برگ سے ادھر اس دریا کی وادی بھی بہت خوشنما ہے۔ بعد میں بھی مجھے اس وادی کی سیر کا دو تین بار اتفاق ہوا ہے اور ہر بار وہ سیر پُرلطف رہی ہے۔ "ہائیڈل برگ" کی یونیورسٹی "بوّن" کی یونیورسٹی سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ بون کی جنگی روایات غالباً ہائیڈل برگ سے زیادہ روشن ہیں۔ لیکن ہائیڈل برگ کی علمی شہرت "بوّن" سے بہت زیادہ ہے۔ ہائیڈل برگ کا طرہ امتیاز ایک پاکستانی اور خصوصاً ایک سیالکوٹ کے رہنے والے کے لئے یہ ہے کہ اسے علامہ سر محمد اقبال کی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

ہائیڈل برگ آج بھی اپنی یونیورسٹی کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اور جرمنی کی صنعتی ترقی سے اس حد تک متاثر نہیں ہوا جس حد تک جرمنی کے دوسرے بڑے شہر ہوئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر قصر ہائیڈل برگ اور دامن میں دریائے نیکر ابھی تک زائرین کیلئے باعث کشش ہیں۔

مین ہیم سے جہاز نے واپس دریا کے اتراؤ کی طرف سفر شروع کر دیا۔ اور واپسی کے سفر میں ہماری دلچسپی میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ زیادتی ہوتی گئی۔ ہمارا واپسی کا سفر کولون پر ختم نہ ہوا ہم اس جہاز میں راٹرڈیم تک آئے۔ کولون سے نیچے دریا بہت ہموار علاقے میں سے گذرتا ہے۔

ڈوزل ڈارف شہر کا پھیلاؤ اب تو بہت بڑھ گیا ہے۔ اس وقت جرمنی کے صنعتی شہروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ وسط شہر میں پھولوں کی خوشنما کیاریاں تھیں یہاں سے ایلبر فیلڈ تک ایک برقی گاڑی چلتی تھی۔ جس کا ایک پہیہ چھت کے اوپر تھا جس سے گاڑی لٹکی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں یہ گاڑی ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔

راٹرڈیم | راٹرڈیم میں ہمارا قیام صرف ایک رات ہوا۔ ہم "سنہری بلی کے ہوٹل" میں ٹھہرے راٹرڈیم ان دنوں بھی یورپ کی بڑی بندرگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن اب تو تین سال سے یہ دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے بحری جہاز یہاں بلجیم، فرانس، سوئٹرزلینڈ، مغربی جرمنی اور ہالینڈ کیلئے ہر قسم کا سامان لاتے ہیں اور ان علاقوں سے سامان لے جاتے ہیں۔ راٹرڈیم سے یہ سامان دخانی کشتیوں یا "بارجز" کے ذریعے ان علاقوں میں پہنچتا ہے اور اسی طرح وہاں سے لایا جاتا ہے۔

ایمسٹرڈیم | راٹرڈیم سے ہم ایمسٹرڈیم گئے۔ یہ شہر ابھی تک ہالینڈ کا دارالحکومت شمار ہوتا ہے۔ گو ایک عرصے سے حکومت کے تمام ادارے ہیگ میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ایمسٹرڈیم کی بنیادیں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیروں اور کیلیوں پر جمی ہوئی ہیں۔ شہر کے اندر بہت سی نہریں بہتی ہیں۔ جن کے ذریعے بہت سا سامان ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصوں تک منتقل ہوتا ہے۔ ان نہروں میں سے بھی ایمسٹرڈیم کی سیر کی جاتی ہے۔ ہالینڈ کے مغربی علاقے کا اکثر حصہ سمندر کی سطح سے نیچا ہے۔ اور اس تمام علاقے میں نہروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ سمندر سے نیچا ہونے کی وجہ سے ان علاقوں سے بارش کے پانی کے نکاس کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اس مہم کو بخوبی سرانجام دینے کیلئے حکومت نے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا ہوا ہے۔ بارش کا پانی چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے بڑی نہروں میں پہنچتا ہے۔ ان نہروں سے اس زمانے میں ہوائی چکیوں کی طاقت سے پانی کو بلند کر کے دریاؤں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جہاں سے وہ پانی سمندر میں پہنچ جاتا تھا۔ اب یہ کام بجلی کی طاقت سے لیا جاتا ہے۔ سمندر کے پانی کو روکنے کے لئے بڑے بڑے بند بنے ہوئے ہیں۔ جن کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ ہالینڈ کی تاریخ میں اس کے باشندوں کی سمندر کے ساتھ کشمکش کی داستان ایک نہایت شاندار باب ہے۔ جس پر ہولنڈیوں کو بجا ناز ہے۔ ایمسٹرڈیم بھی یورپ کی بڑی بندرگاہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں ایمسٹرڈیم کو کھلے سمندر تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا بند تعمیر کر کے جس کی لمبائی بیس میل ہے۔ بہت سے حصے کو پر کر کے ملک کے گیارہ صوبوں میں بارھویں صوبے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب ایمسٹرڈیم کو براہ راست کھلے سمندر تک رسائی نہیں رہی۔ لیکن اس کی بندرگاہ کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بحری جہازوں کے ایمسٹرڈیم آنے جانے کا رستہ اب بحر شمال کی نہر کے ذریعہ ہے۔ جو کئی میل لمبی ہے۔ اور جیسے اس کے نام سے ظاہر ہے ایمسٹرڈیم کے بحیرہ شمالی کے ساتھ رابطے کا ذریعہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں ایمسٹرڈیم ہیروں کے کاٹنے کا اور صاف کرنے کا سب سے بڑا یورپین مرکز تھا۔ اور ہیروں کی تجارت اور ہیروں کے کاٹنے کا

ہنر زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھوں میں تھے۔ لیکن اب یہ فن ایمسٹرڈیم کے ساتھ مخصوص نہیں رہا۔
ایمسٹرڈیم میں ہم بڑے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی ایک نہایت صاف آرام دہ بورڈنگ ہاؤس میں
ٹھہرے جہاں ہماری سب ضروریات کا سامان مہیا تھا۔

ہالینڈ فن مصوری میں ایک تاریخی اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس فن کے سب سے مشہور ہولینڈی
فنکار مشہور عالم "رامبراں" تھے ان کا سب سے بڑا شہکار "دی نائٹ واچ" ایمسٹرڈیم کے میوزیم
میں ہے۔ یہاں ہالینڈ کے دیگر مشہور مصوروں اور خود "رامبراں" کے فن کے نہایت دلکش نمونے
کثرت سے جمع کئے ہوئے ہیں۔ یہ عجائب گھر ایمسٹرڈیم کی سب سے ممتاز قابل دید جگہ ہے۔ ہالینڈ میں ہم
نے دیکھا کہ ٹریم بعض دفعہ ایسی جگہ بھی کھڑی ہو جاتی جہاں کوئی سوار ہونیوالا یا اترنے والا نہ ہوتا۔
البتہ لائن کے ساتھ تازہ دودھ کے کنستر رکھے ہوئے ہوتے جن کے ساتھ لیبل لگا ہوتا۔ ٹریم کا کنڈکٹر
یہ کنستر اٹھا کر ٹریم میں رکھ لیتا۔ ہالینڈ میں ہر قسم کی کاروباری دیانت اور امانت کا معیار ان دنوں
بھی بہت بلند تھا اور اب بھی اسی درجے پر ہے۔ اگرچہ یورپ کے بعض اور علاقوں میں وہ صورت
قائم نہیں رہی۔

ہیگ | ہماری ایسٹر کی تعطیلات سے اب صرف ایک دن باقی تھا۔ جو ہم نے ہیگ کی سیر کے
کیلئے رکھا تھا۔ لیکن مسٹر یوسف امام آکسفورڈ سے اتنے لمبے عرصے کی جدائی سے افسردہ ہو گئے تھے
اور انہوں نے فوراً واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری صبح میں اکیلا ایمسٹرڈیم سے ہیگ گیا اور
"ہیگ" اور "سخے وے ننگن" کی سیر میں دن گذار کر شام کو ایمسٹرڈیم پہنچا اور اسی رات کے جہاز پر لندن
واپس چلا گیا۔ ہیگ میں بھی ان دنوں ابھی سٹیم ٹریم چلتی تھی شہر کے اندر PEACE PALACE
دیکھا جس کی کارنیگی فونڈیشن کے اہتمام کے ماتحت دو سال قبل ہی تکمیل ہوئی تھی۔ جیسا کہ فونڈیشن
کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اس عمارت کے مصارف کیلئے اور فونڈیشن کے قیام کے لئے روپیہ مسٹر اینڈریو
کارنیگی نے عطا کیا تھا۔ مسٹر کارنیگی ایک مفلس سکاچ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسے جانے کے لئے
انہیں کئی میل ننگے پاؤں سردیوں میں برف پر چل کر جانا پڑتا تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو امریکہ چلے گئے
وہاں آہستہ آہستہ آہنی صنعت میں اقتدار پیدا کیا اور کروڑ پتی ہو گئے۔ اپنی دولت کا بہت سا حصہ
انہوں نے امن عالم کے استحکام، عام انسانوں کی معاشرتی بہبودی اور اپنے اصل وطن سکاٹ لینڈ
کے نادار طلبا کی تعلیم اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کی ترقی کے لئے وقف کر دیا۔ نیویارک
کا کارنیگی ہال اور وہاں کی کارنیگی ENDOWMENT FOR PEACE اور ہیگ کی کارنیگی

فونڈیشن ان ہی کی فیاضی کے مرہون ہیں۔ ہیگ کا پیس پیلس جب تیار ہو گیا تو کئی حکومتوں نے اپنی طرف سے اس کی زیبائش کیلئے تحائف پیش کئے۔ جرمن کے قیصر ولیم ثانی نے محل کے گرداگرد آہنی جنگلا اور محل کے آہنی پھاٹک ارسال کئے۔ جب پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی تو کہا جانے لگا کہ قیصر ولیم نے PEACE PALACE تیار ہونے پر کہا "یہ لو اب اس کے گرد آہنی جنگلا اور آہنی پھاٹک لگا دو کیونکہ میں اب جنگ کی تیاری کر رہا ہوں"۔ میں جب پیس پیلس دیکھنے گیا تو اس وقت میرے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ذرہ نوازی سے چالیس سال بعد میں عالمی عدالت کا جج منتخب ہو کر اس عدالت کے اجلاس میں شامل ہوں گا۔ اور ۴۴ سال بعد اس عدالت کا نائب صدر اور ۵۶ سال بعد اس کا صدر منتخب ہو جاؤں گا نہ ہی اس وقت یہ تصور میں آسکتا تھا کہ عین انہی ایام میں جس عظیم مرتبت شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے سلسلہ احمدیہ کی امامت اور مسیح محمدی کی خلافت کے مقام پر فائز کیا۔ اس کی مساعی حسنہ کے نتیجے میں اور اس کی غلامی کی وجہ سے مجھے ہیگ میں مسجد کی بنیاد رکھنے اور مسجد کی تعمیر کی تکمیل پر اس کے افتتاح کی سعادت بفضل اللہ نصیب ہو گی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس وقت تو یہ بھی ذہن میں نہیں آتا تھا کہ بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد جب وطن واپسی ہو گی تو کبھی یورپ آنے کا اتفاق بھی ہو گا یا نہیں۔

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح ثانی کی بیعت بذریعہ خط

لندن واپس آیا تو تین ہفتوں کی ڈاک جمع تھی۔ علاوہ خطوط قادیان سے بہت سے اخبار، اعلان اور پمفلٹ حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے وصال اور جماعت میں اختلاف کے متعلق آئے ہوئے تھے۔ جس صبح میں لنڈن پہنچا اسی دن سہ پہر کو ڈاک ہندوستان روانہ ہونیوالی تھی۔ ڈاک نکلنے کے وقت سے پہلے تمام اعلانات ورسائل کے تفصیلی مطالعہ کا تو وقت نہ تھا۔ لیکن ان سے اتنا معلوم ہو گیا کہ بنیادی اختلاف اس بات پر ہے کہ جماعت کا روحانی پیشوا کوئی فرد ہو یا بغیر کسی روحانی پیشوا کے جماعتی امور کی سرانجام دہی صدر انجمن کے سپرد ہو اور انجمن کی قیادت جماعت کیلئے کافی ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ کی نوعیت کے متعلق بھی کچھ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ لیکن اصل اختلاف ایک واجب الاطاعت امام کی ضرورت کے متعلق تھا۔ مجھے قادیان سے رخصت ہوئے اور وطن سے دور رہتے اڑھائی سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں جو اندرونی اختلافات پیدا ہوئے ان کا مجھے علم نہیں تھا۔ نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ جماعت کی سرکردہ شخصیتوں میں سے کون کس خیال کا حامی ہے

لیکن باوجود اپنی نوعمری کے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی کو بفضل اللہ خوب سمجھتا تھا۔ اور یہ بات کسی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک دینی اور روحانی جماعت کی قیادت ایک انجمن کر سکتی ہے۔ پھر اس مسئلے کو حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کی لاہور کی تقریر دل نے بھی خوب واضح کر دیا ہوا تھا۔ اور خواجہ کمال الدین صاحب کی تلقین نے میرے موقف کو بجائے کسی بھی لحاظ سے کمزور کرنے کے اور مضبوط کر دیا تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء میں ایک خط میں میں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے ماموں صاحب چوہدری عبداللہ خاں صاحب سے کر دیا تھا۔ اختلاف کے بارے میں والد صاحب نے مجھے لکھا کہ یہ ایمان کا معاملہ ہے میں اس میں تمہیں کوئی حکم نہیں دیتا صرف یہ مشورہ دیتا ہوں کہ فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لینا۔ اور جو فیصلہ بھی کرو غور و فکر اور دعاؤں کے بعد کرنا۔ والدہ صاحبہ نے لکھوایا کہ جماعت میں بہت فساد پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی بیعت اور تمہارے بہن بھائیوں کی بیعت کا خط لکھوا دیا ہے۔ تم بھی اس خط کے ملنے پر فوراً بیعت کا خط لکھ دو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیعت کا خط اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے خطوں کے جواب تو فوراً لکھ کر ڈاک میں ڈال دیئے اور پھر فراغت سے بیٹھ کر ڈاک کا تفصیلی مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعہ کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو فیصلہ میں نے کیا وہ درست ہے اور خلافت کے ساتھ وابستگی لازم ہے۔ جب چوہدری فتح محمد سیال صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان سے کچھ تفاصیل بھی معلوم ہوئیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے فوراً اپنی بیعت کا خط ارسال کر دیا تھا۔ اور چونکہ میرے خیالات سے خوب واقف تھے اس لئے میرے متعلق لکھ دیا تھا کہ وہ سفر پہ گیا ہوا ہے لندن واپس آنے پر بیعت کا خط لکھ دیگا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

۱۹۱۴ء کے موسم گرما کا وہ دن مجھے خوب یاد ہے جب آسٹریا کے آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ اور ان کی بیگم کے سیراجیوو میں قتل کئے جانے کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن اخبار بیچنے والے لڑکے کی صدا ابھی تک میرے کانوں میں ویسے ہی محفوظ ہے۔ گویا میں نے صدا ابھی ابھی سنی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ قتل کر دیا گیا“۔ اس وقت وہ واقعہ ہولناک تو معلوم ہوا لیکن اس کے تباہ کن نتائج کا کوئی تصوّر فوری طور پر ذہن میں نہ آیا۔

کچھ دنوں کے بعد مسز فائنان نے ۱۷،۵ ادی گروُد کی رہائش ترک کر دی اور ایک اور مکان ۱۵ کننگٹن گارڈنز سکوئر میں چلی گئیں۔ میں اور دیگر مہمان جو ان کے ہاں مقیم تھے ان کے ساتھ

ہی نقل مکان کر گئے۔ یہ مکان پہلے مکان سے دگنا وسیع تھا اور اس کی جائے وقوع بھی زیادہ سہولت کا موجب تھی۔ لیکن طبیعت پہلے مکان اور وہاں کی طرز رہائش سے مانوس ہو چکی تھی۔ ہم سب جو وہاں مستقل طور پر رہتے تھے ایک کنبہ کے افراد کی مانند تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ نئے مکان میں نصف سے زیادہ رہنے والے ہمارے لئے اجنبی تھے۔ سارا ماحول ہمارے لئے غیر مانوس تھا۔ پھر جنگ شروع ہو گئی۔ سارے مکان میں ہم دو ہی ہندوستانی تھے۔ دوسرے صاحب ہوشیار پور کے مسٹر محمد طفیل تھے وہ بھی قانون کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جنگ اور جنگی سرگرمیوں کے متعلق ہمارے جذبات ویسے نہ تھے جیسے برطانوی بورڈرز کے تھے۔ ہر چند میں مسز فائنرن کا نہایت ممنون تھا اور انگلستان کے عرصہ قیام کے آخر میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن میرا ایل ایل بی کا آخری امتحان قریب آرہا تھا۔ اور مجھے یکسوئی چاہئے تھی جو اس نئے مکان اور نئے ماحول میں اس حد تک میسر نہیں تھی جس حد تک مجھے مطلوب تھی۔ اس لئے ناچار ستمبر کے مہینے میں نقل مکانی کر کے میں نمبر ۳ واٹکن ایونیو چلا گیا۔ یہ مکان آرام دہ تھا۔ دو خواتین اس کا انتظام کرتی تھیں۔ ایک کا ایک بیٹا تیرہ چودہ سال کا تھا اور میں اکیلا مہمان تھا۔ یہ جگہ ڈسٹرکٹ ریلوے کے ایک اسٹیشن کے بالکل پاس تھی اس کے قریب کا علاقہ وہی تھا جو ۱۷۵ دی گروو کے مغرب کی طرف تھا۔ اور جس سے میں خوب واقف تھا۔ اس مکان سے بھی صبح کی سیر کیلئے میں ریونسکورٹ پارک میں گھومنے چلا جاتا تھا۔ جب میں ۱۵ کننگٹن گارڈنز سکوئیر میں رہتا تھا تو ایک جرمن طالب علم نے جو اسی مکان میں رہتے تھے مجھ سے کہا کہ اگر تم پسند کرو تو ہم صبح ناشتے سے پہلے دریائے سرپنٹائین میں نہانے کیلئے چلے جایا کریں اور وہاں تم تیرنا بھی سیکھ لینا۔ اس طرح تمہاری سیر بھی ہو جایا کرے گی اور کچھ ورزش بھی ہو جائے گی۔ مجھے کھلی جگہ میں نہانے کی عادت نہیں تھی اسلئے حجاب تھا۔ انہوں نے کہا اتنی سویرے بہت کم لوگ وہاں ہوں گے اور کچھ پردے کا انتظام بھی ہے۔ چنانچہ میں نے غسل کا سوٹ خرید لیا اور ہم صبح ہی صبح سرپنٹائین میں نہانے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ نہانے کیلئے جو جگہ مخصوص تھی وہاں نوٹس لگا ہوا تھا کہ کوئی شخص بغیر غسل کا لباس پہنے نہ نہائے۔ عورتوں کیلئے کوئی اور جگہ ہو گی۔ یہ جگہ صرف مردوں کیلئے تھی۔ انگریز قوم ان دنوں قانون کی بہت پابند تھی۔ جو شخص بھی پانی میں داخل ہوتا غسل کے لباس میں ملبوس ہوتا۔ لیکن جونہی پانی سے باہر نکلتا غسل کے لباس کو اتار پھینکتا اور تولیہ لیکر بدن کو صاف کرنے میں مصروف ہو جاتا اور اپنے ہمجولیوں کے ساتھ بات چیت میں لگ جاتا۔ غسل تو غسل کے لباس میں ہوتا لیکن جب پانی سے باہر آتے تو چونکہ غسل ختم ہو چکا

ہوتا اسلئے قانون کی پابندی بھی ختم ہو جاتی ۔ یہ دیکھ میرا وہاں غسل کیلئے جانا ختم ہو گیا۔ البتہ گرمیوں کے موسم میں میں وہاں کئی بار کشتی چلانے کیلئے جاتا رہا جیسے اس سے پہلے بھی جایا کرتا تھا۔

۲۱ کرامول روڈ میں ہم قانون کے طلبا نے MOOTS (مجلس بحث) کا طریق بھی جاری کیا ہوا تھا۔ پہلے MOOT کیلئے جو قانونی مسئلہ بحث کیلئے چنا گیا اس کا فیصلہ کلکتہ ہائی کورٹ میں مسٹر جسٹس امیر علی نے "موہری بی بی بنام دھرموداس گھوش" کے مقدمے میں کیا تھا۔ ان کا فیصلہ اپیل میں بھی بحال رہا تھا۔ اپیل بنچ کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں بھی اپیل ہوا۔ اور وہاں بھی سید امیر علی صاحب کا فیصلہ بحال رہا۔ اب رائٹ آنریبل سید امیر علی خود پریوی کونسل میں جج تھے۔ انہوں نے MOOT میں جج بننا منظور کیا، ان کے ساتھ دوسرے جج سر ہوزہ شیو شیپرڈ ہوئے جو تھوڑا عرصہ قبل مدراس ہائی کورٹ کی ججی سے فارغ ہوئے تھے۔ فریقین کی طرف سے دو دو وکیل تھے۔ سینئر وکیل تو دو ایسے طالبعلم تھے جو بیرسٹری کا آخری امتحان پاس کر چکے تھے۔ لیکن ابھی بیرسٹری کی سند انہیں نہیں ملی تھی۔ اپیلانٹ کی طرف سے سینئر وکیل گجرات کے چوہدری عبدالغنی صاحب تھے۔ اور ان کے ساتھ جونیئر میرے ہم جماعت مسٹر محمد حسن تھے۔ ریسپانڈنٹ کی طرف سے سینئر وکیل ایک بنگالی صاحب تھے اور میں ان کے ساتھ جونیئر تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ فیصلہ پریوی کونسل کے فیصلے کے مطابق ریسپانڈنٹ کے حق میں ہی ہوگا۔ غرض یہ تھی کہ MOOT میں حصہ لینے والوں کو عدالت میں بحث کرنے کی مشق ہو جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں طرف کے سینئر کچھ گھبرائے ہوئے رہے اور اپنا کیس واضح طور پر پیش نہ کر سکے اور دونوں طرف سے کیس پر اصل بحث جونیئر وکیلوں نے کی۔ بحث کے آخر میں سید امیر علی صاحب نے فیصلہ سنایا اور بڑی وضاحت سے متنازعہ امور اور مسائل بیان کر کے فیصلے کی تائید میں دلائل بیان کئے۔ ان کا فیصلہ ہمارے لئے ایک نہایت مفید سبق تھا۔ فیصلے کے دوران میں انہوں نے فریقین کی طرف سے جو بحث کی گئی اس کے متعلق کچھ تعریفی کلمات بھی کہے MOOT کی کارروائی کے بعد ساتھ کے بڑے کمرے میں چائے وغیرہ کا انتظام تھا۔ حاضرین کی خاصی تعداد تھی۔ بیگم امیر علی (جو برطانوی نژاد تھیں) بھی موجود تھیں۔ سید امیر علی صاحب نے کمال شفقت سے میرا تعارف بیگم صاحبہ سے کروایا اور فرمایا یہ نوجوان بہت ترقی کرے گا۔ چائے کی تقریب کے دوران میں بھی دو تین بار یہ جملہ انہوں نے میرے متعلق دہرایا۔ جس سے طبعاً مجھے خوشی بھی ہوئی اور ساتھ ہی بڑی تضرع کے ساتھ میری روح آستانہ الٰہی پر گری۔ یا اللہ تیرے فضل و رحم سے ان کے دل میں میرے متعلق حسن ظن پیدا ہوا ہے۔ میں تو نہایت ناچیز ہوں اور مستقبل مشکلات سے پُر نظر آتا ہے۔ تو اپنے فضل سے سب مشکلات آسان کرنا اور ان کے حسن ظن کو

صحیح ثابت کرنا۔ میرا سہارا تجھی پر ہے۔

۱۹۱۳ء میں جب میں گرمیوں کی تعطیلات کے سفر کے بعد لنڈن واپس آیا اور سر ٹامس آرنلڈ سے ملاقات ہونے پر ان سے اپنے سفر کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا۔ اگر تم جانے سے پہلے میرے ساتھ ذکر کرتے تو میں تمہیں ماسکو اور کازان جانے کا مشورہ دیتا۔ کازان یونیورسٹی ایک تاتاری دارالعلوم ہے۔ وہاں کے عربی کے پروفیسر میرے دوست ہیں۔ تمہیں ان سے ملکر خوشی ہوتی۔ اس وقت میں نے ارادہ کیا کہ ۱۹۱۴ء کے گرما کی تعطیلات میں میں وارسا، ماسکو اور کازان جاؤں گا۔ لیکن جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے اس ارادہ کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں نے لنڈن میں ہی گذاریں اور مجھے ایل ایل بی کے آخری امتحان کی تیاری کا اچھا موقعہ مل گیا۔

حج کرنیکے میرے انتظامات میں جنگ کی وجہ سے رکاوٹ | میرا سہ سالہ قیام انگلستان جب ختم ہونے کے قریب آیا تو وطن واپسی کا شوق تیز ہونے لگا اور والدین اور عزیزوں سے ملنے کی خوشی کی توقع دل میں موجزن ہونے لگی۔ لیکن شروع اگست میں جب انگلستان بھی کچھ تامل کے بعد جنگ میں شامل ہوگیا تو جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالی مشکلات کے تصور نے ذہن پر تسلط جمانا شروع کر دیا۔ اس سال حج کی تاریخیں یکم دو اور تین نومبر تھیں۔ میرا امتحان دس اکتوبر کو ختم ہونے والا تھا۔ جون کے مہینے میں میں نے ارادہ کیا کہ وطن واپس جاتے ہوئے میں حج کرتا جاؤں۔ میں نے ٹامس کک کی معرفت لنڈن سے مارسیلز تک ریل کے سفر کا اور وہاں سے پورٹ سعید تک جہاز کے سفر کا اور پورٹ سعید سے خدیویل اسٹیمر پر جدے تک کے سفر کا انتظام کر کے ٹکٹ جون میں خرید لئے ہوئے تھے۔ جنگ شروع ہونے سے سفر کی سب سہولتیں ختم ہوگئیں۔ لنڈن سے مارسیلز تک ریل کا سفر ناممکن ہوگیا۔ اگر باقی سہولتیں میسر بھی آتیں تو بھی لنڈن سے مارسیلز تک بحری رستے سے سفر کرنے کے لئے ایک ہفتے کا زائد وقت درکار تھا۔ جس کی گنجائش نہیں تھی اسلئے بصد حسرت حج کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ٹامس کک نے ٹکٹ واپس لے لئے اور ان کی رقم واپس کر دی۔ تاروں وغیرہ کے خرچ کے بدلے ایک پونڈ وضع کر لیا۔

انگلستان سے واپسی کے سفر کی تیاری | ہندوستان کے سفر کے متعلق بھی پریشانی ہونے لگی۔ کیونکہ تمام بحری وسائل سفر حکومت کے ضبط میں آگئے۔ ڈاک کا جہاز ہر ہفتے بمبئی جاتا تھا اور بجائے مارسیلز سے ہندوستان کی ڈاک لینے کے لنڈن سے ہی ڈاک لیکر روانہ ہوتا تھا۔ لیکن اب اس پر انڈیا آفس کی معرفت ہی جگہ مل سکتی تھی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ انڈیا آفس تو شاید سرکاری افسروں ہی کو جگہ دے طالبعلموں کی انہیں کیا پرواہ ہوگی۔ لیکن ان سے درخواست کئے بغیر کوئی صورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ میں انڈیا آفس

گیا اور متعلقہ افسر کی خدمت میں اپنی ضرورت بیان کی۔ وہ بہت ہمدردی سے پیش آئے اور بعد دریافت بتایا کہ ۱۰ اکتوبر کو روانہ ہونیوالے جہاز کے دوسرے درجے میں ایک مسافر کی گنجائش ہے۔ میں نے کرائے کا چیک ان کے حوالے کیا اور یہ جگہ اپنے لئے محفوظ کر لی۔ میں نے یہ ذکر مسٹر محمد حسن سے کیا اور کہا کہ وہ بھی انڈیا آفس جا کر ۱۰ اکتوبر کو روانہ ہونے والے جہاز "عریبیا" میں جگہ لینے کی کوشش کریں۔ وہ گئے اور واپس آکر بتایا کہ اب تو کوئی جگہ اس جہاز میں خالی نہیں۔ لیکن ان کا نام نوٹ کر لیا گیا ہے اور اگر کوئی جگہ ہوئی تو انہیں مل جائے گی۔ تین چار دن بعد انہیں اطلاع ملی کہ انہیں ایک خالی ہونیوالی جگہ دیدی گئی ہے۔ وہ بھی جا کر ٹکٹ خرید لائے۔

ہم دونوں کو جون میں بیرسٹری کی سند مل چکی تھی۔ اب صرف ایل ایل بی کا آخری امتحان باقی تھا۔ اس کے متعلق یہ دقت تھی کہ ہمارا آخری پرچہ ۱۰ اکتوبر کو تھا اور جہاز بھی اسی دن قبل دوپہر روانہ ہونیوالا تھا۔ یہ امکان تو تھا کہ ہم بجائے لندن کی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہونے کے ریل پر "پلائی موتھ" جا کر وہاں جہاز پر سوار ہو جاتے۔ لیکن ہم سے کہا گیا کہ لندن ہی سے سوار ہونا مناسب ہوگا۔ کیونکہ جنگ کے نتیجے میں روزانہ حالات بدلتے ہیں۔ اور یہ یقینی بات نہیں کہ جہاز ضرور "پلائی موتھ" ٹھہر سکے گا۔ ہم دونوں یونیورسٹی کے رجسٹرار سے جا کر ملے اور یہ مشکل بیان کر کے گذارش کی کہ ۱۰ اکتوبر کو ہمارا پرچہ شرع محمدی کا ہے۔ شرع محمدی کی کلاس میں ہم دو ہی طالبعلم ہیں۔ اسلئے اغلباً ہم دو ہی اس پرچے میں امتحان کیلئے بیٹھنے والے ہوں گے۔ اس صورت میں اگر اس پرچے کے امتحان کی تاریخ دو دن پہلے کر دی جائے تو ہماری مشکل حل ہو جائے گی۔ انہوں نے فوراً اس امر کی تصدیق تو کر لی کہ شرع محمدی کے امتحان میں صرف ہم دو ہی بیٹھنے والے ہیں۔ اور ہمارے فارغ اوقات بھی نوٹ کر لئے اور امید دلائی کہ شرح محمدی کے پرچے کی تاریخ بدلنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی جلد ہی ہمیں اطلاع مل گئی کہ یہ تبدیلی کر دی گئی ہے۔ نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق ہمارا امتحان ۸ اکتوبر کو ختم ہونیوالا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی جو پابندیاں عاید کر دی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بنک سے نقد روپیہ ملنا بند ہو گیا۔ سب ادائیگی چیک کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس پابندی میں چند دن کے بعد کچھ تخفیف ہو گئی۔ لیکن بڑی رقوم نقد نہ مل سکتی تھیں۔ سونے کے سکے (پونڈ اور دس شلنگ بھی چلنے بند ہو گئے۔ ان کی جگہ سرکاری نوٹ ایک پونڈ اور دس شلنگ کے جاری ہو گئے اس سے پہلے صرف بنک آف انگلینڈ کے نوٹ چلتے تھے۔ اور سب سے کم قیمت کا نوٹ پانچ پونڈ کا تھا۔ جیسے جیسے جرمن افواج بلجیم میں بڑھنا شروع ہوئیں۔ برطانوی آبادی اور بہت سے

بلجیم کے لوگ بھی برطانیہ آنا شروع ہو گئے۔ ہمارے لندن سے روانہ ہونے سے عین قبل انٹورپ پر جرمنوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

ایل ایل بی کا آخری امتحان | اللہ تعالیٰ کے فضل سے امتحان میں میرے پرچے بہت اچھے ہو گئے۔ فالحمد للہ۔ پانچ پرچے تو پانچوں مضامین میں پاس کے درجے کے تھے اور چار مضامین میں چار پرچے آنرز کے درجے کے تھے۔ مجھے کسی سوال کے جواب میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یہاں ممتحنوں نے اختیار دیا تھا کہ سات سوالوں میں سے پانچ کے جواب لکھو۔ وہاں مجھے سوچنا پڑتا کہ کونسے پانچ سوالوں کے جواب لکھوں۔ کیونکہ بفضل اللہ سب سوالوں کے جواب آتے تھے۔ میں سوالوں کے جواب لکھنے سے پہلے ہر سوال کا جواب لکھنے کیلئے وقت مقرر کر لیتا تھا اور اس تقسیم وقت کے مطابق جواب لکھتا تھا۔ اس طریق سے مجھے بہت سہولت رہی۔ امتحان کے ہال میں ہمارے سامنے ہی بڑا کلاک لگا ہوا تھا جس سے وقت کی رفتار معلوم ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی یہ خواہش بھی ہوتی کہ وقت کی رفتار ذرا آہستہ ہو جائے۔ تاکہ سوالوں کے تفصیلی جواب لکھے جا سکیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے امتحان کے کمرے میں کبھی ممتحن کی مراد سمجھنے یا سوال کی تہہ تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں ہر امتحان میں پہلے تو سوالات اطمینان سے پڑھتا اور ہر سوال کا پورا مطلب سمجھ لینے کے بعد جواب لکھنا شروع کرتا۔ اس سے بھی مجھے ہمیشہ بہت فائدہ ہوا۔ ایل ایل بی کے آخری امتحان میں میرے پرچے تسلی بخش ہوئے اور میں انگلستان سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوا کہ جہاں تک میرے بس میں تھا میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اسکی عطا کردہ توفیق سے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہے۔ میرا دل اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس کے فضل اور ذرہ نوازیوں اور عنایات کے احساس سے پُر تھا۔ فالحمد للہ۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی مشفقانہ عنایات | لندن کے قیام کے دوران میرے لئے یہ احساس بہت تسکین اور اطمینان کا موجب رہا کہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ اور میرے والدین میری حفاظت اور ترقی کے لئے بہت دعائیں کرتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ میرے ہر عریضے کا جواب اپنے مبارک قلم سے لکھتے اور اس میں بڑی شفقت کا اظہار فرماتے۔ خاکسار بھی اپنی ہر دلچسپی کا اظہار حضور کی خدمت میں بلا تکلف گذارش کر دیتا۔ ایک دفعہ میرے عزیز دوست مسٹر آسکر برنلر نے ذکر کیا کہ میرے اعصاب پر کچھ بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں پوری توجہ سے مطالعہ نہیں کر سکتا اور نیند بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ میں نے حضورؓ کی خدمت میں گذارش کر دیا۔ حضور نے کمال شفقت سے ان کیلئے

کچھ ہدایات تحریر فرمائیں جو میں نے انہیں بتادیں۔ جن میں سے ایک جو مجھے یاد رہ گئی ہے وہ یہ تھی کہ پڑھتے وقت روشنی کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھیں بلکہ ایسے طور پر بیٹھیں کہ روشنی بائیں کندھے کے اوپر سے کتاب یا کاغذ پر پڑے۔ شاید یہ بھی تحریر فرمایا کہ رات کو نہ تو پیٹ بھر کر کھائیں نہ ہی خالی پیٹ سوئیں۔ لیکن پختہ یاد نہیں کہ یہ ہدایت ان کیلئے لکھی یا کسی اور تعلق میں خاکسار نے حضورؓ سے سنی یا تحریر فرمائی۔ اس کے بعد خاکسار سے کوتاہی ہوگئی کہ آنکھ کے متعلق حضورؓ کی خدمت میں اطلاع نہ بھیجی تو حضورؓ نے خود کمال شفقت سے اپنے والا نامے میں دریافت فرمایا کہ آپ کے وہ عزیز من درست کیا ہوئے؟ میں جب بھی انگلستان سے باہر سفر پر جاتا تو حضورؓ سے اجازت حاصل کر کے جاتا۔ حضورؓ کا خاکسار کے نام آخری شفقت نامہ وصال سے صرف چند دن پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ میں ایک نادان نوجوان تھا ۱۹۰۷ء میں تو ابھی میری عمر بھی چودہ سال ہی تھی۔ آپ نے اس وقت کمال شفقت اور ذرہ نوازی سے میرے والد صاحب کو توجہ دلائی کہ مجھے اب بیعت کرنی چاہیئے اور اسدن سے حضورؓ کے وصال تک یہ عاجز آپ کی پیہم شفقت اور عنایات کا مورد رہا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء وجعل اللہ الجنۃ العلیا مثواہ۔ اور میری کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ آپؓ کے فیض کا چشمہ ہر ایک کیلئے یکساں بہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے آپ کو شاہانہ مرتبہ عطا فرمایا تھا اور نہایت پُر شوکت اور بارُعب شخصیت عطا فرمائی تھی لیکن آپ کا دربار ہر کس و ناکس کیلئے کھلا رہتا تھا۔

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

والی کیفیت تھی۔

آپؓ کی بڑی صاحبزادی آپؓ کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں بیعت ہونے سے بہت پہلے مولوی عبدالاحد صاحب غزنوی امرتسری کے عقد میں آئی تھیں۔ ان کے صاحبزادے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب غزنوی آپؓ کے نواسے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب میں بی اے کا امتحان دینے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر تھا وہ بھی امرتسر سے تشریف لائے۔ پہلے بھی آیا کرتے تھے گو سلسلہ سے منسلک نہ تھے۔ اس بار انہوں نے آپکی خدمت میں گذارش کی کہ میں کچھ عرصہ ٹھہر کر آپؓ سے علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے فرمایا جتنی دیر چاہیں ٹھہریں۔ لیکن جو علم آپ پڑھنا چاہتے ہیں وہ آپکے گھر میں بھی بہت ہے۔ اس پر انہوں نے ایک رقعہ لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا جس میں اپنی درخواست دہرائی اور عربی کا ایک شعر لکھا جس کا ترجمہ یہ تھا۔ "تیری بخشش سے بہت بعید ہے کہ تو ایک نافرمان کو مایوس کرے اور اگر میں تیرے دروازے

سے لوٹا دیا جاؤں تو کونسا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔" آپؓ پڑھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ "شعر تو اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہے۔ ہاں اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو جو پڑھنا چاہیں پڑھ لیں۔"
آپؓ کا لباس وضع قطع، کھانا پینا نہایت سادہ تھے۔ آپؓ علم و عرفان کے سمندر تھے۔ طب میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ قادیان جیسی بستی میں رہتے ہوئے بھی غیر از جماعت امراء آپ کی خدمت میں طبی مشورے کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ اور بڑی بڑی رقوم آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے تھے لیکن آپؓ غریب اور امیر میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔ آپؓ صبح جب مجلس میں رونق افروز ہوتے تو زائرین اور حاجتمند لوگوں کا تانتا بندھ جاتا۔ کوئی زبانی گذارش کرتا کوئی تحریری۔ درس تدریس، مطب، خلافت کے فرائض کی سرانجام دہی، وعظ و نصیحت سب جاری رہتے، ہدیئے، تحائف، نذرانے پیش ہوتے رہتے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی رہتی۔ جس جیب میں ہدیوں اور نذرانوں کی رقوم بغیر التفات کے رکھی جاتیں۔ اس میں سے سائل اور حاجتمند کی حاجت روائی کمال فیاضی سے ہوتی چلی جاتی۔ خالی جیب ہی آکر بیٹھتے اور جہاں تک حاشیہ نشین اندازہ کر سکتے مجلس برخاست کرنے پر خالی جیب ہی تشریف لے جاتے۔

میرے جرمن دوست آسکر نے ایک دفعہ مجھ سے کہا میں چاہتا ہوں کہ تمہاری معاشرت کا اپنی معاشرت کے ساتھ موازنہ کروں۔ تم اپنے ذہن میں کسی ایسی زندہ شخصیت کا نام رکھ لو جو تمہارے خیال میں تمثیلی شخصیت ہو اور میں بھی ایک ایسی شخصیت کا نام اپنے ذہن میں رکھ لوں گا۔ میں تم سے سوال کروں گا کہ فلاں فلاں حالات میں تمہارے تجویز کردہ شخص کا کیا طرزِ عمل ہوگا۔ تم مجھے بتاتے جانا۔ میں تمہارے جواب سے اندازہ کر سکوں گا کہ کس کا معیار بلند ہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنے ذہن میں ایک شخصیت کا انتخاب کر لیا ہے تو انہوں نے سوال کیا کہ اگر ان صاحب کو کوئی شخص ملنے کے لئے آئے اور وہ اسے نہ ملنا چاہیں تو اطلاع ہونے پر وہ اسے کیا کہلا بھیجیں گے؟ میں نے کہا اوّل تو اطلاع کی ضرورت نہ ہوگی۔ ان کا دربار عام ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی سے نہ ملنا چاہیں تو صاف کہدیں گے ہم آپ سے نہیں ملنا چاہتے۔ اس پر آسکر نے کہا تو پھر وہ جیتے۔ میں نے کہا کیسے؟ کہا اسلئے کہ جو شخصیت میرے ذہن میں ہے وہ صاحب اطلاع ہونے پر کہلوا دیں گے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں اور یہ لفظاً صحیح نہیں ہوگا۔ انہوں نے دریافت کیا تمہارے ذہن میں کون صاحب تھے؟ میں نے کہا حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ میں نے پوچھا آپکے ذہن میں کون صاحب تھے؟ انہوں نے کہا میرے والد۔ لندن سے وطن واپسی کے وقت میرے دل میں یہ بڑی حسرت تھی کہ اس ہمہ تن شفقت ہستی کا دیدار نہ ہوگا۔

ماں باپ کی شفقت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے۔ ماں کی مامتا تو ایک بحر ناپیدا کنار ہوتا ہے۔ وطن سے دور ایک بالکل اجنبی ماحول میں میرے لئے یہ امر بہت ہی تسکین و اطمینان کا موجب تھا کہ میرے والدین صبح و شام، دن رات آستانہ الٰہی پر میرے لئے تضرع اور خشوع سے دست بدعا ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے کمال فضل و رحم سے انکی عاجزانہ التجاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا اور ہر لحظہ اور ہر حالت میں حفاظت فرمائی۔ بعض دفعہ ایسے حالات میں اور ایسے طور پر اس کی ذرہ نوازیوں کی کیفیت ظہور میں آتی کہ دل تسبیح اور حمد سے بھر جاتا اور بے اختیار سجدات لک روحی وجنانی کا گیت گانے لگ جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں لندن کے پُر شور بازاروں میں سے بلند آواز سے تسبیح اور حمد اور قرآن کریم کی دعاؤں کو وجدانہ کیفیت میں پڑھتا ہوا تیزی سے گذرتا چلا جاتا اور پھر بھی دلکو تسلی نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے بیشمار افضال اور اسکی ان گنت عنایتوں کا کچھ بھی شکر ادا ہوسکا ہے۔ میں نے قیام انگلستان کے دوران یہ التزام رکھا کہ والد صاحب کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے میں کبھی ناغہ نہ ہو۔ جب جنگ شروع ہونے پر ڈاک ریل کے ذریعہ مارسیلز تک جانا بند ہو گئی تو میرا عریضہ والد صاحب کی خدمت میں پہنچنے میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی۔ والدہ صاحبہ کو معلوم ہوا کہ اس ہفتے کی ڈاک ایک ہفتہ بعد ملے گی تو غش کھا گئیں۔ جن دنوں میں لندن سے روانہ ہونے والا تھا خبریں آنا شروع ہوئیں کہ ایک جرمن آبدوز جس کا نام "ایمڈن" تھا بحیرہ عرب میں ہندوستان جانیوالے برطانوی جہازوں کو اپنے تارپیڈوؤں کا نشانہ بنا رہا ہے اور بہت سے جہاز اس نے غرق کر دیئے ہیں۔ بحیرہ متوسط بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر میں نے قبل از وقت والد صاحب کی خدمت میں لکھا کہ میں فلاں تاریخ فلاں جہاز پر لندن سے روانہ ہوں گا تو میرے وطن پہنچنے تک میرے والدین کا وقت بہت پریشانی میں گذرے گا۔ اس خیال سے میں نے اپنی روانگی کے پروگرام کے متعلق انکی خدمت میں کوئی اطلاع نہ دی۔ البتہ ۱۸ راکتوبر کو خط لکھا کہ میرا امتحان ختم ہو گیا ہے۔ پرچے بفضل اللہ اچھے ہو گئے ہیں اور اب میں جلد یہاں سے روانہ ہونیوالا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خط بھی میرے ساتھ ہی جہاز "عربیبیا" پر جائے گا اگر یہ خط ان کی خدمت میں پہنچ گیا تو میں بھی بفضل اللہ پہنچ جاؤں گا۔ اور انہیں لمبا عرصہ میرا انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ اپنے ماموں صاحب کی خدمت میں میں نے وضاحت سے لکھ دیا کہ جس جہاز پر یہ خط آرہا ہے اس پر میں بھی سفر کروں گا اور جب یہ آپ کی خدمت میں پہنچے گا میں بھی بفضل اللہ گھر پہنچ چکا ہوں گا۔ ان دنوں ان کا ڈاکخانہ "ستراہ" تھا جو "ڈاتہ زید کا" سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے "ڈاتہ زید کا" کی ڈاک ان دنوں ہفتے میں ایک یا دو بار تقسیم ہوتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میرا خط انہیں میرے سیالکوٹ پہنچنے کے بعد ملے گا۔

لندن سے روانگی | آخر بصد انتظار روانگی کا دن آیا جہاز نے لنگر اٹھایا۔ بحیرہ متوسط میں ایک دو بار یہ اندازہ ہوا کہ دشمن کی زیر آب جنگی کشتیوں نے ہمارے جہاز پر تارپیڈو چھوڑا لیکن بفضل اللہ خطا گیا۔ بحیرہ عرب میں بھی ایسا ہی تجربہ ہوا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے یکم نومبر کو بخیریت بمبئی پہنچ گئے۔ بحیرہ قلزم میں جوں جوں جہاز جدہ کے قریب ہوتا گیا دل میں حسرت بڑھتی گئی کہ کاش کعبۃ اللہ کی زیارت اور حج کی سعادت نصیب ہو جاتی۔ دعاؤں کے ذریعے جو التجائیں ہو سکیں حضرت احدیت کے حضور گذاری جاتی رہیں۔ بمبئی پہنچنے کا دن عید کا دن تھا۔ ہم اگرچہ ابھی گھر نہیں پہنچے تھے لیکن ساحلِ وطن پر آ اترے تھے اور یہ بھی بہت خوشی اور اطمینان کا موجب تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

وطن میں واپسی | بمبئی سے ہم اسی شام بی بی اینڈ سی۔آئی ریلوے کی نئی نئی جاری کردہ نارورن ایکسپریس پر جو بعد میں (فرنٹیئر میل کہلائی) لاہور جانے کے لئے کولابا اسٹیشن پر گئے جو ان دنوں بمبئی میں ریلوے کا بڑا اسٹیشن تھا۔ دوسرے درجے کے ٹکٹ خریدے۔ جس قلی نے ہمارے سامان کی ذمہ داری لی تھی اس نے وزن کرنیوالے کانٹے کے قریب پہنچ کر دبی زبان میں مجھے کہا صاحب آپ کا سامان کم تلوا دوں؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہمارا سامان کم کیوں تولا جائے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہا صاحب کم وزن پر کرایہ کم لگے گا۔ اور آپ مجھے کچھ انعام دے دیں گے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ہرگز نہیں۔ مجھے سخت صدمہ ہوا کہ وطن پہنچتے ہی پہلا تجربہ بددیانتی کی ترغیب کا ہوا۔ ہم تین سال ایسے ملک میں گذار کر آئے تھے جہاں ان دنوں کسی کو ایک کمسن بچے کو بھی فریب دینے کا خیال تک نہیں ہوتا تھا۔

تیسرے دن صبح لاہور پہنچے۔ مسٹر محمد حسن صاحب کے بہنوئی عبدالحمید صاحب ریلوے پولیس میں انسپکٹر تھے اور ان کا دفتر بھی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر ہی تھا۔ جہاں ہماری گاڑی کھڑی ہوئی۔ وہ ہمیں پہنچتے ہی ملے۔ ان کے ساتھ مکرمی ڈاکٹر عباداللہ صاحب بھی تھے۔ مسٹر محمد حسن تو گاڑی بدل کر امرتسر جانیوالے تھے اور میرا ارادہ بھی اسی گاڑی سے قادیان جانیکے لئے بٹالے جانے کا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عباداللہ صاحب سے کہا کہ قادیان چلیں۔ انہوں نے فرمایا میں امرتسر سے ایک ضروری کام کے لئے لاہور آیا ہوں۔ آج میں وہ کام کر لوں تو کل اکٹھے قادیان چلیں گے۔ میں ان کی رفاقت کی خواہش میں رضامند ہو گیا۔ اسٹیشن سے تانگہ کرایہ کر کے گورنمنٹ کالج کے برائنچ ہوسٹل واقعہ شیش محل گیا۔ چوہدری شمشاد علی خانصاحب کا کمرہ دریافت کر کے ان کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں میرے آنے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی۔ دن بھر ان کے ساتھ گذار کر دوسری صبح ڈاکٹر عباداللہ صاحب کے ساتھ قادیان گیا۔ لاہور میں انہوں نے دن کا اکثر حصہ میرے ساتھ ہی گذارا تھا۔ میں نے دریافت کیا آپ جس کام کے لئے لاہور تشریف لائے تھے وہ ہو گیا؟ کہنے لگے

اس کام کیلئے فرصت ہی نہیں ملی اب پھر کسی وقت آ کر کروں گا۔ امرتسر کے سٹیشن پر انہیں کوئی واقف مل گیا دوکان کی چابی اس کے حوالے کی اور کہا یہ ہمارے ہاں پہنچا دینا۔ اور کہہ دینا کہ میں ظفر اللہ خاں کے ساتھ قادیان جا رہا ہوں کل واپس آ جاؤں گا۔

قادیان میں حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ کی خدمت میں باریابی اور دستی بیعت کی سعادت

قادیان میں ہم ایک دن ٹھہرے۔ بہشتی مقبرے میں دعا کی۔ مسجد مبارک میں شکرانے کے نفل گذارے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل ہوا۔ دستِ مبارک پر بیعت کی سعادت نصیب ہوئی۔ احباب کی ملاقات سے لطف اندوز ہوئے۔ دوسرے دن واپس لوٹے۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب تو امرتسر ٹھہر گئے اور میں لاہور پہنچا۔ چوہدری شمشاد علی خانصاحب اسٹیشن پر مل گئے ان کے پاس ٹھہر کر دوسرے دن بعد دوپہر کلکتہ میل پر سیالکوٹ روانہ ہو گیا۔ مجھے رخصت کر کے جب وہ واپس ہوسٹل پہنچے تو انہیں والد صاحب کا تار ملا کہ اگر ظفر اللہ خاں لاہور میں ہو تو اسے وہیں روک لو اور ہمیں اطلاع دو۔ انہوں نے جواب میں تار دیا کہ میں ابھی اُسے اسٹیشن سے رخصت کر کے آیا ہوں۔

سیالکوٹ واپسی

میں نے وزیر آباد گاڑی بدلی اور سیالکوٹ پہنچا میں نے اپنا بڑا ٹرنک بذریعہ ریل سیالکوٹ بھجوا دیا تھا۔ اسے لینے کیلئے گیا تو کلرک نے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے کہا لاہور سے کہا نہیں اس سے پہلے۔ میں نے کہا بمبئی سے۔ اس جواب سے بھی اسکی تسلی نہ ہوئی۔ ٹرنک پر جہاز کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا اگر آپ کو اس بات پر حیرت ہے کہ میں انگلستان سے آیا ہوں اور اسٹیشن پر میرے استقبال کے لئے کوئی شخص موجود نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے کسی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ اسٹیشن سے تانگہ کرایہ کر کے میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوئی چوتھائی رستہ طے کیا ہو گا کہ دیکھا مقابل سمت سے میرے خالہ زاد بھائی چوہدری غلام نبی صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی سلطان علی اور میرے بھائی شکر اللہ خاں اور عبداللہ خاں اپنی گھوڑا گاڑی پر آ رہے ہیں انہوں نے مجھے تانگے پر بیٹھے ہوئے پہچان لیا۔ گاڑی ٹھہرائی اور شوق سے لپک کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھے تانگے ہی میں چھوڑ کر گاڑی واپس کر کے تیزی سے گھر کو لوٹ گئے۔ انہیں شوق تھا کہ وہ جلدی گھر پہنچ کر والدہ صاحبہ کو میرے آنے کی خبر دیں۔ ان دنوں رواج تھا کہ جب کوئی نوجوان انگلستان یا کسی اور بیرونی ملک سے تعلیم کی تکمیل کر کے واپس آتا تو ریلوے اسٹیشن پر اس کا استقبال کیا جاتا۔ والد صاحب کی بھی خواہش تھی کہ میری واپسی پر ایسا انتظام کیا جائے۔ لیکن ان کی خواہش دل کی دل میں رہ گئی۔ میرا خط ملنے پر والد صاحب نے قیاس کیا کہ میں انگلستان سے روانہ ہونے کو ہوں والدہ صاحبہ

اور وہ خود کچھ پریشان ہوئے کہ مجھے بحری سفر کا پُر خطر مرحلہ درپیش ہے۔ جب ماموں صاحب کو دانتہ زیدکا میں میرا خط ملا تو وہ خط پڑھتے ہی سیالکوٹ پہنچے اور والد صاحب کو مبارکباد دی۔ والد صاحب نے کہا کہ کس بات کی مبارکباد؟ کہا ظفراللہ خاں کے بخیریت واپس پہنچنے کی۔ انہوں نے کہا کہ اسکی تو ابھی یہی اطلاع آئی ہے۔ کہ وہ لندن سے روانہ ہونیوالا ہے۔ ماموں جان نے کہا کہ جب اس نے خط لکھا تھا تو وہ روانہ ہونیوالا تھا۔ لیکن جس جہاز میں خط آیا ہے اسی میں وہ بھی آگیا ہے۔ میرے نام جو اس کا خط آیا ہے اس میں وضاحت سے یہی لکھا ہے۔ اس سے میرے والدین کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ میں بفضل اللہ بخیریت واپس پہنچ گیا ہوں۔ لیکن اب یہ جستجو ہوئی کہ میں رستے میں کہاں رُک گیا ہوں۔ والدہ صاحبہ نے ماموں صاحب سے کہا اب تو وہ سیالکوٹ پہنچنے والا ہی ہو گا۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو ہم وزیرآباد پہنچ کر اس کا خیر مقدم کریں۔ چنانچہ والدہ صاحبہ ماموں صاحب اور عزیزہ شکراللہ خاں وزیرآباد چلے گئے اور لاہور سے آنیوالی گاڑیوں کے مسافروں کی پڑتال کرتے رہے۔ جب تمام رات کی بیداری سے والدہ صاحبہ کی طبیعت نڈھال ہونے لگی تو ماموں صاحب نے انہیں تو عزیزہ شکراللہ خان کے ساتھ سیالکوٹ واپس بھیج دیا اور خود وزیرآباد ٹھہرے کہ جب میں آؤں تو مجھے وہاں روک لیں اور والد صاحب کو اطلاع دیں پھر جیسے وہ ارشاد فرمائیں اس کے مطابق ہم دونوں سیالکوٹ پہنچ جائیں۔ اتنے میں والد صاحب نے اسٹیشن پر میرے خیر مقدم کیلئے دعوتی کارڈ چھپنے دیئے جن میں وقت اور تاریخ لکھنے کیلئے جگہ خالی رکھی۔ ان کے ایک منشی صاحب مطبع سے یہ کارڈ لیکر مکان پر پہنچے ہی تھے کہ ساتھ ہی میں بھی پہنچ گیا۔ ماموں صاحب ابھی وزیرآباد اسٹیشن پر انتظار ہی میں تھے۔ والدہ صاحبہ کو تو مجھے دیکھتے ہی اطمینان ہو گیا۔ اور انہوں نے شکرانے کے نوافل ادا کرنے شروع کر دیئے۔ والد صاحب کو طبعاً خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی لیکن ان کی خوشی اس خیال سے کچھ ادھوری سی رہ گئی کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق خیر مقدم کی تقریب نہ منا سکے۔ دوسرے دن جب کچہری تشریف لے گئے تو ان کے احباب میں سے جس جس کو میرے واپس آنے کی خبر ملی انہوں نے والد صاحب کو مبارکباد پیش کی۔ مرزا ظفراللہ خاں صاحب جو وزیرآباد کے مشہور رئیس خاندان میں سے تھے ان دنوں سیالکوٹ میں سب جج درجہ اول تھے وہ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن نہایت قابل اور فہمیدہ بزرگ تھے۔ انہوں نے والد صاحب سے کہا سنا ہے کہ ظفراللہ خاں واپس پہنچ گیا ہے۔ والد صاحب نے کہا اللہ تعالٰے کا شکر ہے لیکن ہمیں تو اس نے اطلاع بھی نہ دی۔ انہوں نے فرمایا معلوم ہوتا ہے بڑا محتاط اور سعادت مند نوجوان ہے۔ ایک تو ایسے خطرے کے وقت میں سفر پر روانہ ہونے کی اگر آپ کو پہلے سے اطلاع ہوتی تو آپ اس کے سفر کے

دوران پریشان رہنے اور دوسرے اس نے آپ کے احباب کو اسٹیشن پر جانے کی زحمت سے بچا لیا۔ میری دانست میں تو اس نے بہت اچھا کیا اور آپ دُہری مبارکباد کے مستحق ہیں - ماموں صاحب بھی جب وزیرآباد کے اسٹیشن پر لاہور سے آنیوالے مسافروں کی پڑتال کرتے کرتے تھک گئے تو سہ پہر کو میں سیالکوٹ پہنچا تھا اسی رات کو وہ بھی سیالکوٹ آگئے - مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دریافت کیا تم نے ریل میں کس لباس میں سفر کیا۔ میں نے کہا اسی لباس میں جو میں اسوقت پہنے ہوئے ہوں (قمیص، شلوار، کوٹ، ترکی ٹوپی) بہت ہنسے اور فرمایا میں تو کسی ترکی ٹوپی اور شلوار پہنے ہوئے داڑھی والے مسافر کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا - میں تو کوٹ پتلون ہیٹ والوں ہی میں تمہیں دیکھتا رہا - کچھ دنوں کے بعد میں لاہور گیا چیف کورٹ میں پریکٹس کی اجازت کیلئے درخواست دی - چند دن بعد لائسنس مل گیا -

ایل ایل بی لندن یونیورسٹی کے امتحان میں آنرز کے ساتھ اول درجہ میں کامیابی

کچھ دنوں کے بعد لندن سے ایل ایل بی کے امتحان کا نتیجہ آیا - میں نے جلدی سے چھپے ہوئے پرچے پر نگاہ دوڑائی - لیکن مجھے اپنا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں نظر نہ آیا - مجھے حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی کہ پرچے تو بفضل اللہ اپنے اندازے کے مطابق بہت اچھے ہوگئے تھے - پھر کیا ہوا جو میرا نام آنرز کی فہرست چھوڑ محض پاس ہونیوالوں کی فہرست میں بھی نہیں ہے - نتیجے کے پرچے میں کامیاب امیدواروں کے نام چار درجوں میں لکھے ہوئے تھے - اول درجہ آنرز - دوئم درجہ آنرز - سوئم درجہ آنرز اور پاس - اوّل درجہ آنرز میں صرف دو نام تھے - ان کی طرف یا تو میری توجہ نہ ہوئی اس خیال سے کہ اگر یونیورسٹی بھر میں صرف دو امیدوار ہی اوّل درجہ آنرز حاصل کر سکے ہیں تو میرا نام ان میں کہاں شامل ہوگا - یا میں جلدی میں باوجود تمام ناموں پر نگاہ دوڑانے کے یہی خیال کرتا رہا کہ اوّل درجہ میں میرا نام درج نہیں اور میں اپنا نام اس سے نچلے درجوں میں تلاش کرتا رہا - جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ دیکھ کچھ بھی ہو میں کامیاب نہیں ہوا تو میں نے نتیجہ کے پرچہ کو پھر دیکھنا شروع کیا تاکہ اپنے ہم جماعت طلباء اور بالخصوص مسٹر محمد حسن کا نتیجہ معلوم کروں اب میں نے شروع سے نام پڑھنا شروع کئے - تو پہلا ہی نام خان تھا - میں نے سوچا یہ خان کون ہے - ہماری جماعت میں تو کوئی خان نہیں تھا - یہ کوئی بیرونی امیدوار ہوگا - اتنے میں میری نگہ پورے نام پر پڑی جو یوں لکھا تھا "KHAN ZAFRULLAH" اور میں چونکا کہ یہ تو میرا ہی نام ہے - میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ میں کامیاب نہیں ہوا اللہ تعالیٰ کا کیسا فضل اور کیسی ذرہ نوازی ہوئی کہ مجھے نہ صرف آنرز میں اوّل درجہ عطا فرمایا بلکہ یونیورسٹی بھر میں اوّل رکھا - فالحمد للہ ثم الحمد للہ - یہ ان مواقعہ میں سے ایک تھا (اللہ تعالیٰ کے فضلِ بے پایاں سے میری زندگی میں کئی ایسے مواقع پیدا ہوئے) جن پر بے اختیار میرے دل سے صدا

اُٹھتی سجدلک روحی وجنانی (سجدے میں ہیں تیرے حضور میری روح اور میرا دل) اور بار بار اُٹھتی چلی جاتی۔

ڈاتہ زید کا اپنے ننھال کا سفر | ماموں صاحب کی طرف سے اصرار تھا کہ میں جلد ان کی خدمت میں ڈاتہ زید کا حاضر ہوں مجھے بھی اپنے نانا جان، نانی صاحبہ اور دیگر بزرگان اور عزیزان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ سیالکوٹ سے ڈاتہ زید کا کا فاصلہ تو صرف بائیس میل تھا لیکن سفر بڑا مشکل تھا۔ سیالکوٹ سے پسرور تک تو سڑک تھی لیکن کچی۔ وہاں تک اکے چلتے تھے۔ سیالکوٹ میں اڈہ پسروریاں ایک معروف مقام ٹبہ جالیاں کے پاس تھا۔ وہاں سے اکے روانہ ہوتے۔ نصف فاصلے پر بلّو بانے کے مقام پر اِکّے گھوڑے کو ہماری دینے ٹھہرتے اور مسافر چند منٹ سستا لیتے۔ اکے میں بیٹھنے کی ترکیب نہایت تکلیف دہ تھی۔ اور کچی سڑک پر تو چند میل بھی اکے میں سفر کرنا شدید عقوبت کا باعث ہوتا تھا۔ پختہ سڑکوں پر ٹم ٹم یا ٹانگہ میسر آجاتا تھا۔ لیکن کچی سڑک پر عموماً اکے ہی چلتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اکے کی ساخت اگرچہ مسافروں کیلئے بہت تکلیف کا موجب تھی لیکن گھوڑے کیلئے آسانی رہتی تھی۔ میرے انگلستان سے واپس آنے تک پسرور تک سڑک پختہ ہو چکی تھی۔ پسرور سے ڈاتہ زید کا کے پہلے تین میل تو سڑک تھی لیکن باقی حصہ دیہاتی رستہ تھا۔ یہاں اکہ بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اسلئے پسرور سے ہی گھوڑے کا انتظام ہوتا تھا۔ ڈاتہ زید کا سے گھوڑا بھیج دیا جاتا اور پسرور پہنچتے ہی اکے سے اتر کر گھوڑے پر سفر شروع ہو جاتا۔ اس طرح اس بیس بائیس میل کے سفر میں دن کا اکثر حصہ صرف ہو جاتا۔ بارہ میل اکے میں جکڑے ہوئے اور دس میل گھوڑے کی پیٹھ پر ایک ایسے شخص کیلئے جو تین سال کا عرصہ ایک ایسے ملک میں گذار چکا تھا جہاں سفر کیلئے ہر سہولت میسر تھی ایک مہم تھی لیکن میری عمر اور شوق کے مقابلے میں یہ صعوبت کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ پسرور تک سڑک پختہ ہو جانے سے کچھ فرق تو پڑ گیا تھا لیکن باقی حصہ سفر کی وہی حالت تھی۔

چودھری بشیر احمد صاحب | چودھری بشیر احمد صاحب کی عمر اس وقت چودہ سال تھی میرے انگلستان جانے کے وقت وہ قادیان تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ تھوڑا عرصہ قبل ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے چھوٹی عمر میں ہی انہیں غیر معمولی رشد اور ذہانت عطا فرمائے تھے۔ والدہ کے انتقال پر انہوں نے اپنے والد صاحب کی خدمت میں تعزیت نامہ لکھا اور انہیں صبر جمیل کی تلقین کی ۱۹۱۱ء کی تعطیلات شروع ہونے پر جب سکول بند ہوا تو قادیان سے اپنے گاؤں جانے کیلئے وہ سیالکوٹ آئے اور ایک رات ہمارے ہاں ٹھہرے میری والدہ صاحبہ

کو ان کے والد صاحب سے بہت انس تھا۔ وہ بچپن میں ہمارے گاؤں ڈسکہ میں تعلیم کیلئے گئے تھے اور ہمارے ہی ہاں ٹھہرے تھے۔ میری والدہ نے انہیں اپنا بھائی بنا لیا تھا پہلے بھی دونوں خاندانوں کے درمیان قرابت کے تعلقات تھے۔ اس وجہ سے اور بھی مضبوط ہو گئے۔ چوہدری بشیر احمد صاحب کا ہمارے ہاں آنا ایسا ہی تھا جیسے ایک بھائی کا تعطیل میں اپنے گھر آنا۔ میرے دل میں ان کے لئے ان کی والدہ کی وفات کی وجہ سے نہایت گہرا جذبہ ہمدردی کا پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میرے انگلستان جانے کے ایک سال بعد ان کے والد صاحب کی بھی وفات ہو گئی اور یہ خبر میرے لئے بڑے صدمے کا موجب ہوئی۔ انہیں قادیان کا تعلیم الاسلام اسکول چھوڑنا پڑا اور پسرور ہائی سکول میں آگئے۔ دانہ زید کا جاتے ہوئے میں انہیں ملا۔ سکول کا وقت تھا اور وہ اپنے استاد سے اجازت لیکر مجھے ملنے کیلئے آئے۔ چند منٹ ہی ملاقات ہوئی۔ تین سال کے عرصے میں قد خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ چہرے پر وہ رونق اور آنکھوں میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ مجھ سے ملتے رہیں گے۔ اور اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ جہاں تک ممکن ہو گا ان کے دل سے افسردگی اور حسرت کے احساس کو زائل کرنے کا اہتمام کیا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔ اس کے بعد جب تک وہ پسرور سکول میں تعلیم پاتے رہے اوسطاً مہینے میں دو بار ہمارے ہاں سیالکوٹ آتے رہے۔ ہمارا گھر ان کے لئے اپنا ہی گھر تھا اور انہیں بھی یہی احساس تھا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۱۶ء کو نارووال سیالکوٹ ریلوے کا افتتاح ہوا اور پسرور اور سیالکوٹ کے درمیان سفر آسان ہو گیا۔ کسی مغربی ملک میں ایک دیہاتی علاقے میں ریل کا جاری ہونا اور اس طریق سے اس علاقے کا باقی دنیا کے ساتھ الحاق ہونا ایک ایسی تقریب شمار کیا جاتا۔ جس کے منانے کیلئے سکولوں میں تعطیل کی جاتی اور منتظمین کی طرف سے انتظام کیا جاتا کہ سکول کے بچے ریل پر کچھ فاصلہ سفر کریں اور اس تقریب پر خوشی منائیں۔ لیکن یہاں ردعمل اس کے برعکس تھا۔ میں نے بشیر احمد کو لکھا کہ ریل کے جاری ہونے پر تو وہ ضرور سیالکوٹ آئیں گے۔ میں انہیں اسٹیشن پر مل جاؤں گا وہ آگئے لیکن ان سے معلوم ہوا کہ وہ میرے لکھنے پر آگئے ہیں لیکن سکول کی طرف سے ممانعت تھی کہ کوئی طالب علم اس دن ریل پر سفر نہ کرے اور پسرور سے باہر نہ جائے لہذا خلاف ورزی موجب تعزیر ہوگی۔ واپس جانے پر انہوں نے لکھا کہ تعزیر بھگتنا پڑی۔!

عدالت میں پیش ہونے کا پہلا تجربہ | دسمبر ۱۹۱۴ء تک مجھے پریکٹس کا لائسنس مل چکا تھا لیکن والد صاحب نے فرمایا کہ کرسمس کی تعطیلات کے بعد باقاعدہ کام شروع کرنا۔ تعطیلات سے چند دن قبل والد صاحب کی طبیعت ایک دن علیل ہو گئی اور عدالت تشریف نہ لے جا سکے۔ مجھے فرمایا تم چلے جاؤ۔

شیخ حسین بخش کے مقدمے میں میری جگہ اپنی حاضری لکھوا دینا۔ شیخ ظہور الٰہی صاحب بھی ہمارے ساتھ وکیل ہیں۔ آج اس مقدمے میں کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ سنیئر سب جج صاحب نے راضی نامے کیلئے مہلت دیدی تھی۔ راضی نامہ نہیں ہوا۔ آج صرف مزید کارروائی کے لئے تاریخ مقرر ہوگی۔ اگر کوئی بات چیت کرنا ہوئی تو شیخ ظہور الٰہی صاحب کرلیں گے۔ میں نے مقدمے کے کاغذات دیکھے تو مجھے احساس ہوا کہ ہمارے فریق کو راضی نامے کیلئے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ شیخ حسین بخش سیالکوٹ شہر میں بڑے بازار میں دوکان کرتے تھے۔ اور اپنی دوکان کے مالک تھے۔ ان کی دوکان اور آس پاس کی دوکانوں کی چھتیں ہموار تھیں اور ان کے اوپر کوئی عمارت نہیں تھی۔ ان چھتوں کے ساتھ ساتھ ایک گلی جاتی تھی جس پر چند مکانوں کے دروازے کھلتے تھے۔ یہ کھلی چھتیں ان مکانوں کے رہنے والوں کیلئے ایک قسم کا صحن نظر آتی تھیں۔ ان مکانوں میں رہنے والے سب ہندو تھے۔ کسی اجتماع کے موقعہ پر ان چھتوں پر بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ شیخ حسین بخش صاحب نے کہا کہ ان کی دوکان کی چھت پر جمع نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ چھت کو نقصان پہنچے۔ مقابل کے مکانوں والوں نے کہا انہیں دوکانوں کی چھتوں پر شادی غمی کی تقریبوں کیلئے جمع ہونے کا حق آسائش حاصل ہے۔ اور دوکانوں کے مالک نہ صرف اس حق میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ پابند ہیں کہ دوکانوں کی چھتوں کو اچھی حالت میں رکھیں اور ان پر کسی قسم کی عمارت تعمیر نہ کریں۔ شیخ صاحب نے بزور اس ادعا کی تردید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلہ والوں کی طرف سے شیخ حسین بخش صاحب کے خلاف دعویٰ استقرار یہ دائر کیا گیا کہ ان کا موعودہ حق تسلیم کیا جائے اور مدعا علیہ کے نام حکم امتناعی جاری کیا جائے کہ وہ اس میں مزاحم نہ ہو اور کسی قسم کی کوئی عمارت اپنی دوکان کی چھت پر نہ بنا سکے۔ اوّل تو موعودہ حق آسائش ہی بالکل غیر معین قسم کا تھا۔ جو قانوناً قابلِ قبول اور قابلِ نفاذ نہیں تھا۔ پھر واقعات اس کی تائید میں نہیں تھے مدعیان کی طرف سے تائیدی شہادت بہت کمزور اور متضاد تھی۔ ایسی صورت میں شیخ حسین بخش کو راضی نامے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں شیخ ظہور الٰہی صاحب کو اپنے طالبعلمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ شیخ فیروز الدین مراد صاحب کے برادر اکبر تھے۔ ان کے بھتیجے شیخ عنایت اللہ صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ سکول سیالکوٹ میں میرے ہم جماعت تھے۔ اور میں کئی بار ان سے ملنے کیلئے اُن کے آبائی مکان پر جایا کرتا تھا۔ میں کچہری پہنچ کر شیخ ظہور الٰہی صاحب سے ملا اور مقدمے کے متعلق اپنے تاثر کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا تمہاری رائے بالکل درست ہے۔ ہماری طرف سے مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ مدعیان کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں اس لئے ہم کسی راضی نامے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ میں نے دریافت کیا۔ پھر راضی نامے کی تجویز کیسے پیش ہوئی۔ کہنے لگے سنیئر سب جج صاحب سیالکوٹ ہی کے رہنے والے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مدعیان کا کچھ نہ

کچھ حق تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن ہم اس پر رضامند نہیں ہیں۔

سردار ہرپرت سنگھ صاحب | سنیئر سب جج سردار ہرپرت سنگھ صاحب تھے وہ اپنی ملازمت کی میعاد کے آخر کو پہنچے ہوئے تھے اور چند مہینوں میں پنشن پر جانیوالے تھے۔ جب مقدمہ بلایا گیا اور فریقین کے وکلا پیش ہوئے۔ تو جج صاحب نے دریافت فرمایا راضی نامے کی کوئی صورت پیدا ہوئی یا نہیں۔ مدعیان کے وکیل صاحب نے گذارش کی کہ مدعا علیہ کچھ بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ جج صاحب نے شیخ ظہور الٰہی صاحب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا۔ آپ جانتے ہیں ہم اس شہر کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں دونوں فریق سے ہمدردی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مقدمہ بازی خواہ مخواہ طول نہ پکڑے۔ اگر راضی نامے کی کوئی صورت نہ ہوئی تو ہم یہ دعویٰ تو خارج کردیں گے لیکن پھر اپیل ہوگی اور بات بڑھے گی۔ آئندہ تنازعات کا دروازہ کھلے گا فریقین مقدمہ بازی کے چکر میں پھنس کر برباد ہوں گے۔ بہتر ہو کہ کوئی نہ کوئی صورت راضی نامے کی ہو جائے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ جج صاحب کسقدر سادہ اور بھولی طبیعت کے مالک ہیں۔ لیکن شیخ ظہور الٰہی صاحب جج صاحب کے ہر جملے پر۔ "آپ بجا فرماتے ہیں"۔ "آپ تو فریقین کیلئے بمنزلہ ماں باپ کے ہیں"۔ "آپ کی ہمدردی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔" کا راگ الاپتے رہے۔ آخر جج صاحب نے آئندہ تاریخ مقرر کی اور فرمایا کہ اگر اس اثناء میں راضی نامہ ہوگیا تو بہتر ورنہ ہم اس تاریخ پر فریقین کی بحث سنیں گے۔ یہ میرا ضلع کی ابتدائی عدالتوں کی کارروائی دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا۔ اور اس کا اثر بہت عرصے تک میری طبیعت پر رہا۔ میں نے بیس مہینے اپنے والد صاحب کے زیر ہدایت سیالکوٹ ضلع کی عدالتوں میں وکالت کا کام کیا لیکن میری طبیعت پر جو نقش پہلے دن ثبت ہوا وہ مٹ نہ سکا اور میری طبیعت ضلع کی عدالتوں میں وکالت کے کام کی طرف مائل نہ ہو سکی۔

سیالکوٹ میں پریکٹس کا آغاز | جنوری ۱۹۱۵ء میں میں نے والد صاحب کے زیر ہدایت وکالت کا کام شروع کر دیا۔ والد صاحب کا کام زیادہ تر دیوانی تھا۔ زمین کے مقدمات میں انہیں خاص مہارت اور شہرت حاصل تھی۔ جب میں نے پریکٹس شروع کی والد صاحب سیالکوٹ میں دیوانی کے کام میں چوٹی کے وکیل شمار کئے جاتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے میں فوجداری کام لے تو لیتا ہوں لیکن یہ کام میری طبیعت پر گراں ہوتا ہے۔ میری طبیعت میں ذمہ داری کا احساس بہت تیز ہے۔ زمین کے مقدمات میں یہ سہولت ہے کہ زرعی اراضیات کے متعلق تمام ضروری تفاصیل برطانوی عملداری کے ابتداء سے مال کے کاغذات میں محفوظ شدہ موجود ہیں۔ ہر قطعہ کے متعلق کوائف اور حقوق ان کاغذات سے مل جاتے ہیں اور انہی پر مقدمات کے فیصلے

کا دارومدار ہوتا ہے۔ زبانی شہادت صرف رسمی ہوتی ہے۔ البتہ مال کے کاغذات اشتمال بندوبست جمع بندی وغیرہ کے اندراجات میں سے متنازعہ رقبہ کے متعلق ضروری کوائف معلوم کرنیکے لئے کسی قدر واقفیت اور مشق کی ضرورت ہے۔ وہ تم مجھ سے سیکھ سکتے ہو۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے۔ زرعی اراضیات کے مقدمات کا فیصلہ "پنجاب لاز ایکٹ" کی دفعہ ۵ کے ماتحت رواج کے مطابق ہوتا ہے۔ تم تھوڑی سی توجہ سے رواج کے اصولوں اور قواعد سے واقفیت پیدا کر سکتے ہو۔ اور چیف کورٹ کے فیصلہ جات پر نگاہ رکھنے سے رواج کے متعلق اپنی واقفیت تازہ رکھ سکتے ہو۔ مجھے زمین کے مقدمات کے متعلق یہ اطمینان رہتا ہے کہ میری سستی یا غفلت کی وجہ سے میرے کسی موکل کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر جج غلطی کرے تو اس کی اصلاح اپیل میں ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے موکل کو کچھ نقصان برداشت کرنا ہی پڑے تو اس نقصان کی نوعیت مالی ہوتی ہے۔ اس کی جان۔ آبرو یا آزادی خطرے میں نہیں پڑتی۔ فوجداری مقدمات میں ملزم کی جان، آزادی اور آبرو پر آنچ آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور فیصلے کا مدار بہت حد تک استغاثے کی شہادت پر ہوتا ہے۔ جس میں دشمنی، ضد، دھڑے بندی جیسے عناصر کا بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے جیسے حساس طبیعت والے پر یہ ذمہ داری بہت بوجھل ہوتی ہے۔ فوجداری مقدمے کے دوران میں بعض دفعہ میرے لئے نیند مشکل ہو جاتی ہے۔"

والد صاحب کے ساتھ کام کرنے کے سلسلے میں بعض پابندیاں ان کی طرف سے مجھ پر عاید کی گئی تھیں۔ انہوں نے فرمایا ہمارا کام مشترک ہوگا۔ اور آمد بھی مشترک ہوگی۔ اور آمد کا حساب تمہارے سپرد ہوگا۔ اسے باقاعدگی سے رکھنا ہوگا۔ تمہارے اخراجات پر میں کوئی پابندی عاید نہیں کرتا۔ جو مناسب سمجھو خرچ کرو۔ اس سلسلے میں انہوں نے بتایا تمہارے انگلستان کے قیام کے عرصے میں تمہارے اخراجات کا مجھ پر کوئی بوجھ نہیں پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل رہا کہ جسقدر اخراجات تمہارے انگلستان کے سفر اور وہاں کے قیام پر ہوئے اس قدر اضافہ میری آمد میں ہوتا رہا۔ کام مشترک ہونے کے متعلق فرمایا میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا کہ کسی مقدمے میں ہم ایک دوسرے کے خلاف عدالت میں پیش ہوں باپ بیٹے کے درمیان یہ صورت کبھی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ پنڈت بیلی رام وکیل اور ان کے صاحبزادے مسٹر جگجیت رائے بیرسٹر ایکدوسرے کے خلاف مقدمہ لے لیتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ طریق پسند نہیں۔ تم ہر مقدمے کے کاغذات اچھی طرح دیکھ لیا کرو۔ میرے ساتھ جب چاہو عدالت میں چلے جایا کرو تاکہ تمہاری واقفیت میں اضافہ ہوتا رہے۔ جو مقدمہ اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہو

بے شک کرو - مجھ سے جو مشورہ اور رہنمائی چاہو میں دید یا کروں گا - دیوانی مقدمات میں عرضیدعویٰ یا جواب دعویٰ جیسے بھی صورت ہو ہر مقدمے میں تیار کر کے مجھے دکھا لیا کرو - تاکہ تمہیں مشق ہو جائے - بیرسٹر لوگ عموماً دستاویزات کے تیار کرنے سے جی چراتے ہیں - لیکن یہ وکالت کے کام کا بڑا اہم حصہ ہے بہت دفعہ فیصلے کا انحصار عرضیدعویٰ یا جوابی دعویٰ کی عبارت پر آٹھہرتا ہے - یہ بہت احتیاط کا کام ہے - کام کے جس حصے کا تعلق زیادہ تر انگریزی کے ساتھ ہو وہ تدریج تمہاری طرف منتقل ہوتا جائے گا - تم میرے ساتھ ابتدائی کام میں شریک رہو گے - لیکن اپیل کا کام میں تمہاری طرف منتقل کرتا جاؤنگا اپیل میں انگریزی میں بحث کرنا آسان رہتا ہے - میں نے والد صاحب کی ہدایات کا خلاصہ ایک جگہ بیان کر دیا ہے - لیکن یہ تمام امور انہوں نے یک وقت ارشاد نہیں فرمائے - باوجود وکالت پیشہ ہونے کے وہ بہت خاموش طبیعت اور نہایت کم گو تھے - بات بہت آہستہ کرتے تھے مختصر الفاظ میں مطلب بیان فرماتے تھے - بعض دفعہ تو سوال کا جواب دینے میں اسقدر تاخیر کرتے کہ میرے جیسی عجلت پسند طبیعت بے صبر ہونے لگتی - مقدمے کی بحث کے دوران میں اگر مخالف وکیل کوئی سوال کرتا یا جج کوئی بات دریافت کرتا تو معاملہ خواہ کتنا واضح ہوتا تامل اور تدبر کے ساتھ جواب دیتے - جلدی نہ کرتے - ان کا نمونہ اور ان کی ہدایات میرے لئے مشعلِ راہ تھیں - میں نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا - فجزاہ اللہ احسن الجزا - لیکن طبائع کی افتاد کا فرق رہا - میں جلدی اور تیزی سے بات کرنے کی عادت کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکا بعد میں جب میں نے چیف کورٹ میں کام کرنا شروع کیا تو بعض دفعہ جج صاحبان فرماتے آہستہ بات کرو - تم اتنا تیز بولتے ہو کہ تمہارا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے - عدالت میں تو بحث کو طول دینا میرا کبھی معمول نہیں رہا - لیکن اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں بعض مسائل پر مجھے بہت لمبی تقریریں کرنے کی ضرورت پیش آئی - وہاں میرے رفقا میری لمبی تقریروں سے دق تو ضرور آتے ہونگے لیکن یہ عنایت انکی ہمیشہ مجھ پر رہی کہ سنتے توجہ کے ساتھ تھے - والد صاحب جو مقدمہ میرے سپرد فرماتے اس کی پیروی عدالت کے کمرے میں میں خود ہی کرتا - والد صاحب اس اثناء میں عدالت کے کمرے میں تشریف نہ لے جاتے - گو کچھ عرصہ بعد مجھے اپنے ایک منشی سے معلوم ہوا کہ شروع شروع میں جب میں ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اپیل میں پیش ہوتا تو والد صاحب اجلاس والے کمرے کے بغل کے کمرے میں جا بیٹھتے اور وہاں سے بحث سنتے -

مسٹر ایچ - اے روز اور مسٹر بارکر ڈسٹرکٹ و سشن جج

جب میں نے سیالکوٹ میں کام شروع کیا تو وہاں ڈسٹرکٹ اور سشن جج مسٹر ایچ - اے - روز تھے ان کا مزاج کچھ

تلخ اور تیز تھا اور کسی قدر ضدی بھی تھے۔ججی کے فرائض کی سرانجام دہی میں یہ صفات سدّ راہ تھیں۔ ان کا جلد تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ مسٹر بارکر آئے جو طبیعت کے حلیم تھے اور بہت سوچ سمجھ کر چلتے تھے۔ میں دو بار ان کے سامنے بحث کر چکا تھا کہ ان کی ملاقات کسی تقریب میں والد صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے والد صاحب سے کہا ظفراللہ خاں بہت محنت سے کام کرتا ہے اور بحث میں اپنا مطلب خوب واضح کر دیتا ہے۔ والد صاحب نے یہ ذکر مجھ سے کیا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ مسٹر بارکر سے میرے حق میں تعریفی کلمات سنکر انہیں خوشی ہوئی۔ فالحمدللہ۔

مسٹر ایبٹ آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر | ان دنوں سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ای آر ایبٹ تھے۔ گفتگو میں ان کا لہجہ سخت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ محض ان کا طرز کلام تھا۔ طبیعت کے نہایت شریف تھے۔ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا اور حکومت کی طرف سے جنگی قرضہ اور فوجی بھرتی حاصل کرنے پر بہت زور دیا جا رہا تھا۔ بعض مقامات پر انہیں حاصل کرنے کیلئے سختی کئے جانے کی شکایت بھی سنی جاتی تھی۔ لیکن مسٹر ایبٹ نے سیالکوٹ کے ضلع میں ایسی شکایت پیدا ہونیکا کوئی موقعہ نہ دیا۔ پسرور میں جنگی قرضے کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا۔ مسٹر ایبٹ صدر تھے۔ ان کی تقریر کے بعد بدوملہی کے ذیلدار مسٹر سدھ بی ملہی نے اپنی طرف سے دس ہزار روپیہ کی پیش کش کی۔ مسٹر ایبٹ نے انہیں سختی سے یہ کہتے ہوئے روک دیا۔ اپنا قرضہ اتار نہیں سکتے اور حکومت کو قرضہ دینے ہیں بیٹھ جائیے۔

سیّد میر حامد شاہ صاحب | سیّد میر حامد شاہ صاحب ڈپٹی کمشنر کے فارسی دفتر کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مسٹر ایبٹ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں کسی سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کے اجلاس کے کمرے میں موجود تھا۔ شاہ صاحب کچھ کاغذات پیش کر کے ان پر احکام لے رہے تھے۔ ایک رپورٹ پڑھی کہ آپ کی عدالت کے احاطے میں جو آم کے درخت ہیں ان کا پھل اتنی رقم پر نیلام ہوا۔ آپ کی منظوری کیلئے پیش ہے۔ مسٹر ایبٹ نے اپنے مخصوص درشت لہجے میں کہا۔ "حامد شاہ کیا حکومت مجھے اڑھائی ہزار روپیہ ماہوار اس کام کیلئے دیتی ہے کہ میں ان چند روپوں کے متعلق رپورٹیں سنوں۔ اور انکی منظوری دوں"۔ شاہ صاحب نے ان سے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔ "مجھے اس سے غرض نہیں قواعد میں لکھا ہے کہ آپ کی منظوری ضروری ہے اور قواعد آپ کی منظوری سے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں دستخط کیجئے"۔ مسٹر ایبٹ نے فوراً دستخط کر دیئے اور میری طرف دیکھ کر اور مسکرا کر کہا۔ "شاہ صاحب خفا ہو گئے ہیں"۔

مالی سال کے آخر میں تحصیلدار صاحب نے بطور انکم ٹیکس افسر والد صاحب کی آمد پر انکم ٹیکس تشخیص کیا۔ اور باوجود اس وضاحت کے کہ میں والد صاحب کے ساتھ کام کرتا ہوں اور میری کوئی علیحدہ آمد نہیں میری مفروضہ

آمد پر بھی انکم ٹیکس تشخیص کر کے ٹیکس کا مطالبہ کیا۔ والد صاحب نے فرمایا اس مطالبے کے خلاف ڈپٹی کمشنر کے پاس عذرداری کر دو۔ ورنہ آئندہ سال یہ مطالبہ بڑھ جائے گا۔ اور یہ عذر سماعت نہ ہوگا کہ تمہاری کوئی علیحدہ آمد نہیں۔ چنانچہ میں نے عذرداری کی درخواست ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں پیش کر دی۔ اور زبانی بھی کہہ دیا کہ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ہی کام کرتا ہوں اور میری کوئی علیحدہ آمد نہیں۔ ہماری جملہ مشترکہ آمد پر ٹیکس تشخیص ہو چکا ہے۔ مسٹر ایبٹ نے قلم اٹھایا اور درخواست پر چند لفظ لکھ کر اپنے سررشتہ دار کو درخواست دیدی۔ میں نے دریافت کیا آپ نے کیا حکم دیا؟ کہا تحصیلدار صاحب سے رپورٹ طلب کی ہے۔ میں نے کہا تحصیلدار صاحب اس پر کیا رپورٹ کریں گے۔ یہ امر واقعہ کا سوال ہے۔ اور یہ امر میرے علم میں ہے۔ میں کہتا ہوں میری کوئی الگ آمد نہیں آپ میری بات تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اگر تسلیم کرتے ہیں تو درخواست منظور کیجئے اور اگر تسلیم نہیں کرتے تو رد کیجئے۔ مسٹر ایبٹ مسکرائے اور سررشتہ دار سے کاغذ واپس لیکر پہلے الفاظ کاٹ دیئے اور ان کی جگہ "منظور" لکھ دیا۔ میں شکریہ ادا کر کے چلا آیا (اسوقت ابھی انکم ٹیکس کا علیحدہ مرکزی محکمہ قائم نہیں ہوا تھا۔ نائب تحصیلدار اور تحصیلدار ہی انکم ٹیکس کا کام کرتے تھے۔) مسٹر ایبٹ بعد میں کمشنر اور پھر فنانشل کمشنر ہوئے جب پنشن پر گئے تو آکسفورڈ کے قریب ایک مکان جس کا نام "OLD VICERAGE" تھا خرید کر اس میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۷ء میں جب میں انگلستان گیا تو مجھے اپنے ہاں دعوت دی اور بہت تواضع سے پیش آئے۔

۱۹۳۵ء میں جب میں مرکزی حکومت ہند میں وزیر تجارت تھا تو حکومت پنجاب کے شملہ کے دفاتر کے برآمدے میں سے گذرتے ہوئے ایک دروازے پر مسٹر ایبٹ کا نام دیکھا۔ میں سن چکا تھا کہ مسٹر ای آر ایبٹ کے ایک صاحبزادے انڈین سول سروس میں منتخب ہو کر پنجاب میں متعین ہیں۔ میں چک ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور سلام کیا۔ حیران ہوئے کہ یہ شخص بلا اطلاع کیسے آگیا اور ہے کون۔ میں نے ان کے والدین کی خیریت دریافت کی اور ذکر کیا کہ میں OLD VICERAGE میں ان سے ملا ہوں۔ اس پر اور بھی حیران ہوئے اور کہا پھر آپ اپنا نام نشان بھی بتائیں۔ میں نے نام بتایا تو فوراً کھڑے ہو گئے اور معذرت کی کہ پہلے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے پہچان نہ سکا۔ میں نے کہا معذرت مجھے کرنا چاہئے کہ میں بلا اطلاع کمرے میں گھس آیا۔ ان کی شادی سر آٹو نیمیار مشہور ماہر مالیات کی بیٹی سے ہوئی۔ سول سروس سے استعفاء دیکر کچھ عرصہ تو لندن میں مالی حلقوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی سعی کرتے رہے اور اب چند سالوں سے ٹرنٹی

ہاؤس کیمرج کے BURSAR ہیں۔

رائے بہادر کیشو داس مجسٹریٹ | ان دنوں سیالکوٹ میں فوجداری صیغے میں سنیئر مجسٹریٹ بااختیارات زیر دفعہ ۳۰ ضابطہ فوجداری رائے بہادر کیشو داس تھے۔ بہت خوش پوش باوضع اور بارعب افسر تھے۔ توجہ اور سلیقے سے کام کرتے تھے۔ اور جلد کام ختم کر لیتے تھے۔ بڑے صفائی پسند تھے۔ ان کی گاڑی، گھوڑا، ساز و سامان سب نستعلیق تھے۔ ایک گھوڑے کی بانکی گاڑی تھی جسے خود چلاتے تھے۔ لیکن دو گھوڑے جوڑی کے تھے۔ جنہیں باری باری جوتا جاتا تھا۔

شیخ عبدالرحمٰن صاحب مجسٹریٹ | شیخ عبدالرحمٰن صاحب (برادر اصغر شیخ رحمت اللہ صاحب مالک انگلش ویر ہاؤس لاہور) سیالکوٹ میں مجسٹریٹ درجہ اول بھی تھے اور سب جج درجہ اول بھی یعنی انہیں فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے اختیارات تفویض تھے۔ نہایت خلیق اور منکسر مزاج تھے۔ گفتگو میں خواجہ حافظ شیرازی کے مقولے "فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم" کے قائل تھے۔ اپنا کام بہت توجہ، محنت اور دیانتداری سے سرانجام دیتے تھے۔ بہت زود نویس اور خوشنویس تھے۔

میر عباداللہ صاحب سنیئر سب جج | دیوانی صیغے میں سنیئر سب جج سردار چرت سنگھ صاحب تھے۔ ان کے پنشن پر جانے کا زمانہ قریب تھا۔ ان کے بعد میر عباداللہ صاحب سنیئر سب جج ہو کر آئے۔ وہ بھی نہایت شریف طبع اور منکسر مزاج تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے میر مقبول محمود صاحب نہایت قابل اور ہونہار تھے۔ تقسیم سے قبل والیانِ ریاست کی چیمبر کے سکرٹری ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں ضرور بہت ترقی کرتے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ایک نہایت المناک ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے سردار سر سکندر حیات خاں صاحب میر عباداللہ صاحب کے داماد تھے۔ اور سردار شوکت حیات خاں صاحب ان کے نواسے اور اپنے ماموں میر مقبول محمود صاحب کے داماد ہیں۔

دیوان سیتارام صاحب منصف | دیوان سیتارام صاحب سیالکوٹ میں منصف تھے نہایت قابل اور بیدار مغز افسر تھے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رورعایت روا نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں سب جج اور سنیئر سب جج ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پنشن پر جانے سے پہلے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج بھی ہو گئے تھے۔ لباس اور وضع قطع میں بہت سادہ تھے۔ لیکن پختہ کار اور سلیم الطبع تھے۔ ہمارے گاؤں کے رقبے میں سے نہر اپر چناب کی ایک شاخ نکالی گئی تھی جس کا نام اب بمباں والہ راوی بیدیاں نہر ہے۔ اسی رقبے میں ایک سائفن بنایا گیا جہاں نہر کا پانی نیچے سے ہو کر گذرتا تھا۔ اور بارش کے مہینے میں بارش کا پانی سطح پر سے گذر جاتا تھا۔ چونکہ سائفن کا قطر ضرورت سے کچھ کم رکھا گیا

اسلئے بارش کے موسم میں پانی رک جاتا تھا اور ارد گرد کے رقبے میں فصل خراب ہو جاتی تھی یہ رقبہ والد صاحب کی ملکیت تھا۔ پہلی بار جب ایسا ہوا تو والد صاحب نے متعلقہ محکمہ کو نوٹس دیا کہ سائفن کے قطر کو بڑھانے کا انتظام کیا جائے اور فصل کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ محکمہ نے مناسب اصلاح کا وعدہ کیا لیکن عملاً کوئی اقدام نہ کیا۔ دوسرے سال پھر وہی صورت پیش آئی۔ پھر نوٹس دیا گیا اور نقصان کا معاوضہ طلب کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تیسرے سال پھر ویسا ہی ہوا۔ اگلی بار ۸۰ ضابطہ دیوانی کے مطابق نوٹس دیکر والد صاحب نے ہرجانے کی وصولی کا دیوانی دعویٰ دائر کر دیا جو دیوان سیتارام صاحب کے سپرد ہوا حکومت کی طرف سے ہر طرح کے عذر اٹھائے گئے لیکن پوری تحقیقات کے بعد دیوان صاحب نے ڈگری صادر کر دی۔ اس مقدمے کے آخری مراحل کے دوران میں انگلستان سے واپس آیا تھا۔

سیالکوٹ چھاؤنی میں مستری جھنڈا صاحب کی فرنیچر کی دکان تھی وہ خود بڑے اعلیٰ درجے کے کاریگر تھے۔ کچھ کاریگر ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ انگریز افسران ان کے ہاں کی بنی ہوئی اشیاء کی بہت قدر کرتے تھے۔ وہ بہت سنجیدہ مزاج۔ شریف طبع انسان تھے۔ ان کی رہائش شہر میں ٹبہ معماراں کے محلے میں تھی۔ ان کا ایک نوجوان پڑوسی جو ان کا رشتہ دار بھی تھا۔ چالاک اور شوخ طبع تھا۔ اور ان سے بلاوجہ پرخاش رکھتا تھا۔ کئی طریق سے انہیں دق کرتا تھا۔ آخر اس نے ان کے خلاف ایک بے بنیاد استغاثہ دائر کر دیا۔ مستغیث کی طرف سے چودھری محمد امین صاحب وکیل تھے۔ مستری جھنڈا صاحب نے والد صاحب کو اپنی طرف سے وکیل کیا اور انہوں نے مجھے پیروی کرنے کا ارشاد فرمایا۔ شہادت استغاثہ لینے کے بعد مجسٹریٹ نے استغاثہ خارج کر دیا۔ لیکن اس سے مستغیث کے رویہ میں کوئی اصلاح نہ ہوئی۔ وہ مثل سابق مستری صاحب کے خلاف شرارت اور ایذا دہی کے طریق اختیار کرتا رہا۔ مستری صاحب نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اس کی شرارتوں کا کس طریق سے سدِ باب کیا جائے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس کی تادیب کیلئے اس کے خلاف بدنیتی سے جھوٹا استغاثہ دائر کرنے کی بنا پر ہرجانے کا دیوانی دعویٰ کیا جائے۔ مستری صاحب نے کہا میں تو قانونی باریکیاں نہیں جانتا جو مشورہ تم دو میں اسپر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ ان کی اجازت اور ہدایت کے مطابق میں نے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ مدعا علیہ نے پھر چودھری محمد امین صاحب کو اپنی طرف سے وکیل مقرر کیا۔ چودھری صاحب والد صاحب کے دوست بھی تھے اور کچھ دور کا رشتہ داری کا تعلق بھی تھا۔ میرے لئے وہ ہر طرح

سے واجب الاحترام شخصیت تھے کچہری میں والد صاحب کا اور ان کا دفتر بھی ایک ہی کمرے میں تھا کچہری کے اوقات میں میرا فراغت کا بیشتر حصہ ان کی صحبت میں گذرتا تھا۔ جب وہ اس مقدمہ میں مدعاعلیہ کی طرف سے وکیل مقرر ہوئے تو مجھ سے کہا تم نے یہ دعویٰ محض مدعاعلیہ کو دق کرنے کیلئے کیا ہے یا سنجیدگی سے کیا ہے؟ میں نے کہا بہت سنجیدگی سے کیا ہے۔ دق کرنا تو آپ کے موکل نے شعار بنایا ہوا ہے۔ ہم تو اسکی شرارت کو روکنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے ایسا دعویٰ تو قابل سماعت ہی نہیں کوئی استغاثے ہر روز خارج ہوتے ہیں اگر ہر مستغیث پر ہرجانے کا دعویٰ ہونے لگے تو ایک مذاق بن جائے۔ میں نے کہا بدنیتی اور دشمنی کی وجہ سے جھوٹا استغاثہ کیا جائے اور وہ خارج ہو جائے تو مستغاث علیہ ضرور ہرجانے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہاں ایسا دعویٰ کرنے کا رواج نہیں اور ایسا دعویٰ آپ کو اجنبیہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسے دعویٰ میں کامیابی جھوٹے استغاثوں کی روک کا موجب ہو سکتی ہے۔ فرمایا اچھا دیکھیں گے۔ جواب دعویٰ میں علاوہ واقعاتی عذرات کے یہ عذر بھی کیا گیا کہ ایسا دعویٰ قانوناً قابل پذیرائی نہیں۔ یہ مقدمہ بھی دیوان سیتارام صاحب کے سپرد ہوا۔ اور آخر میں مدعی کے حق میں ڈگری ہو گئی۔ میں نے عمداً زیادہ ہرجانہ طلب نہیں کیا تھا۔ غرض تو مدعاعلیہ کی تادیب تھی تا وہ شرارت میں بڑھتا نہ جائے۔ مستری جھنڈا صاحب کو اندیشہ تھا کہ وہ ایک استغاثہ خارج ہونے کے بعد ایک اور جھوٹا استغاثہ دائر کر دے گا۔ ہمارے دعویٰ کا اصل مقصد یہ تھا کہ مدعاعلیہ کو یہ احساس ہو جائے کہ ایسے اقدامات کی کچھ قانونی پاداش بھی ہو سکتی ہے۔ دیوان صاحب نے ہماری مطلوبہ رقم ہرجانہ کی ایک شق میں تھوڑی سی تخفیف کر دی اور بقیہ جملہ مطلوبہ رقم کی ڈگری دیدی۔ مدعاعلیہ نے اپیل دائر کی جس کی سماعت مسٹر بار کرنے کی اور اپیل خارج کر دی جب مدعاعلیہ کو تاوان اور دونوں عدالتوں کے خرچہ کی رقم ادا کرنی پڑی اور برادری کی نظروں میں خفت بھی ہوئی تو اس نے مستری صاحب کو دق کرنا چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک مرنجان مرنج شریف انسان مزید پریشانی سے بچ گیا۔

موضع آلو مہار ضلع سیالکوٹ کے ایک بزرگ نے جو سادات میں سے تھے اور جن کی اولاد نرینہ نہیں تھی رواج کے مطابق اپنے نواسے کو اپنا متبنّیٰ بنایا اور اسے اپنا وارث قرار دیا ان کے قریبی یکجدی کوئی نہیں تھے۔ ان کی وفات پر ان کے دُور کے جدّیوں نے دعویٰ کیا کہ متوفی رواج کے پابند نہیں تھے۔ شرع محمدی کے پابند تھے اور شرع محمدی میں تبنیت جائز نہیں۔ اسلئے وہ شرع محمدی کے مطابق ان کی وراثت میں اپنا حصہ پانے کے مستحق ہیں۔ ابتدائی عدالت میں مدعیان کی طرف سے چودھری محمد امین صاحب وکیل تھے اور مدعاعلیہ کی طرف سے والد صاحب۔ اس عدالت

نے قرار دیا کہ ہر چند کہ متوفی سید تھے لیکن ان کا خاندان پشتوں سے آلومہار میں آباد ہوا ہے۔ اور زراعت پیشہ ہے۔ اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں ہر موقعہ پر رواج کا پابند رہا ہے اسلئے متوفی بھی رواج کے پابند تھے۔ اور اپنے نواسے کو متبنٰی بنانے کے مجاز تھے۔ مدعیان نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی جس کی سماعت بھی مسٹر بارکر نے کی۔ والد صاحب نے اپیل کی پیروی میرے سپرد کی۔ مقدمہ کی تیاری کے دوران میں مجھے خیال ہوا کہ اس کیس کے واقعات کے تحت شرع محمدی کے مطابق بھی غالباً متوفی کے ترکے کا کثیر حصہ مدعا علیہ کو ہی پہنچتا ہے۔ چنانچہ میں نے کچھ وقت صرف کر کے شرع محمدی کے مطابق حصہ کشی کی تو معلوم ہوا کہ شرع محمدی کے مطابق بھی مدعیان صرف ایک نہایت خفیف حصہ جائداد کے حقدار ہوتے ہیں اور بقیہ تمام جائداد کا حقدار یا مدعا علیہ خود ہے یا اس کے وہ قریبی رشتہ دار ہیں جو اسکی بنیت کے موئید ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہی اپنے نانا کا وارث ہو۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کیلئے مجھے ایک لمبا حساب کا سوال حل کرنا پڑا لیکن میں نے یہ تمام تفصیل نوٹ کر لی۔ جب اپیل کی سماعت شروع ہوئی اور چودھری محمد امین صاحب امر زیر تنازعہ کو بیان کر چکے کہ متوفی شرع محمدی کے پابند تھے رواج کے پابند نہیں تھے تو میں نے کہدیا کہ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ شرع محمدی کے مطابق مدعیان کا جو حصہ وراثت میں بنتا ہے وہ انہیں دیدیا جائے۔ چودھری محمد امین صاحب کچھ حیران ہوئے کہ میں نے بحث کے بغیر ہی ان کا موقف تسلیم کر لیا ہے۔ مسٹر بارکر نے ان سے کہا اب آپ مجھے لکھا دیں کہ مدعیان شرع محمدی کے مطابق کسقدر کے حقدار ہیں۔ چودھری صاحب نے چونکہ تفصیلی حصہ کشی نہیں کی ہوئی تھی انہیں اس میں کچھ مشکل پیش آئی۔ مسٹر بارکر نے مجھ سے پوچھا تم نے یہ تمام قضیہ حل کیا ہے؟ میرے اثباتی جواب پر کہا پھر تم مجھے لکھا دو۔ چنانچہ میں انہیں لکھواتا گیا اور چودھری صاحب ساتھ ساتھ پڑتال کرتے گئے۔ جب حصہ کشی کا سلسلہ آخر کو پہنچا تو مسٹر بارکر نے پنسل ہاتھ سے رکھ کر کہا میرا تو سر چکرا گیا ہے اور مدعیان کا حصہ اتنا کم نکلا ہے!

شرع محمدی کا اطلاق تسلیم کر لینے سے میری غرض یہ تھی کہ مقدمہ بازی کا سلسلہ ختم ہو اور رضامندی سے تصفیہ ہو جائے۔ اگرچہ وکالت میرا پیشہ رہا ہے لیکن مجھے مقدمہ بازی سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ عرصہ ہوا میں ابھی پریکٹس کرتا تھا کہ جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسے میں میری تقریر اصلاح معاشرہ پر ہوئی۔ اس میں میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ ہمارے ملک میں دیہاتی طبقہ خصوصیت سے مقدمہ بازی کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس سے حتی الوسع بچنا چاہیئے۔ میری تقریر کے

ختم ہونے پر ہمارے نوجوان وکلاء سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ کہنے لگے تم نے یہ کیا کہہ دیا۔ اگر تمہاری نصیحت پر عمل شروع ہو گیا تو ہمارا کاروبار تو ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا رزق تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ میں بھی آپ کی طرح پریکٹس کرتا ہوں اور مجھے تو بہت خوشی ہو اگر ملک میں غیر ضروری مقدمہ بازی بند ہو جائے۔ خواہ میری پریکٹس جاری رہے یا نہ رہے۔ اگر قانون کی پریکٹس نہ رہے گی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کوئی اور رستہ کھول دیگا۔ آپ بتائیں کیا ایک ڈاکٹر کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ ملک میں بیماری بڑھے یا کم ہو۔؟

سیالکوٹ میں پریکٹس کے زمانے میں وہاں کے بعض سرکردہ وکلاء

دیوانی وکلاء میں پنڈت بیلی رام صاحب پیش پیش تھے۔ وہ والد صاحب سے ایک دو سال سنیئر تھے۔ میرے انگلستان جانے سے دو تین سال قبل ان کے صاحبزادے مسٹر پربجیت رائے بیرسٹری کی سند حاصل کر کے آئے تھے اور سیالکوٹ میں پریکٹس شروع کی تھی۔ ان کا کام بھی بڑھتا گیا لیکن فوجداری میں زیادہ دیوانی میں کم۔ شروع میں ہی انہوں نے شہر سے باہر ایک عالیشان بنگلہ تعمیر کیا تھا۔ پنڈت بیلی رام صاحب نے بہت لمبی عمر پائی اور شاید ۶۵ سال سے زائد عرصہ پریکٹس کی۔ سردار سنت سنگھ صاحب کی پریکٹس دیوانی ہی میں تھی۔ نہایت شریف طبع کم گو تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ فضولیات میں قطعاً حصہ نہیں لیتے تھے۔ بہت محنت سے کام کرتے تھے۔ قانونی کتب اور نظائر کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ لالہ اننت رام صاحب بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ انہوں نے خالص اپنی محنت اور توجہ سے اپنی پریکٹس کو فروغ دیا تھا۔ ان کے والد عدالت میں چپراسی تھے انکے پریکٹس شروع کرنے کے بعد بھی ان کے والد صاحب نے اپنا کام ترک نہ کیا۔ باپ بیٹے دونوں کی خودداری کی یہ ایک درخشاں مثال تھی۔ نہ بیٹے کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد اپنی روزی خود کمانے پر مصر ہیں تو یہ امر ان کے لئے خفت کا موجب ہے۔ نہ باپ کو یہ احساس تھا کہ میرا بیٹا ایک کامیاب وکیل ہے اسلئے مجھے اب اپنا کام چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ میرے بیٹے کیلئے خفت کا باعث نہ ہو۔

جب میں نے پریکٹس شروع کی دیوان چرن داس صاحب بہت سی جائداد پیدا کر چکے تھے ریلوے چوک میں ان کا عالیشان بنگلہ اور وسیع باغ تھا۔ ان کا مزاج امیرانہ تھا۔ وکالت بھی امیرانہ طریق پر کرتے تھے۔ خوش باش تھے۔ طبیعت بشاش تھی۔ بہت ملنسار تھے۔ خان بہادر حاجی چودھری سلطان محمد خانصاحب بیرسٹرایٹ لاء۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا بہت تجربہ رکھتے تھے۔ مملکت افغانستان میں میرمنشی رہ چکے تھے۔ جس محفل میں تشریف فرما ہوتے اس کے روح رواں ہوتے۔ بہاندیدہ ہونے کی وجہ سے ان کے

ذاتی تجربات اور واقعات کا ذخیرہ لامتناہی تھا۔ میں نے جب سیالکوٹ میں کام شروع کیا تو مجھ سے فرمایا قانون تو تم اپنے والد سے سیکھنا لیکن بات کرنے کا ڈھنگ مجھ سے سیکھنا۔ بہت حاضر جواب تھے۔ بار روم میں چھیڑ خوانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن جو صاحب حاجی چودھری صاحب سے چھیڑ خوانی پر آمادہ ہوتے وہ پہلے ہی قدم پر بری طرح پچھاڑے جاتے۔ ملک کے نامور شاعر فیض احمد فیض حاجی چودھری صاحب کی یادگار ہیں۔ چودھری سردار خاں صاحب ایک متین سنجیدہ مزاج، عبادت گذار، کثیر العیال، قدامت پسند، پابند وضع بزرگ تھے۔ والد صاحب کے ساتھ بہت دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں گھروں میں آپس میں بہت میل جول اور آنا جانا تھا۔ والد صاحب نے جب سلسلہ احمدیہ میں دلچسپی لینی شروع کی تو یہ امر چودھری صاحب کو ناگوار ہوا۔ کبھی گفتگو میں بحث کا رنگ بھی آجاتا۔ والد صاحب کا سلسلہ عالیہ احمدیہ میں منسلک ہونا چودھری صاحب کے لئے بہت رنج کا موجب ہوا والد صاحب کی بیعت کا شہر بھر میں بہت چرچا ہوا اور سارے شہر میں فوراً خبر پھیل گئی والد صاحب کچہری گئے اور چودھری صاحب سے ملاقات ہونے پر السلام علیکم کہا۔ چودھری صاحب نے جواب میں فرمایا "وعلیکم السلام ان کنت مسلماً" (وعلیکم السلام اگر تم مسلمان ہو) والد صاحب نے قریب کے حاضرین کو گواہ ٹھہرایا کہ چودھری صاحب نے میرے مسلمان ہونے میں شک کیا ہے۔ اب مجھ پر سلام میں سبقت واجب نہیں البتہ چودھری صاحب اگر چاہیں تو یہ سلسلہ پھر شروع ہو سکتا ہے۔ اور میں پہلے کی طرح سلام میں سبقت کرنا شروع کر دوں گا۔ چودھری صاحب کا مکان لب سڑک تھا اور کھلے موسم میں بعض دفعہ وہ اپنے دفتر کے کمرے کے باہر لب سڑک کرسی پر تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ ان کا مکان مسجد احمدیہ کو جانیوالی گلی کے کونے پر تھا۔ مجھے بار ہا وہاں سے گذرنا ہوتا تھا میں ابھی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ میں نے والد صاحب سے دریافت کیا کہ میں چودھری صاحب کی خدمت میں مثل سابق سلام عرض کیا کروں یا نہ۔ فرمایا وہ تمہارے بزرگ ہیں تمہیں جب بھی موقعہ ہو تم ضرور سلام کہا کرو وہ جواب دیں یا نہ دیں۔ مجھ سے دو تین سال سینئر شیخ نوابدین مراد صاحب بیرسٹرایٹ لاء تھے۔ اپنے کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ محنت سے کام کرتے تھے۔ طبیعت بہت بشاش تھی۔ توقع تھی کہ اپنے پیشے میں ترقی کرتے لیکن چند سال ہی پریکٹس کی تھی کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

ابتدائی عدالتوں میں پریکٹس کرنے سے بے رغبتی | سیالکوٹ میں پریکٹس کے لحاظ سے مجھے ایک نہایت بیش قیمت سہولت یہ حاصل تھی کہ والد صاحب جیسا شفیق، ہمدرد، صاحب تجربہ استاد میسر تھا۔ دفتر، لائبریری، مکان، سواری، سب موجود تھے۔ پھر جج اور مجسٹریٹ ایسے نہیں تھے کہ مجھے ان سے شکایت ہوتی۔ ضلع بھر میں برادری اور رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ جو کام والد صاحب میرے

سپرد کرتے رہے میں نے اسے دلچسپ پایا اور میں اسے توجہ سے کرتا رہا۔ علاوہ وکالت کے کام کے شہر سیالکوٹ میں اور ضلع کے مختلف حصوں میں سلسلہ احمدیہ کی فعال اور مخلص جماعتیں تھیں۔ شہر کی جماعت کی سرگرمیوں میں میں شوق سے حصہ لیتا تھا۔ سیالکوٹ کی جماعت میں محاسب کی خدمت میرے سپرد تھی جسے میں بڑے شوق سے ادا کرتا رہا۔ جماعت کے بزرگوں کی صحبت میرے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی تھی اور موجب سعادت تھی۔ مجھے کوئی ایسی عادت نہیں تھی کوئی ایسا شوق نہیں تھا کوئی ایسی مرغوب دلچسپی نہیں تھی جسے میں سیالکوٹ میں پورا نہ کر سکتا۔ والدہ صاحبہ کی محبت اور شفقت ایک انمول نعمت تھی۔ جس کی قدر و منزلت میرے انگلستان کے سہ سالہ قیام نے دوبالا کر دی تھی اور ان سے جدائی مجھے گوارا نہیں تھی۔ لیکن باوجود ان تمام سہولتوں، آسائشوں اور کششوں کے ابتدائی عدالتوں کی پریکٹس کے ساتھ مجھے دلی رغبت پیدا نہ ہو سکی۔ چیف کورٹ کی پریکٹس کا نہ مجھے کوئی اندازہ تھا نہ تجربہ۔ لاہور میں وکالت کا کام شروع کرنے کیلئے مجھے نہ ضروری معلومات حاصل تھیں نہ ذرائع میسر تھے۔ میں نے معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں سیالکوٹ کو چھوڑ کر کسی نئے ماحول میں منتقل ہونے کے خیال سے پریشان بھی ہوتا تھا۔

دھرم سالہ کا سفر | ۱۵ء کی گرمیوں چودھری حاکم دین صاحب اور ڈاکٹر لال دین صاحب کے والد جو بڑے مخلص، متقی اور بڑے متواضع بزرگ تھے دھرم سالہ میں گورکھا رجمنٹ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے دونوں صاحبزادگان گرمیوں میں ان کے پاس گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لال دین صاحب نے مجھے بھی ستمبر کی تعطیلات میں دھرم سالہ آنے کی دعوت دی۔ میں نے والد صاحب سے اجازت لیکر دعوت منظور کر لی اور اگست کے آخر میں دھرم سالہ کیلئے روانہ ہوا۔ لاہور سے پٹھانکوٹ کی گاڑی رات کے ۹ بجے روانہ ہوئی۔ سیکنڈ کلاس کے ایک بڑے خانے میں ہم دو مسافر تھے۔ دوسرے صاحب ایک نسبتاً معمر بزرگ تھے جو رات کے وقت بھی رنگین چشمہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ٹرنک پر ان کا نام اور عہدہ یوں لکھا ہوا تھا "دی وینریبل آرک ڈیکن احسان الحق"۔ میں نے سمجھ لیا کہ آپ کلیسا کے بزرگ عہدے دار ہیں۔ وہ مجھ سے پہلے کمرے میں تشریف فرما تھے اور اپنے بستر پر آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ میں ریل کی روانگی سے تقریباً بیس منٹ پہلے پہنچا تھا۔ اتنے تھوڑے سے وقفے میں سوڈا برف والا دو بار لیمونیڈ اور برف لیکر آیا اور آرک ڈیکن صاحب کو پلا گیا۔ معلوم ہوا کہ آرک ڈیکن صاحب نے اسے ہدایت دے رکھی ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد انہیں لیمونیڈ اور برف مہیا کرتا رہے۔ جب مغل پورہ اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوئی تو وہ برف لیمونیڈ لئے حاضر ہو گیا۔ اٹاری، امرتسر، بٹالہ، گورداسپور، دینا نگر کے

اسٹیشنوں پر بھی اس نے برف لیمونیڈ حاضر کیا۔ آخر جب گاڑی پٹھانکوٹ پہنچی تو وہ آخری بار برف لیمونیڈ لئے حاضر ہوا اور آرک ڈیکن صاحب نے اس کا حساب ادا کر دیا۔ گاڑی تین بجے قبل فجر پٹھانکوٹ پہنچی ان چھ گھنٹوں میں آرک ڈیکن صاحب سو سکے یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھے بفضل اللہ آسانی سے نیند آجاتی ہے۔ لیکن ہر بار "صاحب لیمونیڈ!" کی آواز سے آنکھ کھل جاتی اور مجھے تعجب ہوتا کہ وینریبل آرک ڈیکن صاحب نے اپنے متبرک معدے میں کس قسم کی بھٹی سلگا رکھی ہے جس نے انہیں تشنۂ دائم کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پٹھانکوٹ کے اسٹیشن کے باہر ہی ڈاک کا تانگہ تیار کھڑا تھا اور ڈاک کے تھیلے اس پر لادے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آرک ڈیکن صاحب بھی اسی تانگے پر سفر کرنے والے ہیں۔ میری نشست آگے کوچوان کے ساتھ تھی اور آرک ڈیکن صاحب کی نشست پیچھے تھی جو ان کیلئے آرام دہ تھی۔ کیونکہ اپنی عمر اور وزن کے لحاظ سے پچھلی نشست میں سوار ہونا ان کے لئے آسان تھا۔ کوچوان صاحب سکھ تھے۔ جب ہم شہر سے نکل کر پالم پور والی سڑک پر ہو لئے اور ذرا اجالا ہونے لگا تو کوچوان صاحب نے میرے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ وہ کالکا، شملہ، راولپنڈی، مری، سرینگر کی سڑکوں پر ڈاک کا تانگہ چلاتے رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انہیں معلوم ہو گیا کہ میں سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں چودھری جلال دین صاحب کا ذکر آگیا جو اس وقت سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات تھے۔ میں نے بتایا وہ برادری میں میرے بھائی ہیں۔ کہا وہ بہت نیک شریف انسان ہیں۔ ہر ایک سے خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں ڈاک کے تانگوں کا سفر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ تانگہ بہت مضبوط ساخت کا ہوتا تھا۔ تین سواریوں، ان کے سامان اور ڈاک کے تھیلوں کے لئے کشادہ جگہ ہوتی تھی۔ دو گھوڑے جتتے تھے۔ میدانی حصے میں ہر چھ میل پر گھوڑوں کی بدلی ہوتی تھی۔ پہاڑی علاقے میں ہر تین میل بعد گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ تمام سفر سرپٹ طے ہوتا تھا۔ چوکی کے قریب پہنچنے پر کوچوان کے بگل بجانے پر دو سائیس دو سازکسے ہوئے گھوڑوں کو لیکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جونہی تانگہ کھڑا ہوتا جتے ہوئے گھوڑے ہٹالئے جاتے اور تازہ گھوڑے جوت دیئے جاتے۔ کوچوان بگل بجاتا اور دائیں ہاتھ والے گھوڑے کو ایک چابک رسید کرتا اور گھوڑے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیتے۔ گھوڑوں کی تبدیلی میں نصف منٹ سے زیادہ صرف نہ ہوتا۔ ہر دس بارہ میل پر بنگلہ ہوتا یہاں تانگہ چار پانچ منٹ کیلئے رکتا۔ سواریاں اتر کر چند قدم ٹہلتیں یا چائے پانی پی لیتیں۔ گھوڑے بہت اچھی حالت میں رکھے جاتے تھے۔ اور ان کی مناسب دیکھ بھال ہوتی تھی۔ کبھی کوئی گھوڑا شوخی کرتا تو کوچوان

اسے جلد ضبط میں لے آتا۔ ایسے موقعہ پر کوچوان اپنے مزاج کے مطابق مظاہرہ کرتا۔ کوئی گھوڑے کو پچکارتا اور پیار کے لفظ استعمال کرتا۔ کوئی تیزی کرتا اور گھوڑے کو گالی دیتا۔ ہمارے یہ کوچوان کچھ تیز طبیعت کے تھے۔ گالی دشنام ان کے منہ سے ایسے نکلتے تھے جیسے پھل جھڑی سے شرارے مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کا یہ اسلوب آرک ڈیکن صاحب کی طبیعت پر گراں ہو رہا ہے۔ ایک چوکی پر گھوڑے بدلنے کے بعد تانگہ روانہ ہوا تو دائیں ہاتھ کا گھوڑا شرارت پر اتر آیا۔ کوچوان نے گالی دی اور ایک چابک رسید کی گھوڑے نے پچھلے پاؤں اٹھا کر دولتی لگائی۔ کوچوان صاحب غصے میں آگئے گالیوں اور چابک دونوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ گھوڑے کی شرارت میں کمی نہ آئی بلکہ اور بڑھ گئی۔ کوچوان نے دو تین چابک زور سے جلدی جلدی ہی لگائے۔ گھوڑے کی غیرت بھی جوش میں آئی۔ اب کی بار اس کی پچھلی ٹانگیں خاصی بلند ہوئیں اور نیچے آنے میں بائیں ٹانگ بجائے زمین پر آرہنے کے درمیانی چوبی تیر پر آرہی اور گھوڑے کا سہارا باقی تین ٹانگوں پر رہ گیا۔ اب کوچوان صاحب تانگہ روکنے پر مجبور ہو گئے اور تانگہ سے اتر کر گھوڑے کی ٹانگ آزاد کرانے میں مصروف ہوئے۔ کوئی سائیس بھی قریب نہ تھا جو ہاتھ بٹاتا۔ گھوڑے کی ٹانگ کو نقصان پہنچتا تو ان پر حرف آتا۔ تانگے سے اتر کر مصروف پیکار ہونے سے ان کے وقار میں بھی فرق آیا۔ ان کے غصے کا پارہ اور بھی چڑھ گیا اور گالیوں کی بوچھاڑ کیفیت اور کمیت میں اور بھی بڑھ گئی۔ گھوڑے کی شرارت کی وجہ سے تانگے کی رفتار میں تو کمی نہ آتی تھی لیکن اس کے توازن میں ضرور فرق آگیا تھا۔ آرک ڈیکن صاحب کو پچھلی نشست سے سامنے کا ڈرامہ تو نظر نہیں آتا تھا لیکن کوچوان کی درشت کلامی اور تانگے کے ہچکولوں کی وجہ سے وہ بیزار ہو رہے تھے اور جب گھوڑے اور اس کے خاندان کے خلاف کوچوان کی دشنام طرازی معمول سے بڑھ گئی تو آرک ڈیکن صاحب نے نہایت سنجیدہ لہجے اور پرمتانت آواز میں احتجاج کیا۔ "ارے بھائی وہ تو جانور ہے تم کیوں گالیوں سے اپنی زبان گندی کرتے ہو۔ شریفوں کے کان گندے کرتے ہو اس سے کیا فائدہ؟" اتنے میں کوچوان صاحب گھوڑے کی ٹانگ آزاد کرواکے اپنی نشست پر واپس آگئے تھے۔ بگل بجایا اور تانگہ اپنی رفتار پر پھر روانہ ہوگیا۔ گھوڑے کی شرارت بھی کچھ ضبط میں آگئی۔ کوچوان صاحب کا مزاج اعتدال پر آیا تو مجھ سے پوچھا "ایہہ پچھے کون اے" (یہ پیچھے کون بیٹھا ہے) میں نے کہا پادری صاحب ہیں۔ پوچھا "ایہدا کیہہ ناں ایں؟" (اس کا کیا نام ہے) میں نے کہا احسان الحق۔ پوچھا "سائی اے؟" (کیا عیسائی ہے؟) میں نے کہا ہاں عیسائی ہیں۔ اور گرجے کے بڑے افسر ہیں۔ کوچوان نے بڑبڑانا شروع کیا۔ "تا جاندی اے۔ ناں سان الحق تے ہے سائی! بھارا شریف بنیا پھردا اے میریاں

گالیاں نال ایہدے کن گندے ہُندے نیں - ہوں - ہاں میں مسائی تے ناں میرا احسان الحق چنگا شریف اے ۔" (بہت تیزے کی ۔ نام احسان الحق ہے اور ہے عیسائی ۔ بڑا شریف بنا پھرتا ہے ۔ میری گالیوں سے اس کے کان گندے ہوتے ہیں ۔ ہوں ! ہوں میں عیسائی پر نام ہے میرا احسان الحق اچھا شریف ہے ۔) میں پریشان ہورہا تھا کہ کہیں آرک ڈیکن صاحب کوچوان کی بڑبڑاہٹ نہ سُن لیں لیکن تانگے کے شور میں غالباً آواز پیچھے سنائی نہیں دیتی تھی - کوچوان صاحب کبھی خاموش ہوجاتے کبھی میرے ساتھ کوئی بات کرلیتے لیکن دفعتہً پھر بڑبڑانے لگ جاتے ۔ "ہوں ! ناں مسان الحق ہاں میں مسائی - بھارا شریف" (ہوں ! نام احسان الحق - ہوں میں عیسائی - بڑا شریف)

نو بجے کے قریب ہم شاہ پور پہنچے - یہاں سے ایک سڑک توسیدھی پالم پور جاتی ہے اور دوسری بائیں طرف دھرم سالہ جاتی ہے - یہ تانگہ تو پالم پور جانیوالا تھا اور یہاں سے دوسرا تانگہ دھرم سالہ جانے کیلئے تیار تھا - میں نے تانگہ بدل لیا اور مختصر سے ناشتے کے بعد یہ دوسرا تانگہ دھرم سالہ کی طرف روانہ ہوگیا - آرک ڈیکن صاحب نے بھی ناشتہ کیا اور پہلے تانگے میں پالم پور تشریف لے گئے ۔ مجھے ان کے متعلق کچھ پریشانی رہی - کوچوان صاحب کا بڑبڑانا تو کچھ ایسے فکر کی بات نہیں تھی لیکن ایک حرکت اس نے ایسی کی تھی جس سے مجھے اندیشہ تھا کہ پالم پور کے راستہ میں معزز پادری صاحب کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے - ہوا یہ کہ ایک مقام پر پانی کا چشمہ پہاڑ کی جانب سے بہتا تھا اور سڑک کے کنارے ایک حوض میں اس کا پانی جمع ہوتا تھا - پانی بہت صاف ، ٹھنڈا اور شیریں تھا - کوچوان نے تانگہ ٹھہرایا اور پادری صاحب سے کہا کہ اگر چاہیں تو پانی پی لیں - وہ شوق سے اترے اور سیر ہوکر پانی پیا - تانگے کی طرف واپس آئے لیکن ابھی سوار نہ ہونے پائے تھے کہ کوچوان صاحب نے تانگہ چلا دیا - مجھے بہت پریشانی ہوئی اور میں نے انہیں سمجھایا کہ انہیں ایک معزز انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے - انہوں نے تانگہ روک لیا اور یوں بھی چند قدم پر رکتے ہی کیونکہ یہ تو انکی نیت ہو نہیں سکتی تھی کہ آرک ڈیکن صاحب کو سڑک پر چھوڑ کر چلے جاتے - لیکن اس قسم کا مذاق بھی نا واجب تھا - اس کے بعد اس کی بڑبڑاہٹ بھی کسی حد تک رک گئی شاید اپنے غصہ کے اس عملی اظہار کے بعد ان کی طبیعت صاف ہوگئی ہو بلکہ ندامت کا کچھ احساس پیدا ہوگیا ہو ۔

لوئر دھرم سالہ پہنچنے پر چوہدری حاکم دین صاحب ، میاں حکیم الدین اور ڈاکٹر لال دین صاحب مل گئے - اور ہم سب اکٹھے اپر دھرم سالہ چلے گئے - ان دنوں لوئر دھرم سالہ میں تو کچھ آبادی تھی اور چند

سرکاری دفاتر بھی تھے۔ لیکن اپر دھرم سالہ کی کیفیت ایک چھوٹے سے گاؤں کی تھی۔ لوئر دھرم سالہ میں خانصاحب اللہ بخش صاحب نے اپنا خوشنما بنگلہ بنایا ہوا تھا۔ وہ جنگلات کے محکمہ کے پنشن یافتہ افسر تھے اور دھرمسالہ ہی میں بس گئے تھے۔ بعد میں بھی میری ملاقات ان سے ہوئی بہت خلیق اور متواضع تھے۔ اپر دھرمسالہ میں لال دین صاحب کے والد نمبردار گوارہ ماسٹر محمد دین صاحب کی رہائش تو رجمنٹ میں تھی لیکن ہمارے لئے انہوں نے مکان قصبے کی آبادی میں لے رکھا تھا۔ ہر شام وہ کھانا ہمارے ساتھ کھاتے تھے اور کچھ وقت ہمارے ساتھ گذارتے تھے۔ اپر دھرمسالہ کی بلندی سطح سمندر سے قریب نو ہزار فٹ ہے اور شمالی جانب اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو تمام وقت برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اپر دھرم سالہ سے چار ہزار فٹ اوپر مستقل برف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں تھا اور میرے ساتھیوں نے دو ایک بار برف دیکھنے کیلئے جانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا لیکن مجھے کوئی ایسا شوق نہیں تھا اسلئے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔ قصبے کے عقب میں کچھ بلندی پر سے ایک پہاڑی نالہ بہت شفاف پانی کا برف کی مانند سرد بہتا تھا۔ جب دھوپ نکلی ہوئی ہوتی اور موسم سرد نہ ہوتا تو ہم اس نالے میں نہانے کیلئے جاتے۔ اس کے درمیان بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ جن کے گرد پانی بہتا تھا۔ پانی کے اندر تو چند سیکنڈ سے زیادہ یک وقت ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ ہم کنارے سے اتر کر پانی میں سے ہو کر ایک بڑی چٹان پر دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ پڑھتے یا بات چیت میں وقت گذرتا۔ ان دنوں ایک کھیل کا رواج تھا جسے لوڈو کہتے تھے۔ کبھی وہ کھیلتے۔ کھیل کے دوران میں اگر لوڈو کا چھوٹا سا چکور دانہ جس پر نشان لگے ہوتے تھے پانی میں گر جاتا تو چودھری حاکم دین صاحب فوراً حکم دیتے "لال دین کود جاؤ" وہ کچھ دق تو ہوتے کہ ہر بار یخ بستہ پانی میں اترنے کو انہیں ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن برادرِ خورد تھے اطاعت کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ پانی اسقدر شفاف تھا کہ ہمیں چٹان پر سے بیٹھے ہوئے بھی پانی کی تہہ میں دانہ صاف نظر آتا تھا کہ کس جگہ گرا ہے۔

چار ہفتے کا عرصہ بہت لطف میں گذرا لیکن رات کے وقت کچھ محصول تازہ خون کی صورت میں پلنگ کی چولوں میں رہنے والوں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ لال دین صاحب نے کیٹنگز پاوڈر خشک تمباکو یا اور جو کچھ کسی نے بتایا چادروں پر چھڑکا، ابلتا پانی پلنگوں کی چولوں میں ڈالا، لیکن اس اذیت سے مخلصی نہ ہو سکی۔ ستمبر کے آخر میں ہم لاہور واپس آگئے۔ اگرچہ ان دنوں گرمی کی شدت کم ہو چکی تھی لیکن ہمیں نو ہزار فٹ کی بلندی سے اترنے پر حرارت کا درجہ ابھی تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔

قادیان کے سالانہ جلسہ ۱۹۱۵ء میں شمولیت

دسمبر ۱۹۱۵ء میں میں سالانہ جلسے پر قادیان گیا خلافت ثانیہ کے پہلے جلسے پر ہی حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ کے عرفان علم قرآن، تفقہ فی الدین، وسعتِ نظر اور فکر کی گہرائی موجب حیرت ہوئی تھی۔ اس دوسرے جلسے پر یہ نقش اور بھی گہرا ہو گیا اور میں اس وثوق کے ساتھ لوٹا کہ سلسلہ حقہ کی حفاظت، جماعت کی بہبودی اور ترقی، اسلام کا مستقبل، مسلمانانِ عالم کے حقوق کی نگہداشت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی برتری اور کلمۃ اللہ کا اعلاء سب اس بطلِ جلیل کے ہاتھوں میں محفوظ ہیں، ایدہ اللہ بنصرہ العزیز، ہمارا فرض اسکی کامل اطاعت اور اسکی آواز پر لبیک کہنا اور ہر حکم کو بجا لانا ہے۔ وباللہ التوفیق۔ سالانہ جلسے کے بیشمار فوائد میں بہت بڑے معاشرتی فوائد بھی شامل ہیں۔ بہت سے اسلامی شعائر اور اقدار جو نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اور جن پر مسلمانانِ ہند کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تعامل نظر نہیں آتا تھا پھر سے تازہ ہونا شروع ہو گئے اور ان کا نمونہ قائم ہونا شروع ہو گیا۔ فالحمد للہ۔

انڈین کیسیز کی اسسٹنٹ ایڈیٹری

۱۹۱۵ء کے آخر میں میری پریکٹس کا پہلا سال ختم ہو گیا۔ پریکٹس کے لحاظ سے تو میرے لئے کوئی وجہ بے اطمینانی کی نہیں تھی۔ لیکن اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالنے کے متعلق مجھے اطمینان نہیں تھا۔ ادھر میرے ذہن میں کوئی اور منصوبہ بھی نہیں تھا۔ میں یہ تو محسوس کرتا تھا کہ مجھے اس طرزِ زندگی میں تبدیلی کی خواہش ہے لیکن اس کے بدل کے طور پر میں کیا چاہتا ہوں یہ میرے ذہن میں ابھی واضح طور پر نہیں آیا تھا۔ والد صاحب نے سکول کی تعلیم ورنیکلر سکول میں مکمل کی تھی۔ مختاری اور وکالت کے امتحان بھی اردو میں پاس کئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے کچھ واقفیت انگریزی سے پیدا کی تھی لیکن انہیں اپنے انگریزی کے تلفظ پر پورا اعتماد نہیں تھا اسلئے انہوں نے انگریزی بولنے کی کبھی مشق نہ کی۔ وکالت کا کام شروع کرنے کے بعد انہیں انگریزی کے ساتھ زیادہ سابقہ پڑنے لگا اور اس تقاضے کو انہوں نے اس حد تک تو پورا کیا کہ انہوں نے انگریزی پنجاب ریکارڈ منگوانا شروع کیا جس میں چیف کورٹ کے نظائر اور چیف کورٹ سے جو اپیل پریوی کونسل میں جاتے تھے ان کے فیصلہ جات چھپ کر شائع ہوتے تھے۔ بعد میں جب چودھری شہاب الدین صاحب نے "کریمنل لا جنرل" سے قدم آگے بڑھا کر "انڈین کیسیز" جاری کیا تو والد صاحب نے اسے بھی منگوانا شروع کیا۔ انڈین کیسیز میں ملک بھر کی اعلیٰ عدالتوں کے دیوانی اور فوجداری فیصلے اور پریوی کونسل کے فیصلے جو ہندوستان سے تعلق رکھتے ہوں سب چھپتے تھے سال بھر میں انڈین کیسیز کی چھ ضخیم جلدیں شائع ہوتی تھیں۔ اپنے ابتدائی سالوں میں ہندوستان

بھر میں یہ اپنی قسم کا واحد رسالہ تھا اور بہت اعلیٰ معیار پر بڑی کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ چودھری شہاب الدین صاحب خود ایڈیٹر تھے۔ اور علاوہ ادارتی عملے کے ہر صوبے کی عدالت اعلیٰ میں ایک ایک قانون پیشہ صاحب رپورٹر تھے اور ایک رپورٹر لندن میں تھے۔ یہ اصحاب اپنی اپنی عدالتوں کے منتخب فیصلہ جات کی نقول حاصل کر کے اور ان کے ہیڈ نوٹ تیار کر کے انڈین کیسیز کے دفتر میں بھیج دیتے تھے۔ پنجاب چیف کورٹ (بعد میں لاہور ہائی کورٹ) کے رپورٹر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب تھے۔

جولائی ۱۹۱۶ء میں انڈین کیسیز کے ایک شمارے کے سر ورق کے ساتھ سفید کاغذ کی ایک چھپی ہوئی سلپ چسپاں تھی۔ جس میں ایڈیٹر صاحب کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ انہیں انڈین کیسیز کے مرتب کرنے میں ایک قانون دان اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ خواہشمند اصحاب ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے شرائط طے کر لیں۔ مجھے خیال ہوا کہ میری طبیعت میں ابتدائی عدالتوں میں پریکٹس کے متعلق جو بے اطمینانی کا احساس ہے ممکن ہے اس سے خلاصی پانے کا یہ رستہ ہو۔ چودھری شہاب الدین صاحب میرے والد صاحب کے دوست تھے اور مجھے بھی جانتے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں لکھا کہ میں نے یہ اعلان پڑھا ہے۔ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں لیکن آپ مجھے جانتے ہیں اور میں اس خط کے ذریعے آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ اوّل کیا آپ کا اندازہ ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں دوسرے کیا آپ کی رائے میں اگر میں یہ کام کرنے کے قابل ہوں تو مجھے پریکٹس چھوڑ کر یہ کام کرنا چاہئیے؟

چودھری صاحب نے کمال شفقت سے جلد ہی میرے خط کا جواب لکھا۔ جس میں انہوں نے فرمایا یہ کام قابلیت بھی چاہتا ہے اور خاص مشق اور مہارت بھی چاہتا ہے میرا اندازہ ہے کہ تم یہ کام جلد سیکھ لوگے اور اچھی طرح کر لوگے۔ پوری مہارت حاصل کرنے کیلئے ایک سال کی مشق درکار ہوگی۔ تمہیں پریکٹس چھوڑ کر یہ کام کرنا چاہئیے یا نہیں اس کے متعلق مشورہ دینا آسان نہیں۔ پریکٹس اگر چل نکلے تو اس کا میدان وسیع ہے۔ اور ایک کامیاب وکیل کیلئے بہت سے ترقی کرنے کے رستے کھل جاتے ہیں۔ لیکن پریکٹس کے رستے میں بہت سے اونچ نیچ بھی ہیں۔ اگر تمہاری طبیعت اس کام کو پسند کرے تو تمہارے اوسط گذارے کی ایک مستقل صورت نکل آئے گی تم خود غور اور فکر کے بعد فیصلہ کر لو۔ چودھری صاحب نے ایک اندازہ مشاہرے اور سالانہ اضافے کا بھی لکھا۔

چودھری صاحب کا جواب آنے پر میں نے والد صاحب سے ذکر کیا اور آپ سے مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے فرمایا طبیعت کی موافقت کے متعلق تو تم خود بہتر سوچ سکتے ہو لیکن مشاہرہ کم ہے

میری رائے میں ابتدائی مشاہرہ بھی زیادہ ہونا چاہیئے اور مشاہرے کی آخری حد بھی زیادہ ہونی چاہیئے اس سے میں نے اندازہ کیا کہ اگر مشاہرے میں ایزادی ہو جائے تو والد صاحب کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے چودھری شہاب الدین صاحب کی خدمت میں لکھا کہ میں آپ کے مشورے کا ممنون ہوں۔ میری طبیعت اس کام کے کرنے پر مائل ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایک تو آپ کے تجویز کردہ مشاہرے میں کچھ ترمیم چاہتا ہوں۔ اور دوسرے کام کی نوعیت اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض اور مراعات کی نسبت کچھ تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے فیصلہ کرنے میں مدد مل سکے۔ اس خط و کتابت کے دوران میں چودھری صاحب ڈلہوزی میں تشریف فرما تھے! انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا مجھے تمہاری تجویز مشاہرے کے متعلق منظور ہے۔ تفاصیل عند الملاقات طے ہو سکتی ہیں۔ میں ۲۲ راگست کو دو تین دن کیلئے لاہور جاؤں گا اگر تم مجھے وہاں مل لو تو بالمشافہ گفتگو میں سب کچھ سمجھا دوں گا۔ ان کا جواب ملنے پر میں نے استخارہ کیا اور اپنے تئیں مطمئن پاکر میں ۲۳ راگست کی صبح کو دس بجے کے قریب ان کی خدمت میں لاہور حاضر ہو گیا۔

انڈین کیسیز کا دفتر اور چودھری صاحب کا رہائشی مکان بازار جج محمد لطیف میں واقعہ تھے۔ دفتر کی عمارت دو منزلہ تھی۔ رہائشی مکان کے نچلے کمرے دفتر اور پریس کیلئے استعمال ہوتے تھے۔ چودھری صاحب دفتر کی عمارت کی اوپر کی منزل میں جو ان کے اپنے استعمال کے لئے مخصوص تھی برآمدے میں تشریف فرما تھے اور اپنے کام میں مصروف تھے۔ چودھری صاحب نے مختصر طور پر مجھے میرے فرائض سے آگاہ کیا۔ بیس ماہ کی پریکٹس کے عرصے میں مجھے انڈین لاء رپورٹس۔ پنجاب ریکارڈ، انڈین کیسیز وغیرہ سے واقفیت ہو چکی تھی۔ ہر ماہ پنجاب ریکارڈ کا شمارہ جب آتا تو میں شام کے وقت اس میں درج شدہ نظائر میں سے تین چار سرسری والد صاحب کو پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ جس سے مجھے اعلیٰ عدالتوں کے فیصلہ جات اور قانونی مسائل کی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے کسی قدر واقفیت بھی ہو گئی تھی اور ان میں دلچسپی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے ایڈیٹری کے کام کا یہ حصہ تو مجھے کچھ مشکل نظر نہ آیا۔ البتہ طباعت کے کام کی نگرانی اور پروف پڑھنا اور ان کی اصلاح کرنا میرے لئے ایک نئی بات تھی۔ چودھری صاحب نے اس ابتدائی وضاحت کے ساتھ ہی اپنے دفتر سے دریافت کیا کہ پنجاب چیف کورٹ کے کوئی نئے فیصلے آئے ہیں؟ معلوم ہوا اس دن یا ایک دن قبل چیف کورٹ کے سولہ فیصلے دفتر میں پہنچے ہیں۔ چودھری صاحب نے دفتر کو ارشاد فرمایا رپورٹر کے تیار کردہ ہیڈ نوٹ ان سے علیحدہ کر لو اور فیصلہ جات کی نقول جو آئی ہیں وہ بھیج دو۔ یہ نقول میرے سپرد کیں اور فرمایا ان میں سے جتنے فیصلوں کے ہیڈ نوٹ

تیار کر سکو آج تیار کر لینا۔ میں انہیں شام کو دیکھ لوں گا اور کل جو کچھ ان کے متعلق کہنا ہو گا بتا دوں گا۔ یہی طریق اس کام کے سیکھنے کا ہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ اس دن چودھری صاحب کے ساتھ اصولی بات چیت ہو گی اور اس کے بعد اگر میرا پورا اطمینان ہو گیا تو میں زبانی گذارش کر دوں گا کہ میں آخر ستمبر یا شروع اکتوبر میں حاضر ہو کر کام شروع کر دوں گا ورنہ یہ عرض کر دوں گا کہ میں اس وقت رخصت ہوتا ہوں۔ تحریراً آپ کی خدمت میں جو کہنا ہے گذارش کر دوں گا لیکن چودھری صاحب نے فوراً میرے عملی امتحان کی صورت پیدا کر دی۔ میں نے خیال کیا آج کا دن تو لاہور ٹھہرنا ہی ہے۔ کل پوری بات چیت کر کے دھرم سالہ چلا جاؤں گا جہاں میرا ارادہ ستمبر کا مہینہ گذارنے کا تھا۔ فیصلوں کی نقول لیکر میں ساتھ کے کمرے میں چلا گیا جہاں میرے لئے میز، کاغذ، قلم وغیرہ مہیا کر دیئے گئے تھے۔ دعاء کی الٰہی تو اپنے خاص فضل سے مجھے اس کام کی سمجھ عطا فرما اور اسے میرے لئے آسان کر دے۔ دو چار فیصلے پڑھے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ جو کام میرے سپرد ہوا ہے وہ مجھے آسان نظر آتا ہے یا مشکل۔ یہ تو مجھے پہلے ہی احساس تھا کہ چیف کورٹ کے فیصلے نسبتاً سادہ اور آسان ہوتے ہیں۔ ہمارے جج صاحبان بلا ضرورت پیچیدگیوں میں نہیں الجھتے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی احساس تھا کہ چودھری صاحب نے فرمایا ہے۔ ہیڈ نوٹ تیار کرنا ایک فن ہے۔ جس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے لمبی مشق کی ضرورت ہو گی۔ میں نے جب تین چار فیصلے پڑھے تو خیال ہوا کہ ان کے ہیڈ نوٹ تیار کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے ہوئے قلم اٹھایا اور توجہ سے اپنے کام میں لگ گیا۔ ابھی دو تین ہیڈ نوٹ تیار کئے ہوں گے کہ چودھری صاحب نے آواز دی آؤ کھانا کھاؤ۔ میں حاضر ہو گیا۔ ہاتھ دھو کر کھانے میں شامل ہو گیا۔ چودھری صاحب نے دریافت کیا یہیں ٹھہرو گے نا؟ میرے ذہن میں تو لاہور ٹھہرنے کا کوئی پروگرام تھا ہی نہیں۔ جب ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہونے کیلئے آیا تھا تو چودھری صاحب کے ہاں ٹھہرا تھا۔ بعد میں بھی دو تین بار ان کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لاہور میں ایک دن تو اب ٹھہرنا پڑ ہی گیا تھا۔ لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میں نے چودھری صاحب کے ساتھ کام کرنا ہے تو مجھے ان کا مہمان نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا آپ اجازت دیں تو میں آسانی سے اور انتظام کر لوں گا۔ انہوں نے پھر فرمایا یہیں ہمارے پاس ہی ٹھہرو تمہیں سہولت رہے گی۔ میں نے عذر کر دیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد چند منٹ متفرق گفتگو رہی۔ پھر میں اجازت لیکر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ سوائے نماز کی ادائیگی کے میں نے کسی اور طرف توجہ نہ کی۔ چار بجے تک میں نے بفضل اللہ سولہ فیصلہ جات کے ہیڈ نوٹ تیار کر لئے۔ چودھری صاحب اس وقت تک کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے۔ میں نے سب فیصلہ جات ہیڈ نوٹ سمیت چودھری

صاحب کی میز پر رکھ دیئے اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ چودھری صاحب کے ہاں ٹھہرنے سے تو میں نے انکار کر دیا ہے اب رات بسر کرنے کی کیا صورت ہو گی۔ بہت سوچ بچار کے بعد خیال آیا کہ محترم مولوی سید ممتاز علی صاحب ایڈیٹر تہذیب النسواں کے بڑے صاحبزادے سید حمید علی صاحب کے ساتھ سید افضل علی صاحب اور سید انعام اللہ شاہ صاحب کے واسطے سے میری کچھ واقفیت ہے۔ ان کے مکان واقعہ ریلوے روڈ کا مردانہ حصہ خاصا کشادہ ہے۔ ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ آج میں ان کے ہاں ٹھہر جاؤں کل جو صورت ہو گی دیکھی جائے گی۔ چنانچہ میں نے تانگہ منگوایا اور اپنا مختصر سامان لیکر میں سید حمید علی صاحب کے ہاں چلا گیا۔ حسنِ اتفاق سے حمید علی صاحب اپنے در دولت پر تشریف فرما تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور فوراً میرے لئے کمرے کا انتظام کر دیا اور فرمایا تمہارا اپنا گھر ہے۔ جتنا عرصہ چاہو ٹھہرو۔ کسی تکلّف کی ضرورت نہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے رات بسر کرنے کا سامان تو کر دیا لیکن یہ شام اور آنے والی رات مجھ پر بڑی بوجھل تھیں۔ مجھے بار بار اپنے آپکو یاد دلانا پڑتا تھا کہ مشکلات ہی کامیابی کا زینہ ہیں مجھے ان کے مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔ ایک بات کسی حد تک میری تسلی کا موجب تھی اور وہ یہ کہ جو کام مجھے دیا گیا تھا اسے میں نے کچھ مشکل نہ پایا تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اکیلاپن اور اداسی وقتی تاثرات ہیں زیادہ دیر قائم نہیں رہیں گے لیکن سونے تک میں اپنی طبیعت کو ان تاثرات سے آزاد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر میں اپنی مشکلات اور الجھنوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اور اسکی نصرت اور اس کے فضل کو عاجزی سے طلب کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں دفتر کے لئے روانہ ہوا۔ ریلوے روڈ سے بازار جج محمد لطیف کوئی ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہو گا۔ میں پیدل چلنے کا عادی تھا نصف گھنٹے میں دفتر پہنچ گیا۔ چودھری صاحب دفتر میں موجود تھے۔ میرے پہلے دن کے کام کی نظر ثانی فرما چکے تھے۔ خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا تمہارا کام میری توقع سے بہت بہتر ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم جلد اسکی تفاصیل پر حاوی ہو جاؤ گے۔ کل میں نے تمہیں سولہ فیصلہ جات کے ہیڈ نوٹ تیار کرنے کو کہا تھا۔ تم نے سب تیار کر لئے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ بارہ میں تو مجھے کسی اصلاح کی گنجائش نظر نہیں آئی۔ چار میں میں نے بعض مقامات پر خفیف سی اصلاح کی ہے وہ تم دیکھ لینا۔ آج جو کام تم کرو گے وہ میں شام کو دیکھ لوں گا اور اگر اس کے متعلق کسی ہدایت کی ضرورت ہوئی تو نوٹ کر دوں گا۔ ہیڈ نوٹ تیار کرنے کے علاوہ کام کے آخری پروف پڑھنا بھی تمہارے ذمے ہو گا۔ تمہارے پڑھ لینے کے بعد پروف میرے پاس آیا کرے گا۔ تمہارے تیار کردہ ہیڈ نوٹ مجھے بھیج دیئے جایا کریں گے

جہاں ضرورت ہوگی میں اصلاح کر دوں گا۔ دفتر کی عام نگرانی بھی تمہارے ذمے ہوگی۔ میں آج شام ڈلہوزی واپس جا رہا ہوں۔ میری غیر حاضری میں دفتر کے تم ذمہ دار ہوگے۔ جس بات کے متعلق ضروری سمجھو مجھ سے دریافت کر لیا کرنا ورنہ خود فیصلہ کرنا۔ چودھری صاحب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ تو میرے تقرر کا فیصلہ فرما چکے ہیں اور میرے لئے اب مزید غور کی گنجائش نہیں۔ میں نے اتنا کہنے کی جرأت کی کہ بعض تفاصیل کے متعلق مجھے دریافت کرنا ہے۔ فرمایا پوچھ لو۔ میں نے دریافت کیا دفتر کے اوقات، تعطیلات، رخصت وغیرہ کی کیا صورت ہوگی۔ فرمایا دفتر کے مقررہ اوقات کا میں تمہیں پابند نہیں کرتا۔ دیر سے آؤ جلدی چلے جاؤ یہ تمہاری مرضی پر ہے۔ کام وقت پر اور توجہ سے سرانجام پاتا رہے یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ اوقات کا فیصلہ تم پر ہے۔ یہی حال تعطیلات اور رخصت کا ہے۔ جب تم کہیں جانا چاہو خوشی سے جاؤ میری اجازت کی ضرورت نہیں لیکن مجھے اطلاع کر دو اور یہ اندازہ کر لو کہ کام میں حرج یا تاخیر نہ ہو۔ یہ صورت چودھری صاحب کیلئے تو موجب اطمینان ہوگی۔ لیکن میرے لئے باعث اطمینان نہ تھی۔ ان کی طرف سے اسقدر اعتماد کا اظہار اور ہر بات کا میری ذمہ داری پر چھوڑنا مجھ پر بہت بوجھل تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس انتظام کے ماتحت مجھے کبھی آزادی نہیں ہوگی۔ ہر وقت ذمہ داری کی زنجیر میں جکڑا رہوں گا۔ لیکن میرے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی اور حجاب بھی مانع تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی احساس تھا کہ چودھری صاحب نے خود ہی سب فیصلہ کر دیا اور فوراً مجھے ذمہ دار بھی کر دیا۔ میرے مجوزہ پروگرام کو کہ میں آخر ستمبر یا شروع اکتوبر سے کام شروع کروں گا عملاً منسوخ کر دیا۔ میں خاموش ہو رہا کہ اچھا اب جو خدا کو منظور ہوگا۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔ (اس پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف میں جھکتا ہوں۔)

مسٹر پارتھا سارتھی آئینگر اسسٹنٹ ایڈیٹر انڈین کیسز

انڈین کیسز میں ایک اور اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر پارتھا سارتھی آئینگر تھے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ تجربہ رکھتے تھے اور کچھ عرصے سے انڈین کیسیز کے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ مدراسی برہمن تھے اور مدراس ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ تھے۔ چودھری صاحب نے ہمارے درمیان تقسیم کار اس طرح کی کہ بعض عدالتوں کے فیصلہ جات کو طباعت کیلئے وہ تیار کریں اور باقی عدالتوں کے فیصلہ جات میں تیار کروں، میرے کام کی نظر ثانی چودھری صاحب خود فرمایا کریں اور پارتھا سارتھی صاحب کا کام پروف میں میری نظر سے گذرتا رہے۔ اگر میں ان کے کام میں کسی اصلاح کی ضرورت محسوس کروں تو ہم دونوں آپس میں مشورہ کر کے طے کر لیں۔ اگر اختلاف ہو تو چودھری صاحب فیصلہ فرمائیں۔ بعض قانونی رسائل کے ساتھ یہ انتظام تھا کہ اگر کوئی فیصلہ ان میں پہلے چھپ جائے تو ہم اسے نقل کر لیں اور ان کا ہیڈ نوٹ بھی نقل کر لیں۔ اور اگر

کوئی فیصلہ انڈین کیسیز میں پہلے چھپ جائے تو وہ انڈین کیسیز سے نقل کر لیں۔ ان رسائل میں سے ایک "اودھ کیسیز" بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت بشیشر ناتھ سری واستوا صاحب تھے جو بعد میں اودھ جوڈیشنل کمشنری کے چیف کورٹ بن جانے پر اودھ چیف کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس ہوئے۔ سری واستوا صاحب نہایت قابل قانون دان تھے۔ چوہدری صاحب کی نگاہ میں اودھ کیسیز نہایت ممتاز رسالہ تھا۔ انکی ہدایت تھی کہ جو فیصلہ جات اودھ کیسیز میں پہلے چھپ جائیں ان کے ہیڈ نوٹ بدون نظر ثانی اور بلا ترمیم انڈین کیسیز میں نقل کر لئے جائیں۔ ہر عدالت کے رپورٹر صاحب بھی جو فیصلہ چھپنے کیلئے انتخاب کرتے اس کی مصدقہ نقل حاصل کر کے اس کا ہیڈ نوٹ تیار کرتے اور نقل کے ساتھ اپنا ہیڈ نوٹ شامل کر کے دفتر میں بھیج دیتے۔ مسٹر پارہ تھا سارتھی اور میں ان ہیڈ نوٹس پر غور کر کے ان کی حسب ضرورت ترمیم کر دیتے یا بلا ترمیم چھپنے کے لئے دیدیتے یا خود نیا ہیڈ نوٹ تیار کرتے۔

والد صاحب کا خدمت دین کیلئے پریکٹس ترک کرنا اپنے پروگرام میں اس تبدیلی کے نتیجے میں مجھے بعض پریشانیوں کا سامنا بھی ہوا۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ میں والد صاحب کے ساتھ آخری مشورہ نہ کر سکا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انہیں لازماً یہ احساس ہو گا کہ میں نے ایک ایسے اہم معاملے میں بغیر ان کی آخری رضامندی کے فیصلہ کر لیا۔ اور نہ صرف اپنے لئے آزادانہ طور پر ایک طریق کار کا انتخاب کر لیا بلکہ ان کے ساتھ وکالت کا کام کرنا بھی بند کر دیا۔ مجھ سے جیسے بھی بن آیا میں نے جو صورت پیش آگئی تھی ان کی خدمت میں گذارش کر دی۔ والد صاحب کے پہلے والا نامہ سے مجھے کچھ اطمینان ہوا اس میں رنجیدگی کا کوئی اظہار نہیں تھا بلکہ خط شفقت سے لکھا ہوا تھا۔ البتہ الیسا ترشح ہوتا تھا کہ اگر میں سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہونے میں چند ماہ کی تاخیر کر لیتا تو انہیں سہولت رہتی۔ ان کا اپنا ارادہ پریکٹس ترک کر کے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ عبادت، ذکر الٰہی اور خالص خدمتِ دین میں گذارنے کا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں سلسلہ میں بیعت ہوتے ہی انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام کی خدمت اقدس میں گذارش کی تھی کہ اگر حضورؑ اجازت بخشیں تو پریکٹس ترک کر کے حضورؑ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں حضور نے فرمایا اقامت فی ما اقام اللہ (قائم رہنا اس بات پر جس پر اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہو) کے مدنظر پریکٹس جاری رکھیں اور اس پیشے میں تقویٰ کا نمونہ قائم کرنے کی کوشش کریں اور استغفار بہت کرتے رہیں۔ اور اپنی آمد سے اللہ تعالیٰ کے رستے میں فراخی سے خرچ کرتے رہیں۔ والد صاحب حضورؑ کی نصیحت پر تا حد استطاعت بفضل اللہ عامل رہے۔ خلافتِ اولیٰ کے قیام پر حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بھی وہی گذارش کی۔ حضورؓ نے فرمایا حضرت مسیح موعودؑ نے جس بات کی اجازت نہیں دی ہم

کیسے دیں۔ آپ پریکٹس جاری رکھیں۔" اس دوران میں والد صاحب نے قرآن کریم کو حفظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب اس مبارک عزم کی تکمیل ہو گئی تو حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اطلاع کی حضور رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "نصر اللہ خان نے ہماری محبت حاصل کرنے کی خوب تدبیر کی ہے ہمارے محبوب کو اپنے دل میں رکھ لیا ہے کہ اب تو نور الدین مجھ سے محبت کریگا۔" ۱۹۱۶ء کے دوران میں جب والد صاحب نے پریکٹس ترک کرنے کا خیال ظاہر کیا تو والدہ صاحبہ نے اور خاکسار نے مشورہ دیا کہ ابھی پریکٹس جاری رکھیں۔ ان کی عمر اس وقت ۵۳ سال تھی۔ صحت اچھی تھی۔ پریکٹس اچھی چلتی تھی۔ دیوانی کام میں اور خصوصاً زمین کے مقدمات میں آپ چوٹی کے وکیل شمار کئے جاتے تھے۔ شہر اور ضلع میں آپ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ باوجود زمیندار خاندان کا فرد ہونے کے شہر میں آپ کا بہت رسوخ تھا برسوں شہر کی میونسپلٹی کے رکن رہ چکے تھے۔ تین سال وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ (ان دنوں میونسپلٹی کے صدر سرکاری حیثیت سے ڈپٹی کمشنر صاحب ہوا کرتے تھے) آخر خود اپنی مرضی سے میونسپلٹی کی رکنیت ترک کر دی تھی۔ اور اب پریکٹس ترک کرنے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے۔ والدہ صاحبہ اور میرے مشورے کے جواب میں فرمایا "انسان کی حرص کی تو کوئی حد نہیں لیکن قناعت بہت قابل قدر صفت ہے۔ تمہاری اعلیٰ تعلیم کا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انتظام فرما دیا تم اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ پریکٹس کے علاوہ میرے اور وسائل اتنے ہیں کہ میری سادہ زندگی کی ضروریات کے علاوہ تمہارے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کے لئے کفالت کر سکتے ہیں۔ تمہاری بہن اپنے گھر میں خوش ہے۔ اس کے علاوہ میری اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ پریکٹس اس لئے جاری رکھنا کہ پریکٹس جاری رہے لا حاصل ہے۔ اب میری بینائی کچھ کمزور ہوتی جا رہی ہے نئے انگریزی دان وکلاء سے مقابلہ ہے۔ میری انگریزی کی مہارت محدود ہے۔ آج نہیں تو کل میری پریکٹس پر اثر شروع ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ میں ایسے وقت میں پریکٹس چھوڑ دوں جب میری پریکٹس اچھی چل رہی ہے۔ ورنہ کسی وقت پریکٹس مجھے چھوڑ جائے گی۔ علاوہ ازیں جس بات کا میری طبیعت پر سب سے بڑھ کر اثر ہے وہ یہ ہے کہ اگر تمام عمر روزی کمانے ہی میں صرف ہو جائے تو حاصل کیا ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے میری ضروریات کا انتظام فرما دیا ہے تو اب میں اپنے وقت کا اکثر حصہ خدمت دین میں صرف کر دوں۔"

حضرت خلیفۃ المسیح ثانی نے فرمایا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ کے وصال پر جماعت میں جب

اختلاف ہوا تو ان ایام میں میں نے دو شخصوں کے متعلق نام لیکر دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے کم سے کم ایک کو بیعت کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور چوہدری نصر اللہ خان صاحب نے بیعت کر لی۔ خاکسار کا اندازہ ہے کہ ۱۹۱۶ء کے آخر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے والد صاحب کو ارشاد فرمایا کہ اب خدمتِ دین کیلئے اپنے آپ کو فارغ کر لیں۔ چنانچہ آپ نے طے کر لیا کہ اپریل ۱۹۱۷ء تک پریکٹس کا کاروبار بند کر کے قادیان حاضر ہو جائیں گے۔

انڈین کیسیز کے کام میں تو بفضل اللہ مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چوہدری صاحب کے ڈلہوزی واپس تشریف لے جانے کے بعد ان کی ہدایات کے مطابق کام ہوتا رہا۔ ہفتہ دس دن بعد اودھ کیسیز کا ایک شمارہ آیا جس میں چار فیصلے ایسے تھے جو ابھی انڈین کیسیز میں نہیں چھپے تھے۔ سابق دستور تو یہی تھا کہ یہ چاروں فیصلے ہیڈ نوٹ سمیت انڈین کیسیز میں نقل کر لئے جاتے۔ لیکن میں نے ان چاروں فیصلہ جات کے ہیڈ نوٹ خود تیار کئے۔ جب یہ رسالہ میرے ہیڈ نوٹوں کے ساتھ چوہدری صاحب کی خدمت میں ڈلہوزی پہنچا تو انہوں نے میرے تجویز کردہ ہیڈ نوٹوں کو پسند فرمایا اور ہدایت بھیجی کہ انڈین کیسیز میں میرے تیار کردہ نوٹ شائع کئے جائیں۔ ساتھ ہی لکھا کہ اب ظفر اللہ خاں کا کام نظر ثانی کیلئے میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ سو محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور ذرہ نوازی سے ایک سال کا عرصہ جس میں مجھے نوٹ تیار کرنے کی مہارت حاصل کرنی تھی دو ہفتے میں ختم ہو گیا۔ فالحمد للہ۔ اس کے بعد میرا یہ طریق رہا کہ میں ہر فیصلہ توجہ سے پڑھتا۔ اگر رپورٹر کے تجویز کردہ ہیڈ نوٹ میں یا ایسے قانونی رسائل کے کسی ہیڈ نوٹ میں جسے نقل کیا جا سکتا میں اصلاح کی گنجائش دیکھتا تو بلا تامل اصلاح کر دیتا یا خود نیا ہیڈ نوٹ تجویز کرتا۔ انہی ایام میں آخری پروف پڑھتے وقت کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے ہیڈ نوٹ میں مجھے کوئی سقم نظر آیا اور میں نے اس میں مناسب اصلاح تجویز کی۔ یہ ہیڈ نوٹ ہمارے کلکتہ کے رپورٹر کا تیار کردہ تھا۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے متعلق ادارتی ذمہ داری مسٹر پارتھا سارتھی کی تھی۔ مسٹر پارتھا سارتھی نے اسے بلا ترمیم پاس کر دیا تھا۔ جب لالہ کشن چند صاحب ہیڈ پروف ریڈر میری تجویز کردہ ترمیم مسٹر پارتھا سارتھی کے پاس لیکر گئے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ترمیم تو مناسب ہے، لیکن اگر ہیڈ نوٹ ترمیم کیا گیا تو ہمارے رپورٹر خفا ہو جائیں گے۔ وہ میرے کمرے میں تشریف لائے گرمی کا موسم تھا۔ میں نے پوچھا کچھ پینے کو منگواؤں؟ مسکرائے اور جلدی سے کہا نہیں تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا تکلف تو آپ کر رہے ہیں کچھ پسند ہو تو فرما دیجئے۔ اس پر کچھ جھینپ کر کہا "اچھا تو پھر لیمونیڈ سہی کون دیکھتا ہے"! میں نے لیمونیڈ منگوایا اور انہوں نے کچھ تامل سے پی لیا

پس منظر اس مختصر گفتگو کا یہ تھا کہ جیسا ان کے نام سے ظاہر ہے مسٹر پارتھا سارتھی آئینگر مدراس کے برہمنوں میں اعلیٰ پائے کے برہمن تھے اور ذات پات کے لحاظ سے کھانے پینے اور دیگر معاشرتی معاملات میں ان پر شدید پابندیاں تھیں۔ جب شروع شروع میں لاہور تشریف لائے تھے تو اپنے دستور کے مطابق جوتا بھی نہیں پہنتے تھے کیونکہ ان کے عقائد کے مطابق چمڑہ ناپاک ہونے کی وجہ سے جسم کو نہیں چھونا چاہیئے۔ لیکن پنجاب کی سردی سے مجبور ہو کر آخر چپل کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ ہیڈ نوٹ میں ترمیم کے متعلق مسٹر پارتھا سارتھی نے مسکراتے ہوئے فرمایا تمہاری تجویز کردہ ترمیم بہت مناسب ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن کلکتے کے رپورٹر بہت نازک طبع ہیں میں ان کے ہیڈ نوٹ میں کبھی کبھی ترمیم کیا کرتا تھا۔ انہوں نے چودھری صاحب کی خدمت میں احتجاج کیا جس پر چودھری صاحب نے یہ ہدایت دی کہ کلکتہ کے رپورٹروں کے ہیڈ نوٹ میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ تب سے میں نے ان کے ہیڈ نوٹ کی نظر ثانی ترک کر دی ہوئی ہے۔ میں نے کہا میرے خیال میں تو یہ ایسا سقم ہے کہ اس کی اصلاح ضرور ہونی چاہیئے۔ لہذا یہ معاملہ ہمیں چودھری صاحب کی خدمت میں ڈلہوزی بھیج دینا چاہیئے۔ مسٹر پارتھا سارتھی اس پر بھی رضامند نظر نہ آئے تو میں نے کہا اگر آپ اس ترمیم کے ساتھ متفق ہو جائیں تو اس کی ذمہ داری میں لے لوں گا اس پر بخوشی رضامند ہو گئے۔

کارساز ما بہ فکر کار ما

شروع اکتوبر میں جب چودھری شہاب الدین صاحب لاہور واپس تشریف لائے تو دو ایک دن کے بعد مجھ سے فرمایا تم کچھ ملول نظر آتے ہو۔ میں نے والد صاحب کے متعلق ذکر کیا کہ وہ اب اپنا کام بند کرنے والے ہیں اور اس مرحلے پر مجھے ان کا ہاتھ بٹانے کیلئے ان کے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ چودھری صاحب نے ذرا سوچ کر فرمایا تم نے یہاں کا کام تو خوب سمجھ لیا ہے اور تمہاری رفتار بھی تیز ہے۔ تم ہر ہفتے میں تین دن سوموار، منگل اور بدھ سیالکوٹ چلے جایا کرو وہاں یہ انتظام کر لینا کہ زیادہ مقدمات کی تاریخیں ان تین دنوں میں مقرر ہو جایا کریں باقی چار دن یہاں ٹھہر کر یہاں کا کام کر لیا کرو۔ مجھے ان کے اس ہمدردانہ مشورے اور اجازت سے بہت اطمینان ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے محض اپنے فضل سے چودھری صاحب کے دل میں یہ تحریک کر دی اور بغیر میرے سوال کرنے کے یہ مشکل جو مجھے ناقابلِ حل معلوم ہوتی تھی ایک لحظے میں حل ہو گئی۔ چودھری صاحب کے متعلق بھی میرا دل شکر سے لبریز ہو گیا کہ انہیں میری پریشانی کا پورا احساس ہوا اور انہوں نے فوراً اس کا مناسب حل تجویز کر دیا۔ اگر چودھری صاحب میرے مشاہرے میں نصف کی تخفیف بھی کر دیتے تو میں بخوشی قبول کر لیتا اور کام میں بھی کسی پہلو سے غفلت نہ ہونے دیتا۔ لیکن انہوں نے کوئی ایسا ذکر نہ کیا میں

نے خیال کیا مہینے کے آخر پر معلوم ہو جائے گا کہ چودھری صاحب کا کیا منشا ہے۔ والد صاحب کی خوشنودی کے مقابل مجھے کسی اور بات کی پرواہ نہ تھی۔ یکم نومبر کو جب مجھے اکتوبر کی تنخواہ بھی پوری ادا ہوئی تو میں جناب چودھری صاحب کا اور بھی ممنون ہوا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ شروع اکتوبر سے میرا پروگرام ہو گیا کہ میں اتوار کی رات کو سیالکوٹ چلا جاتا اور تین دن وہاں کام کر کے بدھ کی رات یا جمعرات کی صبح کو واپس لاہور آ جاتا۔ اس اثناء میں کالج بھی کھل گئے تھے۔ اور چودھری شمشاد علی خاں صاحب تو گورنمنٹ کالج میں ایم۔ ایس۔ سی کیمیا کی تیاری کر رہے تھے اور شیش محل ہوٹل میں رہتے تھے۔ سید افضل علی صاحب فورمین کرسچین کالج میں ایم۔ اے (تاریخ) کی تیاری کر رہے تھے اور کالج کے نئے ہوسٹل یوئنگ ہال میں فروکش تھے۔ ان دوستوں کے لاہور آ جانے سے میرا اکیلے پن کا احساس بہت حد تک رفع ہو گیا۔ اکتوبر ہی میں کسی وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری رہائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو گیا۔ چودھری صاحب کے رہائشی مکان کے مغرب کی طرف ایک اور مکان چودھری صاحب کی ملکیت تھا۔ جو چودھری صاحب نے شیخ رکن دین صاحب سنیئر سب جج لاہور کو رہائش کے لئے دے رکھا تھا۔ شیخ صاحب بھی ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور چودھری صاحب کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اکتوبر میں شیخ صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور وہ مکان خالی ہو گیا۔ چودھری صاحب نے خود ہی مجھ سے کہا کہ اگر یہ مکان تمہاری ضروریات کے مطابق ہو تو تم اس میں آجاؤ۔ مکان بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا مکانیت خاصی تھی۔ میں نے اس مکان میں رہائش کر لی۔ میں نے مکان کے کرائے کا کوئی ذکر چودھری صاحب کے ساتھ نہ کیا۔ جو کرایہ بھی وہ فرماتے مجھے بخوشی منظور ہوتا لیکن انہوں نے خود ہی فرما دیا کہ کرائے کا کوئی سوال نہیں۔ اس وقت شہر کے اندر ابھی بجلی کا انتظام نہیں تھا کچھ عرصہ بعد اندرون شہر بجلی میسر آنے لگی اور چودھری صاحب نے دفتر کی عمارت میں اور اپنے رہائشی مکان میں بجلی کا انتظام فرمایا تو ساتھ ہی میرے رہائشی مکان میں بھی یہ انتظام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس مکان کا بجلی کا بل بھی دفتر کی طرف سے ادا ہوا کرے۔ گویا میرے لاہور پہنچنے سے دو مہینے کے اندر مجھے ہفتے میں تین دن سیالکوٹ رہنے کی اجازت مل گئی۔ رہائش کیلئے بلا کرایہ مکان مل گیا اور مکان کے ساتھ بجلی اور پانی کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ فالحمد للہ۔ چند دنوں میں میں نے مکان کا سامان وغیرہ مہیا کر لیا اور ایک ملازم کا انتظام بھی ہو گیا۔

سید میر افضل علی صاحب | ان دنوں شام کے وقت ہفتے میں تین چار دن سید افضل علی صاحب کے کمرے میں مجمع احباب ہوتا اور محفل جمتی تھی۔ میں جب بھی ممکن ہوتا اس میں شریک ہوتا

چودھری شمشاد علی خاں صاحب بھی تشریف لاتے۔ سید احمد شاہ صاحب بخاری، سید محمد شاہ صاحب بھی تشریف فرما ہوتے۔ جب موقع ملتا سید انعام اللہ شاہ صاحب سیالکوٹ سے تشریف لاتے۔ گاہ گاہ بعض اور احباب بھی جمع ہو جاتے۔ بہت لطف کی صحبت رہتی۔ یونینگ ہال سے مولوی محمد شریف صاحب شامل ہوتے۔ سید افضل علی صاحب مراد آباد کے ایک چوٹی کے سید خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ پنجاب میں برطانوی عملداری کے قیام پر صوبہ جات متحدہ سے بہت سے افسران پنجاب میں تعینات ہوئے۔ میرے بچپن کے زمانے تک ان افسران اور ان کے افراد خاندان کو ہندوستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک ان سب خاندانوں کی زبان اور معاشرت ہندوستانی تھی۔ پنجابی زبان یا معاشرت کا اثر ان میں دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ ان کے لباس کی طرز بھی ہندوستانی تھی۔ خوراک کا بھی یہی حال تھا۔ اس وقت تک پنجاب کے وسطی اضلاع میں پان کا استعمال انہیں تک محدود تھا۔ چائے بھی زیادہ تر انہیں گھرانوں میں استعمال ہوتی تھی۔ رشتہ ناطہ بھی ان خاندانوں کا آپس میں ہوتا تھا۔ انکی رہائش ایک ہی محلے میں یا قریب قریب کے محلوں میں ہوا کرتی تھی۔ فوجی چھاؤنیوں میں ملازمت پیشہ اور نوکر طبقہ بھی ہندوستانی ہوا کرتا تھا۔ سید افضل علی صاحب کے دادا صاحب محترم ایک وقت میں لاہور کے کوتوال تھے۔ ان کے نانا ڈپٹی قائم علی صاحب گورداسپور میں ریونیو افسر تھے۔ ان کے والد محترم سید نفضل علی صاحب سیالکوٹ میں ڈسٹرکٹ جج کے ریڈر تھے اور ان کی رہائش میانہ پورہ میں تھی۔ ان کے بڑے ماموں سید فیض العسکری صاحب تحصیلدار تھے اور چھوٹے ماموں سید نذر الباقر صاحب کمسریٹ میں افسر تھے۔ ان کے دونوں ماموں ان کے پھوپھا بھی تھے۔ سید افضل علی صاحب کی پہلی شادی سید نذر الباقر صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی اور ان کی وفات کے بعد دوسری شادی سید فیض العسکری صاحب کی منجھی صاحبزادی سے ہوئی۔ سید نذر الباقر صاحب کی بڑی صاحبزادی کی شادی سید سجاد حیدر یلدرم صاحب سے ہوئی۔ میاں بیوی دونوں بڑے پائے کے ادیب تھے۔ ادب اور انشا پردازی اس گھرانے کا خاصہ تھے۔ والدہ سید افضل علی کا ناول "گودڑ میں کا لعل" مشہور ادبی شاہکار ہے۔ سید افضل علی صاحب کے ادبی مضامین کا مجموعہ "تخیلات" پنجاب یونیورسٹی کا کورس ہے۔

سید افضل علی صاحب مدرسے کے ابتدائی درجے ہی میں میرے ہم جماعت تھے۔ ان دنوں ان کے والد صاحب کی رہائش قلعہ کے نیچے زنانہ مشن ہسپتال کے قریب تھی۔ جب وہ نقل مکان کر کے میانہ پورہ میں چلے گئے تو سید افضل علی صاحب کو امریکن مشن سکول میں داخل کرا دیا جو ان کے نئے مکان کے قریب تھا۔ جب ۱۹۰۰ء میں والد صاحب نے مجھے بھی اسی مدرسے میں داخل کرا دیا تو ہم پھر ہم جماعت ہو گئے۔

اور ہمارا دوستانہ تعلق ان کی وفات تک قائم رہا۔ وہ نہایت مخلص اور باوفا دوست اور ایک انمول موتی تھے۔ ان کی رفاقت اور محبت کا نقش ہر دم میرے دل میں تازہ ہے اور ہر روز کئی بار مجھے ان کے لئے دعا کی توفیق ملتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب ہم دوسری بار ہم جماعت ہوئے تو ہم دونوں سن شعور کو پہنچ رہے تھے۔ سید افضل علی گو عمر میں مجھ سے دو سال بڑے تھے لیکن شروع سے ہی ان کا سلوک میرے ساتھ ایسا رہا گویا میں ان سے بڑا ہوں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ میں احمدی تھا وہ ابتداء میں شیعہ تھے۔ لیکن اختلاف عقائد ہمارے دوستانہ تعلقات میں بارج نہ تھا۔ ان کا مکان مدرسے کے قریب تھا۔ تفریح کے وقفے میں ہم ان کے مکان پر جا کر ظہر کی نماز ادا کرتے تھے۔ شیعہ اصحاب کسی مجتہد بزرگ کی امامت میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں ورنہ فرداً فرداً پڑھتے ہیں۔ سید افضل علی صاحب مجھے امام کرتے لیکن نماز میں ہاتھ کھلے چھوڑتے اور سجدہ کے مقام پر خاکِ شفا رکھ لیتے۔ ہم دونوں لاغر بدن تھے۔ لیکن ان کا قد مجھ سے بڑا تھا۔ ورزش کی گھنٹی میں اکثر ہم زور آزمائی کرتے جو اس وقت تک جاری رہتی جب تک وہ مقابلہ نہ چھوڑ جاتے۔ اس مقابلے کے دوران میں ہم دونوں ہنستے رہتے اور شاید زیادہ ہنسنے کے سبب ہی وہ مقابلے سے جلد عاجز آجاتے۔ ۱۹۱۰ء میں ہم دونوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ہماری جماعت میں چالیس طلبا تھے۔ ان میں سے صرف آٹھ پاس ہوئے۔ خواجہ محمد ابراہیم صاحب لالہ امین چند صاحب اور میں اوّل درجے میں فیروز الدین صاحب، عبدالرحمٰن صاحب، خواجہ رحمت اللہ صاحب اور سید افضل علی صاحب دوسرے درجے میں اور خانصاحب، احمد دین صاحب تیسرے درجے میں، ان میں سے لالہ امین چند صاحب اور خواجہ رحمت اللہ صاحب اس سال دوسری بار امتحان میں بیٹھے تھے۔ میں نے تو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور سید افضل علی سیالکوٹ مرے کالج میں جو اس وقت سکاچ مشن کالج کہلاتا تھا داخل ہوگئے۔ اسی سال انہیں تپ دق کا عارضہ لاحق ہوگیا جس میں وہ قریب پانچ سال مبتلا رہے۔ جوں توں کر کے ۱۹۱۲ء میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی اے کیا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو سید افضل علی فورمن کرسچین کالج میں بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کی رہائش نیوٹن ہال میں تھی۔ دسمبر کے مہینے میں میں اپنے لائنس کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا کہ انہیں دفعتاً اطلاع ملی کہ ان کے والد محترم حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے ہیں۔ وہ نہایت شریف طبع پابند وضع بزرگ تھے۔ میرے والد صاحب کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اور میرے ساتھ ہمیشہ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی وفات کا صدمہ سید افضل علی صاحب کیلئے طبعاً جانکاہ تھا لیکن ساتھ ہی معاش کے وسائل بند ہو جانے کی وجہ

سے انتہائی پریشانی کا باعث بھی تھا۔ سید افضل علی صاحب پختہ عزم کے متوکل نوجوان تھے ہر بات کی دیکھ بھال کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تعلیم کی بہر حال تکمیل کریں گے۔ ۱۹۱۵ء میں بی اے میں کامیاب ہوگئے اور ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ خواجہ محمد ابراہیم صاحب کا اور سید افضل علی صاحب کا مدرسہ سے ہی بہت دوستانہ تھا۔ دونوں ایک ہی کالج میں داخل ہوئے۔ دونوں ٹی بی کے مریض ہوئے۔ اکٹھے انٹرمیڈیٹ پاس کیا ایک ہی وقت میں بی اے پاس کیا۔

چوہدری شمشاد علی خاں صاحب | چوہدری شمشاد علی خانصاحب کاہنور ضلع رہتک کے راجپوت خاندان کے سپوت تھے۔ ان کی والدہ ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ ان کے والد چوہدری تاج محمد خاں صاحب فوج میں رسالدار تھے اور ملازمت کے سلسلے میں ان کی تعیناتی طویل عرصہ کیلئے ملک سے باہر رہی۔ چوہدری شمشاد علی خانصاحب نے یہ عرصہ زیادہ تر اپنے تایا زاد بھائی چوہدری حبیب اللہ خانصاحب کے پاس گذارا وہ بھی رسالے میں افسر تھے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں ان کی تعیناتی سیالکوٹ چھاؤنی میں تھی۔ ان کی رجمنٹ کے ہیڈ کلرک مرزا احمد بیگ صاحب تھے جو نہایت متقی بزرگ اور بڑے پرجوش اور مخلص احمدی ہیں۔ وہ بعد میں انکم ٹیکس افسر ہو گئے تھے اور اب پنشن کے بعد ساہیوال میں مقیم ہیں۔ چوہدری شمشاد علی خانصاحب کا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کے نیک نمونے سے متاثر ہو کر چوہدری صاحب نے بھی سلسلہ احمدیہ کی طرف توجہ کی اور اس کا کچھ مطالعہ بھی کیا اسی دوران میں ان کی واقفیت سید انعام اللہ شاہ صاحب سے ہو گئی اور ان کا ماحول احمدیت کا ہو گیا۔ طبیعت میں سعادت تھی اور اخلاص کی صفت سے متصف تھے۔ جب ان پر حقیقت کھل گئی تو سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت وہ اپنے خاندان میں پہلے احمدی تھے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے میٹرکولیشن کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے ہم جماعت ہوئے اور ہوسٹل میں ایک ہی ڈارمیٹری میں جگہ ملی۔ میرے ساتھ بھی دوستانہ تعلق ہو گیا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ چھاؤنی اپنے تایا زاد بھائی کے پاس تشریف لے گئے۔ اور جتنا عرصہ ان کے پاس ٹھہرے مجھ سے بھی ملاقات ہوتی رہی پھر اپنے وطن کاہنور تشریف لے گئے۔ کاہنور پہنچ کر چوہدری صاحب نے بخریت پہنچنے کی اطلاع دی اور تعطیلات کے دوران میں ہمارے درمیان خط و کتابت جاری رہی تعطیلات ختم ہونے والی تھیں کہ چوہدری شمشاد علی خانصاحب

کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کے والد صاحب ان کے کالج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اسلئے انہیں اپنی رجمنٹ میں بطور جمعدار بھرتی کرانے کیلئے اپنے پاس بلایا ہے۔ لہٰذا وہ اب واپس کالج نہیں آئیں گے۔ میں نے انہیں فوراً جواب میں لکھا آپ کو اپنی تعلیم ضرور جاری رکھنی چاہیئے اور انہیں مشورہ کیلئے سیالکوٹ آنے کو کہا۔ ان کے سیالکوٹ آنے پر ہم نے مشورہ کیا اور ایک ایسی تجویز پر اتفاق کر لیا جس پر عمل کرنے سے وہ کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔

چونکہ مجھے ہر ہفتے میں تین دن کے لئے سیالکوٹ جانا ہوتا تھا اور انڈین کیسیز کا کام باقی چار دنوں میں سرانجام دینا ہوتا تھا اسلئے ایک تو مجھے سویرے کام شروع کر کے دیر تک کام کرنے کی عادت ہو گئی اور دوسرے اتوار بھی میرے لئے کام کا دن بن گیا۔ میں صبح ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے یا اس سے بھی قبل کام شروع کر دیتا تھا۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتا اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔ عصر کی نماز کے بعد عموماً چائے اور سیر اور شام کے کھانے اور مغرب کی نماز کیلئے وقت فارغ رکھتا۔ اس کے بعد پھر کام میں لگ جاتا اور نصف شب یا اس کے بعد تک کام کرتا۔ میری طبیعت پر یہ پروگرام بوجھل نہیں تھا۔ مجھے کام میں دلچسپی تھی اور میں شوق سے کام کی طرف متوجہ رہتا تھا۔

پٹنہ ہائی کورٹ میں پہلے کیس کی پیروی

مونگھیر (بہار) شہر میں اور بھاگل پور میں اور ان کے مضافات میں کچھ اصحاب جماعت احمدیہ میں داخل ہو چکے تھے۔ مونگھیر میں حکیم خلیل احمد صاحب جماعت کے ایک معزز اور نہایت مخلص رکن تھے۔ ایک مسجد کی تولیت اور امامت ان کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ ان کے جماعت احمدیہ میں شامل ہونے کے بعد جماعت کے دیگر احباب بھی انکی امامت میں اس مسجد میں نماز ادا کرنے لگے۔ محلہ دار اس پر معترض ہوئے انہوں نے حکیم صاحب کی امامت اور تولیت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جماعت احمدیہ میں شامل ہونے سے حکیم صاحب اسلام سے مرتد ہو گئے ہیں اور مسجد کی تولیت اور امامت کے اہل نہیں رہے۔ اور جماعت احمدیہ کے افراد بھی مسجد میں داخل ہونے اور وہاں فرداً فرداً یا باجماعت نماز ادا کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ معاملہ دیوانی عدالت میں گیا۔ ابتدائی عدالت میں محمد ابراہیم صاحب سب جج نے قرار دیا کہ احمدی جماعت کے افراد کافر نہیں مسلمان ہیں گو ان کے عقائد مدعتی ہیں۔ چونکہ محلہ داروں کی کثرت ان عقائد کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے جماعت احمدیہ کے افراد مسجد میں فرداً فرداً تو نماز ادا کر سکتے ہیں لیکن اپنے میں سے کسی فرد کی امامت میں نماز ادا نہیں کر سکتے۔ اس فیصلے کے خلاف دونوں فریق نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اپیل دائر کی ڈسٹرکٹ جج نے سب جج صاحب کا فیصلہ بحال رکھا۔ فریقین نے پٹنہ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی فریق مخالف

کا مطالبہ تھا کہ جماعت احمدیہ کو کافر قرار دیا جائے اور انہیں مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ حکیم خلیل احمد صاحب کا مطالبہ تھا کہ انہیں مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ حکیم صاحب اور جماعت احمدیہ کو ہائی کورٹ میں اپیل کی پیروی کے لئے وکیل مقرر کرنے میں دقت پیش آئی۔ کوئی مسلمان وکیل جماعت کی طرف سے اپیل کی پیروی کرنے پر رضامند نہ تھا۔ آخر خورشید حسنین صاحب (جو اہل تشیع میں سے تھے) رضامند ہو گئے اور ایک ہندو مختار صاحب کو مختار مقرر کر لیا گیا۔ بحث کی تیاری خورشید حسنین صاحب کی ہدایت کے ماتحت مکرمی سید وزارت حسین صاحب (ساکنہ اوریٰنی) نے بہت محنت اور توجہ سے کی۔ شروع دسمبر ۱۹۱۶ئہ میں دونوں اپیلیں سماعت کیلئے چیف جسٹس صاحب سر ایڈورڈ شیمیئر اور مسٹر جسٹس رو کے اجلاس کی ہفتہ وار فہرست میں درج ہو گئیں۔ حکیم خلیل احمد صاحب اور سید وزارت حسین صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمتِ اقدس میں عریضہ ارسال کیا کہ فریق مخالف نے مسٹر مظہر الحق صاحب اور مولوی فخر الدین صاحب گورنمنٹ پلیڈر کی سرکردگی میں سب ممتاز وکلا کو اپنی طرف سے وکیل مقرر کر لیا ہے۔ صرف سید حسن امام صاحب نے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور ہم اس میں کسی فریق کی حمایت یا مخالفت نہیں کرنا چاہتے۔ ویسے بھی سید حسن امام صاحب کا کام زیادہ تر فوجداری تھا اور وہ بہت کم دیوانی کام اپنے ذمے لیتے تھے۔ ان حالات میں دونوں بزرگوں نے حضور رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا کہ کیا مناسب نہ ہو گا اگر خورشید حسنین صاحب کے ساتھ جماعت کی طرف سے بھی کم سے کم ایک اور وکیل مقرر کیا جائے۔ اس عریضہ پر حضور رضی اللہ عنہ نے جماعت کی طرف سے مجھے پٹنہ ہائی کورٹ میں پیروی کرنے کیلئے ارشاد فرمایا۔ اس ارشاد کے ملنے پر ایک طرف تو میرا دل حضور رضی اللہ عنہ کی شفقت اور عنایت کے اندازے سے لطف اندوز ہوا کہ حضور رضی اللہ عنہ نے اس حقیر خادم کو ایسے اہم معاملے میں جماعت کی نمائندگی کے قابل گردانا اور دوسری طرف اپنی کم مائیگی، بے بضاعتی اور ناتجربہ کاری کے احساس سے پریشان ہوا کہ اتنی بھاری ذمہ داری کما حقہٗ نباہنے کی کیا صورت ہو گی۔ مجھے پریکٹس شروع کئے ابھی دو سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ جو تھوڑا بہت کام میں نے اس وقت تک کیا تھا وہ کلیۃً ضلع کی ابتدائی عدالتوں میں تھا۔ چیف کورٹ میں میں کبھی پیش نہیں ہوا تھا۔ مجھے عدالت ہائے عالیہ کے ضابطے اور رسم و رواج کا کوئی علم تھا نہ تجربہ۔ جس قضیے کے سلسلے میں مجھے پیروی کرنا تھی اس کے واقعات کا مجھے سرسری علم بھی نہیں تھا۔ صرف اتنی اطلاع تھی کہ مونگھیر کی ایک مسجد کی تولیت اور امامت

کا تنازعہ ہے اور اس تنازعہ کی تہہ میں یہ مسئلہ ہے کہ احمدی جماعت کے افراد مسلمان ہیں یا نہیں۔ اس تنازعہ کے متعلق فقہی اور قانونی مسائل کے ساتھ مجھے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ادھر تاریخ سماعت اسقدر قریب تھی کہ مجھے فوراً لاہور سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے چودھری شہاب الدین صاحب سے اجازت طلب کی جو انہوں نے کمال شفقت سے بلا تامل عطا فرمائی۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب میری تحریک پر فوراً میرے ہمراہ چلنے پر تیار ہو گئے۔ فجزاہما اللہ احسن الجزاء۔

سید انعام اللہ شاہ صاحب | سید انعام اللہ شاہ صاحب سیالکوٹ کے مشہور سادات خاندان کے نونہال تھے۔ شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب جن کی شاگردی کا فخر علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کو حاصل تھا اس خاندان کے بزرگ تھے۔ سلسلہ احمدیہ کے سرکردہ بزرگ سید میر حامد شاہ صاحبؓ سید انعام اللہ شاہ صاحب کے پھوپھا تھے۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہایت متواضع تھے اور دوست نوازی کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ کبر اور رعونت کے شدید دشمن تھے۔ غم اور پریشانی کو پاس پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ سفر اور حضر میں بشاشت کے ضامن تھے۔ سکول سے ان کی طبیعت جلد اکتا گئی تلاش روزگار میں پہلے سیالکوٹ شہر کے چونگی کے محکمے میں ملازمت کر لی۔ ادبی مذاق رکھتے تھے۔ جس چنگی خانے میں ان کی تعیناتی ہوتی وہی شہر کے ادبی مذاق رکھنے والے نوجوانوں کا مرکز بن جاتا۔ وہاں ہر اتوار کو پر لطف محفل ہوتی۔ میری عمر ان کی عمر سے چار پانچ سال کم تھی۔ انگلستان جانے سے پیشتر میری ان کے ساتھ شناسائی تو ہو گئی تھی۔ لیکن کوئی ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ لاہور سے پیغام صلح اخبار کے جاری ہونے پر وہ پیغام صلح کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد پیغام صلح کے ارباب حل و عقد کی پالیسی سے دل برداشتہ ہو کر سیالکوٹ کے محکمہ چونگی میں واپس چلے گئے حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کے وصال پر جماعت میں جو اختلاف ہوا اس میں باوجود فریق لاہور کے بزرگ اصحاب کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس عہد کو آخر تک پورے اخلاص کے ساتھ نبھایا۔ میری انگلستان سے واپسی پر سیالکوٹ کے محکمہ چونگی میں ہی کام کر رہے تھے۔ تھوڑا عرصہ بعد ملازمت ترک کر کے کھیلوں کے سامان کی تجارت شروع کر دی۔ اس تبدیلی کا محرک جلب منفعت نہ تھا بلکہ جذبۂ حریت و خودداری تھا۔ وہ شہر کی انجمن شبان المسلمین کے فعال رکن تھے۔ جو صاحب اس مجلس کے صدر تھے وہی بلدیہ کے نائب صدر تھے۔ انجمن کی مجلس انتظامیہ میں جب کوئی مسئلہ زیر بحث آتا تو سید

صاحب اپنی افتاد طبیعت سے مجبور نہایت آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ بعض دفعہ ان کا موقف صدر صاحب انجمن کے موافق نہ ہوتا اور سید صاحب کا طرز بیان صدر صاحب کی طبع پر ناگوار ہوتا اور وہ اس کا اظہار ایسے طور پر کرتے کہ سید صاحب کی طبع نازک پر گراں گذرتا۔ آخر انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان دو ناموافق اور متضاد رشتوں میں سے ملازمت کے رشتہ کو قطع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا استعفےٰ تیار کیا۔ اگر صرف استعفےٰ داخل کرنا مقصود ہوتا تو دو سطروں میں لکھا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ استعفےٰ چونکہ اعلانِ آزادی تھا اسلئے اس میں تمام وجوہ شرح و بسط سے درج کی گئیں اور بلدیہ کی تمام سرگرمیوں، خامیوں، غفلتوں، خطاکاریوں پر مبسوط اور نمک پاش تبصرہ کیا گیا اور نائب صدر بلدیہ بھی تنقید سے نہ بچ سکے۔ بلدیہ کی مجلس میں زیر صدارت نائب صدر صاحب یہ دستاویز بتمام و کمال پڑھ کر سنائی گئی تو مجلس نے بلا تامل اور بالاتفاق سید صاحب کا استعفےٰ نامنظور کیا اور سید صاحب کو بہ جرم گستاخی ملازمت سے علیحدہ کرنے کا حکم صادر کر کے سید صاحب کی حریت ادبی قابلیت اور ندرت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ استعفےٰ کی دستاویز کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "بایں وجوہ - نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ - بس اب خانہ آباد دولت زیادہ"۔ سید صاحب ملازمت کی قیود سے آزاد ہوئے تو لاہور کی آمد و رفت کے لئے بھی وقت میسر آنا آسان ہو گیا، سید افضل علی صاحب کے ساتھ ان کا گہرا دوستانہ تھا۔ میرے ساتھ بھی رشتہ اخوت و عقیدت مضبوط ہوتا جارہا تھا۔ جب میں نے پٹنہ کے سفر کا ذکر کیا تو کمال شوق سے تیار ہو گئے۔

پٹنہ ہائی کورٹ | پٹنہ پہنچتے ہی سید وزارت حسین صاحب سے ملاقات ہوئی ڈاک بنگلے میں قیام ہوا۔ اس کے عین مقابل مظہر الحق صاحب کا بنگلہ تھا۔ ڈاک بنگلے میں پہنچ کر جو سٹیشن کے بالکل قریب تھا سید وزارت حسین صاحب سے مقدمے کے کوائف معلوم کئے۔ سید صاحب قانون پیشہ نہیں تھے لیکن انکی مقدمہ کی تیاری نہایت مکمل تھی۔ انہوں نے بڑی احتیاط اور ترتیب سے واقعات، تنقیحات، فقہی اور قانونی مسائل، کتب فقہ، قانونی دلائل اور نظائر کا مرقع تیار کر لیا تھا، ماتحت عدالتوں کے فیصلے پڑھنے کے بعد جو بات بھی میں دریافت کرتا اس کا مکمل اور شافی جواب فوراً مہیا فرما دیتے۔ ان کی نوٹ بک میں تمام امور کا خلاصہ اور ضروری حوالہ جات نہایت خوش خط با ترتیب درج تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمے کے تمام پہلو بفضل اللہ صفائی سے میرے ذہن

ہیں آگئے اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے ایک دن کی محنت اور توجہ سے اپنی تیاری مکمل کر لوں گا۔ سید صاحب نے کمال دوراندیشی سے ضروری کتب فقہ اور اور قانون اور نظائر ڈاک بنگلے میں مہیا کر لی ہوئی تھیں۔ مجھے کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہ پڑی کتب قانون اور نظائر انہوں نے خورشید حسنین صاحب سے حاصل کی تھیں۔ سید صاحب نے اطمینان دلایا کہ ضرورت پڑنے پر خورشید حسنین صاحب مزید کتب وغیرہ مہیا فرما دیں گے۔ ہم ہفتہ کے روز پٹنہ پہنچے تھے۔ واقعات کے متعلق تو میری تیاری اسی روز مکمل ہو گئی فقہ اور قانونی مسائل کے متعلق حوالہ جات کا دیکھنا باقی رہ گیا۔ اس کے بعد تیاری کا سب سے ضروری حصہ خالصتہً میرا کام تھا یعنی دلائل کا ترتیب دینا اور اس ترتیب کا نوٹ کرنا۔ اسی دن میں سید وزارت حسین صاحب کی معیت میں خورشید حسنین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ساتھ مختصر طور پر تبادلہ خیالات کیا۔ ان سے دو ایک مفید باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ ایک تو انہوں نے بتایا کہ مظہر الحق صاحب زیادہ تر فوجداری کام کرتے ہیں۔ دیوانی کام میں انہیں زیادہ دلچسپی نہیں۔ سید فخر الدین صاحب کے متعلق بتایا کہ وہ بہت قابل وکیل ہیں اور دیوانی کام کا انہیں بہت تجربہ ہے۔ لیکن انہیں بحیثیت گورنمنٹ پلیڈر سرکاری کام کی طرف اسقدر توجہ کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس مقدمے میں باقی وکلاء کے ساتھ صرف بطور عام مشیر کے شامل رہے ہیں۔ خود انہوں نے تیاری میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور بحث میں بھی کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ بحث مظہر الحق صاحب ہی کریں گے۔ مقدمہ کی تیاری میں ان کے مددگار مسٹر محمد یونس اور مولوی محمد طاہر صاحبان رہے ہیں اور وہی اجلاس میں بھی ان کے مشیر اور مددگار ہوں گے۔ باقی تین چار وکلاء نے اپنی خدمات اسلئے پیش کر دی ہوئی ہیں کہ ان کے نام بھی ریکارڈ میں شامل ہو جائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مظہر الحق صاحب اور چیف جسٹس صاحب کے تعلقات گو دوستانہ ہیں لیکن مظہر الحق صاحب کی طبیعت کچھ تصنع کی طرف مائل ہے اور چیف جسٹس صاحب سادگی پسند کرتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مظہر الحق صاحب نے چیف جسٹس صاحب کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ اس مقدمے میں پیچیدہ فقہی اور دینی مسائل پر بحث ہو گی اس لئے مناسب ہو گا کہ مسلمان جج یعنی مسٹر جسٹس شرف الدین اجلاس میں شامل ہوں۔ اس پر چیف جسٹس صاحب نے سید شرف الدین صاحب سے استصواب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ چونکہ انہیں جماعت احمدیہ کے عقائد سے سخت اختلاف ہے اس لئے ان کا اجلاس میں شریک ہونا مناسب نہ ہو گا۔ تاریخ سماعت کے متعلق بتلایا کہ کیس آئندہ ہفتے کی فہرست میں تو درج ہے لیکن ہمارے کیس سے پہلے جو کیس درج

ہیں ان کی سماعت آئندہ ہفتے کے دوران میں ختم نہ ہو سکے گی اسلئے ہمارے کیس کی سماعت تو شاید ابھی دو ہفتے تک نہ ہو سکے گی۔ مجھے یہ سنکر پریشانی ہوئی کہ میں ڈیڑھ دو ہفتے پٹنے میں بیٹھا کیا کروں گا۔ خورشید حسین صاحب نے فرمایا تم سوموار کے دن رجسٹرار صاحب سے مل لینا شائد وہ کوئی عمل تجویز کر سکیں۔ میں نے دریافت کیا مجھے پیروی کیلئے تحریری درخواست پیش کرنا ہوگی یا اجلاس میں زبانی گذارش کرنا کافی ہوگا۔ اس کے متعلق بھی فرمایا کہ رجسٹرار صاحب سے دریافت کر لینا مناسب ہوگا۔

اتوار کے دن کا اکثر حصہ تیاری میں گذارا لیکن سب مراحل اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے لئے سید وزارت حسین صاحب کی سابقہ محنت اور توجہ کے نتیجے میں آسان ہو گئے اور میں نے عصر کے وقت تک اپنی تیاری مکمل کر لی۔ سید وزارت حسین صاحب نہایت متین اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ یہ فیصلہ ساری جماعت کے لئے ہی اہم تھا لیکن جماعت ہائے صوبہ بہار کے لئے اور خصوصاً مونگھیر اور بھاگلپور کی جماعتوں کے لئے تو بہت ہی اہم اور نازک تھا۔ جب حکیم خلیل احمد صاحب اور سید وزارت حسین صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ کی خدمت میں استصوابی عریضہ ارسال کیا تھا تو یہ دونوں بزرگ تو شاید میرے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے انہیں توقع ہو گی کہ حضورؓ ان کے عریضے کے جواب میں الہ آباد یا کلکتہ یا لاہور کے کسی نامور وکیل کے تقرر کا مشورہ دیں گے۔ لیکن مرکز سے اطلاع بھیجی گئی کہ حضورؓ نے خاکسار کا انتخاب فرمایا ہے۔ اور خاکسار حضورؓ کے ارشاد کے ماتحت جلد پٹنہ حاضر ہو جائے گا۔ علم لیاقت اور تجربہ کا تو کیا ذکر میری تو عمر بھی ابھی تئیس[۲۳] سال ہی تھی۔ فریق مخالف کے وکلاء میں سے سب سے جونیئر سے بھی میں کہیں جونیئر تھا اور سب سے کم عمر سے کہیں کم عمر تھا تجربہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میرا چیف کورٹ یا ہائی کورٹ کا تجربہ صفر تھا۔ لیکن یہ بزرگ اور جماعت کے دیگر احباب خوب سمجھتے تھے کہ ظاہری اسباب تو محض ایک آلہ ہیں نتیجہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ رعایت اسباب بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ضروری ہے لیکن سہارا خدا تعالیٰ کے فضل پر چاہیئے۔ میرے پٹنہ پہنچنے پر یہ بزرگ اور دیگر احباب بڑی بشاشت اور خندہ پیشانی سے ملے اور سید وزارت حسین صاحب تو سارا وقت پورے اعتماد کے ساتھ نہ صرف تعاون کرتے رہے بلکہ اپنے توکل اور تقویٰ کے مقام کے لحاظ سے میری ہمت افزائی کا موجب بنے رہے۔ مقدمے کی تیاری کے متعلق بھی انہوں نے مجھ پر پورے اعتماد کا ثبوت دیا۔ جو کچھ میں دریافت کرتا نہایت خوش اسلوبی سے واضح فرما دیتے لیکن خود میری

تیاری میں کوئی دخل نہ دیتے۔ میری طبیعت ان کے اوصافِ حمیدہ سے بہت متاثر ہوئی۔ تقسیم ملک تک جماعت کے جلسہ سالانہ پر ان سے ضرور ملاقات ہوتی۔ تقسیم کے بعد ملاقات کا موقعہ تو نہیں ہوا لیکن ان کی نہایت خوشگوار صحبت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ ان کی خیریت کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ اور جب موقعہ میسر آتا ہے میں اپنا نیازمندانہ سلام ان کی خدمت میں بھجوا دیتا ہوں۔ حکیم خلیل احمد صاحب سے ملاقات کے زیادہ مواقع میسر آتے رہے ہیں۔ یہ بزرگ بھی بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ نہایت بشاش طبع تھے۔ ان کی زندگی باقی انسانوں کی طرح یقیناً آلامِ انسانی سے خالی نہیں رہی ہوگی۔ لیکن میں نے انہیں کبھی ملول خاطر نہیں دیکھا۔ افسوس کہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تیاری مکمل ہو جانے کے بعد ہم بانکی پور، مراد پور اور دریا کی سیر کو گئے۔ مشہور کتب خانہ خدا بخش دیکھا۔ لبِ دریا مہاراجہ دربھنگہ کا محل دیکھا۔ سول سٹیشن میں پبلک عمارات اور رؤسا اور وکلاء کے عالیشان مکانات دیکھ کر طبیعت محظوظ ہوئی۔ سوموار کی صبح کو ہائی کورٹ گئے اور رجسٹرار صاحب سے ملاقات کی۔ تاریخ سماعت کے متعلق تو انہوں نے وہی فرمایا جو خورشید حسنین صاحب سے معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن میری مشکل کا اندازہ کر کے کہا اس ہفتے کے دوران میں تو سماعت کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی لیکن آئندہ ہفتے کی فہرست میں اس کیس کو پہلے نمبر پر رکھ دیا جائے گا متفرق کام کے بعد اسی دن اسکی سماعت شروع ہو سکے گی۔ مجھے پیروی کی اجازت ملنے کے متعلق کہا تم بیرسٹر ہو اور پنجاب چیف کورٹ کے ایڈووکیٹ ہو اور خورشید حسنین صاحب تمہارے ساتھ شامل ہیں۔ اجازت ملنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ تحریری درخواست کی ضرورت نہیں پیش ہونے پر ان امور کا ذکر کر کے اجازت طلب کرنا اسی وقت اجازت مل جائے گی۔

بنارس اور الہ آباد کی سیر | اب چھ دن کی فراغت تھی یہ عرصہ اتنا نہ تھا کہ میں لاہور جا کر وہاں ایک دو دن ٹھہر سکتا۔ سفر اتنا لمبا تھا کہ بہت سا وقت تو سفر میں گذر جاتا اور کوفت کے مقابلے میں کام بہت کم ہو سکتا۔ دوسری طرف پٹنہ میں بیکار بیٹھے رہنا بھی طبیعت پر بوجھ تھا۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب نے تجویز کیا کہ تین چار دن میں بنارس اور الہ آباد دیکھ آئیں ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھنے کے بعد میں نے لالہ پدم سین صاحب کو جو گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم اے کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں ریڈر ہو گئے تھے اطلاع کر دی کہ ہم دو دن کیلئے الہ آباد آئیں گے آپ ہمارے قیام کا بندوبست کر دیں۔

سید حیدر امام | سوموار کا باقی وقت فراغت کا تھا۔ سہ پہر کو ہم مراد پور کے بڑے بازار میں سے جا رہے تھے کہ ینگ مینز انسٹی ٹیوٹ کے سامنے سے گزر ہوا۔ ایک نظر دیکھنے کے لئے اندر چلے گئے وہاں سید مہدی قلی صاحب اور سید حیدر امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سید حیدر امام صاحب، سید اشرف امام صاحب کے اکلوتے فرزند اور خان بہادر سید فضل امام صاحب کے پوتے تھے سید فضل امام صاحب نواب سید امداد امام اثر کے برادر اکبر تھے جو سر سید علی امام اور سید حسن امام صاحبان کے والد بزرگوار تھے۔ سید حیدر امام صاحب ان دنوں ابھی کالج میں تحصیل علم کر رہے تھے۔ لیکن اپنے والدین کی واحد اولاد ہونے کے باعث خاندانی امور کے انصرام میں ان کا بہت کچھ دخل تھا اور ابھی سے حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی ان کی طبیعت کا جزو بن چکے تھے۔ مزاج بیشک امیرانہ تھا لیکن سادگی اور تواضع شعار تھے۔

اسی رات سید انعام اللہ شاہ صاحب اور میں پٹنہ سے روانہ ہو کر دوسری صبح بنارس پہنچے۔ چھاؤنی کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترے۔ یہاں کسی سے واقفیت یا شناسائی نہ تھی کرائے کے اکے پر شہر گئے۔ یہاں کے اکے پنجاب کے اکوں کی نسبت سادہ قسم کی سواری تھے اور سبک رفتار تھے پنجاب میں اکے صرف کچی سڑکوں پر استعمال ہوتے تھے۔ دلی اور یوپی میں اکہ شہری سواری تھی۔ اسلئے یہاں کے اکے ہلکی ساخت کے تھے گو نشستوں کا طریق دونوں میں ایک ہی تھا۔ شہر میں پہنچ کر گھاٹ پر گئے اور کشتی کرایہ پر لیکر دریا کی سیر میں کچھ وقت صرف کیا۔ دریا سے شہر کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ گو شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے شہر کی کوئی خصوصیت نظر نہ آئی۔ لیکن یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے اور اس کے بعد نصف صدی کے عرصے میں مجھے بنارس شہر میں سے گذرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ممکن ہے اس دوران میں شہر کی ہیت میں خوشنما تبدیلی ہو چکی ہو۔ مرکزی حکومت ہند کی وزارت کا رکن ہونے کے زمانے میں میں ایک بار بنارس گیا لیکن اس موقعہ پر شہر کی ایک جانب سے گذر کر ہندو یونیورسٹی میں گیا تھا۔ شہر کے اندر جانے کا موقعہ نہ ہوا۔ دریا کی سیر کے دوران میں سید انعام اللہ شاہ صاحب کو کھانے کی شدید اشتہا محسوس ہونے لگی۔ دریا کی نچلی طرف بائیں جانب مہاراجہ صاحب بنارس کے خوبصورت محل کا نظارہ نہ دریا کے اوپر کی طرف جنت مقام شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی بنا کردہ مسجد کے نازک فلک شگاف مینار ان کی بے چینی کا کچھ بھی مداوا کر سکے۔ دریا کے کنارے دو ایک چناؤں پر جو نظر پڑی تو فوراً واپس چلنے پر مصر ہوئے چنانچہ کشتی بان کو ہدایت ہوئی کہ جلد سے جلد ہمیں گھاٹ پر واپس پہنچا دے۔ بازار میں پہنچتے ہی

مطعم کی تلاش شروع ہوئی ایک سوڈالیمن کی دوکان پر لیمونیڈ کی طلب پر جو سلوک ہندو دوکاندار کی طرف سے ہمارے ساتھ روا رکھا گیا اس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ اس متبرک ہندو شہر میں ایک مسلمان مسافر عزت نفس قائم رکھتے ہوئے اپنی سادہ ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔ ہم سٹیشن واپس جانے والے تھے تاکہ وہاں جا کر معلوم کریں کہ وہاں کوئی ریفرشمنٹ روم ہے یا نہیں جہاں کھانا مل سکے کہ ہمیں ایک مسلمان نانبائی کی دوکان نظر آئی۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب کی طبیعت شدتِ اشتہا سے بے قابو ہو رہی تھی لہذا ہم نے فیصلہ کیا کہ مزید انتظار کی زحمت نہ اٹھائی جائے۔ اور جو کچھ بھی میسر ہو اسے بصد شکر قبول کیا جائے۔ یوں تو سید انعام اللہ شاہ صاحب بہت خوش خو رتھے لیکن ساتھ ہی بھوک برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے کھانے کی اشتہا انہیں بے چین کر دیتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم شہنشاہ اورنگ زیب کی مسجد کی زیارت کو گئے اور تھوڑی دیر شہر میں گھوم کر چھاؤنی کے سٹیشن پر واپس آ گئے۔ عصر کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر رات ہوتے ہم الہ آباد پہنچے۔

پدم سین صاحب نے ہماری رہائش کا انتظام مسٹر گریوال کے بنگلے پر کیا ہوا تھا۔ وہ بھی میری طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھے۔ ہمارے کھانے کا انتظام پدم سین صاحب کی مختصر رہائش گاہ میں تھا۔ مسٹر پدم سین جینی تھے اور ان کے والد اور گھر کے لوگ جین مت کے رسم و رواج کے پورے پابند تھے۔ ان حالات میں ان کا ہمیں اپنے ہاں کھانے کیلئے مہمان کرنا حد درجہ کے اخلاص اور عنایت کا ثبوت تھا۔ کھانا تو وہی تھا جو ایک جینی گھرانے میں تیار ہوتا۔ اسلئے سید انعام اللہ شاہ صاحب جیسے خوش خور کیلئے یہ دو دن سخت آزمائش کے دن ثابت ہوئے ہوں گے۔ قہرِ درویش بر جان درویش والی کیفیت تھی۔ چونکہ مسٹر پدم سین نے ہمارے قیام کے دوران اپنا سارا وقت فارغ رکھا تھا کہ ہمیں الہ آباد کی سیر کرا دیں اور ہمیں کوئی وقت اکیلے نہ گذارنا پڑے۔ اور وہ سارا وقت ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ اسلئے سید انعام اللہ شاہ صاحب کو یہ موقعہ بھی نہیں ملتا تھا کہ کہیں نان کباب کے نقل کی تلاش کر لیں۔ میں ان کے چہرے سے ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا علاج میرے بس میں نہ تھا مجھے ان کی حالت پر رحم بھی آتا اور ان کے چہرے کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی۔ ایک سہ پہر ہم گنگا، جمنا کا سنگھم دیکھنے گئے۔ ریل کے پل کے نیچے ہم جمنا کے گھاٹ پر کشتی میں سوار ہوئے۔ ہم کل چھ افراد تھے اور ساتواں کشتی بان۔ سنگھم کی سیر بہت پر لطف رہی۔ جمنا کا پانی بالکل صاف ہے اور گنگا کا مٹیالا۔ سنگھم سے کچھ دُور نیچے تک دونوں دریاؤں کے دھارے الگ الگ نظر آتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں۔ ہمارے واپس

ہوتے ہوتے سورج غروب ہو گیا۔ لیکن اس رات پوری چاندنی تھی۔ جمنا کا پانی چاندنی میں چاندی کی طرح چمکتا نظر آتا تھا۔ پانی کی رو تو خاموش تھی لیکن بہت گہری تھی کشتی عین منجدھار میں چل رہی تھی اور چونکہ بہاؤ کے مخالف جا رہی تھی اسلیئے رفتار بہت دھیمی تھی۔ میں نے سید انعام اللہ شاہ صاحب سے کہا میر صاحب اگر کشتی بان کہے کہ کشتی میں بوجھ زیادہ ہے اور میں اسے سنبھال نہیں سکتا۔ ضروری ہے کہ آپ میں سے ایک شخص پانی میں کود جائے تاکہ بوجھ ہلکا ہو اور میں باقی سبکو سلامتی سے کنارے لگا سکوں تو کیا آپ ہم سب کی خاطر یہ قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں گے؟ سید انعام اللہ صاحب کے چہرے کی حالت قابلِ دید تھی۔ سراسیمگی سے جھنجھلا کر کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی مذاق کا موقعہ ہے کیسے لطف کی کیفیت کو تم نے بدمزہ کر دیا۔" گھاٹ پر پہنچ کر ہم گاڑی میں سوار ہو گئے اور شہر کو چل دیئے۔ سید صاحب خلافِ عادت بالکل خاموش تھے۔ جب ہم دریا سے کوئی دو میل دور جا چکے تو دفعتاً چونک کر کہا ظفر اللہ خاں تمہارا کیا خیال ہے کیا میں نہ کود جاتا؟" میں نے کہا ہاں آپ ضرور کود جاتے۔ الٰہ آباد سے پٹنہ واپسی کا سفر رات کے وقت ہوا صبح جب گاری پٹنہ پہنچنے کو تھی اور میں تیار ہو لیا تو میں نے سید صاحب سے دریافت کیا ہمارے اور کوٹ کہاں ہیں؟ کہنے لگے اوپر کی سیٹ پر رکھے ہیں۔ میں دیکھ چکا تھا کوٹ اوپر کی سیٹ پر نہیں تھے۔ اس ڈبے میں صرف ہم دونوں سفر کر رہے تھے ہم نے سمجھ لیا کہ کوٹ رات میں چوری ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ پولیس کو اطلاع دینا بے کار ہے۔

سوموار کے دن ہم وقت پر اجلاس میں حاضر ہو گئے ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۲۱ قاعدہ ۱۱ کے ماتحت متعدد درخواستیں فہرست میں درج تھیں ان کے بعد مطبوعہ فہرست میں چوتھے یا پانچویں نمبر پر ہمارا کیس تھا لیکن اس کے گرد سرخ حلقہ کھینچ کر اسے پہلے نمبر پر ظاہر کیا گیا تھا۔ ہم اجلاس میں ہی بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے ایک تو اس وجہ سے کہ میں وہاں کسی کو جانتا نہ تھا اور خورشید حسین صاحب بھی ہمارے نزدیک نہ پھٹکے تھے کہ ان کی سرپرستی میں میں بار روم میں جا بیٹھتا دوسرے اس لیئے بھی کہ اجلاس میں بیٹھنے سے جج صاحبان کے مزاج کا کچھ اندازہ ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ بنچ کو خطاب کرنے کا کیا طریق ہے اور عدالت کے کیا آداب ہیں۔ میں گاؤن، وِگ وغیرہ تو پہنے ہوا تھا لیکن اجلاس میں بیٹھے ہوئے وکلاء کو دیکھ کر احساس ہوا کہ میرے سوٹ کی جیکٹ سیاہ ہونی چاہیئے تھی اور میں عام روزمرہ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اسی دوران میں مظہر الحق صاحب اجلاس میں تشریف لائے اور بڑی شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور میری طرف جھک کر

فرمایا ذرا باہر چلو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا وہ دراز قد اور بارعب انسان تھے اور خوش پوش یورپین معلوم ہوتے تھے۔ رنگ بہت گورا تھا۔ کسی عام شخص سے بات کرتے تو یورپین لہجے میں اردو بولتے تھے اور تکلف سے بات کرتے معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھ انگریزی میں بات کرتے رہے۔ انگریزی بہت سلیس بولتے تھے لہجے اور تلفظ میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ مجھے ساتھ لیکر سید فخرالدین صاحب کے کمرے میں تشریف لے گئے اور میرا ان سے تعارف کرایا۔ سید صاحب ایک متین طبع متبرک صورت بزرگ تھے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہماری گفتگو میں انہوں نے کوئی دخل نہ دیا۔ مظہرالحق صاحب نے مجھ سے فرمایا یہ مقدمہ بہت اہم ہے اور ہم سب تمہاری بحث سننے کے نہایت مشتاق ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تمہیں بحث کرنے کی اجازت ملنے میں کوئی روک پیدا نہیں ہوگی مجھے تو بہر صورت کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن ممکن ہے ہائی کورٹ کے متعلقہ قواعد کی تعبیر میں مشکل پیدا ہو۔ میں نے خیال کیا کہ میں تمہیں توجہ دلا دوں۔ کیا تم نے متعلقہ قواعد کا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے کہا میں نے قواعد تو نہیں دیکھے لیکن رجسٹرار صاحب کے ساتھ مشورہ کیا تھا وہ فرماتے تھے کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیئے۔ فرمایا بہتر ہو کہ تم خود متعلقہ قواعد ایک نظر دیکھ لو۔ چنانچہ مسٹر مظہرالحق نے سید فخرالدین صاحب سے قواعد کی کتاب لیکر متعلقہ قاعدہ مجھے دکھایا۔ اس میں درج تھا کہ کسی چارٹرڈ انڈین ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ کو بحث کی اجازت دی جا سکتی ہے بشرطیکہ پٹنہ ہائی کورٹ کا کوئی ایڈووکیٹ اس کے ساتھ نمائندگی میں شامل ہو۔ مسٹر مظہرالحق نے فرمایا پنجاب چیف کورٹ ضابطہ دیوانی کے منشا کے مطابق ہائی کورٹ کا درجہ تو رکھتی ہے لیکن چارٹرڈ ہائی کورٹ نہیں۔ تم لنڈن ہائی کورٹ کے بھی ایڈووکیٹ ہو۔ لیکن وہ انڈین ہائی کورٹ نہیں۔ اسلئے بظاہر تم پر اس قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میں تو کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گا لیکن ممکن ہے جج صاحبان یہ سوال اٹھائیں۔ تمہیں سوچ لینا چاہیئے کہ ایسی صورت میں تمہارا کیا جواب ہونا چاہیئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر یہ سوال پیدا ہوا تو اول تو میں یہ درخواست کروں گا کہ جج صاحبان میری بحث بطور AMICUS CURIAE (مشیر عدالت) سن لیں جس کا انہیں پورا اختیار ہے ورنہ میں اپنے موکلوں سے مختار نامہ خاص حاصل کر لوں گا۔ بہر صورت میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے بر وقت مجھے متنبہ کر دیا۔

عدالت کا متفرق کام ایک بجے ختم ہوا اور اجلاس دو بجے تک ملتوی ہو گیا۔ اجلاس کے دوبارہ شروع ہونے پر ہمارا کیس بلایا گیا۔ چیف جسٹس صاحب نے فرمایا ہماری فہرست پر تو اس کیس کا پہلا نمبر نہیں۔ پیشکار صاحب نے عرض کیا کہ رجسٹرار صاحب نے یہ کیس اول نمبر پر اسلئے رکھا ہے کہ ایک

فریق کا وکیل لاہور سے آیا ہے اور ایک ہفتہ سے سماعت کا منتظر ہے۔

چیف جسٹس۔ اچھا یہ وہ کیس ہے جس کے متعلق مجھ سے کہا گیا تھا کہ غیر مسلم جج ان مسائل کی پیچیدگی کو سمجھ سکتا ہے نہ ان کے متعلق کسی فیصلے پر پہنچ سکتا ہے۔

مسٹر مظہر الحق۔ جناب من! میں نے ہی آپ کی خدمت میں یہ گذارش کی تھی۔ لیکن میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مناسب ہوگا اگر عدالت کے واحد مسلم جج سماعت میں شریک ہوں۔

چیف جسٹس۔ اچھا تو دوسرے فریق کی طرف سے کون پیش ہے ؟

ظفر اللہ خان۔ جناب عالی میں حکیم خلیل احمد وغیرہ کی طرف سے پیش ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میں لنکنز اِن کا بیرسٹر ہوں، لنڈن ہائی کورٹ اور پنجاب چیف کورٹ کا ایڈوکیٹ ہوں۔ مسٹر خورشید حسین میرے ساتھ نمائندگی میں شامل ہیں۔

چیف جسٹس۔ ہمیں اجازت دینے میں کوئی روک نظر نہیں آتی۔

مسٹر مظہر الحق۔ جناب عالی میں کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن باادب آپ کی توجہ متعلقہ قاعدے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

چیف جسٹس۔ قاعدے کی شرائط تو پوری موجود ہیں۔

مسٹر مظہر الحق۔ جناب عالی! قاعدے میں چارٹرڈ انڈین ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ ہونے کی شرط ہے اور میرے فاضل دوست پنجاب چیف کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں۔

چیف جسٹس۔ پنجاب چیف کورٹ کا درجہ بھی ہائی کورٹ کا ہے۔

مسٹر مظہر الحق۔ ضابطہ دیوانی کی رو سے بیشک پنجاب چیف کورٹ ہائی کورٹ شمار ہوتی ہے لیکن وہ عدالت چارٹر کی بنا پر قائم نہیں ہوئی۔ اسلئے چارٹرڈ ہائی کورٹ نہیں۔

ظفر اللہ خاں۔ جناب عالی میرے فاضل دوست بجا فرماتے ہیں پنجاب چیف کورٹ کا درجہ تو ہائی کورٹ کا ہے لیکن وہ عدالت چارٹرڈ ہائیکورٹ نہیں

چیف جسٹس۔ پھر تم کیا کہتے ہو ؟

ظفر اللہ خاں۔ جناب عالی عدالت کو اختیار ہے کہ وہ کسی ایڈوکیٹ کی بحث بحیثیت مشیر عدالت سن لے۔

چیف جسٹس۔ اگر متعلقہ قاعدے کے الفاظ رستے میں روک ہوں تو مشکل ہوگی۔ لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم نے حال ہی میں اس قاعدے میں کچھ ترمیم کی ہے۔ پیشکار رجسٹرار سے وہ کاغذات منگوالو اور اتنے عرصے میں اگلے کیس کے وکلاء کو بلوالو وہ کیس مختصر ہے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

اگلے کیس کی سماعت شروع ہوگئی اور اس کی سماعت کے دوران میں مطلوبہ کاغذات بھی

چیف جسٹس صاحب کے سامنے پیش کر دیئے گئے - جب چیف جسٹس صاحب کا اطمینان ہو گیا کہ جو کاغذات انہوں نے طلب فرمائے تھے وہ مہیا کر دیئے گئے ہیں - تو انہوں نے پیشکار صاحب سے فرمایا یہ کاغذات مسٹر مظہر الحق کو دیدیں وہ خود بھی دیکھ لیں اور اپنے دوست کو بھی دکھلادیں مسٹر مظہر الحق نے خود دیکھ لینے کے بعد کاغذات مجھے دیدیئے - ان کاغذات سے معلوم ہوا کہ متعلقہ قاعدے کی عبارت میں سے لفظ "چارٹرڈ" حذف کر دیا گیا ہوا ہے - فسبحان اللہ والحمد للہ۔ تھوڑی دیر بعد زیر سماعت مقدمے کی بحث ختم ہو گئی اور چیف جسٹس صاحب نے مسٹر مظہر الحق صاحب سے دریافت کیا اب تو کوئی عذر نہیں - انہوں نے کہا اب کوئی روک نہیں - اس پر چیف جسٹس صاحب نے فرمایا پیروی کرنے کی اجازت دیجاتی ہے - اب چار بجنے کو ہیں - اجلاس کل صبح دس بجے تک ملتوی کیا جاتا ہے کل پہلا کیس یہی ہو گا -

دوسری صبح اجلاس شروع ہونے پر چیف جسٹس صاحب نے مجھ سے دریافت کیا تم بحث کرنے کیلئے تیار ہو -

ظفر اللہ خاں - جناب عالی! میری ایک گذارش ہے - آپ کے سامنے دو بالمقابل اپیل ہیں دونوں ماتحت عدالتوں نے قرار دیا ہے کہ جماعت احمدیہ کے افراد مسلمان ہیں اور مسجد میں فرداً فرداً یا دوسرے نمازیوں میں شامل ہو کر باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں - لیکن احمدی امام کی قیادت میں علیحدہ باجماعت نماز ادا نہیں کر سکتے - ہمارا مطالبہ اپیل میں صرف اس قدر ہے کہ ہمیں مسجد میں احمدی امام کی اقتدا میں نماز باجماعت کی بھی اجازت ہونی چاہئے - فریق مخالف ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے کسی حصے کو بھی تسلیم نہیں کرتا - ان کا مطالبہ اپیل میں یہ ہے کہ احمدی جماعت کے افراد مسلمان ہی نہیں اسلئے مسجد میں داخل ہونے کے مجاز نہیں - اور مسجد میں کسی صورت میں نماز ادا کرنے کے حقدار نہیں - یہ واضح ہے کہ اگر فریق مخالف اپنے مطالبے میں کامیاب ہو جائے تو ہماری اپیل لازماً ساقط ہو جاتی ہے اگر احمدی مسلمان ہی نہیں تو ان کا مسجد کے ساتھ کیا واسطہ - اس لئے مناسب ہو گا کہ عدالت پہلے فریق مخالف کے اپیل کی سماعت کرے - اگر بحث سماعت کرنے کے بعد عدالت کی رائے ہو کہ احمدی مسلمان نہیں تو ہماری اپیل کی سماعت پر وقت صرف کرنا غیر ضروری ہو گا -

چیف جسٹس - معقول تجویز ہے - مسٹر مظہر الحق آپ بحث شروع کریں -

مسٹر مظہر الحق - جناب عالی ہم نے ابھی یہ طے نہیں کیا کہ ہم اپنی اپیل پر زور دیں گے یا نہیں

چیف جسٹس - بالفاظ دیگر آپ ابھی بحث کیلئے تیار نہیں - (مجھ سے مخاطب ہو کر) کیا تم

تیار ہو۔؟

ظفر اللہ خاں - جناب میں تیار ہوں۔

بحث شروع ہوئی۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اس مرحلے پر اپنی بحث کو اس فقہی مسئلے تک محدود رکھتا کہ ایک مسجد میں ایک نماز کیلئے دو جماعتیں ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ اور اس مسئلے پر کہ احمدی مسلمان ہیں یا نہیں بحث کی ابتداء مظہر الحق صاحب کے ذمے چھوڑ دیتا لیکن میں نے یہ طریق اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ عدالت پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مظہر الحق صاحب اس بنیادی زیر تنازعہ مسئلے پر بحث کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ میری طرف عدالت کا رویہ اس وقت تک ہمدردانہ تھا۔ اس بنیادی مسئلے پر ہمارا موقف مضبوط اور قرین انصاف تھا۔ میرے لئے موقعہ تھا کہ میں ججوں کے خالی ذہن میں پہلے اپنا نقش جما لوں۔ اور دونوں مسائل پر بیک وقت اپنے دلائل پیش کر دوں مظہر الحق صاحب جوابی تقریر دونوں مسائل پر کریں اور مجھے دونوں کے متعلق جواب الجواب کا موقعہ ہو۔ یہ طریق اسلئے بھی لازم ہو گیا تھا کہ طبعاً ججوں کے ذہن اس مسئلے پر روشنی کے خواہاں تھے کہ احمدی جماعت کے عقائد کیا ہیں اور کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ احمدی مسلمان نہیں۔

میری بحث کو عدالت نے توجہ سے سنا اور ججوں کا رویہ متواتر ہمدردانہ رہا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ جج دیکھتے تھے کہ میں ایک ناتجربہ کار مبتدی وکیل ہوں اور تن تنہا۔ (خورشید حسین صاحب بحث شروع ہو جانے کے بعد چند منٹ کیلئے تشریف لائے تھے اور پھر اپنے دوسرے کام کی پیروی کیلئے تشریف لے گئے تھے۔) تجربہ کار وکلاء کی ایک مضبوط ٹیم کے مقابل کھڑا ہوں۔ فریق مخالف کی جانب مظہر الحق صاحب، محمد یونس صاحب، محمد طاہر صاحب، چند اور وکلاء اور ایک گروہ علماء کرام کا جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور میرے ساتھ فقط سید وزارت حسین تھے اور وہ بھی ایک جانب تشریف رکھتے تھے۔

مظہر الحق صاحب نے اپنے جواب میں انتہائی زور اسی مسئلے پر دیا کہ جماعت احمدیہ کے عقائد خلاف اسلام اور مستلزم بہ کفر ہیں۔ یہ ان کا بنیادی مطالبہ تھا اور لازم تھا کہ وہ اس پر زور دیتے۔ لیکن ان کی ایک دلیل پر مجھے کچھ حیرت ہوئی جس سے ان کی غرض صرف ججوں کی طبیعت میں بانی سلسلہ احمدیہ کے خلاف مخالفت اور غصے کا جذبہ پیدا کرنا تھی۔ کسی قدر پر تصنع جوش سے انہوں نے فرمایا کہ "ہم مسلمان جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا انتہائی احترام کرتے ہیں ایسے شخص کو اور اس کے متبعین کو مسلمان کیسے گردان سکتے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی شان

میں ایسے گستاخانہ اور خلافِ ادب کلمات کہنے کا مجرم ہو۔ جس کا انگریزی ترجمہ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔" اس پر انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں میں سے بعض فقروں کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ جن سے ججوں کی طبائع میں جوش پیدا ہونا لازم تھا۔ ان کے چہروں سے بھی ایسا مترشح ہوتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں ان کی طبائع پر یہ اثر بھی ہوا ہوگا کہ جو وکیل ججوں کی طبیعت میں جوش پیدا کر کے کام نکالنا چاہتا ہے وہ دلائل سے تہی دست ہے۔

جواب الجواب میں میرے لئے مظہر الحق صاحب کے تمام دلائل کا جواب ضروری تھا۔ بعض کے متعلق تو جج صاحبان ہی کہہ دیتے کہ ان کے جواب کی ضرورت نہیں۔ باقیوں کے متعلق ان کا اطمینان کرنا میرے لئے بفضل اللہ کچھ مشکل ثابت نہ ہوا۔ البتہ حضرت مسیح کی مفروضہ اہانت کے الزام کی تردید میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا۔ میں نے عرض کیا مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میرے فاضل دوست نے ایک ایسی مغالطہ میں ڈالنے والی دلیل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو دراصل بے بنیاد ہے۔ انہیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے تھا کہ یہ دلیل فاضل ججان کی طبیعت پر ناگوار گذرے گی۔ اس لئے انہیں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیئے تھا۔ ان کے لئے واجب تھا کہ ان تحریرات کا جن میں سے بعض فقروں کا ترجمہ انہوں نے پڑھ کر سنایا ہے پس منظر اور سیاق و سباق خوب اچھی طرح سمجھ لیتے اور اگر اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں وہ پھر بھی ان تحریروں کے کسی حصے کا پڑھ کر سنانا ناگزیر سمجھتے تو ساتھ ہی ان کا سیاق و سباق بھی پڑھ کر سنا دیتے۔ یا ان کا خلاصہ بیان فرما دیتے تا کہ کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کوئی الجھن پیدا نہ ہوتی اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہتی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا اسلئے مجھے یہ وضاحت کرنے کے لئے چند منٹ آپ کی توجہ طلب کرنا ہوگی۔ میرے فاضل دوست کی مفروضہ دلیل کا ایک تو اصولی اور بنیادی رد ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعت احمدیہ صدق دل سے یہ ایمان رکھتی ہے کہ قرآن کریم کا ہر لفظ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ قرآن کریم حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ایک سچے نبی اور رسول ہونے کے لحاظ سے نہایت احترام سے کرتا ہے بلکہ ان کی والدہ کا ذکر بھی احترام سے کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ جو عاشقِ قرآن اور خادمِ قرآن تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا پورا احترام نہ کرتے۔ آپؑ نے بار بار فرمایا ہے کہ ہم مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا سچا اور برگزیدہ رسول مانتے ہیں۔ اور آپؑ کا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ حضرت مسیح کے روحانی مثیل ہیں۔ جیسے یوحنا نبی (حضرت یحییٰ) ایلیا نبی کے مثیل تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس صادق نبی کے آپ مثیل ہیں اس کی شان میں کوئی کلمہ گستاخی کا یا سوئے ادب کا کہتے۔

پس منظر ان تحریروں کا یہ ہے کہ بدقسمتی سے عیسائی پادریوں کا یہ وطیرہ ہوگیا ہے کہ وہ بانی اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سخت بدزبانی کرتے رہتے ہیں۔ اور طرح طرح کے جھوٹے اور ناپاک الزامات کا نشانہ آپ کی ذات مطہر کو بناتے ہیں۔ وہ حقیقت کی پرواہ کرتے ہیں نہ مسلمانوں کی دل آزاری کا احساس ان کے رستے میں روک ہوتا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر اور ان کے ظلم سے تنگ آکر بانی سلسلہ احمدیہ نے چاہا کہ ان کو ان کے اپنے گھر کی حقیقت کے بعض حصوں کی طرف توجہ دلائی جائے جس سے ممکن ہے کہ ان کے طرزِ عمل کی اصلاح ہوسکے۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا عیسائی پادری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور قرآن کریم جیسی پاکیزہ وحی پر حملہ کرنے میں نہ صرف اپنی اخلاقی پستی کا ثبوت پیش کرتے ہیں بلکہ پرلے درجے کی احسان فراموشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول اور برگزیدہ نبی مانتے ہیں اور آپ کی والدہ کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ تو یہ اس لئے ہے کہ قرآن کریم ہمیں یہی سکھاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیں یہی تعلیم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا تو ہماری نگاہ میں وہی درجہ ہے جو قرآن کریم میں بیان شدہ ہے۔ لیکن یہ یسوع جس کا ذکر انجیلوں میں ہے اس کو ہم نہیں جانتے نہ ہم اسے پہچانتے ہیں نہ قبول کرتے ہیں۔ اس کی اور اس کے اجداد کی جو تصویر انجیلوں میں درج ہے اس سے تو یہ لوگ راستباز اور بااخلاق بھی ثابت نہیں ہوتے۔ اور اس بات کے ثبوت میں اس تصویر کے بعض رخ ہم پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ میرے فاضل دوست نے آپ کو پڑھ کر سنایا ہے۔ وہ بانی سلسلہ احمدیہ نے حضرت مسیحؑ کے متعلق نہیں کہا اور نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ سب بیانات یسوع کی نسبت یا تو لفظاً انجیل کے بیانات ہیں یا ان بیانات کا جو انجیل میں ہیں صحیح خلاصہ اور مطلب ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ بھی جناب بانی سلسلہ احمدیہ کی طرف سے نہیں۔ اگر یہ عبارتیں قابل اعتراض یا ناگوار ہیں تو ان کی ذمہ داری انجیل نویسوں پر ہے۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے صاف فرمایا ہے کہ ہم ان باتوں کو حضرت مسیحؑ کی شان کے منافی سمجھتے ہیں اور ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا اطلاق حضرت مسیح پر ہوسکتا ہے۔ میرے فاضل دوست کو چاہئے تھا کہ یہ تمام پس منظر اور سیاق سباق جو ان تحریروں میں موجود ہے پیش کر دیتے تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہتی۔

میرے جواب الجواب پر بحث ختم ہوگئی۔ چیف جسٹس صاحب نے فرمایا ہم فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں اور میرا نام لیکر اور مجھے مخاطب کرکے اپنی طرف سے اور مسٹر جسٹس رو کی طرف سے بھی کچھ تعریفی الفاظ میری نسبت فرمائے۔ فجزاھما اللہ۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ میری حیثیت بہ مقابلہ اس ذمہ داری کے

جو مجھ پر ڈالی گئی تھی ایک ٹوٹی ہوئی چھڑی کی بھی نہیں تھی۔ اگر میں کسی حد تک اس ذمہ داری کو نبھا سکا تو یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی ذرہ نوازی تھی۔ جس کی جاذب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی دعائیں ہوئیں۔ فالحمد للہ۔ اجلاس برخاست ہوا مظہر الحق صاحب نے میری طرف بڑھ کر کمال شفقت سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور دریافت فرمایا کب تک ٹھہرو گے۔ میں نے عرض کیا میں آج رات ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ فرمایا کہاں ٹھہرے ہو؟ میں نے کہا ڈاک بنگلے میں۔ فرمایا وہ تو میرے مکان کے سامنے ہی ہے۔ اگر اسٹیشن پر جانے سے پہلے چند منٹ کے لئے آسکو تو میرے لئے خوشی کا باعث ہو گا۔ میں نے کہا ضرور حاضر ہوں گا۔

شام کے کھانے کے بعد میں مظہر الحق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے میں وہ سیاسیاتِ ہند میں بڑی مستعدی سے حصہ لیتے تھے اور کانگرس کی قیادت میں ایک بارسوخ شخصیت تھے۔ میں کسی لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا وہ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ کہا تم نے بڑی قابلیت سے بحث کی۔ واقعات، قانون، عقائد، فقہی مسائل سب پر تمہیں عبور تھا اور ہر بات کو تم نے احسن طریق سے پیش کیا ہم سب نے تمہاری بحث کو بڑے شوق اور دلچسپی سے سنا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ تیاری کیلئے تو مجھے کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ سید زارت حسین صاحب نے سب کچھ تیار کر رکھا تھا میرا تو بہت کم حصہ تھا۔ کہا پھر بھی تم نے ہر بات بڑی خوبی سے اور بڑے موثر طریق پر پیش کی۔ میں نے عرض کیا کہ ایک بات ضرور تھی شاید اس سے کچھ مدد ملی ہو۔ اور وہ یہ کہ آپ سب صاحبان کے لئے تو یہ صرف ایک کیس تھا گو اہم ہی سہی لیکن مجھ نو آموز کے لئے یہ ایک اہم کیس بھی تھا اور میرے اپنے عقائد اور ایمان بھی زیرِ بحث تھے اور جماعت کے حقوق بھی خطرے میں تھے۔ اس کے بعد کبھی میری ملاقات مظہر الحق صاحب سے نہیں ہوئی۔ آخر عمر میں پریکٹس ترک کر کے اور سیاسات سے دست کش ہو کر انہوں نے گوشہ نشینی اور زہد اختیار کر لیے تھے۔ چودھری شمشاد علی خاں صاحب جب انڈین سول سروس کے انتخاب میں کامیابی کے بعد صوبہ بہار میں تعینات ہوئے تو مظہر الحق صاحب کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ ان کے ذریعے مجھے مظہر الحق صاحب کی طرف سے سلام پیام پہنچتا رہتا تھا اور ان کی زندگی کی افتاد میں انقلابی تغیر کی تفصیل معلوم کر کے حیرت ہوئی تھی کہ سوٹ بوٹ انگریزی ٹوپی، سگرٹ سگار، بنگلہ موٹر، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ریش بڑھا کر گیروے کپڑے پہن کر ایک آشرم میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔

لکھنؤ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں حاضری

اسی رات پٹنہ سے روانہ ہو کر دوسرے دن سید انعام اللہ شاہ صاحب اور میں لکھنؤ پہنچے سید سجاد حیدر یلدرم صاحب کے ہاں قیام کیا۔ وہ ان دنوں مہاراجہ صاحب محمود آباد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ مہاراجہ صاحب نے از راہ عنایت کھانے پر مدعو فرمایا اور ملاقات کا شرف بخشا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شاہانہ مزاج اور خلق عطا فرمائے تھے۔ میری کیا حیثیت تھی وہ بادشاہوں کے ہمسر تھے لیکن نہایت اکرام سے پیش آئے

جناب ڈاکٹر علی نقی صاحب خلف الرشید شمس العلماء مولوی میر حسن صاحب

شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر علی نقی صاحب فوجی ڈاکٹر تھے اور ان کی رجمنٹ ان دنوں لکھنؤ میں تھی۔ وہ میرے بڑے کرم فرما تھے۔ دس سال قبل کرنل ہیرسین سول سرجن چھاؤنی سیالکوٹ نے میری دائیں آنکھ کے پپوٹے کا اپریشن کیا تھا۔ ڈاکٹر علی نقی صاحب کی تعیناتی ان دنوں چھاؤنی سیالکوٹ میں تھی۔ اپریشن کے بعد مجھے اپنے رجمنٹل مکان میں لے گئے تھے اور جب تک مجھے صحت ہوئی اپنا مہمان رکھا تھا۔ اور بڑی شفقت سے خبر گیری فرماتے رہے۔ وہ میرے والد صاحب کے دوست تھے اور سید انعام اللہ شاہ صاحب کے عزیز اور بزرگ تھے۔ ہم دونوں لکھنؤ چھاؤنی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہت شفقت اور تواضع سے پیش آئے۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب نے جو تعریفی کلمات میری نسبت فرمائے تھے وہ اخبارات میں شائع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی پڑھے۔ مجھ سے فرمایا ہم تو تمہیں بچپن سے جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذہانت اور فراست عطا فرمائی ہے۔ بہت ترقی کرو گے لیکن افسوس ہے کہ تم نے دینی لحاظ سے اپنے آپ کو ایک نہایت تنگ حلقے میں محدود کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے تم ایک قیدی ہو کر رہ گئے ہو۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں بڑے ادب کے ساتھ خواجہ حافظ شیرازی کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں کہ ؎

عقل گرداند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است
عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما

خان بہادر محمد حسین صاحب سیشن جج کانپور

ایک دن لکھنؤ ٹھہر کر ہم کانپور گئے اور چند گھنٹے خان بہادر محمد حسین صاحب سیشن جج (والد محترم ڈاکٹر محمد نسیم صاحب بیرسٹر ایٹ لاء) کے ہاں قیام کیا۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ خان بہادر صاحب کے ہاں سالن میں بہت تیز مرچ استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ مجھے مرچ کھانے کی عادت نہیں تھی لہٰذا انہوں نے مشورہ دیا کہ میں خان بہادر صاحب کی خدمت میں ذکر کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ خان بہادر صاحب

نے فرمایا یہ تو تم نے بہت اچھا کیا کہ فکر کر دیا بیشک ہمارے ہاں تیز مرچ کا ہی رواج ہے۔ میرے گھر سے تو بہت تیز مرچ کھانے کی عادی ہیں لیکن اتفاق سے وہ ان دنوں دلی گئی ہوئی ہیں۔ پھر بھی میں باورچی کو تاکید کر دیتا ہوں۔ چنانچہ باورچی کو طلب فرمایا اور تاکید کی کہ دوپہر کے کھانے کے سالن میں مرچ بہت کم صرف برائے نام ہو۔ یہ صاحبان مرچ کھانے کے عادی نہیں۔ ہمارا اطمینان ہو گیا۔ ہم شہر کی سیر کو چلے گئے۔ جب دوپہر کا کھانا چنا گیا تو دیکھا کہ خان بہادر صاحب کے سامنے ایک چھوٹی طشتری میں چھوٹی سبز مرچ رکھی ہیں۔ میرے دل میں کچھ ندامت کا احساس ہوا کہ میں نے اپنے آرام کی خاطر میزبان کا کھانا بے مزہ کر دیا۔ میں نے پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تو میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں بہنے لگیں اور یہی کیفیت سید انعام اللہ صاحب کی ہوئی۔ خان بہادر صاحب برابر ہر نوالے کے ساتھ سبز مرچ کھاتے چلے گئے! اسی شام کانپور سے روانہ ہو کر دوسرے دن دوپہر ہم بفضل اللہ بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ کام تو بہت جمع تھا لیکن میری دو ہفتوں کی غیر حاضری بظاہر چوہدری شہاب الدین صاحب کیلئے باعث ملال نہ ہوئی تھی۔ اخبارات میں یہ پڑھ کر کہ چیف جسٹس صاحب نے میری بحث کے متعلق تعریفی کلمات فرمائے خوش معلوم ہوتے تھے۔ میں اپنے کام کا بقایا صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مسروقہ اورکوٹوں کے سلسلہ میں بنارس کی عدالت میں حاضری

تین چار دن بعد (سید انعام اللہ شاہ صاحب ابھی لاہور میں میرے ساتھ ہی مقیم تھے) یوپی پولیس کے ایک سب انسپکٹر صاحب تشریف لائے۔ ہمارے مسروقہ اورکوٹ ان کے پاس تھے جن کی شناخت انہوں نے ہم سے کرائی اور بتایا کہ مغل سرائے اسٹیشن پر یہ کوٹ عبداللہ نامی ایک ریلوے قلی نے ریل سے چرائے تھے۔ وہ انہیں ایک بورے میں بند کر کے لے جا رہا تھا کہ سب انسپکٹر صاحب نے اسے دیکھ لیا۔ اور دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ وہ گھبرا کر بھاگا۔ سب انسپکٹر صاحب نے تعاقب کیا اور اسے پکڑ لیا بورے میں سے اورکوٹ نکلے۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب کے کوٹ کی جیب میں ایک کارڈ ان کے نام کا تھا جس پر ان کا سیالکوٹ کا پتہ لکھا تھا۔ سب انسپکٹر صاحب تکمیل تفتیش میں سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ سید صاحب لاہور میں میرے پاس ہیں۔ کوٹ شناخت کرنے کے بعد ہماری توقع تھی کہ کوٹ ہمارے حوالے کر دیئے جائیں گے اور قصہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن سب انسپکٹر صاحب نے ہم دونوں کے نام سمن بطور گواہ ہمارے حوالے کئے۔ جن میں حکم تھا کہ ہم دو جنوری ۱۹۱۷ء کو بنارس میں مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں گواہی کے لئے حاضر ہوں۔ بنارس میں جو چند گھنٹے ہم نے گذارے تھے ان کی یاد کوئی ایسی

خوشگوار نہیں تھی اور الٹے پاؤں اتنا لمبا سفر بھی ایک زحمت تھا لیکن چارہ بھی نہیں تھا۔ اسی شام ہم بنارس روانہ ہوگئے بنارس میں ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا مجسٹریٹ صاحب نے اجلاس شروع ہوتے ہی کیس بلا لیا اور ہماری شہادت قلمبند کرنے کے بعد حکم صادر فرمایا کہ کوٹ ہمارے حوالے کردیئے جائیں۔ عدالت سے فارغ ہوتے ہی ہم اسٹیشن پر چلے گئے اور پہلی گاڑی سے لاہور روانہ ہوگئے۔

پٹنہ ہائی کورٹ کا فیصلہ | میری غیر حاضری میں چودھری شہاب الدین صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ یکم جنوری سے میرے مشاہرے میں پچاس روپے ماہوار کا اضافہ ہوگا۔ گویا جو اضافہ ۲۲ اگست کو ہونے والا تھا وہ یکم جنوری سے ہوگیا۔ اس سے مجھے یہ بھی اطمینان ہوا کہ باوجود میرے ہر ہفتہ سیالکوٹ جانے کے اور پٹنہ اور بنارس کے دو سفروں کے جناب چودھری صاحب میرے کام سے خوش ہیں فالحمدللہ۔ شروع سال میں پٹنہ ہائی کورٹ نے اپنا فیصلہ صادر کیا اور عدالت ماتحت کے فیصلے کو بحال رکھا فیصلہ سناتے وقت چیف جسٹس صاحب نے خورشید حسنین صاحب سے فرمایا کہ اس کیس میں اہم اور مشکل فقہی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ اگر ہمارے فیصلے کے خلاف کوئی فریق پریوی کونسل میں اپیل کرنا چاہے تو ہمیں اجازت دینے میں تامل نہ ہوگا۔ اس اطلاع کے ملنے پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے خاکسار کو مشورہ کے لئے طلب فرمایا اور بعد مشورہ فرمایا کہ بنیادی سوال پر تینوں عدالتوں کا فیصلہ ہمارے حق میں ہے کہ ہم بحمدللہ مسلمان ہیں۔ نماز کے لئے علیحدہ جماعت قائم کرنے کا فقہی مسئلہ کچھ بھی ہو عدالت کا فیصلہ قرین انصاف ہے کہ جب محلہ والوں کی کثرت غیر احمدی ہے تو احمدیوں کو الگ با جماعت نماز اس مسجد میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اصولاً یہی طریق امن کا طریق ہے۔ ہمیں مزید چارہ جوئی کی ضرورت نہیں

والد صاحب کا وکالت ترک کرکے قادیان میں سلسلہ احمدیہ کی خدمت کیلئے سکونت اختیار کرنا | اپریل ۱۹۱۷ء میں والد صاحب نے سیالکوٹ میں اپنا وکالت کا کاروبار بند کر دیا اور قادیان حاضر ہوگئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے کمال لطف و شفقت سے نظارت اعلیٰ و نظارت بہشتی مقبرہ کے فرائض آپ کے سپرد فرمائے۔ والد صاحب نے اپنے طور پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا انڈکس بھی تیار کرنا شروع کیا۔ آپ نے بھائی عبدالرحیم صاحب سے ان کا مکان واقعہ محلہ دارالعلوم (جو تعلیم الاسلام سکول کے ہوسٹل کے جنوب کی جانب تھا) خرید لیا یہ مکان دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل آپ نے چودھری فضل احمد صاحب (والد محترم چودھری عصمت اللہ خان صاحب ایڈووکیٹ) کو رہائش کے لئے دیدی اور اوپر کی منزل کے دونوں کمرے اپنی رہائش کے لئے رکھ لئے۔ سال میں تین چار بار والدہ صاحبہ پندرہ دنوں کے لئے قادیان حاضر ہوتیں باقی وقت ڈسکہ میں یا میرے پاس گذارتیں جو میرے لئے بہت

خوشی اور برکت کا موجب تھا۔ سال کے شروع میں میرے گھر سے لاہور آچکے تھے اور گھر کا انتظام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی چودھری غلام نبی صاحب مردانے کے تمام امور کے ذمہ دار ہو گئے اور مجھے خانہ داری کے انتظام سے کلی طور پر فراغت ہوگئی۔ اب ہفتہ میں تین دن سیالکوٹ جانے کی ضرورت بھی نہ رہی۔

چیف کورٹ لاہور میں پہلے کیس کی پیروی

اسی دوران میں میرے ماموں صاحب نے ایک فوجداری نگرانی کے خواہشمند سائل کو میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے چیف کورٹ میں کام شروع کرنے کے امکان کی طرف ابھی کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ انڈین کیسیز کے کام کے ساتھ میں مانوس ہوگیا تھا اور مجھے اس میں پوری دلچسپی تھی۔ چودھری شہاب الدین صاحب میرے کام سے خوش تھے اور میری ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ چیف کورٹ میں قدم رکھنے سے ابھی میری طبیعت حجاب محسوس کرتی تھی۔ اب یہ کیس سامنے آیا تو میں نے ماتحت عدالتوں کے فیصلے پڑھے اور میری رائے ہوئی کہ چیف کورٹ میں کامیابی کی گنجائش ہے۔ یہ احساس بھی میرے لئے ایک قسم کا ذہنی چیلنج بن گیا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ میں ابھی چیف کورٹ بار ایسوسی ایشن کا رکن نہیں ہوا تھا نہ میرا کوئی منشی ہی تھا۔ جو دفتری کارروائی اپنے ذمے لیتا۔ کچھ تامل اور سوچ بچار کے بعد میں نے یہ کیس لے لیا اور توکلاً علی اللہ نگرانی کی درخواست کا فارم حاصل کرکے چیف کورٹ میں نگرانی دائر کردی۔ ٹائپ وغیرہ کے کام کی سہولتیں مجھے انڈین کیسیز کے دفتر میں میسر تھیں ان کے متعلق کوئی دقت پیش نہ آئی۔ نگرانی کی بحث پیشی مقرر ہوگئی اور بعد سماعت فیصلہ سائل کے حق میں ہوگیا فالحمدللہ۔ اس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوگیا کہ چیف کورٹ کا کام کوئی ایسا مشکل نہیں۔ اس کے بعد کبھی مہینہ میں ایک دو کیس کسی تعلق کی وجہ سے میرے پاس آجاتے اور میرا تعارف چیف کورٹ کے حلقوں سے ہونے لگا

لاہور میں قانونی پریکٹس کا آغاز

چودھری شہاب الدین صاحب نے ایک دن مجھ سے فرمایا ظفراللہ خاں خدا نے تمہیں بڑا صاف ذہن عطا فرمایا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم سارا وقت انڈین کیسیز کے دفتر میں بند رہو۔ اگر تمہیں عدالت کا کام ملے تو تم شوق سے لے لیا کرو۔ چیف کورٹ میں کام کا تجربہ تمہارے انڈین کیسیز کے کام میں ممد ہوگا۔ اور انڈین کیسیز کا کام تمہیں پریکٹس میں مدد دیگا۔ ان کے اس ارشاد سے مجھے بہت حوصلہ ہوا۔ میں نے سید انعام اللہ شاہ صاحب کو سیالکوٹ سے بلا لیا کہ وہ میرے ساتھ پریکٹس کے کام میں معاون ہوں۔ اور میں چیف کورٹ بار ایسوسی ایشن کا ممبر بھی بن گیا۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب کا قیام لاہور میں میرے ساتھ ہی تھا۔

سید افضل علی صاحب کا ایم اے کے
امتحان کے لئے بیرم خان پر THESIS

سید افضل علی صاحب نے ایم کے امتحان کے لئے بیرم خان
پر THESIS لکھنا تھا۔ انہوں نے بڑی کاوش

سے مواد جمع کیا مسوّدہ تیار کر کے مجھے پڑھنے کیلئے دیا۔ میں بیرم خان کے متعلق صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ ہمایوں کے وزیر تھے۔ ان کے ساتھ ہی ہندوستان سے نکل کر ایران گئے۔ ان کی وساطت اور تدبر کا ہی کارنامہ تھا کہ شاہ طہماسپ صفوی ہمایوں کے لئے فوج مہیا کرنے پر رضامند ہو گئے۔ ہمایوں کی وفات پر بیرم خان اکبر کے وزیر بھی ہوئے اور اتالیق بھی اور اکبر کے عہد کے ابتدائی سالوں میں بڑی دانشمندی سے نوجوان شہنشاہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ سید افضل علی صاحب کے مسوّدے سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ بیرم خاں کی شاعری کا باب تو میرے لئے بالکل نیا علم تھا۔ میں نے سید افضل علی صاحب سے کہا کہ ان کا تیار کردہ مسوّدہ نہ صرف تاریخی لحاظ سے بلکہ ادبی لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں کسی قدر اصلاح کا محتاج ہے۔ اگر وہ پسند کریں تو ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر ہر روز گھنٹہ بھر مسودے کی اصلاحی نظر ثانی پر صرف کریں۔ دو ہفتے میں اصلاح شدہ مسودہ ممتحن صاحب کی خدمت میں بھیجنے کیلئے تیار ہو جائے گا۔ وہ رضامند ہو گئے اور ہم دونوں نے یہ وقت مسوّدے کی ترتیب میں مناسب تبدیلی کرنے اور زبان چست کرنے میں صرف کیا ممتحن پروفیسر جادوناتھ سرکار تھے۔ امتحان سے چند ہفتے قبل سید افضل علی صاحب نے بتایا کہ انہیں اپنے پروفیسر صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر جادوناتھ سرکار نے ان کے مضمون کی بہت تعریف کی ہے اور اسے اوّل نمبر پر رکھا ہے۔ میں نے مبارک باد دی لیکن وہ کچھ متفکر تھے کہ میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی ہے۔ تم نے زبان کی اتنی اصلاح کر دی اور اسے ایسا چست کر دیا کہ پروفیسر جادوناتھ سرکار جیسے تاریخ دان بھی متاثر ہوئے۔ اب جو میں امتحان میں بیٹھوں گا اور میرے پرچے میری پھیکی زبان میں ہوں گے جو میرے مضمون کے اصل مسوّدے کی زبان تھی تو ممکن ہے کسی ممتحن کو شک گذرے کہ THESIS اس شخص کا تیار کردہ نہیں جو امتحان میں بیٹھا ہے۔ اور میں گرفت میں آجاؤں۔ میں نے سمجھایا کہ THESIS پر ساری محنت تو آپ نے کی تھی۔ میں نے تو کہیں کہیں آپ ہی کے الفاظ کی ترتیب بدل کر زبان میں کچھ چستی پیدا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ سارے مضمون میں ایک پورا جملہ بھی تو میرا وضع کردہ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ جس شخص نے اپنی لگاتار محنت اور کوشش کے نتیجے میں بیرم خان کے اصل مقام کو جو اسے تاریخ ہند میں اور ادبیات ہند میں ملنا چاہیئے واضح کر دیا ہے اسے امتحان کے

متعلق کچھ بھی پریشانی نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے۔ چند دن بعد مجھ سے کہا میں اس سال امتحان میں نہ بیٹھوں تو ٹھیک رہے گا۔ میں نے بڑے زور سے احتجاج کیا کہ ۱۹۰۷ء میں ہم نے میٹرکولیشن کا امتحان اکٹھے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد چار سال تو آپ کے بیماری کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ بی اے کے امتحان سے چند ماہ پیشتر آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ بی اے میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی تو آپ نے ایم اے کی ٹھان لی۔ ان دو سالوں میں جو کچھ تھوڑا بہت پس انداختہ آپ کے والد مرحوم چھوڑ گئے تھے اس کا اکثر حصہ آپ نے دوست نوازی میں صرف کر دیا۔ اب ایم اے کے امتحان سے آپ فقط اسلیئے جی چراتے ہیں کہ زندگی کی ذمہ داریاں ایک سال اور التوا میں پڑ جائیں اور THESIS کے معاملے کو بہانہ بنانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا گیا وہ ہنستے رہے۔ میں نے خیال کیا مجھے چھیڑ کر لطف اٹھا رہے ہیں۔ ورنہ یہ ان کے ذہن میں کیسے آسکتا ہے کہ THESIS میں اعلیٰ کامیابی کی وجہ سے امتحان میں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ امتحان قریب آ گیا۔ میں مطمئن تھا کہ انہوں نے پھر التوا کا ذکر نہیں کیا تیاری میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ضرور کامیاب ہوں گے۔

امتحان کے پہلے دن عین پرچے کے وقت میرے پاس تشریف لائے اور فاتحانہ انداز میں فرمایا۔ دیکھ لو امتحان ہو رہا ہے اور میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں اب تو باور کروگے کہ میں امتحان میں نہیں بیٹھا۔ جو میں چاہتا تھا میں کر گذرا۔ اب جو تم چاہتے ہو تم کر لو۔ میں بہت سٹ پٹایا میری پریشانی اور بے بسی پر وہ بے اختیار ہنستے رہے۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب بھی آ گئے۔ وہ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش میں تھے لیکن ان کے چہرے کی کیفیت سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سازش میں شریک تھے کہ سید افضل علی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوں۔ آخر میں نے کہا پچاس روپے فیس داخلہ بھی ضائع کی کہنے لگے نہیں نہیں وہ بچ گئے۔ اگلے سال کام آئیں گے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہا میں نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ داخل کر دیا تھا کہ مجھے اختلاج قلب کی تکلیف ہے میں امسال امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی تفصیل ایسے مزاحیہ طور پر بیان کی کہ میں بھی ہنس پڑا۔ آخر کہا اب امتحان تو آئندہ سال ہی دینا ہو گا میری تقصیر کی تعذیر کیا تجویز ہوئی؟ میں نے کہا آپ کی تعزیر ایک سال قید بامشقت۔ آپ یونینگ ہال کا عشرت کدہ چھوڑ کر میرے ہاں درمیانی منزل کے بغل والے کمرے میں قیام فرمائیے۔ خوانِ یغما نان کباب یک قلم ترک کر کے غریب خانے کی دعوت شیرازیہ پر قانع ہو جائیے۔ آئندہ سال کے امتحان کی تیاری ابھی سے پھر شروع کر دیجئے۔ امتحان میں کامیابی اس قید خانے سے رہائی کا پیغام ہو گی۔ انہوں نے ناک بھوں چڑھائے حسرت کی آہیں کھینچیں۔ مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی آخر سمجھ گئے کہ جائے مفر

نہیں۔ گو دل میں یہ بھی سمجھے ہوں گے کہ سستے چھوٹے۔ چند دن بعد چار و نا چار "زندان" میں بسر اکر لیا
سیڑھیوں سے دوسری طرف سید انعام اللہ شاہ صاحب کا کمرہ تھا۔ اس سے انہیں کچھ ڈھارس تھی۔
اسی سال چودھری بشیر احمد صاحب میٹرکولیشن کے امتحان میں کامیاب ہو گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں
داخلہ لے لیا۔ یوں تو انہوں نے ہوسٹل میں بھی کمرہ لے لیا لیکن بالعموم ہر شام گھر آتے اور ہفتے میں تین چار
یوم گھر پر ہی ٹھہر جاتے۔ ادھر چودھری شمشاد علی خاں صاحب ایم ایس سی (کیمیا) میں کامیاب ہو گئے اور
انہیں محکمہ آب و ہوا کے سائنس کے صیغے میں ملازمت مل گئی اور وہ اس سلسلے میں آگرہ تشریف لے گئے۔
تھوڑا عرصہ بعد سر مائیکل اوڈوایر گورنر پنجاب نے اپنے صوبے سے ایک ڈبل کمپنی (سگنلز) بھرتی کرنے کا اعلان
کیا اور چودھری شمشاد علی خاں صاحب اس میں بھرتی ہو کر عراق چلے گئے۔ آخر جون ۱۹۱۷ء میں چودھری
شہاب الدین صاحب نے حکم صادر کیا کہ یکم جولائی سے میرے مشاہرے میں پچاس روپے اضافہ ہو گا۔ مجھے
انڈین کیسز میں کام کرتے ابھی دس ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرے مشاہرے میں دو سالانہ ترقیوں کے برابر اضافہ
ہو گیا۔ رہائشی مکان اور اس کے بجلی پانی کا خرچ مستزاد تھا۔ فالحمد للہ۔ اس کے بعد یہی رفتار جاری رہی
اور یکم جنوری ۱۹۱۹ء سے میرا مشاہرہ دگنا ہو گیا

آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کا سفر ہندوستان

بیس اگست ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ملک معظم کی حکومت کا مقصد ہندوستان کو نوآبادیات
کے پورے درجے تک پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے لئے وزیر ہند نے ہندوستان تشریف لا کر وائسرائے لارڈ
چیلمسفورڈ کی شمولیت میں رائے عامہ کا رجحان معلوم کرنے کا اعلان بھی کیا۔ ان کی تشریف آوری پر
دہلی میں مختلف انجمنوں، پارٹیوں اور مجالس کے نمائندگان ان کی اور وائسرائے کی خدمت میں پیش
ہوئے اور ہندوستان کی آئینی ترقی کے متعلق اظہار رائے کیا اور تجاویز اور منصوبے پیش کئے۔
جماعت احمدیہ کی طرف سے بھی ایک وفد پیش ہوا اور اپنا ایڈریس پیش کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی
بھی اس موقعہ پر دلی تشریف لے گئے اور وزیر ہند اور وائسرائے کے ساتھ علیحدہ ملاقات کی۔ اور تبادلہ
خیالات کیا۔ وزیر ہند کے ساتھ ملاقات کے دوران میں ترجمانی کے فرائض ادا کرنے کی سعادت
حضور رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے ماتحت خاکسار کو حاصل ہوئی۔ وزیر ہند نے بہت تپاک اور احترام سے
حضور رضی اللہ عنہ کا خیر مقدم کیا اور کہا آپ کی جماعت کی طرف سے جو ایڈریس آج پڑھا گیا وہ نہایت مفید
تجاویز پر مشتمل تھا۔ چار پانچ نکات کو تو میں نے خاص طور پر نوٹ کیا ہے۔ اور میں اپنی رپورٹ میں
ان سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ ان نکات کا وزیر ہند نے مختصر ذکر بھی کیا اور دریافت کیا یہ ایڈریس

کس کا لکھا ہوا ہے۔ حضورؓ نے فرمایا میں نے اردو میں لکھا تھا اور (خاکسار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) اس نے انگریزی میں ترجمہ کیا وزیر ہند نے کہا ترجمہ بھی بہت اچھا تھا اور اگرچہ بسیط دستاویز تھی اس نے پڑھی بھی بڑی عمدگی سے۔ ایک گھنٹے کے قریب گفتگو رہی اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ وزیر ہند جو کچھ کہتے رہے اس کے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضورؓ انگریزی خوب سمجھتے تھے لیکن چونکہ حضورؓ خود اردو میں اظہار خیال فرماتے تھے۔ حضورؓ کے ارشادات کا ترجمہ خاکسار کردیتا تھا۔ خاکسار حضورؓ سے اجازت لیکر اسی رات دلّی سے رخصت ہوگیا۔ وائسرائے کے ساتھ حضورؓ کی ملاقات دوسرے دن تھی۔ اس موقعہ پر ترجمانی کے فرائض صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے ادا کئے۔

حکومت پنجاب کی طرف سے پبلسٹی کمیٹی کا قیام

عالمی جنگ کے دوران میں رائے عامہ کی تائید حاصل کرنے اور جنگی سرگرمیوں میں تعاون کی روح کو مضبوط کرنے کیلئے حکومت نے ایک پبلسٹی کمیٹی قائم کی اور جماعت احمدیہ کو بھی دعوت دی کہ وہ اپنا نمائندہ اس کمیٹی پر نامزد کرے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے خاکسار کو نامزد کیا۔ کمیٹی کا افتتاحی اجلاس شملہ میں حکومت پنجاب کے مرکزی دفاتر "ایلزلی" میں ہوا۔ میں اجلاس میں شامل ہونے کیلئے شملہ گیا۔ اس سے پہلے مجھے ایک بار شملہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان دنوں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ شملہ میں تشریف فرما تھے اور خاکسار کو طلب فرمایا تھا۔ خاکسار سید انعام اللہ شاہ صاحب کی رفاقت میں حاضر ہوا تھا اور ہفتہ عشرہ خدمت اقدس میں گذارنے کی بے بہا نعمت سے مشرف ہوا تھا۔ حضورؓ اور حضور کے رفقاء اور خدام نواب محمد علی خاں صاحبؓ کے مہمان تھے۔ ان ایام میں بھی جب کوئی ایسے صاحب حضورؓ کی ملاقات کے لئے تشریف لاتے۔ جن کے لئے انگریزی میں بات چیت کرنا موجب سہولت ہوتا تو خاکسار کو ترجمانی کا ارشاد ہوتا۔ ایک موقعہ پر حضورؓ نے فرمایا۔ اس کی ترجمانی میں مجھے یہ اطمینان رہتا ہے کہ یہ میری بات اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور پھر وضاحت سے سمجھا دیتا ہے۔ حضورؓ کا اظہار خوشنودی خاکسار کے لئے بہت ہمت افزائی کا موجب ہوا۔ کیونکہ ترجمانی یوں بھی آسان نہیں ہوتی اور حضورؓ کی ترجمانی میں ایک تو ذمہ داری کا احساس شدید ہوتا۔ دوسرے حضورؓ پسند فرماتے تھے کہ مسئلہ زیر بحث کے ایک پہلو پر حضورؓ اپنا ارشاد مکمل فرمالیں تو ترجمہ کیا جائے جس سے لازم آتا تھا کہ نہ صرف حضورؓ کے ارشادات کا مفہوم پوری طرح ذہن میں آجائے۔ بلکہ حضورؓ کے استدلال کی ترتیب بھی ذہن میں محفوظ رہے۔ تیسرے حضورؓ خود انگریزی خوب سمجھتے تھے اور ترجمہ کے دوران میں ترجمان کو یہ احساس رہتا تھا کہ اگر کہیں مفہوم کی ادائیگی میں تفاوت ہوا تو حضورؓ فوراً فرمادیں گے میرا یہ مطلب نہیں۔

پبلسٹی کمیٹی کے اجلاسوں میں جو فیصلے ہوئے منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھا کہ ایک اخبار جاری کیا جائے۔ جس میں علاوہ خبروں کے جنگ کے مختلف پہلوؤں پر اور اس کے نتائج اور آئندہ پیش آنے والے حالات پر اہل دانش اور تدبیر کے نتائج فکر بھی شائع ہوں۔ خان صاحب شیخ عبدالعزیز صاحب پبلسٹی کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے اور پبلسٹی کے مختلف شعبوں کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے اپنے معاونین کے طور پر دو ایسے اصحاب کا انتخاب کر کے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا جو بعد میں علاوہ ان فرائض منصبی کی سرانجام دہی کے علم و ادب کے میدان کے بھی شہسوار ہوئے۔ اوّل حکیم احمد شجاع صاحب جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں پہلے ترجمان، پھر اسسٹنٹ سکریٹری اور پھر سکریٹری ہوئے۔ دوسرے سید افضل علی صاحب جنہوں نے تھوڑا عرصہ پہلے ہی ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔

ایک دلچسپ دیوانی مقدمہ | سیالکوٹ میں ہمارا رہائشی مکان محلہ نخاس میں تھا۔ اس محلے کی آبادی لوہاروں کی تھی۔ جن میں سے اکثر تو آہنگری پیشہ کرتے تھے لیکن بعض معمار تھے اور بعض ملازم تھے۔ ایک کنبے کے افراد نے جراحی کے اوزار بنانے میں اسقدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ ان کے تیار کردہ اوزاروں کی شہرت اور مانگ دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ آپس میں رشتے دار تھے۔ گویا سارا محلہ ایک وسیع کنبہ تھا۔ جیسے عام طور پر ایسے پیشہ وروں کے متعلق دیکھنے میں آیا ہے یہ سب لوگ بااخلاق دیندار، شریف کردار، پابند احکام شریعت، ہمدرد اور باوفا تھے۔ ہمارے ساتھ ان سب کا سلوک نہایت شریفانہ اور ہمدردانہ رہا۔ جب ستمبر ۱۹۰۴ء میں میرے والدین سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے تو ہمارے آپس کے تعلقات میں کچھ فرق نہ آیا۔ محلے والوں میں سے مستری اللہ دتا صاحب کا گھرانہ سرکردہ گھرانہ تھا۔ ان کا مکان لب سڑک تھا۔ اس کی تقسیم اس طور پر تھی کہ سڑک کی طرف (جس کا نام جنڈرالوالہ بازار تھا) نچلی منزل میں ان کی دو دکانیں تھیں۔ جن میں وہ آہنگری کا کام کرتے تھے ان کے پیچھے ان کا رہائشی مکان تھا جس کا دروازہ سڑک کی طرف نہیں بلکہ ساتھ والی گلی میں کھلتا تھا۔ دو دکانوں کی چھت رہائشی مکان کی اوپر کی منزل کے صحن کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کے گرد پردے کی دیوار تھی اور اس پر مختصر سی کوئی عارضی عمارت غسل خانہ وغیرہ کی بھی تھی۔ مستری صاحب کے تین فرزند مستری غلام حسین، مستری علی محمد اور مستری محمد علی صاحبان تھے۔ اور پھر آگے ان کی اولاد تھی۔ کثرتِ عیال کے ساتھ ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور کاروبار میں بھی وسعت ہوتی گئی۔ ایک مرحلے پر انہیں کچھ سرمائے کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے ایک دوست شیخ میراں بخش صاحب تھے جو ایک وقت میں ریاست جموں میں ایک معزز

عہدے پر فائز رہے تھے۔ ان کی رہائش محلہ دو دروازہ میں تھی لیکن وہ اکثر مستری صاحبان کی ملاقات کے لئے ان کی دوکان پر تشریف لایا کرتے تھے۔ اپنی ضروریات کے پیش نظر مستری صاحبان نے کچھ رقم شیخ میراں بخش صاحب سے قرض لیکر دوکانیں ان کے پاس رہن کر دیں۔ قبضہ مستری صاحبان کا ہی رہا لیکن دوکانوں کا کرایہ باقاعدہ شیخ صاحب کو ادا ہوتا رہا۔ شیخ صاحب کی وفات پر دوکانوں کا حق مرتہنی انکے صاحبزادے شیخ عبدالرحیم کے حصے میں آیا۔ یہ صاحب کچھ امیرانہ طبیعت کے تھے انہیں نقد روپے کی ضرورت پیش آئی اور انہوں نے مستری صاحبان سے مطالبہ کیا کہ رہن کی رقم ادا کرکے جائداد فک کرالیں۔ مستری صاحبان کے پاس رقم موجود نہ تھی۔ شیخ عبدالرحیم صاحب نے حق مرتہنی سردار تارا سنگھ صاحب کے پاس فروخت کر دیا۔ مستری صاحبان کو اس سے صدمہ ہوا کیونکہ جب تک مرتہن کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اب حق مرتہنی ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں چلا گیا جس سے حسنِ سلوک کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ نئے مرتہن نے انہیں دق کرنا شروع کیا۔ مقدمہ بازی شروع ہو گئی سردار تارا سنگھ صاحب نے دعویٰ دخل دائر کر دیا اور ان کے حق میں ڈگری ہو گئی۔ اجرائے ڈگری میں انہوں نے دوکانوں کا دخل لے لیا۔ مستری صاحبان نے دوکانیں خالی کر دیں اور بازار کے دوسری طرف کی دوکانوں کے عقب میں ایک کھلی جگہ کرایہ پر لے کر اور اس پر ایک عارضی شیڈ کھڑا کر کے وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ سردار تارا سنگھ صاحب کی غرض یہ تھی کہ مستری صاحبان کو دوکانوں کی چھت کے استعمال سے جو سہولت اور آسائش حاصل تھی اس سے محروم کر دیں اور وہ ایک خطیر رقم سردار صاحب کو قیمت کے طور پر ادا کر کے دوکانیں واپس لیں لیکن یہ غرض پوری نہ ہوئی۔ دوکانوں کا قبضہ تو انہوں نے لے لیا لیکن چھت پر مستری صاحبان کا قبضہ بدستور رہا۔ دوکانیں کرایہ پر بھی نہ دی جا سکیں۔ محلے میں سے کوئی انہیں لینے پر تیار نہ ہوا اور محلے سے باہر بھی یہ احساس تھا کہ سردار صاحب نے خواہ مخواہ ایک شریف خاندان کے لئے مشکل پیدا کی ہے۔ آخر سردار صاحب نے اپنے وکیل صاحب کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے اجرائے ڈگری کی صورت میں ایک درخواست پیش کر دی کہ اجرائے ڈگری ابھی تک نامکمل ہے۔ دوکانوں کا قبضہ تو مجھے مل گیا ہے لیکن چھت کا قبضہ نہیں ملا۔ چھت پر سے پردے کی دیوار اور غسل خانے وغیرہ کی عارضی عمارت گرا کر مجھے چھت کا قبضہ دلایا جائے۔ والد صاحب مستری صاحبان کی طرف سے وکیل تھے۔ اس مرحلے پر میں نے والد صاحب کے ساتھ سیالکوٹ پریکٹس شروع کی اور والد صاحب نے مستری صاحبان کی طرف سے اس درخواست کی جواب دہی میرے

سپرد کی۔ میں نے عذر داخل کیا کہ چھت اور دو کانیں علیحدہ علیحدہ نہیں دو کانوں کے دخل کی ڈگری ہوئی اُس ڈگری کے اجرائی میں دو کانوں کا دخل دلایا گیا اور بیلف نے رپورٹ کی کہ اجرائی مکمل ہو چکی ہے اس پر عدالت نے تکمیل اجرائی کی تصدیق کر کے مثل داخل دفتر کر دی۔ اگر ڈگری دار کو اس حکم پر اعتراض تھا تو اس حکم کی نظر ثانی کی درخواست کرتا یا اس کے خلاف اپیل کرتا۔ اپیل کی میعاد گذر جانے پر یہ حکم قطعی ہو گیا اب اجرائی ڈگری کے متعلق کوئی مزید کارروائی نہیں ہو سکتی دیوان سیتا رام صاحب نے عذر منظور کیا اور درخواست خارج کر دی۔ اس پر سردار صاحب نے نیا دعویٰ چھت کا دخل حاصل کرنے کیلئے دائر کر دیا اور ساتھ ہی حکمِ امتناہی حاصل کرنے کی درخواست دی کہ مدعا علیہ کو چھت کے استعمال سے روک دیا جائے۔ مدعا علیہم کی طرف سے اس کی پیروی بھی والد صاحب نے میرے سپرد کی۔ میں نے جواب دعویٰ میں عذر کیا کہ چھت دو کانوں سے الگ نہیں چھت کا دخل حاصل کرنے کیلئے علیحدہ دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ آرڈر نمبر ۲ قاعدہ نمبر ۲ ضابطہ دیوانی عارض ہے۔ یہ عذر قبول ہو کر دعویٰ خارج ہوا۔ سردار صاحب نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اپیل دائر کی۔ عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال رہا اور اپیل خارج ہوئی۔ مدعی نے چیف کورٹ میں اپیل کی۔ اس دوران میں میں لاہور جا چکا تھا۔ مستری غلام حسین صاحب لاہور تشریف لائے اور اپنی اور اپنے بھائیوں کی طرف سے مجھے وکیل کیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس مرحلے پر معاملے کی نزاکت کے پیشِ نظر ہمیں ایک قابل سنیئر ایڈووکیٹ اپنی طرف سے کھڑا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا میری طرف سے تمہیں پورا اختیار ہے جیسے تم چاہو کرو۔ میں میاں سر فضل حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسئول علیہم کی طرف سے سنیئر وکیل ہوں۔ انہوں نے فرمایا معاملہ دلچسپ ہے اور مسئول علیہم کا موقف معقول معلوم ہوتا ہے۔ تم خود ہی کیوں پیش نہیں ہو جاتے۔ میں نے عرض کیا مسئول علیہم میرے سابق محلہ دار ہیں اور مجھے اس معاملے میں گویا ذاتی دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرحلے پر مناسب احتیاط کر لی جائے۔ انہوں نے پیروی کرنا قبول فرما لیا۔ اور میں نے دوسرے دن ایک مفصل ٹائپ شدہ مقدمہ کا بریف ان کی خدمت میں پیش کر دیا جس کے بعد انہیں کسی مزید تیاری کی زحمت اٹھانا نہ پڑی۔ اپیل کی سماعت مسٹر جسٹس مارٹینو کے اجلاس میں ہوئی۔ اپیلانٹ کے وکیل کی بحث سننے کے بعد جج نے اپیل خارج کر دی۔ ہماری طرف سے بحث کی نوبت نہ آئی۔ مستری غلام حسین صاحب طبعاً بہت خوش تھے۔ لیکن میرے لئے اس قضیئے کا یوں طے پا جانا کئی وجوہ سے بہت اطمینان کا موجب تھا۔

ایک تو مجھے شیخ عبدالرحیم صاحب کی حرکت ناپسند تھی کہ انہوں نے اپنے والد صاحب کے دوستانہ تعلقات کا جو مستری صاحبان کے ساتھ تھے پاس نہ کیا اور محض اپنے اصراف کی خاطر دو کانات سردار نارا سنگھ کے حوالے کر دیں۔ سردار نارا سنگھ نے حق مرتہنی صرف اس نیت سے خرید کیا تھا کہ مستری صاحبان کو دق کر کے ان سے کوئی بڑی رقم وصول کریں۔ مستری صاحبان اس مشکل میں تھے کہ اگر دو کانیں ان کے ہاتھ سے نکل جاتیں تو ان کے رہائشی مکان کا صحن غائب ہو جاتا اور اس سے متعلق تمام سہولت اور آسائش ختم ہو جاتی۔ اگر سردار نارا سنگھ دو کانوں کو گرا کر دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت ان کی جگہ کھڑا کر دیتے تو مستری صاحبان کا رہائشی مکان قابلِ رہائش نہ رہتا۔ مستری صاحبان بے بس تھے۔ اس مشکل سے رہائی کی ان کے لئے قانونی صورت کوئی نہیں تھی۔ سردار نارا سنگھ نے انہیں دق کرنے کے لئے جو رستہ اختیار کیا اسی سے اللہ تعالیٰ نے مستری صاحبان کی مخلصی کا رستہ نکال دیا۔ سردار نارا سنگھ جب اجرائے ڈگری میں دو کانوں کا دخل لے چکے تو انہیں کسی مزید قانونی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی اگر وہ دو کانوں کے اوپر عمارت بنانے کے لئے نقشہ تیار کرواتے اور بلدیہ سے اجازت طلب کرتے تو مستری صاحبان کو دو کانوں کی چھت پر حق آسائش ثابت کرنے کیلئے عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور ان کے لئے یہ مرحلہ بہت دشوار ثابت ہوتا۔ لیکن سردار صاحب نے مستری صاحبان کو دق کرنے کی نیت سے اجرائے ڈگری کی کارروائی کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی اور اپنے رستے میں خود مشکلات پیدا کر لیں۔ چیف کورٹ کے فیصلے کے نتیجے میں سردار نارا سنگھ صاحب کی ناواجب کارروائیوں کا سدباب ہو گیا اور آخر انہوں نے جو قیمت شیخ عبدالرحیم صاحب کو ادا کی تھی مستری صاحبان سے وصول کر کے دو کانیں ان کے نام منتقل کر دیں۔

جس دن چیف کورٹ میں اپیل کی سماعت ہوئی والد صاحب بھی اتفاق سے لاہور میں تشریف فرما تھے۔ عدالت سے واپسی پر جناب مستری غلام حسین صاحب نے چاہا کہ شام کے کھانے کی دعوت ان کی طرف سے قبول کی جائے۔ وہ میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور مہمان کی طرف سے میزبان اور اس کے دیگر مہمانوں کی دعوت مجھے کچھ تکلف محسوس ہوا اور میں نے انہیں ٹال دیا۔ پھر انہوں نے ہم سب کو سینما دیکھنے کی دعوت دی۔ ہمارے مکان کے قریب ہی ایک بہت بڑی تھیٹر کی عمارت تھی جس میں سینما کی تصویریں دکھائی جاتی تھیں۔ احمدیہ جماعت کو سینما دیکھنے کی ابھی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن والد صاحب نے فرمایا مجھے سینما کے ساتھ کوئی رغبت نہیں۔ مستری صاحب کی دونوں تجاویز پر عمل نہ ہو سکا۔ والد صاحب نے فرمایا بجائے سینما دیکھنے کے شاہی مسجد کے جنوبی طرف والے

میدان میں نماز مغرب ادا کریں۔ کچھ سیر بھی ہو جائے گی اور مستری صاحب کے مقدمے میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ کے شکر کا موقعہ بھی میسر آ جائے گا۔ والد صاحب کی اس تجویز کی تہ میں شاید یہ خواہش بھی ہو کہ اس موقعہ پر ہم سب اس مقام کے قریب نماز ادا کریں جہاں انہوں نے لاہور میں اپنی طالب علمی کے زمانے کا اکثر حصہ اس حالت میں گذارا تھا کہ کسی ایک وقت بھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا۔ اس زمانے میں والد صاحب کی رہائش اورینٹل کالج کے ہوسٹل میں ہوا کرتی تھی جو حضوری باغ کے گرد کے حجروں میں تھا۔ ان حجروں کے عقب کے اس میدان کی طرف کھلتے تھے جس میں والد صاحب نے نماز مغرب ادا کرنا تجویز کیا۔ چنانچہ مستری غلام حسین صاحب، سید انعام اللہ شاہ صاحب، سید افضل علی صاحب، چوہدری بشیر احمد صاحب اور میں نے والد صاحب کی اقتداء میں نماز مغرب اس مقام پر ادا کی جہاں ان کی خواہش تھی۔ نماز ختم ہونے پر ہم نے دیکھا کہ ٹبّی کی طرف آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ ہم جلد اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹے اور قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ سینما کی عمارت تمام کی تمام آگ کی لپیٹ میں ہے۔ اس وقت تک آگ کے شعلے اسقدر بلند ہو رہے تھے کہ ارد گرد کی تمام عمارتیں روشن ہو رہی تھیں اور حرارت اسقدر تھی کہ سو سو گز تک برداشت نہ ہو سکتی تھی۔ جب عمارت میں آگ شروع ہوئی سینما جاری تھا اور عمارت تماش بینوں سے بھری ہوئی تھی۔ تماش بینوں کو بڑی سراسیمگی اور ہراس کی حالت میں بھاگنا پڑا۔ آگ کے شعلوں کی روشنی ہمارے مکان تک آتی تھی۔ نصف شب کے بعد کہیں جا کر آگ کے شعلے دھیمے ہوئے اور آگ قابو میں آئی۔ دوسرے دن دیکھا کہ حرارت کی شدت سے مسمار شدہ عمارت کے بھاری آہنی گارڈر لچک کر نیچے گر چکے تھے۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں میری طبیعت میں بڑے زور سے خیال پیدا ہوا کہ گرمیوں کے موسم میں اگر رہائش کا انتظام شہر سے باہر کسی کھلی جگہ ہو جائے تو نسبتاً آرام دہ ہو گا۔ انہیں دنوں اخبار میں ایک اشتہار دیکھا کہ ڈیوس روڈ پر ایک بنگلہ چھ مہینے کے لئے بارعایت کرائے پر مل سکتا ہے۔ اس کے کرایہ دار ایک رئیس زادے تھے جو چیفس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کے چھوٹے بھائی بھی وہیں تعلیم پاتے تھے اور ان کے ساتھ ہی بنگلے میں رہتے تھے۔ اب دونوں بھائی چیفس کالج سے تعلیم ختم کر کے جانے والے تھے۔ بنگلے کے کرایہ داری کی میعاد میں ابھی چھ ماہ باقی تھے اس عرصے کے لئے وہ بنگلے کو کرایہ پر دینے کے خواہشمند تھے اور رعایتی کرایہ لینے پر رضامند تھے۔ سید افضل علی صاحب نے جب پبلسٹی کمیٹی میں کام شروع کیا تو انہوں نے اپنی رہائش کا علیحدہ انتظام کر لیا تھا۔ میں نے انہیں تحریک کی کہ وہ میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔ انہیں کچھ تامل تھا لیکن رضامند ہو گئے۔ ڈیوس روڈ سے ہمارے

دفاتر دور تھے اسلئے سواری کا انتظام ضروری تھا۔ ہم نے ایک پرانی ہلکی گاڑی خریدی۔ سید افضل علی صاحب کے ماموں سید فیض العسکری صاحب اس وقت فیروزپور میں تحصیلدار تھے انہوں نے مہربانی سے ایک عمدہ گھوڑا بھیج دیا اور ہماری سواری کا انتظام ہوگیا۔ یکم اپریل سے ہم ۲۶ ڈیوس روڈ میں منتقل ہوگئے۔ یہ بنگلہ سڑک سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر تھا اور اس کے گرد فراخ قطعہ بطور باغیچے وغیرہ کے تھا...

حکومت کے خلاف سیاسی مظاہرے اور مارشل لا کا نفاذ

۶ راپریل کو لاہور میں اور پنجاب کے بعض دیگر شہروں میں حکومت کے خلاف سیاسی مظاہرے ہوئے جلوس نکلے اور بعض مقامات پر پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوا۔ لاہور میں طلباء کا ایک جلوس انارکلی اور نیلے گنبد سے گذر کر ٹھنڈی سڑک پر پہنچا انارکلی بازار میں جلوس کا جھنڈا شیخ اعجاز احمد صاحب بلند کئے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچنے سے پہلے جھنڈا ان سے مسٹر اے ایم جان نے لے لیا۔ ٹھنڈی سڑک پر پولیس نے جلوس کو روکنا چاہا۔ اس پر تکرار ہوگیا اور پولیس نے گولی چلائی ایک گولی مسٹر اے ایم جان کو گھٹنے کے نیچے لگی۔ جلوس منتشر ہوگیا لیکن عوام میں جوش اور ہیجان کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔ جب دوسرے شہروں سے بھی ایسی خبریں آنا شروع ہوئیں تو جوش اور بھی بڑھ گیا۔ پبلک جلسے اور جلوس چاروں طرف شروع ہوگئے۔ جب پنجاب کے بہت سے شہروں میں امن عامہ کی حالت مخدوش ہوگئی تو مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

جنرل ڈائر کے وحشیانہ احکام جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد کھوکھلی کر دی

۱۳ راپریل کو خاکسار کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ارشاد موصول ہوا کہ چند گھنٹوں کے لئے مشورے کے لئے قادیان حاضر ہوں۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ ان دنوں خاکسار کے پاس تشریف فرما تھے۔ میں ۱۴ر کی صبح کی گاڑی قادیان گیا اور عرض کرتا گیا کہ رات کی گاڑی سے انشاء اللہ واپس آجاؤں گا۔ اسی دن امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا خونیں واقعہ ہوگیا۔ لاہور میں بھی مارشل لاء کا نفاذ ہوگیا۔ بہت سی پابندیاں نقل وحرکت پر عائد کی گئیں۔ کرفیو کا عمل جاری ہوگیا، شہر کے اندر زندگی دوبھر ہوگئی سول سٹیشن میں چونکہ بہت سے یورپین اور اینگلو انڈین بھی رہتے تھے اسلئے وہاں بہت کم پابندیاں عائد کی گئیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے پر کڑی پابندی عائد کی گئی۔ ہر بات کے لئے مارشل لاء کے افسروں سے پاس حاصل کرنا ضروری ہوگیا۔ امرتسر میں تو جلیانوالہ باغ کے حادثے کے علاوہ بہت سے اور مظالم روا رکھے گئے جن کی غرض عقوبت کے علاوہ تذلیل بھی تھی۔ ان میں سے ایک رینگنے کا حکم بھی تھا۔ وہاں کے فساد میں ایک اینگلو انڈین خاتون بیگناہ قتل ہوئی تھی۔ بیشک یہ ایک وحشیانہ فعل تھا اور

قانون کے ماتحت موجب تعزیر تھا۔ لیکن علاوہ مجرموں کی تعزیر کے جنرل ڈائر نے حکم دیا کہ جس بازار میں یہ جرم ہوا تھا وہاں سے جو ہندوستانی گذرے وہ ہاتھ پاؤں پر رینگتا ہوا گذرے۔ یہ حکم اس بازار کے رہنے والوں پر بھی حاوی تھا جو اپنے مکانوں سے نکلتے وقت اور واپس آتے وقت اس حکم کی پابندی پر مجبور تھے اور اس ذلت اور رسوائی کو برداشت کرنے کے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں تھا۔ برطانوی استبداد سے ہندوستان کو آزادی تو ۲۸ سال بعد حاصل ہوئی لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء اور خصوصاً جنرل ڈائر کی وحشیانہ کارروائیوں نے ہندوستان سے برطانوی راج کی صف لپیٹ دی۔ مارشل لا کے دوران جو نہایت ذلت آمیز امتیاز گورے اور کالے کے درمیان کیا گیا وہ ہندوستانی دلوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا۔ بیشک ہنٹر کمشن نے اپنی رپورٹ اور سفارشوں سے ہندوستانیوں کے زخمی اور آزردہ دلوں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اب ہندوستانی برطانیہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے اور نباہنے کے لئے تیار تو تھے لیکن آزادی اور مساوات کی سطح پر نہ کہ غلامی اور محکومیت کی بناء پر۔

میں ۱۴ اپریل کو قادیان حاضر ہوا۔ اور اسی شام بٹالہ واپس آگیا لیکن اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ بٹالہ اور امرتسر کے درمیان ریلوے لائن توڑ دی گئی ہے۔ اور ریل گاڑی کا سلسلہ آمد و رفت بند ہو گیا ہے۔ میں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر حیران کھڑا تھا کہ حسن اتفاق سے مکرمی شیخ فضل الحق صاحب تشریف لے آئے اور کیفیت معلوم کر کے ریلوے کے ایک افسر سے ملے اور دریافت کیا کہ مجھے امرتسر پہنچانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ انہوں نے فرمایا اگر رات کے دوران میں انہیں فوری طور پر کہیں جانا نہ پڑ گیا تو صبح ہونے ہی وہ ٹرالی پر امرتسر جائیں گے اور مجھے ساتھ لیتے جائیں گے۔ مجھے فجر کے وقت اسٹیشن پر پہنچ جانے کو کہا۔ شیخ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اندریں حالات آپ میرے مکان پر چلیں اور وہیں قیام کریں صبح جو صورت ہو گی اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ شیخ صاحب کے دولت کدے پر میں نے بہت آرام سے رات بسر کی۔ فجر کی نماز کے وقت انہوں نے فرمایا کہ آدھی رات کے قریب ان ریلوے افسر صاحب کا پیغام آیا تھا کہ انہیں فوری طور پر روانہ ہونا پڑا ہے اسلئے افسوس کرتے ہیں کہ آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکے۔ اب آپ آرام سے تیار ہوں۔ ناشتے کے بعد اسٹیشن پر جا کر صورت حال معلوم کریں گے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریل گاڑی تو ابھی تک بند ہے لیکن مسافر ٹم ٹم پر امرتسر جا رہے ہیں۔ میں بھی ایک ٹم ٹم پر سوار ہو گیا۔ ہم صبح ۹ بجے کے قریب بٹالہ سے روانہ ہوئے ۱۲ بجے دوپہر کے لگ بھگ ویرکا سے گذرے۔ امرتسر کی جانب سے لوگ کثیر تعداد میں پیدل اور ہر قسم کی سواری پر سراسیمگی

کی حالت میں آ رہے تھے۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے خالی ہاتھ اور گھریلو سامان اٹھائے عجیب پریشانی کی کیفیت میں چلے آتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ امرتسر میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ اور لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ ایک صاحب نے جو ٹم ٹم پہ آ رہے تھے مجھے پہچان لیا اور بڑی ہمدردی سے نہایت الحاح کے ساتھ کہا۔ برائے خدا آگے مت جاؤ امرتسر میں کل فوج نے بڑی بے رحمی سے گولی چلا کر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اب شہریوں پہ ہر قسم کا ظلم توڑا جا رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پہ کوڑے لگتے ہیں اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے کہا مجھے بہر صورت لاہور پہنچنا ہے اور امرتسر سے گذرنے کے بغیر چارہ نہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سفر جاری رکھا۔ امرتسر پہنچ کر ہم سیدھے ریلوے اسٹیشن پہ گئے شہر کے اندر جانے پہ پابندی تھی اور ہمیں شہر کے اندر داخل ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسٹیشن پہ معلوم ہوا کہ لاہور کوئی گاڑی نہیں جا رہی کیونکہ امرتسر اور لاہور کے درمیان بھی ریل کی لائن توڑ دی گئی ہے۔ یہاں سے بھی مسافر ٹم ٹم پر لاہور جا رہے تھے میں بھی ایک ٹم ٹم پہ سوار ہو گیا اور سواریوں کی تعداد پوری ہونے پہ ہم روانہ ہو گئے۔ رستے میں ایک مقام پر گھوڑے کو ستانے کے لئے چند منٹ ٹھہرے۔ پینے کے لئے پانی میسر آ گیا۔ وہی بصد شکر پی لیا۔ صبح ناشتے کے بعد یہی چند گھونٹ حلق سے اترے تھے۔ پانچ بجے شالامار پہنچے یہاں پولیس نے روک دیا کہ لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے اور باہر سے آنے والوں کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا کہ میری رہائش لاہور میں ہے میں باہر سے آنے والا نہیں۔ پولیس افسر نے کہا ٹم ٹم کو تو آگے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تم چاہو تو پیدل چلے جاؤ لیکن چھ بجے سے کرفیو کا عمل شروع ہو جائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے باہر پایا جائے گا اسے کوڑے لگیں گے۔ میرے ساتھ کوئی زیادہ سامان تو تھا نہیں فقط ایک ہلکا سا بیگ تھا۔ اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ سول اسٹیشن کرفیو کی حدود سے باہر ہے۔ یہ سہولت ضرور تھی کہ شالامار سے آتے ہوئے ۲۶ ڈیوس روڈ ریلوے پل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا پھر بھی یہ پریشانی تھی کہ تین چار میل کا فاصلہ بہت جلد طے کرنا لازم ہے۔ میں باغبانپورہ سے کچھ آگے نکلا تھا کہ ایک صاحب نے جو شہر کی جانب سے اپنے تانگے کو بہت تیز چلاتے ہوئے آ رہے تھے مجھے بلند آواز سے ٹھہرو ٹھہرو کہہ کر روکا اور اپنے تانگے کو بھی روکا۔ میں نے خیال کیا شائد میری حالت سے متاثر ہو کر مجھے تانگے پہ بٹھا کر اپنے ہاں باغبانپورے لے جانا چاہتے ہیں کہ رات ہمارے ہاں بسر کر لو صبح لاہور چلے جانا لیکن انہوں نے بدحواسی میں فقط اتنا کہا تم پاگل ہوئے ہو اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ آگے مت جاؤ۔ لاہور میں تو بڑی سختی ہو رہی ہے۔ یہیں کہیں ٹھکانا تلاش کرو۔ میں نے ان سے

تو کچھ نہ کہا آگے چلدیا۔ لیکن دل میں حیران ہوا کہ ان کی نیت تو ہمدردی کی تھی لیکن عملاً میرے نہایت قیمتی پانچ منٹ ضائع کئے۔ جب میں ریلوے کے پل پر پہنچا تو پل کی چڑھائی تیزی سے چڑھنے کی کوشش میں میرا پسینہ بہنا شروع ہوگیا یہاں تک کہ میرے سر سے پسینے کے قطرے بارش کی طرح گرنے لگے۔ پل گذر کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ غروب آفتاب میں ابھی کچھ وقفہ ہے اور میں اب مکان کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ فوج یا پولیس کا پہرہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گڑھی شاہو سے گذر کر میں چودھری شہاب الدین صاحب کی رہائش گاہ "المنازل" کے عقب میں کھیتوں میں سے ہولیا اور اپنے مکان پر پہنچ گیا۔ عین اس وقت والد صاحب نے مغرب کی نماز کی امامت شروع کی تھی۔ جلد وضو کرکے میں نماز میں شامل ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔

والدہ بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ میرے خیریت سے پہنچنے سے انہیں بہت اطمینان ہوا۔

مارشل لا کے ہندوستانیوں کی تذلیل کرنے والے احکام

مارشل لا کے ماتحت ایک حکم یہ جاری ہوا کہ سب ہندوستانی اپنی موٹریں اور گاڑیاں مارشل لا کے محکمے کے سپرد کر دیں یہ حکم بھی ایک امتیازی حکم تھا۔ اور تمیز کی بناء افسر اور رعایا نہیں تھی۔ اگر محض حاکم اور محکوم میں تمیز کی جاتی تو اس حکم میں پھر بھی سختی کا پہلو تو قائم رہتا لیکن تذلیل اور تحقیر کا پہلو اتنا نمایاں نہ ہوتا۔ یہ حکم بھی صرف ہندوستانیوں پر حاوی تھا۔ یورپین اور اینگلو انڈین اس سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً ایک ہندوستانی ڈپٹی کمشنر یا کمشنر تو مجبور تھا کہ اپنی موٹر یا اپنی گاڑی حوالہ کر دے۔ اور کرائے کے تانگے پر دفتر جائے لیکن اس کے دفتر کا اینگلو انڈین سپرنٹنڈنٹ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جہاں چاہتا جا سکتا تھا۔ سر شادی لال جو ان دنوں چیف کورٹ کے جج تھے اور بعد میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے اپنی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر مارشل لا کے افسر اعلیٰ کرنل جانسن کے دفتر میں گئے جو پنجاب کلب میں قائم کیا گیا تھا اور کرنل جانسن سے کہا میں عدالت اعلیٰ کا جج ہوں اور مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے موٹر کی ضرورت ہے مجھے اس حکم سے مستثنیٰ کیا جائے۔ کرنل جانسن نے کہا مجھے کسی کی ضرورت سے غرض نہیں میرا مقصد امن کا قیام ہے۔ اس غرض کے حصول کے لئے پیش آمدہ حالات میں ضروری ہے کہ سب موٹر گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں حوالہ کی جائیں۔ آپ اپنی گاڑی لے آئے ہیں اب اسے حوالہ کر دیں۔ سر شادی لال صاحب نے کہا بہت اچھا میں عدالت میں پہنچ کر گاڑی بھیج دوں گا۔ کرنل جانسن نے کہا گاڑی تو اب یہیں رہے گی آپ جیسے چاہیں عدالت چلے جائیں۔

ہمارے پاس بھی ایک پہیوں پر حرکت کرنے والی سواری تھی جو قانوناً گاڑی کی تعریف میں آتی تھی۔ ہم نے سائیس سے کہہ دیا اسے لے جاؤ اور حوالے کر دو۔ اسے یہ گاڑی شہر کے اندر واٹر ورکس کے تالاب

کے قریب والی مارشل لاء کی چوکی پر حوالے کرنا تھی۔ ہمیں ہمارے دفاتر نہیں پہنچا کر سائیس گاڑی چوکی پر لے گیا۔ مارشل لاء افسر نے بڑی ترشی کے لہجے میں پوچھا تم کیوں یہاں آئے ہو؟ اس نے کہا حضور گاڑی حوالے کرنے آیا ہوں۔ پوچھا کہاں ہے گاڑی؟ سائیس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا افسر نے گاڑی کی طرف دیکھا اور غصے سے کہا یہ گاڑی ہے؟ بھاگو اسے لیکر اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہمارا ہدیہ جبری ہی سہی بڑی حقارت سے رد کر دیا گیا۔ اور ہمیں بفضل اللہ یہ سہولت جیسی بھی تھی مارشل لاء کے دوران میں بھی حاصل رہی۔ فالحمد للہ۔ اگر گاڑی ضبط ہو جاتی تو ڈیوس روڈ پر رہائش جاری رکھنا نہایت مشکل ہو جاتا گرمی کی شدت ہو رہی تھی اور کرائے کی سواری کا ملنا مشکل تھا۔ ڈیوس روڈ سے سید افضل علی صاحب کا دفتر بھی دو میل سے زائد فاصلے پر تھا اور میرا دفتر بازار جج محمد لطیف میں تو تین میل سے بھی زائد فاصلے پر تھا۔ اگر رہائش شہر کے اندر پہلے مکان میں پھر منتقل کی جاتی تو مارشل لاء کی پابندیوں کی وجہ سے وہاں زندگی دوبھر ہو جاتی۔

ایک اور طریق سیاسی دباؤ کا اور قومی قیادت کو حکومت کی نظروں میں معتوب ظاہر کرنے کا یہ اختیار کیا گیا کہ جن شخصیتوں کو حکومت مشتبہ شمار کرتی تھی ان کے مکانوں کی دیواروں پر لکڑی کے تختے آویزاں کئے گئے۔ جن پر مارشل لاء کے اعلانات اطلاع عام کیلئے چسپاں کئے جاتے۔ ان تختوں اور اعلانوں کی حفاظت صاحب مکان کے ذمے ہوتی۔ اگر شرارتاً بھی کوئی شخص ان تختوں یا اعلانوں کو نقصان پہنچاتا تو صاحب مکان مستوجب تعذیر گردانا جاتا۔ دن کے وقت تو بھلا صاحب مکان بورڈ کے پاس کوئی پہرہ دار مقرر کر دیتا لیکن رات کے اندھیرے میں اس فرض سے سرخروئی حاصل کرنا مشکل امر تھا۔ میاں فضل حسین صاحب کے بنگلے کے باہر بھی یہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے تو یہ ترکیب کر لی کہ بورڈ اس طریق سے آویزاں کیا جائے کہ جب چاہیں دونوں طرف کی رسیوں کو کھینچ کر بورڈ کو زمین سے ۹ - ۱۰ فٹ کی بلندی تک اوپر کھینچ لیا جائے۔ دن بھر تو بورڈ اتنی بلندی پر لٹکا رہتا کہ گذرنے والا اگر چاہے تو اعلانات کو آسانی سے پڑھ سکے اور غروب آفتاب کے بعد اسے بلند کر دیا جاتا۔

نقل و حرکت پر پابندی اتنی کڑی ہو گئی کہ بغیر اشد ضرورت کے کوئی شخص سفر پر آمادہ نہ ہوتا۔ مجھے ایک دن لاہور سے ڈسکہ جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ پاس حاصل کیا۔ گوجرانوالے تک ریل کا سفر تھا پھر سڑک کا۔ اگرچہ گوجرانوالہ شہر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی لیکن سٹیشن سے آتے اور جاتے سول سٹیشن سے گذرنا لازم تھا اور وہاں پاس دکھانا اور اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ واپسی پر میں مارشل لاء کے دفتر میں گیا۔ مارشل لاء افسر انگریز فوجی افسر تھا۔ بنگلے کے برآمدے کے پہلو میں اس کا دفتر تھا۔ چند مرد

عورتیں اپنے پاس پر تصدیقی مہر حاصل کرنے کے منتظر تھے۔ مئی کا مہینہ تھا، دوپہر کا وقت تھا، گرمی کی شدت تھی، باری آنے پر میں اندر گیا۔ فوجی افسر نے کوئی حیل حجّت نہ کی جو کچھ ضروری تھا خاموشی سے کر کے پاس واپس میرے حوالے کر دیا۔ اگرچہ میں تین سال انگلستان میں رہ چکا تھا۔ پھر بھی یہ امر میری طبیعت پر بہت شاق گذرا کہ وہ نوجوان افسر جو بظاہر شریف طبع معلوم ہوتا تھا کرسی پر بالکل ننگا بیٹھا ہوا تھا۔ صرف کپڑے کا ایک ٹکڑا پانی میں بھیگا ہوا ناف کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اسی حالت میں مرد بھی اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور مستورات بھی۔

مارشل لاء ٹریبونلز میں لیڈران کے خلاف سنگین مقدمات

مارشل لاء کے قواعد کی خلاف ورزی پر تو فوراً سرسری کارروائی ہو کر کوڑے یا جرمانہ یا قید کی سزا دیدی جاتی تھی۔ لیکن مارشل لاء کے جاری ہونے سے عین پہلے جو فسادات ہوئے تھے ان کے سلسلے میں مفروضہ جرائم کی سزا دہی کے لئے مارشل لاء ٹریبونلز قائم کئے گئے تھے۔ ٹریبونل نمبر ایک کے سامنے جو کیس رکھا گیا اس میں لالہ ہرکشن لال صاحب، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ صاحب اور چھ سات اور معزز زین زمرہ ملزمان میں شامل تھے۔ ان میں دو مسلمان ملزمان سردار حبیب اللہ خاں صاحب اور سید محسن شاہ صاحب بھی تھے۔ ملزمان پر علاوہ دیگر الزامات کے ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے اور جنگ پر اکسانے کا الزام بھی تھا جس کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی۔ ٹریبونل کے صدر مسٹر جسٹس لیزلی جونز تھے۔ ان کے ساتھ ایک انگریز سیشن جج مسٹر ہیریسن اور ایک ہندوستانی سب جج شیخ دین محمدؒ تھے۔ سب ملزمان زیر حراست تھے۔ ان مارشل لاء کی عدالتوں میں سرکار کی طرف سے جو وکلاء پیروی کرتے تھے ان میں خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بھی تھے جو اُن دنوں لائل پور میں سرکاری وکیل تھے اور وہاں سے بلائے گئے تھے۔

سردار حبیب اللہ خان اور سید محسن شاہ صاحبان کیطرف سے مارشل لاء ٹریبونل میں پیروی

ٹریبونل نمبر ا کے اجلاس شروع ہونے کو تھے کہ مسٹر محمد حسن صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ سردار حبیب اللہ خاں صاحب کی والدہ محترمہ بہت پریشان ہیں۔ عام طور پر وکلاء مارشل لاء کی عدالتوں میں ملزمان کی طرف سے پیروی کرنے سے خائف ہیں۔ انہوں نے سردار حبیب اللہ خانصاحب کی طرف سے مسٹر مورٹن کو وکیل کیا ہے۔ لیکن وہ ضعیف ہونے کے علاوہ اردو اچھی طرح نہیں سمجھتے اور انہیں ایک قابل جونیر کی ضرورت ہے۔ سردار صاحب کے بھائی مسٹر نو کرامت میرے پاس آئے تھے۔ اور کہتے تھے ان کی والدہ محترمہ چاہتی ہیں کہ میں تم سے کہوں کہ تم سردار صاحب کی طرف سے مسٹر مورٹن کے ساتھ لبطور جونیر کام کرو۔ میں نے کہا میں ہر طرح خدمت کے لئے تیار ہوں۔

لیکن میں علاوہ جونیر ہونے کے پریکٹس کا زیادہ تجربہ نہیں رکھتا۔ وہ اچھی طرح سوچ لیں کہ کیا میری بجائے کسی زیادہ تجربہ کار وکیل کا انتخاب بہتر نہ ہوگا۔ مسٹر محمد حسن نے کہا تم پر انہیں اعتماد ہے اور ساتھ ہی یہ بھی دقت ہے کہ زیادہ تجربہ کار وکلاء میں سے کوئی پیروی کے لئے تیار بھی نہیں۔ سب ڈرتے ہیں کہ خود کسی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ تم جو مناسب فیس چاہو انہیں منظور ہوگی۔ میں نے کہا میں اپنے تعلقات کی وجہ سے فیس تو خود تجویز نہیں کرنا چاہتا جو وہ مناسب سمجھیں تجویز کر دیں مجھے عذر نہ ہوگا۔ مسٹر محمد حسن صاحب نے خود ہی بات چیت کر کے فیس تجویز کی اور میں نے بلا تامل ان کی تجویز منظور کر لی۔

لالہ ہرکشن لال صاحب | لالہ ہرکشن لال صاحب سے میرا ذاتی تعارف نہ تھا۔ ٹربیونل کی کارروائی کے دوران میں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا رہا جس کے نتیجے میں میرے دل میں ان کی بڑی عزت قائم ہوگئی باقی ملزمان کے ساتھ وہ بھی عدالت میں لائے جاتے۔ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتے جیب سے کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ عدالت کی کارروائی کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوتے نہ کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرتے۔ کارروائی ختم ہونے پر باقی ملزمان کے ساتھ اٹھ کر چلے جاتے۔ ان کے چہرے پر کسی وقت بھی کوئی آثار پریشانی یا ملال کے دیکھنے میں نہ آتے۔ جہاں تک آپ کا تعلق تھا ایسے معلوم ہوتا کہ عدالت کی تمام کارروائی ایک کھیل ہے جس میں انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اسے تضیع اوقات خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ صاحب | ڈاکٹر گوکل چند نارنگ صاحب کو میں کسی قدر جانتا تھا۔ قابل وکیل تھے۔ چیف کورٹ میں کسی حد تک ناموری حاصل کر چکے تھے۔ آریہ سماج کے ایک ممتاز رکن شمار کئے جاتے تھے۔ سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ لاہور کے فسادات میں ان کا ذکر اس رنگ میں آتا رہا تھا کہ ان ایام میں انہوں نے قیام امن میں سعی کی اور ایک دو مقامات پر شاید کسی پولیس افسر ہی کے گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس کو روکنے کی کوشش کی اور واپسی کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ بھی ملزمان میں شامل تھے۔ عدالت کی کارروائی کے دوران میں طبعاً بہت دلچسپی لیتے رہے اور اپنی صفائی خود کرتے رہے۔ ان کی جائز کوشش یہی تھی کہ استغاثے کی شہادت سے ہی یہ امر ثابت کر دکھائیں کہ ایام زیر بحث میں ان کی تمام تر سعی پولیس اور حکام کے ساتھ قیام امن میں تعاون اور تائید کی تھی اور ان کا دامن ہر قسم کی باغیانہ اور مفسدانہ سرگرمیوں کے دھبے سے پاک رہا۔

استغاثے اور عدالت کی توجہ زیادہ تر ان ملزمان کی طرف تھی جو باغیانہ سرگرمیوں کے سرغنہ گردانے گئے تھے۔ سردار حبیب اللہ خان صاحب اور سید محسن شاہ صاحب کا ذکر کسی جلسے میں شرکت یا تقریر کرنے

کے تعلق میں کبھی آ جاتا تھا۔ مسٹر مورٹن کی رائے تھی اور مجھے اس سے اتفاق تھا کہ ہمیں بے تعلق بحرح کرکے اپنے موکلان کو عدالت کے نوٹس میں نہیں لانا چاہیئے۔ جہاں کسی امر کی وضاحت کے ان کے حق میں جانے کا امکان ہوتا مسٹر مورٹن یا میں ایک دو سوال کرکے وضاحت کرا دیتے۔ سردار صاحب اور سید صاحب کو بھی کوئی خواہش ناموری حاصل کرنے کی نہ تھی۔ عدالت کی کاروائی کے متعلق شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ توقع سے زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ چار پانچ دن کے بعد مسٹر محمد حسن صاحب نے مجھ سے کہا کہ عدالت کی کاروائی لمبی ہو رہی ہے۔ کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ سید محسن شاہ صاحب کی وکالت بھی اپنے ذمے لے لو۔ اس سے تمہارے کام اور تمہاری ذمہ داری میں کوئی زیادہ اضافہ نہیں ہو گا۔ اگر تم رضامند ہو جاؤ تو تمہاری موجودہ روزانہ فیس سردار صاحب اور سید صاحب مل کر ادا کر دیا کریں۔ اس طرح سردار صاحب کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں نے ان کی تجویز کو خوشی سے قبول کر لیا۔ عدالت کی کاروائی اندازاً نصف تک پہنچی ہو گی کہ مسٹر محمد حسن صاحب نے پھر تجویز کی کہ اب بقیہ عرصہ کیلئے تم نصف فیس پر کام کرنا منظور کر لو۔ میں نے یہ ترمیم بھی بلا تامل قبول کر لی خصوصاً اس لئے بھی کہ سید محسن شاہ صاحب پر مقدمہ کی کاروائی ناقابل برداشت بوجھ ہو رہی تھی۔ علاوہ مقدمے کی پریشانی اور متعلقہ اخراجات کے ان کی پریکٹس جو ان کا ذریعہ معاش تھی بالکل بند تھی۔ سردار صاحب کا انحصار پریکٹس پر نہیں تھا لیکن ان پر بھی اخراجات بار ہو رہے تھے۔ آخر عدالت کی کاروائی اختتام کو پہنچی اور ٹریبونل نے اپنا فیصلہ سنایا۔ لالہ ہرکشن لال صاحب اور دیگر ممتاز ملزمان کو عمر قید اور ضبطی جائداد کی سزا دی گئی۔ ایک دو ملزمان کو دس دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ سردار صاحب اور سید صاحب بری کئے گئے۔ ٹریبونل کا فیصلہ دیرتک قائم نہ رہا اور باقی ملزمان بھی جلد رہا ہو گئے۔ اسی سال دسمبر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے امرتسر میں ہوا۔ برطانوی عملداری ہندوستان میں ۲۸ سال بعد جاکر ختم ہوئی لیکن ۱۹۱۹ء کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کی کیفیت اب چراغِ سحری کی ہے۔ ان واقعات کے دو سال کے اندر ہی آئینی اصلاحات کی پہلی قسط کا نفاذ ہو گیا اور میاں فضل حسین صاحب اور لالہ ہرکشن لال صاحب پنجاب کی صوبائی حکومت کے پہلے وزراء مقرر ہوئے۔

لاء کالج لاہور میں بطور لیکچرار تقرر

۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں میاں فضل حسین صاحب نے مجھے طلب فرمایا اور کہا کہ لاء کالج لاہور میں گرمیوں کی تعطیلات کے بعد دو لیکچراروں کی ضرورت ہو گی۔ ایک مسلم کا انتخاب کیا جائے گا اور ایک غیر مسلم کا۔ تم درخواست دیدو۔ یونیورسٹی کی لاء کالج کمیٹی کے چیرمین سرجان مینارڈ (فنانشل کمشنر) بحیثیت وائس چانسلر تھے اور سیکرٹری میاں فضل حسین صاحب تھے۔ سرشادی لال صاحب اور کرنل سٹیفنسن پرنسپل گورنمنٹ کالج بھی کمیٹی کے ممبر تھے۔ میاں صاحب نے دریافت فرمایا کمیٹی کے ممبران میں سے تمہیں کسی

کی تائید کی توقع ہے؟ میں نے کہا میں دو تین بار سر شادی لال صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ وہ
میرے تعلیمی ریکارڈ کی تعریف کرتے تھے ان سے ضرور کچھ توقع ہو سکتی ہے۔ میاں صاحب مسکرائے اور فرمایا اچھا
تو اب ان سے ملکر انہیں بتا دینا کہ تم نے درخواست دی ہے۔ سر جان مینارڈ سے مل کر بھی فقط اتنا کہہ دینا
کہ تم نے درخواست دی ہے۔ کرنل سٹیفنسن سے کہہ دینا میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم ہوں اور اگر کسی اور امیدوار
کا ریکارڈ میرے ریکارڈ سے بہتر نہ ہو تو میں امید کرتا ہوں آپ میری تائید کریں گے۔ چنانچہ میں نے میاں
صاحب کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔ سر شادی لال نے فرمایا تمہاری موزونیت کے متعلق تو کوئی شک ہی نہیں
ہو سکتا تمہارا ریکارڈ استثنائی طور پر اچھا ہے۔ دو ہفتے بعد میاں صاحب نے مجھے پھر طلب فرمایا اور کہا
لو میاں تمہارے تقرر کا تو فیصلہ ہو گیا ہے۔ صرف شادی لال نے تمہارے تقرر کی مخالفت کی تھی۔ کمیٹی کا اجلاس
شروع ہوتے ہی سر جان مینارڈ نے مجھ سے پوچھا کہ درخواست کنندگان میں کوئی نمایاں طور پر ممتاز بھی ہے؟
میں نے تمہارا نام لیا۔ اس پر سر جان نے کہا تو کیا اس پر کمیٹی کا اتفاق سمجھ لیا جائے؟ شادی لال نے کہا
اس کا تعلیمی ریکارڈ تو اچھا ہے لیکن ابھی تجربہ نہیں۔ میں نے کہا پانچ سال کی پریکٹس ہے میرے ساتھ بھی
اس نے کام کیا ہے۔ میری رائے اس کی نسبت بہت اچھی ہے۔ پانچ سال ہوئے لندن یونیورسٹی کے ایل ایل بی
کے امتحان میں آنرز میں یونیورسٹی بھر میں اول رہا۔ میری رائے میں کالج میں کام کرنے کے لحاظ سے یونیورسٹی
کا تازہ تجربہ ہونا اس کے لئے مفید اور ممد ہو گا۔ کرنل سٹیفنسن نے کہا اگر میاں صاحب اسے ذاتی طور پر
جانتے ہیں اور ان کی رائے میں یہ بہترین امیدوار ہے تو تامل کی کوئی وجہ نہیں۔ کمیٹی نے اس پر اتفاق رائے کا
اظہار کیا اور معاملہ طے ہو گیا۔ شادی لال نے اس خیال سے کہ دوسری اسامی کے متعلق جلدی رائے ظاہر کر دینے
پر کمیٹی ان سے اتفاق کرے گی فوراً کہا دوسری اسامی کے متعلق میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کمرشل لاء پر لیکچر دینے
کے لئے ایک قابل تجربہ کار قانون دان کی ضرورت ہو تو لالہ ہرگوپال بہترین امیدوار ہے۔ میرے سامنے اسے بہت
دفعہ پیش ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اسے ہر لحاظ سے قابل پایا ہے۔ اس پر میں نے کہا میری رائے میں
چونی لال آنند زیادہ موزوں ہو گا وہ بیرسٹر ہے اور لندن یونیورسٹی کا ایل ایل بی ہے۔ لالہ ہرگوپال کو تعلیمی ماحول
ترک کئے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے اور اسکی تعلیم بھی سب ملکی ہے۔ اسے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکچر دینے میں
قوت بیان کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ لازم بات ہے کہ جو شخص تین سال انگلستان میں تعلیم پاتا رہا ہے اور اس نے
وہاں کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے وہ اچھا لیکچرار ثابت ہو گا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ کمیٹی اس بات پر اتفاق کرے کہ میں
ان دونوں امیدواروں سے کہہ دوں کہ وہ وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ دونوں میں سے جسے وائس
چانسلر موزوں تر خیال کریں اس کا تقرر ہو جائے۔ اس پر کمیٹی نے اتفاق کر لیا۔ اب یہ یقینی بات ہے کہ وائس چانسلر

دونوں کو ایک نظر دیکھ کر ہی آنند کے حق میں رائے قائم کریں گے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مسٹر سی ایل آنند دوسرے لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد میں مسٹر چیٹرجی کے ریٹائر ہونے پر پورے وقت کے پروفیسر ہوئے اور کنور سین صاحب کے استعفیٰ دینے پر کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ان ہر دو مواقع پر سرشادی لال صاحب نے مجھ سے فرمایا اگر تم چاہو تو تمہارا تقرر ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا مجھے خواہش نہیں۔ پرنسپل کی جگہ خالی ہونے پر مجھ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ایک قابل آدمی درکار ہے تمہاری رائے میں کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا ایک تو آپ تنخواہ میں اضافہ کریں موجودہ ۵۰۰ - ۷۵ - ۱۰۰۰ پر قابل آدمی ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے پوچھا تمہاری رائے میں کیا تنخواہ ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا میری رائے میں کم از کم ۱۰۰۰ - ۵۰ - ۱۲۵۰ ہونی چاہیئے۔ کہا اگر تنخواہ اس کے مطابق ہو جائے تو تم کام کرنے کے لئے تیار ہو گے۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اول تو میں اپنے آپ کو اس کام کے لئے موزوں خیال نہیں کرتا اور دوسرے میں اپنی پریکٹس جیسی بھی ہے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے تو لیکچراری سے بھی استعفیٰ دیدیا ہے کیونکہ میرے پاس اب وقت نہیں۔ میری رائے میں مسٹر سی ایل آنند قابل بھی ہیں اور موزوں بھی ہیں۔ ان کا تقرر ہو جائے تو خوب ہو گا۔

اکتوبر ۱۹۱۹ء میں ڈیوس روڈ والی کوٹھی کے کرائے کی میعاد ختم ہو گئی اور میں بازار جج محمد لطیف والے مکان میں واپس آگیا۔ سید افضل علی صاحب نے گمٹی بازار کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا جو حویلی نواب محبوب سبحانی کے نام سے مشہور تھا۔ جب تک میں ڈیوس روڈ پر رہا چودھری شہاب الدین صاحب نے بازار جج محمد لطیف والا مکان شیخ دین محمد صاحب ممبر مارشل لاء ٹربیونل کو رہائش کے لئے دیدیا تھا۔ میری واپسی تک ٹربیونل کا کام ختم ہو کر مکان پھر خالی ہو چکا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص رحم تھا کہ اس نے اپنے فضل سے سید افضل علی صاحب اور خاکسار اپنے دونوں بیس اور عاجز بندوں کو اور ان کے متعلقین کو مارشل لاء سے متعلق پریشانیوں سے محفوظ رکھا۔ فالحمد للہ۔

لاء کالج میں ضابطۂ فوجداری اور رومن لاء کا پڑھانا میرے سپرد ہوا۔ ان دو مضامین کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ لیکن پرانے پروفیسروں اور لیکچراروں نے جو مضامین اپنے لئے چن رکھے تھے ان سے جو کچھ بچا وہ مسٹر آنند کے اور میرے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ ضابطۂ فوجداری لیکچرار اور طلباء دونوں کے لئے آسان مضمون تھا رومن لاء طلباء کے لئے ایک بالکل نیا مضمون تھا جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے۔ اس کے پڑھانے میں مجھے لنڈن یونیورسٹی کے پروفیسر میورہیسن صاحب کے طریق اور ان کے لیکچروں سے تیار کردہ خلاصے سے جو میرے پاس محفوظ تھا بہت مدد ملی اور میں بہت سی زحمت سے بچ گیا۔ جو پانچ سال (۲۴-۱۹۱۹ء) میں لاء کالج میں لیکچرار رہا یہی دونوں مضامین میرے سپرد رہے۔

شیخ اعجاز احمد | شیخ اعجاز احمد صاحب فرزند اکبر شیخ عطاء محمد صاحب جو علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے برادر اکبر تھے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد لاء کالج میں داخل ہوئے۔ مجھے شیخ عطاء محمد صاحب سے نیاز حاصل تھا۔ علامہ ممدوح کا تو میں شاگرد بھی تھا اور اب ان کا جونیئر ہم پیشہ بھی تھا۔ لیکن شیخ اعجاز احمد صاحب سے اس وقت تک دُور کی صاحب سلامت تھی۔ چودھری بشیر احمد صاحب کے ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب جب ایل ایل بی کلاس میں تھے تو انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ مضامین کی تیاری میں کبھی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اسکی کوئی صورت نہیں۔ اگر آپ کچھ وقت دے سکیں تو میں آپ کے پاس آکر مشکل مقامات حل کر لیا کروں۔ میں نے کہا کہ کوئی خاص وقت مقرر کرنا تو مشکل ہے آپ اپنی رہائش ہی میرے ہاں منتقل کر لیں۔ جب بھی وقت میسر آجایا کرے گا میں آپ کی مدد کر دیا کروں گا۔ چنانچہ ان کی رہائش کا انتظام دفتر کی عمارت کی تیسری منزل میں کر دیا گیا جہاں ایک آرام دہ کمرہ میسر تھا۔

مسٹر ایسکوبیتھ | چودھری شہاب الدین صاحب نے ایک روز مجھے بلایا۔ ایک اینگلو انڈین صاحب ان کے پاس تشریف فرما تھے۔ چودھری صاحب نے ان کا تعارف کرایا اور فرمایا انہیں اپنے ساتھ کام میں شامل کر لو اور مناسب آزمائش کے بعد مجھے بتانا کیسے کام کرتے ہیں اور کیا ان کے تعاون سے تمہارا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکتا ہے۔ ان صاحب کا نام مسٹر ایسکوبیتھ تھا۔ چیف کورٹ سے ڈپٹی رجسٹرار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے پر جج صاحبان نے ان کے حسنِ خدمت کے صلے میں انہیں پریکٹس کی اجازت مرحمت فرمائی چند سال پریکٹس کی۔ قابل اور محنتی تھے۔ مزاج کے منکسر اور شریف طبیعت تھے میرے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو خود ہی مجھے تنبیہ کی کہ میرے ہاتھ میں روپیہ نہ دینا میں اس معاملے میں بہت کمزور ہوں۔ اسی کمزوری ہی کا نتیجہ تھا کہ عیسائی تنظیم سالویشن آرمی کی شکایت پر ان کا پریکٹس کرنے کا لائیسنس ضبط ہو گیا تھا۔ پنشن پر گذارہ مشکل تھا۔ چودھری شہاب الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے انہیں میرے سپرد کیا۔ ان کی بیوی فوت ہو چکی تھیں دو بیٹے تھے بڑا بیٹا صحت عامہ کے ڈائرکٹر کے دفتر میں بطور اسسٹنٹ کام کرتا تھا۔ چھوٹا ابھی سکول میں پڑھتا تھا۔ مسٹر ایسکوبیتھ پنجابی خوب جانتے تھے لیکن تلفظ اور لہجے سے ظاہر ہو جاتا تھا کہ کچھ یورپین ملونی ہے۔ میں نے جو کام ان کے سپرد کیا انہوں نے بہت توجہ اور سرعت سے کیا اور مجھے اس میں اصلاح کی بہت کم ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت جلد میں چودھری صاحب کی خدمت میں گذارش کرنے کے قابل ہو گیا کہ مسٹر ایسکوبیتھ بہت توجہ سے کام کرتے ہیں۔ ان کا کام نہایت تسلی بخش ہے۔ وقت کے بہت پابند ہیں۔ محنت سے کام کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ان کے کام کے

متعلق ہر طرح سے اطمینان ہے میری رپورٹ پر مسٹر ایسکوتھ انڈین کیسیز کے عملے کے مستقل رکن ہوگئے اور ایڈیٹری کے کام میں میرے نہایت قابل قدر معاون ثابت ہوئے۔ بہت جلد ہمارے تعلقات گہرے دوستانہ ہوگئے۔ میں ان کا نہایت ممنون تھا۔ اگر مجھ سے کسی قسم کی اعانت طلب کرتے تو مجھے دریغ نہ ہوتا۔ صرف ایک بار کسی ضرورت پر کچھ قرض طلب کیا۔ چھوٹی سی رقم تھی میں نے فوراً پیش کر دی۔ انہوں نے کبھی دوبارہ ایسا مطالبہ نہ کیا اور میں نے ان سے کبھی یہ رقم طلب نہ کی۔

مسٹر ایسکوتھ کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ پنجاب کی تاریخ سے خوب واقف تھے اور چیف کورٹ کی تو چلتی پھرتی تاریخ تھے۔ ابھی میرے ساتھ کام کرتے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ انہوں نے زور دینا شروع کیا کہ تم پریکٹس کی طرف زیادہ توجہ کرو تمہارا کام بہت جلد بڑھ جائے گا۔ لاہور میں قابل مسلمان کے لئے بہت گنجائش ہے۔ ہماری ملاقات اتوار کے سوائے ہر روز نہ ہوتی تھی۔ اور ہر روز کسی نہ کسی تعلق میں وہ ضرور اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اور مجھے ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ایک دن کہا میں صبح عموماً مسٹر جسٹس مارٹینو کے ہمراہ سیر کو جاتا ہوں۔ آج صبح سیر کے دوران میں ہائی کورٹ بار کا ذکر آ گیا۔ جج صاحب نے کہا مسلمانوں میں اچھے وکلاء کی کمی ہے۔ میں نے پوچھا تو جوانوں میں کوئی آگے بڑھنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا ایک کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ جلد آگے آ جائے گا اس کا طریق استدلال بہت موثر ہوتا ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ کیا مسٹر عزیز احمد سے بھی زیادہ کہا عزیز احمد کا تجربہ بیشک زیادہ ہے لیکن ظفراللہ خاں کا طرز بیان عزیز احمد سے بہتر ہے۔ یہ سنا کر کہنے لگے دیکھو اب تو جج بھی تمہارا ذکر کرنے لگے ہیں تمہیں چاہیئے پریکٹس کی طرف زیادہ توجہ کرو (مسٹر عزیز احمد مجھ سے کئی سال سنیئر تھے راولپنڈی میں کئی سال پریکٹس کرنے کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ مسٹر جسٹس مارٹینو راولپنڈی میں سیشن جج رہ چکے تھے ان کے اور مسٹر عزیز احمد کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے)

مدراس ہائی کورٹ میں ایک جماعتی کیس کی پیروی | اسی دوران میں مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا ارشاد موصول ہوا کہ میں مدراس ہائی کورٹ میں ایک فوجداری نگرانی کی پیروی کروں۔ جس کا اثر جماعت احمدیہ کے حقوق پر پڑتا تھا۔ جنوبی ہند کے مالابار کے علاقے میں مسلمان آبادی کا ایک طبقہ ماپلا کہلاتا ہے۔ یہ لوگ ان عرب تاجروں کی اولاد ہیں جو مالابار میں آکر بس گئے اور اسی علاقے کی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ ماپلا قوم کے مسلمان بہت حد تک ملکی رسوم و رواج کے پابند ہیں۔ اس علاقے میں مادری نظام رائج ہے اور یہی صورت کوچین اور ٹراونکور میں بھی ہے۔ ماپلا لوگ بھی اسی نظام کے پابند ہیں۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وراثت کا سلسلہ اور نسب کا سلسلہ باپ کے ذریعے نہیں بلکہ ماں کے ذریعے چلتا ہے۔ عورت خاوند کو بیاہ لاتی ہے اور عورت ہی مشترکہ خاندان کی سردار ہوتی ہے۔ گو جائداد اور اختیارات مرد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ لیکن بیٹا باپ کا وارث نہیں ہوتا ماں کا وارث ہوتا ہے۔ اس کے مرنے پر وراثت اس کے بیٹوں کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اس کا چھوٹا بھائی بحیثیت اس کی ماں کا بیٹا ہونے کے وارث

ہوتا ہے۔ اور اگر چھوٹا بھائی نہ ہو تو ہمشیرہ زادہ وارث ہوتا ہے۔ اگر ہمشیرہ زادہ نہ ہو تو خالہ زادہ وارث ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو نانی کا بیٹا یعنی ماموں اور وہ بھی نہ ہو تو نانی کی والدہ کی دختری نسل میں سے سب سے معمر مرد وغیرہ۔

مالابار میں مختلف مقامات پر احمدی جماعتیں قائم ہیں اور تبشیر کے ذریعے نئے افراد جماعت میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک شادی شدہ نوجوان ماپلا کے جماعت میں داخل ہونے پر اس کی بیوی کے بھائیوں نے اسے خاندان مشترکہ سے خارج کر دیا اور قاضی مدراس سے فتویٰ حاصل کر کے کہ احمدی ہونے سے وہ مرتد ہو گیا ہے اور اس کا نکاح فسخ ہو گیا ہے اپنی بہن کی شادی کسی اور شخص سے کر دی۔ خاوند اگر اس مرحلے پر سلسلہ احمدیہ کے مرکز سے مشورہ کرتا تو غالباً یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ دیوانی عدالت کی طرف رجوع کرے اور دعویٰ حق استقرار دائر کرے کہ جماعت احمدیہ میں داخل ہونے سے نکاح فسخ نہیں ہوا اور مدعا علیہا شرعاً اور قانوناً اس کی زوجیت میں ہے۔ لیکن خاوند نے مقامی وکیل کے مشورے سے بیوی، اس کے بھائیوں اور اس شخص کے خلاف فوجداری استغاثہ دائر کیا جس کے ساتھ بیوی کے دوسرے نکاح کی رسم ادا کی گئی تھی، استغاثے کی سماعت سیشن جج نے کی جو مدراسی برہمن تھے اور تصفیہ طلب فقہی امور اور مسائل کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے قرار دیا کہ جمہور مسلمانوں اور احمدیہ جماعت کے مابین عقائد میں اختلاف ہے۔ اسلئے مستغیث مسلمان نہیں شمار ہو سکتا اور اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو چونکہ مستغاث علیہم نے نکاح ثانی میں قاضی مدراس کے فتویٰ پر عمل کرنے میں نیک نیتی سے کام لیا ہے اس لئے ان کا یہ فعل جرم نہیں گردانا جاسکتا۔ اور وہ کسی سزا کے متوجب نہیں۔ چنانچہ فاضل سیشن جج صاحب نے استغاثہ خارج کر دیا اور ملزمان کو بری قرار دیا۔ بریت کے خلاف اپیل کا حق صرف حکومت کو ہے۔ حکومت سے درخواست کرنے پر جواب ملا کہ اس معاملے میں چونکہ بنائے تنازعہ اختلاف عقاید ہے اور مذہبی امور میں دخل دینا حکومت کے لئے مناسب نہیں اسلئے حکومت اپیل کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔ نگرانی کے متعلق مدراس ہائی کورٹ کے اجلاس کامل کا فیصلہ تھا کہ بریت کے حکم کے خلاف ہائی کورٹ نگرانی کی سماعت نہیں کرے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ چارہ جوئی کا اور کوئی راستہ کھلا نہیں اسلئے نگرانی بہر صورت داخل کر دی جائے۔ چنانچہ نگرانی دائر کی گئی اور اس کی سماعت کی تاریخ مقرر ہونے پر خاکسار کو پیروی کا ارشاد ہوا۔ اس سفر میں چودھری بشیر احمد صاحب میرے ہم سفر ہوئے۔ مدراس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ سماعت میں ابھی چند دن تاخیر ہو گی اسلئے ہم اس وقفہ میں سکندر آباد چلے گئے اور وہاں حضرت عبداللہ بھائی اللہ دین کے ہاں مہمان ہوئے۔ ان فرشتہ سیرت بزرگ کے ہاں یہ تین چار دن کا قیام بہت دلچسپ رہا۔ حیدرآباد ان دنوں مغلیہ تہذیب اور تمدن کی جھلک پیش کرتا تھا۔

نگرانی کی سماعت مسٹر جسٹس اولڈ فیلڈ اور مسٹر جسٹس کرشنن کے اجلاس میں ہوئی۔ مسئول علیہم کی طرف سے

مسٹر مدہون نائر وکیل تھے جو سرشنکر نائر سابق رکن مجلس انتظامیہ وائسرائے ہند) کے داماد اور ان دنوں گورنمنٹ پلیڈر تھے بعد میں جج ہائی کورٹ مدراس ہوئے اور پھر پریوی کونسل میں جج مقرر ہوئے ان کے ساتھ ایک مسلمان وکیل بطور جونیئر تھے حکومت کی طرف سے مسٹر ایڈمس پبلک پراسیکوٹر پیش تھے۔ مسٹر جسٹس اولڈ فیلڈ نے مسٹر ایڈمس سے پوچھا تمہارا اس معاملے میں کیا موقف ہے۔ مسٹر ایڈمس نے جواب دیا کہ انہیں غیر جانبدار رہنے کی ہدایت ہے۔ مسٹر جسٹس اولڈ فیلڈ نے فرمایا مذہبی مسئلے کے متعلق حکومت کا غیر جانبدار رہنا تو مناسب ہے لیکن اس کیس میں ایک اہم قانونی سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ سیشن جج کی رائے کہ اگر مسئول علیہم کا فعل نیک نیتی پر مبنی ہو تو اسے جرم نہیں قرار دیا جاسکتا ہے قابل پذیرائی ہے یا نہیں اس کے متعلق تمہارا کیا موقف ہے۔ مسٹر ایڈمس نے کہا کہ اس مسئلے کے متعلق بھی مجھے غیر جانبدار رہنے کی ہدایت ہے۔ اس پر مسٹر جسٹس اولڈ فیلڈ نے کہا تو پھر تمہارے لئے تو تمہارا اجلاس میں حاضر رہنا نہ رہنا برابر ہے۔ مسٹر ایڈمس بولے تو جناب پھر میں رخصت ہوتا ہوں۔ اور وہ تشریف لے گئے۔

میں بحث کے لئے کھڑا ہوا تو مجھے خیال تھا کہ مسئول علیہم کی طرف سے ابتدائی عذر پیش کیا جائے گا کہ فل بنچ کے فیصلے کے رُو سے بریت کے حکم کے خلاف نگرانی قابل سماعت نہیں۔ لیکن مسئول علیہم کی طرف سے کوئی ایسا عذر پیش نہ کیا گیا۔ اس طرح وہ امر جسے میں اپنے رستے میں سب سے کڑی مشکل سمجھتا تھا اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا ہی نہ ہوا۔ بنیادی مسئلہ زیر تنازعہ میرے لئے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں اسکی وضاحت کرتا گیا سینئر جج صاحب فرماتے گئے درست ہے معقول ہے اس حد تک تو ہماری رائے تمہاری تائید میں ہے اور اس طرح میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ جب میں نے اس مسئلے پر بحث کرنا چاہا کہ نیک نیتی کا سوال غیر متعلق ہے تو جج صاحب نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ امر واضح ہے اور کسی بحث کا محتاج نہیں۔ آخر میں مجھ سے سوال کیا کہ اگر ہماری رائے ہو کہ سشن جج کا فیصلہ غلط ہے اور قائم نہیں رہ سکتا تو نگرانی کے ضابطے کے ماتحت ہم مستغاث علیہم کو خود سزا دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہم صرف یہی حکم دے سکتے ہیں کہ مقدمے کی از سر نو کارروائی ہو۔ کیا تمہیں اصرار ہو گا کہ ان پر دوبارہ مقدمہ چلایا جائے؟ میں نے کہا ہماری غرض مستغاث علیہم کو سزا دلوانا نہیں۔ ہمارا مقصد اپنے حقوق کی وضاحت اور حفاظت ہے۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو ہم مستغاث علیہم کی تعزیر پر مصر نہیں۔ ان کے لئے یہی مشکل کافی ہے کہ مستغیث کا نکاح برقرار ہے اور دوسرا نکاح ناجائز ہے۔ چنانچہ ہائی کورٹ نے اسی کے مطابق فیصلہ صادر کیا۔ نگرانی کی بحث کے دوران میں پٹنہ ہائی کورٹ کا فیصلہ ہمارے لئے بہت تقویت کا موجب ہوا۔

جماعت احمدیہ کے افراد کے متعلق ارتداد کا سوال کئی عدالتوں میں اٹھایا گیا

جماعت احمدیہ کے افراد کے متعلق ارتداد کا سوال کئی بار عدالتوں میں آیا ہے۔ غالباً پہلی بار یہ سوال سیالکوٹ میں چھاؤنی کی جامع مسجد کی تولیت اور امامت کے سلسلے میں عدالت کے روبرو آیا تھا۔ مولوی مبارک علی صاحب کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے پر چھاؤنی کے مسلمانوں کی طرف سے انہیں جامع مسجد کی تولیت اور امامت سے علیحدہ کرنے کیلئے دیوانی عدالت میں چارہ جوئی کی گئی۔ اس وقت سیالکوٹ میں کوئی احمدی وکیل نہیں تھا۔ والد صاحب ابھی سلسلہ احمدیہ میں بیعت نہیں ہوئے تھے۔ مولوی مبارک علی صاحب کی طرف سے والد صاحب کو وکیل کیا گیا۔ عدالت ابتدائی میں جج لالہ دھنپت رائے صاحب تھے انہوں نے قرار دیا کہ جماعت احمدیہ کے افراد مسلمان ہیں اور دعویٰ خارج کر دیا۔ مدعیان نے ڈویژنل جج کی عدالت میں اپیل دائر کی۔ ڈویژنل جج مسٹر پیوس تھے جو بعد میں چیف کورٹ کے جج ہوئے۔ انہوں نے عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال رکھا اور اپیل خارج کی۔ مدعیان نے اس فیصلے کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل کی۔ چیف کورٹ نے قرار دیا کہ دعویٰ چونکہ مولوی مبارک علی صاحب کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے کے چھ سال کے اندر دائر نہ کیا گیا اسلئے زائد المیعاد ہے اور اس بناء پر اپیل خارج کر دی۔ چونکہ چیف کورٹ نے مدعا علیہ کے عقائد کی نسبت کوئی فیصلہ نہ دیا اسلئے چیف کورٹ کا یہ فیصلہ اصل بنائے تنازعہ پر نظیر نہ ہوا۔

۱۹۱۷ء میں امرتسر میں ایک شخص بنام سراج دین کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے پر اسکی بیوی کی طرف سے دعویٰ دائر کیا گیا کہ میرا خاوند سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے۔ اسلئے قرار دیا جائے کہ میرا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ مدعیہ کی طرف سے مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہل حدیث مختار خاص پیروی کرتے تھے اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب بیرسٹر ایٹ لاء وکیل تھے۔ مقدمے کی سماعت مسٹر سیمور سب جج درجہ اوّل امرتسر نے کی۔ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ارشاد پر مدعا علیہ کی طرف سے پیروی کے لئے امرتسر جایا کرتا تھا۔ مدعیہ کے گواہان کے زمرے میں مولانا عبد الاحد غزنوی صاحب (والد ماجد مولانا اسمٰعیل غزنوی صاحب) بھی اپنے تحریری فتویٰ کی تصدیق کے لئے پیش ہوئے۔ ان کا فتویٰ تھا "مرزائے قادیان کافر است و ہمہ مریدانِ او کافر اند وہر کہ در کفر ایشاں شک آرد او ہم کافر است"۔

ظفر اللہ خاں۔ جناب مولانا اگر کوئی شخص ایسے شخص کو کافر شمار نہ کرے جو جناب مرزا صاحب کے مریدان کے کفر میں شک کرتا ہو تو اس کے حق میں کیا ارشاد ہے؟

مولانا عبد الاحد غزنوی صاحب۔ وہ بھی ویسا ہی کافر ہے۔

ظفر اللہ خاں۔ اور جو اس کے کفر میں شک کرے اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

جناب مولانا صاحب - وہ بھی ویسا ہی کافر ہے -

اس پر سب جج صاحب نے فرمایا - "چلو اب سب کافر ہو چکے قصہ تمام ہوا -"

ہماری طرف سے سلسلہ احمدیہ کے کچھ علماء پیش ہوئے جنہوں نے شہادت دی کہ جماعت احمدیہ کے عقائد عین اسلام ہیں - اور جرح میں جو اعتراضات پیش کئے گئے ان کے مناسب جواب دیئے اور کچھ غیراز جماعت مسلمان معززین پیش ہوئے جنہوں نے جماعت احمدیہ کے افراد کے متعلق شہادت دی کہ ان کا عمل عین ارکان اسلام کے مطابق ہے اور ہم انہیں مسلمان سمجھتے ہیں - ان میں مرزا بدرالدین صاحب بیرسٹرایٹ لاء اور سردار محمد اکبر خاں صاحب بیرسٹرایٹ لاء بھی شامل تھے - جب ان گواہوں کی شہادت ہو چکی جنہیں ہماری طرف سے بذریعہ عدالت طلب کیا گیا تھا تو جج صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا شہادت ختم ہے ؟ میں نے کہا جناب ایک گواہ باقی ہے - پوچھا وہ کون ہے ؟ میں نے کہا جناب مدعیہ کے مختار مولانا ثناء اللہ صاحب - اس پر مولانا ثناء اللہ صاحب نے فرمایا "مجھے تو طلب نہیں کیا گیا" - میں نے کہا آپ عدالت میں موجود ہیں طلبی کی ضرورت نہیں - مولانا صاحب نے فرمایا لیکن مجھے خرچ خوراک ملنا چاہیئے - میں نے کہا عدالت میں موجود ہونے کی صورت میں آپ خرچ خوراک کا مطالبہ کرنے کے مجاز تو نہیں لیکن مجھے آپ کے ساتھ بحث مقصود نہیں لیجئے تین روپے حاضر ہیں قبول فرمائیے اور اقرار صالح کیجئے - جب مولانا صاحب شہادت دینے کھڑے ہوئے تو میں نے ان کے اخبار اہلحدیث کا ایک پرچہ جیب سے نکالا اور اس میں مندرجہ ایک نوٹ کی طرف مولانا صاحب کو توجہ دلائی اور دریافت کیا کیا یہ آپ کا لکھا ہوا ہے ؟ فرمایا میرا لکھا ہوا ہے - میں نے پوچھا درست ہے ؟ فرمایا درست ہے - میں نے وہ پرچہ بطور شہادت پیش کر دیا - اس نوٹ کا مضمون یہ تھا - "ایک صاحب نے ہم سے سوال کیا ہے کہ آپ نے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے ملکر اشاعت اسلام کا ادارہ قائم کیا ہے - اگر اس ادارے کی تبلیغی سرگرمیوں کے نتیجے میں کوئی غیر مسلم مرزائی ہو جائے تو کیا آپ کے نزدیک وہ مسلمان ہو گا ؟ - ہماری طرف سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہونا دو لحاظ سے ہے ایک اخروی نجات کے لحاظ سے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے - اور فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے - ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے - دوسرے عرف عام کے لحاظ سے اس لحاظ سے ہم ہر کلمہ گو کو مسلمان سمجھتے ہیں مرزائی بھی کلمہ گو ہیں اسلئے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا" ڈاکٹر کچلو نے مولانا سے کوئی سوال کرنا چاہا تو جج صاحب نے فرمایا مدعا علیہ کے وکیل نے صرف ایک دستاویز کی گواہ سے تصدیق کرائی ہے اس کے مضمون کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا اسلئے آپ اس دستاویز کے مضمون کے متعلق جرح کرنے کے مجاز نہیں - اگر کچھ کہنا ہو تو بحث کے دوران میں کہہ لیں - بحث کے لئے میں فلاں تاریخ مقرر کرتا ہوں - اس پر اجلاس برخاست ہو گیا - اس دن کا اجلاس متواتر کئی گھنٹے جاری رہا تھا - جج صاحب اور وکلاء سب تھکے ہوئے تھے - عدالت کے کمرے

سے سب اکٹھے باہر آگئے۔ تین روپے ابھی مولانا صاحب کے ہاتھ میں ہی تھے انہوں نے انہیں چھنکایا اور مسکرا کر مجھے فرمایا "مرزا صاحب سے ہمیں کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہی رہتا ہے۔" بحث ہوئی اور چند دن بعد سب جج صاحب نے فیصلہ سنایا۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے فیصلے اور مدعا علیہ کی طرف سے جو شہادت پیش ہوئی تھی اس پر حصر کرتے ہوئے قرار دیا کہ مدعا علیہ کا نکاح فسخ نہیں ہوا اور دعویٰ خارج کر دیا۔ مدعیہ کی طرف سے اپیل دائر کی گئی جس کی سماعت گورداسپور میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج امرتسر کی عدالت میں ہوئی۔ خاکسار اس تاریخ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں وزیر ہند کی آمد کے موقعہ پر حاضر تھا اسلئے اپیل کی پیروی کے لئے گورداسپور حاضر نہ ہو سکا۔ غالباً حضورؓ کے ارشاد کے ماتحت میاں محمد شریف صاحب رسپانڈنٹ کی طرف سے پیش ہوئے اپیل میں عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا اور اپیل خارج ہو گئی۔

سیالکوٹ شہر میں حضرت مولوی فیض الدین صاحبؓ کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے پر مخالفین نے مولوی صاحب جیسے نیک خصلت اور فرشتہ سیرت انسان پر ایک سراسر بے بنیاد غبن کا الزام عاید کر کے فوجداری استغاثہ دائر کر دیا۔ حضرت مولوی صاحب کا خاندان پشت در پشت سے اپنے علم و فضل کے باعث سیالکوٹ میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور شہر کی دو بڑی مساجد کی تولیت مولوی صاحب کے سپرد تھی ان میں سے ایک مسجد تو لب سڑک واقعہ تھی اور اس کے احاطہ میں ایک بزرگ کا مزار بھی تھا۔ ساتھ کی گلی کے اندر ایک دوکان اس مسجد کے زیر یں تھی۔ دوسری مسجد گلی کے اندر سڑک سے کچھ فاصلے پر مولوی صاحب کے رہائشی مکان کے مقابل واقعہ تھی اس کی عمارت سڑک والی مسجد کی نسبت وسیع تر تھی۔ اس کے احاطے میں بائیں جانب ایک قبرستان تھا اور دائیں جانب ایک کھلی جگہ اور اس سے ہٹ کر دو تین پرانی طرز کی کوٹھڑیاں تھیں جن میں سے ایک میں ایک کولہو چلایا کرتا تھا۔ مولوی صاحب خود اس مسجد میں امامت کرتے تھے۔ یہیں میں ان کی خدمت میں قرآن کریم کے درس کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ دونوں مساجد کا نام کبوترانوالی مسجد تھا۔ سڑک والی مسجد بیرونی کہلاتی تھی اور گلی والی اندرونی۔ مولوی صاحب کے خلاف جو استغاثہ دائر کیا گیا اسکی بنیاد اس فرضی بیان پر رکھی گئی کہ بیرونی مسجد کے سامان میں سے ایک سائبان اور کچھ اور اشیاء مولوی صاحب نے غبن کر لی ہیں سارا شہر جانتا تھا کہ یہ بیان سراسر بے بنیاد ہے اور استغاثے سے غرض محض مولوی صاحب کی ایذا رسانی ہے۔ آخر اس بات پر راضی نامہ ہوا کہ مولوی صاحب بیرونی مسجد کی تولیت سے دست بردار ہو جائیں اور ملحقہ دوکان کے کرائے کی وصولی کا حق اور بیرونی مسجد کے نظم و نسق کی ذمہ داری مستغیثان کے مقرر کردہ متولی کے سپرد کر دیں اور اندرونی مسجد کی تولیت اور امامت بدستور مولوی صاحب کے سپرد رہے اور اندرونی مسجد میں جماعت احمدیہ کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے اندرونی مسجد کے کنوئیں پر

پمپ لگایا گیا سقاوے بنائے گئے۔ وضو خانہ اور ڈیوڑھی کی تعمیر کی گئی۔ کولھو والی کوٹھڑیوں کی جگہ اور ان کے سامنے کی کھلی جگہ پر مہمان خانہ تعمیر کیا گیا اور بعد میں مدرسۃ البنات کی عمارت تعمیر ہوئی۔ بجلی میسر آنے پر مسجد اور متعلقہ عمارات میں بجلی کی روشنی اور پنکھوں کا انتظام ہوا۔ ان تمام امور کے متعلق بلدیہ کے دفتر میں مناسب اندراجات اجازت طلبی اور اجازت دہی کے ہوتے رہے بجلی کے مطالبات کی ادائیگی کی رسیدیں لی جاتی رہیں حضرت مولوی فیض الدین صاحبؓ کے حین حیات میں تو کسی قسم کا تعرض جماعت کے ساتھ نہ ہوا۔

مولوی صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۶ء میں مخالفین نے جماعت احمدیہ کے اندرونی مسجد میں نمازیں ادا کرنے میں مزاحمت شروع کی اور آخر ایک درخواست زیر دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوجداری دائر کر دی کہ مسجد کے ساتھ جماعت احمدیہ کا کسی وقت کوئی تعلق نہیں رہا۔ مولوی فیض الدین صاحب کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے کے دن سے بلکہ مسجد پر درخواست کنندگان کا قبضہ رہا ہے اور وہی مسجد کو نمازوں اور دیگر دینی اغراض کیلئے متواتر استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ چند ہفتوں سے جماعت احمدیہ کے افراد ناجائز طور پر مسجد پر قابض ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور درخواست کنندگان اور ان کے رفقاء کی عبادات میں مخل ہوتے ہیں۔ لہٰذا زیر دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوجداری درخواست کنندگان کے قبضے کی تصدیق کی جائے اور مسئول علیہم کو حکم دیا جائے کہ وہ اور ان کے رفقاء اس میں مخل نہ ہوں۔ یہ درخواست سرسری کارروائی کے بعد خارج ہو گئی اور درخواست کنندگان کو ہدایت ہوئی کہ وہ عدالت دیوانی میں اپنے حقوق کے اثبات کے لئے چارہ جوئی کریں۔ چنانچہ ان کی طرف سے دیوانی دعویٰ دائر ہوا اور مجھے جماعت کی طرف سے پیروی کا ارشاد ہوا۔ اس مقدمے میں کوئی قانونی سوال زیر بحث نہیں تھا۔ واقعات ہی زیر بحث تھے۔ لیکن تنازعہ فرضی تھا۔ شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ اصل واقعات کیا ہیں۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے بائیس سال کے لمبے عرصے میں کئی بار مسجد میں جلسے ہوتے رہے تھے۔ جن میں غیر مسلم اصحاب بھی شریک ہوتے رہے۔ خود مدعیان اور ان کے گواہ بیرون عدالت تسلیم کرتے تھے کہ مسجد پر ۱۹۰۴ء سے جماعت احمدیہ کا قبضہ چلا آتا ہے۔ مقدمے کی سماعت پنڈت اونکار ناتھ زتشی صاحب سینیئر سب جج کر رہے تھے۔ جب گواہ کے بعد گواہ پیش ہوتا اور اوّل سے آخر تک فرضی کہانی بیان کرتا چلا جاتا اور سنجیدگی سے محض اپنے تخیل سے فرضی واقعات کا طومار کھڑا کر دیتا تو سب جج صاحب اپنی حیرت کے اظہار کو نہ روک سکتے۔ گو ان میں سے اکثر کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ عدالت سے باہر جب میں ان کی دروغ بیانی پر تعجب کا اظہار کرتا تو وہ بغیر کسی پشیمانی کے ہنس کر کہہ دیتے صاحب یہ جھوٹ تھوڑا ہے۔ یہ تو باطل کے مقابلے میں حق کو سربلند کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ تو ثواب کا کام ہے ہم اپنے ذاتی فائدے کے لئے تھوڑے ایسا کر رہے ہیں۔ آخر جب عدالت سے باہر بار روم میں اور دیگر مجلسوں میں ان کی اس حرکت پر نفرین ہونے لگی اور غیر از جماعت معززین نے بھی مدعیان کو ملامت کرنا شروع کیا تو

مدعیان نے اس شرط پر دعویٰ واپس لے لیا کہ خرچے کا بار ان پر نہ ڈالا جائے۔

اسی سلسلے میں چند سال بعد سابق ریاست بہاولپور میں ایک مقدمہ ہوا جس میں شوہر کے سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے پر اس کے ارتداد اور تنسیخ نکاح کا سوال اٹھایا گیا۔ ابتدائی عدالت سے لیکر عدالت عالیہ ریاست بہاولپور تک متفقہ طور پر قرار دیا گیا کہ مطابق فیصلہ جات پٹنہ ہائی کورٹ و مدراس ہائی کورٹ جماعت احمدیہ کے افراد مسلمان ہیں اور دعویٰ خارج ہوا۔ مدعیہ کی طرف سے وزیر اعظم خان بہادر نبی بخش محمد حسین صاحب کی خدمت میں درخواست نظر ثانی گذاری گئی۔ وزیر اعظم صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ ریاست کی عدالتیں برطانوی ہند کی عدالت ہائے عالیہ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ شرعی ہے۔ ریاست کی عدالتوں کو شریعت کے اصولوں کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ فیصلہ زیر نظر منسوخ کیا جاتا ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اس قضیئے کی از سر نو سماعت ہو۔ چنانچہ محمد اکبر خاں صاحب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مقدمے کی از سر نو سماعت شروع ہوئی۔ فریقین کی طرف سے تمام مسائل متنازعہ فیہا پر شہادت شروع ہوئی اور مقدمہ ایک مذہبی معرکے کی شکل اختیار کر گیا۔ حفظِ امن کی غرض سے عدالت کے اندر اور باہر پولیس کا پہرہ مقرر ہوا۔ مدعا علیہ شوہر کی طرف سے میرے چھوٹے بھائی چوہدری اسداللہ خاں صاحب بیرسٹر پیروکار تھے۔ علمائے سلسلہ احمدیہ کی شہادت سلسلہ کے عقائد کے متعلق ہوئی۔ ایسے مسائل پر شہادت بھی بحث کا رنگ پکڑ جاتی ہے۔ شہادت کے دوران میں ہی عدالت کے اندر جو دو کانسٹیبل پہرہ پر مقرر تھے ان میں سے ایک نے سلسلہ احمدیہ میں بیعت کر لی! ایک مرحلہ پر مدعیہ کے ایک گواہ پر جرح کے دوران میں چوہدری اسداللہ خاں صاحب نے ایک سوال کیا جس پر ڈسٹرکٹ جج صاحب نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور فرمایا اس سوال کا جواب تو ہم مسل پر ثبت نہیں کریں گے اس سے تو اعلیٰ حضرت والئی ریاست کی ہتک ہوتی ہے اور ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ ایسی کوئی بات مسل پر آنے دیں۔ عزیزم اسداللہ خاں نے گذارش کی کہ جواب سے تو صرف یہ ظاہر ہوگا کہ مدعیہ کا ادعا بالکل باطل ہے اور گواہ کا موقف غلط ہے۔ اعلیٰ حضرت کی ذات پر تو کوئی حرف نہیں آتا لیکن ڈسٹرکٹ جج صاحب مصر رہے کہ وہ جواب مسل پر ثبت نہیں فرمائیں گے۔ اس گواہ نے بیان کیا تھا کہ جماعت احمدیہ کے افراد کافر ہیں لہٰذا ایک مسلمان خاتون کا نکاح احمدی کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی مسلمان خاتون احمدی کی زوجیت میں آئے تو وہ زنا کی مرتکب ہوگی۔ چوہدری اسداللہ خاں صاحب نے گواہ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت والئی بہاولپور کی پھوپھی بیگم صاحبہ محترمہ مرحومہ کا نکاح خان عبدالحمید خاں صاحب فرزند اکبر خان بہادر خان عبدالغفور خاں صاحب خان آف زیدہ کے ساتھ ہوا تھا اور اس نکاح سے بفضل اللہ

اولاد بھی ہوئی جو عین حیات ہے؟ گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ چودھری اسداللہ خاں صاحب نے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ خان عبدالحمید خان صاحب بوقت نکاح احمدی تھے اور اب تک بفضل اللہ جماعت احمدیہ کے مخلص رکن ہیں؟ اس پر جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب نے فرمایا ہم ان سوالوں کا جواب ہرگز قلمبند نہیں کریں گے یہ تو اعلیٰ حضرت کی توہین ہے۔ چودھری اسداللہ خاں صاحب نے عرض کیا کہ سوال کی غرض تو یہ ثابت کرنا ہے کہ پٹنہ ہائی کورٹ اور مدراس ہائی کورٹ کے فیصلے تو الگ رہے۔ خود اعلیٰ حضرت اور آپ کے مشیر علمائے کرام کا فیصلہ ہے کہ جماعت احمدیہ کے افراد پکے مسلمان ہیں ورنہ یہ رشتہ کیسے طے پاتا؟ جج صاحب تو ان سوالوں کا جواب مسل پر تحریر کرنے میں اعلیٰ حضرت کی ہتک تصور کرتے تھے درحالیکہ اعلیٰ حضرت کی ہتک یہ قرار دینے یا تصور کرنے میں ہوتی کہ آپ ایک خلاف شریعت فعل کے مرتکب ہوئے!

ضلع کی عدالتوں میں وکالت کے کام کو میں نے اپنی طبیعت کے موافق نہ پایا جب میں نے انڈین کیسیز میں کام شروع کیا تو اس وقت میری طبیعت پریکٹس سے کچھ اکتائی ہوئی تھی۔ چودھری شہاب الدین صاحب سے جو خط وکتابت ہوئی اس میں یہی ملحوظ تھا کہ جب تک میں انڈین کیسیز میں کام کروں گا عدالتی کام کام نہیں کروں گا۔ لیکن لاہور پہنچنے کے بعد آہستہ آہستہ میں عدالتی کام کی طرف کھچتا چلا گیا۔ اس تبدیلی میں سب سے بڑا حصہ تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا تھا۔ حضورؓ نے خاکسار سے یہ تو کبھی نہیں فرمایا کہ تم پریکٹس کی طرف توجہ کرو یا زیادہ توجہ کرو لیکن حضورؓ کا اعتماد خاکسار کے لئے بہت ہمت افزائی کا موجب ہوا۔ ابھی میں نے کسی ہائی کورٹ میں حاضری نہیں دی تھی کہ حضورؓ نے پٹنہ ہائی کورٹ میں ایک نہایت اہم اپیل کی پیروی خاکسار کے سپرد کی۔ پھر امرتسر کے کیس میں پیروی کا ارشاد فرمایا (جب اس کیس کا فیصلہ بفضل خدا جماعت کے حق میں ہو گیا تو امرتسر کے ایک دوست نے حضورؓ کی خدمت میں کیس کا ذکر کرتے ہوئے گذارش کی کہ ظفراللہ اپنے خرچ پہ پیروی کے لئے لاہور سے امرتسر آتا رہا ہے۔ جماعت امرتسر نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے سفر خرچ کے طور پر ایک مناسب رقم پیش کی جائے۔ حضورؓ نے فرمایا یہ مناسب نہیں اس طرح قوم کی خاطر قربانی کرنے کی روح ماری جاتی ہے) ایک ذاتی مقدمہ کی پیروی کا ارشاد بھی خاکسار کو فرمایا اگرچہ احباب کا مشورہ تھا کہ میاں محمد شفیع صاحب یا مسٹر پٹمین کو وکیل کیا جائے۔ بعد میں مدراس ہائی کورٹ میں نگرانی کی پیروی کا ارشاد فرمایا۔ چودھری شہاب الدین صاحب نے بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اوّل تو شروع میں خود ہی تجویز فرمائی کہ میں ہر ہفتے میں تین دن والد صاحب کی سہولت کے لئے سیالکوٹ چلا جایا کروں پھر خود ہی فرمایا میں نہیں چاہتا کہ تم انڈین کیسیز ہی کے ہو کر رہ جاؤ عدالت کا کام ملے تو لے لیا کرو۔ عدالتی کام میں جب میرا زیادہ وقت صرف ہونے لگا تو ان کی

پیشانی پر کبھی بل نہ آیا اور ان کی شفقت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ خود عدالتی کام بہت کم لیتے تھے۔ جب لیتے تو اس پر بہت محنت کرتے اور مجھے بھی ساتھ شامل کر لیتے۔ جس سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ مل جاتا مثلاً نواب سر فتح علی خاں صاحب قزلباش کی وفات پر ان کی وصیت کے جواز کے متعلق جو دعویٰ سردار محمد علی خاں صاحب قزلباش نے دائر کیا اس میں مدعی کی طرف سے چودھری صاحب وکیل تھے اور اس میں بطور مشیر کے مجھے شامل رکھتے تھے۔ جب غالباً ۱۹۲۳ء میں امرتسر میں فرقہ دارانہ فسادات ہوئے اور فریقین کے چالان ہوئے۔ تو مسلمان ملزمان کے خلاف جو سب سے اہم چالان تھا اس کی سماعت مسٹر بورن نے کی۔ اس مقدمہ میں بھی چودھری شہاب الدین صاحب نے میاں محمد شریف صاحب سوداگر چرم امرتسر کو مشورہ دیا کہ مجھے صفائی کی طرف سے سینئر وکیل کیا جائے۔ میاں محمد شریف صاحب نے صفائی کے اخراجات کا اکثر حصہ اپنی جیب سے ادا کیا۔ مجھے کئی دن متواتر ہر روز اسی سلسلے میں امرتسر جانا پڑا۔ میری پریکٹس بفضل اللہ بڑھ رہی تھی ۱۹۲۳ء سے میرے وقت کا اکثر حصہ عدالتی کام کی مصروفیتوں میں صرف ہونے لگا۔ جس کی وجہ سے میں نے انڈین کیسیز کے دفتر میں کام کرنا بند کر دیا۔ چودھری شہاب الدین صاحب اس بات پر رضامند ہو گئے کہ جو کام مجھے گھر پر بھیج دیا جائے وہ میں کر دیا کروں اس کام کے معاوضے کی جو شرح مقرر ہوئی اس کے حساب سے اوسطاً مجھے اس کام سے اسقدر آمد ہو جاتی جسقدر مشاہرہ مجھے انڈین کیسیز سے ۲۳ء میں ملا کرتا تھا اسی سال میں نے اپنی رہائش نبت روڈ پر مجیٹھہ ہاؤس میں بطور کرایہ دار منتقل کر لی۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ مسٹر البکوینو مجھے متواتر ترغیب دیتے رہتے تھے کہ مجھے عدالتی کام کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ ان کی رائے بھی میرے لئے حوصلہ افزائی کا موجب ہوئی۔ میرے ماموں چودھری عبداللہ خاں صاحب (دانہ زید کا) نے مجھے چیف کورٹ میں سب سے پہلا کیس بھیجا۔ اس سے ایک طرف تو مجھے چیف کورٹ کے دفتری ضابطے کے ساتھ تعارف ہو گیا اور دوسرے یہ احساس ہونے لگا کہ عدالت عالیہ میں کام کا طریق میری طبیعت پر گراں نہ ہوگا۔ چند سال بعد میرے ماموں صاحب نے ہی مجھے پہلا سیشن کیس کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا۔ ۱۹۱۵-۱۶ء میں جب میں والد صاحب کے ساتھ کام کر رہا تھا مجھے ان کے ساتھ دو تین سیشن کے مقدمات کا ابتدائی تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت میں بطور رفیق کے کام کر رہا تھا اور ذمہ داری کا زیادہ تر بوجھ تجربہ کار کندھوں پر تھا۔ جب مجھے تن تنہا اپنی ذمہ داری پر قتل کے مقدمے میں ملزمان کی صفائی کا بار اٹھانا پڑا تو مجھے احساس ہوا کہ ذمہ داری کے لحاظ سے دیوانی مقدمات اور سیشن کے مقدمات میں کوسوں کا فرق ہے۔ کسی انسان کے گلے میں پھانسی کا رسہ کسا جانا یا ڈھیلا ہو جانا دونگٹے کھڑے کرنے والی ہیبتناک حقیقت ہے۔ ملزم قصوروار ہو یا بے قصور اپنی جان ہتھیلی پر لئے ہوتا ہے۔ لیکن عدالتی ڈرامے میں مرکزی حیثیت صفائی کے وکیل کی ہوتی ہے

اسے بھی ہر لحظہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک انسانی جان یا جانیں بہت حد تک اس کے علم اس کی فراست اور اس کے ضبط پر انحصار کئے ہوئے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ نتیجہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے جسے ہر قدرت ہے لیکن ملزم یا ملزمان کے ساتھ اسکی اپنی جان بھی شکنجے میں ہوتی ہے۔ اپیل کے مرحلے پر یہ احساس اسقدر شدید نہیں ہوتا کیونکہ واقعات کے ثبوت اور تردید کا مرحلہ گذر چکا ہوتا ہے۔ شہادت کی تجزیہ و تنقید اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے پر بحث ہوتی ہے۔ سیشن میں جرح پر بہت کچھ انحصار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایک غیر ضروری یا غیر محتاط سوال ملزم کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ یا کسی ضروری سوال کے متعلق غفلت یا کوتاہی ملزم کے خلاف قیاس مضبوط کر دیتی ہے۔ اور کارروائی کے دوران میں سوچ بچار کا زیادہ موقعہ نہیں ہوتا۔

میرا پہلا سیشن کیس | میرے پہلے سیشن کیس میں آٹھ ملزمان پر (جو آپس میں چچیرے بھائی تھے) اپنے ایک چچا کے قتل کا الزام تھا۔ مختصر واقعات یہ تھے کہ جیسے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اکثر ہوتا ہے خاندان میں کاشت اراضیات کے سلسلے میں باہمی تکرار ہو جاتی تھی اور مقتول جو کنبے میں سرکردہ ہونے کی حیثیت رکھتا تھا اپنے بھتیجوں کیساتھ سختی سے پیش آتا تھا ایک ایسے موقعہ پر مقتول ملزمان کے کوئیں پر اپنے بیٹوں سمیت آگیا۔ انہیں کنواں چلانے سے روکدیا کنوئیں کی ماہل کاٹ دی جس کے نتیجے میں آبپاشی کا تمام سامان کنوئیں میں گر گیا اس کے بعد اپنے بیٹوں سمیت ملزمان میں سے جو موجود تھے ان پر دھاوا بول دیا۔ ان کی جان پر آبنی۔ انہوں نے بھی ڈانگ سوٹا جو کچھ میسر آیا ہاتھ میں لے لیا اور مقابلے پر ڈٹ گئے۔ زدوکوب میں چچا کے سر پر ضربات لگیں۔ دونوں فریق کا جوش ٹھنڈا ہوا۔ چچا کے بیٹوں نے گھر جا کر آپ کی تیمارداری میں سعی کی۔ اوپلے جلا کر گرم راکھ اس کے سر کی ضربات پر باندھی۔ گرم دودھ میں گھی ملا کر پلایا بھتیجوں نے معافی طلب کی بڑے میاں نے معاف کیا اور طرفین کو نصیحت کی کہ آپس میں اتفاق سے رہنا چاہیئے۔ پولیس کو واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ سب انسپکٹر صاحب معہ عملہ کے تشریف لائے۔ بڑے میاں سے پوچھا کیا واقعہ ہوا؟ وہ جوش میں آئے اور کہا بھائیوں بھائیوں میں تکرار ہو جایا کرتی ہے ہمیں آپس میں کوئی شکوہ نہیں۔ آپ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ ہم مقدمہ بازی میں پھنس کر عدالتوں میں خوار نہیں ہونا چاہتے۔ آپ کا یہاں کچھ کام نہیں آپ تشریف لے جائیں۔ سب انسپکٹر صاحب چلے گئے۔ تیسرے دن بڑے میاں کے زخموں میں درد شروع ہوا اور خون بہنے لگا۔ ایک دو گھنٹوں کے اندر حالت خراب ہو گئی اور داعی اجل کو لبیک کہا، پولیس کو اطلاع ہوئی، تفتیش ہوئی، چالان ہوا، مقدمہ سیشن سپرد ہوا، میں ملزمان کی طرف سے پیروی کے لئے لاہور سے سیالکوٹ گیا۔ لالہ منالال صاحب سیشن جج تھے۔ چوہدری محمد امین صاحب سرکاری وکیل تھے۔ ملزمان میں سے دو تین تو بوقت وقوعہ موجود نہیں تھے۔ باقیوں کی طرف سے میں نے جرح میں حق خود حفاظتی کی بنیاد رکھنا شروع کی اور جن واقعات کا بیان کیا ہے شہادت استغاثہ سے ان کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بحث میں اس بات سے بہت مدد ملی

کہ مقتول اپنے بیٹوں سمیت غصے اور جوش کی حالت میں ڈانگوں سے مسلح ہو کر ملزمان کے کنوئیں پر ان کی تادیب کیلئے گئے تھے۔ ماہل کاٹ ڈالی تھی اور حملے میں ابتداء کی تھی۔ اگر زیادتی ملزمان کی طرف سے ہوتی تو بڑے میاں انہیں آسانی سے معاف نہ کرتے نہ پولیس کو واپس کرتے۔ چونکہ ملزمان کے موقف کی تائید شہادت استغاثہ سے ہی ہو جاتی تھی ہم نے کوئی شہادت صفائی پیش نہ کی اور اس کے نتیجے میں بحث میں اوّل تقریر سرکاری وکیل صاحب کی ہوئی اور جوابی تقریر میری ہوئی۔ اس طریق سے حرفِ آخر کا فائدہ ہمیں حاصل ہوا۔ اگست کا مہینہ تھا مجھے لاہور جانے کی جلدی نہیں تھی۔ فیصلے کے انتظار میں میں سیالکوٹ ٹھہر گیا۔ شیخ اعجاز احمد صاحب ان دنوں سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ میں ان کے ہاں مہمان تھا۔ میں نے خواب دیکھا کہ سیشن جج صاحب قمیص اور دھوتی پہنے پلنگ پر اوندھے پڑے ہوئے بے چینی کی حالت میں کراہ رہے ہیں۔ میں نے شیخ صاحب کو خواب سنایا اور کہا تعبیر واضح ہے کہ جج صاحب کا ذہن الجھن میں ہے خدا کرے اسم بامسمیٰ ثابت ہوں۔ (پنجابی میں مُنّا سے مراد تین چوتھائی لی جاتی ہے) آٹھ ملزمان میں سے چھ کو بری کر دیں خواہ دو کو حق خود حفاظتی کی زیادتی میں چند سال قید کی سزا دیدیں۔ فیصلہ سنائے جانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اتفاق سے جج صاحب کے ریڈر صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے دریافت کیا فیصلے کی کب تک توقع کی جائے۔ انہوں نے کہا صاحب ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے تین بار جج صاحب نے فیصلہ لکھوایا ہے لیکن ابھی ان کا اطمینان نہیں ہوا بہت پریشانی میں ہیں۔ لکھواتے ہیں پھر بدل دیتے ہیں۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا جج صاحب کی تو وہی کیفیت معلوم ہوتی ہے جو مجھے خواب میں دکھائی گئی۔ خدا خیر کرے۔ آخر فیصلہ سنایا گیا۔ چھ ملزم بری ہوئے دو کو حق خود حفاظتی سے تجاوز کرنے کی وجہ سے پانچ پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ملزمان، ان کے متعلقین اور ماموں صاحب نے اسے کامیابی شمار کیا اتفاق سے چوہدری محمد امین صاحب کے ساتھ اسی روز ملاقات ہوئی۔ فرمایا تو تمہیں مزید فیس دلوانے کا انتظام کرتے ہیں۔ میرے نزدیک فیصلہ بالکل غلط ہوا ہے۔ میں حکومت کو تحریک کر رہا ہوں کہ اس فیصلے کے خلاف حکومت کی طرف سے اپیل کی جائے۔ میں نے یہ ذکر ماموں صاحب سے کیا ملزمان اور متوفی کے کنبے کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ملزمان کا گاؤں "اونچا چہ" دانہ زید کا سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملزمان کو مزید مشکل کا سامنا ہو۔ مجھ سے پوچھا کیا کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ حکومت اپیل کرنے سے رک جائے میں نے کہا ایک صورت ہے کہ جن دو ملزمان کو سزا ہوئی ہے ان کی طرف سے فوراً ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی جائے۔ چونکہ میں نہیں جانتا سیشن جج نے اپنے فیصلے کی بنا کس بات پر رکھی ہے۔ لہٰذا فیصلہ پڑھنے کے بعد ہی صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے کہ اپیل میں کامیابی کی کس حد تک توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر اپیل خارج بھی ہو جائے تو سیشن جج صاحب کے فیصلے پر ہائی کورٹ کی تصدیق ہو جائے گی اور اگر حکومت بعد میں اپیل دائر بھی کرے تو وہ اپیل بے نتیجہ ہو گی۔ ہم اگر جلد اپیل

دائر کر دیں تو اسکی سماعت چھ ہفتوں تک ہو جائے گی۔ حکومت کے اپیل دائر کرنے کی میعاد چھ ماہ ہے۔ سرکاری وکیل صاحب اپنی رائے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بھیجیں گے اگر وہ اتفاق کریں گے تو وہ کاغذات کمشنر صاحب کو بھیجیں گے اگر انہیں اتفاق ہوا تو وہ لیگل ریممبرینسر کو بھیجیں گے اور وہ گورنمنٹ ایڈووکیٹ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد طے کریں گے کہ اپیل دائر کی جائے یا نہ۔ اس تمام کارروائی کی تکمیل سے کہیں پہلے ہماری اپیل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی مشورہ کے مطابق اپیل دائر کر دی گئی۔ سیشن جج صاحب کا فیصلہ پڑھنے سے مجھے اور اطمینان ہو گیا کہ بفضل اللہ اپیل منظور ہو گی۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں مجمل طور پر تجویز کیا تھا کہ ان دو ملزمان نے حق خود حفاظتی کی حدود سے تجاوز کیا ہے اور یہ تجویز انہیں مجرم قرار دینے کے لئے کافی نہیں تھی۔ اگر چند اشخاص میں سے بعض خود حفاظتی کی حدود سے تجاوز کریں تو ان میں سے کسی کو مجرم قرار دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جج یہ تجویز کرے کہ فلاں ضرب یا ضربات حد سے تجاوز تھیں۔ اور وہ خاص ضرب یا ضربات فلاں ملزم نے رسید کیں اگر شہادت سے یہ ثابت نہ ہو سکے تو کسی ملزم پر جرم عاید نہیں کیا جا سکتا۔ اپیل کی سماعت کے دوران میں میں نے یہی عذر پیش کیا اور اس کی بنا پر دونوں اپیلانٹ بھی بری کئے گئے۔ اور حکومت کی اپیل کی گنجائش نہ رہی۔

مجھے اپنی پریکٹس کے دوران میں ۱۶ سولہ سیشن کیس کرنے کا موقعہ ہوا ان میں سے بفضل اللہ چودہ[۱۴] میں پوری کامیابی ہوئی۔ ایک میں سولہ[۱۶] ملزمان میں سے تیرہ[۱۳] بری ہوئے ایک کو پھانسی کی سزا ہوئی دو کو عمر قید کی۔ دوسرے میں ملزمان کو عمر قید کی سزا ہوئی۔

خان بہادر عبد الغفور خاں صاحب خان آف زیدہ سیشن جج

جن جج صاحبان کی عدالت میں میں سیشن میں پیش ہوا ان میں سے دو اپنے اپنے رنگ میں بہت ممتاز تھے۔ ان میں سے ایک خان بہادر خان عبد الغفور خاں صاحب خان آف زیدہ تھے۔ ان کی عدالت میں گو کام بڑی تیزی سے نہیں ہوتا تھا لیکن نہایت احتیاط سے ہوتا تھا۔ اور ملزمان اور ان کے وکلاء کو کوئی موقع شکایت کا نہیں ہوتا تھا۔ بار ثبوت نہ صرف قانوناً بلکہ عملاً استغاثے پر رہتا۔ ملزم کو ہر سہولت میسر آتی اور معقول شک کا فائدہ ملتا۔ جج صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیرک دماغ عطا فرمایا تھا۔ اور امیرانہ خلق بخشا تھا۔ اگرچہ ان کا رعب بھی بہت تھا لیکن وکلاء اپنے فرض کی ادائیگی میں پوری آزادی محسوس کرتے تھے اور جج صاحب کے مزاج میں کبھی تیزی نہ آنے پاتی تھی۔ ان کے روبرو میرے پہلے کیس میں دو ملزم تھے سردارا اور خوشیا۔ پہلے کی طرف سے میں وکیل تھا دوسرے کی طرف سے میرے مشورے سے میرے شاگرد اور دوست لالہ پرتاب چند پوری کو وکیل کیا گیا تھا۔ سرکاری وکیل شیخ عطاء محمد صاحب برادر اکبر شیخ دین محمد صاحب جج ہائی کورٹ تھے۔ عدالت کا اجلاس گجرات میں تھا۔ میں نے کاغذات

کے مطالعہ کے دوران میں نوٹ کیا تھا کہ مقتول کی موت کا سبب ایک سونٹے کی ضرب تھی جو اس کے ماتھے پہ لگی جس سے اس کے دماغ کے گرد کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ شہادت استغاثہ میں بالاتفاق زور اس بات پہ دیا گیا تھا کہ سردارا نے مقتول کے سر کے وسط میں ایک خوفناک بھاری کلہاڑے سے ضربات رسید کی تھیں۔ مقتول کے سر کے وسط میں ایک ضرب تیز دھار والے آلہ کی بھی تھی جس سے چند قطرے خون کے بھی نکلے تھے لیکن یہ ضرب محض سطحی تھی اور خفیف تھی۔ اجلاس شروع ہوتے ہی میں نے درخواست پیش کی کہ سول سرجن صاحب کو مزید جرح کے لئے طلب کیا جائے۔

سرکاری وکیل صاحب۔ سول سرجن کی شہادت مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی وہاں جرح ہو چکی ان کا وہ بیان ضابطہ فوجداری کے مطابق سیشن کی مثل پہ لایا گیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ انہیں دوبارہ طلب کیا جائے۔

سیشن جج صاحب۔ سینئے صاحب۔ ہمارا اختیار سول سرجن کو طلب کرنے کا ہے یا نہیں؟

سرکاری وکیل صاحب۔ بیشک آپ کا اختیار ہے لیکن آپ اختیار اصول کی بنا پہ استعمال کریں گے اور یہاں کوئی اصولی بات پیش نہیں کی گئی۔

سیشن جج صاحب۔ وکیل صفائی سول سرجن کے بیان کی وضاحت چاہتے ہیں۔

(ریڈر سے مخاطب ہو کر) سول سرجن کو پرسوں کے لئے بلا لو۔

سردارا قوی ہیکل جوان تھا اور گاؤں میں اپنے گروہ کا سرغنہ تھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ اس واردات کے وقت موقعہ پہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے استغاثے کی طرف سے اسے پھانسنے کے لئے قتل کی زیادہ تر ذمہ داری اس پہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جب سول سرجن صاحب حاضر ہوئے تو میں نے ان سے سوال کیا مقتول کی موت کس ضرب کے نتیجے میں واقعہ ہوئی؟

سول سرجن صاحب۔ ماتھے کی ضرب سے۔

ظفراللہ خاں۔ اس ضرب کی کیا نوعیت تھی؟

سول سرجن صاحب۔ یہ ضرب کسی کند آلے سے لگائی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ماتھے کے اندر کی ہڈی پھٹ گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں موت واقعہ ہوئی۔

ظفراللہ خاں۔ کیا مقتول کے سر پہ کوئی ضرب تیز دھار والے آلے کی بھی تھی؟ اگر تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی؟

سول سرجن۔ ایک ایسی ضرب تھی جو سطحی تھی اور جلد سے نیچے نہیں گئی تھی جلد کے پھٹنے سے کچھ خون

بھی لگا ہوا تھا۔ یہ ضرب خفیف تھی۔ اس مرحلے پر میں نے سردارے کو کھڑا ہونے کو کہا وہ اپنا کمبل جو وہ اوڑھے ہوئے تھا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چھ فٹ سے لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، وہ قوت اور مردانگی کی تصویر تھا۔

ظفراللہ خان ۔ ڈاکٹر صاحب آپ اس شخص کو دیکھیں اور اس کلہاڑے کو بھی ملاحظہ کریں اور فرمائیں کہ اگر یہ شخص لڑائی کے دوران میں غصے اور جوش کی حالت میں مقتول کے سر پر اس کلہاڑے کے ساتھ الٹی یا سیدھی ضرب لگاتا تو کیا اس ضرب کی نوعیت اور کیفیت وہی ہوتی جو مقتول کے ماتھے کی ضرب یا سر کی ضرب کی تھی ۔

سول سرجن صاحب ۔ اگر یہ شخص اس کلہاڑے کے ساتھ مقتول کے سر پر ذرا سی طاقت سے بھی ضرب رسید کرتا تو ضرب کے مقام کی ہڈی بالکل چور ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ۔ مقتول کے سر کی ضرب سطحی اور خفیف تھی ماتھے کی شدید تھی لیکن ہڈی صاف پھٹی ہوئی تھی۔ ان دونوں ضربات میں سے کوئی ضرب اس کلہاڑے سے لگی ہوئی نہیں ۔

زبانی شہادت سے بھی مترشح ہوتا تھا کہ سردارا واردات میں شامل نہیں تھا۔ جب بحث کی نوبت آئی تو میں نے جج صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ سول سرجن صاحب کی شہادت انگریزی میں ہوئی ہے ۔ مناسب ہوگا کہ ان کے بیان کا اردو ترجمہ اسیسر صاحبان کو سنا دیا جائے ۔ جج صاحب نے ریڈر کو ارشاد فرمایا کہ سول سرجن کے بیان کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنا دیں ۔ ریڈر صاحب نے اردو بیان پڑھنا شروع کیا لیکن اس میں بھی طبی اصطلاحیں انگریزی میں درج تھیں ابھی ریڈر نے تین چار سطریں ہی پڑھی تھیں کہ جج صاحب نے انہیں روک دیا۔

جج صاحب ۔ اسیسر صاحبان سول سرجن صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ سردارا ملزم نے اس کلہاڑے کے ساتھ مقتول کو نہیں مارا ۔

سرکاری وکیل صاحب اور میں جب اپنی تقریریں ختم کر چکے تو جج صاحب نے اسیسر صاحبان سے یوں خطاب فرمایا۔

اسیسر صاحبان ہمارا قاعدہ ہے کہ بحث ختم ہونے کے بعد ہم واقعات اور قانون پر مختصر سا خطاب اسیسر صاحبان سے کرتے ہیں ۔ جس سے انہیں اپنی رائے قائم کرنے میں مدد ملے ۔ لیکن اس مقدمے میں ابھی ابھی جو تقریر ملزمان کی طرف سے وکیل صفائی نے کی ہے وہ اتنی واضح اور اتنی بے رو رعایت ہے کہ اب ہمارے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ اپنی اپنی رائے بیان کریں ۔

اسیسر صاحب نمبر ۱ ۔ جناب عالی شہادت استغاثہ اور ڈاکٹری شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارا تو واردات میں شامل نہیں تھا ۔

سیشن جج صاحب ۔ اور نوشیا ؟

اسیسر صاحب - جناب عالی خوشیئے کے متعلق تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ موجود تھا -

سیشن جج صاحب - ارے صاحب جو شہادت سردارے کے خلاف ہے وہی خوشیئے کے خلاف ہے اگر وہ نہیں تھا تو یہ بھی نہیں تھا -

اسیسر صاحب - جناب عالی خوشیئے کے متعلق تو خیال ہوتا ہے کہ وہ موجود تھا -

سیشن جج صاحب - اچھا صاحب آپ کی مرضی -

اسیسر صاحبان نمبر ۲، ۳، ۴ نے اسیسر صاحب نمبر ۱ کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا - جج صاحب نے حکم دیا کہ ملزمان کو دو دن بعد فیصلہ سننے کے لئے بعلم ان کی عدالت میں پیش کیا جائے - فیصلے میں دونوں کو بری کر دیا -

اس چالان میں سردارے اور خوشیئے کے علاوہ تین چار اور بھی ملزم درج تھے - لیکن وہ مفرور تھے - خوشیئے کی طرف سے بھی یہی عذر تھا کہ وہ واردات میں شامل نہیں تھا - بعد میں معلوم ہوا کہ اسیسر صاحب نمبر ۱ واردات کے تین چار گھنٹے کے اندر اتفاقاً اپنے کسی کام کی خاطر پنڈی بہاؤالدین گئے تھے جہاں یہ واردات ہوئی تھی اور انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سردارا شامل نہیں تھا - لیکن اسے پھنسانے کی کوشش ہو رہی ہے - غالب قیاس ہے کہ یہ ذکر انہوں نے دوسرے اسیسر صاحبان سے کیا ہو گا - میں نے اس واردات سے پہلے سردارے کو لاہور میں دیکھا تھا - ایک دیوانی اپیل میں اس نے مجھے وکیل کیا تھا - اس موقعہ پر میں نے اسکی شکل و شباہت کے متعلق مذاقاً اسے کہا تھا اگر کبھی تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ کھڑا کر دیا گیا تو جج صاحب تمہاری شکل دیکھتے ہی قیاس کر لیں گے کہ تم نے جرم کا ارتکاب کیا ہے - چند مہینے بعد یہ واردات ہو گئی اور جب مقدمہ سیشن میں گیا تو اس کی طرف سے پیغام آیا کہ میرے خلاف قتل کا مقدمہ کھڑا کر دیا گیا ہے اب آ کر میری صفائی کرو - خان آف زیدا کارروائی کے دوران میں بھی اپنی رائے کے اظہار سے نہیں رکتے تھے - اور شہادت اور وکلاء کی بحث کے بعد جب اسیسر صاحبان سے خطاب کرتے تو اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتے - ایک سیشن کیس میں تین ملزم تھے (میں اس کیس میں وکیل نہیں تھا) ایک عورت تھی ایک نوجوان لڑکا اور ایک پوری عمر کا مرد اس کیس میں جج صاحب نے اسیسر صاحبان سے یوں خطاب فرمایا

"اسیسر صاحبان اس میں ان تینوں ملزمان پر قتل کا الزام ہے - ان میں سے ایک عورت ہے - آپ جانتے ہیں اور ہم بھی جانتے ہیں اور گاندھی جی نے بھی کہا ہے کہ عورت کا کام ہے کہ گھر میں بیٹھے اور چرخہ کاتے - عورت کو مردوں کی لڑائی بھڑائی کے ساتھ کیا واسطہ ؟ پھر پولیس نے اس عورت کا چالان کیسے کر دیا - آپ نے دیکھا ہے کہ یہ بک بک بہت کرتی ہے - معلوم ہوتا ہے دوران تفتیش میں بھی پولیس

کو اپنی بک بک سے دق کرتی رہی - انہوں نے خیال کیا یہ ضرور واردات میں شریک ہو گی اس کا بھی ضرور چالان کرنا چاہیئے - اور یہ دوسرا یہ تو ابھی بچہ ہے یہ کیسے قتل میں شامل ہو گا - البتہ تیسرے کے متعلق مضبوط شہادت ہے کہ اس نے مقتول کو مارا - اب قتل دو قسم کا ہے ایک بڑا قتل ہے ایک چھوٹا قتل بڑا قتل یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مارنا چاہتا ہے اور اسے مار ڈالتا ہے - اور چھوٹا قتل یہ ہے کہ مارنا تو نہیں چاہتا لیکن اتفاقاً وہ مر جاتا ہے - اس بات کی تو کوئی شہادت نہیں کہ یہ ملزم مقتول کو مار ڈالنا چاہتا تھا - اس لئے بڑا قتل تو اس نے کیا نہیں اب آپ بتائیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے؟ اس خطاب کے بعد اسیسر صاحبان سوائے چھوٹے قتل کے اور کیا کہہ سکتے تھے -

میاں احسان الحق صاحب سیشن جج | دوسرے سیشن جج جو اپنے کام میں بہت ممتاز تھے میاں احسان الحق صاحب تھے - میرے سیالکوٹ میں پریکٹس کرنے کے زمانے میں میاں صاحب سیالکوٹ میں سرکاری وکیل تھے - وہیں سے سیشن جج ہوئے - مجھے کیمل پور میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر تین سیشن کیسز ان کی عدالت میں کرنے کا اتفاق ہوا - وہ پوری تیاری کے بعد عین وقت پر اجلاس شروع کرتے اور بہت جلد جلد لیکن کامل توجہ کے ساتھ کام کرتے - مجھے جرح کو لمبا کرنے کی عادت نہیں تھی - میں بھی اپنی تیاری میں یہ طے کر لیتا تھا کہ شہادت استغاثہ سے کن امور کی تائید میرے مقصد میں ممد ہو گی اور اسی کے متعلق گواہوں سے سوال کرتا - یہ طریق انہیں بھی پسند تھا مجھے اس سے بہت فائدہ ہوا - تینوں مقدمات میں شہادت اور بحث تین چار گھنٹوں میں ختم ہو جاتی رہی - اس کے فوراً بعد میاں صاحب فیصلہ لکھوا دیتے -

سید افضل علی صاحب کا محکمہ انکم ٹیکس میں تقرر | جب پہلی جنگ یورپ کے اختتام کے بعد حکومت پنجاب نے پبلسٹی کے محکمہ کو بند کرنے کا فیصلہ کیا تو سید افضل علی صاحب کو نئے سرے سے تلاش روزگار کی فکر ہوئی - عین اس وقت حکومت ہند نے انکم ٹیکس کا الگ محکمہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا - اور انکم ٹیکس کلکٹر اور انکم ٹیکس انسپکٹر کی آسامیوں کے لئے درخواستیں طلب کیں - میں نے سید افضل علی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کلکٹر کی آسامی کے لئے اپنی درخواست بھیج دیں - انہوں نے کہا کلکٹر کی اسامی کیلئے میرا انتخاب غیر اغلب ہے ایسا نہ ہو کلکٹری کے پیچھے دوڑوں اور انسپکٹری بھی ہاتھ سے جائے - میں نے زور دیا کہ کلکٹری کے لئے درخواست دیں - آپ ایم اے ہیں معقول مشاہرے پر پبلسٹی کے محکمہ میں ذمہ دارانہ خدمات انجام دیتے رہے ہیں آپ کے محکمے کے افسر اعلیٰ ضرور زوردار سفارش کریں گے - لیکن وہ رضامند نہ ہوئے انکم ٹیکس انسپکٹر کی اسامی کے لئے درخواست بھیج دی - انہی دنوں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ لاہور تشریف لائے اور خاکسار کو غریب خانہ پر قیام کا فخر بخشا - سید افضل علی صاحب کو اپنی درخواست کے سلسلے میں مسٹر کنگ فنانشل کمشنر کے سامنے پیش ہونے کی اطلاع شملہ سے مل چکی تھی - انہیں حضرت صاحبؓ کے حضور نیاز تو حاصل تھا لیکن بوجہ حجاب

اور احترام خود دعا کے لئے عرض کرنے کی بجائے مجھ سے کہا کہ تم عرض کرو۔ میں نے ان کی موجودگی میں گذارش کی اور حضورؓ نے کمال شفقت کے لہجے میں فرمایا دعا کریں گے ۔ تاریخ مقررہ پر سید افضل علی صاحب شملہ گئے۔ واپسی پر بتایا مسٹر کنگ نے ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد فرمایا افسوس ہے انسپکٹر کی اسامیاں تو پر ہو چکی ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اگر صرف یہی بتانا تھا تو مجھے شملہ بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے زحمت بھی ہوئی اور اخراجات کی زیر باری بھی ہوئی۔ پھر بھی میں نے رسماً شکریئے کے الفاظ کے ساتھ رخصت طلب کی اس پر مسٹر کنگ مسکرائے اور کہا انسپکٹر کی اسامیاں تو پر ہو چکی ہیں لیکن کلکٹر کی اسامیوں میں ابھی گنجائش ہے اگر تمہیں منظور ہو تو اس پر تمہارا تقرر کر دیا جائے۔ (بعد میں اس عہدے کا نام بدل کر انکم ٹیکس افسر کر دیا گیا) چنانچہ سید افضل علی صاحب کا تقرر بطور انکم ٹیکس کلکٹر ہو گیا اور رہتک میں تعیناتی ہوئی۔ اس کے جلد بعد مجھے ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا قیام انہیں کے ہاں تھا۔ مغرب سے پہلے ہم دونوں سیر کو نکلے تو میں نے دیکھا ان کا اردلی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے سید صاحب سے کہا واپس چلیں کہنے لگے کیوں کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا آپ کی کلکٹری ہماری نگرانی کر رہی ہے اور میں افضل علی کی رفاقت چاہتا ہوں انکم ٹیکس کلکٹر سے مجھے سروکار نہیں۔ کہنے لگے یہ خود ہی میرے پیچھے چلا آتا ہے میں اسے منع نہیں کرتا کہ اسکی دلشکنی نہ ہو اب اسے کہہ دیتا ہوں تم میرے ساتھ ہو اسکی ضرورت نہیں! میں نے دریافت کیا کام کیسے چل رہا ہے؟ کہنے لگے میں قانون تو جانتا نہیں اور مجھے وکلاء کی بحث سنکر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ابھی تو یہ حالت ہے کہ ایک وکیل بحث کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ ٹھیک کہتا ہے دوسرا اس کا جواب دیتا ہے تو خیال کرتا ہوں یہ ٹھیک کہتا ہے بحث کے آخر میں میری طبیعت کا رجحان آخری تقریر کرنے والے کے حق میں ہوتا ہے! میں نے کہا تھوڑے سے تجربے کے بعد وکیلوں کا رعب جاتا رہے گا۔ کہنے لگے وکلاء کی بحث سے اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے سن لیا ہے۔ جب وکیل نہیں ہوتے تو مشکل بڑھ جاتی ہے۔ سائل دھائی دیتا ہے۔ حضور کے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔ حضور کے بیوی بچوں کے تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں رہے گا۔ پہلے تو میں خیال کرتا تھا مجھے بددعائیں دیتے ہیں پھر میں سمجھا کہ عجز اور انکساری کے طور پر اپنے بیوی بچوں کو میرے بیوی بچے کہہ کر توجہ دلاتے ہیں کہ اگر ٹیکس میں تخفیف نہ ہوئی تو ان کا برا حال ہو گا۔ سید افضل علی صاحب نے اپنے محکمے میں دیانت، قابلیت اور فرض شناسی کا بہت اعلیٰ معیار قائم کیا اور بہت نیک نام افسر ثابت ہوئے۔ چند سالوں کی خدمت کے بعد اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے اور اگر عمر وفا کرتی تو یقیناً ملازمت کی میعاد پوری کرنے سے پہلے کمشنر ہوتے لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور آج سے زائد از تیس سال قبل داعی اجل کو لبیک کہا۔ یغفر اللہ لہ ویجعل اللہ الجنۃ العلیاء مثواہ۔ ہمارے درمیان اوائل ایام طفولیت میں دوستی کا رشتہ قائم ہوا اور ان کے آخری

دم تک قائم رہا۔ کبھی بھولے سے بھی ہمارے درمیان رنجش چھوڑ غلط فہمی بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑے تھے۔ لیکن ان کا سلوک میرے ساتھ ہمیشہ بڑے بھائی کی شفقت کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی کے احترام اور اطاعت کا نمونہ رہا۔ یہ سب انکی صفائی قلب اور اعلیٰ خلق کا تقاضا تھا۔ میری کسی خوبی کا اس میں دخل نہ تھا ان کی وفات پر تیس سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے لیکن ان کی یاد میرے دل میں ہر لحظہ تازہ ہے اور بفضل اللہ کوئی دن نہیں گذرتا کہ اس میں میری طرف سے ان کے لئے دعائے مغفرت میں ناغہ یا کوتاہی ہو وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن عجز، انکسار، تواضع اور حیا ان کے خاص جوہر تھے۔ اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشاء پرداز تھے ان کے مضامین کا مجموعہ "تخیلات" بلند پایہ اور مایۂ ناز ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

مرکزی اسمبلی کی رکنیت کیلئے انتخاب میں حصہ لینا | ۱۹۲۳ء میں پنجاب کونسل کا دوسرا انتخاب ہوا۔ مجھے کونسل میں جانے کا کوئی ایسا شوق نہیں تھا۔ چودھری شہاب الدین صاحب ۱۹۲۰ء میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور اب وہ چاہتے تھے کہ پنجاب کونسل میں آجائیں۔ ان کا اصل وطن بھی ضلع سیالکوٹ میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے اس خواہش کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ سیالکوٹ سے منتخب ہونا چاہتے ہیں بشرطیکہ میں اس حلقے سے کھڑا نہ ہونا چاہوں میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے تو کوئی شوق نہیں لیکن اگر حضرت خلیفۃ المسیحؓ نے ارشاد فرمایا تو مجھ پر تعمیل واجب ہو گی۔ جناب چودھری صاحب نے حضرت صاحب کی خدمت میں تحریراً گذارش کی کہ انہیں سیالکوٹ سے کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ ظفر اللہ خاں آپکے کھڑے ہونے کے متعلق رضامندی دے چکا ہے اسلئے ہم بھی رضامند ہیں لیکن یہ رضامندی صرف اس انتخاب کے متعلق ہے آئندہ انتخابات پر اس کا اثر نہ ہو گا۔ خاکسار کے متعلق حضور نے فرمایا کہ یہ پبلک ذمہ داری کے کاموں سے گھبراتا ہے اسے ان امور کی عادت ڈالنے کے لئے ہدایت دی جائے کہ اضلاع لاہور، امرتسر، گورداسپور، فیروزپور کے حلقے سے مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو۔ اس حلقے سے تین امیدوار تھے۔ حلقے میں شہر اور دیہات دونوں شامل تھے اور شہری رائے دہندگان کی بھاری کثرت تھی۔ شیخ صادق حسن صاحب امرتسر سے امیدوار تھے شہر امرتسر میں علاوہ ان کے خاندانی اور کاروباری رسوخ کے ان کی کشمیری برادری کے بہت سے ووٹ تھے۔ اور شہر لاہور میں بھی یہی صورت تھی یوں بھی قیاس یہی تھا کہ وہ کامیاب ہو جاتے لیکن ساتھ ہی انہوں نے علمائے کرام سے فتویٰ پر دستخط حاصل کر کے بڑے بڑے اشتہار شہروں اور قصبوں کی دیواروں پر جا بجا چسپاں کرا دیئے کہ ظفر اللہ خاں کو ووٹ دینا ناجائز ہے کیونکہ وہ قادیانی ہونے کی وجہ سے کافر ہے۔ قواعد انتخاب کے لحاظ سے یہ کارروائی ناجائز اور انتخاب کو باطل کرنے والی تھی شیخ صادق حسن صاحب انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ میں دوسرے نمبر پر آیا باقی دونوں امیدوار تیسرے اور چوتھے نمبر پر آئے۔ شیخ صاحب کی حمایت میں نشر کردہ اشتہاروں نے ایک اصولی سوال کھڑا کر دیا تھا۔ جس کے حل

کرنے کی یہی صورت تھی کہ انتخابی ٹریبونل کے سامنے یہ سوال لایا جائے اور انتخاب کو باطل قرار دیئے جانے کی درخواست کی جائے۔ درخواست کا علم ہونے پر شیخ محمد صادق صاحب (برادر اصغر شیخ صادق حسن صاحب) میرے پاس لاہور تشریف لائے اور منت سماجت سے مجھے درخواست کی پیروی سے دست کش ہونے پر آمادہ کرنے کی سعی کرتے رہے۔ میں نے ان سے تو کوئی وعدہ نہ کیا لیکن ان کی تشریف آوری کا ذکر اور انکی گفتگو کا خلاصہ حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی خدمت میں گذارش کر بھیجا۔ حضورؓ نے ارشاد فرمایا کہ شیخ محمد صادق صاحب کا یہ کہنا کہ یہ اشتہار بازی ان کے ایما سے نہیں ہوئی تو بالبداہت غلط ہے اور یہ کہنا کہ یہ اشتہار بازی محض بعض لوگوں کی طرف سے ایک قسم کا مذاق تھا سنجیدہ باتوں سے تمسخر ہے سو بہت قابلِ افسوس ہے۔ لیکن ان کی منت سماجت سے ظاہر ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی اس غلط حرکت کے نتیجے میں انتخاب باطل قرار دیا جائے گا۔ اور انہیں پریشانی صرف اس وجہ سے ہے کہ جو چیز اتنی تگ و دو کے بعد حاصل کی ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ان کی طرف سے کسی قسم کا اظہار نہیں ہوا کہ اُن کی یہ حرکت ناواجب تھی، اور وہ اس پر نادم ہیں۔ بایں ہمہ جب وہ اپنے برادر اکبر کی طرف سے اور لازماً ان کے ارشاد کے ماتحت امرتسر سے چلکر تمہارے پاس آئے تو یہ عملاً ندامت کا اظہار ہے۔ پھر وہ انگلستان میں تمہارے ساتھ رہے ہیں اور تمہارے درمیان دوستانہ تعلقات بھی رہے ہیں تمہاری طرف سے حسنِ سلوک مناسب ہے۔

چنانچہ حضورؓ کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے درخواست کی مزید پیروی ترک کر دی۔

پرنس آف ویلز حال ڈیوک آف ونڈسر کی لاہور تشریف آوری پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی طرف سے کتاب تحفہ شہزادہ ویلز میں قبول اسلام کی دعوت

شہزادہ ویلز (حال ڈیوک آف ونڈسر) ۱۹۲۲ء میں ہندوستان کی سیاحت کیلئے تشریف لائے اور اس دوران میں ان کا ورود لاہور میں بھی ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے جماعت احمدیہ کی طرف سے شہزادہ ویلز کے لئے ایک نہایت قابلِ قدر تحفہ کتاب کی شکل میں تیار کیا جس میں اسلام کی حقانیت اور اس کے زندہ مذہب ہونے کے دلائل پیش کرکے اور عیسائیت کی موجودہ تعلیم اور اسلام کی تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے شہزادے کو قبول اسلام کی دعوت دی۔ یہ کتاب حضورؓ نے اردو میں تحریر کی اور اس کا مسودہ خاکسار کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے ارسال فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ پانچ دن کے اندر ترجمہ تیار کرکے قادیان لے آؤ یہاں نظر ثانی کی جائے گی۔

مجھے ان دنوں دن بھر مصروفیت رہتی تھی ترجمے کے لئے فقط شام کا وقت میسر آتا تھا۔ جیسے جیسے میں ترجمہ کرتا ساتھ ساتھ انگریزی مسودہ ٹائپ کر دیا جاتا۔ محض اللہ تعالےٰ کے فضل و رحم سے یہ اہم ذمہ داری حضورؓ کی مقرر کردہ میعاد کے اندر پوری ہوگئی اور خاکسار ترجمہ لیکر حضورؓ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ دو دن میں نظر ثانی بھی مکمل ہوگئی اور مسودہ طباعت کے لئے تیار ہوگیا۔ خاکسار جب حضورؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضورؓ نے فرمایا ایک بات تمہیں کہنا یاد نہ رہا کہ انگریزی عبارت کا انداز انجیل کے انداز پر ہونا چاہیئے۔ خاکسار نے گذارش کی کہ اصل تحریر کے انداز

سے ہی خاکسار نے یہ قیاس کر لیا تھا اور خاکسار نے حضورؓ کے منشاء کے مطابق زبان کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمے کی نظر ثانی میں حضورؓ خود شامل تھے اور حضورؓ کے ساتھ صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے مولوی شیر علی صاحبؓ ایم اے اور ماسٹر محمد دین صاحب بی اے بی ٹی شریک تھے۔ اس مجلس کا اجلاس فجر کی نماز کے بعد شروع ہو جاتا تھا۔ اور عشاء کی نماز کے بعد تک جاری رہتا تھا صرف نمازوں اور کھانوں کیلئے توقف ہوتا تھا۔ گو دونوں دن حد درجہ کی مصروفیت رہی اور کام بھی پوری توجہ اور احتیاط کا طالب تھا لیکن اس پاکیزہ صحبت اور صالح مصروفیت کے دوران میں طبیعت ایک لمحہ کے لئے بھی اکتائی نہیں نہ کسی وقت کوئی کوفت محسوس ہوئی حضرت صاحب کی بشاش طبیعت نے حضورؓ کے سب رفقاء کو بشاش اور خرم رکھا۔ کتاب وقت پر تیار ہو گئی اور اس کی ایک خاص جلد چاندی کے خوبصورت بکس میں شہزادہ ویلز کو پیش کر دی گئی۔ چالیس سال بعد اقوام متحدہ کی اسمبلی کا سترھواں اجلاس نیویارک میں ہو رہا تھا جس کا میں صدر تھا۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کی دعوت سے لوٹنے پر میں جلدی میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ دیکھا اقوام متحدہ کے قانونی محکمہ کے ڈائریکٹر ایک صاحب کے ساتھ کھڑے گفتگو میں مصروف ہیں۔ میں نے ان سے پہلو بچا کر نکلنا چاہا انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے ٹھہرا لیا اور کہا صاحب صدر اتنی جلدی کیا ہے ذرا رکیئے میں آپ کا تعارف ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر سے کرا دوں۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ جب آپ لاہور تشریف لائے تھے تو مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ کہنے لگے مجھے لاہور جانا خوب یاد ہے میں نے وہاں بہت اچھا وقت گذارا میں نے کہا مجھے یہ بھی فخر حاصل ہے کہ جو کتاب جماعت احمدیہ کی طرف سے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اس کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں میں نے کیا تھا۔ انہوں نے بلا تامل اور بے ساختہ کہا وہ کتاب ابھی تک میرے پاس ہے۔

جماعت احمدیہ لاہور کے امیر کے طور پر تقرر | خلافت ثانیہ کے دور کی ابتداء میں جب جماعت میں اختلاف ہوا میرے والد صاحب اس وقت جماعت سیالکوٹ کے پریذیڈنٹ تھے۔ میں نے انگلستان کی واپسی پر سیالکوٹ کے قیام کے زمانے میں کچھ عرصہ جماعت کے محاسب کی خدمت سرانجام دی۔ خلافت ثانیہ کے ابتدائی سالوں میں حضرت خلیفۃ المسیحؓ نے بعض جماعتوں میں امارت کا نظام جاری فرمایا۔ خان صاحب مولوی فرزند علی خاں صاحب سب سے پہلے امیر فیروزپور میں مقرر ہوئے۔ تھوڑا عرصہ بعد حضرت خلیفۃ المسیحؓ لاہور تشریف لائے اور ایمپرس روڈ پر احمدیہ ہوسٹل میں قیام فرمایا۔ والد صاحب بھی قادیان سے تشریف لائے اور ماموں صاحب دانہ زید کا سے آئے میں ان دنوں بازار جج محمد لطیف میں رہتا تھا دونوں بزرگ وہیں قیام فرما تھے۔ ایک شام جب دونوں احمدیہ ہوسٹل حضورؓ کی خدمت میں حاضری کیلئے

تشریف لے گئے تو میں غالباً دفتر کے کام کی مصروفیت کی وجہ سے ان کی ہمراہی سے اور حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں حاضری سے محروم رہا واپسی پر والد صاحب نے کسی قدر شکوے کے لہجے میں کہا آج تم حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں تھے۔ حضورؓ نے جماعت لاہور کے افراد سے مشورہ طلب کیا تھا کہ لاہور میں کسے امیر مقرر کیا جائے ماموں صاحب نے جلدی سے کہا مشورے کے بعد حضورؓ نے تمہیں امیر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مبارک ہو۔ اس پر والد صاحب نے فوراً فرمایا لیکن تمہارے حق میں صرف ایک رائے تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں لاہور میں نسبتاً نووارد تھا اور جماعت کے سرگرم کارکنان کے مقابلے میں نوعمر بھی تھا۔ تقویٰ، عبادت، علم قرآن، خشیت اللہ، حسن کردار، تواضع، اخلاق، روحانیات، میل جول، مہمان نوازی، سلسلے کی خدمات، قربانی غرض ہر صفت کے لحاظ سے کئی بزرگ جماعت میں مجھ سے بہت درجے بلند تھے۔ ان کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں تھی اور مجھے ان کے ساتھ کوئی بھی نسبت نہیں تھی۔ میاں چراغ الدین صاحب بڑے پائے کے بزرگ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پرانے صحابی تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد جماعت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کے صاحبزادے میاں عبدالعزیز مغل صاحب نہایت مخلص اور مستعد خادم سلسلہ تھے۔ حکیم محمد حسین صاحب قریشی موجد مفرح عنبری بھی پرانے صحابی، بڑے عبادت گذار اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ سلسلے کے کاموں میں جوانوں سے بڑھ کر مستعد اور سرگرم تھے۔ سید دلاور شاہ صاحب نہایت مخلص اور سرگرم کارکن تھے سلسلے کی تبلیغ کا خاص جوش رکھتے تھے۔ بابو عبدالحمید صاحب آڈیٹر نہایت مخلص اور بڑی پابندی اور باقاعدگی سے کام کرنے والے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اہل بیت کے ساتھ انہیں خاص عقیدت تھی۔ حضرت صاحب نے جب جماعت سے مشورہ طلب فرمایا کہ لاہور کی جماعت میں امیر کسے مقرر کیا جائے تو حسب توقع جماعت کی رائے دو بزرگوں قریشی محمد حسین صاحبؓ اور سید دلاور شاہ صاحبؓ کے حق میں تھی۔ میں تو کسی شمار میں نہ تھا۔ مجھے تو اس پر بھی حیرت ہوئی کہ ایک صاحب نے میرے حق میں رائے دی۔ دارالامان واپسی پر حضورؓ نے بعض ہدایات خاکسار کو ارسال فرمائیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ امیر کو جماعت کی انفرادی اور اجتماعی بہبودی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنا چاہیئے۔ اور جماعت کو مناسب تحریک کرتے رہنا چاہیئے۔ جن امور کا فیصلہ جماعت کو کرنا ہو ان کے متعلق مشورے کا یہ اسلوب رہنا چاہیئے کہ اختلاف نہ ہو۔ اور تمام امور اتفاق رائے سے طے ہوں۔ اگر اتفاق رائے نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ کثرت رائے سے فیصلہ ہونا چاہیئے۔ امیر کو چاہیئے کہ اتفاق رائے یا کثرت رائے سے فیصلہ کرے لیکن جہاں اسکی رائے میں اتفاق رائے یا کثرت رائے کے مطابق فیصلہ سلسلے کے مفاد کے خلاف ہو وہ ایسی رائے کو رد کر سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں اسے مرکز میں رپورٹ کرنا ہو گا کہ کن وجوہ کی بنا پر اس نے جماعت کی رائے کو رد کیا ہے۔ جماعت کے کارکن امیر کے روبرو ذمہ دار ہوں گے اور امیر جملہ امور کے متعلق مرکز کے سامنے

غیر احمدی علمائے کرام کا قادیان میں جلسہ منعقد کرنا

۱۹۲۱ء میں حنفی اور اہل حدیث مسلک کے علمائے کرام نے مشترکہ اعلان کیا کہ وہ "قادیانیت" کو مغلوب کرنے اور قادیان کو فتح کرنے کیلئے قادیان میں ایک زبردست مشترکہ جلسہ کریں گے چنانچہ اس غرض کے لیے علمائے کرام کا ایک عظیم اجتماع قادیان میں ہوا۔ دیگر اعلانات کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ہم مرزا صاحب کی قبر کھود کر دیکھیں گے اگر ان کے جسم کو قبر میں کوئی گزند نہ پہنچا ہو تو ہم ان کے دعویٰ کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے۔ ورنہ ثابت ہو جائے گا کہ ان کا دعویٰ نعوذ باللہ جھوٹا ہے۔ ایسے اعلانات کی وجہ سے حفظِ امن اور شعائر اللہ کی حفاظت کے متعلق جماعت پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہو گئی۔ خصوصاً اس امر کے مدنظر کہ حکومت کی طرف سے جو جماعت احمدیہ کو اس کے ضبط اور نظام کے باعث شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور جماعت کے متعلق بدظنی رکھتی تھی۔ کسی موثر اقدام یا انتظام کی امید نہیں تھی۔ جلسہ کی تاریخ سے ایک دن پہلے خاکسار کو حضرت خلیفۃ المسیحؓ کا ارشاد موصول ہوا کہ احمدیہ ہوسٹل کے طلباء کو ساتھ لیکر فوراً قادیان پہنچ جاؤ۔ میں ہوسٹل کا وارڈن بھی تھا۔ جمعہ کا دن تھا میں نے جمعہ کی نماز میں اعلان کیا کہ ہوسٹل کے تمام طلباء شام کی گاڑی سے قادیان جانے کیلئے اسٹیشن پہ پہنچ جائیں۔ چودھری بشیر احمد بھی اگرچہ ہوسٹل میں نہیں رہتے تھے آگئے۔ شیخ بشیر احمد صاحب (حال ایڈووکیٹ لاہور سابق جج ہائی کورٹ) ہوسٹل میں رہتے تھے لیکن اس دن کسی کام سے اپنے وطن گوجرانوالہ گئے ہوئے تھے شام کو واپس آئے تو اسٹیشن پر اپنے ہمجولیوں کو دیکھ کر ان سے سبب دریافت کیا اور معلوم ہونے پہ وہ بھی شامل ہو گئے۔ گاڑی نصف شب کے قریب بٹالہ پہنچی۔ بعض طلباء نے خواہش ظاہر کی کہ دو چار گھنٹے اسٹیشن پہ آرام کرنے کے بعد قادیان روانہ ہوں۔ میں نے کہا میرے نام جو ارشاد آیا ہے اس میں فوراً پہنچنے کا حکم ہے توقف کی گنجائش نہیں۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ تین چار میل چلنے کے بعد شہری طلباء میں سے بعض نے تھکان کی شکایت کی اور کہا کچھ سستا لیں۔ میں نے کہا ستانے بیٹھ گئے تو منزل بہت دور ہو جائے گی۔ ہمت سے بڑھتے چلو۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ہم مسجد مبارک کے چوک میں پہنچ گئے۔ دفاتر سب کھلے تھے اور ہر طرف روشنی تھی میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا متعلقہ دفتر میں اپنے پہنچنے کی اطلاع کردو اور وضو کر کے نماز میں شامل ہو جاؤ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نماز کے فوراً بعد سب کی ڈیوٹی لگادی گئی اور سب اپنے اپنے مقررہ مقام پہ چلے گئے۔ مجھے ارشاد ہوا کہ علمائے کرام کے جلسے میں حاضر رہوں اور اگر کوئی اشتعال انگیز بات کی جائے تو مجسٹریٹ صاحب کو توجہ دلادوں۔ میرے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ نے پریس کے نمائندگان اور چھ رضاکاروں کو جلسہ میں جانے کی اجازت دی۔ جماعت کے افراد کو جلسہ گاہ میں جانے یا اس کے قریب سے گذرنے کی ممانعت کر دی گئی تاکہ کسی قسم کے تصادم کا امکان پیدا نہ ہو۔ قصبے کے اندرون اور بیرون احمدیہ محلوں میں پہرے۔ حفاظت اور خبر رسانی کا انتظام تھا۔ ہر فرد چوکس تھا۔ نمازوں اور دعاؤں میں خاص سوز و گداز تھا، باہمی محبت اور ہمدردی کا بحرِ بیکراں ہر طرف موجزن تھا۔

جلسہ کی کارروائی صبح ہوتے ہی شروع ہو جاتی تھی اور دوپہر کے وقت کھانے اور نمازوں کا وقفہ چھوڑ کر پھر شروع ہو کر پہر رات گئے تک جاری رہتی تھی۔ علمائے کرام کثیر تعداد میں تشریف لائے تھے اور سب کو وقت دینے کیلئے ضروری تھا کہ اجلاس لمبے ہوں۔ نتیجۃً میری حاضری بھی جلسے میں صبح سے رات تک لازم تھی۔ جب اجلاس نماز اور کھانے کیلئے ملتوی ہوتا تو میں واپس جاکر جلدی میں کچھ کھا لیتا اور مسجد مبارک میں نماز میں شامل ہونے کا موقعہ بھی میسر آجاتا اور مختصر رپورٹ بھی حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گذارش کر دیتا۔ رات کا اجلاس ختم ہونے کے بعد حضور رضی اللہ عنہ دن بھر کی تمام رپورٹیں سننے کے بعد انتظامات کے معائنے کے لئے تشریف لے جاتے خاکسار بھی اردل میں حاضر رہتا۔ واپسی پر مجھے دو تین گھنٹے نیند کیلئے میسر آجاتے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ان تین دنوں میں امام جماعت کو نیند کیلئے کوئی وقت میسر آیا کہ نہیں اور اگر میسر آیا تو کتنا؟ معائنے کے دوران میں بھی عجب کیفیت دیکھنے میں آتی ہر مقام اور ہر چوکی پر ڈیوٹی والے مستعد اور چوکس تھے۔ احمدیہ محلوں میں ہر جگہ روشنی تھی اور کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ہر فرد بلا استثناء اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورے شوق اور انہماک سے ادا کر رہا تھا۔ حضرت مولوی سید سرور شاہ صاحب رضی اللہ عنہ ایسے جید عالم اور واجب الاحترام بزرگ بیت المال کے دروازے پر پہرہ دار کے طور پر جوانوں کی طرح مستعد استادہ تھے۔ آنکھوں میں وہی چمک، لبوں پر وہی تبسم، چہرے پر وہی بشاشت جو قرآن کریم کا درس دیتے وقت ہوا کرتی تھی۔ وہ قرآن کریم کا درس یہ قرآن کریم پر عمل۔ اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ سب سے زیادہ خطرے اور بدیں وجہ سب سے زیادہ اعزاز کی ڈیوٹی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار پر پہرہ کی ڈیوٹی تھی۔ حفاظت کی سہولت کی خاطر حضور کے مزار اور حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کے مزار کے گرد جلدی میں ایک کچی دیوار چاروں طرف کھڑی کر کے اس پر چھت ڈال دی گئی تھی دیوار کے گرد اور چھت پر پہرہ تھا۔ احمدیہ ہوسٹل کے طلباء میں سے بعض کی ڈیوٹی اس مقام پر تھی ان طلبا میں میاں عطاء اللہ صاحب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جو بعد میں جماعت راولپنڈی کے امیر ہوئے۔ چھت پر شیخ بشیر احمد صاحب، شیخ یوسف علی صاحب، شیخ محمد احمد صاحب اور مرزا عبدالحق صاحب پہرے پر متعین تھے۔

علمائے کرام کے جلسے میں بفضل اللہ کوئی ناگوار واقعہ رونما نہ ہوا۔ فالحمد للہ تقریریں تو بیشک سلسلے کی مخالفت میں تھیں۔ جلسے کی غرض ہی یہی تھی۔ لیکن کوئی بات عملاً فساد، اشتعال یا شر انگیزی کی نیت سے کہی گئی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے اپنی تقریر کی تمہید کے طور پر چند اشعار حضرت مسیح الموعود علیہ السلام کی مشہور نظم ؎

جمال و حسن قرآں نور جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

پڑھے - لازم ہے کہ جماعت احمدیہ کے مکمل ضبط اور نظم کا بھی اثر منتظمین جلسہ اور علمائے کرام پر ہوا ہو - جس کے نتیجے میں کوئی ناگوار بات معرضِ ظہور میں نہ آئی -

پہلی رات کا معائنہ مکمل کرنے کے بعد حضورؓ نے انتظامات کے متعلق مشورہ کیا اور مزید ہدایات جاری فرمائیں - حضورؓ نے فرمایا کہ بعض مقامات پر انتظام کی مضبوطی کی ضرورت ہے جس کے لئے ارد گرد کے علاقے سے جماعتوں کے کچھ افراد کو بلانا ہوگا اور حضورؓ نے مشورہ طلب کیا کہ کون متعدد قابلِ اعتماد صاحب عزم و احتیاط نوجوان میسر آسکتا ہے جو حضورؓ کا ارشاد جیسے اسے سمجھا دیا جائے جماعتوں تک پہنچا دے دو تین نام حضور کی خدمت میں پیش کئے گئے - لیکن حضورؓ مطمئن معلوم نہ ہوئے - میں نے چودھری بشیر احمد صاحب کا نام پیش کیا فرمایا وہ ٹھیک ہیں - رات کے تین بجے کا وقت تھا چودھری بشیر احمد صاحب کو طلب فرمایا اور تفصیلی ہدایات دیں چار بجے کے قریب چودھری صاحب دارالامان سے گھوڑے پر نکلے اور جو امور ان کو تفویض کئے گئے تھے ان کی انجام دہی کے بعد ایک گھنٹہ قبل دوپہر واپس پہنچ کر حضورؓ کی خدمت میں رپورٹ پیش کر دی - اس عرصے میں وہ گھوڑے پر سے نہیں اترے - موضع بھنگواں یعنی ننہال میں گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی ناشتہ کر لیا - فجزاہ اللہ - جلسہ ختم ہونے کے دوسرے دن میں اپنے طلباء کے قافلے کے ساتھ لاہور روانہ ہوگیا - قادیان سے بٹالہ تک کا سفر ٹم ٹم پر ہوا - ایک ٹم ٹم راستے میں الٹ گئی ایک نوجوان کے بازو کو چوٹ آئی بٹالے سے لاہور تک اس کے لئے لیٹنے کا سامان کر دیا گیا -

جنگ کے اختتام کے ایک سال بعد آسکر برنلر کی خیریت کی خبر

پہلی عالمی جنگ ختم ہونے کے ایک سال بعد میرے عزیز دوست آسکر برنلر کے بہ خیریت ہونے کی خبر ملی ان کا آخری خط مجھے اگست ۱۹۱۴ء میں برسلز سے لکھا ہوا ملا تھا کہ وہ اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کے لئے جرمنی جا رہے ہیں - جنگ کے دوران مجھے ان کے متعلق بہت تشویش رہی اور میں ان کی حفاظت اور سلامتی کے لئے دعا کرتا رہا - ان کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کے والدین فوت ہو چکے ہیں - مال و جاہ و حشم سب ختم ہو چکے ہیں - وہ جنگ میں دو تین بار زخمی ہوئے ایک گھٹنہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایک ٹانگ ایک انچ چھوٹی ہوگئی لیکن چلنے پھرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں جنگ میں بڑی بہادری سے لڑے اور مشکلات و مصائب کا مقابلہ بڑی جوانمردی سے کیا "نائٹ آف ہوہن زالرن" کا رتبہ اور آئرن کراس کا اعزاز ملا -

آسکر سے ملنے کیلئے یورپ کا سفر ۱۹۲۴ء میں میں نے لاء کالج کی لیکچراری سے استعفیٰ دیدیا انڈین کیسز کی ایڈیٹری کے فرائض سے میں سبکدوش ہو چکا تھا گو جو کام مجھے گھر پہ بھیج دیا جاتا تھا وہ میں کر دیتا تھا۔ اس عرصے میں میں متواتر مصروف رہا۔ انگلستان سے واپس آئے مجھے دس سال ہونے آئے تھے۔ عالمی جنگ نے اقدار حیات میں انقلابی تفاوت پیدا کر دیا تھا۔ یورپ کی تہذیب، تمدن، سیاست پر ایک زلزلہ عظیم آچکا تھا۔ ہندوستان بفضل اللہ جنگ کی زد میں نہیں آیا تھا۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں ایک انقلابی دور میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں دو تین مہینے فراغت حاصل کر کے یورپ سے ہو آؤں اپنے عزیز دوست آسکر برنلر سے جو ان دنوں جرمنی میں قیام پذیر تھے دوبارہ ملنے کی خواہش کا بھی اس پروگرام میں بہت دخل تھا۔ میں نے پاسپورٹ کی درخواست دی پاسپورٹ تو مل گیا لیکن محکمہ متعلقہ نے اس میں جرمنی کا نام شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اطالوی کمپنی کے جہاز سے بمبئی سے وینس جانے کا انتظام کیا تھا۔ وینس پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں برطانوی نائب کونسل کا دفتر ہے۔ وینس میں ٹامس کک کے دفتر کی معرفت مجھے آسکر کا برلن سے لکھا ہوا خط بھی مل گیا۔ وہ خط لیکر میں کونسل خانے میں گیا اور بتایا کہ مجھے ان دوست کو ملنے کے لئے جرمنی جانا ہے اور پاسپورٹ میں جرمنی کا نام درج کرانے کی ضرورت ہے۔ افسر متعلقہ نے خط پڑھ کر آسٹریا اور جرمنی کے نام پاسپورٹ میں درج کر دیئے۔ وینس سے میں بذریعہ ریل وی آئینا گیا وہاں تین دن ٹھہرا۔ ان دنوں آسٹریا کے سکے کی قیمت بہت گری ہوئی تھی۔ آسٹرین سکے کے لحاظ سے میں دو تین دن لکھ پتی بنا رہا دو جوڑے جوتوں کے خریدے جن کی قیمت پانچ لاکھ کراؤن ادا کی۔ برطانوی سکے میں یہ کل رقم تین پاؤنڈ پانچ شلنگ بنی۔ جوتے بہت عمدہ تھے میرے بہت کام آئے۔ وی آئینا سے میں بذریعہ ریل براستہ پراگ برلن گیا اور وہاں آسکر کے پاس بارہ دن ٹھہرا۔ ان کی ہمشیرہ ایلس بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ میرے قیام برلن کے دوران آسکر نے فیصلہ کیا کہ وہ میرے ہمراہ انگلستان چلیں گے اور انہیں اس سفر کیلئے اور لندن میں عارضی قیام کیلئے اجازت نامہ مل گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی لندن مذاہب کانفرنس میں شرکت ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں لندن میں ایک کانفرنس برٹش ایمپائر کے مختلف مذاہب کے نمائندوں کی ہونے والی تھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی جو حضورؓ نے منظور فرمائی تھی۔ کانفرنس کے سلسلے میں حضورؓ نے احمدیت یا حقیقی اسلام تصنیف فرمائی تھی اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارشاد بھی خاکسار کو ہوا تھا۔ خاکسار انگلستان کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے تین چوتھائی حصہ مسودے کا ترجمہ کر سکا تھا

حضورؓ نے خاکسار کو سفر کی اجازت مرحمت فرمائی اور بقیہ حصہ مسودے کا ترجمہ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے سپرد فرمایا۔ میں ابھی برلن میں ہی تھا کہ مولوی عبدالرحیم نیر صاحب نے جو ان دنوں لندن میں سلسلہ احمدیہ کے مبلغ اور لندن مسجد کے امام تھے مجھے لکھا کہ حضورؓ کا ارشاد ہے کہ حضورؓ اور حضورؓ کے رفقاء کے قیام کا انتظام میرے مشورے کے ساتھ کیا جائے اس لئے مجھے جلد لندن پہنچنا چاہیئے۔ نیر صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں آسکر اور میں لنڈن پہنچ گئے حضور کے قیام کے لئے نمبر ۶ چیشم پیلس کرایہ لیا گیا جو ہر لحاظ سے موزوں ثابت ہوا۔ اس سال ویمبلے میں ایک بڑی نمائش بھی ہوئی تھی لیکن مذاہب کی کانفرنس کا نمائش سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مذاہب کانفرنس کا انتظام امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں کیا گیا تھا جو ساؤتھ کنسنگٹن میں واقع ہے اور اس زمانے میں لندن یونیورسٹی کے مرکزی دفاتر کا صدر مقام تھا۔ ممکن ہے مذاہب کانفرنس کے منتظمین نے کانفرنس کے انعقاد کے لئے اس موقعہ کا اسلئے انتخاب کیا ہو کہ نمائش کی وجہ سے بہت سے مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی لندن میں موجود ہوں گے۔ اس کے علاوہ کانفرنس اور نمائش کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ورودِ لندن | لندن مشن میں ان دنوں مولوی عبدالرحیم نیر صاحبؓ کے ساتھ ملک نواب الدین صاحب مرحوم اور سردار مصباح الدین صاحب معاون تھے۔ ماسٹر عزیز دین صاحب مرحوم تجارتی صیغے کے انچارج تھے۔ ماسٹر محمد دین صاحب امریکہ سے تشریف لائے ہوئے تھے اور حکیم فضل الرحمٰن صاحب مغربی افریقہ سے، حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ، حضرت خان ذوالفقار علی خاں صاحبؓ، چوہدری فتح محمد سیال صاحبؓ، حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحبؓ، حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی صاحبؓ، حضرت مولوی عبدالرحیم درد صاحبؓ، حضرت بھائی عبدالرحمٰن قادیانی صاحبؓ، حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب، چوہدری محمد شریف صاحب ایڈووکیٹ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، شیخ عبدالرحمٰن مصری صاحب اور چوہدری علی محمد صاحب حضور کی معیت میں تشریف لائے حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحبؓ اور چوہدری محمد شریف صاحب ایڈووکیٹ اپنے مصارف سفر خود برداشت کر رہے تھے۔ مسٹر آسکر بٹلر اور خاکسار کو بھی حضورؓ کی تشریف آوری پر حضورؓ کے دیگر خدام میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہو گیا۔ ان دنوں شیخ اعجاز احمد صاحب کے صوبجاتی جوڈیشل سروس میں لئے جانے کا معاملہ زیر غور تھا۔ انہوں نے لکھا کہ حضرت صاحبؓ کے لندن پہنچنے پر حضورؓ کی خدمت میں میرے لئے دعا کی درخواست کرنا۔ حضورؓ کی تشریف آوری پر خاکسار نے شیخ صاحب کی درخواست کا ذکر کیا۔ حضورؓ نے کمال شفقت کے لہجے میں

فرمایا کہ دعا کریں گے۔ خاکسار نے شیخ صاحب کی خدمت میں یہ کیفیت لکھدی اور اپنا وثوق ظاہر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ضرور کامیابی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسا ہی کیا۔ حضور کے قیام انگلستان کے دوران میں اخبارات میں حضورؓ کے ورود اور قیام کا بہت چرچا تھا۔ مکان پر ملاقاتیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ بعض اوقات اور خصوصاً ہفتہ اور اتوار کی سہ پہر کو ملاقاتیوں کا سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا کہ حضورؓ ملاقاتیوں کو باصرار کھانے کے لئے ٹھہرا لیتے۔ جو کھانا تیار ہوتا ملاقاتیوں کو کھلا دیا جاتا۔ حضورؓ اور حضورؓ کے رفقاء روٹی، پنیر اور چائے پر گذارا کرتے۔ آٹھ دس ہفتوں کے قیام کے دوران میں حضورؓ دوبارہ نمائش دیکھنے ویمبلے تشریف لے گئے دو ایک بار پیدل قدمی کے لئے ہائیڈ پارک بھی تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ بلدیہ کی دعوت پر برائٹن تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ جماعت کے ایک انگریز فرد کی دعوت پر پورٹ سمتھ تشریف لے گئے۔ باقی سارا وقت کانفرنس کے سلسلہ میں اور نجی طور پر بلا واسطہ اعلائے کلمۃ اللہ میں گذارا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضورؓ کا تمام وقت بلکہ تمام شعوری زندگی ہی اسی دھن میں گذری کہ دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبولیت پھیلے، اسلام کا جھنڈا ہر بلندی پر لہرائے۔ حضورؓ نے ایک مضمون کانفرنس میں پڑھنے کے لئے تیار کیا۔ جس کا انگریزی ترجمہ کرنے کیلئے خاکسار کو ارشاد ہوا۔ جس تقریب میں حضورؓ شمولیت فرماتے حضورؓ کے کلمات طیبات اور حضورؓ کی تقریر کی ترجمانی کی سعادت خاکسار کو نصیب ہوتی۔ فالحمدللہ۔ ایک موقعہ پر چند غیر مسلم ہندوستانی طلباء نے حضورؓ کو چائے کی دعوت دی حضورؓ نے قبول فرمائی۔ حضورؓ کے ساتھ ذکر کئے بغیر ان کی طرف سے اس موقعہ پر حضورؓ کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ انہیں یہ خیال ہے کہ حضورؓ حکومت برطانیہ کی دعوت پر حکومت کے مہمان کے طور پر تشریف لائے ہیں۔ اور حکومت برطانیہ کی غرض یہ ہے کہ حضورؓ ہندوستانی طلباء کو حکومت کی وفاداری کی تلقین کریں۔ غالباً ان کے ذہن میں یہ نقشہ ہوگا کہ قادیان میں کوئی بڑی خانقاہ ہے اور حضورؓ اس کے مجاور اعلیٰ ہیں۔ ایڈریس پڑھے جانے کے بعد حضورؓ نے ایڈریس کے جواب میں آزادی اور اس کے حصول کے طریق کے متعلق ایسا اطمینان کن خطاب فرمایا کہ میزبانوں کے چہروں سے پہلے حیرت اور پھر مسرت کے جذبات بیساختہ ظاہر ہونے لگے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنے سراسر غلط اندازے پر ندامت بھی ضرور محسوس ہوئی ہوگی۔ حضورؓ کے خطاب کے بعد ان میں سے ہر ایک کی ہر حرکت سے اپنے معزز مہمان کا انتہائی احترام و اکرام ظاہر ہوتا رہا۔ چوہدری غلام مصطفیٰ الٰہیؓ صاحب مرحوم ایڈووکیٹ گوجرانوالہ ان دنوں لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ سلسلہ احمدیہ میں شامل نہ تھے لیکن اپنی جبلی شرافت اور اخلاق کی وجہ سے انہوں نے حضورؓ اور حضورؓ کے سب رفقاء کی آکسفورڈ ڈسٹرکٹ کے لائنز کارنر ہاؤس میں وسیع پیمانے پر چائے کی دعوت کی۔

اس سال میرے والدین حج کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ میں نے لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے انہیں حج کے

سفر پر رخصت کیا تھا۔ اس سال حج کے دوران میں پانی کی قلت کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی اس خبر سے خاکسار کو بھی پریشانی تھی اور حضورؓ بھی پریشان تھے۔ جب تک ان کی بخیریت واپسی کی خبر ملی حضورؓ متواتر ان کی خیریت اور حفاظت کے لئے دعا فرماتے رہے اور خاکسار کو تسلی دیتے رہے۔

حضرت نعمت اللہ خاں صاحب کی کابل میں شہادت

قیامِ انگلستان کے دوران میں حضرت نعمت اللہ خالصاحبؓ کی کابل میں سنگساری سے شہادت کی خبر پہنچی جس سے حضورؓ اور حضورؓ کے رفقاء کے دل درد اور غم سے نڈھال ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لندن کے ایکس ہال میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔ جس میں سرکردہ اصحاب نے اس ظالمانہ فعل کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ اس دردناک واقعہ کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں نے افغانستان کے سفیر متعینہ پیرس کے نام ایک خط لکھا (ان دنوں لندن میں افغانستان کا کوئی سفیر متعین نہ تھا) اس خط کی ابتداء میں نے قرآن کریم کی سورۂ البروج کی پہلی گیارہ آیات سے کی جن کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”وہ لوگ جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو عذاب میں مبتلا کیا پھر (اپنے فعل سے) توبہ بھی نہ کی انہیں یقیناً جہنم کا عذاب ملے گا۔ اور (اس دنیا میں بھی) انہیں (دل کو) جلا دینے والا عذاب ملے گا“ میرا خیال تھا کہ یورپ میں رہتے ہوئے جناب سفیر اپنی حکومت کے اس وحشیانہ اقدام پر اگر نادم نہیں تو دل میں متاسف ضرور ہوں گے۔ مجھے یہ توقع تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی حکومت کے اس بہیمانہ اور سرکاری فعل پر برملا اظہار افسوس کریں گے لیکن یہ ضرور امید تھی کہ وہ خاموش رہ کر کم سے کم اپنی ذاتی بے تعلقی کا اظہار کریں گے۔ لیکن ان کی طرف سے مجھے ایک نہایت خشم ناک جواب ملا جس کے آخر میں انہوں نے یہ لکھ کر اپنے شعلہ غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ”ہم نے تمہاری گستاخانہ چٹھی کے پرزے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے ہیں کہ وہ اسی لائق تھے“ خاکسار نے بڑے غور اور بہت دعاء کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں درخواست کی کہ اگر حضورؓ پسند فرمائیں تو خاکسار کو تبلیغ کے سلسلہ میں افغانستان بھیج دیں لیکن یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خالصاحب شاہ افغانستان سیاحت یورپ کے لئے تشریف لے گئے۔ جہاں جہاں وہ گئے وہاں حکومتوں اور رعایا نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور آپ کے شایان شان اعزاز و احترام کیا۔ یورپ کے طول و عرض میں خاص و عام اس بات سے آگاہ ہوئے کہ آپ وہ شاہ والا حشم ہیں کہ جن کے فرمان کے تحت ایک معصوم نوجوان کو اختلاف عقائد کی بناء پر سنگسار کیا گیا۔ شاہ امان اللہ اور ان کی ملکہ کا سفر یورپ ہر پہلو سے کامیاب رہا اور آپ شاداں و فرحاں اپنی مملکت کو واپس لوٹے جہاں الٰہی تقدیر ”تعز من تشاء و تذل من تشاء“ کا نقشہ دکھانے کے لئے ان کی منتظر تھی۔ ان کی مراجعت کے چند ہی ماہ بعد ایک غیر معروف بے حیثیت بچہ سقا یکایک بگولے کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہ امان اللہ کے اقتدار

اور ان کی بادشاہت کا تختہ الٹ دیا۔ شاہ امان اللہ خاں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے اپنی حیات دنیوی کا بقیہ حصہ بے وطنی میں ایسی حالت میں گذارا جو قرآن کے الفاظ میں معیشتاً ضنکا (تکلیف دہ زندگی) کی عبرتناک مثال تھی اور جس کی کیفیت "لا یموت فیھا ولا یحییٰ (نہ زندہ نہ مردہ) کی تھی۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

مذاہب کانفرنس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا مضمون

جس دن کانفرنس کے اجلاس میں حضورؓ کا مضمون پڑھا جانے والا تھا۔ اس سے پہلی شب خاکسار بعد نماز عشاء اپنے کمرہ میں جاکر سوگیا تھا کہ حضورؓ نے یاد فرمایا۔ خاکسار حاضر ہوا۔ باقی بزرگان اور احباب بھی حاضر تھے۔ حضورؓ نے فرمایا امر زیر غور یہ ہے کہ کل کانفرنس کے اجلاس میں مضمون پڑھ کر کون سنائے بعض احباب کی خواہش ہے کہ مضمون میں خود پڑھوں۔ بعض کا مشورہ ہے کہ کوئی اور پڑھ کر سنائے۔ تمہارا نام بھی لیا گیا ہے۔ تمہیں اسلئے بلایا ہے کہ جن دوستوں کے نام اس سلسلے میں لئے گئے ہیں ان سب سے کچھ حصہ مضمون کا سنا جائے تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ ان میں سے کون اس کام کے لئے موزوں ترین ہوگا۔ دو تین اصحاب کو مکان کے مختلف حصوں میں کھڑے ہونے کا ارشاد ہوا اور درمیانی دروازے کھول دیئے گئے جن دو تین اصحاب کا نام لیا گیا تھا انہوں نے باری باری مضمون کی چند سطریں بلند آواز سے پڑھ کر سنائیں۔ اپنے متعلق تو حضورؓ نے فیصلہ فرما دیا تھا کہ مضمون خود نہیں پڑھیں گے۔ مشورے کے بعد حضورؓ نے فیصلہ فرمایا کہ کانفرنس میں مضمون خاکسار پڑھ کر سنائے۔ میری آواز کے متعلق کہا گیا تھا کہ بھرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب کو ارشاد ہوا کہ وہ میرے گلے کی ٹنکچر آئیوڈین کے ساتھ مرمت کرتے رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس فرض کو ایسی مستعدی اور اسقدر تکرار کے ساتھ ادا کرنا شروع کردیا کہ دوسری صبح ناشتے پر مجھے خدمت اقدس میں فریاد کرنی پڑی کہ اگر ڈاکٹر صاحب اسی طور پر خاکسار کے مظلوم گلے پر توجہ مرکوز فرماتے رہے تو خاکسار کانفرنس کے اجلاس کے وقت تک بالکل معذور ہو چکا ہوگا۔ حضورؓ نے ارشاد فرمایا کہ خاکسار کی مزید عقوبت بند کردی جائے۔

مذاہب کانفرنس میں خاکسار کا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا مضمون پڑھ کر سنانا

جب حضورؓ کانفرنس میں تشریف لے گئے تو حاضرین نے کمال احترام سے حضور کا خیر مقدم کیا۔ ہر شخص کی خواہش اور کوشش تھی کہ حضورؓ کے ساتھ مصافحہ کرنے کا شرف حاصل کرے۔ ایک پادری صاحب نے جو ویلز سے تشریف لائے تھے حضورؓ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا میں آپ کی تصنیف "احمدیت یا حقیقی اسلام" یہاں سے خرید کرلے گیا تھا اور راتوں رات اسے ختم کرلیا۔ جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو میری طبیعت یہ برداشت نہ کرسکی کہ میں بغیر ختم کئے اسے ہاتھ سے رکھ دوں۔ جب حضورؓ کا مضمون پڑھا جانے کا وقت آیا تو حضورؓ نے خاکسار کی طرف جھک کر بڑی شفقت سے فرمایا "گھبرانا نہیں میں دعا کرتا رہوں گا"۔ ہال میں سب نشستیں پر ہو چکی تھیں۔

اور بہت سے لوگ کھڑے رہ گئے تھے۔ سارا مضمون کامل خاموشی سے سنا گیا۔ ہال میں بالکل سناٹا تھا جب مضمون ختم ہوا تو سامعین میں سے اکثر یکبارگی اسٹیج کی طرف لپکے ہر ایک کی کوشش تھی کہ مصافحہ کا شرف حاصل کرے۔ خواجہ نذیر احمد صاحب فرزند خواجہ کمال الدین صاحب بھی اسی ہجوم میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے مضمون ہر لحاظ سے کامیاب رہا اور بالاتفاق کانفرنس میں پڑھے جانے والے مضامین میں سے سب سے اعلیٰ شمار کیا گیا۔ حضورؓ نے لندن کے قیام کے دوران لندن کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا جس کی عمارت کی تکمیل پر رسم افتتاح کی سعادت شیخ سر عبدالقادر صاحب کو حاصل ہوئی۔

انگلستان سے واپسی | حضورؓ کے واپسی کے سفر پر روانہ ہونے سے چند دن پہلے میں حضورؓ کی اجازت سے ایمسٹرڈیم گیا۔ لنڈن سے ایمسٹرڈیم تک کے ایل ایم کی ہوائی سروس تھوڑا عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی۔ میں نے اسی سروس سے یہ سفر کیا۔ ہوائی سفر کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ چھوٹا سا جہاز تھا جس میں فقط پانچ مسافروں کی گنجائش تھی۔ نشست کے لئے بید کی کرسیاں تھیں۔ تین پچھلی قطار میں اور دو ان کے آگے۔ مسافروں اور پائلٹ کے درمیان فقط ایک تختے کی اوٹ تھی۔ سب کیلئے جہاز کے اندر جانے اور نکلنے کا ایک ہی مشترکہ دروازہ تھا، پرواز کوئی زیادہ بلندی پر نہ تھی۔ مطلع صاف تھا۔ اور نیچے سب کچھ صفائی سے نظر آتا تھا۔ لندن سے روانہ ہو کر جہاز چند منٹ کے لئے رائٹرڈیم ٹھہرا اور تھوڑی دیر بعد ایمسٹرڈیم پہنچ گیا۔ تین چار دن بعد چوہدری محمد شریف صاحب بھی ایمسٹرڈیم تشریف لے آئے۔ ایمسٹرڈیم سے چوہدری صاحب اور میں برسلز گئے۔ اور دو دن وہاں ٹھہر کر پیرس میں حضورؓ کے قافلے کے ساتھ شامل ہو گئے۔ پیرس میں حضورؓ کا قیام "لودارہ" کے قریب گرینڈ ہوٹل میں تھا۔ یہاں لندن جیسی مصروفیت تو نہ تھی لیکن یہاں بھی حضور کے وقت کا اکثر حصہ ملاقاتوں میں صرف ہوا۔ صرف ایک دن حضورؓ وارسائے کا محل دیکھنے تشریف لے گئے۔ خلیفہ تقی الدین صاحب اور خاکسار ہمراہ تھے۔ پیرس کے قیام کے دوران میں حضورؓ نے خاکسار سے فرمایا تم نے تو ہوائی جہاز کا سفر کر لیا اب کوئی ایسا انتظام کرو کہ ہم بھی یہ تجربہ کر سکیں۔ خاکسار نے گذارش کی کہ حضورؓ کے رفقاء تو یہ منظور نہ کریں گے کہ حضورؓ اس نئی سواری کا تجربہ کریں جس میں ابھی کچھ خطرے کا عنصر بھی ہے۔ فرمایا انہیں پہلے نہ بتایا جائے۔ خاکسار نے عرض کیا بعد میں جب انہیں معلوم ہو گا تو خاکسار ہدفِ ملامت ہو گا کہ خاکسار نے حضورؓ کو کیوں یہ مشورہ دیا اور خاکسار کا کوئی عذر قابلِ پذیرائی نہ ہو گا۔ خاکسار کو احساس تھا کہ حضورؓ کی خواہش ہے کہ کوئی موقعہ ہوائی سفر کا پیدا ہو جائے لیکن میری اپنی طبیعت یہ ذمہ داری لینے سے گریز کرتی تھی میرا قیاس ہے کہ حضورؓ میرے تذبذب کو بھانپ گئے اور اصرار نہ فرمایا۔ پیرس سے بمبئی کے سفر کے انتظامات کی نگرانی حضورؓ نے میرے سپرد فرمائی اور بفضل اللہ یہ سفر بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ کوئی امر حضورؓ کے لئے پریشانی کا باعث نہ ہوا۔ فالحمد للہ۔

حضورؓ کی معیت میں وینس کی سیر | حضورؓ کا قافلہ بذریعہ ریل وینس روانہ ہوا۔ وینس میں قیام کا انتظام میٹرو پول ہوٹل میں تھا جو سینٹ مارک کے چوک کے قریب نہر کبیر کے کنارے واقعہ ہے۔ جہاز کی روانگی میں ابھی دو دن کا وقفہ تھا۔ حضورؓ کو یہ دو دن فراغت کے میسر آگئے۔ موسم خوشگوار تھا سینٹ مارک کا چوک شہر کا مرکز ہے اور ہر لحظہ نکتہ رس طبائع کے لئے ان فی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی نئی نئی تصویریں پیش کرتا ہے۔ پہلی بار جب حضورؓ چوک دیکھنے تشریف لے گئے تو خاکسار نے گذارش کی کہ یہ چوک دنیا کا خوبصورت ترین چوک کہا جاتا ہے۔ فرمایا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے دنیا کے تمام چوک نہیں دیکھے البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو چوک میں نے دیکھے ہیں ان سب میں سے خوبصورت ترین یہ چوک ہے۔ چوک کے ایک طرف ڈوج کا محل اور سینٹ مارک کا گرجا ہیں۔ اور باقی تین طرف دوکانیں اور قہوہ خانے ہیں۔ ہر دوکان ایک عجائب گھر معلوم ہوتی ہے۔ وینس میں شیشے اور چمڑے اور ریشم ہر قسم کا نہایت نفیس سامان خرید کے لئے ملتا ہے۔ حضورؓ نے بہت سی چھوٹی چھوٹی اشیاء اعزا اور احبا کے لئے تحائف کے طور پر خریدکیں۔ بارہ اشخاص کے لئے ایک چائے کا سیٹ حضورؓ کو بہت پسند آیا لیکن حضورؓ نے اپنے لئے خریدنا پسند نہ فرمایا۔ خاکسار سے فرمایا تم خرید لو۔ خاکسار نے گذارش کی یہ چیز خاکسار کی حیثیت سے بہت بڑھ کر ہے۔ فرمایا تمہیں اس کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ خاکسار حضورؓ کے فرمان کو تفاول سمجھ کر خریدنے پر آمادہ تو ہوگیا لیکن پوری قیمت پاس نہیں تھی۔ حضورؓ نے فرمایا جسقدر ضرورت ہے ہم قرض دیدیتے ہیں۔ خاکسار کے لئے تعمیل ارشاد میں کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہی۔

حضورؓ کی معیت میں جہاز کا سفر | جہاز پر حضورؓ اوّل درجے میں تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمدؓ صاحب، حضرت حافظ روشن علی صاحب، حضرت خان ذوالفقار علی خاں صاحب، چوہدری محمد شریف صاحب رضی اللہ عنہم اور خاکسار دوسرے درجہ میں تھے۔ باقی تمام اصحاب عرشے کے مسافر تھے ان کے لئے رسد وغیرہ وینس سے خریدی گئی تھی۔ باورچی ساتھ تھا اسلئے انہیں کھانے کے متعلق کوئی دقت نہیں تھی۔ انہوں نے عرشے کے اپنے حصے پر اپنے لئے خوب آرام دہ انتظام کر لیا تھا۔ ہم لوگ کھانے یا وضو کیلئے اپنے درجوں میں جاتے تھے ورنہ سارا وقت عرشے پر احباب کے ساتھ گذرتا تھا۔ وہیں نمازیں ادا ہوتی تھیں۔ وہیں حضورؓ کے جلوہ افروز ہونے کے باعث محفل عرفان قائم ہوتی تھی۔ تمام سفر کے دوران موسم بفضل اللہ خوشگوار رہا۔ فالحمد للہ۔ حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمدؓ صاحب حضورؓ کے ارشاد کے ماتحت کچھ عرصہ قاہرہ قیام کرنے کیلئے پورٹ سعید سے رخصت ہوئے۔ حضورؓ نے بہت دعاؤں کے ساتھ پرنم آنکھوں سے آپ کو رخصت کیا۔

بحیرہ قلزم سے گذرتے ہوئے ایک چاندنی رات میں حضورؓ معہ رفقاء دوسرے درجے کے اوپر کے عرشے پر تشریف فرما تھے کسی خادم کی گذارش پر ارشاد ہوا کہ حاضرین مجلس میں سے ہر ایک دو چار شعر سنائے۔ باقی تمام خدام کو تعمیل

ارشاد میں کامیاب ہو گئے صرف خاکسار بوجہ شدید حجاب کے قاصر رہا۔ آخر میں جملہ خدام کی گذارش پر حضورؓ بھی شعر سنانے پر رضامند ہو گئے لیکن ارشاد فرمایا کہ سب احباب قریب ہو جائیں میری آواز زیادہ فاصلے پر سنی نہ جائے گی۔ خاکسار تو پہلے ہی حضورؓ کے دست راست پر بیٹھا تھا باقی احباب سب قریب ہو گئے اور حضورؓ نے غالب کی غزل اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل، کچھ ایسے دردانگیز لہجہ میں سنائی کہ سب آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ بمبئی پہنچنے پر خاکسار حضورؓ سے رخصت حاصل کر کے اسی شام لاہور روانہ ہو گیا۔ فیروز پور کے اسٹیشن پر قبلہ والد صاحب اور سید انعام اللہ شاہ صاحب منتظر تھے وہاں سے لاہور تک اکٹھے سفر ہوا۔

کشمیر کا پہلا سفر

۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی خواہش کشمیر جانے کی ہوئی۔ چودھری بشیر احمد صاحب ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ ہم سب پہلے کوہ مری جائیں۔ دو چار دن ٹھہر کر میں واپس لاہور آ کر بقیہ کام سے فارغ ہو جاؤں اور پھر کوہ مری واپس آ کر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں اور وہاں سے ہم سب کشمیر جائیں۔ میری لاہور واپسی کے بعد والد صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ چودھری بشیر احمد صاحب نے خدمت اور تیمارداری کا حق بڑے اخلاص اور تندہی سے ادا کیا۔ والد صاحب کی کمزوری کے مدنظر رہائش کا عارضی انتظام بدل کر پنڈی پائنٹ پر نون کا بنگلہ کرایہ پر لے لیا گیا۔ چنانچہ تعطیل کا اکثر حصہ ہم نے وہیں گذارا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے ہمارا وقت بہت اطمینان اور خوشی میں گذرا۔ والد صاحب کی طبیعت بفضل اللہ جلد بحال ہو گئی اور ستمبر کے وسط میں ہم عازم کشمیر ہو گئے۔ کوہ مری سے ہم دوپہر کے کھانے کے بعد روانہ ہوئے عصر کے وقت ڈومیل پہنچے پر معلوم ہوا کہ آگے پتھر گرنے کی وجہ سے سڑک بند ہے اور کاریں بھی رکی ہوئی تھیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ رات ہم مظفر آباد میں بسر کریں۔ پل سے پار ہو کر ہم مظفر آباد چلے گئے۔ ڈاک بنگلے میں تو گنجائش نہیں تھی لیکن سرائے کی چھت پر ہمیں جگہ مل گئی۔ نانبائی کی دوکان سے گرم نان اور کباب میسر آ گئے جو ہم نے شوق سے کھائے۔ رات چاندنی تھی۔ سماں بہت سہانا تھا۔ رام گنگا کا پانی چاندنی کی طرح چمکتا اپنے سریلے راگ گاتا بہتا چلا جاتا تھا۔ صبح ہونے تک سڑک کھل گئی۔ ہم سویرے ہی روانہ ہو کر دس بجے تک سرینگر پہنچ گئے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ہاں قیام ہوا۔ وہ اس وقت حکومت کشمیر میں وزیر تھے۔ ہمارے کوہ مری سے روانہ ہوتے وقت مہاراجہ صاحب کشمیر بیمار تھے۔ جس دن ہم سرینگر پہنچے اسی دن ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے ماتم میں سب دکانیں کاروبار اور سب ادارے بند ہو گئے۔ ہم نے ایک ہاؤس بوٹ کرایہ پر لی اور نسیم باغ چلے گئے۔ ہمارا قیام ہفتہ بھر رہا۔ اس دوران میں ہم نے خطۂ کشمیر کے مختلف مقامات کی سیر کی۔ نشاط، شالامار، ہارون تو جھیل کے اس پار ہی تھے۔ دُور کے مقامات تک ہم کار پر گئے۔ سرینگر کے محلہ خانیار میں حضرت مسیحؑ کی

قبر کی زیارت کی جب ہماری کار محلہ خان یار کے چوک میں جا کر کھڑی ہوئی تو محلہ کے چند نوجوان ہمارے گرد جمع ہو گئے ان کے چہروں کے نقش بالکل اسرائیلیوں کے تھے۔ بارہ سال بعد جب مجھے دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا تو یہودی محلے میں میں نے بالکل ویسے ہی چہرے دیکھے جو محلہ خان یار سری نگر میں دیکھے تھے۔ وادی کشمیر کے پہاڑ اور چشمے سبزہ زار اور باغات، لطیف ہوائیں اور شیریں پانی دل کو موہ لینے والے ہیں۔ کشمیر کا سحر دل پر آہستہ آہستہ تسلط جماتا ہے لیکن اسے ہمیشہ کیلئے اپنا بنا لیتا ہے۔ ہمارا واپسی کا سفر بانہال کے راستے ہوا۔ سرینگر سے سہ پہر کو روانہ ہو کر اور بانہال کی چوٹی سے گذر کر رات ہم نے بانہال کے بنگلے میں گذاری یہ سڑک کوہ مری اور بارہ مولے والی سڑک سے نسبتاً دشوار گذار ہے لیکن منظر کے لحاظ سے بہت زیادہ دلکش ہے۔ ویری ناگ کا چشمہ بہت ہی پر فضا منظر پیش کرتا ہے۔

دو سبق آموز تجربات | اسی سال اور پھر ایک سال بعد مجھے ہائی کورٹ میں دو ایسے تجربات ہوئے جن سے میرا یہ یقین محکم سے محکم تر ہو گیا کہ گو رعایت اسباب تو بیشک لازم ہے لیکن عاقبۃُ الامورِ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایک باپ اور بیٹے کو قتل کے جرم میں سیشن کی عدالت سے پھانسی کی سزا ہوئی باپ نے اقرارِ جرم کر لیا تھا۔ بیٹے کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی اس کی طرف سے میں وکیل تھا۔ تاریخ سماعت پر چیف جسٹس سر شادی لعل اور ان کے رفیق جج کے اجلاس میں اپیل کا پہلا نمبر تھا۔ جن وکیل صاحب کا کیس دوسرے نمبر پر تھا انہوں نے اجلاس شروع ہونے سے قبل مجھ سے دریافت کیا تمہارا کیس اندازاً کتنا وقت لیگا۔ میں نے کہا قریباً آدھ گھنٹہ۔ پوچھا کیا ایسا ہی مختصر کیس ہے؟ میں نے کہا واقعہ قتل کا ایک ہی چشم دید گواہ ہے۔ چیف جسٹس صاحب اڑ جائیں گے کہ اس کی شہادت کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اس پر اپیل نامنظور ہو جائیگی اتنے میں جج صاحبان تشریف لے آئے۔ لیکن چیف جسٹس صاحب کی جگہ مسٹر لی راسینل صاحب اجلاس میں شریک ہوئے۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ چیف جسٹس صاحب مہاراجہ ہری سنگھ کی تاجپوشی کی تقریب میں شمولیت کے لئے جموں تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے دوسرے وکیل صاحب کے کان میں کہا میرا کیس تو اب بھی آدھ گھنٹے میں ہی ختم ہو جائے گا لیکن اب بفضل اللہ اپیل منظور ہو جائے گی اور سائل رہا ہو جائیگا۔ اس کیس میں مقتولین میاں بیوی تھے۔ ان کی شادی کو چند دن ہی گذرے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ جیسے کئی دیہات میں ہوتا ہے ان کی جائے سکونت ایک احاطے کے اندر تھی۔ احاطہ میں چاروں طرف رہائشی کوٹھے تھے اور درمیان میں وسیع مشترکہ صحن تھا۔ اس صحن میں احاطے کے اندر رہنے والوں کی چارپائیاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھی تھیں۔ یہ میاں بیوی ایک ہی چارپائی پر ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ ان کی چارپائی سے کچھ فاصلے پر شوہر کی ماں اپنی چارپائی پر سو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں پچھلے پہر کسی شخص نے تیز دھار دار آلے کے ساتھ میاں بیوی کو شدید ضربات پہنچائیں جن سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے دہائی دینے سے شوہر کی ماں اور دوسرے لوگ بھی جاگ اٹھے۔ پولیس کے آنے پر ماں نے بیان کیا

کہ جب اس نے چیخ پکار کا شور سنا تو وہ جاگ گئی اور دونوں ملزمان کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ جب وہ جاگے تو مجرم بھاگ گئے ہوئے تھے۔ وہ اندھیرے کی وجہ سے کسی کو شناخت نہ کر سکے۔ پولیس نے عدالت میں وقوعہ کے گواہ کے طور پر صرف مقتول شوہر کی ماں کو پیش کیا۔ شناخت کے متعلق ماں نے عدالت میں بیان کیا کہ ملزم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ان کی آوازوں سے شناخت کر لیا۔ اور درخت سے ایک لالٹین بھی لٹک رہی تھی جس کی روشنی سے بھی میں نے ان کو شناخت کر لیا۔

میں نے جج ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ملزمان کی شناخت کا کوئی قابلِ اعتماد ثبوت نہیں۔ مقتول شوہر کی والدہ کے بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اسے خود بھی شناخت کا یقین نہیں۔ وہ پہلے کہتی ہے میں نے ملزمان کو انکی آواز سے پہچانا۔ اگر فرض بھی کیا جائے کہ اس فعل میں ایک نہیں دو شخص شامل تھے تو یہ نہایت غیر اغلب ہے کہ وہ حملہ کے وقت آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے اس کمزوری کے احساس کے ماتحت گواہ کو ترغیب دلگئی کہ وہ اپنے بیان کو مضبوط بنانے کے لئے لالٹین کا ذکر کرے۔ لیکن اس ایزادی نے اس کے بیان کو اور بھی کمزور کر دیا ہے۔ اوّل تو رپورٹ ابتدائی میں لالٹین کا کوئی ذکر نہیں۔ لالٹین کا ذکر پہلی بار پولیس کی ضمنیوں میں آنا شروع ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ لالٹین کی ضرورت پولیس کو محسوس ہوئی اور ان کی ترغیب پر گواہ نے لالٹین کو اپنے بیان میں داخل کیا۔ دوسرے یہ بالکل خلاف فطرت اور خلاف دستور بات ہے کہ چند دن پہلے کا شادی شدہ جوڑا کھلے صحن میں سوتے ہوئے جہاں قریب ہی اور لوگ بھی سو رہے تھے اپنی چارپائی پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک جلتی ہوئی لالٹین اوپر لٹکا دے۔ اندریں حالات اپیلانٹ کی شمولیت اس وقوعے میں بالکل قرین قیاس نہیں۔ اور اسے بری ہونا چاہئے۔ مسٹر جسٹس لی راسینول نے پبلک پراسیکیوٹر سے اس دلیل کا جواب سننے کی خواہش کی۔ پبلک پراسیکیوٹر مسٹر دلیس راج ساہنی نے کہا کہ مقتول کی والدہ کا بیان واضح ہے۔ اس کی کوئی تردید مسل پر نہیں کوئی وجہ نہیں کہ کیوں اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔ مسٹر جسٹس لی راسینول نے مسٹر ساہنی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ایک تو بیان بالکل غیر اغلب ہے پھر لالٹین کا ذکر رپورٹ ابتدائی میں نہیں، آپ ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مقتولین حیا کے احساس سے یہاں تک ناآشنا تھے کہ انہوں نے اپنی چارپائی کے عین اوپر جلتی لالٹین لٹکائی؟ مسٹر ساہنی نے کہا جناب عالی ان دیہاتی لوگوں کے حیا کے معیار کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ مسٹر جسٹس لی راسینول نے کچھ برہم ہو کر کہا مسٹر ساہنی اگر آپ کوئی معقول بات نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ خاموش رہیں۔ ہم اپیل منظور کرتے ہیں اور اپیلانٹ کو بری کرتے ہیں۔ یہ قیاس آرائی کہ جو کچھ ہوا وہ اگر نہ ہوتا تو اس کی جگہ کیا ہوتا۔ اکثر حالات میں ایک بے نتیجہ فعل ہوتا ہے مثلاً اس کیس میں اگر باپ نے سیشن کی عدالت میں اقرار جرم نہ کر لیا ہوتا اور سیشن کی عدالت دونوں ملزمان کو مقتول شوہر کی والدہ کی شہادت کی بنا پر پھانسی کی سزا دیتی اور دونوں کی طرف سے اپیل کی جاتی اور اپیل

کی سماعت وہی بنچ کرتا تو دونوں کو بری قرار دیا جاتا۔ وجہ قتل یہ بیان کی گئی تھی کہ مقتولین کی شادی سے پہلے مقتولہ کا رشتہ اپیلانٹ کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ لیکن مقتولہ کے والدین نے انکار کر دیا تھا اور اس کا رشتہ مقتول کے ساتھ کر دیا تھا اس رنج سے ملزمان نے دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا۔ اگر یہی وجہ جرم کے پس پردہ تھی تو قیاس غالب ہے کہ اپیلانٹ بھی اس فعل میں شامل تھا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ قتل اکیلے اپیلانٹ نے ہی کیا ہو اور جب دونوں ماخوذ ہو گئے تو باپ نے اپنے بیٹے کی جان بچانے کی خاطر اقبال جرم کر لیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے یہ جذبہ قبول فرماتے ہوئے بیٹے کو رہائی دلائی۔ یہ بھی بظاہر محض اتفاق ہی تھا کہ اپیل کی سماعت کے دن سر شادی لال اجلاس میں شامل نہ ہو سکے۔ اپیل کی سماعت اس دن سے پہلے یا اس دن کے بعد ہوتی تو سر شادی لال اجلاس میں موجود ہوتے اور اپیل نامنظور ہو جاتی۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد سر شادی لال اور مسٹر جسٹس آغا حیدر کے اجلاس میں ایک اپیل کی سماعت ہوئی جس میں عبد اللہ نامی اپیلانٹ کو سیشن کی عدالت سے پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ چند سال قبل ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں ایک بنئے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تین اشخاص پر شبہ ہوا ان میں سے عبد اللہ تو مفرور ہو گیا اور باقی دو گرفتار ہو گئے۔ کیس سیشن سپرد ہوا۔ سیشن کی عدالت میں پیشی سے پہلے دونوں ملزمان میں سے ایک مر گیا سیشن کی عدالت میں استغاثے کی طرف سے تین چشم دید گواہ پیش ہوئے سیشن جج صاحب نے ان کی شہادت کو ناقابل اعتبار قرار دے کر رد کر دیا۔ اور ملزم کو بری کر دیا۔ کچھ سال بعد عبد اللہ منٹگمری (حال ساہیوال) کے ضلع میں گرفتار ہوا جہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ اس پر مقدمہ چلا سیشن کی عدالت میں استغاثے کی طرف سے وہی تین چشم دید گواہ پیش کئے گئے اور مزید شہادت یہ پیش کی گئی کہ ملزم نے اپنی نئی جائے سکونت میں ایک سکھ سے کہا تھا کہ میں تو اپنے گاؤں سے ایک بنئے کے قتل کی وجہ سے مفرور ہوں۔ سیشن جج صاحب نے اپنے پیش رو کی طرح چشم دید شہادت تو رد کر دی لیکن ملزم کے بیان کردہ اقبال جرم پر انحصار کر کے ملزم کو مجرم قرار دے دیا اور پھانسی کی سزا کا حکم صادر کیا۔ اپیلانٹ کی طرف سے میں نے اپنی بحث میں عدالت کو اقبال جرم کی شہادت کی کئی خامیوں کی طرف توجہ دلائی جن کی وجہ سے بیان کردہ اقبال جرم کی کہانی بالکل ناقابل اعتبار ٹھہرتی تھی۔ سرکاری وکیل صاحب سے جواب کچھ بن نہ آیا۔ عدالت نے فیصلہ محفوظ رکھا۔ چند دن بعد جب فیصلہ صادر ہوا تو بالکل خلاف توقع عدالت نے مزید شہادت کے لئے دفعہ ۴۲۸ ضابطہ فوجداری کے ماتحت کیس عدالت سیشن میں واپس کیا۔ گویا عدالت نے یہ تو تسلیم کیا کہ جو شہادت پیش کی جا چکی ہے اس کی بنا پر اپیلانٹ کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوتا اس صورت میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپیل منظور ہو کر اپیلانٹ کو بری کیا جاتا۔ مگر عدالت نے میری بیان کردہ خامیوں کی طرف توجہ دلا کر مزید شہادت قلمبند کئے جانے کا حکم صادر کیا۔ جب کیس ہائی کورٹ میں واپس آیا تو پھر تفصیلی

بحث ہوئی اور عدالت نے یہ قرار دیتے ہوئے کہ اب کوئی خامی باقی نہیں رہی اپیل خارج کر دی۔ چند ماہ بعد ایک دن گرمی کی شدت کے موسم میں عدالت ہائی کورٹ میں بجلی کی رو بند ہو گئی۔ میں اس وقت مسٹر جسٹس آغا حیدر کے اجلاس میں پیش تھا۔ روشنی اور پنکھے بند ہو گئے۔ خس کی ٹٹیوں میں سے ہوا گذارنے والی مشین بھی بند ہو گئی اور شدید حبس محسوس ہونے لگا۔ مسٹر جسٹس آغا حیدر رحیم شحیم بھاری بھر کم پہلوان تھے۔ چند منٹوں میں بےچین ہو گئے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا یہ بھی کوئی عدالت ہے؟ عمارت ایسی ہے کہ گرمیوں میں شدید گرم اور سردیوں میں سخت سرد یہاں کام کیسے ہو اور یہاں انصاف بھی کیا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے وہ عبداللہ کا کیس اس میں کیا ہوا تھا۔ میں ان کے آخری فقرہ کو سنکر ششدر رہ گیا۔ ان کی واضح مراد تھی کہ عبداللہ کے کیس میں انصاف نہیں ہوا تھا یا اسے ناحق پھانسی دیدی گئی۔ لیکن باوجود اس احساس کے کہ ان جج صاحب نے نہ صرف اس فیصلے میں شرکت کی تھی بلکہ پھانسی کے وارنٹ پر دستخط بھی کئے تھے! اگر انہیں چیف جسٹس کے ساتھ اتفاق نہیں تھا تو اپنا اختلافی فیصلہ لکھتے اس صورت میں اپیل کی سماعت کسی تیسرے جج کی عدالت میں ہوتی اور آخری فیصلے کی ذمہ داری اس پر ہوتی۔ لیکن انہیں چیف جسٹس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اپنے ضمیر کا خون کرنا گوارا ہو گیا۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں حصہ لینے کی تیاری

۱۹۲۶ء کے اگست میں والد صاحب ڈسکہ میں تشریف فرما تھے کہ ان کی طبیعت پھر ناساز ہو گئی۔ اس سال بھی مجالس قانون ساز کے انتخابات ہونے والے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں چودھری سر شہاب الدین صاحب ضلع سیالکوٹ کے حلقے سے چودھری جہان خاں صاحب گورایہ کے مقابلے میں پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے اور بعد میں کونسل کی صدارت پر فائز ہوئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انکی خواہش تھی کہ وہ ضلع سیالکوٹ سے بھی امیدوار ہوں اور ضلع گورداسپور سے بھی۔ اور دونوں حلقوں میں کامیاب ہو جانے کی صورت میں ایک نشست خالی کر دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح رضی کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا جس میں علاوہ دیگر امور کے یہ بھی ذکر کیا کہ ظفراللہ خاں کو کچھ نہ کچھ فائدہ مجھ سے پہنچتا رہتا ہے۔ حضور رضی نے خاکسار کو قادیان طلب فرمایا۔ حاضر خدمت ہونے پر چودھری صاحب کا عریضہ پڑھنے کے لئے دیا اور دریافت فرمایا کہ اگر چودھری صاحب تم سے رنجیدہ خاطر ہوں تو تم کس قدر مالی فائدے سے محروم ہو جاؤ گے خاکسار نے عرض کیا کہ انڈین کیسیز کے دفتر سے جو کام بھیجا جاتا ہے اس سے چند سو روپے ماہوار کی آمد ہو جاتی ہے۔ لیکن رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ چودھری صاحب ہمیشہ خاکسار کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے رہے ہیں اس لئے خاکسار ان کا ممنون ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار ان کا

کسی رنگ میں محتاج نہیں۔ حضورؓ نے فرمایا۔ چوہدری صاحب نے ۱۹۲۳ء میں پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ ضلع سیالکوٹ سے انتخاب کے لئے امیدوار نہیں ہوں گے۔ اس الیکشن میں ان کا ارادہ ضلع گورداسپور سے امیدوار ہونے کا بھی ہے۔ اس حلقے میں ہم ان کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہیں اور ممکن ہے یہاں سے وہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہو جائیں۔ لیکن ضلع سیالکوٹ کے متعلق انہیں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے۔ فرمایا کہ انہیں یہ جواب لکھنے سے پہلے میں چاہتا تھا کہ تم سے بھی دریافت کر لوں۔ لاہور واپس آنے کے بعد جب انڈین کیبنٹ کے دفتر سے مجھے کچھ کام بھیجا گیا تو میں نے واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ آئندہ مجھے کام نہ بھیجا کریں۔ دوسرے دن چوہدری صاحب میرے مکان پر تشریف لائے اور دریافت فرمایا ظفر اللہ خان کیا وجہ ہوئی تم نے انڈین کیبنٹ کے کام کے متعلق کہلا بھیجا ہے کہ آئندہ تمہیں نہ بھیجا جائے میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہوں آپ ڈرائیور کو ارشاد فرمائیں کہ کار نہر کے کنارے کنارے لے چلے وہاں میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب عرض کر دوں گا لیکن اگر آپ نے کچھ فرمانا ہو تو میرا جواب سن لینے کے بعد فرمائیں۔ مسکرا کر فرمایا بہت اچھا۔ میں نے ان کے اس خط کا ذکر کیا جو انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور کہا کہ اس میں آپ نے فرمایا کہ مجھے آپ سے فائدہ پہنچتا رہتا ہے اس بات سے مجھے کوئی رنج تو نہیں ہوا کیونکہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ امرِ واقعہ ہے لیکن آپ کے اس فقرے نے میرے ذہن میں خیالات کی ایک رو جاری کر دی۔ انسان کا اندازہ اپنی ذات کے متعلق صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ میرا اندازہ اپنے متعلق یہ ہے کہ میں حتی الوسع حفظِ مراتب کا خیال رکھتا ہوں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے جس مقام پر کھڑا کیا ہو اس کے کچھ واجبات مجھ پر عاید ہوتے ہیں انہیں مناسب طور پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً سر شادی لال چیف جسٹس ہیں۔ بہت سے امور میں مجھے ان کے طرز و طریق سے اختلاف ہے۔ ان کی بعض کمزوریاں تو آشکارہ ہیں۔ میں ان کی عدالت میں پریکٹس کرتا ہوں۔ سال میں اوسطاً ایک مرتبہ میں چند منٹوں کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو آتا ہوں۔ ممکن ہے ان کو اس سے حیرت بھی ہوتی ہو کہ میں نہ ان کی خوشامد کرتا ہوں نہ کوئی غرض پیش کرتا ہوں۔ لیکن میں کسی خوف یا طمع کی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔ میرے دل میں کسی انسان کا خوف ہے نہ کسی سے کوئی طمع ہے۔ آپ میرے بچپن سے میرے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور آپ کا ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے آپ سے فائدہ پہنچنے کے متعلق جو کچھ لکھا اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں خود اپنا امتحان کر لوں کہ کیا جسے میں سمجھتا ہوں میرے دل میں آپ کا احترام آپ کے گذشتہ حسن سلوک کی وجہ سے اور والد صاحب کے دوست ہونے کی وجہ سے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جسے میں احترام سمجھتا ہوں اس کی حقیقت آئندہ کے طمع کی خاطر خوشامد کی ہے۔ میں نے انڈین کیبنٹ کا کام اسلئے بند کر دیا ہے کہ جلبِ منفعت کا پہلو ہمارے تعلقات سے خارج ہو جائے۔ اگر آئندہ

بھی میرے جذبات آپ کے متعلق وہی رہیں جو اب تک ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ میرا اندازہ اپنے متعلق صحیح تھا۔ اور اگر ان میں فرق آ گیا تو میں سمجھوں گا میرا نفس مجھے فریب دیتا تھا۔ چودھری صاحب نے میری بات خاموشی سے سنی اور جب میں ختم کر چکا تو صرف اتنا فرمایا ظفر اللہ خاں کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں۔

جب ۱۹۲۶ء کے انتخاب کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ چودھری جہان خانصاحب گورایہ کے ساتھ ہو گا۔ چودھری صاحب ضلع سیالکوٹ کے ایک خوش خلق، مہمان نواز، بارسوخ زمیندار تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن ہونے کی وجہ سے ضلع بھر کے سرکردہ زمینداروں کے ساتھ ان کا متواتر میل جول اور باہم مشورہ رہتا تھا۔ ان کے رشتہ داری اور برادری کے تعلقات بھی بہت وسیع تھے۔ ۱۹۲۳ء میں چودھری سر شہاب الدین صاحب کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے انہیں انتخاب کے سلسلہ میں معتدبہ اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے اس لئے انہیں یہ احساس ضرور ہو گا کہ انتخاب میں امیدوار کو بہت کچھ گرم سرد حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کی طبیعت اس طرف مائل تھی کہ اگر آپس میں سمجھوتے کے ساتھ کسی فیصلے کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ طریق مناسب ہو گا۔ اس انتخاب میں اگرچہ امیدوار تو میں تھا لیکن چودھری جہان خاں صاحب جانتے تھے کہ میری تائید جس قدر ہو گی وہ میرے والد صاحب کے تعلقات اور رسوخ کی وجہ سے ہو گی۔ ضلع سیالکوٹ کے نارووال کے علاقے میں چودھری فتح دین صاحب ذیلدار مدّو کا ملوان ایک بارسوخ اور بااثر زمیندار تھے۔ انہوں نے کسی ملاقات کے دوران میں چودھری جہان خانصاحب سے کہا کہ انتخاب کی سردردی کی بجائے کیوں نہ کوئی صورت سمجھوتے کی اختیار کر لی جائے۔ چودھری صاحب نے فرمایا اگر آپ کے ذہن میں کوئی صورت ہو تو فرمائیں۔ چودھری فتح دین صاحب نے کہا قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیا جائے۔ چودھری جہان خانصاحب نے فرمایا مناسب ہے۔ لیکن قرعہ اندازی ڈپٹی کمشنر صاحب کریں۔ چودھری فتح الدین صاحب نے جواب میں کہا کہ اس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ . . . .

. . . . اس کے بعد چودھری فتح الدین صاحب نے والد صاحب سے کہا۔ میں نے چودھری جہان خانصاحب کو قرعہ اندازی پر رضامند کر لیا ہے آپ بھی رضامندی دیدیں والد صاحب نے فرمایا مجھے تو یہ طریق پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ آپ چودھری جہان خاں صاحب کو اس طریق پر آمادہ کر چکے ہیں اور میرے انکار کر دینے سے آپ کی سبکی ہو گی اسلئے میں بھی رضامندی دیدیتا ہوں۔ چنانچہ والد صاحب نے خاکسار کو ارشاد فرمایا کہ چودھری جہان خاں صاحب کے ساتھ ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس جا کر قرعہ اندازی کر لو۔ میں نے جب مسٹر ہرن ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں کو اپنے بنگلے پر بلوایا اور دیا سلائی کی ڈبیہ خالی کر کے ایک میں میرے نام کا پرزہ ڈال دیا دوسری میں چودھری

جہان خاں صاحب کے نام کا۔ اپنے جمعدار اردلی سے کہا ان میں سے ایک اٹھالو اور اس میں جو پرزہ ہے وہ نکالو جو پرزہ جمعدار نے نکالا اس پر میرا نام تھا لہذا چودھری جہان خاں صاحب انتخاب سے دستکش ہو گئے۔

والد صاحب کی وفات | اس کے تھوڑا عرصہ بعد والد صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی حرارت کے ساتھ کھانسی رہنے لگی۔ والدہ صاحبہ کے اطلاع دینے پر میں ڈسکے گیا اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو لاہور لے آیا ڈاکٹر محمد یوسف صاحب نے معائنہ کیا اور WET PLURESY تشخیص کی۔ بہت توجہ سے علاج کرتے رہے فجزاھا اللہ احسن الجزاء۔ کچھ دن بعد پھیپھڑے سے پانی نکالا جس سے بفضل اللہ کچھ افاقہ ہوا لیکن پھر تکلیف بڑھنا شروع ہو گئی۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کو بعض فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں شملے کا سفر پیش آگیا۔ ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر یار محمد خانصاحب علاج کرتے رہے۔ دو تین دن بعد پھر پانی نکالنے کی تجویز ہوئی۔ لیکن اب کی بار بجائے افاقے کے کمزوری بڑھنا شروع ہو گئی۔ ۳۱ر اگست منگل وار کی صبح کو بعد نماز فجر والدہ صاحبہ نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا خواب کی تعبیر واضح تھی اور والدہ صاحبہ نے بھی یہی تعبیر بتائی کہ تمہارے والد جمعہ کا دن شروع ہوتے ہی فوت ہو جائیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ ابھی سے سب تیاری کر لی جائے۔ چنانچہ تفصیلی ہدایات دیں جن کی تعمیل کر دی گئی۔ یہ دن ہم سب کے لئے سبق آموز بھی تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم کے نشانات کے ظاہر کرنے والے بھی تھے۔ دل درد سے پُر بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر کلیتہً راضی بھی تھا۔ کچھ تفصیل ان ایام کی میری کتاب "میری والدہ" میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور مجھے ہمت بھی نہیں پڑتی۔ والدہ صاحبہ کے خواب کے مطابق ۲ ستمبر ۱۹۲۶ء بعد نماز مغرب جب اسلامی شمار سے جمعہ کا دن شروع ہی ہوا تھا ہم اس سراپا شفقت بزرگ ہستی کی ہدایت اور رفاقت سے محروم ہو گئے یغفر اللّٰہ لہ ویجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔ والدہ صاحبہ کی ہدایات کے مطابق سب انتظام ہو چکا تھا دو بجے شب ہم ان کے جنازے کو لیکر روانہ ہوئے طلوع آفتاب کے وقت قادیان پہنچے۔ اسی رات حضرت خلیفۃ المسیحؓ باوجود رستے کی خرابی کے ڈلہوزی سے قادیان تشریف لائے۔ ۴ ستمبر ۹ بجے صبح اپنے ناظر اعلیٰ کا جنازہ پڑھایا اور سلسلہ کے پہلے ناظر اعلیٰ مقبرہ بہشتی میں خاص صحابہ کے قطعہ میں دفن ہوئے۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں کامیابی | والد صاحب کی وفات کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ چودھری اکبر علی خاں صاحب سکنہ کوٹلی نوناں تحصیل ڈسکہ انتخاب میں امیدوار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پہلے تو میں نے اس اطلاع کو باور نہ کیا۔ چودھری صاحب کے میرے ساتھ خاندانی اور ذاتی بہت دوستانہ تعلقات تھے اور وہ میرے معاونین میں سے تھے بیشک ان کی طبیعت مزاح کی طرف مائل تھی لیکن یہ معاملہ سنجیدہ تھا اور بہرصورت انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ معلوم ہوا ان کا موقف یہ ہے کہ قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا کہ

کون امیدوار ہو درست نہیں اور رائے دہندگان کو اپنی رائے کے اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انہیں کامیابی کی توقع نہیں وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ میرا انتخاب ہی مناسب ہوگا لیکن وہ قرعہ اندازی کے طریق کو پسند نہ کرتے تھے۔ اصولاً تو ان کا موقف درست تھا اور جب وہ انتخاب میں حصہ لینے پر مصر تھے تو انہیں باز رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ وقت آنے پر انہوں نے درخواست دیدی۔ اسلیئے انتخاب کی کارروائی لازم ہوگئی اور ہمیں انتخاب کا بکھیڑا جھیلنا پڑا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ضلع سیالکوٹ کے سرکردہ زمیندار اصحاب کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات مضبوط ہو گئے۔

انتخاب کی بھاگ دوڑ کے سلسلہ میں ایک لطیفے کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ماہرہ کلاں کے "سفید پوش" چودھری جہان خاں صاحب نے خواہش کی کہ میں ان کے ہمراہ ان کے گاؤں جاکر وہاں کے رائے دہندگان سے ملوں۔ چنانچہ ایک شام میں اور چودھری قاسم علی خاں صاحب ذیلدار ان کے ہمراہ ان کے گاؤں گئے اور رات ان کے ہاں مہمان رہے۔ دوسری صبح انہوں نے دیہہ کے مالکان کو اپنے دیوان خانے میں بلا لیا اور میرا ان سے تعارف کرایا اور میرے آنے کی غرض بیان کی اتنے میں ناشتہ آگیا۔ میزبان نے فرمایا تمہارا وقت قیمتی ہے ناشتہ کرلیں گفتگو جاری رہے گی ناشتہ ختم ہوا تو مالکان دیہہ میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے حاضرین سے کہا "بھائیو میں تو کہتا ہوں پرچی (ووٹ) اسی چودھری کو دینی چاہیئے" حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ رائے تو ہماری بھی یہی ہے لیکن تمہارے مشورے کی کوئی خاص وجہ ہے اس نے کہا "وجہ یہ ہے کہ ہم سب زمیندار ہیں اور جب ہمیں بیل خریدنا ہوتا ہے تو علاوہ اور باتوں کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بیل چرنے (کھانے) میں کیسا ہے جو بیل اچھی طرح چرتا ہے وہ کلبہ رانی بھی خوب کرتا ہے۔ میں اس چودھری کو کھاتے دیکھتا رہا ہوں یہ چرتا خوب ہے چلے گا بھی خوب"۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور ہنستے ہنستے محفل برخاست ہوئی۔ چودھری اکبر علی صاحب صرف اتنا دعا کرتے تھے کہ ان کی ضمانت ضبط نہیں ہوگی۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو اس کے برعکس ان کی تائید میں آراء کی اسقدر کمی رہی کہ ان کا زر ضمانت ضبط ہوگیا۔

پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی | میاں سر فضل حسین صاحب ۱۹۲۱ء میں پنجاب کی حکومت میں وزیر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ ریونیو ممبر ہوئے۔ اپنی وزارت کے زمانے میں انہوں نے چودھری لال چند صاحب کو اپنے ساتھ شامل کرکے یونینسٹ پارٹی قائم کی تھی۔ چودھری لال چند صاحب کے انتخاب پر عذرداری ہوئی اور ان کا انتخاب منسوخ ہوا۔ ان کی جگہ چودھری چھوٹو رام صاحب منتخب ہوکر یونینسٹ پارٹی کے نائب لیڈر ہوئے۔ یہ پارٹی اقتصادی اصولوں کی بنا پر قائم کی گئی تھی۔ اس کے ارکین

میں کثرت مسلمانوں کی تھی۔ لیکن ہندو اور سکھ بھی اس میں شامل تھے۔ اگرچہ یہ پارٹی دیہاتی پارٹی شمار کی جاتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ صوبے کی دیہاتی آبادی کی خوشحالی کو فروغ دینا اس کے مقاصد میں شامل تھا لیکن اس کا اصل مقصد صوبے کی آبادی کے تمام کمزور اور پسماندہ عناصر کی خوشحالی کو ترقی دینا تھا۔ ان عناصر میں دیہاتی آبادی (عیسائی، ہندو، سکھ، مسلمان) کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ مسلمان من حیث القوم دیگر اقوام کی نسبت کمزور اور پسماندہ تھے۔ میاں سر فضل حسین صاحب کی دور بینی دور اندیشی اور سیاسی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ یہ تجویز انہیں سوجھی جو کارگر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دو عملی کے دور میں اگرچہ تعلیم، صحت، زراعت، جنگلات، بلدیات، وغیرہ کے محکمے وزرا کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ لیکن امن عامہ اور مالیات کے نہایت اہم محکمے معہ چند دیگر محکمہ جات کے "محفوظ" رکھے گئے تھے اور ان کا انصرام ممبران عاملہ کے سپرد تھا جو کلیۃً گورنر کے ماتحت تھے علاوہ ازیں گورنر کو وزراء کے محکموں کی نگرانی کے متعلق بھی بعض اختیارات حاصل تھے۔ اس صورتِ حالات میں گورنر اور ممبرانِ عاملہ کی نگاہ میں وہی وزراء حقیقتاً قابلِ قدر سمجھے جا سکتے تھے اور انہی کی رائے کو وزن دیا جا سکتا تھا جنکو مجلس قانون ساز میں اکثریت کی تائید اور حمایت حاصل ہو۔ تعمیری محکمہ جات کو خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ چلانے اور انہیں رفاہ عامہ کو فروغ دینے کا آلہ بنانے کے لئے علاوہ دیگر لوازمات کے روپے کی ضرورت تھی۔ اور خزانے پر اختیار وزراء کا نہیں ممبر عاملہ کا تھا۔ اسلئے لازم تھا کہ میاں سر فضل حسین صاحب کو اپنے تعمیری منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجلس قانون ساز کی تائید حاصل ہو۔ اس وقت کے حالات کے ماتحت یونینسٹ پارٹی کا قیام ایک سیاسی شاہکار تھا۔ اس پارٹی پر نہ تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ یہ فرقہ دارانہ پارٹی ہے۔ اس لئے اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ یہ صوبے کے دوسرے فرقوں کے حقوق کا تحفظ کر سکے یا ان کی موثر نمائندگی کر سکے۔ اور نہ ہی یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ یہ ایسی اقتصادی پارٹی ہے جو شہری طبقہ کے خلاف ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کی اس سے توقع نہیں ہو سکتی۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب اپنی سہ سالہ رکنیتِ مجلس کے دوران میں اس پارٹی کے رکن رہے۔ شیخ سر عبدالقادر صاحب، شیخ دین محمد صاحب اور کئی دیگر معززین شہری طبقہ میں سے وقتاً فوقتاً اس پارٹی کے قابلِ احترام رکن رہے۔ جن حالات میں اس پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور جو کام اس نے کر دکھلایا ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا جائے تو ہر صائب غیر جانبدار رائے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی کہ بیس سال کے عرصے میں صوبہ پنجاب اگر ہندوستان کے ایک پسماندہ صوبے کی حیثیت سے بڑھ کر ایک ترقی یافتہ صوبہ شمار ہونے لگا تو اس قلب ماہیت کی داد کی مستحق یونینسٹ پارٹی تھی۔ اور اس پارٹی کی بنیاد رکھنے والے اور روح رواں میاں سر فضل حسین صاحب ہر پنجابی کے مخلصانہ شکریہ کے مستحق تھے۔ فجزاہ اللہ۔ آج کے کئی خود ساختہ مورخ اس سادہ حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی کا تیسرا اور چوتھا عشرہ

ایک دور تھا۔ چوتھے عشرہ کے وسط میں وہ دور بدلنا شروع ہوا اور بہت جلد سیاسیاتِ ہند ایک نئے انقلابی دور میں داخل ہو گئی۔

میاں سر فضل حسین صاحب | میاں سر فضل حسین صاحب ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک بطور وزیر اور بطور ممبر عاملہ حکومت پنجاب میں سرگرمِ عمل رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک حکومت ہند میں وائسرائے کی مجلسِ عاملہ کی زینت رہے مئی ۱۹۳۵ء میں جب وہ پنجاب واپس لوٹے تو صحت کی یہ حالت تھی کہ سانس تک لینا دشوار تھا۔ میں قیاس کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی پختہ علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اپنی نحیف ناتوان جان کو تیسری بار بالکل بدلے ہوئے حالات میں وقف رنج و محن کریں۔ لیکن پرانے رفقاء میں سے برسر اقتدار عنصر نے شرط پیش کی کہ اگر ان کی قیادت اس مرحلے پر میسر نہ ہو گی تو وہ بھی خدمتِ عامہ سے دست کش ہو جائیں گے۔ ان سے یہ اصرار کیا گیا کہ وہ قوم کی ضرورت کو ذاتی آرام پر ترجیح دیں اور پرانے رفقاء کو اپنی رہنمائی سے محروم نہ فرمائیں۔ میاں صاحب خوب جانتے تھے کہ یہ شرط اور یہ دعویٰ اخلاص و وفا ہاتھی کے دانت ہیں۔ انکی ڈائری کے اندراجات اس پر شاہد ہیں لیکن میرا علم ان کی ڈائری سے حاصل کردہ نہیں بلکہ خود ان سے حاصل کیا ہوا ہے۔ لیکن وہ آخر فضل حسین تھے۔ جانتے ہوئے کہ یہ دعوت محض فریب ہے۔ آپ نے اسے قبول فرمایا۔ شاید یہ بھی خیال ہو کہ اس کے پردے میں جو چال چلی جا رہی ہے آپ اس کا تدارک فرما سکیں گے لیکن قویٰ اور استعدادیں سب خدمتِ قوم میں صرف ہو چکی تھیں۔ پندرہ سال سے ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ آخری چند سالوں میں بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ہفتہ بھر لگاتار درجۂ حرارت اعتدال پر رہا ہو۔ پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور جان جانِ آفرین کو سپرد کر دی غفراللہ لہ برحمتہ۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں پنجاب اور ہندوستان نے بہت مخلص خادم ملت پیدا کئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحم سے ان سب کی سعی مشکور فرمائے۔ اور انہیں جزائے جزیل عطا فرمائے اور اپنی رحمت سے وافر حصہ بخشے آمین۔ اگر آج قوم میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ تو یہ تمام واجب الاحترام خادمانِ ملت کی مساعی اور ان کی مسلسل قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ میاں سر فضل حسین صاحب اس گروہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۶ء کے دور میں ان کی تعمیری خدمات مسلمانانِ ہند کے لئے عموماً اور مسلمانانِ پنجاب کے لئے خصوصاً ان کے مستقبل کے لحاظ سے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے کے سیاسی نقاد اور مورخ بھول جاتے ہیں۔ کہ صدی کے آغاز میں مسلمان باوجود پنجاب میں اکثریت رکھنے کے دوسری قوموں کے مقابلے میں صوبے میں کیا حیثیت رکھتے تھے۔ اور صوبہ پنجاب صوبجات بنگال

بمبئی اور مدراس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ اگر ۱۹۲۱ء کے بعد بھی وہی حالات جاری رہتے تو ترقی کے راستے کھلنے پر غیر مسلم عناصر کا قدم ترقی کی شاہراہ پر مسلمانوں کے مقابلے میں تیز سے تیز تر ہوتا جاتا اور ہر سال مسلمانوں کی نسبتی حالت گرتی چلی جاتی۔ قیاس غالب ہے کہ ان نقادوں اور مورخین میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نصیب نہ ہو سکتا۔ پنجاب کا درجہ بجائے دوسرے صوبوں کے مقابل میں تدریجاً بلند ہونے کے تدریجاً گرتا چلا جاتا۔ میاں سر فضل حسین صاحب کی مساعی کے نتیجے میں تمام سرکاری اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں مسلمان طلباء کے لئے کم سے کم ۴۰ فیصدی نشستیں محفوظ ہوئیں۔ صوبہ بھر میں سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں تدریج اضافہ ہوتا گیا۔ صوبہ بھر میں تعلیم کا معیار، کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے پنجاب نے اوّل بڑے صوبوں کی ہمسری کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا اور جلد ہی انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ صحت اور طبی محکموں اور اداروں میں چستی پیدا ہوئی شہروں اور دیہات میں شفا خانوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہونے لگا۔ صوبے کی زندگی کے ہر شعبے کی نبض تیز چلنے لگی۔ میاں سر فضل حسین صاحب دوربینی اور دور اندیشی کے اوصاف سے متصف تھے حسن تدبیر سے کام لیتے تھے، درد مند دل رکھتے تھے، خدمت کو بھی انعام سمجھتے تھے، دوسروں سے کام لینے کا ڈھب انہیں آتا تھا۔ بایں ہمہ وہ ایک انسان تھے اور اتنا ہی کر سکتے تھے جتنا ایک انسان سے ہو سکتا ہے۔ ان کی قیادت میں بیشمار اصحاب نے علیٰ قدرِ مراتب ملک اور قوم کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور مخلصانہ تعاون کے ذریعے ان منصوبوں کو تکمیل تک پہنچایا اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ٹھہرے۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۵ء کے دور میں میاں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی بہت کارآمد اور کارگر ثابت ہوئی۔ ترقی کے منصوبوں کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس پارٹی نے اراضیات پر شرح محاصل کی ایزادی کی تائید میں رائے دیکر روپیہ فراہم کرنے کا سامان کیا۔ یہ کسی پر احسان نہیں تھا۔ پارٹی کے اراکین جانتے تھے کہ یہ روپیہ بلا واسطہ ان کی بہبودگی والے منصوبوں پر خرچ ہوگا۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک میاں صاحب وائسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ جب لارڈ ارون (جو بعد میں اپنے والد کی وفات پر لارڈ ہیلیفیکس ہوئے) وائسرائے ہند نے میاں صاحب کو سر حبیب اللہ صاحب کی جگہ وائسرائے کی مجلس عاملہ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور میاں صاحب نے میرے ساتھ اس کا ذکر کیا تو میں نے عرض کیا کہ وائسرائے ہند کی دعوت قبول کرنا تو ناگزیر ہے۔ لیکن پھر صوبے میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا جب وائسرائے نے میرے ساتھ زبانی ذکر کیا تو میں نے تامل کا اظہار کیا

وائسرائے نے کہا آپ ہمیشہ زور دیتے ہیں کہ ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کو آگے بڑھایا جائے۔ اب یہ موقعہ ہے آپ مرکزی حکومت کے رکن کی حیثیت سے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی خود سعی کر سکیں گے۔ اس دلیل کو رد کرنا مشکل تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں نو سال سے صوبے میں کام کر رہا ہوں میرے ساتھ کام کرنے والے توقع رکھتے ہیں کہ میں جگہ خالی کروں تو وہ میری جگہ لیں۔ جگہ تو ایک ہی ہے اور ایک ہی کو مل سکتی ہے۔ اگر میں اس سے چمٹا رہوں تو کئی رفیق میں جن کو یہ ناگوار ہوگا۔ باپ بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو بیٹوں کی خواہش ہوتی ہے کہ جائداد کا انتظام اب ہمارے سپرد ہونا چاہیئے اور یہ تو میدان سیاست ہے۔ حکومت ہند میں کام کرنے کے دوران میں میاں صاحب نے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی بہبودی کے لئے جو کوششیں کیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ نمونے کے طور پر ایک کا ذکر مناسب ہوگا۔ آپ سے پہلے سر سید علی امام صاحب، سر میاں محمد شفیع صاحب، سر محمد حبیب اللہ صاحب وائسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے۔ اور سب نے علیٰ قدر مراتب گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ لیکن ہر مرحلے پر خدمت کا میدان کھلا ہوتا ہے۔ اور نئے نئے مواقع خدمت کے میسر آتے رہتے ہیں میاں سر فضل حسین صاحب نے ایک واضح مقصد اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس کے حصول کے لئے وہ صوبے میں کوشاں رہے اور وہی مقصد وہ اپنے ساتھ مرکز میں لے گئے۔ ہمیشہ اُن کی یہی کوشش رہی کہ ملک اور اہل ملک ہر شعبے میں آگے قدم بڑھائیں اور ترقی کی اس جدوجہد میں مسلمان پورا حصہ لیں اور اس میں انہیں ان کا پورا حق دیا جائے۔ اپنی رکنیت کی میعاد کے پہلے نصف میں ہی آپ نے اپنے محکمے کے سکرٹریٹ میں جو اونچے عہدے تھے ان پر ہندوستانیوں کا تقرر کر لیا تھا سیکرٹری سر گرجا شنکر باجپائی صاحب تھے۔ جائنٹ سیکرٹری مسٹر رام چندرہ صاحب عیسائی تھے۔ ڈپٹی سیکرٹری صالح اکبر حیدری صاحب تھے۔ کچھ عرصے کے لئے خان بہادر شیخ خورشید محمد صاحب انڈر سیکرٹری رہے۔ اس وقت تک وائسرائے کی کونسل کے کسی دوسرے ہندوستانی یا غیر ہندوستانی رکن کو ایسا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کے متعلقہ محکمہ جات میں سے آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل رائے بہادر دیا رام ساہنی ہوئے۔ انڈین میڈیکل سروس کا مرکزی ادارہ ہندوستانی عنصر سے بالکل خالی تھا اور اس کے ڈائرکٹر جنرل جنرل میگا صاحب اتنا سننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ مناسب موقعہ پر مرکز میں کسی ہندوستانی افسر کا تقرر زیر غور آئے۔ میاں صاحب نے اپنی میعاد ختم ہونے سے پہلے لفٹنٹ کرنل گنا پتی کے تقرر بطور پبلک ہیلتھ کمشنر ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل آئی ایم ایس کی منظوری وائسرائے سے لے لی۔ میاں صاحب کے مرکزی حکومت کا رکن ہونے سے پہلے تک مرکزی اعلیٰ ملازمتوں میں خال خال ہی کوئی مسلمان نظر آتا تھا۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ اس صورت حال کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ چنانچہ سر ہربرٹ ایمرسن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں تفصیلی

رپورٹ پیش کریں۔ سر ہربرٹ اس وقت ہوم سیکرٹری تھے بعد میں پنجاب کے گورنر ہوئے۔ جون ۱۹۳۲ء میں جب میاں صاحب نے کمزوری صحت کے سبب چار مہینے کی رخصت لی اور ان کی جگہ میرا عارضی تقرر ہوا تو آپ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ سر ہربرٹ ایمرسن کی رپورٹ پیش ہونے والی ہے۔ اس پر بحث تو کچھ عرصہ بعد ہوگی لیکن تم اس رپورٹ پر اپنا نوٹ ضرور لکھ دینا تاکہ بحث کے وقت میں اپنی تائید میں تمہارے نوٹ سے بھی فائدہ اٹھا سکوں۔ یہ ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلئے کسقدر ہوکس تھے۔ آپکی صحت کی حالت سے کوئی دیکھنے والا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کسی بات کیطرف توجہ کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی یہ نکتہ آپ نے فراموش نہ کیا کہ ان کی جگہ عارضی طور پر کام کرنے والا بھی ان کے موقف کی تائید میں نوٹ لکھ جائے تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہم دونوں کی یہ رائے ہے بالآخر حکومت ہند نے ۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو یہ ہدایت جاری کی کہ مرکزی اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کو کم سے کم ۲۵ فیصد حصہ ملنا چاہیئے۔ اگر مقابلے کے امتحان میں مسلمان ۲۵ فیصد سے زائد حصہ حاصل کریں تو وہ ان کا حق ہوگا۔ لیکن اگر ان کا حصہ ۲۵ فیصد سے کم رہ جائے تو کمی کو نامزدگی سے پورا کیا جائے۔

گول میز کانفرنس کے مباحثات کے دوران میں ایک نہایت اہم اور پیچیدہ مسئلہ جو پیدا ہوا وہ فرقہ وارانہ نمائندگی کا تھا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مجالسِ قانون ساز میں ہمیں محفوظ نشستوں کے ذریعے حق نمائندگی ملنا چاہیئے۔ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے ان کی مجالس میں تو ہماری اکثریت ہونی چاہیئے لیکن جہاں ہم اقلیت میں ہیں وہاں بھی ہمیں آبادی کے تناسب سے کچھ زائد حصہ ملنا چاہیئے۔ اس قضیئے کا فیصلہ آخر برطانیہ کی حکومت کے ذمے ڈالا گیا۔ برطانوی حکومت نے حکومت ہند کی رائے طلب کی۔ وائسرائے کی مجلسِ عاملہ میں اس پر تفصیلی بحث ہوئی۔ سابق سندھ اور صوبہ سرحد کے متعلق تو کوئی مشکل پیش نہ آئی ان دو صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی اتنا تھا کہ اقلیت کو زائد نمائندگی دینے کے بعد بھی مسلمانوں کی کثرت قائم رہ سکتی تھی۔ لیکن پنجاب میں مسلمانوں کا تناسب آبادی میں صرف ۵۶ فیصد تھا اور چھوٹی اقلیتوں کو چھوڑ کر دو بڑی اقلیتیں ہندوں اور سکھوں کی تھیں۔ پنجاب کے متعلق بھی مجلس عاملہ میں اتفاق ہوگیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے خفیف سی اکثریت مجلس قانون ساز میں قائم رہی۔ لیکن بنگال میں ایک اور مشکل تھی وہاں مسلمانوں کا تناسب آبادی صرف ۵۴ فیصد ہونے کے علاوہ یورپین اقلیت جو تعداد میں بہت قلیل مگر تجارتی، صنعتی اور مالی لحاظ سے نہایت اہم تھی انہیں معتدبہ نمائندگی دینے کا فیصلہ تھا۔ اس غرض کیلئے جو طریق بھی اختیار کیا جاتا، مسلمانوں کی اکثریت قائم نہ رہتی۔ اور ہندوؤں کو زائد نمائندگی تو الگ تناسب آبادی کے مطابق بھی نمائندگی نہ مل سکتی آخر مجلسِ عاملہ کی اکثریت نے جس تجویز کی سفارش کی اس کے مطابق

مسلمانوں کو ۸ء ۴۴ فیصدی نمائندگی محفوظ نشستوں کی صورت میں اور ۸ء۰ فی صدی مزدوروں کی نشستوں سے متوقع صورت میں دی گئی۔ گویا مسلمان ۸ء۰ ۸ء۴۴ فیصدی نمائندگی کے حقدار ٹھہرے۔ کثرت کی اس تجویز سے میاں صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے اور سر بی این مترنے ہندوؤں کی طرف سے اختلاف کیا حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے فیصلے میں اس تناسب کو قائم رکھا۔ ہندوؤں کو اس تجویز کے ماتحت تناسب آبادی کے مقابلے میں کم نمائندگی دی گئی۔

میثاق لکھنؤ کی رو سے مسلمانوں کو بنگال میں عام نشستوں میں سے ۴۰ فیصدی دیا گیا تھا۔ چونکہ خاص نشستوں کی تعداد ۳۰ فیصدی تک پہنچ جاتی تھی۔ (یورپین، صنعت وحرفت، تجارت، مزدور، یونیورسٹی) اور اس میں سے مسلمانوں کو کوئی نشست حاصل نہیں ہوتی تھی۔ عملاً مسلمانوں کی نمائندگی ۲۸ فیصدی رہ جاتی تھی۔ حکومت کے متذکرہ بالا فیصلے سے مسلمانوں کی نمائندگی ۸ء۴۴ فیصدی ہو گئی جو میاں سر فضل حسین صاحب کی مساعی کا ہی ثمرہ تھا۔ تصویر کے تمام نقوش کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر سر فضل حسین ایک محکم اور مضبوط بنیاد نہ قائم کر گئے ہوتے تو ۱۹۳۵ء کے بعد کی نہایت قابلِ قدر اور قابلِ احترام قیادت کو پاکستان کی عمارت تعمیر کرنے میں بہت دشواری پیش آتی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مرکزی اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کے متعلق حکومت ہند کی ۴ رجولائی ۱۹۳۴ء والی ہدایات جاری نہ ہو چکی ہوتیں تو ۱۹۴۷ء میں کتنے مسلمان ان ملازمتوں میں ہوتے اور کیا وہ تعداد ایک آزاد ملک کی حکومت کے صیغہ جات کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے قابل ہوتی؟

۱۹۲۶ء میں جب میں پنجاب کی کونسل کیلئے منتخب ہو گیا تو حضرت خلیفۃ المسیحؓ نے مجھے ہدایت فرمائی کہ میں کونسل میں اور سیاسی میدانِ عمل میں میاں سر فضل حسین کے ساتھ پورا تعاون کروں۔ حضورؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں قیادت کی کمی تو ہے ہی اس پر مستزاد یہ کمزوری ہے۔ کہ جب کوئی کام کا شخص آگے آتا ہے تو بجائے اس کے ساتھ تعاون کرنے کے اور اس کی پوزیشن مضبوط کرنے کے اس کی مخالفت کر کے اسے کمزور کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ میاں صاحب اس وقت قوم کی دانشمندانہ اور مخلصانہ خدمت کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کی تائید اور ان کے ساتھ تعاون لازم ہے۔ میں تو پہلے ہی میاں صاحب کا مداح اور ممنونِ احسان تھا اس لئے حضورؓ کے ارشاد کی تعمیل میرے لئے آسان تھی۔ میاں صاحب یونینسٹ پارٹی کے بانی اور لیڈر تھے۔ ان کی تائید اور ان کے ساتھ تعاون کا موثر ذریعہ یہی تھا کہ میں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اور کوئی صورت تھی بھی نہیں۔ ایوانِ مجلس میں نشستوں کی جو ترتیب تھی اس کے مطابق میری نشست علامہ سر محمد اقبال صاحب اور مولوی سر رحیم بخش صاحب کے درمیان تھی۔ مجلس کا پہلا اجلاس جنوری

۱۹۲۷ء کے اوائل میں شروع ہوا۔ چوہدری سر شہاب الدین صاحب صدر مجلس تھے میاں فضل حسین صاحب قائد مجلس تھے۔ اگرچہ وزارت چھوڑ کر گورنر کی مجلس عاملہ کے رکن ہو چکے تھے۔ لیکن بدستور یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے جیسے وزارت کے زمانے میں تھے۔ کونسل کے اجلاس شروع ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ چوہدری سر شہاب الدین صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا میاں صاحب کہتے ہیں ظفر اللہ خاں کا ذہن تو صاف ہے اور کام کی طرف توجہ بھی کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اپنی مرضی چلاتا ہے۔ میں نے کہا میں ایک وقت محسوس کرتا ہوں۔ ہر چند کہ میں ہر معاملے میں میاں صاحب کے منشاء کے مطابق قدم اٹھانا چاہتا ہوں لیکن بعض اوقات ان کا منشاء معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تفاوت بھی ہو جاتا ہے۔ میاں صاحب بہت کم اپنے منشاء کا اظہار فرماتے ہیں۔ اکثر امور میں ان کے منشاء کے متعلق قیاس کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ان امور کا تجربہ نہیں اسلئے قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میاں صاحب لیڈر ہیں۔ ان کا حق ہے کہ جو فیصلہ وہ فرمائیں اس کی تعمیل ہو لیکن فیصلے کا علم ہونا ضروری ہے۔ میں اس سے زیادہ کا خواہاں نہیں کہ اگر کسی معاملے میں میں کچھ گذارش کرنا چاہوں تو وہ سن لیں۔ اس کے بعد اگر ان کا فیصلہ میری رائے کے خلاف بھی ہو تو میری طرف سے تعمیل میں انشاء اللہ کوتاہی نہ ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے میری یہ گذارش چوہدری صاحب نے میاں صاحب کی خدمت میں پہنچا دی۔ کچھ دن بعد میاں صاحب نے مجھے اپنے مکان پر پانچ بجے صبح طلب فرمایا۔ جاڑے کے دن تھے پانچ بجے ابھی خاصا اندھیرا تھا میں حاضر ہو گیا۔ میاں صاحب پلنگ میں بیٹھے ہوئے کام میں مصروف تھے۔ بغیر کسی تمہید کے فرمایا میں آج دورے پر جا رہا ہوں۔ پہلے گورنر صاحب سے ملاقات ہے۔ وہیں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ گورنر صاحب نے سر سکندر سنگھ صاحب کو بھی بلایا ہے۔ وہ فلاں معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں گے اگر بات سلجھ گئی تو فبہا۔ میں فلاں صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع کر دوں گا۔ وہ تمہیں بتا دیں گے۔ اگر تصفیہ نہ ہوا تو تم اس تجویز کی (اور ایک پرچے پر اپنے دستخطی تحریر شدہ تجویز دی) دس نقلیں کروا کر اور پارٹی کے دس اراکین سے دستخط کروا کر مجلس کے دفتر میں بھجوا دینا۔ اس کے بعد دو ایک اور امور کی وضاحت فرمائی۔ دو ایک امور کے متعلق ہدایات فرمائیں اور مجھے رخصت کر دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ جو گذارش میں نے چوہدری صاحب کی خدمت میں کی تھی وہ میاں صاحب نے منظور فرمالی میری سیاسی تربیت کا دور ایک آزمودہ کار سیاستدان کی نگرانی میں شروع ہو گیا۔

مسٹر جسٹس بخشی ٹیک چند | ۱۹۲۶ء کے انتخاب میں بخشی ٹیک چند صاحب بھی پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ بخشی صاحب نہایت قابل قانون دان تھے اور اس وقت لاہور ہائی کورٹ بار میں چوٹی کے وکیل تھے عام سیاسی سرگرمیوں میں انہوں نے کبھی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ ان کی عدالتی مصروفیات کسی اور کام کے لئے انہیں فرصت بھی نہیں دیتی تھیں۔ ان کا کونسل میں آنا ایک معمہ تھا جس کا حل جلد ہی معلوم ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء

کے اوائل میں لاہور ہائی کورٹ میں عارضی جج کی ایک جگہ خالی ہونے والی تھی۔ سر شادی لال صاحب (چیف جسٹس) نے اس کے لئے بخشی ٹیک چند صاحب کا نام گورنر صاحب (سر میلکم ہیلی) کو بھیج دیا گورنر صاحب نے لکھا کہ ایک اسامی کے لئے صرف ایک نام بھیجنے سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ تقرر کا اختیار گورنر یا گورنر جنرل کو نہیں بلکہ چیف جسٹس کو ہے۔ مناسب ہوگا کہ کم سے کم ایک نام اور بھیجا جائے۔ چیف جسٹس صاحب نے دوسرا نام رائے بہادر جے لال صاحب کا بھیج دیا اور ان کا تقرر خالی اسامی پر ہو گیا۔ چیف جسٹس صاحب اور بخشی صاحب کو وقتی طور پر زک پہنچی۔ اسی سال انتخابات ہوئے اور بخشی صاحب کونسل کے رکن منتخب ہو گئے۔ وزراء کے تقرر میں گورنر صاحب کو مشکل کا سامنا ہوا۔ سر میلکم ہیلی کی طبیعت اقتدار پسند تھی وہ ایسے وزراء کے متلاشی تھے جو اپنی مرضی پر اصرار کرنے کی بجائے ان کے مشورے پر عمل کرنے والے ہوں۔ انہوں نے ایک ترکیب تو یہ سوچی کہ کونسل کی تین بڑی پارٹیوں میں سے ایک ایک وزیر چنا جائے اور اس طرح یونینسٹ پارٹی کو کمزور کیا جائے۔ اس ترکیب کے رستے میں یہ مشکل پیدا ہو گئی کہ بخشی صاحب کی موجودگی میں ہندوؤں میں سے کوئی اور رکن وزارت قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور اگر کوئی تیار ہو بھی جاتا تو باقی ہندو اراکین اس کے خلاف ہو جاتے اور یہ بات وزارت کے لئے کمزوری کا باعث ہوتی اگر بخشی صاحب کو وزیر مقرر کیا جاتا تو ان کی زبردست شخصیت گورنر صاحب کے ہر مشورے کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوتی۔ اس مشکل کا حل گورنر صاحب کو یہی نظر آیا کہ چاروناچار بخشی صاحب کو ہائی کورٹ کی ججی پیش کی جائے اتفاق سے ایک جج ریٹائر ہونے والے تھے۔ اور اس سلسلے میں ایک عارضی اسامی خالی ہونے والی تھی۔ چنانچہ آخر دسمبر میں بخشی صاحب کو یہ اسامی پیش کی گئی۔ بخشی صاحب ان دنوں کرسمس کی تعطیلات میں اپنے وطن نور پور ضلع کانگڑہ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں ان کے نام دستی پیغام بھیجا گیا اور فوری جواب کی خواہش ظاہر کی گئی۔ انہوں نے جواب بھیجا کہ ہم تعطیلات کے بعد لاہور آنے پر جواب دیں گے۔ تعطیلات کے بعد لاہور پہنچ کر انہوں نے چیف جسٹس صاحب سے مشورہ کیا اور گورنر صاحب کو جواب دیا کہ ہمیں ججی کی کوئی ایسی خواہش نہیں اور عارضی اسامی قبول کرنے کیلئے تو ہم کسی صورت تیار نہیں۔ اگر مستقل اسامی جو خالی ہونے والی ہے اس پر تقرر کی تجویز ہو تو ہم اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ مستقل اسامی پر بجائے سینئر عارضی جج کا تقرر ہونے کے بخشی صاحب کا تقرر ہوا اور بخشی صاحب پہلے دن سے ہائی کورٹ کے مستقل جج ہو گئے اور چار عارضی ججوں سے جن میں جے لال صاحب بھی شامل تھے سینئر ہو گئے۔ چیف جسٹس صاحب اور بخشی صاحب کی عارضی زک چند مہینوں کے اندر ہی فتح سے بدل گئی اور زک آخر کار گورنر صاحب ہی کو ہوئی۔ بخشی صاحب نے کونسل کے پہلے اجلاس میں صرف رکنیت کا حلف اٹھایا اور پھر چند دنوں کے اندر ہی ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی پر رونق افروز ہو گئے۔ قریب بیس سال اس کرسی پر متمکن رہے اور ان بیس سالوں کا ہر لحظہ ہندو افراد اور ہندو قوم کو تقویت دینے اور مسلمانوں کو

انتہائی حد تک کمزور کرنے میں صرف کیا۔ وہ نہایت قابل قانون دان تھے۔ کمزور دلیل کو مضبوط اور مضبوط دلیل کو کمزور کر دکھانا ان کا ذہنی مشغلہ تھا۔ انہوں نے جو طریق کار اپنے لئے تجویز کیا اس پر متواتر کاربند رہے۔ جب میاں سر فضل حسین صاحب نے سرکاری اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلمان طلباء کے لئے چالیس فیصدی نشستیں محفوظ کرائیں تو بخشی صاحب جو ان دنوں پریکٹس کرتے تھے کہا کرتے تھے فضل حسین چالیس فیصدی مقدمات بھی مسلمان وکلاء کو بھجوانے کا انتظام کرے! ججی کی کرسی پر بیٹھتے ہی آپ نے جیسے تہیہ کر لیا کہ ان کے اجلاس سے کوئی مسلمان فریق مقدمہ ہندو فریق کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے گا۔ نہ کوئی مسلمان وکیل کسی ہندو وکیل کے مقابلے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور آخر تک انہوں نے اس قاعدے سے کبھی انحراف نہ کیا۔ بخشی صاحب کا طریق کار یہیں تک محدود نہیں تھا۔ ان کا منصوبہ ایک مکمل منصوبہ تھا جس کے موٹے اصول یہ تھے۔ (۱) اگر فریق مقدمہ ایک جانب مسلمان اور دوسری جانب غیر مسلمان ہو تو فیصلہ غیر مسلمان کے حق میں ہوگا۔ (۲) اگر دونوں فریق مسلمان ہوں اور ایک فریق کی طرف سے ہندو وکیل ہو اور دوسرے کی طرف سے مسلمان تو فیصلہ ہندو وکیل کے حق میں ہوگا۔ (۳) اگر دونوں فریق مسلمان ہوں اور دونوں کے وکلاء مسلمان ہوں تو فیصلہ اس فریق کے حق میں ہوگا جس کے وکیل کو دوسرے فریق کے وکیل کے مقابلے میں بخشی صاحب کم قابلیت کا سمجھتے ہوں۔ سر شادی لال بھی عرصہ چیف جسٹس رہے مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں بہت نقصان پہنچا اور بہت ناانصافیاں ان کے ساتھ ہوئیں۔ لیکن مقدمات کے فیصلے میں وہ کھلے بندوں بخشی صاحب کی سی جرأت اور حوصلے کے ساتھ انصاف کے گلے پر چھری نہیں پھیرتے تھے۔ سر شادی لال کے فیصلوں میں ممکن ہے تلاش کرنے پر کچھ مثالیں بخشی صاحب کے وضع کردہ تین قوائد کے خلاف مل جائیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں سب سے بڑا ظلم جو مسلمانوں اور اصول انصاف کے ساتھ ہوا وہ بخشی صاحب کو کرسی عدالت پر بٹھانے میں مد ہونا تھا۔

بخشی صاحب کو جج مقرر ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ چودھری بشیر احمد صاحب نے جو اس وقت تک ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ ہو چکے تھے اور میرے ساتھ کام کرتے تھے کہنا شروع کیا کہ بخشی صاحب کبھی کوئی فیصلہ ہمارے حق میں نہیں کریں گے۔ میں انہیں ہر بار ان کے ایسا کہنے پر سمجھاتا کہ ایک جج کے متعلق ایسی رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ تعصب سے کام لیتے ہیں۔ بشیر احمد مسکرا کر کہہ دیتے اچھا دیکھ لینا۔ کچھ عرصہ بعد ایک دیوانی اول اپیل کی جس میں میں رسپانڈنٹ کی طرف سے وکیل تھا۔ بخشی صاحب اور مسٹر جسٹس جانسٹن کے اجلاس میں سماعت ہوئی اپیلانٹ کی طرف سے سر موتی ساگر وکیل تھے۔ اجلاس کو جاتے ہوئے چودھری بشیر احمد صاحب نے مجھ سے کہا تمہارا کیا اندازہ ہے اس کیس میں کیا ہوگا۔ میں نے کچھ دق ہو کر جواب دیا ہمارا کیس ایسا مضبوط ہے کہ کوئی عدالت یہ کیس ہمارے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتی۔ چودھری صاحب نے پھر مسکرا کہا اچھا

دیکھیں گے۔ عدالت ابتدائی میں اس کیس کا فیصلہ ایک ہندو جج نے کیا تھا۔ دونوں فریق مسلمان تھے۔ عدالتِ ابتدائی میں مدعیان کا (جواب اپیلانٹ تھے) وکیل ہندو تھا۔ بلکہ اسی نے مدعیان کو دعوی دائر کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ہائی کورٹ میں بھی ان کے وکیل ہندو تھے۔ سر موتی ساگر نے کوئی گھنٹہ بھر بحث کی ان کی بحث ختم ہونے پر مجھے اطمینان تھا کہ اس کیس میں بخشی صاحب کی باریک بین نگاہ بھی ہمارے خلاف کوئی بات تلاش نہ کر سکے گی۔ میں نے بحث شروع کی اور بخشی صاحب نے ہر قدم پر ہمارے کیس میں عیب اور سقم دیکھنے شروع کئے۔ میں ایک بات کا جواب دیتا۔ وہ میری دلیل کے تین جواب دیتے۔ بحث لمبی ہو گئی۔ اور جتنی لمبی ہوتی گئی بخشی صاحب کا عزم نمایاں ہوتا گیا بخشی صاحب کے قاعدہ نمبر ۲ کے ماتحت اپیل منظور ہو گئی۔ جائیداد متنازعہ کی مالیت اتنی تھی کہ ہم استحقاقاً پریوی کونسل میں اپیل کرنے کے مجاز تھے۔ پریوی کونسل کے جس اجلاس میں اپیل کی سماعت ہوئی اس کے صدر لارڈ اٹیکن تھے جو اپنے وقت کے قابل ترین ججوں میں شمار ہوتے تھے۔ لارڈ میکملن، لارڈ رائٹ اور سر لانسیلاٹ سانڈرسن بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ میں نے واقعات بیان کئے لارڈ اٹیکن نے کہا دونوں عدالتوں کے فیصلے پڑھ کر سناؤ۔ فیصلے پڑھ دینے کے بعد جب میں بحث شروع کرنے کو تھا۔ تو لارڈ اٹیکن نے کہا تمہاری بحث سننے کی ضرورت نہیں۔ وکیل مخالف سے کہا آپ بتائیں ہائی کورٹ کا فیصلہ کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ آدھ گھنٹے کے قریب وکیل صاحب اپنی طرف سے ہائی کورٹ کے فیصلے میں جان ڈالنے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ میرے جواب کی نوبت ہی نہ آئی۔ فیصلہ محفوظ ہوا۔ چند دن بعد اطلاع مل گئی کہ اپیل منظور ہو کر ہائی کورٹ کا فیصلہ منسوخ اور عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال ہوا۔ فیصلے کی اطلاع مل جانے کے بعد ایک تقریب میں لارڈ اٹیکن سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دریافت کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اس کیس میں پس پردہ کیا بات تھی جو ہائی کورٹ میں اس فیصلے کا باعث ہوئی۔ میں نے کہا مجھے معلوم تو ہے لیکن میں کہنا نہیں چاہتا۔ مسکرائے اور فرمایا ضرور کوئی لوکل تعصب ہو گا۔

سردار سر محمد نواز خاں صاحب کوٹ فتح خاں اسٹیٹ کے مالک اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے مزارعان اور دیگر مالکان سے بعض واجبات کی وصولی کا حق رکھتے ہیں۔ اسٹیٹ میں ایک ڈھیری (سکھ مذہبی ڈیرہ) ہے جس کے مہنت صاحب نے دورانِ بندوبست عذر کیا کہ سردار صاحب ڈھیری سے "حق بوھا" وصول کرنے کے حقدار نہیں۔ یہ عذر رد ہوا۔ مہنت صاحب نے عدالت مال میں چارہ جوئی کی لیکن فنانشل کمشنر کی عدالت تک فیصلہ ان کے خلاف رہا۔ پھر انہوں نے عدالت ہائے دیوانی کی طرف رجوع کیا کہ قرار دیا جائے کہ سردار صاحب ڈھیری سے حق بوھا وصول کرنے کے مجاز نہیں۔ سردار صاحب کی طرف سے عذر کیا گیا کہ ان واجبات کے متعلق فیصلے کا اختیار صرف عدالت ہائے مال کو ہے۔ دیوانی عدالت کو اختیار سماعت نہیں ڈھیری ہمیشہ سے یہ واجبات

ادا کرتی رہی ہے اور اب بھی ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عدالت ابتدائی نے قرار دیا کہ دیوانی عدالت کو اختیار سماعت نہیں۔ اور واقعات پر بھی مدعی متوجب ادائیگی ہے۔ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے اس فیصلے کے خلاف مہنت صاحب کی اپیل خارج ہوئی۔ ہائی کورٹ میں اپیل ثانی کی گئی وہ بھی خارج ہوئی۔ مہنت صاحب نے لیٹرز پیٹنٹ کے ماتحت اپیل کی۔ لیٹرز پیٹنٹ بنچ میں سینئر جج بخشی ٹیک چند صاحب تھے۔ اس ہفتے میں اس اپیل کی سماعت کی باری نہ آئی۔ لیٹرز پیٹنٹ بنچ جب پھر تشکیل ہوتا تو اس اپیل کی سماعت ہوتی۔ لیکن دوسرے ہفتے میں ان لیٹرز پیٹنٹ اپیلوں میں سے جن کی باری نہیں آئی تھی صرف ایک یہ اپیل خلاف دستور سابق اس نئے بنچ کے اجلاس میں رکھدی گئی جس کے سینئر جج بخشی ٹیک چند صاحب تھے۔ بخشی ٹیک چند صاحب کے قاعدہ نمبر ا کے ماتحت مال کی تین عدالتوں اور دیوانی کی تین عدالتوں کی تجویز کے خلاف اپیل منظور ہو کر قرار دیا گیا کہ عدالت ہائے دیوانی کو اختیار سماعت ہے اور ڈھیری "حق بوھا" کی ادائیگی کی متوجب نہیں۔ سردار صاحب کے مختار میرے پاس تشریف لائے کہ پریوی کونسل میں اپیل کی اجازت طلب کی جائے۔ ہم نے اجازت طلب کی لیکن ہماری درخواست اس بنا پر رد کر دی گئی کہ دو روپے سالانہ کا تنازعہ ہے اس لئے یہ تنازعہ پریوی کونسل میں لے جانے کے لائق نہیں۔ ہم نے پریوی کونسل میں درخواست بھجوائی کہ عدالت ہائے دیوانی کو اختیار سماعت ہی حاصل نہیں اور یہ اصولی سوال ہے اس لئے اپیل کی اجازت خاص دی جائے۔ پریوی کونسل نے اجازت خاص عطا کی۔ اپیل کی سماعت ہوئی۔ پریوی کونسل نے قرار دیا کہ پنجاب ریونیو ایکٹ کی واضح دفعہ کے ماتحت ان امور میں اختیار سماعت صرف عدالت ہائے مال کو ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کو اختیار سماعت نہیں۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ منسوخ ہو کر ڈھیری کا دعویٰ خارج ہوا۔

بخشی ٹیک چند صاحب کے ججی کے عہدے پر سرفراز ہونے کے بعد میں نے ۸½ سال ہائی کورٹ میں پریکٹس کی۔ محض اللہ کے فضل اور اس کی ذرہ نوازی سے مقدمات میں میری کامیابی کی شرح بہت بلند تھی۔ فالحمد للہ لیکن اس تمام عرصے میں بخشی صاحب کے اجلاس سے میرے حق میں صرف ایک فیصلہ ہوا۔ اس کیس میں دونوں فریق اور دونوں طرف کے وکلاء مسلمان تھے۔ میں ریسپانڈنٹ کی طرف سے وکیل تھا۔ اور امر زیر تنازعہ خالصۃً امر واقعہ تھا۔ جس میں عدالت ماتحت کے فیصلے میں اپیل ثانی میں دخل اندازی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کیس پر جناب بخشی صاحب کی رائے میں ان کا قاعدہ نمبر ۳ عاید ہوتا ہو۔ بخشی صاحب کا رویہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے اسقدر ظاہر اور باہر تھا کہ بعض ہندو وکلاء کیس کے فیصلے کے متعلق شرط باندھ کر بڑی بڑی فیس وصول کرتے تھے۔ چودھری محمد اسمٰعیل صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور ان کے برادران کی اپیل اول ایک رقبہ نہری اراضی کی خرید کے متعلق ہائی کورٹ میں دائر تھی جو بخشی صاحب کے اجلاس کی فہرست

میں آگئی ۔ چودھری صاحب ان ہندو وکلاء میں سے ایک کے پاس گئے کہ ہم آپ کو وکیل کرنا چاہتے ہیں۔ واقعات سنکر وکیل نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ خریدار اراضی پہ آپ کی ادا کردہ رقم واپس مل جائے تو میری فیس اسقدر ہوگی۔ اگر آپ مصر ہیں کہ رقبہ متنازعہ کی ڈگری آپ کے حق میں ہو جائے تو میری فیس دُگنی ہوگی۔ چودھری صاحب نے موخرالذکر رقم ادا کردی اور رقبہ متنازعہ کی ڈگری ان کے حق میں ہوگئی۔ لیکن "لیسوا سواءً" (سب ایک جیسے نہیں) والی کیفیت تھی سارے ہندو جج بخشی صاحب کے رنگ میں رنگین نہیں تھے۔

مسٹر جسٹس جے لال صاحب | مسٹر جسٹس جے لال مذہبی عقائد اور تمدن کے لحاظ سے کٹر ہندو تھے اور شکل و شباہت میں بھی بخشی صاحب سے بڑھ کر ہندو دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں حق و انصاف کے تقاضے سے سرمو ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ قانونی قابلیت میں وہ بخشی صاحب کے ہم پلہ نہیں تھے لیکن جہاں بخشی صاحب نے اپنی مسلمہ قابلیت کو مسلم آزاری کا آلہ بنا رکھا تھا۔ وہاں مسٹر جسٹس جے لال شرافت کے پتلے شریف نواز اور بے لاگ انصاف کرنے والے تھے۔

مسٹر جسٹس رنگی لال صاحب | دوسری مثال مسٹر جسٹس رنگی لال صاحب کی دیجا سکتی ہے وہ سب جج سے سیشن جج اور پھر ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ کہا جاتا تھا کہ سر شادی لال سے ان کی قرابت داری ہے۔ اگر تھی بھی تو ان کے اطوار سر شادی لال کے نہ تھے۔ بہت قابل اور بیدار مغز جج تھے۔ بہت جلد بات کی تہہ کو پہنچتے تھے۔ مقدمات کے فیصلوں میں کسی قسم کی طرفداری کے روادار نہیں تھے۔ جن خوبیوں کے خود حامل تھے جہاں انہیں پاتے تھے ان کی قدر کرتے تھے۔

جسٹس مہر چند مہاجن صاحب | میں نے مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن صاحب کی ججی کا زمانہ بہت کم دیکھا لیکن ان کی پریکٹس کے زمانے میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ ان کی قابلیت مسلمہ تھی لیکن بخشی صاحب کے چیلے اور ان کے نقش قدم پہ چلنے والے تھے۔

سر شادی لال صاحب چیف جسٹس | سر شادی لال کی پالیسی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ وہ ہائی کورٹ کی ججی پہ کسی قابل مسلمان کا تقرر گوارا نہیں کرتے تھے۔ مسٹر جسٹس شاہ دین تو ان سے سینئر تھے اور ایک درخشندہ گوہر تھے۔ افسوس کہ چیف کورٹ کے ہائی کورٹ ہونے سے پہلے ہی فوت ہوگئے۔ سر شادی لال کے چیف جسٹس ہو جانے کے بعد اگر ان کا بس چلتا تو کوئی مسلمان ہائی کورٹ کا جج ہونے نہ پاتا۔ لیکن یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک ایسے صوبے کی ہائی کورٹ میں جس کی آبادی میں کثرت مسلمانوں کی تھی مسلمان ججوں کا تقرر لازم تھا۔ شیخ عبدالقادر صاحب اپنی مرنجاں مرنج طبیعت اور شیریں گفتاری کی وجہ سے ہر طبقے میں ہر دلعزیز تھے ایک عارضی اسامی پہ ان کے تقرر پہ سر شادی لال رضامند ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد پھر دو سال کے لئے

ان کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد اگر عارضی تقرر جاری رہتا تو وہ جلد مستقل آسامی پہ فائز ہو جاتے لیکن سر شادی لال کو شبہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے جو کبھی ان کی شکایت میں آواز اٹھتی ہے۔ اس میں شیخ صاحب کا ضرور دخل ہے۔ لہذا جب پھر ان کے تقرر کا سوال اٹھا تو اس بہانے انکار کر دیا کہ ان کا کام تسلی بخش نہیں رہا۔ سید عبدالرؤف کا تقرر الٰہ آباد سے ہوا۔ مسٹر جسٹس عبدالرؤف نہایت شریف طبع پابند وضع خوش اخلاق بزرگ تھے۔ میرے ساتھ تو بہت شفقت سے پیش آتے رہے۔ ہر ایک ان کے حسن سلوک کا مداح تھا۔ لیکن انہیں ہر قدم نہایت احتیاط سے اٹھانا پڑتا تھا۔ سر شادی لال کی عینک کے شیشے تو بہت موٹے تھے لیکن نگہ بہت باریک اور دور بین تھی۔ سید صاحب اپنا وقت نیک نامی سے گذارتے رہے۔ ان کی میعاد ختم ہونے پر مسٹر جسٹس آغا حیدر کا تقرر سہارنپور سے ہوا وہ کچھ مہینوں کے لئے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں عارضی جج رہ چکے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ سر شادی لال کو کبھی آشفتگی کا موقع نہیں دیتے تھے۔ اس واحد مقصد میں اپنی میعاد کے آخر تک کامیاب رہے۔ ان کی جانشینی مرزا ظفر علی صاحب کو حاصل ہوئی۔ جو سب ججی اور سیشن ججی کے مراحل طے کرنے کے بعد ہائی کورٹ کی ججی پہ فائز ہوئے۔ بہت متدین عابد و زاہد نیک نام بزرگ تھے۔ سر شادی لال کے نام سے کانپتے تھے بنچ کے اجلاس میں سینئر جج کی رائے سے اختلاف کرنا الحاد کے مترادف شمار کرتے تھے۔ آخر میں پھر شیخ سر عبدالقادر کا تقرر ہوا۔ لیکن اب میعاد اتنی میسر نہ تھی کہ پنشن کے حقدار ہو سکتے۔ میاں عبدالرشید صاحب کے تقرر کے وقت سر شادی لال کا راج اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ شیخ دین محمد صاحب کا تقرر تو اس راج کے آخری دنوں میں ہوا۔ ۱۹۳۴ء کے ابتداء میں سر ہربرٹ ایمرسن پنجاب کے گورنر تھے وہ اپنے آپکو بہت ہوشیار تصور کرتے تھے۔ سر شادی لال کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ ہائی کورٹ کے سینئر یورپین ججوں سے بھی کچھ تفاصیل انہیں پہنچتی رہتی ہوں گی۔ مسٹر جسٹس براڈوے تو اس معاملے میں غیر جانبدار شمار نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ بیرسٹر تھے اور لاہور چیف کورٹ میں برسوں پریکٹس کرتے رہے تھے۔ جب ان کا تقرر ججی پہ ہو گیا تو انہوں نے سلامتی اور دانش اسی میں سمجھی کہ اگر سر شادی لال شیر بننا چاہتے تو وہ گیدڑ بننا منظور کر لیں۔ لیکن مسٹر جسٹس ہیریا اور مسٹر جسٹس ایڈیسن اس قماش کے نہیں تھے۔ وہ انڈین سول سروس کے سینئر افسر تھے۔ خودداری اور خود اعتمادی کے حامل تھے۔ سر شادی لال اور بخشی ٹیک چند کی چالاکیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور ان کے شاہد تھے۔ سر شادی لال مئی ۱۹۳۴ء میں ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے والے تھے۔ جب ان کا تقرر چیف کورٹ کی ججی پہ ہوا اس وقت اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے عرصہ ملازمت کی میعاد مقرر نہیں تھی۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے دو جج ستر سال سے زائد عمر تک ججی کی کرسی پہ متمکن رہے۔ سر پی سی بینرجی بہتر سال کے ہو گئے شنوائی میں فرق آ گیا لیکن پنشن پہ جانے کا ذکر سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آخر چیف جسٹس سر گریموڈ میرز نے اس طرح

انہیں رضامند کیا کہ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے کا تقرر بطور جج ہائی کورٹ ہو جائے۔ اسی طرح سر جان ناکس بھی ستر سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد پنشن لینے پر آمادہ کئے جا سکے۔ آئندہ کے لئے اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا کہ مستقل اسامی پر تقرر کے وقت جج صاحبان سے تحریری عہد لے لیا جاتا کہ وہ ساٹھ سال کی عمر ہونے پر پنشن لے لیں گے۔ سر شادی لال کے تقرر کے وقت کوئی ایسا اقرار نامہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ساٹھ سال کی عمر ہو جانے پر ملازمت چھوڑ دینے کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ سر ہربرٹ ایمرسن نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اپنے جانشین کے متعلق کوئی مشورہ پیش کرنا چاہیں تو فرما دیں۔ سر شادی لال نے کمال سادگی سے کہہ دیا کہ جب وقت قریب آئے گا میں اپنی رائے کا اظہار کر دوں گا۔ اس سے گورنر صاحب بھانپ گئے کہ شادی لال ساٹھ سال کی عمر ہونے پر پنشن پر نہیں جائیں گے۔ اتفاق سے پریوی کونسل میں ایک ہندوستانی جج کی جگہ خالی ہونے والی تھی۔ سر ہربرٹ نے گورنر جنرل کی وساطت سے وزیر ہند کو رضامند کیا کہ سر شادی لال کا تقرر پریوی کونسل میں ہو جائے اور سر شادی لال کو یہ پیشکش کی۔ سر شادی لال نے عذر کیا کہ ان کے لئے لندن کی رہائش تکلیف دہ ہوگی اور ان کی صحت بھی اجازت نہیں دیتی۔ گورنر صاحب نے کہا۔ بادشاہ سلامت کی پریوی کونسل کا رکن ہونا بڑا اعزاز ہے اور اس سے انکار مناسب نہیں۔ صحت کا عذر تو بہرصورت مشکل پیدا کرے گا اگر آپ نے یہ عذر پیش کیا تو آپ کو چیف جسٹس کا عہدہ بھی چھوڑنا ہوگا غرض سر شادی لال نے چار و ناچار پریوی کونسل میں جانا منظور کر لیا۔ آخری دن وکلا سے رخصت کی تقریب میں جو تقریر آپ نے کی اس میں حکومت پر بھی کڑی تنقید کی۔ آپ ٹائپ شدہ تقریر پڑھتے جاتے تھے اور بخشی ٹیک چند صاحب رومال سے اپنے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

جسٹس سر شادی لال سے سر جوگندر سنگھ کی ستم ظریفی

آخری ایام میں آپ نے مختلف گروہوں سے الوداعی ایڈریس لینا شروع کئے۔ ان دنوں بابو فضل الدین صاحب آپ کے ریڈر تھے۔ انہوں نے ایک دن مجھے ایک ایڈریس کی چھپی ہوئی کاپی دکھلائی جو سکھ وکلاء نے چیف جسٹس صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ ایڈریس انگریزی میں تھا جس میں چیف جسٹس صاحب کی خوب مدح سرائی کی گئی تھی۔ لکھا تھا کہ آپ نے ہمیشہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھا اور سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا، ہر ایک کو اس کا مناسب حق دلوایا۔ اور سب سے انصاف کیا۔ انگریزی میں اس مدح سرائی کے بعد خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر درج تھا ؎

عمرتان باد و مدام اے ساقیانِ بزمِ جم
گرچہ جامِ ما نشد پُرمے بدورانِ شما!

سرشادی لال فارسی جانتے تھے۔ ایڈریس پیش کرنے والوں کو یہ توقع تو نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اس ستم ظریفی کو سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے غالب قیاس یہی تھا کہ ایڈریس پیش کرنے والے خود کسی کی ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ نے اپنے مکان پر سرشادی لال کے اعزاز میں رخصتی ڈنر دیا جس میں میں بھی مدعو تھا۔ وزراء میں سے سر جگندر سنگھ مدعو تھے۔ وکلاء میں سے مسٹر بھگت رام پوری اور میں۔ باقی سب ہندوستانی جج صاحبان تھے۔ مختصر سی پارٹی تھی۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ دو تین کرسیوں کے پیچھے سفید رومال بندھے ہوئے ہیں۔ کسی نے میزبان سے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ملازموں کو واضح طور پر سمجھا تو دیا ہے کہ فلاں فلاں مہمان گوشت نہیں کھاتے لیکن پھر بھی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ اسلئے ایسے مہمانوں کی کرسیوں کے پیچھے نشان کے طور پر سفید رومال باندھ دیئے ہیں۔ اس پر سردار جوگندر سنگھ نے بے ساختہ فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔ ہمارے گورو جی نے فرمایا ہے بعض لوگ جانور کا گوشت تو نہیں کھاتے لیکن انہیں انسان کا خون پوسنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ ان کے یہ کہنے پر مجھے یاد آگیا کہ سر جوگندر سنگھ فارسی اچھی جانتے ہیں اور خواجہ حافظ کے کلام سے واقف ہیں۔ جب کھانا ختم ہوا تو مہمان باہر باغیچے میں نکل آئے۔ میں نے موقعہ پاکر علیحدگی میں سر جوگندر سنگھ سے کہا۔ خالصہ جی! سکھ وکلاء نے جو ایڈریس سرشادی لال کو پیش کیا ہے اس میں خواجہ حافظ کا شعر کیسے جڑ دیا گیا۔ وہ ہنسے اور فرمایا وہ لوگ میرے پاس آئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ ایڈریس میں شامل ہوں۔ میں نے کہا میرا تو کوئی تعلق نہیں اور میرا سرشادی لال نے کچھ سنوارا نہیں۔ تمہیں اگر ان کی خوشامد منظور ہے تو جاؤ اور ایڈریس پیش کرتے پھرو۔ انہوں نے جواب دیا ہماری تو کوئی ایسی نیت نہیں تھی۔ لیکن چیف جسٹس صاحب نے خود خواہش ظاہر کی ہے کہ انہیں ہماری طرف سے ایڈریس دیا جائے۔ آپ اگر شامل نہیں ہوتے تو ایڈریس تو لکھ دیں۔ میں نے ایڈریس لکھنے سے بھی انکار کیا۔ وہ لوگ چلے گئے اور پھر ایڈریس لکھ کر لے آئے اور کہا اسے دیکھ تو لیں اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہو اصلاح کر دیں۔ میں نے انگریزی عبارت کی مناسب اصلاح کر دی اور درمیان میں حافظ کا شعر بھی لکھ دیا!

مسٹر جسٹس ایڈیسن | مسٹر جسٹس ایڈیسن ہائی کورٹ کے جج مقرر ہونے سے عین پہلے ۱۹۲۴ء میں انتخابات کی ٹریبیونل کے پریذیڈنٹ مقرر ہوئے تھے۔ پیر اکبر علی صاحب وکیل فیروزپور کا کیس بھی ٹریبیونل کے سپرد تھا میں پیر صاحب کی طرف سے اس کیس میں وکیل تھا۔ فریق مخالف کی طرف سے میاں عبدالرشید صاحب وکیل تھے۔ پہلی پیشی کے دن پریذیڈنٹ صاحب نے فریقین کو ضابطے کے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ میں نے ایک امر کے متعلق وضاحت چاہی۔ اس کی تعبیر میرے خلاف کی۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔ پھر ویسے ہی کیا۔ میں نے تیسرا

سوال کیا۔ پھر وہی ہوا۔ اور ساتھ ہی پریذیڈنٹ صاحب نے کہا تمہارے بار بار سوالات کی وجہ سے یوں ہوا ہے۔ اور "بار بار کے سوالات" کے لئے ایک ایسا لفظ استعمال کیا جسے میں نے نامناسب اور نازیبا خیال کیا۔ میں نے انہیں ڈانٹا اور یاد دلایا کہ جج اور وکلاء ایک ہی نظام کی کڑیاں ہیں اور دونوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور اصرار کیا کہ وہ اپنا لفظ واپس لیں۔ انہوں نے وضاحت کی کہ ان کی نیت کسی قسم کی تحقیر کی نہیں تھی میں اس وقت جوش میں تھا میں نے کہا یہ لفظ یقیناً تحقیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر آپ کو یہ معلوم نہ تھا تو آپ کو اس لفظ کے استعمال سے پرہیز لازم تھا۔ انہوں نے ٹریبیونل کے دوسرے ارکان سے دریافت کیا کہ کیا میں نے نامناسب لفظ استعمال کیا ہے؟ دوسرے اراکین مسٹر مورٹن اور مسٹر رالی تھے۔ جو دونوں بیرسٹر تھے۔ دونوں نے کہا یہ لفظ نامناسب تھا۔ مسٹر مورٹن نے تو حیرت کے لہجے میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ تم نے یہ لفظ اس سے کہا؟ اس پر پریذیڈنٹ صاحب نے تاسف کا اظہار کیا اور کہا مجھے اس لفظ کے ایسے معنوں میں استعمال کئے جانے کا علم نہیں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میاں عبدالرشید صاحب کو توجہ دلائی کہ ایک امر پر ان کی طرف سے ضابطے کے مطابق عمل نہیں ہوا۔ اور ساتھ ہی مجھے کہا۔ تم نے صحیح طریق اختیار کیا ہے۔ میں نے کہا۔ پھر مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں۔ آخر میں میں نے ان کے ریڈر سے کوئی سوال کیا انہوں مسل ریڈر سے لیکر خود نہایت نرمی کے لہجہ میں مجھے جواب دیا۔ میں شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا۔ اس دن جب ٹریبیونل کا اجلاس برخواست ہوا تو مسٹر رالی بار روم میں آئے اور جو وکلاء موجود تھے ان سے کہا۔ بار میں سے جو بھی ٹریبیونل کے سامنے پیش ہوا ہے پریذیڈنٹ نے اس کے ساتھ درشت کلامی کی ہے اور وہ سب خاموشی سے برداشت کرتے رہے ہیں۔ آج اس نے ظفر اللہ سے ایک لفظ کہہ دیا جو اسے ناگوار ہوا اور اس نے اُسے فوراً ڈانٹ دیا اور آخر اسے اظہار تاسف کرتے ہی بنی۔ اس نے آج تم سب کی لاج رکھ لی۔ ٹریبیونل کا کام ختم ہوا تو مسٹر ایڈیسن نے ہائی کورٹ میں بطور جج کام شروع کر دیا۔ مجھے انتظار تھا کہ دیکھیں یہاں ان کا رویہ کیا رہتا ہے۔ لیکن یہاں انہوں نے پہلے دن سے ہی میرے ساتھ پوری شرافت کا برتاؤ روا رکھا اور ہمیشہ خوش خلقی سے پیش آتے رہے۔ میں نے بھی ٹریبیونل والے واقعہ کو دل سے نکال دیا۔ وہ بڑے قابل تھے اور کام تیزی سے کرتے تھے۔ آہستہ چلنے والے وکیلوں کو بعض دفعہ دقت کا سامنا ہوتا تھا۔ لندن میں ایک بار ہم کھانے پر اکٹھے تھے مجھ سے دریافت کیا تم شراب کبھی نہیں پیتے؟ میں نے کہا کبھی نہیں۔ کہنے لگے لیکن قرآن نے شراب قطعاً حرام تو نہیں کی۔ میں نے کہا آپ بطور جج قانونی معاملات میں کوئی فیصلہ صادر کریں تو اس کی پابندی قانون لازم قرار دیتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی تفسیر کرنے بیٹھ جائیں تو وہ قابل قبول نہیں۔ میں عالم نہیں ہوں لیکن قرآن کریم کو آپ کی نسبت بہتر سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم نے شراب کے استعمال کی قطعاً ممانعت کی ہے اور بڑے سخت الفاظ میں کی ہے!

مسٹر جسٹس ہیریسن | مسٹر جسٹس ہیریسن ایک قابل اور نقطہ رس جج تھے۔ لیکن مزاج نازک تھا اور اس پر طرہ یہ کہ شراب کے استعمال میں حد اعتدال کو قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ جب مزاج برہم ہوتا تو قابو میں نہ رہتا۔ چھوٹے سے چھوٹے وکیل سے لیکر سنیئر وکلاء تک بشمول بخشی ٹیک چند صاحب ان کی برہم مزاجی کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکے۔ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں شروع سے آخر تک مستثنیٰ رہا۔ اس کی ظاہری وجہ تو یہ تھی کہ وہ وکلاء بھی جنہیں اپنے کیس کے مطالعہ اور تیاری کا شوق ہوتا ہے جج کی طبیعت کے مطالعہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مسٹر جسٹس ہیریسن بعض باتوں سے بہت چڑتے تھے۔ مثلاً اگر کوئی وکیل واقعات کے بیان کرنے میں غلطی کرے تو بہت برہم ہوتے تھے۔ اگر کوئی بہت بڑھا کر بات کرے تو انہیں ناگوار ہوتا تھا۔ اگر وہ کوئی سوال کریں تو ضروری تھا کہ مختصر سے مختصر الفاظ میں ان کے سوال کا جواب فوراً دیا جائے۔ اور اگر کسی وضاحت کی ضرورت ہو تو وہ بعد میں الگ کی جائے۔ لمبی تقریر سے آشفتہ ہوتے تھے۔ بات کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے اسلئے لمبی تقریر کی ضرورت نہ ہوتی تھی تکرار پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار صفائی سے بات کہہ دینا کافی ہوتا تھا۔ مجھے ان کی ذہانت اور انکی طبیعت کا اندازہ شروع شروع میں ہی ہو گیا تھا۔ جسٹس ہیریسن فوجداری اپیل یا نگرانی میں ناجائز کشید شراب کے معاملہ میں بہت نرمی کرتے تھے کہا کرتے تھے اس معاملہ میں قانون ناواجب طور پر سخت ہے۔ جس شخص کے پاس روپیہ ہو اور غیر ملکی شراب کا شوق رکھتا ہو وہ اپنا تہہ خانہ فرش سے چھت تک غیر ملکی شراب کے مٹکوں اور بوتلوں سے بھرے تو اس کے ساتھ قانون کوئی تعرض نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی دیہاتی اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایک مٹکا سستی دیسی شراب کا کشید کرلے تو اسے جیل خانے جانا پڑتا ہے۔ میں قانون کو بدلنے کا اختیار تو نہیں رکھتا لیکن سزا میں تخفیف کرنے کا مجھے اختیار ہے۔ ایسے مقدمات میں اکثر خلیفہ حکومت رائے صاحب سائل کی طرف سے وکیل ہوتے اور مقدمہ یوں طے ہوتا:۔

مسٹر جسٹس ہیریسن۔ مسٹر حکومت رائے یہ کیس تو بالکل صاف ہے۔ ملزم کے جرم میں شک کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

خلیفہ حکومت رائے۔ بجا ہے جناب عالی لیکن سزا بہت سخت ہے۔

مسٹر جسٹس ہیریسن۔ بیشک سزا میں سختی کی گئی ہے۔ تین مہینے کی قید انصاف کے تقاضے کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے۔ میں یہی سزا تجویز کرتا ہوں۔

خلیفہ حکومت رائے وکیل | خلیفہ حکومت رائے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ طبیعت رنگیلی تھی ماجھے کے علاقے کے جرائم پیشہ سب ان کے مرید تھے۔ جرم کرتے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور سب کیفیت بیان کرکے استمداد کرتے وہ اپنی عقل دوڑاتے اور کوئی نہ کوئی رستہ مخلصی یا تخفیف تعزیر کا ڈھونڈ نکالتے۔ ایک واقعہ خود مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا انسانی تعزیر سے بچانے کی سعی تو ہم کر لیتے ہیں اور کئی دفعہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن خدا کی تعزیر سے

بچنے کیلئے کوئی تدبیر کام نہیں آتی۔ واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا ایک دفعہ کاہنہ کاچھے کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا میرا ایک موکل سردیوں کے موسم میں رات دس گیارہ بجے کے درمیان میرے پاس لاہور آیا اور کہا میں نے اپنے گاؤں سے باہر اپنے ایک حریف کو قتل کر دیا ہے۔ اور سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں اب تم کوئی تدبیر کرو۔ میں نے کہا دلی دروازے جا کر ایک بوتل دیسی شراب کی خریدو اور پیتے ہی کوتوالی کے سامنے کسی راہگیر سے تکرار اور گالی گلوچ کرو کوتوالی والے تمہیں رات بھر کے لئے حوالات میں دیدیں گے۔ ان کے دریافت کرنے پر اپنا نام پتہ صحیح لکھوا دینا۔ صبح ہونے پر تمہیں چھوڑ دیں گے تم سیدھے اپنے گاؤں چلے جانا۔ اگر تم پر قتل کا شک کیا گیا اور تمہیں گرفتار کیا گیا تو اپنے وارثوں سے کہنا میرے پاس آجائیں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اپنے گاؤں واپس پہنچا تو پولیس موجود تھی اور اس کی تلاش ہو رہی تھی اسے گرفتار کیا گیا۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں اس نے بیان دیا میں بیگناہ ہوں میں تو اس رات گاؤں میں ہی نہیں تھا۔ مقتول کی نعش روشنی ہونے پر کھیت میں پائی گئی تھی۔ رپورٹ میں درج تھا کہ صبح فجر سے قبل ابھی اندھیرا تھا کہ رپورٹ کنندہ کا گذر کھیت کے قریب سے ہوا اس نے مقتول اور ملزم کی آواز سنی کہ آپس میں گالی گلوچ ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہیں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اتنے میں مقتول زمین پر گر گیا تھا اور دوسرا شخص بھاگ گیا۔ اس نے نیم اندھیرے میں مقتول کے جسم کو ٹٹولا اور محسوس کیا کہ اسے سانس نہیں آتا۔ روشنی ہونے پر معلوم ہوا مر چکا ہے۔ وہ گاؤں گیا اور نمبردار کو اطلاع دی۔ نمبردار نے کہا تھانے جا کر رپٹ درج کراؤ۔ مجسٹریٹ نے مقدمہ سیشن کی عدالت میں بھیج دیا۔ سیشن میں ملزم نے بیان دیا میں اس رات گاؤں میں نہیں تھا۔ اس شام مجھے لاہور میں فلاں کام تھا اس کی خاطر میں لاہور گیا کام ختم کرنے کے بعد میری ایک راہگیر سے تکرار ہو گئی۔ کوتوالی قریب تھی کوتوالی والوں نے مجھے حوالات میں دیدیا۔ رات بھر حوالات میں رکھا صبح رہا کر دیا میں سیدھا گاؤں آ گیا۔ وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ مجھے قتل کے واقعہ کا کوئی علم نہیں۔ صفائی میں کوتوالی کا رجسٹر اور محرر طلب کئے گئے ان کی شہادت سے ملزم کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ ملزم بری ہو کر رہا ہوا۔ رہائی ہونے پر گاؤں واپس گیا ایک ہفتے کے اندر پلیگ کا حملہ ہوا۔ چار دن بعد مر گیا۔ خلیفہ حکومت رائے صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ تین بھائی ہیں ان کے والد صاحب علم دوست تھے اور قرآن کریم کا بہت احترام کرتے تھے۔ تینوں بیٹوں کو انہوں نے قرآن کریم سبقاً پڑھایا تھا۔ خلیفہ صاحب نے مجھے کہا میں تمہارا احترام اس لئے کرتا ہوں کہ تم علم دوست ہو اور قرآن کریم جانتے ہو۔ ایک دن میں اور خلیفہ صاحب ایک قتل کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں لاہور سے فاضلکا جا رہے تھے۔ ماچھے کا علاقہ تھا جس سٹیشن پر گاڑی ٹھہرتی خلیفہ صاحب دروازے میں کھڑے ہو جاتے ہر اسٹیشن پر اپنے تین چار موکلوں کے ساتھ ان کی صاحب سلامت ہوتی فیروزپور پہنچتے تک شام ہو گئی ہم نے گاڑی بدلی اس وقفے میں خلیفہ صاحب ریفریشمنٹ روم میں جا کر اپنی تفریح کا سامان کر آئے۔ جب فیروزپور

سے گاڑی روانہ ہوئی اور اندھیرا ہونا شروع ہوا تو خلیفہ صاحب کی طبیعت پر رقت غالب آنے لگی انہیں توبہ استغفار کی طرف توجہ ہوئی پہلے آہستہ اور پھر بلند آواز سے اور جوش سے کہنا شروع کیا یا اللہ! میں بہت عاجز انسان ہوں۔ مجھ سے بہت گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ میں بہت کمزور ہوں۔ اور پھر یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ میں کیا کروں۔ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین یہ آیت پڑھتے اور زور سے دو ہتڑ اپنے سر پر مارتے اور پھر آہ وزاری اور استغفار میں لگ جاتے۔ اسی کیفیت میں ہم فاضلکا پہنچے۔ ان کے موکل پیشوائی کو آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں اسٹیشن سے اپنے ساتھ لے گئے۔

جسٹس ہیریسن مختصر بحث پسند کرتے تھے۔ میری ایک اپیل ان کے اجلاس میں تھی جس میں تین ملزمان میں سے ایک کو سات اور دو کو پانچ پانچ سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ امر واقعہ کے اٹھارہ چشم دید گواہ استغاثہ کی طرف سے پیش ہوئے تھے ان کے بیانات میں کوئی تفاوت یا تضاد نہیں تھا۔ اگر میں مروجہ طریقے کے مطابق ساری شہادت پڑھ کر سناتا تو ڈیڑھ دو گھنٹے اسی میں صرف ہوتے اور مسٹر جسٹس ہیریسن جیسے نازک مزاج جج کی طبیعت پر بہت بوجھ ہوتا استغاثے کی کہانی کی تائید اٹھارہ بار سنکر ان کے دماغ میں یہ بات محکم ہو جاتی کہ تینوں ملزمان کا جرم ثابت ہے اور ان کی طرف سے کسی بحث پر غور کرنا بے کار ہے۔ میں نے مختصراً واقعات بیان کئے اور کہا کہ اٹھارہ گواہ استغاثے کی کہانی کی تائید کرتے ہیں جن کے بیانات میں کوئی ایسا اختلاف نہیں جو آپ کی توجہ کے لائق ہو۔ میری معروضات یہ ہیں۔ ملزم نمبر ۱ کو دوسرے ملزمان سے زیادہ سخت سزا اس بناء پر دی گئی ہے کہ لڑائی کے دوران میں وہ بھاگ کر گاؤں گیا اور کچھ اور لوگوں کو لڑائی میں شامل ہونے پر آمادہ کر کے لے آیا۔ بیشک ایک گواہ نے ایسا کہا ہے لیکن ایک دوسرے گواہ نے جرح میں تسلیم کیا ہے کہ یہ ملزم لڑائی کے دوران میں سارا وقت جائے وقوعہ پر موجود رہا۔ ملاحظہ ہو ریکارڈ کا صفحہ فلاں سطر فلاں میری گذارش ہے کہ اس کی سزا میں تخفیف ہونی چاہیئے۔ ملزم نمبر ۲ کے متعلق میری گذارش ہے کہ اس کا چچا ملزمان کے جتھے کا سردار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن چچا بھتیجے دونوں کا اس معاملے کے ساتھ کوئی تعلق بیان نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے یہ لڑائی ہوئی۔ باوجود اس کے نہ صرف بھتیجے کو زمرۂ ملزمان میں شامل کر لیا گیا ہے بلکہ چچا کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی گئی چچا کا نام رپورٹ ابتدائی میں زمرۂ ملزمان میں شامل ہے لیکن جب بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو اس دن ۲۰ - ۲۲ میل کے فاصلے پر سیشن جج کی عدالت میں شہادت دینے کے لئے گیا ہوا تھا تو گواہان نے عدالت میں اس کا نام نہیں لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چچا کو ناحق شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے بھتیجے کو بھی اسی طرح شامل کیا گیا ہو۔ اسلئے لازم ہے کہ شہادت استغاثہ کو نہایت

احتیاط سے جانچا جائے آپ کا یقیناً یہ تجربہ ہے کہ ایسے مقدمات میں جب کسی شخص کو ناحق مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے تو شہادت میں دیگر ملزمان کی نسبت اس پر زیادہ بوجھ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس ملزم کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا۔ لیکن ڈاکٹری شہادت میں مقتول پر کسی تیز دھار آلے کا نشان نہیں اس اعتراض کا ردیہ بنایا گیا کہ ملزم کلہاڑے کو الٹا چلاتا رہا۔

مسٹر جسٹس ہیرسن ۔ تم نے کبھی کلہاڑا الٹا چلانے کی کوشش کی ہے ؟

ظفر اللہ خاں ۔ نہیں جناب !

مسٹر جسٹس ہیرسن ۔ کبھی کوشش کر کے دیکھنا بھاری کلہاڑے کو الٹا چلانا سیدھا چلانے کی نسبت مشکل ہے۔ کلہاڑے کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تیز دھار والی طرف پتلی اور ہلکی ہو اور پھل کی طرف موٹی اور بھاری ہو۔ تاکہ جب زور سے وار کیا جائے۔ تو تیز دھار دور تک لکڑی کے اندر گھس جائے اور اسے توڑ دے اور اس میں چوڑا شگاف کر دے۔ اس وجہ سے کلہاڑے کا الٹی طرف سے چلانا مشکل ہوتا ہے۔

بحث ختم کرتے ہوئے میں نے گذارش کی کہ ملزم نمبر ۲ کی نسبت شک کی گنجائش ہے کہ اسے ناحق ملزمان میں شامل کیا گیا ہے۔ اسے شک کا فائدہ ملنا چاہیئے۔ تیسرے ملزم کی نسبت میری کوئی گذارش نہیں۔

استغاثہ کی طرف سے میاں محمد رفیع صاحب وکیل تھے۔ انہوں نے میری بحث کے جواب میں کہا کہ ایک شخص مارا گیا ہے۔ اٹھارہ گواہ چشم دید شہادت دیتے ہیں۔ ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں عدالت ماتحت کے فیصلے میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

مسٹر جسٹس ہیرسن ۔ ملزمان کے وکیل نے یہ سب باتیں خود ہی تسلیم کر لی ہیں جو وجوہ اس نے بیان کی ہیں ان کا اگر کوئی جواب آپ دینا چاہتے ہیں تو کہیئے ؟

میاں محمد رفیع ۔ جناب عالی وہ وجوہ نہایت کمزور ہیں اور شہادت استغاثہ اسقدر قوی ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں وہ وجوہ قابلِ پذیرائی نہیں۔

جج صاحب نے اسی وقت فیصلہ لکھوا دیا۔ میری بیان کردہ وجوہ کا خلاصہ دیکر کہا مجھے ان سے اتفاق ہے۔ میں ملزم نمبر ۲ کو شک کا فائدہ دیکر بری کرتا ہوں۔ ملزم نمبر ۱ کی سزا سات سال سے تخفیف کر کے پانچ سال کرتا ہوں۔ ملزم نمبر ۳ کا اپیل خارج کرتا ہوں۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر نکلے تو چوہدری بشیر احمد صاحب نے جو ان دنوں بطور جونیئر کے میرے شریک کار تھے کہا یہ کس قسم کی وکالت ہے کہ تم نے ایک ملزم کی طرف سے

کچھ کہا ہی نہیں۔ ایک کے لئے صرف سزا میں تخفیف کی استدعا کی اور ایک کی بریت چاہی۔ تمہیں تو تینوں کی طرف سے وکیل کیا گیا تھا۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ تینوں کی رہائی کی کوشش کرتے۔ میں نے کہا مجھے تینوں کی رہائی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اگر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ تینوں بے گناہ ہیں۔ بالفاظ دیگر استغاثے کا بیان کردہ وقوعہ ہوا ہی نہیں۔ یا اگر ہوا ہے تو فرشتوں کے ہاتھوں ہوا ہے انسانوں کے ہاتھوں نہیں ہوا۔ یا اگر انسانوں کے ہاتھوں ہوا ہے تو ان میں ان تین ملزمان میں سے کوئی بھی شامل نہیں تھا تو یہ ایسی غیر معقول بات ہوتی کہ اپیل کلیۃً خارج ہوتی۔ اور تینوں ملزمان کی سزا بحال رہتی۔ بیشک مجھے تینوں کی طرف سے وکیل کیا گیا تھا اور میرا فرض تھا کہ میں ملزمان کے زیادہ سے زیادہ فائدے کی کوشش کرتا۔ مسل کے مطالعہ کے بعد اور پورے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہی طریق سب سے زیادہ فائدے کا ہے۔ اور فیصلے نے ثابت کر دیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔

مسٹر جسٹس ہیرلیس اغوا اور ہیچ قسم کے الزامات کے متعلق بہت احتیاط برتتے تھے۔ ایک مقدمے میں ایک زمیندارہ خاندان کے دو نوجوانوں پر زنا بالجبر کا الزام تھا۔ دونوں کو پانچ پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ مجھے ان کی طرف سے اپیل میں وکیل کیا گیا۔ سماعت کی تاریخ پر جن صاحب نے مجھے وکیل کیا تھا تشریف لائے۔ میں نے ان کی خدمت میں گذارش کی کہ مسل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ملزمان کی طرف سے یہ کہا جاتا کہ ہماری اس عورت کے ساتھ آشنائی تھی اور اس تعلق کی بنا پر ہم اس کے ہاں گئے تھے تو عین ممکن ہے کہ مجسٹریٹ صاحب اس بات کو تسلیم کر لیتے اور اگر وہ نہ کرتے تو اپیل میں یہ بات تسلیم کر لی جاتی۔ ان صاحب نے کہا وکیل صاحب تو یہی کہنا چاہتے تھے لیکن میرا بیٹا اور بھتیجہ نیک کردار نوجوان ہیں وہ کیسے ایسا گندہ الزام خود اپنے ذمے عائد کرتے۔ یہ تمام قضیہ تو عداوت کی بنا پر کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ صاحب خود نیک سیرت معلوم ہوتے تھے۔ مجھے ان کی یہ بات پسند آئی اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اگر ملزم بیگناہ ہیں تو ضرور بفضل اللہ بری ہوں گے میں نے ان سے کہا آپ جا کر دعا میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ سے رحم کے خواستگار ہوں اور دعا میں لگے رہیں جب تک چودھری ظفر اللہ صاحب آ کر آپ کو فیصلہ کے متعلق اطلاع دیں۔ اپیل کی سماعت مسٹر جسٹس ہیرلیس کے اجلاس میں تھی۔ استغاثے کی کہانی مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد میں نے کہا میں صرف تین امور کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اوّل عورت کا بیان ہے کہ اس نے دونوں ملزمان کو شناخت کر لیا تھا کیونکہ اس کی چارپائی کے پاس لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ یہ نہایت غیر اغلب بات ہے۔ اگر لالٹین ہوتی بھی تو ملزمان پہلی بات یہ کرتے کہ لالٹین کو وہاں سے ہٹا دیتے یا اسے گل کر دیتے۔ دوئم عورت کے خاوند کا بیان ہے کہ وہ اس رات ٹھیکری پہرے پر تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی چیخ پکار سنی اور فوراً بھاگ کر گھر آیا۔ رستے میں

ملزمان بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گذرے ان میں سے ایک نے اپنا نیلے رنگ کا تہہ بند کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ اس نے انہیں شناخت کر لیا۔ آپ پولیس کے تیار کردہ نقشۂ موقعہ پر نظر ڈالیں۔ اس میں اس مقام پر نشان ہے جہاں گواہ نے اپنی بیوی کی چیخ پکار سنی اور اس مقام پر بھی نشان ہے جہاں گواہ کہتا ہے کہ ملزمان بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گذرے۔ لیکن نقشے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گواہ پہلے مقام سے جلد تر گھر پہنچنا چاہتا اور نزدیک ترین رستے سے گھر آتا تو دوسرے مقام سے اس کا گذر ممکن نہیں تھا۔ وہاں سے گذرنے کے لئے اسے چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا تیسرے رات اندھیری تھی بھاگتے ہوئے شخص کی شناخت ہو سکتی تھی نہ رنگدار کپڑے کا رنگ شناخت ہو سکتا تھا۔ گواہ کا کہنا کہ فلاں ملزم نے اپنا نیلے رنگ کا تہ بند کندھے پر ڈالا ہوا تھا ثابت کرتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔

مسٹر جسٹس ہیریس۔ اس ملک میں یہ رواج ہے کہ گواہ ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ خصوصاً جرح کے دوران میں اگر گواہ نے تہ بند کا رنگ جرح میں بتایا ہے تو یہ امر قابلِ التفات نہیں اگر اپنے پہلے بیان میں بتایا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

ظفر اللہ خاں ۔ تہ بند کے رنگ والی بات اس نے پہلے بیان میں کہی ہے اور بیان کے اوّل حصہ میں کہی ہے

مسٹر جسٹس ہیریس ۔ تو پھر گواہ دروغ گو ہے۔

وکیل استغاثہ کو سننے کے بعد جج صاحب نے اپنا فیصلہ لکھوایا اور میری تین معروضات کی بنا پر انہیں بری قرار دیا۔ عدالت سے باہر نکلنے پر چوہدری فضل داد صاحب موکل کی تلاش میں گئے دیکھا کہ عدالت کے کمرے سے کچھ فاصلے پر گھاس کے فرش پر وہ نیک بزرگ دنیا و مافیہا سے بے خبر سجدے میں پڑے ہوئے احکم الحاکمین کی درگاہ میں رحم کی التجا میں مصروف ہیں۔ چوہدری صاحب نے ان کے شانے کو ہلا کر کہا اٹھیئے! انہوں نے اپنا سر زمین سے اٹھایا اور دریافت کیا کیا ہوا؟ منشی فضلداد صاحب نے کہا اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہے لڑکے بری ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا الحمد للہ۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر | مسٹر جسٹس آغا حیدر کا وطیرہ اس قسم کے مقدمات میں اس کے برعکس ہوتا تھا۔ اغوا وغیرہ کے الزامات کو وہ عورت کے بیان کی بنا پر ہی ثابت شدہ قرار دیتے تھے۔ اور کسی تائیدی شہادت کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے جرائم کی سزا میں بھی سختی روا رکھتے تھے۔ عموماً انتہائی سزا کا نوٹس جاری کر کے سزا بڑھا بھی دیتے تھے اور ساتھ کوڑوں کی سزا بھی شامل کر دیتے تھے۔ البتہ جہاں عورت کی بدچلنی کا سوال ہوتا تو سزا دینے میں بہت نرمی کرتے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ضلع کے ایک گاؤں کے باہر ایک کاشتکار کی رہائش آبپاشی کے کنوئیں پر تھی ایک رات اس کی نیند کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اپنی چارپائی پر نہیں۔ تلاش کرنے پر اسے اپنے آشنا

کے ساتھ مویشیوں کے جھونپڑے میں پایا۔ قریب ہی لکڑی کا ایک بھاری ٹکڑا پڑا تھا وہ اٹھا کر ان دونوں کو ہلاک کر دیا جھونپڑے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا صبح ہونے پر جو پہلا شخص کنوئیں پہ آیا اسے آواز دی اور کہا میں نے کُتے اور کُتی کو مار دیا ہے۔ جاکر پولیس کو بلا لاؤ۔ پولیس کے سامنے واقعہ بیان کیا۔ مجسٹریٹ اور سیشن کی عدالتوں میں اپنے بیان پہ قائم رہا۔ سیشن جج نے ہر ایک قتل کی سزا ۵ سال قید با مشقت تجویز کی۔ اپیل میں مجھے وکیل مقرر کیا گیا۔ وجہ اپیل ایک ہی تھی کہ سزا نا واجب طور پہ سخت ہے۔ اپیل کی سماعت مسٹر جسٹس آغا حیدر کے اجلاس میں ہوئی سرکاری وکیل مسٹر دیس راج ساہنی تھے۔ میں نے واقعات بیان کئے۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ مجھے یہ بتائیے کہ کیا ملزم نے عورت اور اس کے آشنا دونوں کو وہیں مار ڈالا؟

ظفر اللہ خاں ۔ جی ہاں دونوں کو مار ڈالا ۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ تو پھر آپ کو کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں سزا کا معاملہ مجھ پہ رہنے دیں مسٹر ساہنی آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

مسٹر ساہنی ۔ جناب عالی۔ ملزم نے دو اشخاص کو کمال بے رحمی سے قتل کیا۔ دس سال قید کی مجموعی سزا کو سخت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ لیکن آپ نے واقعات پر بھی غور کیا؟ ان حالات میں میں تو ملزم کے فعل کو جرم بھی قرار نہیں دیتا۔ لیکن قانون کہتا ہے یہ جرم ہے۔ اس لئے میں مجبور ہوں کہ کچھ سزا تجویز کر دوں۔ اس سے بڑھ کر اشتعال کیا ہو سکتا ہے ؟

مسٹر ساہنی ۔ جناب عالی اس طبقے کے لوگوں کو ایسی باتوں پہ اتنا اشتعال نہیں ہوتا ۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ کتنا اشتعال نہیں ہوتا ؟ اشتعال کے درجے کا اندازہ تو ملزم نے اپنے فعل سے بتا دیا ۔

مسٹر ساہنی ۔ لیکن جناب عالی ۔ ملزم نے یہ ساری کاروائی نہایت ٹھنڈے دل سے اور پورے عزم کے ساتھ کی اشتعال کا اس میں کوئی دخل نہ تھا ۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ (کچھ برہم ہو کر) مسٹر ساہنی بتائیے اگر آپ ملزم کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے ؟ (مسٹر ساہنی کو خاموش پا کر) اچھا ۔ تو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر آپ وہی کچھ نہ کرتے جو کچھ ملزم نے کیا تو آپ شرافت کے دعویدار نہ ہو سکتے !

جج صاحب نے ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا تجویز کی ۔ مسٹر ساہنی بہت بڑبڑاتے رہے۔ میری رائے میں اتنی سزا بھی حالات کے لحاظ سے سخت تھی ۔

اس اپیل کے فوراً بعد میری ایک اور اپیل کی سماعت شروع ہوئی۔ کیمبل پور کے ضلع کے ایک گاؤں کا ایک شخص راولپنڈی میں پولیس کنسٹیبل تھا۔ اس نے سپرنڈنٹ پولیس کی خدمت میں درخواست دی کہ میرے گھر میں فلاں شخص نے بہت فساد برپا کر رکھا ہے۔ مجھے دس دن کی رخصت عطاء کی جائے میں گھر جا کر اس کا تدارک کروں رخصت ملنے پر وہ اپنے گاؤں گیا۔ رات کے وقت پہنچا۔ اپنے گھر جانے کی بجائے اپنے چچازاد بھائی کے گھر گیا۔ وہاں اپنے چند اور رشتہ داروں کو جمع کیا۔ اور سب لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر کنسٹیبل کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے پر اندر گئے اور دیکھا کہ علاوہ کنسٹیبل کی بیوی کے وہ شخص بھی موجود ہے جس کا نام اس نے رخصت کی درخواست میں درج کیا تھا۔ سب نے مل کر دونوں پر حملہ کر دیا اور دونوں کو شدید ضربات پہنچائیں جن کے نتیجے میں وہ غیر شخص تو وہیں مرگیا لیکن عورت کی جان بچ گئی۔ سیشن جج نے سب ملزمان کو زیر دفعات ۱۴۹، ۳۲۶، ۳۲۵ مجرم قرار دیکر جو سزائیں دیں ان کا مجموعی عرصہ چودہ سال قید بامشقت بنتا تھا۔ میں نے واقعات بیان کئے۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر۔ مسٹر ظفر اللہ خان میری رائے میں تو جرم دفعہ ۳۰۴ الف کی زد میں آتا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟

ظفر اللہ خان ۔ جناب عالی مجھے آپ کے ساتھ اتفاق ہے۔ لیکن پھر بھی سزا کا سوال ہے۔ واقعات کے مدنظر سزا بہت سخت ہے۔

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ بے شک بے شک سزا کی تجویز مجھ پر رہنے دیں ۔ مسٹر ساہنی سزا کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔

مسٹر ساہنی ۔ جناب عالی ۔ اس کیس میں تو کسی اشتعال کا بھی سوال نہیں۔ ملزمان کے سرغنے نے اپنی رخصت کی درخواست میں لکھا کہ وہ مقتول کی بیخ کنی کے لئے گھر جانا چاہتا ہے ۔ راولپنڈی سے وہ یہ عزم کر کے چلا۔ گاؤں میں پہنچ کر اس نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا اور وہ قتل کا منصوبہ بنا کر حملہ آور ہوئے۔ یہ جرم تو واضح طور پر قتل عمد ہے۔ سیشن جج کو چاہیئے تھا وہ جملہ ملزمان کو دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کے ماتحت مجرم قرار دیکر سب کو پھانسی کی سزا دیتا۔ ملزمان بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کی جان بخشی ہوئی۔ چودہ سال قید بامشقت تو پھانسی کے مقابلے میں بڑی نرم سزا ہے۔ میں حیران ہوں کہ میرے فاضل دوست تخفیف سزا کے خواہشمند ہیں معلوم نہیں کس بنا پر۔!

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ اشتعال کی بنا پر۔ مقتول کا اس شخص کے گھر میں کیا کام تھا اور پھر رات کے وقت ۔ ؟

مسٹر ساہنی ۔ لیکن جناب عالی اس صورت حال کا تو خاوند کو پہلے سے علم تھا جیسے اس کی رخصت کی درخواست سے ظاہر ہے ۔ یہ صورت تو عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ پھر یہ اشتعال کیسے ہوا ؟

مسٹر جسٹس آغا حیدر ۔ مسٹر ساہنی آپ نے ضرور سنا ہے کہ آخری تنکا اونٹ کی کمر توڑتا ہے ۔ یہ صورت حال اتنی لمبی ہو گئی کہ اس شخص کی حد برداشت سے باہر ہو گئی۔ میرے نزدیک یہ جرم اشتعال کے نتیجے میں ہوا ۔ دو دو سال قید بامشقت قرین انصاف ہو گی۔

بیچارے مسٹر ساہنی ! اکثر تو وہ اس حد تک سختی کی حمایت کرتے کہ جج صاحبان دق آ جاتے ۔ اور اس کیس میں یہ کیفیت تھی کہ جب ان کا موقف خالص قانونی لحاظ سے قابل التفات بھی تھا تو جج صاحب ان کی بات پر غور کرنے کو تیار نہ تھے ۔ ان کی رائے تھی کہ ایک مظلوم خاوند نے ایک ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا ۔ اس نے خوب کیا ۔ قانون کہتا ہے یہ جرم ہے ۔ بہت اچھا جرم ہی سہی لیکن عقوبت کی حد جرم کی نوعیت کے مطابق ہونا چاہیئے حقیقی انصاف کا یہی تقاضا ہے ۔

سفر انگلستان | ۱۹۲۷ء میں پنجاب کونسل کا بجٹ کا اجلاس تو لاہور میں ہوا اور دوسرا اجلاس گرمیوں میں شملے میں ہوا۔ اس وقت تک یہ طے ہو چکا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں جس شاہی کمیشن کے تقرر کا وعدہ کیا گیا تھا کہ آئینی اصلاحات کے عملی تجربے کے دس سال بعد مقرر ہو گا اس کا تقرر ۱۹۲۷ء کے آخری مہینوں میں ہو جائے گا ۔ اس کے پیش نظر پنجاب کونسل کے مسلم اراکین نے فیصلہ کیا کہ ان کا ایک نمائندہ انگلستان جائے اور وہاں اراکین پارلیمنٹ اور دیگر اہل الرائے اصحاب سے ملک ہندوستان کے آئندہ آئینی دستور کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ ان پر واضح کرے ۔ یہ تجویز میاں سر فضل حسین صاحب کی تھی اور آخر انہی کے مشورہ سے اس خدمت کو سرانجام دینے کیلئے مجھے منتخب کیا گیا ۔ میاں صاحب اس سال لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے اجلاس کے لئے ہندوستانی وفد میں تشریف لے جا رہے تھے ۔ میں ایک اطالوی جہاز میں نیپلز گیا ۔ ایک دن وہاں ٹھہر کر اور علاوہ دیگر مناظر کے پمپی آئی کے عبرت انگیز کھنڈرات دیکھ کر روم گیا ۔ تین دن وہاں ٹھہرا ۔ نصف دن پاپیادہ اور نصف دن ایک ٹورسٹ ایجنسی کے نظام کی سرپرستی میں اس قریباً تین ہزار سال سے متواتر آباد شہر کے تاریخی مقامات کی سیر کی ۔ روم سے جنیوا گیا ۔ میاں فضل حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہدایات حاصل کیں ۔ جنیوا سے لندن پہنچا ۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خانصاحب یو پی کونسل کے مسلم اراکین کے نمائندے کی حیثیت میں لندن پہنچے ہوئے تھے ۔ ان سے تعارف ہوا ۔ رہائش کیلئے مجھے بیز واٹر کے علاقے میں دو عمدہ کمرے میسر آ گئے ۔ اور حسن اتفاق سے ایک باسلیقہ عمدہ تربیت یافتہ نوجوان لیس ٹائپسٹ کی خدمات بھی میسر آ گئیں ۔ ان دنوں لندن میں مسجد احمدیہ کے انچارج مولانا عبدالرحیم درد صاحب تھے ۔ ان کا پورا تعاون بھی مجھے حاصل رہا ۔ ان کی مشفقانہ توجہ سے مجھے اپنے کام میں بہت مدد ملی

میرے عزیز دوست ڈاکٹر آسکر برنطلر کی رہائش بھی میرے قریب ہی تھی۔ ان کا مشورہ بھی بعض امور میں میرے لئے مفید ثابت ہوا۔ کبھی فرصت کی گھڑی میسر آتی تو میں ان کے ساتھ گذار لیتا۔ سارا دن ملاقاتوں، مجالس میں تقریروں اور نوٹ لکھوانے میں صرف ہوتا۔ بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری شخصیتوں سے ملنے کا موقعہ میسر آیا ان دنوں پہلے لارڈ سنہا پریوی کونسل میں جج تھے۔ اور لندن میں مقیم تھے۔ ان کی رہائش گاہ پہ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ سیاسی مستقبل کے متعلق فرمایا۔ "میاں میں تو ان لوگوں میں سے ہوں کہ اگر آج انگریز اعلان کر دیں کہ ہم ہندوستان کو چھوڑتے ہیں۔ تو میں گھٹنوں کے بل گر کر ان سے التجا کروں کہ الیامت کرو"۔ اس مرتبہ مجھے رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ سسکیس کے علاقہ میں ایک مکان میں مقیم تھے جو ان کے چھوٹے صاحبزادے سید طارق امیر علی صاحب کی ملکیت تھا۔ سید طارق امیر علی اپنے محترم والد کی طرح کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے اور وہاں سے پنشن پا کر وزیر ہند کے مشیر قانون ہوئے۔ سید امیر علی صاحب نے خاکسار کو دوپہر کے کھانے پہ مدعو فرمایا اور بڑی شفقت سے پیش آئے سارا وقت گفتگو اردو میں رہی فرمایا تمہارا MOOT میں بحث کرنا ہمیں یاد ہے۔ میرے لندن کے کام کے متعلق بہت مفید مشورے دیئے۔ میرا دل ان کی صحبت سے جذبات شکر کے ساتھ لبریز لوٹا۔ وہ ۱۹۲۸ء میں فوت ہوئے۔ اسلام کا درد رکھتے تھے۔ اسلام کی اور مسلمانوں کی نہایت مخلصانہ اور بڑی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ فجزاہ اللہ و یزد لہ فی رحمتہ۔ شرح محمدی، تاریخ اسلام اور اسلام کی تعلیم پر اپنی بیش بہا تصانیف اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

میں ہر صبح پہلے دن کی ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات کا خلاصہ نوٹ کروا دیتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے صرف اس موقع پر باقاعدہ ڈائری رکھی۔ ہندوستان واپسی پہ میں نے یہ نوٹ میاں فضل حسین صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اس سفر میں میں اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا جو میرے سپرد کیا گیا تھا اس کا تو میں اندازہ نہیں کر سکتا لیکن خود میرے لئے یہ تجربہ بہت فائدے کا موجب ہوا۔

سائمن کمشن کا تقرر | میں ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ سائمن کمشن کے تقرر کا اعلان ہو گیا۔ سر جان سائمن (چیئرمین) کے علاوہ میجر کلیمنٹ اٹیلی ممبر پارلیمنٹ بھی کمشن کے ایک ایسے رکن تھے جو بعد میں پبلک ذمہ داری کے اونچے منصب پہ فائز ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں وزیر اعظم ہوتے ہی انہوں نے ہندوستان کو آزادی دینے کا اعلان کیا۔ اور عین دو سال بعد اس اعلان کی تکمیل ہو گئی۔ کمشن کے اراکین میں کوئی ہندوستانی شامل نہیں تھا۔ اس فرو گذاشت کی وجہ سے ہندوستان کے ہر طبقے کی طرف سے سخت مایوسی کا اظہار کیا گیا۔ اور جب کمشن ۱۹۲۷ء اور پھر ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا تو ہر جگہ کمشن کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ بعد میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کمشن کے

ساتھ ایک مرکزی کمیٹی شامل کی جائے گی جس کے اراکین مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ منتخب کریں گی اور ہر صوبے میں کمشن کے اجلاسوں کے دوران ایک صوبائی کمیٹی جسے صوبے کی کونسل منتخب کرے گی کمشن اور مرکزی کمیٹی کے ساتھ شامل رہے گی۔ لیکن اس اعلان سے بھی ہندوستانی رائے عامہ پر کوئی خوشگوار اثر نہ ہوا۔ بیشک یہ کہا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبائی کمیٹیوں کو گواہان پر جرح کرنے کی پوری آزادی ہوگی اور ہر کمیٹی اپنی اپنی رپورٹ بھی پیش کرے گی لیکن ہر کوئی جانتا تھا کہ یہ کمیٹیاں محض اشک شوئی کے طور پر مقرر کی جارہی ہیں اور کمشن کی رپورٹ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ خود کمشن کے متعلق بھی یہ تاثر تھا کہ یہ نام کا تو کمشن ہے لیکن دراصل اس کی تمام باگ ڈور ایک شخص واحد کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی اس کے چیئرمین سر جان سائمن کے ہاتھ میں جو ابتداء میں تو لبرل سیاستدان تھے۔ مسٹر ایسکوئتھ کی وزارت میں اٹارنی جنرل رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ قدامت پسندی کی طرف رجعت کرتے گئے تھے۔ ہندوستان کے آئینی مستقبل کے متعلق ان کا نظریہ نہایت رجعت پسندانہ تھا۔ ان خدشات کی تصدیق کمشن کی رپورٹ نے کردی۔

۱۹۲۷ء کے آخر میں کمشن نے ہندوستان کا ابتدائی دورہ کیا۔ کمشن نے تحقیقاتی کارروائی اپنے دوسرے دورے کے دوران ۱۹۲۸ء میں کی۔ کانگریس نے تو کمشن کے ساتھ تعاون نہ کیا لیکن مرکزی اور صوبائی کمیٹیاں کمشن کی کارروائی میں شامل رہیں۔ پنجاب کونسل میں جب کمیٹی کے انتخاب کی تجویز پیش ہوئی تو بحث کے دوران میں تجویز کے خلاف بہت سے دلائل پیش کئے گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں ان دلائل میں سے اکثر کے ساتھ اتفاق کا اظہار کیا اور بڑے زور سے اس بات کی تردید کی کہ مرکزی اور صوبائی کمیٹیاں کسی رنگ میں بھی کمشن کی ہندوستانی رکنیت کا بدل ہو سکتی ہیں۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کمشن میں ہندوستانی اراکین کو شامل نہ کرنے کی کوئی جائز وجہ نہیں ہو سکتی اور ہمیں کمشن کی رپورٹ کے متعلق کوئی امید افزا توقعات قائم نہیں کرنی چاہئیں۔ بایں ہمہ میں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہمیں کمشن کی کارروائی سے عدم تعاون نہیں کرنا چاہئیے۔ ہمارے تعاون سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا اور کسی نفع کی گو پختہ امید نہیں لیکن ایک تو شہادت کے دوران میں ہم ایسے امور کمشن کے روبرو لا سکتے ہیں جو ممکن ہے ہمارے نمائندگان کی عدم موجودگی میں نمایاں طور پر ظاہر نہ ہوں۔ اور دوسرے صوبائی کمیٹی اپنی رپورٹ میں اپنا نظریہ وضاحت سے بیان کر سکتی ہے جس سے ممکن ہے کچھ فائدہ ہو سکے۔ تجویز منظور ہوئی اور صوبائی کمیٹی قائم ہو گئی۔ اس کمیٹی کے سات ارکان تھے۔ جن میں یورپین بھی تھے، سکھ بھی اور ہندو اور مسلمان بھی۔ سردار سکندر حیات خانصاحب اور میں دونوں اس کمیٹی میں شامل تھے۔ کمیٹی نے سردار سکندر حیات خان صاحب کو چیئرمین منتخب کیا۔ کمیٹی کے انتخاب سے پہلے کہا جانے لگا کہ تینوں وزراء کمیٹی میں شامل ہونے چاہئیں۔ اس وقت ملک فیروز خان نون صاحب، لالہ منوہر لال صاحب اور سردار جگندر سنگھ صاحب وزراء تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وزراء کو کمیٹی میں شامل کئے جانے کی تجویز کو میاں سر فضل حسین صاحب کی

تائید حاصل ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن اراکین پنجاب کونسل میں اس تجویز کا کوئی حامی نہیں تھا۔ اسلئے انتخاب کے وقت کونسل میں کوئی ایسی تجویز پیش نہ ہو سکی۔

راجہ نریندر ناتھ صاحب | راجہ نریندر ناتھ صاحب کا خاندان پنجاب کا ایک نہایت ممتاز کشمیری برہمن خاندان تھا۔ راجہ صاحب نہایت وضعدار خوش اخلاق اور با مروت بزرگ تھے۔ راجہ نریندر ناتھ صاحب پہلے پہل اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر مقرر ہوئے تھے اور کمشنر کے عہدے سے پنشن یاب ہونے کے بعد پنجاب کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ پائی تھی اور بہت فراخ دست تھے۔ فارسی عربی میں خوب دسترس تھی۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی جانتے تھے۔ اسلامی تمدن سے متاثر تھے۔ لیکن خاندانی روایات اور سیاسی اور معاشرتی ماحول انہیں جکڑے رکھتے تھے۔ گھر میں ان کا کھانا مسلمان باورچی تیار کرتا تھا۔ صدقہ خیرات بھی ہندو مستحقین تک محدود نہیں رکھتے تھے۔ ان کے صاحبزادے انند کمار گورنمنٹ کالج میں ہمارے ہم جماعت رہے تھے۔ کونسل میں انکی ہندو پارٹی کی ایک رکن ایک خاتون لکھ وتی جین تھیں انہوں نے ایک دن مجلس میں ایک تحریک التوا کا نوٹس دیا جس سے راجہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ چائے کے وقت بڑے جوش سے فرما رہے تھے خدا ان عورتوں سے بچائے تم نے دیکھا آج اس نے کیا حرکت کی ہے ؟ میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ لکھ وتی کی تحریک التوا اس سخت سلوک کے خلاف ہے جو بقول لکھ وتی پولیس نے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی انسٹی ٹیوٹ کے ہڑتالی طلباء کے ساتھ روا رکھا حالانکہ واقعہ یوں ہے کہ میں انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی کا چیئرمین ہوں۔ مجھے آج بعض طلباء کے متعلق ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی کہ وہ ہڑتال میں شامل نہیں اور کلاسوں میں حاضر ہونا چاہتے ہیں لیکن ہڑتال کنندگان انہیں روکتے ہیں اور اندر جانے نہیں دیتے۔ اس پر میں نے ڈپٹی کمشنر کو ٹیلیفون پر کہا کہ جو طالب علم حاضر ہونا چاہتے ہیں ان کے اندر جانے کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اس نے دو چار کانسٹیبل بھیج دیے جنہوں نے ہڑتال کنندگان کو روک دیا کہ جو طالب علم حاضر ہونا چاہتے ہیں ان کے رستے میں مزاحم نہ ہوں۔ اب اس خبطن نے اس پر تحریک التوا کا ناحق نوٹس دیکر میرے لئے دقت پیدا کر دی ہے۔ میں نے کہا آپ ان محترمہ کو سمجھادیں۔ فرمایا وہ سمجھے گی کیسے ؟ ھُنّ ناقصات العقل والدین۔ میں نے کہا پھر آپ نے انہیں اپنی پارٹی کا رکن کیوں بنایا ہوا ہے ؟ بے ساختہ کہا میاں شاوروا ھنّ وخالفوا ھنّ ! ۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے جس جہاز سے میں سفر کر رہا تھا راجہ صاحب بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ ایک روز مجھ سے دریافت فرمایا کہ تصوف کی بنا قرآن کریم کی کس آیت پر رکھی جاتی ہے۔ میں نے کہا میں نے تصوف کا مطالعہ نہیں کیا اس لئے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ جو آیات صوفیائے کرام کے مدنظر ہوں گی ان میں یہ آیت کریمہ اللہ نور السموٰت والارض والی ضرور ہو گی۔ سن کر فرمایا یہ تو تصوف کا نچوڑ ہے۔ لندن میں گول میز کانفرنس

کے دوران میں ایک شام مجھے کھانے پر بلایا اور کوئی مہمان نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ آخر برسرِ مطلب آئے۔ فرمایا سارے ملک کے قضیئے تو کانفرنس میں زیرِ بحث رہیں گے۔ پنجاب کے متعلق تو ہم آپس میں کچھ طے کر لیں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ پوچھا کیا کوئی ایسا سمجھوتا نہیں ہو سکتا کہ ہم فرقہ دارانہ اختلافات کو خواہ مخواہ سیاست میں نہ گھسیٹیں۔ میں نے کہا بہت مناسب ہوگا۔ کہنے لگے اس کی ابتدا تو یوں ہو سکتی ہے کہ موجودہ قوانین میں سے جو ان اختلافات کو بھڑکانے والے ہوں ان کی اصلاح ہو جائے۔ میں نے کہا بڑی اچھی تجویز ہے۔ پوچھا کیا تم رضامند ہو کہ ہمارے ان قوانین کی جن کے نتیجے میں ایسے امتیازات پیدا ہوتے ہیں تنسیخ یا مناسب ترمیم ہو جائے؟ میں نے عرض کیا کہ فرقہ دارانہ امتیازات کے متعلق تو رضامند ہوں لیکن جن قوانین یا قواعد کی غرض پسماندہ طبقات کی اقتصادی حالت کی اصلاح یا اس کا تحفظ ہو ان پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیئے۔ پوچھا مثلاً؟ میں نے کہا مثلاً ایکٹ انتقالِ اراضیات۔ پژمردگی کے لہجے میں فرمایا تو پھر حاصل کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں ڈرنہ ضائع گیا؟ اس پر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے رخصت طلب کی ہنستے ہنستے مجھے رخصت کیا۔

پنجاب اصلاحات کمیٹی نے خوب محنت سے کام کیا۔ جب سائمن کمشن لاہور آیا اور پبلک اجلاس شروع ہوئے تو طبعاً پبلک کو کمشن کی کارروائی میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان دنوں یونینسٹ پارٹی کی سرپرستی میں ایک ہفتہ وار اخبار بنام "دورِ جدید" نیا نیا جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید انعام اللہ شاہ صاحب تھے اور پارٹی کی طرف سے پالیسی وغیرہ کی نگرانی میرے ذمہ تھی۔ سائمن کمشن کی کارروائی کے متعلق ہفتہ وار آرٹیکل تیار کرنا بھی میرے ذمے تھا۔ ایک دن ڈاکٹر گوکل چند نارنگ صاحب نے مجھ سے کہا تمہاری پارٹی کا جو نیا اخبار جاری ہوا ہے اس کا پرچہ مجھے بھی آتا ہے۔ کمشن کی کارروائی کے متعلق جو آرٹیکل اس میں چھپتا ہے بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ میرا ذکر تو اس میں بڑے ادب سے کیا جاتا ہے لیکن مجھ پر تنقید بڑی سخت ہوتی ہے۔ ایڈیٹر بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔

سر جوگندر سنگھ بظاہر تو یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے لیکن پالیسی اپنی چلاتے تھے۔ وہ کمشن کے روبرو بطور گواہ پیش ہوئے تو میاں سر فضل حسین صاحب خاموشی سے آکر ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔ سر جوگندر کو گویا اب دو محاذ پر جنگ کرنی پڑی۔ سامنے کمشن اور پیچھے سر فضل حسین تھوڑی ہی دیر میں ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ دوپہر کو جب اجلاس ملتوی ہوا تو ان کی شہادت ابھی جاری تھی۔ لنچ کے بعد اجلاس شروع ہوا تو چیئرمین نے بتایا کہ سر جوگندر سنگھ کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے وہ بقیہ شہادت کے لئے کمشن کے روبرو پیش نہیں ہو سکیں گے۔

ہم میں سے بعض نے کمشن پر زور دیا کہ عدالتی اور انتظامی محکمہ جات کو الگ الگ کر دینا چاہیئے اس مسئلے پر غور کرنے کیلیئے سر جان سائمن نے ایک سب کمیٹی تجویز کی اور اس کا اجلاس شام کے وقت گورنمنٹ ہاؤس میں طلب کیا۔ حکومت کی طرف سے عذر کیا گیا کہ مجسٹریٹ صاحبان کو عدالتی اور انتظامی فرائض دونوں سر انجام دینے ہوتے ہیں الگ الگ محکمہ جات کے لئے افسران کی تعداد بھی بڑھانا پڑے گی اور اخراجات بھی بڑھ جائیں گے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس مرحلہ پر ایک معمولی سی تبدیلی کر دی جائے۔ جو ہمارے لئے اطمینان کا موجب ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ جو مجسٹریٹ عدالتی فرائض سر انجام دیں ان کے کام کی رپورٹ سشن جج صاحب ہائی کورٹ کو کیا کریں۔ اور ان کے تبادلے تفویض اختیارات اور ترقی کے احکام بھی ہائی کورٹ سے صادر ہوا کریں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کمشنر اور حکومت کا ان میں دخل نہ ہو۔ چیف سیکرٹری صاحب نے غور کا وعدہ کیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

پنجاب کمیٹی نے اپنی رپورٹ تیار کی۔ یہ رپورٹ زیادہ تر سردار سکندر حیات خاں صاحب کے فکر اور محنت کا نتیجہ تھی۔ کمیٹی کے یورپین رکن مسٹر اوون رابرٹس کمیٹی کی اکثریت کے ساتھ پوری طرح متفق تھے۔ جن امور میں کمیٹی کے دوسرے اراکین میں اختلاف تھا مسٹر رابرٹس یونینسٹ پارٹی کے ساتھ متفق تھے۔ جب کمشن کے صوبائی اجلاس ختم ہو گئے تو تمام صوبائی کمیٹیوں کے ساتھ دلی میں کمشن نے تبادلہ خیالات کیا۔ کمشن کی اپنی رپورٹ خالصتاً سر جان سائمن کا نتیجہ فکر تھی۔ پہلی جلد کی تیاری میں تو یقیناً کمشن کے سیکرٹریٹ کا بہت ساحصہ ہوگا لیکن یہ جلد محض تاریخی تبصرہ تھی گو اس لحاظ سے نہایت مفید اور قابل قدر تھی۔ کمشن کے دونوں سیکرٹری سر فنڈلیٹر سٹورٹ اور سر جوزف بھور نہایت قابل تھے۔ سر فنڈلیٹر سٹورٹ انڈیا آفس کے سنیئر افسر تھے۔ جو بعد میں نائب وزیر ہند ہوئے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جنگی محکمے میں انہوں نے نہایت قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ سر جوزف بھور انڈین سول سروس کے سنیئر افسر تھے۔ بعد میں گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے رکن ہوئے رپورٹ کی دوسری جلد نہایت مایوس کن تھی۔ جہاں تک ہندوستان کے آئینی مستقبل کا سوال تھا یہ رپورٹ بالکل بیکار ثابت ہوئی اور عملاً ردی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی۔ دو ضمنی فائدے کمشن کی سرگرمی سے حاصل ہوئے اول برطانیہ میں اور ہندوستان میں ان تمام امور میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور جو امور کمشن کے روبرو زیر بحث آئے ان کے متعلق سنجیدہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ دوسرے برطانیہ پر واضح ہو گیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آخری باب شروع ہو چکا ہے۔ اصلاحات کا دور ختم ہو رہا ہے اور آزادی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اب اس مرحلے پر ٹوٹ کا رہ نہیں سکتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں لیبر پارٹی دوسری بار انگلستان میں برسر اقتدار تھی۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم تھے۔ انہیں شروع سے ہی ہندوستانی

سیاسی عزائم کے ساتھ ہمدردی تھی۔ کانگریس کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے ان کے وزیر ہند مسٹر ویجوڈ بین پہلے لبرل پارٹی کے رکن تھے۔ بعد میں لیبر پارٹی میں شامل ہو گئے انہیں بھی ہندوستانی سیاسی امنگوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ بعد میں لارڈ سٹینز گیٹ ہوئے۔ ان کے صاحبزادے نے یہ مہم شروع کی کہ اتنا جو شخص ہاؤس آف لارڈز کا رکن ہو اسے اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ اس شرف کو ترک کر کے ہاؤس آف کامنز کے انتخابات میں حصہ لے سکے۔ اس مہم میں وہ کامیاب ہوئے۔ مناسب آئینی ترمیم کر دی گئی۔

پہلی گول میز کانفرنس | ۱۹۳۰ء میں وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستان کے آئینی مستقبل پر از سرنو غور کرنے کے لئے لندن میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی۔ اکتوبر میں اس کانفرنس کے اجلاس سینٹ جیمز پیلیس میں شروع ہوئے۔ کانگریس نے شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ مندوبین حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ والیان ریاست کی خاصی تعداد شامل تھی۔ برطانوی نمائندگان میں دونوں ایوانوں کے اراکین اور تینوں سیاسی پارٹیوں کے نمائندے شامل تھے۔ اگرچہ کانگریس کے نمائندے شامل نہیں تھے اور یہ یقیناً بہت بڑا خلا تھا اور تمام مندوبین حکومت کے منتخب کردہ تھے۔ پھر بھی مسٹر شاستری، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیکار، سر چمن لال سیتلواڈ، مسٹر فیروز سیٹھنا، سر مانک جی دادا بھائی، مسٹر چنتامنی، سر اے پی پاترو، سر راما سوامی مدلیار، سر آغا خان، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی سر میاں محمد شفیع، مسٹر جناح (قائداعظم) سر سید سلطان احمد، نواب صاحب چھتاری، خان بہادر حافظ ہدایت حسین، سر عبدالحلیم غزنوی، مولوی ابوالقاسم فضل الحق، سر غلام حسین ہدایت اللہ، نواب سر عبدالقیوم خان، بیگم شاہنواز، سردار اجل سنگھ، سردار سمپورن سنگھ، مسٹر جوشی، مسٹر امبیدکار، نواب صاحب بھوپال، مہاراجہ بیکانیر، سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل، سر لیاقت حیات خان اور کئی دیگر ممتاز شخصیتوں کی موجودگی اس امر کی ضامن تھی کہ ہر نقطہ نگاہ کے اظہار کے لئے کانفرنس میں پورا موقعہ میسر ہو گا۔ کانفرنس کا دفتری انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ دفتری لحاظ سے کانفرنس کے دوران میں اور بعد میں مشترکہ سلیکٹ کمیٹی کے اجلاسوں کے دوران میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پہلی گول میز کانفرنس میں خان بہادر میاں عبدالعزیز فلک پیما اور مسٹر آغا لطیفی سیکرٹریٹ میں شامل تھے مسٹر لطیفی بعد کے اجلاسوں میں بھی شامل رہے اور مسلم وفد کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے سید امجد علی صاحب اپنے خرچ پر تمام اجلاسوں میں شامل رہے اور مسلم وفد کے سیکرٹری کے طور پر بہت مفید خدمات سرانجام دیتے رہے۔ فجزا ھم اللہ۔ مسلم وفد کے نجی اجلاس عموماً ہز ہائی نس سر آغا خان کی صدارت میں ان کے رٹز ہوٹل کے کمرے میں ہوتے رہے ...

صوبۂ پنجاب میں وزارت کی پیش کش | مجھے بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی جو میں نے قبول کی اور وقت آنے پر سفر کیلئے تیار بھی ہو گیا لیکن ایک غیر متوقع رکاوٹ پیدا ہو گئی ۱۹۳۰ء میں مجلس قانون ساز کے انتخابات کا اعلان ہونے پر میں نے ضلع سیالکوٹ کے مسلم اکابرین اور بارسوخ اہل الرائے کے ایک اجتماع میں عرض کیا کہ میں نے پنجاب کونسل میں قریب چار سال ضلع کے مسلم حلقے کی نیابت کی ہے اگر آپ صاحبان سمجھتے ہیں کہ میں نے توجہ اور اخلاص کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی کی کوشش کی ہے اور میرے کام سے مطمئن ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ خدمت میرے سپرد رہنی چاہیئے تو میں اس خدمت کی مزید سرانجام دہی کو اپنے لئے موجب فخر سمجھونگا اور آپ کے اعتماد کی میرے دل میں بہت قدر ہو گی۔ لیکن اگر آپ کی رائے ہو کہ یہ خدمت اب کسی اور کے سپرد ہونی چاہیئے تو میں آپ کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اپنے آپ کو انتخاب کے لئے پیش نہیں کروں گا۔ اور مجھے کسی قسم کا شکوہ نہیں ہو گا۔ جملہ حاضرین نے بالاتفاق اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ میری نیابت میں تبدیلی نہیں چاہتے۔ چنانچہ میں بفضل اللہ بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔ فالحمد للہ۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کا ایک گروپ ملک سر فیروز خاں نون کے وزیر مقرر کئے جانے پر متفق نہیں تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں ان میں سے بعض اراکین کے انتخاب میں ملک صاحب اور ان کے والد بزرگوار نواب ملک محمد حیات خاں نون صاحب نے جو ان دنوں کمشنر تھے ان کی مخالفت کی تھی۔ ان میں سے جو حضرات انتخاب میں کامیاب ہو گئے وہ طبعاً ملک صاحب سے آزردہ تھے۔ کچھ اور اراکین بھی مختلف وجوہ سے ملک صاحب کے وزیر مقرر کئے جانے کے خلاف تھے۔ چودھری سر شہاب الدین صاحب بھی منتخب ہو گئے تھے اور یہ یقینی امر تھا کہ وہ پھر مجلس کے صدر منتخب ہوں گے۔ وہ اپنے لئے وزارت کے قطعاً خواہاں نہیں تھے۔ لیکن ملک فیروز خاں نون کے وزیر ہونے کے مخالف تھے۔ انہوں نے دو تین بار پارٹی کے مسلم اراکین کو اپنے دولتکدے پر مشورے کیلئے طلب فرمایا لیکن یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ وزارت کیلئے کس رکن کا نام پیش کیا جائے میرے تعلقات چودھری صاحب کیساتھ گہرے دوستانہ تھے اور انہیں مجھ پر اعتماد تھا۔ انہوں نے مجھے اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ میرا نام گورنر صاحب کی خدمت میں وزارت کیلئے پیش کیا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ گورنر سر جیفرے ڈی مونٹ مورینسی میری نسبت حسن ظن رکھتے ہیں کیونکہ اسی سال کے ابتداء میں میاں سر فضل حسین صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ گورنر صاحب کہتے ہیں ہائی کورٹ میں جج کی ایک عارضی جگہ خالی ہونیوالی ہے اور میں نے سر شادی لال سے کہا ہے کہ وہ ظفر اللہ خاں کے تقرر پر رضامند ہو جائیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ میری نسبت سر جیفرے کی یہ رائے میرے لئے خاص طور پر موجب اطمینان تھی کیونکہ اس سے پہلے ایک ایسا واقعہ ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے مجھ سے آزردہ خاطر ہونے کا امکان تھا۔ وہ واقعہ یہ تھا۔

پنجاب کونسل میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کے طرز عمل کے متعلق تحقیقات کے مطالبہ کیلئے تحریک التوا

پنجاب کونسل میں ایک تقریر کے دوران میں چودھری عبدالرحمٰن خانصاحب (راہوں ضلع جالندھر) نے بیان کیا کہ مسٹر ورسلے ڈپٹی کمشنر جالندھر نے کسی معاملہ میں انہیں بلا کر دھمکایا۔ چودھری عبدالرحمٰن صاحب آزاد پارٹی کے رکن تھے جس کے لیڈر چودھری افضل حق صاحب تھے۔ میں نے چودھری افضل حق صاحب سے کہا کہ آپ کی پارٹی کے ایک رکن کے ساتھ اگر ایک افسر نے ایسا سلوک کیا ہے تو آپ کو چاہیئے کہ حکومت کو توجہ دلانے کیلئے التوا کی تحریک پیش کریں۔ انہوں نے فرمایا ہم ایک چھوٹی سی پارٹی ہیں۔ ہمارے احتجاج کا حکومت پر کیا اثر ہو گا! میں نے کہا یہ پارٹی کا سوال نہیں بلکہ کونسل کے وقار کا سوال ہے۔ اگر تحریک التوا کے ذریعے یہ مطالبہ کیا جائے کہ چودھری عبدالرحمٰن خانصاحب نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کی تحقیقات کی جائے تو میں امید کرتا ہوں کہ اراکین کونسل کی کثرت تائید میں ہو گی۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ اسے ایک پارٹی کا سوال نہ بنایا جائے بلکہ ایک رکن کونسل کے احترام کے سوال کے طور پر پیش کیا جائے۔ چودھری افضل حق صاحب نے دریافت کیا کیا تم نے اپنی پارٹی کے اراکین کے ساتھ مشورہ کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ لیکن اگر آپ تحریک پیش کرنے پر آمادہ ہوں تو میں انفرادی طور پر اپنی پارٹی کے اراکین کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ چودھری صاحب نے فرمایا۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ دوسری پارٹیوں میں سے بھی ہمیں تائید کی امید ہو سکتی ہے تو ہم التوا کی تحریک پیش کر دیں گے۔ میں نے اپنی پارٹی کے بعض اراکین سے فرداً فرداً بات کی اور اکثر کو اس حد تک تائید پر آمادہ پایا کہ بیان کردہ واقعہ کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ مولوی سر رحیم بخش صاحب نے فرمایا ہم حکومت کے خلاف رائے تو نہیں دیں گے لیکن غیر جانبدار رہ جائیں گے۔ ایسے معاملے میں مجھے ان سے اتنی بھی توقع نہیں تھی۔ ان کے اس اظہار رائے سے مجھے اندازہ ہوا کہ تحریک التوا کامیاب ہو جائے گی۔ ہندو پارٹی میں سے میں نے پنڈت نانک چند صاحب سے بات کی۔ انہوں نے فرمایا تم ہمیں پھنسانا چاہتے ہو اور خود خلاف رائے دو گے میں نے انہیں یقین دلایا کہ یہ پارٹی کا سوال نہیں۔ میں خود تو ضرور تائید میں رائے دوں گا اور امید کرتا ہوں کہ یونینسٹ پارٹی کے اور اراکین بھی تائید میں رائے دیں گے۔ چنانچہ تحریک پیش کی گئی۔ میاں سر فضل حسین صاحب قائد ایوان تھے۔ انہوں نے تحریک کی مخالفت کی اور نہ یادہ زور اس بات پر دیا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب سے ٹیلیفون پر دریافت کیا گیا ہے۔ وہ چودھری عبدالرحمٰن صاحب کے بیان کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب ایک طرف رکن مجلس کا بیان ہے دوسری طرف ڈپٹی کمشنر کا بیان۔ تیسرا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ لہٰذا جب تحقیقات سے مزید کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا تو تحقیقات کرنے سے کیا فائدہ ہو گا۔ چونکہ تحریک التوا پیش کرنے کا مشورہ چودھری افضل حق صاحب کو میں نے دیا تھا اس لئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میاں صاحب

کی تقریر کا جواب مجھے دینا چاہیئے۔ میں نے کھڑے ہو کر اس امر کی وضاحت کی کہ یہ سوال کسی پارٹی سے متعلق نہیں کونسل کے اور کونسل کے اراکین کے احترام کا سوال ہے ہم نہ رکنِ کونسل کے بیان کو رد کرتے ہیں نہ ڈپٹی کمشنر صاحب کے بیان کو ہمارا مطالبہ فقط یہ ہے کہ اس واقعہ کی حقیقت معلوم کی جائے۔ بیشک ایک بیان کے مقابل دوسرا بیان ہے تیسرا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ لیکن یقیناً قائد ایوان کا اور ہم میں سے اکثر کا یہ تجربہ ہے کہ مناسب غیر جانبدارانہ تحقیقات سے ایسے قرائن روشنی میں آجاتے ہیں جن پر غور کرنے سے اصلیت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ ایک ذمہ دار رکن کونسل نے کونسل کے اجلاس میں یہ بیان کیا ہے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے انہیں بلا کر دھمکایا۔ انہوں نے وہ الفاظ دہرائے ہیں جو ڈپٹی کمشنر صاحب نے استعمال کئے۔ ان حالات میں کونسل کا فرض ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کرے کہ اس واقعہ کی مناسب غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے۔ یہ مطالبہ نہ صرف جائز اور معقول ہے بلکہ اس سے کسی صورت گریز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر معاملہ یہیں چھوڑ دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ کونسل اور اراکین کونسل کے احترام اور وقار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو مولوی سر رحیم بخش صاحب نے فرمایا۔ "ماشاء اللہ ماشاء اللہ ہم تائید میں رائے دیں گے"۔ رائے شماری پر تحریک التوا منظور ہو گئی۔ ایک دو روز بعد میاں صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ تم نے جوش میں آکر تحریک تو منظور کرا لی۔ اب اس کا نتیجہ بھی دیکھو۔ تم جانتے ہو جیفرے کسقدر ہمدرد گورنر ہیں۔ اور ہر جائز بات میں ہمارے مطالبات کی تائید کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کونسل کے اختیارات میں ایزادی کا مسئلہ زیر غور ہے۔ مجھے ان معاملات میں کونسل اور ان کے مطالبات کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور میں ہر جائز مطالبے کی تائید کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس قسم کی تحریکات کو اس بات کی تائید میں بطور دلیل پیش کیا جائیگا کہ کونسل اپنے موجودہ اختیارات کو ذمہ دارانہ طریق پر استعمال نہیں کرتی۔ میں نے میاں صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ حالات پیش آمدہ میں اگر کونسل اتنا مطالبہ بھی نہ کرتی تو اپنی ذمہ داری کے سنبھالنے میں قاصر شمار کی جاتی مسٹر ورسلے بیشک سینئر افسر ہیں لیکن یہ تسلیم کرنا کہ ہر حالت میں ایک سینئر افسر کا بیان ایک ناقابلِ تردید حقیقت کا درجہ رکھتا ہے بڑی خطرناک مثال قائم کرنا ہوگا۔ میاں صاحب مطمئن نہ ہوئے۔ چند دن بعد مسٹر ورسلے نے بغیر انتظار کئے کہ حکومت کی طرف سے تحقیقات کا حکم صادر ہوتا ہے یا نہیں محض تحریک التوا کی منظوری کو ہتک شمار کرتے ہوئے قبل پنشن چھٹی پر جانے کی درخواست دے دی۔

اس واقعہ کے بعد گورنر صاحب کا چیف جسٹس صاحب کو میرے ہائیکورٹ کی ججی پر تقرر کیلئے رضامند کرنے کی کوشش کرنا ان کی انتہائی شرافت اور میری نسبت ان کے حسنِ ظن کا ثبوت تھا لیکن یہ جانتے ہوئے بھی میں وزارت کا امیدوار بننے پر رضامند نہ تھا۔ چودھری سر شہاب الدین صاحب اپنی دھن کے پکے تھے۔ جو تجویز ان کے ذہن میں پختہ ہو جائے اسے آسانی سے ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ مجھ سے دریافت کیا کیا حضرت مرزا صاحب قادیان تشریف رکھتے ہیں

میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے بتلایا حضورؓ شملے میں تشریف فرما ہیں اور فلاں دن قادیان واپس
پہنچنے کا پروگرام ہے۔ اس دن صبح کے وقت چوہدری صاحب نے مجھے اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کو اپنے ساتھ امرتسر
چلنے کو کہا۔ ہم دونوں کار میں چوہدری صاحب کے ساتھ امرتسر گئے۔ کالکا سے آنیوالی گاڑی میں حضرت خلیفۃ المسیحؓ تشریف
لائے۔ حضورؓ ایک چھوٹے سیلون میں جس میں دو بڑے درجے کے خانے تھے اپنے رفقاء کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ امرتسر میں
وہ سیلون قادیان جانیوالی گاڑی کے ساتھ لگا دیا گیا۔ چوہدری صاحب نے حضورؓ کے ساتھ بات چیت شروع کی۔
ابھی گفتگو جاری تھی کہ گاڑی کی روانگی کا وقت ہو گیا چوہدری صاحب نے اپنے شوفر کو پیغام بھیجا کہ وہ کار ویرکا اسٹیشن
پر لے آئے اور تین ٹکٹ ویرکا کے منگوالئے۔ ویرکا سے ہم حضورؓ سے رخصت ہو کر لاہور واپس آ گئے۔ گفتگو کا خلاصہ یہ
تھا کہ چوہدری صاحب نے مختصراً پارٹی کے اراکین کے درمیان جو مشورے ہوئے تھے ان کا لب لباب بیان کیا اور کہا ہم چاہتے
ہیں کہ ظفراللہ خاں وزارت کا امیدوار ہو۔ حضورؓ نے دریافت فرمایا پھر یہ کیا کہتے ہیں؟ چوہدری صاحب نے کہا یہ تو نہیں
مانتا۔ حضورؓ نے دریافت فرمایا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ چوہدری صاحب نے کہا ہم آپ کی خدمت میں اسلئے حاضر
ہوئے ہیں کہ آپ اسے ارشاد فرمائیں کہ یہ ہماری بات مان جائے۔ حضورؓ نے فرمایا جب یہ نہیں چاہتے تو میں کیسے مجبور کروں
مزید فرمایا کہ کونسل میں مسلم اراکین پہلے ہی کوئی مضبوط حیثیت نہیں رکھتے آپس میں اختلاف سے انکی حیثیت اور کمزور ہو جائے گی
میری رائے میں بہتر یہی ہو گا کہ پارٹی کے مسلمان اراکین سب مل کر آپس میں اتفاق کے ساتھ مناسب فیصلہ کر لیں اور پھر اس
کی پابندی کریں۔ ممکن ہے چوہدری شہاب الدین صاحب نے اس دوران میں میاں سر فضل حسین صاحب کے ساتھ
بھی اس معاملے کے متعلق خط و کتابت کی ہو لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری صاحب نے گورنر
صاحب کے ساتھ بھی کوئی بات کی ہو یا پارٹی کے بعض اراکین گورنر سے ملے ہوں لیکن مجھے اس کا بھی علم نہیں
میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن جانے کو تیار تھا کہ گورنر صاحب نے مجھے طلب فرمایا اور کہا مجھے معلوم ہوا
ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کے مابین وزارت کے متعلق اختلاف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وزارت
میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا افسوس ہے میں تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ ایک تو میں گول
میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول کر چکا ہوں۔ وہ بھی خدمت کا ایک موقعہ ہے اور میں وہاں جانا چاہتا
ہوں۔ دوسرے پارٹی کے اندر جو اختلاف ہے میں اسے بڑھانے کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ گورنر صاحب نے پوچھا
تم لندن کے سفر پر کب روانہ ہو گے؟ میں نے کہا تین چار دن میں۔ فرمایا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم یہ سفر ایک ہفتہ
کیلئے ملتوی کر دو؟ میں نے کہا کانفرنس کے افتتاح کی تاریخ کے لحاظ سے تو ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میں ایک ہفتہ بعد
روانہ ہو کر بھی بر وقت لندن پہنچ سکتا ہوں لیکن اس التوا سے آپ کی مشکل میں کمی ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی
میرا اندازہ ہے کہ جب تک میں موجود ہوں یہ کشمکش جاری رہے گی۔ بلکہ میرے التوائے سفر سے شاید بڑھ

جائے کیونکہ اس کی یہ تعبیر کی جاسکتی ہے کہ میں وزارت کی خواہش یا امید کی وجہ سے رک گیا ہوں۔ اگر میں چلا جاؤں تو ملک فیروز خاں نون کے لئے میدان خالی ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے پارٹی کے مسلم اراکین ان کے تقرر پر رضامند ہو جائیں۔ گورنر صاحب نے فرمایا تم مجھ سے یہ وعدہ کرتے جاؤ کہ اگر میں بالآخر یہی فیصلہ کروں کہ تمہیں ملک اور قوم کی خدمت کی خاطر وزارت کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیئے اور تمہیں بذریعہ تار اطلاع دوں تو تم عدن سے واپس آجاؤ گے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ پورے غور کے بعد اسی فیصلے پر پہنچیں تو تعمیل ارشاد کروں گا۔ لیکن ایک گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اب کی بار تعلیم وغیرہ کے محکمہ جات کا قلمدان پھر سے مسلمان وزیر کے سپرد ہونا چاہیئے فرمایا یہ بات میرے ذہن میں رہے گی۔

اسی سہ پہر میں سر سکندر حیات خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا گورنر صاحب کے ساتھ جو بات ہوئی انکی خدمت میں گذارش کر دی اور کہا کہ گورنر صاحب آپ سے ضرور مشورہ کریں گے (سردار صاحب ۱۹۳۰ء سے میاں سر فضل حسین صاحب کی جگہ گورنر کونسل کے رکن عاملہ تھے) آپ انہیں یقین دلائیں کہ میں گول میز کانفرنس میں کام کرنے کا متمنی ہوں اور وزارت کا ہرگز خواہشمند نہیں اور یہ صورت پیدا نہ ہونے دیں کہ وہ مجھے عدن سے واپس طلب فرمائیں سردار صاحب سے رخصت ہو کر میں ملک فیروز خانصاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے سب ماجرا بیان کر کے گذارش کی کہ میرا اندازہ ہے کہ گورنر صاحب آپ ہی کو وزارت کی پیشکش کریں گے آپ ضرور ان سے کہیں کہ آپ کو تعلیم وغیرہ کے محکمہ جات کا قلمدان سپرد کیا جائے۔ یہ امر بھی پارٹی کے مسلم اراکین کی دلجوئی کا موجب ہوگا۔ ملک صاحب نے فرمایا "ارے بھائی تم لوگوں کو اصرار ہے تو میں یہ بھی کہہ دونگا۔ لیکن میرا موجودہ قلمدان (لوکل سیلف گورنمنٹ) بڑے مزے کا ہے"۔

پہلی گول میز کانفرنس | لندن پہنچ کر میں نے ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا۔ میرے چھوٹے بھائی چودھری اسد اللہ خاں صاحب اس وقت لندن میں بیرسٹری کے سب امتحان ختم کر چکے تھے اور بیرسٹری کی سند کے انتظار میں تھے۔ میرے کہنے پر وہ میرے ساتھ آ ٹھہرے لیکن میری غرض اس سے پوری نہ ہوئی۔ مجھے تمام دن کانفرنس میں حاضری دینا ہوتی شام کو کچھ فرصت میسر آتی گو بعض دفعہ شام کو بھی کسی دعوت یا تقریب میں جانا ہوتا۔ انہیں شام کے وقت اپنے احباب سے ملنا ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جو شام مجھے گھر پر گذارنی ہوتی وہ اکیلے ہی گذرتی۔ اپنی مصروفیت کے لحاظ سے یہ مجھ پر کچھ دو بھر نہ تھا۔ لیکن دو راتیں ایسی آئیں کہ مجھے تیز بخار ہو گیا۔ میں جانتا تھا یہ میرا پرانا رفیق ملیریا ہے۔ اور کونین کے استعمال سے اسکی اصلاح ہو جائے گی اسلئے مجھے چنداں پریشانی نہیں تھی لیکن ایسی حالت میں تنہائی مجھ پر گراں تھی اسلئے میں نے عزیز اسد اللہ خاں سے کہا کوئی ایسا مکان تلاش کریں جہاں اور لوگ بھی رہتے ہوں تاکہ ان کی عدم موجودگی میں مجھے بالکل تنہا نہ رہنا پڑے۔ چند دن بعد ہم ۲۲ ہیتھ فیلڈ گارڈنز میں منتقل ہو گئے

جہاں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ادھر گھنی آبادی نہیں تھی اور فارغ اوقات میں کھلی ہوا میں چلنے پھرنے کے مواقع میسر آجاتے تھے وہاں بجلی کی ریل کا اسٹیشن بالکل قریب تھا اسلئے آمدورفت میں سہولت تھی۔

ہزہائی نس سر آغا خاں کی قیادت مسلم اراکین کانفرنس کے لئے بیشمار فوائد کا موجب ہوئی۔ فجزاہ اللہ۔ آپ کی باوقار اور قابل احترام شخصیت محتاج تعارف نہیں تھی۔ کانفرنس کے تمام حلقوں میں آپ نہایت عزت کی نگہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ارباب حکومت میں شاید ہی کوئی ہو جس کے ساتھ آپ کا ذاتی تعارف نہ ہو۔ انگریزی محاورہ میں سب دروازے بغیر دستک کے آپ کے لئے کھل جاتے تھے۔ ہفتے میں دو تین بار مسلم اراکین آپ کی قیادت میں جمع ہو کر کانفرنس کے پروگرام اور کارروائی کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔ یہ اجتماع اگرچہ غیر رسمی ہوا کرتے تھے لیکن مسلم وفد کی یکجہتی کو قائم رکھنے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں تدابیر سوچنے اور انہیں عمل میں لانے میں نہایت ممد تھے دوسرے اجتماع میں گفتگو شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب نے ایک رجسٹر سامنے رکھ لیا اور فرمایا مجھے اجازت دیجئے کہ بحیثیت سیکرٹری وفد میں پچھلے اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ پڑھ کر سنا دوں، اس پر قائداعظم مسٹر جناح نے ذرا ترش لہجہ میں فرمایا آپ کو سیکرٹری کس نے مقرر کیا تھا۔ ہم کوئی رپورٹ سننا نہیں چاہتے نہ کسی رپورٹ کے مرتب کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔

رسمی افتتاح اور خوش آمدید کی تقریروں کے بعد سب سے پہلا فیصلہ جو پہلی گول میز کانفرنس نے کیا وہ یہ تھا کہ برما کی ہندوستان سے علیحدگی کو اصولاً تسلیم کر لیا گیا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں برہمی نمائندوں نے کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت بند کر دی۔ اور برما کے آئینی مستقبل پر غور کرنے کیلئے ایک برمی گول میز کانفرنس علیحدہ قائم کر دی۔ برما کی ہندوستان سے علیحدگی یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے عمل میں آئی اور ۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو برما کی آزادی کا اعلان ہوا۔ کانفرنس نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ مختلف آئینی مسائل پر غور کرنے کیلئے کمیٹیاں تجویز کی گئیں۔ اسی دن کانفرنس کے دفاتر کے کمروں میں سے ایک میں مسلم وفد کا اجتماع اس غرض سے ہوا کہ ان کمیٹیوں میں مسلم وفد کی طرف سے نمائندگی کیلئے اراکین نامزد کئے جائیں۔ اس اجتماع میں بھی ڈاکٹر شفاعت احمد خانصاحب نے سیکرٹری کے فرائض خود اپنے ذمے لے لئے۔ میری نشست ڈاکٹر صاحب کے بالکل ساتھ تھی۔ جو نام تجویز ہوتا ڈاکٹر صاحب متعلقہ کمیٹی کے عنوان کے نیچے اسے درج فرما لیتے۔ میاں سر محمد شفیع صاحب کی تحریک پر میرا نام تین کمیٹیوں کے لئے تجویز ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہیں درج نہ فرمایا۔ جب نامزدگی کی کارروائی ختم ہو گئی تو میاں سر محمد شفیع صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا جس جس کمیٹی کے لئے جو جو نام تجویز ہوئے ہیں وہ پڑھ کر سنا دیجئے۔ جب میاں صاحب نے دیکھا کہ میرا نام کسی کمیٹی کے لئے درج نہیں کیا گیا تو بڑے جوش سے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا جن تین کمیٹیوں کے لئے ظفر اللہ خاں کا نام تجویز کیا گیا ہے ان کے لئے اس کا نام درج کرو ورنہ ہم تمہارا نام ہر ایک کمیٹی میں سے کاٹ دیں گے! ڈاکٹر صاحب کو چاروناچار تعمیل کرنا پڑی۔ جن کمیٹیوں میں مجھے نامزد کیا گیا ان میں سے دو کے چیرمین لارڈ سینکی تھے

جو لارڈ رونلڈشے کے نام سے بنگال کے گورنر رہ چکے تھے اور ۱۹۳۵ء میں سر سیموئل ہور کے فرسٹ لارڈ آف ایڈمیرلیٹی ہونے پر وزیر ہند مقرر ہوئے۔ تیسری کمیٹی کے چیئرمین مسٹر ہنڈرسن تھے جو اس وقت وزیر خارجہ تھے اور بعد میں COMMISSION DISARMAMENT کے چیئرمین ہوئے۔ برطانوی مدبرین، والیانِ ریاست اور ہندوستان بھر کے آزمودہ کار صاحب تجربہ سیاسی رہنماؤں کے اس اجتماعِ عظیم میں میں ایک نوآموز طفلِ مکتب تھا اور کسی شمار میں نہ تھا۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب نے میرا نام کمیٹیوں کی فہرست میں شامل نہ کرنے میں میری ناتجربہ کاری کا صحیح اندازہ کیا تھا۔ لیکن جہاں پختہ کار صاحب تجربہ اصحاب مفید اور کار آمد تجاویز پیش کر سکتے تھے اور قیمتی مشورے دے سکتے تھے۔ وہاں ایک کودک ناداں کے لئے نئے نئے تجربات حاصل کرنے اپنی حد نگاہ کو وسعت دینے اور اہل دانش کے فہم و ادراک سے فائدہ اٹھانے کے بہت سے مواقع تھے۔ ہز ہائی نس سر آغا خان صاحب مستقبل کے قائد اعظم اور بانیٔ پاکستان مسٹر جناح، مولانا محمد علی صاحب دوسری اور تیسری کانفرنس کے دوران میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب، میاں سر محمد شفیع صاحب، سر سید سلطان احمد صاحب، مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب کی صحبت کا میسر آنا بھی میرے لئے غنیمت اور باعث فخر تھا۔ ان کے علاوہ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال، نواب سر اکبر حیدری صاحب، سر مرزا اسمٰعیل صاحب جیسے حکمرانوں اور مدبروں کے ساتھ اگر تبادلۂ خیال نہیں تو کم سے کم ان کے نتائج فکر سے آگاہی۔ پھر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جے کار جیسے آزمودہ کار قانون اور سیاست کے ماہرین کی کانفرنس میں شمولیت میرے جیسے مبتدی کے لئے ان سے کچھ سیکھنے کے نادر مواقع مہیا کرتے تھے

مسٹر چنتامنی | میری سب سے پہلی حوصلہ افزائی بالکل غیر متوقع طور پر مسٹر چنتامنی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر چنتا منی کا اصل وطن غالباً مدراس تھا۔ لیکن وہ یوپی میں بس گئے تھے۔ وہ نہایت آزمودہ کار اور بڑے بارسوخ صحافی تھے اور سیاست میں بہت آزاد خیال تھے۔ میں نے کانفرنس میں کسی مسئلے پر اظہار خیال کیا۔ انہوں نے کمال شفقت سے مجھے ایک پرزے پر پنسل سے لکھ کر بھیجا۔

IN THIS GATHERING OF REACTIONARIES IT IS SO REFRESHING
TO HEAR SOMEONE SPEAK OUT WITH COURAGE

سر سرینواس ساستری | ایک دو دن بعد اجلاس برخاست ہونے پر میں نیچے اپنے کوٹ ٹوپی کی تلاش میں تھا کہ سر سرینواس ساستری نے نہایت انکسار کے لہجے میں جس سے میں بہت خجل ہوا مجھ سے فرمایا۔

WILL YOU FORGIVE ME IF I WERE TO SAY HOW MUCH I APPRECIATE
YOUR VALUABLE CONTRIBUTIONS TO OUR DISCUSSIONS

مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی عظیم المرتبت شخصیت کا اخلاق بھی کسقدر بلند ہے۔ میں نے سر سرینواس شاستری کا اسم گرامی برسوں سے سنا ہوا تھا۔ اور ہندوستان اور برطانیہ میں کون شخص تھا جو سیاست میں کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہو اور ان کے اسم گرامی

سے واقف نہ ہو۔ وہ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے روح رواں تھے اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممتاز رکن رہے تھے۔ انگریزی زبان پر قدرت تام رکھتے تھے۔ اپنے خیالات کو بڑے سادہ لیکن نہایت موثر الفاظ میں بیان کرنے کے عادی تھے۔ ایک مرتبہ گورنر جنرل کے سوال پر کہ جو بات آپ نے پیش کی ہے اس کی تائید میں کیا دلیل ہے کمال سادگی سے فرمایا۔

BECAUSE MY LORD THIS IS OUR COUNTRY AND WE WISH TO RULE IT

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے پوچھا تم کدھر جا رہے ہو میں نے عرض کیا پکاڈلی کی طرف۔ فرمایا میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ رٹز ہوٹل کے قریب بس ٹھہرتی ہے وہاں سے بس پر سوار ہوں گا۔ اگر اجازت دو تو تمہارے ساتھ چلوں۔ میں نے کہا یہ میرے لئے باعث فخر ہو گا۔ وہ آہستہ چلتے تھے اور بعض دفعہ کمال شفقت سے میرے بازو کا سہارا لے لیتے تھے۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ اجلاس برخاست ہونے پر میں ان کا منتظر رہتا اور ہم رٹز ہوٹل تک اکٹھے جاتے۔ ان کی ہر بات سادہ سنجیدہ اور پر حکمت ہوتی۔ ایک موقعہ پر لبرل پارٹی کی طرف سے کانفرنس کے بعض اراکین کو ایوان پارلیمنٹ میں دعوت دی گئی۔ میں بھی مدعو تھا میزبانوں کی طرف سے مسٹر لائیڈ جارج نے خوش آمدید کی تقریر کی اور مسٹر سستری نے مہمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔ دونوں اصحاب نہایت فصیح البیان تھے اور انگریزی زبان میں قادر الکلام۔ یہ صحبت بہت پر لطف رہی۔

گول میز کانفرنس کے دوران فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق مفاہمت کی کوششیں

کانفرنس کے دوران میں وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسائل کو سلجھانے کی خاطر پنجاب کے نمائندوں کو طلب کیا اور دو تین اجلاسوں میں کوشش کی کہ کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو جائے لیکن کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا اس گفتگو کے دوران میں ہندو نمائندگان نے سکھ نمائندگان کو پیش پیش رکھا جن کے مطالبات اتنے غیر متناسب تھے کہ وزیر اعظم سارا وقت انہی کے ساتھ الجھے رہے اور آخر اپنی کوشش ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سکھ نمائندگان اور ان کے مطالبات کے متعلق انہوں نے فرمایا۔

THESE DELIGHTFUL PEOPLE ARE QUITE WILLING TO BE CONTENT WITH THE MAXIMUM

ہندو نمائندگان میں سے سر چمن لال سیتلواڈ نے کانفرنس کے دوران میں اپنی طرف سے ایک تجویز برائے فرقہ وارانہ سمجھوتے کی تیار کی اور اسے نجی طور پر تمام نمائندگان کو بھیج دیا۔ اس تجویز میں انہوں نے اس اصل پر زور دیا تھا کہ اکثریت کی کوشش ہونی چاہیئے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی ہو اور اس مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اقلیتوں کے جائز مطالبات پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ مثلاً فرقہ وارانہ نمائندگی

کا اصول اگرچہ اکثریت کی نگہ میں ملک اور اکثریت اور اقلیتوں کے لئے یکساں طور پر نقصان دہ ہے پھر بھی چونکہ اقلیتوں کی طرف سے یا ان میں سے بعض کی طرف سے اس پر اصرار ہے اور وہ اسے اپنے حقوق کے تحفظ کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں تو انہیں مطمئن کرنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر اکثریت کو چاہیئے کہ وہ اس پر رضامند ہو جائے۔ ممکن تھا کہ سر جمنی لال سیتلواڈ کی تجویز کی بنا پر کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو سکتی لیکن اکثریت کی طرف سے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ ہوا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

پہلی گول میز کانفرنس میں شروع سے ہی یہ رجحان نمایاں طور پر ظاہر ہوا کہ ہندوستان کا آئینی نظام وفاقی ہونا چاہیئے اور برطانوی اور ریاستی ہند دونوں اس نظام میں منسلک ہونے چاہئیں۔ والیان ریاست کی طرف سے اس نظریئے کی تائید کی گئی جس سے اسے بہت تقویت پہنچی اور وفاقی نظام کا ترتیب دینا کانفرنس کا مقصد قرار پایا۔ چونکہ اس مقصد کے حصول کے لئے والیان ریاست کی رضامندی لازم تھی اور والیان ریاست طبعاً وفاقی نظام کے اندر اپنے حقوق، اختیارات اور خصوصی مراعات کے ہر پہلو سے تحفظ کے خواہشمند تھے اسلئے پہلی کانفرنس میں جو آواز ان کی طرف سے اٹھائی جاتی تھی (اور وہ بظاہر ایک متفقہ اور مضبوط آواز تھی) وہ بہت توجہ سے سنی جاتی تھی اور اسے بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ کانفرنس کے اجلاسوں میں جن دو جملوں کی کثرت سے تکرار ہوتی تھی وہ "YOUR HIGHNESSES" اور "THEIR HIGHNESSES" تھے شام کی دعوتوں میں تو ٹوسٹ ماسٹر بار بار ان الفاظ کے ساتھ مہمانوں کی توجہ کا طالب ہوتا تھا۔

YOUR HIGHNESSES, YOUR GRACES, YOUR EXCELLENCIES, MY LORDS, LADIES AND GENTLEMEN, PRAY SILENCE FOR ....

مولانا محمد علی صاحب کی وفات کا سانحہ | مولانا محمد علی صاحب نے ایک دن اجلاس میں اس تکرار سے اکتا کر فرمایا مسٹر چیئرمین THEIR HIGHNESSES کی طرف سے تو ہم بہت کچھ سن چکے اب OUR LOWNESSES کو بھی کچھ کہنے کا موقعہ ملنا چاہیئے! مولانا صاحب کی صحت لندن تشریف آوری سے پہلے ہی تشویش کا موجب بن رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر تکلیف میں اضافہ ہوتا رہا۔ کرسمس کی تعطیل میں ضعف بڑھنا شروع ہو گیا۔ آخری ایام میں اپنا سیاسی وصیت نامہ لکھوایا اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے ایک حجرے میں مرقد بنا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے اور رحمت کا سلوک فرمائے آمین۔

پریوی کونسل میں پہلا کیس | جنوری کے آخر میں کانفرنس کا اجلاس ملتوی ہوا۔ اجلاس کے دوران میں مجھے پریوی کونسل کے روبرو پیش ہونے کا موقعہ میسر آگیا۔ ضلع گوجرانوالہ کے ایک قریشی زمیندار خاندان کے ایک

لاولد نوجوان مالک اراضی کا انتقال ہوگیا متوفی کی ہمشیرگان اس کی متروکہ اراضی پر قابض ہوگئیں۔ متوفی کے بعیدی یک جدیان نے اس کی وراثت کا دعویٰ اس بنا پر کیا کہ متوفی کا خاندان امور وراثت میں رواج کا پابند ہے اور رواج کی رو سے یک جدیان کا حق وراثت بمقابلہ ہمشیرگان فائق ہے۔ ہمشیرگان کی طرف سے عذر کیا گیا کہ مدعیان متوفی کے یک جدی نہیں اور اگر یک جدی ثابت بھی ہوں تو متوفی کا خاندان رواج کا نہیں بلکہ شرع محمدی کا پابند ہے۔ جس کی رو سے ہمشیرگان کا حق بمقابلہ یک جدیان فائق ہے۔ عدالت ابتدائی (میر عباد اللہ صاحب سنیئر سب جج گوجرانوالہ) نے قرار دیا کہ مدعیان متوفی کے نویں پشت کے یک جدیان ہیں اور متوفی کا خاندان رواج کا پابند ہے اسلئے مدعیان کا حق وراثت بمقابلہ ہمشیرگان فائق ہے۔ اور مدعیان کے حق میں ڈگری دیدی۔ مدعا علیہم نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ اپیل کی سماعت مسٹر جسٹس مار ٹینو اور مسٹر جسٹس ظفر علی نے کی۔ مدعیان کی طرف سے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب وکیل تھے اور میں ان کے ساتھ جونیئر تھا۔ مدعیان نے متوفی کے ساتھ اپنا رشتہ ثابت کرنے کے لئے ایک خاندانی شجرہ نسب پیش کیا تھا جو ان کے خاندان کی ایک قلمی تاریخ مرتبہ شاہ نواز الدین کے ساتھ شامل تھا اور جس سے ان کا متوفی کا یکجدی ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ کچھ زبانی شہادت بھی پیش کی گئی تھی جس میں خاندانی میراثی کی شہادت بھی شامل تھی جہاں ہائی کورٹ نے شجرہ نسب تو اس بنا پر رد کر دیا کہ اس میں بعض اندراجات کی تحریر اس تحریر سے مختلف ہے جو شاہ نواز الدین کی بیان کی جاتی ہے۔ اور بعض اندراجات پیدائش و اموات ایسے لوگوں کے ہیں جو شاہ نواز الدین کی موت کے بعد پیدا ہوئے یا فوت ہوئے اور جن کی پیدائش یا وفات کا علم شاہ نواز الدین کو نہیں ہو سکتا تھا۔ زبانی شہادت اس بنا پر رد کردی کہ نویں پشت تک کی رشتہ داری کا علم صرف سماعی ہو سکتا ہے جو قابل پذیرائی نہیں۔ اس تجویز کے مطابق قرار دیا گیا کہ مدعیان کا رشتہ متوفی کے ساتھ ثابت نہیں۔ اور ہمشیرگان متوفی کے خلاف جو اراضی متنازعہ پر قابض ہیں مدعیان کا دعویٰ نہیں چل سکتا مدعا علیہم کی اپیل منظور ہو کر دعویٰ مدعیان خارج ہوا۔ مدعیان نے پریوی کونسل میں اپیل بھجوانے کے لئے مجھے وکیل کیا۔ مقدمہ کی مالیت کے لحاظ سے مدعیان استحقاقاً پریوی کونسل میں اپیل دائر کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہائی کورٹ سے سرٹیفکیٹ مل گیا اور میں نے لندن کے ڈگلس گرانٹ اینڈ ڈولڈ سولسٹروں کو اپیل کے کاغذات بھجوا دیئے۔ جب میں پہلی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن ٹھہرا ہوا تھا تو ایک روز مسٹر ڈولڈ نے ٹیلیفون پر مجھے کہا کہ اس اپیل کی سماعت آئندہ ہفتے میں ہونے والی ہے۔ اگر تم وقت نکال سکو تو میں تمہارا نام بطور جونیئر درج کر دیتا ہوں۔ اس حیثیت میں تمہیں پریوی کونسل میں حاضری کا موقعہ مل جائیگا جو تمہارے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔ دوسرے ہفتے کے شروع میں انہوں نے مجھے بتایا کہ اپیل کی سماعت کل ہوگی۔ مناسب ہوگا اگر تم اجلاس شروع ہونے سے نصف گھنٹہ پہلے پہنچ جاؤ تاکہ سنیئر وکیل تمہارے ساتھ مشورہ کر سکے اور تمہاری رائے سے فائدہ اٹھا سکے۔ مشورے کے دوران میں اس بات پر بھی غور ہوا کہ اگر پریوی کونسل نے ہمارے پیش کردہ شجرہ نسب کو

تسلیم کر لیا تو کیا دوسرے سوال پر بھی بحث کی نوبت آئے گی کہ فریقین رواج کے پابند ہیں یا شرع محمدی کے۔ سینئر وکیل اور سر ولسٹر دونوں کی رائے تھی کہ یہ نوبت نہیں آئے گی۔ ہائی کورٹ نے اس سوال کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس لئے اگر پریوی کونسل نے مدعیان کو متوفی کا یکجدی قرار دیا تو لازماً معاملہ ہائی کورٹ میں واپس جائے گا کہ وہ اس قانونی سوال کے متعلق فیصلہ کریں۔ پریوی کونسل کے اجلاس ڈاؤننگ اسٹریٹ میں واقع ایک عمارت میں ہوتے تھے جس کے متعلق باہر سے دیکھنے والا ہرگز یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس عمارت کے اندر مملکت برطانیہ کے بیرونی علاقوں کی سب سے بڑی عدالت بحث سماعت کرتی اور فیصلے صادر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے اجلاسوں میں بڑے عالی مرتبت جج شامل ہوتے اور وہ ایک عدالت کی حیثیت سے وکلاء کی بحث سماعت کر کے فیصلہ صادر کرتے۔ لیکن جوڈیشل کمیٹی جیسے اس کے نام سے ظاہر ہے پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تھی جو لفظاً فیصلہ صادر نہیں کرتی تھی بلکہ فرمانروا کی خدمت میں مشورہ پیش کرتی تھی جو فیصلہ نہیں کہلاتا بلکہ رپورٹ کہلاتا ہے۔ یہ رپورٹ پریوی کونسل کے ایک باقاعدہ رسمی اجلاس میں پیش ہوتی جس میں فرمانروا بذات خود موجود ہوتا اور وہاں سے آرڈر ان کونسل جاری ہوتا جس میں ہائی کورٹ متعلقہ کو ہدایت دیجاتی کہ جوڈیشل کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق عمل کیا جائے۔ چونکہ جوڈیشل کمیٹی فرمانروا کی کونسل کی ایک کمیٹی تھی اسلئے جو جج اسکی عدالت میں شریک ہوتے وہ اجلاس میں اپنے روزمرہ کے عام لباس میں بیٹھتے۔ ان کے اور وکلاء کے درمیان صرف ایک چوڑی میز ہوتی۔ وکلاء اپنا مخصوص لباس اور وگ گون وغیرہ پہنے ہوتے۔ جوڈیشل کمیٹی کی رپورٹ چونکہ مشورہ ہوتی اسلئے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اجلاس میں جو جج شامل تھے وہ متفق الرائے تھے یا ان کے درمیان اختلاف رائے تھا۔ مشورے میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔ پس پردہ اگر کوئی اختلاف ہو بھی تو وہ رپورٹ میں ظاہر نہیں ہوتا۔ جوڈیشل کمیٹی ایک ہی وقت میں دو یا تین الگ الگ اجلاسوں میں بھی مقدمات کی سماعت کرتی۔ یہ اجلاس بورڈ کہلاتے۔

جس بورڈ نے اس اپیل کی سماعت کی اس میں لارڈ بلینز برگ، لارڈ میکملن، سر جارج لاؤنڈز اور سر لانسیلاٹ سانڈرسن شامل تھے۔ سر جارج لاؤنڈز بمبئی ہائی کورٹ میں پریکٹس کر چکے تھے اور پریوی کونسل میں بھی پریکٹس کرتے رہے تھے سر لانسیلاٹ سانڈرسن کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ بحث شروع ہوئی سینئر وکیل نے واقعات مختصراً بیان کرنے کے بعد شجرہ نسب کی طرف توجہ دلائی۔ اور شہادت پڑھ کر سنانا شروع کی۔ ججوں نے طبع شدہ شجرہ نسب سامنے رکھا ہوا تھا۔ زبانی شہادت اور شجرہ نسب کے اندراجات میں تطابق نہ پا کر کہنا شروع کیا کہ زبانی شہادت سے تو شجرہ نسب کی تائید نہیں ہوتی۔ سینئر وکیل کچھ وضاحت کی کوشش کرتے لیکن ججوں کا اطمینان نہ ہوتا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ججوں کو کیا مشکل پیش آ رہی ہے اور اس کا کیا حل ہے۔ سینئر وکیل پریشان ہو رہے تھے اگر میں انہیں کچھ لکھ کر دیتا بھی تو پریشانی میں وہ میرا مطلب سمجھ پاتے اور جو مشکل جج صاحبان کو حیران کر رہی تھی اس کا حل ان کے بس کی

بات بھی نہیں تھی۔ ججوں نے سر ہلا کر کہنا شروع کیا کہ یہ بات تو ہنی نظر نہیں آتی۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ بات تو آسان ہے لیکن اسے واضح کیسے کیا جائے۔ میں نے ایک آدھ بار چند لفظ لکھ کر سنیئر وکیل کو دیئے بھی لیکن وہ تو جو نہ دے سکے مسٹر ڈولڈ بھی قریب ہی بیٹھے تھے میں نے انہیں بھی کچھ لکھ کر دیا۔ اتنے میں ججوں نے اپنی نوٹ بکیں بند کرنا شروع کیں۔ حسنِ اتفاق سے لارڈ ڈلینیز برگ نے میری طرف دیکھا اور میرے چہرے سے میری گھبراہٹ کا اندازہ کر کے فرمایا۔ شاید تم ہماری کچھ مدد کر سکو۔ میں نے گذارش کی اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کروں۔ فرمایا ضرور ضرور اور مجھے اشارہ کیا کہ تم بحث کرو۔ میں نے عرض کیا جناب عالی پیشتر اس کے کہ میں شجرہ نسب اور زبانی شہادت میں تطابق کی کوشش کروں چند تمہیدی الفاظ گذارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جو مشکل آپ محسوس کر رہے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس مقدمے میں گواہان کے بیانات پنجابی زبان میں ہوئے اور اردو زبان میں لکھے گئے ان کا انگریزی میں ترجمہ ہوا جو لندن میں آپکو سنایا جا رہا ہے اور آپ اسے ترجمہ نہ سمجھتے ہوئے اصل سمجھ کر اسکی تعبیر اس طور پر کرتے ہیں گویا وہ الفاظ ایک انگریز نے لندن میں بیان دیتے ہوئے کہے ہیں۔ ان الفاظ کو جب آپ شجرہ نسب کے اندراجات پر چسپاں کرتے ہیں تو ان میں تطابق نہ پا کر پریشان ہوتے ہیں۔ اور اس نتیجے کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ یا شجرہ نسب فرضی ہے یا شہادت جھوٹی ہے۔ مثلاً گواہ کا بیان ہے کہ شخص الف شخص ب کا بھائی تھا آپ شجرہ نسب میں الف اور ب کو تلاش کرتے ہیں۔ الف کا نام شجرہ نسب کے دائیں کنارے پر درج ہے اور ب کا نام اس سے کہیں ہٹ کر بائیں جانب درج ہے۔ الف کا باپ ج درج ہے۔ اور ب کا باپ د لکھا ہوا ہے۔ آپ سوچتے ہیں یہ دونوں بھائی کیسے ہوئے ان کے تو باپ مختلف ہیں بلکہ ان کے تو باپ بھی آپس میں بھائی نہیں یہ تو دور کے COUSINS ہیں اور ایسا تفاوت صرف ایک جگہ نہیں کہ اسے اتفاقیہ غلطی سمجھ لیا جائے یہ تفاوت بار بار سامنے آتا ہے۔ میری گذارش ہے کہ یہ تفاوت محض ظاہری ہے اور انگریزی اور پنجابی زبانوں کا تفاوت ہے شہادت اور شجرہ نسب کا تفاوت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو اوّل تو عدالت ابتدائی ہی جس کے روبرو شہادت دی گئی تھی شجرہ نسب کو اس وجہ سے رد کر دیتی۔ ورنہ ہائی کورٹ اپنے فیصلے کی تائید میں اس کا ذکر کرتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ تو پھر اس معمے کا حل کیا ہے؟ انگریزی زبان میں بھائی سے مراد ہوتی ہے ایک ماں باپ کے بیٹے۔ پنجابی زبان میں ایک ماں باپ کے بیٹوں کو بھی بھائی کہتے ہیں دو بھائیوں کے بیٹوں کو بھی بھائی کہتے ہیں۔ دو چچا زاد بھائیوں کو بھی بھائی کہتے ہیں۔ اور سب ایسے بھائیوں کے بیٹے بھی ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں۔ پنجابی میں COUSIN کا مترادف کوئی ایک لفظ ہے ہی نہیں۔ اگر وضاحت کی ضرورت پڑ ہی جائے تو چچا زاد بھائی، خالہ زاد بھائی، پھوپھی زاد بھائی، ماموں زاد بھائی کہہ لیا جائے گا۔ لیکن کہلائے گا وہ بھائی ہی۔ یہ تو ہر زبان کا اپنا اپنا اسلوب ہے۔ مثلاً انگریزی میں BROTHER-IN-LAW کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بیوی کا بھائی

بہن کا خاوند، بیوی کی بہن کا خاوند، پنجابی زبان میں ان سب رشتوں کے لئے الگ الگ لفظ ہیں یہی حال UNCLE اور AUNT کا ہے، باپ کا بھائی، ماں کا بھائی، پھوپھی کا خاوند، خالہ کا خاوند انگریزی زبان میں سب UNCLE ہیں۔ پنجابی اور اردو زبان میں علی الترتیب۔ چچا، ماموں، پھوپھا اور خالو ہیں۔ اسی طرح AUNT پھوپھی، خالہ، چچی اور ممانی ہیں۔ بھائی کے لفظ کے اطلاق کے متعلق اصول یہ ہے کہ جو شخص مورث مشترک کی نرینہ اولاد کے سلسلے میں اسی پشت میں ہے جس میں ہوں وہ میرا بھائی ہے۔ جو مجھ سے ایک پشت اوپر ہے وہ چچا ہے کیونکہ میرے والد کا بھائی ہے۔ جو مجھ سے ایک پشت نیچے ہے وہ میرا بھتیجہ ہے کیونکہ میرے بیٹوں کا بھائی ہے۔ اب آپ مجھے اجازت دیں تو میں شہادت آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ آپ شجرہ نسب سامنے رکھ کر دیکھتے جائیں کہ شہادت اور شجرہ نسب میں تطابق ہے یا نہیں۔ جیسے جیسے میں شہادت پڑھتا گیا ہر فقرے کا شجرہ نسب کے ساتھ تطابق پا کر جج صاحبان بہت محظوظ ہوتے گئے۔ سر جارج لاؤنڈز اور سر لانسیلانٹ سانڈرسن نے تو میری تائید بھائی کے مفہوم کے متعلق بھی کر دی تھی اب لارڈ بلینز برگ نے بھی کہنا شروع کیا :۔

OH, HOW FASCINATING ! HOW INTERESTING ! OH PREY GO ON

جس سے مجھے بہت حوصلہ ہوا۔ بحث جاری رکھتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ فاضل چیف کورٹ نے شجرہ نسب کو اسی بنا پر رد کیا ہے کہ اس میں چند اندراجات کی تحریر اس تحریر سے مختلف ہے جو شاہ نواز الدین کی تحریر بیان کی جاتی ہے۔ نیز اس میں ایسے لوگوں کی پیدائش اور وفات کے اندراجات ہیں جو شاہ نواز الدین کی وفات کے بعد پیدا ہوئے یا فوت ہوئے۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ لیکن چیف کورٹ نے ان سے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ جو اندراجات شاہ نواز الدین کی قلم کے نہیں ہیں وہ وہی ہیں جن کے درج کرنے کا موقعہ شاہ نواز الدین کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ اس بات سے تو شجرہ نسب کے صحیح ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر یہ اندراجات بھی اسی قلم سے ہوتے جس قلم سے باقی اندراجات ہیں تو یہ یقینی ثبوت اسبات کا ہوتا کہ شجرہ نسب شاہ نواز الدین کا تیار کردہ نہیں۔ جو لوگ شاہ نواز الدین کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ان کی پیدائش کے اندراجات شاہ نواز الدین کے قلم سے نہیں ہو سکتے تھے وہ کسی اور کے قلم سے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے شاہ نواز الدین کی وفات کے بعد خاندان کے کسی دیگر فرد یا افراد نے وقتاً فوقتاً پیدائشوں اور اموات کے اندراجات شجرہ نسب میں درج کئے ہیں :۔ تاکہ شجرہ نسب کی تکمیل ہوتی رہے۔

لارڈ میکملن ۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ خاندانی بائیبل میں وقتاً فوقتاً ایسے اندراجات کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ خاندانی شجرہ نسب مکمل رہے۔

ظفر اللہ خاں ۔ جناب عالی زبانی شہادت بیشک بہت حد تک سماعی ہے لیکن ایک دو پشتوں کے بعد سماعی

شہادت ہی میسر آسکتی ہے۔ یہ شہادت پشت در پشت زبانی روایت کے ذریعے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ زبانی شہادت شجرہ نسب کی تصدیق کرتی ہے۔ اور شجرہ نسب زبانی شہادت کی تصدیق کرتا ہے۔ میراثی کی شہادت بھی متعلق اور قابل پذیرائی ہے۔ میراثی اگرچہ خاندان کا فرد نہیں لیکن خاندان کا شجرہ یاد رکھنا اس کا فرض منصبی ہے۔ میراثی نام ہی خاندان کے سلسلہ وراثت کو محفوظ رکھنے والے کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا نسلاً بعد نسلاً یہی کام ہوتا ہے اور وہ خاندان میں ہر شادی کے موقعہ پر یہ شجرہ نسب بلند آواز سے بیان کرتے ہیں۔ اس بیان کو "کلان کرنا" کہا جاتا ہے۔

لارڈ بلینز برگ۔ کیا ان کے پاس شجرہ نسب لکھا ہوا ہوتا ہے؟

ظفر اللہ خاں۔ نہیں جناب عالی یہ لوگ تو عموماً لکھ پڑھ نہیں سکتے لیکن یہ ان کا پیشہ ہے۔ ان کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور یہ بچپن ہی میں ہر اپنے موکل خاندان کا شجرہ نسب حفظ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

لارڈ بلینز برگ کے دلچسپی کے اظہار پر میں نے "کلان کرنے" کا طریق بیان کیا اور اپنے خاندان سے اس کی مثال دی

لارڈ بلینز برگ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کے بعد فرمایا۔ شجرہ نسب کے متعلق ہمارا اطمینان ہے کہ مدعیان متوفی کے یک جدیان ہیں اور سینئر وکیل صاحب کو ارشاد فرمایا کہ قانونی مسئلے کے متعلق بحث کریں۔ انہوں نے گذارش کی کہ ہائی کورٹ نے قانونی مسئلے پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بہتر ہو اگر اس مسئلے کے فیصلے کے لئے مقدمہ ہائی کورٹ میں واپس بھیج دیا جائے۔

لارڈ بلینز برگ۔ اس مقدمے کو دائر ہوئے دس سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور قانونی مسئلے کا طے کرنا ہمارے لئے ویسے ہی آسان ہے جیسے ہائی کورٹ کے لئے۔ اگر آپ پسند کریں تو اپنے جونیئر کو قانونی مسئلے پر بحث کرنے کی بھی اجازت دیدیں۔

قانونی مسئلے پر بحث کیلئے سینئر وکیل تیار تھے نہ میں تیار تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اگر شجرہ نسب پر بورڈ کا اطمینان ہو گیا تو مقدمہ ہائی کورٹ میں واپس ہو گا۔ اور در اصل میں نے تو کوئی تیاری کی نہیں تھی۔ میں تو محض پریوی کونسل کا اجلاس دیکھنے گیا تھا۔ جب لارڈ بلینز برگ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ قانونی مسئلے پر بھی میں بحث کروں تو سینئر وکیل صاحب نے فوراً رضامندی دیدی اور میرے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔ میں نے عرض کیا جناب عالی پنجاب لاز ایکٹ کی دفعہ ۵ کی رو سے صوبہ پنجاب میں وراثت اور بعض دیگر معاملات کے متعلق تنازعات کا فیصلہ رواج کے مطابق ہونا چاہئے۔ اگر کوئی رواج ثابت نہ ہو اور فریقین مسلمان ہوں تو شرع محمدی کا اطلاق ہوگا۔ اور فریقین ہندو ہوں تو دھرم شاستر کا

فریقین مقدمہ قریشی ہیں لیکن ان کی رہائش دیہات میں ہے اور وہ عرصہ سے مالکان اراضی چلے آتے ہیں اور ان کا گذارہ بھی کاشت اراضی پر ہے۔ تین پشت سے وراثت بروئے کاغذات مال مطابق رواج تقسیم ہوتی چلی آئی ہے۔ جس کا پختہ ثبوت یہ ہے کہ کسی پشت میں بیٹوں کی موجودگی میں بیٹیوں کو حصہ نہیں ملا۔ اگر شرع محمدی کا اطلاق ہوتا تو بیٹیاں

بھی وارث ہوتیں اور انہیں بھی حصہ ملتا۔ متوفی کے والد کی وفات پر متوفی اپنے باپ کی جملہ جائداد کا وارث ہوا۔ مدعا علیہم کو بیٹیاں ہوتے ہوئے کوئی حصہ نہیں ملا۔ کاغذاتِ مال برطانوی عملداری سے پہلے کے دستیاب نہیں ہو سکتے لیکن قیاس یہی ہے اور قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عملداری سے پہلے بھی بیٹیوں کو وراثت میں کبھی حصہ نہیں ملا۔ تمام دیہہ میں کوئی عورت مالک نہیں۔ جسقدر شہادت مسل پر موجود ہے سب رواج کی پابندی کی تائید میں ہے۔ رواج کے خلاف یا شرع محمدی کے اطلاق کی تائید میں کوئی ایک مثال بھی نہیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جانا چاہیئے کہ فریقین رواج کے پابند ہیں۔ عدالت ابتدائی کے فیصلے میں دو نظائر درج ہیں جن میں قرار دیا گیا ہے کہ رواج کے مطابق بکجدیوں کے مقابلہ پر خواہ کتنے بعیدی ہوں ہمشیرگان کا حق وراثت فائق نہیں۔ سوائے اس کے کہ کسی خاندان یا قبیلے میں خاص رواج ان کے حق میں ثابت ہو۔ اس مقدمے میں نہ خاص رواج پر انحصار کیا گیا ہے نہ اس کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ بدیں وجوہ گذارش ہے کہ اپیل منظور ہو کر عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال ہونا چاہیئے۔

کوئی دو ہفتے بعد مسٹر ڈولڈ نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا پریوی کونسل کے دفتر سے فیصلہ جات کی جو اطلاع آئی ہے اس میں درج ہے کہ ہماری اپیل منظور ہوئی لیکن یہ وضاحت نہیں کہ پہلے سوال پر ہائی کورٹ کا فیصلہ منسوخ ہو کر مقدمہ ہائی کورٹ کو واپس ہوا یا دونوں سوالوں کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو کر عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال ہوا۔ میں کل پریوی کونسل کے دفتر میں جا کر معلوم کروں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔

اسی شام مہاراجہ دربھنگہ کی طرف سے جو صوبہ بہار کے بڑے زمیندار تھے اور گول میز کانفرنس کے رکن تھے اپنے اکسیویں جنم دن کی تقریب پر بڑے پیمانے پر سیوائے ہوٹل میں ڈنر دیا گیا جس میں گول میز کانفرنس کے اراکین کے علاوہ بہت سے اور معزز مہمان بھی مدعو تھے۔ ان میں لارڈ ڈبلنبرک بھی تھے۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور پہچان کر بڑے تپاک سے کہا۔ "تم وہی نوجوان ہو جس نے کچھ دن پہلے پریوی کونسل میں ہماری لاعلمی کو علم کی روشنی میں بدل دیا تھا۔ تمہیں معلوم ہوا کہ ہم نے کیا فیصلہ صادر کیا ہے؟" میں نے جو کچھ مسٹر ڈولڈ سے معلوم ہوا تھا گذارش کیا۔ فرمایا "نہیں ہم نے کیس واپس نہیں کیا ہم نے اپیل منظور کر کے ہائی کورٹ کا فیصلہ منسوخ کیا ہے اور عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال کیا ہے اور تمام عدالتوں کا خرچہ مدعیان کو دلایا ہے۔ ہم نے وہ سب کچھ کیا ہے جو تم نے کہا۔ کسی بات میں ہم نے تمہاری استدعا رد نہیں کی۔" پھر شفقت سے میرا بازو پکڑ لیا اور کہا "آؤ میں تمہارا تعارف لارڈ ڈشا سے کراؤں جنہیں ہم پریوی کونسل میں اپنا گرو مانتے ہیں۔" ان کے سامنے بھی میرے متعلق تعریفی کلمات کہے اور فرمایا "اگر تم بدھ کی صبح کو میرے ساتھ ناشتہ کرو تو میرے لئے بڑی خوشی کا باعث ہوگا۔ بدھ کے دن پریوی کونسل کا اجلاس نہیں ہوتا اور ہم فراغت سے گفتگو کر سکیں گے۔" اسی موقعہ پر لارڈ میکملن سے بھی میری ملاقات ہوئی انہوں نے بھی کوئی تعریفی جملہ کہا۔ میں نے ایک رائے کا جواب دیا تو انہوں نے اس رنگ میں کہ گویا میں نے ان کی رائے سے اختلاف کرنے میں بے جا جرأت کی ہے فرمایا۔

NONSENSE! WE KNOW A GOOD THING WHEN WE SEE ONE

ان عالی مرتبہ شرفاء کا خلق کسقدر بلند اور ان کی فیاضی کا سمندر کسقدر وسیع تھا مجھ ایسے نو آموز کے متعلق اتنی ذرہ نوازی! میرا دل اللہ تعالیٰ کے شکر اور حمد سے بھر گیا اور میری ناچیز ہستی کا ہر ذرہ اس کی درگاہ عالی کی دہلیز پر یہ کہتے ہوئے سجدے میں گر گیا۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ کانفرنس میں برطانوی نوابوں، وزرا اور سیاستدانوں، ہندوستانی والیان ریاست اور سیاسی راہنماؤں کے درمیان ایک مبتدی۔ مملکتِ علمی کے اس نقار خانے میں ایک طوطی کی حیثیت بھی نہ رکھنے والا۔ مبصروں اور آزمودہ کار رہنماؤں کے درمیان نو آموز! تونے محض اپنے لطف و کرم سے مجھے توفیق بخشی کہ میں بھی کوئی کام کی بات کہہ سکوں۔ پریوی کونسل میں میں ایک نووارد تونے مجھے محض اپنے فضل و رحم سے اس معمّے کی چابی سمجھا دی جو ججوں کے ذہن کو پریشان کر رہا تھا اور ان کے دلوں کو میری طرف مائل کر دیا سبحان اللہ روحی وجنانی۔

پہلی گول میز کانفرنس کا آخری اجلاس | کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیر اعظم میکڈانلڈ خود صدارت فرما رہے تھے۔ حاضری سو فیصدی تھی۔ ہال کے وسطی حصہ میں بہت بڑے بڑے کیمرے رکھے تھے ان کیمروں کے لئے خاص روشنی کا انتظام تھا۔ حبس کی وجہ سے ہال میں حبس ہو رہا تھا اور خاصی گرمی محسوس ہو رہی تھی صرف چند نمائندوں کیلئے چند جملے کہنے کا موقعہ تھا۔ مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں اس اجتماعِ عظیم میں لب کشائی کروں اگر ایسی خواہش ہوتی بھی تو کوئی توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وزیر اعظم صاحب جن کی نگاہ میں میری کوئی شخصی حیثیت نہیں تھی اور جو یقیناً میرا نام بھی نہیں جانتے تھے مجھے بولنے کا موقعہ عنایت کریں۔ لیکن میرے دل میں ایک خلش تھی کانفرنس کے دوران میں کمیٹیوں کے اجلاسوں میں طبعاً مسلم نمائندگان تحفظ حقوق کی خاطر اپنے مطالبات پر زور دیتے رہے تھے ان کا موقف یہ رہا کہ ہم آزادی اور مساوات کی طرف جلد جلد قدم اٹھانا چاہتے ہیں لیکن یہ آزادی صرف بیرونی اقتدار سے آزادی تک محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ بلکہ اندرون ملک بھی جائز آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ اور یہ مساوات صرف بیرونی اور بین الاقوامی ہی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ملک کے تمام طبقوں کے درمیان مساوات ہونی چاہیئے۔ اور یہ صورتِ حالات عملاً قائم کرنے اور مضبوط کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اقلیتوں کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور ثقافتی حقوق اور اقتدار کی آئینی حفاظت کا سامان کیا جائے۔ لیکن ہمارے موقف کو بعض برطانوی اور ہندوستانی عناصر کی طرف سے لگاتار یہ پیش کیا جاتا تھا اور یہ تاثر پریس کے ذریعے اور دیگر ذرائع سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ مسلمان آزادی کے رستے میں روک بن رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس آخری اجلاس میں ہمارے موقف کی وضاحت میں ایک دو فقرے کہہ دیئے جائیں جو اس تاثر کو زائل کرنے میں ممد ہوں۔ میں انتظار میں رہا لیکن میری یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہ آئی آخر میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا کہ شاید وزیر اعظم کی نظر انتخاب مجھ پر بھی پڑے۔ حسنِ اتفاق سے مسٹر ہینڈرسن (جن کی صدارت میں میں کام کر چکا تھا اور جو وزیر اعظم کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے) کی نظر مجھ پر پڑی

اور انہوں نے وزیر اعظم کے کان میں کچھ کہا جس پر وزیر اعظم نے مجھے بولنے کی اجازت عنایت فرمائی۔ میں نے گذارش کی کہ مسلم نمائندگان یہاں وطن کی آئینی ترقی کے بسرعت ظہور میں آنے کے شدت سے متمنی اور خواہاں ہیں وہاں ان کی یہ بھی آرزو ہے کہ ہندوستان کا جو آئینی قصر تیار ہو اس کی وضع اور نقش و نگار کی رنگینیاں اور بوقلمونیاں ایک ہی ثقافتی رنگ لئے ہوئے نہ ہوں۔ بلکہ ہندوستان کی متعدد ثقافتوں کی جھلکیاں ان میں نمایاں ہوں اور ان کے حسن کو دوبالا سہ بالا کرنے میں ممد ہوں۔ ساتھ ہی ان کی یہ بھی تمنا ہے کہ اس قصر کے تعمیر کرنے میں اور ملک کے تمام تعمیری منصوبوں میں تعاون، خدمت اور قربانی کے مناسب مواقع انہیں بھی میسر آتے رہیں۔ اور وہ اس فخر سے محروم نہ ہوں۔ یہ ایک ایسی جائز خواہش ہے کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

لارڈ بلینز برگ | مقررہ وقت پر میں لارڈ بلینز برگ کے مکان پر حاضر ہوا۔ بہت تواضع اور شفقت سے پیش آئے ان کا خاندانی نام YOUNGER تھا۔ فرمایا ہم چھ بھائی تھے میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میرے بھائی جیمز زندہ ہیں جو مجھ سے چھ سال بڑے ہیں سکاٹ لینڈ میں رہتے ہیں۔ لارڈ بلینز برگ کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ مجھے اپنی والدہ بہت عزیز ہیں۔ اور یہ قدر مشترک ہمارے درمیان ہمدردی اور دوستی کے گہرے پیوند کا موجب ہو گئی۔ انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ مجھے چند سال بعد انہی کی زبانی معلوم ہوئی۔ انہیں جوانی کے آغاز میں ایک شریف زادی سے محبت ہو گئی۔ تمام حالات موافق تھے لیکن ان دنوں انہیں ایک عارضہ لاحق ہو گیا ان کی جلد پر مچھلی کے چانوں کی طرح چانے بن جاتے تھے اور کچھ عرصہ بعد گر جاتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر نارمن واکر سے جو یونیورسٹی میں ان کے ہم جماعت رہے تھے مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں انہیں شادی کرنی چاہیئے یا نہیں۔ نارمن نے کہا رابرٹ مجھے کچھ وقت دو میں اس عارضے کے متعلق کچھ کتب بینی کر لوں اور دو ایک رفقاء کے ساتھ تبادلہ خیال کر لوں۔ چند دن کے بعد اس نے کہا۔ میری پختہ رائے ہے کہ یہ عارضہ لاعلاج ہے اور تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیئے اسلئے انہوں نے شادی کا خیال ترک کر دیا۔ میں نے دریافت کیا آپکو بعد میں کبھی اس فیصلے پر تاسف ہوا۔ فرمایا ظفر اللہ کئی بار تاسف ہوا اور بہت تاسف ہوا۔ لیکن پھر میری طبیعت شادی کرنے پر کبھی مائل نہیں ہوئی۔ وہ مفروضہ طور پر لاعلاج عارضہ قابل علاج بھی ہو گیا اور ان کی اس سے رہائی بھی ہو گئی لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مجھے سولہ سال ان سے گہرے دوستانہ مراسم کی سعادت حاصل رہی اور بہت سا وقت ان کی صحبت میں گذارنے کا موقعہ ملتا رہا میں نے انہیں کبھی افسردہ نہ پایا وہ سنجیدہ طبع تھے لیکن بشاشت ان کا خاصہ تھی۔ وہ پہلے بیرسٹر ہوئے پھر K.C. پھر چانسری کے جج ہوئے پھر لارڈ جسٹس بنگر ہوئے آخر لارڈ آف اپیل ہونے پر لارڈ بلینز برگ نام اختیار کیا۔ اس ناشتے کی صحبت میں ہی فرمایا

میں چاہتا ہوں تم میرے ہاں ڈنر پر آؤ اور میں چند احباب کو تمہاری ملاقات کے لئے بلاؤں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرے لئے فخر کا موجب ہوگا کچھ دن بعد میں بموجب ارشاد شام کے کھانے پر حاضر ہوا۔ راجہ نریندر ناتھ صاحب سردار اجل سنگھ صاحب اور سردارنی صاحبہ بھی مہمان تھے۔ یورپین مہمانوں میں ڈچس آف رچمنڈ اینڈ گارڈن اور لارڈ چیمسفورڈ سابق وائسرائے ہند بھی تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب مہمان گول کمرے میں جانے لگے تو لارڈ بلنیز برگ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اپنے بازو کے نیچے سے گذار لیا سردار اجل سنگھ قریب ہی تھے انہوں نے کچھ تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ لارڈ بلنیز برگ نے اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپک کر فرمایا۔ A GREAT GREAT ADVOCATE سردار صاحب نے مسکرا کر فرمایا میں انہیں جانتا ہوں، ہم دونوں پنجاب کونسل کے رکن ہیں۔ لارڈ بلنیز برگ نے بیساختہ کہا۔ OH! WHAT AN HONOUR پھر یہ سمجھ کر کہ سردار صاحب کو شائد یہ بات ناگوار ہو فوراً کہا۔ I MEAN FOR BOTH OF YOU BOTH OF YOU کسقدر کریمانہ الطاف تھا۔ اور کتنا دوسروں کے احساس کا پاس تھا

فنڈلیٹر سٹوورٹ | کانفرنس کے اجلاس کے دوسرے یا تیسرے ہفتے میں انڈیا آفس کی طرف سے مندوبین کے اعزاز میں بڑے پیمانے پر ایک استقبالیہ دیا گیا۔ میں وہاں درمیان انجمن تنہا ستم کی کیفیت میں تھا۔ ایک صاحب میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا میں تم سے لاہور میں مل چکا ہوں میرا نام فنڈلیٹر سٹوورٹ ہے۔ میں سائمن کمشن کا سیکرٹری تھا۔ میں نے کہا مجھے آپ سے دوبارہ مل کر مسرت ہوئی۔ اب آپ کی تعیناتی کس کام پر ہے انہوں نے مسکرا کر اور کچھ حجاب کے ساتھ کہا اب مجھے انڈیا آفس کا رئیس بنا دیا گیا ہے۔ ایک دو رسمی باتوں کے بعد ہم جدا ہو گئے دو ایک بار بعد میں بھی رسمی مزاج پرسی ہوئی۔ صالح اکبر حیدری انڈین سول سروس (فرزند اکبر سر اکبر حیدری مدار المہام ریاست حیدرآباد) حیدرآباد وفد کے سیکرٹری تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ فنڈلیٹر سٹوورٹ کہتے ہیں میں نے دو تین بار ظفر اللہ خاں کے ساتھ بات چیت کی کوشش کی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے کہا دو ایک بار ان سے صاحب سلامت تو ہوئی ہے۔ وہ مستقل نائب وزیر ہند ہیں اسلئے میں نے حجاب کی وجہ سے از خود ان کے ساتھ زیادہ گفتگو نہیں کی مجھے افسوس ہے انہیں روکھے پن کا احساس ہوا۔ یہ میری طبیعت کا نقص ہے جسکی اصلاح کرنے میں میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا اور اس وجہ سے دوستوں کو اکثر میرے متعلق شکایت کا موقع ملتا رہتا ہے۔ حیدری صاحب نے کہا میں نے سر فنڈلیٹر سے کہہ دیا تھا کہ تمہاری طبیعت میں بہت حجاب ہے جس سے شروع میں ملنے والے کو سرد مہری یا روکھے پن کا گمان ہوتا ہے۔ سر فنڈلیٹر خود بہت قابل قدر شخصیت ہیں اور میرے والد چاہتے ہیں کہ تمہارے متعلق ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ اس کی انہوں نے یہ صورت تجویز کی ہے کہ تمہیں اور سر فنڈلیٹر کو ایک شام کھانے پر بلائیں۔ تم دونوں کے علاوہ صرف میری والدہ میری بیوی، سر فنڈلیٹر کی بڑی صاحبزادی اور میں موجود ہوں گے تاکہ بلا تکلف بات چیت ہو سکے۔ چنانچہ ہائڈ پارک ہوٹل میں جہاں سر اکبر حیدری صاحب کا قیام تھا یہ اجتماع ہوا اور شام بہت لطف میں گذری۔ سر فنڈلیٹر سٹوورٹ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے

اور پھر یہ تعلقات مرورِ زمانہ کے ساتھ محکم سے محکم تر ہوتے چلے گئے۔ میں تو ان کی خدمت میں سوائے اخلاص کے کچھ بھی پیش نہ کر سکا لیکن ان کی طرف سے پیہم نوازشوں کا سلسلہ جاری ہو گیا اور ان کی زندگی بھر اِن میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ان کے مجھ پر بہت احسان ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

انگلستان سے واپسی | عزیزہ اسداللہ خاں اور میں لندن سے پیرس گئے دو دن وہاں ٹھہرے۔ پیرس سے سردار سمپورن سنگھ صاحب ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک دن لوزان ٹھہرے یہاں سردار آنباتا سنگھ صاحب بھی ہمارے قافلے میں شامل ہو گئے۔ ایک رات میلان ٹھہرے۔ وینس سے اطالوی جہاز پر سوار ہو کر بمبئی پہنچ گئے

دہلی سازش کیس | میاں سر فضل حسین صاحب نے ایک روز فرمایا کچھ ملزمان پر دہلی میں ایک سازش کا مقدمہ چلنے والا ہے جس کی سماعت کے لئے ایک سپیشل ٹربیونل قائم کیا جائے گا سر جیمز کریرر (رکن داخلہ) نے مجھ سے کسی قابل قانون دان کا نام پوچھا تھا جو حکومت کی طرف سے اس کیس کی پیروی کر سکے۔ میں نے اسے تمہارا نام بتایا ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے تمہیں یہ پیشکش کی جائے تو تم اس پر غور کر لینا۔ کچھ دنوں کے بعد پنجاب کونسل کے اجلاس کے دوران میں سر ڈونلڈ بائیڈنے جو گورنر کی مجلس عاملہ کے رکن تھے مجھ سے دریافت کیا کہ دہلی میں ایک سازش کے مقدمے کی سماعت کیلئے ایک ٹربیونل قائم ہونیوالا ہے۔ کیا تم بطور رکن ٹربیونل کام کرنا منظور کر لوگے؟۔ میں نے جواب نفی میں دیا۔ دو روز بعد پھر ملے اور فرمایا مجھے مرکزی حکومت کے پیغام کے متعلق غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تم بطور کراؤن کونسل کام کرنے پر رضامند ہو اور رضامندی کی صورت میں تمہاری فیس کیا ہو گی؟ میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور فیس بتا دی۔ چند دن بعد انہوں نے بتایا مرکزی حکومت نے تقرر منظور کر لیا ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ تمہیں کیس کی تیاری کے لئے ایک مہینہ درکار ہو گا۔ توقع ہے کہ ٹربیونل مئی کے شروع میں کام کی ابتداء کر سکے گا اسلئے اگر تم اپریل کے شروع میں دلی پہنچ جاؤ تو تمہیں تیاری کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔

اپریل ۱۹۳۱ء کے شروع میں میں مقدمہ سازش کی تیاری کیلئے دلی چلا گیا۔ پرانی دلی میں سوس ہوٹل میں قیام کیا اس ہوٹل کے کمرے کشادہ اور آرام دہ تھے۔ گرمیوں میں گرمی سے آسائش رہتی تھی جب میں مقدمہ کے واقعات پر عبور حاصل کر چکا تو میں نے سر جیمس کریرر کو مشورہ دیا کہ اس مقدمے کیلئے ٹربیونل قائم کرنا مناسب نہیں۔ ملزمان میں کثرت ایسے نوجوانوں کی ہے جن سے کوئی نہ کوئی جرم سرزد ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن صرف دو تین ہی ایسے ملزم ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سازش میں شریک تھے اور ان کے خلاف کسی وقوعہ میں شامل ہونے کی کوئی شہادت نہیں۔ ان میں سے ایک کے متعلق خود استغاثہ تسلیم کرتا ہے کہ ایک مرحلے پر اس نے سازش میں شرکت ترک کر دی تھی۔ ان دو تین ملزمان پر فرد جرم عاید کئے جانے کیلئے استغاثہ زور نہیں دے سکے گا۔ اور اگر زور دے بھی تو ٹربیونل غالباً فرد جرم عاید نہیں کرے گا۔ میری رائے تھی کہ سازش کا الزام ترک کر کے جو جرم ہر ایک سے صادر ہونا بیان

کیا جاتا ہے اس الزام کے تحت ان پہ عام عدالتوں میں کارروائی کی جائے۔ ٹریبونل قائم کرنے سے پبلک کی توجہ ان نوجوانوں کی طرف منعطف ہوگی اور انہیں قومی ہیرو بنالیا جائے گا۔ کارروائی طول کھینچے گی۔ حکومت کو بھاری اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور نتیجہ معلوم۔ سر جیمز نے میری گذارش توجہ سے سنی لیکن میرے مشورے پر عمل نہ کیا۔

سازش کیس ٹریبونل کے اراکین | سازش کیس کی سماعت کیلئے جو ٹریبونل مقرر کیا گیا اس کے صدر مسٹر وبائیٹ صوبہ متحدہ کے ایک سیشن جج تھے۔ اور دوسرے دو اراکین خان بہادر شیخ امیر علی صاحب ریٹائرڈ سیشن جج پنجاب اور رائے بہادر لالہ کنورسین صاحب ریٹائرڈ چیف جسٹس جموں و کشمیر تھے۔ جب میں لاء کالج لاہور میں لیکچرار ہوا تو ان دنوں لالہ کنورسین صاحب لاء کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کے والد محترم لالہ بھیم سین صاحب سیالکوٹ میں وکالت کرتے تھے۔ شیخ امیر علی صاحب ٹریبونل میں شریک ہونے سے برسوں پہلے پنشن یاب ہو چکے تھے۔ وہ ٹریبونل کی کارروائی کی طرف تمام وقت پوری توجہ بھی قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ رائے بہادر کنورسین صاحب کی جو رائے ہوتی اس پر اتفاق فرماتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عملاً ہر معاملہ رائے بہادر کنورسین صاحب کی رائے کے مطابق طے پاتا اور ان کی رائے جو درخواست بھی ملزمان کی طرف سے دی جاتی اس کی تائید میں ہوتی۔

ٹریبونل میں کیس کی کارروائی | ملزمان پر الزام یہ تھا کہ وہ ایک ایسی سازش میں شریک ہوئے جس کا مقصد ہندوستان میں برطانوی حکومت کو بزور ختم کرنا تھا اور اس سازش کے مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے ایک کثیر مقدار بارود کی تیار کی۔ اور بہت سے اور جرائم مثلاً ڈکیتی وغیرہ کے مرتکب ہوئے۔ سب ملزمان تعلیمیافتہ نوجوان تھے۔ دو تین ان میں سے گریجوایٹ تھے۔ مسٹر وتسیاینہ صنعتی کیمیا میں ڈگری حاصل کر چکے تھے اور طلائی تمغہ لے چکے تھے۔ ان کا خفیہ نام اپنے رفقاء میں سائنٹسٹ تھا۔ ظاہر ہے کہ ملزمان کو عوام کی ہمدردی حاصل تھی۔ پریس اور پبلک کو مقدمہ کی کارروائی سے بہت دلچسپی تھی۔ ملزمان کو اس مقدمہ کی پیروی کیلئے حکومت کی طرف سے اخراجات مہیا کئے جاتے تھے۔ جو اندازاً دس ہزار روپے ماہوار تھے۔ ابتداء میں ملزمان کی طرف سے سینئر وکیل مسٹر آصف علی صاحب تھے ان کے ساتھ دو تین جونیئر وکیل تھے۔ جب کارروائی نے طول کھینچا تو مسٹر آصف علی صاحب کی جگہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب نے لی۔ ٹریبونل کے اجلاس حکومت ہند کے سیکریٹریٹ کی جنوبی عمارت کے وسطی حصے میں نئی دہلی میں شروع ہوئے۔ ان دنوں حکومت ہند کے دفاتر شملہ منتقل ہو چکے تھے۔ جب دفاتر کے دتی واپس آنے کا وقت قریب آیا تو ٹریبونل کے اجلاس پرانے وائسریگل لاج واقعہ پرانی دہلی میں منعقد ہونے لگے۔ ٹریبونل کے اجلاس شروع ہونے تک میری تحریک پر چوہدری محمد امین صاحب کو جو اس وقت شیخوپورہ میں سرکاری وکیل تھے میرا شریک کار مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب تک ٹریبونل کے اجلاس نئی دہلی میں ہوتے رہے میری رہائش ایک قریب کے سرکاری بنگلہ میں رہی۔ جب ٹریبونل کی عدالت پرانے وائسریگل لاج میں منتقل ہوئی تو مجھے قریب ہی ایک بنگلہ جو کسی وقت میں وائسریگل ڈسپنسری ہوا کرتا تھا رہائش کے لئے مل گیا۔

میاں نسیم حسین صاحب | اس زمانے میں گرمیوں کے موسم میں نئی دہلی سنسان ہو جایا کرتی تھی۔ ہمارا بنگلہ مختصر مگر آرام دہ تھا خس کی ٹٹیوں اور بجلی کے پنکھوں کی مدد سے گرمی سے آسائش رہتی تھی۔ میاں سرفضل حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے میاں نسیم حسین صاحب نئے نئے گوڑ گاؤں میں مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے۔ وہ ہمارے بنگلے سے سولہ میل کے فاصلے پر رہتے تھے۔ میں ہفتے میں دو تین بار وہاں جاکر انہیں ساتھ لے آتا وہ شام کا کھانا میرے ساتھ کھاکر واپس جاتے۔ میں ساتھ جاکر انہیں چھوڑ آتا۔ اتوار کا دن وہ اکثر ہمارے ساتھ گذارتے تھے انہی دنوں وہ سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے تھے۔ میاں نسیم حسین صاحب کی شادی پشاور کے ایک نہایت معزز اور علم دوست خاندان میں ہوئی۔ محترمہ بیگم نسیم حسین بفضل اللہ حسن اخلاق اور علم دین کے بیش قیمت زیور سے آراستہ تھیں۔ شادی کے چند سال بعد میاں نسیم حسین صاحب کا تقرر بطور پرائیویٹ سیکرٹری ملک سرفیروز خاں نون صاحب ہوا جو اس وقت لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے۔ میاں صاحب نے اپر رچمنڈ روڈ پر آرمونڈ کورٹ میں رہائش اختیار کی۔ وہاں سے ہائی کمشنر صاحب کا رہائشی مکان جو پٹنی ہل پر تھا دور نہ تھا اور لنڈن کی احمدیہ مسجد بھی قریب ہی تھی۔ محترمہ بیگم نسیم حسین نے خواہش ظاہر کی کہ وہ سلسلہ احمدیہ کے عقائد اور تعلیم کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتی ہیں۔ نسیم حسین نے مولانا جلال الدین شمس صاحب سے جو ان دنوں مسجد اور مشن کے انچارج تھے درخواست کی کہ وہ ہفتے میں ایک دو بار ان کے مکان پر تشریف لاکر ان امور کی وضاحت فرما دیا کریں جن کے متعلق ان کی بیگم صاحبہ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مولانا صاحب نے بخوشی یہ خدمت اپنے ذمے لی اور باقاعدہ میاں صاحب کے ہاں حاضر ہوتے رہے۔ جب محترمہ بیگم صاحبہ کو سلسلہ احمدیہ کی صداقت کے متعلق پورا اطمینان ہو گیا تو انہوں نے بصد شوق سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہونے کا فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے کمال فضل اور ذرہ نوازی سے ان کی زندگی کا ہر پہلو اسلام کی تعلیم کی عملی تصویر بن گیا۔ جو عہد بیعت انہوں نے کیا اسے پورے اخلاص کے ساتھ کماحقہٗ پورا کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے پورا کرتی چلی جا رہی ہیں۔ اس راستے میں جو مشکل بھی انہیں پیش آئی وہ ان کے اخلاص میں ایزادی اور استقامت میں مضبوطی کا باعث ہوئی۔ میاں نسیم حسین صاحب پاکستان کے قیام پر وزارت خارجہ میں شامل کئے گئے۔ تہران، بغداد، بیروت میں بطور سیکرٹری، کونسلر، سفیر متعین رہے۔ ملازمت کا عرصہ نہایت نیک نامی سے گذارا۔ جس کو بھی آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ آپ کے حسن اخلاق کا مدح سرا ہوا۔ بیروت کی تعیناتی پر وہ خاص طور پر خوش اور مطمئن تھے۔ لبنان اور اردن دونوں آپ کے حلقہ سفارت میں تھے۔ جب بھی عمان جانے کا موقعہ ہوتا قدس پہنچ کر مسجد اقصیٰ میں نمازیں اور نوافل ادا کرتے اور ہر مشکل کا حل اپنے مولا سے طلب کرتے۔ جب موقع ملتا چھٹی لیکر حج یا عمرہ کے لئے مکہ شریف حاضر ہوتے مدینہ شریف حاضر ہوکر مسجد نبوی میں نمازیں اور نوافل ادا کرتے۔ جب ممکن ہوتا محترمہ بیگم صاحبہ ان متبرک مقامات کے سفروں

میں اُن کے ساتھ شریک ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی ان کے ساتھ خاص سلوک تھا۔ میاں بیوی دونوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکی ستاری غفاری اور قدرت پر کامل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کا سلوک بھی ان کے ساتھ اسی اعتماد اور بھروسے کے مطابق تھا۔ میں پاکستان جاتے ہوئے بیروت سے گذرا میاں نسیم حسین صاحب مطار پر تشریف فرما تھے۔ دورانِ گفتگو میں ایک پریشانی کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا خاص طور پر دعا کرنا۔ میں نے کہا میاں اب دعا کا ہی چارہ باقی ہے آپ بھی دعا کرتے رہیں میں بھی انشاءاللہ کروں گا۔ پاکستان سے واپسی پر پھر ملاقات ہوئی۔ میں نے اس امر کے متعلق دریافت کیا ہنستے ہوئے فرمایا بس وہ معاملہ تو خود بخود ہی صاف ہوگیا اور جیسے ہماری خواہش تھی ویسے ہی طے ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا۔ ان کی صحت کچھ عرصہ سے کمزور چلی آرہی تھی طبی مشورے کے لئے لندن تشریف لے گئے اتفاق سے میں بھی ان دنوں لندن میں تھا۔ اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ بیروت میں ان کی میعاد ختم ہوچکی تھی وہ رخصت پر تھے اور بطور ہائی کمشنر غانا جانے کے احکام صادر ہوچکے تھے۔ صحت کے متعلق ڈاکٹروں نے تو اطمینان دلایا لیکن بیروت جانے کے بعد دل پر پھر بیماری کا حملہ ہوا مجھے لکھا کہ اس حالت میں غانا جانے کے خیال سے پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے لکھا اللہ تعالیٰ آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔ آپ کو غانا نہیں جانا ہوگا۔ وہ احکام منسوخ ہوگئے ہیں لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے حضور سے حاضری کا حکم جاری ہوا یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃً مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اور وہ اللہ تعالیٰ کا مسکین لیکن نہایت مخیر اور راضی برضا خادم اور بندہ لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک کہتا ہوا اپنے مولا کے حضور حاضر ہوگیا۔ یغفر اللہ لہ ویجعل الجنۃ العلیا ثواہ

مقدمہ سازش دہلی میں عدالتی کاروائی

سازش کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ابتداء سے ہی ملزمان اور ان کے وکلاء کی روش سے ظاہر تھا کہ وہ کاروائی کو طول دینا اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں ایک تو مبینہ سازش کا جال کافی وسیع تھا اسلئے گواہانِ استغاثہ کی فہرست لمبی تھی۔ تین تو سلطانی گواہ تھے۔ دوسرے اور تیسرے گواہ کا بیان تو ایسا لمبا نہیں تھا لیکن پہلے گواہ کا بیان سترہ دن میں ختم ہوا اور اس پر جرح تو نو مہینوں میں جاکر ختم ہوئی۔ اس کے علاوہ جب بھی ملزمان مقدمہ کی کاروائی روک دینا چاہتے تو ان میں سے کوئی ایک پیٹ درد یا سر درد یا کسی ایسے ہی عارضے کا بہانہ بنا کر عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیتا اور کاروائی رک جاتی جب متواتر یہ چال چلی جانے لگی تو حکومت نے آرڈیننس کے ذریعے اس کی روک تھام کر دی۔ ملزمان نے کاروائی کو طول دینے کیلئے اور چالیں سوچ لیں۔ کسی نہ کسی عذر لنگ کی بنا پر التوا کی درخواست پیش ہو جاتی اور ٹریبونل کی کثرت رائے سے منظور ہو جاتی۔ عملاً دو تہائی وقت کاروائی مقدمہ معطل رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سنگین مقدمے کی عدالتی کاروائی ایک کھیل اور تماشہ بن کر رہ گئی۔ عدالت کے اجلاس کا وقت ملزمان کے لئے تفریح کا وقت ہوتا۔ اجلاس شروع

ہوتے ہی ملزمان پہلے تو آزادی کا گیت گاتے پھر کسی نہ کسی سنجیدہ یا غیر سنجیدہ عذر کی سماعت ہوتی۔ یہ مرحلہ طے پاتا تو گواہ سلطانی پر جرح جاری ہو جاتی۔ گواہ سلطانی نہایت ہوشیار تھا اور اس کا حافظہ بہت صاف تھا طویل اور تفصیلی جرح بھی اس کے بیان کے کسی حصہ کو کمزور یا مشکوک نہ کر سکی۔ نو مہینے کی جرح کے عرصے میں اس نے پریشانی کا اظہار کیا نہ تھکان کا، کسی وقت جھنجھلایا نہ جوش میں آیا ایک ہی نہج پہ پورے سکون سے ہر سوال کا جواب دیتا چلا گیا۔ ملزمان چونکہ پڑھے لکھے نوجوان تھے اسلئے جب وہ عدالت کے کمرے میں موجود ہوتے اور عدالتی کارروائی نہ ہو رہی ہوتی تو کبھی کبھی وہ مجھے اپنے کٹہرے کے پاس بلا لیتے عموماً تو ان کی غرض کسی تکلیف کا اظہار ہوتی کہ اس کی اصلاح کرادی جائے۔ یا کسی سہولت کا مطالبہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہ کسی عام دلچسپی کے معاملے پر اظہار رائے بھی کرتے۔ شروع ہی میں انہوں نے مجھے کہا کہ جیل میں ان کا وقت مشکل سے کٹتا ہے۔ کوئی مشغلہ نہیں۔ میں جو میگزین یا کتاب اپنے پڑھنے کیلئے خریدتا پڑھ کر انہیں دیدیتا۔ جو جائز سہولت وہ طلب کرتے اس کا انتظام کروا دیتا۔ جس تکلیف سے انہیں پریشانی ہوتی وہ رفع کرادی جاتی۔ میرے اس طریق سے چودھری محمد امین صاحب کو پریشانی ہوتی۔ فرماتے ملزمان کے ساتھ ایسا نرمی کا سلوک انہیں اکسانے کا موجب ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کس بات پہ اکسانے کا؟ کہنے لگے وہ کوئی بے جا جرأت کر بیٹھیں تو؟ میں نے کہا اس کا تدارک ہو سکتا ہے ملزمان ہی تو ہیں نا؟ ابھی جرم تو ان کے خلاف ثابت نہیں ہوا۔ مجرم ہوتے تو الگ بات تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت | ابھی پہلے گواہ سلطانی پہ جرح جاری تھی کہ مجھے دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کی دعوت آگئی۔ اس اثناء میں گاندھی اِرون سمجھوتے کے نتیجے میں کانگریس نے گول میز کانفرنس میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا۔ اور گاندھی جی کو اپنا واحد مندوب نامزد کیا تھا۔ یہ امر طے ہو جانے کے بعد کانگریس کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو بطور ایک مسلمان نمائندے کے کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔ یہ تجویز مسلمانوں اور کانگریس کے درمیان ایک بڑے نزاع کا باعث بن گئی۔ مسلمانوں کا موقف تھا کہ کانگریس نے کانفرنس میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔ کانگریس چاہے تو دس بیس مندوبین کا ایک وفد کانفرنس میں شمولیت کیلئے بھیج دے۔ گاندھی جی بیشک اس وفد کے رئیس ہوں اور اگر کانگریس چاہے تو باقی تمام مندوبین کانگریسی مسلمانوں سے انتخاب کرے جن میں بیشک ڈاکٹر انصاری بھی شامل ہوں چشم ما روشن دل ما شاد لیکن اگر کانگریس کا فیصلہ یہ ہو کہ کانگریس کے واحد نمائندے گاندھی جی ہوں گے تو گاندھی جی تو ہوئے تمام کانگریس کے نمائندے کانگریسی ہندوؤں کے بھی اور کانگریسی مسلمانوں کے بھی جن میں ڈاکٹر انصاری صاحب شامل ہیں۔ اس صورت میں اگر ڈاکٹر انصاری صاحب بھی نامزد کئے جائیں تو وہ کس کے نمائندے ہوں گے؟ اندریں حالات اگر ڈاکٹر انصاری کو نامزد کیا گیا تو مسلمان مندوبین کانفرنس میں شمولیت سے انکار کر دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی یہ تجویز کامیاب

نہ ہو سکی۔ اس تجویز کی مخالفت میں پیش پیش مولانا شفیع داؤدی صاحب تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر لندن میں گاندھی جی اور مسلم وفد کے مابین مذاکرات

مسز سروجنی نائیڈو اگرچہ کانفرنس میں شریک نہیں تھیں لیکن لندن میں موجود تھیں اور ہندوستان کے آئینی مستقبل میں طبعاً گہری دلچسپی رکھتی تھیں یہ جانتے ہوئے کہ اس گتھی کا تسلی بخش طریق پر سلجھنا ہندو مسلم مفاہمت پر موقوف ہے انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ گاندھی جی اور مسلم وفد کے درمیان سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے چنانچہ یہ قرار پایا کہ گاندھی جی مسلم وفد کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لئے ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ہاں رٹز ہوٹل میں شام کے کھانے کے بعد تشریف لائیں گے۔ مسلم وفد کے سب اراکین بروقت گاندھی جی کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ دروازہ کھلا اور گاندھی جی تشریف لائے۔ تمام حاضرین تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے سب کی طرف سے عظیم المرتبت مہمان کو خوش آمدید کہا۔ اور آرام کرسی آپ کے بیٹھنے کیلئے پیش کی گاندھی جی نے انکار میں سر ہلایا مسکرائے اور فرمایا مجھے فرش پر بیٹھنا پسند ہے۔ آپ کے دائیں ہاتھ میں ساگوان کا ایک خوبصورت بکس تھا جو آپ نے فرش پر اپنے سامنے رکھ لیا اور قالین پر تشریف فرما ہو گئے۔ حاضرین میں سے بعض اراکین معزز مہمان کے احترام میں قالین پر بیٹھ گئے لیکن سب کے لئے فرش پر بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی اسلئے باقی لوگ کرسیوں اور صوفا پر بیٹھ گئے۔ گاندھی جی نے بڑے اطمینان سے اپنا بکس کھولا میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں اس میں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ بکس کھلنے پر اس میں سے ایک چھوٹا سا بہت خوبصورت پیتل کا چرخہ نکلا جو تہ کیا ہوا تھا۔ گاندھی جی نے اسے احتیاط سے کھول کر فرش پر رکھا اور خاموشی سے چرخہ کاتنا شروع کر دیا۔ جب دو ایک تاریں نکال چکے تو نگاہ اوپر اٹھائی اور مسکراتے ہوئے اشارہ کیا کہ ہم گفتگو پر آمادہ ہیں۔ اس اثناء میں حاضرین کی توجہ تمام تر چرخے پر مرکوز رہی۔ مجھے کو جلد سو جانے کی عادت ہے اور میں رہتا بھی کچھ فاصلے پر تھا لیکن یہ موقعہ بہت اہم تھا بزرگوں کی موجودگی میں مجھے کچھ کہنا تو تھا نہیں لیکن میرے لئے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ تھا اس لئے میں ہمہ تن گوش تھا دو گھنٹے سے زائد گفتگو جاری رہی۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات زیر بحث تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا ان میں سے بعض مطالبات کو نہ صرف میں تسلیم کرتا ہوں بلکہ ان کی تائید میں ہوں مثلاً سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور دوسرے صوبوں کے ساتھ سرحدی صوبے کی آئینی برابری ایسے مطالبات ہیں جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ بعض مطالبات ایسے ہیں جن پر مجھے اعتراض نہیں اگر آپ انہیں ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے انہیں قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ جو مطالبہ مشکل پیش کرتا ہے وہ مجالس قانون ساز میں نمائندگی کا مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق پہلی مشکل یہ ہے کہ میں نے ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل ڈاکٹر انصاری صاحب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں اس مسئلے کے متعلق کوئی فیصلہ ان کی غیر حاضری میں نہیں کروں گا۔ اسلئے اس مسئلے پر گفتگو صرف ان کی موجودگی میں ہو سکتی ہے۔ اب بحث اس امر پر شروع ہوئی کہ یہ مشکل حل کیسے ہو۔ آخر گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا حل کوئی ایسا مشکل نہیں آپ صاحبان

وزیر ہند سے کہیں کہ وہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو لندن بلالیں۔ ان کے آنے پر اس مسئلے پر گفتگو ہوسکے گی دیر تک اس پر بحث ہوئی مسلم وفد کیلئے یہ تجویز بالکل ناقابل قبول تھی۔ گاندھی جی کی اس تجویز سے صریحاً یہ مراد تھی کہ تم لوگوں نے زور دیا تھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو کانگریس کے وفد سے الگ کانفرنس میں شمولیت کیلئے دعوت نہ دیجائے۔ اب تم ہی وزیر ہند کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرو کہ ہم سے سخت غلطی ہوئی۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی لندن میں موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اسلئے ہم آپ سے بادب استدعا کرتے ہیں کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو بذریعہ تار کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دیں۔ جب اس ابتدائی مشکل کا کوئی حل سوجھتا نظر نہ آیا تو میں نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ اور بادب گذارش کی کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا اگر فی الحال اس مسئلے کو ایک طرف رہنے دیا جائے۔ اگر باقی سب مسائل پر سمجھوتا ہو جائے تو گاندھی جی اور ہم سب ملکر ڈاکٹر انصاری صاحب کی خدمت میں بذریعہ تار درخواست کریں کہ وہ تشریف لاکر گفتگو میں شامل ہوں۔ یہ طریق یقیناً ڈاکٹر صاحب کیلئے زیادہ موجب اعزاز ہوگا بہ نسبت اس کے کہ ان کو بلوانے کے لئے ایسی حکومت کے وزیر خارجہ سے درخواست کیجائے جسے گاندھی جی شیطانی حکومت شمار کرتے ہیں۔ میری گذارش پر گاندھی جی مسکرائے اور سر ہلا کر اس تجویز سے اتفاق کا اظہار کیا۔

گاندھی جی اور مسلم وفد کے درمیان گفت وشنید کا سلسلہ دو تین نشستوں میں جاری رہا۔ فرقہ دارانہ نیابت کے مسئلے کے علاوہ کسی اور مسئلے پر کوئی ناقابل حل اختلاف نمودار نہ ہوا۔ نیابت کے مسئلے پر گاندھی جی کا یہی موقف رہا کہ یہ مسئلہ بغیر ڈاکٹر انصاری صاحب کی موجودگی کے حل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ وہ جداگانہ نیابت کے طریق کو ملک اور خود مسلمانوں کیلئے حد درجہ مضر اور نقصان دہ یقین کرتے ہیں۔ البتہ اگر مسلمان پورے غور و فکر کے بعد اسی بات پر مصر ہوں کہ ان کے حقوق کے تحفظ کیلئے یہ طریق ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو وہ بادل ناخواستہ اپنی رائے کے خلاف اس طریق کے قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں گے بشرطیکہ ڈاکٹر انصاری بھی اسے قبول کرنے پر تیار ہوں۔ سوال کیا گیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب جداگانہ نیابت کے طریق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوں تو کیا صورت ہوگی۔ گاندھی جی نے فرمایا ایسی صورت میں میں انہیں رضامند کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ صاحبان کی طرف سے وکالت کروں گا۔ اس مرحلے پر مزید وضاحت کیلئے میں نے کچھ سوال کرنے کی اجازت چاہی گاندھی جی نے اجازت دیدی۔ میں نے گذارش کی کہ جب آپ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پوری وکالت کر چکیں اور ڈاکٹر صاحب جواباً کہیں کہ جداگانہ نیابت کا طریق ملک کیلئے بھی اور مسلمانوں کیلئے بھی سم قاتل کا حکم رکھتا ہے اس لئے وہ اس مسئلے میں آپ کے فرمان کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ تو آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟ فرمایا میں ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دوں گا۔ میں نے دریافت کیا اگر ڈاکٹر صاحب آپکی وکالت کے نتیجے میں جداگانہ نیابت

کے طریق کو قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں لیکن باقی کانگریسی مسلم متفقہ طور پر اس کے خلاف اظہار رائے کریں تو آپ کس کے ساتھ ہوں گے؟ فرمایا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔ میں نے دریافت کیا اگر کانگریسی مسلم سب متفقہ طور پر فرقہ دارانہ مفاہمت کی خاطر جداگانہ نیابت کے طریق کو قبول کرنے کے حق میں ہوں لیکن ڈاکٹر انصاری صاحب اس کے خلاف مصر ہوں تو آپ کا کیا موقف ہو گا؟ فرمایا میں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ ہوں گا۔

جب قائداعظم مسٹر جناح کے باقی تیرہ نکات کے متعلق گاندھی جی نے اتفاق رائے کا اظہار کر دیا اور صرف جداگانہ نیابت کا مسئلہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی ہاں یا نہ کا محتاج رہ گیا تو مسلم وفد نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ اس مفاہمت کی تکمیل کیلئے اب جو کچھ مسلم وفد کو کرنا ہو اس سے مطلع فرمائیں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ دو تین دن تک اس سوال کا جواب بھجوا دیں گے۔ دو تین دن بعد گاندھی جی کی طرف سے ایک کاغذ کا پرزہ موصول ہوا جو پنسل سے لکھا ہوا تھا اور جس پر نہ کوئی تاریخ درج تھی نہ کوئی عنوان تھا۔ خلاصہ اس تحریر کا یہ تھا کہ مفاہمت کی صورت میں گاندھی جی مسلم وفد سے یہ توقع رکھیں گے کہ مسلم وفد کانفرنس میں ان کی طرف سے پیش کردہ تمام مطالبات کی تائید کرے۔ ان مطالبات کی کسی قدر وضاحت اس تحریر میں تھی۔ مثلاً یہ کہ کامل آزادی کے مطالبے میں فوج اور مالیات پر کامل اختیار شامل ہو گا۔ یہاں تک تو مسلم وفد کے لئے کوئی دقت نہیں تھی۔ ان کے حقوق کا تحفظ ہو جانے کی صورت میں وہ کامل آزادی کا مطالبہ کرنے میں گاندھی جی کے دوش بدوش تھے۔ لیکن گاندھی جی کی تحریر میں یہ مطالبہ بھی درج تھا کہ مفاہمت کی صورت میں مسلم وفد اچھوت اقوام کے لئے مراعات کی تائید نہیں کرے گا بلکہ ان کے خلاف موقف اختیار کرے گا۔ اس مطالبے پر مسلم وفد نے پورا غور کیا اور وفد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ مطالبہ اس شکل میں قابل قبول نہیں۔ گاندھی جی نے تحریر فرمایا تھا کہ اچھوت اقوام کے لئے خاص مراعات تجویز کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندو سوسائٹی میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا جو اس کی یکجہتی کو برباد کر دے گا۔ مسلم وفد نے طے کیا کہ جب اچھوت اقوام کے مقابلے میں تعداد میں زیادہ اور تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت میں ان کی نسبت کہیں آگے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے مسلم وفد کو تحفظ حقوق پر اصرار ہے تو وہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اچھوت اقوام کسی تحفظ کی محتاج نہیں۔ البتہ مسلم وفد یہ موقف اختیار کر سکتا ہے کہ اچھوت اقوام کے حقوق کے تحفظ کا سوال ہندو سوسائٹی کا نجی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر ہندو نمائندگان کی جو مفاہمت اچھوت اقوام کے ساتھ قرار پا جائے مسلم وفد اس کی تائید کریگا۔ چنانچہ اسی فیصلے کے مطابق گاندھی جی کی خدمت میں جواب بھیج دیا گیا۔ اچھوت اقوام کی نسبت یہ موقف گاندھی جی کو منظور نہ ہوا۔ اور گفتگو کا سلسلہ اس مرحلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کانگریس کی شمولیت کی وجہ سے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق جو توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ تو پوری نہ ہوئیں۔ گاندھی جی کی موجودگی کانفرنس کی افتاد اور رفتار میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکی۔ گاندھی جی کی آمد پر لندن کے بعض حلقوں میں کانفرنس میں کچھ دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔

فقرِ بکنگھم میں مثلِ سابق نمائیندگان کے لیئے استقبالیہ دعوت دیگئی۔ سنا گیا کہ گاندھی جی نے دعوت تو قبول کر لی ہے لیکن اس تقریب میں شمولیت کی خاطر اپنے لباس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اور آخر کار تاجدار برطانیہ کچھ تامل کے بعد انہیں ان کے روزمرہ کے لباس میں خوش آمدید کہنے پر رضامند ہو گئے۔ واللہ اعلم بالصواب یہ ہم نے بھی دیکھا کہ گاندھی جی اپنے روزمرہ کے لباس میں ہی تھے۔ ہز میجسٹی نے مسکراتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا اور دو تین منٹ آپس میں گفتگو رہی۔ شاہ جارج پنجم کی آواز کی گونج دور تک پہنچتی تھی۔ ڈاکٹر امبیدکار صاحب کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ "ڈاکٹر امبیدکار مجھے تو آپ سے مصافحہ کرکے بڑی خوشی ہوئی ہے ان دوسرے لوگوں کو آپ سے مصافحہ کرنے میں کیوں تامل ہوتا ہے؟" واقعہ یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں ممکن ہے مہاراجہ الور کو ڈاکٹر امبیدکار صاحب کے ساتھ مصافحہ کرنے میں تامل ہوتا ہو۔ لیکن کسی اور مندوب کی طرف سے ڈاکٹر امبیدکار صاحب کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ مسلمان مندوبین تو طبعاً ڈاکٹر امبیدکار صاحب کا ویسے ہی احترام کرتے تھے جیسے باقی اراکین کانفرنس کا اور وزیر اعظم کے تو وہ منظورِ نظر تھے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب | دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب بھی مسلم وفد کی زینت تھے۔ لندن میں ان کا ورود وہاں کے فلسفی، ادبی اور مستشرقین حلقوں میں بہت دلچسپی کا موجب رہا والڈارف ہوٹل میں آپ کے اعزاز میں وسیع پیمانے پر استقبالی دعوت کا انتظام ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے اور نئے احباب کی ملاقاتوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن کانفرنس کی سست رفتاری سے ان کی طبیعت بہت اکتائی رہی۔

(قائداعظم) مسٹر جناح نے پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر ہندوستان واپسی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اور لندن میں ایک پُر فضا مقام پر ایک مکان میں رہائش اختیار کرکے پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ پہلی گول میز کانفرنس کی کارروائی سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائی بھی ان کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب نہ ہوسکی۔

سر سید علی امام صاحب | دوسری گول میز کانفرنس میں سر سید علی امام صاحب بھی شریک تھے۔ میں ابھی کالج میں پڑھتا تھا جب وہ آسمانِ سیاست کو روشن کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ملاقات میرے لئے بڑی خوشی اور فخر کا موجب تھی وہ بڑے اعلیٰ خلق کے مالک تھے۔ کمال شفقت سے پیش آئے خود میری طرف بڑھ کر مجھے مصافحہ کی عزت بخشی اور فرمایا مدت سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ حیدر امام سے اکثر تمہارا ذکر سنا ہے۔

دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائی میں فرقہ وارانہ نیابت کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بنا رہا۔ اس سال برطانیہ کی اقتصادی حالت میں ضعف آجانے سے برطانیہ طلائی معیار ترک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مالی ضوابط کے جاری کرنے کے مسئلے پر برطانیہ کی وزارت میں اختلاف ہو گیا اور وزیر اعظم میکڈانلڈ مخلوط وزارت بنانے پر مجبور ہو گئے

قدامت پسند حزب 'TORRIES' نے ان کی قیادت میں کام کرنا منظور کر لیا۔ وزارت میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مسٹر ویجووڈ بن کی جگہ سر سیموئل ہور وزیر ہند مقرر ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ گول میز کانفرنس کی کارروائی کا جلد کوئی نتیجہ نکلے لیکن فرقہ دارانہ نیابت کا مسئلہ ہر قدم پر رکاوٹ پیدا کرتا۔ آخر کار باہمی مفاہمت نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس امر کا فیصلہ برطانوی حکومت نے اپنے ذمے لے لیا اور دوسری گول میز کانفرنس کے اختتام کے بعد مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے فیصلے کا انتظار رہنے لگا۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں لارڈ ولنگڈن نے ایک سنہری پلیٹ جو HONBLE COMPANY OF GOLDSMITHS کے زیر اہتمام تیار کی گئی تھی میری والدہ صاحبہ کو تحفتہً بھجوائی تھی۔ لارڈ ولنگڈن اس کمپنی کے پرائم وارڈن تھے اس پلیٹ پر یہ عبارت کندہ تھی:۔

HOMAGE FROM ENGLAND
TO
A DEVOTED INDIAN MOTHER
OF
A DISTINGUISHED INDIAN SON

FEBRUARY 31

جب میں اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کیلئے لندن گیا تو والدہ صاحبہ نے ایک ایرانی قالین اور ایک میز جس پر پیتل کاری کا کام تھا لارڈ ولنگڈن کیلئے بھجوائے۔ جنہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور والدہ صاحبہ کی خدمت میں بڑے تپاک اور شکریے کا خط لکھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً وہ اپنے اخلاص کے اظہار کے طور پر والدہ صاحبہ کی خدمت میں مختلف تحائف ارسال کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں میرے قیام لندن کے دوران میں مجھے کئی بار ان سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے مجھے GOLDSMITHS COMPANY کے کورٹ ڈنر میں شمولیت کی دعوت بھی دی۔ اس موقعہ پر علاوہ ایسی کمپنیوں کے صدیوں پرانے رسوم و رواج کے مظاہرے کے ان کے بیش بہا سونے اور جواہرات کے تاریخی نمونے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ملکہ ایلزبتھ اوّل کا طلائی آبخورہ، شاہ جیمز اوّل کا شراب پینے کا سیٹ اور بیشمار ایسی ہی دیگر اشیاء جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جب مہمان رخصت ہوئے تو ہر مہمان کو رخصت ہوتے وقت دروازے پر ایک خاصا وزنی بکس دیا گیا جس میں مختلف اقسام کے چاکولیٹ بڑے قرینے سے سجائے ہوئے تھے۔ یہ بکس میں نے دوسرے دن ایملی بینرج کی خدمت میں پیش کر دیا۔

مسلم لیگ کی صدارت | دسمبر ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا۔ لیگ کونسل کی طرف سے مجھے صدارت کی دعوت دی گئی اور میں نے قبول کر لی۔ ان دنوں مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی ایک اور سیاسی پارٹی آل پارٹیز مسلم کانفرنس بھی تھی۔ لیکن دو سیاسی پارٹیاں مسلم قوم کیلئے ضعف کا باعث تھیں۔ ادھر کانگریس مسلمانوں

کی سیاسی طاقت اور جمعیت کو کمزور کرنے کے درپے تھی میرے مسلم لیگ کی صدارت کرنے کے خلاف جماعت احرار اور دیگر مخالف عناصر نے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی یہ کوشش تو نعرہ بازی اور فساد کی دھمکیوں سے آگے بڑھنے نہ پائی لیکن اصل کمزوری مسلم قیادت میں اختلافات، باہمی شکر رنجیاں، اور رقابتیں تھیں جن کے نتیجہ میں قوم میں ایک حد تک سیاسی جمود پیدا ہو گیا تھا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نئی دہلی میں ہوا۔ خطبہ صدارت پڑھا گیا، تقریریں ہوئیں، تجاویز پاس ہوئیں، لیکن سیاسی فضا میں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوا۔ ۱۹۳۲ء کے اول نصف میں بحیثیت صدر مسلم لیگ میری یہ کوشش رہی کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا مسلم لیگ میں ادغام ہو جائے اور اس کے کچھ امکانات بھی پیدا ہو گئے لیکن سال کے وسط میں میاں سرفضل حسین صاحب کے رخصت پر جانے کے سلسلے میں ان کی جگہ میرا عارضی تقرر عمل میں آیا اور مجھے لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا اور یہ تحریک رک گئی۔ دو ایک سال کے اندر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور مسلم لیگ نے سرنو تازگی پکڑنے لگی۔

موٹر کار کا حادثہ | دسمبر ۱۹۳۱ء میں کرسمس کی تعطیلات کا اکثر حصہ میں نے لاہور میں والدہ صاحبہ کی خدمت میں گذارا کچھ عرصہ قبل والدہ صاحبہ نے میرے متعلق ایک خواب دیکھا تھا جس کے لئے مجھے ارشاد فرمایا کہ حضرت صاحب کی خدمت میں تحریر کر کے تعبیر دریافت کرو۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ حضورؓ نے فرمایا پہلے کوئی جسمانی تکلیف پہنچے گی اس کے بعد دنیاوی مرتبے میں بلندی ہوگی۔ ۳۱ دسمبر کی سہ پہر کو والدہ صاحبہ کے ساتھ چائے پر سید انعام اللہ شاہ صاحب نے مجھے آہستہ سے کہا والدہ صاحبہ بہت افسردہ نظر آتی ہیں اس کا سبب دریافت کرو۔ میں والدہ صاحبہ کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ لیکن مجھے ان کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو رخسار سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کوئی خاص بات نہیں کل تم دلی جا رہے ہو اسلئے طبیعت افسردہ ہے۔ میں نے عرض کیا آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں فرمایا اس وقت تو تم جاؤ میں بعد میں آ جاؤں گی۔ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو میں دلی واپس جانیکے لئے اپنے مکان سے موٹر کار میں روانہ ہوا۔ رستے میں ایک دوست سے رخصت ہونے کے لئے چند منٹ نیڈوز ہوٹل ٹھہرا۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت میں نے کار میں بیٹھنے کے لئے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا تو میرے دوست نے کہا لمبا سفر ہے تمہیں اگلی نشست میں آرام رہیگا۔ بہتر ہے تم وہاں بیٹھو۔ میں نے ان کا مشورہ صائب سمجھا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا امرتسر سے گذر کر بیاس سے پار ہوئے تو میں نے وقت دیکھا دو بجنے میں بیس منٹ تھے۔ میں نے خیال کیا جالندھر اسٹیشن پر رک کر دوپہر کا کھانا کھائیں گے ہم جالندھر سے ۱۲ میل کے فاصلے پر تھے کہ ایک کار جو ہم سے آگے جا رہی تھی سڑک کے پختہ حصے سے ہٹ کر کچے حصے پر ہو گئی بارشیں نہیں ہوئی تھیں موسم بہت خشک تھا کچے حصے پر بہت گرد تھی۔ کار کے اس حصے پر جانے سے گرد کا ایک گھنا غبار اٹھا جس میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے شوفر سید عبدالکریم صاحب نے گاڑی کو ٹھہرانے کیلئے رفتار کو آہستہ بھی کر لیا اور اسے سڑک کے بالکل بائیں کنارے تک لے گئے دفعتہً کار کی ٹکر ایک بیل گاڑی سے ہوئی جو بالکل ہمارے سامنے سے آ رہی تھی لیکن جسے ہم گرد کی وجہ سے دیکھ نہیں سکے تھے۔ بیل گاڑی کا درمیانی تیر موٹر کا شیشہ توڑتے ہوئے پورے زور سے میرے بائیں رخسار پر

آکر لگا۔ بیل گاڑی کا ایک بیل وہیں مرگیا۔ کار کا RADIATOR بالکل شکستہ اور بے کار ہو گیا۔ میرے چہرے کے بائیں طرف شدید زخم آیا ایک لحظے کیلئے تو مجھے یوں احساس ہوا جیسے زندگی کا چراغ گل ہو گیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کمال ذرہ نوازی سے دماغ نے پھر کام کرنا شروع کر دیا میرے اوپر اور نیچے کے سامنے کے دانت نکل گئے اوپر کا ہونٹ درمیان سے کٹ گیا بائیں آنکھ کے گرد کی ہڈی بائیں کونے سے ٹوٹ گئی اور جلد دو تین انچ تک کٹ گئی۔ سید عبدالکریم صاحب کو بفضل اللہ کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ کار البتہ بے کار ہو گئی تھی۔ جالندھر کی طرف سے ایک خالی لاری آرہی تھی اسے ٹھہرا کر ڈرائیور کو رضامند کیا گیا کہ مجھے جالندھر کے سول ہسپتال میں پہنچا دے۔ ہسپتال پہنچنے تک خون جاری رہا لیکن میں بفضل اللہ پورے ہوش میں رہا۔ ہسپتال پہنچنے پر سٹریچر لایا گیا لیکن میں نے کہا اگر کوئی صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر رستہ بتاتے جائیں تو میں پیدل عمل جراحی کے کمرے تک پہنچ سکتا ہوں۔ عمل جراحی کی میز پر بیٹھ کر میں نے دو تار لکھوائے۔ ایک چیف کمشنر دہلی کے نام کہ مجھے دو ہفتے کی رخصت دی جائے۔ دوسرا ٹریبونل کے صدر کے نام کہ دو ہفتے تک حاضر عدالت نہیں ہو سکوں گا۔ جالندھر میں ان دنوں کنور دلیپ سنگھ صاحب جج ہائی کورٹ کے بھائی کیپٹن شمشیر سنگھ آئی۔ ایم۔ ایس سول سرجن تھے لیکن وہ نئے سال کی گھوڑ دوڑ دیکھنے لاہور تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر لوبسو صاحب تھے انہوں نے فرمایا چہرے پر زخم پھیلا ہوا ہے میں مناسب مقامات پر ٹانکے لگا کر پٹی کر دیتا ہوں دو دن میں تم لاہور کا سفر برداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے وہاں مناسب عمل جراحی کر دیا جائیگا میں نے کہا آپ مجھے کلوروفارم دیکر زخم کو اچھی طرح صاف کریں اور جو عمل ضروری ہے سب اسی وقت مکمل کر دیں۔ انہوں نے کہا میں یہ ذمہ داری لینے سے ڈرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں آپ کی رائے میں جو عمل ضروری ہے آپ اس کی تکمیل کریں۔ وہ رضامند ہو گئے اور میں نے دعا کرتے ہوئے کلوروفارم سونگھنا شروع کر دیا۔

شیخ غلام دستگیر صاحب کا مکان ہسپتال کے بالکل قریب تھا میں نے ان کی خدمت میں پیغام بھجوا دیا کہ میں ہسپتال میں اس حالت میں ہوں۔ چھٹی کا دن تھا وہ بستی تشریف لے گئے ہوئے تھے انہیں وہاں پیغام پہنچا دیا گیا وہ جالندھر تشریف لے آئے اور فوراً ایک عمدہ بستر اور ضروری سامان ہسپتال بھجوا دیا۔ جب اپریشن کے بعد مجھے ہوش آیا تو وہ میرے کمرے میں میرے پلنگ کے پاس تشریف فرما تھے۔ ضربات میرے چہرے پر تھیں اعصاب پر بہت اثر تھا۔ شیخ صاحب کی موجودگی اور ان کی توجہ میرے لئے بہت تسکین اور اطمینان کا موجب ہوئی۔ شیخ صاحب جالندھر میں چوٹی کے دیوانی وکیل تھے۔ اور بلدیہ کے صدر بھی تھے۔ انہوں نے چھ کاؤ والی موٹر گاڑی حادثے کے مقام پر بھیج دی جو میری کار کو کھینچ لائی اور سید عبدالکریم صاحب کو بھی لے آئی۔ سید صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو السلام علیکم کہہ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور رونے لگے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ ضربات کوئی ایسی شدید نہیں اور حادثے کی ذمہ داری ان پر نہیں۔ شیخ غلام دستگیر صاحب نے میرے آرام کا سامان کرنے اور میرے ساتھ عملی ہمدردی کے اظہار میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ پچیس سال قبل گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی ان کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ بعد میں بھی جب کبھی مجھے جالندھر جانے کا اتفاق ہوتا

تھا میں ان کا مہمان ہوتا تھا اور ان کے ہاں ہر طرح کا آرام پاتا تھا۔ میں ان کی پیہم نوازشوں کا کسی صورت میں کوئی بدل ان کی خدمت میں پیش نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں دونوں جہانوں میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ لاہور میں اس حادثے کی اطلاع ہوتے ہی چوہدری شہاب الدین صاحب تشریف لے آئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کیا ظفر اللہ خاں دماغ کو تو چوٹ نہیں آئی؟ میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا ہے دماغ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا اور جہاں تک اندازہ ہو سکتا ہے بائیں آنکھ بھی صدمے سے محفوظ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سید انعام اللہ شاہ صاحب اور والدہ صاحبہ بھی تشریف لے آئے۔ والدہ صاحبہ میری حالت دیکھ کر متواتر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتی رہیں کہ اس نے اس خطرناک حادثے میں ایسی حفاظت فرمائی۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب کی طبیعت بہت نفاست پسند تھی۔ ہسپتال کے کمرے کی حالت کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے مذاق میں ٹال دیا۔ بہت متعجب ہوئے کہنے لگے ظفر اللہ خاں تم عجب قسم کے آدمی ہو ہمیں تو ذرا سر درد کی بھی تکلیف ہو تو ہم اسقدر چیختے چلاتے ہیں کہ سارے محلے کو بیزار کر دیتے ہیں۔ ہم تو اسے اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ ہم تکلیف میں ہوں اور محلہ بھر میں کوئی شخص آرام کی نیند سو سکے۔ اور تم ہو کہ چہرہ تمام پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ ہونٹ کٹ گیا ہے۔ زخم کے ٹانکوں کی وجہ سے اور دانت نکل جانے سے بات کرنے کے قابل نہیں اور اس حالت میں بھی مذاق کرتے ہو۔ خود تو ہنس نہیں سکتے لیکن دوسروں کو ہنساتے ہو۔ میں نے کہا میر صاحب اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسی بلا کا سامنا ہوا اور اس نے محض اپنے رحم اور ذرہ نوازی سے جان بخشی فرمائی اور کاری ضرب سے محفوظ رکھا۔ ہنسنے اور شکر کرنے کا ہی مقام ہے رونے اور واویلا کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں۔

والدہ صاحبہ کو جب میری حالت کے متعلق اطمینان ہو گیا تو فرمایا کل میری افسردگی کا سبب یہ تھا کہ میں نے اس سے پہلی رات خواب دیکھا کہ سیاہ بادل اٹھا ہے اور آسمان پر چھا گیا ہے اس اندھیرے میں بجلی گری اور دہشتناک کڑک کی آواز آئی۔ ساتھ ہی بادل چھٹ گیا اور روشنی ہو گئی لوگوں نے کہا خیر رہی، خیر رہی۔ بس تمہارے کمرے کے دروازے کے پاس ایک سیاہ لکیر بجلی گرنے کے نشان کے طور پر باقی رہ گئی۔ میں اس خواب سے ہراساں تھی اور سارا وقت دست بدعا رہی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحم سے تمہیں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکر ہے کہ اس نے خطرہ ٹلا دیا۔ دو دن بعد میں سفر کے قابل ہو گیا اور ہم لاہور چلے گئے جہاں میو ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں کمرہ لے لیا گیا۔ لفٹننٹ کرنل بروم بڑی توجہ اور شفقت سے میری خبرگیری کرتے رہے۔ پہلے دن ہی زخموں کے معائنے کے بعد انہوں نے فرمایا ڈاکٹر لوسو نے بہت توجہ اور احتیاط سے زخموں کو سیا ہے اور ہر ممکن ضرورت کا لحاظ رکھا ہے۔ فکر کی ضرورت نہیں۔ چند دن کے بعد میں ہسپتال سے اپنے مکان ماڈل ٹاؤن چلا گیا۔ میں ابھی کام کاج کے قابل نہیں تھا۔ چہرے کے زخم اچھے ہو رہے تھے منہ کے اندر کا حصہ ابھی نازک حالت میں تھا۔ دانت اور جبڑوں پر زور دینے سے درد محسوس ہوتا تھا۔ سیال خوراک پر گذارہ تھا۔

نواب صاحب ممدوٹ کی وراثت کے مقدمہ کی پیروی | چند سال قبل نواب غلام قطب الدین خانصاحب رئیس ممدوٹ کی وفات پر ان کے چچازاد بھائی شاہ نواز خانصاحب نے جو ریاست حیدرآباد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ نواب صاحب کے وارث کی حیثیت سے ریاست ممدوٹ اور متعلقہ جائداد کا دعویٰ حکومت ہند کے سیاسی محکمے میں کیا تھا۔ اور اس کی پیروی کیلئے مجھے وکیل مقرر کیا تھا۔ حکومت ہند نے نوابی کے خطاب اور سیاسی جاگیر کا فیصلہ بحق نواب شاہ نواز خاں صاحب کیا لیکن ذاتی جائداد کے متعلق ہدایت کی کہ اراضیات کے داخل خارج کا فیصلہ فنانشل کمشنر صاحب خود کریں۔ فنانشل کمشنر صاحب نے داخل خارج کے متعلق بحث کی سماعت کیلئے ۱۷ جنوری کی تاریخ مقرر کی۔ ۱۶ جنوری کو نواب صاحب میرے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا فریق مخالف نے سید حسن امام صاحب کو وکیل مقرر کیا ہے اور وہ پٹنہ سے لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ میری حالت کو دیکھتے ہوئے نواب صاحب کی رائے ہوئی کہ ہمیں بحث کے التوا کی درخواست کرنی چاہیئے میں ابھی تک اس قابل نہیں تھا کہ زیادہ دیر کھڑا رہ سکوں اور نہ آسانی سے تقریر کر سکتا تھا۔ تاہم میں نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری طرف سے التوا کی درخواست مناسب نہ ہوگی۔ خصوصاً جب فریق مخالف کے لائق اور قابل احترام وکیل پٹنہ سے لاہور آنے کی زحمت اٹھا چکے ہیں۔ نواب صاحب نے پوچھا کہ اس حالت میں تم عدالت میں کیسے جا سکو گے؟ اور بحث میں کیسے حصہ لے سکو گے؟ میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے توفیق عطا فرمائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔ نواب صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد چار بجے سہ پہر کے قریب سید مراتب علی صاحب اور سید امجد علی صاحب تشریف لائے اور میں مکان کے چمن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ سورج چمک رہا تھا اور موسم اعتدال پر تھا۔ ہم نے وہیں ناشتہ کیا محترم سید صاحبان کے رخصت ہونے پر میں کمرے میں واپس آیا تو مجھے اعضاء شکنی اور لرزہ محسوس ہونے لگا اور ملیریا کے حملے کے آثار نمودار ہوئے۔ کمرے میں آگ جلائی گئی میں نے ۳۰ گرین کونین کھائی جو ایسی حالت میں تجربہ سے میرے لئے ہمیشہ مفید ثابت ہوتی رہی تھی۔ والدہ صاحبہ میرے کمرے میں تشریف لائیں اور میری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئیں۔ میں نے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ گو درجہ حرارت جلدی بڑھ گیا ہے لیکن میری طبیعت میں قرار ہے اور میں اندازہ کرتا ہوں کہ نیم شب تک درجہ حرارت اعتدال پر آجائے گا۔ ان کی بے چینی میں اس سے کوئی کمی نہ ہوئی اور وہ بہت اضطراب کی حالت میں دعا کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے نصف شب تک میرا بخار اتر گیا۔ والدہ صاحبہ کی طبیعت میں بھی سکون آگیا اور میں آرام کی نیند سو گیا۔ صبح کے وقت والدہ صاحبہ میرے کمرے میں تشریف لائیں اور یہ دیکھ کر کہ میں بفضل اللہ اچھی حالت میں ہوں انہیں اطمینان ہوا۔ فرمایا کل شام جو میں اسقدر مضطرب تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو خواب میں نے تمہیں جالندھر میں سنایا تھا اس کا ایک حصہ میں نے اس وقت بیان نہیں کیا تھا۔ اور خواب کا وہ حصہ میری پریشانی کا باعث ہو رہا تھا۔ خواب میں بجلی گرنے کے بعد جب مطلع صاف ہوا اور لوگوں نے کہا "خیر رہی خیر رہی" تو ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ ساتھ والے مکان پر بجلی گری ہے اور اس کی چھت اڑ گئی ہے۔ یہ سن کر ہم لوگ اپنے

مکان کی چھت پر گئے اور وہیں سے ساتھ والے مکان کی طرف دیکھا کہ چھت اڑ گئی ہوئی ہے اور شہتیریاں ننگی ہو گئی ہیں یہ حالت دیکھ کر میں نے کہا کیا خوبصورت مکان تھا اور اب کیا حالت ہو گئی ہے۔ کل شام جب تمہیں تکلیف شروع ہوئی اور تیز بخار ہو گیا تو مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں یہ میرے خواب کا دوسرا حصہ نہ ہو۔ الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہم بے کسوں پر رحم فرمایا۔ اور تمہاری تکلیف رفع ہو گئی۔

چودھری شمشاد علی خانصاحب کی وفات

چودھری شمشاد علی خاں صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ایس سی کی سند حاصل کی ابھی دنوں سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تحریک پر صوبہ پنجاب کی طرف سے سگنلز کی ایک ڈبل کمپنی بھرتی ہوئی۔ چودھری شمشاد علی خانصاحب اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس میں بھرتی ہو گئے۔ ڈبل کمپنی عراق میں جنگی فوجی خدمت کرتی رہی جنگ کے ختم ہونے پر اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ چونکہ جنگ کے دوران میں انڈین سول سروس کے مقابلے کا امتحان التوا میں رہا تھا لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ایک افسر صوبہ پنجاب سے نامزد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چودھری شمشاد علی خانصاحب نے بھی درخواست دی۔ انتخابی بورڈ نے اپنی فہرست میں ان کا نام اول نمبر پہ رکھا لیکن ان کے انتخاب کے رستے میں ایک رکاوٹ یہ تھی کہ جتنی عمر اس انتخاب کے لئے مقرر کی گئی تھی چودھری صاحب کی عمر اس سے زیادہ تھی۔ انہوں نے آئی سی ایس کے قوائد کی بناء پر استدعا کی کہ جتنا عرصہ انہوں نے ڈبل کمپنی میں جنگی فوجی خدمت میں صرف کیا وہ انہیں مجرا دیا جائے۔ بورڈ نے قرار دیا کہ نامزدگی کیلئے جو قواعد وضع کئے گئے ہیں ان کی رُو سے یہ عرصہ مجرا نہیں دیا جا سکتا لیکن بورڈ نے وزیر ہند کی خدمت میں جو رپورٹ بھیجی اس میں سفارش کی کہ وزیر ہند اپنے اختیارات سے یہ عرصہ اگر مجرا دیدیں تو چودھری شمشاد علی خانصاحب کو نامزد کیا جائے۔ اور اگر عمر کا معاملہ ان کے رستے میں روک ہو تو حمید اصغر صاحب (فرزند شیخ اصغر علی صاحب) کو نامزد کیا جائے۔ وزیر ہند نے فیصلہ کیا کہ نامزدگی کے قواعد میں ترمیم کرنا ان کے اختیار میں نہیں لیکن جو امتحان یورپین اور ہندوستانی فوجی خدمت کرنے والوں میں سے انڈین سول سروس کے افسر انتخاب کرنیکے لئے ہندوستان میں لیا جانا قرار پایا ہے اس میں شامل ہونے کی چودھری صاحب کو اجازت دیجاتی ہے۔ چودھری صاحب اس امتحان میں شامل ہوئے اس کے نتیجے میں اٹھارہ امیدوار آخری انتخاب کیلئے لندن بلائے جانے والے تھے۔ جن میں سے چھ کا انتخاب ہونا تھا۔ چودھری شمشاد علی خانصاحب اٹھارویں نمبر پر آئے اور آخری انتخاب کیلئے لندن بلائے گئے۔ انتخاب میں بفضل اللہ کامیاب ہوئے۔ انہیں طبعاً خواہش تھی کہ ان کی تعیناتی پنجاب میں ہو لیکن تعیناتی بہار میں ہوئی وطن واپسی پر جب تمام کیفیت مجھ سے بیان کی تو کہا یہ اطلاع ملنے پر کہ میری تعیناتی بہار میں ہوئی ہے مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے میں گولی مار دی ہے اور میں بالکل بے قابو ہو کر رونے لگ گیا یہ کیفیت دو تین گھنٹے تک جاری رہی اور پھر جا کر میری طبیعت سنبھلی۔ بہار میں انہیں اپنے کام میں خوب دلچسپی ہو گئی اکثر تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے کہ بہار میں تعیناتی کی اطلاع ملنے پر ان کی طبیعت میں اس قدر رنج کیوں پیدا

ہوا تھا۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب، سید افضل علی صاحب، چودھری بشیر احمد صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب کے ساتھ بھی ان کے گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے اور ہم چھ دوست آپس میں ایک مضبوط رشتۂ اخوت میں منسلک تھے۔

چودھری شمشاد علی خانصاحب کی شادی ان کے کالج میں داخل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی کی ولادت ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں جب چودھری شمشاد علی خانصاحب بھاگلپور کے حاکم ضلع تھے ان کی بڑی صاحبزادی میرے نکاح میں آئیں اور اس تعلق سے ہمارا رشتہ آپس میں اور بھی گہرا اور مضبوط ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں چودھری شمشاد علی خانصاحب چھپرہ کے حاکم ضلع تھے۔ مسافت کے لحاظ سے تو ہمارے درمیان سینکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا لیکن تعلق محبت اور اخلاص کے رُو سے ہمارے گھر دیوار بدیوار ہی تھے۔ والدہ صاحبہ کو ان کے ساتھ ان کے کالج کے زمانہ سے ہی بیٹوں کی طرح انس تھا اور انہیں بہت عزیز رکھتی تھیں۔ انہیں بھی والدہ صاحبہ کے ساتھ بہت محبت تھی۔ فرمایا کرتے تھے میں بچہ تھا جب میری والدہ فوت ہو گئیں۔ مجھے ان کا ہوش نہیں۔ مجھے ماں کی محبت کا تجربہ والدہ صاحبہ کی محبت سے ہوا ہے۔

۸ جنوری ۱۹۳۲ء کی صبح کو والدہ صاحبہ نے اپنے خواب کا دوسرا حصہ سنایا ہی تھا اور وہ ابھی میرے کمرے ہی میں تشریف فرما تھیں کہ ایک تار آیا جس میں یہ اندوہناک خبر تھی کہ شمشاد علی خاں گولی لگنے سے فوت ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون یغفر اللہ لہ ویجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔ والدہ صاحبہ کے سترہ دن پہلے کے منظر خواب کے دونوں حصے پورے ہو گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ میرے بیس سال پہلے کے خواب کے مطابق تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب وہ پنجاب تشریف لائے تھے تو مجھ سے ذکر کیا کہ وہ انڈین سول سروس کے فیملی فنڈ میں شامل ہیں اب اس فنڈ کو انگلستان منتقل کر دینے کی تجویز ہے۔ جو ہندوستانی افسر اس فنڈ میں شامل ہیں انہیں اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو اپنی ادا کردہ رقم معہ منافع واپس لے لیں اور چاہیں تو فنڈ کے انگلستان منتقل ہو جانے پر بھی بدستور فنڈ میں شامل رہیں۔ فرمایا مجھے اس وقت فنڈ سے سولہ سترہ ہزار روپے کی رقم واپس مل سکتی ہے اور میں نے لکھ دیا ہے کہ میری رقم واپس کر دی جائے۔ میں نے بڑے اصرار سے کہا کہ آپ رقم واپس نہ لیں اور فنڈ میں شامل رہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی چٹھی واپس لے لی اور فنڈ میں شامل رہے۔ ان کی وفات کے وقت ان کے نو بچے تھے۔ پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے ان میں سے صرف بڑی صاحبزادی شادی شدہ تھیں۔ باقی سب بچے اور ان کی بیگم فنڈ سے پنشن پانے کے حقدار تھے۔ ان سب کی پنشن چودھری صاحب کی وفات کے وقت بیس ہزار روپے سالانہ کے قریب بنتی تھی جو ادا ہونی شروع ہوئی۔ جیسے جیسے بچوں کی شادیاں ہوتی گئیں ان کے حصے کی پنشن ختم ہوتی گئی۔ سب سے چھوٹا بچہ تو چھوٹی عمر میں فوت ہو گیا۔ منجھلا بیٹا ۱۹۴۶ء میں فوت ہو گیا دوسرے دونوں بیٹوں کی پنشن اکیس سال کی عمر ہونے پر ختم ہو گئی۔ بڑا صاحبزادہ

نصراللہ خاں فوج میں لفٹنٹ کرنل ہوا۔ اور فوج سے منتفی ہونے کے بعد اب انٹر کانٹینٹل ہوٹل کی انتظامیہ میں ہے۔ چھوٹا سعید اللہ خاں اب فضائیہ میں ایئر کموڈور ہے۔ چوہدری صاحب کی بیگم صاحبہ محترمہ کی پنشن اب تک جاری ہے

جنوری ۱۹۳۲ء کا نصف اوّل اپنے ساتھ بہت صبر آزما صدمات لایا۔ ۱۷ جنوری کی صبح کو میں جسمانی اور جذباتی دونوں لحاظ سے سخت مجروح اور نڈھال تھا، بدن میں سکت نہیں تھی، دماغ پریشان تھا۔ تقریر کرنے کی طاقت نہیں تھی، گویائی کی قوت مضمحل تھی، لیکن عدالت میں حاضری لازم تھی اور ریاست ممدوٹ کی وراثت کے اہم مسئلے پر بحث کا آغاز مجھے کرنا تھا۔ فنانشل کمشنر سر مائیلز اِرونگ تھے۔ عدالت کے کمرے سے باہر سید حسن امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ چوہدری شمشاد علی خانصاحب کی وفات کی خبر اخبار میں دیکھ چکے تھے۔ مرحوم کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ بڑے ساتھ افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اور فرمایا تم پہلے ہی نڈھال ہو رہے تھے۔ اب تو بالکل بحث کے قابل نہ ہوگے۔ بہتر ہو ہم دونوں فنانشل کمشنر سے کہہ کر تاریخ سماعت ملتوی کرالیں۔ میں نے کہا آپ اتنی دُور سے تشریف لائے ہیں اور بحث کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں اس مرحلے پر التوا مناسب نہیں میں کسی طور انشاء اللہ نباہ کر لوں گا۔ البتہ میری یہ کوشش ہوگی کہ بحث آج ختم ہو جائے۔ کیونکہ کل صبح مجھے شمشاد علی خانصاحب کے جنازے کے امرتسر پہنچنے پر وہاں موجود ہونا ہے تاکہ وہاں سے جنازے کے ساتھ انہیں دفن کرنے کے لئے قادیان جاسکوں۔ بحث کے دوران میں مجھے بہت آہستہ بولنا پڑا تاکہ میری بات آسانی سے سمجھی جاسکے۔ دس بجے بحث شروع کر کے ایک بجے تک میں نے ختم کر لی دو بجے سید حسن امام صاحب نے بحث شروع کی اور چار بجے ختم کر دی۔ فنانشل کمشنر صاحب نے کہا جواب کل صبح سنیں گے۔ اس پر سید حسن امام صاحب نے کہا اگر آپ ایک گھنٹہ مزید اجلاس جاری رکھ سکیں تو عنایت ہوگی اور جواب بھی آج ہی ختم ہو جائے گا۔ کل صبح ظفر اللہ خاں کو ایک نہایت اندوہناک فرض کی ادائیگی کیلئے امرتسر پہنچنا ہے۔ وہ فوراً رضا مند ہو گئے۔ اور میں نے ایک گھنٹے میں جواب ختم کر لیا۔ فجزاء ھم اللہ خیراً۔ اس تنازعے کا فیصلہ آخر باہمی راضی نامے سے ہو گیا۔ نواب شاہ نواز خانصاحب نے ممدوٹ ہاؤس لاہور اور ضلع منٹگمری کی اراضیات مرحوم نواب صاحب کی بیوہ کو دینا منظور کر لیا۔ اور ریاست کی باقی تمام جائداد نواب صاحب کے نام منتقل ہو گئی۔ میں ۱۸ کی صبح امرتسر پہنچا اور شمشاد علی خاں کے جنازے کے ساتھ قادیان گیا۔ تدفین سے فارغ ہو کر اسی شام دہلی کیلئے روانہ ہو کر صبح ٹریبونل کی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ جب میں لندن کے سفر پر روانہ ہوا تھا تو پہلے سلطانی گواہ پر جرح ہو رہی تھی واپس آیا تو اس پر جرح جاری تھی۔

چوہدری شمشاد علی خانصاحب کے گھر کے لوگ چھپرہ سے میرے پاس دلی آگئے۔ اپنے ماڈل ٹاؤن والے مکان کے اوپر ہم نے دوسری منزل تعمیر کر لی اور انہوں نے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ حسن اتفاق سے ہمارے مکان سے ملحق قطعہ زمین ابھی تک خالی تھا۔ اس کے مالک اسے فروخت کرنے پر رضا مند ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد محترمہ کواجی

نے اس قطعہ پر اپنا مکان تعمیر کر لیا اور وہ ان کی مستقل رہائش گاہ بن گیا۔

گول میز کانفرنس کی مشاورتی کمیٹی | گول میز کانفرنس کے کام کو ہندوستان میں جاری رکھنے کیلئے ایک مشاورتی کمیٹی زیر صدارت لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند قائم کی گئی تھی۔ مجھے بھی اس میں نامزد کیا گیا تھا اس کا اجلاس وائسرائے کی صدارت میں دلّی میں بلایا گیا۔ مسلمانوں کو انتظار تھا کہ حکومت برطانیہ فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرے۔ اسمیں تاخیر ہو رہی تھی۔ اس لئے مسلمانوں میں یہ تحریک شروع ہوئی کہ مسلمان نمائندے مشاورتی کمیٹی کے اجلاس میں شامل نہ ہوں۔ اس سلسلے میں مولانا شفیع داؤدی صاحب میرے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ تم کمیٹی کے اجلاس میں شامل نہ ہونا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا یہ زیادہ موثر نہ ہوگا اگر شامل ہو کر کمیٹی کی مزید کارروائی تا اعلانِ فیصلہ فرقہ وارانہ نیابت بند کرادی جائے۔ فرمایا بیشک یہ زیادہ موثر ہوگا لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کارروائی بند کر دی جائے گی۔ میں نے عرض کیا میں ضامن ہوں۔ چنانچہ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ مجوزہ ریلوے اتھارٹی پر غور شروع ہوا۔ میری باری آئی تو میں نے کہا جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اسمبلی میں ہمارا کیا تناسب ہوگا ہم کسی معاملے پر غور میں حصہ نہیں لے سکتے۔ مختصر بحث کے بعد وائسرائے نے اجلاس ملتوی کر دیا اور اس طرح مشاورتی کمیٹی کا خاتمہ ہو گیا۔

وائسرائے کی کونسل پر عارضی تقرر | اپریل ۱۹۳۲ء میں ایسٹر کی تعطیلات میں میں والدہ صاحبہ سے ملنے کیلئے لاہور گیا۔ وہاں مجھے ٹیلیفون پر پیغام ملا کہ میاں سر فضل حسین صاحب کا ارشاد ہے کہ دلّی واپس جاتے ہوئے میں شملے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ کالکا سے شملے جاتے ہوئے بار بار موٹر کا ٹائر خراب ہوا اور میں اپنے اندازے کی نسبت تین گھنٹے دیر سے پہنچا۔ میں پریشان تھا کہ میاں صاحب دق ہوں گے کہ میں وقت پر نہیں پہنچا۔ اور ممکن ہے دوپہر کے کھانے پر بھی میرا انتظار کیا ہو۔ میاں نسیم حسین صاحب نے بتایا کہ میاں صاحب تو دو ہفتوں سے صاحب فراش ہیں۔ بہت کم نیچے تشریف لاتے ہیں۔ مجھے اپنے کمرے ہی میں طلب کیا اور فرمایا میری حالت دیکھ لو۔ میں نے لاچار ہو کر وائسرائے سے کہہ دیا ہے کہ مجھے لازماً چار مہینے رخصت پر جانا ہوگا۔ میں نے دریافت کیا کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ فرمایا ایبٹ آباد میں انتظام کیا ہے۔ میں نے عرض کیا ایبٹ آباد بلندی اور آب و ہوا کے لحاظ سے تو موزوں ہوگا کیونکہ زیادہ بلندی پر نہیں اور آب و ہوا معتدل ہے۔ لیکن اگر چند دن بارش نہ ہو تو سڑکوں پر گرد اڑنے لگتی ہے لہٰذا مکان ایسی جگہ ہونا چاہیئے جہاں گرد کی تکلیف نہ ہو۔ فرمایا ملک لور ے میں ایک مکان مل گیا ہے جو سڑک سے ہٹ کر واقعہ ہے اور ارد گرد باغیچہ بھی ہے۔ اب گفتگو اس نہج پر چلنے لگی کہ میاں صاحب کوئی ایسا جملہ فرما دیتے جس کا تعلق ان کے رخصت پر جانے کے ساتھ ہوتا اور میں اس کا لفظی جواب عرض کر دیتا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ چاہتے ہیں میں یہ دریافت کروں کہ انکی غیر حاضری میں انکی جگہ کون کام کریگا۔ میں نے

تہیہ کر لیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ اگر وہ بتانا پسند فرمائیں گے تو خود فرمائیں گے۔ اتنے میں چائے کا وقت ہو گیا تو میرے لئے چائے اپنے کمرے میں منگوائی۔ آخر فرمایا میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ وزیر ہند کا اصرار ہے کہ تم تیسری گول میز کانفرنس میں ضرور شامل ہو اسلئے تم دلی جاؤ تو چیف کمشنر سے کہدینا کہ تمہیں اب سازش کے مقدمے کی پیروی ترک کرنا ہو گی وہ ابھی سے سوچ لیں کہ تمہاری جگہ کس کا تقرر مناسب ہو گا۔ میں نے عرض کیا آپ کا ارشاد ہے تو میں ایسا ہی کروں گا لیکن مقدمے کی سماعت کی رفتار تو بہت ہی سست ہے۔ پچھلے سال جب میں گول میز کانفرنس میں شمولیت کیلئے لندن گیا تھا تو میری واپسی پر وہی گواہ سلطانی زیر جرح تھا جسے میں زیر جرح چھوڑ گیا تھا۔ چودھری محمد امین صاحب کو میری غیر حاضری میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ فرمایا اگلی بار تمہاری غیر حاضری لمبی ہو گی۔ پہلے چار مہینے میری جگہ کام کرنا ہو گا پھر گول میز کانفرنس میں جانا ہو گا۔ مناسب یہی ہے کہ تم مقدمے کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاؤ۔ میں نے کہا اگر آپ کی جگہ کام کرنا ہوا تو ہر صورت مجھے مقدمے سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے فرمایا میں نے وائسرائے سے بات کر لی ہے۔ وہ رضامند ہے لیکن تم اس انتظام کو پختہ جب ہی سمجھنا جب تمہیں وائسرائے کی طرف سے اطلاع ملے۔ میں نے شکریئے کے اظہار میں کچھ کہنا چاہا لیکن آپنے ٹال دیا اور مجھے فوراً رخصت کر دیا۔ میری روانگی کا وقت بھی قریب تھا۔ دوسری صبح میں دلی پہنچ گیا۔ اسی صبح ٹریبیون اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ میاں سر فضل حسین صاحب چار مہینے کی رخصت پر جارہے ہیں اور اندازہ ہے کہ ان کی جگہ اس عرصے کیلئے لاہور کے ایک وکیل کا تقرر ہو گا۔ یہ خبر پڑھ کر صفدر علی صاحب اسسٹنٹ جیلر نے جو مقدمہ سازش کے ملزمان کو جیل سے عدالت لاتے اور لے جاتے تھے ٹیلیفون پر مجھے کہا مبارک ہو معلوم ہوتا ہے میاں صاحب کی جگہ تمہارا تقرر ہونیوالا ہے۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ خبر میں کوئی نام درج نہیں۔ دوسری صبح انہوں نے پھر ٹیلیفون کیا کہ آج نام چھپ گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام ہے تمہارا نہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میری نسبت کہیں زیادہ اس کے اہل ہیں۔ اس کے تیسرے دن مجھے وائسرائے کا خط ملا۔ چونکہ معاملہ ابھی تک بصیغہ راز تھا اسلئے لازم تھا کہ جیسے انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے خط لکھا تھا میں بھی انہیں اپنے ہاتھ سے جواب لکھوں اور پھر خود ہی ڈاکخانے جا کر خط کو بذریعہ رجسٹری بھیجنے کا انتظام کروں۔ اگر یہ کام کسی اور کے سپرد کرتا تو اندیشہ تھا کہ بات ظاہر ہو جاتی۔ جواب لکھ کر میں نے گاڑی کیلئے آواز دی۔ دوپہر کا وقت تھا میری اہلیہ نے بھی میری آواز سن لی اور پوچھا گرمی میں کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا ذرا ڈاکخانے تک ایک خط رجسٹری کرانے جارہا ہوں۔ کہا عبدالکریم کو کیوں نہیں دیدیتے؟ میں نے کہا یہ کام عبدالکریم کے کرنے کا نہیں ان دنوں میڈنس ہوٹل کے پھاٹک کے برج میں ایک چھوٹا سا ڈاکخانہ تھا میں خط وہاں لے گیا اور رجسٹری کرنے کیلئے پیش کیا۔ مجھے رجسٹری کے قواعد کا علم تھا نہ خط رجسٹری کرنیکا تجربہ۔ بابو صاحب خط دیکھ کر برافروختہ ہوئے۔ شاید پتہ پڑھ کر خیال کیا ہو کہ یہ کوئی منگتا ہے جس کے بگڑے ہوئے دماغ میں خیال آیا ہے کہ چلو وائسرائے ہی سے کچھ مانگ لیں خط میری طرف واپس پھینک کر غصے کے لہجے میں کہا "آجاتے ہیں کہیں کے نہ عقل نہ سمجھ۔ یہ لو فارم اسے پر کر کے لاؤ"۔ میں نے ان سے معذرت کی اور فارم پُر کر کے پیش کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب سرکاری اعلان ہو گیا تو درگا داس صاحب نے جو شملہ میں ٹریبیون کے نمائندے تھے اخبار میں لکھا۔ "میاں صاحب کی جگہ ایک ادنٰے درجے کے وکیل کا تقرر ہوا ہے"۔

ایسے واقعات بعد میں بھی کبھی کبھی ہوتے رہے اور ہر بار میں اپنے نفس کو تنبیہہ کرتا دیکھنا کہیں گھمنڈ میں نہ آجانا۔ ہوتم منگتے ہی لیکن اپنے پیدا کرنے والے کے در کے منگتے ہی رہنا انسانوں سے کبھی حاجت روائی نہ چاہنا۔ تم وکیل رہو، یا کچھ اور بنو ہوتم ادنیٰ ہی اعلیٰ وہی ہے جسے اللہ بلند کرے، تم ادنیٰ ہو اور عاجز ہو اس کے آگے ہر وقت جھکے رہو۔ درگا داس صاحب کو میں اس سے پہلے بھی جانتا تھا۔ بعد میں تو اکثر مجھ سے ملتے رہے۔ میرے مکان پر بھی کئی بار تشریف لاتے تھے۔ میں انہیں نہایت اکرام اور تواضع سے ملتا اور وہ بھی میرے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے۔ تنقید کے طور پر کچھ کہتے تو ہنس کر کہتے۔ کئی سال بعد جب میں فیڈرل کورٹ کا جج تھا۔ ایک دن میڈنز ہوٹل کے ڈاکخانے والے بابو صاحب جو ملازمت کی میعاد پوری کر چکے تھے اپنی کسی ذاتی ضرورت کے سلسلے میں مجھے ملنے کیلئے میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں کچھ خجل ہوا کہ انہیں یاد آتا ہوگا کہ اسے تو خط رجسٹری کرانے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ معمّر تھے۔ میں ادب اور تواضع سے پیش آیا اور جو ارشاد انہوں نے فرمایا میں نے اس کی تعمیل کر دی۔

مقدمہ سازش کے ملزمان | سازش کے مقدمے کے دوران میں ملزم گیانندر اشو پوڈار کی صحت گرنے لگی اس کی طرف سے ڈاکٹر کچلو صاحب نے ضمانت کی درخواست دی۔ ڈاکٹری رپورٹ تھی کہ اسے سر میں MASTOID کی تکلیف ہے عدالت نے چھ مہینے کیلئے ضمانت منظور کر لی اور اس عرصے کیلئے عدالت میں حاضری سے بھی مستثنٰے کر دیا۔ جب چھ مہینے کے بعد وہ عدالت میں حاضر ہوئے تو صحت اچھی ہونے کی ڈاکٹری رپورٹ پر انہیں پھر حوالات بھیج دیا گیا۔ تین چار ہفتے کے بعد انکی صحت پھر گرنا شروع ہو گئی، وہ بہت خاموش طبع نوجوان تھے۔ شہادت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابتداء میں سازش میں شریک ہوئے تھے لیکن بعد میں الگ ہو گئے کسی خاص جرم میں انہوں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ وقت آنے پر میں ان کے خلاف فرد جرم عائد کئے جانے پر زور نہیں دوں گا۔ وہ دوسرے ملزمان کے ساتھ عدالت میں آتے ایک طرف بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھتے تھک جاتے تو ملزمان کے کٹہرے کے اندر ہی فرش پر لیٹ کر سو جاتے۔ ان کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی، میں فکر مند تھا اسلئے ایک روز ڈاکٹر کچلو صاحب سے کہا، پوڈار کی صحت پھر گر رہی ہے آپ دوبارہ اس کی ضمانت کیلئے درخواست کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے ہنستے ہوئے فرمایا جیل کے ڈاکٹر کو دینے کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ میں نے کہا حکومت ہزار روپے ماہوار صفائی کے اخراجات کے لئے دیتی ہے آخر وہ ساری رقم شربت، مٹھائی پر تو خرچ نہیں ہو جاتی۔ خیر جو کچھ بھی ہے آپ ضمانت کی درخواست دیں آخر ڈاکٹر کو کچھ تو رپورٹ کرنا ہوگی۔ درخواست پیش ہوئی۔ عدالت نے مجھ سے دریافت کیا میں نے کہا ڈاکٹری رپورٹ طلب ہونی چاہئیے۔ رپورٹ آئی۔ ایک فقرہ ادھر دوسرا ادھر اور طبی اصطلاحات کے جھمیلے میں مطلب خبط۔ البتہ آخر میں لکھا تھا کہ اس کا وزن کم ہو رہا ہے۔ عدالت نے مجھ سے دریافت کیا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اس ملزم کو پہلے ضمانت پر اس لئے رہا کیا گیا تھا کہ اسے MASTOID کی تکلیف ہے۔ اس عارضے کا علاج عموماً عمل جراحی سے ہوتا ہے۔ اس امر کے متعلق ڈاکٹری رپورٹ میں کچھ درج نہیں کہ کوئی عمل جراحی ہوا یا نہیں اور اب MASTOID کی کیا کیفیت ہے اکثر حصہ رپورٹ کا مبہم ہے

جس سے میں تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ میرا شاہدہ اسباب کی تائید کرتا ہے کہ اس ملزم کی صحت گر رہی ہے ڈاکٹری رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اس کا وزن کم ہو رہا ہے۔ اندریں حالات میں حکومت کی طرف سے یہ ذمہ داری لینے کیلئے تیار نہیں کہ اسے حوالات میں رکھا جائے۔ اس پر عدالت کیلئے سوائے ضمانت منظور کرنے کے اور چارہ نہ رہا۔

جب ٹریبونل کی عدالت میں میرے آخری دن کی کاروائی ختم ہوئی تو پریذیڈنٹ صاحب نے چند رسمی الوداعی کلمات فرمائے۔ ڈاکٹر کچلو صاحب نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس پر ملزمان میں سے دو صاحب کھڑے ہو گئے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید میرے خلاف کچھ احتجاج کیا چاہتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ "ٹریبونل کے صدر صاحب اور ہمارے وکیل صاحب نے جو کچھ کہا ہے ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ ہم ظفراللہ خان کی قانونی قابلیت کا اندازہ تو نہیں کر سکتے لیکن ہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اس نے سرکار کی طرف سے اس مقدمہ کی پیروی پوری شرافت کے ساتھ کی ہے"۔ اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی ہے کہ مجھے گوشۂ گمنامی سے اٹھا کر وائسرائے کی مجلسِ عاملہ میں محض اپنے لطف و کرم اور ذرہ نوازی سے بٹھا دیا ساتھ ہی ڈاکخانے کے بابو صاحب سے میری عقل اور سمجھ کا معیار مجھے بتا کر اور درگا داس صاحب سے میری قابلیت کا اندازہ قائم کرا کر مجھے بے جا فخر اور گھمنڈ سے بچا لیا۔ پھر اس ارحم الراحمین کی شفقت جوش میں آئی اور دو نوجوان ملزمان کے منہ سے جن پر دہشت پسندی اور سازش کے الزام تھے اور جنہیں میں حکومت کے وکیل کی حیثیت میں زندان میں ڈلوانے کی سعی کر رہا تھا ایسے الفاظ کہلوا دیئے جو اِن حالات میں ملزمان کی طرف سے وکیل استغاثہ کے حق میں شاید ہی کبھی کہے گئے ہوں۔ شام کی گاڑی سے میں لاہور جانے کے لئے روانہ ہوا تو ملزمان میں سے پروفیسر نگھم اور ان کے ایک اور رفیق جو پہلے سے ضمانت پر رہا تھے مجھے الوداع کہنے کیلئے اسٹیشن پر آئے اور لوپڈار کی طرف سے پیغام لائے کہ اگر وہ آنے کے قابل ہوتے تو ضرور آتے۔

دوسرے دن لاہور میں یونینسٹ پارٹی کی طرف سے میاں صاحب کے اعزاز میں لنچ دیا گیا۔ میں نے میاں صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ کام کے متعلق مجھے کچھ ہدایات فرما دیں۔ فرمایا میں ہر وقت تمہارے پہلو میں تو کھڑا نہیں رہ سکوں گا تم اپنی ہمت سے تیر سکو گے یا کم ہمتی سے غرق ہو گے۔ البتہ ایک بات ہے۔ باجپائی کے سیکریٹری ہونے پر جائنٹ سیکریٹری کا عہدہ خالی ہو گا۔ میں نے کوشش کی تھی وائسرائے راگھیندرہ کے تقرر پر رضامند ہو جائیں لیکن چونکہ ریڈسر وس میں اور محکمے میں راگھیندرہ سے سینیئر ہے وہ رضامند نہ ہوئے۔ وہ عارضی تقرر تھا اب تمہارے وقت میں مستقل تقرر کا فیصلہ ہو گا۔ اگر راگھیندرہ کا تقرر ہو سکے تو میرے لئے اطمینان کا باعث ہو گا۔

خان بہادر ڈنشا نادرشاہ پرسنل اسسٹنٹ | اسی شام میں لاہور سے شملے روانہ ہو گیا میاں صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ خان بہادر ڈنشا نادرشاہ میرے ہمراہ تھے۔ کالکا سے ہم کرایہ کی موٹر پر شملہ گئے۔ جب پہاڑ کا سفر شروع ہوا تو میں نے خان بہادر صاحب سے کہا آپ جانتے ہیں مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں اور میں شملہ اور

دلی کے ارباب حل و عقد سے بھی شناسا نہیں۔ آپ جہاں تک ہو سکے مجھے کام کرنے کے طریق اور حکام سے میل جول کے آداب سے مطلع کر دیں۔ انہوں نے کچھ ضروری باتیں اس وقت بتلا دیں بعد میں بھی بہت مفید رفیق کار ثابت ہوئے۔ ان کے تجربے سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ شملہ میں میری رہائش ریٹریٹ میں تھی جو میاں صاحب کا سرکاری بنگلہ تھا۔ میاں صاحب از راہ عنایت اپنا سب ذاتی سامان میرے استعمال کیلئے میری سہولت کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ مجھے اس بارے میں کوئی تردد نہ کرنا پڑا اور میاں صاحب کی نوازش سے بہت آرام ملا۔ فجزاہ اللہ خیرا۔ مکان پر پہنچنے کے چند منٹ بعد خان بہادر صاحب نے بتایا کہ مسٹر ریڈ جو ان دنوں میاں صاحب کے محکمہ کے قائمقام سیکرٹری تھے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کس وقت ملاقات کیلئے آئیں اور وہ کہتے ہیں کہ باقی افسران محکمہ بھی یہی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہہ دیجئے میں کل صبح دس بجے خود دفتر آؤں گا سیکرٹری صاحب اُس وقت میرے کمرے میں تشریف لے آئیں اور پھر میرے ساتھ چلیں۔ تاکہ میں محکمہ کے ہر افسر سپرنٹنڈنٹ اسسٹنٹ اور کلرک کے کمرے میں جاکر ان سے ملوں۔ خان بہادر نادر شاہ نے کہا آپ جیسے کہتے ہیں میں ان سے کہے دیتا ہوں لیکن یہ یہاں کا دستور نہیں۔ افسروں کا فرض ہے کہ وہ آکر ملیں۔ میں نے کہا بیشک یہاں یہی دستور ہوگا لیکن میرا یہ دستور نہیں۔ میں باہر سے آیا ہوں وہ یہاں موجود ہیں میرا فرض ہے کہ میں خود جاکر اپنا تعارف کراؤں۔

وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شرکت کے لئے تیاری

اسی شام وائسرائے کی کونسل کا اجلاس تھا۔ ان ایام میں تیسری گول میز کانفرنس کی تیاری کے سلسلے میں حکومت ہند کی طرف سے مختلف متعلقہ مسائل پر تفصیلی مراسلات وزیر ہند کی خدمت میں بھیجے جارہے تھے۔ مراسلے کا مسودہ متعلقہ محکمہ تیار کرتا تھا۔ کونسل میں اس پر غور ہو کر اور اگر کوئی ترمیمات منظور ہوں تو انہیں عمل میں لا کر مراسلہ لندن بھیج دیا جاتا تھا اُس شام کے اجلاس میں محکمہ دفاع کے مراسلے کا مسودہ زیر بحث آنا تھا۔ مجھے امور دفاع کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا پریشان ہوا کہ پہلے ہی دن ایک ایسا موضوع زیر غور آئیگا جس کے متعلق میں کچھ بھی تو نہیں جانتا۔ گو یہ ضروری نہیں تھا کہ میں بحث میں حصہ لیتا۔ لیکن یہ تو لازم تھا کہ مجوزہ مراسلے کی جن تجاویز کی میں تائید کروں ان کے حسن و قبح پر مجھے کچھ اطلاع ہو۔ میں نے مسودے کا مطالعہ اس دعاء کے ساتھ شروع کیا۔ "یا اللہ تجھے سب علم ہے اور سب قدرت ہے تو اپنے فضل و رحم سے میرے ذہن کو جلا بخش اور میری رہنمائی فرما۔" مسودہ پڑھتے ہوئے میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ حکومت کے مرکزی دفاتر کی کارکردگی بڑے اعلیٰ پیمانے کی ہے کیونکہ مسودہ میں امور متعلقہ کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔ جیسے جیسے میں پڑھتا گیا مجھے کچھ اطمینان ہوتا گیا کہ یہ معاملات اب مشکل اور پیچیدہ نہیں جیسے مجھے خدشہ تھا پڑھتے پڑھتے جہاں مجھے خیال ہوتا کہ یہاں اصلاح کی گنجائش ہے میں حاشئے پر پنسل سے خط کھینچ دیتا جب میں ختم کر چکا تو میرے دل

میں اللہ تعالیٰ کے شکر کا گہرا احساس تھا کہ اس نے مجھے ایک ایسے امر کے سمجھنے کا محض اپنے فضل سے فہم عطا فرمایا جسے میں مشکل گردانتا تھا۔

وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں طریق کار

اجلاس کے لئے وائسریگل لاج حاضر ہوا۔ دستور یہ تھا کہ اجلاس کے وقت سے چند منٹ پہلے اراکین کونسل اور کمانڈر انچیف وائسرائے کے اے ڈی سی کے بڑے کمرے میں جو استقبالیہ کمرہ تھا پہنچ جاتے۔ وہاں سے ان کے ہمراہ پہلی منزل پر اجلاس کے کمرے میں جاکر اپنی اپنی نشست پر بیٹھ جاتے۔ دو تین منٹ بعد دوسری جانب سے وائسرائے تشریف لے آتے۔ لارڈ ولنگڈن کے زمانے میں لباس کے متعلق کوئی پابندی نہیں تھی۔ کمانڈر انچیف فوجی وردی میں ہوتے اور سویلین اراکین دن بھر کے معمولی لباس میں۔ لارڈ ولنگڈن آتے ہی اپنے رفقا کے ساتھ بے تکلفی سے دو چار منٹ عام گفتگو فرماتے۔ پھر پرائیویٹ سیکرٹری سے دریافت فرماتے۔ "ایرک! آج کیا کام ہے؟" سر ایرک میول وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری (جو کمرے کے کونے میں اپنی الگ میز لگائے بیٹھے ہوتے) ایجنڈے میں جو امر نمبر اول پر درج ہوتا اس کا نام لے دیتے۔ وائسرائے رکن متعلقہ کو ارشاد فرماتے:۔
"WELL, MY DEAR?" اس پر رکن متعلقہ مختصر طور پر معاملہ پیش کرتے۔ آٹھ دس منٹ میں باقی اراکین میں سے جو چاہتا اظہار رائے کرتا۔ دس میں سے نو امور پر اس اظہار رائے کے دوران ہی میں اتفاق ہو جاتا کہ کیا فیصلہ مناسب ہوگا۔ کسی نہایت اہم معاملے پر یا ایسے معاملے پر جس کے متعلق آخر تک اختلاف قائم رہے رائے شماری کی نوبت آتی۔ لارڈ ولنگڈن خود اپنی طرف سے بہت کم کسی رائے کا اظہار کرتے۔ صرف کبھی کبھی کوئی جملہ وضاحت کے طور پر فرماتے جس سے فیصلے میں آسانی ہو جاتی۔ جو فیصلہ بھی ہوتا وہ اسے بشاشت سے اپنا لیتے۔ اس طریق سے اکثر امور جلد بالاتفاق طے پا جاتے جن میں اختلاف قائم رہتا ان کے متعلق بھی کسی قسم کی کشیدگی پیدا نہ ہوتی۔ لارڈ لنلتھگو کے آنے پر اس طریق کار میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی۔ لباس کے متعلق ہدایت جاری ہوئی کہ کونسل کے اجلاسوں میں مارننگ سوٹ لازمی لباس ہوگا۔ سر جیمز گرگ وزیر خزانہ ایسی پابندیوں کے سخت مخالف تھے اور ضیاع اوقات کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ وہ اس ہدایت پر بہت چیں بجبیں ہوئے لیکن عمل کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو مجھ سے کہا اس فضول رسم کو بند کریں میں نے کہا کیسے بند ہو کہا اگر تم میرے ساتھ اتفاق کرو تو میں پرائیویٹ سیکرٹری سر گلبرٹ لیتھویٹ سے کہہ دوں کہ ہم دونوں کو اس قدر مصروفیت ہے کہ ہم کونسل کے اجلاس کے لئے لباس بدلنے کیلئے وقت نہیں پاتے۔ میں نے کہا ضرور کہہ دیجئے۔ اس پر یہ ہدایت منسوخ ہوگئی۔ لیکن کونسل کے اجلاسوں میں وہ بے تکلفی کا ماحول پیدا نہ ہوا جو لارڈ ولنگڈن کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لارڈ لنلتھگو کسی رفیق کار کو اس کے نام سے نہیں پکارتے تھے۔ عہدے کا نام لیکر خطاب کرتے تھے طرز خطاب نہایت خشک اور رسمی ہوتا تھا ہر رکن اپنی باری پر بولتا تھا۔ ہر معاملے میں رائے شماری ہوتی تھی نتیجہ یہ تھا کہ اکثر معاملات میں اختلاف ہوتا تھا۔ لارڈ لنلتھگو اپنی رائے شروع میں ظاہر کر دیتے تھے جو اتفاق کا نہیں بلکہ اختلاف کا موجب ہو جاتی تھی۔ لارڈ ولنگڈن نے ایک دفعہ مجھ سے کہا میں نے تو اپنے لئے یہ قاعدہ تجویز کیا ہوا ہے کہ جس

معاملے میں میرے تینوں ہندوستانی رفقاء متفق ہوں میری رائے ان کی تائید میں ہوگی خواہ تینوں یورپین اراکین اور کمانڈر انچیف
کی رائے خلاف بھی ہو۔ ایسی صورت میں چونکہ ہم چار ایک طرف اور وہ چار دوسری طرف ہوں گے لہذا میرا کاسٹنگ ووٹ فیصلہ
کن ہوگا۔ میں نے لارڈ ولنگڈن کو ہمیشہ اس قاعدے کی پابندی کرتے دیکھا۔ لیکن بہت کم معاملات میں کاسٹنگ ووٹ کی نوبت آتی
کیونکہ یورپین اراکین میں سے ایک دو لارڈ ولنگڈن کے ساتھ ضرور شامل ہوتے۔ کمانڈر انچیف سر فلپ چیٹوڈ ان کے ہم مکتب
رہے تھے اور دونوں کا آپس میں بہت دوستانہ تھا وہ عام سیاسی یا انتظامی امور میں بہت کم رائے زنی کرتے تھے۔ لیکن جب
کچھ کہتے تو بہت کام کی بات کہتے۔ اگر دیکھتے کہ کونسل میں وائسرائے کی رائے سے اختلاف ہو رہا ہے تو یا ان کی تائید کرتے یا کوئی
ایسا حل تجویز کرتے جس پر اتفاق ہو جاتا۔ لارڈ ولنگڈن کے وقت میں طریق کار ایسا ہی رہا ان کی شخصیت بھی ایسی تھی کہ کونسل
کے اجلاسوں میں کام سہولت سے ہوتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے عہد میں ہندوستانی نقطۂ نظر اور ہندوستانی امنگوں اور جذبات
کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ لارڈ لنلتھگو کے زمانے میں عملاً آئینی قدم تو آگے بڑھا لیکن ہندوستانی جذبات کا اتنا خیال
نہیں رکھا جاتا تھا جتنا لارڈ ولنگڈن رکھتے تھے۔ لارڈ ولنگڈن پہلی ہی ملاقات میں ملاقاتی کے دل میں یہ تاثر پیدا کرنے میں
کامیاب ہو جاتے تھے کہ انہیں ملاقاتی کا احترام ہے اور اس کے جذبات اور خواہشات کے ساتھ ہمدردی ہے۔ لارڈ لنلتھگو
کے متعلق ضرور یہ تاثر رہتا تھا کہ خشک مزاج ہیں۔ میرے ذاتی تعلقات تو ان کے ساتھ بھی ہمیشہ اچھے رہے اور وائسرائے
ہونے کے عرصے میں اور بعد میں بھی ان کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ رہا لیکن وہ اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے۔
فرمایا کرتے تھے جہاں دوسرے امور میں مساوات ہو میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ میں ہر بار ہندوستانی کو ترجیح
دیتا ہوں لیکن ان کی نگاہوں میں دوسرے امور میں مساوات شاذ ہی ہوتی تھی۔

وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں پہلی مرتبہ شمولیت

میں کونسل کے اجلاس میں شرکت کیلئے وائسریگل لاج پہنچا اپنے رفقاء کے ساتھ
میری پہلے سے شناسائی تھی۔ کمانڈر انچیف صاحب کے ساتھ پہلی بار ملاقات ہوئی
ان کے چیف آف سٹاف جنرل سر کینتھ وگرم اس اجلاس میں ان کے ساتھ تھے کیونکہ محکمہ دفاع کے مراسلے کا مسودہ زیر بحث
آنیوالا تھا۔ اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے میں نے حلف لیا اور پھر محکمہ دفاع کے مسودے پر گفتگو شروع ہوئی۔ وزیر ہند کی
خدمت میں جانے والے مراسلات چونکہ نہایت اہم امور پر مشتمل ہوتے تھے اسلئے ان پر بہت توجہ دیجاتی تھی اور ہر پیراگراف پر
علیحدہ علیحدہ غور کیا جاتا تھا۔ میرا کونسل کے اجلاس میں شامل ہونے کا پہلا تجربہ تھا مسودہ زیر غور کے اکثر پیراگرافس
پر تو اتفاق رائے سے صاد ہوگیا۔ بعض پیراگرافس میں مجھے اصلاح کی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ اپنی باری پر میں ان میں
ترمیم کی تجویز پیش کرتا رہا اور جنرل وگرم سے مشورہ کرنے کے بعد کمانڈر انچیف میری ترمیم کو منظور کرتے رہے۔ کونسل کا اجلاس
ختم ہونے پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے واپس آگیا۔

محکمہ جات کے افسران اور کارکنان سے پہلی تعارفی ملاقات

دوسری صبح میں دفتر گیا۔ مسٹر ریڈ میرے کمرے میں تشریف لے آئے اور میرے محکموں کے ہر افسر، سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ اور کلرک کے کمرے میں جاکر ایک ایک کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ دوپہر تک میں نے اپنے مختلف محکموں کے سینکڑوں کارکنان کے ساتھ ملاقات کی۔ میرے قلمدان میں تعلیم، صحت اور اراضیات کے علاوہ تیرہ چودہ متفرق محکمہ جات شامل تھے مثلاً آثار قدیمہ، سمندر پار بسنے والے ہندوستانی سروے آف انڈیا وغیرہ وغیرہ۔

CAPITATION RATES TRIBUNAL میں حکومت ہند کی طرف سے پیروی کی پیش کش

ہندوستان میں جو برطانوی فوج کے دستے رکھے جاتے تھے ان کی تنخواہیں اور جملہ اخراجات تو ہندوستان کی طرف سے ادا ہوتے ہی تھے لیکن ان کے علاوہ ان دستوں کی بھرتی اور ٹریننگ پر جو اخراجات حکومت برطانیہ نے برداشت کئے ہوتے تھے ان کا ایک حصہ بھی ہندوستان کو ادا کرنا ہوتا تھا۔ ان واجبات کا نام CAPITATION CHARGES تھا۔ انکی جو شرح تجویز شدہ تھی اس پر ہندوستان کی طرف سے عذر کیا گیا تھا کہ اس میں تخفیف ہونی چاہئے۔ اس قضیئے کے تصفیئے کیلئے ایک عدالت قائم کی گئی تھی جس میں دو برطانوی جج شامل تھے اور دو ہندوستانی جج سر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ اور سر شادی لال چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ شامل کئے گئے تھے۔ ایک آسٹریلین جج صدر تھا۔ اس عدالت کا نام CAPITATION RATES TRIBUNAL تھا۔ اس کے اجلاس لندن میں ہونیوالے تھے۔ میرے شملہ پہنچنے کے چند دن بعد وائسرائے نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ کمانڈر انچیف چاہتے ہیں کہ اس عدالت کے روبرو ہندوستان کی طرف سے تم وکالت کرو۔ ادھر وزیر ہند مصر ہیں کہ تم تیسری گول میز کانفرنس میں ضرور شامل ہو۔ دونوں کا وقت ایک ہی ہے تم جیسے چاہو انتخاب کرلو۔ مجھے سوچ کر بتادینا۔ میں نے عرض کیا مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میں کمانڈر انچیف کا ان کے انتخاب کیلئے نہایت ممنون ہوں لیکن میں گول میز کانفرنس میں جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں وہاں میں اپنے ملک کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً زیادہ مفید خدمت کرسکوں گا۔ میں نے سمجھ لیا کہ محکمہ دفاع کے مراسلہ کے مسودہ میں جو ترامیم کونسل کے اجلاس میں میں نے تجویز کی تھیں وہ کمانڈر انچیف کو مناسب معلوم ہوئیں اور اسی لئے ان کی طرف سے مجھ پر اس اعتماد کا اظہار ہوا۔ گو میں کمانڈر انچیف کی اس تجویز کے مطابق تو عمل نہ کرسکا لیکن وہ جب تک ملازمت میں رہے مجھے ہمیشہ ان کا اعتماد حاصل رہا۔ پنشن پر چلے جانے کے بعد بھی جب کبھی انگلستان میں ملاقات کا اتفاق ہوتا وہ بہت تپاک سے ملتے اور بڑی تواضع سے پیش آتے۔

محکمہ تعلیم، صحت و اراضیات کے سکریٹریٹ میں انگریز افسران کی بجائے ہندوستانی افسران کا تقرر

اسی سال کے اوائل میں میرے تقرر سے پہلے محکمہ تعلیم صحت و اراضیات کے سکریٹری سر فرینک نوائس وائسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے تھے۔ میں نے ایسے ہی میاں صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی جگہ سکریٹری کون ہوگا۔ انہوں نے فرمایا باجپائی کو سیکریٹری نہ کیا گیا تو بڑی بے انصافی ہوگی۔ چنانچہ آپ نے سر گرجاشنکر باجپائی کی سفارش کی وائسرائے نے کچھ

تامل کیا۔ میاں صاحب کے زور دینے پر کہا باجپائی کی صحت اچھی نہیں خون کے دباؤ کا عارضہ ہے۔ آخر یہ طے پایا کہ باجپائی صاحب وہ اپنا جاکر معائنہ اور علاج کرائیں اور جب صحت کی بحالی کا سرٹیفکیٹ پیش کریں تو ان کا تقرر بطور سیکرٹری کیا جائے۔ وہ رخصت پر گئے تو سوال پیدا ہوا کہ قائمقام سیکرٹری کون ہو۔ میاں صاحب نے مسٹر رام چندرہ کی سفارش کی وائسرائے نے کہا یہ عارضی تقرر ہے مسٹر ریڈ سروس میں بھی سینئر ہیں اور محکمے میں بھی سینئر ہیں قائمقام سیکرٹری انہیں ہونا چاہیئے۔ جب میاں صاحب رخصت پر گئے تو مسٹر ریڈ قائمقام سیکرٹری تھے، مسٹر رام چندرہ قائمقام جائنٹ سیکرٹری تھے اور مسٹر صالح اکبر حیدری قائمقام ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ مجھے چارج لئے ابھی تین ہفتے ہوئے تھے کہ باجپائی صاحب نے وہ آنا سے بحالی صحت کا سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ سول سرجن صاحب نے تصدیق کی کہ باجپائی صاحب کی صحت اب بالکل بحال ہو چکی ہے۔ میں نے وائسرائے سے ذکر کیا اور اجازت چاہی کہ اب میں ان کی تقرری کا حکم لکھ دوں انہوں نے فرمایا لکھ دو اگرچہ مجھے سمجھ نہیں آتی فضل حسین کیوں اس کے اتنے گرویدہ ہیں۔ میں نے کہا اب جائنٹ سیکرٹری کی جگہ بھی خالی ہوگی اسے بھی پر کرنا ہے وائسرائے نے کہا میں تو چاہتا تھا کہ ریڈ کو جائنٹ سیکرٹری کیا جائے کیونکہ وہ سینئر ہے لیکن فضل حسین اسے پسند نہیں کرتے تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا مجھے کام کرتے تھوڑا عرصہ ہوا ہے میں ابھی ریڈ اور رام چندرہ کے کام کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا آپ دورے پر جا رہے ہیں آپ کی واپسی پر کچھ عرض کروں گا۔ چند دن بعد مسٹر ریڈ نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ مسٹر باجپائی کے واپس آنے پر جائنٹ سیکرٹری کے تقرر کا سوال پیدا ہو گا مجھے سر فضل حسین نے کہا تھا کہ تم سینئر ہو تمہارا استحقاق افضل ہے۔ امید ہے تم اس کے ساتھ اتفاق کرو گے۔ میں نے کہا مجھے تو میاں صاحب نے ایسا نہیں کہا۔ مسٹر ریڈ نے پوچھا کیا مجھے اجازت ہے کہ میں سر فضل حسین کو خط لکھوں اور ان سے وضاحت کرا لوں۔ میں نے کہا بیشک لکھیئے میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے خود بھی میاں صاحب کی خدمت میں لکھ دیا کہ مجھے خوب یاد ہے آپ نے اس معاملے میں مجھے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن چونکہ مسٹر ریڈ کو کچھ غلط فہمی ہے اس لئے میں نے اسے اجازت دیدی ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں وضاحت کیلئے خط لکھ دیں۔

میاں صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ میں نے ریڈ کے خط کے جواب میں وضاحت کر دی ہے۔ میاں صاحب اپنے والا نامول میں ہمیشہ مجھے ڈیر ظفر اللہ کے الفاظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس خط میں انہوں نے "ڈیر چودھری صاحب" لکھا۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میں کس تقصیر کی پاداش میں "ظفر اللہ" سے "چودھری صاحب" ہو گیا ہوں۔ جواب میں فرمایا اب تم بڑے عہدے پر متعین ہو میں نے خیال کیا شاید اب نام سے مخاطب کیا جانا تم پر گراں گذرے۔ میں نے اس پر احتجاج کیا تو مجھے تسلی دی کہ میرے دل میں تمہارے متعلق کوئی تبدیلی نہیں۔ میں نے خیال کیا ممکن ہے میاں صاحب نے طرز خطاب میں تبدیلی میری آزمائش کے طور پر کی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مسٹر ریڈ نے مجھے بتایا کہ ان کے خط کے جواب میں سر فضل حسین نے انہیں دو خط لکھے ہیں۔ ایک رسمی جو ان کے خط کے جواب کے طور پر مسل پر رکھا جائے گا۔ اس میں اتنا ہی لکھا تھا میں نے قائمقام وزیر کو اپنی رائے لکھ بھیجی ہے۔ دوسرا خط پرائیویٹ تھا جس میں میاں صاحب نے وضاحت کی تھی کہ ان کی قائمقام

تقرری ان کے سنیئر ہونے کے لحاظ سے ہوئی تھی لیکن مستقل تقرری کیلئے میاں صاحب کی رائے مسٹر رام چندرہ کے حق میں ہے۔ مسٹر ریڈ نے مجھ سے کہا اس سے میرے لئے مشکل پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو میں سر فضل حسین صاحب کیلئے کوئی دقت پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ ان کی مرضی کے خلاف اگر میرا تقرر ہو بھی جائے تو اس سے نہ صرف وہ ہی ناخوش ہوں گے میں بھی آزردہ رہوں گا۔ دوسری طرف اگر مسٹر رامچندرہ کو مجھ پر ترجیح دیجائے تو مجھ پہ حرف آتا ہے۔ اس مشکل کا ایک حل میرے ذہن میں آتا ہے اس میں تمہاری مدد درکار ہے۔ میرے دریافت کرنے پہ کہا کہ مسٹر باجپائی ۸ راگست کو واپس آنیوالے ہیں۔ اس دن سے وہ سیکریٹری ہوں گے اور جائنٹ سیکریٹری کا عہدہ خالی ہوگا۔ مسٹر رام چندرہ ۸ راگست سے ۱۹ راکتوبر تک رخصت لینا چاہتے ہیں اس عرصے میں تم وزیر ہو گے اگر تم مجھے ۸ راگست سے جائنٹ سیکریٹری مقرر کر دو تو میں ۱۹ راکتوبر سے رخصت لے لوں گا اور رخصت سے واپسی پر اپنے صوبے میں واپس چلا جاؤں گا۔ ۱۹ راکتوبر سے مسٹر رامچندرہ جائنٹ سیکریٹری ہو جائیں گے۔ میں نے کہا اگر اس طرح آپ کی مشکل رفع ہوتی ہے تو میں بخوشی یہ تجویز وائسرائے کی منظوری کیلئے پیش کر دوں گا۔ اور مجھے یقین ہے وہ منظوری دیدیں گے۔ جب وائسرائے دورے سے واپس آئے تو میں نے یہ بات ان سے چھیڑی انہوں نے پوچھا تمہاری کیا رائے قائم ہوئی؟ میں نے کہا ریڈ شریف طبع افسر ہے۔ میں نیا ہوں مجھے ضرورت ہے کہ سیکریٹری اپنے نوٹ میں معاملے کی وضاحت کرکے اپنی رائے پختہ اور واضح طور پہ بیان کرے۔ فیصلہ کرنا بیشک میرا کام ہے لیکن سیکریٹری کا نوٹ مجھے معاملہ زیر غور کے حسن و قبح پہ مطلع کرنے والا ہونا چاہیئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اپنا نوٹ لکھنے سے پہلے مسٹر ریڈ میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اور جس طرف میرا رجحان پاتے ہیں ویسا ہی نوٹ لکھ بھیجتے ہیں جس سے مجھے بہت کم مدد ملتی ہے۔ مسٹر رامچندرہ بھی کام کے لحاظ سے غنیمت ہیں ریڈ سے کچھ بہتر ہیں لیکن ایسا نمایاں فرق نہیں کہ میں انہیں ریڈ پہ ترجیح دینے پہ زور دوں البتہ ایک فوقیت انہیں ضرور حاصل ہے۔ میرے قلمدان میں سمندر پار ہندوستانیوں کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور کام کی موجودہ تقسیم میں یہ مسئلہ جائنٹ سیکریٹری کے سپرد ہے۔ مسٹر رامچندرہ اس کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ مسٹر ریڈ کو اس کا تجربہ نہیں۔ تاہم اگر مسٹر ریڈ نے میرے ساتھ ہی کام کرنا ہوتا تو میں ان کے ساتھ گذارہ کر لیتا لیکن میں تو ۲۰ راکتوبر کو رخصت ہو جاؤں گا۔ سر فضل حسین ریڈ کے تقرر کے حق میں نہیں۔ اگر ریڈ کا تقرر ہو بھی جائے تو دونوں کیلئے مشکل ہوگی۔ ریڈ نے جو اس مشکل کا حل تجویز کیا تھا وہ میں نے بیان کیا۔ پوچھا تم اس پہ راضی ہو؟ میں نے کہا میں راضی ہوں تو فرمایا پھر ایسا ہی لکھ دو۔ میں نے کہا اس سلسلے میں ڈپٹی سیکریٹری کا عہدہ خالی ہوگا۔ صالح حیدری قائم مقام ڈپٹی سیکریٹری ہیں قابل اور ہونہار افسر ہیں۔ آپ متفق ہوں تو ان کا تقرر ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے پہ کر دیا جائے۔ کہا بڑی خوشی سے۔ چنانچہ اس کے متعلق میں نے احکام دیدیئے۔

لارڈ ولنگڈن کا طریق تھا کہ وہ زبانی گفتگو میں تجاویز کی منظوری دیدیتے جو کچھ طے پاتا اس کے مطابق متعلقہ

وزیر مسل پر حکم لکھ دیتا اور آخر میں وائسرائے کی منظوری کا ذکر کر دیتا۔ وائسرائے کی تحریری منظوری کیلئے وائسرائے کو مسل بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ لارڈ لنلتھگو نے یہ طریق بدل دیا ان کے ساتھ بھی معاملہ پہلے زبانی طے پاتا۔ متعلقہ وزیر اس کے مطابق سفارش لکھ کر مسل ان کی خدمت میں بھیج دیتا اور وہ اپنے قلم سے سرخ سیاہی میں اپنی منظوری لکھتے اگرچہ مسٹر ریڈ کا معاملہ ان کی خواہش کے مطابق طے پا گیا تھا لیکن شملے کے یورپین حلقوں میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ ایک غیر معروف داڑھی والے مولوی نے قائمقام وزیر ہوتے ہوئے ایک سنیئر یورپین افسر کے مقابلے میں ایک ہندوستانی افسر کا تقرر بطور جائنٹ سیکرٹری کروا دیا!

ڈائرکٹر جنرل آئی ایم ایس کے محکمہ میں پہلے ہندوستانی افسر کا تقرر

ان دنوں انڈین میڈیکل سروس کے ڈائرکٹر جنرل، جنرل میگا تھے صحت عامہ کا کمشنر انڈین میڈیکل سروس کا ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل بھی ہوا کرتا تھا۔ اس عہدہ کے خالی ہونے پر جنرل میگا نے سفارش کی کہ مدراس کے کرنل رسل کو اس عہدے پر مقرر کیا جائے۔ میں نے جنرل میگا کو بلوایا اور کہا کہ ان کے مرکزی دفتر میں کوئی ہندوستانی افسر نہیں۔ اس کی طرف توجہ ہونی چاہیئے۔ میں نے پوچھا آئی ایم ایس کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کیلئے کن شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے؟ جنرل میگا نے کہا چونکہ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل پبلک ہیلتھ کمشنر بھی ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ لفٹننٹ کرنل ہونے کے ساتھ اسے پبلک ہیلتھ کا ڈپلوما بھی حاصل ہو۔ میں نے کہا اس وقت انڈین میڈیکل سروس میں تین ہندوستانی میجر ایسے ہیں جن کے پاس پبلک ہیلتھ کا ڈپلوما ہے۔ وہ جلد لفٹننٹ کرنل ہو جائیں گے۔ کیا آپ یہ کر سکتے ہیں کہ مسل پر نوٹ کر دیں کہ آئندہ جب یہ اسامی خالی ہو تو ان تین میں سے کسی کے تقرر پر غور کیا جائے۔ جنرل صاحب نے جواب دیا:۔

"SIR I CANNOT BIND THE HANDS OF MY SUCCESSOR"

(جناب میں اپنے جانشین کے ہاتھ نہیں باندھ سکتا) میں نے کہا:۔

"WERY GOOD GENERAL! I SHALL DO THE BINDING"

(بہت خوب جنرل! ہاتھ باندھنے والا کام میں کر دوں گا)

میں نے وائسرائے سے ذکر کیا کہ یہ آسامی خالی ہونے والی ہے اور ڈائرکٹر جنرل نے کرنل رسل کی سفارش کی ہے۔ وائسرائے کہنے لگے میں کرنل رسل کو مدراس کی گورنری کے زمانے سے جانتا ہوں بہت قابل افسر ہے تمہیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟ میں نے کہا نہیں مجھے کرنل رسل پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن آئی ایم ایس کے مرکزی دفتر میں ابھی تک ایک بھی ہندوستانی کا تقرر نہیں ہوا۔ تین ہندوستانی افسر جو میجر ہیں اور پبلک ہیلتھ کا ڈپلوما بھی رکھتے ہیں جلد لفٹننٹ کرنل ہو جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ کرنل رسل کے تقرر کے حکم میں یہ لکھ دوں کہ جب آئندہ یہ آسامی خالی ہو تو ان تین افسروں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر بھی غور کیا جائے۔ فرمایا بیشک بیشک ضرور

لکھ دو۔ چنانچہ میں نے کرنل رسل کی تقرری کے حکم میں ان تین افسروں کے متعلق بھی ہدایت کر دی اور آخر میں لکھ دیا کہ وائسرائے اسے منظور کرتے ہیں۔ جب جنرل میگا نے میرا نوٹ پڑھا تو بہت سیخ پا ہوئے۔ مسٹر صالح حیدری ڈپٹی سیکرٹری سے کہا میں وائسرائے کے پاس احتجاج کرنا چاہتا ہوں وزیر سے اجازت لے دو کہ میں وائسرائے سے مل لوں۔ مسٹر حیدری نے ان سے کہا وزیر تو بلا تامل اجازت دیدے گا لیکن آپ وائسرائے سے کہیں گے کیا؟ اور وائسرائے تو رضامندی دے چکے ہیں اور یہ حکم اب وائسرائے کا حکم ہے۔ جنرل میگا خاموش ہو گئے۔ اپنی میعاد ختم ہونے پر جنرل میگا وزیر ہند کے طبی مشیر مقرر ہو گئے تھے انہوں نے آئی ایم ایس کے متعلق ایک کتاب بھی شائع کی۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کے موقعہ پر ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے لندن گیا تو یہ کتاب مجھے تحفہ دی۔ اور بہت تپاک کے الفاظ اس میں درج کیے۔ جب ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کی جگہ پھر خالی ہوئی تو میاں صاحب نے اس آسامی پر لفٹنٹ کرنل گناپتی کا تقرر کیا جو ان تین افسران میں سے ایک تھے جن کے نام میں نے نوٹ میں درج کیے تھے۔ لفٹنٹ کرنل گناپتی سر سری سنگھ گاؤڑ کے داماد تھے۔

اصلاحات کے متعلق وزارت داخلہ کے مراسلے بنام وزیر ہند پر میری اختلافی رائے

آئینی اصلاحات پر وزارت داخلہ کے مراسلہ بنام وزیر ہند کا مسودہ جب وائسرائے کی کونسل میں زیر بحث آیا تو مجھے ایک پیراگراف سے اختلاف ہوا۔ سوال یہ تھا کہ کسی صوبے میں ہنگامی صورت پیدا ہو جانے پر امن عامہ کی حفاظت اور قانون کی پابندی کی نگرانی کا اختیار اور ذمہ داری کس کے سپرد ہو۔ باقی سب اراکین کونسل کا مسودے میں درج شدہ تجویز پر اتفاق تھا۔ میں اپنی تجویز پر مصر رہا۔ فیصلہ ہوا کہ میری اختلافی رائے مراسلے میں درج کر دی جائے اور مجھے ارشاد ہوا کہ تم خود ہی اختلافی رائے لکھ بھی دو میں نے ایک پیراگراف لکھ کر پرائیویٹ سیکرٹری کو بھیج دیا۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے تھی "ہم میں سے ایک کی رائے ہے کہ" پرائیویٹ سیکرٹری نے ٹیلیفون پر مجھ سے کہا کہ مناسب ہوگا اگر اس اختلافی پیراگراف کے شروع میں تمہارا نام درج کر دیا جائے تاکہ وزیر ہند کو معلوم ہو جائے کہ یہ اختلافی رائے کس کی ہے۔ میں نے کہا بیشک درج کر دیجئے! چند دن کے بعد مراسلے کے متعلق وزیر ہند کا تار موصول ہوا۔ متنازعہ مسئلے کے متعلق لکھا کہ اس مشکل اور پیچیدہ مسئلے کا موزوں اور قابل عمل حل وہی ہے جو اختلافی رائے میں درج ہے۔ جب وزیر ہند کے تار پر کونسل میں غور ہوا تو میرے رفقاء نے پھر زور دیا کہ میں ان کے ساتھ متفق ہو جاؤں۔ میں نے کہا یہ عجیب دعوت ہے کہ جب وزیر ہند میری ہی تجویز کو موزوں اور قابل عمل سمجھتے ہیں تو میں اپنی رائے چھوڑ کر آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں! آخر کار کونسل نے وزیر ہند کی رائے تسلیم کر لی۔

فرقہ دارانہ نیابت کے سلسلہ میں حکومت ہند کی سفارشات میں تبدیلی کرانے کی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی طرف سے کوشش

میاں سر فضل حسین صاحب کے رخصت پر جانے سے پہلے کونسل فرقہ دارانہ نیابت کے مسئلے پر اپنی تجویز وزیر ہند کی خدمت میں بھیج چکی تھی۔ اس تجویز پر وزیر ہند کی رائے میاں صاحب کے رخصت پر جانے کے بعد وصول ہوئی۔ وزیر ہند نے تجویز کیا کہ مدراس، بمبئی اور صوبہ متو[illegible]ط کی مجالس میں مسلمانوں کی نشستوں میں ایک دو نشستوں کا اضافہ کر دیا جائے

مگر پنجاب اور بنگال کی مجالس میں مسلمانوں کی نشستوں میں کمی کی جائے۔ یہ تار دیکھتے ہی میں نے وائسرائے سے ملاقات کا وقت لیا اور وزیر ہند کی تجویز کے خلاف احتجاج کیا۔ وائسرائے خود بھی سمجھ گئے کہ مدراس، بمبئی اور صوبہ متوسط میں مسلمانوں کو ایک یا دو نشستیں زائد مل جانے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور پنجاب میں کمی ہونے سے ان کی خفیف سی اکثریت بھی جاتی رہے گی اور بنگال میں کمی ہونے سے ان کی نمائندگی ۴۰ فیصد سے بھی گر جائے گی۔ وائسرائے سے میں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اگر کوئی ایسی تخفیف کی گئی تو میں کونسل سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں صحیح طور پر مجھ پر الزام آئے گا کہ جو تناسب سر فضل حسین قائم کروا گئے تھے وہ میرے قائمقام ہونے کے عرصے میں قائم نہ رہا۔ وائسرائے نے میرے موقف سے ہمدردی کا اظہار کیا اور تائید کا وعدہ کیا۔ کہا میں ابھی سر ہیری ہیگ وزیر داخلہ اور کمانڈر انچیف سے بات کرتا ہوں اور انہیں اسبات پہ پختہ کر لیتا ہوں کہ جو سفارش ہم پہلے کر چکے ہیں اس پر قائم رہیں۔ اس طرح تین ہم ہونگے جو تقسیم ہو جائیں گے۔ اگر باقی اراکین ہمارے ساتھ شامل نہ بھی ہوئے تو میں اپنا فیصلہ کن ووٹ استعمال کروں گا اور ہماری کثرت ہو جائے گی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ ساری کونسل کا یہی موقف ہوگا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی شام کونسل کا اجلاس ہوا۔ وائسرائے نے فرمایا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ کتنا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے اور ہمیں اس پہ کتنا وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اسبات پہ متفق ہو جائیں کہ ہم اپنی پہلی سفارش پہ قائم رہیں گے سوائے اس کے کہ وزیر ہند کی کوئی ایسی ترمیم ہو جس کی تائید میں کوئی معقول وجہ پیش کی گئی ہو۔ چنانچہ کونسل میں اسبات پہ اتفاق ہو گیا۔ اس کے بعد وزیر ہند کے تار پہ غور شروع ہوا۔ وائسرائے نے پرائیویٹ سیکرٹری سے دریافت کیا مدراس کے متعلق وزیر ہند کی کیا تجویز ہے۔

پرائیویٹ سیکریٹری۔ وزیر ہند تجویز کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو مدراس میں ایک نشست زائد دی جائے۔

وائسرائے۔ کوئی وجہ بیان کرتے ہیں۔

پرائیویٹ سیکریٹری۔ کوئی وجہ بیان نہیں کی۔

وائسرائے۔ ظفر اللہ تم مدراس میں یہ زاید نشست لینا چاہتے ہو؟

ظفر اللہ۔ اگر اس زائد نشست کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں ہماری مجوزہ نشستوں میں کمی کی جائے تو مجھے یہ زائد نشست منظور نہیں۔

وائسرائے۔ تو ہمیں وزیر ہند کی یہ تجویز منظور نہیں۔

پرائیویٹ سیکریٹری۔ مدراس کے متعلق وزیر ہند کی یہ بھی تجویز ہے کہ عورتوں کیلئے جو چار نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسلمان عورت کے لئے محفوظ کر دی جائے۔

وائسرائے۔ یہ تجویز معقول معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس پہ کسی کو اعتراض ہے؟

کسی نے اعتراض نہ کیا اور یہ تجویز بالاتفاق قبول کر لی گئی۔ اس طرح وائسرائے نے مجھ سے کہلوا لیا کہ پنجاب اور بنگال

میں مسلم نشستوں میں کمی کر کے بمبئی اور صوبہ متوسط میں مسلمانوں کیلئے زائد نشست منظور نہیں۔ پنجاب کے متعلق تو بالاتفاق فیصلہ ہو گیا۔ بنگال کے متعلق سر بی ایل متر نے پھر اپنا سابقہ اعتراض دہرایا کہ ہندوؤں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کم نیابت دی گئی ہے جس کا میں نے تفصیلی جواب دیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ پہلے جو سفارش کی گئی تھی وہ سر بی ایل متر کی ہندوؤں کی نیابت کی کمی کی شکایت کے ساتھ دہرائی جائے۔ آخر کار حکومت برطانیہ نے اسی کے مطابق فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

سر جان اینڈرسن تھوڑا عرصہ پہلے بنگال کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے کلکتہ سے وائسرائے کی خدمت میں لکھا کہ میں تو یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں گویا محبوس بیٹھا ہوں۔ کوئی ہندو لیڈر مجھ سے ملتا ہے نہ مسلمان۔ مسلمانوں کو تو اب شکوہ نہیں ہونا چاہیئے۔ فرقہ وارانہ نیابت کے فیصلے میں بنگال میں ان کی نیابت ۲۸ فیصد سے بڑھا کر ۴۸ فیصد کر دی گئی ہے گو ابھی اس کا اعلان نہیں ہوا۔ لیکن اگر میرے ساتھ وہ رابطہ قائم کریں تو میں بغیر تفصیل میں جانے کے ان کا اطمینان کر سکوں۔ اگر ظفر اللہ خاں دو تین دن کیلئے کلکتے آجائے تو ممکن ہے اس جمود کی حالت میں حرکت پیدا ہو سکے۔ وائسرائے نے میرے ساتھ ذکر کیا اور کہا اگر تم جا سکو تو گورنر کے پاس ٹھہر جانا اور مسلمان اہل الرائے اصحاب سے ملنا۔ میں نے کہا میں چلا جاتا ہوں لیکن میرا گورنر ہاؤس میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ اگر میں گورنر کا مہمان ہوا تو جو اصحاب مجھ سے ملنا چاہیں گے وہ آسانی سے آ جا نہیں سکیں گے۔ میں سر عبدالحلیم غزنوی صاحب کے ہاں ٹھہر جاؤں گا اور وہیں سب اصحاب سے ملاقات کروں گا۔ غزنوی صاحب کے ہاں مجھے بہت آرام ملا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے تقسیم سے قبل کلکتے جانے کا موقعہ ہوتا میں انہی کے ہاں ٹھہرتا اور وہ حد درجے کی تواضع سے پیش آتے رہے۔ فجزاہ اللہ خیراً۔ اس موقع پر میں بنگال کی مسلم قیادت کے متعلق کوئی اچھا اثر لیکر نہ لوٹا۔ مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب کو میں پہلے سے جانتا تھا وہ مہربانی فرما کر پانچ چھ اصحاب کے ہمراہ میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ بظاہر بے تکلفی سے گفتگو ہوتی رہی اور بعد اطمینان تشریف لیگئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں اصحاب میں سے تین چار کے ہمراہ پھر تشریف لائے۔ اور کچھ مزید امور کے متعلق گفتگو فرمائی۔ آخر ایک روز تنہا تشریف لائے اور فرمایا میرے تمہارے درمیان کوئی تکلف تو ہے نہیں۔ ہندو ہم پر زور دے رہے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں۔ تم مجھے صاف صاف بتلا دو کہ اگر فرقہ وارانہ نیابت کی صورت میں ہماری پوزیشن کمزور ہے تو ہم ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ کی صورت کر لیں۔ میں نے دریافت کیا آپ کے اندازہ کے مطابق مضبوط پوزیشن کیا ہو سکتی ہے؟ کہا اسوقت ہمیں عام نشستوں کا ۴۸ فیصدی حاصل ہے جو کل نشستوں کا ۲۸ فیصدی بنتا ہے۔ اگر ہمیں کل نشستوں کا ۴۰ فیصدی ملنے کی امید ہو تو ہم سمجھیں گے ہماری پوزیشن مضبوط ہے۔ ہندو شاید ہمیں ۴۰ فیصدی مخلوط انتخاب کے اصول پر دینے پر رضامند ہو جائیں۔ گو ابھی وہ اتنے پر رضامند نظر نہیں آتے۔ میں نے عرض کیا میرا اندازہ ہے کہ آپ ۴۰ فیصدی سے زیادہ کی پختہ امید رکھ سکتے ہیں۔ پوچھا کیا مخلوط انتخاب سے؟ میں نے کہا نہیں جداگانہ انتخاب سے۔ فرمایا تو پھر ہمیں ہندوؤں کی خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے

کہا کہ اپنے تمام مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ آپ خود کریں۔ لیکن میں صرف یہ گذارش کروں گا کہ جو فیصلہ بھی کریں متفقہ طور پر کریں اور قومی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کریں۔ ذاتیات کو درمیان میں نہ آنے دیں۔ کہنے لگے ہاں ہاں لیکن یہ تو بتاؤ ہم فیصدی سے کسقدر زیادہ کی ہم امید رکھ سکتے ہیں؟ ۴۲ کی ۵۴ کی؟ میں نے کہا ۵۴ سے بھی زیادہ کی۔ پوچھا کیا جداگانہ نیابت کے طریق سے؟ میں نے کہا بیشک۔ فرمایا سچ کہتے ہو؟ عرض کی یقیناً سچ کہتا ہوں۔ کہا تو بس فیصلہ ہے ہمیں اور کیا چاہیئے؟ میں نے مشورہ دیا کہ آپ اصحاب گورنر سے رابطہ پیدا کریں اور جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس کی تصدیق ان سے چاہئے آپ کو ان کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اگر ابھی سے آپس میں تعلقات قائم ہو جائیں گے اور اعتماد پیدا ہو جائے گا تو آئندہ تعاون میں آسانی رہے گی۔ میں تین دن کلکتے ٹھہرا اور صبح سے شام تک اس مہم میں مصروف رہا۔ تیسرے دن گورنر صاحب سے دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوئی اور میں نے مختصراً انہیں بتایا کہ مسلمانوں میں سے سربرآوردہ اشخاص کی طرف سے وہ تعاون کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اگر گورنر صاحب ان کی طرف قدم بڑھائیں گے تو انہیں تعاون پر آمادہ پائیں گے۔

مسٹر حسین شہید سہروردی

اس موقعہ پر کلکتے میں میری ملاقات مسٹر حسین شہید سہروردی سے بھی ہوئی ابھی جوان تھے لیکن قابلیت ظاہر تھی۔ میں نے وائسرائے سے ذکر کیا اور مشورہ دیا کلکتہ ہائی کورٹ میں جگہ خالی ہونے پر انہیں جج کا عہدہ پیش کرنا موزوں ہوگا۔ اگر انہیں ہائی کورٹ میں جانا منظور ہوتا تو جلد ان کا تقرر جج پر ہو جاتا۔ لیکن انہیں سیاسی سرگرمیاں زیادہ مرغوب تھیں۔

اچھوت اقوام کو جداگانہ نیابت کی تجویز کے خلاف گاندھی جی کا برت اور معاہدہ پونا

فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق حکومت برطانیہ نے جو فیصلہ صادر کیا اس میں اچھوتوں کو علیحدہ نیابت کا حق دیا گیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف گاندھی جی نے پونا میں برت شروع کر دیا۔ جب گاندھی جی کی جسمانی حالت برت کے نتیجے میں کمزور ہونا شروع ہوئی تو ہندو لیڈران کی طرف سے بھاگ دوڑ شروع ہوئی کہ اچھوت اقوام کے لیڈروں کے ساتھ کوئی سمجھوتے کی صورت نکالی جائے۔ آخر پونا میں ایک معاہدہ ہوا اور اسکی اطلاع وائسرائے کو موصول ہوئی۔ مجلس عاملہ کا اجلاس طلب ہوا۔ وائسرائے نے فرمایا اس قضیے کا فیصلہ تو ہو گیا ہے لیکن گاندھی جی کی حالت بہت کمزور ہو چکی ہے بلکہ نازک بیان کی جاتی ہے۔ مناسب ہوگا اگر ہماری طرف سے فوراً وزیر ہند کی خدمت میں سفارش بھیج دی جائے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد کا فوراً اعلان کیا جائے۔ تاکہ گاندھی جی اپنا برت ترک کر دیں اور کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہو۔ میرے تمام رفقاء نے وائسرائے کی تجویز کے ساتھ اتفاق کیا میں نے کہا مجھے ایک وجہ سے کچھ تامل ہے۔

وائسرائے - یہ حیل وحجت کا موقعہ نہیں گاندھی کے برت کو بہت جلد ختم کرانا بہت ضروری ہے۔

ظفر اللہ خاں - آپ بجا فرماتے ہیں مجھے آپکو صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ معاہدہ پونا میں پنجاب کے ہندوؤں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں۔ فرقہ وارانہ نیابت کا جو فیصلہ برطانوی حکومت نے صادر فرمایا ہے اس میں اچھوت اقوام کے

لئے پنجاب میں کوئی نشست نہیں۔ معاہدہ پونا میں ان کے لئے پنجاب میں نشستوں کی تخصیص کی گئی ہے۔ کل کو پنجاب کے ہندو کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں معاہدہ پونا کا یہ حصہ منظور نہیں اس صورت میں ایک نئی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

وائسرائے۔ تم مشکلیں ہی بیان کرتے ہو کوئی حل بھی تو بتاؤ۔

ظفر اللہ۔ اجازت ہو تو حل بھی عرض کر دیتا ہوں۔

وائسرائے۔ کہو! لیکن وقت بہت تنگ ہے۔

ظفر اللہ۔ آپ اس وقت اجلاس ملتوی کر دیں پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کو ارشاد فرمائیں کہ وہ سردار سکندر حیات خانصاحب کو (جو اس وقت قائمقام گورنر پنجاب تھے) اس مشکل سے آگاہ کریں اور ان سے کہیں کہ مندرجہ ذیل تین ہندو لیڈران کو جو اس وقت شملے میں موجود ہیں طلب فرمائیں۔ (۱) ڈاکٹر گوکل چند نارنگ صاحب جو پنجاب کی وزارت میں ہندو وزیر ہیں (۲) راجہ نریندر ناتھ صاحب جو پنجاب کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر ہیں۔ (۳) بھائی پرمانند صاحب جو مرکزی اسمبلی میں پنجاب کے ہندوؤں کے نمائندے ہیں۔ ان حضرات سے دریافت کریں کہ وہ معاہدہ پونا کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں! اگر وہ کہیں کہ تسلیم کرتے ہیں تو غرض پوری ہو گئی۔ اگر وہ کہیں کہ تسلیم نہیں کرتے تو ان پر واضح کر دیں کہ تاخیر کی ذمہ داری ان پر ہوگی اور اگر کوئی ناگوار صورت پیدا ہو گئی تو الزام ان پر آئے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس پر یہ اصحاب رضامند ہو جائیں گے اور یہ ذمہ داری اٹھانے پر تیار نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر آج انہیں پابند نہ کیا گیا تو کل معاہدہ پونا کے سرکاری طور پر منظور ہو جانے کے بعد ممکن ہے وہ انکار کریں کہ ہم سے کسی نے پوچھا نہیں۔ آخر یہ تجویز منظور ہو گئی۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا کونسل کا اجلاس چھ بجے تک ملتوی ہوا سر سکندر حیات خانصاحب نے رپورٹ کی کہ راجہ نریندر ناتھ صاحب تو شملہ سے آج ہی لاہور جانے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ اسلئے ان سے بات نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ اور بھائی پرمانند صاحب سے بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو چاروناچار رضامند ہو گئے لیکن بھائی پرمانند صاحب نے فرمایا کہ میں اس طریق کو صحیح تسلیم نہیں کرتا جو گاندھی جی نے اختیار کیا ہے۔ قومی حقوق ایک شخص کے برت رکھ لینے یا ترک کر دینے سے طے نہیں کئے جا سکتے۔ یہ قوم کے حقوق کا سوال ہے پنجاب کے ہندوؤں کی اس میں سخت حق تلفی ہے میں اس معاہدہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر ڈاکٹر نارنگ صاحب نے بھائی پرمانند صاحب سے کہا میں آپ سے متفق ہوں لیکن اسوقت بہت مشکل مرحلہ درپیش ہے۔ گاندھی جی کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر ہمارے کسی فعل سے ایسی قابل احترام ہستی کی صحت کو کوئی گزند پہنچ گیا تو ہم قوم کو کیا منہ دکھائیں گے؟ کچھ دیر تو بھائی پرمانند اپنی ضد پر قائم رہے لیکن آخر آبدیدہ ہو کر ڈاکٹر نارنگ سے کہا میرا دل تو نہیں مانتا لیکن آپ کے زور دینے سے میں ہاں کہہ دیتا ہوں۔ یہ رپورٹ ملنے پر کونسل نے معاہدہ پونا کی تصدیق وزیر ہند کی خدمت میں ارسال کر دی اور حکومت برطانیہ نے اسے تسلیم کر لیا گاندھی جی نے اپنا برت ترک کر دیا۔

تیسری گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین | تیسری گول میز کانفرنس کے مندوبین کا انتخاب ان دنوں ہوا جب میں میاں فضل حسین صاحب کی رخصت کے سلسلہ میں قائمقام ممبر وائسرائے کونسل تھا۔ وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں میں نے جو نام مسلم وفد کی رکنیت کیلئے پیش کئے ان میں سے ایک تو وائسرائے نے فوراً بلا تامل رد کر دیا۔ باقی ناموں پر میرے رفقاء نے اتفاق کیا اور ان کے نام غیر مسلم نمائندگان کے ناموں کے ساتھ وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دیئے گئے۔ وزیر ہند نے میرے تجویز کردہ ناموں میں سے دو کے متعلق اختلاف کیا (قائداعظم) مسٹر جناح کے متعلق تو لکھا "وہ ہر بات پر تنقید تو بہت کڑی کرتے ہیں لیکن کوئی اثباتی حل پیش نہیں کرتے۔ اب انہوں نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے معاملات کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق نہیں رہا"۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے متعلق لکھا۔ "وہ دوسری گول میز کانفرنس میں تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے کانفرنس کے دوران میں ایک لفظ بھی نہیں کہا"۔ میں نے دونوں اصحاب کی شمولیت پر پُر زور اصرار کیا اور وائسرائے نے میری معروضات وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دیں۔ بالآخر وہ ڈاکٹر صاحب کو شامل کرنے پر تو رضامند ہو گئے لیکن (قائداعظم) مسٹر جناح صاحب کے متعلق میری سعی ناکام رہی۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت | چار مہینے کیلئے میاں صاحب کی جگہ حکومت ہند میں کام کرنے کا جو موقعہ مجھے ملا اس سے تیسری گول میز کانفرنس میں زیر بحث آنیوالے امور پر مجھے حکومت ہند اور کسی حد تک وزیر ہند کے موقف کا علم ہو گیا۔ اور اس سے مجھے تیسری گول میز کانفرنس میں بہت مدد ملی۔ جب ہم لندن میں ہز ہائی نس سر آغا خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بعض اراکین وفد نے سر آغا خاں کی خدمت میں گذارش کی کہ فرقہ وارانہ نیابت کا فیصلہ تو ہو گیا لیکن ہمارے باقی مطالبات کے متعلق ہمیں پختہ طور پر معلوم ہونا چاہیئے تاکہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ امور زیر بحث پر ہم کیا موقف اختیار کریں۔ آپ وزیر ہند سے ملیں اور ان سے کہیں کہ وہ بالمشافہ ہمارے ساتھ بات چیت کر کے ہمیں بتائیں کہ ہمارے مطالبات کو وہ کس حد تک منظور کرنے کیلئے تیار ہیں۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں صاحب نے میرے لندن پہنچنے پر مجھے ہدایت دی تھی کہ جس دن وفد کی ملاقات ان سے ہو اس دن میں وقت مقررہ سے چند منٹ پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں اور ملاقات کے چند منٹ بعد بھی ٹھہر جایا کروں۔ اس ارشاد کے مطابق میں باقی اراکین کے رخصت ہو جانے پر آپ کی خدمت میں ٹھہر رہا۔ آپ نے فرمایا یہ تو بڑا ٹیڑھا مطالبہ ہے۔ وزیر ہند تو کبھی اس پر رضامند نہیں ہوں گے اگر وہ اس طریق سے الگ الگ گفتگو کرنے لگے تو چند دنوں میں کانفرنس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ کسی فریق کا ان پر اعتماد نہیں رہے گا۔ تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ میں نے مشورہ دیا کہ وفد کی خوشنودی کی خاطر آپ وزیر ہند سے ملیں اور ان کا ردعمل معلوم ہونے پر فیصلہ فرمائیں کہ وفد کو کیا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ تین چار دن بعد ہز ہائی نس نے بتایا کہ وہ وزیر ہند سے ملے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مشکل مرحلہ تو فرقہ وارانہ نیابت کے فیصلے کا تقاضو

طے ہوچکا ہے۔ باقی مطالبات کے متعلق جہاں تک میرا اندازہ ہے کسی دوسرے عنصر کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت نہیں اور حکومت کو کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیئے۔ لیکن حکومت برطانیہ ان امور کا فیصلہ بیک وقت کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ ایسا کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ حکومت مسلم وفد کے ساتھ الگ سمجھوتا کرنا چاہتی ہے۔ یہ نامناسب بھی ہے اور مسلم وفد کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔ کانفرنس کے نمائندگان میں سے جب کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں انکار نہیں کرتا لیکن کسی وفد کے خصوصی مطالبات کے متعلق مجھ سے گفتگو نہیں ہوتی۔ مسلم وفد کے اراکین پہلے بھی مجھ سے ملتے رہے ہیں اور اب بھی بخوشی مل سکتے ہیں مطالبات کے متعلق اطمینان کرنے کا طریق یہ ہے کہ کانفرنس کے دوران میں میں مختلف مسائل کے متعلق حکومت کا نظریہ بیان کرتا رہوں گا ایسے مواقع پر متعلقہ امور کی نسبت مزید وضاحت حاصل کرنے کے لئے مجھ سے آزادانہ سوال کئے جا سکتے ہیں۔ میں صفائی سے جواب دیتا جاؤں گا۔ اگر وفد کی طرف سے کسی امر کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو آپ خود مجھ سے مل لیا کریں یا ظفر اللہ خاں کو بھیج دیا کریں وہ پچھلے چند ماہ میں بہت حد تک حکومت کے نقطۂ نگاہ سے واقف بھی ہو چکا ہے۔
میں نے ہز ہائی نس کی خدمت میں گذارش کی کہ جو کچھ وزیر ہند نے ان سے کہا ہے وہ وفد سے ذکر کر دیں لیکن اگر مناسب سمجھیں تو جو کچھ میری نسبت کہا گیا ہے اس کا ذکر نہ فرمائیں۔ ہز ہائی نس نے وزیر ہند کے ساتھ گفتگو کا خلاصہ وفد کے سامنے بیان کر دیا اور وفد کا اطمینان ہو گیا۔

فرقہ وارانہ نیابت کے فیصلے کے متعلق میرے دل میں ایک خلش سی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں وزیر ہند کے متعلق مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ مسلم مطالبات کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب فرقہ وارانہ نیابت کے معاملے میں حکومت ہند کی سفارشات کے متعلق انہوں نے اپنے تار میں ایسی ترمیمیں تجویز کیں جو بنگال اور پنجاب میں مسلم پوزیشن کو کمزور کرنے والی تھیں تو مجھے اس سے صدمہ ہوا اور افسوس بھی ہوا کہ میرا اندازہ ان کے متعلق غلط نکلا۔ تیسری گول میز کانفرنس کے دوران میں بھی مجھے ان کا رویہ ہمدردانہ ہی معلوم ہوا۔ اور ذاتی طور پر میرے ساتھ تو ان کا سلوک مشفقانہ تھا یہ تفاوت میرے لئے ایک الجھن بن گیا لیکن جلد ہی یہ عقدہ حل ہو گیا۔ تیسری گول میز کانفرنس کے ابتدائی ایام میں وزیر اعظم میکڈانلڈ نے بعض نمائندگان کو ہاؤس آف کامنز کی عمارت میں اپنے کمرے میں فرداً فرداً ملاقات کا موقعہ دیا مجھے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد ہوا۔ میں ملا تو فرمایا "جب سے آپ لوگ دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر گئے ہیں ہمیں بہت سے نجی قضیوں کا سامنا رہا ہے۔ اسلئے میں ذاتی طور پر ہندوستان کے معاملات کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکا اس اثناء میں فرقہ وارانہ نیابت کا قضیہ تو طے ہو گیا ہے۔ میں اچھوت اقوام کی نمائندگی کے متعلق کچھ مزید اقدام کرنا چاہتا تھا لیکن میرے رفقاء رضامند نہ ہوئے، پنجاب اور بنگال میں بھی ہم نے رفقاء کے اصرار پر مسلمانوں کو میری اپنی تجویز سے زائد نمائندگی دینا پڑی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ بشاشت سے اس پر رضامند ہو جاؤ گے اور اب ملکر باقی معاملات طے کر سکو گے!" مجھے اس امر سے تو کوئی حیرت نہ ہوئی کہ وزیر اعظم مجھے غیر مسلم نمائندہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہز ہائی نس

نواب صاحب بھوپال کو مہاراجہ بھوپال کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔) لیکن ان کی بات سے مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ پنجاب اور بنگال میں ہماری نمائندگی میں تخفیف کی تجویز ان کی طرف سے ہوئی تھی نہ کہ وزیر ہند کی طرف سے۔

نئے آئین میں ہندوستان کے مالیات پر حکومت برطانیہ کا اختیار بدستور قائم رکھنے کی تجویز

تیسری گول میز کانفرنس میں تسلیم شدہ اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی سعی ہوتی رہی۔ ایک مشکل سوال جو درپیش تھا وہ ہندوستانی مالیات پر وزیر ہند کے اختیارات سے متعلق تھا۔ ہندوستانی مندوبین کا مطالبہ تھا کہ نئے آئین میں ہندوستانی مالیات پر حکومت ہند کو پورا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ برطانوی نمائندگان کی طرف سے اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس صورت میں ہندوستان کی ساکھ کو لندن کے مالی حلقوں میں صدمہ پہنچے گا اور یہ امر ہندوستان کے لیئے مالی نقصان کا باعث ہوگا۔ مالی ذمہ داری کے لندن سے دلی منتقل کرنے کے تعلق میں جو سوال پیدا ہوتے تھے ان پر غور کرنے اور ان کا حل سوچنے کیلئے وزیر ہند نے ایک مالی کمیٹی قائم کی اور مسلم وفد سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا ایک نمائندہ اس کمیٹی کے لیئے نامزد کریں۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب نے مالی مسائل کا کسی حد تک مطالعہ کیا ہوا تھا اور فیڈرل مالی نظام پر ایک رسالہ بھی شائع کر چکے تھے۔ میری تجویز پر ان کا نام اس کمیٹی کیلئے بھیج دیا گیا۔ دو تین دن بعد مسٹر لطیفی نے ہز ہائی نس آغا خان کی خدمت میں گذارش کی کہ وزیر ہند نے خواہش ظاہر کی ہے کہ مالی کمیٹی کیلئے ظفر اللہ خاں کو نامزد کیا جائے۔ مجھے تو مالیات کا تجربہ نہ تھا نہ میں نے ان مسائل پر غور کیا تھا اور پھر وقت یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو نامزد کیا جا چکا تھا۔ ہز ہائی نس آغا خاں نے فرمایا میں نے شفاعت احمد خاں سے ذکر کیا ہے وہ رضامند ہیں کہ انکی بجائے تمہیں نامزد کر دیا جائے۔ ناچار مجھے اس کمیٹی میں شامل ہونا پڑا۔ اس کمیٹی کے باقی تمام اراکین مالیات کے ماہر یا کم سے کم مالیات میں تجربہ رکھنے والے اصحاب تھے۔ میری نشست سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کے پہلو میں تھی۔ میں نے بحث میں بہت کم حصہ لیا البتہ جو کچھ کہا جاتا رہا اسے توجہ سے سنتا رہا۔ ابتدائی تبادلہ خیالات کے بعد وزیر ہند نے تجویز کیا کہ کمیٹی کے اراکین بنک آف انگلینڈ کے گورنر سر مانٹیگو نارمن اور انگلستان کے پانچ بڑے بنکوں کے صدر افسروں سے بھی تبادلہ خیالات کر لیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیئے کمیٹی کے اراکین بنک آف انگلینڈ میں گورنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ساتھ انگلستان کے پانچ بڑے بنکوں کے افسران اعلیٰ بھی موجود تھے ان سب کی رائے سو فیصد گورنر صاحب سے متفق تھی۔ گورنر صاحب بات کرتے کرتے رکتے اور اپنے رفقا سے سوال کرتے۔ کیوں صاحبان ایسا ہی ہے یا نہیں؟ اور وہ اثبات میں سر ہلا دیتے۔ گورنر صاحب کی رائے کا خلاصہ یہ تھا۔ لندن کے مالی حلقوں میں ہندوستان کی ساکھ بہت بلند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان جو قرضہ لیتا ہے اس کے سود اور اصل کی بروقت ادائیگی کی ضمانت وزیر ہند دیتے ہیں اس کے نتیجے میں اس ملک کے ان طبقوں میں جو اپنا روپیہ ان قرضوں میں لگاتے ہیں ہندوستان پر اعتماد ہے۔ ہندوستان کو اس سے یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ جب بھی روپے کی ضرورت ہوتی ہے اسے قرضہ ملنے میں

کوئی دقت پیش نہیں آتی اور بہت رعائتی شرح پر قرضہ مل جاتا ہے۔ اب آپ لوگ ویسٹ منسٹر میں بیٹھے ہندوستان کے آئینی مستقبل پر غور کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ کے کام کے سیاسی پہلوؤں کا نہ علم ہے نہ ان سے سروکار ہے آپ سیاسی لحاظ سے جو چاہیں فیصلہ کریں۔ ہماری سرگرمیاں مالی میدان تک محدود ہیں سیاسیات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں نہ ہم اس میں دخل دینا چاہتے ہیں البتہ جن باتوں کا ہمیں تجربہ ہے ان کی بنا پر ہم کسی قدر وثوق سے رائے دے سکتے ہیں کہ جو سیاسی فیصلے مالی حالات پر اثر انداز ہوں ان کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا جیسے میں کہہ چکا ہوں ہندوستان کی ساکھ کی لندن کی مالی منڈی میں مضبوطی کی بنا وزیر ہند کی ضمانت ہے۔ اگر ہندوستان کے مالیات پر وزیر ہند کا اختیار نہ رہے یا اس حد تک کمزور ہو جائے کہ ہندوستان کے قرضہ جات کی پشت پر وزیر ہند کی ضمانت نہ ہو تو ہندوستان کی ساکھ گر جائے گی اور لندن میں ہندوستان کیلئے قرضے کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا اور موجودہ رعائتی شرح پر قرضہ لینا تو ناممکن ہو جائے گا کمیٹی کے اراکین میں سے بعض نے گورنر صاحب کے بیان میں رخنہ تلاش کرنے یا کوئی امید افزا پہلو ڈھونڈ نکالنے کے بہت جتن کئے لیکن بے سود انہوں نے فرمایا صاحبان یہ میری خوشنودی یا میرے رفقاء کی خوشنودی کا سوال نہیں۔ مالیات کے اپنے قواعد ہیں اور ان کا اپنا مقیاس الحرارت ہے۔ مالی بحران کو کسی کی خوشنودی رفع نہیں کر سکتی۔ ریاضی اور طبیعات کی طرح مالیات بھی اپنے قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں اور قوانین کا عمل خوشنودی یا رنجیدگی سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ سیاسیات کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ شوق سے جو فیصلہ چاہیں کریں۔ آپ کے فیصلے کا لندن کی مالیات کی منڈی پر کیا ردعمل ہو گا اس کا اندازہ میں نے اور میرے رفقا نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ کیوں صاحبان! کیا میں نے ٹھیک کہا۔ پانچوں یکبارگی اثبات میں بلے! اس دوران میں میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ گورنر صاحب کا بیان بالکل واضح تھا۔ کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ گورنر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم نے کوئی سوال نہیں کیا! میں نے کہا جناب میں نے آپ کے بیان کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اگر آئینی اصلاحات کے نتیجے میں ہندوستانی مالیات پر برطانیہ کے اختیارات کو کسی خفیف حد تک بھی لندن سے دلی منتقل کیا گیا تو ہندوستان کی ساکھ لندن کی مالیات کی منڈی میں بالکل گر جائے گی۔ اور اس صورت میں ہندوستان کیلئے لندن کی منڈی میں قرضہ لینا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں؟ فرمایا "میں نے ان الفاظ میں تو اپنا مطلب بیان نہیں کیا لیکن کم و بیش میرا مطلب یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "تو جناب اس صورت میں آپ سے کوئی مزید سوال کرنا آپ کا وقت ضائع کرنا ہے۔ آپ کی وضاحت کے ہم ممنون ہیں۔ باقی بحث ویسٹ منسٹر میں ہو گی۔"

دوسری صبح کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ کمیٹی کے اراکین وزیر ہند کے ساتھ بنک آف انگلینڈ کے گورنر صاحب کی گفتگو کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ میں خاموش رہا۔ وزیر ہند نے دریافت کیا تم کیا تاثر لیکر لوٹے؟ میں نے کہا جناب گورنر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر مالیات ہند پر برطانوی حکومت کا اختیار خفیف حد تک بھی لندن سے دلی منتقل کیا گیا تو ہندوستان لندن میں اپنی ساکھ کھو بیٹھے گا۔ میری گذارش ہے کہ اگر سیاسی اختیار لندن سے دلی منتقل ہو لیکن مالیات پر اختیار منتقل نہ ہو تو برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات میں ایسا شدید تلاطم پیدا ہو گا کہ اس کے نتیجے میں برطانیہ اپنی ساکھ ہندوستان میں کھو بیٹھے گا

ان دونوں صورتوں کے درمیان انتخاب ہے تو مشکل لیکن کرنا ہی ہوگا۔ میں بات ختم کر چکا تو سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے میری طرف جھک کر کہا۔ تم نے مالیات کا مطالعہ کہاں کیا تھا؟ میں نے کہا میں تو مالیات کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا اور یہ بات تو مالیات کے متعلق ہے بھی نہیں عام فہم کی بات ہے کہ ایک ملک کی حکومت آزاد کیسے کہلا سکتی ہے اگر اس کے مالیات پر کسی اور حکومت کا اختیار ہو۔

پنڈت نانک چند صاحب | تیسری گول میز کانفرنس میں پنجاب کے ہندو نمائندے پنڈت نانک چند صاحب تھے۔ صوبجاتی خود اختیاری کا مسئلہ زیر بحث آیا تو انہوں نے بڑے جوش سے بحث کی کہ دوسرے صوبجات میں تو قانون اور امن عامہ کا محکمہ صوبائی ذمہ دار حکومت کے اختیار میں ہونا چاہیئے لیکن پنجاب میں یہ صورت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس صوبے میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور مسلمان آبادی کا نہایت غیر ذمہ دار عنصر ہیں۔ مسلمانوں کی غیر ذمہ داری کی مثال یہ دی کہ پنجاب کونسل میں ان کی پارٹی کے ایک رکن ایسے تھے جو سات بار قتل کے الزام میں زیر حراست آچکے تھے!۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ یہ صاحب ہندو تھے یا مسلمان؟ فرمایا کچھ بھی ہو وہ صاحب آپ کی پارٹی میں شامل تھے!! (ان کا اشارہ یونینسٹ پارٹی کے ایک ہندو رکن کی طرف تھا۔ جو بار ہا قتل کے الزام میں ماخوذ ہوئے تھے لیکن ہر بار بری قرار دیئے گئے۔ یہ قصہ ۱۹۲۶ء کے پہلے کا تھا جس کی نسبت میرا علم بھی سماعی تھا۔ میری ان صاحب کے ساتھ ذاتی ملاقات نہیں تھی) پنڈت صاحب کی بے ربط اور غیر متعلق لیکن نہایت جوشیلی تقریر سے اکثر اراکین اکتا گئے تھے اور چیئرمین (لارڈ سنکی) کا تکدر تو ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا دوسرے یہ تقریر "دلپذیر" اسقدر طویل ہو گئی تھی کہ کانفرنس کا اجلاس معمول سے ۴۵ منٹ لمبا ہو گیا۔ جب اجلاس ختم ہوا اور ہم سب نیچے اتر کر اپنے کوٹ چھتریاں سنبھالنے لگے تو پنڈت صاحب نے مجھ سے کہا "ظفر اللہ تم کل میری تقریر کا جواب دو گے؟" میں نے کہا "نہیں جناب!" کہنے لگے "ہیں نہیں؟ کیوں نہیں؟" میں نے کہا "میں آپ کی تقریر کا جواب دینے لگ جاؤں تو مجھ میں اور آپ میں کیا فرق رہ جائیگا؟" ہمارے قریب دو تین انگریز نمائندے بھی اپنے کوٹ سنبھال رہے تھے وہ بے اختیار ہنس پڑے! دوسرے دن میں نے مسئلہ زیر بحث پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تقریر کے آخر میں صرف اتنا کہا۔ "جناب عالی! کل ایک تقریر کے دوران میں یہ نہایت غیر معمولی خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ پنجاب میں قانون اور امن عامہ کا محکمہ وزراء کے سپرد نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا امتیاز کیا گیا تو ہماری یہ تمام محنت جو ہم برسوں سے کر رہے ہیں بالکل اکارت جائے گی" میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ لارڈ سنکی نے بڑے جوش سے فرمایا۔ "مجھے کلّی اتفاق ہے!"

تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر لارڈ سنکی نے بعض ہندوستانی مندوبین کے متعلق چند تعریفی کلمات کہے۔ مسلم وفد میں سے ہز ہائی نس آغا خان کا تو حق ہی تھا۔ لیکن مجھے بھی انہوں نے یہ امتیاز بخشا۔ کچھ عرصہ بعد میں لندن میں تھا پارلیمنٹ کے ایک کمرے میں میری تقریر اسلام کے اقتصادی نظام پر ہوئی۔ لارڈ سنکی

بھی تشریف فرما تھے۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے چیئرمین کو ایک پرزہ لکھ کر دیا کہ میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ موقعہ دیئے جانے پر فرمایا مجھے ظفراللہ خاں کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل رہا ہے میں اس کے متعلق صرف کہنا چاہتا ہوں کہ جب یہ کوئی بات کہدے تو اس پر پختگی سے قائم رہتا ہے۔ اس کا لفظ ہی دستاویز ہے۔ اس کے دستخط کی ضرورت نہیں رہتی۔

انگلستان میں ریلوے کے عملہ کی خوش اخلاقی | تیسری کانفرنس کا اجلاس طول کھینچ گیا تھا پہلی کانفرنس کی طرح مجھے کرسمس کی تعطیلات انگلستان ہی میں گذارنا پڑیں ملک عبداللہ خالد صاحب انڈین سول سروس کے انتخاب میں کامیاب ہو کر اپنی ٹریننگ کیلئے لندن تشریف لائے ہوئے تھے۔ کرسمس کے موقعہ پر میں ان کے ہمراہ ٹارکی گیا اور وہاں سے واپسی پر ہم دونوں لارڈ بلینزبرگ کی دعوت پر ونچیلسی میں ان کے مہمان ہوئے ان کی ہدایت تھی کہ ہم لندن سے ہیسٹنگز جائیں جہاں سے ان کی کار ہمیں ونچیلسی لے جائے گی۔ ریل لندن سے براہ راست بھی ونچیلسی جاتی ہے۔ لیکن اس رستے جانے سے وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ ہیسٹنگز سے ونچیلسی ۹ میل کے فاصلے پر ہے اور سڑک بہت اچھی ہے۔ ونچیلسی اب تو بالکل ایک گاؤں رہ گیا ہے ایک وقت میں مشہور بندرگاہ تھی اور انگلستان کے جنوب مشرقی ساحل کی ان پانچ بندرگاہوں میں شمار ہوتی تھی جو انگلستان کے بحری دفاع کے لحاظ سے نہایت اہم سمجھی جاتی تھیں۔ اب سمندر پیچھے ہٹ گیا ہے اور جو خشک قطعہ سمندر سے برآمد ہوا ہے وہ "رامنے مارش" کہلاتا ہے اور بڑا زرخیز اور آباد ہے۔

ملک صاحب اور میں وکٹوریہ اسٹیشن سے ہیسٹنگز کی گاڑی پر سوار ہوئے اور اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ ابھی ہیسٹنگز پہنچنے کا وقت نہیں ہوا تھا کہ گاڑی کھڑی ہوئی اور ایک قلی نے ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا اور دریافت کیا آپ اترنا نہیں چاہتے؟ ہم نے کہا ہم ہیسٹنگز جا رہے ہیں۔ اس نے کہا ہیسٹنگز جانیوالا حصہ تو پولگیٹ پر کٹ کر ہیسٹنگز چلا گیا۔ یہ تو ایسٹ بورن ہے۔ ناچار ہم اتر گئے۔ (اب تو سب ہیسٹنگز جانیوالی گاڑیاں ایسٹ بورن ہو کر جاتی ہیں۔ اس وقت ہیسٹنگز جانیوالا حصہ پولگیٹ پر کٹ کر ہیسٹنگز جایا کرتا تھا) میں اسٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس گیا اور قصہ بیان کیا وہ معذرت کرنے لگے کہ آپکو زحمت ہوئی وکٹوریہ اسٹیشن والوں کو چاہئیے تھا کہ آپکو گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھنے کی ہدایت کرتے میں نے کہا کہ مجھے فکر ہے کہ ہمارے میزبان کی کار ہیسٹنگز اسٹیشن پر ہمارا انتظار کر کے واپس چلی جائے گی اور وہاں ہمیں زحمت کا سامنا ہوگا۔ انہوں نے کہا نہیں نہیں فکر نہ کریں۔ پولگیٹ جانیوالی گاڑی تیار ہے میں آپکو اس میں بٹھا دیتا ہوں وہاں سے چند منٹ کے بعد آپ کو ہیسٹنگز جانیوالی گاڑی مل جائے گی۔ آپ ہیسٹنگز چالیس منٹ دیر سے پہنچیں گے میں ہیسٹنگز کے اسٹیشن ماسٹر کو ٹیلیفون پر کہہ دیتا ہوں وہ کار کو روک رکھیں گے۔ ہمیں گاڑی میں بٹھا دینے کے چند منٹ بعد وہ پھر دوڑے دوڑے آئے اور کہا ہیسٹنگز کے اسٹیشن ماسٹر کہتے ہیں ابھی لارڈ بلینزبرگ کی کار نہیں آئی انہوں نے ایک پورٹر کو باہر کھڑا کر دیا ہے کہ جب کار آجائے تو ڈرائیور سے انتظار کرنے کو کہہ دے۔ جب ہم ہیسٹنگز پہنچے تو وہاں کے اسٹیشن ماسٹر ہمارے انتظار میں پلیٹ فارم

پر موجود تھے ساتھ جا کر ہمیں کار میں بٹھایا اور رخصت کیا۔ پردیس میں ریل کے عملے کی طرف سے یہ خوش اخلاقی کا سلوک میرے لئے بہت ہی خوشگوار تجربہ تھا۔ اپنے دیس میں تو کسی کو ہماری فکر نہ ہوتی۔ وطن واپسی پر میں نے دورِ جدید کیلئے ایک مضمون "دیس اور پردیس" لکھا۔ جس میں پردیس میں ریلوے سفروں کے خوشگوار تجربات کا دیس کے ناگوار تجربات کے ساتھ موازنہ کیا۔ جب ۱۹۳۴ء میں میرے مرکزی وزیر ہونے کا اعلان ہوا اور بیان کیا گیا کہ تجارت اور ریلوے کا قلمدان میرے سپرد ہوگا تو ایک انگریزی اخبار نے میرے اس مضمون کا انگریزی ترجمہ شائع کیا اور نوٹ لکھا کہ اب ہم دیکھیں گے کہ یہ اپنے زمانے میں کن اصلاحات کو جاری کرتا ہے!

لارڈ بلینزبرگ | لارڈ بلینز برگ حسب معمول بڑی تواضع سے پیش آئے اور ہمارے دو دن ان کے ہاں بڑی مسرت میں کٹے۔ لارڈ بلینز برگ کا اندازِ گفتگو اسقدر دلچسپ تھا کہ ان کے ہوتے کسی اور کی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ زبان نہایت ستھری، معلومات کا ذخیرہ اتنا وسیع کہ سلسلہ کلام جاری رکھنے کیلئے موضوع تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بات سے بات نکلتی چلی آتی۔ بعض دفعہ سلسلہ کلام مذہب کی طرف ہو جاتا۔ انہوں نے شروع میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کسی خاص عقیدے کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ وہ گرجے جانے کے عادی نہ تھے۔ فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی اور رنگین شیشے کی صنعت (STAINED GLASS) سے بہت دلچسپی لیتے تھے ایک کثیر رقم خرچ کر کے انہوں نے ونچلسی کے گرجے کی دو کھڑکیوں کو رنگین شیشے (STAINED GLASS) سے مزین کرا دیا۔ ان کے دو بھتیجے پہلی عالمی جنگ میں کام آئے تھے ایک ایک کھڑکی تو انکی یادگار کے طور پر تیار ہوئی دوسری کھڑکی ایک لائف بوٹ کے ملاحوں کی یادگار کے طور پر تیار ہوئی جنہوں نے ایک بحری طوفان میں پھنسے ہوئے ایک جہاز کے مسافروں کی جانیں بچانے کی کوشش میں اپنی جانیں سمندر کی نذر کر دی تھیں بعد ازاں اس گرجے کی باقی کھڑکیوں کو بھی اس قسم کے شیشے سے مزین کرا دیا۔ ان کھڑکیوں کی رسم افتتاح بھی بڑی شان سے کی گئی۔ اس سارے منصوبے پر انہوں نے پچھتر ہزار پونڈ صرف کئے ان کھڑکیوں کو دیکھنے کیلئے دور دور سے زائرین ونچلسی جاتے ہیں۔ مصوری کے فن سے بھی انہیں بہت دلچسپی تھی۔ نوجوان مصوروں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ جب انہوں نے ونچلسی کا سب سے بڑا مکان گرے فرائرز خرید لیا تو اس کی مرمت اور زیب و زینت پر ایک کثیر رقم خرچ کی۔ اس مکان اور ان کے لندن کے مکان کے کمروں کی دیواریں مصوری کے اعلیٰ اور ادنیٰ نمونوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جو وہ مصوروں کی ہمت افزائی کیلئے خریدتے رہتے تھے۔ اپنے ملازموں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ تھا۔ انہیں کسی کام کو کہتے تو الفاظ اور لہجے سے ایسا معلوم ہوتا کہ انکساری سے ان سے عنایت طلب کر رہے ہیں۔ ایک بار میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا شام کے کھانے کے بعد ہیسٹنگز میں ایک کنسرٹ میں جانے کا ارادہ کیا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا ٹیلیفون پر تین ٹکٹوں کا انتظام کیا۔ میں سمجھا کسی اور مہمان کو بلانے کا ارادہ ہوگا لیکن ہیسٹنگز تک صرف میں ساتھ تھا وہاں پہنچنے پر ایک ٹکٹ جیب اپنے ڈرائیور کو دیا اور کہا "کانسرٹ ختم ہونے پر اطمینان سے کار دروازے کی طرف لے آنا ہم تمہارا انتظار کریں گے۔" گرے فرائرز میرے لئے وطن سے اور اپنے گھر سے دور دوسرا گھر بنا رہا۔ میں جب

بھی انگلستان جاتا اور لارڈ بلینز برگ کو اطلاع ہوتی تو مجھے اپنے لندن والے مکان میں بلاتے وچیلسی جانے کا پروگرام بنتا۔ کبھی ان کے ہمراہ ان کی کار میں جاتا کبھی ریل پر ہیسٹینگز جاتا اور وہاں سے ان کی کار میں وچیلسی جاتا۔ مجھے کہہ رکھا تھا کہ جب آؤ جس دوست کو چاہو ساتھ لے آؤ۔ تم نے دیکھ لیا ہے مکان فراخ ہے اور مجھے کوئی دقت نہیں ہو گی بلکہ اطمینان رہیگا۔ کہ تم یہاں اکیلے محسوس نہیں کرو گے۔ چنانچہ میرے کئی احباب کو میرے ساتھ گرے فرائرز میں مہمان ہونے اور لارڈ بلینز برگ کی صحبت سے مستفید ہونیکا موقعہ ملا ہے۔

مسٹر ڈوواٹر (سولیسٹر) نے ان کے متعلق دو واقعات مجھے سنائے تھے جو ان کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جب وہ چانسری جج تھے تو ایک تنازعہ ان کے اجلاس میں پیش ہوا جسمیں مدعی کا مطالبہ تھا کہ مدعا علیہ نے معاہدہ شکنی کی ہے۔ اور مدعی ہرجانے کا مستحق ہے۔ انہوں نے قرار دیا کہ مدعا علیہ معاہدہ کا پورا کرنا واجب تھا اور چونکہ اس کی طرف سے کوتاہی ہوئی اسلئے مدعی ہرجانہ وصول کرنے کا حقدار ہے۔ انہوں نے مدعی کے حق میں ہرجانے کی ڈگری صادر کر دی چند دن بعد کسی تقریب میں ان کی ملاقات مدعا علیہ کے وکیل سے ہوئی۔ دوران گفتگو اس مقدمے کا ذکر آگیا انہوں نے وکیل سے فرمایا کہ فلاں مرحلے پر آپکے موکل پر واجب تھا کہ وہ معاہدے کی تکمیل کی پیشکش مدعی کو کرتا وکیل نے کہا ہم نے پیشکش کی تھی۔ کہا تو پھر آپ نے بحث میں اس طرف توجہ کیوں نہ دلائی اس نے کہا اسلئے کہ ہمنے جو چٹھی لکھی تھی وہ PREJUDICE WITHOUT تھی اور اسلئے ہم اسے شہادت میں پیش کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ دوسرے دن انہوں نے مدعا علیہ کے وکیل کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ایک چیک دیا اور کہا یہ وہ رقم ہے جو آپ کے موکل کو میرے فیصلے کے رو سے فریق ثانی کو واجب الادا ہے آپ ایسا انتظام کریں کہ آپکے موکل کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ رقم میں نے دی ہے۔ بنگال کے ایک پولیس انسپکٹر پر کوئی فوجداری الزام ثابت ہو کر اسے سزا ہوئی اس کی اپیل اور نگرانی کی درخواست دونوں نامنظور ہوئیں اور وہ اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس نے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کرنے کیلئے خاص اجازت کی درخواست کی اور خود درخواست کی پیروی کیلئے پیش ہوا۔ بورڈ کے صدر لارڈ بلینز برگ تھے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ فوجداری معاملات میں پریوی کونسل کے روبرو سماعت کی اجازت صرف ایسی استثنائی صورت میں دیجاتی ہے جب عدالت ماتحت نے کوئی ایسا حکم صادر کیا ہو جس کے صادر کرنے کا اسے اختیار ہی نہ ہو۔ تمہارے معاملے میں یہ صورت نہیں سائل آنسو بہاتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ سر جارج لاؤنڈز ان دنوں پریوی کونسل میں پریکٹس کرتے تھے اور کمرے میں موجود تھے۔ لارڈ بلینز برگ نے جلدی میں ان سے کہا سر جارج جلدی جانا اور اس شخص سے اس کا لندن کا پتہ دریافت کرنا۔ پتہ ملنے پر لارڈ بلینز برگ نے سائل کو ایک چیک بھیجا جس کی رقم اس کے کلکتہ سے آنے جانیکے اخراجات کیلئے کافی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ذاتی چٹھی وزیر ہند کو لکھی کہ اس شخص کے متعلقہ کاغذات منگوا کر اپنے مشیران کی معرفت اپنا اطمینان کر لیں کہ اس کے ساتھ بے انصافی تو نہیں برتی گئی۔

گرے فرائرز کی شام کی صحبتوں میں ہمارے درمیان بعض دفعہ الٰہیات کا ذکر چھڑ جاتا۔ مجھے جو تھوڑا بہت علم اسلامی تعلیم کے متعلق تھا میں بیان کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ حیات آخرت کے متعلق ان کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ ایک بار فرمایا ظفر اللہ جو کچھ تم کہتے ہو ایسا معقول اور قابل قبول ہے کہ افسوس ہوتا ہے ان امور پر زیادہ روشنی کیوں میسر نہیں۔ میں نے کہا "روشنی تو میسر ہے دروازے کھڑکیاں اور روشندان کھولنے اور ان سے پردے ہٹانے کی ضرورت ہے۔" فرمایا "ٹھیک کہتے ہو۔"

۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے لندن کے رہنے والے بیس پچیس بچوں کے رہنے کے لئے گرے فرائرز میں جگہ کر دی تاکہ لندن کے باہر نسبتاً محفوظ مقام پر آجائیں۔ یہ بچے لندن سے ایک استانی کی نگرانی میں آگئے۔ لیڈی ٹیورسٹاک نے مجھے بتایا کہ یہ تو چاہتے تھے کہ ان بچوں کو جو مفلس ترین گھروں سے آئے تھے مہمانوں والے کمروں میں رکھیں۔ لیکن میں نے مشورہ دیا کہ اس طرح تو آپ اپنا سارا سامان برباد کر لیں گے اور بعد میں سارے مکان کی زینت کا از سر نو انتظام کرنا ہوگا۔ بہتر ہو اگر ان بچوں کو تیسری منزل کے کمروں میں جگہ دی جائے اور آپ کے خادم جو سب سازو سامان کی قدر و قیمت سے واقف ہیں اور اس کی صفائی اور حفاظت کرتے ہیں مہمانوں والے کمروں میں آجائیں سو ایسا ہی کیا گیا۔ لارڈ بلیز برگ نے سب بچوں کو موسم کے مطابق نئے صاف ستھرے لباس بنوا دیئے اور یہ بچے گرے فرائرز کے پرآسائش ماحول میں خوش و خرم رہنے لگے۔ میں جب نومبر میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں لنڈن گیا تو دلچیلسی بھی حاضر ہوا۔ چودھری انور احمد صاحب میرے ساتھ تھے۔ لارڈ بلیز برگ نے بتایا کہ ہر اتوار کی صبح کو وہ ہر بچے کو ایک پنس جیب خرچ دیتے ہیں۔ دوسری صبح میں نے کچھ پنس فراہم کر لئے اور جب یہ بچے سیر سے واپس آئے تو میں نے بھی ایک ایک پنس انہیں دیا۔ بچے بہت خوش ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا اس ہفتے میں تو دو اتوار آگئے! ایک دن لارڈ بلیز برگ نے سر شادی لال کے ذکر میں کہا۔ ظفر اللہ میرے ساتھ جب وہ تمہارا ذکر کرتے ہیں تو تمہاری تعریف ہی کرتے ہیں۔ میں نے کہا اسلئے کہ وہ جانتے ہیں کہ آپ کا سلوک میرے ساتھ مشفقانہ ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے دریافت کیا کیا سر شادی لال متمول حیثیت کے ہیں؟ میں نے کہا یہاں کے معیار سے تو کوئی ایسے متمول نہیں خوشحال ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے معیار کے مطابق متمول شمار کئے جاتے ہیں۔ پوچھا اپنی دولت کیسے صرف کرتے ہیں؟ میری مراد یہ ہے کہ کیا اپنے اموال کا کچھ حصہ ایسے کاموں پر بھی صرف کرتے ہیں جس کی غرض عام لوگوں کیلئے خوشی اور دلچسپی کے ذرائع مہیا کرنا ہو؟ میں نے کہا میں نے تو کبھی ایسا نہیں سنا۔ جو کچھ سننے میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے بیٹوں کے لئے بہت سی جائداد چھوڑنا چاہتے ہیں۔ فرمایا اگر یہ صحیح ہے تو ظفر اللہ بستر مرگ پر ان کے خیالات کی رو کیا ہوگی! سر شادی لال نے

سر شادی لال کے آخری ایام

۱۹۳۸ء کے اکتوبر میں پریوی کونسل کی ججی سے استعفیٰ دیدیا تھا اور نئی دہلی میں اپنے بنگلے میں رہائش اختیار کر لی تھی ایک سال ہی میں ان کی صحت گرنا شروع ہو گئی۔ آخر میں لاچاری کی حالت میں صاحب فراش ہو گئے۔ رائے بہادر لالہ

رام سرن داس صاحب کے سانخوان کے پرانے دوستانہ مراسم تھے۔ رائے بہادر صاحب دلی آئے تو مجھے بھی ملنے تشریف لائے۔ وہ پرانی وضع کے با اخلاق بزرگ تھے۔ بہت افسردہ نظر آتے تھے میں نے وجہ دریافت کی فرمایا یہ میشرسے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیئے۔ ابھی ابھی سر شادی لال کے ہاں سے آیا ہوں۔ بہت ضعف کی حالت میں ہیں۔ مجھے پہچان بھی نہ سکے۔ حواس بھی قائم نہیں۔ تم جانتے ہو جب پنجاب کے چیف جسٹس تھے ان کا کسقدر رعب ہوتا تھا۔ ہر کوئی خوشامد کرتا تھا۔ تمام عمر انہیں یہی فکر رہی کہ اپنے لڑکوں کیلئے کافی دولت چھوڑ جاؤں۔ اب بھی پنشن آتی ہے لڑکے ہی وصول کرتے اور خرچ کرتے ہیں۔ انہیں تو اب اپنا بھی ہوش نہیں۔ برآمدے میں جو کمرہ کھلتا ہے اس میں ایک بوسیدہ چارپائی پر پڑے ہیں۔ کوئی ملازم پاس نہیں کہ پیاس لگے تو پانی ہی پلا دے۔ مجھے رائے بہادر صاحب کے بیان سے لارڈ بلینز برگ کا سوال یاد آگیا کہ بستر مرگ پر سر شادی لال کے خیالات کی رو کیا ہوگی؟

ایک بار میں لارڈ بلینز برگ کے ہمراہ کار میں لندن سے ونچیلسی جا رہا تھا۔ انہوں نے وقت کا اندازہ کرکے جیک اپنے ڈرائیور سے کہا خبروں کے نشر ہونے کا وقت ہے ریڈیو لگا دو۔ خبروں میں سنا کہ ہٹلر کی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو رہی ہیں۔ خبریں سننے کے بعد لارڈ بلینز برگ نے فرمایا معلوم نہیں یہ شخص کہاں جاکر رکے گا۔ سچ یہ ہے کہ اسے روکنے کیلئے ہمیں ایک BULLDOG درکار ہے۔ ہمارا BULLDOG چرچل ہے لیکن چرچل کو کیبنٹ میں لانے سے سب اسلئے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ کیبنٹ میں لیا گیا۔ تو بس وہی کیبنٹ ہوگا۔!

پنڈت نانک چند صاحب | تیسری گول میز کانفرنس ختم ہونے پر میں لاہور واپس چلا گیا۔ ہائی کورٹ کے بار روم میں ایک دن میرے ایک ہندو رفیق نے مجھ سے کہا کل شام ڈی اے وی کالج میں تیسری گول میز کانفرنس کے موضوع پر پنڈت نانک چند کی تقریر تھی۔ تقریر کے دوران میں انہوں نے تمہارا ذکر بڑے تعریفی الفاظ میں کیا اور کہا کہ گول میز کانفرنس کے حلقوں میں اس نے بڑی نیکنامی حاصل کی ہے اور اس کا وجود پنجاب کیلئے بڑے فخر کا باعث ہے۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت صاحب سے بھی ملاقات ہوگئی فرمایا تم نے سنا کل شام میں نے تمہارے متعلق کیا کہا ہے؟ میں نے کہا ہاں میں نے ابھی ابھی سنا ہے اور میں آپ کا نہایت ممنون ہوں لیکن آپ نے میرے لئے ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔" پوچھا "کیسی مشکل؟" میں نے کہا آپ نے میری تعریف کی اب مجھ پر بھی لازم ہوا کہ میں بھی آپ کی تعریف کر دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے میرے متعلق فرمایا وہ سچ سمجھ کر ہی فرمایا لیکن میں سچ کہتے ہوئے آپکی کیا تعریف کروں؟" بہت ہنسے۔ اس پر میں نے کہا ایک خدمت میں کر سکتا ہوں آپ جس مجلس یا مجمع میں چاہیں میں یہ بیان دینے کو تیار ہوں کہ کانفرنس میں آپنے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کہنے لگے بہت خوب بہت خوب مجھے یہ منظور ہے تم اتنا کہہ دو تو سب ہندو یہ سمجھیں گے میں نے کانفرنس میں ان کی بہت خدمت کی ہے اور آئندہ انتخاب میں سب مجھے ووٹ دیں گے!۔

خان بہادر قلی خان صاحب | کچھ دنوں بعد اس کے مقابل کے تجربے کی بھی ایک مثال سامنے آگئی۔ سید افضل علی صاحب ان دنوں پشاور میں اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس تھے۔ میں پشاور ان کی ملاقات کیلئے گیا۔ عصر کے بعد انہوں نے فرمایا میرا ایک

کرم فرما تم سے ملنے کے بڑے شائق ہیں وہ ہر روز کلب میں تشریف لاتے ہیں۔ ہم کلب چلتے ہیں وہاں ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی کلب میں سید صاحب نے میرا تعارف خان بہادر قلی خاں صاحب سے کرایا۔ خان بہادر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ فرمایا ہم تو گول میز کانفرنس میں زیر بحث مسائل کی پیچیدگیوں سے واقف نہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ ہندو اخبارات آپ کے متعلق بہت برا بھلا لکھتے ہیں جس سے ہمیں پختہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ پکے مسلمان ہیں! خان بہادر صاحب کے ساتھ میرے بڑے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے ۱۹۳۵ء سے جب کبھی انہیں شملے یا دلی آنیکا موقعہ ہوتا میرے ہاں قیام فرماتے اور بڑے اخلاص کے ساتھ تعلقات نبھاتے رہے۔ فجزاہ اللہ۔ چند سال پہلے جب مس ایلیس کو اغوا کیا گیا تو سرحد کی حکومت نے خان قلی خاں صاحب کو ان کی رہائی کیلئے رستہ صاف کرنے کی مہم پر بھیجا تھا جسکو انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ گو آخری مرحلہ پر یہ معاملہ خان بہادر مغل باز خان صاحب کے ہاتھوں طے پایا۔ جب خان قلی خاں صاحب نے یہ سرگذشت مجھے سنائی تو میں نے دریافت کیا خان بہادر صاحب اس کامیابی پر حکومت کی طرف سے کچھ خوشنودی کا اظہار بھی ہوا۔ فرمایا ہاں حضور مغل باز خان کو تو بہت انعام واکرام ملا اور ہمیں صرف دو مربعہ زمین اور وہ تمغہ جو عورتوں کو ملتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا کیا تمغہ قیصر ہند یا کچھ ایسی بلا۔

مقدمہ سازش دہلی کا انجام

وائسرائے نے دہلی پہنچ کر مجھے بلایا اور دوران گفتگو فرمایا مقدمہ سازش کے متعلق اب ہم نے تمہارے مشورے کیمطابق ٹریبونل ختم کر کے ملزمان کے خلاف عام عدالتوں میں چالان دائر کر دیئے ہیں میں نے عرض کیا اگر شروع میں یہی طریق اختیار کیا جاتا تو بہت سا روپیہ اور وقت بچ جاتا۔

گول میز کانفرنسوں کے نتیجے میں ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی تجاویز کیمتعلق حکومت برطانیہ کا قرطاس ابیض اور انپر غور کرنیکے لئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی۔

گول میز کانفرنسوں کے نتیجے میں حکومت برطانیہ نے اپنی تجاویز ایک قرطاس ابیض کی شکل میں پارلیمنٹ میں پیش کیں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی ان پر غور کرنے کیلئے قائم ہوئی اس کمیٹی کے صدر لارڈ لنلتھگو تھے جو بعد میں وائسرائے ہند ہوئے اراکین میں تین سابق وائسرائے، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ ریڈنگ اور لارڈ ارون شامل تھے۔ ان کے علاوہ مارکوئیس آف سالسبری آرچ بشپ آف کنٹربری، سر آسٹن چیمبرلین، لارڈ ڈاربی، لارڈ زٹلینڈ اور پارلیمنٹ کے اور بہت سے نمائندے بھی اراکین میں تھے۔ شہادت کے مرحلے پر کمیٹی کے کام میں اعانت کرنے کیلئے ہندوستان سے ایک وفد کمیٹی کے ساتھ شامل کیا گیا۔ میں بھی اس وفد میں شامل تھا۔ مشترکہ کمیٹی کے اجلاس ۱۹۳۳ء کے موسم بہار میں شروع ہوئے۔ لندن پہنچنے پر میں حسب معمول ہز ہائی نس سر آغا خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کچھ آشفتہ نظر آئے۔ ایک تار مجھے دیا اور فرمایا اسے پڑھو وہ تار ان کے نام ڈاکٹر شفاعت احمد صاحب کی طرف سے تھا اس کا مضمون یہ تھا۔ "مبارکباد مجھے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے آئندہ اجلاس کیلئے صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اب مسلمانوں میں میری حیثیت وہی ہے جو گاندھی جی کی ہندوؤں میں ہے"۔

معلوم ہوا ہز ہائی نس کی آشفتگی اس تار کی وجہ سے تھی۔

پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے روبروشہادتیں | مشترکہ کمیٹی کے روبرو ہندوستان سے بھی گواہ پیش ہوئے اور انگلستان سے بھی۔ بعض گواہان انفرادی حیثیت میں پیش ہوئے اور بعض جماعتی نمائندوں کی حیثیت میں کچھ گواہان قرطاس ابیض کی تجاویز کی تائید میں تھے اور کچھ مخالفت میں۔ سر مائیکل اوڈوائیر اور ان کے ہم خیالوں نے قرطاس ابیض کے خلاف انگلستان میں ایک محاذ قائم کر رکھا تھا اور وہ مسٹر چرچل کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ چنانچہ سر مائیکل اپنے چند رفقاء سمیت کمیٹی کے روبرو شہادت دینے کیلئے تشریف لائے اور مسٹر چرچل بھی بہ نفسِ نفیس شہادت دینے آئے۔ سر جان ٹامسن نے جو دہلی کے چیف کمشنر رہ چکے تھے قرطاس ابیض کی تائید میں ایک انجمن قائم کی اور خود اس کے وائس چیئرمین بنے لیکن اس انجمن کی طرف سے کمیٹی کے روبرو کوئی شہادت پیش نہ ہوئی۔ اس کی سرگرمی رائے عامہ کی تائید حاصل کرنے تک محدود رہی۔ ہندوستان سے ایک وفد پیش ہوا جس کے لیڈر مہاراشٹر کے ایک معزز برہمن تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے تو حامی تھے لیکن ان کا مطالبہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کو کسی ایسے قانون کے بنانے کا اختیار نہ ہو جو مذہب پر اثر انداز ہو۔ ان پر جرح کے دوران میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار نے بہت کوشش کی کہ انہیں قائل کرسکیں کہ قانون سازی کے اختیارات پر ایسی حدبندی ناقابلِ عمل ثابت ہوگی۔ لیکن وہ اپنی بات پر مصر رہے۔ آخر مسٹر جیکار نے دق ہو کر پوچھا آپ مذہب کے اتنے حامی ہیں تو آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ آپ کے مذہب کے رُو سے سمندر پار کا سفر روحانی نجات کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ انہوں نے فرمایا "میں یہ تسلیم کرتا ہوں"۔ مسٹر جیکار نے پوچھا، "پھر آپ نے مذہب کی تعلیم کے خلاف یہ حرکت کیوں کی؟" انہوں نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی روح کی بہبودی کو اس لئے خطرے میں ڈالنا منظور کیا کہ میں اپنے کروڑوں ہم جنسوں کی ارواح کی بہبودی کا تحفظ کرسکوں"۔ یہ فقرہ انہوں نے ایسے جوش اور اخلاص کے ساتھ کہا کہ کانفرنس کے اراکین نے بیساختہ انہیں خراجِ تحسین پیش کیا!

مشترکہ کمیٹی کے سامنے مسٹر چرچل کی شہادت | اس میں شک نہیں کہ جو اصحاب کمیٹی کے روبرو شہادت دینے کیلئے تشریف لائے ان میں سے موثر ترین شخصیت مسٹر چرچل کی تھی۔ ان کی شہادت چار دن جاری رہی۔ مسٹر چرچل قرطاس ابیض کی ہر تجویز اور اس سارے منصوبے کے سو فیصدی مخالف تھے۔ ان پر سوالات کے درمیان وزیر ہند، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیکار، سر ہری سنگھ گاوڑ وغیرہم سب جتن کرکے تھک گئے۔ لیکن مسٹر چرچل اپنے موقف سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ مسٹر چرچل اپنی سابقہ تقریروں میں ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ دیئے جانے کی حمایت کر چکے تھے جب انہیں ان کے وہ سابقہ اعلانات یاد دلائے جاتے تو فرماتے "نوآبادیات کے درجے کا تو میں اب بھی مویّد ہوں لیکن نوآبادیات کا درجہ تو ہندوستان حاصل کر چکا ہے۔ ہندوستان نے معاہدہ ورسائے پر دستخط کئے، ہندوستان لیگ آف نیشنز کا رکن ہے۔ یہ نوآبادیات کا درجہ ہی تو ہے۔ لیکن درجہ اور بات ہے اور نوآبادی کے اختیارات اور بات!

ان کے لئے ہندوستان ابھی تیار نہیں۔ ہندوستان کی آبادی کے ۹/۱۰ حصے کو ان امور میں دلچسپی بھی نہیں۔ وہ کیا جانیں خود اختیاری کس جانور کا نام ہے اور اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور اسے کس طریق پر چلایا جا سکتا ہے ان کا مفاد تو اس میں ہے کہ امن قائم رہے، انصاف ہو اور انکی بہبودی کی نگہداشت کی جائے۔ اور یہ موجودہ صورت میں ہو رہا ہے۔ یہ سیاسی مطالبات تو محض ایک شورش ہے جو خود غرض سیاسی قیادت نے بپا کر رکھی ہے۔" جہاں وزیر ہند جو قرطاس ابیض کے بانیوالے تھے اور ہندوستان کے سیاسی میدان کے شہسوار ناکام رہے۔ وہاں مجھے مسٹر چرچل جیسے آزمودہ کار پہلوان کے ساتھ نبرد آزمائی کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں کمیٹی کا اجلاس شروع ہونے سے کچھ وقت پہلے پہنچ جایا کرتا تھا اور اپنی نشست پر بیٹھے لکھائی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ ایک صبح میں اسی شغل میں تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے سر اٹھاکر دیکھا تو وزیر ہند تھے انہوں نے دریافت فرمایا ظفر اللہ! آج شاید تمہاری باری آجائے کیا تمہارا ارادہ چرچل سے کوئی سوال پوچھنے کا ہے؟" میں نے کہا میری کیا مجال ہے! کہنے لگے "تم سب یہ غلطی کر رہے ہیں کہ چرچل پر اسکی سابقہ تقریروں کی بنا پر جرح کرتے رہے ہیں چرچل بڑا ہوشیار پارلیمنیٹیرین ہے۔ تم نے دیکھا کیسی ہوشیاری سے اپنے سابقہ اقوال کی تعبیر کر کے ٹال جاتا ہے۔ "ذمہ دار بات ہے اختیارات اور بات۔" اس قسم کی جرح سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر تمہارا ارادہ چرچل سے کچھ سوال کرنے کا ہو تو تم اسے ہندوستان کی موجودہ حالت کے متعلق سوال کرو جس کے متعلق اسے کچھ علم نہیں۔ وہ سمجھتا ہے ہندوستان آج بھی وہی ہے جو آج سے تیس ۳۵ پینتیس سال پہلے تھا جب چرچل بنگلور میں فوجی خدمت کر رہا تھا۔ یہ اوڈوائر کے ہم خیالوں کا پڑھایا ہوا یہاں آیا ہے خود اسے آج کے ہندوستان کے متعلق بہت کم علم ہے۔ تم اسے اس میدان میں دھکیل کر لے جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم ہے اور اسے نہیں وہاں یہ تمہارے مقابل پر ٹہتا ہوگا۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں کوشش کروں گا۔

مسٹر چرچل پر سردار بوٹا سنگھ کی جرح | سہ پہر کے اجلاس میں مسٹر چرچل پر سوالات کرنے کیلئے سردار بوٹا سنگھ ورک کی باری آگئی۔ وہ شیخوپورہ کے ایک وکیل تھے جو پنجاب کونسل کے نائب صدر تھے اور مشترکہ کمیٹی میں سکھوں کے نمائندہ تھے انہیں مسٹر چرچل پر جرح کرنے کا بہت شوق تھا ان کی نشست میرے دائیں ہاتھ تھی وہ بہت خوب شخص تھے لیکن نامانوس ماحول میں تھے۔ انگریزی بالکل پنجابی لہجہ میں بولتے تھے لیکن بلند حوصلہ اور باہمت تھے۔ جب چیئرمین نے ان کا نام پکارا تو فوراً اپنے کاغذات سنبھالے، عینک چڑھائی اور بڑے مشفقانہ لہجے میں مسٹر چرچل کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" مسٹر چرچل نے اپنا سگار ہلاکر مسکراتے ہوئے کہا۔ "شوق سے شوق سے" سردار صاحب نے پوچھا "مسٹر چرچل آپ نے کہا ہے" آہستہ آواز میں مجھ

سے پنجابی میں دریافت کیا بھائی کیا کہا تھا اس نے MOB؟ میں نے کہا نہیں MASSES) ہاں ہاں آپ نے کہا ہے MASSES یعنی عوام کو ان مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں! کیا یہ ٹھیک ہے؟ مسٹر چرچل نے کہا "ٹھیک ہے! ہندوستانی عوام کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔" سردار صاحب نے پوچھا "اچھا تو پھر بھلا آپ کیا کہیں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں MASSES (عوام) ہوں۔" مسٹر چرچل نے مسکرا کر جواب دیا:-

I WOULD CONGRATULATE THE MASSES

(میں عوام کو مبارکباد کہوں گا) اچھا ہوا کہ سردار صاحب اور مسٹر چرچل کے درمیان ایسے لطائف کا سلسلہ کوئی بیس منٹ جاری رہا۔ اس سے کمیٹی کی کارروائی کی انتہائی سنجیدگی کچھ ہلکی ہو گئی۔ جب میری باری آئی تو مسٹر چرچل نے سوچا ہو گا کہ ایک داڑھی والے نے تو مضحکہ خیزی کا مظاہرہ کر لیا اب دیکھیں دوسرا داڑھی والا کیا گل کھلاتا ہے۔ اتفاق سے ہم تھے بھی دونوں پنجابی جاٹ۔

مسٹر چرچل پر میری جرح | مسٹر چرچل اگرچہ کمیٹی کے روبرو گواہ کی حیثیت میں آئے تھے اور چند سالوں سے انہوں نے وزارت میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن مسلمہ طور پر وہ برطانوی سیاست کے آسمان کے ایک درخشندہ ستارے تھے۔ ایک ڈیوک کے پوتے، ایک وزیر خزانہ کے بیٹے۔ پہلی عالمی جنگ میں برطانیہ کے بحری محکمہ کے وزیر، ایک صاحب تجربہ سیاسی قائد، ایک بارعب رکن پارلیمنٹ، ایک بلند پایہ ادیب، ایک نامور نقاد اور مورخ، غرض ہر لحاظ سے وہ ایک قابل احترام شخصیت تھے۔ اور ایسی کمیٹیوں میں تو گواہ کی بھی وہی حیثیت ہوتی ہے جو ارکان کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے سوالات اور لب و لہجہ میں ان کا پورا احترام مدنظر رکھا اور وہ بھی بہت خوش اخلاقی سے جواب دیتے گئے۔ پہلے پہلے تو میرے سوالات کا بلا تامل جواب دیتے۔ جو بات تسلیم کرنے کے لائق ہوتی تسلیم کرتے اور جس امر کا اعتراف کرنا پڑتا اعتراف کرتے۔ لیکن جب انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ تو میرے مسلمات سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان نہ صرف آزادی کا طالب ہے بلکہ آزادی کیلئے تیار بھی ہے تو ان کے رویہ میں تبدیلی ہوئی اور میرے سوالات کو ٹالنا شروع کیا ایک سوال کو جب دوبارہ ٹال چکے تو میں نے عرض کیا "مسٹر چرچل مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ انگریزی میری مادری زبان نہیں اور میں باوجود دوبارہ کوشش کرنے کے اپنا مطلب آپ پر واضح نہیں کر سکا اگر آپ اجازت دیں تو میں پھر کوشش کروں۔" چونکہ اب وہ محتاط ہو چکے تھے اسلئے مجھے اپنے سوالات کو اس طریق پر ڈھالنا تھا کہ جواب میں انہیں ٹالنے کی گنجائش نہ ہو۔ مجھے یہ بھی فائدہ تھا کہ جیسے وزیر ہند نے مجھے بتایا تھا مسٹر چرچل ہندوستان کی موجودہ حالت سے واقف نہ تھے۔ میں نے جب یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی کہ آزادی کیلئے جو معیار مسٹر چرچل نے خود پیش کیا ہے ہندوستان اسے بہت حد تک پورا کرتا ہے اور اس ادعا کے ثبوت میں واقعاتی تصویر کے نقوش کھینچنا شروع کئے۔ خصوصاً صوبہ پنجاب کے حالات کی بنا پر جن سے وہ واقف نہیں تھے تو انہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اگر وہ ہر سوال کے جواب میں کہتے مجھے اس کا علم نہیں تو دو تین بار عدم علم کا اعتراف

کرنے کے بعد ان کی شہادت کا وزن بہت حد تک ہلکا ہو جاتا اور سوالات تسلیم کرتے جانے سے جو موقف ہندوستان کو مجوزہ آئینی اصلاحات دیئے جانے کے خلاف انہوں نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا اس کی بنیاد کمزور ہو رہی تھی۔ اس دن ان پر میری جرح گھنٹہ بھر جاری رہی اور ختم نہ ہوئی تھی کہ اجلاس دوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔ دوسرے دن گھنٹہ بھر اور اسی پر صرف ہوا۔ جب میں نے مسٹر چرچل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جرح ختم کی تو مسٹر چرچل نے کمال فیاضی سے فرمایا۔ "لارڈ چیئرمین میں نے تو محسوس نہیں کیا کہ مسٹر ظفر اللہ خاں کو انگریزی ان کی مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مشکل پیش آئی ہو۔" جب چوتھے دن کے آخر میں مسٹر چرچل کی شہادت مکمل ہو چکی تو ساری کمیٹی نے دیر تک چیئرز کے ساتھ انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ مسٹر چرچل اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے فرمایا:-

"YOU HAVE GIVEN ME TWO MOST DIFFICULT HOURS BEFORE THIS COMMITTEE"

(ترجمہ۔ اس کمیٹی کے روبرو تم نے دو گھنٹے میرا ناک میں دم کئے رکھا۔)

یہ اعتراف انکی بڑائی کا ثبوت تھا۔ اگر میں کسی خفیف حد تک مسٹر چرچل کے مخالفانہ موقف کا اثر اراکین کمیٹی کے ذہنوں سے زائل کرنے میں کامیاب ہو سکا تو اس کا سہرا اوّل تو وزیر ہند کے سر ہے جنہوں نے مسٹر چرچل پر موثر جرح کا مجھے طریق سمجھایا اور پھر میاں سر فضل حسین صاحب کے سر ہے جن کی مساعی کے نتیجہ میں پنجاب کا پسماندہ صوبہ سابقہ اصلاحات کے نظام کو ذمہ دارانہ طور پر چلانے میں ایسا کامیاب ہوا کہ چند ہی سالوں میں اس کا شمار ہندوستان کے ترقی یافتہ صوبوں میں ہونے لگا۔ میں نے مسٹر چرچل پر جرح کے دوران میں صوبہ پنجاب کو ہی بطور مثال پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان مزید اصلاحات کیلئے تیار ہے۔ بعد میں مسٹر چرچل سے کئی بار مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہمیشہ بڑے تپاک سے پیش آتے رہے۔

مشترکہ کمیٹی کے سامنے سر مائیکل اوڈوائر کی شہادت

سر مائیکل اوڈوائر بھی اپنے رفقا کے ساتھ شہادت دینے کیلئے تشریف لائے۔ جب ان کے سامنے بھی میں نے پنجاب کی مثال پیش کی تو انہوں نے فرمایا مسٹر ظفر اللہ خاں! تم نے بہترین صوبے کو مثال کے لئے چنا ہے۔ میں نے کہا مثال تو بہترین ہی پیش کی جاتی ہے۔ جب میں نے انہیں ایسے منصوبوں کی طرف توجہ دلائی جو صوبہ پنجاب میں عوام کی بہبودی کو ترقی دینے کی خاطر جاری کئے گئے تھے تو بعض کے متعلق انہوں نے فرمایا "اُس کی ابتدا تو میرے وقت میں ہوئی تھی۔" یا "میرے وقت میں اس پر غور شروع ہو گیا تھا۔" یا "اُس کی طرف تو میں نے توجہ دلائی تھی۔" میں نے کہا میری غرض یہ نہیں کہ آپ کی مساعی پر پردہ ڈالا جائے۔ میری غرض تو یہ دکھانا ہے کہ برصغیر میں سیاسی ذمہ داری۔ خدمتِ خلق، اقتصادی، صنعتی اور حرفتی ترقی، تعلیمی اور ذہنی دلچسپی حفظانِ صحت اور طبی اداروں کے قیام اور فروغ کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں اور دن بدن زیادہ ہو رہی ہیں۔

کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس ٹورنٹو میں شرکت

موسم گرما میں کمیٹی کی کارروائی چند ہفتوں کیلئے ملتوی ہو گئی ہندوستانی وفد کے اکثر اراکین اس عرصے کیلئے واپس ہندوستان چلے گئے۔ رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کے سیکرٹری

جنرل مسٹر اولسین میکیڈم نے مجھ سے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی میں ایک کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس کینیڈا کے
شہر ٹورنٹو میں اگست کے مہینے میں ہونے والی ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہندوستان کی طرف سے بھی ایک وفد اس کانفرنس
میں شامل ہو۔ سر راما سوامی مدلیار، میر مقبول محمود صاحب اور مجھے اس میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ ہم لورپول
سے ڈچین لائن کے جہاز پر مانٹریال گئے۔ چند گھنٹوں کیلئے جہاز کیوبک ٹھہرا۔ جہاز سے شہر کا نظارہ بہت دلفریب
تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اٹھارویں صدی کے فرانس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر سینٹ لارنس کے کنارے پر رکھ دیا گیا ہے
کیوبک سے جہاز نے لنگر اٹھایا تو سامنے دریا پر پل نظر آرہا تھا بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جہاز کے قریب پہنچنے پر
یا تو پل کا وسطی حصہ کھل جائے گا یا اگر ایسا نہ ہوا تو جہاز کے بادبان پل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ جہاز تدریج
پل کی طرف بڑھتا گیا لیکن پل کا کوئی حصہ نہ کھلا سب مسافر یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ جہاز پل کے نیچے پہنچا تو دکھائی
دیا تو بعض مسافروں کی چیخیں نکل گئیں لیکن بادبانوں کا پل کے ساتھ تصادم نہ ہوا۔ آنکھ کو تو ایسے دکھائی دیا کہ پل
تک پہنچ کر بادبان خود نیچے ہو کر سمٹ گئے اور پل کے نیچے گذر کر دوسری طرف پھر پہلے جیسی بلندی اختیار کر لی لیکن
دراصل یہ سب کیفیت ایک فریب نظر تھی۔ پل کی بلندی اتنی تھی کہ جہاز آسانی سے نیچے سے گذر سکتا تھا البتہ آنکھ فریب
کھا جاتی تھی۔

کیوبک سے مانٹریال تک دریا کے دونوں طرف فرانسیسی نسل کے لوگوں کی آبادی ہے، منظر نہایت دلفریب
ہے۔ یہ سارا دن بہت لطف میں گذرا، غروب آفتاب کے وقت ہم مانٹریال پہنچے۔ رات میں فورڈ ہوٹل میں ٹھہرا
مانٹریال کی ہر بات میرے لئے انوکھی تھی۔ یہ شہر یورپ اور امریکہ اور خصوصاً انگلستان فرانس اور کینیڈا کا
مرکب ہے، نئی دنیا میں یہ میرا پہلا ورود تھا اور یہ دنیا مجھے سچ مچ ہر لحاظ سے نئی معلوم ہوتی تھی بعد میں کئی بار مجھے
کیوبک اور مانٹریال جانے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے ہر بار یہاں کے قیام کو خوشگوار پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ کینیڈا
کے ہر شہر اور ہر خطے کے متعلق میری طبیعت پر یہی تاثر ہے۔ مانٹریال ایک دن ٹھہر کر میں آٹوا گیا جو کینیڈا کا
دارالحکومت ہے۔ چند گھنٹے وہاں ٹھہر کر ٹورنٹو چلا گیا۔ کانفرنس وہاں کی یونیورسٹی کے ہارٹ ہاؤس میں ہونے
والی تھی۔ ابھی کانفرنس کے شروع ہونے میں کچھ دنوں کا وقفہ تھا۔ میں صرف ایک رات ٹورنٹو ٹھہرا ہارٹ ہاؤس
کے وارڈن مسٹر بکرسٹتھ نے ہارٹ ہاؤس ہی میں میرے قیام کا بہت آرام دہ انتظام کر دیا تھا۔

نیویارک کا پہلا سفر | دوسری صبح میں نیویارک روانہ ہو گیا۔ BUFFALO اسٹیشن پر گاڑی بدلی
موسم گرم تھا مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی اسٹیشن کے BUFFET سے میں نے بٹر ملک BUTTER MILK
لیا اور اس میں اتنا ہی برف کا پانی ڈال کر لسی بنائی اور تھوڑا سا نمک ملا کر سیر ہو کر پیا جس سے مجھے بہت تسکین
ہوئی شام ہونے تک ہم نیویارک پہنچ گئے۔ وہاں میری کسی سے واقفیت نہ تھی سفر کے آخری حصے میں ریل کی کھڑکی سے

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نیویارک کے ہوٹلوں کے اشتہار نظر آتے رہے۔ انہیں دیکھ کر میں نے قیام کیلئے پیراموٹ ہوٹل کا انتخاب کیا جو گرینڈ سنٹرل سٹیشن سے قریب ہی تھا۔ ہوٹل کے اندر ہوا ٹھنڈی کی ہوئی تھی جس سے گرمی کی زحمت سے بچاؤ رہتا ان دنوں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بہت کساد بازاری تھی اور صدر روزویلٹ کی نیوڈیل NEW DEAL کا بہت چرچا تھا۔ اگرچہ دو سال قبل برطانیہ کے سکے کی قیمت سونے کا معیار ترک کرنے کی وجہ سے گر گئی تھی لیکن پھر بھی ڈالر کے مقابلے میں سٹرلنگ مضبوط حالت میں تھا۔ ان دنوں ایک پونڈ کے پانچ ڈالر ملتے تھے اور نیویارک میں سب اشیاء نسبتاً سستی معلوم ہوتی تھیں لوکل آمدورفت کے ذرائع تو بہت ہی سستے تھے بس یا بجلی کی ریل پر جہاں سے جہاں چاہو چلے جاؤ کرایہ فقط پانچ سینٹ تھا اور سینٹ تھے ایک شلنگ کے ۲۵! البتہ ففتھ ایوینیو کی بسوں پر کرایہ دس سینٹ تھا یعنی پانچ پنس سے کچھ کم۔ نیویارک کی سیر کا ایک طریق یہ تھا کہ ففتھ ایوینیو کی کسی بس پر سوار ہو کر اوپر کے عرشے پر بیٹھے شہر کی آخری حد تک چلے جائیں۔ میں نیویارک صرف تین دن ٹھہرا لیکن سارا وقت سیر میں گذرا۔ مجھے بعد میں کئی بار نیویارک جانا ہوا ہے اور کئی دفعہ میرا قیام خاصے لمبے عرصے کیلئے ہوتا تھا۔ وسط اگست ۱۹۶۱ء سے شروع فروری ۱۹۶۴ء تک تو میرا مستقل قیام نیویارک میں ہی تھا لیکن بعض مقامات جو میں نے ان تین دنوں میں دیکھے پھر دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مثلاً آزادی کے بت تک گو میں ایک بار پھر گیا ہوں۔ لیکن بت کے اندر جا کر بت کی آنکھوں میں سے سمندر کا نظارہ میں نے ان تین دنوں کے قیام میں ہی کیا۔ نیویارک سے میں واپس ٹورنٹو گیا کیونکہ میں وہاں ایمپائر پارلیمنٹری ایسوسی ایشن کی کینیڈین شاخ میں تقریر کرنا منظور کر چکا تھا۔

شکاگو کا پہلا سفر اور WORLD FAITHS CONGRESS میں شمولیت

ٹورنٹو سے فارغ ہو کر میں شکاگو گیا جہاں ہوٹل مارلین میں مہاراجہ صاحب بڑودہ عالمی مذاہب کانگریس کا افتتاح کرنے والے تھے اور اس میں مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ ان دنوں شکاگو میں صد سالہ نمائش بھی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہاں غیر معمولی رونق تھی۔ صوفی مطیع الرحمٰن صاحب اس زمانے میں وہاں سلسلہ احمدیہ کے مبشر تھے وہ ازراہ کرم اسٹیشن پر پیشوائی کیلئے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے چند امریکن دوست بھی تھے جو مجھے اتنے جوش اور تپاک سے ملے گویا برسوں کے بچھڑے بھائی ہوں۔ مغربی ممالک میں پہلی ہی ملاقات پر اسقدر تپاک اور بے تکلفی کا اظہار میرے لئے اچنبھا تھا اور کسی قدر دقت کا موجب بھی اسٹیشن سے ہم سب ہوٹل گئے۔ صوفی صاحب نے میرے لئے کانگریس ہوٹل میں کمرہ لے رکھا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ہوٹل پہنچ کر صوفی صاحب کے ساتھ تخلیئے میں بیٹھ کر گفتگو کا موقعہ ملے گا پروگرام طے ہوگا۔ عالمی مذاہب کانگریس کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوں گی۔ منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے بدلنے کا موقعہ ہوگا۔ لیکن ہوٹل پہنچ کر ان میں سے ایک بات بھی نہ ہو سکی صوفی صاحب کے امریکن دوست کمرے میں بھی ہمارے ساتھ آگئے اور اطمینان سے کمرے پر قابض ہو گئے کوئی کرسی پر بیٹھ گیا کوئی صوفے پر کوئی میز پر دو تین تو پلنگ پر بھی بیٹھ گئے۔ مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ جو اسٹیشن ہی سے شروع ہو گئی تھی۔

جاری رہی میں ایک سوال کا جواب دے نہ چکتا تھا کہ دو تین اور سوال کر دیئے جاتے تھے۔ پانچ دس منٹ ہی گذرے ہونگے کہ تجویز ہوئی چلو نمائش دیکھنے چلیں، میری طبیعت سکون چاہتی تھی لیکن سکون کا امکان ہر لحظہ دور سے دور تر ہو رہا تھا۔ ناچار میں نے طے کیا کہ میری مرضی کے ہونے کا تو کوئی امکان نہیں پھر انہی کی مرضی سہی۔ صوفی صاحب خوش ہو رہے تھے کہ ان کے امریکن دوست بڑی بے تکلفی سے ان کے مہمان دوست کی آؤ بھگت کر رہے ہیں۔ ہم سب نمائش میں گئے جہاں آؤ بھگت بڑی بے تکلفانہ جاری رہی۔ یہ دیکھو! یہ کھاؤ! یہ پیو! آ آ! ان سے ملو یہ میرے BUDDY ہیں! میں نے بڈی کا لفظ پہلے صرف کبڈی کے جز کے طور پر سنا ہوا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ بڈی سے امریکن کون رشتہ مراد لیتے ہیں۔ آخر ہم ہوٹل واپس لوٹے۔ اور میں نے اپنے مہربان دوستوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اب مجھے صوفی صاحب کے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں۔ صوفی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ تپاک اور اخلاص کا اظہار قطعاً نمائشی نہیں تھا اور یہ بے تکلفی امریکن طبیعت کا خاصا ہے اس کا بعد میں مجھے وسیع پیمانے پر تجربہ ہوتا رہا۔

مسٹر مائیکل پاولز

ان احباب میں سے مسٹر مائیکل پاولز شادی شدہ تھے اور ان کے دو بچے تھے جن میں سے بڑا لڑکا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ہاں دعوت دی مسز پاولز اور بچوں سے ملاقات ہوئی کھانے کے بعد مائیکل نے اصرار کیا کہ میری ٹائیوں میں سے ایک ٹائی نشانی کے طور پر چن لو۔ اس کے بعد جب بھی میں شکاگو گیا ان سے لازماً ملاقات ہوتی اور بہت سا وقت اکٹھے گذرتا وہ پہلی ملاقات کے وقت شہر میں ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے بعد میں شہر سے باہر کھلے حصے میں اپنا مکان تعمیر کر لیا جہاں کئی بار مجھے اپنا مہمان رکھا۔ ان کی اہلیہ ڈوروتھی میری تمام عادات اور ضروریات سے واقف ہو گئی تھیں۔ جب کبھی میں ان کے ہاں مہمان ہوا مجھے کبھی دوسری بار کوئی بات بتانے کی ضرورت نہ ہوئی ان کے صاحبزادے میرے دیکھتے دیکھتے بڑے ہوئے سکول ختم کیا پرڈو یونیورسٹی انڈیانا میں انجینئرنگ کی تعلیم کیلئے داخل ہوئے ایک بار میں شکاگو میں تھا۔ مائیکل نے کہا کل پرڈو کا فٹ بال کا میچ الینائے یونیورسٹی کے ساتھ ہے۔ اگر تم چل سکو تو مائیکل جونیئر ان کے بیٹے کے کیلئے بہت خوشی کا موجب ہوگا۔ ہم میچ دیکھنے گئے۔ یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ ہوڈے نے ہمیں لنچ کی دعوت دی۔ میچ دیکھتے وقت میری نشست مسز ہوڈے کے دائیں ہاتھ پر تھی کھیل دیکھتے دیکھتے جب کوئی موقعہ جوش ظاہر کرنے کا ہوتا وہ میرے بائیں بازو کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑتیں اور جب پھر طبیعت سکون پر آتی تو معذرت کرتیں۔ امریکن فٹ بال کا میچ دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں نے کھیلوں میں ایسا جوش پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ شہر میں سے گذرتے ہوئے دیکھا یونیورسٹی کے طلباء نے عجب عجب سوانگ بھرے ہوئے تھے ایک جگہ ایک کارڈ بورڈ کی نو فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی عورت ایک کارڈ بورڈ کے لڑکے کو بالوں سے پکڑے ہوئے پانی کے فرضی حوض میں ڈبکیاں دے رہی تھی اور اوپر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا:
"WE'LL DUCK THE ILLINOIS" مجھے DUCK کے معنی اس دن معلوم ہوئے! میں نے مسز ہوڈے سے دریافت کیا۔ آپ کو اپنی ٹیم کے جیتنے کی کوئی امید ہے؟ انہوں نے کہا بالکل نہیں۔ الینائے والے پچھلے سال کے چیمپین

ہیں۔اور ہم پچھلے سال ان سے بری طرح ہارے تھے۔ مجھے امریکن فٹ بال کے قواعد کا کچھ علم نہ تھا اسلئے کھیل کیمتعلق تو میں کوئی اندازہ نہ کر سکا جو کچھ مسز ہوڈے بتا دیتیں سن لیتا۔لیکن ہجوم کے جوش وخروش اور چیئر لیڈرس کی قلابازیوں سے اندازہ کرتا رہا کہ تماشیٔوں کو نہ صرف کھیل میں دلچسپی ہے بلکہ وہ سب ایک طرح سے خود کھیل میں شامل ہیں۔ آخر پردو نے الیانائے کو شکست دیدی! اس پر اتنا شور ہوا کہ الاماں!!

مائیکل اور میں یونیورسٹی کے مہمان تھے کھانے کے بعد مائیکل اور جونیر مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر اور یہ اطمینان کر کے کہ باوجود اردگرد کے شور وشغف کے میں آرام سے سو جاؤں گا۔یونیورسٹی کی فتح کے شادیانوں میں شریک ہونے کو چلے گئے۔چلتے ہوئے مائیکل نے اپنے بیٹے سے کہا "میاں پہلے مجھے کوئی DATE (صنفِ نازک سے ایک رفیقہ) تلاش کردو پھر تم جہاں چاہو جاؤ!"

صوفی مطیع الرحمن صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ایک سفید امریکن مسلمان وکیل نے ایک کتاب تاریخ عالم پر خریدکی جو اقساط میں چھپ رہی تھی اس کا ایک جزو اسلام کی ابتدائی تاریخ پر اِن صاحب کو بھیجا گیا لیکن بجائے تاریخی واقعات کے اس میں وہی فرضی قصے کہانیاں درج تھیں جو مغرب میں اسلام کے متعلق مشہور ہیں انہوں نے اس بنا پر قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ فرضی کہانیوں کی کتاب ہے۔ناشران نے قیمت وصول کرنے کیلئے عدالت میں چارہ جوئی کی۔خریدار نے وہی عذر عدالت میں کیا۔شہادت ہوئی صوفی صاحب نا ڈاکٹر بریڈن اور بعض دیگر مستند مستشرقین شہادت میں پیش ہوئے۔عدالت نے قرار دیا کہ یہ کتاب تاریخ کی کتاب نہیں فرضی قصے کہانیوں کی کتاب ہے۔اسلئے مدعیان قیمت وصول کرنے کے حقدار نہیں۔دعویٰ خارج ہوا اور مدعا علیہ کا خرچہ مدعیان پر ڈالا گیا!

شکاگو سے میں بروقت ٹورنٹو پہنچ گیا۔مندوبین کانفرنس کی رہائش کا انتظام یونیورسٹی کے کالجوں میں کیا گیا تھا اور بہت آرام دہ تھا۔ہر نمائندے کیلئے ایک سونے کا کمرہ اور ایک نشست کا کمرہ مہیا کیا گیا تھا کھانوں کا انتظام ہارٹ ہاؤس میں تھا۔کنیڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز میزبان تھی۔ ان کے صدر مسٹر رادلے ایک کامیاب وکیل تھے جو بعد میں صوبہ اونٹاریو کے چیف جسٹس ہوئے۔مسٹر اور مسز رادلے نے اپنے مکان پر کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی کا انتظام کیا۔میر مقبول محمود صاحب ایسی تقریبوں میں ہندوستانی لباس فاخرہ میں تشریف لے جاتے تھے اور چونکہ چیمبر آف پرنسز کے سیکریٹری کی حیثیت سے والیانِ ریاست کے نمائندے شمار ہوتے تھے اسلئے کانفرنس کے حلقوں میں انہیں ہزہائی نس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ٹورنٹو کے مضافات میں مسز ڈنلیپ نے اپنے فارم پر مندوبین کانفرنس کے اعزاز میں وسیع پیمانے پر ایک شاندار گارڈن پارٹی کا انتظام کیا ان کے ہاں بہت پُر لطف وقت گذرا۔ ان کے میاں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا لیکن بجائے

قانون کی پریکٹس کرنے کے سکول میں ٹیچر ہو گئے تھے ۔ ان دنوں چند منچلے نوجوانوں نے چاندی کھود نکالنے کی امید میں ایک کمپنی بنائی اور مسٹر ڈنلپ سے کہا کہ وہ ان کے قانونی کاغذات تیار کر دیں۔ اور کمپنی کے رجسٹریشن وغیرہ کے متعلق سب کارروائی سرانجام دیں۔ اس کام کی فیس کے عوض انہیں معقول تعداد میں کمپنی کے حصص دیدیئے جائیں گے۔ مسٹر ڈنلپ رضامند ہو گئے۔ کمپنی کو چاندی کا کھوج تو نہ ملا مگر سونے کا مل گیا اور مسٹر ڈنلپ مالا مال ہو گئے۔ مسٹر ڈنلپ کو زراعتی فارم بنانے کا بہت شوق تھا کیونکہ ان کا سینہ کمزور تھا اور وہ کھلی ہوا میں رہائش اختیار کرنے کے خواہش مند تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلد تپ دق سے فوت ہو گئے۔ ان کی یاد میں مسز ڈنلپ نے یہ فارم بنایا۔ فارم کیا تھا مویشیوں کے لئے بہشت تھا۔ ہم مویشی خانہ دیکھنے گئے تو قریب پہنچنے پر میں سمجھا کہ سامنے کی عمارتیں فارم کے منیجر اور عملے کے رہائشی بنگلے ہیں دروازوں اور کھڑکیوں پر جالی لگی ہوئی تھی کھڑکیوں میں پھولوں کے بکس رکھے ہوئے تھے اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہ سب سامان فرحت و آسائش گئوماتا کیلئے مہیا کئے گئے ہیں۔ ہر گائے کا الگ الگ تھان تھا۔ نرم بستر عمدہ چارہ اور صاف پانی میسر تھے اور ریڈیو کے ذریعے موسیقی کا بھی انتظام تھا۔ صبح و شام دودھ دوہتے وقت سریلی موسیقی کی تانیں ان شیر دیویوں کو محظوظ کرتی تھیں۔ ایک گائے کے متعلق بتایا گیا کہ اس کا تھان عین ریڈیو کے نیچے تھا کسی ضرورت کے ماتحت اس کا تھان بدلا گیا تو اس نے دودھ دینا بند کر دیا۔ جب اسے پرانے تھان پر واپس لایا گیا تو دودھ پھر پہلے سی افراط سے جاری ہو گیا۔ ایک خاص نسل کا قیمتی بچھڑا PRAIRIE کے علاقے سے فارم کیلئے خریدا گیا۔ چونکہ علاوہ عالی نسب ہونے کے نازک اندام بھی تھا اسلئے اسے ہوائی جہاز سے لانے کا انتظام کیا گیا اور اسے پیراشوٹ سے فارم میں اتارا گیا! ان دنوں انسانوں میں سے بھی ابھی کسی کسی کو ہی ہوائی جہاز سے سفر کرنا نصیب ہوتا تھا۔ فارم کے رہائشی مکان کے ایک وسیع کمرے کی چھت اونچی رکھ کر اس کے اندر لکڑی کا وہ جھونپڑا رکھا تھا جس میں مسٹر اور مسز ڈنلپ نے شادی کے بعد اپنی اہلی زندگی شروع کی تھی۔ مسز ڈنلپ کا ایک مکان شہر میں بھی تھا۔ سردیوں میں ان کی رہائش شہر میں ہوتی۔ گرمیوں میں کچھ وقت شہر میں اور کچھ فارم میں بسر کرتیں ان کے ایک ہی صاحبزادے موفاٹ ڈنلپ ان دنوں آکسفورڈ میں تعلیم پا رہے تھے۔

کامن ویلتھ کانفرنس | کانفرنس کے مختلف PANELS میں کئی مسائل زیر بحث آئے۔ ایک دلچسپ آئینی مسئلہ جس پر بہت بحث ہوئی یہ تھا کہ جنگ کی صورت میں اگر کامن ویلتھ کے اکثر ممالک جنگ میں شامل ہوں تو کیا کچھ ممالک کا غیر جانبدار رہنا ممکن ہے؟ اس وقت تو کسی نتیجے پر اتفاق نہ ہو سکا لیکن ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو انگلستان کے اتباع میں کامن ویلتھ کے باقی تمام ممالک تو جرمنی کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے لیکن آئرلینڈ غیر جانبدار رہا اور کامن ویلتھ کا رکن بھی رہا۔ اس طرح یہ مسئلہ عملاً حل ہو گیا۔ اس وقت تو کامن ویلتھ کی رکنیت کی یہ شرط تھی کہ ہر رکن تاجدار برطانیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے۔ ہندوستان اور پاکستان جمہوری مملکتیں بن جانے کے بعد بھی کامن ویلتھ کے رکن رہے تو یہ شرط بھی ساقط ہو گئی اب تو ہر برطانوی مقبوضہ خود مختار ہونے کے بعد جمہوری مملکت بن جاتا ہے اور کامن ویلتھ کا رکن بھی رہتا ہے۔ البتہ ملکۂ انگلستان

کامن ویلتھ کی رسمی رئیسہ ضرور تسلیم کی جاتی ہیں لیکن یہ ایک بے حقیقت رشتہ ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر جارحانہ حملہ کرکے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک تیسرے ملک کے خلاف جنگ میں غیر جانبدار رہنا تو الگ رہا کامن ویلتھ کے دو ملکوں کے درمیان عملاً جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ کامن ویلتھ کا نام تو ابھی تک باقی ہے۔ لیکن اس نام میں اب کوئی حقیقت باقی نہیں۔ برطانیہ اور کامن ویلتھ کے سب سے پرانے ممالک یعنی کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کامن ویلتھ کے نظریئے کو گلے پڑے ہوئے ڈھول کی طرح بجائے چلے جا رہے ہیں۔

اس کانفرنس کے دوران میں جن شخصیات کے ساتھ واقفیت ہوئی اُن میں سے مسٹر فلپ نوئل بیکر کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ مضبوط ہوتے چلے گئے۔ مسٹر ونسنٹ میسی کو میں کچھ عرصہ پہلے سے جانتا تھا۔ وہ لندن میں کینیڈا کے ہائی کمشنر تھے۔ اور بعد میں کینیڈا کے پہلے کینیڈین گورنر جنرل ہوئے۔ ہارٹ ہاؤس کی عمارت ٹورنٹو یونیورسٹی کو انہیں کے خاندان کا عطیہ ہے۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کی طرف سے کانفرنس کے اعزاز میں یونیورسٹی میوزیم میں شام کے وقت استقبالیہ دعوت دی گئی۔ اس موقعہ پر میری ملاقات پروفیسر جی ایس بریٹ سے ہوئی جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور چوبیس سال قبل وہاں سے استعفیٰ دیکر ٹورنٹو یونیورسٹی میں آگئے تھے۔

پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے سامنے شہادت کا اختتام

کانفرنس کے اختتام پر میں لندن واپس آگیا اور مشترکہ کمیٹی کے اجلاس دوبارہ شروع ہو گئے۔ نومبر میں کمیٹی کے رُوبرو شہادت پیش ہونے کا مرحلہ ختم ہو گیا اور کمیٹی کے کام میں ہندوستانی وفد کی شرکت بھی ختم ہو گئی۔ میں لاہور واپس جانے سے پہلے وزیر ہند سے ملا اور ایک ذاتی معاملہ میں گفتگو کی اجازت چاہی اجازت ملنے پر میں نے کہا۔ سنا ہے ہندوستانی وفد کے چند اراکین کی قدر دانی کے طور پر انہیں ملک معظم کی طرف سے اعزازات دیئے جانے کی تجویز ہے اور اس تعلق میں میرا نام بھی زیرِ غور ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ نے جو نوازشات مجھ پر کی ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ فرمائیں اور میرا نام اس فہرست سے خارج کر دیں۔ ایک لحظہ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے فرمایا کمیٹی کے چیدہ اراکین مثلاً چیئرمین مارکوئیس آف سالبری آسٹن چیمبرلین، آرچ بشپ آف کنٹربری سب متفقہ طور پر کانفرنس کے سلسلہ میں تمہارے کام کو بڑی قدر کی نگہ سے دیکھتے ہیں اور تمہارے بڑے مداح ہیں اگر تمہارا نام شامل نہ کیا گیا تو انہیں تاسف بھی ہوگا اور حیرت بھی کہ یہ فرد گذاشت کیوں ہوئی۔ میں نے کہا آپ ان سے کہدیں کہ خود میری درخواست پر ایسا کیا گیا ہے۔ مشترکہ کمیٹی کے پبلک اجلاس ختم ہونے پر کمیٹی کے اراکین کے درمیان قرطاس ابیض کی تجاویز پر بحث کا مرحلہ شروع ہو گیا میں لاہور واپس چلا گیا اور اپنے عدالتی کام میں مصروف ہو گیا۔

۱۹۳۴ء میں سر شادی لال کی طرف سے ہائی کورٹ کی ججی کی پیشکش!

۱۹۳۴ء کے شروع میں سر شادی لال نے چودھری شہاب الدین صاحب سے کہا۔ آپ چاہتے تھے ظفر اللہ خان کو ہائی کورٹ کی ججی کا موقعہ دیا جائے اب ایک جگہ خالی ہونے والی ہے۔ آپ اسے کہیں مجھے مل لے۔ چودھری صاحب نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا تو میں نے کہا آپ

چیف جسٹس صاحب سے کہدیں کہ میں ان کا ممنون ہوں لیکن مجھے ججی کی کوئی خواہش نہیں۔ ججی تو میں یوں بھی قبول نہ کرتا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ سر شادی لال چاہتے ہیں کہ میں ہائی کورٹ کا جج بن جاؤں۔ تو میری طبیعت میں یہ بات اور بھی پختہ ہو گئی کہ مجھے ججی نہیں لینی چاہیئے۔ اگر سر شادی لال صاحب مجھے ہائی کورٹ کا جج مقرر کرنے پر آمادہ تھے تو یہ اسباب کا ثبوت تھا کہ ججی کا عہدہ میرے لئے موزوں نہیں رہا۔ کچھ دنوں کے بعد خان بہادر شیخ دین محمد صاحب میرے دفتر میں تشریف لائے اور فرمایا ہائی کورٹ میں جج کی ایک جگہ خالی ہونے والی ہے جس پر ایک مسلمان کا تقرر ہوگا۔ میں نے سر سندر کر یک سے (جو اسوقت پنجاب میں رکن عاملہ تھے) اپنے متعلق ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "اگر ظفر اللہ کی خواہش ججی پر تقرر کی ہو تو پھر کسی اور کے متعلق غور کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر وہ ججی نہیں چاہتے تو اس صورت میں میں تمہاری تائید کر دوں گا۔" تم صفائی سے مجھے بتا دو تمہاری کیا مرضی ہے تاکہ اگر تمہاری خواہش ہو تو میں اس سلسلے میں کوئی سعی نہ کروں۔ میں نے اُنکی خدمت میں گذارش کی کہ مجھے ججی کی کوئی خواہش نہیں اور مجھے ان کے تقرر سے خوشی ہوگی۔

وائسرائے کی طرف سے پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ کی پیشکش

تھوڑے عرصہ بعد مجھے دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وائسرائے سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا تم چار سال سے گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں کام کر رہے ہو۔ چار ماہ میرے ساتھ بھی تم نے کام کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اپنی وائسرلیٹی کی میعاد ختم کرنے سے پہلے تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔ میں نے عرض کیا انسان کی یہی خواہش ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزت کی روزی عطا فرمانا چاہئے سو وہ اپنے فضل و رحم سے مجھے عطا کر رہا ہے میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے لیکن آپکو میرے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ سر شادی لال کے جانے کے بعد تم لاہور ہائیکورٹ کا چیف جسٹس ہونا پسند کرو گے؟ میں نے کہا یہ عہدہ بہت عزت اور ذمہ داری کا ہے اگر مجھ سے یہ خدمت لینا مطلوب ہو تو مجھے عذر نہیں ہوگا لیکن میں اس کے لئے تگ و دو کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ فرمایا تم بس اتنا کرو کہ ایمرسن سے بات چیت کر لو۔ (سر ہربرٹ ایمرسن اس وقت گورنر پنجاب تھے) میں نے کہا میں بادب گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ میرا ایسا کرنا اس عالی منصب کے وقار کے لحاظ سے نامناسب ہے اور اپنی طبیعت کے لحاظ سے بھی میں ایسا کرنے سے معذور ہوں۔ انہی ایام میں ہز ہائی نس سر آغا خان دلی تشریف لائے اور تین دن وائسرائے کے ہاں مہمان رہنے کے بعد اس بنگلے میں تشریف لے گئے جو آپ کی رہائش کیلئے تیار کیا گیا تھا۔ میں بھی ملاقات کیلئے حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی کمال شفقت سے بڑھ کر معانقے کا شرف بخشا اور بڑی مسرت کے لہجے میں فرمایا "مجھے تم پر فخر ہے۔ مجھے تم پر بڑا فخر ہے"۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا میں وائسرائے کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا تمہیں معلوم ہے میری ان سے بڑی بے تکلفی ہے۔ دورانِ گفتگو میں وائسرائے نے مجھ سے کہا مجھے چودہ سالہ ہندوستان

میں خدمت کرتے گذرے ہیں۔ تمہارا نام لیکر کہا کہ اس سارے عرصے میں مجھے ایک ایسے شخص کا تجربہ ہوا ہے جس نے برسوں ملکی خدمت کی ہے لیکن کبھی مجھ سے کسی بات کی خواہش نہیں کی اور حال ہی میں جب میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو اس نے کہا "تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟" میں نے عرض کیا میں نے وائسرائے کو تو ان الفاظ میں جواب نہیں دیا تھا۔ انہوں نے آپ سے اس رنگ میں بیان کرنا مناسب خیال کیا۔

سر ڈگلس ینگ کا بطور چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ میں تقرر!

مئی ۱۹۳۴ء میں سر شادی لال نے چیف جسٹس کے عہدے کا چارج چھوڑا اور سر ڈگلس ینگ الہ آباد ہائی کورٹ سے اُن کی جگہ چیف جسٹس ہوئے سر شادی لال نے ہائیکورٹ بار کے اراکین کو فسٹ بنچ کے اجلاس کے کمرے میں بلوایا تا کہ نئے چیف جسٹس سے ان کا تعارف کرایا جائے۔ جب سر ڈگلس ینگ نے میرے ساتھ مصافحہ کیا تو فرمایا چودھری صاحب میں چاہتا ہوں ہم جلد مل سکیں۔ میں نے کہا جب آپ کا ارشاد ہو میں حاضر ہو جاؤں گا مجھے کچھ تعجب بھی ہوا کہ انہوں نے میرے نام کی بجائے چودھری صاحب کہہ کر خطاب کیا۔ وہ ایک دن قبل ہی لاہور پہنچے تھے اور پہلے سے مجھے جانتے بھی نہیں تھے۔ دوسرے ہی دن ان کا پیغام ملا کہ آئندہ اتوار ہم سے ملو۔ اتوار کے دن میں چیف جسٹس کے ہاں جانے کیلئے کار میں بیٹھا ہی تھا کہ شملہ سے سردار سکندر حیات خانصاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے فرمایا۔ "میں رخصت پر جا رہا ہوں میں نے اپنی جگہ کام کرنے کیلئے سر مائیلز ارونگ کا نام تجویز کیا تھا۔ مگر گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے کہا ہے کہ پہلے تم سے دریافت کر لوں۔ اگر تم رضامند ہو تو اس عرصے کیلئے وہ تمہارا تقرر مناسب سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا میرا پروگرام انگلستان جانے کا ہے میں ان دنوں یہاں موجود نہیں ہوں گا۔ انہوں نے فرمایا "سنا ہے تم ۲ر جون کو شملے آرہے ہو آؤ گے تو بات کریں گے۔" میں چیف جسٹس صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بیٹھتے ہی فرمایا چودھری صاحب آپ میرے ساتھ اجلاس میں کیوں شامل نہیں ہو جاتے؟ میں نے کہا مجھے ججی کی خواہش نہیں۔ پوچھا گرمیوں کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا انگلستان جانے کا ارادہ ہے۔ کہنے لگے میں بھی تعطیلات میں یورپ جاؤں گا وہاں ملاقات ہو گی۔ لیکن ایک وعدہ کرتے جائیں کہ اگر کسی وقت تمہاری رائے میں تبدیلی ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہدیں۔ میں پہلی مستقل آسامی کیلئے تمہارا نام بھیج دوں گا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت حاصل کی۔ ان کا سلوک میرے ساتھ ہمیشہ بہت مشفقانہ رہا۔ عدالت کے اجلاس میں بھی بے تکلفی سے مجھے چودھری صاحب کہکر خطاب کرتے۔ عموماً فوجداری بنچ میں شریک ہوتے تھے۔ دیوانی کا کام بہت کم کرتے تھے دلوالئے کے کام میں البتہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے یہ دستور تھا کہ فوجداری اور خصوصاً قتل کی اپیل میں سائل کے وکیل سارا ریکارڈ پڑھ کر سناتے۔ کہیں کہیں شہادت استغاثہ کے متعلق کوئی تنقیدی فقرہ بھی کہہ دیتے اور آخر میں مختصر دلائل پیش کرتے جن کا جواب سرکاری وکیل دیتے۔ انہوں نے آتے ہی یہ طریق بدل دیا۔ پہلی اپیل کی سماعت کے وقت ہی کہہ دیا۔ "میرے شریک اجلاس اور میں ریکارڈ پڑھ کر آتے ہیں۔ ہمیں ریکارڈ پڑھ کر سنانے کی ضرورت نہیں۔ دلائل کی تائید میں ریکارڈ کے جس حصے کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو اس کا حوالہ

دیدیا کریں۔ دلائل ہم توجہ سے سنا کریں گے۔" پہلے ہی دن چھ اپیلوں کی سماعت کرلی۔ جن میں سے صرف دو منظور ہوئیں۔ چودھری فضل داد صاحب نے کچھ پریشانی میں مجھے یہ کیفیت سنائی اور کہا بار روم میں بڑی گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ تو بڑی سختی کیا کریں گے۔ میں نے کہا مجھے تو ان کے طریق پر کوئی اعتراض نہیں۔ وکیل صاحبان کو چاہیے تیاری کر کے اجلاس میں جایا کریں اور دلائل سے جج صاحبان کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ ریکارڈ کے پڑھنے میں اسقدر وقت صرف کرنے سے کیا حاصل ؟

اس دن میں سارا وقت مسٹر جسٹس ملٹن کے اجلاس میں چودھری لوہاپ سنگھ صاحب کی طرف سے ان کی اپیل میں بحث کرتا رہا تھا۔ کیس لمبا تھا اور دو تین دن اور چلنے والا تھا۔ چودھری لوہاپ سنگھ صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے ہم جماعت رہے تھے۔ بعد میں پنجاب کونسل کے رکن بھی رہے۔ چودھری چھوٹو رام صاحب کے رفقاء اور دوستوں میں سے تھے۔ اپنے حلقے کی انجمن امداد باہمی کے نائب صدر تھے۔ اس حیثیت میں ان کے خلاف غبن کے الزام میں مقدمہ چلایا جس میں سیاسی جنبہ داری کا بہت کچھ دخل تھا۔ انہیں پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان تمام حالات کی وجہ سے مجھے انکی اپیل کے متعلق غیر معمولی فکر تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دوسرے روز مسٹر جسٹس ملٹن لاہور کی عدالتوں کے معائنے کے لئے جانیوالے تھے اور اپیل کی سماعت تیسرے دن پر ملتوی ہوگئی۔ لیکن اس دن میری ایک فوجداری اپیل اول بنچ میں پانچویں نمبر پر لگ گئی۔ عدالت کا اجلاس ساڑھے تین بجے ختم ہوتا تھا۔ تین بجکر دس منٹ پر میری اپیل کی باری آگئی۔ اجلاس ختم ہونے میں فقط بیس منٹ باقی تھے۔ میرے کیس میں دو ملزموں کو سیشن کی عدالت سے پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ بیس منٹ میں ایسے کیس کا خوش اسلوبی سے ختم ہونا دشوار معلوم ہوتا تھا کیس ملتوی کرایا جاسکتا تھا کیونکہ اگلی صبح پھر چودھری لوہاپ سنگھ صاحب کی اپیل کی سماعت شروع ہونیوالی تھی۔ قتل کی اپیل میں التوا کی درخواست کرنے میں مجھے اسلئے تامل تھا کہ چیف جسٹس ینگ کے اجلاس میں وہ میرا پہلا کیس تھا۔ میرا عذر تو معقول تھا کہ کل صبح ایک اپیل میں جو زیر سماعت ہے مجھے بحث جاری رکھنا ہے لیکن پھر بھی شاید چیف جسٹس صاحب خیال کرنے کہ میں نے بحث کیلئے تیاری نہیں کی۔ کچھ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ ممکن ہے چودھری فضل داد صاحب خیال کریں کہ کل تو کہتا تھا وکیل کو پوری تیاری کر کے عدالت میں جانا چاہیئے تاکہ مختصر وقت میں اپنے دلائل بیان کرسکے اور آج موقعہ آنے پر التوا کی درخواست کردی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں چیف جسٹس صاحب کے مجوزہ طریق کے مطابق کیس پیش کرنے میں اپنا امتحان کردوں، چنانچہ میں نے مختصر طور پر واقعات بیان کئے اور کہا میرا کیس یہ ہے کہ ایک سائل کے متعلق تو معقول شک کی گنجائش ہے کہ اس نے جرم میں حصہ لیا یا نہیں ایک گواہ کہتا ہے اس نے مقتول کو پکڑے رکھا تاکہ دوسرا ملزم آسانی سے حملہ کرسکے (ریکارڈ کا صفحہ فلاں سطر فلاں) دوسرا گواہ کہتا ہے یہ دونوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ (ریکارڈ کا صفحہ فلاں سطر فلاں) اس اختلاف کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے خلاف جرم ثابت ہے۔ اسے شک کا فائدہ ملنا چاہیئے۔ دوسرے سائل کے متعلق گذارش ہے کہ ملزم اور مقتول دونوں نابالغ

کی دوکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ ایکدوسرے سے الجھ گئے ایک نے جو کچھ ہاتھ میں آیا پکڑ کر دوسرے پر حملہ کر دیا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ ان حالات میں جرم قتل عمد کی حد تک نہیں پہنچتا ملزم کو استثناء کا فائدہ ملنا چاہیئے۔ میری بحث دس منٹ میں ختم ہو گئی۔ سرکاری وکیل کا جواب سننے کے بعد عدالت نے فیصلہ دیا کہ ملزم اول شک کے فائدے کا حقدار ہے لہٰذا وہ بری کیا جاتا ہے۔ ملزم ثانی کا جرم قتل عمد قرار نہیں دیا جا سکتا اس کو دس سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔ عین ۱/۲ ۳ بجے اجلاس ختم ہو گیا۔ دوسری صبح میں مسٹر جسٹس ہلٹن کے اجلاس میں چودھری پرتاپ سنگھ صاحب کی اپیل میں بحث جاری رکھ سکا چار دن کی بحث کے بعد وہ بری ہو گئے۔

۲ رجون کو میں شملے گیا ملاقات ہوتے ہی میاں فضل حسین صاحب نے دریافت فرمایا کیا تم سے سکندر نے کہا تھا کہ وہ رخصت پر جانا چاہتا ہے اور تم اس عرصے میں اسکی جگہ کام کرو۔ میں نے کہا انہوں نے فرمایا تھا کہ انہوں نے سر مائیلز ارونگ کا نام تجویز کیا تھا لیکن گورنر چاہتے ہیں کہ وہ مجھ سے دریافت کریں کہ میں ان کی جگہ لینے پر تیار ہوں کہ نہیں میں نے جواب دیا کہ میں انگلستان جانے کا ارادہ کر رہا ہوں اور یہاں موجود نہیں ہوں گا۔ میاں صاحب نے فرمایا تم آج ہی اسے مل کر کہدو کہ تم اس کی جگہ کام کرنے کو تیار رہو۔ میری تو ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ جہاں بھی موقعہ ملے انگریز کی جگہ ہندوستانی کو ملے اور یہاں ہندوستانی کی جگہ ایک ہندوستانی ہی انگریز کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سردار سکندر حیات خاں کو ٹیلیفون پر مطلع کیا کہ میں شملے پہنچ گیا ہوں اور ساڑھے چار بجے حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ میں ان کے ہاں جا رہا تھا کہ راستے میں سر مائیلز ارونگ مل گئے۔ صاحب سلامت کے بعد انہوں نے فرمایا چودھری صاحب سنا ہے آپ انگلستان جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ارادہ تو ہے۔ کہنے لگے آپ خوش قسمت ہیں میں اور میری بیوی بھی رخصت پر جا رہے تھے۔ جہاز پر جگہ بھی لے لی تھی۔ لیکن مجھے سر سکندر کی جگہ کام کرنے کیلئے روک لیا گیا ہے۔ میری بیوی بمبئی چلی گئی ہیں اب وہ اکیلے سفر کریں گی۔ میں سردار صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ گھنٹہ بھر ٹھہرا۔ ناشتہ ان کے ساتھ کیا انہوں نے اپنی رخصت کے متعلق پروگرام کا ذکر کیا اور دوسرے کئی امور کا تذکرہ بھی ہوا لیکن ان کی رخصت کے زمانے میں انکی قائم مقامی کے متعلق کوئی ذکر نہ آیا میری جو بات سر مائیلز ارونگ کے ساتھ ہو چکی تھی اس کی وجہ سے میں نے بھی اس ذکر کی ضرورت نہ سمجھی اور واپس آ کر میاں صاحب کو بتلا دیا کہ سر مائیلز کا تقرر ہو چکا ہے۔

دوسرے دن میاں سر فضل حسین صاحب سے گفتگو کے نتیجے میں یہ طے ہوا کہ میں اپنے خرچ پر لندن جاؤں اور غیر رسمی ملاقاتوں سے کوشش کروں کہ مشترکہ کمیٹی میں قرطاس ابیض پر غور کے درمیان مسلم مفاد کو نظر انداز نہ کر دیا جائے اگر ایسا نہ کیا جاتا اور مشترکہ کمیٹی ہمارے مطالبات یا کسی ایک مطالبے کے خلاف سفارش کر دیتی تو مسلم عوام کو یہ شکایت ہو سکتی تھی کہ جب تک سرکاری خرچ پر وفد جاتے رہے ہر کوئی وفد میں شامل ہونے کا شوق رکھتا تھا لیکن جب سرکاری طور پر وفد بھیجنے کا سلسلہ بند ہو گیا تو کسی نے اس بات کا خیال رکھنے کی پرواہ نہ کی کہ مشترکہ کمیٹی مسلم مطالبات

یا کسی ایک مطالبے کے خلاف سفارش نہ کر دے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں بار بار لندن جانے سے تمہارے وکالت کے کام کا خاصا نقصان ہوا ہوگا اور اب تمہیں ملک سے باہر بھیجنا اور تمہارے اپنے خرچ پر بھیجنا تم پر ناواجب بوجھ ڈالنا ہے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ وکالت کے کام کے متعلق آپ فکر نہ کریں۔ باوجود سال کا اکثر حصہ ملک سے باہر رہنے کے میری آمد میں خدا کے فضل سے اضافہ ہی ہوتا گیا ہے کمی نہیں ہوئی اور اخراجات بھی کوئی ایسا بوجھ نہیں ہوں گے کیونکہ میری عادات بالکل سادہ ہیں۔ ان دنوں ہائی کورٹ میں میری نو اپیلیں سماعت ہونے والی تھیں۔ چیف جسٹس صاحب سے درخواست کی تو انہوں نے میرے انگلستان جانے سے قبل ان سب کی سماعت ہو جانے کا انتظام کر دیا۔

دہلی سے لندن تک پہلا ہوائی سفر

میں نے پہلا ہوائی سفر ۱۹۲۴ء میں لندن سے ایمسٹرڈم تک کیا تھا اس پر دس سال گذر چکے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب میں پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت کیلئے لندن گیا تو مارسیلز پہنچنے پر میرے بعض رفقاء نے تجویز کیا کہ مارسیلز سے لندن کا سفر ہوائی جہاز پر کریں۔ میں بھی ان کیسا تھ شامل ہو گیا۔ ہوائی جہاز آج کے جہازوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ نشستیں بھی تنگ تھیں کل اٹھارہ بیس مسافروں کی گنجائش تھی۔ مارسیلز سے روانہ ہو کر پیرس کے مطار پر اترے اور آدھ گھنٹہ ٹھہر کر روانہ ہو گئے۔ لندن کرائیڈن مطار پر اترے۔ اب ۱۹۴۳ء میں میں نے دہلی سے لندن ہوائی جہاز سے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثناء میں ہندوستان میں انڈین ٹرانس کانٹی نینٹل ایرویز کا اجراء ہو چکا تھا۔ اس میں زیادہ حصہ امپیریل ایرویز کا تھا۔ امپیریل ایرویز کو جو بی او اے سی کی پیش رو تھی دو ڈائریکٹر مقرر کرنے کا اختیار تھا جن میں سے ایک کا ہندوستانی ہونا لازم تھا امپیریل ایرویز نے اپنی طرف سے مجھے انڈین ٹرانس کانٹی نینٹل ایرویز کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ اس کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر ین ہارن تھے۔ جب میں نے ان سے انگلستان ہوائی جہاز سے جانے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا ہم انتظام کر دیتے ہیں کہ تم ہمارے ڈائریکٹر کی حیثیت سے سفر کرو میں دلی سے انڈین ٹرانس کانٹی نینٹل ایرویز کے جہاز پر کراچی کیلئے روانہ ہوا یہ جہاز پہلے جودھپور ٹھہرتا تھا۔ یہاں اترتے وقت پائیلاٹ کے اندازے میں غلطی کی وجہ سے جہاز کے نچلے حصے کو کچھ نقصان پہنچا جسکی وجہ سے جہاز کی مرمت ضروری ہوئی اور جہاز کراچی جانے کے قابل نہ رہا۔ جودھپور کے مطار پر ایک آرام دہ ہوٹل تیار ہو چکا تھا رات ہم نے وہاں بسر کی۔ دوسرے دن قبل دوپہر کراچی سے امپیریل ایرویز کا جہاز جس پر ہم نے قاہرہ تک سفر کرنا تھا ہمیں لینے کیلئے جودھپور آ گیا۔ یہ ایک بھاری بھرکم ٹائپ کا جہاز تھا۔ جس کی رفتار پچھتر میل فی گھنٹہ تھی۔ جودھپور میں اسے تیل لینے کی ضرورت تھی اور وہاں جہاز میں تیل بھرنے کا انتظام نہیں تھا۔ لکڑی کی سیڑھی لگائی گئی۔ مزدور دو دو گیلن کے ٹین ہاتھوں میں اٹھائے سیڑھی پر چڑھ کر تیل جہاز کے حوض میں ڈالتے تھے۔ دو اڑھائی گھنٹے میں تیل بھر گیا اور ہم دو بجے بعد دوپہر روانہ ہو کر شام کو کراچی پہنچے کلارنی

ہوٹل میں جس کا نام اب پیلیس ہوٹل ہے کھانا کھایا اور دو تین گھنٹے آرام کیا۔ نصف شب کے بعد دو بجے کراچی سے روانہ ہوئے جیوانی، گوادر، شارجہ، بحرین ٹھہرتے ہوئے شام کے کھانے کے وقت تک بصرہ پہنچنے کی امید میں تھے کہ پائیلاٹ نے اطلاع دی کہ جہاز کو تیز باد مخالف کا سامنا ہے اور بصرے کی جانب بڑھنا دشوار ہو رہا ہے اس وقت ہم کویت کے اوپر ہیں۔ یہاں ہنگامی استعمال کیلئے ایک AIR STRIP ہے میں یہاں اترنے لگا ہوں۔ جہاز کویت اترا۔ جام صاحب والئے نانگر کے بھتیجے اور میں دو ہی ہندوستانی مسافر تھے۔ باقی سب مسافر یورپین تھے کویت ان دنوں دیوار کے اندر گھرا ہوا ایک گاؤں تھا کسی قسم کی سہولت میسر نہیں تھی۔ مجھے اور کنور صاحب کو تو محمد الغانم صاحب اپنا مہمان بنا کر اپنے مکان پر لے گئے اور باقی مسافر چوپال میں چلے گئے۔ غانم صاحب کا مکان ہمارے اس زمانے کے متوسط درجے کے شہری مکانوں کی طرز کا دو منزلہ مکان تھا جس کے چھوٹے سے صحن میں ایک پانی کا کنواں تھا اور اس کے ساتھ ہی غسل کے لئے ایک سقاوہ تھا۔ دوسری منزل پر ایک چبارہ تھا۔ ہمیں اس چوبارے میں اتارا گیا۔ فرش پر عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور ایک جانب ایک بڑا پلنگ تھا۔ میں بھی بہت تھکا ہوا تھا لیکن کنور صاحب تو بالکل نڈھال ہو رہے تھے۔ انہیں تپ دق کی شکایت شروع ہو چکی تھی اور علاج کیلئے یورپ جا رہے تھے۔ غانم صاحب نے ایک طرف تو ہمارے لئے کھانے کی تیاری کی ہدایت دیدی تھی اور دوسری طرف پڑوسیوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ہمارے ہاں دو ہندوستانی مہمان آئے ہیں۔ ان کے پڑوسی ایک ایک دو دو کر کے ہماری ملاقات کیلئے آنا شروع ہوئے۔ کنور صاحب کیلئے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے بہت کہا آپ پلنگ پر لیٹ جائیں اور کھانا تیار ہونے تک آرام کر لیں۔ لیکن وہ وضع کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے۔ کہا مجھے کھانے کی تو پرواہ نہیں اسوقت نیند ہی غذا کا کام بھی دے سکتی ہے۔ لیکن یہ لوگ ہمارے میزبان کے احترام اور ہماری تواضع کی خاطر آ رہے ہیں میرا فرض ہے کہ میں بیدار رہوں اگرچہ میں ان کی بات بھی نہیں سمجھتا اور آنکھیں کھلی رکھنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ آخر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ کھانا آیا اور ہم نے جلد فارغ ہو کر سونے کی تیاری کی۔ ایک پلنگ میرے لئے بھی ڈالدیا گیا۔ صبح میں نے سقادے میں غسل کیا جس سے بہت فرحت ہوئی۔ طلوع آفتاب سے قبل روانہ ہوئے۔ بصرے پہنچ کر ناشتہ کیا۔ یورپین مسافروں نے منہ ہاتھ بھی یہیں دھوئے قبل دوپہر بغداد پہنچے۔ گرمی کی وہ شدت تھی کہ الاماں۔ میں نے مطار پر یکے بعد دیگرے چھ بڑے گلاس تازہ لیمونیڈ کے برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے غٹ غٹ چڑھائے لیکن پیاس کی شدت میں فرق نہ آیا۔ ریگستان کے وسط میں رُطبہ کے مقام پر لنچ کھایا۔ پٹرول کی پائپ لائن کے ایک سٹیشن کے پاس اتر کر دوسری بار تیل لیا۔ غروب آفتاب کے بعد گیزا پہنچے۔ یہاں سمندر کی جانب سے ٹھنڈی ہوا میں سانس لینا میسر آیا اور جان میں جان آئی۔ شام کا کھانا یہاں کھایا۔ نصف شب کے قبل قاہرہ پہنچے جہاز سے قاہرہ کا نظارہ بہت پُر لطف تھا۔ ہوٹل میں آرام سے رات بسر کی گو رات یہاں بھی گرم تھی۔ صبح ہوائی کشتی سے روانہ ہوئے کریٹ اور ایتھنز ٹھہرتے ہوئے شام کے وقت برنڈزی پہنچے اس دن کا سفر آرام سے بھی گذرا اور جب کشتی یونانی جزائر کے اوپر سے گذرنا شروع ہوئی تو منظر بھی دلچسپ ہو گیا۔ اٹلی کے اوپر سے امپیریل ایرویز کو پرواز کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے

برنڈزی سے پیرس کا سفر ریل پر ہوتا تھا۔ امپیریل ایرویز کی ہوائی کشتی کے پہنچنے کے دن رات کی شمال کو جانیوالی تیز گاڑی میں سونے کے کمرے ہوائی مسافروں کیلئے محفوظ کرلئے جاتے تھے۔ برنڈزی پہنچنے پر سامان تو کشتی سے ریل پر پہنچا دیا جاتا تھا مسافروں کو ہوٹل میں لے جاکر کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اور پھر ریل پر اپنے اپنے سونے کے کمروں میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ تیسرے دن صبح گاڑی پیرس پہنچتی تھی۔ یہاں پھر اسٹیشن سے ہوٹل لے جاکر ناشتہ کرنے کے بعد مطار پر امپیریل ایرویز کے ہوائی جہاز پر سوار کر دیا جاتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ لارڈ اور لیڈی ولنگڈن جو رخصت پر انگلستان جارہے تھے اور رستے میں دو ہفتے فرانس کے جنوبی ساحل پر ٹھہرے تھے اسی روز ہوائی جہاز سے لندن تشریف لے جارہے تھے۔ ہوائی جہاز پر ان کے لئے ایک خاص کیبن محفوظ تھی۔ مجھے بھی انہوں نے وہیں بلالیا۔ ان کے فرزند اور بہو، لارڈ اور لیڈی ریٹن ڈن بھی ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے کرائیڈن کے مطار پر وزیر ہند سر سموئیل ہور اور ان کی مشاورتی کونسل کے اراکین وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن کے استقبال کے لئے موجود تھے اس حسن اتفاق کے نتیجے میں مطار پر ہی میری ملاقات وزیر ہند سے ہوگئی۔ وہ فضائیہ کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ اور انہیں ہوائی آمد و رفت میں بہت دلچسپی تھی۔ جب وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن سے بات چیت کرچکے تو مجھ سے دریافت کیا۔ کیا یہ تمہارا پہلا ہوائی سفر ہے؟ میں نے کہا ہندوستان سے یہاں تک پہلا ہوائی سفر ہے۔ پوچھا تمہارے کیا تاثرات ہیں؟ میں نے پوچھا صاف صاف بیان کردوں؟ فرمایا میں یہی چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہوائی جہاز پر دہلی سے نکلے تو نیچے راجپوتانے کا ریگستان تھا۔ کراچی سے بصرے تک ایک طرف خشک پہاڑیوں کا سلسلہ دوسری طرف جلتی ریت کے ٹیلے بصرے سے بغداد تک کہیں کہیں دریا کے کنارے سبزہ تھا۔ بغداد سے گیزا تک عرب کا ریگستان۔ قاہرہ سے جب یونانی جزائر کے اوپر پہنچے تو نیچے سبزے کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوسری صبح اٹلی میں ریل باغات کے ایک لمبے سلسلے میں سے تیز نکلتی جارہی تھی۔ متواتر آبادی تھی شہروں کے اندر گرجاؤں کے کلس اور گنبد منظر میں تنوع پیدا کرتے تھے۔ فرانس اٹلی سے بھی زیادہ سرسبز۔ انگلستان کا جنوبی حصہ فرانس سے بھی بڑھ کر سرسبز۔ میرا غالب تاثر تو یہ تھا کہ قدرت کی طرف سے دنیاوی زندگی کی آسائشوں کے سامانوں میں سے آپ لوگوں کو بہت ہی وافر حصہ ملا ہے اور ہمیں بہت ہی محدود۔ لیکن آپ ہیں کہ آپس میں صلح اور امن کے ساتھ ان سامانوں اور آسائشوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے ہر وقت یہاں جنگ کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں کسقدر تباہی ہوئی اب پھر جنگ کی تیاریاں ہیں۔ پوچھا تمہارا خیال ہے جنگ ہوگی؟ میں نے کہا یقیناً ہوگی۔ ہٹلر نے اپنی کتاب MEIN KAMPF میں اپنے سارے پروگرام کو پیش کر دیا ہے لیکن آپ لوگ اسے دیوانے کی بڑ سے زیادہ درجہ نہیں دیتے۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ یورپ کی حالت ایک ایسی کشتی کی ہے جو شام کے وقت دریا کی سطح پر چلتی جارہی ہے کشتی کے مسافر عرشے پر شراب کے دور کے ساتھ موسیقی اور رقص میں محو ہیں اور کسی کو ہوش نہیں کہ تھوڑے ہی فاصلے پر آگے آبشار ہے جہاں پہنچ کر کشتی غرق ہو جائے گی اور تمام عیش و سرور ماتم اور نوحہ خوانی میں بدل جائے گا فرمایا تمہارے تاثرات تو بڑے ڈراونے ہیں لیکن میں امید کرتا ہوں کہ یہ نوبت نہیں آئے گی اور ہم امن قائم رکھنے میں کامیاب ہوں۔

جائیں گے۔ میں نے کہا خدا تعالےٰ ایسا ہی کرے۔ میں نے اپنا تاثر بیان کر دیا ہے۔ پوچھا تم کب تک ٹھہرو گے؟ میں نے کہا تین چار مہینے تو ٹھہروں گا ہی اس نیت سے آیا ہوں کہ مشترکہ کمیٹی کے کام کا کچھ اندازہ ہوتا رہے اور اس سلسلے میں اگر کوئی اپنے ملک اور قوم کی خدمت ہو سکے تو کر سکوں۔ فرمایا تم نے بہت اچھا کیا۔ کل صبح مجھے انڈیا آفس میں ملنا آپس میں بات چیت کریں گے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہوا کہ مطار پر پہنچتے ہی وزیر ہند سے ملاقات ہو گئی اور جس غرض کیلئے میں آیا تھا اس کے متعلق مناسب سعی کرنے کا رستہ مطار پر ہی کھل گیا۔

پارلیمنٹ کے ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی کے اراکین سے غیر رسمی ملاقاتیں

دوسرے دن وزیر ہند کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے میرے انگلستان آنے پر اطمینان کا اظہار کیا۔ مشترکہ کمیٹی کے کام پر مختصر تبصرہ کیا اور فرمایا ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملتے رہا کرو۔ میں تمہیں بتا دیا کروں گا کہ کن اراکین سے تمہارا ملنا مفید ہو سکے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ مشترکہ کمیٹی اپنی رپورٹ میں قرطاس ابیض کی تجاویز سے اختلاف نہیں کرے گی۔ لیکن بعض اراکین وقتاً فوقتاً بعض تجاویز کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سے تمہارا ملتے رہنا اور ان تجاویز کے متعلق اپنا تاثر اور نقطہ نگاہ بیان کرنا ان کیلئے اطمینان کا موجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس پروگرام کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا۔ وزیر ہند مشترکہ کمیٹی کے جن اراکین سے ملنے کا مشورہ دیتے میں ان سے ملتا اور انکی خاص دلچسپی کے موضوع پر ان سے بات چیت کرتا۔ اس کے بعد وزیر ہند کے ساتھ ملاقات کے دوران میں گفتگو کا خلاصہ ان کی خدمت میں بھی پیش کر دیتا۔

لارڈ زٹلینڈ سے فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق گفتگو

وزیر ہند نے بتلایا کہ لارڈ زٹلینڈ فرقہ وارانہ نیابت کے فیصلے سے مطمئن نہیں وہ کہتے ہیں بنگال کے ہندوؤں کے ساتھ اس معاملے میں زیادتی ہوئی ہے۔ میں لارڈ زٹلینڈ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تفصیل سے گفتگو ہوئی وہ بار بار کہتے بنگال میں ہندوؤں کی نمائندگی میں بیس فیصدی سے بھی زیادہ کمی کر دی گئی ہے۔ انہیں آبادی کے تناسب کے مطابق بھی نمائندگی نہیں دی گئی۔ مسلمان جہاں جہاں بھی اقلیت میں ہیں انہیں آبادی کے تناسب سے بڑھ کر نمائندگی دی گئی ہے۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں لیکن یہی سلوک بنگال کے ہندوؤں کے ساتھ بھی ہونا چاہیئے۔ اگر آبادی کے تناسب سے زیادہ نہیں تو کم سے کم آبادی کے تناسب کے مطابق تو انہیں نمائندگی ملنی چاہیئے اس سے کم دینا تو انصاف نہیں۔" میں نے ان کے ساتھ بہت سر کھپایا کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی تو ملاحظہ فرمائیے کہ چون فیصدی مسلمانوں کو صرف اٹھائیس ۲۸ فیصدی نیابت دی گئی تھی۔ اتنی بڑی تفاوت کی اصلاح تو بڑی تبدیلی سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ہندوؤں کو آبادی کے تناسب کے مطابق نیابت میں حصہ دیا جائے تو مسلمانوں کی مجوزہ نیابت ہو باوجود ان کی اکثریت کے ۴۸ فیصدی ہے اور بھی کم ہو جائے گی یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اکثریت کو نصف سے بھی کم نیابت دی جائے۔ اس تفاوت کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ یورپینوں کو بنگال میں دس فیصدی نیابت دی گئی ہے۔ حالانکہ آبادی میں وہ ایک فیصدی بھی نہیں۔ انہیں دس فیصدی نیابت دینے کی وجہ سے

مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی نیابت میں اقلیت میں ہوں گے۔ اور ہندو اقلیت میں ہوتے ہوئے نیابت میں اپنی آبادی کے تناسب سے کم حصہ پائیں گے۔ آپ یورپین نیابت کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق کر دیں تو مسلمانوں کو نیابت میں اکثریت حاصل ہو سکے گی گو انکی آبادی کے تناسب کے مطابق نہ ہو۔ اور ہندوؤں کو انکی آبادی کے تناسب کے مطابق نیابت مل سکے گی اور ممکن ہے اس سے کچھ زیادہ بھی مل سکے۔ لیکن لارڈ زٹلینڈ مطمئن نہ ہو سکے۔ آخر مسکرا کر فرمایا ظفر اللہ! تم مجھے قائل نہیں کر سکتے اور میں تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔ میرا اطمینان تو تم نہیں کر سکے۔ تمہارا اطمینان میں کر دیتا ہوں۔ میں نے کمیٹی کے اراکین پر بہت زور دیا ہے کہ ہندوؤں کی نمائندگی میں اس تفاوت کی اصلاح ہونی چاہیئے لیکن وہ میری بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں سو تمہیں اس بارے میں فکر کی ضرورت نہیں۔

لارڈ ڈاربی سے گفتگو | اسی طرح وزیر ہند نے فرمایا۔ لارڈ ڈاربی قانون اور امن کا محکمہ وزراء کے سپرد کئے جانے پر مطمئن نہیں۔ میں نے ہز ہائی نس سر آغا خاں کی خدمت میں گذارش کی کہ وہ کسی دن لارڈ ڈاربی کو جن کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے لنچ پر مدعو کریں اور مجھے بھی یاد فرمالیں۔ لنچ پر کھانا ختم ہونے کے بعد ان سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے اپنی بے اطمینانی کی وجوہات بتائیں۔ میں نے اس معاملہ کے حسن وقبح کے پہلو تفصیل سے پیش کئے۔ آخر انہوں نے کہا میں اب تک تو اس تجویز کی مخالفت کرتا رہا ہوں اب وعدہ کرتا ہوں کہ مخالفت ترک کر دوں گا میں نے کہا یہ تو کافی نہیں۔ پوچھا پھر تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ اب آپ اس تجویز کی تائید کریں اور کہیں کہ آپ کا اطمینان ہو گیا ہے کہ قانون اور امن کے محکمے وزراء کے سپرد کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ ہنسے اور سر آغا خان سے کہا۔ ظفر اللہ بڑا مشاق سودے باز معلوم ہوتا ہے۔ اور مجھ سے فرمایا اچھا جیسے تم کہتے ہو ویسا ہی کر دوں گا۔

لارڈ ہارڈنگ سے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی پر گفتگو | ایک دن وزیر ہند نے فرمایا لارڈ ہارڈنگ سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی پر مطمئن نہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ذکر آنے پر فرمایا جناب ظفر اللہ صاحب! (یہ ان کا طریق گفتگو تھا انگریزی میں بھی ہندوستانیوں کو اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔) مجھے تو اب ہندوستان سے آئے عرصہ ہو گیا ہے۔ جب میں وہاں تھا سندھ بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا مجھے اندیشہ ہے کہ بمبئی سے علیحدہ ہو کر یہ صوبہ اپنے اخراجات برداشت نہ کر سکے گا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے آپ بتائیں کہ آپ اس لحاظ سے مطمئن ہیں؟ میں نے عرض کیا جناب میں نے اس مسئلے کا خاص طور پر مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن سندھ میں بہت بڑا رقبہ اراضی قابل کاشت ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے اب تک اس کا اکثر حصہ زیر کاشت نہیں لایا جا سکا۔ اب سندھ میں وسائل آب پاشی کو جلد جلد بڑھایا جا رہا ہے بڑے بڑے بند بنانے کے منصوبے بن چکے ہیں کچھ تو تیار ہو کر جاری بھی ہو چکے ہیں۔ اور کچھ جاری ہونے کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ آئندہ ترقیات کے بھی عمدہ امکانات ہیں۔

میں سندھ کی مالی حالت کے متعلق اپنے دل میں کوئی خدشہ نہیں پاتا۔ فرمایا بس میرا اطمینان ہو گیا مجھے آپ کی رائے پر اعتماد ہے۔

وزیر ہند کی طرف سے میاں سر فضل حسین کے ریٹائرڈ ہونے پر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کی پیشکش

وسط جولائی میں ایک دن وزیر ہند نے دریافت فرمایا ظفر اللہ اب تمہارا آئندہ کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کمیٹی کا اجلاس چند ہفتوں کے لئے ملتوی ہونے والا ہے اور آپ اس عرصہ کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔ میں نے بھی ناروے کی سیر کا ارادہ کیا ہے۔ کمیٹی کے اجلاس دوبارہ شروع ہونے پر میں لندن آجاؤں گا اور امید ہے کہ آخر اکتوبر تک ٹھہر سکوں گا۔ فرمایا تمہارے پروگرام سے میری مراد قیام انگلستان کے پروگرام سے نہ تھی۔ دو سال ہوئے تم نے سر فضل حسین کی جگہ کام کیا تھا۔ آئندہ اپریل میں انکی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ تم دوبارہ خدمت عامہ کی ذمہ داری اٹھانے کیلئے تیار ہوگے۔ میں نے کہا اگر آپ کو اطمینان ہے کہ میں اس قابل ہوں تو میرے لئے فخر کا باعث ہوگا۔ فرمایا میں نے وائسرائے سے بات چیت کی ہے ہم دونوں کی خواہش ہے کہ آئندہ سال تم وائسرائے کی کونسل میں سر فضل حسین کی جگہ لو۔ میں نے کہا میں آپ دونوں کا ممنون ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے آپ میری دو تین معروضات پر غور فرمالیں۔ اول یہ کہ اب تک چار مسلمان وائسرائے کی کونسل کے رکن ہو چکے ہیں۔ سر سید علی امام بہار سے تھے، میاں سر محمد شفیع پنجاب سے تھے، سر محمد حبیب اللہ مدراس سے تھے، میاں سر فضل حسین پنجاب سے ہیں۔ گویا چار میں سے دو کا تقرر پنجاب سے ہوا ہے۔ اگر اب پھر پنجاب سے ہی تقرر ہوا تو بنگال یوپی اور بمبئی کے مسلمانوں کو شکوہ ہوگا کہ ان میں سے کیوں کسی کو منتخب نہیں کیا گیا۔

وزیر ہند۔ ہم کسی صوبہ وارانہ انتخابی قاعدے کے پابند نہیں۔ ہمیں جہاں سے موزوں شخص ملتا ہے ہم انتخاب کر لیتے ہیں۔ پھر تمہاری خدمات تو کسی خاص صوبے سے متعلق نہیں۔ تم سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت میں مستعد رہے ہو۔

ظفر اللہ خاں ۔ میں آپ کے حسن ظن کا ممنون ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ دو افراد کی موزونیت پر غور فرمالیں۔ ایک نواب صاحب چھتاری اور دوسرے سر سکندر حیات خاں صاحب۔ یہ دونوں صاحبان اپنے صوبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ دونوں گورنر کے فرائض بھی ادا کر چکے ہیں۔ اور نواب صاحب تو میاں سر فضل حسین صاحب کی جگہ کام بھی کر چکے ہیں۔

وزیر ہند۔ ظفر اللہ! میں ان دونوں صاحبان کو جانتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔ نواب چھتاری تو گول میز کانفرنس میں آتے رہے ہیں اور سردار سکندر حیات خاں حال ہی میں لندن میں تھے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب موزوں ہوگا؟

ظفر اللہ خان ۔ جناب یہ سوال مجھ سے تو نہیں ہونا چاہیئے یہ امر تو آپ کے لئے غور طلب ہے ۔

وزیر ہند ۔ تو پھر میں نے اپنا انتخاب تمہیں بتا دیا ہے۔ اب کیا تم رضامند ہو ؟

ظفر اللہ خاں ۔ اپنی رضامندی تو میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں لیکن میری ایک گذارش ابھی باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میرا تعلق سلسلہ احمدیہ کے ساتھ ہے جس کے بعض عقائد کے ساتھ عام مسلمانوں کو اختلاف ہے۔ جب ۱۹۳۲ء میں میں نے سر فضل حسین صاحب کی جگہ کام کیا تھا تو اس وقت بھی اس بنا پر مسلمانوں کے ایک طبقے کی طرف سے میرے تقرر پر اعتراض کیا گیا تھا۔ اب بھی اعتراض ہو گا کہ جب وہ لوگ مجھے مسلمان ہی نہیں سمجھتے تو میرا تقرر مناسب نہیں۔ آپ اس پر غور فرمالیں۔

وزیر ہند ۔ تم نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں جو خدمت سرانجام دی ہے اسکے بعد کوئی بہت ہی کوتاہ اندیش مسلمان ہو گا جو تمہارے تقرر پر معترض ہو۔ اگر یہی باتیں تمہارے رستے میں روک ہیں تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم پوری طرح رضامند ہو۔ ؟

ظفر اللہ خاں ۔ جہاں تک میری رضامندی کا سوال ہے میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اس خدمت کا میرے سپرد ہونا میرے لئے باعث فخر ہو گا اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ میری ایک یہ بھی گذارش ہے کہ اس فیصلے کا اعلان ابھی نہ کیا جائے۔ میں پریکٹس کرتا ہوں اور اپنا نقطۂ نظر عدالت کے روبرو زور سے پیش کرنے کا عادی ہوں۔ اس وقت تو جج صاحبان خیال کرتے ہیں کہ یہ میرا معمول ہے۔ اس تقرر کے اعلان کے بعد ممکن ہے کوئی جج خیال کرے کہ میں اپنے آئندہ منصب کے زعم میں ایسا کرتا ہوں اور یہ غلط فہمی میرے لئے دقت کا موجب ہو گی۔

وزیر ہند۔ عام طور پر چارج لینے سے کتنا عرصہ پہلے اعلان کیا جاتا ہے۔ ؟

ظفر اللہ خاں ۔ دو تین ماہ قبل ۔

وزیر ہند ۔ میں تمہاری خواہش وائسرائے کو پہنچا دوں گا۔ تو اب ہم آخر ستمبر میں ملیں گے۔ امید ہے تمہارا وقت خوشگوار رہے گا۔

لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کی طرف سے کونسل کی رکنیت کی پیشکش

اس دوران میں ہندوستان میں میاں سر فضل حسین صاحب کے جانشین کے انتخاب کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں اور کچھ آوازیں میرے تقرر کے خلاف اٹھنے لگی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد میری ملاقات وائسرائے سے ہوئی۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا میں تم سے ایک عنایت کا متمنی ہوں۔ میں نے کہا ارشاد فرمائیں۔ کہا میری میعاد دو سال سے کم عرصے میں ختم ہو جائے گی میری جگہ جس شخص کا بھی تقرر ہو گا وہ خواہ کتنا ہی قابل ہو اس کا ہندوستان کا تجربہ میرے تجربے کے برابر نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں چارج چھوڑوں تو اپنے جانشین کیلئے ایسی کونسل چھوڑ

جاؤں جس کے مشوروں پہ وہ پورا اعتماد کر سکے۔ تمہیں معلوم ہے سر فضل حسین کی میعاد آئندہ سال ختم ہوگی میں چاہتا ہوں کہ ان کی جگہ بہترین مسلمان کا انتخاب کیا جائے۔

ظفر اللہ خاں ۔ بجا ہے۔ لیکن مجھے آپ کے ایسا کہنے سے کچھ ملال ہوا ہے۔

لارڈ ولنگڈن ۔ وہ کیوں ؟

ظفر اللہ خاں ۔ اسلئے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ اور میرا اندازہ تھا کہ آپ میرے کام سے مطمئن ہیں اندریں صورت مجھے خیال ہو سکتا تھا کہ آئندہ تقرر کے وقت آپ مجھے بھی ذہن میں رکھیں گے۔

لارڈ ولنگڈن ۔ میری مراد تو تمہیں سے ہے !

ظفر اللہ خاں ۔ لیکن آپ نے جو لفظ استعمال کیا وہ تو مجھ پہ چسپاں نہیں ہوتا !

لارڈ ولنگڈن ۔ تم بہت شریر ہو۔ میں جانتا ہوں تم بہت روپیہ کماتے ہو۔ لیکن کیا تم میری خواہش پوری کرنے پہ رضامند ہو ؟

ظفر اللہ خاں ۔ میں کوئی اتنا کماتا نہیں اللہ تعالیٰ میری ضروریات سے بڑھ کر میرے لئے مہیا فرما دیتا ہے میں آپ کے حسن ظن اور اچھی رائے کا نہایت ممنون ہوں۔ اور اس خدمت کیلئے خوشی سے آمادہ ہوں"۔ اگرچہ وزیر ہند پختہ طور پہ مجھ سے فرما چکے تھے۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ خود وائسرائے سے اس کا ذکر کروں۔ جب انہوں نے ذکر شروع کیا تو میں جانتا تھا کہ ان کی کیا مراد ہے۔ لیکن انہوں نے میرے متعلق اپنی رائے کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جس سے میں خجل ہوا اور میں نے نہ چاہا کہ وہ یہ خیال کریں کہ میں اپنے آپکو ان الفاظ کا مستحق خیال کرتا ہوں۔ لارڈ ولنگڈن بڑے اعلیٰ خلق کے انسان تھے اور ہر شخص سے نہایت مہربانی اور تلطف سے پیش آتے تھے۔

جب ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے یہ شور بڑھنا شروع ہوا کہ میاں سر فضل حسین کی جگہ ظفر اللہ خاں کا تقرر ہمارے لئے بہت ناگوار ہوگا تو سید انعام اللہ شاہ صاحب نے کچھ اضطراب میں مجھے لکھا۔ "ہم یہاں اسقدر پریشان ہو رہے ہیں اور تم نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا جو تسلی اور اطمینان کا باعث ہو۔ اسوقت تو وائسرائے بھی انگلستان ہی میں ہے۔ تمہیں وزیر ہند اور وائسرائے سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہوگا۔ کچھ تو ہمیں بھی بتاؤ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔" میں نے انکی خدمت میں لکھا آپ کیوں پریشان ہیں؟ دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال فضل و رحم سے وہی کرے جو ہم سب کیلئے فائدہ مند ہو اور اس کی رضا کا موجب ہو۔ اگر وہ چاہے کہ میں یہ خدمت کروں تو وہ رستہ کھول دیگا اور کوئی مخالفت رستے میں روک نہ ہو سکے گی۔ اور اگر وہ چاہے کہ میں کسی اور طریق سے اسکی رضا جوئی کروں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ ہمیں ہر حالت میں خوشی ہے۔ البتہ مخالفین کی کوششیں اگر کارگر نہ ہوئیں تو ان کے لئے کسقدر اذیت کا موجب ہوگا۔ واللہ المستعان وھو علٰی کل شیئٍ قدیر۔

وائسرائے کی کونسل میں میرے تقرر کی ایک طبقہ کی طرف سے مخالفت

۳۰ ر اکتوبر کی ملاقات میں وزیر ہند نے بتایا مجھے بہت سے تار اور مراسلات ہندوستان سے تمہارے تقرر کی مخالفت میں موصول ہوئے ہیں۔ میں نے کروفٹ اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہدیا تھا کہ ان سب کو ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے جاؤ۔ تم سچ کہتے تھے۔ بعض عناصر تمہارے تقرر کے بہت ہی مخالف ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنا مفاد بھی نہیں پہچانتے۔ وائسرائے کا مشورہ ہے کہ اگر تمہارے تقرر کا اعلان ابھی سے کردیا جائے تو یہ جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا اگر وائسرائے یہ چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ اس پر مسٹر کروفٹ کو بلوا کر کہا وائسرائے کو اطلاع کردو ظفر اللہ رضامند ہے کہ آئندہ ہفتے میں تقرر کا اعلان کردیا جائے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا ایک اور بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ وائسرائے کی اور میری دونوں کی خواہش ہے کہ تم بجائے سر فضل حسین کا قلمدان سنبھالنے کے سر جوزف بھور کا قلمدان اپنے ذمے لو جس میں تجارت اور ریلوے کے اہم محکمہ جات شامل ہیں۔ میں نے کہا بہت شکریہ! لیکن یہ دونوں محکمے میرے لئے بالکل نئے ہوں گے اور ان دونوں میں اور خاص طور پر تجارت کے محکمے میں تو بعض بہت پیچیدہ مسائل کا سامنا ہوگا۔ کہا درست ہے محنت درکار ہوگی اور تم محنت سے جی چرانے والے نہیں۔ میں یہ ہدایت دیدوں گا کہ ان مسائل کے متعلق جو مراسلات تمہارے قیام لندن کے دوران دلی سے موصول ہوں وہ تمہیں دکھا دیئے جائیں۔ اور جب تم ہندوستان واپس جاؤ گے تو وائسرائے بھی یہی ہدایت دیدیں گے۔ تاکہ چارج لینے پر تمہارے لئے ان محکموں کے مسائل بالکل نئے نہ ہوں۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ سر فضل حسین کی میعاد پہلے ختم ہوتی ہے اور سر جوزف بھور کی میعاد دو تین ہفتے بعد ختم ہوتی ہے۔ اسلئے یہ انتظام کردیا جائے گا کہ تم سر فضل حسین سے ان کے محکمے کا چارج لے لو۔ اور پھر سر جوزف بھور کی میعاد ختم ہونے پر ان سے چارج لے لو۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں۔ میں سر جوزف بھور کی میعاد ختم ہونے پر ان ہی سے چارج لے لوں گا۔ فرمایا ایسا ہونے سے جو صاحب سر فضل حسین سے چارج لیں گے وہ کونسل میں تم سے سینئر شمار ہوں گے۔ میں نے کہا اصولاً ایسا ہی ہونا چاہیئے اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

سر میاں فضل حسین صاحب کی جگہ کنور سر جگدیش پرشاد کا تقرر

میاں فضل حسین صاحب کے ریٹائر ہونے پر انکی جگہ کنور سر جگدیش پرشاد صاحب کا تقرر ہوا۔ وہ یوپی کے رہنے والے تھے۔ اور اس صوبے میں انڈین سول سروس کے سینئر افسر تھے۔ وہ گورنر کی عاملہ کونسل کے رکن تھے۔ ان سے میرا پہلے تعارف نہیں تھا ملاقات ہونے پر انہوں نے بتایا کہ اپنے نئے منصب کا چارج لینے سے پہلے وہ کبھی شملے تشریف نہیں لائے۔ مرکزی حکومت کا تمام کارخانہ اور کاروبار ان کے لئے ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ اپنے محکمہ جات کے معاملات کے متعلق بلاتکلف مجھ سے مشورہ طلب فرماتے اور پیش آمدہ اہم مسائل کے متعلق تو بغیر باہمی مشورے کے کوئی رائے قائم نہ کرتے۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات

ہمیشہ بہت دوستانہ رہے اور ہمارے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہ ہوا جس کے نتیجے میں ہم دونوں کو تقویت پہنچتی رہی۔ ہم دونوں کے اہل خانہ کے درمیان بھی دوستانہ مراسم قائم ہوگئے اور یہ تعلقات آخر تک بہت گہرے اور مضبوط رہے۔

انگلستان سے واپسی | لندن سے ہندوستان واپسی کا سفر بھی اسی رستے ہوا۔ لندن سے پیرس تک ہوائی جہاز پر سفر ہوا پیرس سے شام کے کھانے کے بعد ریل پر سوار ہوئے اور تیسری صبح برنڈزی پہنچے۔ سامان تو ریل سے ہی ہوائی کشتی پر بھیج دیا گیا۔ مسافروں کو ناشتے کیلئے ہوٹل لے جایا گیا۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر اس انتظار میں تھے کہ ہوائی کشتی پر جائیں کہ اتنے میں ہم نے اپنا سامان ہوٹل واپس آتے دیکھا۔ وہ اسقدر بھیگا ہوا تھا کہ بکسوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ جو کشتی ہمارا سامان ہوائی کشتی پر لے جا رہی تھی اس کی ایک اور کشتی سے بندرگاہ کے اندر ہی ٹکر ہوگئی اور ہمارے سامان والی کشتی الٹ گئی سب سامان پانی میں گر گیا اسے نکال تو لیا گیا لیکن پانی میں شرابور ہو رہا تھا۔ اور بندرگاہ کا پانی گندہ ہونیکی وجہ سے سخت بو آرہی تھی۔ اس وقت اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہوٹل کے سب کمروں میں آگ جلائی گئی اور سامان بکسوں سے نکال کر خشک کرنے کیلئے پھیلا دیا گیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہوائی کشتی بجائے نو بجے صبح روانہ ہونے کے پانچ بجے شام روانہ ہوئی اتنے میں موسم میں ناخوشگوار تغیر رونما ہو چکا تھا۔ روانگی کے تھوڑا عرصہ بعد ہوائی کشتی طوفان میں گھر گئی۔ جب یہ حالت برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نشست سے کھسک کر بلا تکلف فرش پر لیٹ گیا۔ ایتھنز پہنچنے تک متواتر یہی کیفیت رہی۔ رات وہاں ٹھہرے۔ ہوٹل بہت آرام دہ تھا لیکن سامان کی حالت ایسی تھی کہ آرام نصیب ہونا مشکل تھا۔ صبح تک موسم تو صاف ہو گیا لیکن سامان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ کراچی پہنچنے تک میں نے فیصلہ کیا کہ کراچی سے ہوائی جہاز پر دلی جانے کی بجائے میں کراچی سے ریل پر لاہور چلا جاؤں۔ دلی جانے میں بڑی دقت یہ تھی کہ جو کپڑے میں لندن سے پہنے آرہا تھا وہ دہلی کیلئے موزوں نہیں تھے اور سوٹ کیس کا سارا سامان گندے پانی میں لتھڑا رہنے کے باعث سخت بدبودار ہو رہا تھا۔

رسوائے عالم راج پال کی دریدہ دہنی اور اسکا انجام | چند سالوں سے حکومت پنجاب کا ایک طبقہ جماعت احمدیہ کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا اس کی ابتدا ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ جب ایک دریدہ دہن ننگِ انسانیت شخص نے جس کا نام راجپال تھا ایک نہایت شرمناک کتابچہ بنام "رنگیلا رسول" شائع کر کے اپنی دنیا اور عاقبت تباہ کرلی۔ یہ کتابچہ مسلمانوں کیلئے شدید روحانی اذیت کا موجب ہوا۔ حکومت کی طرف سے مصنف پر فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ ابتدائی عدالت سے اسے کچھ قید کی سزا ہوئی جو اپیل میں تو قائم رہی لیکن ہائی کورٹ میں نگرانی کی درخواست پر مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ نے قرار دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین قانون کی زد میں نہیں آتی اور ملزم کو رہا کر دیا۔ اس فیصلے سے مسلمانوں کے جذبات سخت مجروح ہوئے۔ راج پال رہا ہوا لیکن جلد ہی ایک جوشیلے مسلمان علم دین کے ہاتھوں جس کی آنکھوں میں راج پال کے فعل کی وجہ سے دنیا اندھیر ہو رہی تھی کیفر کردار کو پہنچا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی سیرت النبیؐ کے جلسوں کی تحریک

اس شدید ہیجان کے دور میں حضرت امامؓ جماعت احمدیہ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ راج پال کے فعل شنیع کی ذمہ داری کسی حد تک ہم پر بھی عاید ہوتی ہے کیونکہ ہم اپنے اولین فرض کی کماحقہ ادائیگی سے اب تک غافل رہے ہیں۔ جو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حضورؐ کے خلق عظیم کی صحیح تصویر غیر مسلموں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ آپ نے ملک کے طول و عرض میں سیرت النبی کے جلسوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ جو اب تک جاری ہے۔ اور جس سے بہت نیک نتائج مترتب ہو چکے ہیں۔ اور آئیندہ ہونے کی امید ہے۔

تعزیرات ہند میں ترمیم جس کی رو سے بانیان مذاہب کی توہین قابل تعزیر قرار دی گئی

دوسرے آپ نے ملک کے تعزیری قانون میں ترمیم کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں قانون میں ایسی ترمیم کر دی گئی جس کے الفاظ واضح طور پر بانیان مذاہب کی تحریری یا تقریری توہین کو قابل تعزیر قرار دیتے ہیں۔

مسلم اوٹ لک کے مالک اور ناشر پر پنجاب ہائیکورٹ کی طرف سے توہین عدالت کا مقدمہ

اس اثناء میں لاہور سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے مسلم اوٹ لک میں ایک اداریہ شائع ہوا جس میں مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلے پر سخت تنقید کی گئی۔ اس پر اخبار کے مالک مولوی نور الحق صاحب اور پرنٹر سید دلاور شاہ صاحب احمدی کے نام ہائی کورٹ سے توہین عدالت کا نوٹس جاری ہوا۔ مسلمان وکلاء کا ایک مشاورتی جلسہ میاں سر محمد شفیع صاحب کے دفتر میں منعقد ہوا۔ مسئول علیہم کی طرف سے یہ واضح کیا گیا کہ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اداریہ زیر بحث سے مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ کی توہین لازم آتی ہے۔ اداریہ کا مضمون جائز تنقید کی حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ کیونکہ تنقید کی شدت سے جج کی توہین لازم نہیں آتی اگر ہائی کورٹ قرار دے کہ اداریہ سے توہین لازم آتی ہے تو وہ بصد شوق سزا بھگتنا قبول کریں گے۔ معافی طلب کرنا یا عدالت سے رحم کی درخواست کرنا انہیں ہرگز گوارہ نہ ہو گا۔ اب یہ سوال اٹھا کہ مسئول علیہم کی طرف سے وکیل کون ہو۔ سب نگاہیں میاں سر محمد شفیع صاحب کی طرف اٹھیں۔ لیکن آپ نے فرمایا میں معذور ہوں۔ لیڈی شفیع کی طبیعت سولن میں ناساز ہو گئی ہے اور میرے لئے آج رات سولن جانا ضروری ہو گیا ہے اس لئے میں کل عدالت میں مسئول علیہم کی طرف سے پیروی کیلئے حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس پر متفقہ طور پر یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ شیخ سر عبد القادر صاحب مسئول علیہم کی طرف سے پیروی کریں۔ شیخ صاحب مولوی نور الحق صاحب کو ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور جیسے بعد میں مولوی صاحب سے معلوم ہوا۔ فرمایا کہ گورنر کی مجلس عاملہ میں ان کے عارضی تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے ان کا ایک ایسے کیس میں پیش ہونا مناسب نہ ہو گا جس میں ایک طرف مسلمانوں کے نازک جذبات تلاطم میں ہیں اور دوسری طرف ہائی کورٹ کی توہین کا سوال ہے۔ چنانچہ کمرے میں واپس آکر مولوی صاحب نے فرمایا کہ شیخ صاحب نے ان کا اطمینان کر دیا ہے کہ وہ پیروی سے معذور ہیں۔

توہین عدالت کے کیس میں مسئول علیہم کی طرف سے پیروی کیلئے میرا انتخاب!

اس مرحلے پر میاں محمد شفیع صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ میری رائے میں میرے دوست نصراللہ خان (میاں صاحب اکثر مجھے میرے والد صاحب کے نام سے ہی یاد فرمایا کرتے تھے) سے بہتر کوئی اس خدمت کو نباہ نہیں سکتا اس مجلس میں بہت سے اصحاب ایسے موجود تھے جو لیاقت اور تجربے کے لحاظ سے مجھ سے کہیں آگے تھے۔ مثلاً میاں عبدالعزیز صاحب، مولوی غلام محی الدین صاحب، سید محسن شاہ صاحب، ملک برکت علی صاحب، خلیفہ شجاع الدین صاحب، غلام رسول خان صاحب، میاں عبدالرشید صاحب، میاں محمد رفیع صاحب لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ذرہ نوازی نے اس مرحلے پر اس سعادت کے حصول کیلئے اس عاجز کا نام ہی میاں صاحب کی زبان سے نکلوایا۔ الحمد للہ۔ بہت سی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ ممکن ہے بعض رشک سے کہ یہ فخر ان کے حصے کیوں نہ آیا اور بعض شکر میں کہ انہیں اس امتحان میں نہ ڈالا گیا۔ میں نے عرض کیا میں اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں سمجھتا لیکن اگر مجھے ارشاد ہو تو اس کیس کی پیروی میرے لئے باعث فخر ہوگی اور میں یہ سعادت حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوں۔ دوسرے ہی دن پانچ ججوں کے اجلاس میں اس کیس کی سماعت تھی۔ تیاری کیلئے زیادہ وقت تو میسر نہ تھا لیکن دعاء کے مواقع ضرور میسر تھے۔

ہائیکورٹ میں توہین عدالت کے کیس کی سماعت!

اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے ہی عدالت کے ہال میں پبلک سامعین کا حصہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وکلاء میں سے بھی بہت سے موجود تھے۔ میں نے پہلے تو یہ عذر اٹھایا کہ عدالت کو توہین عدالت کے معاملے میں اختیار سماعت حاصل نہیں۔ یہ خاص اختیار کہ اپنی مزعومہ توہین کی سزا عدالت خود ہی تجویز کرے برطانوی عدالتوں کا خاص مسئلہ ہے۔ اور برطانیہ میں بھی یہ اختیار "عدالہائے ریکارڈ" تک محدود ہے۔ اس اصطلاح سے برطانیہ میں جو مراد لی جاتی ہے اس کے مدنظر لاہور ہائی کورٹ کورٹ آف ریکارڈ نہیں۔ اس نظریے کی تائید میں میں نے بعض نظائر بھی پیش کئے۔ دو گھنٹے کے قریب تو اسی بحث میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلم آؤٹ لُک کا زیر بحث اداریہ جائز تنقید کی حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور تنقید خواہ کتنی شدید ہو توہین عدالت نہیں کہلا سکتی۔ ہر روز عدالت ہائے اپیل عدالتہائے ابتدائی کے فیصلوں کو منسوخ کرتی ہیں اور بعض دفعہ عدالت ماتحت کے جج کے متعلق سخت الفاظ بھی استعمال کرتی ہیں لیکن اس سے ماتحت جج کی توہین لازم نہیں آتی۔ آخر میں میں نے کہا اگر باہیں ہمہ آپ قرار دیں کہ اداریہ زیر بحث سے جج متعلقہ کی توہین لازم آتی ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی حفاظت کی سعی میں اگر ہائی کورٹ کے ایک جج کی توہین لازم ہو گئی تو یہ امر ناگزیر تھا جس کی پوری ذمہ داری مسئول علیہم تسلیم کرتے ہیں۔ جب بحث ختم ہوئی تو مولانا ظفر علی خان صاحب سامعین کے حصے سے کٹہرے کو ہٹا کر میری طرف لپکے اور اس ناچیز کے ہاتھوں کو بوسہ

دیکھ بلند آواز سے فرمایا۔ آج تم نے ان لوگوں کا منہ کالا کر دیا جو کہتے ہیں مسلمانوں میں قابل وکیل نہیں ملتا۔ فجزاہ اللہ عدالت عالیہ سے ان دو خادمان رسول مقبول کو چھ چھ ماہ زندان میں یاد رسول اور ذکر الٰہی میں صرف کرنے کی مہلت عطا ہوئی۔ زہے بند و زہے زندان۔

ورتمان امرتسر کی دریدہ دہنی | لاہور میں یہ فتنہ ابھی فرو نہ ہوا تھا کہ امرتسر سے ایک اور فتنے نے سر اٹھایا۔ ورتمان نامی ایک رسالے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ایک اور پلندہ شائع ہوا۔ دو دن کے اندر حضرت امام جماعت احمدیہ کا لکھا ہوا ایک مطبوعہ اشتہار بعنوان "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرنے والے کیا اب بھی بیدار نہ ہونگے" لاہور، امرتسر اور بعض دیگر شہروں کی دیواروں پر چسپاں پایا گیا۔ فوراً دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ پانچ یا پانچ سے زائد آدمیوں کا مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا، ہر قسم کے اشتہارات اور رسالہ جات کی طباعت اور اشاعت بدون اجازت ڈپٹی کمشنر ممنوع قرار دی گئی۔ غرض امن عامہ کے لحاظ سے ایک ہنگامی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن آخر حکومت کی مشین بھی حرکت میں آئی۔ ورتمان کے طابع اور ناشر کے خلاف حکومت کی طرف سے ہائی کورٹ کے دو ججان کے روبرو استغاثہ دائر ہوا۔ سرکار کی طرف سے میاں سر محمد شفیع کو وکیل مقرر کیا گیا۔ عدالت نے مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلے کو منسوخ قرار دیا اور ملزمان کے خلاف جرم قائم ہو کر انہیں قید کی سزا ہوئی۔

مسٹر اوگلوی ڈپٹی کمشنر لاہور سے جھڑپ | اس اثناء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ لاہور تشریف لائے۔ جماعت کی طرف سے ایک مختصر رسالے کے شائع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ خان ذوالفقار علی خان صاحب کو اور خاکسار کو ارشاد ہوا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کی عدالت میں حاضر ہو کر رسالے کی طباعت اور اشاعت کی اجازت طلب کریں۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی تھے وہ بھرے بیٹھے تھے۔ فرمایا ورتمان کے مضمون کے متعلق مرزا صاحب کو ایسا جوش پیدا کرنے والا اشتہار شائع کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ ورتمان کا مضمون متقاضی تھا کہ حکومت بہر حال طابع اور ناشر کے خلاف مقدمہ چلائے۔ میں نے کہا "جیسے راجپال کے خلاف چلایا تھا!" کہنے لگے "میرا بس چلتا تو میں ضرور پھر راجپال کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاتا"۔ میں نے عرض کیا "لیکن آپ کا بس تو نہ چلا نا!" ڈپٹی کمشنر نے پوچھا "یہ ورتمان والا اشتہار لاہور کی دیواروں پر چسپاں کرنے کا کون ذمہ دار ہے؟" میں نے عرض کیا "مجھے ذاتی طور پر تو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی لیکن چونکہ میں لاہور کی جماعت احمدیہ کا امیر ہوں اسلئے ذمہ داری میری ہے۔" پوچھا "حفظ امن کی ذمہ داری کس کی ہے؟" میں نے کہا "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی۔" کہنے لگے اگر شہر میں فساد ہو جاتا تو؟ میں نے کہا "تو اسے فرو کرنا آپ کا فرض ہوتا امام جماعت احمدیہ کا فرض ہے کہ دینی غیرت کی حفاظت کریں۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے قانون کے اندر رہتے ہوئے جو طریق وہ مناسب سمجھیں گے اختیار کریں گے۔ اگر وہ قانون کی خلاف ورزی کریں تو آپ بیشک ان کے خلاف اقدام کریں۔" اوگلوی بولے "خوب تو اگر تمہیں امام جماعت کی طرف سے قانون شکنی کا حکم ملے تو تم قانون شکنی کرو گے؟" میں نے کہا یہ سوال فضول ہے اسلام قانون شکنی کی اجازت نہیں

دنیا۔ امام جماعت احمدیہ خادم اسلام ہیں اور احکام اسلام کے پابند ہیں وہ ایسا حکم نہیں دے سکتے اسلئے یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔" ادگلوی نے کہا "لیکن اگر کبھی یہ صورت پیدا ہو جائے؟" میں نے کہا "فضول سوال دہرانے سے معقول نہیں ہو جاتا لیکن اگر آپ کو جواب سننے پر اصرار ہے تو مجھے جواب دینے سے انکار نہیں۔ میں نے بیعت میں عہد کیا ہے کہ امام جماعت جس نیک کام کا حکم دیں گے میں ان کی اطاعت کروں گا۔ میں ضرور اس عہد کو نبھاؤں گا کیا آپ اسی جواب کے منتظر تھے؟" ادگلوی نے کہا "جواب بہت دلچسپ ہے میرا فرض ہے کہ میں اسے ہز ایکسیلنسی گورنر تک پہنچا دوں۔" میں نے کہا "آپ فرض کی ادائیگی میں تاخیر کیوں کر رہے ہیں۔ ٹیلیفون آپ کے سامنے پڑا ہے اٹھائیے اور گورنر کو اس دلچسپ جواب سے مطلع کیجئے؟" اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے گفتگو کا رخ بدلا اور کہا "اچھا آپ صاحبان کس کام کیلئے آئے ہیں؟" میں نے رسالے کا مسودہ پیش کیا اور کہا اس کے چھپوانے اور شائع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کیلئے۔ انہوں نے مسودہ پڑھا دو ایک مقام کی وضاحت چاہی اور کہا "مجھے تو اس میں کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔" اور اجازت پر دستخط کر دیئے۔ میں نے کہا شکریہ اور ہم کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بھی کھڑے ہوئے۔ مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ "چوہدری صاحب مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے آپ صاف کہہ دیتے ہیں۔" ان کے ساتھ بعد میں کئی بار سابقہ پڑا ہمیشہ بہت شرافت سے پیش آتے رہے ہمارے تعلقات بہت دوستانہ رہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح کا بہت احترام کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ پنجاب کے ہوم سیکرٹری تھے۔ جب قادیان میں احرار کانفرنس کے سلسلہ میں گورنر پنجاب کے ساتھ الجھن پیدا ہوئی تو ہماری اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ خود اس معاملے کا ذکر چھیڑا اور بغیر کسی کا نام لئے کہا۔ "بہت افسوس ہے اس معاملے میں امام جماعت کی پوزیشن کا خیال نہ رکھا گیا۔" مجھے ان کے اس فقرے سے کچھ حیرت بھی ہوئی کیونکہ گفتگو کے سیاق سباق میں اس فقرے کا مطلب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ اس معاملے میں گورنر نے غلط رویہ اختیار کیا۔

ریاست کشمیر میں حصول بنیادی حقوق کی جدوجہد کی ابتدا

خطۂ کشمیر جہاں اپنے دلفریب مناظر اور گوناگوں خوبیوں کے باعث اپنی جاذبیت میں لاثانی ہے وہاں اہل خطہ باوصف اپنی اعلیٰ ذہنی اور فنی استعدادوں کے عرصہ دراز سے ستم ہائے روزگار کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے ایک سو پچیس سال میں تو خاص طور پر ان پر عرصہ حیات تنگ رہا ہے۔ پہلے ڈوگرہ راج کے مظالم کی چکی انہیں نہایت باریک پیستی رہی اور اب ہندوستانی آمریت کی رتھ کے پہیئے ان کی رہی سہی ہڈیاں توڑ کر ان کی علیحدہ ہستی کو معدوم کرنے کے درپے ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے کشمیر کی مظلوم آبادی نے اپنے بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد جاری کر رکھی ہے۔ پہلے پہل جب ان کی طرف سے انسانی حقوق کے مطالبے کی صدا بلند ہوئی تو اس کا جواب ڈوگرہ حکومت کی طرف سے بندوق کی گولیوں سے دیا گیا جسے مظلوم جانبازوں نے پیٹھوں پر نہیں اپنے سینوں پر لیا۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام حضرت امام جماعت احمدیہ نے شملے کے مقام پر سرکردہ ابنائے کشمیر کو جنہوں نے خود یا جن کے آباء نے ترک وطن کر کے پنجاب میں سکونت اختیار کی ہوئی تھی جمع ہونے کی دعوت دی اور کشمیر میں صورت حالات کی طرف توجہ دلا کر متحدہ اقدام کی ضرورت کو واضح فرمایا۔ اس کے نتیجے میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اراکین کمیٹی کے اصرار پر امام جماعت احمدیہ نے اس کمیٹی کی صدارت منظور کر لی۔ کمیٹی کی طرف سے اس کے نتیجے میں اہالیان کشمیر کی جدوجہد آزادی کی سرگرمی سے تائید شروع ہو گئی۔

گلینسی کمیٹی اور اس کی رپورٹ وائسرائے نے سر بجینلڈ گلینسی کو مقرر فرمایا کہ وہ حالات کا جائزہ لیکر رپورٹ کریں اور اصلاحی تجاویز پیش کریں۔ ان کی رپورٹ کے نتیجے میں بعض ابتدائی اصلاحات عمل میں آئیں۔ جناب صدر آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارشاد کے ماتحت میں بھی متعدد بار سر بجینلڈ سے ملا اور اس سلسلے میں وائسرائے کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ جناب صدر کمیٹی کے ارشاد پر وائسرائے کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے سر بجینلڈ کی رپورٹ پر تبصرہ بھی تیار کیا۔ بعض اپیلوں کی پیروی کیلئے چیف جسٹس جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے اجلاس میں بمقام جموں پیش ہوا۔ سر بجینلڈ گلینسی نے بتایا کہ انہوں نے جن باتوں پر زور دیا ہے ان میں سے دو کے متعلق مہاراجہ صاحب قطعاً کسی اصلاح کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ وہ ریاست سے دستبردار ہونا قبول کریں گے لیکن ان دو معاملات میں ہرگز کسی تبدیلی پر رضامند نہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو ریاست میں گائے کے ذبح کرنے کے سنگین جرم میں عمر قید کی سزا تھی۔ اور دوسرا وہ قانون تھا جس کی رُو سے ریاستی ہندو مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہو جانے پر مرتد کر خاندانی جائداد میں اپنے حصے سے محروم ہو جاتا تھا۔ آخر کار امر اول کے متعلق اس قدر تخفیف عمل میں لائی گئی کہ جرم کی سزا عمر قید سے کم کر کے دس سال قید بامشقت کر دی گئی۔

حکومت پنجاب کے ایک طبقہ کی طرف سے غلط فہمی کی بناء پر جماعت احمدیہ کی مخالفت اور ایذا رسانی جناب امام جماعت احمدیہ نے رنگیلا رسول کی اشاعت کے بعد سیرت النبی کے جلسوں کا سلسلہ جاری کرنے اور ورتمان کے مضمون کی اشاعت پر پوسٹر شائع کرنے اور بانیانِ مذاہب کی عزت کے تحفظ کے سلسلے میں قانون کی مناسب ترمیم کے متعلق ہندوستان اور انگلستان میں کامیاب جدوجہد کرنے اور اہالیان کشمیر کے بنیادی انسانی حقوق کے حصول کی خاطر آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کرنے اور پھر ضبط اور سرگرمی سے اس تحریک کو چلانے اور فروغ دینے کے سلسلے میں جو اقدام کئے ان سے حکومت پنجاب کے ایک طبقے کے ذہنوں پر یہ اثر پڑا کہ جماعت احمدیہ نے سیاسیات میں دخل دینا شروع کر دیا ہے اور وہ جماعت کو پہلے سے بڑھ کر شک کی نگہ سے دیکھنے لگے۔ ادھر خلافتِ ثانیہ کے دور میں جماعت احمدیہ کے اندرونی نظام کی مضبوطی بھی ان کے دلوں میں کھٹکتی تھی اور انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس جماعتی نظام کے دو پہلو خاص طور پر اس طبقۂ حکام کو ناپسند تھے۔ ایک تو وہ جماعت کے صیغۂ قضا کو جس میں احمدیوں کے باہمی تنازعات فیصلہ پاتے ہیں شبہ کی

نگہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے متعلق انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ صیغۂ قضاء احمدیوں کے مابین فوجداری تنازعات کا فیصلہ کرتا اور تعزیر عائد کرتا ہے جیسے وہ حکومت کے اختیارات میں تصرف تعبیر کرتے تھے۔ یہ شبہ بالکل بے بنیاد تھا۔ صیغہ قضاء کو جرائم اور ان کی تعزیر کے ساتھ قطعاً کوئی سروکار نہ اب ہے نہ کبھی تھا۔ یہ صیغہ خالصتاً دیوانی تنازعات کا فیصلہ کرتا ہے اور فریق متعلقہ سے ان فیصلہ جات کو مناسب ترغیب اور وعظ و نصیحت اور اخلاقی دباؤ سے منظور کراتا ہے اور یہ بات حکومت کی اعلان کردہ پالیسی کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کا کامیابی کے ساتھ جاری رہنا حکومت کے اس طبقہ کو لپسند نہیں تھا۔ دوسرے سلسلے کے اندر صدر انجمن احمدیہ کے مختلف شعبوں کے انصرام کیلئے نظارتوں کا قائم ہونا انہیں حکومت کے اندر حکومت کی شکل میں نظر آتا تھا۔ اور وہ بجائے اس کے کہ اس نظام کو تربیت اور امن کا قابلِ قدر نمونہ شمار کرتے اسے حکومت کا مدمقابل اور آئندہ کیلئے خطرہ سمجھنے لگے تھے۔

سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب اور جماعت احمدیہ | سر ہربرٹ ایمرسن انڈین سول سروس کے ایک قابل افسر تھے۔ لیکن اپنے آپ کو بے جا حد تک دوربین اور نقطہ شناس سمجھتے تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر جماعت اور سلسلہ کے صحیح حالات معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ ان کا انحصار سرکاری خفیہ رپورٹوں اور مخالفین سلسلہ خصوصاً احرار کے پروپیگنڈا پر تھا۔ جب مرکزی حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کے عہدہ سے ترقی پا کر وہ پنجاب کے گورنر ہوئے تو اس عزم کے ساتھ پنجاب آئے کہ صوبہ میں رعایا کے دو فریق شمار ہوں گے۔ ایک حکومت کے تابعین دوسرے حکومت کے مخالفین اور مخالفین کو کمزور کرنے اور انہیں قابو میں رکھنے کی ایک تجویز ان کے ذہن میں یہ بھی تھی کہ انہیں آپس میں الجھائے رکھنا چاہیئے۔ جماعت احمدیہ کو اس کے عقائد، اس کے اتحاد، اس کے نظام اور اس کی عالمی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہیں جلد ایک موقعہ جماعت کی "تادیب" کا میسر آگیا۔ جماعت احرار نے جس کا تمام ریکارڈ ہنگامے اور شورش پیدا کرنے کا تھا اور جو ہمیشہ جماعت احمدیہ کے خلاف عوام کو اشتعال دلانے کے مواقع کی تلاش میں رہتی تھی قادیان میں ایک تبلیغی کانفرنس کے انعقاد کی اجازت حکومت سے چاہی۔ جماعت کی

قادیان میں احرار کی تبلیغی کانفرنس | طرف سے حکومت پر واضح کیا گیا کہ اس کانفرنس کی غرض سوائے فساد کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ قادیان جماعت احمدیہ کا مرکز ہے۔ قادیان کی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ احمدی ہے باقی $\frac{1}{10}$ حصے میں سے ایک بڑی کثرت غیر مسلم ہے۔ غیر احمدی عنصر نہایت قلیل ہے۔ احمدی اور غیر مسلم تو کانفرنس میں شامل نہیں ہوں گے۔ غیر احمدی عنصر احرار کی تبلیغ کا محتاج نہیں نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں احراری تبلیغ جماعت احمدیہ کے خلاف اشتعال انگیز تقریروں کا سلسلہ بن کر رہ جائے گی۔ لیکن حکومت نے ان عذرات کی طرف کوئی التفات نہ کیا اور کانفرنس کی اجازت دیدی۔ جماعت کو سابقہ تجربے کی بنا پر علم تھا کہ احراری مقررین جماعت کے خلاف انتہائی درجے کا اشتعال پیدا کرنے کی سعی کریں گے جس سے امن کا قیام خطرے میں پڑ جائے گا۔

قادیان کی احمدی آبادی ایک وسیع رقبے میں بکھری ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے قیام امن کا کوئی انتظام نہ تھا اور نہ عام حالات میں کسی خاص انتظام کی ضرورت تھی۔ حالات پیش آمدہ کے مدنظر چوہدری فتح محمد سیال صاحب ناظر امور عامہ نے اردگرد کی جماعتوں کے نام چٹھیاں لکھیں کہ وہ ایک مقررہ تعداد ایسے افراد جماعت کی قادیان بھیج دیں جو کانفرنس کے ایام میں حفظ امن کے سلسلے میں خدمت بجا لائیں۔ اس طور پر پہلے بھی جب کبھی حفظ امن کے متعلق خدشہ پیدا ہوتا رہا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور بفضل اللہ کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس موقعہ پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے ناظر امور عامہ صاحب کو ہدایت دی کہ باہر سے کسی کو نہ بلایا جائے۔ ناظر امور عامہ نے کہا اگر حکومت حفظ امن کی ذمہ داری خود لے لے اور اس کا خاطر خواہ انتظام کر دے تو ہم ممنون ہوں گے اور ہمیں کسی خاص انتظام کی ضرورت نہ رہے گی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا حکومت کو حفظ امن کے متعلق کوئی خدشہ نہیں اور حکومت کسی خاص انتظام کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ ناظر امور عامہ نے کہا۔ چونکہ ہمیں اس بارے میں خدشہ ہے اسلئے ہمیں از راہ احتیاط باہر سے پہرہ وغیرہ کیلئے آدمی منگوانے کی ضرورت ہے۔ جب ڈپٹی کمشنر صاحب کی طرف سے یہ رپورٹ حکومت کو پہنچی تو حکومت کی طرف سے حضرت امام جماعت احمدیہ کے نام کریمنل لاء امینڈمنٹ ایکٹ کے ماتحت نوٹس جاری کیا گیا کہ وہ باہر سے افراد جماعت کا کانفرنس کے دنوں میں قادیان آنا بند کر دیں اور اگر کوئی فرد جماعت ان ایام میں باہر سے قادیان آئے تو اس کے قیام و طعام کی کوئی سہولت بہم نہ پہنچائی جائے۔ یہ نوٹس نہ صرف فرعونیت کا مظہر تھا بلکہ بوجوہات ذیل ناواجب بھی تھا۔ (۱) قادیان میں جو اکناف عالم کی احمدیہ جماعتوں (چھوٹی ہوں یا بڑی) کا مرکز تھا مجلس احرار کو جو مسلمہ طور پر جماعت احمدیہ کی دشمن تھی اور جس کی طرف سے بارہا اعلان ہو چکا تھا کہ وہ تحریک احمدیت کو کچل کر رکھ دیگی ایک تبلیغی کانفرنس کی اجازت دیدی گئی۔

(۲) اس کانفرنس میں شمولیت کی غرض سے (خواہ آنے والے کا حقیقی مقصد کیا ہی مفسدانہ کیوں نہ ہو) ہر شخص قادیان آنے کا مجاز تھا کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔

(۳) جس جماعت کا مرکز قادیان تھا اس کے افراد کو کانفرنس کے ایام میں قادیان آنے کی اجازت نہیں تھی خواہ ان کے دل کسقدر مضطرب اور بے چین ہوں کہ معلوم نہیں احرار کے کیا منصوبے ہیں اور قادیان میں کیا ہوتا ہے۔

(۴) نوٹس ناظر امور عامہ صاحب کے نام جاری نہ کیا گیا جن کی طرف سے جماعتوں کے نام خطوط بھیجے گئے تھے بلکہ حضرت امام جماعت احمدیہ کے نام بھیجا گیا جن کا براہ راست ان کے بھیجے جانے میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ اس نوٹس کی غرض حضرت امام جماعت احمدیہ کو گرفت میں لانا تھی۔

مجلس احرار کی یہ نام نہاد "تبلیغی کانفرنس" قادیان میں منعقد ہوئی۔ جماعت احمدیہ کا تو کوئی فرد کانفرنس کے نزدیک بھی نہ گیا۔ معلوم نہیں تبلیغ کا تختہ مشق کسے بنایا گیا۔ گورنر نے بعد میں خود مجھ سے کہا کہ کانفرنس میں

صرف جماعت احمدیہ کو گالیاں دی گئیں۔ جماعت کے خلاف گند اچھالا گیا اور اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی

امام جماعت احمدیہ کی اپنے خطبات جمعہ میں حکومت پنجاب کے احکام متذکرہ بالا پر کڑی تنقید

کانفرنس کے انعقاد کے بعد حضرت امام جماعت احمدیہ نے اپنے خطباتِ جمعہ میں حکومت کے اس ناروا طرز عمل پر تنقید شروع کی ہر جمعہ کے دن سی آئی ڈی پولیس کے دو افسر گورداسپور سے موٹر سائیکل پر خطبہ جمعہ کے نوٹ لینے کیلئے قادیان آتے حضور رضی اللہ عنہ کا ارشاد تھا کہ انہیں حضور رضی اللہ عنہ کے قریب آرام سے بیٹھنے کی جگہ دی جائے۔ تاکہ پوری طرح خطبہ سن سکیں اور اطمینان سے نوٹ لے سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ پورا خطبہ نہ سن سکیں یا کوئی فقرہ ادھورا سننے سے غلط فہمی ہو اور اپنے فرائض کو پوری طرح سرانجام دینے سے قاصر رہیں۔ خطبہ کے ختم ہونے پر یہ افسر واپس گورداسپور جاتے اپنی رپورٹ تیار کر کے مسٹر سنگیشس ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں پیش کرتے۔ رپورٹ کا ترجمہ انگریزی میں ہو کر راتوں رات لاہور گورنمنٹ ہاؤس پہنچایا جاتا۔ صبح ہی صبح گورنر اسے ملاحظہ فرماتے۔ ہر ہفتے کے دن صبح کو گورنر صاحب حضرت امام جماعت احمدیہ کے پہلے دن کے خطبہ جمعہ کا انگریزی ترجمہ پڑھ لیتے۔ پڑھتے ہوئے کڑھتے تو ضرور ہوں گے۔ کیونکہ حضور رضی اللہ عنہ ہمیشہ بات وضاحت سے فرمانے کے عادی تھے۔ اور ان خطبات میں حضور رضی اللہ عنہ حکومت کے طرز عمل پر کڑی تنقید فرما رہے تھے۔ لیکن گورنر کو کہیں بھی ہاتھ ڈالنے کی گنجائش نظر نہ آتی۔ بعد میں گورداسپور کے یورپین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جناب شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ لاہور (سابق جج ہائی کورٹ لاہور) سے کہا جب میں خطبہ جمعہ کا ترجمہ پڑھتا تھا تو کسی مقام پر میں سمجھتا کہ اب یہ پھنسے لیکن اگلے ہی فقرے میں ایسی وضاحت ہو جاتی کہ کوئی بات قابل گرفت نہ رہتی۔

گورنر پنجاب کی خواہش پر ان سے میری ملاقات

یہ صورتِ حالات تھی جب ۱۹۳۴ء میں مَیں لندن سے واپس لاہور پہنچا۔ ریل کے لاہور پہنچنے کا وقت شام کا تھا۔ دوسرے دن صبح میں حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمتِ اقدس میں قادیان حاضر ہوا اور جملہ حالات سے آگاہی حاصل کی۔ اسی شام لاہور واپس آیا۔ سید انعام اللہ شاہ صاحب نے دریافت کیا کیا تم گورنر سے ملو گے؟ میں نے کہا نہیں! وہ حیران ہوئے اور کہا کیا ملنا مناسب نہ ہوگا؟ میں نے کہا میرے خیال میں مناسب نہیں ہوگا۔ اگر میں گورنر صاحب سے ملوں تو وہ فرمائیں گے کہو کیا کہنا ہے۔ اور مجھے ان سے کچھ کہنا نہیں۔ اسلئے میرے انہیں ملنے سے کیا حاصل؟ ہاں اگر وہ مجھے بلائیں تو اور بات ہے۔ میں حاضر ہونے پر کہہ سکتا ہوں میں حاضر ہوں فرمائیے کیا ارشاد ہے؟۔ دوسری صبح سردار سکندر حیات خاں صاحب نے ٹیلیفون پر فرمایا گورنر صاحب چاہتے ہیں تم ان سے آج دس بجے قبل دوپہر مل لو۔ اور اگر یہ وقت مناسب نہ ہو تو چار بجے بعد دوپہر مل لو۔ میں نے کہا میں دس بجے ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میں حاضر ہوا گورنر صاحب نے میرے تقرر پر مبارکباد دی۔

ظفراللہ خان ۔ آپ کا مبارکبادی کا تار مجھے مل گیا تھا اور میں نے جواب دیدیا تھا۔ آپ کو مل گیا ہوگا۔

گورنر ۔ ہاں مل گیا تھا۔ شکریہ مجھ سے جو مسلمان ملتے رہے ہیں ان سے کہتا رہا ہوں کہ آپ کے تقرر پر اعتراض کرنا بڑی کوتاہ اندیشی ہے۔

ظفراللہ خان ۔ شکریہ ! لیکن آپ کے تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ حکومت نے جسے مناسب سمجھا انتخاب کر لیا۔ قصہ ختم ہوا ۔

گورنر ۔ آیئے آرام کرسیوں پر بیٹھ کر فراغت سے بات چیت کریں۔

آرام کرسیاں ساتھ ساتھ بچھی تھیں۔ میں سامنے دیوار کی طرف ٹکٹکی لگا کر بیٹھا رہا اور گورنر صاحب اپنے نقطۂ نگاہ سے اس قضیئے کی حکایت سناتے رہے۔ قریباً ایک گھنٹہ اس میں صرف ہوا۔ ان کی بات ختم ہو جانے پر بھی میں خاموش ہی بیٹھا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ آخر صرف یہ قصہ سنانے کیلئے تو انہوں نے مجھے نہیں بلایا۔ اسلئے میں انتظار میں تھا کہ آخر انہیں مجھ سے کیا کہنا ہے۔ میرے خاموش رہنے اور کچھ بھی نہ کہنے پر انہوں نے پھر وہی قصہ شروع کر دیا لیکن اکی بار پہلے کی نسبت مختصر کیا۔ آخر میں کہا میں سمجھتا ہوں مرزا صاحب کو ایک حد تک شکوے کا حق ہے احرار نے حکومت کی اجازت کا بہت بے جا فائدہ اٹھایا۔ اگر مجھے پہلے سے اندازہ ہوتا کہ وہ اس موقعہ کو محض دشنام طرازی اور اشتعال انگیزی کیلئے استعمال کرینگے تو انہیں کانفرنس کی اجازت ہرگز نہ ملتی۔ میں نے کہا ان کے پہلے ریکارڈ سے تو حکومت کو یہی توقع ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن اجازت دینے کے بعد یہ کیسے ہوا کہ احمدیوں کو تو اپنے مرکز میں آنے سے روک دیا جائے اور دوسری طرف سے کسی فساد کھڑا کرنیوالے کو بھی کوئی روک نہ ہو۔ اتنا کہہ کر میں پھر خاموش ان کا عذر سنتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ انکا کچھ منشاء معلوم ہو کہ مجھے انہوں نے کس غرض کیلئے طلب فرمایا ہے۔ آخر انہوں نے کہا مرزا صاحب نے اپنے رنج اور شکوے کا کافی اظہار کر لیا ہے میں سمجھتا ہوں اب ان کے خطبات کا یہ سلسلہ بند ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا میں اس کے متعلق کیا کر سکتا ہوں؟ فرمایا میرا خیال ہے اگر تم ان سے کوئی بات چیت کرو اور آپس کی غلط فہمی رفع ہو جائے تو یہ ایک مستحسن اقدام ہوگا۔ میں نے عرض کیا مجھے دو باتوں کے متعلق حیرت ہے اوّل یہ کہ اگر نوٹس جاری کرنا لازم ہی ہو گیا تھا تو ناظر امور عامہ کے نام جاری ہونا چاہیئے تھا۔ جنہوں نے احمدیہ جماعتوں کو آدمی بھیجنے کے لئے خطوط لکھے تھے۔ اس پر فرمایا ہم امام جماعت احمدیہ کے سوائے جماعت کے اور کسی کارکن کو تسلیم نہیں کرتے۔ (میں نے سمجھ لیا کہ یہ "حکومت کے اندر حکومت" والی رمز ہے) میں نے عرض کیا اچھی بات آپ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اس نوٹس میں کس حد تک معقولیت تھی کہ باقی تو ہر شخص کو کانفرنس کے دوران میں قادیان جانے کی اجازت ہو۔ اور صرف جماعت احمدیہ کے افراد کو اجازت نہ ہو کہ وہ اپنے مرکز میں جا سکیں۔ یہ دونوں پہلو حضرت امام جماعت احمدیہ اور جماعت احمدیہ کی توہین کے ہیں اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ طریق کیوں اختیار کیا گیا۔ گورنر صاحب نے فرمایا چوہدری صاحب صرف آپکی ذکاوت حس ہے۔ میں نے کہا بیشک ہے۔ جہاں انسان کی جان سے بڑھ کر محبوب ہستیوں اور اقدار کے احترام کا سوال ہو ہر غیرت مند

انسان ذکی الحس ہوتا ہے۔ اور جن اشخاص کو ایسے جذبات سے شناسائی ہی نہ ہو وہ ایسی ذکاوتِ حس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

ایک دن چھوڑ کر تیسرے دن گورنر صاحب نے چار بجے بعد دوپہر مجھے پھر یاد فرمایا اور کہا آپ نے کچھ سوچا کہ موجودہ الجھن کو کس طور سلجھایا جا سکتا ہے؟ میں نے کہا یہ الجھن آپ کی پیدا کردہ ہے اور آپ ہی اسے سلجھا سکتے ہیں۔ فرمایا آپ بھی مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا میں کس حیثیت میں مدد کر سکتا ہوں۔ آپ سوائے امام جماعت احمدیہ کے کسی اور کی کوئی حیثیت جماعت میں تسلیم نہیں کرتے اور حضرت امام جماعت احمدیہ نے مجھے اپنی نمائندگی کا فخر نہیں بخشا۔ گورنر صاحب نے فرمایا آپ کو جماعت اور حکومت کے درمیان تعلقات کے استوار رہنے میں تو دلچسپی ضرور ہے۔ میں نے کہا یقیناً ہے اور اگر اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو کہ میں حضرت امام جماعت احمدیہ کے نمائندے کے طور پر دلچسپی لے رہا ہوں تو میں اپنی سی کوشش کرنے کیلئے حاضر ہوں۔ اس سے انہیں کچھ اطمینان ہوا کہ میں ان کے اور حضرت امام جماعت احمدیہ کے درمیان واسطہ بن سکتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں تین چار بار قادیان حاضر ہوا۔ اب جو گورنر صاحب کو بالواسطہ ہی سہی حضرت خلیفۃ المسیح کے ساتھ تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا تو انہیں بار بار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حضور کا نقطۂ نظر معقول ہے۔ مثلاً پہلی بار خاکسار کے حاضر ہونے پر حضور نے فرمایا کہ یہ جو گورنر صاحب چاہتے ہیں کہ میرے خطبات میں حکومت کی شکایت کا سلسلہ بند ہو جائے تو میں جو بار بار حکومت کے موقف کی غلطی واضح کر چکا ہوں اگر یکلخت خاموش ہو جاؤں تو اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ میرے اپنے موقف کی غلطی مجھ پر واضح ہو گئی ہے۔ یا حکومت نے مجھے کوئی دھمکی دی ہے جس سے ڈر کر میں خاموش ہو گیا ہوں۔ اگر پہلی بات ہو یعنی حکومت کی طرف سے میرے موقف کی غلطی مجھ پر واضح کر دی جائے تو میں آئندہ کے لئے نہ صرف اس موضوع پر خاموش ہو جاؤں گا بلکہ اعلان بھی کر دوں گا کہ میرا موقف غلط تھا اور میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے اس میں کوئی باک نہ ہو گا۔ چونکہ دھمکی سے میں خاموش نہیں ہو سکتا اس لئے اگر میں ایسا سمجھے جانے کا موقعہ مہیا کر دوں تو میں اپنے ہاتھوں اپنی توہین کرنے والا ہوں گا۔ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ اگر حکومت میرے موقف کو صحیح سمجھ کر اس کی صحت کو تسلیم کر لے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکومت کو جو غلط فہمی ہو گئی تھی وہ رفع ہو گئی ہے اور اب اس معاملے کو طول دینا بے معنی ہے۔ میں حکومت کے وقار کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا لیکن مجھے جماعت کے وقار کی بھی تو حفاظت کرنی ہے۔ میں نے یہ سب باتیں گورنر صاحب کے گوش گذار کر دیں۔ گورنر صاحب نے فرمایا اچھا چیف سکریٹری مرزا صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھ دیگا۔ خط کا مضمون طے ہوا۔ گورنر صاحب نے کہا وہ خط شائع نہ کیا جائے۔ حضور نے فرمایا مجھے خط شائع کرنے کا کوئی شوق نہیں بلکہ میں تو یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ مجھے کوئی خط لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ تو مجھے کہنا ہو گا کہ حکومت نے میرا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا ہے اس لئے اب اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آخر گورنر صاحب نے کہا چیف سیکریٹری کی طرف سے خط لکھا جائیگا تو یہ بات چھپی تو رہے گی نہیں۔

احرار کونسل میں سوال کرکے بھی معلوم کرسکتے ہیں اسلئے انہیں خط کا مضمون ظاہر نہ کئے جانے پر اصرار نہیں۔

یہ قضیہ جو مسٹر ایمرسن گورنر پنجاب نے کھڑا کردیا تھا اس طرح وقتی طور پر فرو ہوگیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گورنر کے دل سے کدورت کی میل دھوئی نہ گئی کیونکہ احرار کی طرف سے جماعت کی ایذا رسانی کا سلسلہ جاری رہا ان کے حوصلے یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے موسم گرما میں قادیان میں رہنے والے ایک غیر احمدی شرارت پسند نوجوان نے صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحبؓ پر جبکہ وہ سائیکل پر سوار شہر سے دارالعلوم کی طرف تشریف لیجارہے تھے اچانک لاٹھی سے حملہ کیا جس سے ان کے کندھے پر ضرب آئی۔ صاحبزادہ صاحب اپنی خوبیوں کی وجہ سے جماعت احمدیہ کی ایک نہایت ہی محبوب شخصیت تھے اور اس حرکت کی غرض صریحاً یہ تھی کہ جماعت کے افراد کو اشتعال دلایا جائے اور اس طرح قادیان میں ہنگامہ کھڑا کرکے جماعت کے خلاف کاروائی کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ اگرچہ یہ واقعہ افراد جماعت کیلئے رنج واندوہ کا موجب ہوا لیکن انہوں نے اپنی روایتی امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے سے احتراز کرتے ہوئے اس سازش کو ناکام بنادیا۔

گورنر پنجاب اور امام جماعت احمدیہ کی ملاقاتیں

کچھ عرصہ بعد حضرت خلیفۃ المسیحؓ کلو کے علاقے میں منالی کے مقام پر تشریف رکھتے تھے کہ گورنر صاحب شملہ سے سڑک کے راستے لاہور جاتے ہوئے چند دن کے لئے منالی ٹھہرے جب انہیں معلوم ہوا کہ امام جماعت احمدیہ منالی میں تشریف فرما ہیں تو انہوں نے حضورؓ کو سہ پہر کے ناشتے کی دعوت دی جسے حضورؓ نے قبول فرمایا اور اس طرح باہم تبادلہ خیالات کا موقعہ پیدا ہوگیا۔ گورنر نے کہا آپس میں بعض امور کے متعلق غلط فہمی رہی ہے۔ میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر چاہتا ہوں کہ ہم ان امور پر بالمشافہ تبادلہ خیالات کرلیں۔ بہتر ہوا گر پہلے آپ اپنا نقطۂ نگاہ بیان فرمادیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح ابھی اپنی بات ختم نہ کرپائے تھے کہ شام ہوگئی۔ گورنر نے کہا آپ کو جب لاہور آنے کا اتفاق ہو تو اپنے سیکرٹری سے فرمادیں وہ میرے سیکرٹری کے ساتھ ٹیلیفون پر ملاقات کا وقت طے کرلیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد دوسری ملاقات لاہور میں ہوئی۔ اور بہت حد تک دونوں اصحاب کو ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی ہوگئی

میرے وطن مالوف ڈسکہ میں احرار کی مخالفت اور پولیس کا میرے بھائی اور دیگر احمدیان کے خلاف جھوٹا مقدمہ

لارڈ ولنگڈن کی وائسرائیلٹی کے باقی ماندہ عرصہ میں کوئی مزید ایسا واقعہ مخالفین جماعت احمدیہ کی طرف سے نہ ہوا جو ذاتی طور پر میرے لئے پریشانی کا موجب ہوتا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں ان کے جانے کے بعد ایک ناگوار واقعہ رونما ہوا۔ میرے وطن مالوف ڈسکہ میں احرار نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ میرے بھائیوں میں سے صرف چوہدری شکراللہ خاں صاحب ڈسکے میں موجود تھے کیونکہ ان کی مستقل رہائش وہیں تھی۔ ان کے علاوہ گاؤں میں دس بالغ مرد جماعت احمدیہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے۔ ان میں سے کوئی احرار کے جلسے میں شامل ہوا نہ جلسہ گاہ کے قریب ہی گیا۔ مغرب کی نماز کے وقت

ایک مفسد گروہ احمدیہ مسجد کے دروازے پر آکر جمع ہو گیا اور نماز ختم ہونے پر جب نمازی مسجد سے نکلے تو ان پر حملہ کر دیا۔ میرے بھائی کو سر پر چوٹیں آئیں جن سے کچھ خون بھی نکلا وہ دوڑ کر اپنے زنانہ مکان میں داخل ہو گئے اور کواڑ اندر سے بند کر لئے مفسدوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا اور دروازہ توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ دروازہ بہت مضبوط تھا ان کی سعی کارگر نہ ہو سکی۔ یہ صورت حالات نصف شب تک رہی۔ اسی اثناء میں عزیز شکر اللہ خاں نے پولیس افسر کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں صورت حالات بیان کی اور مکان کے عقب سے ایک ہمدرد پڑوسی کے ہاتھ تھانے بھجوا دیا۔ پولیس افسر نے بے اعتنائی سے رقعہ پھینک دیا اور کہا "ہونے دو جو ہوتا ہے"۔ لیکن ایسے واقعہ پر پردہ تو نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ پولیس والوں نے تفتیش شروع کی۔ ان کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ جنبہ داری سے کام لے رہے ہیں۔ میں نے سر ڈونلڈ بائیڈ رکن عاملہ پنجاب کو لکھا کہ ضلع سیالکوٹ کے سپرنڈنٹ پولیس کے سابقہ رویے سے ظاہر ہے کہ انہیں جماعت احمدیہ کے ساتھ اور خصوصاً میرے خاندان کے ساتھ عناد ہے اور اس واقعہ کے دوران میں اور اس کے بعد لوکل پولیس افسر کا رویہ بھی جنبہ داری کا رہا ہے۔ ان حالات میں مناسب ہوگا کہ اس واقعہ کی تفتیش کے دوران میں سپرنڈنٹ پولیس یا چھٹی پر چلے جائیں یا ان کا تبادلہ کر دیا جائے تاکہ یہ اطمینان ہو سکے کہ تفتیش غیر جانبدارانہ طریق سے ہوگی۔

اس خط کے لکھنے کے چند دن بعد وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے مجھ سے دریافت کیا کیا کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس کے متعلق تم نے سر ڈونلڈ بائیڈ کو خط لکھا ہو؟ میں نے مختصراً واقعہ بیان کیا اور کہا ان حالات میں میں نے اس مضمون کا خط سر ڈونلڈ کو لکھا ہے۔ وائسرائے نے کہا آج گورنر پنجاب تمہارا وہ خط لیکر میرے پاس آیا تھا اور کہتا تھا کہ اس خط میں اس کے پولیس افسروں پر ناواجب الزامات عاید کئے گئے ہیں۔ اور اب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان الزامات کی اصلیت ظاہر کرنے کے لئے پبلک تحقیقات کا انتظام کرے۔ میں نے کہا مجھے یہ سنکر بہت اطمینان ہوا ہے گورنر کو جماعت احمدیہ کے متعلق شبہ ہے کہ یہ ایک سرکش جماعت ہے جس سے حکومت کو خطرہ ہے۔ جماعت احمدیہ کو شکایت ہے کہ گورنر اور حکومت کے بعض افسران کا رویہ جماعت کے متعلق غیر ہمدردانہ اور غیر منصفانہ ہے پبلک تحقیقات کے نتیجے میں حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اگر ہماری شکایات بے بنیاد ثابت ہوئیں تو ہمارے لئے اطمینان کا موجب ہوگا۔ اگر گورنر کے شبہ کی تائید ہوئی تو ہم اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں گے۔ آپ کے لئے بھی کوئی دقت نہیں ہوگی۔ جونہی گورنر تحقیقات کے فیصلے کا اعلان کریں گے میں کونسل سے مستعفی ہو کر جماعت احمدیہ کی طرف سے تحقیقاتی کمیشن کے روبرو پیروی کروں گا۔ وائسرائے نے کہا میں تمہاری مشکل کا اندازہ کر سکتا ہوں اور مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ خود میرے خاندان کو سکاٹ لینڈ میں ایک لمبے عرصہ تک اپنے مذہبی عقائد کی خاطر سختی برداشت کرنی پڑی تھی اور مخالف حالات کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ میں نے گورنر سے کہہ دیا ہے کہ بہ حیثیت گورنر جنرل میں ایسی تحقیقات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم سے بھی کہتا ہوں کہ تم مخالف حالات کو صبر سے برداشت کرتے جاؤ۔ میں جہاں تک ممکن ہوگا تمہاری ہمدردانہ مدد اور تائید کروں گا۔ جبتک ایسے حالات

پیدا نہ ہو جائیں کہ تم بغیر اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے خدمت عامہ کو جاری نہ رکھ سکو استعفے کا خیال مت کرو۔ میں نے گورنر سے کہہ دیا ہے کہ جہاں تک واقعات کا سوال ہے میں ہر اس بات کو صحیح سمجھوں گا جو تم اپنے ذاتی علم سے بیان کرو۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ تم بھی کسی پبلک تحقیقات پر زور نہیں دو گے۔ میں نے کہا میں آپ کی ہمدردی کا ممنون ہوں۔ پبلک تحقیقات کا رستہ اگر بند ہے تو ایک اور دروازہ کھلا ہے ہم اسے کھٹکھٹاتے چلے جائیں گے اور اللہ العالمین سے داد خواہ رہیں گے۔

پولیس کی تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بھائی اور ڈسکہ کلاں کے جملہ بالغ احمدی افراد کا اس الزام کے ماتحت چالان کر دیا گیا کہ انہوں نے بلوہ کر کے احرار پر حملہ کیا اور انہیں ضربات پہنچائیں۔ اس بلوے اور حملے کا مقام اور وقت فرضی تجویز کئے گئے اور اصل واقعہ کا پولیس کی تفتیش اور رپورٹ میں ذکر تک نہ آیا۔ چالان ایک غیر مسلم مجسٹریٹ کے سپرد ہوا جس نے مکمل تحقیقات کے بعد قرار دیا کہ پولیس کی پیش کردہ کہانی فرضی اور بے بنیاد ہے۔ پولیس نے فرضی ابتدائی رپورٹ درج کی اور جعلی ضمنیات تیار کیں جن پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ملزمان کو بغیر فرد جرم عاید کرنے کے الزام سے بری قرار دیا گیا فالحمد للہ۔

مجسٹریٹ کے اس حکم کے بعد انسپکٹر جنرل پولیس نے ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو محکمانہ تحقیقات کا حکم دیا کہ مجسٹریٹ نے جو الزام پولیس پر عاید کئے ہیں ان کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں۔ اب گویا ایک طور سے بیچارے مجسٹریٹ صاحب زیر الزام آ گئے۔ اس تحقیقات میں مجسٹریٹ نے اپنے پہلے حکم سے بڑھ کر پولیس کے رویہ پر تنقید کی اور ان کی کوتاہیوں اور فرضی اور جعلی کارروائیوں کا پردہ فاش کیا اس تحقیقات کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ مقامی پولیس افسر کا ڈسکہ سے تبادلہ کر دیا گیا۔ وائسرائے نے مجھ سے کہا تمہارا موقف کامل طور پر درست ثابت ہوا۔

۱۹۳۶ء میں سر ہربرٹ کے دوبارہ گورنر پنجاب مقرر ہونے کا اعلان ہوا۔ لیکن انہیں دوسری مرتبہ اس کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اپنی پہلی میعاد کے اختتام پر رخصت پر انگلستان گئے۔ ان کی رخصت کے دوران میں مئی ۱۹۳۶ء میں مجھے بھی بعض سرکاری امور اور فرائض کی سرانجام دہی کے لئے انگلستان جانا پڑا۔ وہاں لارڈ ولنگڈن نے مجھے بتایا کہ سر ہربرٹ دوبارہ پنجاب کی گورنری کا چارج لینے کے لئے واپس نہیں جا سکیں گے۔ معلوم ہوا وہ واپس جانے کی تیاری میں تھے کہ ایک دن سیر سے واپس آنے پر انہیں قضائے حاجت کے ساتھ خون آیا۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ڈاکٹر وجہ تو تشخیص نہ کر سکے لیکن چونکہ تکلیف جاری تھی انہوں نے مشورہ دیا کہ ان کا ہندوستان واپس جانا خطرہ سے خالی نہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے وزیر ہند کو اطلاع دے دی کہ وہ گورنری پر واپس نہیں جا سکتے۔ اس کے کچھ دن بعد وہ تکلیف بالکل رفع ہو گئی۔ لیکن اس وقت تک کسی اور کا تقرر ہو چکا تھا۔

امام جماعت احمدیہ کی طرف سے تحریک جدید کا اجراء | ۱۹۳۴ء کے قضیئے کا ایک نہایت نیک اور ثمر آور نتیجہ تحریک جدید کا اجرائے تھا، جو نہ صرف بفضل اللہ جماعت کی تنظیم کی مضبوطی کا باعث ہوا بلکہ اس کے نتیجے میں بیرونِ ملک میں تبشیر اسلام کے ایک نہایت شاندار باب کا آغاز ہوا الحمد للہ۔ مولانا روم نے کیا ہی خوب اور کیا ہی سچ فرمایا ہے :-

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ اند
زیر آں گنج کرم بنہادہ اند

سر جوزف بھور ممبر ریلوے و تجارت کی طرف سے ناکام کوشش کہ میرے چارج لینے سے پہلے ریلوے کے محکمہ کا علیحدہ قلمدان بن جائے اور مجھے صرف محکمہ تجارت کا چارج ملے | نومبر ۱۹۳۴ء میں میرے انگلستان سے واپس آنے کے کچھ دن بعد وائسرائے نے مجھے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا اسمبلی میں یورپین اراکین کچھ عرصہ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ مواصلات کا ایک الگ قلمدان ہونا چاہئیے جس میں ڈاک تار ٹیلیفون ریلوے سب محکمے شامل ہوں پچھلے ستمبر میں جب میں چھٹی پر تھا حکومت کی طرف سے اسمبلی میں وعدہ کیا گیا کہ ان کے مطالبے پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ اب بھور[1]، سر کار[2]، گرگ[3] اور نوئیس[4] کا خیال ہے کہ بھور کی میعاد ختم ہونے پر یہ تبدیلی عمل میں لائی جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا قلمدان تجارت کے محکمے تک محدود رہ جائے گا۔ تجویز یہ ہے کہ مواصلات کا محکمہ نوئیس کے سپرد کیا جائے۔ امید ہے تمہیں اس تبدیلی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کیا مجھے اس تبدیلی پر سخت اعتراض ہے اور میں اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ہندو اخبارات نے شور مچا رکھا ہے کہ حکومت کا سب سے بڑا قلمدان کونسل کے سب سے کم عمر رکن کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ میری کم عمری تو ایک بہانہ ہے اصل منشا یہ ہے کہ یہ قلمدان مسلمان رکن کے سپرد نہ ہو اور یہ معاملہ ایک ہندو مسلم سوال بن گیا ہے جو میرے لئے پریشانی کا موجب ہے۔ آپ جانتے ہیں میں نے یہ قلمدان طلب نہیں کیا تھا۔ وزیر ہند کی اور آپ کی خواہش تھی کہ میں یہ قلمدان سنبھالوں اس کا اعلان ہوتے ہی ہندوؤں کی طرف سے اس تجویز کی مخالفت شروع ہو گئی۔ ادھر مسلمانوں کا ایک طبقہ میرے تقرر ہی کا مخالف تھا۔ اب اگر میں اس تبدیلی پر رضامند ہو جاؤں تو وہ طبقہ کہے گا اسے خدمت کی تو کوئی خواہش نہیں اسے تو فقط کونسل میں لئے جانے کی خواہش ہے خواہ اسے کوئی بھی محکمہ دیا جائے۔ اور اگر کوئی کچھ بھی نہ کہے تو بھی میں خود اس میں اپنی خفت محسوس کرتا ہوں۔ وائسرائے نے فرمایا مجھے اندیشہ تھا کہ تمہارا ردعمل یہی ہوگا لیکن تم بھور سر کار اور نوئیس سے مل لو اور انکی بات سن لو

۱۔ سر جوزف بھور ممبر تجارت و ریلوے ۲۔ سر نرپیندرا ناتھ سرکار ممبر قانون۔ ۳۔ سر جیمز گرگ ممبر مالیات ۴۔ سر فرینک نوئیس ممبر صنعت ڈاک و تار وغیرہ

بعد میں گرگ سے بھی مل لینا۔ میں نے کہا مجھے اس میں کوئی تامل نہیں

وائسرائے کی خواہش پر سر جوزف بھور، سر فرینک نوئیس اور سر این این سرکار اراکین کونسل سے ملاقات

وائسرائے نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا بھور وغیرہ سے ظفراللہ کی ملاقات کا انتظام کر دو۔ سر جوزف بھور نے کہا میں سرکار اور نوئیس کو اپنے ہاں بلا لیتا ہوں ظفراللہ سے کہو وہ میرے دفتر میں آجائے۔ میں وہاں گیا تینوں اصحاب موجود تھے لیکن بات چیت سر جوزف بھور ہی کرتے رہے۔ اسمبلی کی کارروائی کی مجلد رپورٹوں کا ڈھیر ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ان میں نشان کے طور پر کاغذ کے سلپ رکھے ہوئے تھے۔ جو بات وائسرائے نے مختصر الفاظ میں مجھے بتائی تھی انہوں نے تفصیلاً بتائی اور ساتھ حوالے بھی پڑھ کر سنائے۔ وہ ہر دو تین منٹ کے بعد رکتے اور میری طرف دیکھتے میں خاموش بیٹھا رہا۔ آخر ان کی بات ختم ہو گئی اور میں پھر بھی ویسے ہی خاموش بیٹھا رہا۔ بھور نے میری طرف دیکھا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ آخر مجھ سے کہا وائسرائے چاہتے تھے ہم یہ معاملہ تم پر واضح کر دیں۔ میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا تو دوسری مرتبہ پھر کہا۔ وائسرائے کی خواہش تھی کہ یہ صورت وضاحت سے تمہیں بتا دی جائے۔ میں نے کہا بہت خوب آپ نے وضاحت کر دی۔ کیا وائسرائے نے کچھ اور بھی کہا تھا؟ پوچھا کیا مطلب؟ میں نے کہا آپ نے وضاحت کر دی کیا وائسرائے نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وضاحت کے بعد کیا کرنا ہے؟ کہا اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن کیا تم اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ میں نے کہا میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس قلمدان کی خود خواہش نہیں کی تھی۔ ۳؍ اکتوبر کو وزیر ہند نے یہ کہہ کر کہ وائسرائے اور وہ دونوں چاہتے ہیں کہ میں یہ قلمدان سنبھالوں مجھے اس پر راضی کیا تھا۔ اب آپ کہتے ہیں آپ اسمبلی میں اس کے متعلق کچھ وعدہ کر چکے ہیں۔ جو کچھ آپ نے اسمبلی میں کہا وہ ۳؍ اکتوبر سے پہلے کا ہے۔ باوجود آپ کے اسمبلی کے اعلان کے وزیر ہند اور وائسرائے کا مجھے یہ قلمدان پیش کرنا اور میرا اسے قبول کرنا آپ کے اعلان کو منسوخ کرنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ کا اعلان ۳؍ اکتوبر کے بعد کا بھی ہو تو میں اس کا پابند نہیں اس دن مجھے یہ قلمدان پیش کیا جا چکا تھا اگر بعد میں کوئی تبدیلی مقصود تھی تو کم از کم مجھ سے مشورہ تو ہونا چاہئے تھا۔ اس پر سر فرینک نوئیس نے کہا ظفراللہ میرا تو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں میں آئندہ گرما میں رخصت پر جانا چاہتا ہوں میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ رخصت سے واپسی پر میرا قلمدان کونسا ہو گا۔ میں نے کہا سر فرینک مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ سر جوزف نے میرا ردعمل معلوم کرنا چاہا سو میں نے بیان کر دیا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے سر جوزف بھور سے دریافت کیا کیا وائسرائے نے کوئی ہدایت دی ہے کہ متعلقہ محکمہ جات کی اہم کارروائیوں کے متعلق مجھے اطلاع دی جاتی رہے۔ فرمایا ضرور ضرور میں خود نہیں چاہتا کہ چارج لینے تک تم محکمہ کی اہم کارروائیوں سے بالکل ناواقف رہو تمہیں پوری اطلاع ملتی رہے گی۔ میں نے دریافت کیا کیا لندن میں آئندہ ہائی کمشنر کے تقرر کے متعلق کچھ فیصلہ ہوا؟ فرمایا کوئی رسمی اطلاع تو وزیر ہند کی طرف سے نہیں آئی۔ لیکن یہ واضح ہے کہ اس منصب پر میرے علاوہ کسی اور کے تقرر

کا امکان نہیں۔ قلمدان میں تبدیلی کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ میں نے وائسرائے کی خدمت میں گذارش کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ سر جوزف بھور نے مجھے اطمینان دلایا ہے کہ وہ اہم معاملات کے متعلق کاغذات مجھے بھیجتے رہیں گے فرمایا بیشک بیشک میں نے بھور کو تاکید کر دی ہے۔ اچھا اب تم گرگ سے بھی مل لو۔ تمہیں پہلے اس سے ملنے کا کبھی اتفاق ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں جناب۔ فرمایا اس کے طرز گفتگو پر نہ جانا وہ بہت منہ پھٹ ہے۔ لیکن آدمی اچھا ہے۔

وائسرائے کی خواہش پر سر جیمز گرگ رکن کونسل سے ملاقات

میں سر جیمز گرگ کی خدمت میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا کچھ تو وائسرائے نے ہی بتا دیا تھا۔ کچھ میں ان کی شہرت پہلے سن چکا تھا۔ میں نے اسی کے مطابق گفتگو شروع کی:

ظفر اللہ خاں۔ سر جیمز! ہمیں اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ پہلا موقعہ ہے۔ آپ مجھے جانتے نہیں لیکن آپ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس کی یہ وجہ ہو کہ آپ کو بیسویں صدی میں کسی شخص کا داڑھی رکھنا پسند نہ ہو لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی اور کا دخل نہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس کے علاوہ آپ کی ناپسندیدگی کا سبب کیا ہے؟

سر جیمز گرگ۔ (ذرا حیرت سے) تم تو بڑے صاف گو معلوم ہوتے ہو۔ میں بھی صفائی سے بات کرنے کا عادی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ فضل حسین سخت فرقہ پرست ہے مجھے معلوم ہوا ہے تم اس کے گہرے دوست اور سیاسی شاگرد ہو۔ ریلیں حکومت ہند کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ریل کے محکمے کا بجٹ حکومت ہند کے سارے بجٹ سے جس میں فوج اور دفاع کے اخراجات بھی شامل ہیں زیادہ ہے۔ اس محکمے کو ایک فرقہ پرست کے سپرد کر دینے کے معنی ہیں کہ حکومت ہند کو دیوالے کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ظفر اللہ خاں۔ میں آپ کی صاف گوئی کا ممنون ہوں۔ چونکہ اب مجھے ناپسندیدگی کی وجہ معلوم ہوئی میں اس کا جواب دینے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ اس صاف گوئی کی تہ میں بہت کچھ گدلا پن ہے جس سے آپ آگاہ نہیں۔ سر فضل حسین یقیناً ہر وقت کوشاں رہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا قدم جس قدر جلد ہو سکے آگے بڑھتا جائے اور اس دور میں مسلمانوں کو بھی ان کا جائز اور مناسب حصہ ملتا رہے۔ اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو وہ ضرور فرقہ پرست ہیں۔ مجھے بیشک یہ فخر حاصل ہے کہ وہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن ان کا یہ خاصا نہیں کہ وہ دوسرے شخص کے معاملات اور اس کی ذمہ داریوں کے نبھانے میں خواہ مخواہ دخل دیں ۱۹۳۲ء میں جب میں نے ان کے رخصت پر جانے کے وقت ان کی جگہ کام شروع کیا تو مجھے پہلے ایسے کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ مناسب ہدایات دیدیں۔ جواب میں انہوں نے فرمایا تھا "میں ہر وقت تمہارے ساتھ تو کھڑا نہیں رہوں گا تم اپنی ہمت سے تیرو گے یا غرق ہو گے۔" جو شخص اپنے محکمے کے متعلق اپنی جگہ کام کرنے والے کو ایسا کہتا ہے اس کے متعلق کسی کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ کسی دوسرے

کے کام میں خواہ مخواہ دخل دیگا۔ ایک بات میں اپنے متعلق بھی کہہ دوں۔ اگر میں وائسرائے کی کونسل کا رکن ہوا تو اس منصب کی ذمہ داریوں کو بھلا یا بُرا نبھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہوگی۔ نہ فضل حسین پر نہ جیمز گرگ پر۔

سر جیمز گرگ ۔ میرے لئے یہ امر باعث اطمینان ہوگا ۔

ظفر اللہ خان ۔ شکریہ ! اب فرمایئے میری فرقہ پرستی کس طرح حکومت ہند کو دیوالیہ کرے گی ۔ ؟

سر جیمز گرگ ۔ ملازمتوں کے معاملے میں فرقہ داری برتنے سے ۔

ظفر اللہ خان ۔ بہت خوب ! آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں پر تقرر پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے نتیجے کی بناء پر ہوتا ہے ۔ وائسرائے کی کونسل کا رکن افراد کے انتخاب میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ جہاں تک فرقہ دارانہ نمائندگی کا سوال ہے حکومت ہند نے اپنی ۴ جولائی کی جاری کردہ ہدایت میں مسلم نمائندگی کی شرح ۲۵ فیصدی مقرر کردی ہے بیشک وقتاً فوقتاً مجھ پر مسلمانوں کی طرف سے زور دیا جا سکتا ہے کہ میں اس تناسب کو بڑھانے کی کوشش کروں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی اس ہدایت پر عمل کرنے کے رستے میں روکیں پیدا کی جائیں۔ لیکن جب تک حکومت اس ہدایت میں تبدیلی نہ کرے میرا فرض ہوگا کہ میں اس بات کی نگرانی کروں کہ اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا جا رہا ہے ۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا اس پر کوئی اعتراض ہے ؟

سر جیمز گرگ ۔ مجھے اتفاق ہے حکومت کی ہدایت پر عمل ہونا چاہیئے خواہ مجھے وہ ہدایت پسند ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس سے تفاوت نہ بیشی کی طرف ہو نہ کمی کی طرف ۔

ظفر اللہ خاں ۔ یہ تو رہی اعلیٰ ملازمتوں کی صورت ۔ ریلوے کے محکمے میں اس سے نچلا درجہ لوئر گزیٹڈ سروس کا ہے ۔ اس میں تقرر امتحان کے نتیجے میں ہوتا ہے جس کا اہتمام ریلوے بورڈ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ کونسل کے رکن کا اس میں دخل نہیں ۔ سب سے نچلا درجہ سبارڈینیٹ سروسز کا ہے ۔ اس میں تقرر کی ذمہ داری ہر ریلوے سسٹم کے ایجنٹ پر ہوتی ہے اور وہ اسے ہر محکمہ کے اعلےٰ افسر کے سپرد کرتا ہے ۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی تو صدائے بازگشت بھی کونسل کے رکن کے کانوں تک نہیں پہنچتی اب اور کیا باقی رہا ؟

سر جیمز گرگ ۔ ترقیات اور تبادلے ۔

ظفر اللہ خاں ۔ سر جیمز شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میرا انتخاب کونسل کی رکنیت کے لئے وزیر ہند نے وائسرائے کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد خود کیا تھا۔ میں چار سال سے متواتر ان کے ساتھ گول میز کانفرنس اور مشترکہ کمیٹی میں کام کرتا رہا ہوں۔ وائسرائے کی کونسل میں چار ماہ وائسرائے کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ اگر میں ایسے فہم اور عقل کا مالک ہوتا کہ مثلاً آسام اور بنگال ریلوے کے چیف انجنیئر کی اسامی خالی ہونے پر ریلوے بورڈ کے ساتھ اٹھ بیٹھتا کہ میرے ایک مسلمان دوست کو جو نارتھ ویسٹرن ریلوے میں فلاں دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہے اس خالی اسامی

پر مقرر کیا جائے۔ تو کیا ایسے فاطر العقل کا انتخاب وزیر ہند کرتے؟ بیشک اعلیٰ مناصب پر تقرر ریلوے بورڈ کی سفارش پر اور ایک حد تک کونسل کے رکن کی منظوری سے ہوتا ہے اور اس سے اوپر وائسرائے کی منظوری سے۔ لیکن اگر وزیر نا معقول طور پر ضد کرے تو چیف کمشنر کو حق ہے کہ وہ خود حاضر ہو کر وائسرائے کو حقیقت حال سے آگاہ کرے۔ بیشک ایک ضدی نا معقول انسان بہت سی مشکلات پیدا کر سکتا ہے لیکن ایک شخص کو ضدی اور ہٹ دھرم قرار دینے سے پہلے اس کے متعلق کچھ تجربہ ہونا چاہئے۔ یونہی بے بنیاد رائے قائم کر لینا خود غیر معقول ہے۔

سر جیمز گرگ۔ درست ہے۔ اصل حقیقت تجربے سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ میں ممنون ہوں کہ تم نے یہاں آنیکی زحمت اٹھائی اور میرے ساتھ بات کرنیکے لئے وقت نکالا۔

میں نے اس گفتگو کا خلاصہ بھی وائسرائے سے بیان کر دیا۔ وہ محظوظ ہوئے اور کہا کاش میں پردے کے پیچھے سے تم دونوں کی گفتگو سن سکتا۔ لاہور واپس آنے پر میں نے یہ ساری کیفیت مختصر الفاظ میں وزیر ہند کی خدمت میں لکھدی آخر میں لکھا میں قلمدان میں مجوزہ تبدیلی پر رضامند نہیں لیکن میں وائسرائے کیلئے اور آپ کیلئے کوئی الجھن بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میری رائے میں اس مشکل کا حل یہی ہے کہ آپ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کیلئے نیا انتخاب کر لیں کچھ دنوں لعد ان کا جواب آیا۔ تمہارا خط ملا ہے۔ میں نے وائسرائے کو خط لکھا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ ہوگا۔ مجھے وائسرائے نے پھر دہلی طلب کیا اور فرمایا:۔

"MY DEAR! SAMMY HOAR HAS SENT ME A STINKER"

(مائی ڈیر! سر سیموئل ہور نے مجھے سخت ڈانٹ کا خط لکھا ہے) اگر تمہیں قلمدان میں تبدیلی منظور نہیں تو میں اس پر زور نہیں دوں گا۔ میں نے تو بھور سے کہا تھا کہ یہ بات اچھی معلوم نہیں ہوتی کہ تمہارے وقت میں تمہارے پاس دو نوں محکمے رہے اور تمہارے جانے پر تمہاری جگہ آنیوالے سے ایک محکمہ لے لیا جائے۔ اس نے کہا میں ریلوے کا محکمہ ابھی سے چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر تو ظفر اللہ کو شکایت نہ ہوگی۔ میرے پاس صرف تجارت کا محکمہ ہوگا وہ مجھ سے اس کا چارج لے لیگا۔ میں نے اس سے کہا یہ تو چالاکی ہوگی کہ ساڑھے چار سال تک دونوں محکمے اپنے پاس رکھ کر جاتے وقت تم ایک محکمہ کسی دوسرے کے سپرد کر دو تاکہ تمہارے جانشین کے چارج میں ایک ہی محکمہ جائے۔

اس وقت تو اس طور پر یہ بات ٹل گئی۔ معلوم ہوتا ہے سر جوزف بھور کو اس سے ملال ہوا کیونکہ باوجود وائسرائے کی تاکید کے اور اپنے وعدے کے انہوں نے درمیانی پانچ مہینوں سے زائد عرصے میں مجھے ایک لفظ تک ان امور کے متعلق ادا نہ کیا جو ان کے قلمدان میں شامل تھے اور جو زیر غور یا زیر بحث آتے رہے اور میں نے جب چارج لیا تو میں بقول ان کے ان امور کے متعلق کورے کا کورا تھا۔

چیف جسٹس ینگ کی عدالت میں مقدمات کی پیروی

مئی ۱۹۳۵ء میں میں نے قلمدان وزارت کا چارج لیا۔ جس میں تجارت اور ریلوے کے محکمہ جات شامل تھے نومبر ۱۹۳۴ء سے وزارت کا چارج لینے کے ایک دن پہلے تک میں نے اپنی قانونی پریکٹس جاری رکھی اور عدالتی کام میں مصروف رہا۔ اس عرصے میں میں نے نیا دیوانی کام لینا بند کر دیا۔ کیونکہ نئی دیوانی اپیلوں کی سماعت میرے بقیہ عرصہ پریکٹس میں ممکن نہیں تھی۔ البتہ ایسا دیوانی کام میں کرتا رہا جو میں پہلے سے لے چکا تھا یا جس کی سماعت کا وقت قریب آنے پر مجھے اس میں وکیل مقرر کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس چھ ماہ کے عرصے میں میرے کام میں فوجداری کام کا تناسب پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ فوجداری اپیلیں اوّل اجلاس میں جس میں چیف جسٹس ینگ صاحب شمولیت فرماتے تھے سنی جاتی تھیں اور اس اجلاس میں میری متواتر کامیابی کی شہرت بہت جلد پھیل گئی تھی۔ پھر تو ایسا بھی ہونے لگا کہ میں ماڈل ٹاؤن سے اپنے دفتر میں صبح آٹھ بجے پہنچتا جو ہائی کورٹ کے عقب میں تھا اور چودھری فضل داد صاحب ایک پھانسی کی سزا کے خلاف اپیل کی طبع شدہ پیپر بک میرے سامنے رکھ دیتے کہ یہ اپیل آج کی فہرست میں پہلے دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہے ۔ میں احتجاج کرتا کہ اتنے تنگ وقت میں پوری تیاری نہیں ہو سکتی۔ وہ فرماتے ملزمان کے وارث میرے کمرے میں آبدیدہ بیٹھے ہیں اور بصد منت ملتجی ہیں کہ آپ انہیں مایوس نہ کریں۔ آپ تامل کریں گے تو وہ اس کمرے میں آکر واویلا کریں گے۔ آخر آپ مان جائیں گے۔ بہتر ہے کہ وہ وقت جو یوں صرف ہوگا تیاری میں صرف کریں۔ میں دروازہ بند کر دیتا ہوں کسی کو آنے نہ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے تیز فہم عطا فرمایا ہے۔ بہت جلد تیاری ہو جائے گی۔ وہ مدد فرمائے گا۔ بیٹھئے میں جاتا ہوں اور ان کو تسلی دیتا ہوں کہ آپ تیاری میں مصروف ہیں۔ میں بیچارگی میں ہار مان لیتا۔

میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے کیس کی پوری تیاری کرتا جس کے دوران میں میں اس بات کا پورا لحاظ رکھتا کہ کونسی دلیل، شہادت کا کونسا پہلو اور انسانی فطرت کی کونسی خامی چیف جسٹس کے مزاج پر اثر پیدا کرنے والی ہوگی۔ اس کے مطابق میں ایک مختصر نوٹ تیار کر لیتا اور اپنے ذہن میں ان کو پیش کرنے کی ترتیب طے کر لیتا بفضل اللہ یہ طریق ہر بار کامیاب ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے اندیشہ ہوتا کہ شاید آج کے کیس میں میں کامیاب نہ ہو سکوں اور میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا میں اور زیادہ التجا اور الحاح کرتا۔ خاص مشکل کیس کے متعلق والدہ صاحبہ کی خدمت میں بھی دعا کے لئے گذارش کرتا۔ عزیز اسداللہ خاں بیرسٹر ان ایام میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ اور ان کی رہائش دفتر کے اوپر کی دو منزلوں میں تھی۔ والدہ صاحبہ صبح میرے ساتھ ہی ماڈل ٹاؤن سے تشریف لے آتیں اور شام کو میرے ساتھ تشریف لے جاتیں۔ فرمایا کرتی تھیں بیٹا تمہارے موکل نہیں جانتے کہ جب وہ تمہیں وکیل کرتے ہیں تو ساتھ ہی میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی طرف سے وکیل بن جاتی ہوں۔ تم عدالت میں جاتے ہو تو میں دعاؤں میں مصروف ہو جاتی ہوں کہ یا اللہ تو اپنے فضل و رحم

سے میرے بیٹے کو سرخروئی سے واپس لائیو۔ والدہ صاحبہ مقدمات میں بھی دلچسپی لیتیں۔ ایک دن شام کے کھانے کے بعد میں نے ایک کیس کا ذکر کیا جس کی سماعت دوسرے دن صبح کو ہونے والی تھی اور دعا کیلئے گذارش کی۔ یہ سنکر کہ ملزم پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام ہے میری بیوی نے کہا یہ ہوا تو ضرور پھانسی پر لٹکنا چاہیئے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا بیٹی ہمیں تو ہر ایک کے لیئے خدا سے رحم کی ہی التجا کرنی چاہیئے۔ ہمیں کیا معلوم اس نے یہ جرم کیا ہے یا نہیں اور اگر کیا بھی ہے تو اس کے پھانسی پر لٹکنے سے اس کی بیوی تو واپس آ نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ بخشنہار ہے۔ اس سے بخشش ہی کا طلبگار ہونا چاہیئے۔ دوسری شام جب میں نے ذکر کیا کہ آپ کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا۔ تو کہا اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے۔

چیف جسٹس ینگ پہلے دن سے یہ دیکھ کر کہ میں ان کے منشا کے مطابق کیس تیار کرتا اور پیش کرتا ہوں میری گذارشات توجہ سے سنتے اور ساتھ ساتھ تائیدی جملے کہہ کر میری حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے میری کسی گذارش کو کبھی رد کیا ہو۔ البتہ بعض دفعہ ایسا ضرور ہوا کہ انہوں نے میری گذارش سے بھی بڑھ کر میرے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کے کچھ لوگ بیساکھی کے میلے سے اپنے گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ رستے میں ایک حریف کے ساتھ تکرار ہو گئی ملزمان چار کس تھے۔ انہوں نے لاٹھیوں سے حریف کو زدوکوب کیا۔ اس کی تین چار پسلیاں ٹوٹ گئیں اور پیٹھ پر ایک ضرب سے اس کا ایک گردہ پھٹ گیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ چاروں ملزمان کو قتل عمد کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی میں نے اپیل میں ان کی طرف سے دو گذارشات کیں۔ اول ان میں سے دو کے متعلق شہادت سے ثابت کیا کہ جس معاملے پر تکرار ہوئی تھی اس کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ متوفی کے ساتھ الجھتے۔ پھر شہادت سے یہ بھی ثابت کیا کہ بعض گواہان کو ان دو کے ساتھ سابقہ عداوت تھی۔ ان دو کے متعلق میں نے گذارش کی کہ انہیں شک کا فائدہ ملنا چاہیئے اور انہیں بری ہو کر رہا ہونا چاہیئے۔ دوسرے میں نے متوفی کی ضربات کی بنا پر گذارش کی کہ دوسرے دو ملزمان کا جرم قتل عمد کی حد تک نہیں پہنچتا۔ پسلی کا ٹوٹنا مہلک ضرب نہیں ہوتا اور متوفی کی موت پسلی ٹوٹنے سے نہیں ہوئی۔ گردے کا پھٹنا اتفاقیہ امر ہے۔ اگر ضرب دو انچ ادھر ادھر لگتی تو ضرب خفیف قرار دی جاتی۔ اندریں حالات ان دو ملزمان کا جرم ضرب شدید قرار دیا جانا چاہیئے۔ یا زیادہ سے زیادہ جرم زیر دفعہ ۳۰۴ حصہ دوئم تعزیرات ہند اور جو دفعہ بھی عاید ہو پانچ سال قید بامشقت مناسب سزا ہونی چاہیئے۔

چیف جسٹس۔ پسلی ٹوٹنا معمولی بات ہے۔ پرنس آف ویلز کئی دفعہ گھوڑے سے گر کر ہنسلی توڑ چکے ہیں۔ اور کئی لوگ ایک گردے کے ساتھ دوڑتے پھرتے ہیں!

ایڈووکیٹ جنرل کی بحث سننے کے بعد فرمایا۔ چودھری صاحب آپ نے ہمارے لئے ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ آج شاید میری دلیل تسلیم نہیں کی جائے گی، آپ نے استغاثہ کی شہادت کو ہماری نگہ میں مشتبہ کر دیا ہے۔ اگر دو

ملزمان کے خلاف گواہوں نے جھوٹ بولا ہے۔ تو ہم دوسرے دو ملزمان کے خلاف اسی شہادت کی بنا پر جرم کیسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم چاروں کو بری کرنے پر مجبور ہیں۔ میرے فاضل رفیق کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ چاروں ملزم بری ہو کر رہا ہوئے۔

چیف جسٹس کے اجلاس میں ایک بار مجھے کچھ مشکل کا سامنا ہوا۔ ملک وال کے اسٹیشن کے چیف گڈس کلرک پر جو ہندو تھے غبن کے تین الزام عائد کئے گئے۔ مسٹر فیلیوس مجسٹریٹ درجہ اوّل گجرات کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ ملزم کے چھوٹے بھائی گجرات میں وکیل تھے۔ وہ بھی ملزم کی طرف سے پیروی کر رہے تھے اور ایک سینئر وکیل بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ مجسٹریٹ نے ملزم کو بری کر دیا۔ سرکار کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی۔ اپیل میں ایک الزام کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن دو کو قائم رکھا گیا۔ ملزم کے چھوٹے بھائی میرے پاس آئے اور کہا میں چودہ سال پہلے لاء کالج میں تمہارا شاگرد رہ چکا ہوں۔ اس تعلق کی بنا پر تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم اس مصیبت میں ہماری مدد کرو۔ میں نے عذر کیا کہ اس مقدمے میں حساب کے رجسٹروں کی پڑتال کی ضرورت ہو گی اور میں اس فن سے دور کی شناسائی بھی نہیں رکھتا۔ آپ کسی ایسے وکیل کے پاس جائیں جسے ان امور کی واقفیت ہو اور جو پوری توجہ سے رجسٹروں کی پڑتال کر سکے۔ وہ مصر ہوئے کہ میں ان کے بھائی کی طرف سے ضرور بحث کروں۔ آخر کار میں رضامند ہو گیا تا کہ ان کے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ میں ان کے ہندو ہونے کی وجہ سے یہ ذمہ داری نہیں لینا چاہتا۔ میرا تامل اس وجہ سے بھی تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ بالکل بودا تھا جس کے پڑھنے سے ذہن پر یہ اثر ہوتا تھا کہ ملزم کی بے جا رعایت کی گئی ہے اپیل کی سماعت چیف جسٹس کے اجلاس میں تھی۔ ان کے ساتھ مسٹر جسٹس رنگی لال شامل تھے۔ سرکار کی طرف سے دیوان رام لال صاحب ایڈووکیٹ جنرل پیروی کر رہے تھے۔ ایڈووکیٹ جنرل نے کوائف بیان کئے۔ رجسٹروں کے اندراجات کی طرف توجہ دلائی اور کہا جناب عالی ملزم کا جرم واضح طور پر ثابت ہے۔

چیف جسٹس۔ یہ بالکل واضح کیس ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص نے اتنی جرأت کیسے کی؟

ایڈووکیٹ جنرل۔ جناب عالی اب میں آپ کی توجہ دوسرے الزام کی طرف منعطف کراتا ہوں۔

چیف جسٹس۔ مسٹر ایڈووکیٹ دوسرے الزام کے متعلق آپ کیوں زحمت اٹھاتے ہیں؟ کیا ایک جرم ثابت ہو جانا کافی نہیں؟

ایڈووکیٹ جنرل۔ جناب عالی ایک جرم بھی کافی ہے۔ لیکن دوسرا جرم بھی ثابت ہو تو سزا تجویز کرنے میں آپ کو مدد ملے گی۔

چیف جسٹس۔ سرکاری روپیہ کا غبن سنگین جرم ہے آپ فکر نہ کریں۔ ہم سزا میں نرمی نہیں کریں گے۔ چودھری صاحب آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ظفر اللہ خاں۔ جناب عالی اگر ایڈووکیٹ جنرل مزید کچھ کہنا نہیں چاہتے تو میری گذارش بہت مختصر ہے۔

ملزم کے ارتکاب جرم کو معقول شبہ کی گنجائش کے بغیر ہر پہلو سے محکم طور پر ثابت کرنا استغاثے کا فرض ہے اور بریت کے حکم کے خلاف اپیل کرنے میں تو اس بار ثبوت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ میرے فاضل دوست نے صرف اتنا کیا ہے کہ مقدمے کے کوائف بیان کرنے کے بعد متعلقہ رجسٹرات میں سے چند اندراجات کی طرف آپ کو توجہ دلائی ہے۔ جن سے بادی النظر میں ملزم کی ذمہ داری کا قیاس ہو سکتا ہے۔ لیکن جرم ثابت کرنے کیلئے اتنا کافی نہیں مجسٹریٹ نے بھی ان اندراجات پر توجہ کی ہے اور اپنے فیصلے میں وجوہات دیئے ہیں کہ کیوں ان اندراجات کی بنا پر جرم ثابت ہونا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے فاضل دوست نے ان وجوہات کے متعلق ایک نقطہ تک نہیں کہا جس سے لازم آتا ہے کہ میرے فاضل دوست ان وجوہات کی تردید سے قاصر ہیں۔ اس صورت میں اپیل خارج ہونا چاہیئے۔

مسٹر جسٹس رنگی لال ۔ مسٹر ایڈووکیٹ جنرل! میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ آپ نے اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کیا اور ہمارے ذہنوں میں پختہ طور پر یہ تاثر پیدا نہیں کیا کہ فاضل مجسٹریٹ کا فیصلہ قطعی طور پر غلط اور بے جا ہے۔ جب تک ہم اس نتیجہ پر نہ پہنچیں آپ اپنی اپیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ فوجداری مقدمات میں تو اگر ملزم کی طرف سے بھی اپیل ہو جب بھی بار ثبوت استغاثے پر ہوتا ہے اور آپ کی اپیل بریت کے خلاف ہے ۔ ایڈووکیٹ جنرل نے میری طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھا اور مزید بحث کے لئے کھڑے ہو گئے۔ میری کوشش یہ تھی کہ وہ رجسٹروں کے اندراجات کے جھمیلے میں الجھیں اور میری باری آنے تک جج صاحبان اس الجھن سے پریشان ہو جائیں جس کا میں فائدہ اٹھا سکوں۔ ایڈووکیٹ جنرل کی چال یہ تھی کہ یہ الجھن پیدا کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہو تاکہ جج صاحبان پر یہ اثر ہو کہ معاملہ تو صاف ہے لیکن ملزم کا وکیل خواہ مخواہ الجھن پیدا کر رہا ہے۔ انکی یہ چال کامیاب نہ ہوئی بلکہ جج صاحبان کی طبائع پر الٹا اثر ہوا کہ ایڈووکیٹ جنرل اپنی ذمہ داری نبھانے سے جی چراتے ہیں ضرور ان کے کیس میں کچھ کمزوری ہے۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہیئے کہ ہم ملزم کو کسی جائز فائدے سے جو قانون اسے دیتا ہے محروم نہ کر دیں ۔ ایڈووکیٹ جنرل کو دن کا اکثر حصہ رجسٹروں کے اندراجات کی وضاحت کرنے اور زبانی شہادت اور اندراجات میں تطابق ظاہر کرنے میں صرف کرنا پڑا۔ جب انہوں نے بحث ختم کی تو میرا کام بہت حد تک ختم ہو چکا تھا۔ ایک تو چیف جسٹس پریشان ہو رہے تھے۔ کیس بہت لمبا ہو گیا تھا۔ وہ اوسطاً دن میں چھ سات پھانسی کی اپیلیں فیصلہ کرنے کے عادی تھے اور یہاں چینی کی چند بوریوں کے کرائے کی رقوم کے غبن کی گتھی سلجھانے پورا دن صرف ہو گیا۔ اور ابھی صرف استغاثے کی طرف سے بحث ختم ہوئی تھی۔ انکی طبیعت میں یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ اگر جرم ثابت کرنے کے لئے استغاثے کو اتنے پیچدار مراحل میں سے گذرنا لازم ہے تو ہر قدم پر شک کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ مسٹر جسٹس رنگی لال بحث کی طرف توجہ کر رہے تھے۔ لیکن مجھے انکی طبیعت کا تجربہ تھا کہ ذرا بھی

شک کی گنجائش باقی رہ گئی تو وہ چیف جسٹس پر سزا دینے کے لئے زور نہیں دیں گے۔

ظفراللہ خاں ۔ جناب عالی میں اپنے فاضل دوست کا ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ کی توجہ مسل کے ضروری حصوں کی طرف منعطف کرادی ہے جس سے آپ نے دیکھا کہ زبانی شہادت صرف ملزم کے دفتر کے باقی عملے کی ہے اور اس شہادت میں یہ کمزوری ہے کہ اس قیاس کا بہت امکان ہے کہ جملہ گواہان یا ان میں سے بعض خود اس غبن میں شریک تھے۔ کیونکہ غالب قیاس ہے کہ انکی شرکت یا کم سے کم ان کی مجرمانہ غفلت کے بغیر یہ غبن نہیں ہو سکتا تھا۔ رجسٹر کے جملہ اندراجات کا جن پر استغاثے کا انحصار ہے یقینی طور پر ملزم کے قلمی ہونا ثابت نہیں ۔ (زبانی شہادت کے بعض حصوں اور اندراجات میں سے بعض کی طرف توجہ دلانے کے بعد میں نے گذارش کی) جناب عالی اس تمام سر دردی کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ممکن ہے ملزم نے اکیلئے زرقوم غبن کی ہوں۔ ممکن ہے اس نے دفتر کے عملے کے تمام یا بعض افراد کے ساتھ مل کر یہ رقوم غبن کی ہوں اور ممکن ہے کہ دفتر کے عملے کے باقی افراد یا ان میں سے بعض نے یہ رقوم غبن کی ہوں اور الزام ملزم کے سر تھوپ دیا ہو۔ میرا فرض نہیں کہ میں ملزم کو بے گناہ ثابت کروں۔ استغاثے کا فرض ہے کہ اسے مجرم ثابت کرے۔ قیاس یا غالب قیاس کہ ملزم نے یہ جرم کیا ہے اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ جو شہادت تحریری یا زبانی آپ کے سامنے موجود ہے اس سے ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوتا۔ بیشک امکان جرم ظاہر ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ غالب قیاس پیدا ہوتا ہے کہ اس سے جرم سرزد ہوا۔ اور میں پورے وثوق سے یقین رکھتا ہوں کہ آپ محض غالب قیاس کی بناء پر ملزم کو مجرم قرار نہیں دیں گے ۔ میں نے غالب قیاس کی حد تک ملزم کے ملوث ہونے کو تسلیم کر کے ایک طرف تو جج صاحبان کے ضمیر کی تسلی کر دی اور دوسری طرف ان کی قانونی ذمہ داری کے احساس کو ابھار دیا۔ جب ایڈووکیٹ جنرل نے جواب دینا شروع کیا تو جج صاحبان آرام سے بیٹھے اطمینان کا سانس لے رہے تھے کہ اس جھمیلے سے خلاصی کا راستہ نکل آیا۔ جونہی ایڈووکیٹ جنرل نے جواب ختم کیا چیف جسٹس نے فرمایا۔ مسٹر ایڈووکیٹ جنرل ہم نے دو دن اس کیس پر ضائع کئے ہیں اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ریل کے محکمے میں ہر کوئی جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ اس صورت میں ہم اس بدقسمت ملزم کو سزا کے لئے چن لینے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے ۔ ہم اپیل خارج کرتے ہیں ۔

دیوان رام لال صاحب ایڈووکیٹ جنرل نے ایک دن مذاق میں مجھ سے فرمایا۔ ظفراللہ! اب تمہارے وزارت کا عہدہ سنبھالنے کا وقت قریب آرہا ہے ۔ یا تو تم میرے ساتھ یہ دوستانہ مروت کا سلوک کرو کہ تم پریکٹس بند کر دو اور یا پھر میں تمہارے یہاں سے رخصت ہونے تک رخصت لے لیتا ہوں۔ مقدمات کا فیصلہ تو ایک طرف ہو یا دوسری طرف اس سے مجھے کچھ پریشانی نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر کسی روز تم نے یہ کہہ دیا کہ میرا ملزم تو بے گناہ ہے البتہ یہ قتل ایڈووکیٹ جنرل نے کیا ہے تو چیف جسٹس پھانسی کا رسہ میرے گلے میں ڈال دیں گے ۔

لاہور سے رخصت ہونے کے چند دن قبل گورنر اور وزرا کی طرف سے مجھے الوداعی ڈنر دیا گیا۔ میزبانوں نے ازراہ

تلطف رسمی تعریفی کلمات کہنے ہی تھے لیکن چیف جسٹس ننگ نے ایک رقعہ لکھ کر گورنر کو بھیجا کہ وہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اپنی باری آنے پر انہوں نے بہت تعریفی کلمات فرمائے اور آخر میں کہا ایک لحاظ سے میں نے اطمینان کا سانس لیا ہے کہ یہ اب یہاں سے جانیوالا ہے۔ کیونکہ اس کی یہاں موجودگی اس صوبے کے امن وامان کے لئے خطرے کا باعث ہو رہی تھی۔ جب یہ میرا اجلاس کے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو میں ہوشیار ہو جاتا تھا مبادا اس کے زور خطابت کے اثر کے تحت مجھ سے سرکار کے حق میں کوئی بے انصافی سرزد ہو جائے۔ باوجود اس کے نوبت یہانتک پہنچ گئی تھی کہ کوئی شخص چاہے کسی بھی جرم کا مرتکب ہوا ہو اسے وکیل کر لینا تو صاف بچ نکلتا تھا۔ جب تقریروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور مہمان اور میزبان کرسیوں سے اٹھ کر بات چیت میں لگ گئے تو میں نے چیف جسٹس سے کہا آپ نے جو کچھ فرمایا میں اس کیلئے نہایت ممنون ہوں۔ لیکن آپ کی ایک بات پورے طور پر صحیح نہیں تھی۔ پوچھا وہ کونسی؟ میں نے کہا آپ نے فرمایا جو ملزم مجھے وکیل کر لیتا تھا وہ صاف بچ نکلتا تھا۔ فرمایا اس میں کیا غلطی تھی؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ میرے اجلاس میں تم ہمیشہ کامیاب رہے ہو؟ میں نے کہا یہ درست ہے لیکن میں آپکے اجلاس میں قدم رکھنے سے پہلے ملزم پر خاصا جرمانہ کر لیا کرتا تھا۔ ہنس کر فرمایا ہاں مجھے کہنا چاہیئے تھا کہ ہر ملزم پھانسی اور قید سے بچ نکلتا تھا۔

خان بہادر نادر شاہ | میرے پرسنل اسسٹنٹ خان بہادر نادر شاہ صاحب کی عمر پچپن سال سے تجاوز کر چکی تھی اور میاں صاحب ان کی ملازمت کی میعاد میں توسیع بھی فرما چکے تھے۔ جب تک وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے میں بھی قواعد کے مطابق سال بسال ان کی ملازمت کی میعاد میں توسیع کرتا رہا اس کے بعد قواعد کی رو سے توسیع کی گنجائش نہ تھی۔ ملازمت ختم کرنے پر خان بہادر صاحب کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ مجھے جب بھی کراچی جانے کا اتفاق ہوتا میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ بڑے فرض شناس محنتی اور دیانتدار افسر تھے۔

سر جیمز گرگ کی صاف دلی | مجھے شملہ پہنچے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ایک سہ پہر پانچ بجے کے قریب سر جیمز گرگ دفتر سے اپنے مکان کو لوٹتے ہوئے رستے میں میرے مکان ریٹریٹ پر چند منٹ کیلئے رک گئے۔ میں نے ناشتے میں شامل ہونے کو کہا فرمایا مجھے جلدی ہے اس وقت زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ صرف دو باتیں کہنے کیلئے آیا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تمہارے قلمدان کی تبدیلی کے متعلق جو سازش بھور نے کی تھی میں اس میں شامل تھا۔ اب اس کی اصلیت مجھ پر کھلتی جا رہی ہے۔ بھور بہت چالاک شخص تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس کی چالاکیوں کا علم ہونا شروع ہوا ہے۔ اننک میں اندھیرے میں رہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے دونوں محکمے ایسے ہیں جن میں وزارت خزانہ کو متواتر دلچسپی رہتی ہے۔ اور محکمہ تجارت کی مسلیں تو ہر روز میرے پاس آتی ہیں۔ میرے تمہارے درمیان بہت دفعہ اختلاف ہوگا۔ یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہم آپس میں تبادلہ خیالات اور مفاہمت باہمی سے فیصلے پر پہنچ جایا کریں گے۔ جو بات میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستانیوں میں یہ کمزوری دیکھی ہے کہ ذمہ داری لینے سے گھبراتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ آخری

فیصلے کی ذمہ داری کسی اور کی طرف منتقل کر دی جائے۔ تمہارے چارج لینے کے وقت سے میں نے دیکھا ہے کہ تم خود ایک نتیجے پر پہنچتے ہو اور صفائی سے اسے بیان کرتے ہو اور اس کے متعلق ذمہ داری لیتے ہو۔ مجھے اس سے بہت اطمینان ہوا ہے۔ اچھا پھر ملیں گے۔

مجھے ان کے ساتھ چار سال کام کرنے کا موقعہ ہوا۔ بارہا ہمارا آپس میں اختلاف بھی ہوا۔ بہت لوگ ان کے الفاظ کی ناملائمت کے شاکی تھے۔ مجھے کبھی ان سے یہ شکوہ پیدا نہیں ہوا۔ ہمارے اختلافات بہت جلد بات چیت سے ہموار ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اپنی بات کہہ لینے کے بعد بہت جلد مناسب تصفیے کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ جب میں نے چارج لیا گندم کی درآمد پر محصول عاید تھا جس کے وہ سخت مخالف تھے اس محصول کے متعلق ہر سال غور ہوتا کہ جاری رہے یا ہٹا دیا جائے۔ زمیندار طبقے کی طرف سے بہت خدشہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ محصول ہٹا دینے سے باہر سے سستا غلہ آنا شروع ہو گا اور گندم کی قیمت ملک میں اتنی گر جائے گی کہ زمیندار طبقہ کو مصیبت کا سامنا ہو گا۔ سب حالات کا جائزہ لینے کے بعد میری رائے ہوئی کہ آئندہ سال یہ محصول جاری رہنا چاہیئے۔ میں نے مثل پر اپنی رائے لکھدی اور مسل وزیر خزانہ کے سامنے رکھدی۔ میرا نوٹ پڑھ کر مسکرائے اور فوراً قلم اٹھا کر لکھا مجھے شدید اختلاف ہے لیکن میں ہر ایک سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا اسلئے ناچار اپنی رضامندی دیتا ہوں۔

جب اپنی میعاد ختم کر کے انگلستان چلے گئے تو بھی ہمارے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ وہ ہندوستان کے آئینی اور سیاسی مستقبل میں بہت دلچسپی لیتے رہے۔

مجھے چارج لئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کے ایک اجلاس کے ایجنڈے میں قلمدانوں کی تقسیم کا مسئلہ درج ہو کر پھر وہی قضیہ سامنے آگیا۔ میں وائسرائے سے ملا۔ انہوں نے دریافت فرمایا اب تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا وہی جو نومبر میں تھی بلکہ اس سے بھی مضبوط تر۔ اب تو میں چارج لے چکا ہوں۔ اب اگر میرے قلمدان کو تراش کر نصف سے کم کر دیا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ میں اپنی ذمہ داری کو سنبھالنے میں پورا نہیں اترا۔

وائسرائے۔ تمہیں معلوم ہے نوئیس رخصت پر جانیوالا ہے۔ اس نے زور دیا ہے کہ اس کے جانے سے پہلے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ واپسی پر کونسے محکمے اس کے سپرد ہوں گے۔ پھر سرکار کہتا ہے۔ اس کے پاس کام اتنا کم ہے کہ اس کا اکثر وقت فارغ رہتا ہے۔ وہ ناول پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہے۔ اسے کچھ زائد کام ملنا چاہیئے۔

ظفر اللہ خان۔ میں آپ کو دقت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اتنے عرصے میں کچھ بوجھ تو آپ کا ہلکا ہو گیا ہے سر جوزف بھور چلے گئے ہیں۔ اور کریگ اب کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں۔ سرکار کو اگر واقعہ میں کام کی کمی کی شکایات ہے

تو اس کے تدارک میں میں مدد کر سکتا ہوں ۔ میرے تجارت کے محکمے میں اس وقت دو اہم مسائل :۔
INSURANCE LAW اور COMPANY LAW کی ترامیم ہیں ۔ یہ دونوں پیچیدہ اور وقت طلب مسائل ہیں ۔ میرے پاس وافر وقت نہیں اگر سر اپنی اپنی سرکار پسند کریں ۔ تو میں یہ دونوں مسائل ان کے سپرد کرنے کو تیار ہوں ۔ دو تین سال تو ان کو ناول پڑھنے کی فرصت نہیں رہے گی ۔ آپ سال بھر کے بعد تشریف لے جانے والے ہیں ۔ آپ کے جانشین ممکن ہے قلمدانوں کی نئی تقسیم کرنا چاہیں ۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ کے وقت میں کوئی تبدیلی نہ ہو اور جب نئے وائسرائے آئیں تو وہ جیسے مناسب سمجھیں قلمدان تقسیم کر دیں ؟

وائسرائے ۔ تمہاری تجویز مجھے تو معقول معلوم ہوتی ہے اگر تم کمپنی لاء اور انشورنس لاء کی ترمیم کے مسائل ابھی سے سرکار کو دینے کو تیار ہو تو یہ مسئلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے ۔ اسی شام کونسل کا اجلاس ہوا ۔ دو تین اراکین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ اس پر کمانڈر انچیف سر فلپ چیٹوڈ نے وائسرائے سے کہا آپ نے اپنے رفقاء کے خیالات معلوم کر لئے ہیں ۔ قلمدانوں کی تقسیم کا سوال آپ کے اختیار کی بات ہے ۔ آپ بعد غور جو تجویز کریں ۔ آپ کے رفقاء کو اس پر عمل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے ۔ دوسرے دن ہم سب کو وائسرائے کے فیصلے کی اطلاع مل گئی کہ وائسرائے اپنے وقت میں قلمدانوں کی تقسیم میں کوئی تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتے نئے وائسرائے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جیسے پسند کریں عمل کریں ۔ وزیر تجارت نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کمپنی لاء اور انشورنس لاء کی ترمیم کے مسائل وزیر قانون اپنے ذمے لے لیں جسے وزیر قانون نے منظور کر لیا ہے ۔

کوئٹہ کا قیامت خیز زلزلہ | ۳۱ مئی کو کوئٹہ میں شدید زلزلہ آیا جس سے جان اور مال کا بہت نقصان ہوا انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اس اطلاع کے ملتے ہی میں نے چیف کمشنر ریلویز سر گھتری رسل کو ہدایت دی کہ ریل کے محکمے کی طرف سے جسقدر مدد ممکن ہو سکے دیجائے ۔ اخراجات کی منظوری اور متعلقہ قواعد اور ضوابط کی ترمیم یا تنسیخ کا انتظار نہ کیا جائے ۔ جس قسم کے احکام کی ضرورت ہو گی بعد میں جاری کر دیئے جائیں گے ۔ اس وقت فقط یہی مقصد سامنے ہونا چاہیئے کہ مصیبت میں مبتلا انسانوں کی تکلیف کو رفع کرنے اور انہیں آرام پہنچانے میں محکمہ کیا مدد کر سکتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ بھی ہو سکتا ہو کیا جائے ۔

سید انعام اللہ شاہ صاحب کی وفات | جب میں چارج لینے کیلئے لاہور سے شملے جانے کیلئے روانہ ہوا تھا سید انعام اللہ شاہ صاحب لاہور سے انبالہ تک میرے ساتھ تشریف لائے تھے ۔ انبالہ میں مجھ سے رخصت ہو کر اپنے اخبار "دور جدید" کے کام کے سلسلے میں حیدر آباد دکن روانہ ہو گئے ۔ وہاں غذائی زہریت کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے نواب اکبر یار جنگ صاحب ہوٹل سے انہیں اپنے مکان پر لے گئے ۔ علاج میں ہر ممکن سعی کی گئی لیکن جانبر نہ ہو سکے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ نہایت مخلص اور باوفا دوست تھے ۔ ہم سب کیلئے ان کی وفات شدید صدمے کا باعث

ہوئی بعید یہ آباد ہی میں اماںتاً دفن ہوئے۔ چونکہ موصی تھے بعد میں میں نے ان کی نعش کو قادیان پہنچانے اور بہشتی مقبرہ میں دفن کئے جانے کا انتظام کر دیا۔ یغفر اللہ لہ ویجعل اللہ الجنۃ العلیا مثواہ۔ ان کی یاد آج تک دل کو گرماتی ہے اور بفضل اللہ ان کے لئے دعائے مغفرت میں کبھی ناغہ یا کوتاہی نہیں ہوئی۔

ریلوے افسران کی کانفرنس میں شمولیت اور ان سے خطاب

ہندوستان کی جملہ ریلویز کی کانفرنس ایسوسی ایشن کا اجلاس سال میں دو بار ہوتا تھا۔ ایک بار شملے میں ایک بار دلی میں۔ میرے چارج لینے کے بعد جب شملے میں اجلاس ہوا تو سابق دستور کے مطابق میں بحیثیت وزیر ریلوے ایسوسی ایشن کے بڑے ڈنر کے موقعہ پر مہمان خصوصی تھا۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایجنٹ مسٹر ہائٹ اس اجلاس کے صدر تھے۔ میں نے چیف کمشنر سے کہا کہ ڈنر کے موقعہ پر تو رسمی تقریریں ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ کانفرنس کے اجلاس کے دوران میں میں کانفرنس کے اراکین سے خطاب کروں۔ آپ اس کا انتظام کر دیں۔ انہوں نے انتظام کر دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ تم سے پہلے وزراء ریلوے کے محکمے میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں لیتے رہے۔ ریلوے افسران کو یہ معلوم کر کے بہت اطمینان ہوا ہے کہ تم ان سے خطاب کرنا چاہتے ہو اور وہ بڑے شوق سے تمہارے خطاب کے منتظر ہیں۔ میں وقت مقررہ پر اجلاس میں حاضر ہو گیا۔ میں نے کہہ رکھا تھا کہ میری تقریر کے وقت صرف افسران اجلاس کے کمرہ میں موجود ہوں سیکرٹری، سٹینو گرافر، چپراسی کوئی کمرے میں موجود نہ ہو۔ یہ سب افسران عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ ان میں بھاری کثرت یورپین افسران کی تھی۔ خال خال کوئی ہندوستانی بھی تھا۔ ہر ایک ان میں سے اپنے اپنے فن میں ماہر اور صاحب تجربہ تھا۔ میں ہی ان میں ایک ایسا تھا جو ریلوے کے وسیع محکمے کے متعدد شعبوں میں سے کسی کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ ان کی نگہ میں یہ بڑی جرأت اور حوصلے کا کام تھا کہ میں ان سے کچھ سیکھنے یا معلوم کرنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں کچھ بتانے کیلئے حاضر ہوا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے کسی پیشرو نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بیشک وہ شوق سے منتظر تھے کہ دیکھیں یہ نابلد ہم سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے انہیں کچھ اس طرح خطاب کیا۔ صاحبان! میں آپ کا نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے نہایت قیمتی اوقات میں سے جب آپ اہم امور اور مسائل کے متعلق تبادلہ خیالات اور مشورے کیلئے جمع ہیں کچھ وقت میری باتیں سننے کیلئے نکال لیا ہے۔ میں آپ کی خدمت میں ان عوام کے نمائندے کے طور پر حاضر ہوا ہوں جن کے آپ اور میں خادم ہیں اور جو آپ کے گاڑی بانی کے کاروبار کے سب سے بڑے گاہک ہیں۔ یعنی تیسرے درجے میں سفر کرنیوالے مسافر۔ ان خدا کے بندوں کے ساتھ آپ کی ریلوں پر کیا سلوک ہوتا ہے اس کا آپ میں سے کسی کو کوئی ذاتی تجربہ نہیں نہ ذاتی علم ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ وہم ہو کہ آپ ان کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں لیکن جو علم بھی آپ کو ان کے متعلق ہے وہ شنید ہے اور سرسری ہے۔ اس لحاظ سے میں آپ کے مقابلے میں صاحب علم اور صاحب تجربہ ہوں۔ آپ سب ریلوے کی اعلیٰ ملازمتوں کے افسر

ہیں ۔ اور اسی درجے سے ملازمت شروع کر کے اپنے موجودہ معزز مناصب پہ پہنچے ہیں۔ جس دن سے آپ نے ملازمت شروع کی آپ کو ریل کا سفر کرنے کیلئے اول درجے کا پاس میسر رہا۔ جیسے جیسے آپ کی ملازمت کا عرصہ گذرتا گیا آپ کو پہلے آٹھ پہیوں والا اور پھر سولہ پہیوں والا سیلون میسر آتا گیا۔ مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہر شخص کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں مناسب سہولتیں میسر آنی چاہئیں۔ میں فقط یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں میں ان شعبوں کے متعلق جن کا آپ کو تجربہ ہے نابلد اور کورا ہوں وہاں جو باتیں میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ آپ کیلئے نئی اور اچنبھا ہوں گی۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا ذاتی تجربہ کی بنا پہ کہوں گا۔ یا وہ واردات میری ذات پہ گذری ہو گی۔ یا میں نے اسے اپنی آنکھوں سے کسی اور پہ گذرتے دیکھا ہو گا۔ میں محض شنید سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے ریل کے ہر درجے میں سفر کیا ہے اور اب بھی مجھے کسی درجے میں سفر کرنے میں باک نہ ہو گا۔ میں موقعہ دیکھ کر تیسرے درجے میں بھی سفر جاری رکھوں گا۔ ایک تو اس لئے کہ میری عادت نہ جاتی رہے۔ دوسرے اس لئے کہ میں دیہاتی ہوں اور میرے بہت سے عزیز رشتہ دار اور دوست دیہاتی ہیں اور تیسرے درجے میں سفر کرنے کے عادی ہیں اور میں بعض دفعہ ان کے ساتھ سفر کرتا ہوں۔ اور تیسرے اسلئے بھی کہ اب میرا فرض ہے کہ میں دیکھتا رہوں کہ تیسرے درجے کے مسافروں کی طرف مناسب توجہ ہو رہی ہے یا نہیں۔ پہلی بات جو میں آپ صاحبان کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ریل کا محکمہ بیشک حکومت کا ایک محکمہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم حکومت کے افسر نہیں اگر چہ ہمیں تو یہی سکھایا گیا ہے کہ حکومت کا ہر افسر پبلک کا خادم ہے لیکن ریل کے افسروں پہ تو خصوصیت سے یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ہم گاڑی بان ہیں اور ریل کے مسافروں کے خادم ہیں۔ ہم کرسی پہ حکومت کرنے کیلئے نہیں بیٹھے۔ خدمت کرنے کیلئے بیٹھے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ریل کے محکمے کو اچھی طرح چلانے سے صرف یہ مراد نہیں کہ گاڑیاں اچھی اور صاف ستھری ہوں۔ ریلیں تیز چلیں اور وقت پہ روانہ ہوں اور وقت پہ پہنچیں یہ سب کچھ بھی بلاشبہ ضروری ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ ہر درجے کے مسافر جن میں سب سے بڑی تعداد تیسرے درجے کے مسافروں کی ہے آرام سے سفر کریں۔ اور انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں تیسرے درجے کے مسافروں کی ایک بہت بڑی کثرت اب تک ان پڑھ ہے۔ وہ آپکی ہدایتوں کے بورڈ نہیں پڑھ سکتے سفر تو ہر شخص کیلئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن ان خدا کے بندوں کے لئے بہت ہی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ سٹیشن پہ پہنچتے ہیں تو نہیں جانتے ان کی منزل مقصود کو جانیوالی گاڑی کب آئے گی، کب روانہ ہو گی، ٹکٹ گھر کب کھلے گا، کرایہ کیا ہو گا، کتنے سٹیشن رستے میں ہوں گے، منزل پر کب پہنچے گی، اگر لاہور جیسا سٹیشن ہو تو انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ٹکٹ گھر کہاں ہے، پلیٹ فارم کدھر ہے، اسٹیشنوں پہ تیسرے درجے کے مسافروں کیلئے جو انتظار کرنے کی جگہ بنی ہوتی ہے اس کے گرد اس قسم کی باڑیں اور سلاخیں ہوتی ہیں کہ مسافروں کو خیال ہوتا ہے انہیں حوالات میں

دیدیا گیا ہے۔ پھر وہ ہراساں ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں ہماری گاڑی کب چھوٹے گی۔ ایسا نہ ہو ہم بیٹھے رہ جائیں اور گاڑی چھوٹ جائے۔ بابو سے پوچھتے ہیں تو وہ جھڑک دیتا ہے۔ ابھی تمہاری گاڑی کا وقت نہیں ہوا۔ بندۂ خدا تم اس بیچارے کو نرمی اور شفقت سے بتاؤ کہ گاڑی کے روانہ ہونے میں کتنا عرصہ باقی ہے۔ "ابھی وقت نہیں ہوا" سے اس نے یہ تو سمجھ لیا کہ گاڑی فوراً چھوٹنے والی نہیں لیکن اس کے اس خدشے کا تدارک تو نہ ہوا کہ شاید میں اونگھتا رہ جاؤں اور گاڑی چھوٹ جائے۔ یہ تو میں نے ان مسافروں کی ایسی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے جو انہیں لازماً پیش آتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ٹکٹ کلکٹر یا بابو دق کرنے یا پیسے بٹورنے پر آمادہ ہو تو ان پریشانیوں میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایک ٹکٹ کلکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فخریہ کہا تھا۔ ہم بھی افسر ہیں اور مسافروں پر ہمارا احترام لازم ہے۔ اگر کوئی مسافر گستاخی پر آمادہ ہو تو ہم فوراً اس کا مزاج درست کر دیتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا آپ کیا کرتے ہیں؟ کہا بالکل آسان بات ہے اس سے ٹکٹ لیا اور زمین پر گرا کر اس پر پاؤں رکھ دیا اور تحکم سے کہا جلدی کرو ٹکٹ حوالے کرو۔ وہ کہتا ہے میں نے ابھی ٹکٹ دیدیا ہے۔ ہم کہتے ہیں جھوٹ بکتے ہو ٹکٹ دو ورنہ ساتھ جرمانہ بھی دینا پڑے گا اور نہیں تو کانسٹیبل کے حوالے کئے جاؤ گے اس کے ہوش جلد ٹھکانے آجاتے ہیں۔ میں آپ صاحبان کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہم خادم ہیں۔ خدمت ہمارا فرض ہے اور خدمت کا شوق ہمارا خاصہ ہونا چاہیئے۔ اب میں آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے واقعات سناتا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اگر ایک پڑھے لکھے دوسرے یا اوّل درجے کے مسافر کے ساتھ ایسا غیر ہمدردانہ سلوک ہو سکتا ہے تو ایک ان پڑھ تیسرے درجے کے مسافر کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوتا ہوگا۔ میں نے چند واقعات اپنے ذاتی تجربے سے بیان کئے پھر میں نے چند واقعات ایسے بیان کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ غیر ممالک مثلاً برطانیہ میں مسافروں کے آرام کا کسقدر خیال رکھا جاتا ہے۔ آخر میں میں نے دو تین باتوں کی طرف خاص توجہ دلائی۔ اوّل مسافروں کو ہر قسم کی اطلاع بہم پہنچانے کا انتظام ہونا چاہیئے۔ تاکہ اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو۔ دوسرے مسافروں کی ہر مناسب مدد ہونی چاہیئے تاکہ ریل پر سفر کرنا ان کے لئے ایک تکلیف دہ مجاہدہ نہ ہو بلکہ ایک خوشگوار تجربہ ہو۔ تیسرے ریل کے تمام عملے کا یہ شعار ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک مسافر کے ساتھ اور خصوصاً تیسرے درجے کے مسافروں کے ساتھ ہر موقعہ پر خوش خلقی سے پیش آئیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری معروضات کو توجہ سے سنا اور امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے حلقہ اختیار میں انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

دوران تقریر میں حاضرین کے چہروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ کچھ تو پوری توجہ سے سن رہے تھے اور نوٹ کرتے جاتے تھے کچھ غور سے سن رہے تھے اور ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ شوق سے سن رہے ہیں۔ بعض کے ماتھوں پر شکن تھے اور چہروں پر حیرت کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور پریشانی کہ آئندہ کیا ہوگا۔ بعض چہروں پر تیوری بھی تھی کہ یہ داڑھی والا مولوی کہاں سے آگیا جو ہم کو حکمت سکھانے کی بے سود بلکہ گستاخانہ کوشش کر رہا ہے۔ جی آئی پی ریلوے کے متعلق میرے کانوں تک

شکایتیں پہنچی تھیں کہ یورپین سنیئر افسر ہندوستانی افسروں کے ساتھ ہندوستانہ رواداری کا سلوک روا نہیں رکھتے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میری باتوں کی طرف سب سے زیادہ توجہ جی آئی پی ریلوے نے کی۔ اس ریلوے کے ایجنٹ مسٹر ولسن مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ زبانی بھی بتاتے تھے اور رپورٹیں بھی بھیجتے رہتے تھے کہ انہوں نے کیا کیا اصلاحی اقدام کئے ہیں۔ جب مسٹر بائٹ ریلوے بورڈ میں آگئے۔ اور کرنل کارسن ان کی جگہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایجنٹ ہوئے تو انہوں نے بھی ان امور کی طرف توجہ شروع کردی۔ دوسری ریلوں پر بھی آہستہ آہستہ کچھ توجہ ہونے لگی۔ لیکن بہت حد تک ایجنٹ کی شخصیت پا ممد ہوتی یا روک بن جاتی۔ میں جب دورے پر جاتا تو جو امور قابلِ اصلاح نظر آتے واپسی پر ان کا ذکر چیف کمشنر سر گتھری رسل سے کرتا۔ وہ بہت اچھے رفیق ثابت ہوئے۔ ہم آپس میں آزادی سے تبادلہ خیالات کرتے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور وہ میری باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے اور انکو عملی جامہ پہنانے کی تدبیر کرتے۔

چونکہ ہر شخص کو ریل پر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اسلئے ہر شخص کو ریل کے محکمے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ اسمبلی میں بھی ریل کے محکمے پر سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ان کے ذریعے بھی مجھے عوام کے احساسات اور ان کی شکایات کا علم ہوتا رہتا اور جہاں اصلاح کی گنجائش ہوتی میں محکمے کو توجہ دلاتا۔ پروفیسر رانگا (مدراس) نے ایک سوال کے ذریعے توجہ دلائی کہ جنوبی ہند کی ایک ایکسپریس گاڑی کے تیسرے اور درمیانے درجے کے غسل خانوں کی حالت رات کے پچھلے حصے میں ناگفتہ بہ ہوتی ہے ان کی صفائی کی طرف مناسب توجہ ہونی چاہیئے۔ محکمے کی طرف سے جواب آیا کہ یہ شکایت بے بنیاد ہے۔ اسمبلی میں میں نے جواب میں کہہ دیا کہ دریافت پر معلوم ہوا ہے کہ حالت ایسی نہیں جو قابلِ شکایت ہو لیکن توجہ کی جائے گی۔ اس کے بعد جب میں دورے پر جنوبی ہند گیا تو میں نے ایک رات کا سفر اسی ایکسپریس گاڑی سے کیا اور رات کے پچھلے پہر دو تین مقامات پر اپنے سیلون سے نکل کر میں نے تیسرے درجے کی گاڑیوں کے غسل خانوں کو دیکھا اور ان کی حالت کو بہت کچھ قابلِ اصلاح پایا شملے واپسی پر میں نے جن امور کا ذکر چیف کمشنر سے کیا ان میں ایک یہ بھی تھا۔ انہوں نے بورڈ کے ایک متعلقہ رکن اور ڈائرکٹر کو مشورے کیلئے بلایا۔ شکایت کے متعلق تو اب کہا نہیں جاسکتا تھا کہ بے بنیاد ہے کیونکہ میں خود دیکھ آیا تھا لیکن دونوں نے کہا مزید اصلاح کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ تیز رفتار گاڑی ہے رات کے پچھلے حصے میں صرف تین چار مقامات پر تین چار منٹ ٹھہرتی ہے۔ ایک مقام پر تین چار منٹ میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین ڈبوں کے غسل خانوں کی صفائی ہوسکتی ہے۔ اس سے زیادہ صفائی کے موجودہ سٹاف سے توقع نہیں کی جاسکتی اسلئے کوئی چارہ نہیں۔ میں نے کہا ہمدردی ہو اور تخئیل پر کچھ زور دیا جائے تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ کہنے لگے آپ کوئی ترکیب بتائیں۔ میں نے کہا رات کے دو بجے سے لیکر صبح آٹھ بجے تک چھ سات بار تو گاڑی ٹھہرتی ہوگی ایک نقشہ تیار کروالیا جائے کہ پہلی بار ٹھہرنے پر انجن کے عین پیچھے کے تین ڈبوں کے غسل خانوں کو اچھی طرح سے صاف کردیا جائے۔ دوسری بار ٹھہرنے پر ان کے بعد کے تین اور ڈبوں کے غسل خانے صاف کئے جائیں۔ اور اسی ترتیب سے صفائی ہوتی رہے ان چھ گھنٹوں میں دو تین بار سب غسل خانے صاف ہو جاکریں گے

کہنے لگے ہاں اس طریق سے ضرور کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ ہمارا خیال اس طرف نہیں گیا۔

ائیر کنڈیشن ڈبے چلانے کی تجویز

سر گتھری رسل انجنیئر تھے۔ میں نے ان سے مشورہ کیا کہ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ ریل کے ڈبوں کے اندر مٹی نہ آئے اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا انتظام ہو سکے۔ انہوں نے کہا دونوں باتیں ہو سکتی ہیں ۔ میں غور کر کے منصوبہ تیار کر دوں گا۔ آخر باہمی مشورے سے طے ہوا کہ شمالی ہند میں برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے ڈبوں کا تجربہ کیا جائے اور اگر یہ تجربہ کامیاب ہو تو اسے وسعت دی جائے۔ اگرچہ اسمبلی میں اس تجویز پر کچھ مخالفانہ تنقید ہوئی لیکن یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور ایسے ڈبے شمالی ہند کی تیز گاڑیوں میں مہیا کر دیئے گئے۔ سر گتھری رسل کی یہ بھی تجویز تھی کہ ایک پوری ٹھنڈی ٹرین کا بھی تجربہ کیا جائے جس میں صرف دو درجے ہوں ۔ ایک سونے والے ڈبوں کا اور دوسرا بیٹھنے والے ڈبوں کا۔ ان کا اندازہ تھا کہ سونیوالے ڈبوں میں فی کس کرایہ اوّل درجے کے کرائے سے کچھ زیادہ رکھنا پڑے گا لیکن بیٹھنے والے ڈبوں میں کرایہ درمیانے درجے کے کرایہ کے برابر ہوگا ۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پوری ٹرین کو انجن سے طاقت لیکر ٹھنڈا کرنے کا انتظام کیا جائے تو ٹھنڈا کرنے کا اوسط خرچ ہر ڈبے کو برف سے ٹھنڈا کرنے کی نسبت کم ہوگا۔ سردیوں میں ٹرین کو گرم رکھا جا سکے گا مجھے اس منصوبے میں بہت دلچسپی تھی کیونکہ اس سے عوام کیلئے آرام سے سفر کرنے کے انتظام کی ابتدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ایک تو میں نے ۱۹۳۸ء میں ریل کے محکمے کا چارج چھوڑ دیا۔ پھر ۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی اور اس قسم کے منصوبوں میں دلچسپی کم ہو گئی اور توجہ زیادہ اہم امور کی طرف منتقل ہو گئی۔ افسوس ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بیس ۲۵ سال بعد بھی ابھی عام مسافروں کے لئے یہ سہولت مہیا نہیں کی جا سکی۔ حالانکہ ۳۷-۳۶ء میں مبصرین کی رائے تھی کہ اس کے مہیا کرنے کے راستے میں کوئی ناقابل حل مشکل نہیں۔ میرے نزدیک علاوہ آرام کے اس منصوبے کے جاری کرنے سے معاشرتی اور تمدنی فوائد بھی مترتب ہو سکتے تھے

حکومت برطانیہ سے اٹووا ٹریڈ اگریمنٹ کی ترمیم کے لئے گفتگو

تجارت کے محکمے میں بہت سے دلچسپ اور اہم مسائل زیر غور آتے رہتے تھے جن میں سے بعض پر اسمبلی میں بحث بھی چھڑ جاتی تھی اور سوال جواب کا سلسلہ تو سب کے متعلق جاری رہتا تھا۔ سب سے اہم مسئلہ جو میری وزارت کے زمانے میں زیر بحث آیا اٹووا تجارتی معاہدے کا مسئلہ تھا۔ تجارت کے محکمے کے سیکرٹری مسٹر ٹامس سٹوارٹ تھے جو سر فنڈلیٹر سٹوارٹ نائب وزیر ہند کے برادر اصغر تھے۔ بعد میں وہ خود بھی کونسل کے رکن ہوئے۔ اور پھر صوبہ بہار کے گورنر ہوئے۔ تجارت کے محکمے کے سیکرٹری ہونے کے زمانے میں وہ بہت محنت سے کام کرتے تھے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے پر ان کا نوٹ بہت مفصل اور نہایت واضح ہوتا تھا۔ ان کا نوٹ پڑھ لینے کے بعد مجھے مزید مطالعہ کی بہت کم ضرورت رہ جاتی تھی۔ تجارتی معاہدے کی بحث کی تیاری میں انہوں نے بہت محنت کی

اور میرا کام بہت ہلکا کر دیا۔ اسمبلی نے قرارداد پاس کی کہ معاہدے کے بعض پہلوؤں کی ترمیم کیلئے کوشش کی جائے تاکہ معاہدے کے فوائد میں معتدبہ اضافہ ہو سکے۔ نیز یورپ کے دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کو بڑھانے کے طریقے اختیار کئے جائیں۔ معاہدے کی ترمیم کے سلسلے میں مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ لنکا شائر کے تیار کردہ سوتی کپڑے کی درآمد پر جو رعائتی محصول عاید ہوتا ہے اس کی شرح بڑھائی جائے اور برطانیہ پر زور دیا جائے کہ وہ ہندوستانی کپاس زیادہ مقدار میں خرید کرے۔ اور بھی بہت سے اہم مسائل ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان قابل حل تھے۔ لیکن یہ مسئلہ اپنی نوعیت میں سب سے بڑھ کر تھا۔ بمبئی اور احمد آباد کے سوتی کارخانوں کے مالک مصر تھے کہ برطانوی سوتی کپڑے پر محصول کی رعایت کو اگر منسوخ نہ کیا جا سکے تو اسے جسقدر ہو سکے کم کیا جائے۔ زمیندار طبقہ زور دیتا تھا کہ ہندوستانی کپاس کی کھپت برطانیہ میں بڑھانے کی تدبیر کی جائے۔

شاہ جارج پنجم کی وفات پر پرنس آف ویلز کی جانشینی اور مسز سمپسن سے شادی پر اصرار کی وجہ سے تخت و تاج سے دستبرداری

جنوری ۱۹۳۶ء میں شاہ جارج پنجم فوت ہوئے اور ایڈورڈ ہشتم ان کے جانشین ہوئے۔ مسز سمپسن کا قضیہ شروع ہو چکا تھا۔ شاہ ایڈورڈ ان کے ساتھ شادی کرنے پر مصر تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس تجویز کو قبول کر لیں گے کہ مسز سمپسن کو شادی کے بعد تخت و تاج میں شریک نہ کیا جائے اور ان کی اولاد تخت کی وارث نہ ہو۔ لیکن وزیر اعظم مسٹر بالڈون اس تجویز کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ ادھر کلیسا کے لئے یہ دقت تھی کہ شاہ برطانیہ کلیسائے انگلستان کے سربراہ ہیں۔ کلیسا کے قواعد ایک مطلقہ عورت کے ساتھ جس کا پہلا خاوند زندہ ہو شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ اس قاعدے کی خلاف ورزی کر کے بادشاہ کلیسا کے سربراہ نہ رہ سکتے۔ غرض یہ معاملہ ایک نہایت نازک شکل اختیار کر گیا۔ آخر بادشاہ نے تخت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور ان کی جگہ ان کے برادر اصغر ڈیوک آف یارک جارج ششم کے لقب کے ساتھ شاہ برطانیہ ہوئے۔

لندن میں سر فیروز خاں نون کا تقرر بطور ہائی کمشنر

میں نے جب نومبر ۱۹۳۴ء میں سر جوزف بھور سے لندن میں ہائی کمشنر کے تقرر کے متعلق دریافت کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ وزیر ہند کے رسمی احکامات تو صادر نہیں ہوئے لیکن ان کے اندازہ کے مطابق کوئی ایسا امیدوار میدان میں نہیں جو ان سے زیادہ اس منصب پر تقرر کا حق رکھتا ہو۔ مئی ۱۹۳۵ء میں جب میں ان سے چارج لے چکا تو معلوم ہوا کہ سر جوزف کے کہنے پر وائسرائے نے وزیر ہند کی خدمت میں سفارش کی تھی کہ ہائی کمشنر کا عہدہ خالی ہونے پر سر جوزف کا اس عہدے پر تقرر کیا جائے۔ وزیر ہند نے جواب دیا کہ جلدی کیا ہے ابھی بہت وقت پڑا ہے اور چونکہ ہائی کمشنر کا محکمہ تجارت کے محکمے کے نیچے آتا ہے لہٰذا وزیر تجارت کی رائے معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ اسلئے ظفر اللہ خاں جب چارج لے چکے تو میں اسکی رائے کا بھی انتظار کروں گا۔ ۱۹۳۵ء کے دوران میں سر سیموئل ہور فرسٹ لارڈ آف ایڈمیرلیٹی ہو گئے اور لارڈ زٹلینڈ انکی جگہ

وزیر ہند ہوئے۔

دسمبر ۱۹۳۵ء میں مجھے سر فضل حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ہوا اور میں نے ان سے استصواب کیا کہ لندن میں ہائی کمشنر کے لئے موزوں ترین مسلمان کون ہوگا۔ آپ نے فرمایا امیدوار تو بہت ہیں، سر لیاقت حیات خاں، سر فیروز خاں نون وغیرہ لیکن سر عبدالقادر کا انتخاب مناسب ہوگا۔ شیخ سر عبدالقادر صاحب اس وقت وزیر ہند کی مشاورتی کمیٹی کے رکن تھے اور لندن میں مقیم تھے۔ ان دنوں دستور تھا کہ کرسمس کے موقعہ پر وائسرائے کلکتہ تشریف لے جاتے تھے اور کونسل کا ایک اجلاس آخر دسمبر یا شروع جنوری میں وہاں ہوتا تھا۔ اس اجلاس کیلئے میں پنجاب سے کلکتہ جاتے ہوئے ایک دن پٹنہ ٹھہرا۔ کونسل کے اجلاس کا ایجنڈا مجھے وہاں ملا جس میں ایک مسئلہ ہائی کمشنر کے انتخاب کا بھی تھا۔ میں اسی رات کلکتہ جانیوالا تھا کونسل کا اجلاس دوسرے دن صبح کو ہونا تھا اسلئے ایجنڈا پڑھ کر مجھے تشویش ہوئی کیونکہ اپنے رفقاء کے ساتھ مشورے کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔ کنور سر جگدیش پرشاد جن کے ساتھ میں بے تکلفی سے بات کر سکتا تھا اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کی وجہ سے چھٹی پر تھے اور انکی جگہ سر گرجا شنکر باجپائی کام کر رہے تھے۔

میں نے خان بہادر نادر شاہ سے کہا کہ اسٹیشن پر پہنچتے ہی معلوم کریں کہ کسی اور وزیر کا سیلون بھی اس میل ٹرین کے ساتھ کلکتہ جا رہا ہے یا نہیں جس سے ہم جانیوالے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچ کر انہوں نے بتایا کہ سر گرجا شنکر باجپائی کا سیلون گاڑی کے ساتھ آرہا ہے۔ مجھے یہ سنکر کچھ اطمینان ہوا کہ ان سے کچھ پس منظر اس معاملے کا معلوم ہو جائے گا۔ وہ ۱۹۳۲ء میں محکمہ تعلیم کے سیکرٹری کے طور پر میرے ساتھ کام کر چکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ وہ سر جوزف بھور سے کچھ آزردہ تھے۔

سر جوزف بھور شاہ جارج پنجم کے جشن سیمیں میں بطور نمائندہ حکومت ہند شامل ہوئے تھے۔ میاں سر فضل حسین نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اس موقعہ پر کامن ویلتھ کے تمام وزراء عظام لندن میں موجود ہوں گے اور بیرون ہند رہنے والے ہندوستانیوں کیلئے مراعات اور مساوات کے حصول کی سعی کیلئے یہ اچھا موقعہ ہوگا۔ لہذا بہتر ہوا اگر آپ سر گرجا شنکر کو ساتھ لے جائیں۔ وہ اس معاملے میں آپ کے مشیر و معاون ہوں گے۔ سر جوزف نے کہا میں بڑی خوشی سے یہ کام اپنے ذمے لینے کو تیار ہوں لیکن سر گرجا شنکر کے میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں! طبعاً یہ امر سر گرجا شنکر کو ناگوار ہوا تھا جب ریل پٹنہ پہنچی تو میں سر گرجا شنکر کے سیلون میں چلا گیا۔ وہ اپنے سونے کے کمرے میں جا چکے تھے اطلاع ہونے پر فوراً تشریف لے آئے اور باتوں باتوں میں انہوں نے خود ہی ہائی کمشنر کے تقرر کا ذکر چھیڑ کر فرمایا کیا مناسب نہ ہوگا کہ اگلی بار کسی موزوں مسلمان کا تقرر ہو۔ میں نے کہا طبعاً میں تو اس بات کا خواہشمند ہوں لیکن مجھے معلوم ہوا ہے وائسرائے صاحب سر جوزف بھور کی سفارش کر چکے ہیں۔ باجپائی کہنے لگے سر جوزف بھور تو اپنے آپکو ہر عہدے کیلئے موزوں ترین خیال کرتے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ وزیر تجارت ہوتے ہوئے وائسرائے سے اپنی سفارش اپنے ایک ماتحت عہدے کیلئے بھجوانا نہایت نامناسب فعل ہوگا۔ میں نے پوچھا پھر تو آپکی رائے انکے حق میں نہ ہوگی؟ کہنے لگے چودھری صاحب میرے لئے یہ مشکل ہے

کہ میں عارضی طور پر کام کر رہا ہوں اور مناسب نہیں کہ میں اس قضیے میں دخل دوں۔ میں غیر جانبدار رہوں گا۔ اتنے میں خان بہادر نادر شاہ نے اطلاع دی کہ ہمارا سیلون بھی گاڑی کے ساتھ لگا دیا گیا ہے اور گاڑی اب روانہ ہونیوالی ہے میں سر گر جا شنکر سے رخصت ہو کر اپنے سیلون میں چلا گیا کونسل کا اجلاس BELVEDERE میں ہوا جہاں وائسرائے قیام پذیر تھے۔ اجلاس سے قبل مجھے سر ہنری کریک اور سر جیمز گرگ سے بات کرنے کا موقعہ مل گیا۔ سر ہنری کریک تو سر عبدالقادر کی تائید پر رضامند ہو گئے۔ سر جیمز گرگ نے کہا میں بھور کے تقرر کے سخت مخالف ہوں۔ اس کے علاوہ جو نام تم تجویز کرو مجھے منظور ہو گا۔ مجھے معلوم تھا کہ نوئیس اور سر کار سر جوزف بھور کی تائید میں ہیں اسلئے ان سے بات کرنا بے سود تھا۔ اجلاس میں وائسرائے نے کہا وزیر ہند کونسل کی رائے لندن میں آئندہ ہائی کمشنر کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس معاملے میں اپنی آراء بتا دیں تاکہ میں انہیں مطلع کر دوں۔ سر فرینک نوئیس نے کہا آپ پہلے سر جوزف بھور کی سفارش کر چکے ہیں کیا یہ کافی نہیں؟ وائسرائے نے فرمایا میری رائے وزیر ہند کو معلوم ہے اب وہ کونسل کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔

کمانڈر انچیف۔ مجھے ان معاملات کے ساتھ بہت کم سابقہ پڑتا ہے۔ میری اس معاملے میں کوئی پختہ رائے نہیں۔

سر فرینک نوئیس۔ مجھے آپ کے ساتھ اتفاق ہے۔ سر جوزف بھور نہایت قابل شخص ہیں۔ اور انکی پہلی خدمات ایسی قابل قدر ہیں کہ میرے ذہن میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کا مقابلہ کر سکے۔

سر این سرکار۔ مجھے نوئیس کے ساتھ اتفاق ہے۔

سر جیمز گرگ۔ میں بھور کے سخت مخالف ہوں۔

وائسرائے۔ آپ بھور کے خلاف ہیں لیکن کس کے حق میں ہیں؟

سر جیمز گرگ۔ میں بھور کو کسی صورت نہیں چاہتا اور کسی کا بھی تقرر ہو جائے مجھے اعتراض نہیں۔

سر ہنری کریک۔ میں سمجھتا ہوں اس دفعہ کسی مسلمان کا تقرر ہونا چاہیئے۔ میری رائے میں سر عبدالقادر موزوں ہوں گے۔

سر فرینک نوئیس۔ سر عبدالقادر اور سر جوزف بھور کا بھلا آپس میں کیا مقابلہ ہے؟

سر ہنری کریک۔ سر عبدالقادر قابل شخص ہیں اور صاحب تجربہ ہیں۔ پنجاب میں وزیر، رکن عاملہ، کونسل کے صدر، ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں، اور اب وزیر ہند کی مشاورتی کونسل کے رکن ہیں۔

سر جیمز گرگ۔ مجھے سر ہنری کریک کے ساتھ اتفاق ہے۔ میں نے کہا ہائی کمشنر کو سب سے زیادہ میرے ساتھ کام کرنا پڑے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ سر جوزف بھور کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے اور وزیر ہند نے بھی

ہدایت دی تھی کہ میرے چارج لینے تک جو اہم معاملات سر جوزف بھور کے محکموں میں زیر غور آئیں ان کے ضروری کاغذات میری اطلاع کے لئے مجھے بھیجے جائیں۔ میری لندن سے واپسی پر سر جوزف بھور نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسا کیا جائے گا لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہو گی کہ چھ ماہ کے عرصہ میں انہوں نے مجھے ایک سطر تک نہ بھیجی۔ جب انکی بے اعتمادی کا یہ عالم ہے تو مجھے ان سے تعاون کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

سر جیمز گرگ ۔ مجھے ظفر اللہ کے ساتھ اتفاق ہے ہم دونوں کو بھور پر اعتماد نہیں ۔

سر گرجاشنکر باجپائی ۔ جناب عالی میں عارضی طور پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں سر جگدیش پرشاد کی اس معاملے میں کیا رائے ہے۔ اسلئے میں اس معاملے کے متعلق کوئی رائے نہیں دینا چاہتا ۔

وائسرائے ۔ کونسل میں سے تین آراء سر عبدالقادر کے حق میں ہیں۔ اور دو سر جوزف بھور کے حق میں ہیں میں یہ اطلاع وزیر ہند کو بھیج دوں گا ۔

سر فرینک نوئیس ۔ یہ کیسے ؟ آپ کی رائے بھی تو سر جوزف بھور کے حق میں ہے۔ دونوں طرف آراء برابر ہو گئیں۔ اس صورت میں آپکو کاسٹنگ ووٹ کا اختیار ہے۔

وائسرائے ۔ اس وقت میری رائے غیر متعلق ہے۔ وزیر ہند اراکین کونسل کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

لارڈ زیٹلینڈ وزیر ہند کا سر جوزف بھور کو لندن میں ہائی کمشنر بنانے پر ناکام اصرار

دلی واپس پہنچنے کے بعد وائسرائے نے مجھے طلب فرمایا اور ہائی کمشنر کے تقرر کے متعلق وزیر ہند کا تار دکھایا۔ وزیر ہند نے لکھا تھا میں سر عبدالقادر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ بہت بھلے آدمی ہیں۔ لیکن انتظامی امور کا زیادہ تجربہ نہیں رکھتے اسلئے میری رائے میں ان کا تقرر موزوں نہیں ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ نواب چھتاری، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، سر سکندر حیات خاں، نواب لیاقت حیات خاں، مسٹر لطیفی وغیرہ کی بھی خواہش ہو گی کہ انہیں زیر غور لایا جائے۔ لیکن میں ان سب کو جانتا ہوں اور میری رائے میں ان میں سے کوئی بھی موزوں نہیں۔ آپ کوشش کریں کہ گرگ اور ظفر اللہ بھور کے تقرر پر رضامند ہو جائیں۔ وائسرائے نے دریافت کیا اب تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا میں تو سر جوزف بھور کے تقرر پر رضامند نہیں۔ سر جیمز گرگ سے مشورہ کر کے مزید گذارش کروں گا۔ وائسرائے سے رخصت ہو کر میں سر جیمز گرگ کے پاس گیا اور انہیں وزیر ہند کے تار کے متعلق بتلایا۔ انہوں نے کہا میں بھی بھور کے تقرر پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتا لیکن اب کیا تجویز کی جائے؟ میں نے کہا میرا اندازہ ہے کہ موجودہ وزیر ہند (لارڈ زیٹلینڈ) کسی مسلمان کا تقرر نہیں چاہتے اسلئے جتنے مسلمانوں کے نام انہیں یاد تھے۔ انہوں نے سب کو بیک قلم ناموزوں قرار دیدیا ہے حالانکہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کو اگر یہ عہدہ پیش بھی کیا جائے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے رضامند نہ ہوں۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم وائسرائے کو کسی ایسے شخص کا نام پیش کریں جس کا ریکارڈ مسلمہ ہو لیکن جسے وزیر ہند ذاتی طور پر نہ جانتے ہوں ورنہ وہ کہہ دیں گے

میں انہیں جانتا ہوں میری رائے میں وہ موزوں نہیں۔ سر جیمز نے دریافت کیا تمہارے ذہن میں کوئی ایسا شخص ہے؟ میں نے کہا سر فیروز خاں نون ہیں۔ پوچھا وہ جانے کے لئے رضامند ہوں گے؟ میں نے کہا شوق سے جائیں گے۔ سر جیمز نے کہا تو پھر ابھی چلو وائسرائے سے بات کریں۔ وائسرائے نے بھی دریافت کیا کہ سر فیروز خاں نون رضامند ہوں گے؟ میں نے کہا یقیناً ہوں گے۔ میں ذمہ لیتا ہوں۔ وائسرائے نے وزیر ہند کی خدمت میں تار بھیج دیا کہ گرگ اور ظفر اللہ بھورے کے تقرر پر تو کسی صورت بھی رضامند نہیں وہ وزیر تعلیم پنجاب سر فیروز خاں نون کا نام پیش کرتے ہیں جو آکسفورڈ کے ایم اے ہیں، بیرسٹر ہیں اور آٹھ سال سے پنجاب میں وزیر ہیں۔ مجھے اتفاق ہے کہ ان کا تقرر موزوں ہو گا۔ آخر وزیر ہند کو اپنی ضد ترک کرنی پڑی۔ اور ملک سر فیروز خاں نون کا تقرر بطور ہائی کمشنر لندن ہو گیا۔ جب وزیر ہند کی رضامندی کا تار وائسرائے کو آ گیا تو انہوں نے کونسل میں اس کا ذکر کیا۔ سر فرینک نوئیس کچھ بڑبڑائے لیکن پھر خود ہی کہا اب وزیر ہند فیصلہ کر چکے ہماری رائے زنی بے کار ہے۔

شاہ جارج ششم کی تاجپوشی میں بطور نمائندہ برطانوی ہند شمولیت

مئی ۱۹۳۷ء میں شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کی تقریب قرار پائی۔ حکومت ہند کی طرف سے مجھے برطانوی ہند کا نمائندہ تجویز کیا گیا۔ ہز ہائی نس مہاراجہ بڑودہ والیان ریاست کے نمائندہ تجویز ہوئے۔ جشن تاجپوشی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا اور بخیریت سرانجام پایا۔

کامن ویلتھ وزرائے عظام کی کانفرنس میں شمولیت

جشن تاجپوشی کے بعد کامن ویلتھ کے وزرائے عظام کی کانفرنس کے اجلاس ہونے والے تھے۔ اس کے نمائندوں میں بھی مجھے شامل کیا گیا۔ اس کانفرنس میں کامن ویلتھ کے وزرائے عظام سے شناسائی کا موقعہ میسر آیا۔ کانفرنس کے دوران میں ہی مسٹر بالڈون برطانیہ کی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے اور مسٹر نیول چیمبرلین نے انکی جگہ لی۔

حکومت برطانیہ کے ساتھ معاہدہ تجارت کی ترمیم کی بات چیت

ان مصروفیتوں کے بعد برطانوی وزارت تجارت کے وفد کے ساتھ معاہدہ تجارت کی ترمیم کے متعلق گفتگو شروع ہونے والی تھی۔ ہندوستانی وفد کی قیادت میرے سپرد ہوئی میرے ساتھ چھ غیر سرکاری مشیر تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب جو دس سال بعد پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہوئے، سردار سر داتار سنگھ جو بعد میں امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے وائس چیئرمین ہوئے، سر ایڈورڈ بینتھال جو بعد میں گورنر جنرل کی کونسل کے رکن ہوئے، مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس، مسٹر کستور بھائی لال بھائی اور مسٹر جی ڈی برلا۔ جب حکومت ہند کی طرف سے ان اصحاب کو میرے ساتھ بطور مشیران کام کرنے کی دعوت دی گئی تو پہلے تین اصحاب نے تو بلا تامل یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن آخری تین کی طرف سے سر پرشوتم داس ٹھاکر داس مجھے ملنے کے لئے شملے تشریف لائے اور کہا ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا تقرر محض زیبائشی ہے یا واقعہ میں ہم مشیر ہوں گے۔ میں نے کہا میری تو یہی نیت ہے کہ آپ کے ساتھ ہر قدم پر پورا مشورہ ہو۔ اور آپ کے مشورے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ حکومت کے

نمائندے کی حیثیت سے آخری فیصلہ تو میرا ہی ہوا کرے گا لیکن میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے سب فیصلے نہ صرف باہمی مشورے سے ہوں گے بلکہ بالاتفاق ہوا کریں گے۔ اس سے ان کا اطمینان ہو گیا اور ان تینوں اصحاب نے بھی حکومت ہند کی دعوت قبول کر لی۔ برطانیہ کے وزیر تجارت کرنل آلیور سٹینلے تھے۔ جو لارڈ ڈاربی کے فرزند تھے۔ وزارت کے سیکرٹری مسٹر براؤن نہایت قابل اور زود فہم تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے لئے وزارت کی طرف سے ایک وفد مقرر کیا گیا جس کے چیئرمین تو سر فریڈرک وایٹ تھے لیکن باقی سب اراکین سرکاری افسر اور مبصرین تھے۔ سر فریڈرک ہندوستان کی اسمبلی کے پہلے صدر رہ چکے تھے اور غالباً یہ فرض کیا گیا ہو گا کہ وہ ہندوستانی مسائل اور مزاج کو خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ مفروضہ محض وہم ثابت ہوا۔ ان کے مشیر جو وفد میں شامل تھے بیشک اپنے فرائض منصبی کی سرانجام دہی کے لحاظ سے نہایت قابل اور تجربہ کار اصحاب ہوں گے لیکن ہماری مشترکہ مہم کے لحاظ سے محض لکڑی کے مجسمے تھے۔ میرے ساتھ صرف ایک سیکرٹری تھے۔

سر راگھوان پلے آئی، سی، ایس | جب میں نے ۱۹۳۵ء میں اپنے عہدے کا چارج لیا تو مسٹر صالح اکبر حیدری نے مجھ سے ذکر کیا کہ انڈین سول سروس کے مسٹر این آر پلے جو ان دنوں بمبئی میں کسٹمز کے کلکٹر تھے نہایت قابل افسر ہیں۔ اگرچہ سر جوزف بھور اور مسٹر پلے دونوں صوبہ مدراس کے رہنے والے تھے اور دونوں عیسائی تھے اور دونوں کی بیویاں انگریز تھیں لیکن دونوں کے درمیان کوئی ایسا ربط نہیں تھا۔ میں نے مسٹر پلے کو اپنے محکمے میں ڈپٹی سیکرٹری مقرر کر دیا اور وہ ویسے ہی قابل ثابت ہوئے جیسے مسٹر حیدری نے کہا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جائنٹ سیکرٹری کی جگہ خالی ہونے پر وہ جائنٹ سیکرٹری ہوئے۔ بعد میں وہ حکومت ہند کے ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے اور نائٹ ہڈ کا خطاب بھی پایا۔ تجارتی وفد میں وہ میرے واحد سرکاری مشیر اور سیکرٹری تھے۔ وہ بڑی خوبی سے اپنے فرائض کو سرانجام دیتے رہے۔ دونوں وفود کے پہلے اجلاس میں ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ وفود کے درمیان گفتگو کا سلسلہ تو بہت طویل ہو جائے گا اور ہم کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گے۔ دو چار اجلاسوں کے بعد میں سر فنڈلیٹر سٹوارٹ نائب وزیر ہند سے ملا اور اجلاسوں کی کارروائی کی کیفیت ان سے بیان کی۔ انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا کہ اس طور پر کام کرنا نتیجہ خیز نہ ہو گا انہوں نے فرمایا میں براؤن سے کہوں گا کہ تمہاری آپس میں براہ راست بات چیت ہو تو زیادہ تسلی بخش صورت پیدا ہو جائے گی۔ جب وہ مسٹر براؤن سے بات کر چکے تو مجھے فرمایا اب تم خود براؤن سے مل لو۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں بہت بیدار مغز پایا۔ ہم نے آپس میں یہ طریق کار طے کیا کہ وفود کے درمیان مباحثات کا طریق ترک کر دیا جائے۔ ہم آپس میں کام کی ایک ترتیب طے کر لیں۔ اس ترتیب کے مطابق ہم دونوں آپس میں بات چیت کر کے جب کسی حصے پر مفاہمت کے قریب پہنچ جائیں تو میں اپنے وفد سے مشورہ کر لوں اور وہ اپنے وزیر صاحب سے مشورہ کریں اور اس کے بعد ہم ایک دو ملاقاتوں میں اس حصے کے متعلق فیصلہ کر لیا کریں۔ ہمارا کام پیچیدہ بھی تھا اور طویل بھی۔ اگر دو وفود براہ راست آپس میں بحث میں الجھے رہتے تو کئی سالوں میں بھی ختم نہ ہو سکتا۔

مسٹر براؤن کے ساتھ یہ قرار پایا کہ پہلے مرحلے میں ہم یہ طے کرنے کی کوشش کریں کہ ہندوستان کے برطانیہ سے کیا کیا مطالبات ہیں اور ان کے متعلق مفاہمت کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا اور اہم مطالبہ تو یہ تھا کہ برطانیہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں کپاس خرید کرے۔ لیکن اس مطالبے کے متعلق کسی تصفیے پر پہنچنا اس بات کے ساتھ متعلق تھا کہ برطانوی سوتی کپڑے پر شرع محصول کیا ہو۔ پہلے مرحلے پر یہ طے پایا کہ پیچیدہ مسئلے کو ایک طرف رہنے دیا جائے اور اس پر بعد میں غور کیا جائے۔ اوّل یہ کوشش کی جائے کہ باقی سب امور باہمی رضامندی سے طے ہوجائیں۔ مسٹر براؤن کے ساتھ میری ملاقات ہفتے میں دو تین بار ہوتی۔ اپنے مشاورتی وفد کے ساتھ روزانہ مشورہ ہوتا۔ ہر مرحلے پر حکومت ہند کو اطلاع دیجاتی کہ کیا طے ہورہا ہے۔ جب کسی مسئلے کے متعلق کوئی فارمولا تجویز کیا جاتا اور پھر اس میں کوئی ترمیم مدنظر ہوتی تو میں مسٹر پلے کو چند منٹوں میں سمجھا دیتا اور وہ اپنے کمرے میں جاکر پیچیدہ سے پیچیدہ تجویز کو نہایت صاف اور آسان الفاظ میں قلمبند کرکے چند منٹوں میں لے آتے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ کسی جادو منتر سے کام لیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے بہت صاف فہم عطا فرمایا ہے اور ساتھ ہی سادہ الفاظ میں مشکل سے مشکل مطالب کو بیان کرنے کا ملکہ ودیعت کیا ہے۔ میں نے ایک دن ان سے کہا جو کام آپ کرتے ہیں وہ ہزار جتن کرنے کے باوجود مجھ سے تو نہ ہوسکے۔ مسکرائے اور کہا میں بھی جب دیکھتا ہوں کہ ان اہم مسائل پر گفتگو کے دوران تم کسی تجویز یا ترمیم کے متعلق کس قدر جلد رائے قائم کرلیتے ہو تو مجھے بھی حیرت ہوتی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ سے تو کسی صورت ایسا نہ ہوسکے۔ میں نے کہا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ جو کام ہمارے سپرد ہوا ہے اس کے ایک حصے کے متعلق مجھے مناسب فہم عطا فرما دیا ہے اور دوسرے حصے کے متعلق آپ کو اعلیٰ ملکہ عطا فرمایا ہے اور ہمیں اس کام میں شریک کردیا ہے۔

یورپ کے مختلف ممالک کا سفر اور ان ممالک کے وزرائے وافسران محکمہ تجارت سے ملاقاتیں

وسط جولائی میں انگلستان میں تعطیل کا موسم شروع ہوگیا اور برطانوی وزارت تجارت کے افسران باری باری رخصت پر جانے لگے۔ لہٰذا تجارت کے معاہدے پر گفتگو اگست کے آخر تک ملتوی ہوگئی۔ میں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سر گلبرٹ لیتھویٹ کو تار دیا کہ وائسرائے سے دریافت کرکے مطلع فرمادیں کہ میں اتنے عرصہ کیلئے واپس آجاؤں یا انگلستان میں ہی ٹھہروں؟ ان کا جواب آیا کہ چونکہ واپس آنے جانے میں اتنا وقت صرف ہوجائے گا کہ تم یہاں دو ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہر سکوگے لہٰذا وائسرائے کا ارشاد ہے کہ اسمبلی کی قرارداد کے دوسرے حصے کی تعمیل میں تم یورپ کے دیگر ممالک میں جاؤ اور ان کے ساتھ ہندوستانی تجارت کو فروغ دینے کے متعلق تبادلہ خیالات کرو۔ چنانچہ میں اس سفر پر روانہ ہوگیا اور ہیگ، برلن، کوپن ہیگن، سٹاک ہولم، ہیلسنگفورس، وارسا، پراگ، برلین، وی انیا، بوڈاپسٹ، روم، سوئٹزرلینڈ، پیرس میں ان ملکوں کے وزرائے تجارت اور افسران

محکمہ تجارت اور بعض مقامات پر وزراء خارجہ سے ملاقاتیں کیں۔ اور ہندوستان کی تجارت کے فروغ دینے کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ چونکہ ان ممالک میں ہندوستان کی براہ راست کوئی نمائندگی نہیں تھی اسلئے ہر جگہ برطانوی سفارت خانے کی وساطت کی محتاجی تھی۔ کہیں کہیں میرے اپنے ذاتی تعلقات بھی ممد ہوئے۔ سفر سے میری ذاتی واقفیت میں بہت اضافہ ہوا۔ میرے سفر کا مقصد صرف ابتدائی معلومات حاصل کرنا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کی تجارت کو ان ملکوں میں فروغ دینے کے لئے متواتر جدوجہد اور بالخصوص ہندوستان سے تجارتی وفود بھیجنے کی ضرورت ہے۔ بوڈاپسٹ میں حکومت کی طرف سے علاوہ دیگر معلومات بہم پہنچانے کے مجھے ان کا زراعتی عجائب گھر دکھانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس ملک نے جو پہلی عالمی جنگ کے بعد اپنی سابقہ وسعت کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا ملک ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنی پیداوار کی برآمد کے متعلق کیسا عمدہ انتظام کیا ہوا ہے۔ عجائب گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑے ہال کی سامنے کی دیوار پر بڑے پیمانے کا سارے ملک کا نقشہ بنا ہوا تھا جس پر مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے بجلی کے بلب مختلف رنگوں کے لگے ہوئے تھے۔ جو افسر ہمیں عجائب گھر دکھا رہے تھے وہ نقشے کے سامنے رکھی ہوئی میز کے پاس کھڑے ہو کر میز کے ساتھ لگے ہوئے بٹنوں میں سے ایک دبا دیتے تو ایک خاص رنگ کے بلب مثلاً سرخ یا سبز یا زرد یا نیلے نقشے پر روشن ہو جاتے اور وہ افسر ہمیں بتا دیتے کہ ان مقامات پر جو اس وقت روشن ہیں فلاں جنس یا فلاں پھل کی پیداوار ہوتی ہے جس کی کل مقدار اتنی ہے۔ اس میں سے اس قدر ملک کے اندر خرچ ہوتی ہے اور اسقدر باہر جاتی ہے۔ عجائب گھر کے دوسرے کمروں میں انہوں نے ہمیں بعض تفاصیل باہر جانیوالی پیداوار کے ضبط کے متعلق بتائیں۔ مثلاً ایک سادہ سا لکڑی کا بورڈ دکھایا اور بتایا کہ جہاں جہاں سیب دوسرے ممالک کو بھیجنے کیلئے بکسوں میں بند کئے جاتے ہیں وہاں اس قسم کے بورڈ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر سیب ایسے بورڈ کے سوراخوں میں سے گذرتا ہے اور جو سیب باہر بھیجنے کیلئے مقررہ وزن یا حجم سے کم ہوتا ہے وہ چھانٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ ستائیس سال بعد ۱۹۶۲ء میں جاپان میں بھی میں نے ایک سیبوں کی پیکنگ فیکٹری میں بڑے پیمانے پر یہ انتظام دیکھا۔ ہنگری میں مجھے بتایا گیا کہ ملک سے باہر جانیوالی اجناس اور اشیاء پر حکومت کا اسقدر ضبط ہے کہ کوئی ناقص چیز باہر نہیں جا سکتی۔ میری دانست میں اگر پاکستان میں بھی ایسا ہی انتظام کر دیا جائے تو پاکستان کی ساکھ بیرونی تجارتی حلقوں میں بہت بڑھ جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت پاکستانی تاجروں کی شہرت غیر ممالک میں قابل رشک نہیں۔ ستمبر کے شروع میں پھر برطانوی وزارت تجارت کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وسط اکتوبر تک پہلے مراحل کے متعلق ہمارے نقطۂ نگاہ سے خاطر خواہ سمجھوتہ ہو گیا۔ لیکن دونوں جانب سے مشکل مسائل کا حل ابھی باقی تھا۔ ان کے متعلق یہ قرار پایا کہ فی الحال گفتگو کا سلسلہ ملتوی ہو اور شروع سال میں پھر جاری ہو۔ اس وقت لنکا شائر کے سوتی کارخانہ والوں سے بھی مشورہ لازم ہو گا۔

میں جب واپسی پر بمبئی پہنچا تو مجھے خیال ہوا کہ اس مرحلے پر قائد اعظم مسٹر جناح سے مل لینا بھی مناسب ہوگا۔ چنانچہ میں انکی خدمت میں حاضر ہوا اور تجارتی معاہدے کی گفتگو جس نہج پر چل رہی تھی مختصراً گوش گذار کی۔ میں جانتا تھا کہ تفصیل انہیں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سے معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ بمبئی کے تجارتی حلقوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ میری بات سنکر انہوں نے فقط اتنا فرمایا کہ تم اپنی سی کوشش کئے جاؤ اگر نتیجہ ہندوستان کے حق میں فائدہ مند ہوگا تو مجھے نئے معاہدے کی تائید میں تامل نہ ہوگا۔ میں نے کہا ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے لیکن میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اگر نیا معاہدہ طے ہو جائے تو آپ اسکا جائزہ تجارتی نقطہ نگاہ سے لیں گے سیاسی نقطہ نگاہ سے نہ لیں گے۔ فرمایا یہی صحیح موقف ہے اور میں ایسا ہی کروں گا۔

۱۹۳۹ء میں میں پھر وفد کے ساتھ لندن گیا۔ اس دفعہ ہندوستانی کپاس کی خرید کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔ جب مسٹر براؤن کے اور میرے درمیان اس مسئلہ پر مفاہمت ہوگئی اور اس پر میرے مشیران بھی رضامند ہوگئے تو برطانوی وزیر تجارت اڑ گئے کہ انہیں یہ تجویز کسی صورت منظور نہیں۔ تجویز یہ تھی کہ برطانیہ ہر سال ہندوستان سے ایک مقررہ مقدار میں کپاس خرید کرے۔ اگر برطانیہ کی خرید کپاس معاہدے میں درج شدہ مقدار کے مطابق ہو تو لنکاشائر سے ہندوستان درآمد ہونیوالے سوتی کپڑے پر درآمدی محصول رعایتی شرح سے لگایا جائے۔ اگر خرید کردہ کپاس کی مقدار کم رہے تو کمی کے مطابق درآمدی محصول میں اضافہ ہو جائے۔ برطانوی وزیر تجارت کرنل سٹینلے کا کہنا تھا کہ یہ شرط تعزیری ہے اور ہمارے لئے توہین کا باعث ہے۔ دوسرے انہیں مجوزہ مقدار پر بھی اعتراض تھا کہ یہ بہت زیادہ ہے اور ممکن ہے برطانیہ میں اتنی کپاس کی کھپت نہ ہو یہ رکاوٹ پیدا ہونے پر میں پھر مسٹر فنڈلیٹر سٹوارٹ سے ملا۔ انہوں نے فرمایا مسٹر ولسن وزیر اعظم کے مشیر خاص ہیں میں ان کے ساتھ تمہاری ملاقات کا انتظام کر دیتا ہوں۔ ان کا دفتر بھی نمبر ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ ہی میں ہے۔ تم انہیں معاملہ سمجھا دو اور کہو کہ وہ وزیر اعظم کو مشورہ دیں کہ یہ معاملہ کیبنٹ میں پیش ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا مسٹر براؤن تو کہتے ہیں کہ کرنل سٹینلے یہ معاملہ کیبنٹ میں لے جانے پر رضامند نہیں۔ انہوں نے فرمایا اگر وزیر اعظم حکم دیں گے تو انہیں چارہ نہیں ہوگا۔ ولسن وزیر اعظم کے ساتھ بات کرنے سے پہلے براؤن سے ضرور دریافت کرے گا اور جب براؤن کو رضامند پائے گا تو وزیر اعظم کو بتا سکے گا کہ محکمے کو تو کوئی اعتراض نہیں البتہ وزیر تجارت کو تامل ہے۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی معاملہ کیبنٹ میں گیا اور باوجود وزیر تجارت کرنل سٹینلے کے تامل کے وزیر اعظم کی رائے کے مطابق جو کچھ مسٹر براؤن کے اور میرے درمیان طے ہوا تھا اس کی کیبنٹ نے منظوری دیدی۔ اب سب سے مشکل یہ مرحلہ باقی رہ گیا کہ لنکاشائر کے سوتی کپڑے کی درآمد پر رعایتی شرح محصول کیا مقرر کی جائے۔ میں نے مسٹر براؤن سے کہا کہ ہم دو مرتبہ اس سلسلے میں انگلستان آچکے ہیں۔ اب لنکاشائر والوں کو چاہیئے کہ وہ شروع مئی میں شملے آجائیں اور اس آخری مسئلے پر وہاں گفتگو ہو۔ انہوں نے کہا مناسب ہے۔ میں شروع اپریل میں واپس دلی پہنچ گیا۔ شروع مئی میں لنکاشائر کا وفد شملے آیا۔ لیکن ہماری آپس میں مفاہمت نہ ہوسکی۔ البتہ ہمیں یہ اندازہ

ہو گیا کہ وہ کیا مطالبہ کرتے ہیں اور چارہ ناچار کس قدر پر راضی ہو سکیں گے۔ میں نے برطانوی وفد کے ساتھ آخری گفتگو کا خلاصہ وائسرائے کی خدمت میں پیش کر دیا اور اپنا اندازہ بھی بتایا کہ میرے خیال میں اس نہج پر معاملہ طے ہو سکے گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ برطانوی وفد تو بحری جہاز سے واپس ہونیوالا ہے۔ بہتر ہو میں ہوائی جہاز سے انگلستان چلا جاؤں۔ اگرچہ رسمی گفتگو تو لنکاشائر کے وفد کے واپس پہنچ جانے پر ہی شروع ہوگی۔ اور اتنے میں ہمارا مشاورتی وفد بھی لندن پہنچ جائے گا۔ لیکن مجھے موقعہ مل جائے گا کہ میں غیر رسمی گفتگو میں اپنا نقطۂ نظر پہلے پیش کر لوں گا۔ وائسرائے اس پر راضی ہو گئے اور میں شروع جون میں لندن چلا گیا۔ میرے لئے اپنے مشاورتی وفد کے لحاظ سے ایک مشکل یہ تھی کہ جو امر طے کرنا باقی تھا اس کا اثر ہندوستانی سوتی کپڑے کے کارخانہ داروں پر پڑتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ لنکاشائر کے سوتی کپڑے پر درآمدی محصول میں اوّل کوئی رعایت دی ہی نہ جائے لیکن اگر رعایت دینا لازمی ہو (جیسے وہ بھی جانتے تھے کہ لازمی ہے) تو کم سے کم رعایت دی جائے۔ اس کا حل میں نے یہی سوچا کہ جسقدر رعایت دینے پر میرا مشاورتی وفد آمادہ تھا میں اس سے بھی کم رعایت دینے پر لنکاشائر والوں کے ساتھ اڑا رہوں۔ اس طرح میرے پاس کچھ گنجائش رعایت کو زیادہ کرنیکی ہوگی۔ میں امید رکھتا تھا کہ خواہ لنکاشائر والے راضی نہ بھی ہوں۔ پھر بھی مسٹر براؤن کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے جس کے نتیجے میں رعایت کی منظور شدہ شرح اس شرح سے کچھ کم ہی ہوگی جو میرے مشاورتی وفد کے کارخانہ داران اراکین کی آخری حد تھی۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور مسٹر کستور بھائی لال بھائی کا موقف تو سارا وقت معقول رہا۔ مسٹر برلا کا موقف بظاہر تو یہ تھا کہ ہم جو طلب کرتے ہیں وہ ہمیں پورا ملنا چاہیئے اور ہمیں دوسری طرف کا کوئی مطالبہ منظور نہیں کرنا چاہیئے لیکن دوسرے دونوں کے سمجھانے بجھانے سے مان جاتے تھے۔ آخر ایک دن ایک معاملہ پر وہ اڑ گئے۔ اب تک ہم سب کاروائی اتفاق رائے سے کرتے چلے آئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی ایک معاملے میں بھی ہمارے درمیان اختلاف باقی رہ جائے۔ آخر مسٹر برلا نے کہا اچھا میں مان جاتا ہوں بشرطیکہ معاہدے کی اس شق کی تعبیر وقت آنے پر مجھ پر چھوڑ دیجائے۔ میں نے کہا میری تو یہ کوشش ہے کہ معاہدے کی ہر شق ایسی واضح ہو کہ تعبیر کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن پھر بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا موقعہ پیدا ہو جائے۔ یہ معاہدہ دو حکومتوں کے درمیان ہوگا۔ اختلاف کی صورت میں کوئی طریق اختلاف کے رفع کرنیکا بھی آپس میں طے کیا جائیگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تعبیر آپ پر چھوڑ دی جائے؟ مسٹر برلا نے فرمایا کانگرس میں تو جب باپوجی (گاندھی جی) کے ساتھ اختلاف ہوتا ہے تو وہ آخر میں کہہ دیتے ہیں۔ اچھا میں تمہارا فارمولا مان لیتا ہوں بشرطیکہ اس کی تعبیر مجھ پر چھوڑ دی جائے۔ میں نے کہا کانگرس میں تو یہ بات چل جاتی ہے کیونکہ آخر آپ کو گاندھی جی کی بات ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن دو حکومتوں کے درمیان تو یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ اختلاف کی صورت میں آپ کی تعبیر تسلیم کی جائے۔ اوّل تو کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ عبارت ایسی صاف اور واضح ہو کہ اس کے مطلب کے متعلق کوئی اختلاف پیدا ہی نہ ہو۔ اور اگر اختلاف پیدا ہو ہی جائے تو اس کا فیصلہ کسی غیر جانبدار ثالث یا

منصف کے سپرد ہونا چاہئے۔ پہلے سے یہ نیت کر لینا کہ دوسرا فریق تو ان الفاظ سے یہ مطلب لیگا لیکن ہم وقت آنے پر ان الفاظ کی کچھ اور تعبیر کریں گے دیانت کے خلاف ہے۔ مسٹر برلا نے فرمایا باپو جی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس وقت تو مجھے خیال ہوا کہ مسٹر برلا کو گاندھی جی کی کسی بات سے غلط فہمی ہوئی ہوگی لیکن بعد میں جب کئی بار کانگریس کی قیادت نے تعبیر کے بہانے معاہدات کو بدلنے کی کوشش کی اور اس آڑ میں ان کی خلاف ورزی کی تو مجھے مسٹر برلا کی بات پر یقین کرنا پڑا۔ ۱۹۴۶ء کی کیبنٹ مشن کی تجویز جو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے منظور کر لی تھی پنڈت جواہر لال نہرو کی تعبیروں کا شکار ہوگئی اور وزیر اعظم اٹیلی جیسے تقسیم ہند کے شدید مخالف بھی سمجھ گئے کہ ملک کی تقسیم کے بغیر چارہ نہیں۔ پھر کشمیر میں آرا شماری کے متعلق پنڈت جی کے متعدد وعدے اور اعلانات اور اقوام متحدہ اور کمشن کی قراردادیں جنہیں وہ تسلیم کر چکے تھے تعبیر کا شکار ہوگئیں۔ جس کے نتیجے میں برصغیر کا امن برسوں سے خدشے میں پڑا ہوا ہے اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں تو باہم جنگ تک بھی نوبت پہنچ گئی۔

یہ تو میرے مشاورتی وفد کا حال تھا۔ ادھر کرنل سٹینلے سے ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بھرے بیٹھے تھے۔ علیک سلیک کے بعد فرمایا۔ ظفر اللہ! میں تو سوچ رہا ہوں کہ پچھلی مرتبہ اس مسئلے کا جو فیصلہ کیبنٹ نے میری مرضی کے خلاف کیا تھا اس پر احتجاج کرتے ہوئے میں استعفیٰ دیدوں! میں نے کہا سٹینلے! مجھے تو یہ سنکر کوئی تردد پیدا نہیں ہوا۔ اول تو آپ نے استعفےٰ دینا ہوتا تو اسی وقت دیدیتے۔ دوسرے یہ آپ کا اور وزیر اعظم یا کیبنٹ کا معاملہ ہے میرا اس میں کیا دخل ہے۔ تیسرے آپ استعفیٰ دیدیں گے تو آپ کی جگہ بورڈ آف ٹریڈ کا کوئی اور صدر مقرر ہو جائے گا۔ میں اس سے بات چیت کر لوں گا۔ بیشک مجھے افسوس ہوگا کہ جس شخص کے ساتھ میرے آٹھ سال سے دوستانہ مراسم ہیں اس کے ساتھ اس معاملے میں گفت و شنید نہ ہوگی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جو صاحب آپکی جگہ مقرر ہوں ان کو لنکا شائر کی اسقدر حمایت منظور نہ ہو جتنی آپ کو اپنے خاندانی تعلقات کی وجہ سے ہے اور میرے کام کی مشکل کچھ کم ہو جائے۔ بہر حال ہم نے آپس میں دو حکومتوں کے نمائندوں کے طور پر بات چیت کرنا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے استعفےٰ دینے یا نہ دینے کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ کچھ حیران ہوئے کہ اپنے زعم میں جس بات کو انہوں نے ایک اہم اور موثر اعلان خیال کرتے ہوئے مجھے تشویش میں ڈالنے کی خاطر بیان فرمایا تھا اس کا مجھ پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ میں اتنی صفائی کے ساتھ ان سے بات نہ کرتا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے استعفےٰ والے معاملہ میں رسمی طور پر بھی افسوس یا تشویش کا اظہار کیا تو انہیں اپنے موقف پر اڑے رہنے کا حوصلہ ہو جائیگا۔ استعفےٰ کا ذکر ان سے سنکر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ صاحب کمزور طبیعت کے ہیں اور اپنی کمزوری سے خائف ہیں اور استعفےٰ کی آڑ میں اپنی کمزوری ڈھانپنا چاہتے ہیں۔ واقعہ کے دو مہینے بعد استعفیٰ دینے کے متعلق سوچنا مجھ پر ان کی خودداری کے متعلق کوئی خوشگوار اثر پیدا نہ کر سکتا تھا۔

اس مرتبہ بھی وہی صورت پیدا ہوئی۔ مسٹر براؤن اور میں آپس کی گفت و شنید کے بعد مفاہمت کے قریب پہنچ گئے

جو فرق ہمارے درمیان باقی رہ گیا تھا اس کے متعلق میں نے انہیں لنکا شائر کے حق میں خفیف سی رعایت پیش کر دی۔ انہوں نے اپنے مطالبے کا بقیہ حصہ ترک کر دیا۔ کرنل سٹینلے نے ہماری مفاہمت کو تسلیم کرنے یا اسے کیبنٹ میں پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں پھر سر فنڈلیٹر سٹورٹ کی خدمت میں حاضر ہوا مسٹر ولسن سے ملا۔ یہ آخری مرحلہ تھا۔ میں لارڈ ڈاربی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کہ وہ اپنے فرزند کو سمجھائیں انہوں نے فرمایا کہ بیچارہ آلیور تو بیمار ہو گیا ہے اور صاحب فراش ہے۔ میں آج لنکا شائر جا رہا ہوں تین چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک اس کی طبیعت اچھی ہو گئی تو اس سے بات کروں گا۔ لیکن کرنل سٹینلے صاحب فراش ہی رہے اور معاملہ وزیر اعظم کی ہدایت کے ماتحت کیبنٹ میں پیش ہو گیا۔ دوسرے دن میں مسٹر براؤن سے ملا انہوں نے بتایا کہ کیبنٹ نے تمہاری آخری پیشکش کے مطابق منظوری دیدی ہے۔ کیبنٹ میں کچھ اختلاف ہوا۔ بعض اراکین کی رائے تھی کہ ہمیں اپنے مطالبے پر اصرار کرنا چاہیئے۔ بحث کے آخر میں وزیر اعظم نے کہا اس معاملے میں برطانیہ بڑا ملک ہے اور ہندوستان چھوٹا ہے اگر ظفر اللہ خاں کی آخری پیشکش سے ہندوستان کو کچھ فائدہ ہوتا ہے تو کوئی ہرج نہیں ہمیں یہ پیشکش مان لینی چاہیئے۔ مجھے کامن ویلتھ سے باہر بہت سی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ میں ہندوستان کے ساتھ ایک نیا تنازعہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا۔ میں ظفر اللہ خاں کو جانتا ہوں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا تو پھر جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ہمیں تسلیم کرنا ہو گا یا معاہدے کو ترک کرنا ہو گا اس سے کامن ویلتھ کے دوسرے ممالک پر خوشگوار اثر نہیں ہو گا اسلئے مناسب یہی ہے کہ اس کی آخری پیشکش کو منظور کر لیا جائے۔ میں نے یہ سنکر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل و رحم سے ایک ناچیز ذرے کو کسقدر نوازا۔ سجدت لك روحي و جناني۔ مسٹر براؤن نے کہا۔ فیصلہ تو میں نے تمہیں غیر رسمی طور پر بتا دیا ہے لیکن پروٹوکول کا تقاضا ہے کہ کیبنٹ کا فیصلہ حکومت کا وزیر ہی دوسری حکومت کے وزیر کو بتائے۔ میرے وزیر تو ابھی تک صاحب فراش ہیں۔ اسلئے کل صبح دس بجے تم اور میں وزیر صحت کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور وہ تمہیں کیبنٹ کا فیصلہ سنا دیں گے۔ کرنل سٹینلے کی غیر حاضری میں یہ معاملہ کیبنٹ کے اجلاس میں وزیر صحت کے سپرد تھا۔

دوسری صبح ہم دونوں سر جارس کنگسلے وڈ وزیر صحت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کیبنٹ کا فیصلہ مجھے پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ انہوں نے ایک دو فقرے ہی پڑھے تھے کہ مجھے پریشانی ہوئی کیونکہ وہ میری تجویز نہیں تھی بلکہ وہ مسٹر براؤن کی تجویز تھی۔ میں نے مسٹر براؤن کی طرف دیکھا وہ بھی سمجھ گئے تھے۔ اٹھ کر کہا منسٹر مجھے معاف کرنا یہ کیبنٹ کے فیصلے والا کاغذ نہیں ہے اور ان کے سامنے پڑی مسل سے اصل کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھا ہوا انہوں نے مجھے پڑھ کر سنایا۔ ہم ان کا شکریہ ادا کر کے واپس آگئے۔ اچھا ہوا کہ مجھے فیصلہ

پڑھ کر سنانے کا ناگوار فرض کرنل سٹینلے کو نہ ادا کرنا پڑا۔ ورنہ ضرور ان کی تمہید یہ ہوتی ظفر اللہ! اب تو میں ضرور استعفےٰ دیدوں گا لیکن فیصلہ پڑھ کر تمہیں سنا دیتا ہوں۔ ان کی طبیعت کی ناسازی نے انہیں استعفےٰ دینے سے محفوظ رکھا۔

ان دنوں سر ہومی مودی بمبئی مل اونرز ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور اس حیثیت سے اسمبلی کے رکن تھے وہ لندن تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہیں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سے معاہدے کی تفاصیل معلوم ہو گئیں۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو کہا میں بورڈ آف ٹریڈ کے عملے میں سے کسی سے ملوں گا تو کہوں گا کہ ظفر اللہ نے تم پر ضرور جادو کیا ہے۔ پھر مجھ سے پوچھا اچھا سچ بتاؤ تم نے کیسے انہیں ان شرائط پر رضامند کر لیا؟ وائسرائے (لارڈ لنلتھگو) رخصت پر آئے ہوئے تھے۔ جب معاہدہ طے ہو گیا اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بڑے تپاک سے ملے اور کہا بڑا مشکل کام تھا لیکن تم نے خوب نبھایا۔

سر شادی لال کی جگہ پریوی کونسل کی پیشکش | سر فنڈلیٹر سٹورٹ سے رخصت ہونے گیا تو انہوں نے بتایا سر شادی لال ہندوستان جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ یوں تو وہ ہر سال ہی کہتے رہے ہیں۔ ان کا یہاں دل نہیں لگتا، صحت اچھی نہیں، آب و ہوا ناموافق ہے، لیکن اب کی بار معلوم ہوتا تھا ان کا ارادہ واپس آنے کا نہیں۔ اگر انہوں نے استعفےٰ بھیج دیا تو کیا تم ان کی جگہ آنا چاہو گے؟ میں نے دریافت کیا آپ کا کیا مشورہ ہے؟ کہا میرا مشورہ ہے کہ تم ان کی جگہ آجاؤ۔ میں نے کہا اگر سر شادی لال نے استعفےٰ بھیج دیا تو اس وقت سوچ لوں گا۔

قانون خلع | میں جب شملے واپس پہنچا تو اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ قاضی محمد احمد کاظمی صاحب نے اسمبلی میں خلع کے متعلق ایک مسودہ قانون پیش کیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان شادی شدہ عورتوں کو ہندوستانی عدالتوں سے خلع حاصل کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس مسودے میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان عورت اسلام ترک کر کے کوئی ایسا مذہب اختیار کر لے جس مذہب کی پیرو عورت کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح شرع محمدی کی رو سے جائز ہے تو ایسی صورت میں عورت کے ترک اسلام کی وجہ سے اس کا نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ ہندو اراکین کی طرف سے اس دفعہ کی مخالفت کی گئی تھی۔ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اسلئے اسمبلی کے سرکاری اراکین اس میں غیر جانبدار رہیں گے۔ اگر یہ صورت قائم رہتی تو اسمبلی میں مسودے کی یہ دفعہ منظور نہ ہو سکتی۔ سید غلام بھیک نیرنگ صاحب چند دیگر مسلم اراکین کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم اس معاملے میں حکومت کا موقف بدلوانے کی کوشش کرو۔ میں نے عرض کیا میں حاضر ہوں لیکن ایک امر غور طلب ہے، یہ مسئلہ اس غلط مسئلے کی شاخ ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے اور جہاں یہ سزا عاید نہ کی جا سکے وہاں مرتد کے دیوانی حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے واضح ہے کہ ارتداد ایک نہایت قبیح اخلاقی اور روحانی فعل ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی کا

موجب ہے۔ لیکن اگر ارتداد تبدیلی عقیدہ تک محدود ہو اور اس کے ساتھ کوئی اور جرم شامل نہ ہو تو اسکی جسمانی سزا کوئی نہیں۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات کریمہ اس پر دلیل ہیں۔ اس بنا پر میں مسودہ کی اس دفعہ کی سرکاری تائید کے حصول کی کوشش تو کر سکتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس میں بفضل اللہ کامیابی بھی ہو جائے لیکن آپ اراکین میں سے بعض اصحاب ایسے ہیں مثلاً مولانا ظفر علی خان صاحب جو یقین رکھتے ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے اور ارتداد سے تنسیخ نکاح لازم آتا ہے ایسا نہ ہو کہ سرکاری تائید حاصل ہونے کے بعد ایسے اصحاب اڑ بیٹھیں کہ یہ دفعہ اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ سید صاحب نے فرمایا مولانا ظفر علی خاں دو تین دن کیلئے ایبٹ آباد تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی واپسی پر ان کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد پھر تم سے بات چیت کریں گے۔ تین چار دن کے بعد مولانا ظفر علی خانصاحب بھی ان اصحاب کے ہمراہ تشریف لائے۔ میں نے گذارش کی کہ آپ نے ۱۹۲۴ء میں حضرت مولوی نعمت اللہ خاں صاحب کی کابل میں سنگساری کے موقع پر چند مقالے زمیندار میں شائع کئے تھے۔ جن میں آپ کا موقف تھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اگر اس موقعہ پر بھی آپ کا وہی موقف ہوا تو مسودہ قانون کی دفعہ متنازعہ کی آپ مخالفت کریں گے اور آپس میں آرا کا اختلاف ہو گا۔ اس پہلو پر ابھی سے غور ہو جانا چاہیئے۔ مولانا ہنس دیئے اور فرمایا وہ اور بات تھی یہ اور بات ہے آپ سرکاری اراکین کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ میں نے کیبنٹ میں سوال اٹھایا کہ اس معاملہ میں سرکاری اراکین کے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ میری غیر حاضری میں کیا گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے رفقاء میری بات سن لیں۔ پھر جو چاہیں فیصلہ کریں۔ وہ رضامند ہو گئے تو میں نے گذارش کی کہ اسلام آزادی ضمیر کا حامی ہے۔ تبدیلئ عقیدہ بے شک گناہ اور اخلاقی اور روحانی جرم ہے۔ لیکن اس کی جسمانی سزا کوئی نہیں۔ اگر ایک مسلمان عورت اسلام کو ترک کر کے کوئی ایسا دین اختیار کرتی ہے جس کی متبعین عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے تو تبدیلئ عقیدہ سے خود بخود نکاح فسخ نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو بہت قباحتیں لازم آتی ہیں۔ جن کی میں نے مثالیں دیں مزید برآں یہ مسئلہ فقہ کا ہے۔ یعنی اسلامی قانون کا اور اسلامی شریعت کی تعبیر کرنا مسلمانوں کا کام ہے۔ اگر موجودہ صورت میں سرکاری اراکین غیر جانبدار رہیں۔ تو اسمبلی میں چونکہ کثرت غیر مسلم اراکین کی ہے۔ مسودہ قانون کی یہ دفعہ رد ہو جائے گی۔ اور گویا عملاً اسلامی شریعت کی تعبیر غیر مسلم اراکین کی رائے کے مطابق ہو گی جو صریح ناانصافی اور زیادتی ہو گی۔ میری گذارش سننے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ سرکاری اراکین دفعہ متنازعہ کی تائید میں رائے دیں۔

حکومت کی طرف سے یہ معاملہ وزیر داخلہ سر ریجنیلڈ میکسول کے سپرد تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میرے لئے مناسب نہیں کہ میں اسلامی شریعت کے ایک ایسے مسئلے پر تقریر کروں جس میں قرآن کریم کی آیات کی تعبیر لازم آتی ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس معاملے میں حکومت کے موقف کی وضاحت تم اپنے ذمہ لو۔ میں نے کہا مجھے منظور ہے۔ چنانچہ وقت آنے پر میں نے اسمبلی میں متعلقہ مسائل کی وضاحت کی۔ ان میں سے بنیادی مسئلہ مرتد کی سزا کا تھا۔ جس پر میں نے تفصیلی بحث کی۔ اجلاس کے ختم ہونے پر میں اسمبلی کی عمارت سے باہر جا رہا تھا کہ مسٹر ایم ایس اینے نے مجھے ٹھہرا لیا اور مبارک باد دی کہا آج تم نے اپنے

دین کی وہ خدمت کی ہے جو یادگار رہے گی۔ تم نے ہمارا تصور اسلام کے متعلق بالکل بدل دیا ہے۔ ہم اب تک یہی سمجھتے تھے کہ دین کے معاملے میں اسلام جبر و ظلم کو روا رکھتا ہے۔ آج تم نے اسلام کی وہ تصویر پیش کی ہے جو نہایت دلکش ہے فالحمد للہ۔ جناب کاظمی صاحب کے مسودہ قانون نے فقہ اسلامیہ کے ایک اور متنازعہ مسئلے کو بھی واضح کر دیا۔ فجزاہ اللہ فقہ حنفیہ میں فقہا کی کثرت اس طرف تھی کہ خیار البلوغ کا حق ایسے نکاح کے متعلق پیدا نہیں ہوتا جس میں عورت کا ولی اس کا باپ یا اس کا دادا ہو۔ اس قانون نے یہ وضاحت کر دی کہ خیار البلوغ کا حق ہر اس عورت کو حاصل ہے جس کا نکاح نابالغی میں کیا جائے۔

والدہ صاحبہ کی وفات | وفات سے کئی سال پہلے والدہ صاحبہ کو خواب میں بتایا گیا کہ ان کی وفات اپریل کے مہینے میں آخری بدھ وار کو ہوگی۔ انہیں اس بات پر یقین تھا کہ اطلاع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن ساتھ ہی جانتی تھیں کہ رویا اور خواب تعبیر طلب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں جب میں انگلستان جانے لگا تو والدہ صاحبہ نے دریافت کیا اپریل تک واپس آ جاؤ گے؟ میں نے جواب دیا امید کرتا ہوں انشاء اللہ آ جاؤں گا۔ اس پر انہوں نے بہت اطمینان کا اظہار کیا۔ چنانچہ خاکسار یکم اپریل کی شام کو دلی پہنچ گیا انگلستان سے میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں لکھا تھا کہ انشاء اللہ یکم اپریل کی شام کو دلی پہنچ جاؤں گا اور بارہ دن دلی ٹھہرنے کے بعد قادیان جاؤں گا۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو دلی تشریف لے آئیں۔ اور اگر سفر کی تھکان اور تکلیف کا خیال ہو تو پھر انشاء اللہ ۱۳ اپریل کو قادیان ملاقات ہوگی۔ یکم اپریل کو گاڑی پونے دو گھنٹے دیر سے پہنچی۔ سٹیشن پر پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ والدہ صاحبہ موٹر میں بیٹھی انتظار کر رہی ہیں۔ چنانچہ جب میں موٹر میں پہنچا تو دعا دی اور پیار کیا اور کہا تم نے یہ کیسے خیال کیا کہ میں بارہ دن اور انتظار کر سکوں گی۔ ابھی ہم دلی میں ہی تھے کہ والدہ صاحبہ کو خون کے دباؤ کی تکلیف ہو گئی۔ پہلے بھی کبھی کبھی انہیں یہ تکلیف ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ علاج کرنے پر دباؤ کی اصلاح ہو گئی اور تکلیف رفع ہو گئی۔ انہی ایام میں انہوں نے ایک رویا دیکھا۔ جس پر وہ اپنی طبیعت میں بہت خوشی محسوس کرتی تھیں۔ اور گو اس کی تعبیر کو خوب سمجھتی تھیں۔ لیکن بار بار خوشی خوشی اسے بیان کرتی تھیں۔ فرمایا میں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک پلنگ پر تشریف فرما ہیں اور بہت خوش نظر آتے ہیں۔ مجھے آپ کو دیکھ کر دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی اور میں نے عرض کی حضرت اگر حضور علیہ السلام اجازت دیں تو میں حضور علیہ السلام کے پاؤں دباؤں۔ آپؑ نے مسکرا کر بڑی شفقت سے اپنے پاؤں پلنگ کے ایک طرف کر لئے تا کہ میرے بیٹھنے کیلئے جگہ ہو جائے۔ میں پلنگ پر بیٹھ گئی اور حضورؑ کے پاؤں دبانے لگی۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ حضور علیہ السلام اس وقت بہت خوش نظر آتے ہیں میں کسی بات کیلئے دعا کیلئے عرض کروں۔ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کس بات کے لئے دعاء کیلئے عرض کروں کہ حضورؑ نے اپنی دائیں طرف کسی شخص سے مخاطب ہو کر اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "ان کا مکان کشادہ بنانا۔" پھر میں بیدار ہو گئی۔ جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے میں بہت ہی خوش ہوں۔

جب ہم قادیان پہنچے تو والدہ صاحبہ نے اپنا یہ رؤیا حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں بھی بیان کیا۔ حضورؓ نے فرمایا یہ جنت کے مکان کی طرف اشارہ ہے۔ اس موقعہ پر ہم آخر اپریل تک قادیان ٹھہرے۔ والدہ صاحبہ کے خواب کی وجہ سے ہی میں نے یہ انتظام کیا تھا کہ ہم اپریل کا آخری نصف قادیان میں گذاریں۔ اس عرصہ میں والدہ صاحبہ باوجود ضعف پیری کے اور خون کے دباؤ کی شکایت کے جو پھر عود کر آئی تھی پیدل جمعہ کی نماز کے لئے مسجد اقصیٰ جاتی رہیں۔ اور حضرت ام المومنین اور حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں حاضر ہوتی رہیں۔ جمعہ کی نماز کے وقت چونکہ اچھی خاصی گرمی ہو جاتی تھی۔ اسلئے جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ جمعہ کی نماز کیلئے مسجد اقصیٰ گئی تھیں تو میں نے عرض کیا اگر آپ مجھے اطلاع دیتیں تو میں سواری کا انتظام کرتا۔ فرمایا نہیں بیٹا مسجد تک جانے میں کیا تکلیف ہے۔

جب والدہ صاحبہ کو معلوم ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح نے ۲۵ اپریل سندھ کی طرف روانگی کا ارادہ فرمایا ہے تو کچھ افسردہ سی ہو گئیں۔ دو روز کے بعد جب معلوم ہوا کہ حضور ۲۷ اپریل کو قادیان سے روانہ ہوں گے تو خوشی خوشی مجھے بتایا کہ تم نے سنا حضرت صاحب ۲۷ کو روانہ ہوں گے؟ میں نے کہا ہاں میں نے بھی سنا ہے۔ پھر دوبارہ مجھ سے کہا روانگی کی ۲۷ تاریخ ہے۔ میں نے کہا میں سمجھتا ہوں مراد ان کی یہ تھی کہ اپریل کے مہینے کا آخری بدھ وار ۲۷ کو ہے اور اگر اس سال ان کا خواب ظاہری رنگ میں پورا ہونا ہے تو حضرت صاحب ان کا جنازہ پڑھا کر قادیان سے روانہ ہوں گے۔ ۲۷ کی صبح کو وہ آخری بار مقبرہ بہشتی گئیں۔ اس دن مجھ سے شکایت کی کہ میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے جسم کے اندر حرارت ہے۔ لیکن بظاہر کوئی تکلیف انہیں نہیں تھی۔

انہی ایام میں والدہ صاحبہ نے بتایا کہ کئی بار انہوں نے غنودگی کی حالت میں سنا ہے کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ کچھ ہونیوالا ہے اور دوسرا شخص جواب میں کہتا ہے اب کی بار تو ہو کر رہے گا۔ ۳۰ اپریل کو جس دن قادیان سے ہماری روانگی تھی والدہ صاحبہ نے زیادہ تکلیف کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو بلوانے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ میں نے عرض کیا اب شملے پہنچ کر ڈاکٹر بلالیں گے۔ انہوں نے مسکرا کر فرمایا اچھا شام کی گاڑی سے ہم قادیان سے روانہ ہو گئے۔ صبح انہوں نے اپنا ایک رؤیا سنایا کہ تمہارے والد صاحب آئے ہیں اور کہتے ہیں آپ تو بہت بیمار ہیں اچھا میں جا کر ڈاکٹر کو لاتا ہوں ایسا ڈاکٹر جس کی ہر بار کی فیس بتیس ۳۲ روپے ہوگی۔

شملہ پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو بلایا۔ انہوں نے کہا تکلیف تو خون کے دباؤ کی ہے۔ لیکن صحیح علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک بیماری کے پہلے مراحل کی تفصیل معلوم نہ ہو۔ خون وغیرہ کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ گردے بھی ٹھیک کام نہیں کر رہے ہیں بہر حال جو علاج تجویز ہوا وہ شروع کر دیا گیا ہے۔ لیکن کمزوری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

شملہ پہنچ کر پہلی رات ہی والدہ صاحبہ نے رویا میں دیکھا کہ والد صاحب تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں میں آپ کے لئے پالکی لے آیا ہوں اب آپ جس وقت تیار ہو جائیں ہم روانہ ہو جائیں۔ والدہ صاحبہ نے کہا میں تو تہجد کے وقت تیار ہو جاؤں گی اور اسی وقت چلنا بھی مناسب ہوگا۔ تاکہ زیادہ گرمی ہونے سے پہلے پہلے سفر طے کر لیا جائے۔ والد صاحب نے فرمایا بہتر ہوگا کہ ۸ بجے کے بعد روانہ ہوں جب بچے ناشتہ سے فارغ ہو جائیں ورنہ بچوں کو تکلیف ہوگی۔ والدہ صاحبہ نے دوسرے دن خواب بیان کرتے ہوئے پالکی کی زیبائش کی تفاصیل بھی بیان کیں کہ ایسی خوبصورت اور اس قسم کی لکڑی کی تھی اور فلاں حصے چاندی کے تھے۔

پانچ دن تو اسی صورت میں گذر گئے کہ گو کمزوری تھی لیکن کسی قسم کی تشویش نہیں تھی۔ تہجد کے لئے اور باقی نمازوں کے لئے خود ہی اٹھ کر غسل خانہ میں وضو کے لئے تشریف لے جاتی تھیں اور جائے نماز پر نمازیں پڑھتی تھیں۔ اکثر وقت پلنگ پر بیٹھے ہوئے گذارتی تھیں۔ چوتھے روز گو ڈاکٹر صاحب نے پلنگ سے اترنا منع کر دیا تھا لیکن پھر بھی ۶ رمئی جمعہ کے دن عصر کے وقت جب میں ان کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ برآمدہ میں جائے نماز پر نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب نماز ختم کر چکیں تو میں نے عرض کی کہ ڈاکٹر صاحب نے تو پلنگ سے ہلنے کی اجازت نہیں دی آپ اس حالت میں ہیں۔ فرمایا نماز پڑھنے میں کوئی تکلیف نہیں۔ پھر میں نے کہا چلئے میں آپ کو پلنگ تک پہنچا آؤں اور میں سہارا دیکر پلنگ تک لے گیا انہوں نے اظہار شفقت کے طور پر سہارا لے لیا لیکن اس وقت ابھی انہیں سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ مغرب کے بعد میں دفتر کے کمرہ میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ والدہ صاحبہ پر ایک قسم کی بیہوشی کی حالت طاری ہو گئی ہے۔ میں فوراً ان کے کمرہ میں گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ضعف کی وجہ سے کچھ نیم بیہوشی سی ہو رہی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ پاؤں دبانے سے پورا ہوش آگیا اور باتیں کرنی شروع کر دیں۔

۷ رمئی ہفتہ کے دن ان کی حالت پہلی شام کی حالت سے تو بہتر تھی۔ لیکن کمزوری کا بہت محسوس کرتی تھیں دوران گفتگو میں انہوں نے کہا اگر ڈاکٹر لطیف یہاں ہوتے تو مجھے جلد صحت ہو جاتی۔ میں نے فوراً ڈاکٹر لطیف صاحب کو دہلی تار دیدیا کہ والدہ صاحبہ آپ کو یاد فرماتی ہیں وہ دوسرے دن صبح شملے پہنچ گئے۔ والدہ صاحبہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئیں ڈاکٹر صاحب کو پیار کیا اور مسکرا کر کہا آپ کے اچھی ہو جاؤں تو سمجھوں بڑے ڈاکٹر ہو۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ دیکھئے میں آپ کا تار ملتے ہی آگیا ہوں والدہ صاحبہ نے کہا میں نے تو تار نہیں بھجوایا اور میری طرف دیکھا میں نے عرض کی کہ کل آپ نے ڈاکٹر صاحب کو یاد کیا تھا۔ اسلئے میں نے تار دیدیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ ان کے لئے شملہ میں ٹھہرنا نہایت مضر ہے یہاں بلندی کی وجہ سے دل پر بہت بوجھ ہے میں انہیں آج ہی اپنے ساتھ دہلی لے جاؤنگا

اور اپنے مکان پر ہی رکھوں گا کیونکہ تین چار روز تک متواتر علاج کی ضرورت ہے۔ اور میرا ہر وقت قریب رہنا ضروری ہے تاکہ دل کی حالت اور خون کے دباؤ کے مطابق علاج میں تبدیلی ہوتی رہے۔ ساتھ ہی والدہ صاحبہ کو تسلی دی کہ تین چار روز کے علاج کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمام تکلیف دور ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی دن دہلی کے سفر کی تیاری کر لی گئی۔ امۃ الحی کی والدہ نے اصرار کیا کہ وہ ضرور والدہ صاحبہ کے ساتھ دہلی جائیں گی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور دوسرے دن میری حاضری شملہ میں لازم تھی۔ اسلئے یہ انتظام کیا گیا کہ میں ان سب کو کالکا ریل میں سوار کرادوں اور پھر آنیوالے ہفتہ کے دن دہلی والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ چنانچہ ہم سب شام کے وقت کالکا پہنچ گئے اور ان سب کو آرام سے ریل میں سوار کرادیا گیا۔ میں نے والدہ صاحبہ سے رخصت چاہی وہ لیٹی ہوئی تھیں میں نے اجازت طلب کی تو اٹھ کھڑی ہوئیں اور میری پیشانی کو بوسہ دیکر دعا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں کھڑے ہوئے دیکھا تو شور مچا دیا "بے جی! بے جی! آپ کیا کر رہی ہیں فوراً لیٹ جائیں۔ آپ کو تو لیٹے لیٹے بھی حرکت نہیں کرنی چاہیئے۔" والدہ صاحبہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا بیٹا لیٹے رہنے کیلئے تو بہت وقت ہے ظفر اللہ خاں کو اب پھر ملناشاید ہو یا نہ ہو۔ دوسرے دن شام کو دہلی ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ حالت پہلے سے بہتر ہے۔ البتہ دوپہر کے وقت امتلا کی شکایت ہو گئی تھی۔ جس سے دل پر کچھ بوجھ بڑھ گیا تھا لیکن یہ حالت ایک دو گھنٹوں کے بعد رفع ہو گئی۔

۱۰ رمئی منگل کے دن دوبار دہلی ٹیلیفون کیا۔ وہی جواب ملا جو پہلے دن ملا تھا۔ ۱۱ رمئی بدھ کے دن صبح کو بھی وہی جواب ملا۔ سہ پہر کو دہلی سے ٹیلیفون ہوا کہ دوپہر کے بعد دل کی حالت بگڑ گئی تھی مگر ٹیکے سے پھر سنبھل گئی۔ اب نسبتاً آرام ہے ہوش میں ہیں اور باتیں کر رہی ہیں لیکن حالت ایسی ہے کہ تمہیں جلد دہلی پہنچ جانا چاہیئے۔ مجھے دوسرے دن شملہ میں ایک ایسا ضروری سرکاری کام تھا کہ میں سہ پہر سے قبل روانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۲ رمئی جمعرات کی صبح کو ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ حالت پہلے سے بہتر ہے لیکن پھر بھی میں نے احتیاطاً اپنے تینوں بھائیوں کو تار دیدیئے کہ دہلی پہنچ جائیں اور ہمشیرہ صاحبہ کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔ عزیز اسد اللہ خاں تو بدھ کی رات کو ہی لاہور سے روانہ ہو گیا تھا اور جمعرات کی صبح کو دہلی پہنچ گیا تھا۔ باقی ہم سب ۱۳ رمئی جمعہ کی صبح کو دہلی پہنچ گئے۔

ڈاکٹر لطیف صاحب نے بتایا کہ امۃ الحی کی والدہ نہایت جانفشانی کے ساتھ والدہ صاحبہ کی خدمت میں لگی رہی ہے اور اپنی صحت اور آرام کا کچھ خیال نہیں کیا۔ اور پھر میں نے خود بھی مشاہدہ کر لیا کہ ہم سب بیٹوں، بہوؤں اور بیٹی سے وہ حق خدمت ادا نہ ہو سکا جو امۃ الحی کی والدہ نے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے وافر عطا فرمائے آمین۔

۱۰ بجے کے قریب والدہ صاحبہ نے مجھے فرمایا۔ "اب پھر"۔ میں نے اسے استفہام تصور کر کے جلدی سے عرض کی اب پھر اللہ تعالیٰ کا فضل چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ پرسوں کی نسبت آپ کی حالت بہت اچھی ہے انشاء اللہ آپ کو بہت جلد صحت ہو جائے گی۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا "اب پھر مجھے قادیان لے چلو"۔ میں نے عرض کی کہ وہاں علاج کا پورا انتظام نہیں ہو سکے گا

والدہ صاحبہ نے بہت حسرت سے مسکرا کر کہا۔ "اچھا!"۔

اس دن دوپہر کو والدہ صاحبہ کو امتلاء کی تکلیف نہ ہوئی اور یہ وقت جو تشویش کا ہوا کرتا تھا بخیریت گذر گیا۔ جس سے کچھ امید ہونے لگی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں شفا دیگا۔

۱۴ مئی ہفتہ کے دن دوپہر تک والدہ صاحبہ کی وہی حالت رہی۔ دوپہر کے وقت سب لوگ تو چودھری بشیر احمد صاحب کے ہاں کھانا کھانے کیلئے چلے گئے۔ والدہ امۃ الحی اور میں والدہ صاحبہ کے پاس رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دو بجے کے قریب میں وضو کر رہا تھا کہ مجھے کسی نے آواز دی کہ والدہ صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ میں ان کے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ انہوں نے اپنی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور کہا آؤ بیٹا اب آخری باتیں کر لیں اور اپنے بھائیوں اور بہن کو بھی بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت کمرہ ہی میں ٹیکا تیار کر رہے تھے انہوں نے انگریزی میں مجھ سے کہا دل کی حالت بگڑ گئی ہے اور نبض بھی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ لیکن میں نے والدہ صاحبہ سے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے خود ہی نبض سے شناخت کر لیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ کیا اور سول سرجن صاحب کو بھی ٹیلیفون پر بلا لیا۔ ٹیکہ کرنے کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے نبض دیکھ کر کہا۔ بیبے جی اب تو نبض ٹھیک چل رہی ہے۔ والدہ صاحبہ نے خود نبض دیکھ کر فرمایا ٹھیک تو نہیں چل رہی واپس آگئی ہے لیکن ابھی کمزور ہے۔ اتنے میں وہ سب عزیز جو کھانا کھانے کیلئے گئے ہوئے تھے واپس آگئے اور چوہدری بشیر احمد صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب بھی اطلاع ملنے پر تھوڑی دیر کے بعد کچہری سے آگئے۔

والدہ صاحبہ نے فرمایا یہ وقت سب پر آتا ہے اور اولاد کو جب والدین سے جدا ہونا پڑتا ہے تو انہیں کرب بھی ہوتا ہے۔ لیکن میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہوں اور خوشی سے اس کے حضور جا رہی ہوں۔ میں تم سب سے رخصت ہونا چاہتی ہوں لیکن چاہتی ہوں کہ تم لوگ رونے دھونے سے باز رہو، اسوقت بھی اور میرے بعد بھی، پھر ہمشیرہ صاحبہ کے کان میں کچھ کہا، پھر باری باری سے والدہ صاحبہ نے بیٹوں کو پیار کیا اور دعا دی اور پھر بہوؤں سے اور ایسا ہی بشیر احمد اور اعجاز احمد سے اور ڈاکٹر صاحب سے اور امینہ بیگم سے اور احمدہ بیگم سے اور غلام نبی اور عزیز احمد اور چودھری فضل داد صاحب سے رخصت ہوئیں۔ پھر امۃ الحی کو بلوایا اور اسے پیار کیا، پھر عبد الکریم کو بلوایا اور اسے دعا دی، غرض جو کوئی بھی موجود تھا اس سے رخصت ہوئیں، غلام نبی اس وقت غم سے بہت مضطرب ہوا جا رہا تھا اسے تسلی دی اور مجھے فرمایا دیکھو بیٹا اگر اس سے کبھی کوئی قصور سرزد ہو جائے تو اس وقت کو یاد کرنا اور اسے معاف کر دینا۔ پھر شکر اللہ خاں کی بیوی سے دریافت کیا میری صندوقچی لے آئی ہو؟ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا کونسی صندوقچی؟ والدہ صاحبہ نے جواب دیا، وہی جس میں میرے کفن کی چادریں رکھی ہیں۔ زینب بی بی نے کہا ہم نے تو تار ملتے ہی دلی آنے کی تیاری شروع کر دی۔ جلدی میں کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔ اور یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ صندوقچی ڈسکہ میں ہے، والدہ صاحبہ نے فرمایا میں نے تو کوئی تار نہیں دلوایا۔ میں نے عرض کی تار میں نے دیئے تھے۔

میرے دہلی پہنچنے سے قبل والدہ صاحبہ والدہ امۃ الحی سے فرما چکی تھیں کہ جب قادیان لے جاؤ گے تو مجھے بیت "الظفر" کی نچلی منزل ہی میں رکھنا اوپر کی منزل پر میرے اپنے کمرے میں نہ لے جانا اور مجھے فلاں مقام پر غسل دینا۔ اب پھر مجھ سے بھی یہی فرمایا۔ اسپر والدہ امۃ الحی نے عرض کی کہ جو جگہ آپ نے غسل کیلئے تجویز کی ہے وہ تو کافی نہیں اور پورا پردہ بھی نہیں مسکرا کر فرمایا بہت کھلی ہے اور پردہ بھی ہے تم نے اچھی طرح اس کا اندازہ نہیں کیا۔ اتنے میں سول سرجن صاحب بھی آ گئے انہوں نے ڈاکٹر لطیف صاحب کے ساتھ مشورہ کر کے کچھ اور ٹیکے تجویز کئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے الگ دریافت کیا کہ اگر علاج کے لحاظ سے والدہ صاحبہ کا دہلی رہنا ضروری ہو تو چارہ نہیں۔ لیکن اگر علاج کے آخری مراحل ختم ہو گئے ہوں تو آپ مجھے بتا دیں تاکہ میں انکی یہ خواہش بھی پوری کرنے کی کوشش کروں اور انہیں قادیان لے جاؤں۔ انہوں نے کہا کہ ابتک تو کسی ٹیکے کے نتیجے میں دل کی حالت کی اصلاح نہیں ہوئی لیکن ہم ایک دوا اور ٹیکے لگانا چاہتے ہیں جن کا نتیجہ پون گھنٹے تک معلوم ہو سکے گا اس وقت ہم بتا سکیں گے کہ کیا صورت ہے۔ یہ وقفہ گذر جانے کے بعد پانچ بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کسی ٹیکے کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔ اب علاج کے سب مراحل ختم ہو چکے ہیں اور دل کی یہ حالت ہے کہ اندازہ ہے کہ آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ سے زیادہ کام نہیں کر سکے گا۔

یہ سنکر میں والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور کہا اب میں آپ کو قادیان لے چلتا ہوں۔ بہت خوش ہوئیں اور مجھے دعا دی۔ ہم نے اسی وقت تیاری شروع کر دی اور شام کی گاڑی سے ہم سب قادیان روانہ ہو گئے۔ چودھری بشیر احمد صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب بھی ساتھ گئے۔

طبی لحاظ سے تو اسقدر مہلت ملنا موجب حیرت تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انکی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ آہستہ آہستہ کمزوری بڑھتی گئی۔ اور کسی وقت کچھ بیچینی بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن ہوش رات بھر قائم رہا۔ ۱۱ بجے کے قریب عزیز اسد اللہ خاں کو اور مجھے پاس بیٹھے ہوئے دیکھ کر فرمایا "جاؤ بیٹا اب سو جاؤ" یہ آخری کلمہ تھا جو اپنی مرضی سے خود بخود اس پیارے منہ سے نکلا، ڈاکٹر عاجز آ چکے تھے علاج بند ہو چکا تھا۔ روح اپنے خالق کے سامنے پیش ہونے کی تیاری کر رہی تھی لیکن ماں کی مامتا کو اس وقت بھی یہ فکر تھی کہ میرے بیٹوں کے آرام میں خلل نہ آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں اکیلا ہی ان کے پاس تھا تو میں نے بلایا جواب دیا "جیو پتر"۔ میں نے کہا آپ نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ فرمایا میں نے دوسروں کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے کہا دوسرے تو صرف بیٹے ہی ہیں اور میرے اور آپ کے درمیان تو عشق کا رشتہ تھا۔ فرمایا "ہاں"۔ اس رات عجیب کیفیت تھی طبی لحاظ سے روح اور جسم کا جوڑ ختم ہو چکا ہونا چاہیئے تھا لیکن روح اپنے خالق کے سامنے سجدہ میں پڑی ہوئی عرض کر رہی تھی کہ آپ کی رحمت سے بعید نہیں کہ آپ اس جوڑ کے قائم رہنے کا حکم فرمائیں جب تک آپ کی یہ عاجزہ اور ناتوان بندی اس سرزمین میں پہنچ جائے جو آپ کے ایک محبوب کی جائے قیام ہونے کی وجہ سے آپ کے انوار اور رحمت کی مہبط ہے۔ گاڑی تیز چل رہی تھی اور ہر لحظہ ہمیں قادیان سے

قریب کر رہی تھی اور ہم یہ نظارہ دیکھ رہے تھے :-

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا داری کوئش را بجان خویشتن دارم

۱۵ مئی اتوار کے دن پونے دس بجے قبل دوپہر ہم قادیان پہنچے۔ میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کی قادیان آگیا ہے۔ فرمایا "بسم اللہ بسم اللہ" میں نے کہا آپ کو کوٹھی لے چلیں فرمایا ہاں اپنی کوٹھی لے چلو۔ بیت الظفر پہنچ کر آپ کا پلنگ نچلی منزل میں گول کمرہ میں بچھایا گیا۔ میں نے عرض کی آپ نے مکان پہچان لیا؟ فرمایا ہاں۔ پھر میں نے کہا آپ کا پلنگ نچلی منزل میں ہی گول کمرہ میں ہے۔ اس پر نظر اٹھا کر کمرہ کی دیواروں کو دیکھا اور فرمایا "میں نے پہچان لیا ہے" اب روح کو اطمینان ہو گیا کہ خدا کے مسیح کی تخت گاہ تک پہنچنے کی مہلت مل گئی اور کوئی اور خواہش باقی نہ رہی

عصر کے وقت ڈسکہ سے کفن کی چادریں بھی پہنچ گئیں وہی جو ہم ۱ سال قبل زمزم کے پانی سے دھوئی گئی تھیں پھر رات آئی اور کیسی رات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی روحانی شہزادی نے ہمارے گھر کو ایک رات کیلئے اپنی قیام گاہ تجویز کر کے اسے نور سے بھر دیا ہے اور ہر لحظہ یہاں فرشتے نازل ہو رہے ہیں۔ نصف شب کے قریب جب بظاہر کئی گھنٹوں سے بیہوشی کا عالم تھا کسی نے مجھ سے کہا تم بلاؤ تو جواب دیں۔ میں نے بلایا تو جواب دیا "ہاں"۔ تین بجے کے قریب جب تہجد کا وقت ہوا تو کامل بیہوشی کی حالت ہو گئی۔ محض سانس آتا تھا گویا اپنے رویا کے مطابق پالکی میں سوار ہونے اور سفر شروع کرنے کیلئے تیار ہو گئی تھیں۔ صبح ساڑھے سات بجے کے قریب میں نے والدہ امۃ الحی سے کہا کہ سب لوگ ناشتہ کر لیں کیونکہ ان کا عہد ہے کہ بچے ناشتہ کر لیں گے تو روانہ ہوں گی۔

سانس جو کچھ وقت پہلے تیز ہو گیا تھا ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہلکا ہونا شروع ہو گیا اور جب گھر کے لوگ مہمان اور ملازم سب ناشتہ ختم کر چکے تو نو بجے کے قریب روح اپنے مولا کے حضور حاضر ہو گئی۔ یہ ۱۶ مئی ۱۹۳۸ء سوموار کا دن تھا۔ ۱۲ بجے کے قریب جسم کو اس مقام پر سپرد خاک کر دیا گیا جو پہلے سے اس کی آخری قیام گاہ تجویز ہو چکا تھا۔

وکل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

وہ محبوب وجود ہمارے درمیان موجود نہ رہا۔ اس پیارے چہرے کو آنکھیں تلاش کریں گی لیکن نہ پا سکیں گی۔ ہم ان کی مسلسل درد بھری دعاؤں سے محروم ہو گئے۔ لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کی رضا کو خوشی سے قبول کیا۔ اور اس خیال سے اطمینان حاصل کیا کہ ہماری والدہ نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رضا جوئی میں گذاری۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وافر رحمت کا سلوک فرمایا ہو گا۔ اور اپنے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بخشے اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارا وقت آنے پر وہ ہمیں بھی اپنی رحمت میں داخل فرمائیگا آمین۔ میرے لئے جب وہ وقت آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پھر یہ ممکن کر دے گی کہ میری نظر پھر اس پیارے چہرے

پہ پڑے تو میری تمام محبت اور تمام حسرت اور تمام شوق اس ایک ہی لفظ میں ادا ہو جائیں گے۔ "بسبے"۔ اور ان کی طرف سے۔ "جیو پتر"۔ پھر ایک بار میرے دل کو خوشی سے بھر دے گا۔

اے خدا بر تربت او بارش رحمت ببار

داخلش کن از کمال فضل در بیت النعیم

انگلستان کے ساتھ نیا تجارتی معاہدہ اسمبلی میں

انگلستان کے ساتھ نیا تجارتی معاہدہ اسمبلی کے ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ کانگریس تو حزب مخالف تھی۔ انہوں نے تو معاہدے کی مخالفت کرنا ہی تھی۔ سر ہومی مودی نے مجھے بتلایا کہ قائداعظم مسٹر جناح نے ان سے معاہدے کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی اور انہوں نے ان سے وہی کہا جو وہ لندن میں مجھ سے کہہ چکے تھے۔ (قائداعظم) مسٹر جناح نے ان سے دریافت کیا تم کس طرف رائے دو گے۔ مسٹر مودی نے کہا میں مل اونرز ایسوسی ایشن کا صدر ہوں اور میری ایسوسی ایشن چاہتی ہے کہ میں اسمبلی میں معاہدے کے خلاف رائے دوں کیونکہ انکی رائے میں اس معاہدے کا زیادہ فائدہ تو ملک کے زمینداروں کو ہے جن کی کپاس زیادہ مقدار میں اور اچھی قیمت پر خریدی جائے گی جس کے نتیجے میں ملک کے اندر بھی کپاس کی قیمت بڑھ جائے گی اور یہاں کے کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا مہنگا ہو جائے گا۔ ادھر لنکا شائر کے بنے ہوئے کپڑے پر رعائتی شرح سے محصول عاید ہونے کے نتیجے میں ان کے کپڑے کی قیمت کم ہو جائے گی اس طرح ہندوستانی مل اونرز کو لنکا شائر والوں سے دونوں محاذ پر مقابلہ کرنا ہوگا اور زمینداروں کو جو فائدہ پہنچیگا اس کی قیمت انہیں ادا کرنی ہو گی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ معاہدے کے اندر اس قسم کا توازن مدنظر رکھا گیا ہے کہ ہم اس قسم کے کپڑے میں جو ہمارے کارخانوں میں بنایا جاتا ہے پھر بھی لنکا شائر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اس لئے باوجود کارخانہ داروں کی خواہش کے میں معاہدے کے خلاف رائے دوں میں غیر جانبدار رہوں گا اور کسی طرف رائے نہیں دوں گا۔ مسٹر مودی نے مجھ سے کہا کہ میں نے یہ گفتگو تمہیں اسلئے بتادی ہے کہ تمہیں میرا موقف معلوم ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میں نے (قائداعظم) مسٹر جناح سے کیا کہا ہے۔

(قائداعظم) مسٹر جناح آزاد پارٹی کے لیڈر تھے اور اسمبلی کا فیصلہ اس پارٹی کی رائے پر منحصر تھا۔ اگر یہ پارٹی معاہدے کے حق میں رائے دیتی تو کانگریس پارٹی کی مخالفت بے اثر ہو جاتی۔ اور اگر وہ غیر جانبدار رہتی تو کانگریس پارٹی کی مخالفت کامیاب ہو جاتی۔ دراصل کانگریس پارٹی بھی سمجھتی تھی کہ یہ معاہدہ ملک کیلئے فائدہ مند ہے۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ اسمبلی معاہدے کی تائید کرے یا نہ کرے حکومت ہر صورت میں معاہدے کا نفاذ کرے گی اور ملک کو جو فائدہ معاہدے سے حاصل ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اسمبلی میں معاہدے کی مخالفت

سے کانگریس پارٹی کی سیاسی ساکھ بڑھانے میں کیا ہرج ہے (قائداعظم) مسٹر جناح کی آزاد پارٹی کا موقف تھا کہ کانگریس ہمارے مخالف ہے اور حکومت ہماری موید نہیں لہٰذا ہم نہ کانگریس کا ساتھ دیں گے نہ حکومت کا اور غیر جانبدار رہیں گے۔ انہیں بھی اطمینان تھا کہ اسمبلی کا فیصلہ کچھ بھی ہو معاہدے کا نفاذ تو ہو کر رہے گا لہٰذا ان کے غیر جانبدار رہنے سے اگر اسمبلی میں معاہدہ رد بھی ہو جائے تو ملک کے اس کے فوائد سے محروم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایسی مجالس میں جہاں حکومت کے خلاف فیصلہ ہونے سے حکومت کو مستعفی نہ ہونا پڑتا ہو کئی دفعہ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسمبلی میں جب قائداعظم مسٹر جناح نے معاہدے کے متعلق تقریر کی تو جہاں انہوں نے معاہدے کی بعض شقوں پر تنقید کی وہاں اپنی روایتی دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ یہ معاہدہ پہلے معاہدے (معاہدہ آٹووا) سے بہت بہتر ہے اور میری نسبت از راہِ ذرہ نوازی فرمایا۔ "اگرچہ ظفر اللہ کی تعریف میں میرا کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسا ایک باپ کا اپنے بیٹے کی ستائش کرنا لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس نے معاہدے کے متعلق اپنے فرض کو احسن طریقہ سے سرانجام دیا ہے اور اس کے لئے اسے مبارکباد پیش کرتے ہوئے جو کچھ مختلف اطراف سے کہا گیا ہے میں اسکی پوری طرح تائید کرتا ہوں" اسمبلی میں رائے شماری ہونے پر معاہدہ منظور نہ ہوا لیکن سب کی توقع کے مطابق حکومت نے معاہدے کا نفاذ کر دیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد میں دورے پر بمبئی گیا تو سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے تاج ہوٹل میں مجھے لنچ کی دعوت دی۔ اس موقعہ پر بمبئی کے سرکردہ تاجران اور کارخانہ داران بھی مدعو تھے۔ اپنی استقبالی تقریر میں تجارتی معاہدے کے مشاورتی وفد میں اپنی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا وفد میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کرنے سے قبل میں اور میرے رفیق کار ظفر اللہ سے ملنے گئے تھے۔ اس ملاقات میں اس نے مشاورتی وفد سے تعاون کی طریق کار کی جو وضاحت کی وہ ہر پہلو سے سو فیصدی اس نے پوری کی۔ یہ صرف میرا ہی تاثر نہیں بلکہ سب رفقائے کار کا یہی تاثر ہے۔

لارڈ لنلتھگو کی وزارت کے قلمدانوں کی نئی تقسیم

۱۹۳۸ء میں میرے انگلستان سے واپس آنے پر لارڈ لنلتھگو نے وزارت کے قلمدانوں کی نئی تقسیم کا فیصلہ کیا۔ مجھے تجارت، صنعت، پبلک ورکس اور لیبر کے محکمہ جات کا قلمدان سپرد ہوا۔ میرے نئے محکموں کے سیکرٹری سر اینڈریو کلو تھے اور جائنٹ سیکرٹری مسٹر صالح اکبر حیدری تھے۔ سر اینڈریو کلو کے وزیر ہونے پر مسٹر حیدری سیکرٹری ہوئے۔ مسٹر حیدری نے میرے ایمائ پر پبلک ورکس کے محکمے میں ایک منصوبہ تیار کروایا جس کے تکمیل پانے کی مجھے بڑی خواہش تھی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں میرا قلمدان پھر تبدیل ہو گیا اور وہ منصوبہ وہیں کا وہیں رہ گیا کیونکہ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہو گئی اور ایسے امور کی طرف سے توجہ بھی ہٹ گئی اور ان کے لئے روپیہ بھی میسر نہ رہا۔ وہ منصوبہ مختصراً یہ تھا کہ ریلوے کے

پل سے لیکر قریب چھ میل نیچے تک یعنی ہیلی نہر کے مخرج تک دریائے جمنا کا دلی کی طرف کا کنارہ اس طور پر ترتیب دیا جائے کہ ایک تو طغیانی کے زمانے میں شہر کے نشیب میں سیلاب کا پانی جمع نہ ہو اور دوسرے لال قلعہ سے لیکر اس تمام رقبہ میں ایک خوشنما پارک بن جائے۔ جس میں پرانا قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ اور دیگر سب پرانی عمارات شامل ہو جائیں تاکہ دلی کی بڑھتی ہوئی آبادی کے عوام کیلئے ایک سیرگاہ مہیا ہو جائے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ خزانے کی وزارت کے ماہرین اخراجات کی بناء پر ہر قسم کی روک پیدا کریں گے۔ لیکن مجھے امید تھی کہ میں سر جیمز گرگ سے تو یقیناً اور سر جیریمی ریسمین سے اغلباً منظوری لے لوں گا۔ لیکن جنگی امور حائل ہو گئے۔ میرا ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ حکومت کی طرف سے امراء کے لئے تو ہر آسائش کا سامان جلد ہو جاتا ہے لیکن عوام کی تفریح اور آرام کی طرف بہت کم توجہ دیجاتی ہے۔

پریوی کونسل کی پیشکش | ۱۹۳۸ء کے آخر میں وائسرائے نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ سر شادی لال نے پریوی کونسل کی عدالت سے استعفےٰ دیدیا ہے اور وزیر ہند دریافت کرتے ہیں کہ کیا تم ان کی جگہ لندن جانا چاہتے ہو؟

میں نے کہا سر فنڈلیٹر اسٹورٹ نے میرے ساتھ اس امکان کا ذکر کیا تھا اور اس وقت میں نے نیم رضامندی ظاہر کی تھی۔ لیکن مسٹر رنسی مین کے مشن متعلقہ چیکوسلواکیہ کے ناکام ہونے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جنگ ناگزیر ہے۔ اسلئے میں اب لندن جانا نہیں چاہتا۔ اسلئے نہیں کہ میں متوقع جنگ کی وجہ سے لندن جانے سے ڈرتا ہوں وہاں جنگ کے دوران میں جو اوروں کا حال ہو گا وہی میرا بھی ہو گا۔ لیکن میرے لئے اس منصب میں یہ کشش تھی کہ لندن میں رہتے ہوئے میں ملک کی آئینی ترقی کیلئے کچھ کوشش کر سکوں گا۔ اور دوسرے ہندوستانی طلباء مقیم انگلستان کیلئے مزید سہولتیں بہم پہنچانے میں مدد کر سکوں گا۔ جنگ کی صورت میں ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں رہے گی۔ اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا مجھے پسند نہیں۔

وائسرائے۔ یہ تو اچھا ہے کہ تم جانا نہیں چاہتے۔ مسٹر جیکر بہت رنجیدہ ہیں کہ سر تیج بہادر سپرو کو تو پریوی کونسل کی رکنیت کا اعزاز عطا ہوا لیکن ان کی خدمات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سر شادی لال کی جگہ ان کا انتخاب ہو جائے تمہارے انکار سے ایک تو مسٹر جیکر کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تم سر اپن اپن سرکار کے جانے پر قانون کا قلمدان سنبھال لو اور میری میعاد کے پورے ہونے تک میرے رفیق کار رہو۔

ظفراللہ خاں۔ آپ نے جو ارشاد فرمایا ہے اسکی تعمیل کے نتیجے میں مجھے ایک سال اپنی میعاد سے زائد ٹھہرنا ہو گا۔ عام طور پر وزارت کی میعاد کے ختم ہونے پر اگر میعاد میں چھ ماہ یا سال بھر کی توسیع کی جائے تو وزیر متعلقہ اسے خوشی سے قبول کرتا ہے کیونکہ وزارت کے ختم ہونے پر اس کا مزید کام کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ میری عمر اس وقت پینتالیس سال ہے۔ مجھے یہاں کام ختم کرنے کے بعد پھر اپنی پریکٹس شروع کرنا ہو گی اور جسقدر تاخیر اس میں ہو گی اسی قدر میری دقت میں اضافہ ہو گا۔ لیکن میں آپ کے اعتماد کی قدر کرتے ہوئے آپ کے ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔

سر راما سوامی مدلیار کا تقرر بطور وزیر تجارت

اسی دن سر جیمز گرگ نے مجھ سے دریافت کیا وائسرائے نے تمہارے ساتھ قلمدانِ وزارت کے متعلق کوئی ذکر کیا ہے ؟ میں نے جو کچھ وائسرائے نے کہا تھا انہیں بتا دیا۔ انہوں نے فرمایا میرا مشورہ ہے کہ تم یہ دریافت کرو کہ تمہاری جگہ وزیر تجارت کون ہوگا۔ مجھے تو معلوم ہے مگر مجھے بصیغۂ راز بتایا گیا ہے۔ اسلئے تم خود دریافت کرو۔ میں نے سر گلبرٹ لیتھویٹ سے وائسرائے کی تجویز کا ذکر کرکے دریافت کیا کیا نئے وزیر تجارت کا انتخاب ہو چکا ہے ؟ سر گلبرٹ نے کہا فیصلہ تو ہو چکا ہے صرف بادشاہ کی منظوری کا انتظار ہے۔ اس میں کچھ تاخیر اس وجہ سے ہوئی ہے کہ بادشاہ سلامت سکاٹ لینڈ میں ہیں اور لندن سے کاغذ آنے جانے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ سر گرجا شنکر باجپائی کا انتخاب ہوا ہے۔ میں نے کہا سر گرجا شنکر میرے دوست ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں میرے سیکرٹری تھے نہایت قابل ہیں۔ لیکن ان کا تقرر سر جگدیش پرشاد کے جانے پر کنور صاحب کی جگہ موزوں ہوگا کیونکہ حکومت ہند میں ان کا سارا وقت وزارت تعلیم میں گذرا ہے۔ اس وقت سر این این سرکار کے جانے پر سر گرجا شنکر کا تقرر نقطہ چینی کا باعث ہوگا۔ سر گلبرٹ نے پوچھا وہ کیسے ؟ میں نے کہا اس وقت چھ اراکین کونسل میں تین یورپین ہیں، تین ہندوستانی ہیں، یورپین اراکین میں عموماً ایک براہ راست انگلستان سے مقرر کیا جاتا ہے۔ دو کا انتخاب انڈین سول سروس کے سینئر افسروں سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی اراکین میں دو غیر سرکاری حلقوں سے چنے جاتے ہیں۔ ایک سروس سے لیا جاتا ہے۔ اس وقت سر این این سرکار اور میں غیر سرکاری اراکین ہیں سر جگدیش پرشاد سروس سے ہیں۔ پبلک کی نگاہ میں سروس سے منتخب شدہ ہندوستانی بھی نیم یورپین ہی شمار کیا جاتا ہے۔ سر این این سرکار کی جگہ سر گرجا شنکر کا انتخاب رجعت پسندی کی مثال سمجھا جائے گا اور پبلک کا ردعمل خوشگوار نہیں ہوگا۔ شاید آپ نہ جانتے ہوں کہ موجودہ وائسرائے کو لارڈ ولنگڈن کے مقابلے میں رجعت پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہ تاثر جائز ہے یا ناجائز لیکن ہے ضرور۔ سر گرجا شنکر کے تقرر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کونسل میں صرف میں ہی ایک غیر سرکاری رکن رہ جاؤں گا۔ وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ کونسل میں ہندوستانی غیر سرکاری عنصر کو بڑھایا جائے۔ اس تقرر کے نتیجے میں وہ عنصر اور بھی کم ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے میری رائے میں یہ انتخاب اس وقت ناموزوں ہوگا۔

سر گلبرٹ نے کہا۔ اب تو معاملہ بہت دور جا چکا ہے۔ بہتر ہو اگر تم خود وائسرائے کے ساتھ یہ ذکر کرو لیکن ایک وقت یہ بھی ہے کہ وائسرائے کی نظر میں اس وقت کوئی اور غیر سرکاری شخص ایسا نہیں جس کا تقرر موزوں ہو۔ میں نے کہا سر راما سوامی مدلیار ہر لحاظ سے موزوں ہیں۔ سر جگدیش پرشاد اور سر گرجا شنکر دونوں یو پی کے برہمن ہیں۔ سر راما سوامی مدراس کے غیر برہمن ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ان کا انتخاب موزوں ہوگا۔ سر گلبرٹ نے کہا۔ لیکن وہ اس وقت وزیر ہند کی مشاورتی کونسل کے رکن ہیں اور ہندوستان سے باہر ہیں۔ میں نے

کہا - یہ کوئی ایسی روک نہیں۔ ان کا مشاورتی کونسل کا تجربہ ان کی موزونیت میں اضافہ کرتا ہے کمی نہیں کرتا یہ جگہ
ابھی چھ ماہ میں خالی ہو گی وہ چھ ماہ تک ابھی مشاورتی کونسل میں کام کر سکتے ہیں ۔ سر گلبرٹ نے کہا میں یہ بات وائسرائے
کے گوش گذار کر دوں گا۔ لیکن تم خود بھی ان سے بات کرنا۔ میں نے جو کچھ سر گلبرٹ سے کہا تھا وائسرائے سے بھی کہہ دیا
صرف ان کی رجعت پسندی کی شہرت کا ذکر چھوڑ دیا۔ ہفتہ بھر بعد پرائیویٹ سکریٹری نے مجھے بتایا کہ سر این این سرکار
کی جگہ سر راما سوامی مدلیار کی تقرری کا فیصلہ ہو گیا ہے اور وہ محکمہ تجارت کے وزیر ہوں گے ۔ کچھ دنوں بعد سر عبدالحلیم
غزنوی دلی تشریف لائے تو مجھ سے ذکر کیا کہ سر گرجاشنکر باجپائی کہتے ہیں کہ وائسرائے نے ان سے کہا تھا کہ سر این این
سرکار کے جانے پر انکو کونسل کا رکن لیا جائے گا اور تجارت کا محکمہ ان کے سپرد ہو گا ۔ اس تقرری کی وزیر ہند نے بھی
منظوری دیدی تھی اور کاغذات منظوری کیلئے ملک معظم کو بھیج دیئے گئے تھے۔ اب انہیں بتلایا گیا ہے کہ سر این این
سرکار کی جگہ سر راما سوامی مدلیار کا تقرر ہوا ہے اور وہ وزیر تجارت ہوں گے ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آخری
مرحلے پر یہ تبدیلی کیسے ہو گئی۔ سر عبدالحلیم نے مجھ سے دریافت کیا تم نے کچھ اس کی بابت سنا؟ میں نے کہا سر گرجا
شنکر خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ ان کا تقرر آئیندہ سال سر جگدیش پرشاد کی جگہ ضرور ہو گا۔ دیر آید درست آید

کنور سر جگدیش پرشاد صاحب کے ساتھ میرے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اب سر راما سوامی کے آنے
سے ہم تینوں یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں جب سر جگدیش پرشاد کی جگہ سر گرجا
شنکر باجپائی کا تقرر عمل میں آیا تو وائسرائے کی کونسل کے تینوں ہندوستانی اراکین کی یکجہتی میں کوئی فرق نہ آیا۔
فالحمدللہ ۔ ۱۹۳۹ء میں جب اسمبلی کا اجلاس دلی میں ہو رہا تھا تو ایک دن سر جگدیش پرشاد جو کونسل آف سٹیٹ
کے رکن تھے اسمبلی کے اجلاس میں تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا اگر تم چند منٹ کے لئے فارغ ہو تو ذرا اپنے کمرے
میں چلو میں نے ایک ضروری بات کہنا ہے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ بہت پریشان بلکہ مضطرب نظر آتے تھے۔ میرا
کمرہ قریب ہی تھا۔ بیٹھتے ہی فرمایا۔ میں ابھی وائسرائے سے ملکر آیا ہوں ایک سخت مشکل پیش آ گئی ہے میرے محکمہ میں
دو سینئر منصب خالی ہونیوالے ہیں۔ ایک ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل آئی ایم ایس اور دوسرا وائس چیئرمین امپیریل کونسل
آف ایگریکلچرل ریسرچ ۔ میں نے ان دونوں کے لئے ہندوستانی افسروں کے نام پیش کئے ہیں وائسرائے دونوں
پر یورپین افسروں کے تقرر پر مصر ہیں۔ پچھلے ہفتے جب میں وائسرائے سے ملنے گیا تھا تو یہ ذکر بھی آیا تھا۔ میں نے
وائسرائے سے کہا ان دونوں اسامیوں میں سے ایک پر تو آپ کو ضرور کسی ہندوستانی کے تقرر پر رضامند ہونا چاہیئے
ورنہ میرے لئے سخت مشکل پیدا ہو جائے گی اور میں کونسل میں نہ ٹھہر سکوں گا۔ میں یہ کہہ کر چلا آیا۔ آج پھر میری ملاقات
کا دن تھا۔ وائسرائے نے اس معاملے کا کوئی ذکر نہ کیا نہ ہی میں نے اس معاملے کو چھیڑا۔ لیکن ایک اور معاملے کے سلسلے
میں وائسرائے نے کہا ہاں مجھے احساس ہے کہ یہ معاملہ جلد طے ہونا چاہیئے کیونکہ آپ نے اپنا گرمیوں کا پروگرام بھی طے

کرنا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وائسرائے اپنی ضد پر قائم ہیں اور مجھے استعفیٰ دینا ہوگا۔ آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ یہ تو بڑی مشکل صورت ہوگئی۔ میں نے کہا کنور صاحب آپ تو ہمیشہ ہر معاملے کا ذکر میرے ساتھ فرمادیا کرتے ہیں اگر یہ معاملہ ایسی اہم صورت اختیار کر رہا تھا تو آپ نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا تا میں مناسب مشورہ پیش کرتا اور یہ صورت پیدا ہی نہ ہوتی۔ آپ کا موقف تو صحیح ہے بلکہ میری رائے میں تو ان دونوں اسامیوں پر ہندوستانیوں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ زراعتی ریسرچ کونسل کا وائس چیرمین تو مدت سے ہندوستانی ہوتا آرہا ہے۔ خود وائسرائے کو زراعت سے بہت دلچسپی ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ خود اس عہدے پر موزوں اور ہمدرد ہندوستانی کے تقرر کے حق میں ہوتے۔ آج یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا ہندوستانی میسر نہیں آسکتا۔ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس کے عہدے پر بھی ایک مرتبہ ہندوستانی کا تقرر ہوچکا ہے۔ اور پالیسی کے لحاظ سے انڈین میڈیکل سروس کے مرکزی ادارے میں ایک ہندوستانی کا ہونا اگر لازم نہیں تو مناسب ضرور ہے اور اب متعدد ہندوستانی افسر اس عہدے کے لئے موزوں ہیں۔ آپ کے موقف کا موید ہوتے ہوئے میں آپکو ضرور ایسا مشورہ دیتا جس سے وائسرائے پر زور بھی پڑتا اور استعفیٰ کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا۔

سر جگدیش پرشاد ۔ یہ کوتاہی تو ضرور ہوئی لیکن اب کیا صورت ہو؟

ظفراللہ خاں ۔ اب بھی مجھے تو اطمینان ہے کہ آپکو استعفیٰ دینا پڑے گا نہ وائسرائے کی بات ماننا پڑے گی زراعتی کونسل کا وائس چیرمین تو ہندوستانی ہی ہوگا۔ چاہے انڈین میڈیکل سروس کا ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل یورپین ہوجائے۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔

سر جگدیش پرشاد۔ لیکن بھائی ہمیں بھی تو اپنے اطمینان کی کوئی وجہ بتاؤ۔ آج تو وائسرائے بالکل پختہ معلوم ہوتے تھے۔

ظفراللہ خاں ۔ کنور صاحب میرے اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی رکن کونسل کا اس مرحلے پر ایک ایسے اختلاف کی وجہ سے استعفیٰ دینا کوئی معمولی بات نہیں لہٰذا لیغیر وزیر ہند سے مشورہ کیئے وائسرائے آخری فیصلہ نہیں کریں گے اور وزیر ہند ہرگز تیار نہیں ہوں گے کہ پبلک پریس میں اور پھر برطانیہ میں اسبات کا شور ہو کہ ایک ہندوستانی رکن کونسل نے اسلئے کونسل کی رکنیت چھوڑ دی کہ وائسرائے موزوں ہندوستانیوں کی موجودگی میں ان عہدوں پر یورپین اشخاص کے تقرر پر مصر تھے۔ اگر خدانخواستہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا اور آپکو اپنی بات کو پورا کرنے کیلئے استعفیٰ دینا ہی پڑا تو آپ کا بیان میں تیار کروں گا جس کے شائع ہونے کے بعد وائسرائے کا یہاں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ آپ کیلئے یہ امر تسلی کا موجب نہ ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ نوبت نہیں آئے گی۔ آپ اطمینان اور صبر سے

انتظار کریں انشاء اللہ نتیجہ نیک ہوگا۔ ایک ہفتہ بعد تک میں ہر ملاقات میں انہیں تسلی دیتا رہا کہ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرے ہفتے وائسرائے کی ملاقات سے پھر سیدھے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا مبارک ہو وہی بات ہوئی جو آپ نے کہی تھی وائسرائے نے زراعتی کونسل کے وائس چیئرمین کے متعلق میری تجویز منظور کر لی ہے۔

سر عبدالرحیم صاحب صدر اسمبلی | مئی ۱۹۳۹ء سے میرے قلمدان میں تبدیلی ہو گئی۔ میں نے سر ابن سرکار سے قانون کے محکمے کا چارج لیا۔ اور اسمبلی میں سینئر وزیر ہونے کی حیثیت سے اسمبلی کے پروگرام اور اسمبلی میں سرکاری کام کے انتظامی پہلو کی نگرانی بھی میرے سپرد ہوئی۔ اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم تھے جو ایک نہایت قابل تجربہ کار بارعب اور باوقار شخصیت تھے۔ میں انہیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور وہ بھی میرے ساتھ بہت شفقت کا سلوک فرماتے تھے۔ جزاہ اللہ۔ نائب صدر مسٹر دت تھے جو کانگریس پارٹی کے رکن تھے۔ کانگریس نے اپنی کسی مصلحت کی بناء پر انہیں اس منصب کیلئے چنا ہوگا۔ ورنہ کانگریس پارٹی کے اراکین میں ان سے کہیں زیادہ قابل، تجربہ کار اور صاحب دانش اصحاب موجود تھے۔ ایک مرتبہ شملے کے اجلاس میں ایسا اتفاق ہوا کہ نائب صدر کی صدارت کے دوران میں کسی مسئلے پر رائے شماری ہوئی۔ نائب صدر نے کرسئ صدارت سے رائے شماری طلب کی اور پھر کرسئ صدارت کو خالی چھوڑ کر دوڑے دوڑے اپنی پارٹی کے اراکین کے پیچھے پیچھے رائے شماری کی لابی میں سے ہو کر دوڑتے ہوئے واپس آئے اور پھر کرسئ صدارت پر متمکن ہو کر رائے شماری کے نتیجے کا اعلان کیا۔ وہ جسیم اور بھاری بھرکم تھے۔ ان کا ایوان میں سے یوں سراسیمگی میں بھاگتے ہوئے رائے شماری کی لابی میں جانا اور پھر اسی کیفیت میں ایوان میں سے بھاگتے ہوئے کرسئ صدارت پر واپس آنا ایک مضحکہ خیز منظر تھا جس سے ایوان میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے احتجاج بھی کیا کہ صدارت کے فرائض سرانجام دیتے وقت جو صاحب صدارت کی ذمہ داریوں کے حامل ہوں وہ رائے شماری میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن وہ اپنی چالاکی پر اسقدر مسرور اور فرحاں ہو رہے تھے کہ انہوں نے میرے احتجاج کو ہنسی میں ٹال دیا۔ اسمبلی کے اراکین صاحب صدر کا پورا احترام کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے۔ صاحب صدر اسقدر دانش اور وقار کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیتے تھے کہ اسمبلی کے اجلاسوں میں کبھی کوئی ناگوار صورت پیدا نہ ہوئی۔

میرے زمانے میں وزارت قانون کے سیکرٹری سر جارج سپنس تھے، ڈپٹی سیکرٹری مسٹر شیو بکس لال تھے، اور سولسٹر ایک بنگالی قانون دان تھے تینوں نہایت قابل افسر تھے۔ سولسٹر کی ملازمت کی میعاد میرے وقت میں پوری ہو گئی لیکن مجھے ان کے صائب الرائے ہونے کی وجہ سے انکی بہت قدر تھی اسلیئے میں نے ان کے دوبارہ تقرر کی سفارش

کی۔ اور نائٹ ہڈ کے خطاب کے لئے بھی ان کا نام پیش کیا دونوں سفارشیں منظور ہوئیں۔ حکومت ہند میں اپنی میعاد ختم ہونے کے بعد وہ لندن میں ہائی کمشنر کے مشیر قانون ہوئے۔ فیڈرل کورٹ کے قیام کے ساتھ ایڈوکیٹ جنرل ہند کا تقرر بھی ہو گیا تھا۔ سر بی این متر اس منصب پر فائز ہوئے۔ جو سر این این سرکار کے تقرر سے پہلے حکومت ہند میں وزیر قانون تھے۔ میرے اور ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ باوجود ایڈوکیٹ جنرل کی موجودگی کے حکومت ہند وزیر قانون کے محکمے سے بھی قانونی مشورہ طلب کیا کرتی تھی۔ جن دنوں میں وزیر قانون تھا ان دنوں دو ایک ایسے کیس قانونی مشورے کیلئے آئے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج نے بعض غداروں کی مدد سے سرنگا پٹم کے مقام پر سلطان ٹیپو شہید کی افواج کو پسپا کر کے سلطنت میسور پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور ریاست کا انتظام سابق ہندو حکمران کے سپرد کر دیا تو کمپنی نے جو معاہدہ مہاراجہ کے ساتھ کیا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ سرکار انگریزی کو ریاست کے اندر اپنی کسی چھاؤنی کی توسیع کیلئے یا نئی چھاؤنی قائم کرنے کے لئے زمین کی ضرورت ہوگی تو ریاست مطلوبہ رقبہ بلا معاوضہ سرکار انگریزی کو مہیا کرے گی۔ بعد میں جب کبھی ایسا موقع پیدا ہوا ریاست کی طرف سے مطالبہ ہوتا رہا کہ اگرچہ معاہدے کے مطابق ریاست اپنے حقوق ترک کر دینے کے عوض تو کوئی معاوضہ طلب کرنے کی حقدار نہیں لیکن تیسرے اشخاص کے جو حقوق رقبہ مطلوبہ میں ہوں ان کا معاوضہ سرکار انگریزی ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے دربار کو ہمیشہ یہی جواب ملتا رہا کہ معاہدے کی متعلقہ دفعہ کی صحیح تعبیر یہی ہے کہ ایسی صورت میں تیسرے اشخاص کو جو معاوضہ قابل ادائیگی ہو اس کی ادائیگی کی ذمہ داری بھی ریاست پر ہے۔ چنانچہ ریاست اس کے مطابق یہ معاوضہ ادا کرتی رہی۔ لیکن ریاست نے کبھی اس تعبیر کی صحت کو تسلیم نہ کیا اور اپنا احتجاج اس تعبیر کے خلاف قائم رکھا۔ آخری بار یہ سوال لارڈ کرزن کے عہد میں زیر غور آیا۔ پولیٹیکل سیکریٹری صاحب نے تفصیلی نوٹ لکھا اور جانبین کے دلائل کا خلاصہ درج کرنے کے بعد اپنی رائے درج کی جس کا آخری فقرہ یہ تھا:۔

"IN SHORT THOUGH THERE IS SOMETHING TO BE SAID ON THE OTHER SIDE I AM OF THE VIEW THAT THE LANGUAGE OF THE ARTICLE FAVOURS OUR STAND"

مسل جب وائسرائے لارڈ کرزن کی خدمت میں پیش ہوئی تو انہوں نے سرخ سیاہی میں حسب ذیل حکم ثبت فرمایا:۔

"I AGREE, EXCEPT THAT THERE IS NOTHING TO BE SAID ON THE OTHER SIDE"

اب ویسا ہی موقعہ پیش آنے پر ریاست کی طرف سے پھر وہی سوال اٹھایا گیا۔ جب مسل قانونی مشورے کیلئے

میرے پاس آئی تو میں نے بلا تامل اس رائے کا اظہار کیا کہ ریاست کا موقف درست ہے ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بلا معاوضہ لئے رقبہ مطلوبہ مہیا کرے۔ ریاست نے رقبہ مطلوبہ مہیا کر دیا ہے۔ ریاست کسی معاوضے کا مطالبہ نہیں کرتی۔ لیکن رقبہ مطلوبہ میں تیسرے اشخاص کے حقوق ہیں اور وہ معاوضہ پانے کے حقدار ہیں۔ معاہدے میں یہ درج نہیں کہ ایسی صورت میں ریاست تیسرے اشخاص کے حقوق کو اپنے پاس سے معاوضہ ادا کر کے حاصل کرے گی اور وہ حقوق حکومت انگریزی کو منتقل کرے گی۔ وائسرائے نے اس رائے کے ساتھ اتفاق کیا اور یہ پرانا قضیہ آخر حق و انصاف کے مطابق طے ہو گیا۔

ریاست بڑودہ ایک ساحلی ریاست ہونے کی حیثیت سے اس تجارتی سامان پر جو ریاست کی کسی بندرگاہ پر اترتا بحری محصول وصول کرنے کی حقدار تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ وہی تجارتی سامان بعد میں ریاست سے برطانوی ہند کے علاقے میں بھیجا جاتا جس پر حکومت ہند محصول کا مطالبہ کرتی اور اس طرح ایسے سامان پر دو حکومتوں کے محصول کی ادائیگی کی ذمہ داری عاید ہوتی۔ یہ امر ریاست اور حکومت ہند کے درمیان عرصے سے زیر تنازعہ چلا آتا تھا۔ آخر سر جیمز گرگ وزیر خزانہ کے زمانے میں اس قضیے کا یوں تصفیہ ہوا کہ ریاست اپنی شرح محصول حکومت ہند کی شرح کے مطابق رکھے اور ایسے سامان پر جو ریاست کے محصول کی ادائیگی کے بعد برطانوی ہند میں داخل ہو۔ ریاست حکومت ہند کو سالانہ تشخیص شدہ رقم ادا کر دیا کرے۔ اگر ایسے کسی سامان کے متعلق تنازعہ پیدا ہو تو معاملہ ایک متفقہ ضابطے کے مطابق دونوں حکومتوں کے درمیان طے ہو جایا کرے۔ سامان کو یا تاجر کو ریاست کی برطانوی ہند کی حد پر نہ روکا جائے اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کیا جائے۔ اس معاہدے کے مطابق مقررہ تاریخ سے ریاست میں عمل درآمد شروع ہو گیا لیکن برطانوی ہند کی سرحد پر پہلی سی مشکلات قائم رہیں ریاست کی طرف سے شکایت ہوئی۔ مرکزی ادارہ مالیات کے رکن مسٹر سلیڈ نے ایک عالمانہ تفصیلی نوٹ لکھا کہ معاہدے کو ملک کے قانون کی حیثیت حاصل نہیں۔ اور جب تک معاہدے کی شرائط کو قانونی جامہ نہ پہنایا جائے ان کی تعمیل لازمی نہیں۔ مسل محکمہ قانون میں مشورے کے لئے آئی تو میں نے لکھا کہ معاہدے کی شرائط کو تاریخ مقررہ سے قبل قانونی جامہ پہنانا ہمارا فرض تھا۔ اگر ہم نے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے تو ہم مجاز نہیں کہ اپنی کوتاہی کا اس رنگ میں فائدہ اٹھائیں کہ فریق ثانی تو معاہدے کی عاید کردہ ذمہ داریوں کو ادا کرے اور ہم ان کی ادائیگی سے گریز کریں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم معاہدے کی شرائط کو پورا کریں اور اپنے افسروں کے نام ہدایت جاری کریں کہ ان شرائط کے مطابق عمل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

صوبجات متوسط کے ایک برطانوی ایگزیکٹو انجینئر نے صوبائی حکومت سے اس بناء پر معاوضے کا مطالبہ کیا کہ صوبے میں سپرنٹنڈنگ انجینئر کی تین اسامیوں میں سے ایک تخفیف کر دی گئی ہے۔ جس سے

اس کی ترقی کے امکانات پر مخالفانہ اثر پڑا ہے۔ صوبے کی حکومت نے تمام حالات کا جائزہ لیکر قرار دیا کہ تین اسامیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس افسر کے سپرنٹنڈنگ انجنیئر کی اسامی پر فائز ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسلئے وہ کسی معاوضے کا حقدار نہیں۔ اس حکم کے خلاف افسر مذکور نے حکومت ہند میں اپیل کی یہاں بھی محکمہ متعلقہ نے صوبائی حکومت کے ساتھ اتفاق کیا۔ مسل قانونی مشورے کیلئے وزارت قانون میں آئی۔ ہم نے بھی اتفاق کیا اور قرار دیا کہ معاوضے کی ادائیگی کی ذمہ داری حکومت پر عاید نہیں ہوتی۔ درخواست کنندہ نے وزیر ہند کی خدمت میں اپیل کی۔ وزیر ہند نے لکھا میرے مشیران قانونی کی رائے میں معاوضے کا مطالبہ بجا ہے اسلئے معاوضہ ملنا چاہیئے۔ واپسی پر مسل ہمارے پاس بھی برائے اطلاع آئی۔ میں نے اس پر لکھا "اطلاع ہوئی۔ میری اب بھی یہی رائے ہے کہ ہماری رائے صحیح ہے اور وزیر ہند کے مشیران قانون کی رائے غلط ہے۔ لیکن وزیر ہند کا فیصلہ ناطق ہے کیوں نہ ہو پنجابی کی مثل ہے :۔ "رب نے دتیاں گاجراں تے وچے رنبا رکھ"۔ دوسرے دن سر جارج سپنس جو محکمہ قانون کے سیکریٹری تھے دریافت کیا کہ تمہارے کل کے نوٹ میں جو پنجابی مثل درج تھی اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا آپ نے انگریزی مثل "MAKE HAY WHILE SUN SHINES" تو سنی ہوگی پنجابی مثل اسی مطلب کو ذرا زیادہ بلیغ الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بنارس میں ایک تقریر کی جسے حکومت کے خلاف اشتعال انگیز سمجھا گیا ان کے خلاف فوجداری مقدمہ چلائے جانے کی تجویز ہوئی۔ وزارت داخلہ کی طرف سے مشورے کے لئے مثل محکمہ قانون میں آئی۔ محکمہ کے ڈپٹی سیکریٹری، سولسٹر اور سیکریٹری تینوں نے اتفاق کیا کہ تقریر واضح طور پر قانون کی زد میں آتی ہے اور مقدمہ چلائے جانے کی صورت میں سزایابی کا قیاس غالب ہے۔ میں نے لکھا مجھے قانونی نقطۂ نگاہ سے تو اتفاق ہے۔ لیکن حکومت کا رکن ہونے کی حیثیت سے میرا مشورہ ہے کہ پنڈت صاحب کے خلاف عدالتی کاروائی نہیں ہونی چاہیئے۔ بیشک انکی تقریر کے بعض حصے صراحتًہ قانون کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں لیکن تقریر کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی میں تاخیر ایک ناقابل برداشت ناانصافی اور ظلم ہے۔ اس موقف کے ساتھ ہر شخص کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس کے مقصد کے ساتھ ہر اہل وطن کو ہمدردی ہے۔ پنڈت صاحب کے خلاف مقدمہ چلانے سے ملک میں ہر ایک کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو جائے گی اور شاید ایسی تقریر کرنے سے پنڈت صاحب کی یہی غرض ہو کہ حکومت مقدمہ چلائے تاکہ پبلک کی ہمدردی کانگریس تحریک کے ساتھ ہو جائے وزیر داخلہ[1] نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور مقدمہ نہ چلایا گیا۔

سزا یافتہ مجرموں کی طرف سے گورنر جنرل کی خدمت میں رحم کی درخواستیں وزارت داخلہ میں آتی تھیں

---

[1] سر ریجینلڈ میکسول۔

اور وہاں سے براہ راست وزیر قانون کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔ وزیر قانون ان پر غور کرکے اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ اگر وزیر قانون کی رائے ہوتی کہ درخواست رد ہونی چاہیئے تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا اور درخواست نامنظور ہو جاتی۔ اگر وزیر قانون تخفیف یا سزا کی معافی کا مشورہ دیتا تو وزیر داخلہ مسل کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے اگر دونوں وزراء متفق ہوتے تو مسل گورنر جنرل کی خدمت میں بھیج دی جاتی اور وہ عموماً متفقہ مشورے کو منظور فرما لیتے اور اس کے مطابق حکم جاری ہو جاتا۔ اگر وزیر داخلہ وزیر قانون کی رائے سے اختلاف کرتے تو مسل ان کے نوٹ کے ساتھ وزیر قانون کے پاس واپس جاتی اور وہ وزیر داخلہ کے نوٹ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے اس کے بعد مسل گورنر جنرل کی خدمت میں بھیج دی جاتی۔ ایسی صورت میں وہ عموماً درخواست رد کر دیتے۔ جتنا عرصہ میں وزیر قانون رہا میری طرف سے اوسطاً ہر مہینے میں تین چار درخواستوں پر تخفیف سزا کی سفارش ہوا کرتی تھی اور وزیر داخلہ شاذ ہی میری رائے سے اختلاف کرتے۔ کبھی کبھی میں سزا کی معافی کا مشورہ بھی دیتا۔ ایسے کسی کیس میں وزیر داخلہ نے میرے مشورے سے اختلاف نہ کیا۔ سزائے موت کے خلاف درخواستوں کی کثرت صوبہ مدراس سے موصول ہوتی تھی۔ دوسرا نمبر پنجاب کا تھا اور تیسرا صوبجات متحدہ کا۔ میں نے شروع سے یہ اصول رکھا کہ اگر کسی مجرم کے حق میں کوئی گنجائش بھی نظر آئے تو موت کی بجائے عمر قید یا اس سے بھی کم سزا کی سفارش کی جائے۔ عمر قید سے مراد چودہ سال کی قید یا عبور دریائے شور مراد لی جاتی تھی اور نیک چلنی کی رعایت سے پورا فائدہ اٹھانے والے کو ڈیڑھ سال کی مزید تخفیف مل جاتی تھی۔ موت کی سزا کے متعلق ایک اصول میں نے یہ بھی رکھا ہوا تھا کہ اگر سزا کا حکم صادر ہوئے ایک سال کا عرصہ گذر چکا ہو اور پھانسی نہ دی جا سکی ہو۔ تو اس تاخیر کو تخفیف سزا کیلئے معقول وجہ سمجھا جائے کیونکہ جو ملزم پھانسی پانے کے خوف میں ایک سال گذار چکا ہے وہ اتنی عقوبت برداشت کر چکا ہے کہ اتنے عرصے بعد اسے پھانسی دینا ظلم ہو گا میرے اس نظریئے کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان نے وائسرائے کی خدمت میں احتجاج کیا۔ وائسرائے نے ان کے مراسلات مجھے بھجوا دیئے۔ میں نے جواب دیا افسوس ہے واجب الاحترام چیف جسٹس صاحبان کو یہ نہیں سوجھا کہ اس تاخیر کا علاج ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر پھانسی کی سزا والے مقدمات کا آخری فیصلہ سزا کے حکم کے ایک سال کے اندر ہو جایا کرے تو یہ صورت پیدا ہی نہ ہو۔ مناسب ہو گا اگر گورنر جنرل صاحب انہیں توجہ دلائیں کہ وہ اپنی اپنی ہائی کورٹ میں پھانسی کی اپیلوں میں اتنے لمبے عرصے کی تاخیر کا علاج تجویز کریں۔ تاکہ یہ صورت آئندہ پیدا نہ ہو۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ نے مجھ سے ذکر کیا کہ بخشی ٹیک چند صاحب کہتے ہیں کہ تم نے ایک ایسے مجرم کی پھانسی کی سزا کو صرف تین سال قید میں بدل دیا جس کی پھانسی کی سزا کے خلاف اپیل انہوں نے بہت غور کے بعد رد کر دی تھی۔ میں نے چیف جسٹس سے کہا آپ اس کیس کی مسل منگوا کر ہائی کورٹ کا فیصلہ پڑھ لیں اگر آپ کو اس فیصلے کے ساتھ اتفاق

ہو تو میں اپنی غلطی تسلیم کر لوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ضرور ایسا کیا ہو گا اور انہیں اطمینان ہو گیا ہو گا کہ اگر وہ اپیل بخشی صاحب کی بجائے ان کے اپنے اجلاس میں پیش ہوتی تو وہ تین مہینے کی قید سے زیادہ سزا نہ دیتے۔

ایک اور موقعہ پر چیف جسٹس نیگ نے مجھے کہا۔ ظفر اللہ پھانسی کی سزا میں تخفیف ہونے پر مجھے تو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ اس ملک میں شہادت ایسی غیر تسلی بخش ہوتی ہے کہ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اسلئے مجھے خود پھانسی کی سزا بحال رکھنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن جب تم بالکل معافی کی سفارش کر دیتے ہو تو اس سے ججوں میں بےچینی پیدا ہوتی ہے کیونکہ ایسی سفارش سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ججوں نے اپنے فرائض منصبی کو کما حقہٗ ادا نہیں کیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر کسی درخواست پر تمہارا یہ تاثر ہو کہ ملزم کے خلاف جرم ثابت نہیں تو فیصلہ کرنے والے جج صاحبان کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنے فیصلے کی صحت کی تائید میں اپنے دلائل بیان کر سکیں۔ میں نے کہا جج صاحبان کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہے۔ اگر آئندہ کسی درخواست پر ایسی صورت پیدا ہوئی تو میں ایسا ہی کروں گا۔ مجھے عدالت ہائے عالیہ کے فیصلوں میں دخل اندازی کا شوق نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ رحم کی درخواستوں پر غور کرتے ہوئے میرا منصب عدالت اپیل کا منصب نہیں۔ مثلاً شہادت کا وزن کرنا عدالت کا منصب ہے۔ کسی وزارت کو اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن جہاں کسی مسلمہ اصول کی صریح خلاف ورزی ہوئی ہو یا واضح شہادت بالکل نظرانداز کر دی گئی ہو گویا مسل پر موجود ہی نہیں یا کسی ایسی مفروضہ شہادت پر انحصار کیا گیا ہو جو مسل پر موجود نہیں لیکن کسی غلط فہمی کے نتیجے میں فرض کر لیا گیا ہو کہ مسل پر ایسی شہادت موجود ہے یا کوئی اور ایسا عنصر توجہ کو لیکار لیکار کر اپنی طرف کھینچتا ہو جس کے خلاف آنکھیں بند کر لینا انصاف کا گلا گھونٹنا ہو تو ایسی صورت میں فاضل ججوں کے احترام کے باوجود امور متعلقہ کی بناء پر رائے قائم کرنا اور فیصلے پر پہنچنا فرض منصبی کا تقاضا تھا جس سے گریز کرنا میری نگہ میں خلاف دیانت تھا۔ ایک آدھ فیصلہ تو میری نظر سے ایسا بھی گذرا کہ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ ایک صوبے کے جوڈیشیل کمشنر صاحبان نے ایک اپیل کی سماعت کی جس میں دو ملزمان کو قتل عمد کے جرم میں موت کی سزا دی گئی تھی۔ ایک ملزم نے اقبال جرم کیا تھا۔ اس کے اقبال جرم اور تائیدی شہادت کی بنا پر دونوں ملزمان کے خلاف جرم ثابت شدہ قرار دیا گیا تھا۔ جوڈیشیل کمشنر صاحبان نے اپنے فیصلے میں پہلے تو اس ملزم کے کیس پر غور کیا جس نے اقبال جرم نہیں کیا تھا اور قرار دیا کہ اقبالی ملزم کا اقبال جرم دوسرے ملزم کے خلاف ایکٹ شہادت کے رو سے بطور شہادت استعمال کیا جا سکتا ہے اور تائیدی شہادت کے ساتھ اس پر غور کرنے سے دوسرے ملزم کا جرم ثابت ہے اسلئے اس کی اپیل خارج کی جاتی ہے۔ پھر عدالت نے اقبالی ملزم کے کیس پر غور کیا اور قرار دیا کہ اس کا اقبال جرم قابل پذیرائی نہیں۔ اسلئے اس کی اپیل منظور ہو کر

اسے بری کیا جاتا ہے !!! اگر اقبال جرم ملزم کے خلاف قابل پذیرائی نہیں تو اس ملزم کے خلاف جس نے اقبال جرم نہیں کیا کیسے قابل پذیرائی ہو گیا ؟ اگر میرا منصب عدالت اپیل کا ہوتا تو میرے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ میں جوڈیشل کمشنر صاحبان کی تجویز کو جس کی بنا پر انہوں نے اقبالی ملزم کو بری کیا تھا تسلیم کرتے ہوئے قرار دیتا کہ اقبال جرم دوسرے ملزم کے خلاف بھی قابل پذیرائی نہیں۔ اور اسے بھی بری قرار دیتا لیکن میرا منصب عدالت اپیل کا نہیں تھا مسل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں ملزمان کے خلاف جرم ثابت تھا۔ میری دانست میں اقبال جرم قابل پذیرائی تھا۔ اور اسے رد کرنے میں جوڈیشنل کمشنران نے غلطی کی تھی۔ لیکن اس غلطی کی اصلاح نہ تو میرے ذمے تھی اور نہ ہی ممکن تھی۔ دوسری طرف انصاف کا یہ تقاضا نہیں تھا کہ اگر ایک مجرم عدالت کی غلطی کی وجہ سے سزا سے بچ گیا ہے تو دوسرے مجرم کو بھی لازماً اس غلطی کا فائدہ ملنا چاہیئے۔ ایسا کرنا بے انصافی ہی نہیں بلکہ ظلم ہوتا۔ میں نے یہ ساری مشکل اپنے نوٹ میں درج کر کے نقطۂ سفارش کی کہ درخواست کنندہ کی سزا پھانسی سے تخفیف کر کے عمر قید کر دی جائے جو منظور ہو گئی۔

میری طبیعت کا میلان تو اسی طرف تھا کہ جہاں بھی نرمی کی گنجائش نظر آئے نرمی کی جائے۔ برسوں بعد میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی کہ جہاں تک ہو سکے لوگوں پر حد وارد ہونے سے انہیں بچاؤ اور جہاں گنجائش ہو ان کیلئے مخلصی کا رستہ تلاش کرو۔ کیونکہ یہ بہتر ہے کہ ایک قصور وار سزا سے بچ جائے بجائے اس کے کہ ایک بے قصور پر عقوبت وارد ہو۔ اس کو پڑھ کر مجھے اطمینان بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے مجھے ایسا موقعہ عطا فرمایا کہ میں اس فرمان کے مطابق سعی کر سکا اور ساتھ ہی حسرت بھی ہوئی کہ کاش پہلے اس فرمان کا علم ہو جاتا تو اس تعلق میں مزید مواقع نرمی کے تلاش کرتا۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے پر محکمہ سپلائی کا چارج

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہونے پر وائسرائے نے ایک نیا محکمہ سپلائی کا قائم کیا اور یہ محکمہ میرے سپرد کیا گیا جس سے میرے فرائض میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ایک "وار سپلائی کونسل" بھی قائم کی گئی۔ نہر سویز کے جنوب اور مشرق کے سب برطانوی مقبوضات اور نو آبادیات کی حکومتوں کے نمائندے اس کونسل میں شامل کئے گئے۔ وائسرائے اس کونسل کے صدر تھے اور میں چیرمین۔ سپلائی کا محکمہ بہت جلدی وسعت اختیار کر گیا۔ اس کی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ملک نے جلد جلد اقتصادی ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ ہندوستان سے اسقدر جنگی اور دیگر ضروریات کا سامان برطانیہ کو مہیا کیا گیا کہ جنگ ختم ہونے تک ہندوستان کے ذمہ جو برطانوی قرضہ واجب تھا وہ ادا ہو گیا اور برطانیہ ہندوستان کا دو سو کروڑ پونڈ کا مقروض ہو گیا۔

سپلائی کے محکمہ کے پہلے ڈائرکٹر جنرل جنرل ووڈ مقرر ہوئے۔ سر ووڈ کو اس محکمہ کا پہلا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ جب وہ سندھ کے گورنر ہوگئے تو سر ایون جنکنز محکمہ سپلائی کے سیکریٹری مقرر ہوئے وہ بہت قابل افسر تھے۔ دفتری کام کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شادی نہیں کی تھی اسلئے بیوی بچوں کے دھندوں سے آزاد تھے دفتر میں دیر تک بیٹھ کر کام کرتے رہتے تھے۔ جب اپنا کام ختم کر لیتے تو جائنٹ اور ڈپٹی سیکریٹریوں کے کمروں میں جاکر ان کی میزوں سے مسلیں اٹھا لاتے اور ان پر مناسب احکام صادر کر کے انکی میزوں پر واپس رکھ دیتے۔ دوسری صبح متعلقہ افسران حیران ہوتے کہ جو مسلیں وہ ابھی دیکھ نہیں پائے ان پر سیکریٹری صاحب کے احکام بھی صادر ہو چکے ہیں۔ چونکہ میں بھی آج کا کام کل پر ٹالنے کا عادی نہ تھا اسلئے سر ایون ایسے کام کے دھنی سیکریٹری کے ساتھ میری خوب گذرتی تھی۔ مسل پر ان کا نوٹ ایسا جامع اور واضح ہوتا تھا کہ مجھے مسل کے کسی اور کاغذ کے دیکھنے کی بہت کم ضرورت ہوتی۔ سر ایون بعد میں پنجاب کے گورنر ہو گئے تھے۔ محکمہ کا کام بڑھ گیا تو کلکتہ میں ایک انجینیرنگ کی ڈائرکٹریٹ قائم کی گئی۔ جس کے پہلے ڈائرکٹر جنرل سر گھنشیری رسل ہوئے جو میرے ساتھ ریلوے بورڈ کے چیف کمشنر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔

ڈومنین منسٹرز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن کا سفر

اکتوبر ۱۹۳۹ء کے آخر میں وائسرائے نے مجھ سے ذکر کیا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر نیول چیمبرلین نے ڈومنینز کے وزراء کی ایک کانفرنس طلب کی ہے۔ اور ہندوستان سے بھی ایک نمائندے کو شمولیت کی دعوت دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی طرف سے تم اس کانفرنس میں شرکت کرو۔ جنگ کا زمانہ ہے اور محکموں پر کام کا بہت بوجھ ہے۔ ساتھ ہی افسروں کی کمی ہے۔ کسی افسر کو تمہارے ساتھ بھیجنا مشکل ہوگا۔ جہاں تک معلومات اور مشورے کی ضرورت ہوگی وہ انڈیا آفس مہیا کر دے گا البتہ ایک ذاتی سیکریٹری کی تمہیں ضرورت ہوگی۔ اگر تم کسی ایسے شخص کو ساتھ لے جانے پر آمادہ کر سکو جو تمہارے لئے سہولت کا باعث ہو سکے تو کر لو۔ اگرچہ میں تو نہیں سمجھتا کہ جنگ کے خطرات کے پیش نظر کوئی شخص تمہارے ساتھ جانے پر رضامند ہو سکے گا۔ میں نے عزیزم چودھری انور احمد کاہلوں سے ذکر کیا وہ شوق سے رضامند ہو گئے۔ ان ایام میں انگلستان کا سفر ہوائی کشتی سے ہوتا تھا۔ دہلی سے قریب ترین مقام جہاں سے ہوائی کشتی پرواز کرتی تھی گوالیار سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم دہلی سے ریل پر گوالیار گئے ریذیڈنسی میں ٹھہرے اور ہوائی کشتی کے پروگرام کے مطابق روانہ ہو گئے۔ اسی کشتی میں مسٹر رچرڈ کیسی جو اب لارڈ کیسی ہیں اور آسٹریلیا کے گورنر جنرل رہ چکے ہیں اور ان دنوں آسٹریلیا کے وزیر مالیات تھے اس کانفرنس میں آسٹریلیا کے نمائندے کے طور پر شرکت کے لئے لندن جا رہے تھے۔ گوالیار سے روانہ ہو کر ہوائی کشتی سے کراچی پہنچے رات کراچی میں قیام ہوا، دوسرے دن کراچی سے روانہ ہو کر بحرین ٹھہرنے کے بعد بصرہ پہنچے اور رات وہاں قیام ہوا۔ تیسرے

دن اسکندریہ پہنچے بقیہ سفر میں دن بھی چھوٹا تھا اور جنگی پابندی تھی کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد سفر نہ کیا جائے۔ اسکندریہ سے روانہ ہو کر ہم کارفو اترے اور رات وہاں بسر کرنا پڑی دوسرے دن کارفو سے مارسیلز پہنچے۔ ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مسٹر کیسی اپنی میز سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور کہا ظفراللہ یہاں کے برطانوی قونصل نے مجھے ابھی پیغام دیا ہے کہ ان کی حکومت کی ہدایت ہے کہ ہملوگ یہاں سے لندن تک ہوائی سفر نہ کریں بلکہ ریل سے پیرس جائیں اور وہاں سے ریل سے ہی لندن جائیں۔ قونصل نے ہمارے لئے آج رات کی پیرس جانیوالی ایکسپریس پر سونے والے ڈبے میں کمرے محفوظ کر رکھے ہیں۔ اگر انور اور تم بھی اسی طریق سے سفر کرنا چاہو تو وہ کہتے ہیں وہ تمہارے لئے بھی یہی انتظام کر دیں گے۔ میں نے دریافت کیا کہ پروگرام میں اس تبدیلی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ معلوم ہوا آسٹریلین حکومت نے برطانوی بحری وزارت کو تار دیا تھا کہ وہ مارسیلز سے لندن تک کے ہوائی سفر کے دوران میں مسٹر کیسی اور ان کے رفقاء کی سو فیصدی حفاظت کی ذمہ داری لیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جنگ کا زمانہ ہے ہم تو ایک فیصدی بھی کسی کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ اس پر آسٹریلین حکومت نے ہدایت کی کہ کیسی پارٹی کے سفر کا انتظام ریل کے ذریعے کیا جائے۔ میں نے دریافت کیا کیا ہوائی کشتی یہاں سے سوتھیمپٹن تک جائے گی۔ بتلایا گیا کہ پروگرام تو یہی ہے۔ میں نے کہا پھر ہم تو ہوائی کشتی سے ہی جائیں گے۔ دوسری صبح ہوائی کشتی وقت پر روانہ ہوئی۔ ہماری پرواز فرانسیسی ہسپانوی سرحد کے متوازی جا رہی تھی کچھ عرصہ بعد ہوائی کشتی نے واپس مارسیلز کا رخ کر لیا۔ معلوم ہوا ایک انجن میں کچھ نقص پیدا ہو گیا ہے۔ مارسیلز پہنچ کر گھنٹہ بھر انجن کی اصلاح میں صرف ہوا اور ہم پھر روانہ ہوئے اور چار بجے بعد دوپہر سوتھیمپٹن پہنچ گئے۔

یہاں آکر پہلی بار جنگی بندشوں سے سابقہ پڑا۔ بندرگاہ سے سٹیشن تک ایک چھوٹی سی کھڑکھڑاتی ہوئی موٹر میں گئے ایک معمر پورٹر نے ہمارے سوٹ کیس سنبھال لئے اور دریافت کیا کہاں جائیں گے؟ لندن کہہ کر میں نے دو شلنگ اس کے حوالے کئے اور وہ شکریہ کہہ کر سوٹ کیس لئے غائب ہو گیا۔ ہمارے سٹیشن پہنچنے تک اندھیرا ہو چکا تھا اور روشنی کی ایک شعاع بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ انور میاں کو سیکرٹری کی حیثیت سے سامان کی فکر ہوئی۔ پوچھا کیا کیا جائے؟ میں نے کہا فکر نہ کرو لندن پہنچنے پر مل جائے گا۔ لیکن انہیں اطمینان نہ ہوا۔ اتنے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ پہلی گاڑی آئی جو لندن جانے والی نہیں تھی۔ انہیں پریشانی ہوئی کہ ہمارا سامان اس میں نہ چلا جائے۔ میں نے تسلی دی لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے۔ دوسری گاڑی آئی وہ بھی لندن جانیوالی نہیں تھی۔ تیسری گاڑی لندن جانیوالی تھی۔ لیکن اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ کہاں جگہ مل سکے گی۔ میں ایک کمرے میں گھس گیا۔ انور میاں کسی اور کمرے میں جوں توں کر کے داخل ہوئے۔ گاڑی سست

رفتار تھی اور بہت سے مقامات پر ٹھہری۔ اندازاً ساڑھے چھ بجے ہم سوتھمپٹن سے روانہ ہوئے ہوں گے ساڑھے دس بجے واٹر لو پہنچے۔ یہاں اسٹیشن کے اندر کچھ روشنی تھی۔ انور نے میری طرف دیکھا اور کہا سامان؟ میں نے کہا انجن کے ساتھ کے ڈبے میں چلے جاؤ وہاں سے اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھا لاؤ۔ وہ سمجھے میں مذاق کر رہا ہوں لیکن گئے اور سامان اٹھائے ہوئے خوشی خوشی واپس آئے۔ اتنے میں حکومت کے میزبانی کے صیغے کی طرف سے کرنل کرینک شا ہمیں تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ معذرت کرنے لگے کہ تمہیں بہت پریشانی ہوئی ہوگی میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ اول تو ہمیں کوئی ایسی پریشانی بھی نہیں ہوئی لیکن آخر جنگ کا زمانہ ہے اور ہم تو حیران ہیں کہ مشکلات کے باوجود ہم معہ سامان بخیریت پہنچ گئے ہیں۔ واٹر لو سے ہم سرکاری موٹر پر گروونر ہاؤس پہنچے۔ رستے بالکل سنسان تھے اور گھپ اندھیرا تھا۔ لندن ایک تاریک شہر خموشاں تھا۔ کسی کھڑکی یا دروازے سے روشنی کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کہیں کہیں کوئی شخص ٹارچ کی مدد سے رستہ تلاش کرتا ہوا نظر پڑ جاتا تھا۔ لیکن جب ہوٹل کے اندر داخل ہوئے تو بالکل مختلف نقشہ تھا۔ ہوٹل اندر سے روشنی سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا اور ہر طرف چہل پہل تھی۔ کمرے میں پہنچنے پر کرنل کرینک شا نے کہا تمہیں کہیں کھانے کو تو کچھ نہیں ملا ہوگا۔ انہوں نے گھنٹی بجائی اور خادم کے آنے پر اسے کھانا لانے کو کہا۔ گیارہ بج چکے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ سینڈوچز اور قہوہ میسر آجائیں تو بہت غنیمت ہوگا لیکن پندرہ بیس منٹ کے اندر پر تکلف کھانا مہیا کر دیا گیا۔ ان ایام میں عام خوردنی اشیاء سے صرف تازہ انڈے آسانی سے نہیں ملتے تھے انڈوں کی کمی بھی صرف شہروں میں تھی دیہات میں انکی بھی کمی نہیں تھی۔ باقی سب اشیا آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اگرچہ جنگ کا زمانہ تھا لیکن پولینڈ پر قبضہ کر لینے کے بعد ابھی جرمنی کی طرف سے کوئی مزید اقدام نہیں ہوا تھا۔ کھانا آنے تک کرنل نے کانفرنس کے پروگرام کے متعلق ہمیں ضروری معلومات مہیا کیں۔ بتایا کہ ہمارے استعمال کیلئے سرکاری ڈیملر موٹر موجود رہے گی۔ اور ایک دن چھوڑ کر وزیر اعظم کی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اطمینان کر کے کہ ہمارے آرام کا پورا انتظام ہے وہ ہم سے رخصت ہوئے کانفرنس کے ایام میں ان کے محکمے کی طرف سے تمام انتظامات نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے رہے۔ ہمیں ہر طرح سے ویسا ہی آرام ملتا رہا جیسا ہم امن کی حالت میں توقع کر سکتے تھے اور کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ ہوا۔ فجزاہ اللہ۔

مسٹر کیسی اور ان کے رفقاء مارسیلز سے راتوں رات سفر کر کے پیرس پہنچ گئے۔ پیرس سے لندن کا سفر صرف رات کے وقت ہوتا تھا۔ پہلی رات سفر کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہ رات انہوں نے پیرس میں بسر کی اور دوسری رات لندن کا سفر کیا۔ وزیر اعظم کی دعوت کے وقت تک لندن پہنچ گئے۔ کنیڈا کے نمائندے مسٹر کریر تھے، نیوزیلینڈ کے نمائندے ان کے وزیر اعظم مسٹر پیٹر فریزر تھے۔ بہت بھلی طبیعت کے آدمی تھے۔ میرا ان کے ساتھ بہت جلد دوستانہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا میں لندن پہنچتے ہی انڈیا آفس گیا تھا اور وزیر ہند کے ساتھ ملاقات ہوتے ہی یہ سوال کیا تھا کہ ہندوستان

کے آزاد ہونے میں کونسی چیز روک بن رہی ہے ؟

جنوبی افریقہ کے نمائندے کرنل ریٹیس تھے جو جلد بعد جنوبی افریقہ کے ہائی کمشنر ہو کر لندن آئے۔ وہ BOER WAR میں برطانیہ کے خلاف لڑتے رہے تھے۔ لڑائی ختم ہونے پر دل شکستہ ہو کر مڈغاسکر چلے گئے تھے اور وہیں بس جانے کی ٹھان لی تھی۔ لیکن جنرل سمٹس کے سمجھانے پر واپس آ گئے BOER WAR کے حالات اور جنگ کے دوران اپنے کارناموں پر مشتمل انہوں نے ایک کتاب بنام کمانڈو (COMMANDO) شائع کی تھی۔ جو بہت مقبول ہوئی پھر اس کے بعد کے حالات پر ایک اور کتاب "OUTSPAN" شائع کی۔ دونوں کی ایک ایک جلد مجھے تحفہ دی۔ جہاں کہیں اکٹھے تصویر لیئے جانے کا موقعہ ہوتا میں ان کے ساتھ کھڑا ہو جاتا اور اپنا بازو ان کے بازو میں ڈال لیتا اور کہتا اب آپ اپنے ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے! وہ مسکرا دیتے اور کہتے نان سنس (NONSENSE)

میں نے ایک دن ان سے کہا کرنل ریٹیس میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اپنے دونوں لڑکوں کو ایک سال کیلئے ہمارے ہاں ہندوستان بھیج دیں۔ وہ ہمارے مہمان رہیں۔ جب وہ اپنے ملک واپس جائیں تو جنوبی افریقہ کی ہندوستانی آبادی کے حقوق کے متعلق جو تجویز وہ کریں اسے قبول کر لیا جائے۔ کہا تجویز تو معقول ہے۔ جنگ کے بعد ممکن ہے اس پر عمل بھی ہو سکے۔ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ مشورہ کروں گا۔ لیکن ابھی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ ان کی وفات ہو گئی۔

وزیر اعظم کی دعوت میں پہنچنے پر میں نے انور احمد کو مسٹر ڈبلیو ڈبلیو، کرافٹ کے سپرد کر دیا جنہیں میں گول میز کانفرنس کے وقت سے جانتا تھا۔ وہ وزیر ہند کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے۔ دعوت ختم ہونے پر انہوں نے بتایا کہ جیسے جیسے مہمان آتے گئے میں انور سے کہتا گیا یہ فلاں صاحب ہیں یہ فلاں صاحب ہیں۔ جب وزیر اعظم آئے تو میں نے کہا انور ادھر دیکھو وہ وزیر اعظم آ رہے ہیں۔ انور نے کہا مجھے وزیر اعظم میں کوئی دلچسپی نہیں میں چرچل کے انتظار میں ہوں۔ ان کی شخصیت اہم ہے۔ جب ۱۹۴۰ء میں چرچل وزیر اعظم ہو گئے تو انور احمد نے لندن سے مجھے لکھا آپ کو یاد ہے میں نے مسٹر کرافٹ سے کیا کہا تھا؟

جنگ شروع ہونے پر مسٹر چرچل کو "FIRST LORD OF ADMIRALITY" کا منصب پیش کیا گیا تھا اور انہوں نے قبول کر لیا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کی ابتدا میں بھی وہ اسی منصب پر فائز تھے۔ کانفرنس کے دوران میں انہوں نے کامن ویلتھ کے نمائندگان کو شام کے کھانے پر ADMIRALTY HOUSE میں مدعو کیا کھانے کے بعد ہمیں MAP ROOM میں لے گئے اور برطانوی بحری تجارتی بیڑے کے حفاظتی انتظامات کی تفاصیل کی وضاحت کی۔ جب ختم کر چکے تو کرنل ریٹیس سے دریافت کیا آپ نے کیا تاثر لیا؟ کرنل ریٹیس نے جواب دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتنی خوش نصیبی تھی کہ جب آپ[1] لیڈی سمتھ سے بھاگے تو ہمارے کسی آدمی نے آپ کو گولی کا نشانہ بنا دیا! مسٹر

---

[1] جنوبی افریقہ میں بوروں کی جنگ کے دوران مسٹر چرچل کو جو انگریزوں کی فوج میں تھے بوروں نے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ لیڈی سمتھ میں (صفحہ ۴۱۸ پر)

چرچل اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے۔ مجھ سے دریافت کیا تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا:۔

ALL THIS IS REASSURING

خوش ہوئے اور کہا:۔ YES TAHT IS THE WORD REASSURING

ڈومینیز منسٹرز کانفرنس میں ڈومینیز کے نمائندگان مغربی یورپ کے محاذِ جنگ پر

کانفرنس کے پروگرام میں ہمیں مغربی جنگی محاذ پر لیجانے کی کوئی تجویز نہیں تھی۔ کرنل ریٹس نے اصرار کیا کہ اس کا انتظام کیا جائے۔ کہا دنیا کے کناروں سے ہمیں بلایا ہے اور ہم کس منہ سے محاذ پر گئے بغیر واپس ہو جائیں میرے بیٹے تو میری جان عذاب میں کر دیں گے۔ کہیں گے! DADDY YOU FUNKED IT (ابا آپ محاذ پر جانے سے ڈر گئے) میں تو انہیں منہ نہ دکھا سکوں گا۔ آخر یہ طے ہوا کہ مسٹر ایڈن جو اس وقت ڈومینیز سیکریٹری تھے صرف نمائندگان کو مغربی محاذ پر لے جائیں۔

محاذ پر جانے کیلئے پہلے ہم لوگ لندن سے پیرس گئے۔ وزیر اعظم فرانس مسٹر ڈلاڈیر سے ملاقات ہوئی۔ افواجِ فرانس کا ہیڈ کوارٹر پیرس سے چند میل باہر تھا۔ فرانسیسی کمانڈر انچیف نے ہماری دوپہر کے کھانے کی دعوت کی۔ ہر مہمان کے مینو کارڈ پر جس کے اندر کھانے کی فہرست ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی اس کے ملک کا نقشہ بنایا ہوا تھا۔ یادگار کے طور پر ہم سب نے ایک دوسرے کے کارڈ پر اپنے اپنے دستخط کر دیئے۔ جب بعد میں ہم برطانوی محاذ پر گئے تو برطانوی کمانڈر انچیف لارڈ گورٹ نے بھی میرے اسی کارڈ پر اپنے دستخط کر دیئے لارڈ گورٹ ہندوستان میں چیف آف سٹاف رہ چکے تھے اور میں انہیں پہلے سے جانتا تھا۔

پیرس میں ہمارا قیام HOTEL CRILLION میں تھا۔ ہمارے قیام کی پہلی رات ہوائی حملے کا الارم ہوا۔ میں نے ہدایات وغیرہ تو پڑھ لی ہوئی تھیں اور مجھے معلوم تھا کہ ہوٹل میں رہنے والوں کیلئے پناہ گاہ ہوٹل کی زیر زمین منزل میں ہے۔ اور مجھے وہاں پہنچنا چاہیئے۔ لیکن میں نے سوچا کہ اول تو کوئی ایسا خطرہ نہیں اور اگر ہے بھی تو جو کچھ یہاں ہوگا وہی نیچے ہو کر رہے گا۔ یہاں میں آرام سے بستر میں لیٹا ہوں۔ نیچے شراب کے مٹکوں کے درمیان ٹھٹھروں گا بہتر ہے یہیں پڑا رہوں۔ میں نے کروٹ بدلی اور پھر آرام سے سو گیا۔ صبح ناشتے پر مسٹر ایڈن کا مذاق اڑایا جا رہا تھا کہ وہ سراسیمگی میں سونے کے سوٹ میں ہی نیچے بھاگ گئے۔ ڈریسنگ گاؤن تک اوڑھنے کا خیال نہ آیا اور ان کی یہ ہیئت کذائی خواتین کی پریشانی کا موجب ہوئی۔ مذاق میں انہیں چھیڑا جا رہا تھا کہ انہوں نے عمداً ایسا کیا تھا۔ پیرس کے بازاروں میں رات کے وقت ایسا گھپ اندھیرا نہیں ہوتا تھا جیسے لندن میں ہوتا تھا بازاروں کے لیمپوں کی روشنی بہت دھیمی کر دی گئی تھی جس

جنگی قیدی کی حیثیت میں مقید تھے۔ وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلے اور اپنی فوج میں آملے۔

سے رستہ نظر آجاتا تھا۔ اس سے آنے جانے والوں کو لندن کی نسبت بہت سہولت رہتی تھی۔

میجینو لائن | ہم مغربی محاذ کے جنوبی فرانسیسی حصے میں بھی گئے۔ جو کچھ ہم نے اس حصے میں دیکھا اس میں سے دلچسپ ترین میجینو لائن کا نظام تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے میجینو لائن کے ایک زیر زمین قلعے میں کمانڈر کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے آخر میں تقریروں کے خاتمے پر قلعے کے کمانڈر نے ہم میں سے ہر ایک کے سینے پر میجینو بیج لگایا۔ یہ ایک تانبے کا تمغہ تھا جس کے گرد یہ موٹو (اعلان) کندہ تھا: "EN NE PASSEPAS" یعنی "وہ گذرنے نہ پائیں گے۔" میجینو لائن کا سارا انتظام حیرت انگیز تھا اور اس کے زمین دوز قلعوں کو دیکھ کر تو واقعی یہ یقین ہوتا تھا کہ کسی غنیم کا ان سے گذر کر آگے نکل جانا محالات میں سے ہے۔ ان کے اندر سے بڑی بڑی توپوں کے منہ کھڑکیوں کے رستے مقابل کی وادیوں کی طرف جھانکتے تھے جن میں گولے بھرنے کا کام انسانی ہاتھوں سے نہیں بلکہ بجلی سے چلائی جانیوالی مشینوں سے لیا جاتا تھا۔ غرض یہ نظام فن دفاع کا ایک حیران کن کارنامہ تھا۔

ہمارا آخری دن مغربی محاذ کے برطانوی حصے میں گذرا۔ ان ایام میں ملک معظم کے برادر اصغر ڈیوک آف گلوسٹر برطانوی کمانڈر انچیف کے افسر رابطہ تھے۔ وہ سارا دن ہمارے دورے میں ہمارے ساتھ رہے۔ اپنی کار خود چلاتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو باری باری اوسطاً آدھ گھنٹہ ان کی صحبت میں صرف کرنے کا موقعہ ملا۔ جب میری باری آئی تو شاید وہ دن بھر موٹر چلاتے تھک چکے تھے۔ موسم بھی خوشگوار نہیں تھا اور ان کی توجہ موٹر کو قابو رکھنے میں صرف ہو رہی تھی اسلئے ہمارے درمیان کسی موضوع پر گفتگو کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ شہر قریب آرہا تھا کہ انہوں نے اپنے آرڈرلی افسر سے دریافت کیا اب کیا پروگرام ہے۔ پچھلی نشست سے انہوں نے گذارش کی بلدیہ کے میئر کی طرف سے استقبالی دعوت ہے اور پھر شام کا کھانا ہے۔ اس کے بعد کانسرٹ ہے لیکن کانسرٹ میں آپ کا تشریف لے جانا لازمی نہیں۔ آپ نہ جانا چاہیں تو نہ جائیں۔ اس پر ہز رائل ہائی نس نے فرمایا:-

WHAT I SAY IS DAMN THE CONCERT

میں نے الفاظ میں تو کچھ نہ کہا لیکن میرے دل نے ان کے اس بے تکلفانہ اظہار کوفت کی پرزور تائید کی اور انہیں مرحبا کہا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ کانسرٹ میں اگر ہز رائل ہائی نس کی موجودگی لازم نہیں تو اس خاکسار کی حاضری بھی کوئی ضروری نہیں ہوگی۔ میرے لئے کھانے کے بعد نماز اور نماز کے بعد بستر ا۔

سر فنڈلیٹر سٹورٹ سے لندن میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے محاذ جنگ کے دورے کے تاثرات دریافت فرمائے میں نے کہا میجینو لائن بیشک ایک دفاعی شاہکار ہے اور مجھے تو فنون حرب اور دفاع کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ لیکن اسے دیکھ کر مجھے تین باتوں کا خیال آیا۔ اول دفاع کی لائن خواہ کتنی مضبوط اور ناقابل عبور ہو اس سے دشمن کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ دوسرے میجینو لائن فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد سے شروع ہو کر فرانس

اور بلجیم کی حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے سمندر تک نہیں جاتی اگر پہلی جنگ کی طرح جرمن افواج نے بلجیم میں سے ہو کر فرانس کی طرف بڑھنا شروع کیا تو یہ لائن انہیں کیسے روک سکے گی؟ تیسرے ہوائی حملے کو بھی یہ لائن نہیں روک سکے گی؟ سر فنڈلیٹر نے دریافت کیا برطانوی محاذ سے تم کیا تاثر لیکر واپس آئے؟ میں نے کہا برطانوی حصے میں تو کسی قسم کی کوئی حرکت دیکھنے میں نہیں آئی وہاں سب آرام سے بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے جرمنوں کے انتظار میں کوئی اور مشغلہ نہ ہو!

ملک معظم نے کانفرنس کے نمائندوں کو شام کے کھانے کی دعوت دی کھانے پر سادہ ڈنر جیکٹ پہننے کی ہدایت تھی دلی واپس پہنچنے پر وائسرائے نے بھی مجھے کھانے پر بلایا۔ یہاں بھی لباس کے متعلق یہی ہدایت تھی لیکن وہ غیر رسمی موقعہ تھا کھانے پر وائسرائے اور لیڈی لنلتھگو تھے اور صرف میں ایک مہمان تھا۔ وائسرائے مجھ سے کانفرنس کے کوائف سنتے رہے میں نے ملک معظم کی رسمی دعوت کے ذکر میں دانستہ بیان کیا کہ ملک معظم خود بھی سادہ ڈنر جیکٹ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے اور مہمانوں کو بھی اسی لباس میں آنے کی ہدایت تھی۔ جب میں نے یہ کہا تو وائسرائے نے حیرت کے اظہار کے طور پر اپنے ابرو چڑھائے۔

لارڈ کیٹو | کانفرنس کے ایام میں میری ملاقات لارڈ کیٹو سے بھی ہوئی جو ہندوستان کی سب سے بڑی تجارتی فرم اینڈریو یول اینڈ کمپنی کے جس کا بڑا دفتر کلکتے میں تھا سربراہ رہ چکے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۰ء میں لندن میں ہوئی تھی جب وہ لندن کی مرکزی فرم یول کیٹو کمپنی کے سربراہ تھے۔ ۱۹۳۹ء میں وہ جنگی خدمات کے سلسلے میں وزیر مالیات کے مشیر تھے۔ ملاقات پر میں نے دریافت کیا آپ کا صحیح منصب کیا ہے؟ مسکرا کر کہا ظفر اللہ میں مالیات کے لحاظ سے گویا آرچ بشپ آف کنٹربری کا پرائیوٹ چیپلن ہوں یعنی وزیر مالیات کا مالی مشیر ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ میں اسے مشورہ دوں کہ میرے جیسے آدمیوں سے روپیہ کیسے نچوڑا جا سکتا ہے۔ میں نے ان سے انور احمد کا ذکر کیا اور دریافت کیا۔ کیا انہیں کلکتے کی فرم اینڈریو یول میں لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے بہت سے افسروں نے اپنی خدمات جنگ کے سلسلے میں پیش کر دی ہیں اور کچھ تو ایسی خدمات پر چلے بھی گئے ہیں۔ ہمیں افسروں کی ضرورت تو پڑے گی اور میری خواہش بھی ہے کہ اعلیٰ ماحول کے ہندوستانی نوجوانوں کو مناسب ٹریننگ دیکر ہم اپنی فرم میں لینا شروع کریں اس وقت تک ہم نے صرف دو ہندوستانی لئے ہیں جن میں سے ایک شومئی قسمت سے فوت ہو گیا ہے۔ تم کل شام انور کو ساتھ لیکر میرے ہاں کھانے پر آجاؤ۔ مجھے انور سے ملنے کا موقعہ بھی مل جائے گا اور میں اندازہ کر سکوں گا کہ آیا ہمارے ساتھ کام کرنا اس کی طبیعت کے موافق ہو گا۔ وہ ان دنوں سسکس کے علاقے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے فرمایا تم چاہو تو تمہیں لانے کیلئے میں کار تمہارے ہوٹل بھیج دوں گا اور وہی کار تمہیں واپس بھی لے جائے گی۔ میں نے کہا کار تو حکومت کی عنایت سے ہمیں میسر ہے۔ اسلئے آپ کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے دن شام کو ہم ان کے ارشاد کے مطابق اُن کے ہاں گئے۔ کھانے کے بعد ہم گول کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران میں مجھ سے کہا ذرا لائبریری میں چلو۔ بیٹھتے ہی کہا ظفر اللہ مجھے انور کے متعلق کچھ اور دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہمیں ایسے ہی نوجوان درکار ہیں۔

میں صرف ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور جیسے تم کہوگے ویسے ہی میں کروں گا۔ جنگ کا زمانہ ہے ہم نہیں جانتے کس رات لندن کو بموں سے اڑا دیا جائے۔ اگر انور لندن میں ہوا تو اس کے والدین کو اور تمہیں ہر وقت اس کے متعلق پریشانی ہوگی اور میں بھی اس کی خیریت کے متعلق ذمہ داری محسوس کروں گا۔ اسلئے اگر تم چاہو تو میں اس کی ٹریننگ کا انتظام کلکتے میں کردیتا ہوں۔ میں نے کہا یہ سوال آپ انور سے کریں۔ اس کے جواب پر غور کرنے کے بعد جیسے مناسب ہو فیصلہ کریں۔ انہوں نے گول کمرے سے انور کو بلایا اور جو بات مجھ سے کہی تھی انور سے کہی۔ اس نے بلا تامل کہا۔ جناب بیشک جنگ کا زمانہ ہے یہاں جو حال اوروں کا ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔ اگر آپ مجھے ٹریننگ دینے کا فیصلہ کریں تو میں لندن میں ٹریننگ لینے کو ترجیح دوں گا۔ جب انور گول کمرے میں واپس چلا گیا تو لارڈ کیٹو نے مجھ سے کہا۔ میں انور کی بات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ روح ہے جسے ہم اپنے سب کام کرنے والوں کے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ جب انور میرے ساتھ اپنی ڈیوٹی ختم کرے گا تو یول کیٹو کمپنی کے ساتھ اپنی ٹریننگ شروع کردیگا۔ یہ طے کرکے ہم دونوں بھی گول کمرے میں واپس آگئے اور چند منٹوں کے بعد انور اور میں لارڈ کیٹو سے رخصت ہوکر لندن واپس چلے آئے۔

لارڈ کیٹو بعد میں بنک آف انگلینڈ کے گورنر ہوئے۔ جب بھی میں انگلستان جاتا تو انہیں ملنے بنک آف انگلینڈ جاتا۔ عام طور پر مجھے لنچ کیلئے بلاتے۔ اس وقت تک جنگ زوروں پر تھی اور کھانے پینے کے متعلق بہت سی پابندیاں تھیں۔ کچھ قانوناً اور کچھ اجزاء کی کمی یا گرانی کی وجہ سے لیکن بنک میں کھانا نہایت لذیذ اور بافراط ہوا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد گورنر صاحب میرے ساتھ بنک کے موٹر خانے تک آتے اور شوفر کو ارشاد فرماتے۔ سر ظفر اللہ کو جہاں یہ جانا چاہیں لے جاؤ۔ جب تک وہ زندہ رہے بہت شفقت سے پیش آتے رہے۔ انور سے بھی بہت شفقت کا سلوک کرتے اور میرے پاس اس کے کام کی بہت تعریف کرتے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی انور کلکتے میں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کیلئے ٹھہرا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک وقت کلکتے میں مسلمانوں کیلئے حالات بہت مخدوش ہوگئے۔ میں ان دنوں چند دنوں کیلئے لندن میں تھا۔ لارڈ کیٹو نے مجھ سے کہا ظفر اللہ میں انور کے متعلق بہت پریشان ہوں۔ اب تو یورپین بھی کلکتے میں محفوظ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انور کو ایک دو سال کیلئے لندن ہیڈ آفس میں بلالوں۔ جب حالات سدھر جائیں تو وہ کلکتے واپس جاسکتا ہے۔ میں نے کہا میں کراچی پہنچ کر انور کے والد سے بھی بات کروں گا اور ٹیلیفون پر انور سے بھی بات کروں گا پھر آپ کی خدمت میں اطلاع کروں گا۔ انور کے ابا جان نے کہا ہمیں طبعاً پریشانی تو ہے لیکن انور سے پوچھ لو جیسے وہ چاہے ویسے ہی ہونا چاہیئے۔ میں نے انور سے بات کی اس نے کہا آپ دعا کریں میں بھی دعا کروں گا اور کل آپ کو اطلاع کردوں گا۔ دوسرے دن کہا کل بھی میری یہی رائے تھی لیکن آج میں زیادہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں

کہ حالات ناگوار تو ہیں لیکن خطرہ ایسا شدید نہیں جیسے ان عزیزوں کا اندازہ ہے جو فاصلے پر ہیں۔ لیکن بہر حال میرے فرائض منصبی کا یہی تقاضا ہے اور اخلاقی فرض بھی ہے کہ میں اپنی جگہ نہ چھوڑوں اسلئے آپ لارڈ کیٹو کو لکھ دیں کہ میں ان کی شفقت کا ممنون ہوں۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ میں کلکتے میں ہی ٹھہروں۔

ابھی میں وزراء کی کانفرنس کے سلسلے میں لندن ہی میں تھا کہ والسرائے کا تار آیا کہ فنلینڈ کی استدعا پر لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کا اجلاس ہونیوالا ہے یہاں سے تو کسی کو جنیوا پہنچنے کا موقعہ نہیں تم وہیں سے وفد تیار کرکے ہندوستان کی نمائندگی کیلئے جنیوا چلے جاؤ۔ انڈیا آفس سے مشورہ بھی کرلو اور جو مدد ضروری سمجھو ان سے طلب کرلو۔ میں نے سر فنڈلیٹر سٹورٹ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا ہمارے دفتر میں مسٹر ٹامکنس لیگ آف نیشنز کا کام کرتے ہیں۔ تفاصیل ان کے ساتھ طے کرلو۔ وہی تمہارے ساتھ بطور ہندوستانی وفد کے سیکرٹری کے جنیوا چلے جائیں گے۔ فنلینڈ نے روس کے خلاف جارحانہ کاروائی کرنے کی شکایت کی ہے۔ حالات واضح ہیں۔ ہم سب کی ہمدردی فنلینڈ کے ساتھ ہے۔ وہاں پہنچ کر دیکھ لینا کہ کس نوع کی کاروائی مناسب ہوگی اگر ضرورت سمجھو تو ہم سے مشورہ کرلینا۔ وفد کے قائد تو تم خود ہی ہوگے اپنے سیکرٹری کو جسے تم ساتھ لائے ہو وفد کا ممبر بنا لو۔!

مسٹر ٹامکنس بہت باتدبیر اور سلجھی ہوئی طبیعت کے افسر نکلے۔ سب تفاصیل ان کے ساتھ طے ہوگئیں وزراء کی کانفرنس کی کاروائی آخر نومبر تک ختم ہوگئی۔ جنیوا جانے میں ابھی چار پانچ دن باقی تھے۔ میں نے کرنل کرنیکشا سے دریافت کیا کہ حکومت برطانیہ کی میزبانی کا فائدہ ہم کب تک اٹھا سکتے ہیں! انہوں نے کہا جنگ کا زمانہ ہے واپسی سفر کے انتظامات فوری طور پر تو نہیں ہوسکیں گے۔ آخر چار پانچ دن تو درکار ہوں گے ہی جب تک تم حکومت کے مہمان ہی ہوگے۔ میں نے کہا میں تو یہاں سے لیگ آف نیشنز کے اجلاس کے لئے جنیوا جاؤں گا اور وہاں سے ہندوستان جاؤں گا۔ جنیوا جانے میں ابھی کچھ وقفہ ہے۔ میں چاہتا ہوں تین چار دن لندن سے باہر ہو آؤں کیا یہ انتظام ہوسکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا بیشک ہوسکتا ہے۔ کار لے جاؤ ہم پٹرول کے کوپن وغیرہ مہیا کردیں گے۔ واپسی پر جنیوا جانے تک وہی انتظام قائم رہے گا جو اس وقت ہے۔ تمہاری میزبانی تو نہایت آسان ہے تم نے تو ہم سے کسی قسم کا مطالبہ کیا ہی نہیں۔ یہ ان کا حسنِ اخلاق تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ پٹرول کے متعلق کڑی پابندیاں ہیں۔

لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت | جنیوا کے سفر کا یہ انتظام تھا کہ لندن سے ہوائی جہاز پر پیرس اور وہاں سے ریل پر جنیوا جائیں گے۔ مسٹر ٹامکنس نے لندن سے پیرس تک کے ریل کے ہوائی سفر اور پیرس سے جنیوا تک کے ریل کے سفر کیلئے بکنگ کا انتظام کرلیا ہوا تھا۔ اور احتیاطاً دوسرے دن کے لئے بھی وہی بکنگ کرائی

ہوئی تھیں تاکہ اگر کسی وجہ سے پہلے دن سفر نہ کر سکیں تو دوسرے دن سفر کیا جاسکے۔ انکی اس دوراندیشی سے ہم پریشانی سے بچ گئے۔ کیونکہ پہلے دن جب ہم مطار پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بادلوں کی وجہ سے جہاز اس دن پرواز نہیں کرے گا۔ جنگی ضابطہ کی رو سے ان دنوں لازم تھا کہ پرواز کے دوران ہوائی جہاز سارا وقت زمین سے نظر آتا رہے اور آسانی سے شناخت کیا جاسکے۔ دوسرے دن مطلع صاف تھا اور ہم دو بجے بعد دوپہر پیرس پہنچ گئے۔

دوسری صبح ہم جنیوا پہنچے ہوٹل لورین دا میں قیام ہوا۔ لندن اور پیرس کے مقابلے پر جنیوا میں بہت چہل پہل معلوم ہوتی تھی اور جھیل کا منظر بہت دلکش تھا۔ مہینہ بھر کے قریب اندھیرے میں گزار کر روشنی کی قدر بہت بڑھ گئی تھی۔ ہمارے ہوٹل کے قریب ہی رچمنڈ ہوٹل میں سر ہربرٹ ایمرسن سابق گورنر پنجاب ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں لیگ آف نیشنز کے رفیوجی کمشنر تھے۔ مجھے اور انور کو کھانے پر بلایا کچھ پرانی یادیں تازہ ہوئیں جن سے کچھ تلخیاں بھی وابستہ تھیں۔ اس ہوٹل میں نیوزیلینڈ کے نائب کمشنر مقیم لندن مسٹر جارڈن بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو اسمبلی کے اجلاس میں نیوزیلینڈ کی نمائندگی کیلئے تشریف لائے تھے۔ اجلاس میں جانے اور وہاں سے آتے ہم اکثر انہیں ساتھ لے لیتے تھے۔ ان کا میرا بہت دوستانہ ہو گیا۔ بہت بھلے آدمی تھے۔ نیوزیلینڈ میں جاکر آباد ہونے سے پہلے وہ لندن میں پولیس کانسٹیبل تھے۔ نیوزیلینڈ میں پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے۔ میں بعد میں انہیں لندن میں ان کے دفتر جاکر ملا کرتا تھا۔ اس وقت ان کا دفتر سٹرینڈ میں تھا۔ جب میں پہلی بار ان سے جاکر ملا تو مجھے کھڑکی کے پاس لے گئے اور نیچے بازار کی طرف اشارہ کرکے کہا دیکھو جہاں وہ کانسٹیبل ڈیوٹی پر کھڑا ہے وہاں ایک وقت میں بھی ڈیوٹی پر کھڑا ہوا کرتا تھا۔

اسمبلی کے اجلاس میں مسٹر آر اے بٹلر سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں برطانیہ کے نائب وزیر خارجہ تھے اور برطانوی وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ اب وہ لارڈ بٹلر ہیں۔ میں انہیں گول میز کانفرنسوں کے وقت سے جانتا تھا۔ ان کے والد سر مانٹیگو بٹلر انڈین سول سروس میں تھے اور پنجاب میں تعینات رہے۔ جب وہ ضلع اٹک کے ڈپٹی کمشنر تھے ان دنوں مسٹر آر اے بٹلر اٹک کے قلعہ میں پیدا ہوئے۔ سر مانٹیگو پنجاب کونسل کے پہلے صدر ہوئے۔ بعد میں وہ صوبجات متوسط اور پھر برما کے گورنر ہوئے۔

لیگ کی کونسل نے فنلینڈ کے احتجاج پر غور کرنے کے بعد سفارش کی کہ روس کو لیگ کی رکنیت سے خارج کیا جائے۔ معاملہ اسمبلی میں آیا۔ اسمبلی میں اکثر تقریریں کونسل کی تجویز کی تائید میں ہی ہوئیں لیکن سب دبے دبے الفاظ میں۔ اسکی وجہ روس کا احترام یا روس کی طرف سے کسی کارروائی کا اندیشہ نہیں تھا۔

یورپ کے سب ممالک ہٹلر سے خائف تھے۔ اور کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہتے تھے جس کے ہٹلر کی طبع نازک پر گراں گذرنے کا احتمال ہو۔ میں اس کیفیت کو دیکھ کر حیران ہوا اور کچھ دق بھی ہوا اور میں نے مسٹر ہٹلر سے کہا کہ میں تو صاف صاف بات کروں گا انہوں نے فرمایا کہ خدا کیلئے ضرور کرنا کیونکہ ہماری تو ہمت نہیں پڑتی ("FOR HEAVENS SAKE DO FOR WE DARE NOT") چنانچہ جب میری باری آئی تو میں نے پہلے فنلینڈ اور روس کا سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی موازنہ کیا پھر روس کی بلاوجہ اور سراسر زیادتی کا تذکرہ کیا اور کونسل کی تجویز کی پرزور تائید کی اور آخر میں کہا صاحبان اس مسئلے پر لازم ہے کہ آپ سب یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ ہر قسم کے ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز اٹھائیں اور مناسب اقدام کریں۔ اگر آپ سب ملکر ایسا نہیں کریں گے تو آپ کو ایک ایک کرکے کچل دیا جائیگا۔ اور یہ تہذیب اور اخلاق کی شمع صدیوں کیلئے گل ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے اسمبلی کے صدر مسٹر ہیمبرو جو ناروے کے نمائندے تھے میری بے باکانہ جرأت سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ مجھے روک تو نہیں سکتے تھے لیکن جب میری تقریر ختم ہوئی تو انہوں نے ترجمان سے کہا قواعد کے تحت ساری تقریر کا ترجمہ کرنا لازم نہیں صرف خلاصہ بیان کر دینا کافی ہے۔ کونسل کی تجویز منظور ہوئی اور روس لیگ آف نیشنز کی رکنیت سے خارج کیا گیا۔ سر آغا خاں نے بعد میں مجھے بتایا کہ سوئٹزرلینڈ کے نمائندے نے ان سے کہا کہ سارے اجلاس میں کام کی تقریر ہندوستان کے نمائندے کی ہی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب جنگ کے ابتدائی اقدامات کے بعد ہٹلر کی افواج نے حرکت شروع کی تو ان کا سب سے پہلا شکار ناروے ہی ہوا۔

۱۹۴۷ء میں جب میں پہلی بار پاکستانی وفد کے ساتھ اقوام متحدہ کی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے نیویارک گیا تو ہمارا قیام بارکلے ہوٹل میں ہوا۔ دوسرے دن میں ہوٹل کے ایوان استقبال میں کھڑا تھا کہ مسٹر ہیمبرو تشریف لائے۔ وہ ناروے کے وفد کے رکن تھے اور اسی وقت ہوٹل میں پہنچے تھے۔ جب ہوٹل میں داخلے کی رسوم سے فارغ ہوئے تو میں بڑھ کر آداب بجالایا اور کہا مجھے آپ سے معافی طلب کرنا ہے کیونکہ آٹھ سال قبل جنیوا میں میں آپ کی پریشانی کا باعث ہوا تھا۔ انہوں نے فرمایا نہیں نہیں وہ بھی عجب وقت تھا اور تم بہت ٹھیک کہہ رہے تھے۔ جنیوا سے فارغ ہو کر مسٹر ٹامکنس اور انور احمد تو لندن واپس چلے گئے اور میں ریل سے مارسیلز گیا وہاں سے میں ہوائی کشتی پر دلی واپس پہنچ گیا۔

وائسرائے کی کونسل میں دوبارہ تقرر | فروری کے آخر میں وائسرائے نے مجھے لکھا کہ وہ ملک معظم کی خدمت میں میرے دوبارہ تقرر کی سفارش کرنا چاہتے ہیں اور دریافت فرمایا کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟ میں نے جواب میں ان کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ میں بخوشی رضامند ہوں۔ چنانچہ ملک معظم کی

منظوری پر حکم صادر ہوگیا۔ برطانوی عمل داری میں وائسرائے کی کونسل میں دوبارہ تقرر کی یہ پہلی مثال تھی۔ فالحمد للہ

سلسلہ احمدیہ کی مجلس مشاورت کا اجلاس عموماً ایسٹر کی تعطیلات میں ہوا کرتا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ زیر غور تجاویز پر بحث مباحثے کی ابتداء میں کسی خادم کو ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ وہ حضور رضی اللہ عنہ کے ساتھ سٹیج پر بیٹھ کر تقریروں کی ترتیب اور ان کے ضبط کی نگرانی کرے۔ اگر خاکسار مشاورت کے اجلاس میں حاضر ہوتا تو اس خدمت کی سعادت عموماً خاکسار کو حاصل ہوتی۔ اس خوش نصیبی کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوتا کہ دوران اجلاس حضور رضی اللہ عنہ کے کلمات طیبات سے مستفید ہوتے رہنے کے مواقع میسر آتے رہتے۔

جنگ کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بعض رویا | ۱۹۴۰ء کی مجلس مشاورت کے دوران میں حضور رضی اللہ عنہ نے خاکسار سے فرمایا میں نے پچھلے اگست میں رویا دیکھا کہ گویا جنگ شروع ہو چکی ہے اور میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوں ایسے ہی جیسے اب بیٹھا ہوں۔ اور میرے دائیں ہاتھ پر ذرا پیچھے ہٹ کر ایک شخص کھڑا ہے۔ جسے میں سمجھتا ہوں فرشتہ ہے اور وہ جنگ سے متعلق اہم دستاویز میرے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ایک دستاویز اس نے میرے سامنے رکھی جس میں برطانیہ نے فرانس کو دعوت دی ہے کہ متحد ہو کر ایک ہی ملک اور ایک ہی حکومت اور ایک ہی قوم بن کر جنگ جاری رکھیں۔ بیدار ہونے پر میرے دل پر یہ تاثر تھا کہ شائد برطانیہ فرانس کی نسبت جلد کمزوری محسوس کرنے لگے۔ کیونکہ ایسی دعوت عموماً کمزور طاقتور کو دیتا ہے۔ مجلس مشاورت کے اختتام پر میں شملے چلا گیا۔ ہٹلر کی افواج نے حرکت شروع کی مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیراعظم ہوئے۔ فرانس نے لڑکھڑانا شروع کیا۔ حالت بہت نازک ہو گئی۔ اس مرحلے پر مسٹر چرچل نے فرانسیسی وزیراعظم کو ایک ملک ایک قوم اور ایک حکومت ہو کر جنگ جاری رکھنے کی دعوت دی جس کی مثال تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ خاکسار نے حضرت خلیفۃ المسیح رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا کہ حضور رضی اللہ عنہ کا رویا لفظاً پورا ہو گیا۔ حضور رضی اللہ عنہ نے جواب میں جو والا نامہ رقم فرمایا اس میں تحریر فرمایا۔ تین دن ہوئے میں نے رویا میں کسی کو یہ کہتے سنا کہ برطانیہ کو دو ہزار آٹھ صد ہوائی جہاز امریکہ سے بھیجے گئے ہیں۔ اس والا نامہ کے وصول ہونے کے تین چار دن بعد سر انڈریو کلو کے ہاں ارکان حکومت کا کھانا تھا جو ہر دوسری جمعرات کو باری باری ایک رکن کے ہاں ہوتا تھا۔ اس دن رائٹر کی تار خبروں میں ایک اطلاع امریکہ سے آئی تھی کہ فرانسیسی خرید سامان کے مشن نے جو آرڈر جنگی ہوائی جہازوں کی خرید کا دیا تھا وہ اب برطانوی مشن اپنے ذمے لے لیگا اور اسطرح برطانیہ کو دو ہزار پانچ سو جنگی ہوائی جہاز میسر آجائیں گے۔ جنگ کے حالات کے تذکرے میں میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے اگست ۱۹۳۹ء والے رویا اور اس دوسرے رویا کا ذکر کیا اور رائٹر کی تار خبر سنائی۔ اس پر سر انڈریو کلو نے کہا لیکن تعداد کا فرق ہے۔ رویا میں تعداد دو ہزار آٹھ صد بتائی گئی۔ اور تار خبر میں دو ہزار پانچ صد ہے۔ میں نے کہا تعبیر الرویا کے ماہروں کا کہنا ہے کہ سچے خواب اور رویا میں تعداد کے لحاظ سے کچھ تفاوت قابل التفات نہیں ہوتا اصل بات کو دیکھنا چاہیئے۔ دو تین دن کے بعد میں سفر پر جانیوالا تھا۔ عین وقت پر تیار ہو کر نیچے اترا تو دیکھا کہ

صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب جو ان دنوں میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور میرے ساتھ ہی سفر پر جانیوالے تھے ٹائمز کے تازہ تاروں کا پلندہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا میاں کوئی خاص خبر ہے؟ انہوں نے تار کے کاغذات میرے ہاتھ میں دیدیئے اور فرمایا کوئی خاص بات تو نہیں۔ میں نے جلدی میں ورق الٹے اور چونک کر کہا آپ کے ابا جان کا رویا پورا ہوا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ کوئی خاص خبر نہیں۔ تار کے کاغذات لئے میں دفتر کے کمرہ میں گیا اور ٹیلیفون پر سر انڈرلو کلو سے دریافت کیا سر ہیر کے تار پڑھ لیئے؟ کہا نہیں ابھی خادم نے لاکر میرے سامنے رکھے ہیں میں نے کہا فلاں صفحہ دیکھئے۔ پڑھ کر انہوں نے کہا بیشک حیرت کی بات ہے۔ امریکہ سے تار تھا دو ہزار آٹھ سو ہوائی جنگی جہاز برطانیہ کو بھیجے گئے ہیں۔ میں نے فوراً قادیان میں حضرت خلیفۃ المسیحؓ کی خدمت میں اطلاع کی کہ حضورؓ کا یہ رویا بھی پورا ہو گیا ہے۔ فالحمد للہ۔ حضورؓ نے فرمایا میرے خط کا وہ حصہ جس میں نے رویا کا ذکر کیا تھا نقل کر کے مجھے بھیج دو۔ دوسری صبح دہلی کے اسٹیشن پر شیخ اعجاز احمد صاحب ملنے آئے تو میں نے یہ واقعہ بیان کیا اور حضورؓ کا والا نامہ ان کے سپرد کیا کہ متعلقہ حصے کی نقل کر کے حضورؓ کی خدمت اقدس میں ارسال کر دیں۔

جب مسٹر چرچل کی پیشکش کی خبر آئی تو وائسرائے نے مجھ سے دریافت کیا تمہارا اس کے متعلق کیا تاثر ہے۔ میں نے کہا یہ پیشکش قابل عمل بھی نہیں اور فرانس اسوقت ایسی پریشانی اور پراگندگی کی حالت میں ہے کہ اس کے قبول ہونے کا امکان بھی نہیں لیکن مجھے اس خبر سے تسلی ہوئی ہے۔ پوچھا کس بات کے متعلق؟ میں نے عرض کیا مسٹر چرچل ابتک ہندوستان کی آزادی کے کچھ خلاف رہے ہیں۔ اس پیشکش سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے دباؤ کے ماتحت وہ اب ہندوستان کو آزادی دینے پر بھی آمادہ ہو رہے ہیں۔ پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا یہ تو اس پیشکش سے ہی ظاہر ہے۔ انکی یہ مراد تو نہیں ہو سکتی کہ اگر فرانس یہ پیشکش قبول کرے اور برطانیہ فرانس ایک ملک ہو جائیں تو ہندوستان دونوں کی مشترکہ ملکیت بن جائے گا۔ اور آپ کے بعد کوئی فرانسیسی سیاستدان یا مدبر ہندوستان کا وائسرائے ہو کر آجائے گا۔ اب وہ دن تو گئے کہ ہندوستان کی حیثیت برطانیہ کی ذاتی ملک کی سمجھی جائے۔ وائسرائے صرف "UH! INGENIOUS" کہہ کر چپ ہو گئے۔

اس کے بعد میں نے ان سے اس پیشکش کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیحؓ کے رویا کا ذکر کیا۔ انہیں بہت دلچسپی ہو گئی بعد میں خود بعض دفعہ مجھ سے فرماتے۔ مرزا صاحب نے کوئی اور رویا جنگ کے متعلق دیکھا؟ جب شمالی افریقہ میں برطانوی افواج نے پہلی بار پیش قدمی کی تو وائسرائے بہت خوش تھے مجھ سے کہا آخر فتح کی بھی ایک خبر آئی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد پسپائی ہو گی اور دو ایک بار بڑھنا اور پیچھے ہٹنا ہو گا۔ لیکن آخر کار فتح ہو گی۔ پوچھا مرزا صاحب کا کوئی رویا ہے۔ میں نے کہا ہاں اور حضورؓ کا ایک رویا سنایا۔ بعد میں جب واقعات نے تصدیق کر دی تو اور بھی متاثر ہوئے۔

اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں کنور جگدیش پرشاد صاحب کی میعاد ختم ہو گئی اور انکی جگہ سر گرجا شنکر باجپائی کونسل کے رکن

ہوئے۔ میں سینئر رکن ہونے کی حیثیت سے کونسل کا وائس پریذیڈنٹ ہو گیا۔ سر گرجا شنکر سر راما سوامی مدلیار کے ساتھ اور میرے ساتھ پورا تعاون کرتے رہے۔

جون ۱۹۴۰ء میں جب فرانس کی جمعیت پراگندہ ہو گئی اور جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا اور کہا جانے لگا کہ برطانیہ اب اکیلے جرمنی کا مقابلہ جاری نہیں رکھ سکے گا۔ تو گاندھی جی نے کہہ دیا مجھے یقین ہے کہ جنگ کی ذمہ داری ہٹلر پر عاید ہوتی ہے اور میں برطانیہ کی فتح کیلئے دعا کرتا ہوں۔ لیکن جب چند ہفتوں کے بعد آثار ایسے ظاہر ہونے لگے اور کچھ امید بندھنے لگی کہ برطانیہ مقابلہ جاری رکھ سکے گا تو گاندھی جی اور کانگریس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ ہمیں جنگ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ ہماری جنگ نہیں۔ ہندوستان کو اس جنگ میں ہماری رضامندی کے بغیر شامل کر دیا گیا ہے۔ ہم سے تعاون کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں وزیر مالیات سر جیریمی رسیمین نے تخمینہ بجٹ اسمبلی میں پیش کیا۔ بجٹ پر بحث کے دوران میں زیادہ تر زور اس بات پر دیا گیا کہ ہم پر جنگ کی سرگرمیوں میں تعاون لازم نہیں۔ وزیر مالیات نے مجھ سے کہا بحث کے دوران میں بجٹ پر بجٹ کے نقطہ نظر سے تو جرح قدح بہت کم ہوئی ہے۔ اس کا جواب تو میرے ذمہ ہے اور میں دوں گا۔ بحث زیادہ تر تو سیاسی نقطہ نگاہ سے کی گئی ہے۔ اس کا جواب قائد ایوان کی حیثیت سے تم دو۔ میں نے کہا مناسب ہے۔ میں نے جواب میں کہا بحث میں بہت سے امور کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے پہلے میں ان امور کو لیتا ہوں جن پر ہمارا اصولی اتفاق ہے۔ ان میں سب سے اہم سوال ملک کی آزادی کا ہے۔ ہمیں اتفاق ہے کہ ملک کو جلد سے جلد آزاد ہونا چاہیئے۔ اختلاف صرف طریق اور رفتار کے متعلق ہے۔ آپ بھی تسلیم کریں گے کہ اس مرحلے پر آزادی کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ جرمنی کو شکست ہو۔ اگر برطانیہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے تو ملک کی آزادی ایک لمبے عرصے کیلئے التواء میں پڑ جائیگی۔ آزادی کی پوشاک تیار ہو چکی ہے۔ ہمیں مل کر کوشش کرنی چاہیئے اور دعا بھی کرنی چاہیئے کہ جلد وہ دن آئے جب ہندوستان عزت اور فخر کے ساتھ یہ پوشاک پہننے کے قابل ہو جائے۔ اس طرح میں نے مساوات، اقتصادی آزادی اور بہبودی وغیرہ چھ سات بڑے بڑے مقاصد کے ساتھ حکومت کی طرف سے کامل ہمدردی اور اتفاق کا اظہار کیا۔ دوسری طرف جنگ میں حصہ لینے کے متعلق کانگریس کے موقف کا کھوکھلا پن دلائل سے بھی اور کانگریسی لیڈروں کے سابقہ بیانات سے بھی ثابت کیا۔ دوران بحث میں نواب صاحب آف ڈیرہ نے مجھ سے کہا تھا۔ کانگریس کے اراکین اپنی تقاریر میں شلوک اور منتر پڑھ کر اپنے دلائل کی پختگی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا ہم بھی مجاز ہیں کہ قرآن کریم کی آیات سے استدلال کریں۔ میں نے کہا آپ بھی ویسے ہی آزاد ہیں۔ خود میں نے اپنی تقریر کے ہر نقطے کی تائید میں قرآن کریم سے سند پیش کی۔ میری تقریر کے خاتمے پر مولانا ظفر علی خانصاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور بڑے

جوش سے کہا آج آپ نے تبلیغ کا حق پورا ادا کر دیا۔

حکومت کے پبلسٹی کے محکمے نے میری خواہش یا اشارے کے بغیر میری تقریر کے اردو ترجمے کو ایک لاکھ کی تعداد میں چھپوا کر نشر کیا۔ اور اس طرح ان مسائل پر قرآن کریم کی تعلیم کے خلاصے کی وسیع اشاعت ہو گئی۔ فالحمد للہ

تقریر کے بعد مسٹر ستیا مورتی جو اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے نائب لیڈر تھے میرے پاس آئے اور دریافت کیا کیا مسٹر چرچل کی طرف سے ملک کی آزادی کے سلسلے میں کوئی ہدایات موصول ہوئی ہیں جن کے نتیجے میں تم نے اسقدر واضح الفاظ میں حکومت کی پالیسی کا اعلان کر دیا ہے؟ میں نے کہا وزیر اعظم کی طرف سے کوئی ہدایات تو وصول نہیں ہوئیں۔ لیکن جس رفتار سے برطانیہ کا اقتصادی خون بہہ رہا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے بعد برطانیہ کے بازوؤں میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جائیگی کہ وہ جبراً ہندوستان پر اپنا قبضہ جمائے رکھے۔ فی الحال آپ یہی کافی سمجھیں کہ میں نے قائد ایوان کی حیثیت سے حکومت کی پالیسی کا صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے۔ اور اس سے جو فائدہ چاہیں اٹھائیں۔

میرے کام کا بوجھ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ جنگ کی وجہ سے وائسرائے اور تمام اراکین کونسل کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن سپلائی کی وزارت میں تو ہر روز وسعت ہوتی جا رہی تھی اور یہ محکمہ ایک وزیر کی پوری توجہ اور پورا وقت چاہتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی وزارت قانون کا کام اسمبلی کی قیادت اور وائسرائے کو آئینی امور پر مشورہ دینا سب مل کر میرے لئے بار گراں بن گئے تھے۔

ذیابیطس کے مرض کا لاحق ہونا | ۱۹۴۱ء کے پہلے تین چار مہینوں میں میری توجہ اور میرے اوقات پر اسقدر بوجھ رہا کہ اپریل میں مجھے ذیابیطس کی شکایت شروع ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب نے انسولین کا ٹیکہ تجویز کیا شروع جون میں خان بہادر ڈاکٹر عبدالحمید بٹ پنجاب کے ڈائرکٹر صحت شملہ تشریف لائے۔ ان کا قیام میرے ہاں تھا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ مجھے ذیابیطس کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے تفصیلی معائنے اور مشورے کیلئے لاہور کے ڈاکٹر وشواناتھ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں تو شاید سستی کرتا لیکن انہوں نے متواتر اصرار سے مجھے مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں چھ جون کی سہ پہر کو شملے سے روانہ ہو کر ۷ کی صبح کو لاہور پہنچا اور ڈاکٹر وشواناتھ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ڈاکٹر وشواناتھ صاحب لاہور سے مشورہ اور ان کا تجویز کردہ علاج | ڈاکٹر صاحب نے ۷، ۸ اور ۹ جون کو بڑی توجہ، محنت اور شفقت سے میرا معائنہ کیا اور ۹ کو معائنے کے مکمل ہونے پر بڑی وضاحت سے مجھے سمجھایا کہ اس مرض کی کیا نوعیت ہے اور کسقدر احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ علاج کا کیا طریق ہے۔ اور کسقدر پابندی لازم ہے۔ آخر میں فرمایا اب ایک بات اور باقی ہے لیکن وہ سب سے اہم ہے اور وہ یہ ہے۔

- "GO SLOW"

ظفراللہ خاں - اس سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

ڈاکٹر وشوا ناتھ - مراد یہ ہے کہ کام کا بوجھ ہلکا کرو۔

ظفراللہ خاں - ڈاکٹر صاحب یہ میرے بس کی بات نہیں۔ جنگ کا زمانہ ہے اور میرا کام بہت ذمہ داری کا کام ہے جو میری پوری توجہ اور پورے وقت کا طالب ہے۔ میں کسی صورت یہ بوجھ ہلکا نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر اس کا اثر میری صحت پر اتنا مضر ہو کہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر مجھے ضرور یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہئیے تو چونکہ جان کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ ایک ذمہ داری ہے میں اپنے منصب سے استعفیٰ دیکر پریکٹس شروع کر دونگا پریکٹس میں مجھے اختیار ہوگا کہ زیادہ کام اپنے ذمے نہ لوں۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ - نہیں ایسے خطرے کی حالت تو نہیں لیکن احتیاط لازم ہے۔ تو پھر زندگی کے تفکرات کم کر دو۔

ظفراللہ خاں - وہ کیسے ؟

ڈاکٹر وشوا ناتھ - یہ بتاؤ کہ جب تم بستر میں لیٹ جاتے ہو تو نیند آنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے ؟

ظفراللہ خاں - اوسطاً تین منٹ۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ - کبھی ایسا تو نہیں ہوتا کہ تم سوچ میں پڑ جاؤ اور دیر تک نیند نہ آئے۔

ظفراللہ خاں - کبھی کبھار لیکن بہت شاذ۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ - ایسے وقت میں کیا کرتے ہو ؟

ظفراللہ خاں - اپنے تئیں سمجھاتا ہوں کہ دنیا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تم نہیں ہو۔ آج تم نے اپنی توفیق کے مطابق کام کیا۔ کل صبح تک زندہ رہو گے تو پھر اللہ تعالےٰ کی عطاء کردہ توفیق کے مطابق کام شروع کر دینا۔ یہ وقت آرام کرنے کا ہے۔ اب سو جاؤ۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ - یہ ترکیب کارگر ہوتی ہے ؟

ظفراللہ خاں - ہر بار۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ - تو بس میری یہی مراد تھی۔ تفکرات کو حرز جاں نہ بنانا۔

ڈاکٹر وشوا ناتھ بہت دانشمند اور ہمدرد دوست ثابت ہوئے۔ سال میں دو بار بڑی توجہ اور ہمدردی سے معائنہ کرتے اور مناسب ہدایات دیتے۔ میں فیس ادا کرنے پر اصرار کرتا تو کانوں پر ہاتھ دھرتے۔ افسوس کہ پانچ سال کے اندر گھٹنوں کے عارضے سے ان کی وفات ہو گئی اور میں ان کی توجہ سے محروم ہو گیا۔ لیکن انکی ہدایات پر کاربند رہ کر میں

اب تک بفضل اللہ ان سے فائدہ اٹھا رہا ہوں ۔

تقرر بطور جج فیڈرل کورٹ

۹ر جون کی شام کو لاہور سے روانہ ہو کر دس کی صبح کو میں واپس شملے پہنچ گیا۔ اس رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ دروازہ کھلا ہے اور میرے پھوپھی زاد بھائی چوہدری عنایت اللہ صاحب بہلول پوری ہنستے ہنستے کمرے میں داخل ہوئے ہیں ۔ اس خواب کا میری طبیعت پر اتنا اثر تھا کہ صبح بیدار ہونے پر میں نے خیال کیا کہ جلد تیار ہو کر ناشتے کیلئے چلوں کیونکہ چوہدری صاحب میرے انتظار میں ہوں گے۔ پھر یاد آیا کہ انہیں تو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ خود تو تشریف نہیں لائے ۔ دو دن بعد ۱۲ر جون کی رات کو سید انعام اللہ شاہ صاحب مرحوم کو خواب میں دیکھا۔ بیدار ہونے پر خیال آیا کہ دو دن کے اندر دو مبشر خواب دیکھنا جن میں دوسرا کیفیت میں پہلے کی نسبت بڑھ کر ہے کسی خاص امر کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے ۔ ۱۴ر کی رات کو خواب دیکھا کہ میں چوہدری سردار محمد صاحب کو ملنے کے لئے لائل پور گیا ہوں ان سے ملاقات کرنے کے بعد دل میں خیال آیا کہ میرے ہمنام اور کالج کے زمانے کے دوست چوہدری ظفر اللہ خاں بیرسٹرایٹ لاء بھی یہیں ہیں ان سے بھی مل لوں اور ان سے بھی ملا۔ اگلی بار بیدار ہونے پر بڑے زور سے خیال پیدا ہوا کہ تین مبشر خوابوں کا تواتر اور ترتیب ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی ایسا امر پیش آنے والا ہے جو ممکن ہے ظاہر میں ایسا نظر نہ آئے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت اور انعام اور کامیابی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

اسی دن یعنی ۱۵ر جون کو قبل دوپہر شیخ اعجاز احمد صاحب اور چوہدری بشیر احمد صاحب دلی سے دس دن کی رخصت پر آئے میں نے ان سے کہا معلوم ہوتا ہے میرے حالات میں کوئی تبدیلی ہونیوالی ہے ۔ انہوں نے دریافت کیا کوئی خواب دیکھا ہے ؟ میں نے تینوں خواب بیان کئے ۔ ۱۶ر کو وائسرائے کے ساتھ میری ملاقات کا دن تھا ۔ میں نے پرائیویٹ سیکریٹری کو ٹیلیفون پر بتایا کہ مجھے وائسرائے کے ساتھ کوئی خاص کام نہیں اسلئے میں ملاقات کیلئے نہیں آؤنگا انہوں نے کہا وائسرائے تمہارے ساتھ کسی امر کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں تم آجاؤ۔ اسی سال مارچ کے مہینے میں ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے مسلمان جج سرشاہ محمد سلیمان صاحب کی وفات ہوئی تھی، مرحوم نہایت قابل، خوش مزاج ، خوش اخلاق اور قابل قدر ستی تھے۔ علاوہ اعلیٰ درجہ کی قانونی قابلیت کے ریاضی میں خاص درک رکھتے تھے۔ اور ریاضی دانوں کی نگہ میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات مسلمانانِ ہند کیلئے بڑے صدمے کا باعث تھی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحم سے مغفرت فرمائے اور اپنی رضا اور خوشنودی سے نوازے۔ آمین ۔فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سر مارس گوائر تھے ۔ اور تیسرے جج سرسرینواس وردا چاری تھے ۔ سر مارس گوائر برطانیہ کے محکمہ خزانہ کے مشیر قانون رہے تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا مسودہ ان کا تیار کردہ تھا۔ گول میز کانفرنس اور پارلیمنٹری کمیٹی کے اجلاسوں کے دوران میں ان کے اور میرے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے ۔ جب میں

وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے سر شاہ محمد سلیمان صاحب کی وفات کا ذکر کرکے کہا فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس کے اور میرے درمیان ابھی تک اس بارے میں اختلاف چلا آرہا ہے کہ سر شاہ سلیمان کی جگہ فیڈرل کورٹ کا جج کسے مقرر کیا جائے۔ عارضی طور پر بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر جان بومنٹ کا تقرر کر لیا گیا تھا۔ لیکن اب چیف جسٹس مصر ہیں کہ مستقل تقرر کا فیصلہ ہونا چاہیئے تاکہ عدالت کے اجلاس اکتوبر میں شروع ہونے کے وقت نیا جج اجلاس میں شامل ہوسکے۔ مشکل یہ ہے کہ چیف جسٹس تمہارے سوا کسی اور کا نام تجویز کرنے پر رضامند نہیں اور میں بضد ہوں کہ میں تمہیں کونسل سے فارغ نہیں کرسکتا۔ آخر ہم دونوں کا اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ ہم فیصلہ تم پر چھوڑ دیں۔ تم انتخاب کر لو اگر کونسل میں رہنا چاہو تو چیف جسٹس کسی اور مسلمان کی سفارش کریں گے۔ اور اگر عدالت میں جانا چاہو تو مجھے تمہاری جگہ کسی اور کو تلاش کرنا ہوگا جب آئندہ ملاقات کیلئے آؤ گے تو مجھے اپنے فیصلے سے مطلع کر دینا۔ میں نے کہا میں آپ دونوں صاحبان کا ممنون ہوں۔ مجھے اس بات پر غور کرنے کیلئے ایک ہفتے کی مہلت کی ضرورت نہیں میں ابھی آپ کو اپنی رائے بتا سکتا ہوں۔

وائسرائے۔ بہت خوب۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم کونسل سے نہیں جانا چاہتے۔

ظفراللہ خان۔ معاف فرمایئے گا میری رائے عدالت میں جانے کے حق میں ہے۔

وائسرائے۔ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میں چیف جسٹس سے اپنے اقرار کے مطابق اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں لیکن کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جب تمہاری دوسری میعاد میں ابھی چار سال باقی ہیں اور آئندہ جو تغیرات ہونے والے ہیں ان کے نتیجہ میں تم اپنے لئے بہترین انتخاب کی امید کر سکتے ہو تو ابھی سے تم عدالت کی چار دیواری میں کیوں بند ہونا چاہتے ہو؟

ظفراللہ خان۔ اس کی بڑی وجہ تو طبیعت کی افتاد ہے۔ مجھے سیاسی سرگرمیوں اور مشاغل سے زیادہ رغبت نہیں۔ عدالت کا ماحول میری طبیعت کے زیادہ موافق ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ میں دوسرے شخص کے نقطۂ نگاہ کا کسی حد تک اندازہ کر سکتا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ ملکہ سیاست میں میرے لئے کمزوری کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن عدالت میں یہ میرے فرائض کی ادائیگی میں ممد ہو سکتا ہے پھر اور بھی وجوہ ہیں لیکن وہ میرے ذاتی حالات سے متعلق ہیں۔

وائسرائے کی اس سے تسلی نہ ہوئی لیکن وہ چیف جسٹس سے وعدہ کر چکے تھے کہ میرے انتخاب کو منظور فرما لیں گے صرف اتنا کہا عدالت کا اجلاس اکتوبر میں شروع ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں تم آخر ستمبر تک تو یہاں کام کر سکو گے۔

ان دنوں میں نے ایک تجویز وائسرائے کی خدمت میں پیش کر رکھی تھی کہ کونسل کے اراکین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور کونسل میں کثرت ہندوستانیوں کی ہو۔ وائسرائے نے یہ تجویز اپنی تائید کے ساتھ وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دی تھی۔ اسکی منظوری آگئی۔ وائسرائے نے مجھ سے مشورہ کیا کہ تمہارے جانے پر وزیر قانون اور وزیر سپلائی کن اصحاب کو مقرر کیا جائے۔ وزارت قانون کیلئے میں نے سر سید سلطان احمد صاحب کا نام پیش کیا اور وزارت سپلائی کیلئے سر ہومی مودی کا۔ وائسرائے نے دونوں کے متعلق پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا ان دونوں سے دریافت کرلو کہ وہ نئی کونسل میں شامل ہونے کو تیار ہوں گے۔

سر ہومی موڈی اور سر سلطان احمد کا تقرر بطور اراکین کونسل

سر ہومی مودی اسی دوران میں شملے آئے تھے۔ مجھ سے ملے اور باتوں باتوں میں کہا تم سپلائی کے وزیر ہو ایسا کیوں نہیں کرتے اور ویسا کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور اس پر توجہ کروں گا لیکن بعض مشکلات بھی ہیں۔ اس پر کہا اگر میں وزیر سپلائی ہوتا تو کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیتا۔ میں نے کہا بہت خوب آپ رستہ سوچ لیجئے ممکن ہے موقعہ نکل آئے۔ اس کے بعد جب وائسرائے سے میری بات ہوئی اور انہوں نے سر ہومی مودی کے متعلق اپنی رضامندی دیدی تو سر ہومی کے دوبارہ شملہ تشریف لانے پر میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کوئی رستہ سوچ لیا۔ کہنے لگے وقت ضائع کرنیکا کیا فائدہ ہاں اگر تم میری تجویز پر عمل کرنے کا وعدہ کرو تو میں کچھ سوچ کر تمہیں بتا دوں گا۔ میں نے کہا میں وعدہ کرتا ہوں بشرطیکہ ایک بات آپ میری مان لیں۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے کہا وہ یہ کہ سپلائی کی وزارت کا چارج آپ خود لے لیں۔ کہنے لگے میں یہ مصیبت کیوں سہیڑ لوں؟ میں نے کہا اسلئے کہ پچھلی ملاقات پر آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو یوں کرتے۔ اب میری جگہ لینے کا موقعہ آگیا ہے اور جو تجاویز آپ کے ذہن میں ہیں انہیں عمل میں لائیے۔ کہنے لگے تم مذاق کرتے ہو۔ میں نے کہا میں ہرگز مذاق نہیں کر رہا۔ میں نے آپ کا نام وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا ہے اور وہ رضامند ہیں۔ اس پر میں نے انہیں کونسل کی نئی تشکیل کا منصوبہ بتایا۔ انہوں نے کہا میرے لئے کونسل میں آنا بہت مشکل ہے۔ میں اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو چھوڑ نہیں سکتا۔ میں نے کہا لیکن میں نے تو آپ کے پچھلی گفتگو کی بناء پر وائسرائے کو آمادہ کر لیا ہے۔ اب آپ پیچھے ہٹ جائیں تو میری سبکی ہوگی۔ کہا بڑی مشکل میں ڈال دیا تم نے۔ میں نے کہا کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ لوگ تنقید کرتے رہتے ہیں کہ یوں ہونا چاہیئے اور یوں ہونا چاہیئے اور اب جب موقعہ آیا ہے تو آپ کو مشکل نظر آتی ہے آیئے اور اس مرحلے پر قومی خدمت کو ذاتی مفاد پر مقدم کیجئے۔ آخر انہوں نے فرمایا میں بمبئی واپس جاکر جواب دوں گا۔ چند دنوں کے اندر ان کی اطلاع مل گئی کہ انہیں منظور ہے۔ میں پٹنے جاکر سر سید سلطان احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا میرے لئے یہاں سے نکلنا مشکل ہے لیکن اگر تمہاری خواہش ہے اور وائسرائے رضامند ہیں تو مجھے عذر نہیں۔

سر فیروز خاں اور سر اکبر حیدری کا تقرر بطور اراکین کونسل

کونسل میں دو دوسرے مسلمان رکن کی تقرری کے سلسلہ میں وائسرائے کچھ عرصہ تذبذب میں رہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب کو لیا جائے یا سر فیروز خاں نون صاحب کو۔ آخر غالباً مسٹر امیری وزیر ہند کی رائے ملک فیروز خاں نون کے حق میں پختہ ہو گئی اور ان کا انتخاب بلقب وزیر دفاع ہوا۔ تیسرے مسلمان رکن کونسل کیلئے سر اکبر حیدری صاحب کا انتخاب وائسرائے نے خود کیا۔ جب مجھے اطلاع ملی تو میں نے مشورہ دیا کہ تیسرے مسلمان رکن کا انتخاب بھی برطانوی ہند سے ہونا چاہیئے۔ وائسرائے نے سر اکبر حیدری کے تدبر، دانش اور تجربے کی تعریف کی۔ میں نے کہا ان کی یہ خوبیاں تو مسلمہ ہیں لیکن ابھی فیڈریشن کی تشکیل نہیں ہو سکی اور مرکزی حکومت میں ریاستوں کی نمائندگی قبل از وقت ہے۔ وائسرائے اپنی بات پر مصر رہے۔ حقیقت یہ تھی کہ گو وائسرائے یہ بھی چاہتے تھے کہ کونسل کے رکن تعاونی رجحان رکھتے ہوں تاکہ دوران جنگ کونسل کے اندر سنجیدہ اختلافات رونما ہوں لیکن انکی غرض یہ بھی تھی کہ ریاست حیدرآباد میں سر اکبر حیدری کو جو حیثیت حاصل ہو چکی ہے اسے کمزور کیا جائے اور انہیں وہاں سے باہر لاکر حضور نظام پر اپنی مرضی کے موافق اثر ڈالنے کیلئے رستہ صاف کیا جائے۔ میں نے انہی دنوں جنوبی ہند کے دورے کا پروگرام بنایا اور رستے میں دو دن حیدرآباد قیام کیا۔ حیدرآباد میں سر اکبر حیدری سے ملاقات ہوئی وہ بہت تذبذب میں تھے وائسرائے نے ایک خط انہیں لکھا تھا اور ایک حضور نظام کو دونوں میں نواب صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی بہت تعریف کر کے لکھا "مجھے اس مرحلے پر ان کی رہنمائی کی بہت ضرورت ہے امید ہے حضور نظام جنگ کے حالات کے پیش نظر حکومت ہند کے ہاتھ مضبوط کرنے کی خاطر نواب صاحب کو حیدرآباد سے فارغ کرنا گوارہ فرمالیں گے۔" نواب صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا تمہارے خیال میں وائسرائے کے اس اقدام کی اصل محرک کیا چیز ہے؟ میں نے کہا اول آپ کو حیدرآباد سے ہٹا کر شملہ اور دلی لے جانا، دوسرے کونسل میں آپ کی تائید حاصل کرنا۔ پوچھا تو کیا تمہاری رائے میں مجھے انکار کر دینا چاہیئے؟ میں نے کہا انکار تو نامناسب ہوگا اگر آپ انکار کر دیں تو بھی وائسرائے کسی بہانے آپ کو یہاں سے تو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور آپکے لئے جو کچھ خدمت کا موقعہ کونسل میں ہوگا وہ بھی جاتا رہے گا۔ پوچھا پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ میں نے کہا آپ شکریے کے ساتھ وائسرائے کی پیشکش قبول کر لیں۔ مگر کونسل میں اس پختہ عزم کے ساتھ جائیں کہ وہاں آپ کا کام وائسرائے کی ہاں میں ہاں ملانا نہیں بلکہ ملک کی خدمت کرنا ہوگا۔ وائسرائے آپ کے تدبر، دانش اور قابلیت کے معترف تو ہیں لیکن وہ ان سے یہ فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے کہ خود آپ کے مشوروں کے مطابق عمل کریں۔ بلکہ یہ چاہیں گے کہ آپ کی تائید حاصل کر کے دوسروں سے اپنی بات منوا سکیں۔ جہاں انکی رائے آپ کو صائب نظر آئے آپ ضرور انکی تائید کریں آپکے رفقاء میں سے بھی اکثر یہی کریں گے۔ لیکن جہاں آپ کو ان کی رائے ملک کے مفاد کے حق میں نظر نہ آئے وہاں آپ سنجیدگی اور مضبوطی سے اپنی رائے بیان کریں اور اس پر قائم رہیں۔ یہ طریق آپ کے رفقاء کی حوصلہ افزائی کا موجب بھی ہوگا اور

ان کے وقار کی مضبوطی کا باعث بھی۔ کونسل میں شامل ہونے کے چند ماہ بعد سر اکبر حیدری کا انتقال ہو گیا لیکن اس عرصے میں وہ اپنے فرائض دانشمندی اور جرأت کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ بنگال ناگپور ریلوے کے حصول کے متعلق کونسل میں بہت کشمکش ہوئی تھی لیکن آخر سر اکبر حیدری کی پُرزور تائید کے نتیجے میں فیصلہ ہندوستانی اراکین کونسل کی مرضی کے مطابق ہو گیا تھا۔

چین میں بطور ایجنٹ جنرل تقرر

فروری ۱۹۴۲ء میں جنرل اور میڈیم چیانگ کائی شیک دلی تشریف لائے۔ وائسرائے اور جنرل کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس میں یہ بھی طے پایا کہ چین اور ہندوستان کے درمیان براہ راست تعلق قائم کیا جائے۔ ہندوستان کی حکومت چونکہ خود مختار نہیں تھی اسلئے چین میں ہندوستان کا نمائندہ سفیر نہیں کہلا سکتا تھا۔ طے پایا کہ جس طرح واشنگٹن میں ہندوستان کا نمائندہ ایجنٹ جنرل کہلاتا ہے گو عملاً اس کا منصب سفیر کا ہی ہے اسی طرح چین میں بھی ہندوستانی نمائندہ ایجنٹ جنرل کہلائے گا اگرچہ اس کا درجہ سفیر کا ہی ہوگا۔ چین اور جاپان کی باہمی جنگ کے نتیجے میں چین کے مشرقی اور وسطی علاقوں پر جاپان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چین کی حکومت پیکنگ چھوڑنے پر مجبور ہوئی تو یکے بعد دیگرے دارالحکومت مغربی شہروں میں منتقل ہوتا گیا اور آخر چنگ کنگ میں آگیا۔ چنگ کنگ سیچوان کے صوبے میں دریائے ینگسی کیانگ کے کنارے واقعہ ہے۔ اس مقام پر دریائے جوائیلنگ ینگسی کیانگ میں آکر گرتا ہے۔ چنگ کنگ ان دونوں دریاؤں کے مقام اتصال پر ان کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسکی آب و ہوا بہت مرطوب ہے اور گرمی سردی دونوں میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ ہے۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں جاپانی ہوا بازوں نے چنگ کنگ پر متواتر حملے کرکے جان و مال کا بہت نقصان کیا تھا۔ سردیوں میں ہوائی حملے رک جاتے تھے کیونکہ شہر کہر اور دھند کے پردے میں چھپا رہتا ہے۔

اپریل کے شروع میں وائسرائے نے مجھے خط لکھا جس میں جنرل چیانگ کائی شیک کے ساتھ جو فیصلہ ہوا اس کا ذکر کرکے خواہش کی کہ میں چھ ماہ کیلئے ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کی حیثیت میں چنگ کنگ جانا قبول کرلوں۔ یہ خط بہت مفصل تھا۔ چنگ کنگ کو بے آرامی اور خطرے کا مقام بتایا گیا تھا۔ لکھا تھا تم بیوی اور بچی کو ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔ تمہارا مشاہرہ بطور جج فیڈرل کورٹ برطانیہ کے سفیر متعینہ چنگ کنگ کے مشاہرے اور الاؤنس سے زیادہ ہے۔ اس لئے تمہیں مالی لحاظ سے خسارہ رہیگا۔ کیونکہ جج کے مشاہرہ پر زائد کوئی الاؤنس نہیں ملیگا۔ لیکن میری خواہش ہے جنرل چیانگ کائی شیک اور ان کے رفقاء یہ محسوس کریں کہ ہندوستان کا نمائندہ چوٹی کا آدمی ہے۔ اور مجھے کسی اور کی نسبت یہ اطمینان نہیں کہ وہ اس مہم کو ایسی قابلیت اور ایسے وقار کے ساتھ سرانجام دے سکے جیسے تم دے سکو گے۔ اسلئے میں امید کرتا ہوں کہ باوجود ان مشکلات کے جو میں نے بیان کی ہیں تم یہ فرض اپنے ذمے لینے پر رضامند ہو جاؤ گے۔ اس خط نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ ایک طرف مجھے یہ احساس تھا کہ وائسرائے نے تمام مشکلات کو جانتے ہوئے مجھے یہ دعوت دی ہے جس سے ظاہر ہے کہ انہیں مجھ پر یہ اعتماد ہے کہ میں ان کی بات کو رد نہیں کروں گا۔ دوسری طرف انکی تجویز کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں تھا جو میری

طبیعت پر گراں نہ ہو۔ میرا اپنا پروگرام یہ تھا کہ چھ سال کی متواتر محنت شاقہ کے بعد میں گرمیوں کے مہینے آرام و سکون میں گلمرگ اور وادی کشمیر میں گذاروں گا۔ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کے زمانے میں میں نے ایک دن بھی چھٹی نہیں لی تھی حالانکہ پہلی میعاد میں بھی مجھے چار مہینے کی چھٹی کا حق تھا اور دوسری میعاد میں بھی۔ پھر صحت کے لحاظ سے چنگ کنگ کی آب و ہوا میرے لئے تکلیف دہ بھی تھی اور مضر بھی۔ وائسرائے کا حکمانہ طور پر کوئی اختیار نہیں تھا کہ مجھے چین جانے پر مجبور کر سکتے۔ اگر میں نہ جانا چاہتا تو میرا اتنا لکھ دینا کافی ہوتا بہت شکریہ لیکن افسوس ہے کہ تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ لیکن بار بار مجھے خیال آتا وائسرائے نے اس اعتماد کی بنا پر مجھے لکھا ہے کہ میں خطرے اور بے آرامی سے نہیں گھبراتا اور اگر ملک کی خدمت کا کوئی موقعہ پیش آجائے تو مجھے عذر نہ ہوگا۔ میرا انکار ان کیلئے پریشانی کا موجب ہوگا۔ اسلئے میں نے دوسرے دن انہیں لکھ دیا کہ مجھے تعمیل ارشاد میں عذر نہیں۔

تجویز یہ تھی کہ میں جتنی جلدی ہو سکے روانہ ہو جاؤں اور سفارت خانے کے قیام کے بعد چھ مہینے تک بطور سفیر کام کر کے اکتوبر میں واپس آجاؤں۔ ہندوستان سے چنگ کنگ جانے کیلئے ان دنوں ہوائی جہاز کلکتہ سے روانہ ہو کر برما میں ٹھہرتے ہوئے چنگ کنگ جاتا تھا۔ لیکن عین انہیں ایام میں جاپان کا تسلط شمالی برما پر بھی ہو گیا اور یہ رستہ بند ہو گیا جس کے نتیجے میں میری روانگی ملتوی ہو گئی اور مجھے دو مہینے سرینگر اور گلمرگ میں گذارنے کا موقعہ مل گیا۔

چنگ کنگ کا سفر | آخر کلکتے سے دنجان (شمالی آسام) اور کنمنگ کے رستے چنگ کنگ تک ہوائی جہاز کی ہفتہ وار پرواز کا انتظام ہو گیا اور ہم شروع جون میں کلکتے پہنچ گئے۔ یہاں سر عبدالحلیم غزنوی کے دولتکدے پر قیام ہوا اور ہم نے چنگ کنگ کے سفر کی تیاری یہاں مکمل کر لی۔ میرے ساتھ جنرل نذیر احمد صاحب مرحوم جو اسوقت ابھی میجر تھے میرے ملٹری سکرٹری کی حیثیت میں تھے۔ بابو تاج الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ اور ایک صاحب جو رنگون سے بھاگ کر آئے تھے بطور سائفر اسسٹنٹ اور سٹینوگرافر تھے۔ مجھے ٹیکے کے لئے انسولین کی ضرورت تھی جو دلی سے مہیا نہ ہو سکی تھی۔ کلکتے میں اسکی تلاش میں نے عزیز انور احمد کے سپرد کی۔ انہیں کچھ مشکل پیش آئی جس سے وہ بہت پریشان ہوئے لیکن آخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد انہوں نے مطلوبہ مقدار اسی قسم کی جس کی مجھے ضرورت تھی مہیا کر لی۔ فجزاہ اللہ۔ ہم نے احتیاطاً ایک درجن ڈبے لپٹن کی چائے کے بھی خرید لئے جو ہمارے بہت کام آئے۔ دنجان سے کنمنگ جاتے ہوئے ہمیں ایک بلند سلسلہ کوہ کے اوپر سے گذرنا تھا جس کی بعض چوٹیاں ۱۸ ہزار فٹ سے لیکر ۲۱ ہزار فٹ تک بلند تھیں۔ ہوائی جہاز ۳ . ج . ۵ تھا۔ نشست کیلئے دونوں طرف الومینیم کے بنچ تھے درمیانی حصہ میں سامان بھرا ہوا تھا۔ کلکتے سے صبح کے وقت روانہ ہو کر ۴ بجے

بعد دوپہر ہوائی جہاز چنگ کنگ پہنچتا تھا۔ اگر دریائے ینگسی میں طغیانی نہ ہوتی تو ہوائی جہاز دریا کے دو پاٹوں کے درمیان ایک خشک قطعے پر اترتا۔ اگر دریا میں طغیانی ہوتی اور یہ قطعہ زیر آب ہو جاتا تو جہاز جنوبی کنارے کی پہاڑیوں کے پیچھے مطار پر اترتا جہاں سے شہر پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے صرف ہوتے۔ جن دنوں ہم نے سفر کیا یہ قطعہ خشک تھا اور ہم دریائے ینگسی کے درمیان اتر سکے۔ برطانوی سفیر سر ہوریس سیمور کی طرف سے ان کے فرسٹ سیکرٹری ہماری پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ عملے کے دونوں صاحبان کی عارضی رہائش کیلئے شہر میں انتظام کیا گیا تھا۔ میجر نذیر احمد صاحب فرسٹ سیکرٹری کے ہاں مہمان ہوئے اور مجھے سفیر صاحب نے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ فجزاھما اللہ۔ ہماری منتقل قیام گاہ کے لئے تو جنوبی کنارے کے پہاڑی سلسلے پر ایک بنگلہ لیا گیا تھا جو امپیریل کیمیکل انڈسٹریز کی ملکیت تھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے وقت درکار تھا اس لئے سفیر صاحب نے میجر صاحب کی اور میری پہلے دن کی رہائش کا..... انتظام اپنے فرسٹ سیکرٹری کے ہاں اور اپنے ہاں کر دیا تھا۔ دوسرے دن ہم اس بنگلے میں آگئے۔ یہ بنگلہ ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ بلندی پر درختوں کے جھنڈ میں واقعہ ہونے کی وجہ سے ہوا صاف تھی اور گرمی سے بھی بچاؤ تھا۔ میجر صاحب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مجھے انتظام کے متعلق کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دلی سے ہم سید عبدالکریم کو ساتھ لے گئے تھے۔ ہاؤس بوائے باورچی اور مامائیں مقامی تھیں۔

چنگ کنگ میں قیام | چنگ کنگ میں عام ضروریات زندگی کا مہیا ہو جانا اللہ کے فضل پر منحصر تھا۔ سارے ملک میں سوائے شمالی اور مغربی علاقوں کے تازہ دودھ تو کہیں ملتا نہیں۔ اسلئے دہی مکھن وغیرہ بالکل نایاب تھے۔ موٹی شکر مل سکتی تھی مگر کسی قدر مشکل سے۔ مجھے شکر نہ ملنے سے کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ میرے لئے ذیابطیس کی وجہ سے شکر کا استعمال منع تھا۔ مرغی مل جاتی تھی جسے سید عبدالکریم ذبح کر لیتے تھے۔ ہم مرغی کا گوشت استعمال کرتے تھے۔ ہر شے گراں تھی اور دن بدن گراں تر ہوتی جا رہی تھی۔ چینی شرفاء اور اس طبقے کیلئے جن کے مشاہرے مقرر تھے یہ ایام بہت سختی اور پریشانی کے تھے۔ رشوت عام تھی ہمیں تو اس سے سابقہ نہیں پڑتا تھا لیکن یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی۔ خود جنرل چیانگ کائی شیک کا دامن ایسے تمام شبہات سے پاک تھا لیکن ان کے علاوہ سارے ملک میں مشکل سے ایک درجن افسر ایسے ہوں گے جو ایسی کارروائیوں میں ملوث نہ ہوں ان کے ہم زلف مسٹر کنگ کی جو وزیر خزانہ تھے عام شہرت تھی کہ وہ کھلے بندوں چور بازاری کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر سرداری کرتے ہیں۔ ملک میں اسقدر مصیبت اور پریشانی کا زمانہ تھا اور مسٹر کنگ دونوں کلائیوں پر سونے کی گھڑیاں پہنے پھرتے تھے۔ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب تک سونے کی موٹی زنجیر لٹکتی تھی۔ جیبوں میں جو کچھ تھا وہ تو نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن جب بولتے تھے یا ہنستے تھے تو منہ کے اندر سونے کے دانت یا سونا چڑھے

ہوئے دانت نظر آتے تھے۔ برما روڈ کے رستے جو سامان اتنی مشکلوں سے ملک کے اندر پہنچتا تھا ان میں سے دو تہائی انکی ذاتی ملکیت بتایا جاتا تھا جو انکی طرف سے چور بازار میں بکتا تھا۔ حکومت برطانیہ نے پچاس لاکھ پونڈ قرضہ خاص اغراض کیلئے دینا منظور کیا لیکن بات درمیان میں اس وجہ سے رہ گئی کہ حکومت برطانیہ مصر تھی کہ ان کے نمائندے اس خرچ پر نگاہ رکھیں تاکہ یہ روپیہ ان اغراض پر خرچ ہونے کیلئے دیا جائے۔ میرے واپس چلے آنے کے کچھ عرصہ بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ جنرل چیانگ کائی شیک نے انہیں اپنے منصب سے علیحدہ کر دیا ہے۔

۱۹۴۰۔۴۱ء کی گرمیوں میں چنگ کنگ پر اسقدر بمباری ہو چکی تھی کہ رہائش، کاروبار، دفاتر سب کیلئے جگہ کی بہت تنگی تھی۔ برطانوی سفیر نے ازراہ نوازش اپنے سفارت خانے کی نیم پختہ عمارتوں میں سے دو کمرے ہمیں بھی عنایت کر دیئے جو ہماری دفتری ضرورتوں کیلئے کافی تھے۔ ہندوستانی سفارتی کاروبار تو کوئی ایسا تھا نہیں۔ اسلئے اس سارے عرصے میں جو میں نے چنگ کنگ میں گذارا مجھے کبھی عدیم الفرصتی کی شکایت نہیں ہوئی۔ بلکہ میری طبیعت کے انسان کیلئے چنگ کنگ میں وقت گذارنا سب سے دشوار مسئلہ بن گیا۔ حکومت کے وزیر خارجہ خود جنرل چیانگ کائی شیک تھے۔ ان کا ایک مکان شہر میں بھی تھا لیکن انکی رہائش زیادہ عرصہ جنوبی کنارے کے پہاڑی سلسلے کے عقب میں مطار کے قریب شہر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھی درمیان میں ینگسی دریا پڑتا تھا۔ جس پر سے انہیں معہ موٹر کار FERRY سے گذارنا ہوتا تھا۔ بہت سا وقت انہیں مختلف علاقوں کے دوروں پر بھی صرف کرنا ہوتا تھا۔ ان کے متعلق کچھ پختہ طور پر معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کب چنگ کنگ میں تشریف فرما ہوں گے۔ اسلئے ان تک رسائی بہت مشکل تھی۔ انہوں نے دو نائب وزیر خارجہ مقرر کر رکھے تھے ان میں سے ایک مسٹر سُن فو تھے جو سُن یٹ سین صاحب کے صاحبزادے تھے۔ نائب وزراء کے فرائض کی تقسیم کے لحاظ سے میرا کام ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ میری درخواست پر انہوں نے یہ تجویز منظور کر لی تھی کہ میں ہر بدھ کے دن دس بجے قبل دوپہر انکی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں اور جو کچھ تھوڑا بہت سرکاری کام ہو وہ ان کے ساتھ طے کر لیا کروں۔ اس ملاقات کے دوران میں وہ مجھے ملک کے عام حالات سے اور خصوصاً جنگ کے کوائف سے بھی مطلع فرما دیا کرتے تھے۔ چینی اصحاب بے تکلفانہ گفتگو کرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس طریق کو غیر مہذب شمار کیا جاتا تھا۔ غیر ملکی لوگوں کے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل رہتی تھی تواضع اور خوش خلقی کے تقاضوں کو تو وہ بوجہ احسن پورا کرتے تھے لیکن کامل اعتماد انہیں کسی غیر ملکی پر نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ اس لحاظ سے وہ ایشیائی اور غیر ایشیائی کے درمیان ایک خفیف حد تک فرق ضرور کرتے تھے۔

ایک روز برطانوی سفیر نے مجھ سے کہا مجھے اپنی حکومت کی طرف سے ایک اہم پیغام جنرل چیانگ کائی شیک کو جلد از جلد پہنچانے کی ہدایت ہوئی ہے۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست کی ہے لیکن ممکن ہے اس انتظار میں دو ہفتے گذر جائیں اور نہ معلوم کب ملاقات کا موقعہ میسر آئے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہیں نائب وزیر خارجہ سے ہر ہفتے ملاقات

کا موقعہ ہوتا ہے اگر تم اجازت دو تو میں تمہیں ایک لفافہ ان کے نام دیدوں میں ممنون ہوں گا اگر آئندہ ملاقات کے موقعہ پر تم وہ لفافہ میری طرف سے انہیں پہنچا دو۔ حکومت کی طرف سے پیغام تو میں خود ہی جنرل چیانگ کائی شیک کو پہنچاؤں گا لیکن تمہارے ذریعے نائب وزیر خارجہ کو اطلاع کر دینے سے مجھے یہ اطمینان ہو جائیگا کہ رسمی طریق کے اختیار کرنے میں جو تاخیر ہو گئی اس کا اثر الہ ایک حد تک ہو جائے گا۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل بلا تامل کر دی۔ میرا اندازہ تھا کہ ایسی بے قاعدگی جنگ کے نتیجے میں پیدا شدہ غیر معمولی حالات ہی میں ممکن تھی۔ لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ ایک ایشیائی نمائندے کو ایک مغربی نمائندے کی نسبت کسی قدر زیادہ مراعات حاصل تھیں۔

سر رچرڈ ٹائیخمین | میں نے جلد اندازہ کر لیا کہ ہفتے میں تین بار دفتر جانے سے میں اپنے فرائض منصبی کو پورے طور پر سر انجام دے سکتا ہوں۔ ان میں سے دو ضروری اور مستقل فرائض تو نائب وزیر خارجہ سے ملاقات اور سر اولف کیرو حکومت ہند کے سیکرٹری امور خارجہ کے نام ہفتہ وار خط ارسال کرنا تھا۔ دفتر میں جو وقت فارغ میسر آجاتا وہ میں سر رچرڈ ٹائیخمین کی صحبت میں گذارنے کی کوشش کرتا۔ سر رچرڈ برطانوی سفارت خانے میں چینی امور کے ماہر اور مشیر خصوصی تھے۔ وہ چین کے حالات پر چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ایک لمبا عرصہ چین میں گذار چکے تھے اور چینی زندگی اور چینی سیاست کے ہر پہلو سے خوب واقف تھے۔ وہ کبڑے تھے اسلئے جب چلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ کے بل اوندھے چل رہے ہیں۔ بازو لمبے تھے چہرے پر جھریاں تھیں رنگ زرد تھا لیکن آنکھیں روشن تھیں اور ان میں خاصی چمک تھی۔ پیشانی فراخ تھی۔ انکی صحبت میں ایک گھنٹہ رہنا دس جلدوں کے مطالعہ کی نسبت زیادہ مفید نتیجہ خیز اور کار آمد تھا۔ میرے سیکرٹری مسٹر رچرڈسن اپنی ملازمت کا کچھ عرصہ تبت میں گذار چکے تھے اور تبت کے حالات اور وہاں کی ثقافت اور معاشرت سے خوب واقف تھے اور ان کے مداح تھے۔ وہ بھی سر رچرڈ ٹائیخمین کے مشورے سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ سر رچرڈ میرے ہندوستان واپس آنے کے تھوڑا عرصہ بعد اپنی میعاد ملازمت پوری کر کے پنشن پر چلے گئے اور نارفوک میں اپنے آبائی مسکن میں رہائش اختیار کر لی۔ ان کی موت بہت افسوسناک طریق پر وقوع میں آئی۔ ایک روز دھندلی روشنی میں اپنے مکان کے قریب جنگل میں پھر رہے تھے کہ ایک شکاری نے چوپایہ سمجھ کر کچھ فاصلے سے ان پر گولی چلا دی۔ کسی اور قیاس یا شبہے کی گنجائش نہیں تھی اسلئے اس کے بیان کو قبول کر لیا گیا۔

میں سوموار، بدھوار اور جمعہ کو دفتر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا شہر جانا کسی ایسے موقعہ پر ہوتا جب کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب میں میری شمولیت ضروری یا مناسب ہوتی۔ چنگ کنگ میں گرمی اور حبس سے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ اسلئے دفتر جانے کیلئے ہم صبح ۶ بجے ناشتہ کرتے اور ۷ بجے تک روانہ ہو جاتے۔

پہاڑ سے اترتے وقت میں کرسی میں ہوتا جس کے لمبے بانسوں کو چار چینی کہار سہارا دیئے ہوتے۔ پہاڑی رستہ تنگ تھا اور اس میں قدم قدم پہ موڑ تھے۔ ہر موڑ پہ یہ کیفیت ہوتی کہ میرے سامنے کے دونوں کہار موڑ کاٹ کر پہاڑی کے دوسرے کنارے پہ پہنچ جاتے اور پچھلے کہار ابھی موڑ پہ پہنچے نہ ہوتے اور کرسی درمیان میں لٹکی ہوتی۔ نیچے گہری کھڈ ہوتی میجر نذیر احمد صاحب آگے آگے اپنی ہلکی سے ہلکی وردی میں پیدل جا رہے ہوتے۔ ان کے گلے کے گرد تولیہ لپٹا ہوتا جو بار بار پسینہ پونچھنے کے کام آتا۔ پہاڑ سے اتر کر جب ہم آبادی کے قریب پہنچتے تو تعفن اور بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا۔ خدا خدا کر کے کیچڑ اور غلاظت سے اٹے ہوئے رستوں، گلیوں اور بازاروں سے گذر کر دریا کے کنارے پہنچتے۔ یہاں سے کرسی واپس نکلے چلی جاتی اور میجر صاحب اور میں دریا پار جانیوالی دخانی کشتی میں سوار ہو جاتے جو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی جن میں اکثر کے بدن کا اوپر کا حصہ برہنہ اور پسینے سے تر ہوتا۔ سوائے چند مسافروں کے جو شروع میں سوار ہو چکے ہوتے باقی مسافر کھڑے کھڑے دریا پار کرتے۔ دریا کے دونوں کناروں پر کشتیوں کا ہجوم ہوتا جن میں کثیر تعداد چینیوں کی بود و باش ہوتی۔ کشتیوں میں رہنے والے تمام افراد حوائج ضروری سے فراغت کیلئے دریا ہی کو استعمال کرتے۔ اسی دریا کا پانی پینے اور کھانا پکانے کے کام آتا۔ شہر کی طرف کا کنارہ خاصا اونچا تھا۔ بازار تک چڑھنے کیلئے کرائے کی کرسی میسر آسکتی تھی لیکن ہم یہ چڑھائی سیڑھیوں پر سے پیدل ہی چڑھتے بازار تک پہنچتے پہنچتے پسینہ جاری ہو جاتا۔ وہاں ہماری کار منتظر ہوتی اس میں بیٹھ کر سفارت خانے کے نواح میں ایک کھلی جگہ تک پہنچ جاتے۔ یہاں سے ایک تنگ گلی میں سے ہو کر سفارت خانے میں پہنچ جاتے یہ آخری مسافت کوئی دو تین صد گز کی تھی لیکن بارش کے وقت یہ گلی بدرو بن جاتی اور اس میں سے ہو کر گذرنا بہت احتیاط کا طالب ہوتا۔ چنگ کنگ میں میرا لباس ہلکی بنیان، ململ کا کھلی آستینوں کا کرتہ، شلوار، جرابیں، بوٹ اور ترکی ٹوپی ہوتا۔ اہم رسمی تقریبوں میں شمولیت کے وقت شیروانی پہن لیتا۔

چنگ کنگ پہنچنے کے چند دن بعد اور پھر رخصت ہونے سے چند دن پہلے جنرل چیانگ کائی شیک اور میڈم نے مجھے شام کے کھانے پہ مدعو کیا۔ جنرل چیانگ کائی شیک انگریزی بہت کم جانتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ جتنا وہ ظاہر کرتے تھے اس سے زیادہ سمجھ لیتے تھے لیکن بولنے سے پرہیز کرتے تھے۔ جب میڈم قریب ہوتیں وہی مترجم ہوتیں۔ میڈم خود ویلزلی کالج (امریکہ) کی گریجوایٹ تھیں اور مذہباً عیسائی میتھوڈسٹ فرقے کیساتھ وابستہ تھیں۔ نہایت شستہ طبع اور نہایت ذہین تھیں۔ کھانے پہ بیٹھتے ہی مجھے فرمایا کھانا سب مسلم مطعم سے آیا ہے خادم بھی وہیں کے ہیں کسی غیر مسلم کا ہاتھ کھانے کے قریب نہیں گیا تم بلا تامل اطمینان سے کھاؤ۔ کھانے کے دوران گرم تولیے مرد مہمانوں کو ہاتھ اور چہرہ پونچھنے کیلئے مہیا کئے گئے۔ میں نے تجاہل کے انداز میں دریافت کیا یہ امتیاز صرف مردوں کو کیوں بخشا گیا؟ مسکرائیں اور کہا تم شادی شدہ معلوم ہوتے ہو تم خوب جانتے ہو کہ اگر عورتیں چہرہ پونچھ لیں تو ان کے چہروں کی زینت بھی ساتھ ہی پونچھی جائے۔ کھانے کے جلد بعد کہا افسوس ہے تمہیں جلد رخصت کرنے کی مجبوری ہے تم جنوبی کنارے پہ رہتے ہو اور FERRY کے بند ہونے

سے پہلے ہمارا دریا پار ہونا لازم ہے۔ دریا پار ہونے کی دشواریوں کی وجہ سے شہر اور جنوبی کنارے کے درمیان رات کے وقت آمد و رفت کا سلسلہ بہت محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔ دن کے وقت دفتر سے یا کسی اور تقریب سے واپسی پر تو ہم وہی طریق اختیار کرتے تھے جس طریق سے ہم بنگلے سے دفتر پہنچتے تھے۔ صرف ایک فرق ہوتا تھا۔ واپسی پر میجر صاحب دریا پار ہو کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے کیلئے ایک ٹٹو کرائے پر لیتے۔ میجر صاحب طویل قامت تھے چنگ کنگ کے ٹٹو پستہ قد تھے۔ لیکن تھے مضبوط اور چالاک۔ ٹٹو دریا کے کنارے پر ہی موجود ہوتے اور میجر صاحب وہیں سے ٹٹو کی پیٹھ پر متمکن ہو جاتے۔ سوار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹٹو ان کی ٹانگوں میں سے گزر کر کھڑا ہو جاتا وہ اس کی پیٹھ پر جم جاتے۔ جونہی ٹٹو ان کا وزن اپنی پیٹھ پر محسوس کرتا تیز قدمی سے روانہ ہو جاتا سامنے ہی پتھر کی سیڑھی تھی جو بازار تک چڑھتی۔ ٹٹو اس سیڑھی پر پھرتی سے چڑھ جاتا۔ آبادی کے حصے سے نکل کر ٹٹو نسبتاً فراخ پگڈنڈی کے رستے پہاڑ پر چڑھتا اور بنگلے تک پہنچتا۔ کرسی والے اسی تنگ رستے سے چڑھتے جس سے صبح کے وقت اترائی ہوتی اور جو فاصلہ کے لحاظ سے نزدیک پڑتا۔ میجر صاحب اور میں ایک ہی وقت بنگلے پر پہنچ جاتے۔ لیکن رات کے وقت یہ رستہ غیر محفوظ تھا۔ پہاڑ پر اندھیرے میں پاؤں پھسلنے کا خطرہ بھی تھا اور رہزنوں کا اندیشہ بھی۔ ضرورت پڑنے پر مشعلوں سے مدد لیکر یہ رستہ طے ہو سکتا تھا لیکن بہت احتیاط کی ضرورت تھی اور زیادہ رات گئے تو بہر صورت اس رستے کو اختیار کرنا غیر دانشمندی کا فعل ہوتا۔ ایسے اوقات میں ہم یہ انتظام کرتے کہ ہماری اپنی کار دن کے وقت موٹر FERRY پر جنوبی کنارے کی طرف آجاتی اور جو FERRY چنگ کنگ سے جنوبی کنارے کی سڑک تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہم اس پر اپنی کار تک پہنچ جاتے۔ پھر کار ہمیں بنگلے کے عقب اور بنگلے سے کوئی چار پانچ سو فٹ نیچے آدھ میل کے فاصلے تک پہنچا دیتی جہاں سے ہم پیدل مشعلوں کی مدد سے بنگلے تک پہنچ جاتے سڑک پر ہمارے کہار مشعلیں لئے ہمارے انتظار میں ہوتے۔ لیکن بارش کے وقت یہ طریق بھی اختیار نہ کیا جا سکتا جب ہماری کار جنوبی کنارے پر ہوتی تو چنگ کنگ میں ہمیں سواری کا انتظام کرنا پڑتا۔ عموماً برطانوی سفیر صاحب ازراہ نوازش ہمیں اپنی کار ایسے وقتوں میں مہیا فرما دیتے۔ شہر کی طرف سے ہم اس FERRY پر تو پہنچ جاتے لیکن جب دریا میں پانی کم ہوتا تو یہ FERRY دریا کے وسط میں رک جاتی اور مسافر اتر کر اور کچھ فاصلہ دریا کی خشک پتھریلی تہ پر پیدل گزر کر دریا کے دوسرے پاٹ پر پہنچتے جہاں سے کشتی پر سوار ہو کر سڑک کے قریب پار جا لگتے۔ جب ہمیں پہلی بار یہ سفر کرنا پڑا تو کشتی بان کو دینے کیلئے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایک دو چینی مسافروں نے ہنستے ہنستے اشاروں میں ہم سے کہا فکر نہ کرو اور ہماری طرف سے ملاح کو کچھ دیدیا۔ سڑک کے پاس کشتی جہاں کنارے پر جا کر لگی وہاں سے سڑک تک پہنچنے کیلئے پتھروں پر سے چڑھنا تھا۔ رات اندھیری تھی اور مجھے پھسلنے کا خوف تھا لیکن دوسرے مسافروں کی مدد سے یہ مرحلہ بھی بخوبی نہیں تو بحمد للہ بخیریت طے پا گیا۔ ایسے

اوقات میں انسان کو اپنی لباط معلوم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے شکر اور ان کی قدر سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔

ہنگ کنگ میں بفضل اللہ رہائش کا انتظام تو خاطر خواہ ہو گیا تھا۔ میں گرمی سے بہت گھبراتا تھا لیکن بنگلے کا محل وقوع ایسا تھا کہ جب تک ہم بنگلے میں رہتے تھے گرمی کی شدت سے محفوظ رہتے تھے۔ کھانے کے متعلق بھی کوئی ایسی دقت نہیں تھی۔ شکر کا مجھے پرہیز تھا اور یوں بھی میں سادہ غذا کا عادی ہوں۔ اس لحاظ سے سب ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن ذہنی محرومی سب سے بڑی مشکل تھی۔ ہم باہر کی دنیا سے الگ تھلگ پڑے ہوئے تھے۔ چینی اخبار ہم پڑھ نہیں سکتے تھے۔ پڑھ سکتے بھی تو ان میں باہر کی دنیا کی کوئی خبر شاذ ہی شائع ہوتی تھی۔ باہر کی دنیا کے ساتھ رشتہ ڈاک کے ذریعے ہی قائم تھا۔ ڈاک ہفتے میں ایک بار اسی جہاز سے آتی تھی جس سے میں کلکتے سے ہنگ کنگ کا سفر کیا تھا۔ کلکتے سے ہنگ کنگ کے سفر میں دس گھنٹے صرف ہوتے تھے لیکن جہاز کے ہنگ کنگ پہنچ جانے کے بعد ہماری ڈاک کو ہم تک پہنچنے میں ۴۸ گھنٹے لگتے تھے۔ ہمارے بنگلے سے دریا کا وہ ٹاپو نظر آتا تھا جس پر ہوائی جہاز اترا کرتا تھا اور ہم جہاز کو اترتا دیکھ کر اندازہ کر لیتے تھے کہ کل اسوقت تک ہمیں ڈاک مل جانی چاہئیے

آسٹریلیا کا سفارتخانہ بھی جنوبی کنارے کے سلسلہ کوہ میں واقعہ تھا اس سفارت خانے کے تھرڈ سکریٹری کے ساتھ تعارف ہونا ہمارے لئے بڑی راحت کا موجب ہوا۔ فجزاہ اللہ۔ یہ صاحب مسٹر کیتھ والر ہفتے میں ایک دو بار سلسلہ کوہ کے کنارے کنارے ایک تھیلہ کتابوں، اخباروں رسالوں کا اٹھائے ہوئے ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔ وہ سب ہمارے حوالے کرتے تھے اور جو ہم پڑھ چکے ہوتے تھے ہم انہیں واپس کر دیتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر ٹھہرتے تھے۔ ہمارے پاس انکی تواضع کیلئے لپٹن کی چائے ہی تھی۔ جو ان کی خدمت میں پیش کر دی جاتی تھی۔ دودھ تو میسر ہی نہیں تھا اور شکر کا استعمال شاید وہ عادتاً نہیں کرتے تھے۔ لیکن لپٹن چائے کے چھ سات پیالے اس شوق سے نوش فرماتے تھے جیسے یہ نعمت انہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جب ہنگ کنگ میں ہماری رہائش کا عرصہ ختم ہونے کو آیا تو ہمارے پاس چائے کے تین چار ڈبے ابھی باقی تھے وہ ہم نے مسٹر کیتھ والر کی نذر کر دیئے۔ وہ اتنے خوش ہوئے گویا ایک خزانہ مل گیا۔ میری ملاقات ان سے بعد میں بھی ہوتی رہی ہے اب تک مسٹر والر ماسکو اور واشنگٹن میں آسٹریلیا کے سفیر رہ چکے ہیں۔ آسٹریلیا کی وزارت خارجہ کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ میرے دل میں ان کے احسانوں کی یاد اب تک تازہ ہے۔

انقلاب چین کے تعجب خیز اثرات | میرے لئے ہنگ کنگ کے عرصۂ قیام میں سب زیادہ جو چیز موجب اذیت تھی وہ وہاں کا تعفن اور بدبو تھی۔ جن کی تفصیل بیان کرنا بھی موجب اذیت ہوگا۔ بائیس سال بعد مجھے کینٹن میں ۷۲ گھنٹے گذارنے کا اتفاق ہوا اور میں نے اسے نہایت صاف ستھرا شہر پایا یہاں تک کہ وہاں

مکھیوں کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس قدر صفائی کینٹن کی خصوصیت ہو۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ موجودہ چین کے شہروں کے مقابلہ میں صفائی کے لحاظ سے کینٹن کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ بلکہ اس کا شمار چین کے نسبتاً کثیف شہروں میں ہوتا ہے۔ ستر پچھتر کروڑ انسانوں کی ایسی کثیف آبادی میں جس کا نمونہ میں نے چنگ کنگ میں دیکھا تھا ایک ایسا انقلاب جس کا تجربہ مجھے کینٹن میں ہوا میرے لئے حیران کن تھا۔ اور صرف صفائی ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں کم سے کم جہاں تک مادی اور اخلاقی اقدار کا تعلق ہے چین نے بڑی تیزی سے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

چین کی مسلم آبادی | ستمبر کے مہینے میں چُنگ کنگ میں لیجیلیٹو آن کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں شمولیت کے لئے چین کے شمالی مغربی صوبوں کے اور سنکیانگ کے نمائندے بھی تشریف لائے۔ چین کے شمالی مغربی صوبوں میں سے بعض میں مسلمانوں کی کثرت ہے سنکیانگ میں تو نسلی لحاظ سے بھی کثرت ترکی نسل کی ہے۔ ان میں سے تین چار نمائندوں کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ تعلیمیافتہ ہونے کی وجہ سے یہ اصحاب فارسی جانتے تھے اور میں ان کے ساتھ کچھ گفتگو کر لیتا تھا۔ سنکیانگ کے نمائندے بھی کچھ فارسی جانتے تھے گو انکی زبان ترکی تھی۔ یہ ملاقاتیں میرے لئے بڑی دلچسپی کا موجب ہوئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ چین میں قریباً چار پانچ کروڑ مسلمان ہیں جو زیادہ تر شمال مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان دنوں ان علاقوں میں بینکنگ کا کاروبار زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ تین صوبوں کے گورنر مسلمان تھے۔ دینی اقدار کے لحاظ سے وسط ایشیاء سے قریب ترین علاقوں میں اسلامی رنگ زیادہ گہرا تھا۔ کھانیکے معاملے میں حلال حرام کی تمیز شدت سے کیجاتی تھی یہاں تک کہ چینی مسلم غیر مسلم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بالکل نہیں کھاتے تھے۔ میں جب ۱۹۴۷ء میں ہانگ کانگ سے کینٹن گیا اور سرحد سے چینی ریل میں سوار ہوا تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا کھانے کی گاڑی کے منتظم نے میری نشست پر ہی مجھ سے دریافت کیا کھانا کھاؤ گے ؟ میرے اثباتی جواب پر پوچھا۔ مسلم طعام ؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ مجھے کھانے کیلئے بلاوا دوسرے مسافروں کی نسبت نصف گھنٹہ بعد آیا اس سے بھی میں نے اندازہ کیا کہ میرے لئے علیحدہ کھانا تیار کیا گیا تھا۔

ان دنوں چینی مسلمانوں کی دینی تربیت ان کے علماء کے سپرد تھی جن میں سے ایک خاصی تعداد الازہر کی سندیافتہ تھی۔ ان علماء کو "آہنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ لفظ "آخوند" کا ہی مترادف ہو۔

چُنگ کنگ سے واپسی | ستمبر کے آخر میں میجر نذیر احمد صاحب چینڈو اور لان چاؤ تشریف لے گئے حکومت نے ان کے سفر کا انتظام کر دیا۔ میں شروع اکتوبر میں واپس دلی جانیوالا تھا۔ میں نے ان سے کہا آپ پسند کریں تو میں حکومت ہند کو لکھ دوں کہ آپ میری واپسی کے بعد چُنگ کنگ ٹھہریں گے۔ انہوں نے کہا میں تو ہرگز ٹھہرنا نہیں چاہتا اور تمہارے ساتھ ہی واپس جاؤں گا۔ میں نے کہا میں فلاں تاریخ کو روانہ ہوں گا لہٰذا

آپ بروقت تشریف لے آئیں کیونکہ آپ جانتے ہیں ہوائی جہاز ہفتہ میں صرف ایک بار کلکتے سے آتا اور واپس جاتا ہے۔ اگر آپ بروقت نہ پہنچے تو آپ کو ایک ہفتہ مزید یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ میری روانگی میں ایک دن باقی رہ گیا۔ دوسری صبح روانگی تھی لیکن میجر صاحب تشریف لائے نہ انکی طرف سے کوئی اطلاع ملی۔ عصر کے بعد ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز ٹاپو پر اترتا دکھائی دیا۔ گھنٹہ بھر بعد میجر صاحب ٹٹو پر سوار آموجود ہوئے۔ لان چاؤ سے واپسی میں تاخیر کے متعلق بتلایا بارش اتنی ہوئی کہ مطار کی سطح پر بہت پانی جمع ہوگیا جس کی وجہ سے دو دن انتظار کرنا پڑا۔ چنڈو سے کوئی جہاز ادھر آنیوالا نہیں تھا۔ میں نے اپنے فوجی میزبانوں سے کہا مجھے تو لازماً چنگ کنگ آج پہنچنا ہے کیونکہ کل کلکتے کیلئے روانگی ہے۔ خدا ان کا بھلا کرے انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے ایک صورت نکال لی۔ کل مسٹر ڈینڈل دلکی چنگ کنگ پہنچنے والے ہیں آج ایک جہاز ان کے لئے تازہ سبزی اور پھل لیکر چنڈو سے یہاں آنیوالا تھا۔ انہوں نے مجھے اور ایک اور افسر کو بطور سامان اسی میں لاد دیا۔ جب ہم چنگ کنگ کے قریب پہنچے بلکہ دریا کے اندر ٹاپو بھی نظر آنے لگ گیا تو پائلٹ نے کہا تیل ختم ہو رہا ہے تم دونوں باری باری پمپ کو چلاؤ تاکہ آخری قطرہ تیل کا بھی انجن میں پہنچ جائے۔ ہم دونوں پورے زور سے پمپ کو چلاتے رہے اور میں ساتھ ساتھ دعا بھی کرتا رہا۔ آخری تین چار منٹ تو تین چار دن بن گئے اور سخت پریشانی میں گذرے۔ جب اللہ کے فضل سے ہوائی جہاز کے پہئیے زمین سے لگے تو جان میں جان آئی۔ پوچھنے لگے اچھا یہ بتائیے روانگی کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کل یہاں سے معہ ساز و سامان کے چنگ کنگ شہر چلے جائیں گے۔ وہاں رخصتی مراسم اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر رات گذاریں گے اور پرسوں علی الصبح کلکتے روانہ ہو جائیں گے۔ میجر صاحب نے راتوں رات تیاری مکمل کر لی۔ صبح ہم دونوں اور سید عبدالکریم معہ سامان چنگ کنگ چلے گئے اور وہاں سے مطابق پروگرام تیسری صبح کلکتے روانہ ہو گئے۔ جہاز کنمنگ ٹھہر کر پھر روانہ ہوا لیکن ابھی پوری بلندی پر نہ پہنچا تھا کہ پھر نیچے اتر آیا۔ معلوم ہوا کہ ڈبن جان پر جاپانی ہوائی جہازوں کی طرف سے گولہ باری کا الارم ہو رہا ہے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد خبر آئی کہ اب مطلع صاف ہے۔ ڈبجان ٹھہر کر ہم بفضل اللہ مغرب کے وقت کلکتے بخیریت پہنچ گئے۔ مطار پر عزیز انور احمد تشریف لائے ہوئے تھے اور اپنے ساتھ ایک تھرماس بوتل ٹماٹروں کے رس کی برف میں ٹھنڈی کی ہوئی لیتے آئے تھے کیتھ والر کولیٹن کی چائے سے اس لطف اور تسکین کا ہزارواں حصہ بھی کبھی حاصل نہ ہوا ہوگا جو اس دن کی پریشانی اور تھکان کے بعد ہمیں اس ٹھنڈے رس کے پینے سے حاصل ہوا۔ عزیز انور احمد کیلئے دل سے بہت دعائیں نکلیں۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

وائسرائے سے چین کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار

دلی پہنچ کر جب مجھے وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملا تو میں نے چین کے حالات اور اپنے تاثرات انکی خدمت میں بیان کئے۔ چنگ کنگ سے بھی میں اپنے ہفتہ وار خط میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ سر اولف کیرو کو چین کے حالات اور تاثرات لکھ دیا کرتا تھا اور انہوں

نے مجھے لکھا تھا کہ وائسرائے میرے خط کو بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن جب میں نے وہی باتیں اختصاراً ان کی خدمت میں زبانی گذارش کیں تو انہیں حیرت ہوئی اور انہوں نے میرے تاثرات کے متعلق تعجب کا اظہار کیا۔ میں نے انکی خدمت میں تین باتیں وضاحت سے گذارش کیں :۔

اوّل :۔ جاپان کی شکست کے بعد چین اشتراکیوں کے زیر اقتدار چلا جائے گا۔

وائسرائے :۔ تم ایسا کیوں کہتے ہو ؟

ظفر اللہ خاں :۔ میں یہ اسلئے کہتا ہوں کہ اسوقت جاپانیوں کی جو مدافعت چین کی طرف سے ہو رہی ہے اس کا زیادہ حصہ اشتراکیوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ گومن ڈانگ کی طرف سے دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ اشتراکیوں کا نظام بہت مضبوط ہے۔ انکی تربیت بہت زبردست ہے۔ گومن ڈانگ میں ہر طرف رشوت اور چور بازاری کا زور ہے اور رعایا پر خصوصاً کاشتکاروں پر ناجائز دباؤ اور بے جا سختی عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جاپان کی شکست کے بعد یہ حالت قائم نہیں رہ سکتی۔ اشتراکی ضرور تمام ملک پر چھا جائیں گے گومن ڈانگ پارٹی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دوئم :۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ چینی اشتراکی روسی اشتراکیوں کی طرح سرخ اشتراکی نہیں گلابی رنگ کے اشتراکی ہیں یہ محض خوش فہمی ہے۔ تمام قائدین ماسکو کے تربیت یافتہ ہیں اور سو فیصدی اشتراکی ہیں۔

سوئم :۔ یہ توقع کہ چینی کاشتکار انفرادیت کا دلدادہ ہے اور وہ ہرگز اشتراکی دباؤ قبول نہیں کریگا ایک خیال خام ہے۔ چینی کاشتکار کو انفرادیت سے سروکار ہے نہ اشتراکیت سے۔ جو پارٹی اس پر مسلط ہو جائے گی وہ اسی کا فرمانبردار ہو جائے گا اور اگر اسے افسری دباؤ اور دبدبہ سے کسی حد تک رہائی مل سکیگی تو اپنے آزاد کرنیوالوں کو تہہ دل سے خوش آمدید کہے گا۔

وائسرائے نے میری باتیں سن تو لیں پر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے انہیں کوئی وقعت نہ دی لیکن اگر وہ میرے ساتھ متفق بھی ہوتے تو وہ کر بھی کیا سکتے تھے یہ سب امور ان کے حلقۂ اختیار اور رسوخ سے باہر تھے۔

چُنگ کِنگ سے ہندوستان کی آزادی کے متعلق وائسرائے کو میری یادداشت

میں نے چُنگ کِنگ سے ایک یادداشت وائسرائے کی خدمت میں ہندوستان کے آئین کے سلسلے میں ارسال کی تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ گو جنگ کے دوران میں آئین میں تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن رائج آئین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو عملی اقدام بھی ہندوستان کو آزادی کے لئے تیار کرنے کے سلسلے میں کیا جا سکتا ہے اسکی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ مناسب موقعہ پر ایسا اقدام بہت نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں میں نے لکھا تھا کہ جو اشخاص امور مملکت کا کسی حد تک تجربہ رکھتے ہیں اور حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہیں حکومت کو چاہیئے کہ ان پر اعتماد کا عملی ثبوت دے۔ اور امور سلطنت کے متعلق حقیقی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالے تاکہ سیاسی

پارٹیوں اور عوام پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ حکومت اس بات پر آمادہ ہے کہ سلطنت کی ذمہ داری برطانوی ہاتھوں سے منتقل ہو کر ہندوستانی ہاتھوں میں چلی جائے۔ اگر آئین کی تبدیلی میں تاخیر ہو رہی ہے تو اسکی وجہ ایک تو جنگ ہے جس کے دوران ایسے اہم اور پیچیدہ مسئلے کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا سکتی اور دوسرے باہمی فرقہ دارانہ اختلافات ہیں جن کا ابھی تک کوئی حل نظر نہیں آرہا۔ لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکومت ان دو مشکلوں کو آزادی میں التوا کیلئے بہانہ نہیں بنا رہی اور حکومت کی نیک نیتی پر شک کی کوئی گنجائش نہیں کوئی ایسا اقدام ہونا چاہیئے جس کے نتیجے میں ہندوستان کی حکومت کے متعلق آخری فیصلوں کا اختیار ہندوستانی افراد کے سپرد کر دیا جائے خواہ لفظاً ذمہ داری وائسرائے وزیر ہند اور برطانوی پارلیمنٹ کی رہے۔ ایسا کرنے سے اتنا تو واضح ہو جائے گا کہ جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ موجودہ حالات کو طول نہیں دیگا۔ اور جلد سے جلد ہندوستان کو آئینی لحاظ سے بھی آزاد کر دے گا۔

PACIFIC RELATIONS CONFERENCE میں بطور نمائندہ ہندوستان شرکت

مجھے چنگ کنگ سے واپس آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا اور میں عدالت کے ایک ہی اجلاس میں شامل ہوا تھا کہ سرادلف کیرو نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ PACIFIC RELATIONS CONFERENCE کا اجلاس دسمبر کے مہینے میں کنیڈا کے ایک پہاڑی مقام مُون ٹرمبلانٔ میں ہونے والا ہے جو کیوبک کے صوبے میں واقعہ ہے اور ہندوستان کو بھی اس میں شمولیت کی دعوت دیگئی ہے۔ کانفرنس غیر سرکاری ہے لیکن اس میں کنیڈا، ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ کے علاوہ بحر الکاہل کے گرد کے آزاد ممالک کے نمائندے شامل ہوں گے۔ وائسرائے کا خیال ہے کہ اس کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کی شمولیت ہندوستان کے درجے اور وقار میں اضافے کا باعث ہوگی۔ جنگ کے دوران میں یہاں سے کوئی بڑا وفد تو بھیجا جانا مشکل ہے۔ سفر کے حالات بھی صبر آزما ہیں لیکن وائسرائے سمجھتے ہیں اگر تم ایک چھوٹے سے وفد کی قیادت کرنے پر رضامند ہو جاؤ تو جو مسائل وہاں زیر بحث آنیوالے ہیں ان کے متعلق غیر سرکاری طور پر اظہار رائے کر سکتے ہو۔ تمہیں اس میں پوری آزادی ہوگی۔ محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ کو بھی دعوت دی جائے گی۔ اگر انہوں نے دعوت منظور کر لی تو وہ وفد کی دوسری رکن ہونگی۔ اگر کسی اور کو وفد میں شامل کرنا ممکن ہوا تو میں اطلاع کر دوں گا۔ جو معلومات کانفرنس کے متعلق وصول ہوں گی وہ میں تمہیں بھیجتا رہوں گا۔ وائسرائے نے چیف جسٹس سے دریافت کیا تھا کہ عدالت میں تمہیں کسقدر مصروفیت ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ اجلاس کے بعد ایک خاصا عرصہ فرصت کا ہوگا انہیں تمہارے کانفرنس میں شریک ہونے کے متعلق کوئی تامل نہیں۔ میں نے کہا میں چند دنوں کے اندر بتا دوں گا کہ میں جا سکتا ہوں یا نہیں۔ چیف جسٹس سے بات ہوئی انہوں نے مشورہ دیا کہ تمہیں ضرور جانا چاہیئے۔ میں نے چند احباب کے ساتھ مشورہ کرنے اور کچھ غور کرنے کے بعد سرادلف سے کہدیا کہ میں کانفرنس میں

شمولیت پر رضامند ہوں۔ انہوں نے فرمایا جلد تیاری کرلو کیونکہ سفر لمبا ہے اور ہر مرحلے پر تاخیر کا احتمال ہے۔ محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ نے بھی کانفرنس میں شریک ہونا منظور فرما لیا۔

کینیڈا کا سفر وقت آنے پر ہم کراچی سے ہوائی کشتی پر سوار ہوئے اور قاہرہ پہنچ کر ہمارے سفر کا وہ مرحلہ ختم ہوا۔ قاہرہ پہنچنے پر مسٹر کیسی کے سیکرٹری مجھے ملے اور کہا مسٹر کیسی چاہتے ہیں آپ ان کے پاس ٹھہریں وہ آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا مجھے ابھی بتایا گیا ہے کہ ہماری رہائش کا انتظام شیپرڈ ہوٹل میں ہے۔ مسٹر کیسی کی خدمت میں عرض کریں کہ میں ٹھہروں گا تو ہوٹل میں لیکن جب وہ ارشاد فرمائیں میں انکی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ انہوں نے کہا اس صورت میں انکی خواہش ہے کہ آپ کل دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ میں نے بخوشی انکی دعوت قبول کر لی۔ مسٹر کیسی ان ایام میں مشرق وسطیٰ میں برطانوی وزیر ریاست تھے۔ اب لارڈ کیسی ہیں اور آسٹریلیا کے گورنر جنرل رہ چکے ہیں۔ دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر مسٹر کیسی نے ذکر چھیڑا کہ ہندوستان میں رائے عامہ کو جنگی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے اور ان کے حق میں متاثر کرنے کیلئے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں میں نے ان سے اس یاداشت کا ذکر کیا جو میں نے ہنگ کنگ سے وائسرائے کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ مسٹر کیسی نے کہا تمہاری تجویز بہت مناسب معلوم ہوتی ہے ایسا اقدام ضرور ہونا چاہیئے اور میں سمجھتا ہوں یہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ کہنے لگے امریکہ سے لوٹتے ہوئے تم کیوں انگلستان میں براہ راست وزیر ہند اور وزیر اعظم سے بات چیت نہیں کرتے۔ میں نے کہا میرا کوئی ایسا منصب نہیں کہ میں جنگ کے دوران میں از خود ان سے ملوں اور مطالبہ کروں کہ میری تجویز پر توجہ دی جائے۔ پوچھا اگر تمہیں مشورے کیلئے بلایا جائے تو تمہیں جانے میں کوئی عذر ہوگا؟ میں نے کہا میں بخوشی جاؤں گا۔ کہا بہت خوب! میں مسٹر امیری کو اس بارے میں لکھوں گا۔

ہم قاہرہ میں تین دن ٹھہرے۔ قاہرہ سے روانہ ہو کر وادی حلفہ ٹھہرتے ہوئے خرطوم پہنچے اور ایک رات وہاں قیام کیا۔ دوسرے دن خرطوم سے روانہ ہو کر جوبا ٹھہرتے ہوئے سٹینلے ویل میں رات بسر کی تیسرے دن لیوپولڈ ویل ٹھہرے ہوتے دن لیگوس پہنچے۔ سفر کا دوسرا مرحلہ یہاں ختم ہوا۔ تین دن لیگوس میں گورنر جنرل کے ہاں مہمان رہے۔ گورنر جنرل سر ہنری بورڈیان بہت تواضع سے پیش آئے اور ہمیں ان کے ہاں ہر طرح سے آرام ملا۔ قاہرہ سے لیگوس تک کا سفر بھی ہوائی کشتی سے ہوا۔ چوتھے روز لیگوس سے ہوائی جہاز میں روانہ ہو کر عکرہ پہنچے اور یہاں گورنر سر ایلین برنز کے ہاں قیام ہوا۔ ان کی رہائش کرسچین بورگ کیسل میں تھی جو غانا کے آزاد ہونے کے بعد اب صدر ریاست کی رہائش گاہ ہے۔ یہ محل پرانے وقتوں میں یہاں کے ڈینش حکمرانوں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی جائے وقوع بہت نرالی ہے۔ بحر اوقیانوس سے اٹھتی ہوئی ایک پہاڑی کی چوٹی پر یہ محل بنا ہوا ہے۔ خشکی کی طرف اس قطعہ زمین کی سطح ہموار ہے سمندر کی جانب کئی سو فٹ محل کی عمارت پتھر کی ہے۔ نچلی منزل میں تہ خانے ہیں جن کے اندر پرانے زمانے

میں اس وقت تک محبوس رکھا جاتا تھا جب تک انہیں امریکہ بھیجنے کیلئے مناسب جہاز میسر آئے۔ اوپر کی منزل میں ان دنوں گورنر اور اس کے عملے کی رہائش اور دفاتر کے کام آتی تھیں۔ سرایلین اور لیڈی برنر بہت تواضع سے پیش آتے رہے۔ محل کے کھانے کے کمرے کے باہر عین سمندر کے اوپر ایک جھروکہ تھا۔ صبح کے ناشتے کیلئے میز وہاں لگائی جاتی تھی۔ اگر اتفاق سے کسی مہمان کے ہاتھ سے چھری کانٹا یا چمچہ وغیرہ گر جاتا تو کوئی سو فٹ نیچے بحر اوقیانوس کی لہروں میں جاکر ٹھہرتا۔ سامنے کی چٹانوں پر سورج کی شعاعیں اتنی روشن اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی ہوتیں کہ جھروکے میں بیٹھنے والوں کو آنکھوں کی حفاظت کی خاطر سیاہ چشمے استعمال کرنا پڑتے۔

پہلی شام کھانے کے بعد ریڈیو پر اعلان ہوا کہ تا اطلاع ثانی ہر قسم کے ہوائی جہازوں کی پرواز افریقہ کے شمالی اور مغربی علاقوں کے اوپر بند کی جاتی ہے۔ ہمیں اس اطلاع سے بہت پریشانی ہوئی کہ خدا جانے جنگ کے حالات نے کیا پلٹا کھایا ہے اور معلوم نہیں ہمارا یہ سفر جاری رہ سکے گا یا نہیں۔ اور اگر جاری نہیں رہ سکیگا تو ہم یہاں سے وطن لوٹ سکیں گے یا نہیں۔ لیکن یہ پریشانی جلد رفع ہوگئی۔ دوسری صبح اعلان ہوا کہ امریکی افواج شمالی افریقہ میں اترنا شروع ہوگئی ہیں۔ تیسری شب ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مطار سے ٹیلیفون ہوا کہ اگر گورنر صاحب اپنے مہمانوں کو آدھ گھنٹہ کے اندر مطار پر پہنچانے کا انتظام کر دیں تو انہیں راتوں رات سمندر پار پہنچانے کا بندوبست ہو جائے گا۔ ہوائی جہاز فریٹر یعنی سامان لے جانیوالا جہاز ہے لیکن ہم اسے مسافروں کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم فوراً تیار ہوگئے۔ چلتے چلتے لیڈی برنر نے ازراہ نوازش تین صوفہ کشن کار کی کھڑکی میں سے اندر پھینک دیئے اور کہا یہ لیتے جاؤ شاید کام آجائیں۔ غانا کا مطار ان دنوں امریکی فوجی تصرف میں تھا۔ مطار پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز میں امریکن ہوابازوں کی ایک پارٹی امریکہ واپس جارہی ہے۔ یہ ہواباز امریکی فوجی ہوائی جہاز امریکہ سے ایران لے جاتے تھے اور وہاں انہیں روسی فضائیہ کے افسران کے سپرد کر دیتے تھے۔ پھر اور ہوائی جہاز لانے کیلئے واپس امریکہ جاتے تھے۔ علی الصبح جہاز جنوبی امریکہ کے ملک برازیل میں مقام نتال اترا جہاں امریکی فوجی کیمپ تیار کیا جارہا تھا۔ ناشتے پر ہر شے بافراط میسر تھی ناشتے سے فارغ ہوکر ہم ایک امریکی فوجی ہوائی جہاز پر سوار ہوئے جو رات والے جہاز کے مقابلہ میں ہر قسم کے آرام اور آسائش سے آراستہ تھا۔ نشستیں فراخ اور آرام دہ تھیں۔ مختلف قسم کے پھل سینڈوچ اور غیر منشی مشروبات بافراط میسر تھے۔ سٹوارڈ کوئی نہیں تھا، ہر کوئی آزاد تھا۔ جب چاہے اور جو کچھ چاہے کھائے پیئے۔ شام کے قریب ہم جارج ٹاؤن برٹش گائنا کے قریب ایک امریکی فوجی کیمپ میں اترے۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد روانہ ہوکر سہ پہر کو میامی (فلوریڈا) پہنچے ہمارے ساتھ جو امریکن پائلٹ

سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ہماری خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ نٹال سے روانہ ہوتے ہی آپس میں بات چیت شروع ہوگئی۔ ان میں سے ایک جو ہمارے قریب بیٹھے ہوئے تھے چند منٹوں کی گفتگو کے بعد ذرا حیرانی کے لہجے میں کہہ اٹھے "WHY! YOU ARE LIKE US" (آپ تو ہم جیسے ہی ہیں) میں اس پر ہنسا اور کہا آپ تو رات اندھیرے میں بہت گھبرائے ہونگے کہ معلوم نہیں کس قسم کے وحشی جانور ہمارے ساتھ ہوائی جہاز میں بند کر دیئے گئے ہیں خدا خیر کرے۔ ان صاحب کا نام مرے وایٹ تھا۔ بیس سال بعد جب فروری ۱۹۶۲ء میں میں ڈینور یونیورسٹی کی کسی تقریب میں شمولیت کیلئے وہاں گیا اور انہوں نے میرا نام اخبار میں دیکھا تو انہوں ٹیلیفون پر مجھ سے بات کی اپنا نام کرنل وایٹ بتایا۔ مجھے فوراً یہ بات ذہن میں نہ آئی کہ امریکی ہوائی فوج میں افسروں کے گریڈ بری فوجی گریڈ کے مطابق ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا سر ظفر اللہ تمہیں تو یاد نہیں ہوگا لیکن مجھے یاد ہے کہ بیس سال کے قریب ہوئے ہم نے ایک ہوائی سفر اکٹھے طے کیا تھا۔ میں نے پوچھا تو کیا آپ مرے وایٹ ہیں؟ کہا وہی ہوں۔ اسی دن سہ پہر کو مجھے ملنے آئے اور اپنی بیوی کو ساتھ لائے۔ میں نے اپنے اکٹھے سفر کی بہت سی باتیں انہیں یاد دلائیں۔

میامی پہنچنے پر وہاں پر متعین برطانوی نائب قونصل ہمیں مطار پر ملے اور بتایا کہ انہوں نے ہمارے قیام کیلئے ہوٹل میں کمرے لے رکھے ہیں اور ہمارے نیویارک جانے کیلئے ہوائی جہاز سے بھی اور ریل میں بھی جگہ لے رکھی ہے۔ ہم نے طے کیا کہ رات میامی ٹھہر کر دوسری صبح ریل سے نیویارک روانہ ہو جائیں گے۔ میامی سے نیویارک تک قریب ۳۴ گھنٹے کا سفر تھا جو بفضل اللہ آرام سے طے ہوا۔ نیویارک پہنچنے پر PACIFIC RELATIONS ASSOCIATION کی طرف سے ان کے سیکرٹری ہمیں سٹیشن پر مل گئے اور ہمیں والڈارف ہوٹل لے گئے جہاں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا دلی سے نیویارک پہنچنے میں ہمارے تین ہفتے صرف ہوئے۔ نیویارک میں ہم ہفتہ بھر ٹھہرے۔ ان دنوں ملک بشیر احمد صاحب نیویارک میں مستقل رہائش پذیر تھے۔ ان کی وجہ سے ہمیں بہت آرام ملا۔ فجزاہ اللہ۔ کانفرنس کا وقت آنے پر ہم نیویارک سے بذریعہ ریل راتوں رات سفر کر کے علی الصبح مونٹریال پہنچے اور وہاں گاڑی بدل کر مونٹ ٹرمبلان گئے۔ سردیوں کا موسم تھا یہ مقام لارنشین کے پہاڑی علاقے میں ایک تفریحی مقام ہے۔ ان دنوں وہاں ہر طرف برف تھی۔ سٹیشن سے لاج تک ہم SLEDGES میں گئے۔ کانفرنس کے اغراض کے مدنظر یہ مقام نہایت موزوں تھا۔ مرکزی عمارت میں کھانے کا انتظام تھا۔ اور کانفرنس اور کمیٹیوں کے اجلاس کیلئے علیحدہ کمرے تھے۔ اردگرد کے بنگلوں میں رہائش کے کمرے تھے جو نہایت آرام دہ تھے۔ صبح اٹھنے پر بنگلے کے برآمدے کے آگے برف کی چٹانیں نظر آتی تھیں جو سورج نکلنے پر آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہوتی تھیں اور سہ پہر تک پگھل جاتی تھیں۔ صبح پھر وہی کیفیت ہوتی تھی۔ اردگرد برف سے لدے ہوئے پہاڑ تھے۔ دوپہر کو اگر موسم صاف ہوتا تو SKIING کے شائق اپنا شوق پورا کر سکتے تھے۔ کہیں آنے جانے کا تو موقعہ نہیں

تھا۔ کانفرنس اور اس کے متعلقہ امور ہی تمام توجہ کا مرکز تھے۔ امریکی وفد کے لیڈر پروفیسر فلپ جیسپ تھے جو کولمبیا یونیورسٹی میں انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر تھے۔ بعد میں کچھ عرصہ کیلئے ریاستہائے متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ بھی رہے۔ مجھے کچھ عرصہ ان کے ساتھ کولمبیا یونیورسٹی میں کام کرنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ اب وہ بین الاقوامی عدالت کے جج ہیں۔ برطانوی وفد میں لارڈ ہیلی بھی شریک تھے۔ ہندوستانی وفد میں ہمارے ساتھ سررا ماسوامی مدلیار بھی شامل ہو گئے تھے۔ کانفرنس کا عرصہ بہت دلچسپی میں گذرا۔ ذاتی طور پر میری معلومات میں بہت مفید اضافہ ہوا لیکن بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے کانفرنس کے مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔

کانفرنس کے اختتام پر بیگم شاہنواز کے لئے لیکچروں کا پروگرام تجویز کیا گیا تھا جس کی تکمیل کیلئے انہیں کنیڈا اور ریاستہائے متحدہ کے مختلف مقامات کو جانا تھا۔ لارڈ ہیلی فیکس (سابق لارڈ ارون وائسرائے ہند) واشنگٹن میں برطانوی سفیر تھے۔ مجھے ان کا پیغام ملا کہ وائسرائے ہند چاہتے ہیں کہ تم انگلستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس جاؤ انہوں نے فرمایا اگر تم دو چار دن کیلئے واشنگٹن آجاؤ تو ہم تمہیں سفر کے انتظام کی تفاصیل بتا دیں گے۔ ساتھ ہی مجھے ارل آف اتھلون گورنر جنرل کنیڈا کی طرف سے دعوت آئی کہ میں آٹووا میں ان کے ہاں ٹھہروں۔ ہمارے ٹریڈ کمشنر جو ٹورنٹو میں مقیم تھے مصر تھے کہ میں ٹورنٹو بھی ضرور جاؤں۔ چنانچہ مونٹ ٹرمبلان سے میں آٹووا گیا اور گورنر صاحب کے ہاں مہمان ہوا ارل آف اتھلون شاہ جارج ششم کے ماموں تھے اور انکی بیگم پرنسس ایلس کونٹس اتھلون ایک صاحب ذوق تیز فہم خاتون تھیں۔ ان کے ہاں میرا قیام بڑا خوشگوار رہا۔ ایک شام وہ ہمیں برفانی تفریح کرتب دکھانے کیلئے اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور میں اس سے بہت محظوظ ہوا۔ سرلائی مین ڈف ان دنوں کنیڈا کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے مجھے سپریم کورٹ کے اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی جسے میں نے بڑی خوشی سے قبول کیا۔ میں لیگوس میں نائجیریا کی سپریم کورٹ کے اجلاس میں اور عقرہ میں مغربی افریقہ کی عدالت اپیل کے اجلاس میں شریک ہو چکا تھا اور بعد میں اونٹاریو کی سپریم کورٹ کے اجلاس میں بھی شریک ہوا۔ ریاستہائے متحدہ کے چیف جسٹس کی طرف سے دعوت آئی تھی کہ جب تم واشنگٹن آؤ تو ہمارے اجلاس میں شریک ہونا لیکن میرے واشنگٹن پہنچنے تک سپریم کورٹ کا اجلاس کرسمس کی تعطیلات کی وجہ سے ملتوی ہو چکا تھا۔ کنیڈا کی سپریم کورٹ کے اجلاس میں جس امر پر بحث ہو رہی تھی وہ میرے لئے بہت دلچسپی کا موجب ہوا۔ کیونکہ بالکل وہی مسئلہ ہماری فیڈرل کورٹ میں بھی زیر بحث آنیوالا تھا۔

آٹووا سے ٹورنٹو گئے۔ جہاں ایمپائر پارلیمنٹری ایسوسی ایشن کی طرف سے مجھے شام کے کھانے کی دعوت دی گئی کنیڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی گئی۔ دونوں تقریبوں میں تقریر بھی لازم تھی۔ ٹورنٹو میں نیویارک کے بعض مسلم احباب کی طرف سے تار ملا کہ نیویارک پہنچنے پر تم عیدالضحیٰ کی نماز پڑھانا۔ نیویارک پہنچ کر ان کے ارشاد کی تکمیل کی۔ جو مقام انہوں نے نماز کیلئے مقرر کیا تھا وہ والڈارف ہوٹل کے قریب

ہی تھا۔ ملک بشیر احمد صاحب تشریف لائے اور فرمایا اگر چاہو تو پیدل ہی چلے جائیں۔ میں نے عرض کی مجھے تو پیدل چلنے کا شوق بھی ہے اور ڈاکٹری ہدایت بھی ہے اور یہاں پیدل چلنے کیلئے موقعہ بھی بہت مشکل ملتا ہے مناسب ہے پیدل ہی چلیں۔ امریکہ میں چونکہ مکانوں کے اندر درجہ حرارت اعتدال پر رکھا جاتا ہے۔ اسلئے اندر بیٹھے ہوئے باہر کی سردی گرمی کا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہوٹل سے نکلے تو شدت کی سردی تھی۔ چونکہ فاصلہ زیادہ نہ تھا خاص تکلیف کا احساس نہ ہوا۔

پریذیڈنٹ روزویلٹ کے ساتھ ملاقات | ان دنوں سر گرجا شنکر باجپائی واشنگٹن میں حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل تھے۔ انہوں نے پریذیڈنٹ روزویلٹ، چیف جسٹس سٹون اور مسٹر جسٹس فرنیک فرٹر کے ساتھ میری ملاقات کا انتظام کر دیا۔ پریذیڈنٹ روزویلٹ نے دوران گفتگو میں فرمایا میں چرچل کو مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن میں ان پر زور دینے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا کہ ہندوستان کو جلد آزاد ہونا چاہیئے۔

جسٹس فرنیک فرٹر | سر ماریس گوائر نے مجھے جسٹس فرنیکفرٹر کے نام تعارفی خط دیا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے ان سے ذکر کیا مجھے ذیابیطس کی شکایت ہے۔ اور میرے ڈاکٹر صاحب نے تاکید کی ہے کہ بوسٹن جا کر ڈاکٹر جوسلن سے ضرور اپنا معائنہ کرواؤں۔ میں نے سنا ہے وہ نہایت مصروف اور بڑے بلند پایہ ماہر ڈاکٹر ہیں۔ معلوم نہیں میرے لئے وقت نکال سکیں گے یا نہیں۔ جسٹس فرنیکفرٹر نے کہا میں انہیں خوب جانتا ہوں وہ ضرور وقت نکال لیں گے۔ تم مجھے اپنی فرصت کے دن بتادو میں انتظام کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ازراہ نوازش ٹیلیفون پر بات کر کے انتظام کر دیا۔ اور مجھ سے کہا ڈاکٹر جوسلن کہتے ہیں چونکہ تم پہلی بار معائنہ کے لئے آرہے ہو اسلئے تین دن ٹھہرنے کیلئے وقت نکال لینا۔ اس پہلی ہی ملاقات میں جسٹس فرنیکفرٹر کے ساتھ میرا دوستانہ ہوگیا۔ بعد میں جب بھی مجھے واشنگٹن جانے کا اتفاق ہوتا ان سے ضرور ملنے کی کوشش کرتا۔ کبھی عدالت میں ملاقات ہوتی کبھی ان کے مکان پر۔ وہ نہایت قابل اور ذہین تھے۔ ہارورڈ لاسکول کی پروفیسری سے سیدھے سپریم کورٹ کے جج ہوئے تھے۔ جب خود انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی تو مسٹر جسٹس وینڈل ہومز نے انہیں اپنا کلارک مقرر کیا تھا۔ یہ انتخاب ایک قانون کے گریجویٹ کیلئے بہت بڑا اعزاز شمار کیا جاتا ہے۔ جج ہومز لمبی مدت تک سپریم کورٹ کے جج رہے اور عدالت کی روایات پر گہرا اثر چھوڑ کر نوے سال سے زائد عمر میں ججی کے عہدے کے دوران میں ہی فوت ہوئے۔ جج فرنیکفرٹر ان کے بڑے مداح تھے اور انہیں اپنا گرو تصور کرتے تھے۔ ہر بات پر انکی سند پیش کرتے اور بات کرتے کرتے لپک کر کوئی کتاب انکی اٹھا لیتے جس سے موزوں عبارت پڑھ کر سناتے۔ ایک دفعہ ان سے میری ملاقات ان کے مکان پر ہوئی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھنے کو تھا کہ انہوں نے میرے دونوں بازو پکڑ لئے "نہیں نہیں میں چاہتا ہوں تم اس کرسی پر بیٹھو" کہتے ہوئے مجھے ایک اور کرسی پر دھکیل دیا۔ میرے دل میں خیال گذرا اس کرسی کے ساتھ جسٹس ہومز کا ضرور کچھ تعلق ہوگا۔ جب میں نے

رخصت طلب کی اور کھڑا ہوا تو کہا اب اس کرسی کی پشت پہ جو پتری لگی ہوئی ہے اسکی عبارت پڑھو تو تم جان لوگے کہ میں کیوں چاہتا تھا کہ تم اس کرسی پہ بیٹھو۔ اس پتری پہ لکھا تھا، "یہ وہ کرسی ہے جس پہ جسٹس ہومز اپنے مکان واقعہ بیورلے ہلز کے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق یہ کرسی جسٹس فرینکفرٹر کو پیش کی گئی ہے"۔

پاکستان کے قیام کے بعد جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو کہا ظفر اللہ تمہیں جوڈیشل کام نہیں چھوڑنا چاہئے تھا اب بھی جسقدر جلدی ہوسکے عدالتی فرائض کی طرف لوٹ جاؤ۔ ہر بار ملاقات ہونے پہ یہی مشورہ دہراتے۔ جب ۱۹۵۴ء میں میرا تقرر بین الاقوامی عدالت میں ہوگیا تو عندالملاقات فرمایا اب تم راہ راست پہ واپس آگئے ہو!

انٹر امریکن بار ایسوسی ایشن سے خطاب | میرے واشنگٹن کے قیام کے دوران میں وہاں انٹر امریکن بار ایسوسی ایشن کا اجلاس ہو رہا تھا۔ صاحب صدر نے مجھے اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ وقت پندرہ منٹ اور موضوع ایک نہیں دو۔ اوّل "INDIA'S WAR EFFORT" اور دوسرا "INDIA'S LEGAL AND JUDICIAL SYSTEM" دوسرا موضوع خود ایک مرکب موضوع تھا جس کے دو پہلو تھے۔ میں نے پانچ منٹ پہلے موضوع پہ خرچ کئے اور پانچ پانچ منٹ دوسرے موضوع کے ایک ایک پہلو پہ۔ جب میں نے اپنا خطاب ختم کیا تو صاحب صدر نے جہاں اور بہت تعریفی کلمات فرمائے وہاں یہ بھی فرمایا WE HAVE JUST WITNESSED A MIRACLE OF CONDENSATION (ابھی ابھی ہم نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا معجزہ دیکھا ہے)

سر گرجا شنکر باجپائی کے خدشات | سر گرجا شنکر باجپائی نے میرے اعزاز میں ڈنر دیا جس میں بہت سی معزز شخصیتوں کے ساتھ تعارف اور ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دن سر گرجا شنکر باجپائی نے مجھ سے کہا جنگ کے دباؤ کے ماتحت حالات جلد جلد بدل رہے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ جلد ہی ہندوستان میں کانگرسی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں تم سے مشورہ چاہتا ہوں کہ ان حالات میں کیا مجھے استعفےٰ نہیں دیدینا چاہیئے؟ میں انڈین سول سروس کا رکن ہوں اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مجھے کئی بار کانگرس کے خلاف قدم اٹھانا پڑا ہے یا کانگرس کے خلاف حکومت کو مشورہ دینا پڑا ہے۔ یہ سب باتیں ریکارڈ پہ موجود ہیں۔ اگر کانگرس کے ارباب حل وعقد بدلہ لینے پر اتر آئے تو مجھے بہت مشکل کا سامنا ہوگا۔ اس وقت اگر میں استعفیٰ دیدوں تو خاموشی سے لیکن عزت اور احترام کے ساتھ علیحدہ ہوسکتا ہوں۔ میں نے کہا یہ ایک ایسا ذاتی معاملہ ہے جس کا فیصلہ خود آپ کو ہی کرنا چاہیئے۔ چونکہ آپ نے مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے اسلئے میں اپنا مشورہ آپ کی خدمت میں عرض کردیتا ہوں۔ آپ کی اعلیٰ ذہانت اور قابلیت مسلمہ ہے اور کانگرس کے لیڈر آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کا اپنے فرائض منصبی کو دیانتداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنا ان کی نظر میں ایک قابلِ قدر خوبی ہونا چاہیئے۔ جب وہ اقتدار حاصل کرلیں گے تو انہیں آپ جیسے آزمودہ کار افسروں کی بہت ضرورت ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ وہ انکی قدر کریں گے۔ آپ کو کسی قسم کا خدشہ

نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ جس طرح موجودہ حکومت کی خدمت اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں انکی بھی کریں گے۔ اپنے ایک مستقل افسر سے وہ یہی توقع رکھ سکتے ہیں۔ مجھے تو کوئی وجہ پریشانی کی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا آزادی کے بعد سر گرجا شنکر باجپائی ہندوستانی وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل ہوئے اور پھر بمبئی کے گورنر ہوئے

لارڈ ہیلی فیکس سے ملاقات | واشنگٹن میں لارڈ ہیلی فیکس کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے بتایا تمہارے سفر انگلستان کا انتظام BOMBER COMMAND کی معرفت ہوگا اور اسکی تفاصیل سے آگاہی بخشی۔ دوران گفتگو فرمایا لارڈ لنلتھگو چند ماہ میں اپنے منصب کی توسیع شدہ میعاد بھی پوری کرلیں گے۔ تمہارے ذہن میں ان کے جانشین کے متعلق کوئی تجویز ہے؟

ظفراللہ خاں ۔ چونکہ ان امور میں میرے جیسے شخص کا کوئی دخل نہیں ہوتا اسلئے میرا ذہن اس بارے میں خالی ہے۔

لارڈ ہیلی فیکس ۔ سر سیموئیل ہور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ظفراللہ خاں ۔ میں انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ ہندوستان کے آئینی مسائل کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتے ہیں اور ہندوستانی قیادت کی اکثر شخصیتوں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم ہیں۔ میری رائے میں ان کا انتخاب نہایت موزوں ہوگا۔

لارڈ ہیلی فیکس ۔ انگلستان میں تمہیں مسٹر چرچل سے ملنے کا ضرور اتفاق ہوگا۔ مناسب ہوگا اگر تم اپنی رائے کا اظہار ان پر کردو۔

ظفراللہ خاں ۔ وہ اسے دخل در معقولات تو نہ سمجھیں گے؟

لارڈ ہیلی فیکس ۔ نہیں نہیں۔ وہ تمہیں جانتے ہیں۔ تم بیشک آزادی سے اپنی رائے بیان کردینا۔

ظفراللہ خاں ۔ موقع ملنے پر میں تعمیل ارشاد کردوں گا۔

ڈاکٹر جوسلن | واشنگٹن سے فارغ ہو کر میں بوسٹن گیا وہاں نیو انگلینڈ ڈیکنز ہسپتال میں تین دن ٹھہرا ڈاکٹر جوسلن اور ان کے تمام رفقاء بڑی شفقت اور توجہ سے پیش آتے رہے۔ ڈاکٹر جوسلن مسلمہ طور پر دنیا بھر میں ذیابیطس کے چوٹی کے ماہر تھے۔ وہ بین الاقوامی ذیابیطس کانفرنس کے برسوں صدر رہے۔ ان کے ساتھ کام کرنیوالے بھی اس فن میں کچھ کم درجہ رکھنے والے نہ تھے۔ ڈاکٹر الیگزینڈر ماربل، ڈاکٹر ہاورڈ ایف روٹ اور ڈاکٹر پریسکلا وائیٹ بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ڈاکٹروں نے طبی معائنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور یہی ان کا دستور بھی تھا میری کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ البتہ میرا نام ڈاکٹر جوسلن کے زیر علاج مریضوں کی فہرست میں رکھدیا گیا اور ان کے اور میرے درمیان ایک رابطہ قائم ہوگیا۔ میں اوسطاً ہر دوسرے سال انکی خدمت میں

حاضر ہوتا رہا اور ہر بار ان کی شفقت اور توجہ کا مورد ہوا۔ وہ ہر انسان کو اور خصوصاً ہر مریض کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس میں بڑے، چھوٹے، کالے، گورے، مرد، عورت، امیر، غریب کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ۹۳ سال کی عمر پائی اور آخر تک اپنے فرائض کو توجہ اور تندہی سے سرانجام دیتے رہے۔ گرمیوں کے موسم میں ہفتہ اور اتوار بوسٹن سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور یہ دو دن میساچوسٹ کے شہر آکسفورڈ میں ذیابیطس کے مریض بچوں کے کیمپ میں ننھے مریضوں کی صحبت میں گذارتے تھے۔ پہلی بار کے معائنے کے بعد میں صرف ایک بار ہسپتال میں ٹھہرا۔ بعد کے معائنے ان کے مکان پر ہوتے رہے وہ مکان بھی چھوٹے پیمانے پر ہسپتال ہی تھا۔ وہاں بھی ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ خون اور پیشاب کا معائنہ ایکسرے کی تصاویر ELECTO CARDIOGRAM سب کچھ وہیں مکمل ہو جاتے تھے۔ عموماً ناشتے کے قبل سے سہ پہر تک تمام معائنہ مکمل ہو جاتا تھا۔ البتہ آنکھوں کے معائنے کے لئے جب ضرورت پڑتی خود ہی ڈاکٹر بیتھم کیساتھ وقت مقرر کر کے مجھے انکی خدمت میں بھیج دیتے۔ ان کا مکان بھی قریب ہی تھا۔ عمر کے آخری سالوں میں نیو انگلینڈ ڈیکنیز ہسپتال کے پہلو میں ان کیلئے جوسلن انسٹی ٹیوٹ قائم کر دی گئی تھی اور سڑک کا نام بھی جوسلن روڈ رکھ دیا گیا تھا۔ جب انسٹی ٹیوٹ قائم ہو گئی تو انہوں نے اپنے مکان پر مریضوں کو دیکھنا بند کر دیا۔ ہسپتال میں ٹھہرنے میں یہ بھی فائدہ تھا کہ شام یا سہ پہر کو مرض ذیابیطس کی کنہ متعلقہ پرہیز اور علاج کے بارے میں مریضوں کو لیکچروں کے ذریعہ باخبر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس مرض کا اولین طبیب مریض کو خود بننا پڑتا ہے۔ ایک دو بار ہسپتال میں ٹھہرنے کے بعد پھر اس پروگرام کی ضرورت نہیں رہتی علاوہ ازیں ڈاکٹر جوسلن کا ذیابیطس کے مریضوں کے لئے لکھا ہوا ہدایت نامہ بھی اس سلسلے میں مفید اور کارآمد ہے۔ میں قریب بیس سال ڈاکٹر جوسلن کی مسلسل شفقت کا مورد رہا۔ بڑی خوبیوں والے اور بہت محسن دوست تھے۔ ان کی وفات میرے لئے بڑے صدمہ کا موجب ہوئی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا سلوک روا رکھے۔ آمین۔ پہلی بار جب معائنے کے تمام مراحل مکمل ہو چکے تو بڑی تفصیل سے مجھے ہر بات سمجھائی فرمایا سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ خوشخبری دینا چاہتا ہوں کہ جو ڈاکٹر صاحب لاہور میں تمہارا علاج کرتے ہیں وہ اپنے فن میں طاق ہیں اور ان کا علاج بالکل صحیح طریق پر جاری ہے۔ دوسرے تمہاری صحت کی حالت بہت اچھی ہے۔ ذیابیطس بیشک ایک مرض ہے اور اس کے علاج اور متعلقہ پرہیز وغیرہ کی طرف توجہ لازم ہے۔ لیکن ذیابیطس اسی صورت میں خطرے کا موجب ہوتا ہے جب تک اسکا علم نہ ہو اور اسے ضبط میں نہ لایا جائے۔ اگر شروع میں ہی علم ہو جائے اور اسے ضبط میں لے آیا جائے تو ذیابیطس کی وجہ سے خطرے کا اندیشہ نہیں رہتا ہر سال یا ہر دوسرے سال مکمل معائنہ لازم ہے۔ تاکہ ڈاکٹر اور مریض صحیح حالت سے مطلع رہیں اور اگر اصلاح یا مزید احتیاط کی ضرورت ہو

تو اسکی طرف توجہ کی جائے۔ اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی اور نقص پیدا ہو رہا ہو تو باقاعدہ معائنے کے نتیجے میں اس کا بھی بر وقت پتہ چل جاتا ہے اور اسکی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اگر ذیابیطس کا مریض خود فریبی کا مرتکب نہ ہو اور ہدایات پر کاربند رہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ذیابیطس کی وجہ سے نہ صرف اسکی عمر میں کمی نہ ہو بلکہ پرہیز اور احتیاط کے نتیجے میں اسکی عمر میں اضافہ ہو۔ بعد کے معائنوں پر ہمیشہ تسلی کا اظہار کرتے رہے اور کہا کرتے تھے تم مثالی مریض ہو۔ جو ہدایت دیجاتی ہے اسپر عمل کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا اتنی دور سے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ ہدایات حاصل کروں اور پھر ان پر عمل نہ کروں اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہوگی مسکراتے ہوئے فرمایا لیکن سب ایسا نہیں کرتے!

ہر خیر کا سرچشمہ تو اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ لیکن طبیب اور علم طب اور اصول علاج اور ادویات اور غذاؤں کے اثرات یہ سب بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور اسکی عطا کردہ نعمتیں ہیں مرض کا بر وقت علم ہو جانا، حاذق طبیب کا میسر آنا، صحیح تشخیص ہونا، موزوں علاج تجویز ہونا، علاج اور پرہیز کی توفیق ملنا ادویات کا میسر آنا، ان کا موثر ثابت ہونا سب اسکے فضل اور رحم ہی سے ہوسکتا ہے یہ سب اسباب ہیں۔ مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہے۔ شافی بھی وہی ہے۔ وہ چاہے اور اس کا فضل شامل حال ہو تو بعض بلکہ سب اسباب کے بغیر بھی شفا ہو جائے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسم کے اندر کوئی مرض یا سقم پیدا ہوا۔ مریض کو اس کا علم بھی نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل اور رحمت سے شفا دیدی۔ لیکن رعایت اسباب بھی اس کا فرمان ہے اسلئے تا حد امکان اور استطاعت لازم ہے گو نتیجہ ہر حال میں اسی کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے نومبر ۱۹۳۶ء میں ابتدائی تنبیہہ ہوئی تھی میں نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کی پابندی تو کی لیکن بہتر ہوتا کہ میں اسی مرحلے پر ذیابیطس کے کسی ماہر معالج کے ساتھ مشورہ کرتا۔ خصوصاً جب میرے والد صاحب اسی مرض میں مبتلاء رہے تھے لیکن اس طرف توجہ نہ ہوئی۔ اس غفلت کے نتیجے میں ۱۹۴۱ء کے شروع میں مرض ذیابیطس کی صورت اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر عبدالحمید بٹ صاحب نے باصرار ڈاکٹر دشوا ناتھ صاحب کی خدمت میں بھجوایا جنہوں نے علاج کے صحیح طریق کی طرف رہنمائی فرمائی۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے میرے کام کا بوجھ ہلکا کرنے کا سامان پیدا کر دیا۔ ۱۹۴۲ء میں چین کا سفر پیش آگیا میں اپنی صحت کے لحاظ سے بھی گھبراتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہوا کہ گو میں چنگ کنگ سے نحیف اور دبلا ہو کر لوٹا لیکن ذیابیطس کی حالت اس عرصے میں بہتر ہو گئی۔ جو عرصہ میں نے فیڈرل کورٹ کی رکنیت میں گذارا اس کے دوران میں ذیابیطس میں اصلاح ہو گئی۔ تقسیم ملک کی پریشانیوں۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کی ذمہ داریوں اور گرمیوں میں کراچی کی رہائش نے ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء کے عرصہ میں ذیابیطس میں اضافہ کر دیا۔ انسولین کے ٹیکے

کی مقدار ۲۸ یونٹ یومیہ تک پہنچ گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل اور ذرہ نوازی سے بین الاقوامی عدالت میں جانے کا موقعہ پیدا کر دیا۔ ہیگ کی آب و ہوا اور باقاعدہ زندگی اصلاح میں ممد ہوئی اور ٹیکے کی مقدار بتدریج کم ہو کر ۸ یونٹ رہ گئی۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۴ء پھر نیویارک میں رہنا پڑا ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء میں اسمبلی کی صدارت کی ذمہ داری کا اضافہ ہوا اور کام کے اوقات بہت لمبے ہو گئے۔ انسولین کی مقدار ۱۲ یونٹ تک پہنچ گئی۔ پچھلے چھ سالوں میں یہ مقدار کم ہو کر اب بفضل اللہ پھر ۸ یونٹ پر آ گئی ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے ہوا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

امریکہ سے لندن کا سفر بمبر جہاز میں | انگلستان کے سفر کے متعلق ہدایت تھی کہ منٹریال پہنچ جائیں۔ وہاں سے بمبر سروس پر گلاسگو اور وہاں سے لندن پہنچ سکیں گے۔ اس ہدایت کے مطابق میں منٹریال پہنچ گیا ونڈسر ہوٹل میں ٹھہرا۔ گہری برف پڑی ہوئی تھی۔ دوسری صبح اس جہاز میں سفر کرنے والوں کو ہدایات کیلئے مطار پر لے جایا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ بمبر میں بیٹھنے کا انتظام نہیں ہو گا فرش پر گدے ہوں گے ان پر لیٹے لیٹے سفر کرنا ہو گا۔ بمبر کو گرم کرنے کا کوئی سامان نہیں ہو گا۔ پرواز بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہو گی۔ درجہ حرارت بہت نیچا ہو گا، سردی شدت کی ہو گی اسلئے ہمیں عام لباس کے اوپر ایک ریشمی سوٹ اور اس کے اوپر پھر ایک چمڑے کا سوٹ پہننا ہو گا۔ دونوں قسم کے سوٹ مہیا کئے گئے اور ہم نے تجربے کیلئے پہن لئے، ہاتھوں پر پہلے اون کے دستانے اور ان پر چمڑے کے دستانے، سر پر چمڑے کے کن ٹوپ جن کے اندر چمڑے کے سوٹ کی طرح موٹا اونی استر تھا۔ دوسرے دن اطلاع ملی کہ بمبر آ گیا ہے۔ ہم مطار پر گئے لیکن ایک انجن میں کچھ نقص پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہماری روانگی ملتوی ہو گئی اور ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ تیسرے دن برف کا طوفان شروع ہو گیا جو متواتر پانچ دن جاری رہا۔ غرض ۸ دن منٹریال میں رکنا پڑا، ہوٹل کے اندر تو ہر قسم کا آرام میسر تھا لیکن باہر اتنی شدت کی سردی تھی کہ چند قدم سے زائد چلنا محال تھا۔ مجھے ایک دن تھوڑی دور جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جوں توں چلا تو گیا لیکن واپسی پر میرے دائیں کان سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک شام ہمیں برف پر ہاکی کا کھیل دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دلچسپ کھیل تھا۔ کھلاڑیوں کو تو شوق تھا ہی تماشبینوں کے جوش کی بھی انتہا نہیں تھی۔ آخر ہماری روانگی کا دن آ گیا۔ ہم مطار پر پہنچ کر مطابق ہدایات تیار ہو گئے اور بمبر میں داخل ہوئے۔ تمام فرش پر گدوں اور گدیلوں کا فرش تھا بمبر کے عقب میں سے ایک ایک مسافر داخل ہوتا تھا اور جہاز کی آخری حد تک پہنچ کر لیٹ جاتا تھا۔ اس کے بعد آنیوالا مسافر بالکل اسکے ساتھ لگ کر لیٹ جاتا تھا۔ لیکن اس طور پر کہ ایک کا سر ایک طرف اور اس کے بعد آنیوالے کا دوسری طرف بالکل اسی طرح جیسے سارڈینز مچھلیاں ڈبے میں بند ہوتی ہیں۔ ہم کوئی تیس کے قریب مسافر تھے ہمارے اوپر بھاری اونی اور پشمینے کے لحاف ڈال دیئے گئے۔ ہمارے سوٹ اور اوپر کے لحاف

ملکہ اتنے بوجھل ہو گئے کہ جنبش دشوار ہو گئی۔ لیکن سردی سے پورا بچاؤ ہو گیا، پرواز کی بلندی کے مدنظر آکسیجن کا انتظام تھا اور ہدایت تھی کہ کسی وقت بھی آکسیجن کا ماسک منہ سے نہ ہٹایا جائے۔ جہاز کے اندر ہوائی دباؤ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۴ر جنوری ۱۹۴۲ء کو ہم دوپہر کے بعد منٹریال سے روانہ ہو کر شام کو گینڈر پہنچے یہاں شام کا کھانا کھایا۔ رائل ایر فورس کے جو سکواڈرن وہاں متعین تھے انہیں میں نے خطاب کیا، دس گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم پریسٹوک پہنچے رات بھر میں یہ محسوس کرتا رہا کہ اگر میں گیس ماسک کو منہ سے ہٹا دوں تو میں زیادہ آسانی سے سانس لے سکتا ہوں لیکن ہدایت تھی کہ ایسا نہ کیا جائے۔ مجھے بار بار خیال آتا کہ سنتے تو یہ رہے ہیں کہ آکسیجن کی خوشبو بہت خوشگوار ہوتی ہے اور آکسیجن سانس لینے کے فعل کو آسان کر دیتی ہے لیکن یہ کیسی آکسیجن ہے کہ فرحت پہنچانا تو الگ رہا ماسک سے جو ربڑ کی بو آتی ہے اس کا ازالہ بھی نہیں کر سکتی۔ رات کے پچھلے حصے میں میں نے دیکھا کہ بعض مسافر بےچینی سے کبھی پہلو بدلتے ہیں اور کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب ہم پریسٹوک اتر رہے تھے تو ہمیں بتایا گیا کہ آکسیجن کی مشین خراب ہو گئی تھی اور نالیوں میں سے آکسیجن آہی نہیں رہی تھی اگر ہمیں شروع ہی میں بتا دیا ہوتا تو گیس ماسک منہ سے ہٹا کر میں تو آرام سے سو رہتا کیونکہ بلندی کی وجہ سے کوئی دشواری سانس لینے میں مجھے محسوس نہیں ہوئی تھی ہاں البتہ ماسک کے ربڑ کی بو سے بہت بیزاری رہی۔

لندن پر بمباری کے دوران دو ماہ کیلئے قیام

پریسٹوک سے ہم موٹر کوچ پر گلاسگو اسٹیشن پہنچے ہمیں ہدایت تھی کہ اسٹیشن پر ہی کچھ کھا پی لو اور کچھ کھانے کیلئے ساتھ لے لو کیونکہ ریل کے ساتھ کھانے کی گاڑی نہیں اور لندن پہنچنے تک کھانے کیلئے کچھ میسر نہیں آئے گا۔ ریل گلاسگو سے دس بجے صبح روانہ ہوئی سخت سردی تھی اور ریل گرم کرنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ چار پانچ گھنٹے کے بعد اندھیرا ہونے لگا۔ ریل میں بالکل اندھیرا تھا اسٹیشنوں پر بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ شہروں اور مکانوں کے اندر سے بھی روشنی کی کوئی شعاع باہر آنے نہیں پاتی تھی۔ گیارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم نو بجے رات لندن پہنچے۔ سینٹ جیمز کورٹ میں ہم نے پہلے سے رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں قیام ہوا۔ لارڈ ہیلی فیکس نے جو پیغام دیا تھا اس میں اندازہ تھا کہ لندن میں دو ہفتے قیام رہے گا لیکن مختلف وجوہ سے قیام کا عرصہ زیادہ ہوتا گیا اور مجھے پورے دو مہینے لندن میں ٹھہرنا پڑا۔ جنگ کا زمانہ تھا، سردی کا موسم تھا، لندن پر ہوائی بمباری ہوتی رہتی تھی، دن چھوٹے تھے جلد اندھیرا ہو جاتا تھا۔ کام کیلئے صرف چند گھنٹے میسر آتے تھے۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد کہیں نکلنے کا موقعہ نہیں ہوتا تھا۔ ان سب امور کی وجہ سے طبیعت پر کچھ بوجھ رہتا تھا۔ گو بفضل اللہ میں نے کسی وقت کوئی خوف یا پریشانی محسوس نہیں کی

شاہ جارج ششم کی والدہ ملکہ میری کی طرف سے قصر سینڈرنگھم میں یکروزہ قیام کی دعوت

لندن پہنچنے کے دوسرے دن میں انڈیا آفس گیا۔ وزیر ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا ملک معظم کی والدہ

ملکہ میری دورانِ جنگ میں قصر بیڈ منٹن میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ جو گلوسٹر شائر میں ہے ان کی طرف سے تمہیں ان کے ہاں ایک دن مہمان ہونے کی دعوت ہے۔ میں نے دریافت کیا کیا یہ ممکن ہو گا کہ میں صبح جاؤں اور رات لندن واپس آجاؤں۔ انہوں نے کہا دعوت کے مطابق ایک دن سہ پہر کو لندن سے جانا ہو گا اور دوسرے دن دوپہر کو لندن واپسی ہو سکے گی۔ میں نے کہا اس صورت میں تو میرا جانا نہ ہو سکے گا۔ پرائیویٹ سکریٹری صاحب نے کہا کہ شاہی دعوت تو بمنزلہ حکم ہوتی ہے انکار کی تو گنجائش ہی نہیں۔ میں نے کہا یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن میں تعمیل ارشاد سے اس لئے معذور ہوں کہ میں آدھی دنیا کا چکر کاٹ کر یہاں پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ نہایت مختصر سامان ہے جس میں شام کے کھانے کا لباس نہیں۔ پرائیویٹ سیکریٹری نے کہا یہ کوئی ایسی مشکل نہیں ماس برادرس کے ہاں سے ہر قسم اور ہر ماپ کا لباس کرائے پر مل جاتا ہے۔ میں نے کہا میں بھی جانتا ہوں لیکن مجھے کرائے کا لباس پہننا گوارہ نہیں۔ پرائیویٹ سیکریٹری نے کہا اچھا میں لارڈ کلاڈ ہیملٹن کو جو ملکہ میری کے "EQUERRY - IN - WAITING" (افسر حضوری) ہیں ٹیلیفون پر بتا دوں گا کہ تم اس وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ تین دن بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ لارڈ کلاڈ ہیملٹن سے کہہ دیا گیا تھا انہوں نے ٹیلیفون پر کہا ہے کہ ملکہ فرماتی ہیں شام کے کھانے کا لباس لازم نہیں تم جس لباس میں چاہو آسکتے ہو۔ اب تو تعمیل ارشاد کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ملکہ میری کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ گول میز کانفرنس کے ایام میں اور پھر شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کے موقعہ پر مجھے تین چار بار ان کی خدمت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔ تاجپوشی کے موقعہ پر میں شاہی مہمان تھا لیکن اس وقت میری حیثیت اپنے ملک کے نمائندہ کی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں ذاتی حیثیت میں شاہی مہمان ہوا۔ لارڈ کلاڈ ہیملٹن مجھے اسٹیشن پر مل گئے اور محل تک پہنچتے پہنچتے مجھے ان سے وہاں کے ماحول کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو گئیں قصر بیڈ منٹن ڈیوک آف بوفرٹ کا محل تھا۔ ان کی بیگم ملکہ میری کی بھتیجی تھیں۔ غالباً اس تعلق کی وجہ سے ملکہ نے یہ انتظام منظور فرما لیا تھا کہ جنگ کے دوران میں اس محل کے ایک حصہ میں اپنی رہائش کا انتظام اپنی پسند اور مرضی کے مطابق کر لیں۔ ہم چار بجے سے قبل محل میں پہنچے۔ لارڈ کلاڈ مجھے میرے کمرے میں لے گئے اور کہا تم کچھ آرام کر لو۔ میں بیس منٹ میں آکر تمہیں چائے کیلئے نیچے لے چلوں گا۔ ملاقاتی کمرے میں پہنچے تو میں نے ان سے کہا مجھے چائے کے آداب سے مطلع کر دیں۔ انہوں نے کہا کوئی خاص آداب نہیں دس منٹ تک ملکہ تشریف لے آئیں گی ان کے علاوہ صرف لیڈی لیمنگٹن ہوں گی جو ان دنوں ملکہ کی لیڈی ان ویٹنگ (مصاحبہ) ہیں۔ ملکہ خود ہی میزبانی کریں گی۔ نوکر طلب کئے جانے پر کمرے میں داخل ہو گا اور تعمیل ارشاد کے بعد چلا جائے گا۔ میں نے دریافت کیا ملکہ کو خطاب کرنے کا کیا طریق ہے؟ انہوں نے کہا عام طور پر MA'AM کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا لیڈی لیمنگٹن دراز قد کی وہ باوقار خاتون تو نہیں جن کے میاں عرصہ ہوا مدراس کے گورنر تھے۔ لارڈ کلاڈ نے کہا ہاں وہی ہیں اور لو وہ تشریف لے آئیں۔ میں نے لیڈی لیمنگٹن سے کہا جب میں لندن میں طالب علم تھا آپ کے

میاں نے اور آپ نے ۲۱ کروموبل روڈ میں ہندوستانی طلباء کو ایک استقبالی دعوت سے نوازا تھا۔ میں بھی اس دعوت میں شامل تھا۔ ان دنوں آپ کو مدراس سے واپس آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ فرمایا یہ تو کوئی تئیس سال کی بات ہے کیا تمہیں اب تک یاد ہے۔

اتنے میں ملکہ تشریف لے آئیں اور ہم سب چائے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بالکل سادہ اور بے تکلف تقریب تھی مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہ ہوا۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ میرے آٹووا میں کینیڈا کے گورنر جنرل ارل آف اتھلون کے ہاں مہمان ہونے کا ملکہ کو علم ہے۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ گورنر جنرل کی بیگم صاحبہ شہزادی ایلس کونٹس آف اتھلون نے میرے متعلق ملکہ سے ذکر کیا ہوگا جس کے نتیجے میں ملکہ نے مجھے حاضری کا ارشاد فرمایا۔ ارل آف اتھلون ملکہ میری کے بھائی تھے اور ان کی بیگم شہزادی ایلس ملکہ وکٹوریہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے پرنس لیوپولڈ ڈیوک آف البنی کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں قصر بکنگھم میں ایک پارٹی کے موقعہ پر مجھے ان سے ملنے کا پھر اتفاق ہوا اور میں نے ان سے دریافت کیا کیا آپ ہی نے ملکہ میری کی خدمت میں تحریک کی تھی کہ وہ مجھے اپنی مہمانی کا فخر بخشیں۔ انہوں نے فرمایا ہاں میں نے ہی انہیں لکھا تھا۔ اور وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ چائے کے بعد ملکہ مجھے اپنی نشست گاہ میں لے گئیں اور آدھ گھنٹہ بھر سے زائد بات چیت ہوتی رہی۔ ملک معظم جارج پنجم کی ہمراہی میں جشن تاجپوشی کے لئے اپنے سفر ہند کا ذکر کیا اس پر قریب ۳۴ سال کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن ان کی یادداشت بالکل صاف تھی۔ جس بات پر مجھے بہت تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ ان کا ہندوستانی الفاظ کا تلفظ نہایت صحیح تھا۔ میں نے اس کا اظہار کیا تو فرمایا تم سے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں نے انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے خاص طور پر یہ اہتمام کیا تھا کہ میں ہندوستانی الفاظ اور ناموں کا صحیح تلفظ سیکھ لوں۔ مجھے یہ بات بے حد ناپسند ہے کہ غیر زبان کے الفاظ اور ناموں کو بگاڑ کر بولا جائے میں اسے پرلے درجے کی بد خلقی سمجھتی ہوں۔ ہمارے افسران کی یہ طرز مجھے پسند نہیں۔ "کپورتھلہ" کہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا "کیپرتھالا" کہنا اور صحیح تلفظ کان کو بھی کہیں زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ "حیدرآباد" کو "ہائی ڈرابیڈ" اور "نظام" کو "نائی زیم" بنا دینا جہالت بھی ہے اور کج خلقی بھی۔ ملکہ نے اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے ڈیوک آف کینٹ کی ہوائی حادثے میں المناک موت کا ذکر بھی کیا۔ بڑے صاحبزادے ڈیوک آف ونڈزر کا نہ انہوں نے ذکر کیا نہ میں نے ان کا ذکر چھیڑنا مناسب سمجھا کیونکہ ان کے احساسات کا احترام لازم تھا۔ لارڈ کلاڈ مجھے بتا چکے تھے کہ محل کے جس حصے میں ملکہ سکونت پذیر ہیں اس کا اہتمام اور انصرام ان کے اپنے اختیار میں ہیں۔ لیکن ملکہ نے خود بھی وضاحت کر دی۔ فرمایا میں یہاں ڈیوک اور ڈچیس آف بوفرٹ کی مہمان نہیں ہوں اور تم بھی ان کے مہمان نہیں میرے مہمان ہو۔ یوں میں نے انہیں آج شام کھانے پر بلایا ہے تاکہ تم ان سے بھی مل لو۔ بہت اچھے لوگ ہیں تم ان سے مل کر خوش ہو گے۔ ملکہ نے مسٹر گور کی تصنیف کردہ شاہ جارج پنجم کی سوانح عمری مجھے عنایت کی اور ایک پورا

صفحہ اپنے قلم سے میرے نام اس کے شروع میں رقم فرمایا۔ اپنے تین عدد فوٹو اپنے دستخط ثبت کر کے بھی دیئے۔ ان میں سے ایک میں وہ قصر بیڈ منٹن کے پارک میں کنیڈین سپاہیوں کے ساتھ آرہ کشی کر رہی تھیں۔ میں نے کہا ہندوستان میں یہ تصویر بڑی دلچسپی کا موجب ہوگی۔ فرمایا یہ کوئی ایسی اچنبھے کی بات تو نہیں میں تو بڑے شوق سے ان کے ساتھ شامل ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا کیا آپ ملکہ وکٹوریہ یا ملکہ الیگزینڈرا کا تصور اس شغل میں کر سکتی ہیں۔ فرمایا زمانے کی رفتار کا لحاظ بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔ جب میں نے اجازت چاہی تو باصرار مجھے میرے کمرے تک پہنچانے میرے ساتھ آئیں۔

شام کے کھانے پر ڈیوک اور ڈچیس آف لوفرٹ تشریف لے آئے۔ ڈچیس بات چیت میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی رہیں۔ میں نے لارڈ کلاڈ سے دریافت کر لیا تھا کہ کھانے کے بعد ملکہ کب تک ملاقاتی کمرے میں تشریف فرما رہتی ہیں۔ انہوں نے بتایا نو بجے ریڈیو پر خبریں نشر ہوتی ہیں۔ خبریں ختم ہونے کے اندازاً پانچ منٹ بعد ملکہ تشریف لے جاتی ہیں۔ خبریں ختم ہونے کے بعد میں نے خود کوئی نیا موضوع نہ چھیڑا لیکن ملکہ نے سلسلہ گفتگو پونے دس بجے تک جاری رکھا۔ رخصت ہونے پر فرمایا تمہارا ارادہ ناشتے کے بعد لندن واپس جانے کا ہے میں عمر رسیدہ ہوں اپنے کمرے میں ہی ناشتہ کر لیتی ہوں۔ میں ممنون ہوں کہ تم نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی تمہارے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

ہندوستان کو آزادی دیئے جانے کے سلسلہ میں میری ایک تجویز

میں نے ۱۹۴۱ء کے دوران میں وائسرائے کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ جنگی سرگرمیوں کیلئے ہندوستانی سیاسی حلقوں کی تائید حاصل کرنے کیلئے کوئی ایسا اقدام کیا جانا چاہیئے جس سے انہیں اطمینان ہو جائے کہ جنگ کے کامیابی کے ساتھ ختم ہونے پر برطانیہ ہندوستان کو آزادی دینے کیلئے تیار ہوگا۔ وائسرائے مجھ سے کہہ چکے تھے کہ جنگ کے دوران میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ برطانوی حکومت یا پارلیمنٹ کسی آئینی ترمیم کی طرف توجہ دے سکے اس لئے میں نے اپنی تجویز کو اسی حد تک محدود رکھا تھا کہ آئینی ترمیم کے بغیر باہمی سمجھوتے کے ذریعے حکومت ہند کی تشکیل میں اور وائسرائے ہند اور وزیر ہند کے اختیارات میں مناسب ترمیم کر دی جائے۔ اس تجویز پر مشورے کیلئے مجھے لندن بلایا گیا تھا مشورے کی گفتگو سر جیمز گرگ، سر جان اینڈرسن اور سر فنڈلیٹر سٹوارٹ کے ساتھ قرار پائی سر جیمز گرگ جو وائسرائے کی کونسل میں میرے رفیق رہ چکے تھے ان دنوں نائب وزیر جنگ تھے اور جلد ہی مسٹر ہور بلیشا وزیر جنگ کے مستعفی ہونے پر ان کے جانشین ہو گئے۔ سر جان اینڈرسن بنگال کے گورنر رہ چکے تھے۔ ان دنوں جنگ سے متعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کے امور ان کے سپرد تھے۔ ان کی حیثیت وزیر کی تھی اور وہ کابینہ کے رکن تھے۔ بعد میں وہ لارڈ ویورلے ہوئے۔ ان کی پہلی بیوی ان کے گورنر بنگال ہونے سے پہلے فوت ہو چکی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے وزارت خارجہ کے ایک سینئر افسر کی بیوہ کے

ساتھ شادی کی تھی جنکا اپنا مکان لارڈ نارتھ سٹریٹ میں تھا جو سر جان کیلئے نہایت موزوں ثابت ہوا۔ یہ مکان ایوان پارلیمنٹ اور حکومت کے دفاتر کے بہت قریب تھا اور جنگ کے زمانے میں ایک وزیر کیلئے یہ نعمت غیر مترقبہ تھی۔ سر جان نے مجھے دوپہر کے کھانے پہ مدعو کیا اور میرا تعارف لیڈی اینڈرسن سے کرایا۔ وہ بہت نازک اندام اور نازک طبع تھیں۔ ان کا مکان بالکل گڑیا کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ سر جان اینڈرسن جیسے بھاری بھرکم جسم والے انسان کے لئے تو اس مکان کے اندر آزادی سے چلنا پھرنا بھی دشوار تھا۔ لیکن وہ کہیں جھک کہیں جسم کو بل دیکر گذارہ کر لیتے تھے۔ سر فنڈلیٹر سٹوارٹ کئی سال متقل نائب وزیر ہند کے عہدے پر مامور رہنے کے بعد ان دنوں جنگی تدابیر کے محکمے میں ایک ذمہ دار منصب پر فائز تھے۔ ہماری آپس کی گفتگو کے لئے کوئی خاص پروگرام مقرر نہ تھا۔ ضرورت کے مطابق اور ہر ایک کی مصروفیات اور سہولت کا لحاظ رکھتے ہوئے گفت و شنید جاری رہتی تھی۔ ہفتے میں دو تین بار ہم چاروں جمع ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جن صاحب کے ساتھ ضرورت ہوتی میں علیحدہ علیحدہ بھی مل لیتا تھا۔ پہلی دو تین ملاقاتوں میں ہی اسبات پر ہمارا اتفاق ہو گیا کہ وائسرائے کی کونسل میں باستثنائے کمانڈر انچیف باقی سب اراکین ہندوستانی ہوں اور وائسرائے کی حیثیت صرف ایک آئینی رئیس مملکت کی ہو۔ کونسل کے سینئر ہندوستانی رکن کو اگرچہ "وزیر اعظم" کا نام نہ دیا جائے لیکن عملاً اس کی حیثیت اور اس کے اختیارات وزیر اعظم کے ہوں۔ وزیر ہند وائسرائے کو ہدایت دیدیں کہ انہیں صرف ایسے امور میں دخل اندازی کا اختیار ہے جن کا تعلق براہ راست جنگ کے ساتھ ہو۔ اگرچہ اس تجویز کی تفاصیل پر دونوں جانب سے بہت کچھ نقطہ چینی کی گنجائش تھی۔ لیکن ہم چاروں کا اس امر پر جلد اتفاق ہو گیا کہ کسی ایسی تجویز کو کامیاب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ ایک امر جس کا گو صراحتہً کوئی ذکر تو ہمارے درمیان نہیں ہوا تھا۔ لیکن جو پس پردہ اس تجویز کے حق میں ممد ہوا یہ تھا کہ امریکی صدر روزویلٹ کی طرف سے برطانوی حکومت پر بہت زور دیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرنے کے سلسلے میں جلد کوئی موثر قدم اٹھانا چاہیئے۔ جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے صدر روزویلٹ نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ وہ وزیر اعظم چرچل پر ہندوستان کی آزادی کے متعلق زور دینے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ آئینی طور پر حکومت ہند وزیر ہند کے ذریعے برطانوی پارلیمنٹ کو جواب دہ تھی۔ میں تو مطمئن تھا کہ اگر باہمی سمجھوتے کے نتیجے میں وائسرائے اور وزیر ہند کے اختیارات کی حد بندی کر دی جائے تو تجویز قابل عمل ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے برطانوی رفقاء متفکر تھے کہ جنگ کے نازک مرحلے کے دوران میں اب اہم اقدام کرنے کیلئے وزیر اعظم، وزیر ہند اور برطانوی مجلس وزراء کو کس طرح رضامند کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ہند کے وزراء کے طریق انتخاب کا معاملہ میرے برطانوی رفقاء کیلئے پریشان کن تھا۔ وہ ایسی کسی تجویز پر غور کرنے کیلئے تیار نہ تھے کہ وزراء کا انتخاب اسمبلی کرے۔ یا یہ انتخاب اسمبلی کے مشورے کے ساتھ ہو۔ کیونکہ اول تو اس طریق کو اختیار کرنے کیلئے آئین میں ترمیم

لازم آتی۔ دوسرے برطانوی مجلسِ وزراء اور خصوصاً وزیر اعظم (مسٹر چرچل) اور وزیر ہند (مسٹر ایمری) اس طریق کو منظور کرنے پر کبھی رضامند نہ ہوتے۔ مجھے شروع سے ہی اس مشکل کی اہمیت کا احساس تھا اسلئے میں اس پر مصر نہیں تھا۔ آخر میں نے سر جیمز گرگ سے کہا کہ ہم کسی منتقل نظام حکومت کا فیصلہ تو کر نہیں رہے۔ ہمیں تو ایک عارضی اور عبوری انتظام کی ضرورت ہے جو دوران جنگ میں کام دے سکے اور جو برطانوی حکومت کی طرف سے طوعاً اختیار کیا جائے۔ میری اپنی حیثیت کسی کے نمائندہ ہونے کی نہیں۔ منصب کے لحاظ سے بھی میں جج ہوں۔ سیاست میں میرا کوئی دخل نہیں۔ میں نے ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت میں جسے اپنے ملک کی آزادی مطلوب ہے اور جو سمجھتا ہے کہ یہ آزادی جنگ میں اتحادیوں کی فتح سے ہی حاصل ہو سکتی ہے اپنا مشورہ پیش کیا ہے۔ آپ اور میں چار سال کا عرصہ حکومت ہند میں بطور رفیق کام کر چکے ہیں۔ ہمیں ایکدوسرے پر اعتماد ہے۔ اگر ہم کسی ایسی تجویز پر اتفاق کر سکیں جو تین چار سال تک کام دے جائے تو ممکن ہے اس کے نتیجے میں آئندہ کی بہت سی مشکلات کا حل آسان ہو جائے۔ انتخاب وزراء کے متعلق کوئی آئینی صورت تو اس وقت قابل پذیرائی نظر نہیں آتی صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے۔ کہ وزراء کا انتخاب اس عبوری عرصے کیلئے شخصی طور پر کر لیا جائے۔ سر جیمز اصولاً اس بات پر رضامند ہو گئے۔ اور باقی دونوں اصحاب نے بھی اسے قبول کر لیا۔ اس مرحلے پر میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ جس تجویز کے خاکے پر ہمیں اتفاق ہے اس کی منظوری کی کس قدر امید کی جا سکتی ہے۔ شروع میں ہی مجھ سے کہا گیا تھا کہ ہماری گفتگو کے ماحصل سے سر جیمز گرگ وزیر اعظم کو مطلع کرتے رہیں گے اور سر فنڈلیٹر سٹورٹ وزیر ہند کو بتلاتے رہیں گے۔ اور دونوں اصحاب دونوں وزراء کے ردعمل کا اندازہ کرتے رہیں گے چنانچہ دونوں اصحاب نے بتایا کہ وزیر اعظم اور وزیر ہند کو تجویز کے ساتھ اصولاً اتفاق ہے۔ یہ امر میرے لئے بہت اطمینان کا موجب ہوا۔ کیونکہ مجھے وزیر اعظم صاحب کی طرف سے کچھ خدشہ تھا۔ انہوں نے تو مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کے روبرو ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ دیئے جانے کی بھی سخت مخالفت کی تھی اگرچہ یہ تو دس سال پہلے کی بات تھی۔ لیکن وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی انہوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا تھا جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ وہ ہندوستان کا حق آزادی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے اپنی تجویز کا سب سے امید افزا پہلو یہ نظر آتا تھا کہ اس کی منظوری عملاً ہندوستان کا حق آزادی تسلیم کیئے جانے کے مترادف تھی۔ مسٹر چرچل کو اس تجویز پر رضامند کرنے میں سر جیمز گرگ کا بہت کچھ دخل تھا۔ برسوں پہلے جب مسٹر چرچل وزیر خزانہ تھے انہوں نے سر جیمز کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کیا تھا۔ اور انہیں ان پر بہت اعتماد ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ وزیر اعظم ہونے کے بعد سر جیمز گرگ کو انہوں نے نائب وزیر جنگ اور پھر وزیر جنگ کی علیحدگی پر انہیں وزیر جنگ مقرر کیا۔

اسی دوران میں میں نے سر فنڈلیٹر سٹورٹ سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ممکن ہے وائسرائے ہند (لارڈ لنلتھگو)

ہماری تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ سر فنڈلیٹر نے فرمایا کہ وائسرائے کے ساتھ مشورہ تو لازم ہے اور بات اب اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ ان کے ساتھ مشورہ کیا جائے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلہ میں کم سے کم اتنا اقدام تو ضرور کیا جائے۔ اس تجویز کی تفصیلات کے متعلق بیشک وائسرائے کی رائے کو وقعت حاصل ہوگی لیکن اگر انہیں اصولی اختلاف ہوا تو انہیں حکماً منوایا جائے گا۔ سر فنڈلیٹر سٹورٹ کو میں عرصہ بارہ سال سے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ مزاج، مدبر اور نہایت کم گو تھے۔ حتی الوسع زوردار الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ اس موقعہ پر ان کے الفاظ ایسے واضح اور زوردار تھے کہ میرا اطمینان اور بھی پختہ ہوگیا۔ چند دن بعد انہوں نے بتایا کہ تجویز وائسرائے کو بھیجدی گئی ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ وزیراعظم اور وزیر ہند کو ہماری تجویز کے ساتھ اصولاً اتفاق ہے۔ تو سر جیمز گرگ نے اور میں نے وزراء کے انتخاب پر غور کرنا شروع کیا۔ بعض وزراء کے متعلق تو جلد ہی اتفاق رائے ہوگیا۔ مثلاً سر راما سوامی مدلیار سینئر وزیر (یعنی عملاً وزیراعظم) سر عزیز الحق جو ان دنوں لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے، وزیر تجارت سر وی ٹی کرشنا چاری جو ان دنوں ریاست بڑودہ کے چیف منسٹر تھے وزیر خزانہ، بعض نام ابھی زیر غور تھے کہ ایک ایسی صورت حالات پیش آگئی جس کی وجہ سے وائسرائے کو اس تجویز کے رد کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ عین اُن دنوں میں گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا۔ اس پر سر ہومی مودی، مسٹر این آر سرکار اور مسٹر ایم ایس آنی نے احتجاجاً وائسرائے کی کونسل سے استعفےٰ دیدیا۔ ان دنوں لندن سے ارسال کردہ تجویز وائسرائے کے زیر غور تھی وائسرائے نے وزیر ہند کی خدمت میں اطلاع دی کہ ان حالات میں کسی ایسی تجویز پر عمل کرنا کمزوری دکھانے کا مترادف اور خطرے کا موجب ہوگا۔ چنانچہ جس غرض کے لئے مجھے لندن بلایا گیا تھا وہ فوت ہوگئی اور میں نے واپسی کی تیاری کرلی۔

وزیراعظم چرچل سے لارڈ لنلتھگو کے جانشین کے تقرر کے متعلق گفتگو۔

وزیراعظم چرچل کے ساتھ ملاقات کے دوران میں میں نے اُن سے دریافت کیا آئندہ وائسرائے کے تقرر کے متعلق آپ نے کچھ فیصلہ فرمایا ہے؟ انہوں نے فرمایا ابھی نہیں اور دریافت کیا تمہارے ذہن میں کوئی نام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری رائے میں سر سیموئل ہور نہایت موزوں ہوں گے۔ فرمایا نہیں نہیں۔ تمہیں معلوم ہے گول میز کانفرنس کے دوران میں ہندوستان کے متعلق ان کا کیا موقف تھا۔ میں نے کہا بیشک مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے آپ کا کیا موقف تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے میرا کیا موقف تھا لیکن اب وہ سب باتیں پیچھے رہ گئی ہیں دنیا بہت آگے نکل گئی ہے فرمایا ہور کا تجویز کیا ہوا "ہور لاوال" معاہدہ نہایت غیر دانشمندانہ تجویز تھی۔ میں نے عرض کیا مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے لیکن ہر مدبر سے غلطی ہوسکتی ہے۔ سر سیموئل ہور کو اپنی اس غلطی کے نتیجے میں وزارت خارجہ سے الگ ہونا

پڑا۔ وہ خمیازہ بھگت چکے ہیں۔ لیکن کیا بحیثیت وزیراعظم بالڈون بھی اس معاہدے کی ذمہ داری میں شریک نہیں تھے؟
اس پر کہا:۔

"DONT YOU MAKE A MISTAKE. BALDWIN WAS A SINGULARLY IGNORANT MAN. HE KNEW NOTHING ABOUT FOREIGN AFFAIRS OR FOREIGN POLICY. ALL HE WAS INTERESTED IN WAS WINNING THE ELECTIONS AT HOME. BUT I GRANT YOU SAM HOARE IS DOING A GOOD JOB IN MADRID AND I CANNOT SPARE HIM"

ترجمہ۔ اس بھول میں نہ رہنا۔ بالڈون تو بالکل جاہل مطلق تھا وہ خارجہ معاملات یا خارجہ پالیسی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اسکی غرض صرف ایک تھی ملکی انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ سیموئیل ہور میڈرڈ میں اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا ہے کہ میں اسے وہاں سے فارغ نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا وقت آنے پر وہ میڈرڈ سے سیدھے دہلی جا سکتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے مسائل کو خوب سمجھتے ہیں اور اس بات کے محتاج نہیں کہ چھ مہینے انڈیا آفس میں بیٹھ کر ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور مسائل حاضرہ کا مطالعہ کریں۔ فرمایا میں تمہاری رائے کو وقعت دیتا ہوں اور تمہاری تجویز کو ذہن میں رکھوں گا۔

وزیراعظم چرچل سے ملاقات کے بعد ایک دن سرجان اینڈرسن کے ہاں آئندہ وائسرائے کے تقرر کا ذکر آ گیا۔ لیڈی اینڈرسن نے مجھ سے کہا کیا تمہیں اتفاق نہیں کہ جان کا انتخاب موزوں ہوگا؟ میں نے از راہ تواضع کہہ دیا کہ قابلیت اور تجربے کے لحاظ سے تو بہت مناسب ہوگا۔ اس پر سرجان نے میری طرف دیکھا اور کہا لیکن تم تو سر سیموئیل ہور کے تقرر کے حق میں ہو۔ میں نے کہا میرا یہ منصب نہیں کہ میں وائسرائے کے انتخاب میں دخل دوں واشنگٹن میں لارڈ ہیلی فیکس نے مجھ سے سر سیموئیل ہور کے متعلق ذکر کیا تھا۔ مجھے اُنکی رائے سے اتفاق تھا کہ سر سیموئیل ہور نے بطور وزیر ہند گول میز کانفرنس اور پارلیمنٹری منسٹر کمیٹی میں جس محنت اور تدبر سے کام کیا تھا اس کے مدنظر ان کا انتخاب بطور وائسرائے ہند موزوں ہوگا۔ لارڈ ہیلی فیکس نے خواہش کی تھی کہ میں اس رائے کا اظہار وزیراعظم سے کر دوں وہ میں نے کر دیا۔ اس پر سرجان خاموش ہو گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جو اصحاب اتنے بڑے مناصب پر فائز ہوتے ہیں وہ بھی ذاتی معاملے میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے لگ جاتے ہیں۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ سرجان کو وائسرائے کے منصب پر تقرر کی خواہش ہو۔ وہ بنگال کے گورنر رہ چکے تھے، ہوم سروس میں ان کا ریکارڈ بہت اچھا تھا، مسلّم قابلیت کے مالک تھے، اور حکومت میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ وزیراعظم کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے

لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ میرے وزیر اعظم کے ساتھ اس سلسلے میں سر سیموئیل ہور کا ذکر کرنے کا انہوں نے اثر لیا۔ کچھ عرصہ بعد جب وزیر اعظم چرچل امریکہ گئے تو لارڈ ویول بطور مشیر فوجی ان کے ہمراہ گئے۔ اس سفر کے دوران میں وزیر اعظم نے لارڈ ویول کے متعلق نہایت اچھی رائے قائم کی اور لارڈ لنلتھگو کی جانشینی کے لئے ان کا انتخاب کر لیا۔ سر سیموئیل ہور جب میڈرڈ میں اپنی سفارت کا زمانہ ختم کرکے انگلستان واپس آئے تو انہیں ان کی اس خدمت کے صلے میں کہ انہوں نے جنرل فرینکو کو جنگ میں غیر جانبدار رکھنے میں کامیابی حاصل کی تھی وائی کونٹ بنا دیا گیا اور وہ لارڈ ٹمپل وڈ کے نام سے دارالامراء کے رکن ہوئے جولائی ۱۹۴۷ء میں مجھے انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ بہت تپاک سے پیش آئے اپنی تصنیف "NINE TROUBLED YEARS" کا ایک نسخہ مجھے مرحمت فرمایا۔ ہندوستان کے آئینی مسائل ہی زیادہ تر گفتگو کا موضوع رہے۔ میں نے وائسرائے کے تقرر کے متعلق مسٹر چرچل کے ساتھ اپنی گفتگو کا ذکر کیا۔ فرمایا ہندوستان میں وفاقی دستور کے نفاذ کے رستے میں بڑی روک کانگرس نہیں تھی بلکہ ہندوستانی فرمانروایان تھے۔ یہ ان کی بڑی کوتاہ اندیشی تھی۔ اگر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مطابق مرکز میں وفاقی دستور کا نفاذ ہو جاتا تو ایک لمبے عرصے کیلئے ان کے اور مسلمانوں کے حقوق کی خاطر خواہ حفاظت ہو جاتی۔ اب تقسیم ملک کے نتیجے میں پاکستان میں تو مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت ہو جائے گی لیکن فرمانروا طبقہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اگر ۱۹۴۳ء میں چرچل مجھے بطور وائسرائے بھیج دیتے تو میرا اندازہ ہے کہ میں اس وقت بھی وفاقی دستور کو نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ فرمانروایانِ ریاست کو رضامند کر لینا کچھ مشکل نہ ہوتا نظام کو ہز میجسٹی کا خطاب دیدینے میں کوئی روک نہیں تھی اور وہ اس پر مطمئن ہو جاتے۔ مہاراجہ بڑودہ کی سلامی کی توپوں میں اضافہ کر دیا جاتا۔ فرمانروا طبقہ نے وفاقی دستور کے نفاذ میں روک بن کر اپنی خودکشی کا سامان خود مہیا کر لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ممکن ہے تاریخ کا رخ بدل جاتا۔

جنگ کے دوران برطانیہ میں آسکر برنلر کی نظر بندی

لارڈ لٹن سے میری ایک عرصے سے واقفیت تھی۔ ان کے خاندان کا ہندوستان کے ساتھ لمبے عرصے تک تعلق رہا۔ ان کے والد ہندوستان کے وائسرائے رہ چکے تھے۔ ان کی پیدائش اسی زمانے میں شملے میں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ خود بنگال کے گورنر ہوئے اور چند مہینوں کے لئے قائمقام وائسرائے بھی ہوئے۔ چند سال پیشتر ان کی ملاقات آسکر سے ہوئی اور دونوں میں گہرا دوستانہ ہو گیا۔ شروع جنگ میں آسکر پر سوائے وقتاً فوقتاً پولیس میں رپورٹ کرنے کے اور کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی تھی۔ لیکن جب مئی ۱۹۴۰ء میں جرمن افواج نے پیش قدمی شروع کی اور فرانسیسی سپاہ نے مقابلے کی تاب نہ لاکر ہتھیار ڈال دیئے تو برطانیہ کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ اور ہر قسم کی احتیاط لازم ہوگئی انہی ایام میں تمام غیر ملکیوں کو جو اتحادی ممالک کے باشندے نہیں تھے۔ زیر حراست لے لیا گیا۔ آسکر ان دنوں جرمن شہری تو نہیں تھے لیکن ابھی برطانوی شہری بھی نہ ہو پائے تھے۔ وہ لیگ آف نیشنز کا

حفاظتی پاسپورٹ رکھتے تھے لیکن چونکہ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کی طرف سے جنگ میں شامل رہے تھے اسلئے
انہیں اس مرحلے پر آزاد بھی چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بھی حراست میں لے لئے گئے۔ اوّل اوّل تو انہیں
لورپول کے قریب ایک عارضی کیمپ میں رکھا گیا۔ لیکن پھر وہ آئل آف مین میں ایک متقل کیمپ میں منتقل کر
دیئے گئے۔ میرے لندن پہنچنے کے چند دن بعد ہی لارڈ لٹن مجھے ملنے کیلئے تشریف لائے اور فرمایا میں تمہیں
آسکر کے معاملے کے متعلق کچھ تفاصیل بتانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا جب مئی جون ۱۹۴۰ء میں غیر ملکیوں
کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ذمے غیر ملکیوں کے حالات معلوم کر کے ان
کے متعلق سفارش کرنے کا فرض عائد کیا گیا کہ ہر فرد کے متعلق کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ مجھے مرکزی کمیٹی
کا صدر مقرر کیا گیا کمیٹی کی سفارش پر فیصلہ کرنے کا اختیار وزیر داخلہ کو تھا۔ جو ان دنوں مسٹر ہربرٹ مارسن تھے
آسکر کے متعلق اس کمیٹی کی سفارش تھی کہ یہ شخص ۱۹۲۴ء سے انگلستان میں سکونت پذیر ہے نہایت پر امن شہری ہے
اعلیٰ درجے کا سائنسدان ہے، اس کی سائنٹفک تحقیقات سے بہتوں کو فائدہ پہنچا ہے اور مزید فائدہ پہنچنے کی
امید ہے۔ سیاست میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ نازی پارٹی کے ساتھ اس کا کبھی کسی قسم کا تعلق نہیں رہا لندن
کے علمی طبقے میں اس کے بہت سے دوست ہیں جو اسے ذاتی طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ کمیٹی کے صدر اس
کے ذاتی دوست ہیں۔ کمیٹی کو پورا اطمینان ہے کہ پولیس کو مطلع کرتے رہنے کی پابندی کے ماتحت انہیں رہا کر دینے
کے راستے میں کوئی روک نہیں۔ میری کمیٹی کی سفارش وزارت داخلہ کو بھیج دی گئی۔ مجھے قوی امید تھی کہ جونہی ابتدائی افراتفری
ختم ہو کر باقاعدہ کارروائی شروع ہو گی تو یہ سفارش وزیر داخلہ منظور کر لیں گے۔ مناسب انتظار کے بعد میں نے معلوم کرنے کی
کوشش کی کہ معاملہ کس مرحلے پر ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ معاملہ وزیر داخلہ کے زیر غور ہے۔ چنانچہ میں مسٹر مارسن سے ملا اور دریافت
کیا کہ ان کے نزدیک کونسا امر غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا۔ مجھے اطمینان نہیں۔ ایسا شخص بہت خطرے کا موجب ہو سکتا ہے۔ میں
مزید غور کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں ہر طرح سے اطمینان دلانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے ٹالتے رہے۔ اس کے بعد میں دو
تین مرتبہ انہیں ملا۔ لیکن ان کی طرف سے انکار ہوا اور پھر انکار پر اصرار اور اس میں شدت بڑھ گئی۔ آخر مجھے یہاں تک کہنا پڑا کہ
پریوی کونسلر کی حیثیت سے مجھے بادشاہ تک براہ راست رسائی کا حق ہے۔ میں یہ معاملہ ملک معظم کے نوٹس میں لانا چاہونگا
کہ وزیر داخلہ ایک پریوی کونسلر کی ذاتی شہادت پر جو متعلقہ کمیٹی کا صدر بھی ہے اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس کا جواب انہوں
نے یہ دیا میں تمہیں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے نہیں روکتا۔ لیکن تم خوب جانتے ہو کہ بادشاہ کو ایسے امور میں کوئی
اختیار نہیں۔ رہی اعتماد اور اطمینان کی بات سو میں صاف صاف تم سے کہہ دیتا ہوں کہ جو امور تمہارے اطمینان کا موجب ہیں
وہی مجھے پریشان کرتے ہیں۔ یہ شخص جرمن نژاد ہے۔ پہلی جنگ میں جرمنی کی طرف سے لڑتا رہا اور آہنی صلیب کا تمغہ حاصل کیا۔
اس سے بڑھ کر "KNIGHT OF HOHENZOLTERN" بنایا گیا۔ یہاں اس کے تعلقات سب امراء کے ساتھ

ہیں۔ مجھے خود امراء پر اعتماد نہیں۔ جتنا تم اس کی حمایت میں زور دیتے ہو اتنا میرا شک مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ کہ یہ شخص خطرناک ہے۔ میں تمہاری سفارش ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ اس کے بعد میرے لئے کوئی چارہ نہ رہا سوائے اس کے کہ میں کمیٹی اور اسکی صدارت سے استعفےٰ دیدیتا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سے بیچارے آسکر کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ لیکن میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میں تمہیں ملنے کے لئے زیادہ تر اس خیال سے آیا ہوں کہ تمہیں اطمینان ہو جائے کہ مجھ سے جو کوشش ہو سکتی تھی میں نے کی افسوس کہ میری کوشش کارگر نہ ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ یہ وضاحت نہ بھی فرماتے تب بھی مجھے پورا اطمینان رہتا کہ آپ کی طرف سے کوئی کمی نہیں رہی ہوگی۔ آپ سے ملنے کا تو مجھے کبھی کبھی اتفاق ہوا ہے۔ لیکن آسکر سے متواتر آپ کے متعلق سنتا رہا ہوں۔ اور جب بھی ہم تینوں اکٹھے ملتے رہے ہیں۔ میں آسکر کے ساتھ آپکے مخلصانہ تعلقات کا شاہد رہا ہوں۔ میں آسکر سے ملنے کیلئے آئیل آف مین جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر موقعہ ہوا تو میں ان سے یہ ذکر ضرور کر دوں گا کہ آپ نے ان کیلئے سہولت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ فرمایا مجھے یہ سنکر بہت اطمینان ہوا ہے کہ تم آسکر سے ملنے کیلئے جانے والے ہو۔ تم سے مل کر اسے بہت خوشی ہوگی۔ میری طرف سے جسقدر مناسب سمجھو اسے کہدینا۔ خدا کرے کہ وزارت داخلہ تمہارے رستے میں کوئی روک پیدا نہ کرے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وزارت داخلہ ضرور اجازت دیدے گی۔

آسکر کی نظربندی کے دوران ان سے ملاقات | آئیل آف مین جانے کی اجازت حاصل کرنے کیلئے میں نے انڈیا آفس کے ذریعے وزارت داخلہ کو کہلوایا۔ وہاں سے انڈیا آفس کو جواب ملا کہ ڈاکٹر آسکر برنبلہ کی اس مہینے کی ملاقاتوں کی منظور شدہ تعداد پوری ہو چکی ہے لیکن وزارت داخلہ نے خاص اجازت نامہ جاری کر دیا ہے جو بھیجا جا رہا ہے۔ سر ظفراللہ جب سفر کا پروگرام طے کر لیں ہمیں اطلاع کر دیں تاکہ ہم کیمپ کے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دے سکیں۔ وہ ڈگلس میں سر ظفراللہ کو مل جائیں گے اور انکی سہولت کے مطابق ملاقات کا انتظام کر دیں گے۔ فجزاہ اللہ۔ میں نے آئیل آف مین جانے کے قصد کا ذکر لیڈی اینڈرسن سے کیا وہ اس پروگرام میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں۔ ان کے لئے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ جنگ کے دوران میں ایک شخص کئی بندشوں کے باوجود سخت سردی کے موسم میں لندن سے آئیل آف مین کے سفر کا محض اسلئے متمنی ہے کہ اس کا ایک جرمن دوست وہاں غیر ملکی کیمپ میں نظربند ہے اور وہ اس کی ملاقات کا آرزومند ہے۔ بار بار مجھ سے کہتیں کیا تمہیں سفر کی دقتوں کا اندازہ ہے؟ ریلوں میں کھانا نہیں ملتا۔ شدید سردی کا سامنا ہوتا ہے۔ روشنی نہیں ہوتی۔ پھر جہاز کے سفر میں اور بھی دقتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ پھر تمہاری ملاقات اس قدر زحمت برداشت کرنے کے بعد گھنٹہ بھر کیلئے ہوگی تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ میں نے عرض کیا میں سفر کی دقتوں کا خوب اندازہ کر سکتا ہوں۔ آخر دلی سے کراچی، قاہرہ، خرطوم، جوبا، سٹینلے وِل، لیوپولڈ وِل، لیگوس، عقرہ، نیٹل (برازیل) جارج ٹاؤن (گائینا) میامی، نیویارک، مونٹ ریال، گینڈر، گلاسگو ہوتے ہوئے بفضل اللہ بخیریت لندن پہنچ گیا ہوں لندن سے فلیٹ وڈ ریل پر اور وہاں سے ڈگلس جہاز پر پہنچنا کیا مشکل ہے؟ مجھے حاصل یہ ہوگا کہ میں سوا تین سال کے بعد ایک عزیز دوست سے ملوں گا اور میرے دوست کو اس احساس سے خوشی ہوگی

کہ میں اسے بھولا نہیں۔ اس پر فرمایا میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ تم عجیب آدمی ہو۔ میں تمہاری واپسی پر سفر کے حالات اور ملاقات کی کیفیت سننے کی مشتاق ہوں گی۔ میں نے کہا میں ضرور حاضر خدمت ہو کر گذارش کر دوں گا۔ انشاء اللہ۔

لندن سے فلیٹ وڈ کا سفر بذریعہ ریل دن کے دوران میں مطابق پروگرام طے ہو گیا۔ لیکن جس جہاز سے ہم نے فلیٹ وڈ سے ڈگلس جانا تھا اسے فلیٹ وڈ پہنچنے میں تین چار گھنٹے کی دیر ہو گئی۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ جہاز کو تیل حاصل کرنے میں مشکل پیش آئی۔ اور دو تین قریب کے بندرگاہوں کے درمیان گھومنا پڑا۔ جب جہاز فلیٹ وڈ پہنچا تو مسافر سوار کرلئے گئے۔ لیکن اس عرصے میں جوار بھاٹے کا بہاؤ سمندر کی سمت ہو چکا تھا۔ اور پانی اس سرعت سے سمٹ رہا تھا کہ جہاز کا حرکت کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کے اندر پانی جہاز کے نیچے سے بالکل نکل گیا اور جہاز زمین پر کھڑا رہ گیا۔ شہر کے لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر یہ تماشا دیکھنے آ گئے۔ ان میں سے بعض نے جہاز کے گرد حلقہ لگا ناشروع کر دیا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں شام کے کھانے کے وقت ڈگلس پہنچنا چاہیئے تھا۔ لیکن اب نصف شب سے قبل روانہ ہونا ممکن نہ تھا۔ جہاز پر مسافروں کے لئے باقاعدہ کھانے کا انتظام تو نہیں تھا لیکن چائے اور سینڈوچز میسر تھیں اور حالات کے لحاظ سے یہی نعمت غیر مترقبہ تھیں۔ سونے کے کمرے تو تھے نہیں لیکن کپتان نے کمال نوازش سے میرے لئے دو کمبل مہیا کر دیئے اور میں سموکنگ سیلون کے صوفے پر سو گیا۔ نصف شب کے قریب فلیٹ وڈ سے روانہ ہو کر جہاز تین گھنٹے بعد ڈگلس پہنچا۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ آنکھ کھلنے پر معلوم ہوا کہ غیر ملکیوں کے کیمپ کے سپرنٹنڈنٹ صاحب ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہاں سے قریب ہی تمہارے لئے ہوٹل میں کمرے کا انتظام ہے۔ میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں کیمپ یہاں سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ میں صبح ناشتے کے بعد ہوٹل میں آ جاؤں گا اور تمہیں کیمپ لے چلوں گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری خاطر اسقدر زحمت گوارہ کی اور جہاز کے بے وقت پہنچنے کی وجہ سے ان کے رات کے آرام میں بھی خلل ہوا۔ ہوٹل کا کمرہ بہت آرام دہ تھا انگیٹھی جل رہی تھی۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہدیا کہ میں ناشتے سے فارغ ہو کر نو بجے تک تیار ہو جاؤں گا۔ ناشتے پر معلوم ہوا کہ ۱۹۱۹ء کے امرتسر مارشل لاء کے ناظم کرنل جانسن اسی ہوٹل میں مقیم ہیں لیکن شدید بیمار ہیں۔ اور چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ چنانچہ اسی دن رحلت کر گئے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب عین وقت پر تشریف لائے۔ اور اپنی کار میں مجھے کیمپ لے گئے انہوں نے اپنے دفتر کے کمرے ہی میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا ہوا تھا۔ کمرہ بہت فراخ تھا۔ اور وہ اس کی ایک جانب اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے بتا دیا کہ کمرے کے جس حصے میں آپ اور بیبی ہوں گے وہاں ہمارے قریب ہی ایک افسر موجود رہے گا کیونکہ قواعد کی رو سے یہ ضروری ہے لیکن وہ اپنی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گا۔ اسے ہماری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ نیز امید ہے اس کی موجودگی تمہارے لئے دقت کا موجب نہیں ہو گی۔ میری طرف سے تمہاری ملاقات کے وقت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ تم جب تک چاہو ٹھہر سکتے ہو اور جو بات چیت چاہو آزادی سے کر سکتے ہو۔ میں نے پھر انکی

نوازش کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں آسکر اپنے نگران افسر کی معیت میں آگئے۔ اور ہم باتیں کرنے لگے جلد ہی قہوہ اور کیک مہیا کر دیئے گئے۔ آسکر شکل سے اچھی صحت میں معلوم ہوتے تھے انہوں نے بتایا کہ لورپول کے قریب عارضی کیمپ میں چونکہ انتظام بہت جلدی میں کیا گیا تھا اسلئے آرام دہ نہیں تھا لیکن ڈگلس کے کیمپ میں حالات تکلیف دہ نہیں۔ سب ضروریات مہیا ہیں۔ میں نے لارڈ لٹن کا پیغام انہیں دیدیا۔ ہماری گفتگو زیادہ تر ذاتی امور کے متعلق رہی میں قریب دو گھنٹے ٹھہرا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہوٹل تک میرے ساتھ آنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن میں نے با اصرار ان سے رخصت حاصل کی اور ان کی کار میں ہوٹل واپس آگیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے پھر انکی پیہم نوازش کا شکریہ ادا کیا۔ لندن واپسی کا سفر مطابق پروگرام سہولت سے طے ہو گیا۔ فالحمدللہ۔

ڈاکٹر آسکر برنلر سے میرے گہرے دوستانہ مراسم انگلستان میں میری طالب علمی کے زمانے سے تھے پہلی عالمی جنگ کے بعد ۱۹۲۴ء میں میرے یورپ کے سفر کی ایک غرض ان سے ملاقات بھی تھی۔ جب میں ۱۹۲۷ء میں انگلستان گیا تو وہ ترک وطن کر کے لندن میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ اس قیام کے دوران میں بھی میرا ان کا ہر وقت کا ساتھ رہا۔ میرے ذریعے میرے عزیز احباب سید انعام اللہ شاہ صاحب، چوہدری بشیر احمد صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب سے ان کا غائبانہ تعارف تو اس حد تک ہو چکا تھا کہ گویا بالمشافہ رابطہ ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب سید انعام اللہ شاہ صاحب انگلستان گئے تو ان سے بھی دوستانہ میل جول ہو گیا۔ بعد میں انہیں ہندوستان آنے کے مواقع بھی ملنے لگے اور چوہدری بشیر احمد صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب سے بھی ذاتی محبانہ مراسم ہو گئے۔ وہ جب ہندوستان آتے میرے ہاں قیام فرماتے۔ جب پہلی بار تشریف لائے تو میں نے ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ قابل دید مقامات کی سیر کرائی۔ جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر وہ ہمارے ساتھ قادیان بھی تشریف لے گئے بعد میں کہا کرتے تھے میری طبیعت پر سب سے گہرا اثر قادیان میں جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسہ کا ہے جو دنیا بھر میں ایک نرالا اجتماع ہے۔ وہاں مجھے ہر چہرے پر حقیقی طمانیت اور بشاشت نظر آئی۔ جونہی ایک بھائی کی دوسرے بھائی پر نظر پڑتی دونوں کے چہرے حقیقی خوشی سے کھل جاتے۔ ڈاکٹر برنلر طب کے ڈاکٹر نہ تھے وہ سائنس کے ڈاکٹر تھے لیکن علم الابدان میں انہیں بڑی دسترس تھی۔ بجلی اور روشنی کے اثرات کے ماہر تھے اور ان کے ذریعے بعض امراض کا علاج بھی کرتے تھے۔ انہیں انسانی اعضائے رئیسہ کی RADIATION معلوم کرنے کی بڑی مہارت تھی اور اس کے ذریعے وہ انسان کی صحت کی کیفیت بغیر کسی غلطی کے امکان کے چند لمحوں میں معلوم کر لیتے تھے اور مریض سے ایک بھی سوال کئے بغیر مرض کی پوری کیفیت بتا دیتے تھے۔ ہم نے ہر طرح سے انکی تشخیص کا امتحان کیا اور کبھی حقیقت سے تفاوت نہ پایا۔ علم طبعیات کے مشہور عالم ماہر سر سی، وی، رامن سے میرے گہرے مراسم تھے۔ میں جب کبھی بنگلور جاتا وہ ایک شام میرے ساتھ گزارتے میں آسکر کے ساتھ بنگلور گیا تو سر سی، وی، رامن نے آسکر سے ملاقات کے بعد انہیں اپنی انسٹی ٹیوٹ میں مدعو

کیا اور ان کے درمیان مفصل گفتگو ہوئی۔ بعد میں انہوں نے مجھ سے فرمایا مجھے ڈاکٹر ہزلمر کے نظریات قبول کرنے میں تو بہت تامل ہے لیکن اس شخص کے پاس کوئی ایسا علم ضرور ہے جس کی تحقیق ہونی چاہیئے۔

آسکر ۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں نظر بند کئے گئے تھے لیکن دو سال بعد رہا کر دیئے گئے تھے۔ رہائی کے بعد انہوں نے پھر لندن میں رہائش کا انتظام کر لیا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوتا میں انہیں کے ہاں قیام کرتا سائنٹفک تحقیقات کی دھن انہیں آخر کار امریکہ لے گئی۔ انہوں نے لاس انجلیز میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کے اجلاس کے لئے امریکہ گیا تو ان سے ملنے لاس انجلیز بھی گیا پھر ۱۹۵۱ء میں جب میں جاپانی صلح نامے کی کانفرنس میں شمولیت کیلئے سان فرانسسکو گیا تو وہاں مجھے ملنے کیلئے آئے اور کانفرنس کے اختتام پر اصرار سے اپنے ساتھ دو تین دن کیلئے RED WOODS کی سیر کیلئے لے گئے۔ بجلی کی بعض شعاؤں کی تحقیقات کے دوران میں ایک دن انہیں بجلی کا سخت جھٹکا لگا جس کی وجہ سے ایک لمبا عرصہ بیمار رہے۔ بعد میں مجھے لکھا کہ اب تقریباً صحت یاب ہو چکا ہوں اور آرام اور بحالی صحت کیلئے سینٹا باربرا آیا ہوا ہوں لیکن کچھ دنوں بعد اطلاع ملی کہ دفعتہً کمزوری عود کر آئی اور جان بحق تسلیم کی۔ وہ اپنی ذاتی خوبیوں اور اعلیٰ اخلاق کے باعث ایک نہایت ہی قابل قدر انسان تھے اور میرے نہایت باوفا مشفق دوست اور بھائی تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ وافر رحمت اور غفران کا سلوک فرمائے آمین۔

دل بدرد آید ز ہجر ایں چنیں یکرنگ دوست

لیک خوشنودیم بر فعل خداوند کریم

فلسطین کے سلسلہ میں لارڈ لٹن کی مجھ سے آزردگی

جب دو سال بعد آسکر رہا ہو کر آ گئے تو لارڈ لٹن سے پھر ملاقات کا اتفاق ہوا اور ہم تینوں نے کچھ وقت اکٹھے گذارا۔ اس کے دو تین سال بعد ایک موقعہ پر لارڈ لٹن کو مجھ سے دوستانہ شکوہ بھی ہوا لیکن وہ معاملہ آسکر کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ قضیہ فلسطین سے متعلق تھا۔ لارڈ لٹن فلسطین فوسیفٹ کمپنی کے صدر تھے۔ انہیں طبعاً فلسطین کے حالات میں گہری دلچسپی تھی ایک مرتبہ جب میں انگلستان میں تھا تو ان کی ایک تقریر چیتھم ہاؤس میں رائیل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کی سرپرستی میں فلسطین کے موضوع پر ہوئی۔ انہوں نے اپنی معلومات کی بنا پر تقریر میں امید ظاہر کی کہ صیہونیوں اور عربوں کے درمیان سمجھوتے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور اپنی طرف سے سمجھوتے کا ایک خاکہ بھی پیش کیا۔ ان کی تقریر کے بعد میں نے بھی کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ فلسطین کے حالات کے مطالعہ کے نتیجے میں میرا تاثر تھا کہ صیہونی اپنی طاقت کو بڑی سرعت سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ کسی ایسے سمجھوتے پر تیار نہیں ہوں گے جس کے نتیجے میں فلسطینی عربوں کے حقوق کی کماحقہٗ حفاظت ہو سکے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنے تاثر کا اظہار کیا۔ عیسائی مذہب میں میاں بیوی

کی علیحدگی بذریعہ طلاق کے خلاف حضرت مسیحؑ کا ایک مقولہ بیان کیا جاتا ہے :۔

"THOSE WHOM GOD / HAS JOINED TOGETHER LET NO MAN PUT ASUNDER"

میں نے اس مقولے کے الفاظ میں تبدیلی کرکے کہا۔ فلسطین میں جو صورت پیدا ہوگئی ہے اس کا صحیح نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے :۔

"THOSE WHOM GOD HAS PUT ASUNDER LET NO MAN JOIN TOGETHER"

میرا یہ کہنا تھا کہ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا اور اس موضوع پر سنجیدہ بحث کا امکان ہی نہ رہا۔ میٹنگ کے بعد لارڈ ڈلٹن نے آزردگی کے لہجے میں مجھ سے کہا تم نے اس مقولہ کے الفاظ کو بدل کر میری تقریر کا سارا اثر زائل کر دیا اور میری محنت ضائع ہوگئی۔ لیکن میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس واقعہ پر تقریباً پچیس سال گذر چکے ہیں لیکن ابتک سمجھوتے کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ جنگ ہو چکی ہے اور اندیشہ ہے کہ پھر جنگ کی صورت پیدا ہوگی۔

سر مارلیس گوائر چیف جسٹس ہندوستان کی جگہ سر پیٹرک سپنز کا تقرر

میں جنوری کے پہلے ہفتہ میں لندن پہنچا تھا۔ اسی دوران میں اعلان ہوا کہ ہندوستان کے چیف جسٹس سر مارلیس گوائر کی میعاد ختم ہونے پر ان کی جگہ سر پیٹرک سپنز کا تقرر ہوا ہے۔ میرا خیال تھا کہ سر مارلیس کے بعد میرے سینئر رفیق سر سرینواس وردا چاری چیف جسٹس ہوں گے۔ وہ ایک قابل جج اور فاضل قانون دان تھے۔ طبیعت کے نہایت شریف اور مزاج کے دھیمے تھے اور ہر لحاظ سے اس قابل تھے کہ انہیں ہندوستان کا پہلا ہندوستانی چیف جسٹس ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا۔ یہ بھی ایک موقعہ تھا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک قدم بڑھائے اور ہندوستان کا چیف جسٹس ایک ہندوستانی کو مقرر کرے۔ مجھے اس بات پر بھی کچھ حیرت ہوئی کہ سر مارلیس گوائر نے جو ان امور میں ہندوستان کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہیں کیوں یہ مشورہ نہ دیا کہ سر سرینواس ان کے جانشین ہوں۔ میں نے سر جیمز گرگ سے کہا۔ سر مارلیس گوائر دماغی لحاظ سے بڑے پایہ کے انسان ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنا میرے لئے فخر کا موجب ہے۔ میں نے بہت کچھ ان سے سیکھا ہے۔ سر پیٹرک سپنز کو میں نہیں جانتا۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟ فرمایا جانتا ہوں۔ میں نے دریافت کیا کس پایہ کے انسان ہیں؟ کہا پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ بیرسٹر ہیں، وزیر ہند کے دوست ہیں اور بس۔ میں نے پوچھا ان کا انتخاب کیسے ہوگیا؟ کہنے لگے میں نے کہا جو ہے امیری کے دوست ہیں! میرے دلی پہنچنے پر سر مارلیس گوائر نے مجھ سے کہا میری جانشینی کے اعلان پر تمہیں صدمہ ہوا ہوگا؟ میں نے کہا بیشک مجھے تو پوری امید تھی کہ آپ جج وردا چاری کے تقرر پر زور دیں گے اور آپکی سفارش ضرور مانی جائے گی۔ فرمایا لیکن مجھ سے تو کسی نے پوچھا ہی نہیں میں منتظر تھا کہ جب مجھ

سے دریافت کیا جائے گا تو میں بڑے زور سے اپنی رائے ظاہر کردوں گا۔ لیکن یہ نوبت ہی نہیں آئی۔ میں نے تو دو سال قبل سر شاہ سلیمان کی وفات پر تہیہ کر لیا تھا کہ اُن کی جگہ تمہارا تقرر ہو اور پھر وقت آنے پر تم میری جگہ لو۔ اسی لئے میں وائسرائے کے ساتھ مصر تھا کہ میں سر شاہ سلیمان کی جگہ تمہارے سوائے کسی اور کی سفارش نہیں کروں گا۔ میں نے کہا یہ آپ کی نوازش ہے لیکن جج وردا چاریہ کی موجودگی میں مجھے تو یہ توقع نہیں تھی کہ مجھے مقرر کیا جائے گا۔ لیکن اس بات سے مجھے ضرور صدمہ ہوا کہ ایک ہندوستانی کو چیف جسٹس نہیں کیا گیا۔

ہندوستان واپسی کا سفر | لندن سے ہندوستان واپسی کا سفر ۵ مارچ کو شروع ہوا۔ سر عزیز الحق اور سر جان کولول جن کا سر د جر ملبے کی جگہ بمبئی کی گورنری پر تقرر ہوا تھا میرے ہمسفر تھے۔ سر عزیز الحق رخصت پر وطن جا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا تقرر بطور وزیر تجارت وائسرائے کی کونسل میں طے ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا۔ ہم تینوں کو پونگ ہوائی کشتی میں جو واحد الگ کمرہ تھا دیدیا گیا۔ اور ہمارا سفر اس میں بہت آرام سے کٹا۔ پہلے دن ہم لندن سے ریل پر گئے اور وہاں سے ہوائی کشتی پر شینن پہنچے۔ ان دنوں ابھی شینن میں الاقوامی مطار نہیں بنا تھا۔ لیکن دریا پر ہوائی کشتیوں کے اترنے اور روانہ ہونے کا انتظام تھا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہوائی کشتی کے کسی انجن میں خفیف سا نقص ہے قریب ترین ہوٹل سولہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں ادیر میں تھا۔ مسافروں کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ ہم شام کے کھانے سے فارغ ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہوائی کشتی اس رات روانہ نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ ہوٹل میں ہمیں کمرے دیدیئے گئے۔ اور ہم نے آرام سے رات وہیں بسر کی ہوٹل صاف ستھرا تھا اور کھانا با افراط تھا۔ کوئی بندش نہیں تھی۔ ہوٹل، گاؤں اور اردگرد کی اراضیات ارل آف ڈنریون کی ملکیت تھے۔ انہی کے نام پر ہوٹل کا نام ڈنریون آرمز تھا۔ ان کا محل اور پارک گاؤں کے وسط میں ہوٹل کے قریب ہی تھے۔ جنگی ضوابط کے مطابق شینن سے لزبن تک ہماری کشتی کا سفر رات کے وقت ہونا لازم تھا۔ اسلئے دن بھر ہمیں آدیر ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ البتہ لارڈ ڈنریون نے کمال نوازش سے ہم تینوں کو چائے پر بلایا۔ شام ہوئی تو کھانے کے بعد ہم کوچ میں سوار ہو کر شینن چلے گئے۔ توقع تھی کہ ہمارے پہنچنے تک ہوائی کشتی پرواز کیلئے تیار ہو گی۔ لیکن وہاں پہنچنے پر یہ توقع بر نہ آئی اور ہم پھر ادیر واپس چلے گئے۔ ہمیں کوچ سے اترتے دیکھ کر ہوٹل کی لیڈی مینجر مسکرائیں۔ اور کہا میں؟ واپس؟ اچھا تو وہی کمرے۔ چنانچہ ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ آئرلینڈ جنگ میں غیر جانبدار تھا چنانچہ جنگ کے دوران میں جرمن سفیر ڈبلن میں موجود تھا۔ کھانے پر بندش نہ ہونے کی تو توقع ہی تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انگلستان کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کرنے پر بھی کوئی پابندی نہ تھی ہماری کشتی کے مسافروں کو چونکہ پیدل چلنے اور تاش کھیلنے کے علاوہ کوئی اور شغل میسر نہ تھا اسلئے وہ باری باری لندن کے ساتھ ٹیلیفون پر گفتگو کا سلسلہ متواتر جاری رکھتے تھے اور جہاں تک میں اندازہ کر سکتا تھا یہ گفتگو بالکل آزادانہ بلا روک ٹوک ہوتی تھی۔ دوسرے دن ہم پھر شام کے کھانے کے بعد کوچ پر شینن گئے۔ اور پھر واپس لوٹائے گئے۔ ہمارا بار بار ہوٹل واپس آنا اور مینجر کا "وہی کمرے" کے الفاظ

کیساتھ ہمارا خیر مقدم کرنا ایک مذاق بن گیا ۔ تیسرے دن کی سہ پہر کو ہم نے گاؤں کی واحد ٹیکسی کرایہ پر لی اور ہم قریب ترین شہر لیمیرک کی سیر کو چلے گئے ۔ میں پہلے ایک مرتبہ لیمیرک جا چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہاں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں ۔ لیکن وقت کاٹنے کیلئے یہ بھی غنیمت تھا کہ ٹیکسی میسر تھی ۔ شہر سے گذرتے ہوئے ڈرائیور نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا یہاں ہماری ہوائی حملے سے حفاظت والی کوٹھڑیاں ہیں ۔ میں نے ذرا حیرت کے لہجے میں دریافت کیا تمہیں کس طرف سے خطرہ ہے ؟ ڈرائیور نے فوراً پوری سنجیدگی سے کہا "دونوں طرف سے" ! اس پر سر عزیز الحق اور سر جان کھلکھلا کر ہنس دیئے ۔ ہماری دوپہر کی سیر کا سب سے دلچسپ لحظہ یہ تھا ۔ واپسی پر جب ہم ادیر کے قریب پہنچ رہے تھے تو ڈرائیور نے دائیں جانب ایک فارم کی طرف اشارہ کرکے کہا یہاں شاہ انگلستان کا بھی ایک گھوڑا پل رہا ہے ۔ اس شام جب ہم شینن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اب کشتی روانہ ہونے کو تیار ہے ۔ چنانچہ ہم سوار ہوگئے ۔ دس بجے روانہ ہوکر ایک بجے کے قریب لزبن پہنچے ۔ شہر میں ایک بلند مقام پر ایک ہوٹل میں گئے ۔ یہاں پورے کھانے کا انتظام تھا ۔ مجھے تو اتنی جلدی دوبارہ کھانے کی اشتہا تھی نہ ہمت ۔ میرے دونوں ساتھیوں نے بھی یہی ظاہر کیا لیکن ہمارے بعض ساتھیوں خصوصاً فوجی افسروں نے جو اس وقت تک (غالباً پرتگال کی غیر جانبدارانہ حیثیت کے احترام میں) وردی نہیں پہنے ہوئے تھے اپنی ہمت کے خوب جوہر دکھائے اور جو کچھ مہیا کیا گیا تھا اس کی خوب داد دی ۔ ۴ بجے قبل فجر ہم لزبن سے روانہ ہوکر بارہ گھنٹے کی پرواز کے بعد مغربی افریقہ کے ساحل پر گیمبیا کے دارالحکومت باتھرسٹ پہنچے ہم تینوں کو گورنمنٹ ہاؤس سے وہاں آرام کرنے اور شام کے کھانے کی دعوت پہنچی ۔ جسے ہم نے شکریئے کے ساتھ قبول کیا ۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ہمیں غسل کا موقعہ بھی مل گیا ۔ گورنر صاحب خود تو دورے پر تھے ۔ کھانے پر ان کی بیگم صاحبہ نے میزبانی کے فرائض ادا کئے ۔ دس بجے شام ہم باتھرسٹ سے روانہ ہوکر بارہ گھنٹے کی مزید پرواز کے بعد لیگوس پہنچے اور گورنر جنرل صاحب کے ہاں مہمان ہوئے جہاں میں امریکہ جاتے ہوئے بھی ٹھہر چکا تھا ۔ یہاں سے آگے مواصلات کا الگ انتظام تھا ۔ اس وجہ سے ہمیں تین دن یہاں ٹھہرنا پڑا ۔

لیگوس میں جامع احمدیہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب

جماعت احمدیہ لیگوس نے مجھے جامع احمدیہ کی عمارت کا سنگ بنیاد نصب کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ۔ گورنر جنرل لورڈ بارن اور سر عزیز الحق نے بھی اس تقریب میں شرکت کی ۔ میں نے اپنی تقریر میں اسلامی روزانہ زندگی کے نظام اور معاشرتی اور ثقافتی اقدار کے استحکام کے نقطہ نگاہ سے مسجد کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ۔ تقریب سے واپسی پر سر عزیز الحق نے فرمایا ۔ ہمیں تو آج معلوم ہوا ہے کہ مسجد ہر لحاظ سے مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا مرکز ہونی چاہیئے اب تک تو ہم یہی سمجھتے رہے تھے کہ مسجد ایسے لوگوں کے لئے نماز پڑھنے کی جگہ ہے جن کے مکان فراخ نہ ہوں اور جنہیں گھر میں نماز پڑھنے میں دقت ہو ۔ البتہ جمعہ کے دن ہر مسلمان کو جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جانا چاہیئے

لیگوس سے روانہ ہوکر ہم حسب توقع پہلی رات لیوپولڈ ول ٹھہرے ۔ لیکن دوسرے دن کسی وجہ سے براہ راست سٹینلے ول جانے کی بجائے ہمیں چکر کاٹ کر الزبتھ ول جنوب کی جانب جانا پڑا ۔ یہاں ہمیں ایک ہسپتال میں ٹھہرایا گیا

چونکہ یہ ہسپتال یورپین لوگوں کیلئے بنایا گیا تھا۔ اس لئے یہاں ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ یہاں سے سٹیلیے ول اور جوبا ہوتے ہوئے ہم خرطوم پہنچے جہاں ہمارا قیام ریذیڈنسی میں ہوا۔ ہمارے میزبان سر فیڈرک ہڈلسٹن گورنر جنرل تھے۔ سر جان کولول کو یہاں سر رو بیلے کا تار ملا۔ کہ وہ جلد بمبئی پہنچنے کی کوشش کریں۔ اتنک ہوتا خیر ہو چکی تھی اس سے سر رو بیلے کا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا تھا۔ اور وہ مزید تاخیر کے امکان سے پریشان ہو رہے تھے۔ چنانچہ گورنر جنرل صاحب نے ان کیلئے ایک فوجی ہوائی جہاز کا انتظام کر دیا اور وہ دوسری صبح براستہ عدن بمبئی روانہ ہو گئے اور اسی سہ پہر کو بمبئی پہنچ گئے۔ سر عزیز الحق کو اور مجھے دو رات خرطوم ٹھہرنا پڑا۔ ہم ام درمان کا شہر دیکھنے گئے جو سوڈانی مہدی محمد احمد کا صدر مقام رہ چکا تھا۔

سوڈان کے دو ممتاز مذہبی اور سیاسی رہنماؤں سے شرف ملاقات

ان ایام میں سوڈان میں دو ممتاز مذہبی اور سیاسی رہنما تھے۔ السید میر غنی اور السید سر عبدالرحمٰن المہدی میں نے دونوں کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف ملاقات حاصل کیا۔ السید میر غنی معمر بزرگ تھے قدامت پسند اور پرانی طرز رہائش کے پابند تھے سر عبدالرحمٰن المہدی کی رہائش ایک خوشنما باغ کے اندر ایک جدید طرز کے بنگلے میں تھی وہ السید محمد احمد المہدی کے صاحبزادے تھے جو اپنے والد کی وفات کے وقت ابھی کمسن تھے۔ نئی روشنی کے تعلیم یافتہ تھے۔ انگریزی میں بخوبی گفتگو فرما لیتے تھے۔ دونوں بزرگ میرے ساتھ بہت تواضع سے پیش آئے۔ فجزاھما اللہ۔ خرطوم سے براستہ قاہرہ ہم بفضل اللہ بخیریت کراچی اور وہاں سے دلی پہنچ گئے فالحمد للہ۔ دلی پہنچ کر سر عزیز الحق کو معلوم ہو گیا کہ ان کے وزیر تجارت ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

فیڈرل کورٹ آف انڈیا

فیڈرل کورٹ کا اختیار سماعت بہت محدود تھا۔ ابتدائی تنازعات کی تو فیڈرل کورٹ میں اسی صورت میں سماعت ہو سکتی تھی جب تنازعہ دو صوبوں کے درمیان ہو یا صوبے کی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان ہو۔ صوبے کی اعلیٰ عدالتوں سے اپیل دیوانی ہو یا فوجداری اسی صورت میں فیڈرل کورٹ میں آسکتی تھی جب آئین کی تعبیر کا کوئی سوال زیر تنازعہ ہو۔ البتہ اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو پھر باقی زیر تنازعہ مسائل کے تصفیے کا بھی فیڈرل کورٹ کو اختیار تھا۔ کسی اہم قانونی سوال کے پیش آنے پر گورنر جنرل کو اختیار تھا کہ وہ عدالت سے مشاورتی رائے طلب فرمائیں۔ میں ستمبر ۱۹۴۱ء سے ۱۰ ارجون ۱۹۴۷ء تک فیڈرل کورٹ کا جج رہا۔ اس عرصے میں کوئی ابتدائی تنازعہ فیڈرل کورٹ میں پیش نہیں ہوا۔ ایک مسئلہ گورنر جنرل کی طرف سے مشاورتی رائے کیلئے آیا۔ سوال یہ تھا کہ آیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے رو سے مرکزی حکومت کو اسٹیٹ ڈیوٹی عائد کرنے کا اختیار ہے یا نہیں۔ گورنر جنرل کی طرف سے مسٹر موتی لال سیتلواڈ پیش ہوئے جو بہت قابل ایڈووکیٹ تھے۔ جو وکلاء فیڈرل کورٹ میں پیش ہوتے رہے ان میں سے میری رائے میں باستثناء سر الادی کرشنا سوامی آئیر جو صوبہ مدراس کے ایڈووکیٹ

جنرل تھے مسٹر سیتلواڈ قابل ترین ایڈووکیٹ تھے۔ بعد میں وہ آزاد ہندوستان کے اٹارنی جنرل بھی ہوئے اور اس حیثیت میں حکومت ہند کی طرف سے پرتگال بنام ہندوستان کے تنازعے میں عالمی عدالت کے روبرو بھی پیش ہوئے۔ اسٹیٹ ڈیوٹی والے مسئلے میں انہیں یہ دقت تھی کہ جس مرحلے پر ہماری رائے طلب کی گئی اس وقت تک حکومت ابھی یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ اس ٹیکس کے عاید کئے جانے کی صورت میں وصولی کا کیا طریق ہوگا۔ کیا ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ داری متوفی کی جائداد پر عاید کی جائے گی یا متوفی کے ورثاء پر۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کے مسئلے پر میرا یہ موقف تھا کہ کسی ٹیکس کی نوعیت کا فیصلہ صرف اس کے نام سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسا ہو تو مرکزی یا صوبائی حکومت جو ٹیکس چاہے عائد کردے صرف اس ٹیکس کا نام وہ رکھ لے جس کا اندراج اس کے اختیارات کی فہرست میں ہو۔ میں نے مسٹر سیتلواڈ سے دریافت کیا کہ اس ٹیکس کی وصولی کی کیا صورت ہوگی۔ انہوں نے جواب دیا یہ تفصیل ابھی تک طے نہیں کی گئی۔ میں نے جتنے سوال اس مقصد سے کئے کہ مجوزہ ٹیکس کی نوعیت کا تعین کیا جاسکے ان کا جواب انکی طرف سے یہی دیا گیا کہ یہ تفاصیل ابھی طے نہیں ہو پائیں۔ اور آخر کہا ان کے طے کرنے کا مرحلہ اس وقت آئے گا جب حکومت کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس ٹیکس کا عاید کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ میں نے کہا فیڈرل کورٹ تو گورنر جنرل کے سوال کا جواب دینے کے قابل تب ہی ہو سکے گی جب عدالت کو ان تفاصیل کے متعلق کچھ علم ہو سکے۔ کیونکہ صرف ٹیکس کے مجوزہ نام کی بناء پر کسی رائے کا اظہار ممکن نہیں۔ چنانچہ میں نے مشاورتی رائے میں شمولیت سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ جو کوائف حکومت کی طرف سے عدالت کے روبرو بیان کئے گئے ہیں ان کی بنا پر یہ تشخیص نہیں کی جاسکتی کہ اس ٹیکس کی اصل نوعیت کیا ہوگی۔ چیف جسٹس اور مسٹر جسٹس وردا چاری نے رائے دی کہ بادی النظر میں اور جہاں تک وہ اندازہ لگا سکتے ہیں مجوزہ ٹیکس مرکزی حکومت کے اختیارات میں شامل ہے۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ وہ رائے جسکی بنیاد مفروضات پر ہو، حکومت کیلئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

سر مارس گوائر چیف جسٹس آف انڈیا | صوبائی اعلیٰ عدالتوں سے جو اپیل ہمارے روبرو آتے رہے ان میں مجھے یاد نہیں کبھی سر مارس گوائر سے اختلاف رائے ہوا ہو۔ اختلاف کا امکان اسلئے بھی کم تھا کہ ایک تو وہ نہایت آزاد خیال تھے۔ حکومت کی حمایت کا کوئی شائبہ ان کی طبیعت یا ذہن میں نہیں تھا۔ دوسرے وہ ہر قسم کے نسلی تعصب سے آزاد تھے۔ ایک اپیل میں ڈیفینس آف انڈیا کے تحت وضع شدہ ایک قاعدے کے جواز کا سوال اٹھایا گیا۔ حکومت کی طرف سے سر بی ایل متر اٹارنی جنرل آف انڈیا جو پہلے حکومت ہند میں وزیر قانون رہ چکے تھے پیروی کر رہے تھے۔ بحث سننے کے بعد ہماری متفقہ رائے یہ ہوئی کہ قاعدہ زیر بحث ایکٹ کے تفویض کردہ اختیارات سے متجاوز ہے اور اس لئے قابل پذیرائی نہیں۔ سر مارس گوائر کو اس رائے پر قائم ہونے میں کسی مرحلے پر کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ایک فوجداری اپیل میں آئینی سوال کے علاوہ حکومت کے خلاف منافرت کے جذبات انگیخت کرنے کا بھی سوال تھا۔ بحث کے دوران میں

ہی سر مارس نے مجھ سے کہا کہ جب سے مجالس قوانین ساز کا انعقاد عمل میں آیا ہے حکومت کے خلاف منافرت پیدا کرنا تو حزب مخالف کا فرض منصبی ہو گیا ہے۔ مثلاً صوبجات میں اگر حزب مخالف وزارت کے خلاف منافرت پیدا کر کے مجلس کی کثرت کو یا انتخاب کے موقعہ پر رائے دہندگان کی کثرت کو وزارت کے خلاف نہ اکسادے تو وزارت کی تبدیلی کا کونسا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اب آئینی نقطہ نگاہ سے وہ وقت آگیا ہے کہ اس جرم کی تازہ تعبیر کی جائے۔ اور مناسب یہی ہے کہ ہندوستان میں بھی اب اس کی وہی تعبیر ہو جو انگلستان میں کی جاتی رہی ہے۔ یعنی اس جرم کے قائم کرنے کیلئے یہ ثابت کرنا ضروری ہو کہ جن الفاظ کو جرم کی بناء بیان کیا جاتا ہے ان سے حکومت کے خلاف محض منافرت ہی پیدا نہ ہوتی ہو بلکہ ان کے نتیجے میں نقص امن کا بھی معقول اندیشہ پیدا ہوتا ہو۔ چنانچہ عدالت کے فیصلے میں اس پہلو کی خوب وضاحت کر دی گئی۔ سر مارس جب چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ARTHRITIS کی تکلیف میں مبتلا تھے اور یہ تکلیف بڑھ رہی تھی لیکن ہندوستان میں تعلیمی سرگرمیوں کے فروغ دینے میں انہوں نے بہت دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ مرکزی تعلیمی بورڈ کے صدر تھے۔ ایک دفعہ قادیان تشریف لائے اور میرے مہمان ہوئے۔ سلسلے کے تعلیمی اداروں کو بڑے شوق سے دیکھا۔ جس بات کا انہوں نے گہرا تاثر لیا وہ یہ تھی کہ جماعت احمدیہ نے نہایت قلیل عرصے میں بغیر ایک پیسہ خرچ کرنے کے قادیان کے ہر بالغ کو نوشت و خواند سے بہرہ ور کر دیا تھا۔ قادیان کے سارے بچے تو عرصے سے مدرسہ جانے کے عادی تھے ہی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے مجھے بتایا کہ سر مارس گوائر نے قادیان سے واپسی کے بعد مرکزی تعلیمی بورڈ کے اجلاس میں جماعت کی اس کامیابی کو بہت سراہا۔ اور فرمایا اگر قادیان جیسے دور افتادہ قصبے میں رضاکارانہ طور پر یہ کامیابی بغیر کسی زائد مصرف کے حاصل کی جا سکتی ہے تو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ اسی دھن میں سر مارس نے دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب کے فرائض اپنے ذمے لئے تھے اور عدالت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی جب تک صحت نے اجازت دی وہ ان فرائض کو اعزازی طور پر لیکن بڑی سرگرمی سے ادا کرتے رہے۔ آخر جب ان کا آزار بہت تکلیف دہ ہو گیا تو لاچار انگلستان واپس چلے گئے اور ایسٹ بورن میں لب ساحل ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کی۔ میں انگلستان گیا تو انکی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ چلنے پھرنے سے عاری ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی لارڈ چانسلر کی فرمائش پر سپریم کورٹ کے قواعد کی نظر ثانی اور ترمیم کے متعلق رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ انکی سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ اب ان کی صحت انہیں متواتر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ کچھ عرصہ بعد انکی وفات کی خبر شائع ہوئی۔

سر مارس گوائر کے عدالت سے علیحدہ ہونے کے بعد مجھے متعدد بار اپنے رفقاء سے فیصلوں میں اختلاف رائے ہوا یہاں تک کہ قانونی حلقوں میں میں DISSENTING JUDGE کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب بھی میں نے اختلاف کیا میری رائے لازماً درست تھی۔ اور میرے رفقاء کی رائے صائب نہ تھی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں وہی

موقف اختیار کرتا تھا جو مجھے درست معلوم ہوتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری اختلافی رائے حکومت کے موقف کے خلاف ہوا کرتی تھی۔ مجھے حکومت کے ساتھ کوئی ضد نہ تھی۔ میں اپنی طبیعت کی افتاد اور اپنی تربیت کے لحاظ سے قانون اور امن کا ہمیشہ سختی سے پابند اور حامی رہا ہوں۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی کی رعایت منظور نہیں رہی۔ اللہ کے فضل و رحم سے جو بصیرت مجھے عطا ہوئی ہے اس کے مطابق جو موقف مجھے مطابق قانون اور قرین انصاف نظر آیا میں نے وہی اختیار کیا۔ اس میں کسی موقعہ پر بھی کسی فریق کی رعایت یا مخالفت کا ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے عدالت کا رکن ہوتے ہی اپنی عدالتی نوٹ بک کے پہلے صفحہ پر اس آیت کریمہ کا خط کشیدہ حصہ اپنے ہاتھ سے درج کر لیا تھا:-

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۰۹)

میری طبیعت میں یہ بات تو بفضل اللہ راسخ ہے کہ ایک جج کے فیصلوں پر اس کی اپنی پسند یا ناپسند کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہونا چاہیئے۔ فوجداری معاملات میں چونکہ قانوناً آخری مرحلے تک بار ثبوت استغاثے کے ذمے ہوتا ہے اسلئے جب تک میرا پورا اطمینان نہ ہو جاتا کہ استغاثہ اس بار ثبوت سے بہمہ وجوہ سبکدوش ہو چکا ہے میں الزام کو ثابت شدہ قرار نہ دیتا۔

۱۹۴۲ء کے سیاسی ہنگاموں کے بعد گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس کے ماتحت بہار اور صوبجات متحدہ میں بعض مقامات پر سپیشل ٹربیونلز (خصوصی عدالتیں) قائم کئے۔ مجسٹریٹ ضلع کو اختیار دیا گیا کہ فسادات کے سلسلہ میں جن مقدمات کو وہ چاہے سپیشل ٹربیونل کو تفویض کر دے۔ ایک فوجداری اپیل میں اس آرڈیننس کے جواز کا مسئلہ فیڈرل کورٹ کے سامنے آیا۔ سماعت کے مرحلے پر چیف جسٹس رخصت پر تھے۔ سر سرینواس وردا چاری قائمقام چیف جسٹس تھے۔ میرے علاوہ تیسرے جج پٹنہ ہائی کورٹ کے ایک انگریز جج تھے جنہیں فیڈرل کورٹ کا عارضی جج مقرر کیا گیا تھا۔ وہ خود اس وقت رخصت پر تھے اور بحالی صحت کی خاطر کشمیر گئے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی رخصت کے دوران میں ہی کشمیر سے دلّی آنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے سر بی ایل مترپیش تھے معاملہ بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ کیونکہ مجسٹریٹ اضلاع نے کثیر تعداد میں مقدمات سپیشل ٹربیونلز کو تفویض کرنے شروع کر دیئے تھے اور جو مقدمات ان ٹربیونلز کو تفویض کئے جاتے ان میں ملزمان کا سزایاب ہونا قریب قریب ایک قاعدے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پہلے تین دنوں کی سماعت کے دوران میں قائمقام چیف جسٹس کی اور میری تنقید سے سر بی ایل متر نے یہ اندازہ کیا کہ ہماری رائے آرڈیننس کے جواز کے حق میں نہیں۔ چوتھے روز عدالت کے شروع ہوتے ہی انہوں نے عدالت کو بتایا کہ وزیر ہند کی طرف سے تار موصول ہوا ہے کہ بعض ملزمان کی طرف سے جو کسی خاص عدالت سے سزایاب ہوئے تھے پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کی اجازت کی درخواست کی گئی ہے۔ وزیر ہند نے اپنے مشیر قانونی کے محکمے کو ہدایت دی ہے کہ حکومت کی طرف سے اس درخواست کی مخالفت نہ کی جائے۔ کیونکہ اس اپیل میں بھی ملزمان کی طرف سے آرڈیننس کے جواز کا سوال اٹھایا

جائے گا۔ اندریں حالات قرین قیاس ہے کہ اپیل کی اجازت مل جائے گی اور یہ مسئلہ جلد پریوی کونسل کے زیر غور آجائے گا۔ چونکہ فیڈرل کورٹ کے فیصلے سے بھی اپیل پریوی کونسل میں جاسکتا ہے اسلئے حکومت کی ہدایت پر میری درخواست ہے کہ موجودہ اپیل کی سماعت کو پریوی کونسل کے فیصلہ تک ملتوی کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی تیسرے جج نے کہا مجھے التوا کی درخواست سنکر حیرت ہوئی ہے۔ فیڈرل کورٹ کی ججی پر میرا عارضی تقرر اس بنا پر کیا گیا تھا کہ معاملہ نہایت اہم ہے اور اس کی فوری سماعت لازم ہے۔ مجھے اپنی بقیہ رخصت ترک کر کے کشمیر سے دلی کی گرمی میں آنا پڑا۔ تین دن سے سماعت جاری ہے۔ میرے رفقاء کے تنقیدی الفاظ سے اندازہ کر کے کہ انکی رائے ممکن ہے آرڈیننس کے جواز کے خلاف ہو حکومت اس مرحلے پر سماعت کا التوا چاہتی ہے۔ میری رائے میں ایسی درخواست غیر واجب ہے۔ میں نے سر بی ایل متر سے دریافت کیا آپ وزیر ہند کے تار کی نقل پیش کر سکتے ہیں؟ انہوں نے مسٹر شیو مکیس لال جائنٹ سیکریٹری وزارت قانون کی طرف دیکھا جو ان کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مسٹر شیو مکیس لال نے بڑے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اس پر سر بی ایل متر نے کہا کہ وزیر ہند کے تار کی نقل پیش نہیں کی جاسکتی۔ میں نے ایڈوکیٹ جنرل سے کہا کہ جب آپ وہ دستاویز عدالت کو دکھانے سے گریز کرتے ہیں جس کی بنا پر آپ سماعت کے التوا کی درخواست کرتے ہیں تو کیا آپ جائز طور پر توقع رکھ سکتے ہیں کہ عدالت آپ کی درخواست کو منظور کرے؟ چنانچہ التوا کی درخواست نامنظور ہوئی اور سماعت جاری رہی۔ فریقین کی تفصیلی بحث پر غور کرنے کے بعد میری اور عارضی چیف جسٹس وردا چاری کی یہی رائے ہوئی کہ آرڈیننس کی وہ شق جس میں مجسٹریٹ ضلع کو اختیار دیا گیا ہے کہ ایک خاص قسم کے مقدمات میں سے جن مقدمات کو وہ چاہیں ایک خاص عدالت کے سپرد کر دیں۔ مجسٹریٹ ضلع کو ایک حد تک قانون سازی کے اختیارات تفویض کرتی ہے اور آئین کی رو سے گورنر جنرل کو ایسا کرنے کا اختیار نہیں اسلئے آرڈیننس کی یہ شق غیر آئینی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں آرڈیننس کی باقی شقیں ناقابل عمل رہ جاتی ہیں۔ تیسرے جج نے ہماری رائے سے اختلاف کیا اور فیصلہ کثرت رائے کے مطابق صادر ہوا

مہاراجہ نابھہ کی اہلیہ صاحبہ کا حکومت مدراس اور اس کے چند پولیس افسران کے خلاف دعویٰ

مہاراجہ نابھہ انگریزی حکومت کی نظروں میں معتوب ہو کر ریاست کی گدی سے دست بردار ہوئے اور انہیں صوبہ مدراس میں کوڈائی کنال کے پہاڑی مقام کے میونسپل حدود کے اندر نظر بند کر دیا گیا۔ ان کے فرزند ان کی جگہ گدی نشین ہوئے اور مہارانی صاحبہ نے اپنے فرزند کے پاس ہی رہنا پسند کیا۔ چند وفادار مشیر اور خادم مہاراجہ صاحب کے ساتھ کوڈائی کنال چلے گئے۔ ان میں سے ایک مہاراجہ صاحب کے ڈاکٹر بھی تھے۔ کوڈائی کنال میں رہائش اختیار کرنے کے کچھ عرصہ بعد مہاراجہ صاحب نے ان ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ شادی کر لی اور اس خاتون نے بھی اپنے آپ کو خود ہی مہارانی نابھہ کا لقب دے لیا اگرچہ حکومت کے ہاں مہاراجہ

صاحب کی پہلی بیوی ہی اس لقب کی حقدار سمجھی جاتی تھیں۔ اس خاتون سے مہاراجہ کے ایک بیٹی بھی ہوئی۔ مہاراجہ صاحب پر پابندی تھی کہ جب وہ کوڈائی کنال کے میونسپل حدود سے باہر جانا چاہیں تو ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو قبل از وقت اطلاع دیں۔ انکی بیوی اور صاحبزادی پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک موقعہ پر مہاراجہ صاحب کی بیوی نے اپنی بیٹی کے ساتھ مدراس جانے کا ارادہ کیا۔ کسی مخبر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو غلط اطلاع دی کہ مہاراجہ صاحب فلاں وقت کوڈائی کنال سے موٹر میں کوڈائی کنال روڈ اسٹیشن جائیں گے اور وہاں سے ایکسپرس پر مدراس جائیں گے۔ اس اطلاع پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کوڈائی کنال روڈ کے سب انسپکٹر کو ٹیلیفون پر ہدایت دی کہ مہاراجہ صاحب کو اسٹیشن پر روک لیا جائے اور ایکسپرس پر سوار نہ ہونے دیا جائے۔ مہاراجہ صاحب کی بیوی اور صاحبزادی اسٹیشن پر پہنچ کر ایکسپرس کے انتظار میں کمرہ انتظار میں چلی گئیں اور ان کے سیکریٹری ٹکٹیں خریدنے اور نشستوں کے انتظام کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایکسپریس کے آنے پر سب انسپکٹر نے جس کے ہمراہ دو کانسٹیبل تھے خواتین کو ایکسپرس پر سوار ہونے سے یہ کہہ کر روکدیا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی یہ ہدایت ہے کہ انہیں سوار نہ ہونے دیا جائے۔ سیکریٹری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ خواتین پر کسی قسم کی پابندی نہیں لیکن وہ اپنی بات پر مصر رہا۔ ایکسپرس روانہ ہوگئی اور خواتین کو سوار نہ ہونے دیا گیا۔ ریل گاڑی کے چلے جانے کے بعد سب انسپکٹر پولیس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ مہاراجہ صاحب کی بیوی اور بیٹی کو روک لیا گیا ہے اور دریافت کیا کہ اب انہیں کہاں بھیجا جائے؟ سپرنٹنڈنٹ نے کہا میں نے تو مہاراجہ صاحب کو روکنے کی ہدایت دی تھی تم نے خواتین کو کیوں روکا؟ سب انسپکٹر نے کہا مہاراجہ صاحب تو یہاں آئے ہی نہیں صرف خواتین ہی سیکریٹری کے ساتھ آئی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا تم نے بڑی غلطی کی ہے اب فوراً ان سے معافی مانگو اور ان کی خدمت میں گذارش کرو کہ ان کے سفر میں کوئی روک نہیں وہ ہر طرح سے آزاد ہیں۔

ان واقعات کی بنا پر مہاراجہ صاحب کی بیوی نے اپنی طرف سے اور اپنی بیٹی کی طرف سے حکومت ہند، حکومت مدراس، سپرنٹنڈنٹ پولیس، سب انسپکٹر اور دونوں کانسٹیبلوں پر دیوانی دعویٰ دائر کردیا کہ انہیں خلاف قانون بے جا طور پر روکا گیا اور ہرجانہ طلب کیا۔ مدعا علیہم کی طرف سے عذر کیا گیا کہ پولیس افسروں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے اپنے فرض کی ادائیگی میں کیا۔ البتہ اس میں ان سے غلطی ہوگئی کہ بجائے مہاراجہ صاحب کو روکنے کے انہوں نے خواتین کو روک لیا۔ اندریں حالات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی متعلقہ دفعہ کی رو سے حکومت کی اجازت کے بغیر دعویٰ مدعیان قابل پذیرائی نہیں۔ عدالت ابتدائی نے اس عذر کو جائز قرار دیتے ہوئے دعویٰ خارج کردیا۔ مدراس ہائی کورٹ نے اپیل میں عدالت ابتدائی کا فیصلہ بحال رکھا۔ مدعیان نے فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کی۔ چیف جسٹس اور جج ورداچاری نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھا۔ مجھے ان سے اختلاف ہوا۔ مجھے مہاراجہ صاحب کی بیوی سے اس زمانے میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا جب میں حکومت ہند میں وزیر تھا۔ میری طبیعت ان سے کسی قدر مکدر تھی۔ کیونکہ ایک دن وہ معہ اپنے سیکریٹری

بلا اطلاع اور باوجود اردلیوں کے روکنے کے میری سرکاری رہائش گاہ کے ملاقاتی کمرے میں جہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا آ گئی تھیں یہ امر میری پردہ نشین بیوی کے لئے پریشانی کا موجب ہوا تھا اور انہیں سراسیمگی میں وہ کمرہ فوراً چھوڑنا پڑا تھا۔ اس پس منظر میں مجھے اس خاتون کی کوئی رعایت تو منظور نہ ہو سکتی تھی۔ میرا فرض صرف سوال زیر بحث پر غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنا تھا۔ میرا استدلال تھا کہ مہاراجہ صاحب پر پابندی تھی کہ وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع دیئے بغیر کوڈائی کنال کی میونسپل حدود سے باہر نہ جائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو پولیس انہیں روکنے میں حق بجانب ہوتی۔ اگر اس اطلاع کے بعد کہ مہاراجہ صاحب کوڈائی کنال سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں پولیس افسران کسی غیر شخص کو مہاراجہ نابھہ سمجھ کر روک لیتے تو بھی ان کی طرف سے یہ کہنے کی گنجائش ہوتی کہ ہم نے ظاہری حالات کے ماتحت ان صاحب کو مہاراجہ سمجھ کر روک لیا۔ اس لئے ہماری غلطی نیک نیتی پر مبنی تھی۔ لیکن مہاراجہ کی بیوی اور صاحبزادی پر تو کوئی پابندی تھی نہیں۔ انہیں روکنا کسی صورت میں جائز نہیں تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنے جواب دعویٰ میں کہا۔ میں نے صاف طور پر مدعیان کو نہیں بلکہ صرف مہاراجہ صاحب کو روکنے کی ہدایت کی تھی۔ سب انسپکٹر نے اپنے جواب دعویٰ میں کہا کہ مجھے مہاراجہ صاحب کو روکنے کی ہدایت نہیں تھی بلکہ ان کی بیوی کو روکنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ مہاراجہ صاحب کی بیوی پر چونکہ کوئی پابندی نہیں تھی اسلئے انہیں روکنا پولیس کے فرائض میں داخل نہیں تھا اور یہ فعل ناواجب اور خلاف قانون تھا۔ ان حالات میں غلطی کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میرے رفقاء نے قرار دیا کہ سب انسپکٹر نے غالباً اپنے مشیر قانونی کے غلط مشورے کے ماتحت اپنے جواب دعویٰ میں غلط موقف اختیار کیا ہے۔ مجھے اپنے فیصلے میں لکھنا پڑا کہ عدالت کا فرض ہے کہ وہ فریقین کے تحریری بیانات کی بنا پر مسئلہ متنازعہ کا فیصلہ کرے۔ عدالت مجاز نہیں کہ اپنے آپ فریقین کے بیانات کی ترمیم کر کے اپنی مجوزہ ترمیم پر اپنے فیصلے کی بناء رکھے۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کا قیام

۱۹۳۳ء کی ٹارنٹو کانفرنس کے زیر اثر اور مسٹر آئی ڈیلیسن مقدم کے ترغیب دینے پر میں نے ہندوستان میں انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے قیام پر غور کرنا شروع کیا۔ ۱۹۳۴ء میں میرا بہت سا وقت انگلستان میں گذرا اور اس دوران میں مجھے چیتھم ہاؤس میں رائل انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع میسر آتے رہے۔ جب مئی ۱۹۳۵ء میں میں نے گورنر جنرل کی انتظامیہ مجلس کے رکن کا منصب سنبھالا تو مجھے شملہ میں اور بعد میں دلی میں بین الاقوامی مسائل میں دلچسپی لینے والے اصحاب سے میل جول کا اتفاق ہونے لگا اور چند ماہ کے مشوروں کے بعد انڈین انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا امکان پیدا ہو گیا۔ پنجابی مثل کے مطابق کہ "جیہڑا بولے اوہو ای بوا کھولے" (جو بولے وہی دروازہ کھولے) انسٹی ٹیوٹ کی صدارت کی ذمہ داری مجھے اٹھانا پڑی۔ میری سرکاری رہائش گاہ ۶ کنگ ایڈورڈ روڈ میں انسٹی ٹیوٹ کا افتتاحی اجلاس

ہوا جس میں مارکوئیس آف لوتھیان نے جو اس وقت اتفاق سے دلی میں موجود تھے تقریر کی جسے بہت دلچسپی سے سنا گیا۔

اسلامی پردے کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ | ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں جنوبی افریقہ سے ایک خیر سگالی وفد شملے آیا جس کے قائد جنوبی افریقہ کے ایک وزیر مسٹر موف میئر تھے۔ انہوں نے میری رہائش گاہ دی ریٹریٹ میں انسٹی ٹیوٹ کو خطاب کیا۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ ہوا۔ وفد کے ایک رکن نے مجھ سے دریافت کیا تم شادی شدہ ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے پوچھا کل سیسل ہوٹل میں جو دعوت ہمارے اعزاز میں تھی اس میں تمہاری بیوی شامل تھی؟ میں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا کیا وہ شملہ میں نہیں۔ میں نے کہا وہ شملہ ہی میں ہیں لیکن پردہ کرتی ہیں اور مردوں کی محفل میں نہیں جاتیں۔ اس نے پوچھا بھلا یہ کیوں؟ میں نے پردے کی اسلامی تعلیم مختصر طور پر اسے بتائی اور اس پر کچھ گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں نے اُسے کہا اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت میری بیوی میری والدہ کے ہمراہ عورتوں کی ایک مجلس میں گئی ہوئی ہیں۔ جاتے وقت انہیں کوئی خیال نہ تھا کہ کوئی غیر مرد ان کے کمروں میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے کمرے جس حالت میں تھے ویسے ہی چھوڑ گئی ہیں۔ اگر آپ اور آپ کے وفد کے کوئی اور صاحب پسند کریں تو میں آپ کو ان کمروں میں لے چلتا ہوں۔ آپ انہیں دیکھ کر اندازہ کرلیں کہ ہمارے ہاں پردہ دار عورتوں کی معاشرت کا کیا طریق ہے۔ وہ سب آمادہ ہو گئے اور میں انہیں اوپر لے گیا۔ کمرے چاروں طرف سے کھلے تھے۔ برآمدے کی بغل میں ایک چھوٹے کمرے میں جس کی تین دیواریں شیشے کی تھیں ایک لکڑی کے ایزل پر سامنے کے پہاڑی منظر کی ایک نیم کشیدہ تصویر تھی جو میری بیوی ان دنوں تیار کر رہی تھیں۔ سنگار میز پر ضروری اشیاء قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں ایک تخت پر مصلیٰ بچھا تھا۔ الماریوں میں کتابیں اور رسالے پڑے تھے۔ کچھ زیبائش کا سامان بھی تھا۔ ہر کمرے سے اردگرد کی پہاڑیوں اور وادیوں کے منظر نظر آتے تھے۔ جب ہم نیچے آگئے تو جن صاحب نے پہلے مجھ سے پردے کے متعلق سوال کیا تھا ان سے میں نے دریافت کیا آپ نے پردے کے متعلق کیا اندازہ قائم کیا؟ اس نے کہا میری ہی نہیں ہم سب کی رائے ہے کہ اگر پردہ ایسا ہی ہے جیسا ہم نے دیکھا ہے تو ہم سب پردے کے حق میں ہیں۔ ہمیں تو یہی خیال تھا کہ پردہ دار عورتیں قیدیوں کی مانند زندگی گذارتی ہیں۔ انہیں گھر کی چاردیواری کے اندر محصور رہنا پڑتا ہے۔ دہلیز سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ خانہ داری کے امور کے علاوہ نہ انہیں کسی بات کا علم ہوتا ہے نہ انہیں کسی بات میں دلچسپی ہوتی ہے۔ جب میں نے اپنے گھر میں اس واقعہ کا ذکر کیا تو میری بیوی نے کہا بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ میری غیر حاضری میں تم غیر مردوں کو ہمارے کمروں میں لے آئے کیا یہ پردے کے خلاف نہیں؟ میں نے کہا الاعمال بالنیات۔ میرے ایسا کرنے سے ہماری معاشرت کے ایک پہلو کے متعلق ان کی غلط فہمی کی کسی حد تک اصلاح ہوگئی۔ اور وہ نیک اثر لیکر گئے۔

چیتھم ہاؤس لندن میں رائیل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفیئرز کی کانفرنس میں ہندوستان کی آزادی کے حق میں میری تقریر

۱۹۴۵ء کے مارچ میں چیتھم ہاؤس لندن میں رائیل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کی سرپرستی میں دولت مشترکہ کے نمائندگان کی ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا ہندوستان کی انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بھی ایک وفد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ وفد کے اراکین میں میرے علاوہ کنور سر مہاراج سنگھ، میر مقبول محمود، مسٹر سی ایل مہتہ اور خواجہ سرور حسن شامل تھے۔ افتتاحی اجلاس میں ہر وفد کے قائد سے پانچ پانچ منٹ کی تقریر میں اختصاراً اپنے ملک کی جنگی سرگرمیوں کا خلاصہ بیان کرنے کی استدعا کی گئی۔ ہندوستان کی باری آنے پر میں نے تین منٹ میں ہندوستان کی جنگی سرگرمیوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا ۲۵ لاکھ ہندوستانی کسی نہ کسی حیثیت میں جنگ کے مختلف محاذوں پر برطانیہ اور اتحادیوں کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت اور دفاع کے سلسلے میں مختلف انواع کی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور ان کی طرف سے جان کی قربانی پیش کرنے میں بھی دریغ نہیں ہوا۔ علاوہ فوجی اور جنگی امداد کے ہندوستان نے سامان حرب اور ذخائر خوراک مہیا کرنے میں بھی نمایاں خدمت کی ہے اور قابل قدر نمونہ قائم کیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض تفاصیل کا ذکر کرنے کے بعد میں نے کہا "دولت مشترکہ کے سیاستدانو! کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ ہندوستان کے ۲۵ لاکھ فرزند دلیر نے میدان جنگ میں مملکت برطانیہ کی آزادی کی حفاظت کے لئے داد شجاعت دی ہو لیکن خود ہندوستان ابھی تک اپنی آزادی کا منتظر اور اس کے لئے ملتجی ہو؟ شاید ایک مثال اس کیفیت کو واضح کرنے میں ممد ہو سکے۔ چین کی آبادی اور رقبہ ہندوستان کی آبادی اور رقبے سے بیشک زیادہ ہے لیکن وسعت اور آبادی کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے چین آج ہندوستان سے کوسوں پیچھے ہے۔ تعلیم صنعت و حرفت، وسائل آمد و رفت غرض خوشحالی کے تمام عناصر کے لحاظ سے ہندوستان چین سے کہیں آگے نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چین تو آج دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا ہے اور ہندوستان کسی گنتی میں نہیں؟ کیا اس کی صرف یہی وجہ نہیں کہ چین آزاد ہے اور ہندوستان محکوم؟ لیکن یہ حالت اب دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان بیدار ہو چکا ہے اور آزاد ہو کر رہے گا۔ کامن ویلتھ کے اندر رہ کر اگر آپ سب کو یہ منظور ہو اور کامن ویلتھ کو ترک کر کے اگر آپ ہندوستان کے لئے اور کوئی رستہ نہ چھوڑیں"۔ یہ اجلاس سہ پہر کو ہوا تھا اجلاس کے ختم ہونے پر جب ہم چیتھم ہاؤس سے نکلے تو شام کے اخبار اسٹار میں میری تقریر کا یہ حصہ لفظ بہ لفظ موٹے حروف میں چھپا ہوا تھا اور لوگ اس پرچے کو بڑے شوق سے خرید رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد کانگریسی لیڈر مسٹر آصف علی صاحب نے مجھے بتلایا جن دنوں لندن میں تم نے یہ تقریر کی پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کے سرکردہ اراکین جن میں میں بھی شامل تھا اورنگ آباد دکن کے قلعے میں نظر بند تھے۔ ہم کانفرنس کے اس اجلاس کی کاروائی کو ریڈیو پر سن رہے تھے۔ جب تم نے دولت مشترکہ کے سیاستدانو کہہ کر آواز بلند کی تو ہم سب توجہ سے تمہاری تقریر سننے لگے۔ پنڈت نہرو تو اپنا کان ریڈیو کے بہت قریب لے آئے جب تم نے تقریر ختم کی تو پنڈت جی نے کہا اس شخص نے تو ہم سے بھی بڑھ کر بے باکی سے حکومت

برطانیہ کو متنبہ کیا ہے۔

حکومت برطانیہ کی طرف سے رائیل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل کانفرنس کے مندوبین کو دعوت اور اس میں آزادی ہند کی تائید میں میری تقریر

اسی شام حکومت برطانیہ کی طرف سے کانفرنس کے اعزاز میں کلاریج ہوٹل میں شام کے کھانے کی دعوت دی گئی۔ حکومت کی طرف سے لارڈ کرینبورن جو اس وقت لارڈ پرلیوی سیل تھے اور بعد میں اپنے والد کی وفات پر مارکوئیس آف سالسبری ہوئے میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے وزیراعظم مسٹر چرچل کے سوائے حکومت کے سب اراکین بشمول نائب وزیراعظم مسٹر ایٹلی اور لارڈ چانسلر لارڈ سائمن دعوت میں موجود تھے لارڈ کرینبورن نے مہمانوں کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے کامن ویلتھ کی اہمیت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی۔ مہمانوں کی طرف سے میزبان کی تقریر کا نیم مزاحیہ جواب تو ایک کنیڈین مندوب مسٹر سٹیفورڈ نے دیا جو ایک اخبار کے ایڈیٹر ہونے کے لحاظ سے اس کے اہل بھی تھے۔ سنجیدہ جواب دینے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ میری سہ پہر کی تقریر کا بہت پرچا ہو چکا تھا اور توقع کی جاتی تھی کہ میں ہندوستان کی آزادی پر مزید کچھ کہوں گا۔ دعوت میں جانے سے پہلے میں یہ عذر بھی سن چکا تھا کہ ہندوستان کی آزادی میں تاخیر کی ذمہ داری تمامتر حکومت برطانیہ پر نہیں ڈالی جاسکتی کیونکہ ہندو مسلم اختلاف کے پیش نظر حکومت برطانیہ بہت حد تک معذور گردانی جاسکتی ہے۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں آزادی کے موضوع پر کہا "حکومت برطانیہ ہندو مسلم اختلاف کا عذر رکھ کر اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کرسکتی۔ جنگ کے دوران میں برطانیہ اپنی بہت سی مشکلات کا حل دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ کیا ہندوستان کی آزادی ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل دریافت کرنے سے برطانیہ عاجز ہے؟ بیشک یہ مسئلہ مشکل ہے لیکن برطانیہ کا تدبر اس مشکل کا حل تجویز کرنے سے عاجز نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہندو مسلم اختلاف ہی اس مسئلے کے حل کرنے میں سب سے بڑی روک ہے تو برطانیہ اپنی نیک نیتی کا ثبوت اس واضح اعلان سے پیش کرسکتا ہے کہ اگر فلاں تاریخ تک ہندوستان کی طرف سے ہندو مسلم اختلافات کا متفقہ حل تجویز نہ کیا گیا تو حکومت برطانیہ اپنی طرف سے ایک قرین انصاف حل تجویز کرکے اس کی بنا پر ہندوستان کیلئے ایک ایسا آئین وضع کردیگی جس کے رو سے ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ حاصل ہو جائے گا یہ آئین عارضی ہوگا جونہی مستقل آئین پر فرقہ وارانہ اختلاف رفع ہو کر اتفاق ہو جائے گا پارلیمنٹ متفقہ دستور کے مطابق آئین وضع کردیگی اور اسے رائج کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے نتیجے میں ہندوستان بلکہ سارا دنیا برطانیہ کی حسن نیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔"

دعوت کے اختتام پر بہت سے وزراء نے میری تجویز کے متعلق گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ لارڈ سائمن لارڈ چانسلر نے کہا تم جلد کسی دن ہاؤس آف لارڈز آکر دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ میں تمہاری تجویز کے متعلق

تم سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ ان تقریروں کے دو دن بعد میں سہ پہر کے اجلاس کیلئے اپنے ہوٹل سے چیتھم ہاؤس جا رہا تھا۔ رستے میں لبرل پارٹی کے لیڈر مسٹر کلیمنٹ ڈیوس مل گئے۔ وہ بھی کانفرنس کے اجلاس کے لئے جا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی کہا مبارک ہو تمہاری تقریروں کے نتیجے میں کیبنٹ کے زور دینے پر وائسرائے ہند لارڈ ڈیول کو مشورے کیلئے لندن بلایا گیا ہے لیکن ابھی یہ خبر بصیغہ راز ہے کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی کہ اس نے میری حقیر کوشش کو نوازا اور اسے پُر اثر بنایا۔ چنانچہ لارڈ ڈیول لندن تشریف لائے اور ہندوستان کی آئینی جدوجہد کا آخری مرحلہ شروع ہو گیا۔

لارڈ ایسٹور صدر رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفیرز کی طرف سے کانفرنس کے مندوبین کی مہمان نوازی

ان دنوں رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفیرز کے صدر لارڈ ایسٹور تھے جو موجودہ لارڈ اسٹور کے دادا تھے۔ کانفرنس کے ایام میں ان کی طبیعت علیل تھی لیکن ان کی طرف سے کانفرنس کے مندوبین کو دعوت تھی کہ کانفرنس کے دوران میں باری باری ان کے دولت خانے کلائیوڈین پر کسی ہفتے یا اتوار کے دن آئیں اور دن وہاں گذاریں۔ کلائیوڈین ایک محل ہے جو میڈن ہیڈ کے قرب و جوار میں دریائے ٹیمز کے نزدیک ایک بلندی پر واقع ہے۔ اس کی کھڑکیوں سے دُور دُور تک بہت خوشنما مناظر نظر آتے ہیں۔ ہر ہفتہ اور اتوار کو جو مندوبین کلائیوڈین جانے والے ہوتے انہیں ریل کے اوّل درجے کے واپسی ٹکٹ ٹیپ لو اسٹیشن تک کے بھیج دیئے جاتے اور اس سٹیشن سے کلائیوڈین تک ان کے لئے کوچز کا انتظام کر دیا جاتا۔ لیڈی ایسٹور پلائی متھ کی لیڈی میرس رہ چکی تھیں اور پارلیمنٹ کی رکن تھیں۔ وہ امریکن نژاد تھیں اور امریکہ اور انگلستان میں بہت اچھی شہرت کی مالک تھیں۔ چرچل کے اور ان کے درمیان یوں تو بہت دوستانہ تھا لیکن سیاست میں بہت رقابت تھی۔ مسٹر چرچل انکی سیاسی سرگرمیوں کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں ایک دعوت میں شریک تھے۔ مسٹر چرچل کی کسی بات پر آزردہ ہو کر لیڈی ایسٹور نے کہا "ونسٹن! اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو میں تمہارے قہوے کے پیالے میں زہر ڈال دیتی۔" چرچل نے بے ساختہ جواب دیا "نانسی اگر میں شومئی قسمت سے تمہارا میاں ہوتا تو بصد شوق اس پیالے کو نوش کر لیتا۔"

ہمارے کلائیوڈین پہنچنے پر لیڈی ایسٹور نے بڑے تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اپنے میاں کی طرف سے معذرت کی کہ وہ ناسازی طبع کے باعث بنفس نفیس ہماری میزبانی نہیں کر سکتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فرمایا چائے کے وقت تک اپنی اپنی پسند کے مطابق وقت گذارو۔ جو سیر کو جانا چاہیں ان کے لئے پارک بھی کھلی ہے اور دریا کا کنارہ بھی دُور نہیں جو آرام کرنا چاہیں ان کے لئے کمرے مہیا ہیں۔ میں خود کینیڈین ہسپتال میں بیماروں کو دیکھنے جاؤں گی جو چاہیں میرے ساتھ چلیں۔ مجھ سے دریافت کیا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں وضو کر کے کسی کمرے کے ایک کونے میں نماز ادا کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا تو اچھا تم میرے ساتھ آؤ۔ مجھے غسلخانہ دکھایا اور جب میں وضو کر چکا تو مجھے اپنے بیٹھنے کے کمرہ میں لے گئیں

جو نہایت فراخ اور آراستہ تھا اور جس کی کھڑکیوں سے پارک اور دریا کا بہت دلفریب منظر دکھائی دیتا تھا۔ کمرے میں جابجا مشاہیر کے فوٹو چاندی کے فریموں میں رکھے تھے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا تم انہیں جانتے ہو؟ میں نے کہا خوب اچھی طرح جانتا ہوں مارکوئیس آف لوتھیان ہیں۔ گول میز کانفرنس میں شریک تھے۔ رائے دہندگی کی کمیٹی کے صدر کی حیثیت میں ہندوستان تشریف لے گئے تھے بعد میں ایک موقعہ پر دلی میں میرے ہاں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹر نیشنل افیرز کا افتتاح کیا تھا۔ بہت قابل تھے۔ پوچھا تم جانتے ہو ان کی وفات کیسے ہوئی؟ میں نے کہا ہاں جانتا ہوں امریکہ میں برطانوی سفیر تھے۔ شدید درد شکم میں مبتلا ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ طبی امداد حاصل کرنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ کوئی ڈاکٹر نہ بلایا گیا۔ بیہوشی ہی میں فوت ہو گئے۔ کہنے لگیں یونہی ایک قیمتی جان تلف ہو گئی۔ میرے بڑے اچھے دوست تھے۔ بعض دریدہ دہن لوگ کہا کرتے تھے کہ انہیں میرے ساتھ محبت تھی میں نے کہا آپ کیلئے اس میں چڑنے کی کونسی بات ہے آدھی دنیا کو آپ سے محبت ہے۔ کہا تم یہ سمجھتے ہو میری ڈاک دیکھو تو تمہیں معلوم ہو لوگ مجھے کتنی گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے کہا وہ دوسری آدھی دنیا ہے۔ ہنس کر کہا تم بڑے حاضر جواب ہو چلو اب نماز پڑھو۔

انگلستان میں جرمنی کی شکست کے بعد پارلیمنٹ کے انتخابات اور لیبر پارٹی کا برسراقتدار آنا

چند دن بعد جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا لیکن جاپان کے خلاف جنگ جاری رہی۔ مسٹر چرچل چاہتے تھے کہ جاپان کی شکست تک مشترکہ وزارت جاری رہے۔ لیکن مسٹر اٹیلی کو یہ منظور نہ ہوا چنانچہ پارلیمنٹ کے انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ میں عدالت کی تعطیلات میں ذیابیطس کے معائنے کے لئے انگلستان گیا ہوا تھا انتخابات کے وقت وہیں تھا۔ مسٹر اٹیلی کی پارٹی کو نمایاں کامیابی ہوئی اور وہ وزیراعظم ہو گئے۔ ۱۵ اگست کو ملک معظم نے نئی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں اعلان فرمایا کہ ان کی حکومت ہندوستان کی آزادی کیلئے ضروری اور مناسب اقدام کرے گی۔ عین دو سال بعد اس اعلان کی تکمیل ہو گئی۔

پنڈت نہرو کی طرف سے مجھے اقوام متحدہ کے اجلاس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت میں شرکت کی پیشکش۔

میں ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ مجھے پنڈت جواہر لال نہرو کا ارشاد موصول ہوا کہ میں بطور رکن ہندوستانی وفد میں شامل ہو کر اقوام متحدہ کے اجلاس میں جو سانفرانسسکو میں منعقد ہونے والا تھا حصہ لوں اور جنوبی افریقہ میں ہندوستانی آبادی کے حقوق کے مسئلہ کی بحث میں ہندوستان کی نمائندگی کروں یہ وہ وقت تھا جب مسلم لیگ کے عبوری حکومت میں شرکت کا سوال ابھی طے نہیں ہو پایا تھا۔ اسلئے مجھے پنڈت صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں تامل تھا۔ میں نے عذر کر دیا۔ انہوں نے میرا عذر قبول فرمایا اور لکھا کہ انہوں نے یہ کام مسٹر چھاگلا کے سپرد کر دیا ہے۔

قضیۂ فلسطین | فلسطین کے مسئلے سے مجھے شروع سے دلچسپی رہی ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں حکومت برطانیہ نے عربوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر عرب ممالک ترکی کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دیں تو اتحادیوں کی فتح ہونے پر تمام عرب ممالک کو آزادی حاصل ہو جائے گی البتہ دمشق حمص اور حلب کے مغربی جانب کے علاقے کے لئے ممکن ہے کسی خاص نظام کی ضرورت پیش آئے کیونکہ اس علاقے میں فرانس کی بعض خاص ذمہ داریاں ہیں۔ یہ معاہدہ سر ہنری میکموہن اور شریف حسین کے درمیان ہوا تھا۔ جنگ کے بعد عراق اور فلسطین تو برطانوی نگرانی میں آگئے اور شام اور لبنان فرانسیسی نگرانی میں۔ جب برطانیہ کی طرف سے اعلان بالفور ہوا تو شاہ حسین (موجودہ شاہ اردن کے دادا) نے اس کے خلاف احتجاج کیا کہ برطانیہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس پر برطانوی حکومت کی طرف سے کمانڈر کنورڈی کو جدے بھیجا گیا کہ وہ شاہ حسین کا اطمینان کرائیں کہ اعلان بالفور معاہدے کے تناقص نہیں اور اس سے عرب حقوق پر کوئی مخالفانہ اثر نہیں پڑے گا۔ شاہ حسین نے اس وضاحت کو تسلیم کر لیا بلکہ عرب مہمان نوازی کے جذبے کے ماتحت یہاں تک کہہ دیا کہ اگر فلسطین میں یہودیوں کی آمد بطور مہمان کے ہے تو وہ انہیں خوش آمدید کہیں گے اور ان کے ثقافتی اقدار کی حفاظت کریں گے۔ ۱۹۳۴ء تک صیہونیت فلسطین میں اپنے قدم جما چکی تھی اور اس کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ عرب اراضیات بتدریج صیہونی ایجنسی کی ملکیت اور تصرف میں منتقل ہو رہی تھیں۔ ادھر جرمنی پر ہٹلر کا تصرف قائم ہو گیا تھا اور جرمنی کی یہودی آبادی پر سختی شروع ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں جرمن یہودی فلسطین میں منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بدیں وجہ صیہونی ایجنسی کی سرگرمیاں فلسطین میں تیز تر ہو رہی تھیں۔ اس سال گرمیوں میں جب میں انگلستان گیا تو میں نے وزیر ہند سر سموئیل ہور سے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا فلسطین میں صیہونیت کا زور بڑھ رہا ہے اور عربوں کی حالت کمزور ہو رہی ہے۔ اس صورت حالات کی ذمہ داری دراصل حکومت برطانیہ پر عاید ہوتی ہے۔ اسلئے حکومت برطانیہ کو لازم ہے کہ وہ کوئی موثر اصلاحی اقدام کرے۔ مثلاً عرب زرعی اراضیات کا انتقال غیر عرب مشتریان کے حق میں قانوناً رد کر دیا جائے۔ انہوں نے فرمایا مجھے تفصیلی حالات کا علم نہیں۔ میں سر فلپ کنلف لسٹر وزیر نوآبادیات سے یہ ذکر کروں گا اور ان سے کہوں گا کہ تمہیں بلا کر تمہارا نقطۂ نظر معلوم کریں اور تمہارے خدشات کے تدارک کے طریق پر غور کریں۔ چنانچہ دو تین دن کے اندر ہی مجھے وزیر نوآبادیات کے سیکریٹری کی طرف سے اطلاع ملی کہ وزیر صاحب نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ حسن اتفاق سے سر آرتھر واکوپ ہائی کمشنر فلسطین لندن آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں بھی بلا لیا ہے تاکہ وہ بھی تمہارے خیالات سے واقف ہو جائیں۔ میں نے جو کچھ وزیر ہند کی خدمت میں گذارش کیا تھا وہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ دونوں اصحاب کی خدمت میں عرض کر دیا۔ وزیر نوآبادیات نے فرمایا تمہارا یہ کہنا تو درست معلوم ہوتا ہے کہ عرب اراضیات بتدریج یہودیوں کی ملکیت میں جا رہی ہیں لیکن اس کا تدارک تو خود عرب ہی کر سکتے ہیں۔

حکومت اس بارے میں کیا کر سکتی ہے ۔ میں نے کہا حکومت ایسے انتظامات قانوناً روک سکتی ہے ۔ فرمایا یہ تو بڑا غیر معمولی اقدام ہے اور اس سے بڑا شور ہو گا ۔

ظفر اللہ خاں ۔ حالات بھی تو غیر معمولی ہیں اور برطانیہ کی ذمہ داری بھی بہت ہی غیر معمولی ہے اور بھاری ہے

وزیر نوآبادیات ۔ لیکن میرے علم میں تو اس قسم کا قانون اور کہیں رائج نہیں ۔ میں اپنے رفقا کو کیسے آمادہ کر سکوں گا کہ وہ اس پر رضامند ہو جائیں ۔

ظفر اللہ خان ۔ قانون کی ضرورت مسلم ہو تو نظائر کی حاجت نہیں رہتی ۔ لیکن اس قسم کے قانون کی مثال ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں موجود ہے ۔

وزیر نوآبادیات ۔ یہ بات بیشک ممد ہو سکتی ہے ۔ وہاں کیا قانون ہے ؟

ظفر اللہ خاں ۔ پنجاب انتقال اراضی ایکٹ کے ماتحت زرعی اراضی کا انتقال ایک غیر زراعت پیشہ مشتری کے حق میں نہیں ہو سکتا ۔

میں نے اس قانون کی ضرورت اور اس کے عملی حصے کی کیفیت مختصر طور پر بیان کی اور مسئلہ فلسطین کے بعض پہلوؤں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ وزیر صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور فرمایا ہم دونوں ان امور پر جو تم نے بیان کئے ہیں غور کریں گے ۔ اس ملاقات سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی میرا احساس تھا کہ سر میکڈانلڈ ہو کے کہنے پر سر فلپ میرے ساتھ ملاقات پر تو رضامند ہو گئے لیکن عربوں کی مشکلات میں انہیں ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں واللہ اعلم بالصواب ۔ اس کے قریباً پانچ سال بعد جب فلسطین کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو چکا تھا حکومت برطانیہ نے آخر کار اس طرف کچھ توجہ کی اور بہت کچھ تحقیق و تفتیش کے بعد ایک منصوبہ تیار کیا جسے بطور قرطاس ابیض کے شائع کیا گیا ۔ اس منصوبے کی دو اہم تجاویز تھیں ۔ اول یہ کہ یہودیوں کی آمد پر پابندی عاید کی جائے ۔ دوسری میری پیش کردہ تجویز کہ عرب زرعی اراضیات کا انتقال بحق غیر عرب اشخاص رد کر دیا جائے ۔ یہودی مہاجرین کی تعداد کی نسبت قرطاس ابیض کی تجویز یہ تھی کہ مزید پچھتر ہزار یہودیوں کے داخلے کے بعد عرب رضامندی کے بغیر مزید یہودی مہاجرین داخل نہ ہو سکیں ۔ شہری جائیداد کے انتقال پر قرطاس ابیض کے تحت کوئی پابندی نہ رکھی گئی ہاں سکنی قطعات کے متعلق طے ہوا کہ صنعتی ضروریات کے لئے حکومت کی اجازت کے ساتھ منتقل ہو سکیں گے ۔ قرطاس ابیض کے شائع ہونے پر عربوں کیلئے کسی قدر اطمینان کی صورت تو پیدا ہو گئی لیکن یہودی حلقوں نے بہت احتجاج کیا ۔ ابھی حکومت قرطاس ابیض کے مطابق احکام صادر نہیں کر پائی تھی کہ دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور فلسطین کے قضیے کی طرف سے توجہ ہٹ گئی ۔ جنگ کے دوران میں صیہونیت نے فلسطین میں اپنا تصرف اور بھی مضبوط کر لیا اور قضیۂ فلسطین کی پیچیدگی اور بڑھ گئی ۔ صیہونیوں نے ایک پورا بریگیڈ برطانوی افواج میں بھرتی کرایا اور آخر جنگ تک اس کی نفری میں کمی نہ آنے دی

اگرچہ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن ابھی جاپان سے جنگ جاری تھی۔ کچھ عرصے بعد جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ انگلستان سے واپسی کے سفر میں قاہرہ اور بیروت ہوتے ہوئے میں دمشق گیا۔ اس سفر میں السید محی الدین الحصنی برادر اکبر اخویم مکرم السید منیر الدین الحصنی میرے ہمراہ تھے۔
بیروت میں السید منیر الدین الحسنی بھی مل گئے۔ میرا قیام السید بدر الدین الحصنی کے مکان پر ہوا۔ پانچوں الحصنی بھائیوں اور دمشق کے دیگر احباب جماعت احمدیہ سے ملکر مجھے نہایت خوشی ہوئی اور دمشق مجھے اپنا وطن محسوس ہونے لگا

علامہ الشیخ عبدالقادر المغربی | دمشق کے قیام کے دوران میں مجھے علامہ الشیخ عبدالقادر المغربی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ بھی میسر آیا۔ شیخ لغت کے امام تھے اور اپنے ہمعصروں میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ میرے دل میں ان کے لئے اس وجہ سے بھی بہت احترام تھا کہ وہ ۱۹۲۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے قیام دمشق کے دوران میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور بہت تواضع سے پیش آئے تھے۔ میرے ساتھ بھی بہت تپاک سے ملے اور رخصت ہوتے وقت حضور کی خدمت میں "علی وجہ الاحترام" سلام پہنچانے کا ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد بھی جب کبھی ان کی حیات میں مجھے دمشق جانے کا اتفاق ہوتا میں ضرور حاضر خدمت ہوتا جس سے وہ بہت خوش ہوتے۔ ایک بار دمشق جانے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی کانفرنس کی شرکت کیلئے قاہرہ تشریف لے گئے ہوئے ہیں میں بھی اتفاق سے قاہرہ جارہا تھا وہاں پہنچ کر تو معلوم ہوا کہ وہ سفیر صاحب عراق متعینہ قاہرہ کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ میں بھی وہیں حاضر ہوگیا۔ بہت خوشنودی کا اظہار کیا اور سفیر صاحب سے فرمایا جماعت احمدیہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں گرانقدر خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ مسئلہ نبوت کے علاوہ ہمیں ان سے اور کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد ایک دفعہ میں دمشق گیا تو اخویم مکرم السید منیر الدین الحصنی نے تبلایا کہ شیخ قاہرہ تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ وہاں موٹر کے حادثے میں ٹانگ کو ضرب آگئی تھی اب قریباً صحت یاب ہوچکے ہیں۔ ہم در دولت پر حاضر ہوئے تو حسب معمول بہت خوش ہوئے۔ مزاج دریافت کرنے پر فرمایا "وھن العظم منی واشتعل الراس شیبا" (میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں) کمرے میں چل کر بتایا کہ ٹانگ کی ضرب قریباً اچھی ہوچکی ہے۔ پوری بشاشت سے گفتگو فرماتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت دروازے تک آنے پر مصر ہوئے اور دروازے پر دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ لیکن عمر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ تھوڑے عرصہ بعد انکی وفات کی اطلاع ملی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون لیغفر اللّٰہ لہ ویجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔

دمشق میں آثار قدیمہ اور اسلامی یادگاروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ مسجد اموی میں حضرت ذکریا علیہ السلام کی قبر پر بیرون شہر قریب کے قبرستانوں میں اہل بیت اور صحابہ رضوان اللّٰہ علیہم کی قبروں پر

مہاجرین میں الشیخ محی الدین ابن عربی کی قبر ہے ۔ مسجد اموی کے عقب میں صلاح الدین ایوبی الغازی کی قبر پر دعائیں کیں رخصت کا وقت آیا تو احباب دمشق کی جدائی کے احساس سے طبیعت پر رقت غالب تھی ۔ دمشق سے بیروت کے رستے حیفا گئے ۔ السید محی الدین الحصنی اور السید منیر الدین الحصنی ہمسفر تھے ۔ حیفا سے اوپر جبل کرمل پر قریہ کبابیر پہنچے ۔ کبابیر کی اکثر آبادی سلسلہ احمدیہ کے ساتھ مخلصانہ وابستگی رکھتی ہے ۔ کبابیر سے مغرب کی طرف سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے درمیان میں پہاڑ کی گولائی کی وجہ سے حیفا کا شہر نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ مسجد احمدیہ میں جو قطعات آویزاں ہیں ان میں سے دو پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے یہ الہامات درج ہیں :-

"یدعون لک ابدال الشام" اور "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔"

اس مسجد کا جائے وقوع زبان حال سے اس الہام کی تصدیق کرتا ہے ۔

کبابیر سے ہم یروشلم گئے ۔ ایڈن ہوٹل میں قیام ہوا ۔ السید محی الدین الحصنی دو تین عرب زعماء کو مجھ سے ملنے کیلئے ایڈن ہوٹل لائے ۔ ان حضرات نے مشورہ دیا کہ میں اپنا قیام ولا روزمری (VILLA ROSEMARY) میں جو ایک عرب ہوٹل ہے منتقل کر لوں ۔ کہا ایڈن ہوٹل میں آزادی سے بات چیت نہ ہو سکے گی اور ولا روزمری میں ہمارے لوگ بلا تکلف تمہیں مل سکیں گے اور آزادی سے بات چیت کر سکیں گے ۔ چنانچہ میں ولا روزمری میں منتقل ہو گیا ۔ تین دن وہاں ٹھہرا ۔ اس عرصے میں عرب زعماء سے ملاقاتیں ہوئیں اور مسئلہ فلسطین کے مختلف پہلوؤں کے متعلق عرب نقطۂ نگاہ سے واقفیت ہوئی ۔ عرب اداروں کے دیکھنے کا موقعہ بھی ملا ۔ عرب نقطۂ نگاہ کو تفصیلی اور واضح طور پر مسٹر ہنری کیتان نے بیان کیا جو فلسطین کے وکلاء میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے ۔ ان کے ساتھ بعد میں بھی بیروت اور دمشق میں ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ کبابیر سے یروشلم آتے ہوئے راستے میں کچھ یہودی بستیاں پڑتی تھیں ۔ ان کو بھی دیکھا ۔ یروشلم میں یہودی ادارے بھی دیکھے ۔ یروشلم سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک روسی اشتراکی یہودی بستی تھی ۔ اس کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ۔ یہودی ایجنسی کے ڈاکٹر کوہن سے بھی ملاقات اور تبادلہ خیالات ہوا ۔ اسرائیلی سرگرمیوں کو دیکھ کر میرا تاثر یہ تھا کہ جس سرعت سے یہ لوگ اپنے پاؤں جما رہے ہیں اس کا نتیجہ عربوں کی پسپائی ہو گا ۔ یہودی ایجنسی جو اراضیات عرب مالکان سے خرید تی جا رہی تھی عرب ان اراضیات سے اپنے ہی ہاتھوں مستقل طور پر محروم ہو رہے تھے ۔ صنعت و حرفت کے جو شعبے اور ادارے قائم ہو رہے تھے ان سے عربوں کو کوئی ضمنی یا عارضی فائدہ پہنچا تو ممکن تھا لیکن کسی مستقل فائدے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ خرید کردہ اراضیات اور صنعتی ادارے سب یہودی مہاجرین کے لئے وقف تھے اور نظر آرہا تھا کہ رفتہ رفتہ ساری عرب آبادی یہودیوں کی دست نگر ہو جائے گی ۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر بہت فکرمند اور دل گرفتہ ہوا ۔

جنگ ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے فلسطین کے قضیہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ عرب اور صہیونی مندوبین کو لندن بلایا۔ چونکہ عرب مندوبین صہیونی مندوبین کے ساتھ ملکر بیٹھنے کو تیار نہ تھے لہٰذا مسٹر ارنسٹ بیون وزیر خارجہ برطانیہ نے ان سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں مسٹر بیون نے اقوام متحدہ میں بیان کیا کہ ان مذاکرات کے نتیجے میں فریقین کے موقف اسقدر قریب ہو گئے تھے کہ یقیناً کوئی تصفیہ ہو جاتا لیکن عین اس وقت امریکن صدر ٹرومین نے حکومت برطانیہ کے نام ایک تار بھیجا کہ ایک لاکھ یہودی مہاجرین کو فلسطین میں داخلے کی فوراً اجازت دیجائے۔ اس تار کی عام اشاعت ہو گئی اس پر عرب مندوبین برافروختہ ہو گئے اور صہیونی مندوبین کے حوصلے بڑھ گئے اور باہمی تصفیے کی امید جاتی رہی۔ حکومت برطانیہ نے قضیۂ فلسطین اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اسمبلی نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ حالات کا پورا جائزہ لیکر فریقین کے بیانات پر غور کرنے کے بعد رپورٹ کرے۔ ہندوستان بھی اس کمشن کے اراکین میں شامل تھا۔ کمشن میں ہندوستانی مندوب سر عبدالرحمٰن تھے جو تقسیم ملک سے قبل مدراس ہائی کورٹ کے اور پھر لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان سپریم کورٹ کے جج ہوئے۔ اس کمشن کے سامنے مسٹر موشے شیرٹ نے جو بعد میں اسرائیل قائم ہونے پر اس ملک کے وزیر خارجہ ہوئے یہودی ایجنسی کی طرف سے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے تین قبائل کو (معاذ اللہ) ظلماً مدینے سے نکال دیا تھا۔" معلوم ہوتا ہے ان کے اس بیان کے وقت سر عبدالرحمٰن موجود نہ تھے یا ان کی توجہ ادھر نہ تھی ورنہ مسٹر شیرٹ پر سوالات کے ذریعے ان کے منہ سے اس ایذا دہی اور ان غداریوں کو تسلیم کرایا جاسکتا تھا جو مدینہ طیبہ کے یہودیوں نے ایک لمبے عرصے تک بار بار سرور دو عالم سے کیں جن کی پاداش میں انہیں مدینے سے یکے بعد دیگرے خارج کیا گیا۔ آخر کار اس کمشن نے سفارش کی کہ فلسطین کو تقسیم کیا جائے۔

پنڈت نہرو کی تجویز پر حکومت ہند کی طرف سے انٹرنیشنل کورٹ میں ججی کے لئے میری نامزدگی

میرے ہندوستان واپس پہنچنے کے چند دن بعد سر جارج سپنس سیکریٹری وزارت قانون جو میرے ساتھ اسی حیثیت میں کام کر چکے تھے مجھے ملنے آئے اور کہا پنڈت جواہر لال چاہتے ہیں کہ نئی بین الاقوامی عدالت میں ہندوستان کا بھی ایک جج منتخب ہوسکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر تمہارا نام اس منصب کے لئے پیش کیا جائے تو کامیابی کی امید ہوسکتی ہے۔ انہوں نے مجھے ارشاد فرمایا ہے کہ میں تمہاری رضامندی حاصل کر دں۔ میں متامل تھا لیکن سر جارج مصر ہوئے تو میں نے رضامندی دیدی۔ ججوں کا انتخاب جنوری ۱۹۴۶ء میں اسمبلی کے لندن کے اجلاس میں ہوا۔ اسمبلی میں تو مجھے کثرت آراء حاصل ہو گئی لیکن مجلس امن میں میرا مقابلہ پولینڈ کے قانون دان مسٹر بوہدم ونیارسکی سے ہوا۔ دوسری یا تیسری بار کی رائے شماری میں انہیں کثرت حاصل ہو گئی

اور وہ منتخب ہوگئے۔ وہ متواتر ۱۲ سال بین الاقوامی عدالت کے جج رہے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک عدالت کے صدر بھی رہے۔ ۵ رفروری ۱۹۶۷ء کو پنشن پر گئے۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں رحلت فرماگئے۔

کیبنٹ مشن کا تقرر | ۱۹۴۶ء تک ابھی ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہوسکی تھی۔ ادھر برطانوی حکومت اعلان کرچکی تھی کہ ہندوستان جلد آزاد ہوجائے گا۔ اس وقت جہاں تک اندازہ کیا جاسکتا تھا وزیر اعظم اٹیلی تقسیم ہند کے بالکل حامی نہیں تھے اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی وحدت بھی قائم رہے اور مسلم لیگ اور کانگرس دونوں اسے قبول بھی کرلیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے موسم بہار میں انہوں نے اپنے تین رفقاء لارڈ پیتھک لارنیس (وزیر ہند) مسٹر الیگزینڈر (وزیر بحر) اور سر سٹیفورڈ کرپس (لارڈ پریوی سیل) کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ہندوستان جاکر دونوں سیاسی جماعتوں اور سرکردہ سیاسی شخصیتوں کے ساتھ مشورہ کرکے ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھائیں۔ لارڈ پیتھک لارنیس برسوں سے ہندوستان کی آزادی کے حامی تھے اور ہندوستانی مسائل میں گہری دلچسپی لیتے رہے تھے۔ سر سٹیفورڈ کرپس برطانوی وزارت کی قابل ترین شخصیت شمار ہوتے تھے ہندوستانی سیاست کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتے تھے گو کانگرس کے حامی شمار کئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ پہلے برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے انکی مساعی اس بارے میں ناکام ہوچکی تھیں۔ مسٹر الگزینڈر ہمدرد اور ملنسار طبیعت رکھتے تھے لیکن اس سے قبل انہیں ہندوستانی سیاست سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس مشن کا نام کیبنٹ مشن مشہور ہوا۔

دلی پہنچتے ہی وفد نے شدت گرما کے باوجود نہایت سرگرمی سے اپنا کام شروع کردیا اور حصول مقصد کی مساعی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دونوں سیاسی جماعتوں کے اختلافات اسقدر پیچیدہ صورت اختیار کرچکے تھے کہ ملک کے کسی طبقے میں بھی برطانوی وفد کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن وفد کی مساعی اور وزیر ہند کی پیرانہ سالی میں جواں ہمتی کامیاب ہوئیں اور وفد کے تجویز کردہ منصوبے کی آخری شکل پر مسلم لیگ اور کانگرس کا اتفاق ہوگیا قائداعظم کو مسلم لیگ کی کونسل کی رضامندی حاصل کرنے میں کسی قدر دقت کا سامنا ہوا۔ لیکن کونسل نے آخر ان کا مشورہ قبول کرلیا اور وفد کی تجویز کی منظوری دیدی۔ برسوں کی کشمکش اور تگ ودو کے بعد ملک بھرنے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن یہ اطمینان دیرپا ثابت نہ ہوا۔

کیبنٹ مشن کا تجویز کردہ منصوبہ جسے کانگرس اور مسلم لیگ نے منظور کرلیا | کیبنٹ مشن کے منصوبے کا مختصر خاکہ یہ تھا کہ ملک کو تین علاقوں میں ترتیب دیا جائے (۱) بنگال اور آسام (۲) پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (۳) باقی تمام صوبجات ان تینوں علاقوں کی اپنی اپنی علاقائی حکومت

ہو اور سارے ملک کی مرکزی حکومت وفاقی ہو جس میں یہ تین علاقے منسلک ہوں مرکزی حکومت کے اختیارات امور خارجہ، امور متعلقہ دفاع، صیغہ مواصلات اور ان محکمہ جات کے متعلقہ مالیات تک محدود ہوں۔ باقی سب امور اور صیغہ جات کے اختیارات علاقائی حکومتوں کے سپرد ہوں۔ یہ نظام دس سال تک جاری رہے۔ دس سال کی میعاد پوری ہونے پر علاقہ (۱) اور (۲) کو اختیار ہو کہ اگر ان میں سے ایک یا دونوں چاہیں تو وفاقی نظام سے علیحدہ ہو کر اپنی اپنی علیحدہ آزاد حکومت قائم کرلیں۔ اس امر کا فیصلہ علاقے کی مجلس قوانین ساز کے اختیار میں ہو۔ علاقہ نمبر ۱ کے متعلق یہ شرط بھی رکھی گئی کہ اگر علاقائی مجلس وفاقی حکومت سے علیحدگی کا فیصلہ کرے تو آسام کے نمائندگان کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنی کثرت رائے سے یہ فیصلہ کریں کہ وہ اس علاقے میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اور علاقے نمبر ا سے علیحدگی کی صورت میں وہ علاقہ نمبر ۳ میں شامل ہو جائیں گے۔

مولانا آزاد کا کانگرس کی صدارت سے استعفٰی اور ان کی جگہ پنڈت نہرو کا انتخاب۔

وفد کے منصوبے کی منظوری تک کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ جب لیگ اور کانگرس نے منصوبے کی منظوری دیدی تو مولانا آزاد نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ملک کے دشوار اور پیچیدہ آئینی مسئلے کا حل میسر آگیا ہے کانگرس کی صدارت سے استعفٰی دیدیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کا نام کانگرس کی صدارت کے لئے تجویز کیا اور ان کے انتخاب کی موثر تائید کی چنانچہ پنڈت صاحب کانگرس کے صدر منتخب ہوگئے۔ بعد کے حالات کی روشنی میں مولانا صاحب نے اپنے اس اقدام کو اپنی ساری سیاسی زندگی کا نہایت مضرت رساں اقدام قرار دیا۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی کیبنٹ مشن کے منصوبے کی بعض شقوں کی اپنی "تعبیریں" "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا"

کانگرس کا صدر منتخب ہونے ہی پنڈت نہرو نے کیبنٹ مشن کے منصوبے کی بعض شقوں کی اپنی تعبیر کا اعلان کیا مثلاً آسام کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ منصوبے کی متعلقہ شق کی رو سے آسام کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مجلس قانون ساز کے ذریعہ ابھی اس فیصلے کا اعلان کردے کہ وہ سرے سے علاقہ نمبر ا میں شامل نہیں ہونا چاہتا اور شروع سے ہی وہ علاقہ نمبر ۳ میں شامل ہو جائے۔ یہ تعبیر منصوبے کے الفاظ کے بالکل خلاف تھی۔ اور منصوبے کے الفاظ ہرگز اس تعبیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

لیکن پنڈت صاحب بحیثیت صدر کانگرس اپنی اس تعبیر اور دیگر تعبیرات پر جو اسی قماش کی تھیں مصر تھے جس کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوگئی کہ منصوبے پر اتفاق کا اظہار کرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اپنے صدر کے منہ سے کانگرس نے عملاً منصوبے کو رد کردیا۔ قائداعظم کے لئے اب کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اعلان کردیں کہ کانگرس کی اس بدعہدی کے پیش نظر وہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس پر لارڈ ویول وائسرائے ہند نے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کو ملاقات کے لئے بلایا اور بہت کوشش کی کہ وہ وائسرائے کو یہ یقین

دلادیں کہ وہ منصوبے کی تمام شقوں پر منصوبے کی عبارت کے مفہوم کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہیں اور کسی اپنی خاص تعبیر پر اصرار نہ کریں گے لیکن وہ رضامند نہ ہوئے۔ وائسرائے کی ہر بات کا وہ یہی جواب دیتے رہے ہم نے منصوبے کو تمام وکمال تسلیم کیا ہے اور ہم اسے عمل میں لانے پر آمادہ ہیں لیکن اس کی تعبیر کرنا ہمارا کام ہے اور ہم مصر ہیں کہ ہماری تعبیر کو تسلیم کیا جائے۔ وائسرائے نے پوچھا اگر آپ کی تعبیر اراکین وفد کے منشاء کے مخالف بھی ہو تب بھی کیا آپ اس کی صحت اور قبولیت پر مصر ہوں گے؟ گاندھی جی نے کہا بیشک وفد اپنا کام ختم کر چکا ہے۔ منصوبے کی تعبیر کے متعلق وفد کا منشاء اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا تعبیر کرنا اب ہمارا کام ہے۔ وائسرائے نے کہا جب مسلم لیگ اور کانگرس نے منصوبے کو تسلیم کر لیا تو منصوبے کی حیثیت باہمی معاہدے کی ہو گئی اسلئے اس کی تعبیر پر لیگ اور کانگرس دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے اسے بھی تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اپنی بات پر مصر رہے کہ منصوبے کی تعبیر ہمارا کام ہے اور ہماری تعبیر کے مطابق عمل ہونا چاہیئے۔ یہ موقف اپنی غیر معقولیت کے لحاظ سے اچنبھا معلوم ہوتا ہے اور عام طبائع ایسی دو معزز شخصیتوں کے متعلق مندرجہ بالا بیان کو صحیح تسلیم کرنے میں حد درجہ متامل ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے صحیح ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ وائسرائے کی جو گفتگو اس بارے میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی وہ "LAST DAYS OF THE BRITISH RAJ" کے مصنف مسٹر موسلے نے لفظاً اپنی تصنیف میں درج کی ہے اور وہاں سے پڑھی جا سکتی ہے۔

وزیر اعظم اٹیلی کی ہندوستان کی سالمیت برقرار رکھنے کی آخری ناکام کوشش

برطانوی وفد کے منصوبے کا تو یوں خاتمہ ہو گیا۔ پھر بھی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے ہندوستان کی سالمیت کو قائم رکھنے کی خاطر ایک آخری سعی یہ کی کہ قائد اعظم اور پنڈت نہرو کو لندن آنے کی دعوت دی چنانچہ اواخر ۱۹۴۶ء میں یہ دونوں اصحاب لندن تشریف لے گئے۔ قائد اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو اپنے ہمراہ لیتے گئے اور پنڈت نہرو سردار بلدیو سنگھ کو۔ وزیر اعظم کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی اور آخر وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی تقسیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ وائسرائے اور وزیر اعظم کی مساعی کی اس مختصر کیفیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو کانگرسی قیادت نے کیبنٹ مشن کے منصوبے کو دل سے قبول ہی نہیں کیا تھا یا پھر قبول کرنے کے جلد بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ منصوبہ انہیں قبول نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اور بجائے اسے رد کرنے کی ذمہ داری اٹھانے کے انہوں نے تعبیر بازی کے ذریعے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ شاید کسی وقت اس عقدہ پر روشنی ڈال سکے۔ بعد کے واقعات سے اس امر کی ضرور تائید ہوتی ہے کیونکہ "تعبیر" کا ہتھیار کانگرسی قیادت کے لئے اکثر ایک بہت کارآمد آلہ ثابت ہوتا رہا ہے۔

حکومت برطانیہ کی طرف سے تقسیم ملک کا اعلان

وزیراعظم اٹیلی نے اپنے ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کے بیان میں اعلان فرمایا کہ اب تقسیم ملک کے بغیر چارہ نہیں ملک معظم کی حکومت ہندوستان کے نظم ونسق کے اختیارات ہندوستان کو سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اس پر عمل درآمد کا طریق یہ ہوگا کہ حکومت کے اختیارات صوبائی حکومتوں یا کسی متوازی ادارے کے سپرد کر دیئے جائیں گے اور اس طور پر تقسیم کی کارروائی کی تکمیل کی جائے گی۔ اس بیان سے جہاں مجھے یہ اطمینان ہوا کہ آخر کار حکومت برطانیہ نے قیام پاکستان کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے وہاں مجھے اعلان کے اس حصے سے پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ حکومت کے اختیارات عبوری مرحلے میں صوبائی حکومتوں کو تفویض کئے جانے کا بھی امکان ہے۔ قائداعظم کا برطانوی وفد کے منصوبے کو منظور فرما لینا ان کے صاحب تدبر ہونے کا ثبوت تھا۔ میری نظر میں برطانوی وفد کے منصوبے کا ایک قابل قدر پہلو یہ تھا کہ اس میں پہلے دس سال میں اکثریت کو موقعہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے منصفانہ رویئے اور حسن سلوک کے ذریعے اقلیتوں کا اعتماد حاصل کریں اور انہیں یقین دلائیں کہ آزاد ہندوستان میں ان کے جائز حقوق کی مناسب نگہداشت ہوگی اور ان کے جذبات اور احساسات کا احترام ہوگا۔ ہر چند کہ سابقہ تجربہ کچھ ایسا امید افزا نہیں تھا پھر بھی قائداعظم کا اس منصوبے کو عملاً آزمانے پر تیار ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کا موقف کسی قسم کی ضد یا ہٹ دھرمی پر مبنی نہیں تھا۔ بعد کے حالات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کانگرس کے بعض عناصر نے وفد کے منصوبے کو تسلیم کرنے کی تائید غالباً اس توقع میں کی کہ مسلم لیگ اسے رد کر دیگی اور وفد کی ناکامی کی ذمہ داری لیگ پر ہوگی جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت کی نظروں میں پاکستان کا مطالبہ کمزور ہو جائے گا۔ جب مسلم لیگ نے وفد کا منصوبہ تسلیم کر لیا تو ان عناصر کا اندازہ غلط ثابت ہوا اور انہوں نے منصوبے کو ناکام بنانے کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ بہر صورت آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہر صاحب فہم کی نظر میں وفد کی ناکامی کی ذمہ داری کانگریس پر عاید ہوئی اور پاکستان کا مطالبہ مضبوط تر ہو گیا۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کا پہلا مرحلہ جب مسٹر اٹیلی کے اعلان کے مطابق یہ قرار دیا گیا کہ حکومت کے اختیارات صوبائی حکومتوں کو تفویض کئے جائیں گے تو پنجاب کے حالات کے پیش نظر میں متفکر ہوا۔

ملک خضر حیات خاں صاحب وزیراعظم پنجاب کا استعفےٰ

سر سکندر حیات خاں صاحب کی وفات کے بعد ملک سر خضر حیات خاں صاحب پنجاب میں وزیراعظم ہوئے ملک صاحب سردار صاحب کے رفقاء میں سے تھے اور ان کی جگہ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ ہوئے لیکن یونینسٹ پارٹی کے عناصر میں جلد جلد تبدیلی ہو رہی تھی۔ پارٹی کی رکنیت میں بتدریج مسلم عنصر کم ہو رہا تھا اور غیر مسلم عنصر بڑھ رہا تھا۔ صوبے میں مسلم لیگ کی تنظیم مضبوط ہو رہی تھی اور لیگ کا رسوخ بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ لیگ نے عدم تعاون کے

ذریعہ یونینسٹ پارٹی کو حکومت سے برطرف کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تو لیگ بظاہر کامیاب نہ ہوئی لیکن رائے عامہ میں مسلم لیگ کی وقعت بہت بڑھ گئی اور شہری حلقوں میں خصوصاً لیگ کا اثر ہر جگہ پھیل گیا۔ قائد اعظم نے اس سے قبل ہی ملک صاحب پر زور دینا شروع کیا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اور لیگ سے مل کر کام کریں لیکن وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے "سکندر جناح" پیکٹ کی آڑ لینے کی کوشش کی لیکن قائد اعظم نے اس عذر کو تسلیم نہ کیا۔ ملک صاحب کا موقف تھا کہ پاکستان کا مطالبہ مرکز سے متعلق ہے اور ہم سو فیصدی اس کی تائید میں ہیں لیکن صوبے کے حالات کے پیش نظر یونینسٹ پارٹی جو ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی ہے اور جس کی تشکیل اقتصادی مقاصد کی بنا پر رکھی گئی تھی مسلم حقوق کا بخوبی تحفظ کر سکتی ہے۔ اسی کشمکش کے دوران میں برطانوی وزیر اعظم کا ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کا اعلان ہوا جس کے رو سے پنجاب کے صوبے کے متعلق مرکزی اختیارات صوبائی حکومت کو تفویض ہو سکتے تھے۔ اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کی رکنیت میں غیر مسلم اراکین کو کثرت حاصل ہو چکی تھی۔ اگر اب یہی پارٹی برسر اقتدار رہتی تو مسلم لیگ کے رستے میں اور قیام پاکستان کے رستے میں ایک بڑی روک پیدا ہو جاتی۔ میں ملک سر خضر حیات خان صاحب کو عرصے سے جانتا تھا اور میرے ان کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ جب تک میں حکومت ہند کا رکن رہا مجھے گرمیوں کے موسم میں ملک صاحب کے ساتھ شملے میں ملاقات کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ جب میں حکومت سے علیحدہ ہو کر فیڈرل کورٹ میں چلا گیا تو ہمارے ملاقات کے مواقع کم ہو گئے اور میں نے سیاسی سرگرمیوں میں براہ راست حصہ لینا ترک کر دیا گو قومی معاملات میں میری دلچسپی میں کوئی کمی نہ آئی۔ اب اس مشکل مرحلے پر میری طبیعت بڑی شدت سے اس طرف مائل ہوئی کہ مجھے ملک صاحب کی خدمت میں گذارش کرنی چاہیئے کہ پاکستان کے مطالبے کا تعلق اب صرف مرکزی حکومت کے ساتھ نہیں رہا کیونکہ وزیر اعظم اٹیلی کے اعلان کے مطابق حکومت کے اختیارات صوبائی حکومتوں کو تفویض ہو سکتے ہیں لہٰذا پنجاب میں اختیارات حکومت کا ایک ایسی پارٹی کے ہاتھ میں ہونا جس کی اکثریت غیر مسلم ہو مطالبہ پاکستان کی کمزوری کا باعث ہو گا۔ مجھے کچھ حجاب بھی تھا کہ میں سیاسیات سے باہر ہوتے ہوئے اور پنجاب کے تفصیلی حالات سے واقفیت نہ رکھتے ہوئے ملک صاحب کی خدمت میں کوئی ایسی گذارش کروں جسے وہ دخل در معقولات سمجھتے ہوئے قابل التفات نہ سمجھیں۔ جوں جوں میں وزیر اعظم برطانیہ کے اعلان پر غور کرتا میری پریشانی میں اضافہ ہوتا۔ دو دن اور دو راتیں میں نے اسی کشمکش میں گذاریں۔ رات کو آرام اور سکون سے نہ سو سکنے کا مجھے بہت کم اتفاق ہوا ہے لیکن یہ راتیں میں نے بڑی بے چینی میں کاٹیں۔ آخر تیسری صبح میں نے ملک صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں انکی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گذارش کی کہ انہیں اس مرحلے پر وزارت سے استعفےٰ دیکر مسلم لیگ کا رستہ پنجاب میں صاف کر دینا چاہیئے اور اس طرح اپنی ذمہ داری سے سرخرو ہو جانا چاہیئے۔ اس خط کے ارسال کرنے کے تیسرے

دن ملک صاحب نے ٹیلیفون پر فرمایا کہ تمہارا خط مجھے مل گیا ہے۔ مجھے اصولاً تمہارے ساتھ اتفاق ہے۔ لیکن میں مزید مشورہ کرنا چاہتا ہوں جو ٹیلیفون کی مختصر گفتگو میں ممکن نہیں۔ ایک دن کے لئے لاہور آجاؤ۔ میرے حاضر ہونے پر ملک صاحب نے فرمایا کہ جیسے میں نے ٹیلیفون پر تم سے کہا تھا مجھے اصولاً تمہارے ساتھ اتفاق ہے لیکن میں تمہاری موجودگی میں بھائی اللہ بخش (نواب سر اللہ بخش خاں ٹوانہ) کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور پھر مظفر (نواب سر مظفر علی قزلباش) سے بھی مشورہ کرنا چاہتا ہوں جس نے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا ہے۔ میں ان دو حضرات سے مشورہ کئے بغیر کوئی پختہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔

نواب سر اللہ بخش خاں صاحب ملک صاحب کے بنگلے کے باغ میں ایک خیمے میں فروکش تھے۔ ہم دونوں انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملک صاحب نے ان سے کہا بھائی صاحب میں نے ظفراللہ خاں کی چٹھی آپ کو پڑھکر سنادی تھی۔ اب آپ فرمائیں آپ کی کیا رائے ہے؟ نواب صاحب نے فرمایا میں نے پہلے بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ مجھے ظفراللہ خاں کے ساتھ اتفاق ہے۔ اس مرحلہ پر صحیح طریق یہی ہے کہ تم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہیں سے ملک صاحب نے سر مظفر علی خاںصاحب کے ہاں ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی اسٹیٹ پر تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں ٹیلیفون نہیں تھا ملک صاحب نے اپنے موٹر ڈرائیور کو ارشاد فرمایا کہ فوراً کار میں جاکر نواب سر مظفر علی خاںصاحب کو ان کی اسٹیٹ سے لے آئے۔ نواب صاحب کی تشریف آوری پر ملک صاحب نے میرے خط کا ذکر نواب صاحب سے کیا اور ان کی رائے دریافت کی انہوں نے فرمایا ہم مسلم لیگ کی تحریک عدم تعاون کو ناکام کر چکے ہیں مجلس میں ہماری پوزیشن مضبوط ہے۔ بجٹ کا اجلاس چند دنوں میں شروع ہونے والا ہے۔ اس بات سے تو مجھے اتفاق ہے کہ ہمیں حکومت سے دستبردار ہو جانا چاہیئے لیکن میری رائے میں بجٹ پاس کرنے کے بعد استعفیٰ دینا چاہئے یہ سنتے ہی نواب اللہ بخش صاحب نے فرمایا۔ مشورہ طلب امر یہ نہیں کہ استعفیٰ کب دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ استعفیٰ اس وقت دیا جائے یا نہیں۔ آج سے ڈیڑھ یا دو ماہ بعد استعفیٰ دینے کا فیصلہ بے سود ہے کیا معلوم اس درمیانی عرصہ میں واقعات کیا ہوں اور کیا مراحل پیش آئیں اور کن حالات کا آپ کو سامنا ہو۔ پھر ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ اگر آپ آج یہ فیصلہ کریں کہ بجٹ پاس کرنے کے بعد استعفیٰ دیں گے اور پارٹی کو یہ بتادیں تو پارٹی ابھی منتشر ہو جائے گی اور یوں آپ کا استعفیٰ ہو جائے گا اگر اس وقت پارٹی کو نہیں بتائیں گے اور ان کی مدد سے بجٹ پاس کرنے کے بعد ان کی خلاف مرضی استعفیٰ دیدیں گے تو گویا آپ نے ان سے فریب کیا کہ ان کی مدد سے بجٹ تو پاس کر لیا اور پھر ان کی خلاف مرضی استعفیٰ دیدیا۔ میری تو یہی رائے ہے کہ اس وقت صرف یہ طے ہونا چاہیئے کہ اس مرحلے پر آپ استعفیٰ دیں یا نہ دیں۔ میں اپنی رائے بتا چکا ہوں کہ آپ کو استعفیٰ دینا چاہیئے آگے جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ اس گفتگو کے بعد نواب مظفر علی خاں صاحب چند منٹ ٹھہر کر تشریف لے گئے ملک صاحب نے اسی سہ پہر کیلئے پارٹی کا اجلاس اپنے دولتکدے پر طلب فرمایا اور خود گورنر صاحب سر ایون جنکنز کو ملنے تشریف لے گئے۔ گورنر سے کہا وزیراعظم اٹیلی کے اعلان کے پیش نظر میں سوچ بچار کے بعد اس طرف مائل ہوں کہ مجھے اس مرحلے پر استعفیٰ دے دینا چاہیئے لیکن پختہ فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے آج سہ پہر پارٹی

کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر پارٹی کے ساتھ گفتگو کے بعد میں اسی رائے پر قائم رہا تو میں آج شام پھر آپ سے ملنے کیلئے آؤں گا اور اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔ گورنر صاحب نے فرمایا یہ امر خالصتہً آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ حالات کے پیش نظر میں آپ کی رائے پر کوئی اثر ڈالنا نہیں چاہتا لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے خود بخود یہ رائے قائم کی ہے یا کسی طرف سے آپ کو کوئی تحریک ہوئی ہے۔ اس پر ملک صاحب نے فرمایا کہ فیصلہ تو جو کچھ ہوگا میرا اپنا ہی ہوگا لیکن وزیر اعظم اٹیلی کے اعلان کے نتیجے میں مجھے ظفراللہ خاں نے توجہ دلائی ہے کہ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔

پارٹی کا اجلاس تین بجے سہ پہر سے چھ سات بجے تک رہا۔ میں تو اس میں شامل نہیں تھا لیکن کبھی کبھی میرے کمرے تک آواز پہنچتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خاصی گرم بحث ہو رہی ہے۔ شام کے کھانے پر ملک صاحب نے بتایا کہ پارٹی کے غیر مسلم اراکین ان کے فیصلے پر بہت آزردہ ہوئے اور اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ان کا مجوزہ اقدام درست نہیں لیکن انہوں نے غیر مسلم اراکین کو صاف صاف کہدیا کہ برطانوی وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ان کے لئے اور کوئی رستہ کھلا نہیں رہا۔ کھانے کے بعد ملک صاحب گورنر سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے اور اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور ساتھ ہی گورنر صاحب کو مشورہ دیا کہ نواب صاحب ممدوٹ کو بحیثیت قائد مسلم لیگ پارٹی دعوت دیجائے کہ وہ نئی وزارت تشکیل کریں۔ ملک صاحب کے استعفےٰ کا اعلان ریڈیو پر ہو گیا۔ مسلم لیگ حلقوں میں اس خبر سے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور صبح ہوتے ہی شہر بھر میں خضر حیات زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ راجہ غضنفر علی صاحب اور سردار شوکت حیات خاں صاحب کی سرکردگی میں بہت سے مسلم لیگ کے سرکردہ اصحاب ملک صاحب کے بنگلے پر تشریف لائے انہیں مبارکباد دی گلے لگایا اور پھولوں کے ہار پہنائے۔ اس کے برعکس غیر مسلم حلقوں میں بہت بے چینی پھیل گئی اور ان کی طرف سے مخالفانہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ یہ رو صوبے بھر میں پھیل گئی اور بعض مقامات پر افسوسناک فرقہ وارانہ وارداتیں بھی ہوئیں۔ میں اس دن واپس دلی چلا گیا۔

صوبائی مسلم لیگ قیادت کی طرف سے ملک صاحب پر زور دیا گیا کہ وہ مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ انہوں نے وضاحت سے فرما دیا کہ وہ سیاسیات سے الگ رہنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ انہیں وزارت یا کسی سیاسی اعزاز یا منصب کا خواہش مند سمجھا جائے۔ مسلم لیگ پارٹی کے متعلق انہوں نے اپنی نیک خواہی کا ثبوت یوں دیدیا کہ انہوں نے نواب مظفر علی قزلباش کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں چنانچہ وہ شامل ہو گئے۔ ملک سر خضر حیات صاحب کا پہلا موقف درست تھا یا غلط۔ لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اس مرحلے پر ان کا استعفیٰ دیدینا ایک نہایت قابل ستائش فعل تھا جس کے نتیجے میں صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کا رستہ صاف ہو گیا اور پاکستان کے

استحکام کی صورت پیدا ہو گئی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بہت سی مشکلات کا امکان تھا۔ اس کے مقابل پر پاکستان کے قیام کے بعد ملک صاحب کے ساتھ وہ انصاف اور حسن سلوک روا نہ رکھا گیا جس کا ہر شہری بلا امتیاز حقدار ہے۔

لارڈ ماونٹ بیٹن کا بطور وائسرائے تقرر

لارڈ ماونٹ بیٹن وائسرائے بنکر آئے تو آزادی کے متعلق فوری انصرامات اور درمیانی مراحل جلد جلد طے ہونا شروع ہوئے ۱۹۴۷ء کے دوران میں کیا کیا اتار چڑھاؤ ہوئے۔ کیا کیا چالیں چلی گئیں۔ کونسے منصوبے کامیاب ہوئے اور کونسے ناکام۔ بنی نوع انسان کا کن بلند چوٹیوں اور کن پست وادیوں سے گذر ہوا اور یہ سال اپنے پیچھے کتنی تلخ یادیں اور منحوس ورثے چھوڑ گیا ان کا شمار کرنا اور ان کی صحیح تصویر پیش کرنا ایک دیانتدار راست گو محنتی اور خدا ترس مورخ کو چاہتا ہے جو کسی وقت ضرور پیدا ہوگا۔

تقسیم ملک کے منصوبے کے اعلان پر میرا انڈین فیڈرل کورٹ سے استعفےٰ۔

برطانوی وزیراعظم نے اپنے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کے بیان میں تقسیم ملک کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے فیڈرل کورٹ آف انڈیا سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے چنانچہ میں نے اپنا استعفےٰ بھیج دیا کہ ۱۰ رجون سے میں عدالت سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ اس وقت میرا ارادہ تھا کہ تقسیم کے بعد میں پہلے کی طرح لاہور میں وکالت کروں گا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ ان دنوں ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں صاحب والئی بھوپال دلی میں فروکش تھے۔ جب انہیں میرے ارادے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا تم کچھ عرصے کیلئے میرے پاس بھوپال آجاؤ تاکہ میں اس مشکل مرحلے میں جو والیان ریاست کو درپیش ہے تم سے مشورہ کر سکوں۔ نواب صاحب کی طرف سے میں پہلے بھی بہت کریمانہ الطاف کا مورد رہا تھا اسلئے ان کا ارشاد میرے لئے واجب التعمیل تھا۔ چنانچہ میں فیڈرل کورٹ سے علیحدہ ہوتے ہی بھوپال چلا گیا۔ چونکہ ابھی صحیح اندازہ نہیں تھا کہ بھوپال میں کتنا عرصہ قیام ہوگا اور اس کے بعد کیا حالات ہوں گے اسلئے ہم نے سارا ذاتی سامان سترہ بڑے بکسوں میں احتیاط کے ساتھ بند کر کے ایک دوست کے ہاں پرانی دلی میں رکھوا دیا۔ چند دن بعد ہی دلی میں بے چینی اور بدامنی کے آثار شروع ہو گئے اور جوں جوں تقسیم کی تاریخ قریب آتی گئی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اس کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ ہمارے سامان کا کیا حشر ہوا۔ جہاں انسانی جان، عزت، آبرو کی کوئی قدر باقی نہ رہ گئی تھی اور لاکھوں انسان ہر نوع کی وحشت اور بہیمیت کا شکار ہو رہے تھے وہاں محض سامان کے متعلق دریافت بھی کرنا سنگدلی کے مترادف ہوتا لہٰذا نہ ہم نے دریافت کیا نہ ہی کچھ معلوم ہوا۔

بھوپال میں ہمارے لئے مکان سامان اور ہر سہولت ہز ہائی نس نواب صاحب کے فرمان سے مہیا کر دی گئی تھی اور جتنا عرصہ ہم بھوپال میں ٹھہرے ہم نے بفضل اللہ بہت آرام پایا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ جب آزادی ہند کے ایکٹ کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش ہونے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ تم دو ہفتے کیلئے لندن چلے جاؤ تمہاری وہاں بہت سے ارکان پارلیمنٹ سے شناسائی ہے۔ تم وہاں یہ جائزہ لینا کہ مسودے پر بحث کے دوران میں کیا

کسی ایسی وضاحت کا امکان ہے جس سے نئے آئین میں والیان ریاست ہائے ہند کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ اگر ایسا کوئی موقعہ ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا۔

پنجاب باؤنڈری کمشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنیکے لئے قائداعظم کا ارشاد اور میری طرف سے اسکی تعمیل

میں نواب صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں سفر انگلستان کے لئے تیار ہوا تو دلی سے پیغام آیا کہ قائداعظم نے طلب فرمایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ پنجاب میں جو کمشن حدبندی کیلئے قائم کیا جانیوالا ہے اس کے سامنے مسلم لیگ کی طرف سے وکالت کی ذمہ داری ہم تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا میں حاضر ہوں لیکن نواب صاحب کے ارشاد کے ماتحت میں عازم انگلستان ہونیوالا ہوں مجھے معلوم نہیں کمشن کی کارروائی کب شروع ہوگی اور مجھے تیاری کیلئے کتنا وقت ملے گا۔

قائداعظم :۔ تم انگلستان کتنا عرصہ ٹھہرو گے؟

ظفراللہ خاں :۔ میرا اندازہ تو پندرہ دن کا ہے۔

قائداعظم :۔ پھر کوئی فکر نہیں کمشن کی کارروائی کے شروع ہونے میں ابھی خاصی دیر ہے۔ ابھی تو کوئی امپائر بھی مقرر نہیں ہوا۔

ظفراللہ خاں :۔ امپائر کے متعلق میں گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کسی ایسے شخص کے تقرر پر مصر رہنا چاہیئے جس کی دیانت پر پورا اعتماد ہو سکے۔ آپ لندن کی رہائش کے زمانہ میں پریوی کونسل کے روبرو پریکٹس کرتے رہے ہیں آپ کو اتفاق ہوگا کہ برطانوی لارڈز آف اپیل اپنی روایات کے لحاظ سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں نہایت دیانتدار اور غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ آپ زور دیں کہ ان میں سے کسی کو امپائر مقرر کیا جائے۔ ہر انسان غلطی کر سکتا ہے لیکن ہمیں یہ یقین ہونا چاہیئے کہ جو صاحب مقرر ہوں وہ کسی اثر و رسوخ کے ماتحت یا کسی کے کہنے کہلانے کے نتیجے میں کوئی فیصلہ نہ کریں گے

قائداعظم :۔ میں تمہارے مشورے کو ذہن میں رکھوں گا۔

ظفراللہ خاں :۔ آپ کو کوئی اندازہ بتایا گیا ہے کہ مجھے باؤنڈری کمشن والے معاملہ میں تیاری کیلئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

قائداعظم :۔ تمہیں کافی وقت مل جائے گا۔ لاہور کے وکلاء نے پورا کیس تیار کر لیا ہوگا تمہیں صرف اپنے دلائل کو ترتیب دینا ہوگا اور اسلوب بحث طے کرنا ہوگا۔

ظفراللہ خاں :۔ میں لندن سے واپسی پر کراچی سے سیدھا لاہور چلا جاؤں گا وہاں میں کس کو اپنی آمد سے مطلع کر دوں۔

قائداعظم :۔ نواب ممدوٹ سب انتظام کریں گے۔

قائداعظم سے رخصت ہو کر میں لندن چلا گیا۔ جب وزیراعظم ایٹلی نے ایکٹ آزادی ہند کا مسودہ ایوان عام میں پیش کیا تو میں ایوان کی گیلری میں موجود تھا۔ وزیراعظم کی تقریر بہت صاف اور واضح تھی لیکن ایک امر سے مجھے حیرانی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔ انہوں نے تقریر میں کہا ہم تو چاہتے تھے کہ آزادی کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے پہلے گورنر جنرل ہوں لیکن افسوس ہے کہ مسٹر جناح رضامند نہ ہوئے۔ قائداعظم کے انکار پر مسٹر ایٹلی کا اظہار افسوس مجھے پسند نہ ہوا۔ اول تو اس تفصیل کا ذکر ضروری نہ تھا دوسرے اگر وزیراعظم کی رائے میں ذکر ضروری تھا تو صرف یہ کہنا مناسب ہوتا کہ اس تجویز پر اتفاق نہ ہوا۔ قائداعظم کا نام لیکر افسوس کے اظہار سے مترشح ہوتا تھا کہ اس تجویز کے ناکام رہنے پر وزیراعظم کو قائداعظم سے ذاتی رنجش ہے اور انہوں نے ایوان کے سامنے اس رنجش کو یوں مشتہر کیا۔ بعد میں متعدد مواقع پر ان سے ایسی حرکات سرزد ہوئیں جن سے میرے اس قیاس کو تقویت پہنچی۔ یوں بھی مسٹر ایٹلی حسن اخلاق کا نمونہ نہیں تھے۔

سر سیموئیل ہور جو گول میز کانفرنس کے دوران میں وزیر ہند تھے اور بعد میں وزیر بحر اور پھر وزیر خارجہ ہوئے اور ہور لاوال پیکٹ کے ردعمل کے نتیجے میں وزارت سے مستعفی ہوئے اپنی ہسپانوی سفارت کا عرصہ میڈرڈ میں گذار کر واپس آ چکے تھے۔ میڈرڈ میں حسن کارکردگی کے صلے میں وہ وائی کونٹ بنا دیئے گئے تھے اور اب لارڈ ٹمپل وڈ کے نام سے ایوان امراء کے رکن تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے لندن آنے کی غرض بیان کی۔ انہوں نے فرمایا میں اس معاملے میں ایوان امراء میں کچھ وضاحت حاصل کرنے کی سعی کروں گا۔ جب مسودہ ایوان عام سے منظور ہو کر ایوان امراء میں زیر بحث آیا تو بحث کے دوران میں لارڈ ٹمپل وڈ نے سوال کیا کیا والیان ریاست کے متعلق جو شق اس مسودہ میں ہے اس سے یہ مراد ہے کہ آزادی کے بعد ایک والئی ریاست کو اختیار ہوگا کہ ریاست کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے یا پاکستان کے ساتھ یا اگر پسند کرے تو دونوں میں سے کسی کے ساتھ الحاق نہ کرے بلکہ آزاد رہے؟ ایوان امراء میں مسودے کی نگہداشت نائب وزیر ہند لارڈ لسٹوول کے سپرد تھی جنہیں اس سوال کی توقع بھی نہیں تھی اور سوال ان کے لیے پریشان کن بھی تھا۔ وزیراعظم بہت محتاط تھے کہ پارلیمنٹ میں مسودے کے زیر بحث آنے پر والیان ریاست کے متعلق کسی ایسی بات پر زور نہ دیا جائے جس پر کانگرس بگڑ بیٹھے۔ شق متعلقہ کے الفاظ واضح تھے اور ان کی صحیح تعبیر وہی تھی جو لارڈ ٹمپل وڈ نے اپنے سوال میں پیش کی لیکن لارڈ لسٹوول صاف الفاظ میں اسے تسلیم کرنے سے جی چراتے تھے چنانچہ انہوں نے جواباً صرف اپنے سر کو اثباتی جنبش دیدی جس پر لارڈ ٹمپل وڈ نے فوراً یہ کہہ کر ان کی جنبش سر کو ریکارڈ کرا دیا:-

"I TAKE IT THAT THE NOBLE LORD'S NOD CONFIRMS MY ASSUMPTION"

(میں سمجھتا ہوں معزز لارڈ نے سر ہلا کر میری تعبیر کی تصدیق کی ہے)

ریڈکلف کا تقرر بطور چیئرمین حد بندی کمشن | میں ابھی لندن میں ہی تھا کہ سر سیرل ریڈکلف کو حد بندی کمشن کا چیئرمین مقرر کئے جانے کا اعلان ہو گیا۔ اس خبر سے مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ سر سیرل ایک بیرسٹر تھے جو ابھی پریکٹس کر رہے تھے۔ وہ پارلیمنٹ کے رکن بھی تھے۔ ان پر کسی طرح سے اثر ڈالے جانے کا امکان تھا۔ اس سے پہلے ان کا نام تقسیم ملک کے سلسلہ میں قائم ہونے والے ثالثی ٹریبونل کی صدارت کے لئے بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے تجویز کیا گیا تھا لیکن اس اہم اور جوڈیشل قسم کے منصب کے لئے سر سپرک سپنس چیف جسٹس فیڈرل کورٹ کا تقرر زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ حد بندی کی اہم ذمہ داری کو پہلے اقوام متحدہ کے سپرد کئے جانے کا منشا تھا۔ قائداعظم اس تجویز کے حق میں تھے لیکن پنڈت جواہر لال کو یہ منظور نہ ہوا لہٰذا اس تجویز کو ترک کرنا پڑا۔ میرے مشورے کے مطابق قائداعظم نے انگلستان کی پریوی کونسل کے تین جج صاحبان کو حد بندی کمشن میں بطور اراکین شامل کئے جانے کی تجویز بھی کی۔ لیکن لارڈ ماونٹ بیٹن نے اس بودے عذر پر اس تجویز کو ٹال دیا کہ پریوی کونسل کے جج صاحبان عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی گرمی برداشت نہ کر سکیں گے۔ جب حد بندی کمشن کے صدر کے تقرر پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو صدر کی نامزدگی کو برطانوی حکومت پر چھوڑ دیا گیا اور مسٹر اٹیلی کی حکومت نے پھر سر سیرل ریڈکلف کو نامزد کر دیا اور ماونٹ بیٹن نے قائداعظم کو یہ نامزدگی منظور کر لینے پر آمادہ کر لیا۔ جن حالات میں ملک کی تقسیم ہو رہی تھی اور جو وسیع اور جوڈیشل اختیارات کمشن کے چیئرمین کو تفویض ہونے تھے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے مسٹر اٹیلی کی وزارت کے لئے ریڈکلف کو اس منصب کے لئے نامزد کرنا نہایت غیر مناسب تھا۔ بالخصوص جب اس سے پہلے ایک ویسے ہی اہم اور جوڈیشل منصب کے لئے ان کا نام تجویز ہو کر ان کا اس پر تقرر مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔

پنجاب حد بندی کمشن کے روبرو حاضری | لندن میں کم سے کم عرصہ ٹھہرنے کے بعد میں کراچی ہوتا ہوا اپنے اندازے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گیا نواب صاحب ممدوٹ اور بہت سے احباب سٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب سے معلوم ہوا کہ ریڈکلف لاہور پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے دوسری صبح گیارہ بجے فریقین کے وکلاء کو طلب فرمایا ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا کل ڈھائی بجے بعد دوپہر میرے مکان پر تمہاری ملاقات ہمارے وکلاء کے ساتھ ہو گی۔ اس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ گو وقت تھوڑا ہے لیکن وکلاء نے کیس کی تیاری کی ہوئی ہو گی۔ ان کے ساتھ مشورے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی عطا کردہ توفیق سے بحث کے شروع ہونے تک کیس کا ڈھانچہ تیار ہو سکے گا۔ نواب صاحب نے فرمایا تمہارا قیام تو میرے ہاں ہی ہو گا۔ میں نے عرض کیا میں اپنے دیرینہ کرم فرما سر سید مراتب علی صاحب کے ہاں ٹھہرنے کا انتظام کر چکا ہوں۔ ان کا مکان آپ کے دولتکدے سے قریب ہی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ سوموار کی شام تھی۔ دوسرے دن منگل کی صبح گیارہ بجے ہم سر سیرل ریڈکلف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کمشن کے اراکین جسٹس دین محمد صاحب، جسٹس محمد منیر صاحب، جسٹس مہر چند

مہاجن صاحب اور جسٹس تیجا سنگھ صاحب بھی موجود تھے۔ سر سیرل نے کمیشن کا یہ پروگرام بتلاتے ہوئے حکم دیا کہ آئندہ جمعہ کی دوپہر تک فریقین اپنے تحریری بیانات داخل کر دیں۔ آئندہ سوموار سے کمشن وکلا کی بحث کی سماعت شروع کرے گا۔ وہ خود بحث کی سماعت میں شریک نہیں ہوں گے کیونکہ اگر کمشن کے چار اراکین بالاتفاق یا کثرت رائے سے حد بندی تجویز کر دیں تو انکی طرف سے کسی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کا کام صرف اس صورت میں فیصلہ دینا ہے جب کمشن کے چار اراکین متفقہ یا کثرت آراء سے کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکیں۔ کمشن کے روبرو جو کچھ بیان کیا جائے گا اس کی تفصیلی رپورٹ ہر روز انہیں بھیج دی جایا کرے گی یہ طریق کار بھی میرے لئے پریشانی کا باعث ہوا۔

مسلم لیگ کی طرف سے تحریری بیان کی تیاری | منگل کی دوپہر ہو چکی تھی اور تحریری بیانات جمعہ کی دوپہر تک داخل کئے جانے تھے اس وقت تک مجھے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ میرے ساتھ کون وکلاء صاحبان کام کریں گے۔ اور انہوں نے تحریری بیان یا اس کے لئے ضروری مواد تیار کر لیا ہے یا نہیں اور بحث کی تیاری میں میرے رفقا کہاں تک میری مدد کر سکیں گے؟ مجھے اس وقت تک یہ بھی نہیں بتلایا گیا تھا کہ ہماری طرف سے کمشن کے روبرو کیا ادعا پیش کیا جاتا ہے۔ میں بیتابی سے وکلاء کے ساتھ ۲½ بجے ہونے والی میٹنگ کا منتظر تھا کہ ان سے ان سب امور کے متعلق تفاصیل معلوم کروں اور ہم سب مستعدی سے اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ میں وقت مقررہ پر ممدوٹ ولا پہنچ گیا وہاں بہت سے وکلاء اصحاب موجود تھے۔ ان میں سے اکثر وکلاء کے ساتھ میں اپنے پریکٹس کے زمانے میں کام کر چکا تھا اور انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ بعض ان میں سے برسوں مجھ سے سینئر تھے۔ یہ اجتماع ممدوٹ ولا کے گول کمرے میں تھا۔ مجھے کسی قدر حیرت ہوئی کہ اتنے قانون دان اصحاب کو کیوں جمع کیا گیا ہے۔ میں نے وکلاء صاحبان سے دریافت کیا کہ آپ میں سے کون کون صاحب اس کیس میں میرے رفیق کار ہیں؟ اس پر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے فرمایا کس کیس میں؟ میں نے کہا اسی حد بندی کے کیس میں جس کیلئے میں حاضر ہوا ہوں! خلیفہ شجاع الدین صاحب نے فرمایا ہمیں تو کسی کیس کا کوئی علم نہیں۔ ہم سے تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ تم کیس کی پیروی کیلئے آئے ہو اور اس کمشن کے روبرو مسلم لیگ کا کیس تم پیش کرو گے اور تمہیں ملنے کیلئے ہمیں اس وقت یہاں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے نواب صاحب کی طرف استفساراً دیکھا تو وہ صرف مسکرا دیئے۔ میں نہایت سراسیمگی کی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا وکلاء صاحبان سے معذرت خواہ ہوا کہ وقت بہت کم ہے اور مجھے کیس کی تیاری کرنی ہے اسلئے رخصت چاہتا ہوں۔ نواب صاحب میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر آئے میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا اس وقت مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا لیکن بہر صورت آئندہ دو دنوں میں تحریری بیان تیار کرنا ہے اور پھر اسکی تائید میں بحث کی تیاری کرنی ہے کل صبح سے مجھے کچھ نہ کچھ لکھوانا ہوگا۔ آپ یہ انتظام فرمائیں کہ کل صبح دو اچھے ہوشیار تیز رفتار سٹینوگرافر میرے پاس پہنچ جائیں اور وہ کاغذ پنسل قلم دوات ٹائپ کی مشینیں وغیرہ تمام دفتری سامان ساتھ لیتے آئیں تاکہ میں تحریری بیان لکھوانا شروع کر سکوں۔ نواب صاحب نے فرمایا تم فکر نہ کرو زود نویس اور سب

دفتری سامان صبح سات بجے تمہاری قیام گاہ پہ موجود ہو گا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔ نماز میں درگاہ رب العزت میں فریادی اور ملتجی ہوا۔ الٰہی میں تن تنہا عاجز اور بیکس اور ذمہ داری اسقدر بھاری اس فرض کی کما حقہٗ ادائیگی کی کیا صورت ہو گی؟ تو جانتا ہے میں تو بالکل خالی اور صفر ہوں لیکن تجھے ہر قدرت ہے تو اپنے فضل و رحم سے مجھے فہم اور توفیق عطا فرما اور خود میرا ہادی اور ناصر ہو۔ مجھے اپنی پریکٹس کے زمانے میں کئی بار بہت تھوڑے وقت میں پیچیدہ مقدمات کی بحث کی تیاری کرنی پڑی تھی لیکن وہ کسی طرح بھی پریشان کن تجربہ نہیں تھا سارے ضروری کاغذات مہیا ہوتے تھے۔ اہم مقدمات میں کوئی رفیق کار ساتھ شامل ہوتا تھا۔ موافق مخالف مواد پیش نظر ہوتا تھا۔ صرف یکسوئی اور توجہ درکار ہوا کرتے تھے۔ یہاں ذمہ داری تو اسقدر اہم اور باقی صفر۔ اگر قائداعظم لاہور میں تشریف فرما ہوتے تو میں انکی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایات طلب کرتا لیکن وہ دلی میں تھے ٹیلیفون پہ بات ہو سکتی تھی لیکن ٹیلیفون پر ایسی ہدایات حاصل کرنا غیر مناسب تھا ساتھ ہی مجھے یہ بھی احساس تھا کہ کیس کے متعلق جو تیاری ہونی تھی وہ تو مسلم لیگ لاہور کی قیادت کے ذمے تھی۔ میں اگر قائداعظم کی خدمت میں کچھ گذارش بھی کروں تو وہ ایک رنگ کا شکوہ ہو گا اور ان کی پریشانی کا موجب ہو گا۔ اس سے مجھے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔

میری مضطربانہ دعا کا جواب | میں نماز سے فارغ ہوا تو معلوم ہوا خواجہ عبدالرحیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ خواجہ صاحب ان دنوں کمشنر راولپنڈی تھے لیکن لاہور میں پناہ گزینوں کے استقبال اور انکی خبر گیری کا انصرام ان کے سپرد تھا۔ ان کا دفتر میری قیام گاہ کے مقابل والے بنگلے کے احاطے میں دو خیموں میں تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا تمہارا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں کچھ کاغذات لایا ہوں میں نے اپنے طور پہ سرکاری ریکارڈ سے پنجاب کے دیہات تھانہ جات تحصیلات اور اضلاع کی فرقہ وارانہ آبادی کے اعداد و شمار جمع کرائے ہیں۔ یہ سارے صوبے کی آبادی کے نقشہ جات ہیں۔ ممکن ہے تمہیں کیس کی تیاری میں ان سے کچھ مدد مل سکے۔ اس کے علاوہ کیس کے سلسلہ میں اگر تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ میرا دفتر سامنے ہی ہے اور یہ میرا ٹیلیفون نمبر ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور وہ تشریف لے گئے۔ میرا دل اللہ تعالیٰ کے شکر سے لبریز ہو گیا میں نے محسوس کیا کہ اس قادر و رحیم نے میری مضطربانہ دعا کے جواب میں اسقدر جلد میری بیکسی پہ رحم کی نظر ڈالی اور اپنی طرف سے ضروری معلومات کا ایک بے بہا خزانہ مجھے عطا فرمایا۔ میری ڈھارس بندھی کہ جس قادر ہستی نے چند لمحوں کے اندر غیب سے اسقدر قیمتی مواد مجھے عطا فرمایا ہے جس کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا وہ ضرور باقی مراحل میں بھی میری دستگیری فرمائے گا اور اپنی رحمت سے مجھے فہم اور توفیق عطا فرمائے گا۔

بے لوث اور رضا کارانہ خدمت کرنے والے احباب | خواجہ صاحب کے رخصت ہونے کے بعد چار وکلاء صاحبان تشریف لے آئے۔ صاحبزادہ نوازش علی صاحب مرحوم اور شیخ نثار احمد صاحب منٹگمری سے۔ سید محمد شاہ صاحب مرحوم

پاکپتن سے اور چودھری علی اکبر صاحب ہشیار پور سے چاروں نے فرمایا ہم تمہارے ساتھ شریک کار ہونا چاہتے ہیں جو خدمت چاہو ہم سے لو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ مزید فضل ہوا کہ اس نے چار با اخلاص اور مستعد کام کرنیوالوں کے دل میں تحریک کی کہ وہ میرے ساتھ آکر شامل ہوں اور میرے مشیر اور معاون ہوں۔ لاہور کے وکلاء میں سے احمد سعید کرمانی صاحب وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے اور جس کام کیلئے ان کی خدمت میں گذارش کی جاتی اس کی طرف توجہ فرماتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دنیا و آخرت میں اپنی رحمت سے وافر حصہ عطا فرمائے۔ آمین

میرے چاروں رفقائے کار نے نہایت محنت، مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ دن رات میرے ساتھ کام میں تعاون کیا۔ ہر قسم کی تکلیف برداشت کی لیکن کبھی حرف شکایت زبان پر آیا نہ ماتھے پر شکن۔ سارا وقت پوری بشاشت کے ساتھ مصروف کار رہے۔ ہر مرحلے پر ان کا مشورہ میرے لئے حوصلہ بڑھانے کا موجب ہوا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

چودھری علی اکبر صاحب کے سپرد آبادی کے اعداد و شمار کی تصدیق اور ضروری معلومات کا بہم پہنچانا تھا انہوں نے اپنے فرائض کو بڑی مستعدی سے نبھایا اگرچہ انہیں انکی سرانجام دہی میں بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ جولائی کے مہینے میں لاہور کا موسم سخت گرم ہوتا ہے۔ لیکن گرمی کی شدت چودھری صاحب کے رستے میں کسی قسم کی روک پیدا نہ کر سکی وہ تکان سے چور آتے اور اپنے کام کی رپورٹ سنا کر وہیں فرش پر ہی دراز ہو جاتے اور کچھ آرام کر لیتے کمیشن کے روبرو بحث کے دوران میں جب کبھی آبادی کے اعداد و شمار کے متعلق فریقین کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا تو ایک صاحب فریق مخالف کی طرف سے اور چودھری صاحب ہماری طرف سے نامزد کئے جاتے کہ دفتر آبادی میں جا کر متنازعہ اعداد و شمار کی تصدیق کریں بفضل اللہ ہر بار ہمارے پیش کردہ اعداد و شمار کی تصدیق ہوتی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خواجہ عبدالرحیم صاحب نے جو نقشہ جات ہمیں عنایت فرمائے تھے وہ بہت محنت اور توجہ سے تیار کئے گئے تھے۔

"ملحقہ اکثریت کے علاقوں" کی تشخیص کیلئے یونٹ کا تعین | خواجہ صاحب کے تشریف لیجانے اور وکلاء صاحبان کی تشریف آوری کے بعد ہمنے پہلا کام یہ کیا کہ طریقہ تقسیم کے متعلق سرکاری بیان کا مطالعہ کیا اور اس کے تجزیہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ "ملحقہ اکثریت کے علاقوں" کی تشخیص کے لیئے یونٹ کا تجویز کرنا لازم ہے۔ گاؤں تو عملاً ایسا یونٹ نہیں بن سکتا تھا کیونکہ بعض علاقوں میں اگر ایک گاؤں میں مسلم اکثریت تھی تو ساتھ کے گاؤں میں غیر مسلم اکثریت تھی۔ لہٰذا گاؤں کو یونٹ قرار دیکر کوئی معقول حد بندی تجویز نہیں ہو سکتی تھی۔ تھانہ کو اگر یونٹ تجویز کیا جاتا تو اس صورت میں بھی بہت جگہ وہی مشکل درپیش تھی۔ یونٹ مقرر کرنے کیلئے انتخاب دراصل تحصیل اور ضلع کے درمیان تھا گو ہمنے یہ بھی طے کیا کہ بحث کے دوران میں ہماری طرف سے کمشنری اور دو آبا کو یونٹ مقرر کرنے کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ ان دنوں صوبے بھر کے اخبارات میں ملحقہ اکثریت کے علاقوں پر بحث ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے لدھیانہ تک کا علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ بتایا جاتا تھا اور غیر مسلموں کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ جہلم تک کا علاقہ غیر مسلم اکثریت

کا علاقہ ہے۔ عارضی انتظامی تقسیم میں راولپنڈی ملتان اور لاہور ڈویژن کے جملہ اضلاع ماسوائے کانگڑہ مغربی پنجاب میں شامل کئے گئے تھے۔ اگر ہماری طرف سے ضلع کو یونٹ قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیا جاتا تو اضلاع میں سے امرتسر کو ترک کرنا پڑتا۔ اس خدشے کا اظہار بھی کیا گیا کہ اگر ہم نے ضلع کو یونٹ قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ ہم انتظامی تقسیم میں جو علاقہ مغربی پاکستان میں شامل کیا گیا ہے اس سے بھی کم علاقہ لینے پر رضامند ہیں اور اس کے نتیجے میں ممکن ہے ہمارے علاقے کو اور بھی کم کر دیا جائے۔ تحصیل کو یونٹ قرار دینے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ ضلع فیروزپور کی دو تحصیلیں فیروزپور اور زیرہ اور ضلع جالندھر کی دو تحصیلیں نواں شہر اور جالندھر مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔ ان کے ساتھ مشرق کی طرف ملحقہ تحصیل دسوہہ ضلع ہوشیارپور تھی۔ اس تحصیل میں نہ تو مسلمانوں کی کثرت تھی نہ ہندوؤں اور سکھوں کی۔ عیسائی آبادی جس فریق کے ساتھ شامل کی جاتی اس فریق کی کثرت ہو جاتی۔ اس تحصیل کے عیسائیوں کی طرف سے سر سیرل ریڈکلف کی خدمت میں محضرنامہ ارسال کیا گیا تھا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ لہٰذا تحصیل کو یونٹ قرار دیئے جانے سے فیروزپور، زیرہ، نواں شہر، جالندھر اور عیسائیوں کے شامل ہونے سے دسوہہ پانچوں تحصیلیں مسلم اکثریت کے علاقے شمار ہوتیں۔ ریاست کپورتھلہ میں بھی مسلمانوں کی کثرت تھی وہ بھی ان تحصیلوں سے ملحق علاقہ تھا۔ ضلع امرتسر میں اجنالہ تحصیل میں مسلمانوں کی کثرت تھی اور امرتسر اور ترن تارن میں غیر مسلموں کی لیکن اگر فیروزپور، زیرہ، نواں شہر، جالندھر اور کپورتھلہ پاکستان میں شامل کئے جاتے تو امرتسر اور ترن تارن غیر مسلم اکثریت کے ملحق علاقے نہ رہتے کیونکہ وہ چاروں طرف سے مسلم اکثریت کے علاقوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ضلع گورداسپور میں بٹالہ گورداسپور اور شکرگڑھ کی تحصیلوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور تحصیل پٹھانکوٹ میں غیر مسلموں کی یہ تحصیل کانگڑہ اور ضلع ہوشیارپور سے ملحق بھی تھی جو غیر مسلم اکثریت کے اضلاع تھے۔ پورے غور و خوض کے بعد ہم سب کا میلان اسی طرف ہوا کہ تحصیل کو یونٹ قرار دیئے جانے پر زور دیا جائے۔ لیکن اس بات کا فیصلہ ہم اپنے میلان کی بنا پر نہ کر سکتے تھے ہم مسلم لیگ کی طرف سے وکیل کے طور پر لیگ کا کیس تیار کر رہے تھے۔ لیگ کی طرف سے کیا کیس پیش کیا جائے اس کا فیصلہ کرنا مسلم لیگ کے اختیار میں تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے صدر نواب صاحب ممدوٹ تھے۔ ان سے استصواب لاحاصل تھا۔ وہ اپنی روایتی تواضع اور انکساری کی وجہ سے خود کوئی فیصلہ فرماتے ہی نہیں تھے اور چونکہ ہر امر میں اپنے قریبی مشیران کی رائے کو قبول فرماتے تھے۔ اس لئے تفاصیل پر غور کرنے بلکہ تفاصیل کا علم حاصل کرنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ ان ایام میں ان کے قریب ترین مشیران میاں ممتاز محمد خاں صاحب دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں صاحب تھے۔ سردار صاحب کی طبیعت علیل تھی میاں صاحب کی خدمت میں میں نے گذارش کی کہ تحریری بیان تیار کرنے کیلئے اس امر کا فیصلہ ضروری ہے کہ "ملحقہ اکثریت کے علاقوں" کی تشخیص کے لئے ہماری طرف سے کونسا یونٹ اختیار کرنے پر زور دیا جائے۔ انہوں نے فرمایا اس بات کو تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ جو تجویز تم کرو گے وہی بہتر ہوگی۔ میں نے کہا یہ فیصلہ لیگ کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ میں تو ایک فرد واحد ہوں اور میری حیثیت بھی وکیل کی ہے

مجھے جو ہدایات لیگ کی طرف سے دی جائیں مجھے انکی پابندی کرنی ہو گی۔ میاں صاحب نے میری رائے دریافت کی۔ میں نے مختصر طور پر اپنا اور اپنے رفقائے کار کا رجحان بیان کر دیا۔ میاں صاحب نے فرمایا تو بس یہی ٹھیک ہے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

تقسیم کے بعد قسم قسم کی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں جن کی بنیاد کسی حقیقت پر نہیں۔ کہا گیا ہے کہ چونکہ نواب صاحب ممدوٹ کی خاندانی جاگیر کا بیشتر حصہ تحصیلوار بٹوارے میں پاکستان میں شامل کئے جانے کی امید کی جا سکتی تھی اس لئے انہوں نے تحصیلوار بٹوارے پر زور دیا۔ یہ ایک بالکل بے بنیاد اتہام ہے۔ میری دانست میں نواب صاحب ان تفاصیل سے بالکل ناواقف تھے اور اگر واقف تھے بھی تو یہ واقعہ ہے کہ اس بارے میں انکی طرف سے مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا نہ میں نے ان سے دریافت کیا نہ انہوں نے خود کچھ صراحتًہ یا اشارۃً فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں صوبے کے حالات میں تیزی کے ساتھ ابتری پیدا ہو رہی تھی طبائع میں انتشار اور سراسیمگی تھی۔ متعلقہ کارکنان صوبہ کے لئے کسی امر پر سنجیدگی سے غور کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان اہم امور کے متعلق پہلے سے نہ کوئی تیاری کی گئی تھی نہ متعلقہ اصحاب نے اس پر غور کیا تھا لہٰذا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ بعد میں پیدا ہونے والے حالات ابھی پردہ غیب میں تھے اور اس وقت ان کے متعلق صحیح اندازہ ممکن نہ تھا۔ آج جو الوالحکم ہونے کے مدعی ہیں اس وقت نہ معلوم کیوں خاموش اور دم بخود تھے۔

میں اپنے رفقائے کار کے ساتھ دیر تک مشورے اور تیاری میں مصروف رہا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد بھی کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر اعداد شمار کی پڑتال اور سرکاری اعلان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور تحریری بیان کیلئے نوٹ تیار کرنے میں بہت سا وقت صرف ہوا۔ غرض منگل کا دن بڑی پریشانی میں کٹا۔ لیکن سونے کے وقت تک میری طبیعت میں کسی قدر سکون پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بنیادی مواد بھی میسر فرما دیا ہے اور مخلص رفقاء کار بھی عطا فرما دیئے ہیں لاعلمی کی تاریکی میں کچھ اجالا بھی کر دیا ہے۔ بدھ کی صبح کو میں جلد تیار ہو کر ناشتے سے فارغ ہو گیا سات بج چکے تھے لیکن نواب صاحب کے موعودہ زود نویس ابھی تشریف نہیں لائے تھے ان کے انتظار میں کاغذات کی مزید دیکھ بھال اور تیاری میں مصروف رہا حتیٰ کہ آٹھ بج گئے۔ میں پھر پریشان ہوا۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں ٹیلیفون پر گذارش کی انہوں نے فرمایا میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ ان کے دو نوں سٹینوگرافر معہ ضروری سامان نو بجے تک میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ یہ دونوں صاحبان نو بجے سے پہلے ہی تشریف لے آئے اور میں نے تحریری بیان کا مسودہ لکھوانا شروع کر دیا۔ اتنے میں میرے رفقاء کار بھی تشریف لے آئے اور میرے ساتھ شامل ہو گئے۔ میں لکھواتا جاتا اور وہ جہاں ضرورت سمجھتے مشورہ دیتے یا اصلاح کرتے۔ دونوں زود نویس اپنے فن کے ماہر تھے اور بہت توجہ، محنت اور اخلاص کے ساتھ کام کرتے رہے جس سے ہمارے لئے بہت سہولت ہو گئی۔ جزاہم اللہ احسن الجزا۔ نواب صاحب کے موعودہ زود نویس بحث کے آخر تک ہمیں میسر نہ آئے نہ ہی نواب صاحب کی طرف سے کوئی

اطلاع ملی کہ وہ کیا ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی طرف سے مسلم لیگ کے کیس کی تیاری میں گراں قدر امداد۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان دنوں لاہور ہی میں تشریف فرما تھے بدھ کی سہ پہر کو مولانا عبدالرحیم درد صاحب تشریف لائے اور فرمایا حضرت صاحب نے یہ دریافت کرنے کیلئے مجھے بھیجا ہے کہ حضور کس وقت تشریف لاکر تمہیں تقسیم کے بعض پہلوؤں کے متعلق معلومات بہم پہنچا دیں۔ خاکسار نے گذارش کی کہ جس وقت حضورؓ کا ارشاد ہو خاکسار حضورؓ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔ درد صاحب نے فرمایا حضورؓ کا ارشاد ہے کہ تم نہایت اہم قومی فرض کی سرانجام دہی میں مصروف ہو تمہارا وقت بہت قیمتی ہے تم اپنے کام میں لگے رہو۔ ہم وہیں تشریف لائیں گے موجودہ حالات میں یہی مناسب ہے۔ چنانچہ حضور تشریف لائے اور بٹوارے کے اصولوں کے متعلق بعض نہایت مفید حوالوں کی نقول خاکسار کو عطا کیں اور فرمایا اصل کتب کے منگوانے کیلئے ہم نے انگلستان فرمائش بھیجی ہوئی ہے اگر وہ کتب بروقت پہنچ گئیں تو وہ بھی تمہیں بھیج دی جائیں گی۔ نیز ارشاد فرمایا ہم نے اپنے خرچ پر دفاع کے ایک ماہر پروفیسر کی خدمات انگلستان سے حاصل کی ہیں وہ لاہور پہنچ چکے ہیں اور نقشہ جات وغیرہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ تم تحریری بیان تیار کرلینے کے بعد ان کے ساتھ مشورے کیلئے وقت نکال لینا۔ وہ یہاں آکر تمہیں یہ پہلو سمجھا دینگے۔ چنانچہ متعلقہ کتب انگلستان سے قادیان پہنچیں اور وہاں سے ایک موٹر سائیکل سوار انہیں سائڈ کار میں رکھ کر لاہور لے آئے اور دوران بحث وہ ہمیں میسر آگئیں ان سے ہمیں بہت مدد ملی۔ پروفیسر سپیٹ نے دفاعی پہلو مجھے خوب سمجھا دیا۔ ہندو فریق کی طرف سے مسٹر ایم ایل سیتلواڈ نے ہندوستان کے دفاع کی ضروریات کی بنا پر بڑے زور سے دریائے جہلم تک کے علاقے کا مطالبہ کیا۔ لیکن میری طرف سے پروفیسر سپیٹ کے تیار کردہ نقشہ جات کے پیش کرنے اور ان کی اہمیت واضح کرنے کے بعد فریق مخالف کی طرف سے کوئی معقول جواب اس موضوع پر نہ دیا گیا۔ بحث کے دوران میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی خود بھی اجلاس میں تشریف فرما رہے۔ اور دعا سے مدد فرماتے رہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

جسٹس دین محمد صاحب کا انکشاف کہ پنجاب کی حد بندی کی لائن بالا بالا طے پا چکی ہے اور حد بندی کمیشن کی کاروائی ایک ڈھونگ ہے

بدھ کی شام کو جسٹس دین محمد صاحب تشریف لائے وہ بہت پریشان معلوم ہوتے تھے۔ فرمایا تم اپنی طرف سے تحریری بیان تیار کرو اور جیسے بن پڑے بحث بھی کرنا لیکن میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ سب کاروائی محض کھیل ہے۔ حد بندی کا فیصلہ ہو چکا ہوا ہے اور اسی کے مطابق حد بندی ہوگی۔ میں نے پوچھا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ انہوں نے فرمایا کل جب تم لوگ چلے گئے تو سر سیرل ریڈ کلف نے ہمیں بتایا کہ وہ کل صبح ہوائی جہاز میں اردگرد کا علاقہ دیکھنے جائیں گے اس پر میں نے کہا اگر آپ حد بندی کے سلسلے میں متنازعہ علاقہ کیلئے دیکھنے جا رہے ہیں تو آپ ضرور اس معائنے سے کچھ تاثر لیں گے لطور امپائر آپ

کا فرض ہے کہ اپنا فیصلہ اس مواد کی بنا پر کریں جو کمشن کے روبرو پیش کیا جائے اور جو کمشن آپ کی خدمت میں ارسال کرے۔ اس معائنے سے جو تاثر آپ لیں گے اس کا علم کمشن کو کس طرح ہوگا؟ سر سیرل نے کہا اس پرواز کے لئے جو ہوائی جہاز مجھے مہیا کیا گیا ہے وہ فوجی قسم کا ہے اور اس میں زیادہ سواریوں کے لئے گنجائش نہیں۔ لیکن اگر آپ پسند کریں تو آپ میں سے دو اراکین میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم رکن ریڈکلف کے ساتھ جائیں۔ روانگی آج صبح سات بجے والٹن کے ہوائی اڈے سے تھی۔ جب یہ سب وہاں جمع ہوئے تو فضا گرد آلود تھی پائیلٹ نے کہا میں آپ کو لے تو چلتا ہوں لیکن گرد کی وجہ سے اوپر سے آپ کو کچھ نظر نہیں آئیگا اور آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ اس پر ریڈکلف نے پرواز منسوخ کردی پائلٹ کو اس پرواز کے لئے جو تحریری ہدایات تھیں وہ میں نے دیکھی ہیں تحریری ہدایات کے کاغذ پر پرواز کیلئے ایک لائن لگی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس لائن پر پرواز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے بالا بالا وہی حد بندی کی لائن پہلے سے طے پا گئی ہے۔
ریڈکلف کو برصغیر میں آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ انہوں نے کچھ دن کلکتے میں گذارے ہیں۔ پنجاب کی حد بندی کے سلسلہ میں ابھی فریقین نے اپنے تحریری بیانات کمشن کے روبرو پیش بھی نہیں کئے جن سے ریڈکلف صاحب کو معلوم ہوتا کہ کون کون سے علاقے متنازعہ ہیں۔ فریقین کے بیانات سے متنازعہ علاقہ جات معلوم ہونے سے قبل ہی ان کیلئے ان علاقوں میں ایک خاص لائن پر پرواز کرنے کا انتظام کرنے سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ حد بندی کے سلسلہ میں کسی طرف سے انہیں بریف کیا جا چکا ہے اور حد بندی کی لائن بھی تجویز کر کے ان کو دی جا چکی ہے جس کے مطابق بہت سا ایسا علاقہ جس میں مسلمانوں کی کثرت ہے بالخصوص ضلع گورداسپور کی تحصیلات بٹالہ و گورداسپور پاکستان میں شامل نہیں ہوں گی۔ ایسی صورت میں جبکہ حد بندی بالا بالا طے پا چکی ہے میرا اور منیر کا کمشن کے ڈھونگ میں شامل رہنا مناسب نہیں۔ میں آج رات دلی جا رہا ہوں کل صبح قائداعظم سے مل کر یہ ماجرا ان کے گوش گذار کروں گا اور ان سے اپنے اور منیر کے کمشن سے مستعفی ہو جانے کی اجازت طلب کروں گا۔ میں نے کہا اس واقعہ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حد بندی کا تعین پہلے سے ہو چکا ہے اور کمشن کی کارروائی محض ڈھونگ ہے۔ آپ ضرور دلی جائیں لیکن قائداعظم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کرتے ہوئے یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ وہ قانونی طبیعت کے مالک ہیں۔ اسلئے آپ اپنے استعفےٰ کی بنیاد کسی قانونی عذر پر رکھیں ورنہ وہ رضامند نہیں ہوں گے۔ جسٹس دین محمد نے پوچھا تمہارے ذہن میں کوئی قانونی عذر آتا ہے۔ میں نے کہا آپ کہیں کہ ہم نے سر سیرل ریڈکلف کو امپائر تسلیم کیا ہے اور ہم پر ان کے فیصلے کی پابندی لازم ہے لیکن امپائر کا فرض ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر پہنچنے میں کسی دوسرے شخص کی رائے یا مشورے سے متاثر نہ ہو پائلٹ کی ہدایات پرواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی جانب سے امپائر کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ صوبہ پنجاب کی تقسیم کے لئے حد بندی کی لائن وہ ہونی چاہیئے

جو ہدایات پرواز میں دکھائی گئی ہے۔ اب ہمارا حق ہے کہ امپائر کی مجوزہ پرواز کی غرض دریافت کریں اور یہ بھی دریافت کریں کہ اس لائن پر پرواز کرنے کا کس نے مشورہ دیا اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ اگر ظاہر ہو کہ کسی دوسرے شخص نے مشورہ دیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں امپائر کی غیر جانبداری پر اطمینان نہیں رہا لہٰذا کمشن کے پاکستانی نمائندے استعفٰی دے رہے ہیں۔ جسٹس دین محمد نے فرمایا میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گا اور پرسوں صبح دلی سے واپسی پر تمہیں اپنی ملاقات کے نتیجے سے مطلع کر دوں گا۔

جمعرات کی شام تک تحریری بیان کا مسودہ تیار ہو گیا۔ میں نے سردار شوکت حیات خاں صاحب کے دولت خانے پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ سردار صاحب کی طبیعت ابھی تک علیل ہے بخار کا درجہ حرارت ۱۰۲ ہے اسلئے ٹیلیفون پر آنے سے معذور ہیں۔ پھر میں نے میاں ممتاز محمد خاں صاحب کی خدمت میں ٹیلیفون پر عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں آپ اور سردار صاحب دونوں تشریف لاکر مسودے کا ملاحظہ فرمالیں لیکن سردار صاحب تو ناسازی طبع کی وجہ سے معذور ہیں لہٰذا آپ ضرور تشریف لائیں اور تحریری بیان کا مسودہ دیکھ لیں۔ چنانچہ وہ تشریف لے آئے۔ میں نے تحریری بیان کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور گذارش کی کہ آپ اسے پڑھ لیں اور جو ترمیم آپ اس میں پسند فرمائیں وہ مجھے بتا دیں تاکہ آپ کے ارشاد کے مطابق اصلاح کر دی جائے۔ انہوں نے فرمایا جو کچھ تم نے لکھا ہے ٹھیک ہی ہوگا۔ مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اصرار کیا آپ ضرور توجہ سے اسے پڑھیں اور آزادی سے تنقید کریں میں مسلم لیگ کی طرف سے بحث کرنے کی خاطر اطمینان چاہتا ہوں کہ لیگ کی طرف سے مجھے کیا ہدایت ہے۔ جس مسودے کی آپ تصدیق فرمادیں گے وہی میرا ہدایت نامہ ہوگا اور اسی کے مطابق میں بحث کروں گا۔ میرے اصرار پر میاں صاحب نے مسودہ توجہ اور غور سے پڑھا اور پڑھنے کے دوران میں بھی پسندیدگی کا اظہار فرماتے رہے اور آخر میں فرمایا اس سے بہتر تحریری بیان نہیں ہو سکتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے تحریری بیان پیش کر دیا گیا | جمعہ کی صبح کو میں نے مسودے کی آخری نظر ثانی کی اور صاف ٹائپ ہونے کے لئے دیدیا۔ جسٹس دین محمد صاحب دلی سے واپسی پر سٹیشن سے سیدھے میری جائے قیام پر تشریف لائے اور بتایا کہ قائداعظم استعفٰی کی تجویز پر رضامند نہیں ہوئے انہوں نے فرمایا ہے تم سب لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کرو امید ہے سب کچھ ٹھیک ہوگا۔ مسودہ صاف ٹائپ ہو گیا تو میں نے شیخ نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ کے سپرد کیا اور وہ اسے باؤنڈری کمشن کے دفتر میں بارہ بجے سے قبل داخل کر آئے۔ مسجد احمدیہ میں جمعہ کے خطبہ میں میں نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس مشکل وقت میں آستانہ الٰہی پر گرنے اور بہت خشوع اور عاجزی سے دعائیں کرنے کی تاکید کی۔

حد بندی کمشن کے روبرو بحث لاحاصل | جمعہ کا باقی دن اور ہفتہ اور اتوار دونوں دن بحث کی تیاری میں صرف ہوئے۔ سوموار کو کمشن کے روبرو بحث شروع ہوئی فریق مخالف کی طرف سے مسٹر موتی لعل ستیلواڈ جو تقسیم کے بعد بھارت کے اٹارنی جنرل مقرر ہوئے نے بحث کی۔ ان کے معاونوں اور مشیروں میں چیدہ چیدہ ہندو وکلاء شامل تھے جن میں بخشی ٹیک چند صاحب پیش پیش تھے۔ جس دن بحث ختم ہوئی اس سہ پہر کو مسٹر موتی لعل ستیلواڈ شیخ عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ کے ہاں چائے پر مدعو تھے۔ چائے پر انہوں نے شیخ صاحب سے فرمایا اگر حد بندی کا فیصلہ بحث میں پیش کردہ دلائل کی بنا پر ہوا تو تم لوگ بازی لے جاؤ گے۔" لیکن کمشن کی کاروائی ڈھونگ اور کمشن کے روبرو بحث مباحثہ بالکل لاحاصل تھا۔

سر سید مراتب علی صاحب مرحوم کی بے غرض روائتی مہمان نوازی | قیام لاہور کے دوران میں میرے معزز اور محترم میزبان سر سید مراتب علی صاحب مرحوم نے میرے اور میرے رفقاء کی خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا ہم سب کے دل ان کے بے شمار احسانوں اور عنایتوں کے احساس سے پُر تھے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ چونکہ ان ایام میں ان کا دولتکدہ کمشن کے روبرو مسلم لیگ کی نمائندگی کا مرکز بن گیا تھا اسلئے خورد و نوش کے سلسلے میں ان کی مہمان نوازی بہت وسیع ہوتی گئی لیکن یہ امر ان کی دلی راحت کا موجب ہوا اور انہوں نے یہ فرض اپنی روائتی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے سر انجام دیا۔ بحث کے لئے ہم سب کے عدالت جانے اور وہاں سے لوٹنے کے لئے سواری کا انتظام بھی سید صاحب ہی فرماتے رہے۔ غرض تواضع کا کوئی پہلو کسی وقت ان کی باریک بین نگاہ سے اوجھل نہ ہوا۔ انہوں نے یہ سب خدمت اور تواضع اس اعلیٰ پیمانے پر ایسے حالات میں سر انجام دی جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا اور یہ سب فرائض انہوں نے خالصتہً رضاکارانہ طور پر اپنے ذمے لئے تھے۔

قائد اعظم کا اظہار خوشنودی | میں بحث کے سلسلے میں ابھی لاہور ہی میں تھا کہ مجھے قائد اعظم کا پیغام ملا کہ کمشن سے فارغ ہونے کے بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بھوپال جاؤں۔ انہوں نے کمال شفقت سے شام کے کھانے کی دعوت دی حاضر ہونے پر معانقے کا شرف بخشا اور فرمایا میں تم سے بہت خوش ہوں اور تمہارا نہایت ممنون ہوں کہ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے اسے اعلیٰ قابلیت سے اور نہایت احسن طریق سے سر انجام دیا۔ کھانے کے دوران میں طریقہ تقسیم اور کاروائی تقسیم کے موضوع پر گفتگو رہی۔ آپ سے رخصت ہو کر میں بھوپال چلا گیا۔

پنجاب کی حد بندی کے متعلق ریڈکلف کا غیر منصفانہ فیصلہ | حد بندی کے فیصلے کے اعلان میں دیر ہوتی گئی۔ فیصلے کا اعلان ۱۷ اگست کو ہوا۔ ان دنوں میں بھوپال میں تھا۔ ریڈیو پر فیصلے کا اعلان سنکر مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ فیصلے میں حد بندی کی تقریباً وہی لائن مقرر کی گئی جس پر حد بندی کے تنازعہ کے متعلق فریقین کے تحریری بیانات کمشن کے روبرو پیش ہونے سے بھی دو دن پہلے ریڈکلف نے معائنہ کے لئے پرواز کا ارادہ ظاہر کیا تھا

جو موسم کی خرابی کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے پرواز کے لئے پائلٹ کو جو ہدایات تھیں ان کا نقشہ جسٹس دین محمد صاحب کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اسے دیکھ کر انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ باؤنڈری کمشن کی کاروائی صرف ایک ڈھونگ ہے اور جو لائن پرواز کی ہدایات والے نقشہ میں دکھائی گئی ہے وہی لائن بالا بالا پنجاب کی تقسیم کے لئے حد بندی کی لائن مقرر کی جا چکی ہے جس کے مطابق مسلم آبادی کی اکثریت والے کئی علاقے بالخصوص تحصیلات گورداسپور اور بٹالہ پاکستان کی بجائے ہندوستان میں شامل کئے جائیں گے۔ جس دن ریڈ کلف نے پنجاب باؤنڈری کمشن کے اراکین پر اپنے معائنہ کے ارادے کا اظہار کیا اس دن انہیں ہندوستان آئے ابھی صرف چھ دن ہوئے تھے۔ وہ ۸ر جولائی کو دلی پہنچے تھے اور ایک دو دن کے قیام کے بعد بنگال باؤنڈری کمشن کے سلسلہ میں کلکتہ چلے گئے تھے۔ یہاں سے وہ ۱۴ر جولائی کو لاہور آئے۔ یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ ان دو ایک دنوں میں جو وہ دلی میں ٹھہرے انہوں نے پنجاب کی تقسیم کے تنازعے کا خود مطالعہ کیا ہو اور بغیر فریقین کے دعاوی کو سُنے حد بندی کے لئے خود ایک لائن تجویز کر کے اس پر معائنہ کے لئے پرواز کا فیصلہ کیا ہو۔ اس وقت تک وہ نہ پنجاب حد بندی کمشن کے اراکین سے ہی ملے تھے نہ متعلقہ فریقین کے بیانات ہی دیکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ حد بندی کی یہ لائن کسی اور نے تیار کرائی اور اس کا معائنہ کرنے کی انہیں ہدایت دی۔ یہ صرف قیاس ہی نہیں بلکہ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے کہ پائلٹ کی ہدایات پرواز والا نقشہ مونٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے کے دفتر میں تیار کیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ہدایات پرواز والا نقشہ دیکھ کر جسٹس شیخ دین محمد صاحب نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا وہ انہوں نے قائداعظم سے بیان کر کے حد بندی کمشن سے مستعفی ہونے کی اجازت چاہی تھی۔ قائداعظم نے کمشن سے مستعفی ہونے کی اجازت تو نہ دی لیکن ۸ر اگست ۱۹۴۷ء کو جسٹس دین محمد صاحب کی رپورٹ کی بنا پر انہوں نے چودھری محمد علی صاحب کی زبانی لارڈ اسمے کو ایک پیغام بھیجا کہ پنجاب کی تقسیم اور بالخصوص ضلع گورداسپور کی تقسیم کے متعلق انہیں تشویشناک رپورٹیں مل رہی ہیں اور اگر حد بندی وہی قرار پائی جس کے متعلق اطلاعات مل رہی ہیں تو اس سے پاکستان اور انگلستان کے تعلقات متاثر ہوں گے۔ چودھری محمد علی صاحب اپنی قابلِ قدر تصنیف جس کا نام "THE EMERGENCE OF PAKISTAN" ہے میں لکھتے ہیں کہ وہ یہ پیغام لیکر لارڈ اسمے سے ملنے وائسرائے ہاؤس گئے۔ اسمے اس وقت ریڈ کلف سے مذاکرات میں مصروف تھے۔ چودھری صاحب نے انتظار کیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اسمے فارغ ہوئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ چودھری صاحب نے قائداعظم کا پیغام پہنچایا اسمے نے کہا کہ انہوں نے یا مونٹ بیٹن نے حد بندی کے معاملہ میں ریڈ کلف سے کبھی کوئی بات نہیں کی اور انہیں اس امر کے متعلق ریڈ کلف کے خیالات کا کوئی علم نہیں۔ انہوں نے وضاحت سے کہا کہ حد بندی کے متعلق ریڈ کلف کو ان کی یا مونٹ بیٹن کی طرف سے کوئی مشورہ نہ دیا گیا ہے نہ ہی دیا جائے گا۔ جب چودھری صاحب نے اس رپورٹ

کی تفصیل بیان کی جو قائداعظم کو ملی تھی تو اسمے نے کہا کہ انہیں چودھری صاحب کی بیان کردہ تفصیل سمجھ نہیں آرہی۔ اسمے کے کمرے کی دیوار پر ایک نقشہ لٹک رہا تھا۔ چودھری صاحب نے اسمے کو اشارے سے نقشے کے قریب بلایا تاکہ نقشہ سے اپنی بات کی وضاحت کر سکیں۔ چودھری صاحب نے دیکھا کہ اس نقشہ پر صوبہ پنجاب میں پنسل سے ایک لکیر لگی ہوئی تھی جو بالکل اس رپورٹ کے مطابق تھی جو قائداعظم کو ملی تھی۔ چودھری صاحب نے اسمے سے کہا قائداعظم کو جو رپورٹ ملی اسکی وضاحت کیلئے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے نقشے پر پنسل سے لگی ہوئی لائن خود منہ سے بول رہی ہے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں:۔

"ISMAY TURNED PALE AND ASKED IN CONFUSION WHO HAD BEEN FOOLING WITH HIS MAP"

(اسمے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا میرے نقشے میں کس نے یہ گڑبڑ کی ہے)

آج تک نہ تو ریڈ کلف کی طرف سے اور نہ ہی مونٹ بیٹن کی طرف سے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ پنجاب حدبندی کمشن کے اجلاس کے لئے لاہور پہنچنے سے پیشتر اور تنازعہ کے متعلق فریقین کے تحریری بیانات سے واقف ہونے سے پہلے ہی ریڈ کلف کیلئے جس لائن پر معائنہ کیلئے پرواز کا انتظام کیا گیا اس لائن کا نقشہ کس نے تجویز کیا۔ اور اس معائنہ کی غرض کیا تھی۔ کیا یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ریڈ کلف نے تقریباً اسی لائن کو ہی حدبندی لائن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جو ہدایات پرواز میں دکھائی گئی تھیں۔ چودھری محمد علی صاحب نے اپنی تصنیف میں اسمے کے نقشہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس کی بھی آج تک تردید یا وضاحت نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ریڈ کلف کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی پنجاب کی تقسیم کے لئے مونٹ بیٹن اور اس کے مشیروں نے حدبندی کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا اور ریڈ کلف کو صرف ایک دستخط کرنے والی مشین کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تقسیم ہند کے متعلق پچھلے سالوں میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُن سے جو انکشافات ہوئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مونٹ بیٹن اور کانگرس کے ایک خفیہ سمجھوتے کے نتیجے میں ہوا جس کے رو سے کانگرس نے ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہنا ان شرائط پر منظور کیا کہ اول تقسیم ملک کی تکمیل اور انتقال اختیارات دو مہینوں کے اندر اندر کیا جائے۔ دوئم صوبہ بنگال کی تقسیم ہو اور کلکتہ ہندوستان میں شامل کیا جائے اور سوئم صوبہ پنجاب کی تقسیم ہو کر گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلات ہندوستان میں شامل کی جائیں تاکہ ریاست کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کا جواز پیدا ہو سکے۔ ایٹلی کی وزارت کی طرف سے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہدایت تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے ہندوستان کی سالمیت قائم رکھی جائے اور فریقین کو کیبنٹ مشن پلان کے مطابق اختیارات کے انتقال پر رضامند کیا جائے۔ لبفرض محال اگر ملک کی تقسیم ناگزیر ہو تو بھی بشرطیکہ دفاع کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا انتظام کیا جائے کہ ہندوستانی افواج

کی تقسیم کی نوبت نہ آئے اور دفاع کا یہ ادارہ آل انڈیا بنیاد پر قائم رہے اور دونوں ملک بحر ہند کے علاقہ کی حفاظت میں تعاون کرنے کا معاہدہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اٹیلی وزارت کی یہ ہدایات برطانوی مفاد کی حفاظت کی غرض سے تھیں تاکہ بحر ہند کے علاقہ میں روس کے اثر کے نفوذ کو روکا جا سکے اور برطانیہ کے ہندوستان اور مشرق بعید کے تجارتی راستے محفوظ رہیں۔ ان ہدایات کے علاوہ مونٹ بیٹن خود بھی ملک کی تقسیم کے سخت خلاف تھے اور ہندوستانی افواج کے بٹوارے کا تو ذکر بھی انہیں ناگوار تھا۔ انہوں نے آخر وقت تک سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح فریقین کو کیبنٹ مشن والی تجاویز کے مطابق انتقال اختیارات پر رضامند کر سکیں لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ جب کیبنٹ مشن نے یہ تجاویز پیش کی تھیں تو تنازعہ ختم کرنے کی نیت سے قائداعظم نے ان تجاویز کو منظور کر لیا تھا۔ کانگرس لیڈران نے بھی روائتی پرکاری سے کام لیتے ہوئے اوپرے دل سے تو ان تجاویز کو منظور کر لیا لیکن فوراً بعد پنڈت نہرو اور بعض دوسرے کانگرس لیڈران نے اپنے پبلک بیانات اور تقریروں میں کیبنٹ مشن کی تجاویز کی ایسی ایسی تعبیریں کیں جن سے ظاہر ہو گیا کہ ان کی نیت ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے کی نہیں۔ کیبنٹ مشن کے ارکین کی ہمدردیاں اگرچہ مسلمہ طور پر کانگرس کے ساتھ تھیں لیکن انہوں نے ان "تعبیروں" کو غلط قرار دیا اور کوشش کی کہ کانگرس لیڈران ان تعبیروں کو ترک کر کے کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کا صاف صاف اقرار کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔ اس صورت حالات میں قائداعظم مونٹ بیٹن کے کہنے پر دوبارہ اس جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھے اور انہوں نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو جن کا گلا کانگرس لیڈر خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ چکے تھے دوبارہ زندہ کئے جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ مونٹ بیٹن کی شخصیت ضرور دلفریب تھی لیکن وہ سخت خود پسند تھے اور طبیعت میں خوشامد پسندی بدرجہ اتم تھی۔ جنگ میں جو کامیابی انہیں حاصل ہوئی تھی اس نے اُن کی خود پسندی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اپنے زعم میں وہ سمجھتے تھے کہ جس کام میں وہ ہاتھ ڈالیں اس میں انہیں لازماً کامیاب ہونا چاہیئے۔ ایسی طبیعت والے شخص پر اپنے موقف کی مخالفت ناگوار گذرتی ہے۔ اسلئے قائداعظم کا مستقل مزاجی سے ان کے دام میں آنے سے انکار انہیں سخت ناگوار ہوا۔ یوں تو اپنے تقرر سے پہلے بھی ان کی شہرت "کانگرس پسند" اور "مسلم لیگ کے مخالف" کی تھی۔ اپنے قیام سنگاپور کے دوران میں وہ پنڈت نہرو سے مل چکے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے۔ سر سٹیفورڈ کرپس کے دوست اور گاندھی جی کے ایلچی سدھیر گھوش کے قول کے مطابق کرپس نے مونٹ بیٹن کے تقرر سے پہلے لندن میں ان کی دوبارہ ملاقات پنڈت نہرو سے کرائی تھی اور اس طرح ان کے تقرر پر ایک طرح پنڈت جی کی رضامندی حاصل کی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد مونٹ بیٹن نے پنڈت نہرو اور دیگر کانگرس لیڈر ان سے ذاتی تعلقات قائم کئے اور اوّل الذکر سے کھلم کھلا دوستانہ مراسم بڑھائے۔ ان کی خوشامد پسند طبیعت کا اندازہ لگا کر پنڈت نہرو اور دوسرے کانگرس لیڈران نے ان کے جذبۂ خود پرستی کی ہر طرح تسکین کی اور ان کی اس کمزوری سے کماحقہ فائدہ

اٹھایا۔ قائداعظم تو خوشامد کے فن سے بالکل نا آشنا ایک سیدھے سادھے مگر اپنی دھن کے پکے انسان تھے لہٰذا وہ مونٹ بیٹن کے ذہن خود پسندی کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرسکے۔ اس کے برعکس انہوں نے مستقل مزاجی سے ملک کی تقسیم کے موقف پر قائم رہ کر مونٹ بیٹن کے اولین مقصد یعنی برِاعظم کی سالمیت کو ناکام بنا دیا اور انہیں ان کی اور برطانوی لیبر وزارت کی مرضی کے خلاف تقسیم ملک پر مجبور کر دیا۔ اس شکست سے مونٹ بیٹن کے پندار کو سخت ٹھیس لگی اور ان کے دل میں قائداعظم اور ان کے مطالبہ پاکستان کے خلاف گرہ بیٹھ گئی۔

قائداعظم کو تقسیم ملک کے مطالبے سے باز رکھنے کی نیت سے کانگرس نے جوابی مطالبہ کیا ہوا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوتا ہے تو پھر پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی بھی تقسیم ہو کر مسلم آبادی والے علاقے علیحدہ ہونے چاہئیں۔ جب مونٹ بیٹن قائداعظم کو کسی طرح بھی تقسیم ملک کے مطالبہ کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکے تو انہیں ان کے انگریز افسران نے جنہیں وہ انگلستان سے ساتھ لائے تھے مشورہ دیا کہ وہ قائداعظم کو صاف صاف الفاظ میں دھمکی دیں کہ اگر وہ کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے پر رضامند نہیں ہوتے تو پھر ملک کی تقسیم کی صورت میں بنگال اور پنجاب کے صوبے بھی لازماً تقسیم کئے جائیں گے۔ کانگرس کے چوٹی کے لیڈران کی طرف سے بھی انہیں یہی مشورہ دیا گیا بلکہ امید ظاہر کی گئی کہ جب بنگال اور پنجاب کے مسلمان اپنے صوبوں کی تقسیم کو ناگزیر پائیں گے تو وہ قائداعظم کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ ان مشوروں پر عمل کرتے ہوئے مونٹ بیٹن نے قائداعظم کو بہت ڈرایا دھمکایا لیکن وہ ان کے آہنی ارادے کو متزلزل نہ کر سکے۔ قائداعظم نے بامرِ مجبوری بنگال اور پنجاب کی تقسیم منظور کر لی لیکن مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت کا مطالبہ ترک نہ کیا۔ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں نے ان صوبوں کی تقسیم کے فیصلے کے باوجود قائداعظم کا ساتھ نہ چھوڑا اور کانگرس لیڈروں کی مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جانے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔

ایک کانگرس لیڈر نے مونٹ بیٹن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ مسلمانوں کا تقسیم ملک کا مطالبہ بظاہر منظور کر لیا جائے لیکن بنگال اور پنجاب کے صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ پاکستان ایک علیحدہ آزاد ملک کی صورت میں زیادہ دیر قائم رہ سکنے کے قابل نہ رہے اور مسلم لیگ مجبور ہو کر از خود انڈین یونین میں شامل ہو جانا منظور کرے۔ مونٹ بیٹن کو یہ تجویز "بڑی دانشمندانہ" معلوم ہوئی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور اس نے اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ حکمت عملی اختیار کرنے کے رستے میں مونٹ بیٹن کے لئے ایک بڑی دقت حائل تھی۔ اٹیلی کی وزارت کی طرف سے اسے ہدایت تھی کہ اگر ملک کو تقسیم کرنا پڑے تو کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ دونوں ملک برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہیں۔ قائداعظم تو ماؤنٹ بیٹن سے کہہ ہی چکے تھے کہ پاکستان دولت مشترکہ میں شامل رہے گا۔ لیکن کانگرس نے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی سے جو قرارداد مقاصد منظور کرائی تھی اس

میں واضح طور پر لکھا تھا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد بھارت ایک ری پبلک ملک ہوگا اور ان دنوں دولت مشترکہ میں ایک "ری پبلک" کی شمولیت کا جواز موجود نہ تھا۔ ہندوستان کی وحدت کے قیام میں ناکامی کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح کانگرس بھی برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہنا منظور کرے۔ ایسا ہونے سے ماؤنٹ بیٹن کی وہ خفت بھی مٹ سکتی تھی جو اپنے مقصد اوّل میں ناکام رہنے کی صورت میں لازمی تھی۔ کانگرس لیڈر بھی اتنے نادان نہ تھے کہ انہیں اپنے برے بھلے کی تمیز نہ ہوتی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ان کا طرفدار ہے اور اس سے بنائے رکھنے کی افادیت ان پر ظاہر تھی۔ وہ خود بھی کسی ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جس سے مجلس دستور ساز کی قرارداد مقاصد کے باوجود ہندوستان کا برطانیہ سے گہرا تعلق قائم رہ سکے۔ حکومت ہند کے ایک ہندو افسر وی۔ پی مینن تھے جو سردار پٹیل کے بڑے معتمد تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی انہیں اپنے خاص الخاص عملے میں شامل کر لیا تھا اور رفتہ رفتہ وہ ان کے بھی معتمد ہو گئے تھے۔ قرارداد مقاصد کی روک کو راستے سے ہٹانے کی غرض سے وی۔ پی مینن نے ایک سکیم تیار کی جس کے تحت ملک کی تقسیم ہو کر انتقال اختیارات دونوں ملکوں کو وقتی طور پر DOMINION STATUS کی بنیاد پر کئے جانے کی تجویز تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے وی۔ پی مینن کے ذریعے کانگرس کو پیشکش کی کہ اگر کانگرس یہ سکیم منظور کرے تو وہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی اختیارات منتقل کر دیں گے۔ مئی ۱۹۴۷ء کے دوسرے ہفتہ میں شملہ میں اس پیشکش پر ماؤنٹ بیٹن اور کانگرس لیڈران میں سے پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کے مابین گفت و شنید ہوئی اور ایک خفیہ سمجھوتا ہوا جس کے رو سے کانگرس نے اس پیشکش کو ان تین شرائط پر منظور کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اوّل انتقال اختیارات دو مہینوں کے اندر اندر مکمل کر دیا جائے۔ دوئم صوبہ بنگال کی تقسیم ہونے پر کلکتہ ہندوستان میں شامل کیا جائے اور سوئم صوبہ پنجاب کی تقسیم اس طور پر کی جائے کہ ضلع گورداسپور کی تحصیلات گورداسپور و بٹالہ کو جو مسلم اکثریت کے علاقے تھے ہندوستان میں شامل کیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے تینوں شرائط منظور کر لیں۔ پہلی شرط میں جو مطالبہ کیا گیا وہ صریحاً غیر معقول تھا۔ دو مہینوں کا عرصہ تو ایک متمول خاندان مشترکہ یا ایک کامیاب کاروباری شراکتی ادارے کی تقسیم کے لئے بھی کافی نہیں۔ ایک عظیم ملک کی تقسیم کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا تھا۔ اس شرط پر اصرار کرنے والوں کی منشاء تو یہ تھی کہ ملک کی تقسیم کو ناقابل عمل ثابت کیا جائے۔ انتظامی امور کا تجربہ رکھنے والے ماؤنٹ بیٹن کا اس غیر معقول شرط کو منظور کر لینا ظاہر کرتا ہے کہ خود ان کی نیت بھی یہی تھی۔ کانگرس لیڈروں اور ماؤنٹ بیٹن دونوں کو توقع تھی کہ عمل تقسیم میں اس جلدبازی سے جو گڑبڑ پیدا ہوگی اس کے نتیجے میں نوزائیدہ مملکت پاکستان کے لئے ایسی ایسی پرابلمز کھڑی ہوں گی کہ پاکستان کا قیام ناممکن ہو جائے گا اور مسلم لیگ کو مجبوراً ہندوستان کی سالمیت برقرار رہنے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔ یہ تو منشاء الٰہی تھی کہ پنجاب اور دلّی میں غیر مسلموں اور بالخصوص سکھوں نے مسلمانوں کا جو قتل و غارت برپا کیا اس کے باوجود اور دیگر جملہ نامساعد حالات کے باوصف پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور مخالفین

پاکستان کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔

شملہ میں ہونے والے خفیہ سمجھوتے کی جن شرائط کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پہلی دو شرائط تو اب ڈھکی چھپی نہیں کیونکہ تقسیم کے بعد سردار پٹیل نے جو کانگرس کے چوٹی کے لیڈروں میں سے نسبتاً صاف گو تھے اپنی پبلک تقریروں میں تسلیم کیا ہے کہ ان کی طرف سے یہ شرائط پیش کی گئی تھیں اور ان کے مانے جانے کے بعد ہی انہوں نے ملک کی تقسیم منظور کی تھی۔ کلکتہ کے متعلق سردار پٹیل کے مذکورہ بالا اعتراف کے علاوہ مونٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے نے اپنے MEMOIRS میں تسلیم کیا ہے کہ تقسیم ملک کی جس تجویز کی منظوری برطانوی وزارت سے حاصل کی گئی تھی اس کے مطابق کلکتہ کو ہندوستان میں شامل رکھا گیا تھا۔ یہ بات مسلم لیگ سے مخفی رکھی گئی اور ظاہر یہ کیا گیا کہ کلکتہ کے متعلق فیصلہ باؤنڈری کمشن کرے گا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ کلکتہ ہندوستان میں شامل رکھنے کا فیصلہ بالا بالا ہو چکا تھا اور برطانوی کیبنٹ اس پر صاد کر چکی تھی ظاہرا طور پر اس تنازعے کو بھی بنگال باؤنڈری کمشن کے سپرد کیا گیا اور ریڈکلف سے کلکتہ کے متعلق فیصلہ ہندوستان کے حق میں کرایا گیا۔ صرف یہی ایک بات ریڈکلف، مونٹ بیٹن اور خود اٹیلی کی وزارت کی جانبداری کا پول کھولنے کے لئے کافی ہونی چاہیئے۔ شملہ میں ہونے والے خفیہ سمجھوتے کی تیسری شرط ریاست جموں وکشمیر پر تسلط قائم کرنے کی غرض سے تھی اس شرط کو پورا کرنے اور تحصیلات گورداسپور اور بٹالہ کو جہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی ہندوستان میں شامل کرنے کیلئے جو پاپڑ بیلے گئے ان کا تفصیل سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

ریڈکلف کے لئے پروانہ کی ہدایات والی لائن اور ریڈکلف کے فیصلے کے مطابق مقرر کی جانیوالی حد بندی لائن میں تھوڑا سا فرق تھا۔ اول الذکر کے مطابق مسلم آبادی کی اکثریت والی تحصیلات فیروزپور اور زیرہ پاکستان کے علاقے میں شامل تھیں لیکن موخر الذکر حد بندی کے مطابق وہ دونوں تحصیلات بھی ہندوستان کے علاقے میں شامل کر دی گئیں۔ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ یہ تبدیلی جو ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے مفاد کے مزید خلاف تھی ریڈکلف سے ۸ راگست ۱۹۴۷ء کے دو ایک روز بعد کرائی گئی۔ ان دنوں پنجاب کے گورنر سر ایون جنکنز تھے۔ سکھوں سے ان کی ہمدردیاں مسلمہ ہیں۔ اور ان پر ہی کیا موقوف تھا خود مونٹ بیٹن اور اس کے عملے کے انگریز افسران بالخصوص لارڈ اسمے سکھوں کی فوجی خدمات کی وجہ سے سکھ مفاد سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور سب خواہشمند تھے کہ کسی طرح سکھوں کی امداد کی جائے۔ سکھوں کی طرف سے زور دیا جارہا تھا کہ پنجاب کی تقسیم پر نہری نو آبادیات جن کی اراضیات کی آباد کاری میں انہوں نے بہت محنت کی ہے ہندوستان میں شامل کئے جائیں۔ گورنر جنکنز کے خیال کے مطابق سکھوں کا یہ مطالبہ بالکل غیر منصفانہ نہ تھا۔ گورنر جنکنز کے استفسار کے جواب میں مونٹ بیٹن کے پرائیوٹ سیکرٹری

جارج ایبل نے ۸ راگست ۱۹۴۷ء کو جینکنز کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جینکنز کی اطلاع کیلئے ایک خط لکھا جس کے ساتھ ایک نقشہ منسلک تھا جس میں پنجاب کی حد بندی کی وہی لائن دکھائی گئی تھی جو پائیلٹ کی ہدایات پروازمیں تھی اور جس کے مطابق گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلات تو ہندوستان میں شامل تھیں لیکن فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلات پاکستان میں شامل تھیں ۔ جارج ایبل کے خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ منسلکہ نقشہ اس حد بندی لائن کا ہے جو ریڈ کلف اپنے فیصلے میں مقرر کر رہے ہیں۔ یہ خط مسٹر موڈی کو جنہیں قائداعظم نے انتقال اختیارات کے بعد جینکنز کی بجائے پنجاب کا گورنر مقرر کیا جینکنز کے خفیہ کاغذات میں ملا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جارج ایبل نے یہ خط جینکنز کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جینکنز کی اطلاع کے لئے لکھا تھا لیکن نہ تو ریڈ کلف کی طرف سے اور نہ ہی مونٹ بیٹن کی طرف سے اس تبدیلی کی کوئی معقول وجہ پیش کی گئی ہے جو ۸ راگست کے بعد حد بندی میں کی گئی۔ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ جولائی ۱۹۴۷ء کے آخری عشرے میں جن دنوں ریڈ کلف حد بندی کمشن کی کاروائی کے سلسلہ میں دلی میں تھا اور ظاہرا طور پر حد بندی کا تعین کرنا ان کے سپرد تھا مونٹ بیٹن کے دفتر میں یہ بات اکثر زیر بحث رہتی تھی کہ سکھوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے حد بندی کی لائن کہاں لگائی جائے۔ سکھوں کے ایک مسلمہ ہمدرد مسٹر پینڈرل مون سابق انڈین سول سروس نے اپنی کتاب "DIVIDE AND QUIT" میں لکھا ہے کہ جولائی ۱۹۴۷ء کے آخری عشرے میں اس مسئلہ پر کئی مرتبہ ان کی گفتگو مونٹ بیٹن کے سٹاف سے ہوئی جن میں وی پی مینن شامل تھے اور موخرالذکر نے ان سے دریافت کیا :-

"WHETHER BY ANY <u>JUGGLING WITH THE LINE</u> THE DANGER OF DISTURBANCES (BY SIKHS) COULD BE DIMINISHED ?"

(کیا حد بندی کی لائن میں کچھ ہیرا پھیری کرنے سے فسادات کے خطرے کو کم نہیں کیا جاسکتا ؟)

مسٹر پینڈرل مون کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حد بندی کمشن اور ریڈ کلف تو محض دکھاوا تھے ورنہ حد بندی کا تعین مونٹ بیٹن کے عملے (واسیے وغیرہ) نے کرنا تھا اور ریڈ کلف کا کام صرف اس پر دستخط کرنا تھا۔ ۸ ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مجوزہ حد بندی لائن میں ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے مفاد کے مزید خلاف جو تبدیلی کی گئی اور فیروزپور اور زیرہ تحصیلات جن میں مسلمانوں کی کثرت تھی ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے وہ از قسم "ہیرا پھیری" ہی تھی جو سکھوں کی اشک شوئی کے لئے کی گئی۔

مونٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی کے محرکات | ہندوستان کی تقسیم کے سلسلہ میں مونٹ بیٹن نے پاکستان کے منصوبہ کی مخالفت میں جو کردار ادا کیا اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ خود ابتدا ہی سے اس مطالبہ کے خلاف تھے۔

علاوہ ازیں اٹیلی وزارت نے ان کے ذمہ یہ فرض عاید کیا تھا کہ ہندوستان کی سالمیت بحال رکھنے اور کانگرس اور مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے پہ آمادہ کریں۔ قائداعظم کی مستقل مزاجی نے انہیں اس مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہونے دیا اور انہوں نے اس ناکامی کو ذاتی شکست سمجھ لیا۔ بیشک پنڈت نہرو سے ان کی ذاتی دوستی اور پنڈت جی اور دوسرے کانگرس لیڈروں کی چاپلوسی بھی مونٹ بیٹن کی خوشامد پسند طبیعت پر اثر انداز ہوئی ہو گی لیکن جس شدت سے انہوں نے پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کیا اس سے انکی قائداعظم اور ان کے مشن سے ذاتی رنجش اور عناد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جب مونٹ بیٹن کی سر توڑ کوشش کے باوجود قائداعظم کیبنٹ مشن کی تجاویز کو زندہ کئے جانے پر رضامند نہ ہوئے اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تو مونٹ بیٹن کو اپنی خفت مٹانے کی یہ تجویز سوجھی کہ ہندوستان تقسیم ہو کر بھارت اور پاکستان دو ڈومینین قائم کئے جائیں جو دونوں برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہیں اور وہ دونوں ڈومینینز کے پہلے گورنر جنرل ہوں۔ قائداعظم نے تو پاکستان کے برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہنے پر رضامندی دیدی ہوئی تھی اور مونٹ بیٹن نے کانگرس کو بھی خفیہ سمجھوتے کی شرائط پر اس پہ آمادہ کر لیا تھا۔ اب صرف اس کی یہ بڑی خواہش باقی تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں اسے پہلے گورنر جنرل کے طور پہ قبول کر لیں۔ کانگرس نے مونٹ بیٹن کا بھارت کا پہلا گورنر جنرل ہونا منظور کر لیا لیکن قائداعظم نے اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے زعم میں مونٹ بیٹن کو یقین تھا کہ قائداعظم بھی اس تجویز کو منظور کر لیں گے اور انہوں نے کانگرس لیڈروں اور برطانوی وزارت کو بھی یقین دلایا ہوا تھا کہ یہ تجویز مسلم لیگ اور اس کے قائد کو بھی منظور ہو گی۔ قائداعظم کے انکار نے جہاں انکی امیدوں کے محل کو چکنا چور کر دیا وہاں انہیں برطانوی وزارت اور کانگرس لیڈروں سے خفت بھی اٹھانی پڑی۔ ان کے پندار پہ یہ آخری ضرب ایسی کاری پڑی کہ وہ بوکھلا گئے اور قائداعظم سے اس مسئلہ پہ گفتگو کے دوران دھمکیوں اور تخفیف الحرکتی پہ اتر آئے۔ یہ گفتگو ۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی۔ دو دن بعد مونٹ بیٹن نے قائداعظم کے انکاری فیصلے کی رپورٹ سیکریٹری آف سٹیٹ کو بھیجی۔ اس میں اس گفتگو کو ایک "BOMBSHELL" قرار دیتے ہوئے لکھا "میں نے ان (قائداعظم) سے دریافت کیا معلوم ہے آپ کو یہ انکار کتنا مہنگا پڑے گا؟ انہوں نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا ہاں ASSETS کی تقسیم میں غالباً کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا کروڑوں کا نہیں بلکہ آپ سارے "ASSETS" کھو بیٹھیں گے اور پاکستان کا مستقبل بھی۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔" (مونٹ بیٹن کی رپورٹ نمبر ۱۱ محررہ ۴ جولائی ۱۹۴۷ء بنام سیکریٹری آف سٹیٹ)۔ اس دھمکی سے اور اس بد خلقی سے جس کا اعتراف خود مونٹ بیٹن نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم کے انکار سے انہیں سخت تکلیف پہنچی اور انہوں نے اسے ذاتی

شک سمجھتے ہوئے قائد اعظم سے اس کا بدلہ لینے اور پاکستان کے منصوبے کو ناکامیاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ تقسیم ہند کے سلسلہ میں مونٹ بیٹن پر جنبہ داری کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی تردید میں مونٹ بیٹن نے ایک انگریز مصنف مسٹر ہاڈسن سے ایک کتاب شائع کرائی ہے جس کا نام "THE GREAT DIVIDE" ہے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کے نام مونٹ بیٹن کی متذکرہ بالا رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے ان صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "اپنی انا کے زخمی ہونے پر وہ اس رپورٹ میں اپنے معاندانہ ردِ عمل کے اظہار سے باز نہ رہ سکے۔" انتقالِ اختیارات کے بعد مونٹ بیٹن نے انڈین اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے جس گرمجوشی کا اظہار کیا اس کا مقابلہ اس تقریر سے کرتے ہوئے جو مونٹ بیٹن نے پاکستان اسمبلی میں کی جس میں ویسی گرمجوشی کا فقدان تھا۔ یہی مصنف تسلیم کرتے ہیں کہ "علاوہ اور باتوں کے مسٹر جناح نے مونٹ بیٹن کے دونوں ڈومینینز کا گورنر جنرل ہونے کی امیدوں پر جو پانی پھیر دیا تھا ممکن ہے اس کی رنجش ابھی مونٹ بیٹن کے دل میں باقی ہو۔" مونٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی اتنی ظاہر و باہر ہے کہ ان کے مداحین کو بھی دبی زبان سے ہی سہی اس کے محرکات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے بطور صدر اعظم حیدر آباد جانے کی پیشکش

آخر اگست ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم نے مجھے بھوپال سے کراچی طلب فرمایا۔ حاضر ہونے پر فرمایا میر لائق علی حیدر آباد سے آئے تھے اور اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے پیغام لائے تھے کہ میں تمہیں صدر اعظم کی حیثیت سے حیدر آباد جانے پر آمادہ کروں تاکہ تم اعلیٰ حضرت اور حکومت ہند کے درمیان مناسب سمجھوتے کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت کی واضح تحریر لائیں کہ جو مشورہ تم دو گے یا جو تجویز تم کرو گے وہ اعلیٰ حضرت قبول فرمائیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔ میں نے عرض کیا میں تو کسی شرط پر بھی حیدر آباد جانے کے لئے تیار نہیں۔ فرمایا یہ صورت ہی پیدا نہیں ہوگی کیونکہ اعلیٰ حضرت میری مطلوبہ تحریر نہیں دیں گے۔

اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کرنے کے لئے قائد اعظم کا ارشاد

فرمایا دراصل میں نے تمہیں اسلئے بلایا ہے کہ تم اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کرو۔ اس وقت تمہارا کیا پروگرام ہے؟ میں نے عرض کیا میرا پروگرام تین چار دن کے لئے لاہور جانے کا ہے تاکہ اپنے عزیز و اقارب کی خیریت معلوم کروں اور یہ بھی معلوم کروں کہ موجودہ طوفان و تلاطم میں ان کی کیا حالت ہے۔ فرمایا اچھا چلے جاؤ۔ تمہارے جانے آنے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ لیکن ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو واپس ضرور پہنچ جانا۔ لاہور میں جو کیفیت میں نے دیکھی وہ ناگفتہ بہ تھی مزید برآں میرے بھائی شکر اللہ خاں بیمار ہو کر ڈسکہ سے میو ہسپتال لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ تپ دق کے آخری مراحل سے جلد جلد گزر رہے ہیں اور معالج مایوس ہو چکے ہیں۔ میں نے عزیزم عبداللہ خاں سے کہا کہ انہیں اب ہسپتال سے اپنے مکان پر لے جائیں۔ چونکہ مجھے قائد اعظم کے ارشاد کی تعمیل میں فوراً کراچی واپس

پہنچا تھا میں ان کی خدمت میں حاضر نہ رہ سکا اور نہ ان کے آخری وقت میں ان کے پاس ہونے کی حسرت دل میں لئے کراچی روانہ ہو گیا۔ چند دن بعد وہ فوت ہو گئے۔ غفر اللہ لہٗ

اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شمولیت کے لئے پہلا پاکستانی وفد

قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا جیسے میرا اندازہ تھا میر لائق علی اعلیٰحضرت سے میری منشاء کے مطابق تجزیہ حاصل نہیں کر سکے۔ تم اب پاکستانی وفد کے ساتھ نیویارک جانے کی تیاری کر لو۔ وفد کے اراکین مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب سفیر پاکستان متعینہ واشنگٹن میر لائق علی صاحب اور پیرزادہ عبدالستار صاحب تجویز کئے گئے تھے۔ کچھ دن بعد محترمہ بیگم تصدق حسین صاحبہ کو بھی وفد میں شامل کر دیا گیا اور وہ لاہور سے نیویارک تشریف لے آئیں۔ وفد کے سیکریٹری محمد ایوب صاحب آئی سی ایس مرحوم تھے نیویارک میں پاکستانی قونصل جنرل مسٹر لاری شفیع وفد کے رکن تو نہ تھے لیکن ہر قسم کے انتظام کے تعلق میں ہمیں ان کی مساعی کے نتیجہ میں بہت سہولت میسر آتی رہی۔ وفد کا قیام بارکلے ہوٹل میں تھا۔ ان دنوں اسمبلی کے اجلاس فلشنگ میڈوز میں سٹی آف نیویارک کی نمائش گاہ کے ہال میں ہوا کرتے تھے اور کمیٹیوں اور مجلس امن کے اجلاس لیک سکس میں۔ ہوٹل سے فلشنگ پہنچنے میں ۲۵ منٹ صرف ہوتے تھے اور لیک سکس کا فاصلہ پون گھنٹہ میں طے ہوتا تھا۔ ہمارا وفد مختصر تھا اسلئے ہم نے طے کیا کہ صبح ناشتے پر ہی روزانہ کے کام کے متعلق مشورہ کر لیا کریں گے۔ ہمارے دفتری کام کی ساری ذمہ داری محمد ایوب صاحب پر تھی اور اگرچہ انہیں دردِ گردہ کا عارضہ بھی لاحق تھا لیکن وہ اپنے فرائض کو نہایت تندہی اور بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ رات کو دیر تک وہ مصروف رہتے تھے پھر صبح کو بھی انہیں سب سے پہلے تیار ہونا ہوتا تھا۔ نیند اور آرام کے لئے انہیں بہت کم وقت ملتا تھا لیکن وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی تاخیر یا کوتاہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

تقسیم ملک کی مفاہمتوں میں ایک یہ بھی تھی کہ ہندوستان بدستور اقوامِ متحدہ کا رکن رہے گا اور پاکستان نیا رکن بننے کی درخواست دیگا۔ چنانچہ پاکستان کی درخواست پر مجلس امن نے سفارش کی اور اسمبلی نے رکنیت کی منظوری دیدی۔ پاکستان اور یمن ایک ہی دن اقوامِ متحدہ کے رکن بنے۔ ارجنٹائن نے یہ سوال اٹھایا کہ ہندوستان کی تقسیم پر جو دو آزاد ریاستیں قائم ہوئی ہیں یہ دونوں نئی ریاستیں شمار ہونی چاہئیں اور دونوں کے لئے لازم ہے کہ نئے سرے سے رکنیت کیلئے درخواست دیں لیکن ارجنٹائن کا یہ عذر قابلِ التفات نہ قرار دیا گیا۔

اسمبلی کے اس اجلاس سے پہلے اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہو چکی تھی کہ جن ملکوں کے سفارتی تعلقات ہسپانیہ کے ساتھ قائم ہیں وہ ان تعلقات کو ختم کر دیں اور آئندہ کوئی ملک ہسپانیہ کی موجودہ حکومت کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم نہ کرے۔ اس اجلاس میں یہ قرارداد پھر زیرِ غور آئی۔ میں نے اس کی پُرزور مخالفت کی۔ میں نے کہا اوّل تو اقوامِ متحدہ کا ہرگز یہ منصب نہیں کہ کسی ملک کی حکومت کو الٹنے کی کوشش کرے اگر کبھی غلطی سے ایسا اقدام کیا گیا تو اس کا الٹا اثر

ہو گا۔ چنانچہ یہ اسی قرارداد کا نتیجہ ہے کہ سپانیہ میں رائے عامہ اقوام متحدہ کے خلاف جوش میں ہے اور جنرل فرانکو کی پوزیشن اپنے ملک میں مضبوط تر ہو گئی ہے۔ اقوام متحدہ کا صور تو پھونکا گیا لیکن میڈرڈ کی فصیلیں متزلزل نہیں ہوئیں میں نے یہ بھی کہا کہ مغربی یورپ کے نقشے پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کل آپ کو سپانیہ کی تائید اور دوستی کی ضرورت محسوس ہو گی اور آپ میں سے اکثر آج کے کئے پر پچھتائیں گے۔ باوجود میرے انتباہ کے قرارداد کی تصدیق تو ہو گئی لیکن اس کے بعد کے سالانہ اجلاس میں پھر اس قرارداد کا کوئی ذکر نہ آیا۔ پہلے اور دوسرے اجلاس کے درمیانی عرصے میں ارجنٹائن نے سپانیہ کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ ارجنٹائن کے اس اقدام پر کمیٹی میں کچھ لے دے ہوئی کہ ارجنٹائن نے عمداً قرارداد کی خلاف ورزی کر کے اقوام متحدہ کی توہین کی ہے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت نے بھی بڑے جوش سے اقوام متحدہ کی قرارداد پر عمل نہ کئے جانے پر غصے کا اظہار کیا اور کہا تعجب کی بات ہے کہ ارجنٹائن کو اس فعل پر سرزنش کرنے کی بجائے اسے مجلس امن کا رکن منتخب کر لیا گیا ہے۔ اس وقت انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کا اپنا ملک بھی کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد پر عمل نہ کرنے کے باوجود مجلس امن کا رکن منتخب کیا جائے گا۔

چند ماہ بعد سپانیہ کے وزیر خارجہ پاکستان تشریف لائے۔ میں اپنے فرض منصبی کی بجا آوری میں ان کے استقبال کے لئے کراچی مطار پر حاضر ہوا۔ طیارے سے اترتے ہی میرے ساتھ مصافحہ کیا اور فرمایا سپانیہ میں تمہارا یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا ہے کہ "اقوام متحدہ کا صور تو پھونکا گیا لیکن میڈرڈ کی دیواریں متزلزل نہ ہوئیں"۔ جنوبی افریقہ میں پاکستانی اور ہندوستانی نژاد آبادکاروں کے حقوق پامالی کہنا مناسب ہو گا عدم حقوق پر بحث کے دوران میں میں نے زیادہ تر انسانی وقار کے نقطۂ نگاہ سے تقریر کی۔

فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کا قیام | سب سے اہم مسئلہ جو اس اجلاس میں زیر بحث آیا وہ قضیۂ فلسطین تھا۔ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اقوام متحدہ کے فلسطین کمشن نے فلسطین کی تقسیم کی سفارش کی تھی۔ یہ رپورٹ ۱۹۴۷ء کے اجلاس میں زیر بحث آئی اور اس پر اسمبلی کی اول کمیٹی میں بحث ہوئی۔ کمیٹی کے صدر آسٹریلیا کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ایوٹ تھے۔ بحث کے دوران میں اول کمیٹی نے دو سب کمیٹیاں مقرر کیں۔ ایک کے سپرد یہ کام ہوا کہ تقسیم کی تفاصیل پر غور کر کے رپورٹ کرے اور دوسری کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا کہ فلسطین کی وحدت برقرار رکھتے ہوئے عربوں اور صیہونیوں کے حقوق کی حفاظت کا منصوبہ تیار کرے۔ کولمبیا کے مندوب دوسری کمیٹی کے صدر منتخب کئے گئے۔ کچھ دن بعد وہ اس ذمہ واری سے دستکش ہو گئے اور ان کی جگہ اس سب کمیٹی نے مجھے صدر منتخب کیا۔ دونوں سب کمیٹیوں کی رپورٹ پر طویل بحث و تمحیص کے بعد اول کمیٹی نے تقسیم کے حق میں تجویز منظور کر لی۔ اس عرصے میں بہت کشمکش جاری رہی۔ جب پاکستان کی طرف سے میں نے پہلی بار تقریر شروع کی تو عرب نمائندگان کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میری تقریر کا رخ کس طرف ہو گا۔ پاکستان ایک دو دن قبل ہی اقوام متحدہ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ عرب ممالک کے مندوبین ہمیں خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے اور ہماری طرف سے بالکل بے نیاز

تھے۔ میری تقریر کا پہلا حصہ تو تاریخی اور واقعاتی تھا جس کے بعض حصوں سے بعض عرب مندوبین بھی ناواقف تھے۔ جب میں نے تقسیم کے منصوبے کا تجزیہ شروع کیا اور اس کے ہر حصہ کی ناانصافی کی وضاحت کرنی شروع کی تو عرب نمائندگان نے توجہ سے سننا شروع کیا۔ تقریر کے اختتام پہ ان کے چہرے خوشی اور طمانیت سے چمک رہے تھے۔ اس کے بعد اس معاملہ میں عرب موقف کا دفاع زیادہ تر پاکستان کا فرض قرار دیدیا گیا۔ تقریریں تو عرب مندوبین کی طرف سے بہت ہوئیں اور بعض ان میں سے ٹھوس اور موثر دلائل سے آراستہ بھی تھیں لیکن عرب فصاحت کا اکثر حصہ جذباتی رنگ لئے ہوئے تھا اور وقت کا بہت سا حصہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی بے سود کوشش میں صرف کیا کہ فلسطین میں جو یہودی آکر آباد ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر نسل ابراہیم ہی نہیں بلکہ روسی قبیلے بنام خازار سے ہیں جن کے آباؤ اجداد نے ایک وقت میں یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ عرب موقف ہر پہلو سے اس قدر مضبوط اور قرین انصاف تھا کہ اسے تقویت دینے کے لئے ایسے غیر متعلق دلائل کی طرف رجوع کرنا دراصل اسے کمزور کرنا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرب مندوبین نے مرکزی ہدایت کے ماتحت اپنے دلائل اور تقریروں کو ترتیب نہیں دیا تھا جو کچھ کسی کے ذہن میں آجاتا وہ اسے بیان کرنے سے رک نہ سکتا بحث کے دوران ہی میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ کمیٹی کا فیصلہ دلائل یا انصاف کی بنا پہ نہیں ہو گا۔ کمیٹی میں نیوزی لینڈ کے نمائندے سر کارل بیرنڈسن تھے۔ میری ایک تقریر کے بعد کمیٹی سے نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا کیسی اچھی تقریر تھی۔ صاف، واضح، پُر دلائل اور نہایت موثر۔ سر کارل چونکہ خود نہایت اچھے مقرر تھے مجھے ان کے اظہار تحسین سے خوشی ہوئی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دریافت کیا "سر کارل! پھر آپ کی رائے کس طرف ہوگی؟" وہ خوب ہنسے اور کہا "طفراللہ رائے بالکل اور معاملہ ہے"۔

جب بحث کا سلسلہ ختم ہو کر تقسیم کے منصوبے کے تفصیلی حصوں پر رائے زنی شروع ہوئی تو کمیٹی کے اجلاس کے دوران میں ہی ڈنمارک کے مندوب میرے پاس آئے اور فرمایا واقعات اور تمہارے دلائل سے صاف ظاہر ہے کہ تقسیم کا منصوبہ بالکل غیر منصفانہ ہے اور اس سے عربوں کے حقوق پہ نہایت مضر اثر پڑے گا۔ سکنڈے نیویا کے تمام ممالک کے نمائندوں کی یہی رائے ہے۔ معلوم ہوتا ہے تقسیم کی تجویز ضرور منظور ہو جائے گی کیونکہ امریکہ کی طرف سے ہم پہ بہت زور ڈالا جا رہا ہے میں تمہیں یہ بتلانے آیا ہوں کہ کمیٹی میں عام طور پر یہ احساس ہے کہ ہم امریکہ کے دباؤ کے ماتحت ایک بے انصافی کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اس احساس کا تمہیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تم نے اپنی تقریروں میں علاوہ تقسیم کی سرے سے مخالفت کرنے کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس کی بعض تجاویز ظاہرہ طور پہ عرب حقوق کو غصب کرنے والی ہیں مثلاً یافہ کا شہر جس کی ۹۹ فیصد آبادی عرب ہے اسے اسرائیل میں شامل کیا گیا ہے اسی طرح اور بہت سی ایسی خلاف انصاف تجاویز ہیں۔ اس وقت کمیٹی کی کاروائی بڑی جلدی میں ہو رہی ہے

اگر تم ان تجاویز کے متعلق ترامیم پیش کرتے جاؤ اور مختصر سی تقریر ہر ترمیم کی تائید میں کر دو تو ہم سکنڈے نیویا کے پانچوں ممالک کے نمائندے تمہاری تائید میں رائے دیں گے اور کمیٹی کی موجودہ فضا میں تمہاری تمام ترمیمیں منظور ہو جائیں گی جس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ اگر تقسیم کی ترمیم منظور ہو بھی گئی تو بہت سے امور میں عربوں کی اشک شوئی ہو جائے گی۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی اور میں نے یہ دیکھنے کیلئے کہ ان کا اندازہ درست ہے یا نہیں ایک معمولی سی ترمیم پیش کی اس پر فوراً رائے شماری ہوئی اور ترمیم منظور ہو گئی۔ اس پر السید جمال الحسینی نے جو فلسطینی وفد کے سربراہ تھے اور جن کی نشست عین میرے عقب میں تھی مجھ سے کہا ظفر اللہ یہ تم نے کیا کیا۔ میں نے ڈینش مندوب کی بات انہیں بتلائی۔ انہوں نے حیران ہو کر دریافت کیا کہ اگر تمہاری تمام ترامیم منظور ہو گئیں تو تم تقسیم کے حق میں رائے دو گے؟

ظفر اللہ خاں۔ ہرگز نہیں ہم پھر بھی پرزور مخالفت کریں گے لیکن اتنا تو ہو گا کہ تقسیم کا منصوبہ بہت کمزور ہو جائے گا اور اگر منصوبہ منظور ہو ہی گیا تو اتنا برا نہیں ہو گا جتنا اس وقت ہے۔

السید جمال الحسینی۔ ہمارے لئے تو بڑی مشکل ہو گی۔

ظفر اللہ خان۔ آپ عرب ریاستوں کے نمائندوں سے کہدیں کہ وہ بیشک ترمیم کے حق میں رائے نہ دیں۔ غیر جانبدار رہیں۔

السید جمال الحسینی۔ مشکل تو پھر بھی حل نہیں ہوتی۔

ظفر اللہ خاں۔ کیا مشکل ہے؟

السید جمال الحسینی۔ مشکل یہ ہے کہ اگر تقسیم ہمارے حقوق کو واضح طور پر غصب کرنے والی نہ ہوئی تو ہمارے لوگ اس کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے اور ہمیں سخت نقصان پہنچے گا۔ تم مہربانی کرو اور کوئی ترمیم پیش نہ کرو۔ میں خاموش ہو گیا۔

قواعد کے مطابق کمیٹی میں ہر تجویز کثرت آراء کے ساتھ منظور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کمیٹی میں تقسیم کا منصوبہ منظور ہو گیا۔ لیکن اسمبلی کے اجلاس میں ہر اہم معاملے کے متعلق تجویز کی منظوری کے لئے ⅔ آراء کی تائید لازم ہوتی ہے۔ اب ہماری کوشش یہ تھی کہ تقسیم کے حق میں دو تہائی کثرت پوری نہ ہو۔ اسمبلی میں بھی بحث خاصی لمبی ہو گئی۔ تقریروں کی افتاد سے ہمیں کچھ امید بندھنے لگی کہ تقسیم کی تجویز منظور نہیں ہو گی۔ اندازہ تھا کہ نومبر کے آخری بدھ کے دن رائے شماری ہو جائے گی۔ بعض ممالک کے متعلق ابھی پختہ علم نہیں تھا کہ وہ کس طرف رائے دیں گے۔ مثلاً لائبیریا کی طرف سے ابھی اظہار رائے نہیں ہوا تھا۔ میں واشنگٹن جانے سے قبل لائبیرین وفد کے سربراہ مسٹر ڈینس کو ملنے کیلئے والڈارف اسٹوریا ہوٹل گیا۔ وہ اسمبلی جانے کو تیار تھے۔ میں نے ان کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ انہوں نے کہا میری ذاتی ہمدردی تو عربوں کے ساتھ ہے اور ابھی تک میری حکومت کی ہدایت بھی یہی ہے کہ تقسیم کے خلاف رائے دی جائے۔ لیکن امریکہ کا دباؤ ہم پر

بڑھ رہا ہے۔ کوشش کرو کہ آج رائے شماری ضرور ہو جائے۔ اس صورت میں ہم تقسیم کے خلاف رائے دیں گے۔
لیکن اگر آج رائے شماری نہ ہوئی تو پھر معلوم نہیں کیا صورت ہو۔ میری موجودگی میں انہوں نے اپنی سیکرٹری کو کہا میں
اب اسمبلی کے اجلاس کے لئے جا رہا ہوں میرے نام کہیں سے بھی کوئی پیغام آئے تو مجھے مت بھیجنا جو کچھ بھی ہوگا میں
واپس آکر دیکھ لوں گا۔ مجھ سے کہا آپ نے دیکھ لیا میں نے آج کا انتظام تو کر لیا ہے۔ میں نے ان کا تہہ دل سے شکریہ
ادا کیا اور میں بھی اسمبلی کے اجلاس کے لئے میٹنگ چلا گیا۔ صبح کا اجلاس ختم ہونے تک یہ قیاس محکم ہو گیا کہ تقسیم
کی تجویز منظور نہیں ہوگی۔ سہ پہر کا اجلاس شروع ہونے سے عین پہلے السید فاضل جمالی وزیر خارجہ عراق
بڑی پریشانی کی حالت میں میرے پاس آئے اور فرمایا میں نے سنا ہے کہ آج کا اجلاس بغیر رائے شماری
ملتوی ہو جائے گا۔ چلو صدر اسمبلی سے چل کر معلوم کریں۔ اسمبلی کے صدر برازیل کے مسٹر ارانیا تھے۔ ہم ان کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے فرمایا کل THANKSGIVING DAY ہے اور سیکرٹری
جنرل ٹرگوے لی کہتے ہیں اسمبلی کا اسٹاف آج شام دیر تک کام کرنے پر رضامند نہ ہوگا۔ اسلئے آج سہ
پہر کے اجلاس کے بعد اجلاس پرسوں صبح تک ملتوی کرنا پڑے گا۔ ہم نے کہا کہ رائے شماری آج سہ پہر کے اجلاس
کے آخر میں ہو جانی چاہیئے۔ صدر نے فرمایا اس کے لئے وقت نہیں ہوگا۔ ابھی پانچ تقریریں باقی ہیں۔ پھر ممکن ہے
بعض مندوبین رائے شماری سے پہلے اپنی رائے کی وضاحت کرنا چاہیں۔ ہم نے کہا پانچ تقریریں کرنے والوں میں سے
دو تو ہم ہیں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ آپ ہمارے نام فہرست سے کاٹ دیں باقی صرف تین رہ جائیں گے اور
آراء کی وضاحت کے متعلق آپ کا اختیار ہے کہ آپ اسے رائے شماری ہو جانے کے بعد تک ملتوی کر دیں۔ لیکن
وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ہم ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے کیونکہ اگر تقسیم کے حامی التواء پر مصر تھے تو صدر اگر
التواء پر رضامند نہ بھی ہوتے تو کثرت رائے سے التواء ضرور ہو جاتا۔ لیکن یہ عذر کہ سٹاف دیر تک کام کرنے پر
رضامند نہ ہوگا ایک عذر لنگ تھا۔ اس کے بعد آج تک نہ صرف THANKSGIVING DAY سے پہلی
شام سٹاف نے حسب ضرورت دیر تک کام کرنے پر کوئی عذر نہیں کیا بلکہ THAKSGIVING DAY پر بھی ہمیشہ
اسمبلی کا اجلاس دو بجے بعد دوپہر تک ہوتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صدر اسمبلی اور سیکرٹری جنرل دونوں
امریکن دباؤ کے ماتحت یا ذاتی رجحان سے صیہونیوں کی تائید میں تھے اور جب تقریروں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ
تقسیم کی تجویز کو دو تہائی کی تائید حاصل نہیں تو وہ دونوں اس منصوبے میں شریک ہو گئے کہ اجلاس جمعہ
کی صبح تک ملتوی کیا جائے تاکہ اس وقفہ میں صیہونی صدر ٹرومین کے دباؤ کے ذریعہ تین چار ایسے ممالک
کی تائید حاصل کر سکیں جو اب تک تقسیم کے خلاف تھے۔

سہ پہر کے اجلاس میں میں نے اپنی تقریر میں مغربی طاقتوں کو پر زور انتباہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے

اوّل عالمی جنگ کے دوران میں جو وعدے عربوں سے کیے تھے ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو بدعہدی کے مرتکب ہوں گے اور آئندہ عربوں کا اعتماد کلی طور پر آپ سے اٹھ جائے گا۔ تقریر ختم کرتے ہوئے میں نے کہا:۔

"I BEG YOU. I IMPLORE YOU. I ENTREAT YOU NOT TO DESTROY YOUR CREDIT IN ARAB COUNTRIES. TOMORROW YOU MAY NEED THEIR FRIENDSHIP BUT YOU WILL NEVER GET IT"

لیکن طاقت کا گھمنڈ اندھا اور بہرہ کر دیتا ہے۔ ہمارے احتجاج اور ہمارے انتباہ صدا بصحرا ثابت ہوئے مسٹر ٹرومین ۱۹۴۴ء میں نائب صدر ہوئے تھے صدر روز ویلٹ چوتھی بار صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی چوتھی میعاد کی ابتداء ہی میں فوت ہو گئے اور مسٹر ٹرومین نے انکی جگہ صدارت سنبھال لی ۱۹۴۸ء کے نومبر میں پھر انتخاب ہونے والا تھا۔ اور اب کی بار مسٹر ٹرومین صدارت کے امیدوار تھے۔ صدارتی انتخاب سے ایک سال قبل ہی سارے امریکہ میں بحران کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور امیدوار اور ان کے حامی اپنی کامیابی کے لئے ہر ہونی اور انہونی کر گذرتے ہیں۔ مسٹر ٹرومین کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ انہیں شائد اپنی پارٹی کی پرجوش تائید حاصل نہ ہو اسلئے وہ ابھی سے سرتوڑ کوشش میں تھے کہ ان کا پلڑا جسقدر بھاری بنایا جا سکے بنایا جائے۔ اس جدوجہد میں انہیں امریکہ کے یہودی عنصر کی تائید کی شدید ضرورت تھی۔ نیویارک میں یہودی عنصر نہایت زبردست ہے اور صدر ٹرومین انہیں خوش کرنے اور خوش رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دھن میں انہوں نے اس واضح حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ روس اور ان کے ہم خیال ممالک بھی تقسیم کی تائید میں ہیں اور اس موقف سے ان کی واحد غرض یہ ہے کہ تقسیم کی تجویز منظور ہو جائے تاکہ عرب ریاستوں کے ساتھ امریکہ کے تعلقات الجھ جائیں۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ امریکی وفد کے مشیران قانونی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تقسیم کی تجویز کرنا اسمبلی کے اختیارات سے باہر ہے لیکن صدر ٹرومین نے یہ مشورہ بھی رد کر دیا۔ اب اس آخری مرحلے پر صدر ٹرومین کی سرگرمیوں کا اندازہ واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ لائبیریا کا موقف لائبیرین وفد کے سربراہ مسٹر ڈینس کی زبانی بیان کیا جا چکا ہے۔ ہائٹی کے مندوب نے اپنی تقریر میں بڑے جوش سے کہا تقسیم کی تجویز نہایت غیر منصفانہ تجویز ہے ہم ہرگز اس پر رضامند نہیں ہو سکتے میری حکومت کی مجھے ہدایت ہے کہ ہم اس کے خلاف رائے دیں۔ فلپائنز کی طرف سے جنرل رومیلو جیسے فصیح البیان طلیق اللسان مقرر نے ہر نقطہ نگاہ سے تقسیم کی تجویز کے پرخچے اڑائے اور پورے وثوق سے اعلان کیا ہم ہرگز اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ جمعہ کے دن رائے شماری ہوئی اور نام پکار کر رائے لی گئی۔ عین اس سے قبل ہائٹی

کے مندوب مجھ سے آکر ملے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور نہایت اندوہناک لہجے میں کہا۔ مسٹر منسٹر پرسوں رات تک تو ہمارا وہی موقف تھا جو میں نے اپنی تقریر میں بیان کیا تھا۔ اب مجھے یہ ہدایت موصول ہوئی ہے کہ تقسیم کے حق میں رائے دو۔ تقسیم کے حق میں رائے شماری میں جب ہائیٹی کا نام پکارا گیا تو ایک بیدلی سے کہی گئی "ہاں" سنی گئی۔ جنرل رومیولو نیویارک سے واپس روانہ ہو چکے تھے۔ فلپائن کا نام پکارے جانے پر جواب ملا "ہاں" اسی طرح لائبیریا کا جواب "ہاں" تھا۔ لاطینی امریکہ کی ریاستوں میں سے صرف کیوبا "نہ" پر اڑا رہا۔ تجویز کے حق میں دو تہائی آراء ہو گئیں۔ تجویز منظور ہو گئی۔

اقوام متحدہ کی بنیاد انصاف، مساوات اور حق خود اختیاری پر رکھی گئی تھی لیکن فلسطین کے معاملے میں ان تینوں اصولوں کا خون کیا گیا۔ میثاق اقوام متحدہ میں معاہدات کی پابندی پر زور دیا گیا ہے لیکن فلسطین کے معاملے میں برطانیہ نے جو معاہدات شاہ حسین کے ساتھ کئے تھے ان کی صریح خلاف ورزی کی گئی۔ یہ درست ہے کہ تقسیم کے متعلق رائے شماری میں برطانیہ غیر جانبدار رہا۔ لیکن برطانیہ اعلان بالفور کے ذریعے اسرائیل کی بنیاد رکھ چکا تھا اور فلسطین کے قضیئے کی ابتداء اعلان بالفور سے ہوئی۔ فلسطین میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اور فلسطین کی وجہ سے جس طرح دنیا کا امن برباد ہوگا اور نوع انسان کے ایک بڑے طبقے پر جو تباہی اور مصائب وارد ہوں گے ان کی تمام تر ذمہ داری اول برطانیہ اور مسٹر بالفور پر اور ان کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ اور خاص طور پر صدر ٹرومین پر ہوگی۔

فلسطین پر برطانیہ کی نگرانی ختم ہونے کے دوسرے دن صیہونیوں کی طرف سے اسرائیل کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ یہ اعلان ہوتے ہی صدر ٹرومین کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جب مجلس امن میں اسرائیل نے اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پیش کی تو اس پر رائے شماری کے وقت برطانیہ غیر جانبدار رہا۔ جب یہ درخواست اسمبلی میں پیش ہوئی تو میثاق اقوام متحدہ کی دفعہ ۲ کے فقرہ ۳ کی صریح عبارت کے خلاف باوجود ایک مستقل رکن مجلس امن کی تائید حاصل نہ ہونے کے مجلس امن کی سفارش بحق اسرائیل کو جائز قرار دیکر اسمبلی نے اسرائیل کی رکنیت قبول کر لی۔

اسمبلی میں فلسطین کی تقسیم کی تجویز منظور ہونے کے بعد میں نیویارک سے واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ السید فارس خوری نے جو شام کے وفد کے سربراہ تھے مجھے مشورہ دیا کہ تم رستے میں دو دن دمشق ٹھہر جاؤ اور یہاں جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات شام اور دیگر اراکین اقوام متحدہ کی حکومتوں کے نمائندوں کو بتاتے جاؤ۔ چنانچہ انہوں نے دمشق اطلاع کر دی اور میں تین دن دمشق ٹھہر گیا۔ السید صاحب المعالی شکری القوتلی رئیس جمہوریہ سوریا نے آزاد عرب حکومتوں کے وزرائے خارجہ کے سیکرٹریوں کو دمشق طلب فرما لیا ہوا تھا۔ میں نے ان کی خدمت میں تمام تفاصیل گذارش کر دیں دوران گفتگو مجھ سے سوال کیا گیا کہ فلسطین پر برطانیہ کی نگرانی ختم ہونے پر ہم اسرائیل کے قیام کے خلاف جنگ کریں یا نہ کریں؟

میں نے کہا اس معاملے میں میری رائے کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ مجھے آپ کی جنگی طاقت کا کوئی علم نہیں البتہ میں اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ اس سوال پر غور کرتے ہوئے آپ صاحبان یہ امر ضرور ذہن میں رکھیں کہ اسرائیل کے لئے سمندر کھلا ہوگا۔ امریکہ کے یہودی طبقہ کی طرف سے جو بہت مالدار ہے اسرائیل کو ہر قسم کی مدد پہنچنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اور اسرائیل کی جنگی تیاری اور تربیت آپ کے اندازے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس قیام کے دوران جامعہ دمشق میں فلسطین اور اقوام متحدہ کے موضوع پر میری تقریر ہوئی۔ قضیہ فلسطین کے مختلف پہلو بعد میں بھی اسمبلی کے زیر غور آتے رہے ہیں اور پاکستان کی طرف سے ہمیشہ عرب موقف کی سو فیصدی تائید کی جاتی رہی ہے۔

قائداعظم کی خواہش کہ میں وزارتِ خارجہ پاکستان کا قلمدان سنبھالوں

کراچی پہنچنے پر میں قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ ان کی خدمت میں زبانی عرض کر دی۔ فرمایا اب تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے عرض کی اب بھوپال جاؤں گا۔ ذرا تیز لہجے میں فرمایا تم کب ان مخمصوں سے فراغت حاصل کرو گے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمیں تمہاری یہاں ضرورت ہے۔ میں نے عرض کی میں اگر کسی خدمت کے قابل ہوں تو حاضر ہوں۔ پوچھا لاہور جاؤ گے؟ عرض کیا لاہور ہوتا ہوا بھوپال جاؤں گا۔ فرمایا لیاقت علی خان کی طبیعت علیل ہے وہ لاہور میں ہیں تم وہاں ان سے ملنا۔ تعمیل ارشاد میں لاہور نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے دوران گفتگو میں دریافت فرمایا قائداعظم نے تمہارے ساتھ کوئی بات چیت کی ہے؟ میں نے کہا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا تھا۔

نواب زادہ صاحب:۔ صورت یہ ہے کہ ہمیں پاکستان میں سپریم کورٹ قائم کرنا ہوگا۔ اس کے قواعد مرتب کرنے اور ججوں اور عملے کے انتخاب اور تقرر کے لئے تو کچھ وقت درکار ہوگا لیکن چیف جسٹس کا تقرر جلد ہونا چاہیئے تاکہ وہ ان تمام امور پر غور کرنا شروع کرے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ تم پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا منصب سنبھالو اور ان امور کے متعلق غور کرنا شروع کرو۔ پھر تقسیم پنجاب کے نتیجے میں جو ہلچل مچی ہے اور ابتری پیدا ہوئی ہے خصوصاً پناہ گزینوں کی بھرمار اور مختلف صیغہ جات کے افسران اور عملے میں جو خلا پیدا ہوا ان سب امور نے مل جل کر اس صوبے میں انتظامی حالت خراب کر دی ہے۔ ممدوٹ سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں یہ اکیلے ان کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے قائداعظم سے کہا ہے کہ یہاں کسی بے لاگ اور صاحب عزم چیف منسٹر کی ضرورت ہے اور مشورہ دیا ہے کہ وہ تمہیں یہاں بھیج دیں۔ تیسرے مرکز میں بھی آدمیوں کی ضرورت ہے علاوہ وزارت عظمیٰ کے دفاع اور امور خارجہ کے قلمدان بھی میرے سپرد ہیں یہ بھی ایک شخص کا کام نہیں۔ تم چاہو تو مرکز میں آجاؤ۔ ان سب باتوں پر غور کر کے تم اپنا منشاء مجھے بتا دینا۔

ظفر اللہ:۔ میں آپ کے ارشاد کے مطابق غور کرنے کے بعد حاضر خدمت ہو کر گذارش کر دوں گا۔

نواب زادہ صاحب۔ لیکن قائداعظم چاہتے ہیں کہ تم وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالو۔

ظفراللہ۔ تو پھر میرے غور کرنے اور میری منشاء کی کیا گنجائش باقی رہی؟

نواب زادہ صاحب۔ میں نے سارا قصہ تم سے کہہ دیا ہے۔ اب تمہارے غور اور منشاء کی بس اتنی گنجائش ہے کہ تم بھوپال سے ہو کر جتنی جلدی ہو سکے کراچی پہنچ جاؤ۔

ظفراللہ۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے خدمت میں کوئی عذر نہیں اور جو خدمت سپرد ہو اس کے لئے میں حاضر ہوں لیکن آخر ہز ہائی نس نواب صاحب سے استصواب اور ان کی اجازت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ رضامند ہو جائیں۔ لیکن شائد فوراً اجازت دینے میں وہ دقت محسوس کریں یا انہیں تامل ہو۔

نواب زادہ صاحب۔ قائداعظم کو اصرار ہے کہ تم جلد آجاؤ۔ تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے کہ تم کب تک آسکو گے؟

ظفراللہ۔ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر گذارش کرنے سے پہلے میں کوئی پختہ اندازہ تو نہیں کر سکتا اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نواب صاحب کو قائداعظم کی ہر خواہش کا بہت احترام ہے اور ان کی خواہش کا علم ہونے پر وہ جسقدر جلد ممکن ہو گا مجھے اجازت مرحمت فرما دیں گے۔

مجھ پر سب سے گراں یہ امر ہوتا ہے کہ میری وجہ سے کسی شخص کو پریشانی ہو۔ ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں صاحب والی بھوپال کو میں نہایت احترام کی نگہ سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت خوبیوں کے مالک تھے اور ایک جہان ان کا گرویدہ اور مداح تھا۔ میرے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ نہایت مشفقانہ رہا۔ مجھے بھوپال گئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس میں سے چار ماہ کا عرصہ میں نے پاکستان کی خدمت میں صرف کیا تھا۔ نواب صاحب نے نہ صرف خندہ پیشانی سے مجھے اجازت دی تھی بلکہ ہر پہلو سے میرے آرام اور آسائش کا خیال رکھا تھا۔ اور اپنے الطاف واکرام میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بھوپال میں مجھے اور میرے اہل خانہ کو ہر سہولت حاصل تھی۔ مکان، سامان، سواری اور ملازمین کے علاوہ گرانقدر مشاہرہ جو پاکستان کے وزراء کے مشاہرے سے دس گنے سے بھی زیادہ تھا۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ میں ۱۹۵۰ء کے آخر تک ضرور ان کی خدمت میں رہوں۔ اب ایک طرف قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کا ارشاد کہ میں جلد تر بھوپال سے فارغ ہو کر کراچی پہنچ جاؤں اور دوسری طرف یہ خدشہ کہ اس مرحلہ پر میرے نواب صاحب کی خدمت ترک کرنے سے کہیں انہیں دقت نہ ہو۔ اسی ادھیڑ بن میں میں بھوپال پہنچا۔ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے پر یہ ذکر ناگزیر تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں جو کچھ قائداعظم اور نواب زادہ صاحب سے گفتگو ہوئی تھی عرض کر دی۔ نواب صاحب نے فرمایا سر ظفراللہ والیان ریاست کے ساتھ ہندوستان میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کا اندازہ ہم نے ابھی سے کر لیا ہے۔ آپ کے یہاں ہونے سے مجھے قلبی اطمینان

تھا۔ آپ کے مشورے سے محروم ہو جانا میرے لئے ضرور پریشانی کا موجب ہو گا۔ لیکن میں اپنی خوشی اور ضرورت پر پاکستان کی ضرورت اور بہبودی کو ترجیح دیتا ہوں اور آپ کو قوم کی خدمت سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ قائد اعظم کے ارشاد کی تعمیل میں کراچی جانا چاہیں تو میں آپ کے رستے میں روک نہیں بننا چاہتا۔ لیکن ابھی کچھ وقت تو آپ یہاں گذاریں گے نا؟ میں نے عرض کی نواب زادہ صاحب کی زبانی قائد اعظم کا ارشاد جلد کراچی پہنچنے کا ہے کچھ افسردہ ہو کر فرمایا۔ اچھا تو پھر آپ اپنا پروگرام سوچ کر مجھے بتا دینا۔

دوسرے دن میں نے ذکر کیا کہ ہمیں تیاری کیلئے چنداں وقت درکار نہیں آپ جب اجازت دیدیں ہم روانہ ہو سکتے ہیں۔ فرمایا سفر کا کیا طریق ہو گا۔ عرض کیا دلی کا راستہ تو غیر محفوظ ہے۔ بمبئی تک ریل میں اور وہاں سے بحری جہاز میں جانے کا خیال ہے۔ فرمایا میں تو ہرگز اس پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ بمبئی کا سفر بھی خطرے سے خالی نہیں۔ بچی اور اسکی والدہ اور دونوں بچی ملازمین اور ہلکے ذاتی سامان کے ساتھ میرے بیچ کرافٹ طیارے میں کراچی جائیں۔ حکومت ہند اور حکومت پاکستان سے اجازت لے لی جائے گی کہ طیارے کو سرحد کے قریب اترنا نہ پڑے۔ کوئی بھاری سامان اگر ہے تو وہ ہم بمبئی سے سمندر کے راستے بھجوا دیں گے۔ غرض ہر بات میں نواب صاحب نے اسی شفقت کا سلوک کیا جس کا میں ہمیشہ مورد رہا تھا۔ اللہ انہیں جزائے خیر وافر عطاء فرمائے اور اپنی رحمت کے سائے میں ان کا مقام کرے (آمین)

میرا تقرر بطور وزیر خارجہ پاکستان | ہم ۲۵ دسمبر کی سہ پہر کو کراچی پہنچے۔ عزیزہ امتہ الحی کے خالو بریگیڈیر غلام احمد صاحب کراچی میں تھے۔ عزیزہ اور اس کی والدہ تو ان کے ہاں ٹھہریں اور مجھے سید امجد علی صاحب کے ہاں ۱۸ وکٹوریہ روڈ میں ٹھہرنے کی جگہ مل گئی۔ وہ دن قائد اعظم کا یوم پیدائش تھا۔ ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب تھی میں وہاں حاضر ہو گیا لیکن مجھے ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ قائد اعظم نے میرے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے البتہ نواب زادہ صاحب نے اتنا فرمایا کہ آج تمہیں حلف لینا ہو گا۔ قائد اعظم کی آمد پر نواب زادہ صاحب نے مجھے اس نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ان کے عین بائیں جانب تھی۔ قائد اعظم نے بیٹھتے ہی فرمایا ظفر اللہ خان وزیر خارجہ کے منصب کا حلف لیگا۔ اور میں نے تعمیل ارشاد میں حلف اٹھایا۔

برما کے جشن آزادی میں بطور نمائندہ پاکستان شرکت | اسی اجلاس میں قائد اعظم نے فرمایا ۴ جنوری کو برما کا جشن آزادی ہے۔ تمہیں پاکستان کی نمائندگی کے لئے رنگون جانا ہو گا۔

ظفر اللہ۔ جناب عالی میں نے آج ہی اخبار میں دیکھا ہے کہ ہندوستان کا ارادہ کشمیر کا معاملہ مجلس امن میں پیش کرنے کا ہے۔ مجھے کشمیر کے قضیئے کی تفاصیل کا کچھ علم نہیں۔ لازم ہے کہ میں اس سلسلے میں ضروری واقفیت حاصل کروں۔ وقت کم ہے اور معلومات حاصل کرنا آسان نہیں کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ سردار

نشتر صاحب برما کے جشن آزادی میں پاکستان کی نمائندگی فرمائیں؟

قائداعظم :- تم وزیر خارجہ ہو اور یہ کام تمہارا ہے ۔

رنگون جانے کے لئے میں یکم جنوری کو کراچی سے کلکتے گیا۔ رات عزیز الوراحمد کے ہاں ٹھہرا۔ شہید سہروردی صاحب ملنے کے لئے تشریف لائے اور اپنی مصالحتی مساعی کی تفاصیل سے مجھے مطلع فرمایا۔ دوسرے دن میں کلکتے سے رنگون چلا گیا۔ رنگون کے قیام کے دوران میں رنگون کے تجارتی طبقے کے مسلمانوں نے مجھے اپنی مجلس میں طلب فرمایا برما کی قومیت کا جو قانون تجویز ہوا تھا اس کے مطابق مسلمان تاجروں کی کثیر تعداد برمی قومیت حاصل کر سکتی تھی وہ مجھ سے مشورہ چاہتے تھے کہ کیا برمی قومیت حاصل کرنا ان کے لئے مفید ہو گا۔ میں نے بلا تامل مشورہ دیا کہ جو صاحب بھی برمی قومیت حاصل کر سکتے ہوں انہیں یہ اقدام ضرور کرنا چاہیئے اور برمی مفاد کو اپنا مفاد سمجھ کر وفاداری کے ساتھ ملک کی بہبودی کو فروغ دینے میں پورا تعاون کرنا چاہیئے ۔

اقوام متحدہ کی مجلس امن میں قضیہ کشمیر کی پیروی کے لئے نیویارک کا سفر

۷ جنوری کو کراچی واپسی ہوئی آغا ہلالی صاحب جو ان دنوں وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری تھے مجھے کورنگی کریک پہ ملے اور بتایا کہ ہندوستان نے کشمیر کا معاملہ مجلس امن میں پیش کر دیا ہے اور مجلس امن نے اُنکی درخواست کی سماعت کے لئے ۱۴ جنوری مقرر کی ہے اور کل شام تمہیں کراچی سے روانہ ہونا ہے۔ انہوں نے ایک افسوسناک وقوعے کی خبر سنائی ۔ سندھ کا صوبہ تقسیم کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات سے محفوظ رہا تھا اور کراچی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ صوبہ سرحد سے جو ہندو اور سکھ ہندوستان میں منتقل ہونا چاہتے تھے ان کے متعلق یہ انتظام تھا کہ وہ اپنے اپنے مقامات سے کراچی اس وقت آئیں جب بمبئی جانے والا کوئی جہاز میسر ہو۔ جب ایسا موقعہ ہوتا تو افسران ضلع کو اطلاع کر دی جاتی اور وہ ان لوگوں کو کراچی بھجوا دیتے۔ انہیں ہدایت تھی کہ ان لوگوں کو ایسی گاڑی سے بھیجیں جو رات کوں رات سفر کر کے علی الصبح کراچی پہنچتی ہو۔ کراچی پہنچنے پر ایسے مسافروں کو شہر کے اسٹیشن سے سیدھے بندرگاہ پر پہنچا دیا جاتا اور وہ آسانی سے جہاز پر سوار ہو جاتے۔ اس دفعہ سکھوں کا ایک قافلہ بغیر کسی اطلاع کے خود بخود دن کے وقت ریل پر سوار ہو کر کراچی پہنچ گیا۔ کراچی پہنچنے پر سٹیشن سے تانگے کرائے پہ لیکر وہ شہر میں ایک گوردوارے کو چلدیئے اور رستے میں نعرے بھی لگاتے گئے اس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا اور فساد ہو گیا۔ قائداعظم کو خبر ملی تو انہیں سخت رنج ہوا۔ انہوں نے فوراً سکندر مرزا صاحب سیکریٹری وزارت دفاع کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ فلاں وقت تک مجھے رپورٹ آنی چاہیئے کہ شہر میں بالکل امن ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے کسی اور کو سیکریٹری دفاع مقرر کرنا پڑے گا ۔

سکندر مرزا صاحب نے بعد میں مجھے بتلایا کہ یہ حکم سنتے ہی انہوں نے واپس آکر کراچی کے کمانڈر جنرل اکبر خاں

کو بلا کر وہی الفاظ ان سے کہے جو قائداعظم نے ان سے کہے تھے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ایک انہوں نے امن کی رپورٹ دینے کا وقت اس وقت سے ایک گھنٹہ قبل مقرر کیا جو قائداعظم نے ان کی رپورٹ کے لئے مقرر کیا تھا دوسرے یہ ہدایت دی کہ اگر گولی چلانا پڑے تو ہر گولی کے مقابلے میں بلوائیوں کی ایک نعش انہیں دکھائی جائے۔

جنرل اکبر خاں چلے گئے اور مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ قبل آکر رپورٹ دی کہ شہر میں پورا امن ہے۔

سکندر مرزا :- گولی چلانا پڑی ؟

جنرل اکبر خاں :- بیشک

سکندر مرزا :- کتنی گولیاں چلائیں ؟

جنرل اکبر خاں :- بارہ اور یہ ہیں ان کے خالی کارتوس

سکندر مرزا :- اور نعشیں ؟

جنرل اکبر خاں :- ابھی موقعہ پر پڑی ہیں چلئے دیکھ لیجئے۔

وہ جنرل اکبر خاں کے ساتھ گئے جنہوں نے مختلف مقامات پر گیارہ نعشیں دکھلائیں۔

سکندر مرزا :- ایک نعش اور چاہیئے ؟

جنرل اکبر خاں آیئے وہ بھی دیکھ لیجئے

جنرل اکبر خاں انہیں ہسپتال لے گئے اور ایک زخمی ہسپتال میں دکھلایا اور کہا یہ خوش قسمتی سے زندہ بچ گیا ہے۔ اس کے بعد آج تک کراچی میں فرقہ وارانہ فسادات کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔

میں سات کی شام کو کراچی پہنچا تھا ۸ کا دن سفر کی تیاری کے سلسلے میں بھاگ دوڑ میں گذرا۔ میرا سامان کچھ ۱۸ وکٹوریہ روڈ میں میرے ساتھ تھا۔ یہ بنگلہ بھی ان دنوں مہمانوں کی کثرت سے سرائے بنا ہوا تھا۔ کچھ سامان بریگیڈیر غلام احمد صاحب کی رہائش گاہ فقیر جی لاج میں تھا۔ وزارت خارجہ کا دفتر ان دنوں کلفٹن میں موہاٹا پیلیس میں تھا۔ نیویارک کے اس سفر میں میرے رفقاء چوہدری محمد علی صاحب سیکرٹری جنرل، سید محمد وسیم صاحب ایڈووکیٹ جنرل، کرنل مجید ملک صاحب اور ایک دو عملے کے اصحاب تھے۔ متعلقہ کاغذات بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ذاتی سامان کے علاوہ جو کاغذات اور دفتری سامان وغیرہ ہمیں ساتھ لے جانا تھا اس کے لئے بکس تک میسر نہ تھے۔ چنانچہ جلدی میں کاغذات اور سامان کا اکثر حصہ بوریوں میں باندھ لیا گیا اور یہ قافلہ ۸ ر کی رات کو نیویارک روانہ ہوگیا۔ کیس کی تیاری کے لئے ابھی کوئی وقت نہیں ملا تھا۔ کشمیر کے قضیئے کی تفاصیل کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ اس موقعہ پر بھی میں ویسے ہی کورا تھا جیسے حد بندی کے کیس کے وقت۔ اللہ تعالیٰ سے توفیق طلبی اور اس کے رحم پر ہی بھروسہ تھا۔ البتہ اس دفعہ مجھے چوہدری محمد علی صاحب کا تعاون اور ان کی رفاقت حاصل تھی

اور یہ امر میرے لئے بہت اطمینان کا موجب تھا۔ چودھری صاحب کی لیاقت تدبر اور علمی تجر سے پورا پاکستان واقف ہے یہاں ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ضرور کہنا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں انہوں نے کمال توجہ اور تندہی کے ساتھ دن رات ایک کر کے نہ صرف میرے ساتھ تعاون کیا بلکہ ہر چھوٹے بڑے متعلق اور غیر متعلق نجی، نیم سرکاری اور سرکاری امر میں میرا بوجھ ہلکا کیا۔ خود تکلیف برداشت کی اور مجھے آرام پہنچایا۔ ہر قدم پر میں نے ان کے مشورے اور تدبر کو صائب اور مفید پایا۔

کراچی سے ہم رات کے وقت پین امریکن جہاز سے روانہ ہوئے اندازہ تھا کہ ۱۰ر جنوری کو ہم بفضل اللہ نیویارک پہنچ جائیں گے لیکن ۹ر کی شام کو لندن پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ طیارے کے ایک انجن میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے اس لئے لندن میں چند گھنٹے رکنا ہو گا۔ دوسری صبح اندازہ ہو سکے گا کہ کب روانگی ہو گی۔ دوسری صبح دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سہ پہر یا شام کو روانگی ہو گی۔ ہم نے اس تاخیر سے یہ فائدہ اٹھایا کہ پاکستان ہائی کمشن میں بیٹھ کر ان دستاویزات کے تحریری جواب کی تیاری شروع کر دی جو حکومت ہندوستان نے مجلس امن میں اپنی درخواست کے ہمراہ پیش کی تھیں۔ چودھری محمد علی صاحب کی مدد سے کچھ نوٹ بھی مرتب کئے اور پھر ان کی موجودگی اور نگرانی میں پاکستان کی طرف سے تحریری بیان بھی تیار کروایا۔ اتنے میں شام ہو گئی اور مطار سے بلاوا آگیا۔ لندن سے روانہ ہو کر جب گینڈر پہنچے تو وہاں برفانی طوفان جاری تھا۔ رات مطار پر گذری لیکن سونے کی جگہ میسر آگئی فالحمد للہ۔ لندن میں جو مضمون املا کرایا گیا تھا اسے ہمارے سٹینو گرافر نے راتوں رات ٹائپ کر لیا۔ انہیں اس کام کے لئے رات کا اکثر حصہ جاگنا پڑا فجزاہ اللہ۔ ان کی کوٹھڑی اور میری کوٹھڑی کے درمیان صرف ایک لکڑی کی دیوار تھی۔ ٹائپ کی مشین کی آواز نے مجھے بھی کچھ زیادہ سونے نہیں دیا۔ ۱۲ کی صبح کو گینڈر سے روانہ ہو کر سہ پہر کو ہم نیویارک پہنچے۔ یہاں بھی بہت برف باری ہو چکی تھی۔ لیکن ہمارے پہنچنے تک برف پگھلنا شروع ہو چکی تھی۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب سفیر پاکستان متعینہ واشنگٹن اور لاری شفیع صاحب قنصل پاکستان متعینہ نیویارک مطار پر موجود تھے۔ ہمیں پریشانی تھی کہ مطار سے ہی سیدھے مجلس امن کے اجلاس میں شمولیت کے لئے لیک سکیس جانا ہو گا۔ علاوہ تھکان اور شب بیداری کے ہماری دستاویزات بھی ابھی تیار نہیں تھیں اور اصل مسئلے کے متعلق غور اور تیاری کا تو ابھی کوئی موقعہ میسر نہ آیا تھا لیکن طیارے سے اترتے ہی سفیر صاحب نے فرمایا فکر نہ کریں جب تمہارے سفر میں ہر مقام سے تاخیر کی اطلاع آنا شروع ہوئی تو ہم نے اندازہ کر لیا کہ تم بروقت نہیں پہنچ سکو گے۔ چنانچہ ہم نے مجلس امن کے صدر کی خدمت میں گذارش کی کہ اندریں حالات اجلاس ملتوی کیا جائے۔ انہوں نے ہماری درخواست پر اجلاس پندرہ جنوری تک ملتوی کر دیا ہے۔ ہمارے لئے یہ خبر ایک خوش کن مژدہ تھی۔ ہم مطار سے بجائے لیک سکیس جانے کے سیدھے بار کلے ہوٹل گئے اور آرام کا سانس لیا اور اللہ

تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

تیرہ اور چودہ جنوری تیاری میں صرف ہوئے۔ اتنا وقت تو میسر نہیں تھا کہ تفصیلی تیاری ہو سکتی۔ ایک تو ہندوستانی دستاویزات کا جواب جس کا مسودہ لندن میں زودہ نولیس کو لکھوایا گیا تھا صاف کیا گیا اور دوسرے قضیہ کشمیر کے متعلق نوٹ تیار کئے گئے جن کی بنا پر مجلس امن میں اس مسئلے کی حقیقت واضح طور پر بیان کی جا سکے۔ چونکہ مجلس امن میں یہ قضیہ ہندوستان کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اس لئے مجلس میں پہلے ہندوستان کے نمائندہ کو تقریر کرنی تھی۔ پاکستان کی طرف سے جوابی تقریر کی تیاری تو ہندوستان کے نمائندہ کی تقریر سننے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ البتہ اس کے لئے ضروری مواد جمع کرنا اور اسے ترتیب دینے کا کام پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ اگرچہ قاعدے کے لحاظ سے اس قضیے میں ہندوستان کی حیثیت مستغیث کی تھی۔ لیکن درحقیقت مستغیث پاکستان تھا اور ہندوستان ملزم۔ مستغیث کی حیثیت سے جو کچھ ہم کہنا چاہتے تھے اس کا ڈھانچہ تیار کرنے کا بھی یہی وقت تھا۔ غرض یہ دو دن بہت مصروفیت میں گذرے۔

ہندوستانی وفد کے سربراہ سر گوپالا سوامی آئنگر تھے جو برسوں ریاست کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے اور ان دنوں بھارت کی مرکزی حکومت میں وزیر تھے۔ ان کے معاون سر گرجا شنکر باجپائی اور مسٹر ایم ایل سیتلواڈ تھے۔ ان دنوں مجلس امن کے اراکین ارجنٹائن، بلجیم، کنیڈا، چین، کولمبیا، فرانس، شام، روس، برطانیہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یوگوسلاویہ تھے۔ ان میں سے چین، فرانس، روس، برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ تو مستقل اراکین تھے اور باقی چھ میعادی اراکین۔

ہندوستان کی طرف سے سر گوپالا سوامی آئنگر نے ۱۵ر جنوری کو سہ پہر کے اجلاس میں تقریر کی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا۔ مہاراجہ کشمیر نے ریاست جموں و کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ برضا و رغبت کیا ہے۔ اس کے خلاف پاکستان کی انگیخت پر اور اس کی مدد کے ساتھ قبائلیوں نے ریاست پر دھاوا کر کے بہت فساد اور خون خرابہ کیا ہے۔ قبائلیوں کی روک تھام کے لئے ہندوستان کو اپنی فوج بھیجنی پڑی۔ موجودہ صورت جنگ کا رنگ اختیار کر گئی ہے پاکستان قبائلیوں کی ہر طرح سے مدد کر رہا ہے۔ بہت سے پاکستانی فوجی اور افسر بھی قبائلیوں کے ساتھ ہیں۔ پاکستان کا یہ رویہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے۔ پاکستان کو اس سے روکنا لازم ہے۔ پاکستان قبائلیوں کی مدد بند کرے اور انہیں واپس جانے پر آمادہ کرے۔ الحاق کے متعلق ہندوستان کا موقف یہ ہے کہ جہاں فرمانروائے ریاست ایک مذہب کا ہو اور رعایا کی کثرت دوسرے مذہب کی ہو وہاں فرمانروا کا فرض ہے کہ وہ الحاق کا فیصلہ رعایا کی کثرت رائے کے مطابق کرے۔ ہندوستان اس اصول پر پختہ طریق سے کاربند ہے۔ چنانچہ جب ریاست کشمیر میں امن قائم ہو جائے گا تو ہم کشمیر کی رعایا کے منشاء کے مطابق الحاق کے معاملے میں آخری فیصلہ کریں گے۔ ان کی تقریر کے بعد اجلاس دو دن کے لئے ملتوی ہو گیا۔

دوسرے اجلاس میں میں نے جوابی تقریر میں کہا ہندوستان کے نمائندے نے اپنی تقریر میں عمداً اس قضیئے کی پیچیدگیوں کو پس پردہ رہنے دیا ہے اور صرف پاکستان کے خلاف الزامی پہلو پر زور دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس اہم اور پیچیدہ قضیئے

کے پس پردہ حالات کو ظاہر کرنا اور ہندوستان کو مجرم کی حیثیت میں دکھانا ضروری ہے۔ اسلئے لازماً بہت سے امور کی وضاحت ناگزیر ہے جن کا بیان ہندوستان کی طرف سے اسلئے نہیں کیا گیا کہ وہ ان کے خلاف جاتے ہیں۔ ان تمام واقعات کا مختصر بیان بھی وقت چاہتا تھا اور مجلس امن کے ایک اجلاس میں تقریر کے لئے صرف سوا دو گھنٹے میسّر آتے تھے اسلئے میری تقریر تین اجلاسوں میں مکمل ہوئی۔

چند سالوں کے بعد کولمبیا کے نمائندے نے ایک دفعہ مجھ سے کہا۔ کشمیر کے معاملے میں ہندوستانی نمائندے کی پہلی تقریر سننے کے بعد مجلس امن کے اراکین کی کثرت کا یہ تاثر تھا کہ پاکستان نے آزادی حاصل کرتے ہی فساد کا رستہ اختیار کر لیا ہے اور دنیا کے امن کے لئے ایک خطرے کی صورت پیدا کر دی ہے۔ لیکن جب جواب میں تمہاری طرف سے اصل حقیقت کے رخ سے پردہ ہٹایا گیا تو ہم سب نے سمجھ لیا کہ ہندوستان مکاری اور عیاری سے کام لے رہا ہے اور کشمیر کی رعایا پر ظلم ہو رہا ہے اور ہمارا یہ تاثر بعد میں کسی وقت بھی زائل نہیں ہوا۔

دو تین دن بعد میری تقریر کا جواب مسٹر سیتلواڈ نے دیا۔ اپنی تقریر کے شروع میں انہوں نے میرے متعلق کچھ درشت کلامی بھی کی۔ مسٹر سیتلواڈ بڑے قابل وکیل ہیں انہوں نے اپنی قابلیت کا ہر حربہ استعمال کیا لیکن ایک مردہ کیس میں جان ڈالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ممکن ہے مجلس کے بعض اراکین نے کچھ اثر قبول کیا ہو کیونکہ ہمارے وفد میں سے سفیر اصفہانی صاحب کچھ مشوش نظر آتے تھے مبادا کوئی رکن مسٹر سیتلواڈ کے فریب میں آجائے۔ مسٹر سیتلواڈ نے ہندوستان کے دامن کو پاک اور بے داغ ثابت کرنے کے لئے یہاں تک کہہ دیا کہ مہاراجہ کشمیر کی الحاق کی درخواست قبول کرتے ہوئے ہم نے خود ان پر واضح کر دیا ہے کہ یہ الحاق عارضی ہے اور مستقل جب ہوگا جب کشمیر کی رعایا کی کثرت آزادانہ طور پر اس کی تائید میں اظہار رائے کر دیگی۔ اس سے بڑھ کر انصاف پسندی کا ثبوت ہم کیا دے سکتے ہیں؟ وہ بہت سی کھوکھلی اور بے بنیاد باتیں بھی کہہ گئے۔ میرا تاثر یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے لئے موقعہ پیدا کر دیا ہے کہ ہم اراکین مجلس پر ثابت کر دیں کہ ہندوستان کا دعویٰ کچھ ہے اور عمل بالکل اس کے خلاف ہے۔ میرا یہ بھی تاثر تھا اور اب تک ہے کہ مسٹر سیتلواڈ نے اپنی طرف سے کوئی بات فریب یا بد دیانتی سے نہیں کی تھی۔ البتہ بہت سے واقعات کا انہیں علم نہیں تھا اور میری طرف سے ان واقعات کے پیش کئے جانے پر انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ واقعات صحیح ہو سکتے ہیں۔

تیسرے اجلاس میں بعض اراکین مجلس امن اور بہت سے حاضرین کو خیال تھا کہ میں مسٹر سیتلواڈ کی درشت کلامی کے خلاف احتجاج کروں گا اور ہوا یا ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کا تھوڑا بہت ثبوت سیتلواڈ صاحب کی خدمت میں پیش کر دونگا۔ لیکن میں انکی درشت کلامی پر قطعاً برافروختہ نہیں تھا بلکہ مجھے اس خیال سے

کچھ اطمینان تھا کہ اراکین مجلس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ اگر مسٹر سٹیلواڈ کو درشت کلامی پر اترنا پڑا ہے تو یہ ان کے موقف کی کمزوری کا ثبوت ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے اپنی جوابی تقریر میں صرف اتنا ہی کہا: جناب صدر واراکین مجلس پچھلے اجلاس میں میرے فاضل دوست مسٹر سٹیلواڈ نے اپنی تقریر میں میرے متعلق کچھ درشت الفاظ استعمال کئے تھے ان کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ میں مسٹر سٹیلواڈ کو عرصہ سے جانتا ہوں جب میں ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کا جج تھا تو مجھے بارہا ان کے دلائل سننے کا اتفاق ہوا۔ میری رائے میں مسٹر سٹیلواڈ ہندوستان کے قابل ترین وکیل ہیں اور درشت کلامی ان کا شعار نہیں۔ اس موقعہ پر ان کے موقف کی کمزوری کو جانتے ہوئے میں ان کی مشکلات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ مسٹر سٹیلواڈ کی درشت کلامی ایک استثنائی صورت تھی جو قابل اعتنا نہیں۔ اس کے بعد میں نے ان کی تقریر کی طرف توجہ دلائی ان کے دلائل اور واقعات پر مسلسل اور بفضل اللہ موثر تنقید کی۔

اس کے بعد کئی بار مسئلہ کشمیر پر بحث ہوئی ہے لیکن میری موجودگی میں نہ تو کبھی پاکستان کی طرف سے نہ ہی ہندوستان کی طرف سے کبھی درشت کلامی کی گئی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ بات مثال بن گئی کہ باوجود شدید اختلاف کے دونوں فریق کے نمائندے ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور واقعات اور دلائل کو مضبوطی سے پیش کرنے کے ساتھ یہ التزام رہتا تھا کہ کلام میں بے جا تلخی نہ ہو۔

مسٹر کرشنا مینن | لیکن افسوس ہے کہ جب مسٹر کرشنا مینن نے ہندوستان کے نمائندے کے طور پر کشمیر کے مسئلے کی بحث میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کی طرف سے یہ معیار قائم نہ رہا لیکن وہ بھی اتنی احتیاط کرتے تھے کہ میری موجودگی میں کوئی بے جا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ جن دنوں میں پہلی بار بین الاقوامی عدالت کا رکن تھا تو مجلس امن میں پاکستان کی طرف سے یہ تجویز دہرائی گئی کہ کشمیر کمشن کی تجاویز کی تعبیر کے متعلق فریقین کے درمیان جو اختلاف ہے اس کے لئے بین الاقوامی عدالت سے استصواب کیا جائے اور کمشن کی تجاویز کی جو تعبیر عدالت کرے دونوں فریق اسے قبول کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ مسٹر کرشنا مینن نے ہندوستان کی طرف سے اس تجویز کو رد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی کہ "وہ مذہبی دیوانہ" (خاکسار) عدالت کا رکن ہے اور اگرچہ وہ اس معاملے میں اجلاس میں شرکت نہیں کرے گا لیکن اس کا رکن ہونا ہی ہمارے لئے بے اطمینانی کا موجب ہو گا۔ بعد میں جب میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ تھا تو میں نے پھر اس تجویز کا اعادہ کیا اور کہا کہ اب تو وہ "مذہبی دیوانہ" بین الاقوامی عدالت کا رکن بھی نہیں اب اس تجویز کو مان لینے میں کیا عذر ہے؟ اس پر مسٹر کرشنا مینن نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے مڑ کر اپنے ایک سیکرٹری سے دریافت کیا "کیا میں نے اسے "مذہبی دیوانہ" کہا تھا؟" سیکرٹری نے اثبات میں سر ہلایا۔

مجلس امن کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر کرشنا مینن نے فرمایا میرے وزیر اعظم نے کشمیر کے متعلق کبھی رائے شماری (PLEBISCITE) کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ میں نے جواب میں پنڈت نہرو جی کے بیانات سے دس مثالیں پیش کیں جن میں پنڈت جی نے کشمیر میں (PLEBISCITE) کے ذریعے رائے عامہ معلوم کرنے کا اعلان کیا ہوا تھا اور یہ کہا کہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں لیکن جو مثالیں میں نے بیان کی ہیں وہ اراکین مجلس بلکہ خود ہندوستان کے محترم نمائندے کے اطمینان کے لئے کافی ہوں گی کہ ہندوستان کے قابل احترام وزیر اعظم نے تنازعہ کشمیر کے متعلق یہ لفظ بڑی کثرت سے استعمال فرمایا ہے۔ جب مسٹر کرشنا مینن کی باری آئی تو انہوں نے اس امر کے متعلق صرف اتنا فرمایا میں اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے وزیر اعظم نے کشمیر کے قضیئے کے سلسلے میں کبھی لفظ PLEBICITE استعمال نہیں کیا۔ ایسی ڈھٹائی کا کیا علاج ؟

سر گوپالا سوامی آئینگر | اس کے خلاف سر گوپالا سوامی آئینگر اگرچہ اپنی ہٹ کے پکے تھے لیکن واقعات میں ایجاد اور تصرف نہیں کرتے تھے۔ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کشمیر میں ڈوگرہ مظالم کی داستان کے سلسلہ میں بیان کیا کہ ۱۹۳۴ء تک ریاست کشمیر میں کسی شخص کا اپنی گائے ذبح کرنا نہ صرف جرم تھا بلکہ اس قدر سنگین جرم کہ اس کی سزا عمر قید تھی۔ ۱۹۳۴ء میں اس تعزیر میں تخفیف ہوئی لیکن اب بھی اس جرم کی سزا غالباً سات سال قید بامشقت ہے۔ اجلاس کے اختتام پر جب ہم کمرے سے باہر نکلے تو سر گوپالا سوامی نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈال لیا اور فرمایا ان تفاصیل میں جانے کی کیا ضرورت تھی ؟ میں نے کہا ضرورت کا فیصلہ تو مجھ پر رہنے دیجئے لیکن آپ تو ایک عرصہ کشمیر کے وزیر اعظم رہے ہیں آپ ہی فرمائیں کہ اس وقت کشمیر میں گاؤکشی کی کیا سزا ہے ؟ انہوں نے فرمایا بھائی واقعہ تو یہی ہے کہ اب بھی اس جرم کی سزا سات سال نہیں بلکہ دس سال قید بامشقت ہے۔ لیکن تم یہ بتاؤ تم ملک کی تقسیم پر پاکستان کیوں منتقل ہو گئے۔ تمہارا وطن تو تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب میں ہے۔ اگر تم ہندوستان میں رہتے تو ہندوستان کی سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس ہوتے۔ میں نے کہا میں جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ نام کو تو میں چیف جسٹس ہوتا لیکن عملاً میں نظر بندی میں ہوتا۔ کہنے لگے یہ تمہارا وہم ہے۔

جانبین کی دو دو تقریریں سننے کے بعد مجلس امن نے یہ طے کیا کہ ماہ جنوری کے صدر مجلس پروفیسر لنگن ہوف اور ماہ فروری کے صدر مجلس جنرل مکناٹن فریقین کے نمائندوں کے ساتھ گفتگو کے بعد تصفیہ کی کوئی عملی تجویز مجلس میں پیش کریں۔ مجلس امن کی صدارت ہر ماہ بدلتی ہے۔ جنوری کی صدارت بلجیم کی تھی فروری کی کنیڈا کی۔ چنانچہ فروری کے شروع میں تبادلہ خیالات کے سلسلہ کی ابتداء ہوئی۔ صدر صاحبان فریقین سے علیحدہ علیحدہ بات چیت کرتے تھے۔ فریقین کی تقریروں سے اراکین مجلس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اگرچہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے لیکن اس کا سلجھانا چنداں مشکل نہ ہوگا کیونکہ فریقین اس بنیادی بات پر متفق ہیں کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ

ریاست کی رعایا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مجلس امن پر صرف یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ رعایا کی مرضی معلوم کرنے کا مناسب طریق تجویز کر دے اور اس پر فریقین کا اتفاق ہو جائے۔ اس صورت میں جنگ بندی آسان ہو جائے گی اور قبائلیوں اور رضا کاروں کو ریاست سے واپس جانے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ نیز جب آزاد کشمیر عنصر کو اطمینان ہو جائے گا کہ انہیں پورا حق خود اختیاری حاصل ہو گیا ہے تو وہ بھی لڑنا بند کر دیں گے۔ مجلس امن میں بحث کے دوران میں اور بعد میں صدر صاحبان کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جو وقت فارغ ہوتا اس میں چودھری محمد علی صاحب اور میں باری باری تمام اراکین مجلس سے علیحدہ علیحدہ مل کر اپنا موقف ہر معاملے میں واضح کر دیتے تھے اور جو مشکل انہیں نظر آتی اس کا حل بتا دیتے تھے۔ اس غرض سے ہمیں کم سے کم تین چار بار ہر ایک رکن مجلس سے ملنے کا موقعہ ہوا۔ روس کا موقف اس وقت غیر جانبدارانہ معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ روسی نمائندے پوری دلچسپی لیتے تھے لیکن وہ کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان دنوں اقوام متحدہ میں برطانوی نمائندہ تو سر الیگزینڈر کیڈوگن تھے لیکن اس قضیئے کی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر امور کامن ویلتھ رائٹ آنریبل مسٹر فلپ نوئیل بیکر خود لندن سے برطانیہ کی نمائندگی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ امریکی نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن تھے۔ یہ دونوں اصحاب پوری توجہ اور انہماک سے کوشاں تھے کہ مجلس امن کوئی ایسا حل تجویز کرے جس کے نتیجہ میں جلد اس قضیئے کا پرامن تصفیہ ممکن ہو جائے۔ ہم جانتے تھے کہ سلامتی کونسل کے صدر صاحبان ہمارے ساتھ اور ہندوستانی وفد کے ساتھ گفتگو کے علاوہ اراکین مجلس امن کے ساتھ بھی متواتر مشورہ کر رہے ہیں۔ اراکین مجلس کے ساتھ جو بات چیت ہوتی تھی اس سے کچھ ترشح ہوتا رہتا تھا کہ مجلس کا رجحان کس طرف ہے اور یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ ہندوستانی وفد کس بات پر زور دے رہا ہے۔

آخر مجلس نے باہمی مشورے کے بعد ایک قرارداد پر اتفاق کیا جو اراکین مجلس کی طرف سے یہ قرارداد مجلس میں پیش کی گئی اور اس پر اظہار رائے ہونے لگا۔ اس قرارداد کے رو سے جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ سب تو میسر نہیں آتا تھا لیکن اصولاً ہمارا موقف تسلیم ہو جاتا تھا۔ اسلئے بعض تفاصیل کی وضاحت چاہنے اور بعض پر تنقید کرنے کے ساتھ ہم نے اسے قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن ہندوستانی وفد نے قرارداد کی مخالفت کی اور اس کی مرکزی تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ رائے شماری کو آزاد اور غیر جانبدار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ریاست کی حکومت کی تشکیل بھی غیر جانبداری کے اصول پر ہو۔ مسٹر نوئیل بیکر قرارداد کی بڑے زور سے حمایت کر رہے تھے اور اس کوشش میں بھی تھے کہ ہندوستانی وفد کو اور ان کی وساطت سے پنڈت جواہر لال صاحب کو قرارداد کو قبول کر لینے پر آمادہ کر لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک ملاقات میں امریکہ کے نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن نے بتلایا کہ ہندوستانی وفد اس بات پر زور دے رہا ہے کہ مجلس امن صرف قبائلیوں اور رضا کاروں کو ریاست سے واپس کرانے اور آزاد کشمیر کے لوگوں کے لڑائی سے ہاتھ روکنے کا انتظام کر دے۔ باقی سب کچھ ان پر چھوڑ دیا جائے وہ سب انتظام

کرلیں گے۔ سینیٹر نے کہا ہم نے ان پر واضح کر دیا ہے کہ مجلس امن اس قضیئے میں اپنے فرائض کو اس رنگ میں نہیں دیکھتی۔ مجلس امن کا فرض ہے کہ وہ اس تمام قضیئے کی تہہ کو پہنچے اور یہ معلوم کرے کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو ہتھیار بند ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ واضح ہے کہ جب انہوں نے حق خود اختیاری کو زائل ہوتے دیکھا تو وہ ہتھیار بند ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اب لڑائی بند کرنے کا ایک ہی طریق ہے کہ ان لوگوں کا اطمینان کرا دیا جائے کہ جس حق کے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے لڑائی شروع کی تھی وہ حق اب انہیں بغیر لڑائی کے حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بغیر جنگ بندی کا اور کوئی طریق نہیں۔

آخر تبادلہ خیالات کا سلسلہ ختم ہونے پر مجوزہ قرارداد کے متعلق رائے شماری کا وقت آیا۔ اس وقت تک جتنے اراکین مجلس نے قرارداد کے متعلق اظہار خیال کیا تھا سب نے قرارداد کی تائید کی تھی اور یہی اندازہ تھا کہ قرارداد اگر بالاتفاق نہیں تو گیارہ میں سے دس آراء کی تائید کے ساتھ منظور ہو جائے گی۔ روس کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ شاید غیر جانبدار رہے۔ عین اس مرحلے پر سر گوپالا سوامی آئینگر نے بولنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر انہوں نے فرمایا ہمیں اپنی حکومت کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی ہے کہ ہم مزید ہدایات کے لئے دلی واپس جائیں اس لئے ہم رخصت کی اجازت چاہتے ہیں اور یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہماری واپسی تک اجلاس ملتوی کیا جائے۔ اراکین مجلس اس درخواست پر حیران بھی ہوئے اور آزردہ بھی۔ یہ تو سب نے سمجھ لیا کہ ہندوستان کی نیت بخیر نہیں۔ اکثر نے تو اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا کہ کشمیر میں جنگ جاری ہے اور جانیں تلف ہو رہی ہیں ضروری ہے کہ اس صورت حالات کا جلد کچھ مداوا کیا جائے اور اس امید کا اظہار کیا کہ ہندوستانی وفد بہت جلد واپس آجائے گا تاکہ مجلس اپنی کارروائی کو بغیر غیر ضروری توقف کے جاری رکھ سکے۔ لیکن بعض اراکین نے اپنی آزردگی کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً کولمبیا کے مندوب نے کہا۔ صاحب صدر آپ کو اور اراکین مجلس کو یاد ہوگا کہ ابھی چند دن ہوئے ہندوستان کے فاضل نمائندے نے شکوے کے طور پر کہا تھا کہ کشمیر جل رہا ہے اور مجلس امن ستار بجا رہی ہے۔ کیا میں ہندوستان کے فاضل نمائندے سے دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اب کیا کشمیر کو جلانے والی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے؟ اور اگر نہیں تو اب کون ستار بجا رہا ہے؟ سر گوپالا سوامی آئینگر نے اس قسم کی تنقید سے زچ ہو کر کہا مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کے ایک معزز رکن کی ایک جائز درخواست پر اس قسم کے تکلیف دہ خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مجلس کے اراکین کے ان احساسات کے باوجود مجلس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اجلاس ملتوی کیا جائے۔

جب التواء کی مدت کچھ طول پکڑنے لگی تو چوہدری محمد علی صاحب نے مجھے کہا ہمارا ہندوستانی وفد کے انتظار میں نیویارک بیٹھے رہنا بے معنی ہے لیکن اگر ہم پاکستان لوٹ جائیں تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ التوا مستقل ہو جائے گا اور ممکن ہے قضیۂ کشمیر کے متعلق مجلس کے اراکین کی دلچسپی بھی ٹھنڈی پڑ جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت کشمیر کا مسئلہ

دلّی اور لندن کے درمیان زیر بحث ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم لندن چلیں اور وہاں کچھ کھوج لگائیں کہ پس پردہ کیا پخت و پز ہو رہی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں لندن پہنچے اور وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون اور وزیراعظم مسٹر اٹیلی سے ملاقات کی درخواست کی۔ وزیر خارجہ نے گیارہ بجے قبل دوپہر کا وقت دیا اور وزیراعظم نے اسی دن تین بجے بعد دوپہر کا۔ وزیر خارجہ بہت صاف گو انسان تھے اور میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ انہوں نے میری بات توجہ سے سنی معلوم ہوتا تھا کہ وہ صورت حالات سے واقف ہیں چنانچہ انہوں نے فرمایا مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور اتفاق بھی لیکن ہندوستان کے معاملات میں وزیراعظم پر کرپس کا بڑا اثر ہے وہ اس معاملے میں وزیراعظم کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ان کے الفاظ تھے:۔ "HE HAS BEEN AT HIM" میں نے سنا ہے تم آج وزیراعظم سے مل رہے ہو۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا کرے تمہاری قسمت نیک ہو۔ دوپہر کے کھانے پر میں نے یہ کیفیت چوہدری صاحب کی خدمت میں بیان کر دی۔ ہم دونوں کا یہی اندازہ ہوا کہ صورت حالات بگڑ گئی ہے۔ میں تین بجے وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ صورت ہی سے پشیمان نظر آتے تھے۔ میں یوں تو انہیں بیس سال پہلے سے جانتا تھا جب وہ سائمن کمشن کے رکن تھے لیکن ہمارے درمیان کسی وقت بھی گہرے مراسم نہیں تھے۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ انہوں نے آزادی ہند کے قانون کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کرتے وقت قائداعظم کے متعلق اپنی تقریر میں شکوہ کیا تھا کہ انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بنانے کی تجویز منظور نہ کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو وزیراعظم کے منظور نظر تھے اب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ اور سر سٹیفورڈ کرپس ہندوستان کی حمایت میں تھے۔ دوسری طرف ان دنوں حکومت برطانیہ میں پاکستان کا حمایتی کوئی نہ تھا مقابلہ بالکل غیر متوازن تھا میں نے قریب پون گھنٹہ ان کی خدمت میں صرف کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے نظر ملا کر بات نہ کی کبھی ادھر جھانکتے کبھی ادھر۔ یہی کہتے فکر نہ کرو۔ ہندوستانی وفد جلد نیویارک پہنچ جائے گا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ انہیں آمادہ کروں کہ ہندوستان کے ساتھ اپنا رسوخ استعمال کر کے انہیں ایفائے عہد پر مائل کریں۔ اور اس میلان کا ثبوت مجلس امن کے سامنے پیش شدہ قرارداد کو تسلیم کرنے سے مہیا کریں اور وہ اس طرف آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ کہنے لگے تمہیں اس قرارداد پر کیوں اصرار ہے اصل غرض اور طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر یوں کر دیا جائے یا یوں کر دیا جائے یا یوں کر دیا جائے۔ میں انکی ہر ایک یوں پر تنقید کرتا گیا لیکن وہ راہ پر نہ آئے میں بے نیل مرام لوٹ آیا اور اپنے رفیق کار سے کیفیت بیان کر دی اور نواب زادہ صاحب کی خدمت میں بھی رپورٹ بھیج دی۔ چوہدری محمد علی صاحب اور میں نیویارک واپس ہوئے۔ کچھ دن بعد ہندوستانی وفد کی واپسی پر مجلس امن کے اجلاس پھر شروع ہوئے۔ لیکن اب سماں بدلا ہوا تھا۔ جیسے میں ذکر کر چکا ہوں روس تو اس مرحلے پر غیر جانبدار تھا کہ یہ کامن ویلتھ کا آپس کا معاملہ ہے ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ امریکہ اور برطانیہ پیش پیش تھے۔ مجلس کے

باقی اراکین بیشک اپنی اپنی رائے رکھتے تھے لیکن ان دونوں کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ امریکہ بہت حد تک کامن ویلتھ کا معاملہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ کے مشورے پر چلتا تھا۔ برطانیہ کے نمائندے مسٹر فلپ نوئیل بیکر فریقین کی باہمی مفاہمت سے کسی موثر طریق فیصلہ کے لئے کوشاں تھے لیکن وزیر اعظم برطانیہ اب ان کے مشورے پر عمل پیرا ہونے پر تیار نہ تھے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کا اثر اپنا کام کر چکا تھا۔ ہمارے وفد کے سیکریٹری مسٹر ایوب کو مسٹر نوئیل بیکر کے سیکریٹری نے بتایا کہ وزیر اعظم اٹیلی اور مسٹر نوئیل بیکر کے مابین اختلاف اسقدر بڑھ چکا ہے کہ مسٹر بیکر مستعفی ہونے کی سوچ رہے ہیں اس امر کی تصدیق ۱۹۵۱ء میں خود مسٹر نوئیل بیکر نے کی۔ وہ اس وقت وزارت سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ میرے ان کے ۳۳ء سے دوستانہ مراسم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ مسٹر نوئیل بیکر کا گذر پیرس سے ہوا تو وہ مجھے ملنے تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں کشمیر کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمایا میرے لئے یہ امر نہایت تکلیف دہ ہے کہ اس قضیئے کے خاطر خواہ تصفیہ کی صورت پیدا ہوئی مگر بات بنتے بنتے بگڑ گئی فرمایا ۱۹۴۸ء میں نیویارک میں میں نے بڑی کوشش سے سر گوپالا سوامی آئینگر اور باجپائی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ پنڈت نہرو کو قرارداد منظور کرنے پر رضامند کریں۔ انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کریں گے۔ چنانچہ ہفتہ کے روز دونوں الگ الگ مجھے ملنے کے لئے آئے اور کہا ابھی پختہ اطلاع تو نہیں آئی لیکن ہمارے پیغام کا ردعمل خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے دو ایک دن تک واضح ہدایت آجائے گی اور ہمارا اندازہ ہے کہ سوموار یا منگل وار تک ہم آپ کو پختہ اطلاع دے سکیں گے۔

THEN ON MONDAY I RECEIVED THAT DISASTROUS TELEGRAM FROM ATLEE UPSETTING EVERYTHING

(اور پھر سوموار کے دن مجھے اٹیلی کا وہ منحوس تار وصول ہوا جس نے سارے معاملہ کو بگاڑ کے رکھ دیا)

میں نے سخت احتجاج کیا لیکن اٹیلی نے میری ایک نہ مانی بلکہ اس بات سے میرے خلاف دل میں گرہ باندھ لی۔ تھوڑے عرصے بعد مجھے کامن ویلتھ کی وزارت سے علیحدہ کر کے بجلی اور ایندھن کا وزیر بنا دیا اور کچھ عرصہ بعد وزارت سے ہی الگ کر دیا۔

آخر کار جب مجلس امن میں چینی نمائندے نے جو مارچ کے مہینے میں مجلس کے صدر تھے ایک نئی قرارداد کا مسودہ پیش کیا تو ہمارے سب خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ یہ قرارداد ان تجاویز کے مطابق تھی جس کا ذکر وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے میرے ساتھ لندن میں کیا تھا۔ پہلی قرارداد کے مقابلے میں یہ قرارداد بہت کمزور تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جب مسٹر نوئیل بیکر سر گوپالا سوامی آئینگر اور سر گرجا شنکر باجپائی کے ذریعے پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلی مجوزہ قرارداد منظور کر لینے کی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھے تو پنڈت صاحب لارڈ ماونٹ بیٹن اور سر سٹیفورڈ کرپس کے

ذریعہ وزیر اعظم اٹیلی پر زور ڈال رہے تھے کہ پہلی مجوزہ قرارداد کے ان حصوں کو ترک کیا جائے جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں۔ وزیر اعظم اٹیلی جو شروع ہی سے تحریک پاکستان کے حق میں نہ تھے اور جو قائد اعظم سے بھی بغض رکھتے تھے نہایت آسانی سے ادھر مائل ہو گئے اور اپنی پہلی ہدایات کے خلاف اور اپنے رفیق کار وزیر امور کامن ویلتھ کے مشورے کے خلاف پہلا موقف بدل لیا جس کے نتیجے میں نہ صرف پہلی مجوزہ قرارداد کی بجائے ایک نسبتاً کمزور قرارداد مجلس امن میں پیش کی گئی بلکہ مجلس امن کی ساری فضا ہی بدل گئی۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کو معلوم ہو گیا کہ مجلس امن کی مساعی کو ریشہ دوانی اور حکمت عملی سے بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ جس طرح فلسطین کا قضیہ صدر ٹرومین کی یہود نوازانہ پالیسی کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے لئے خصوصاً اور اسلامی دنیا کے لئے عموماً ان گنت مشکلات اور مصائب کا موجب بنا ہوا ہے اسی طرح کشمیر کے قضیہ کی ذمہ داری جس کے نتیجہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ تک نوبت پہنچی اور جو تا حال بر اعظم پاک و ہند کے لئے خصوصاً اور سارے مشرق کے لئے عموماً بہت سے خطرات کا بیج اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ماؤنٹ بیٹن اور بعض اور شخصیتوں کے علاوہ وزیر اعظم اٹیلی کے سر ہے انسانی تاریخ میں ان دو پستہ قد اور بظاہر بے اثر شخصیتوں (ٹرومین اور اٹیلی) کا شمار ان اشخاص میں ہو گا جن کی انصاف کشی نے امن عالم کو تباہ کر دیا۔

جب نئی قرارداد مجلس امن میں پیش ہوئی تو چودھری محمد علی صاحب نے اور میں نے پھر دن رات اراکین مجلس امن کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ جہاں تک ہو سکے نئی قرارداد کو مضبوط کیا جائے۔ چینی صدر صاحب کے ساتھ متواتر مشورے ہوئے۔ بعض معمولی سی ترامیم اور وضاحتیں انہوں نے تسلیم بھی کیں لیکن قرارداد کا ڈھانچہ وہی رہا جو وزیر اعظم اٹیلی تجویز کر چکے تھے۔ آخر یہ قرارداد اپریل میں کولمبین مندوب کی صدارت میں منظور ہوئی۔ اسی قرارداد میں یہ تجویز تھی کہ تین اراکین کا ایک کمشن مقرر کیا جائے جو بر اعظم پاکستان و ہند جا کر قرارداد کی مختلف تجاویز کو فریقین کے مشورے اور انکی رضامندی کے ساتھ عملی جامہ پہنائے اور کشمیر کے باشندگان کی آزادانہ رائے شماری کا اہتمام کرے۔ کولمبین صدر صاحب کی تجویز پر کمشن کے اراکین کی تعداد تین سے بڑھا کر پانچ کر دی گئی۔ طے پایا کہ اس کمشن میں دو رکن مجلس امن نامزد کرے اور وہ دونوں ایک تیسرا رکن نامزد کریں ان کے علاوہ ایک رکن پاکستان اور ایک ہندوستان نامزد کرے۔ مجلس امن نے بلجیم اور کولمبیا کو نامزد کیا اور ان دونوں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو نامزد کیا پاکستان نے ارجنٹائن کو اور ہندوستان نے چیکوسلواکیہ کو نامزد کیا۔ کمشن کا اصطلاحی نام:-

UNITED NATIONS COMMISSION ON INDIA AND PAKISTAN

(UNCIP)

قرار پایا کیونکہ کشمیر کے علاوہ جونا گڑھ کا قضیہ اور بعض اور امور بھی جو پاکستان کی طرف سے پیش کئے گئے تھے اس کمشن کے سپرد تھے لیکن عرف عام میں اس کمشن کا نام کشمیر کمشن ہی مشہور ہوا۔

قرارداد کے منظور ہونے تک ہندوستان کا یہی موقف تھا کہ مجلس امن لڑائی بند کرانے کا انتظام کر دے باقی سب امور وہ خود طے کر لیں گے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مجلس امن اصل نزاع کا فیصلہ اپنی نگرانی میں کرانے پر مصر ہے تو انہوں نے اپنی فوجی سرگرمیوں کو تیز کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جب حکومت ہند کے اس عزم کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑی تو ہم ابھی نیو یارک ہی میں تھے چنانچہ چوہدری صاحب نے اور میں نے اس اقدام کے متعلق مشورہ کیا اور میری یہ پختہ رائے ہوئی کہ ہمیں ہندوستان کے اقدام کی روک تھام کے لئے اپنی فوج محاذ پر بھیج دینی چاہیئے اور میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنی رائے کی اطلاع وزیراعظم لیاقت علی خاں کی خدمت میں بھیج دوں۔ چوہدری صاحب کو اگرچہ حالات کے لحاظ سے یہ خدشہ تو محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان جنگی فیصلے کی کوشش کرے گا۔ لیکن انہیں ایسا مشورہ تار کے ذریعہ بھیجنے میں تامل تھا ان کے خیال میں CYPHER کے ذریعے سے پیغام بھیجنا محفوظ طریق نہ تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ بات ظاہر ہو جائے گی اور ہم مجلس امن کے روبرو زیر الزام ہوں گے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ وزیراعظم کی خدمت میں پیغام ایک خاص قاصد کے ہاتھ بھیجا جائے میں نے کہا مرحلہ بہت نازک ہے اور ممکن ہے تاخیر خطرے کا موجب ہو۔ بات نکل جانے میں کوئی حرج نہیں۔ مجلس امن اپنا وقار بہت حد تک کھو چکی ہے۔ اگر انہیں پنڈت جواہر لال نہرو کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں تو ہمیں کیا کہہ لیں گے۔ اگر ہم مجلس امن کے خوف سے غافل بیٹھے رہے تو جو نقصان ہمیں پہنچے گا اس کا ازالہ بعد میں نہیں ہو سکے گا۔ ممکن ہے چوہدری صاحب مجھ سے متفق نہ ہوئے ہوں لیکن انہوں نے ناچار رضامندی کا اظہار کر دیا اور میں نے اس مضمون کا CYPHER تار وزیراعظم کی خدمت میں ارسال کر دیا کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا نیو یارک میں نہیں ہوگا لہٰذا ہندوستان کی فوجی تیاری کے پیش نظر لازم ہے کہ ہم اپنی باقاعدہ فوج محاذ پر بھیج دیں وزیراعظم صاحب نے میرا تار ملنے پر کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی کو ہدایت دی کہ وہ کشمیر کے محاذ کے متعلق موجودہ حالت کی رپورٹ پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے رپورٹ پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستانی افواج بڑی مستعدی سے اور بڑے پیمانے پر آگے بڑھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ اس صورت میں آزاد کشمیر کے فوجی دستے ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور نہ صرف آزاد کشمیر کے علاقے بلکہ خود پاکستان کے بعض علاقے خطرے میں پڑ جائیں گے اور ممکن ہے منگلا کے مقام پر نہر کے ہیڈ ورکس بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ان کی بھی یہی رائے تھی کہ اس خدشے کے دفاع کے لئے ہمیں اپنی فوج محاذ پر بھیج دینی چاہیئے۔ وزیراعظم صاحب نے جو وزیر دفاع بھی تھے اس رپورٹ کے نتیجے میں پاکستانی فوج کے محاذ پر بھیجے جانے کے احکام صادر فرما دیئے۔ چنانچہ اپریل کے آخری ہفتے اور مئی کے

پہلے ہفتے میں پاکستانی افواج نے جنگی کشمکش میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پاکستانی افواج کا محاذ پر بھیجا جانا کوئی خفیہ اقدام نہ تھا نہ ہی ایسا اقدام خفیہ رہ سکتا تھا۔ چند ماہ بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریروں میں کہنا شروع کیا کہ پاکستان کا وزیر خارجہ مجلس امن کے سامنے تو کہتا رہا کہ ہماری باقاعدہ فوج جنگ میں شامل نہیں لیکن ہمیں شروع مئی ۱۹۴۸ء میں ثبوت مل گیا کہ پاکستانی فوج جنگ میں حصہ لے رہی ہے اس طرح پاکستان کا وزیر خارجہ مجلس امن کے سامنے صریح غلط بیانی کا مرتکب ہوا۔ لیکن جب ہم نے کمشن کے آنے پر کمشن کے روبرو ثبوت مہیا کر دیا تو ناچار پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا کہ ان کی باقاعدہ فوج محاذ جنگ پر مصروف پیکار ہے۔ مجلس امن میں میرا یہ بیان جنوری اور فروری ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا اور ہماری باقاعدہ فوج کا محاذ پر بھیجا جانا آخر اپریل یا شروع مئی ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا اس لئے وہ بیان بالکل درست تھا۔ اقوام متحدہ کی کشمیر کمشن کے اراکین پہلی بار جنیوا سے ، ۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی آئے۔ پہلے دن وہ مجھ سے رسمی ملاقات کے لئے میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے اپنے ملاقات کے کمرے میں محاذ کے نقشہ جات ٹنکوا دیئے تھے۔ چائے اور رسمی گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ مجلس امن کی کاروائی ختم ہونے کے بعد ہندوستانی فوجی تیاریوں کے پیش نظر پاکستان افواج کے کمانڈر انچیف کے مشورے کے مطابق ہمیں دفاع کے لئے اپنی فوج کو محاذ پر بھیجنا لازم ہو گیا اور شروع مئی سے ہماری باقاعدہ فوج کے دستے محاذ پر برسرپیکار ہیں۔ نقشوں کی مدد سے میں نے سب تفصیل کمشن پر واضح کر دی۔ اس سے قبل کمشن کو اس امر کی اطلاع کسی اور ذریعے سے نہیں پہنچی تھی اور دلی تو ابھی کمشن کا جانا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہذا پنڈت نہرو کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ جب ان کی طرف سے پاکستان افواج کے محاذ پر ہونے کا ثبوت کمشن کے روبرو پیش کر دیا گیا تو پاکستان کو کمشن کے روبرو اس امر کو تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ کمشن کو اس اقدام کی اطلاع ہم نے خود کی تھی اور ان کے کراچی پہنچنے پر پہلی ملاقات میں کر دی تھی۔

اقوام متحدہ کی کشمیر کمشن کے اراکین | کمشن کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ نہایت ہی اہم اور بہت ذمہ داری کا تھا لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ حکومتوں نے اس کام کی اہمیت کو مناسب وقعت نہ دی اور اپنے نمائندوں کے انتخاب میں نہایت سہل انگاری سے کام لیا کمشن کے اراکین بلاشبہ شرفاء تھے لیکن سیاسی سوجھ بوجھ ہمت اور حوصلے کے لحاظ سے اس درجہ تک نہیں پہنچتے تھے جو ان کے فرائض کی کما حقہ ادائیگی کے لئے ضروری تھا۔ ان میں سے صرف ایک رکن ان خوبیوں کے مناسب حد تک حامل ثابت ہوئے جو ان کے فرائض کی کامیاب ادائیگی کے لئے لازم تھیں۔ وہ چیکوسلواکیہ کے نمائندے ڈاکٹر جوزف کوربیل تھے۔ جنہوں نے کمشن سے علیحدگی کے بعد کمشن کی سرگرمیوں کے متعلق ایک کتاب "DANGER IN KASHMIR" شائع کی اس کتاب کا نیا ایڈیشن ۱۹۶۶ء کے شروع میں شائع ہوا ہے۔ بلجیم کے پہلے نمائندے ایک عمر رسیدہ BARRON تھے جنہیں صرف کھانے پینے اور

سونے سے سروکار تھا۔ اگر کسی وقت کمشن کے کام کی طرف توجہ فرماتے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ کمشن کا کوئی اقدام پنڈت جواہر لال نہرو کی طبع نازک پر گراں تو نہیں ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نمائندے کچھ توجہ فرماتے تھے لیکن ان کی شرافت ان کی ہمت پر غالب تھی۔ کولمبیا کے نمائندے ڈاکٹر کوربل سے دوسرے درجے پر تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ ثبوت دیا لیکن ان کے لئے بڑی مشکل تھی کہ انگریزی زبان کی واقفیت بہت محدود تھی۔ ارجنٹائن کے نمائندے پرلے درجے کے شریف اور اس درجہ باحیا تھے کہ ان کے لئے بات کرنا دوبھر تھا۔ کمشن نے جس حد تک اپنے فرائض کو سرانجام دیا اس میں ساٹھ فیصدی ڈاکٹر کوربل کا حصہ تھا بیس فیصدی امریکی نمائندے کا اور بیس فیصدی کولمبین نمائندے کا۔ ڈاکٹر کوربل ۱۹۴۹ء کے شروع میں کمشن سے علیحدہ ہوگئے۔ ان کی علیحدگی کے بعد کمشن نیم مردہ ہوگئی اور تھوڑے عرصے بعد اس نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر جوزف کوربیل رکن کشمیر کمشن | ڈاکٹر جوزف کوربیل کمشن پر تقرری کے وقت چیکوسلواکیہ کے سفیر متعینہ بلگراڈ تھے۔ چیکوسلواکیہ کو ہندوستان نے کمشن کا رکن نامزد کیا تھا۔ ان کی رکنیت کے دوران میں چیکوسلواکیہ اشتراکیت کے زیر اثر آنا شروع ہوگیا۔ اپنے وطن کے رجحان سے خائف ہوکر انہوں نے ۱۹۴۹ء کے شروع میں ہی یہ انتظام کیا کہ ان کے بیوی بچے لندن چلے جائیں۔ کمشن سے مستعفی ہونے پر وہ خود بھی لندن چلے گئے اور وہاں سے بیوی بچوں سمیت امریکہ چلے گئے۔ وہاں ڈینور یونیورسٹی کے شعبۂ سوشل سائنس فونڈیشن میں پروفیسر ہوگئے اور اب چند سالوں سے فونڈیشن کے ڈائرکٹر اور یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے سربراہ ہیں۔ میرے جو مراسم ان کے ساتھ کمشن کے سلسلے میں قائم ہوئے تھے وہ ان کے کمشن سے مستعفی ہونے کے بعد بھی قائم رہے اور بتدریج مضبوط ہوتے گئے حتی کہ ان مراسم نے گہرا دوستانہ رنگ اختیار کرلیا۔ مجھے کئی بار ان کے توسط سے ڈینور یونیورسٹی میں تقریر کے لئے اور دیگر تقاریب کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر موقعہ پر ان کی طرف سے بڑی تواضع اور شفقت کا سلوک ہوا۔ فجزاہ اللہ۔

ایک موقعہ پر میں ڈینور میں ان کے ہاں گیا ہوا تھا ان کے بیوی بچوں کے ساتھ بے تکلفی ہوچکی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں ان کے صاحبزادے سے کہا جب تمہارے ابا کمشن میں پہلے پہل مجھ سے ملے تو یہ مجھے کچھ شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور واقعات پر بھی جب تک پورے طور پر اپنا اطمینان نہ کرلیتے تھے میری بات کا انہیں اعتبار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر کوربیل بھی موجود تھے اور یہ بات دراصل میں نے انہیں سنانے کے لئے کہی تھی۔ وہ نہایت سنجیدہ مزاج ہیں میری بات پر مسکرائے اور کہا نہیں یہ بات نہیں۔ کمشن کے سب اراکین تم سے کچھ خائف تو ضرور تھے لیکن یہ احساس تمہاری قابلیت کی وجہ سے تھا۔ ہمیں تمہارے متعلق کوئی بے اعتمادی ہرگز نہیں تھی۔ ہاں شروع شروع میں ہم سب کو یہ احساس ضرور تھا کہ مسٹر محمد علی اور تم دونوں پنڈت جواہر لال نہرو کی کسی بات کو محض ان کے کہنے پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے اور انکی ہر بات کا تحریر میں ہونا اور واضح الفاظ میں ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

اس پر تمہارے اصرار سے ہمیں تعجب بھی ہوتا تھا اور بعض دفعہ ہمیں دقت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ایک بلند مرتبت شہرہ آفاق ہستی جس کی عالمی شہرت ایسی نیک تھی اس کے زبانی قول یا وعدے کو قبول کرنے میں تم دونوں کو اسقدر تامل کیوں ہے۔ لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی۔ جیسے جیسے ہمارا واسطہ پنڈت نہرو سے پڑتا رہا ہمارے تجربے سے تمہارے موقف کی صحت کی تصدیق ہوتی رہی۔ اگر یہ امر آج تمہارے لئے کسی اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جب میں کمشن سے علیحدہ ہوا اس وقت تک ہم سب کی متفقہ رائے ہو چکی تھی کہ :- "ALL YOUR SUSPICIONS OF PANDIT NEHRU WERE MORE THAN FULLY JUSTIFIED"

(پنڈت نہرو کے متعلق تمہارے شکوک بالکل حق بجانب تھے) کمشن کے اراکین کے متعلق میری رائے صحیح ہو یا غلط لیکن اس میں شک نہیں کہ کمشن نے کراچی اور دلی کے درمیان آنے جانے میں کوئی سستی نہ دکھائی اور دونوں اراکین سارا وقت محنت سے کام کرتے رہے۔ آخر کمشن نے اپنی پہلی قرارداد ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء کو تیار کر لی۔ حکومت ہند نے اسے قبول کر لیا کیونکہ یہ قرارداد بہت حد تک ان کے موقف کی موید تھی لیکن پاکستان کی حکومت نے اسے قبول نہ کیا جس کی بہت سی وجوہ تھیں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ قرارداد جنگ بندی اور فوجی انخلاء تک محدود تھی اور اس میں رائے عامہ کے استصواب کے متعلق کوئی تجاویز شامل نہیں تھیں۔ اس پر کمشن نے اپنی سرگرمی جاری رکھی اور آخر دسمبر ۱۹۴۸ء میں ایک دوسری قرارداد بطور تتمہ کے تیار کی اور دونوں حکومتوں کو پیش کی۔ اس سال اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ کمشن بھی پیرس منتقل ہو گیا تھا اور وہیں یہ قرارداد تیار ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے میں دونوں حکومتوں نے دونوں قراردادوں کو قبول کر لیا۔ اس پر کمشن نے دونوں کو دعوت دی کہ جب اصل تنازع کے طریق فیصلہ پر اتفاق ہو گیا ہے تو اب جنگ جاری رکھنا بے وجہ نفوس اور اموال کا ضیاع ہے چنانچہ کمشن کی تحریک پر یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بند ہو گئی۔ کمشن کی دوسری قرارداد اگرچہ آخری دسمبر میں قبول ہو چکی تھی لیکن اس کی تاریخ ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء قرار پائی۔ اس کے بعد کمشن موقعہ پر طرفین کی فوجوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اب تیرہ اگست کی قرارداد کے مطابق ٹروس ایگریمنٹ (TRUCE AGREEMENT) یعنی فوجی انخلاء کے معاہدے کے ترتیب دینے کا مرحلہ درپیش تھا۔ کمشن نے کراچی میں اس کے متعلق کچھ تبادلہ خیالات کیا اور پھر دلی پہنچ کر طرفین کے فوجی نمائندوں کو طلب کیا کہ وہ ۱۳ راگست کی قرارداد کے مطابق فوجی انخلاء کا منصوبہ تیار کر کے ساتھ لائیں۔ تاریخ مقررہ پر جب طرفین کے نمائندے کمشن کے روبرو پیش ہوئے تو پاکستانی نمائندوں نے تو حسب ہدایت کمشن اپنا منصوبہ کمشن کی خدمت میں پیش کر دیا لیکن ہندوستانی نمائندوں نے کہا کہ ان کا منصوبہ تیار تو ہے لیکن ابھی کمانڈر انچیف اور وزیر اعظم اسے ملاحظہ نہیں کر پائے۔

اسلئے کچھ مہلت درکار ہے۔ آخر ہفتہ عشرہ کی تاخیر کے بعد ان کی طرف سے منصوبہ پیش کیا گیا مگر بدیں شرط کہ کمشن تو اسے ملاحظہ کرے لیکن پاکستان بلکہ مجلس امن کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو۔ چنانچہ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہندوستان نے کیا منصوبہ پیش کیا تھا۔

فوجی انخلاء کے متعلق قرارداد یہ تھی کہ قبائلیوں اور رضاکاروں کے ریاست کی حدود سے اخراج کے بعد پاکستانی فوج تمام کی تمام اور ہندوستانی فوج کا کثیر حصہ (BULK) ریاست سے نکل جائے۔ جنگ بندی کے بعد قبائلی اور رضاکار جو ریاست کے باہر سے لڑائی میں شامل ہوئے تھے ریاست سے چلے گئے اور کمشن کو قرارداد کے اس حصے کی تعمیل کے متعلق اطمینان ہو گیا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کشمیر میں جو ہندوستانی فوجیں داخل ہوئی تھیں ان کا کثیر حصہ (BULK) کیا قرار دیا جائے۔ اس بات پر کمشن اور ہندوستانی نمائندوں کا اتفاق نہ ہو سکا۔ چنانچہ کمشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہم ہندوستان کے پیش کردہ منصوبے پر تو اپنی رپورٹ میں بحث کرنے کے مجاز نہیں کیونکہ ہندوستان کی طرف سے ہم پہ یہ شرط عاید کر دی گئی ہے کہ ہم منصوبے کی تفاصیل کا اظہار نہ کریں۔ لیکن منصوبے پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ہندوستان کا پیش کردہ منصوبہ قرارداد کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا کمشن کے الفاظ حسب ذیل تھے:-

"NEITHER QUANTITATIVELY NOR QUALITATIVELY DOES THE PLAN COMPLY WITH THE TERMS OF THE RESOLUTION"

اس مرحلے پر کمشن نے یہ بھی کہہ دیا کہ جنگ بندی ہو کر حد فاصل مقرر ہو گئی ہے۔ ہماری رائے میں اب مزید کارروائی کی نگرانی کے لئے کمشن کی بجائے ایک فرد واحد زیادہ موزوں ہو گا۔

سر اُوون ڈکسن کا تقرر بطور نمائندہ اقوام متحدہ | مجلس امن نے کمشن کی یہ سفارش منظور کرتے ہوئے آسٹریلیا کی عدالت عالیہ کے جج سر اُوون ڈکسن کو جو بعد میں آسٹریلیا کے چیف جسٹس بھی ہوئے کشمیر کے قضیہ میں اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کیا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ رائے عامہ کے استصواب کی شرائط طے کرنے کے بعد استصواب کا انصرام کریں یا فریقین کی رضامندی سے اس قضیہ کے طے کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں۔ سر اُوون ڈکسن نہایت قابل اور پختہ کار شخص تھے۔ وہ کراچی تشریف لائے اور پھر دلی بھی گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم کوئی ایسی شرائط تسلیم کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے جن کے تحت آزادانہ بے لاگ استصواب رائے کیا جا سکے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے اس قضیہ کو سلجھانے کیلئے کسی اور مناسب اور موثر طریق پر غور کرنا شروع کیا۔ ایک تجویز ان کے ذہن میں آئی جس کے خاکے کا ذکر انہوں نے

دلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے کہا اور کہا پیشتر اس کے کہ میں اس تجویز کی تفاصیل تیار کروں میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تفاصیل تیار ہو جانے پر آپ اس تجویز کے متعلق میرے ساتھ اور وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ تبادلہ خیالات پر آمادہ ہوں گے یا نہیں۔ بقول سراوُدن پنڈت صاحب نے آمادگی ظاہر کی اور سراوُدن نے پنڈت صاحب کو کہا کہ وہ اب کراچی جا کر وزیر اعظم پاکستان سے بھی استصواب کریں گے اور اگر وہ بھی تبادلہ خیالات پر رضامند ہو گئے تو وہ تجویز کی تفاصیل تیار کر کے دونوں کو اس تجویز پر تبادلہ خیالات کی دعوت دیں گے۔ چنانچہ سراوُدن کراچی تشریف لائے اور میرے اور چودھری محمد علی صاحب کے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کی۔ ہم نے کہا کہ تجویز کی تفاصیل ابھی تیار نہیں۔ اگر تفاصیل تیار ہونے پر تبادلہ خیالات کے بعد فریقین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا تو کیا صورت ہو گی۔ انہوں نے فرمایا میں یہ واضح کر دوں گا کہ ایسی صورت میں فریقین کے موقف پر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا اور کشمیر کمشن کی دونوں قرار دادیں جنہیں دونوں فریق تسلیم کر چکے ہیں بدستور قائم رہیں گی اور فریقین پر ان کی پابندی لازم ہو گی۔ اس شرط پر نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب نے بھی سراوُدن ڈکسن کی تجویز پر تفاصیل تیار ہونے کے بعد تبادلہ خیالات کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ سراوُدن نے فرمایا یہ ابتدائی مرحلہ تو طے ہو گیا اب میں اپنی تجویز کی تفاصیل تیار کر کے فریقین کو تبادلہ خیالات کی دعوت دوں گا۔ چودھری محمد علی صاحب نے سراوُدن سے کہا کہ آپ پنڈت نہرو کو اطلاع کر دیں کہ چونکہ دونوں فریق آپ کی تجویز کی تفاصیل تیار ہونے پر اس پر تبادلۂ خیالات کے لئے آمادہ ہیں لہٰذا اب آپ تجویز کی تفاصیل طے کر کے انہیں مطلع کریں گے۔ سراوُدن کو ابھی پنڈت جی کے طریق کار کا تجربہ نہ تھا۔ انہوں نے فرمایا اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ چودھری صاحب پنڈت صاحب کو خوب جانتے تھے اس لئے مصر ہوئے کہ انہیں بذریعہ تار ضرور مطلع کیا جائے۔ ان کے اصرار پر سراوُدن تار بھیجنے پر رضامند ہو گئے اور اسی شام سراوُدن نے پنڈت جی کو تار دیدیا کہ جس تجویز کے خاکے کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وزیر اعظم پاکستان بھی آپ کی طرح اس کی تفاصیل تیار ہونے پر اس پر میرے اور آپ کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے لئے آمادہ ہیں اسلئے میں اب اس تجویز کی تفاصیل تیار کر کے آپ کو مطلع کروں گا۔ دوسرے دن سراوُدن تشریف لائے۔ بڑے آزردہ تھے۔ فرمایا تمہیں معلوم ہے پنڈت نہرو نے میرے تار کا کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے۔ دریافت کرنے پر فرمایا پنڈت جی نے جواب دیا ہے۔ "مجھے تمہارے تار کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے تمہاری کسی تجویز کا علم نہیں۔ میرے لئے یہ بالکل نیا معاملہ ہے تم دلی آؤ تو اس پر بات چیت کریں گے۔" سراوُدن نے فرمایا اس تجویز کے متعلق میری اور پنڈت نہرو کی جو گفتگو ہوئی وہ بالکل واضح تھی اور اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مزید غور کرنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ میری تجویز پر تبادلۂ خیالات کرنا ان کے مفاد کے خلاف ہے اور وہ اب اس پر آمادہ نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ انہوں نے پہلے کسی ایسی تجویز کا ذکر بھی نہیں سنا اور ان کے لئے

یہ ایک بالکل نئی بات ہے خلاف واقعہ ہے بہر صورت اگر یہ میرا دلی جانا بے سود ہے لیکن میں ان کی دعوت کو رد بھی نہیں کر سکتا کہ ایسا کرنا بد خلقی ہوگی۔ لہٰذا میں کل دلی جا رہا ہوں شاید اس معمے کا حل وہاں جا کر معلوم ہو۔ تیسرے دن وہ کراچی واپس آئے اور بتلایا کہ دلی پہنچنے پر سر گرجا شنکر باجپائی ان کی پیشوائی کے لئے مطار پر آئے ہوئے تھے۔ فرمایا جب ہم کار میں بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا آپ کے وزیر اعظم کا اپنی رائے بدل لینا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن انہوں نے یہ کیسے لکھا کہ انہیں میری کسی تجویز کا علم ہی نہیں اور ان کے لئے یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس کے جواب میں سر گرجا شنکر باجپائی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا:۔

"SIR OWEN ! I CONCEIVE THE PRIME MINISTER MUST HAVE SUFFERED AN ATTACK OF TEMPORARY AMNESIA"

(سر اوون! میرا خیال ہے میرے وزیر اعظم پر شاید عارضی نسیان کا حملہ ہو گیا ہو) سر گرجا شنکر کا یہ فقرہ دہرانے کے بعد سر اوون نے جو کچھ کہا وہ پنڈت جی کی وفات کے بعد ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر فرینک گراہم کا تقرر | سر اوون ڈکسن نے اپنی ناکامی کی رپورٹ مجلس امن کو بھیجدی مجلس امن نے فریقین کے بیانات سنکر کینیڈا کے مندوب جنرل میکناٹن سے درخواست کی کہ وہ فریقین کے ساتھ بات چیت کے بعد اس قضئیے کے تصفیہ کے لئے کوئی عملی تجویز پیش کریں جنرل میکناٹن نے جو تجویز پیش کی اس کا مقصد بھی عملاً وہی تھا جو سر اوون کی تجویز کا تھا۔ لیکن ہندوستان نے اسے بھی رد کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر فرینک گراہم کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ کے نمائندے مقرر کئے گئے وہ کئی بار کراچی تشریف لائے اور دلی بھی تشریف لے گئے۔ جنیوا میں فریقین کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا۔ ایک چھوڑ چھ رپورٹیں مجلس امن میں پیش کیں۔ ہر رپورٹ میں اس امر پر بحث تھی کہ فوج کے انخلاء کا کیا طریق ہو۔ عموماً یہی ہوا کہ جو طریق بھی انہوں نے تجویز کیا پاکستان اس پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا مجلس امن کی مساعی بھی ہندوستان کو اپنی ضد ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ ایک عرصے تک تو یہی امر زیر بحث رہا کہ ہندوستان اپنی افواج متعینہ کشمیر میں سے کتنی افواج کے انخلاء پر رضامند ہونے کو تیار ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ہر نوع کا بہانہ اور عذر ہوتا رہا۔ آخر کار مجلس امن کے ایک اجلاس میں میں نے یہاں تک بھی کہدیا۔ صاحب صدر و اراکین مجلس امر زیر تنازعہ یہ ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے مطابق ہندوستان اپنی افواج متعینہ کشمیر میں سے کتنی فوج واپس بلانے کا پابند ہے قرارداد کے الفاظ میں "BULK OF ITS FORCES" لکھا ہے بحث اس امر پر ہے کہ BULK سے کیا مراد لی جائے۔ اس لفظ کی کچھ بھی تعبیر ہو اس سے مراد بہر صورت کثرت ہے یعنی ان افواج کا زیادہ حصہ ریاست سے

واپس بلا لیا جائے۔ ہندوستان نے قرارداد کی اس شرط کی تعمیل کی ایک تجویز کمشن میں پیش کی تھی لیکن کمشن نے قرار دیا کہ ہندوستان کی یہ تجویز قرارداد کی شرط کو پورا نہیں کرتی یعنی جتنی افواج ہندوستان ریاست سے واپس بلانے پر تیار ہے وہ ہندوستان کی افواج متعینہ ریاست کشمیر کا "BULK" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہندوستان کا یہ کہنا تھا کہ جو حصہ انہوں نے ریاست سے واپس بلانا تجویز کیا ہے وہ ان کے اندازے کے مطابق ان کی افواج متعینہ کشمیر کا BULK یعنی زیادہ حصہ ہے اور جو حصہ وہ ریاست میں چھوڑنا تجویز کرتے ہیں وہ انکی افواج متعینہ کشمیر کا کمتر حصہ ہے۔ صاحبان میں آپ کی خدمت میں اور آپ کے توسط سے ہندوستان کے سامنے ایک بہت آسان تجویز پیش کرتا ہوں۔ ہم نہیں جانتے اور آپ بھی نہیں جانتے کہ ہندوستان نے کتنی افواج کا ریاست سے انخلا تجویز کیا تھا اور کتنی افواج کا کشمیر میں چھوڑنا تجویز کیا تھا۔ لیکن اتنا ہم سمجھتے ہیں کہ جو حصہ انہوں نے نکالنا تجویز کیا تھا وہ ان کے اندازے کے مطابق بڑا حصہ تھا اور جو حصہ یہ پیچھے چھوڑنے والے تھے وہ چھوٹا حصہ تھا۔ میری یہ تجویز ہے کہ جو حصہ یہ نکالنے کو تیار تھے اور جو ان کے اندازے کے مطابق بڑا حصہ تھا وہ یہ نہ نکالیں اور اسے پیچھے چھوڑ دیں اور جو حصہ یہ پیچھے چھوڑنے والے تھے جسے یہ تھوڑا حصہ شمار کرتے تھے وہ حصہ یہ ریاست سے نکالیں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تجویز بھی ہندوستان کو نا منظور ہوئی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان نے جو تجویز انخلاء افواج کے متعلق کشمیر کمشن کو پیش کی تھی اس میں صرف قلیل حصہ افواج کا واپس بلوانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

اس اثناء میں حکومت ہند نے ہر طریق سے کشمیر کے عوام کو اپنے حق میں پھسلانے کی کوششیں شروع کر دیں انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جو اسباب پاکستان کے ظہور میں آنے کا موجب ہوئے تھے وہی اسباب کشمیر اور ہندوستان کے اتحاد کے رستے میں روک ہیں۔ بلکہ بعض وجوہ سے کشمیر کے رستے میں یہ روک اور بھی ناقابل عبور ہے۔ برّاعظم ہند و پاک میں اگرچہ مسلمانوں کو ہندو ذہنیت کا بہت کچھ تلخ تجربہ ہوا لیکن مسلمانوں پر ہندو ذہنیت کی "کرم فرمائی" کے رستے میں برطانوی اقتدار ایک حد تک حائل رہا تھا۔ اس کے برعکس کشمیر میں ڈوگرہ راج ایک سو سال سے مسلم آبادی کو بے دردی سے کچلنے میں بلا روک ٹوک مصروف رہا تھا۔ یہ امید رکھنا کہ ڈوگرہ مظالم کی یاد کشمیر کے مسلمانوں کے دل و دماغ سے محو کی جا سکے گی عبث ہے۔ پھر تقسیم ملک کے بعد خود ہندوستان میں جو سلوک مسلم اقلیت کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے وہ کشمیر کے مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ تیسرے ہندوستانی فوج کی طرف سے جو ظالمانہ اور حیا سوز سلوک کشمیر کی مسلم آبادی کے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہندوستان اور کشمیر کے مسلمانوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج قائم کرنے والا ہے۔ ہندوستان کی آنکھیں کھولنے کے لئے یہی امر کافی ہونا چاہیئے کہ وہی شیر کشمیر شیخ عبداللہ جن کو پنڈت نہرو بڑے فخر سے کشمیر کے متعلق اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا کرتے تھے آخر کار ہندوستان کے سلوک اور پنڈت صاحب کی وعدہ خلافیوں سے سبق حاصل کر کے کشمیر کے حق خود اختیاری کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے

جس کی پاداش میں پنڈت جی نے انہیں بغیر مقدمہ چلائے بارہ سال تک جیل میں رکھا۔ اس طویل حراست سے رہا ہونے کے بعد وہ پھر اس حق کے حصول کے لئے انتہائی جدوجہد کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شیخ صاحب نے کشمیری عوام کی کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے پنڈت جی کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں غلطی کی اور الزام لگایا ہے کہ پنڈت جی نے نہ صرف ان سے کئے گئے وعدوں سے انحراف کیا بلکہ اقوام متحدہ کی مجلس امن میں جو کچھ انہوں نے منظور کیا اس سے بھی منحرف ہو گئے اور کشمیر کو ہندوستان کی کالونی بنانے کی پالیسی اختیار کر لی۔

ہندوستان نے جو اقدام کشمیر کا الحاق اپنے ساتھ کرنے کے سلسلے میں کئے ان میں سے ایک کشمیر میں آئین ساز مجلس کا قیام تھا۔ جونہی اس کے متعلق ہندوستان کی طرف سے ابتدائی اعلان ہوا پاکستان نے مجلس امن میں اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے جواب میں سر بی این راؤ نے جو اس زمانے میں اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندہ تھے حکومت ہند کی طرف سے ایک بیان مجلس امن کے روبرو پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان مجوزہ مجلس آئین ساز کو الحاق کے مسئلے پر اظہار رائے کرنے سے روک نہیں سکتا لیکن چونکہ یہ مسئلہ مجوزہ مجلس کے اختیار سے باہر ہوگا اس لئے اگر وہ مجلس اس مسئلے پر کسی رائے کا اظہار کرے تو اس کا کوئی اثر اس قضیئے پر نہیں ہوگا جو مجلس امن کے سامنے ہے۔ لیکن حکومت ہند کے اس اعلان اور اقرار کا بھی وہی حشر ہوا جو ان کے باقی معاہدوں کا ہوتا رہا ہے۔ اور بالآخر ہندوستان نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ کشمیر کی نام نہاد مجلس آئین ساز ہندوستان کے ساتھ الحاق کی تائید کر چکی ہے اسلئے اب اس مسئلے پر کسی استصواب رائے عامہ کی ضرورت نہیں رہی!

مجلس امن میں کشمیر کے معاملے پر ہندوستان کی نمائندگی جب مسٹر کرشنا مینن کرنے لگے تو انہوں نے سرے سے ہندوستان کی تمام ذمہ داری سے ہی انکار کر دیا۔ اول تو کہا کہ ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ پہلے دن سے ہی غیر مشروط، پختہ اور مستقل ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش ہی نہیں۔ دوسرے کمشن کی قرار داد کی رو سے ہندوستانی افواج کا انخلاء اسی صورت میں لازم آتا ہے جب پاکستان کی تمام افواج آزاد کشمیر سے واپس ہو جائیں۔ چونکہ پاکستان نے اس تمام عرصے میں اپنی اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا اسلئے ہندوستان اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو چکا ہے۔ تیسرے چونکہ اس تمام عرصے میں حالات بہت حد تک بدل چکے ہیں اسلئے ہندوستان اب قراردادوں کا پابند نہیں رہا۔ چوتھے چونکہ اب ہندوستان نے آئینی طور پر ریاست کو ہندوستان کا جزو قرار دیدیا ہے اس لئے کشمیر قضیہ حل ہو گیا ہے اور کوئی تنازعہ باقی نہیں رہا جس پر مجلس امن یا کسی اور ادارے کو کچھ کہنے یا کرنے کا حق ہو۔ ان سب باتوں کا کافی وشافی جواب دیا گیا لیکن مسٹر مینن اپنی کج بحثی پر قائم رہے۔ مجلس امن تو فروری ۱۹۴۸ء میں ہی مسٹر ایٹلی کے افسوسناک اقدام کے نتیجے میں اپنی بے بسی کا اظہار کر چکی تھی۔ مسٹر کرشنا مینن کی موشگافیوں کو مجلس کے اراکین حیرانی

سے سنتے تھے اور مسکرا دیتے تھے۔ متعدد بار پاکستان کی طرف سے کہا گیا کہ ایک فریق یکطرفہ طور پر ایک بین الاقوامی قضیئے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر مسٹر کرشنا مینن یا حکومت ہند واقعہ میں ان ڈھکوسلوں کو جو ہندوستان کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں درست سمجھتی ہے تو ان تمام امور کے متعلق بین الاقوامی عدالت کی رائے طلب کی جا سکتی ہے۔ عدالت سے درخواست کی جائے کہ وہ فریقین کے تمام عذرات اور دلائل پر غور کر کے اس امر پر رائے دے کہ کمشن کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرار دادوں کے ماتحت فریقین کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور دونوں فریق عدالت کی رائے کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داری کو پورا کریں۔ لیکن ہندوستان کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ غرض اگر کسی وقت حکومت ہند کو اپنے قول و قرار کا کوئی پاس تھا بھی تو رفتہ رفتہ اس کے نمائندوں نے اپنے اعلانات اور معاہدات کو خیر باد کہہ دیا اور آخر کار یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم نے تو قضیہ کشمیر کو ختم کر دیا ہے اور جموں اور کشمیر کے علاقے مملکتِ ہند کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔

آزادی حاصل کرنے کے لئے کشمیریوں کی جدوجہد کشمیریوں کو حق خود ارادی دلانے کے لئے پاکستان کی مساعی اور قیام امن کے لئے مجلس امن کی تجاویز کو تو ہندوستان نے اب تک کچھ طاقت سے کچھ جبر سے کچھ تلبیس و فریب سے زائل و بے اثر کر دیا ہے۔ بلاشک اس کے نتیجے میں ہندوستان بین الاقوامی حلقوں میں اپنا وقار کھو چکا ہے لیکن بظاہر ہندوستانی ارباب حل و عقد نے اسے سستا سودا سمجھا ہے لیکن وہ ایک حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں جس کے ایک پہلو کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

کشمیر کی مسلمان آبادی ایک صدی سے زائد عرصہ تک ڈوگرہ مظالم کا شکار رہی اور اس کے بعد زائد از بیس سال سے ہندوستانی مظالم سہ رہی ہے۔ ان مظالم میں تخفیف ہونے کی بجائے ان کی شدت بڑھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی ملک کسی قوم کسی گروہ کسی فرد کا محض ان کے نام کی وجہ سے حمایتی نہیں۔ اس کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ لیکن وہ حق اور راستی، امن اور انصاف، شفقت اور رحم، عجز اور انکسار سے ضرور محبت رکھتا ہے اور جبر اور تعدی، ظلم اور سختی، ایذادہی اور ضرر رسانی اس کے غضب کو بھڑکاتی ہیں۔ وہ عقوبت میں دھیما ہے لیکن مظلوم کی فریاد کو سنتا اور آخر ظالم کو پکڑتا ہے۔ وہ شدید البطش ہے اس کی گرفت بہت سخت ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے مابین نہروں کے پانیوں کا تنازعہ

نہروں کے پانی کے متعلق بھی حکومت ہند کا رویہ ویسا ہی رہا جیسا قضیہ کشمیر کے متعلق تھا۔ جب تک تقسیم ملک کی کارروائی کی تکمیل نہ ہوئی حکومت مشرقی پنجاب اور حکومت ہند کی طرف سے پاکستان کو ہر مرحلے پر یہ یقین دلایا گیا کہ ہندوستان نہروں کے پانی میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرے گا۔ البتہ ہندوستان نے یہ ادعا کیا کہ چونکہ متحدہ پنجاب کے مغربی

حصے میں نہری آبپاشی کے ذرائع کو نسبتاً زیادہ فروغ دیا جا چکا ہے اسلئے مشرقی پنجاب کو اس نسبتی زیادتی کے بدلے میں معاوضہ ملنا چاہیئے اور اس معاوضے کی تشخیص میں نہ صرف نہروں کے صرفے اور انکی موجودہ قیمت کو مدنظر رکھا جائے بلکہ اس کے علاوہ اسباب کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ نہروں کے اجراء کے نتیجے میں مغربی پنجاب میں سرکاری افتادہ رقبہ جات کی قیمت میں جنہیں نہروں کی آبپاشی سے زیر کاشت لایا جا سکتا ہے بہت اضافہ ہو چکا ہے اس کے بدلے میں بھی مشرقی پنجاب معاوضے کا مستحق ہے۔ اس ادعا کے دونوں حصوں کے جواز کو اس ثالثی ٹربیونل نے جو پاکستان اور ہندوستان کے مابین اثاثوں کی تقسیم کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور جس کے صدر سر پیٹرک سپنز سابق چیف جسٹس ھند تھے تسلیم کر لیا۔ اور اس کے مطابق معاوضہ کی رقم تشخیص کی گئی۔ ثالثی عدالت نے اپنا کام ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ختم کیا اور یکم اپریل کو یعنی دوسرے ہی دن مشرقی پنجاب کی حکومت نے پاکستان میں جانے والی تمام نہروں کا پانی جو ہندوستان سے گذر کر پاکستان میں آتا تھا بند کر دیا! حالانکہ اس ٹربیونل کے صدر لارڈ سپنز کے بیان کے موجب ٹربیونل کو یقین دلایا گیا تھا کہ پانی بند نہیں کیا جائے گا اور جو معاوضہ ٹربیونل نے تشخیص کیا وہ اس یقین دہانی کی بنا پر ہی تھا۔ فروری ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اپنی ایک تقریر میں ہندوستان کی طرف سے اس یقین دہانی کی خلاف ورزی پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ نہروں کے پانی کا قضیہ ایک خالص قانونی قضیہ تھا۔ پاکستان نے تجویز کیا کہ اس قضیئے کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت سے کرایا جائے لیکن ہندوستان کی حکومت اس پر رضامند نہ ہوئی۔

قائداعظم کی وفات | پاکستان کے قیام پر ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ قائداعظم کی صحت تشویشناک صورت اختیار کر گئی۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی ان کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن انکی اولوالعزمی ان کی صحت کی کمزوری پر غالب رہی۔ ۱۹۴۸ء کے وسط میں دو ایک بار میں نے انہیں توجہ دلانے کی جرأت بھی کی اور مناسب احتیاط پر زور دیا لیکن انہوں نے ہر بار یہ کہکر بات ٹال دی کہ یہ تو ان کی صحت کا معمول ہے۔ چند دن کمزوری کے آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح سے بھی میں نے قائداعظم کی صحت کے متعلق فکر کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا میں خود متفکر ہوں لیکن وہ کسی کی سنتے نہیں۔ اپنی ہی کرتے ہیں۔ آخر کار طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو زیارت (کوئٹہ) تشریف لے گئے۔ وزیراعظم صاحب اپنے رفقاء کو وقتاً فوقتاً قائداعظم کی صحت کے متعلق اطلاع بہم پہنچاتے تھے جس سے اگرچہ پورا اطمینان نہیں ہوتا تھا لیکن تشویش میں اضافہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز مغرب کے وقت پیغام ملا کہ وزیراعظم صاحب نے گورنر جنرل کی رہائش گاہ پر یاد فرمایا ہے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کہ قائداعظم کی تشریف آوری کی تو کوئی اطلاع نہیں پھر ان کی فرودگاہ پر کیوں طلبی ہوئی ہے۔ وہاں پہنچنے پر ایک اے ڈی سی مجھے باغیچے کی طرف لے گئے۔ وہاں وزیراعظم صاحب اکیلے پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ فرمایا

قائداعظم فوت ہوگئے ہیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔ میں نے پوچھا کیا وفات کوئٹہ میں ہوئی۔ فرمایا نہیں آج سہ پہر یہاں پہنچے اور یہاں پہنچنے کے بعد وفات ہوئی۔ فرمایا میں نے سب سے پہلے تمہیں بلایا ہے کیونکہ اس امر کا فوراً فیصلہ ہونا چاہیئے کہ گورنر جنرل کون ہو۔ خواجہ ناظم الدین کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے ؟ میں نے کہا ان کا تقرر نہایت مناسب ہوگا علاوہ اپنی ذاتی خوبیوں اور وقار اور وجاہت کے ان کا تقرر مشرقی پاکستان کے لئے اطمینان کا موجب ہوگا۔ فرمایا میری نگاہ میں یہی امر فیصلہ کن ہے۔

قائداعظم کی اچانک وفات سے حواس سہم گئے۔ اللّٰہ تعالیٰ کی مشیّت نے اس شخصیت کو جو انسانی سعی اور تدبر کے لحاظ سے پاکستان کے وجود میں آنے کا موجب تھی ایسے نازک وقت میں اٹھا لیا جب یہ نوزائیدہ ملک اطمینان کا سانس بھی نہ لے پایا تھا اور ہر طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور قائداعظم کے عزم اور حسن تدبیر کا حد درجہ محتاج تھا۔ اگر اللّٰہ تعالیٰ اپنے کمال فضل سے انہیں دس سال اور زندگی عطا فرماتا تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی مشکلات اور الجھنوں کا جن سے پاکستان ابھی تک خلاصی نہیں پاسکا حل میسّر آجاتا۔ حافظ شیرازی کے الفاظ میں "تدبیرش امید ساحلے بود" واللّٰہ اعلم بالصّواب۔ بادی النظر میں قائداعظم کی وفات ایسے وقت میں ہوئی جب پاکستان میں اس عظیم صدمے کی برداشت کی طاقت نہ تھی لیکن اپنی حکمتوں کو اللّٰہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اس کے فیصلہ میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک میں بحیثیت وزیر خارجہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں پاکستانی وفد کی قیادت کے فرائض سرانجام دیتا رہا اور بالعموم شروع سے آخر تک اجلاس میں شامل رہتا۔ ۱۹۴۷ء کے اجلاس میں بھی میں پاکستانی وفد کا سربراہ تھا۔ لیکن اس وقت تک ابھی میں وزیر خارجہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ اس اجلاس کے دوران میں یہ مجھے محسوس ہوا کہ بین الاقوامی حلقوں میں ابھی پاکستان کی آزاد حیثیت کا پورا علم نہیں۔ اقوام متحدہ میں اکثر ممالک کے نمائندگان سمجھتے تھے کہ پاکستان ہندوستان کی ایک نیم آزاد مگر شکمی ریاست ہے جسے کسی مصلحت کی وجہ سے اقوام متحدہ کی رکنیت دیدی گئی ہے۔ دور کے ممالک تو الگ رہے اقوام متحدہ کے عرب ممالک بھی ان دنوں پاکستان سے پوری طرح متعارف نہیں تھے۔ جس دن اقوام متحدہ کی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا پاکستان کو معرض وجود میں آئے ابھی مہینہ بھر ہی ہوا تھا اور ابھی اقوام متحدہ کی رکنیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اقوام متحدہ کا رکن بننے کے بعد جب میں نے قضیۂ فلسطین پر پہلی تقریر شروع کی تو عرب نمائندگان کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان ان کے موقف کی تائید کرے گا یا مخالفت۔ ہمارے وفد کو نیویارک پہنچے ابھی چند دن ہی گذرے تھے اور جب تک ہمیں رکنیت حاصل ہوئی ہماری کوششوں کے باوجود کسی نے ہمیں قابل التفات نہ جانا۔ رکن بنتے ہی میں نے اولین موقعے پر فلسطین کے مسئلے پر تقریر کی۔ ابتدائی حصہ قضیہ فلسطین کے پس منظر کے متعلق تھا۔ عرب مندوبین ماتھوں پر شکن ڈالے سنتے

رہے کہ دیکھیں آگے چل کر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جب نفس موضوع پر انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ پاکستان تو نہ صرف سو فیصد عربوں کی تائید میں ہے بلکہ واقعات کی تفاصیل کے علم، انہیں ترتیب دینے، قضیئے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے اور دلائل کی مضبوطی کے لحاظ سے عرب مندوبین سے کہیں بڑھ کر ہے تو ان کے استعجاب اور خوشی کی حد نہ رہی۔ تقریر کے ختم ہونے پر جب میں اجلاس کے کمرے سے نکلا تو عرب نمائندگان نے مجھے گھیر لیا اور نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس دن سے ان کی نگاہ میں پاکستان کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی اور نہ صرف فلسطین کے مسئلے پر بلکہ ہر عرب مسئلے پر وہ پورے وثوق سے پاکستان کی تائید اور پر زور حمایت پر انحصار کرنے لگے اور جب تک میرا ان معاملات کے ساتھ تعلق رہا بفضل اللہ ان کے لئے کوئی موقعہ شکایت کا پیدا نہ ہوا۔

پاکستان کے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے پاکستان مختلف ممالک سے متعارف ہوا

جب ۱۹۴۸ء کے شروع میں ہندوستان نے قضیۂ کشمیر مجلس امن میں اس غرض سے پیش کیا کہ مجلس امن پاکستان کی گوشمالی کرے کیونکہ پاکستان ہندوستان سے الحاق شدہ ریاست جموں کشمیر میں بے جا مداخلت کا مجرم ہوا ہے تو اس مسئلے کی حقیقت واضح ہونے پر اراکین مجلس نے پورے طور پر اندازہ کر لیا کہ پاکستان ہندوستان کی شکمی ریاست نہیں اور امن عالم میں خلل انداز نہیں بلکہ ہندوستان کی چیرہ دستیوں کے خلاف داد طلب ہے۔ تجربے نے واضح کر دیا کہ اس زمانے کے ماحول میں پاکستان کے لئے اپنی حیثیت کو متعارف کرانے کا ایک بڑا ذریعہ اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینا ہے۔ جن حالات میں پاکستان وجود میں آیا اور ابتداء میں ہی اسے جن ہنگامی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کے ہوتے پاکستان کی یہ حالت تھی کہ اگر سر ڈھکنے کی تدبیر کی جاتی تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھکنے کی کوشش کی جاتی تو سر ننگا ہو جاتا۔ دیگر ممالک سے خارجی تعلقات کا سوال قبل از وقت تھا کیونکہ ہماری فارن سروس ابھی وجود میں ہی نہیں آئی تھی اور بمشکل چند بڑے بڑے ملکوں کے ساتھ رابطہ قائم ہو سکا تھا۔ ان حالات میں اقوام متحدہ کا وجود بہت غنیمت تھا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے ابتدائی ایام میں اکثر اراکین ممالک کے وزرائے اعظم یا وزرائے خارجہ اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لاتے تھے اور اجلاس کے دوران میں بھی بہت سے ملکوں کے وزرائے خارجہ اجلاس میں شریک رہتے تھے اور ہر رکن ملک کا نمائندہ تو بہر حال وہاں موجود ہی ہوتا تھا۔ اس ذریعہ سے ایسے ممالک کے ساتھ جن سے ابھی سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے متنازعہ امور کے سلجھانے کا ذریعہ اقوام متحدہ میں میسر آ جاتا تھا۔ علاوہ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے مجھے تنازعہ کشمیر کے سلسلے میں بھی مجلس امن کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے نیویارک جانا پڑتا تھا۔ بعض سالوں میں سال کا قریباً نصف حصہ مجھے اقوام متحدہ میں رہنا پڑتا تھا۔

اطالوی نو آبادیوں کا مسئلہ | ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کا سالانہ اجلاس پیرس میں ہوا۔ اس اجلاس کے ایجنڈے میں اطالوی نو آبادیوں کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ لیکن اس مسئلے پر غور کے لئے پیرس میں وقت نہ مل سکا اسلئے اجلاس شروع اپریل ۱۹۴۹ء تک ملتوی ہو گیا۔ اور اپریل ۱۹۴۹ء میں اس مسئلے پر نیو یارک میں غور ہوا۔ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی کی شکست کے بعد جو معاہدہ اٹلی اور اتحادیوں کے درمیان ہوا اس کے رو سے اٹلی اپنی نو آبادیوں سے دست بردار ہو گیا اور ان علاقوں کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار اتحادی دول عظمیٰ کو دیا گیا کہ وہ باہمی مشورے سے اور ان علاقوں کی آبادی کے احساسات کو مد نظر رکھتے ہوئے کریں۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر معاہدے کے نافذ ہونے کے ایک سال کے اندر اتحادی ممالک باہمی اتفاق سے فیصلہ نہ کر سکیں تو یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کیا جائے گا اور اسمبلی جو تجویز کرے گی وہ قابل پابندی ہو گی۔ دول متعلقہ میعاد کے اندر کسی فیصلے پر متفق نہ ہو سکے اس لئے یہ مسئلہ جنرل اسمبلی میں غور اور فیصلے کے لئے پیش ہوا۔

لیبیا کی آزادی | دول متعلقہ میں سے ایک طرف ریاستہائے متحدہ، برطانیہ اور فرانس اور دوسری طرف اٹلی کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو چکا تھا کہ اطالوی نو آبادیات میں سے لیبیا کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ شرقی حصے CYRENACIA پر برطانیہ کی نگرانی بطور امین TRUSTEE کے ہو گی۔ وسطی اور مرکزی حصے TRIPOLI کی ٹرسٹی شپ اٹلی کے سپرد ہو گی اور مغربی حصے FEZZAN کی ٹرسٹی شپ فرانس کے سپرد اور یہ تینوں طاقتیں دس سال کے عرصے میں ان علاقوں کو ایک متحد آزاد ملک کی حیثیت اختیار کرنے کے لئے تیار کریں گی۔ اس سمجھوتے کو برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون اور اٹلی کے وزیر خارجہ کونٹ سفورزا کے اسمائے گرامی کی نسبت سے بیون سفورزا پیکٹ کا نام دیا گیا تھا۔ جب یہ مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث آیا تو اسی سمجھوتے کے مطابق قرارداد اسمبلی میں پیش کی گئی۔ اطالوی معاہدہ امن کی متعلقہ شق میں درج تھا کہ اس مسئلے کے جنرل اسمبلی میں زیر بحث آنے کی صورت میں اسمبلی نو آبادیات کی رائے عامہ کو مناسب وزن دیگی۔ لیبیا کا ایک نمائندہ وفد بسرکردگی السید بشیر سوداوی دوران بحث نیو یارک میں موجود تھا یہ وفد اراکین اسمبلی کو لیبیا کی رائے عامہ سے مطلع کرنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھا۔ وفد کا کہنا تھا کہ لیبیا کا ہر طبقہ مجوزہ قرارداد کا سخت مخالف ہے انہیں لیبیا کے حصے بخرے کئے جانے منظور نہیں۔ وہ جلد سے جلد اپنے وطن کی آزادی کے خواہشمند ہیں اور کسی صورت اپنے وطن کے معاملات اور مستقبل میں اطالوی مداخلت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مغربی طاقتیں اپنا تمام اثر و رسوخ قرارداد کی تائید میں صرف کر رہی تھیں۔ لاطینی امریکن ریاستیں اگرچہ حق خود اختیاری اور رائے عامہ کی تائید پر زور دیتی تھیں۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ اٹلی ان کی تمدنی اور معاشرتی اقدار کا منبع ہے اسلئے وہ ٹرپولی کی نگرانی اٹلی کو سپرد کئے

جانے کی تائید میں ضرور رائے دیں گے۔ اٹلی نے اپنے تیس سالہ اقتدار کے زمانے میں لیبیا کی عرب آبادی کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک روا رکھا تھا۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اٹلی کے لئے ترکی افواج کو لیبیا میں پسپا کر دینا تو کچھ دشوار ثابت نہ ہوا لیکن اس کے بعد ملک کی عرب آبادی کو زیر اقتدار لانے میں اٹلی کو بہت مشکل کا سامنا ہوا۔ اٹلی کی طرف سے اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری مارشل بڈوگلیو پر ڈالی گئی۔ انہوں نے اپنی "قیام امن" PACIFICATION کی پالیسی کی سرانجام دہی میں نہایت درجہ وحشت اور بربریت کے طریق اختیار کئے۔ مثلاً ایسے شیوخ یا قائدین جو کسی قیمت پر اطالوی اقتدار کے سامنے سر خم کرنے پر رضامند نہ ہوتے انہیں جبراً ہوائی جہاز میں کئی ہزار فٹ کی بلندی پر لے جا کر جہاز سے نیچے گرا دیا جاتا یا کوئی ریگستانی آبادی اطالوی اقتدار کا جوا اپنی گردن پر اٹھانے سے انکار کرتی تو مارشل بڈوگلیو کا توپ خانہ آبادی کے گرد گھیرا ڈال دیتا اور آبادی کے پانی کے ذخیروں میں بھاری مقدار میں زہر ڈال دیا جاتا۔ محصور آبادی میں سے جو باہر نکلنے کی کوشش کرتے وہ اطالوی توپ یا بندوق کا نشانہ بنتے اور جو باہر نکلنے کی کوشش کرتے وہ پیاس یا زہر آلودہ پانی پینے سے تڑپتے ہوئے جان دیتے۔ مارشل بڈوگلیو کے "قیام امن" کے منصوبے کی تفاصیل دوران بحث میں اسمبلی کے روبرو بیان کی گئیں۔ اٹلی کے حمائتیوں کی طرف سے اس کے جواب میں یہی کہا جاتا رہا کہ یہ سب مسولینی اور اس کے گروہ کی کرتوتیں تھیں۔ اب جبکہ خود اٹلی والوں نے مسولینی اس کی پارٹی اور اس کی پالیسی کو ختم کر کے ان جرائم سے بیزاری کا ثبوت مہیا کر دیا ہے تو اٹلی پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کو تہذیب اور دیانتداری کے ساتھ انجام دیگا اور برطانیہ اور فرانس کے دوش بدوش لیبیا کو آزادی کیلئے تیار کرنے کی سرگرم کوشش کرے گا۔ لیکن ان کا یہ کہنا نہ تو لیبیا کے وفد کو مطمئن کر سکا نہ ہماری تسلی کا موجب ہوا۔

ہمیں مجوزہ قرارداد بعض اور وجوہ سے بھی ناقابل قبول معلوم ہوتی تھی۔ ہمیں لیبیا کو کسی ایک طاقت یا ایک سے زائد طاقتوں کی نگرانی میں دینا منظور نہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ لیبیا جلد سے جلد آزاد ہو اسلئے دس سالوں کی میعاد بھی ہمیں پسند نہ تھی۔ مزید براں ملک کا تین حصوں میں تقسیم کیا جانا ہمیں ناگوار تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اگر قرارداد کے مطابق لیبیا کو تقسیم کر دیا گیا تو یہ ٹکڑے پھر کبھی اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔ مشرقی حصے کی عملداری انگریزی ہو گی، وسطی حصے کی اطالوی اور مغربی حصے کی فرانسیسی یہ اختلاف خود اتحاد اور آزادی کے رستے میں روک اور بہانہ ہو جائے گا۔ بحث کے دوران اسمبلی میں ہماری طرف سے ان سب امور کی وضاحت پورے طور پر کر دی گئی۔ ان وجوہات کے علاوہ ایک اور امر میرے لئے بہت پریشانی کا موجب تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اٹلی کو شکست دیکر اور اتحادیوں کو ان کے اپنے ہاتھوں سے اسمبلی کے فیصلے کا پابند بنا کر لیبیا کی آزادی کا سامان فرما دیا ہے۔ اب مغربی طاقتوں کی یہ قرارداد لیبیا کی آزادی کے رستے میں حائل ہو گئی ہے۔ مغربی طاقتوں نے تو سمجھا ہوگا کہ جو تجویز وہ کریں گے اسمبلی اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے گی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم اس تجویز کو رد کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو لیبیا کے جلد آزاد

ہونے کی صورت پیدا ہو جائے گی اور اگر لیبیا جلد آزاد ہو جائے تو شمالی مغربی افریقہ کے تینوں عرب ممالک یعنی تونس، الجزائر اور مراکش کی آزادی کا رستہ کھل جائے گا۔ اس لئے میری نگہ میں مجوزہ قرارداد کا رد کیا جانا از بس ضروری تھا۔ مغربی طاقتوں نے ٹریپولی کی نگرانی اٹلی کے سپرد کرنے کی تجویز سے لاطینی امریکن ریاستوں کی تائید حاصل کر لی تھی۔ اس وقت اقوام متحدہ کی رکنیت ساٹھ سے کم تھی اقوام متحدہ کے میثاق کی دفعہ ۱۸ کی رو سے قرارداد کی منظوری کے لئے دو تہائی آرا درکار تھیں۔ بحث کے دوران ہمیں اندازہ ہوا کہ پندرہ اراکین تو یقیناً قرارداد کے خلاف رائے دیں گے لیکن اگر دو چار اراکین رائے دینے سے اجتناب بھی کرتے اور آرا شماری میں ۵۴ اراکین مخالف یا موافق رائے دیتے تو قرارداد کی منظوری کے لئے ۳۶ آراء درکار ہوتیں اور نامنظوری کے لئے ۱۹۔ اپنی طرف سے پوری کوشش کرنے کے بعد بھی ہمیں قرارداد کے خلاف صرف ۱۵ آراء ملنے کا یقین تھا۔ عرب ریاستیں تو قرارداد کے خلاف تھیں لیکن اس وقت صرف چھ عرب ریاستیں اقوام متحدہ کی رکن تھیں۔ ان میں سے مصر کے وزیر خارجہ خشابا پاشا بھی پوری جدوجہد کر رہے تھے اور ہم دونوں آپس میں مشورے کرتے رہتے تھے۔ بحث کا آخری دن آپہنچا اور قرارداد کے خلاف ۱۵ آراء سے زیادہ کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ میری طبیعت میں سخت اضطراب تھا اسی اضطراب کی حالت میں میں نے نماز ظہر میں نہایت عجز و انکسار سے رب العالمین کی درگاہ میں زاری کی کہ الٰہ العالمین ہم گنہ گار نافرمان پر تقصیر ہیں لیکن آخر تیرے بندے اور تیرے حبیب کے نام لیوا ہیں تو ہم پر رحم کی نظر فرما۔ فلسطین کے معاملے میں ہمیں زک ہوئی اب لیبیا کا معاملہ فیصلے کو پہنچنے والا ہے۔ اس علاقے میں تیرے بیکس بندے بڑے مظالم کا نشانہ بنے رہے ہیں۔ تو اپنے فضل و رحم سے ہمیں وہ رستہ دکھا جس پر چل کر ہم تیرے مظلوم بندوں کی رہائی اور مخلصی کی تدبیر کر سکیں۔ تیسری رکعت کے پہلے سجدے میں جاتے ہوئے دفعۃً اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل و رحم سے ایک ترکیب کی تفہیم فرما دی فالحمد للہ۔ جونہی میں نے نماز ختم کی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اقوام متحدہ میں مصر کے مستقل نمائندے محمود فوزی صاحب نے فرمایا میرے وزیر خارجہ دریافت کرتے ہیں تم کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ وہ چاہتے ہیں کہ جلد آ جاؤ تو سہ پہر کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے کچھ مزید غور کر لیں۔ میں وزیر خارجہ مصر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا کچھ مزید غور کیا ہے اور کوئی تجویز ذہن میں آئی ہے؟ میں نے کہا ہاں آئی ہے یا یوں کہئے ذہن میں ڈالی گئی ہے۔ اب تک ہم اس کوشش میں رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے پوری قرارداد کے خلاف آراء حاصل کی جائیں۔ اس کوشش کے نتیجے میں تو ہمیں صرف ۱۵ مخالف آرا حاصل ہو سکی ہیں جو قرارداد کے رد کرنے کے لئے کافی نہیں ہمیں کم سے کم تین چار اور مخالف آراء درکار ہیں۔ اور ان کے حاصل ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جو ممالک برطانیہ یا فرانس کی خوشنودی کی خاطر برطانیہ کو CYRENAICA اور فرانس کو فیضان کی نگرانی سپرد کرنے کے مؤید ہیں ان میں سے تین چار کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اس قرارداد میں برطانوی اور فرانسیسی نگرانی والی شقوں کی تائید میں

رائے دینے کے بعد تیسری شق جس میں ٹریپولی کی نگرانی اٹلی کو سپرد کرنے کی تجویز ہے کے مخالف رائے دیں۔

خشابا پاشا :۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا حاصل ہوگا ؟

ظفراللہ خاں :۔ حاصل یہ ہوگا کہ تیسری شق قرارداد سے خارج ہو جائے گی۔

خشابا پاشا :۔ لیکن ملک تو پھر بھی تقسیم ہو جائے گا۔ برطانیہ اور فرانس کو مجوزہ علاقوں کی نگرانی سپرد کر دی جائے گی۔ تم خود اب تک مُصر رہے ہو کہ لیبیا کی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے اب تم نے یکایک اپنی رائے کیوں بدل لی ہے ؟

ظفراللہ خاں :۔ میں نے رائے نہیں بدلی۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ لیبیا کی تقسیم ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر میری بیان کردہ ترکیب سے تیسری شق قرارداد سے خارج ہو گئی تو کوئی تقسیم نہیں ہوگی۔

خشابا پاشا :۔ وہ کیسے ؟

ظفراللہ خاں :۔ اگر ٹریپولی کی نگرانی اٹلی کے سپرد نہ ہوئی تو لاطینی امریکن ریاستیں بقیہ قرارداد کو قبول نہیں کرینگی اور تینوں شقوں پر رائے شماری کے بعد جب مجموعی طور پر ساری قرارداد پر رائے شماری ہوگی تو لاطینی امریکن ریاستیں اس کے خلاف رائے دیں گی۔

خشابا پاشا :۔ (خوشی سے اچھل کر) خوب تجویز ہے۔ میرے ذہن میں بالکل نہیں آئی تھی پھر اب کیسے کیا جائے ؟ وقت بہت تھوڑا ہے آج شام رائے شماری ہو جائے گی۔

ظفراللہ خاں :۔ لاطینی امریکن ممالک میں ہائیٹی (HAITI) ایک ایسا ملک ہے جس کا اٹلی سے کوئی تعلق نہیں ایک تو ان کے ساتھ کوشش ہونی چاہیئے۔ ان کی زبان فرانسیسی ہے آپ کے وفد میں سے کوئی صاحب ان کے ساتھ بات چیت کریں۔ سر بی این راؤ ہندوستانی نمائندے کے ساتھ میں بات کرتا ہوں۔ مزید غور کے نتیجے میں اگر کسی اور ریاست کے متعلق بھی ایسی توقع ہو سکے تو ان کے ساتھ بھی اس نہج پر بات کی جائے۔

میں فوراً سر بی این راؤ کی تلاش میں گیا۔ وہ جلد مل گئے۔ میں نے دریافت کیا آپ کس طرف رائے دیں گے۔

سر بی این راؤ :۔ مجھے حکومت کی طرف سے ہدایت ہے کہ ہم ریزولیشن کی شقوں پر علیحدہ علیحدہ رائے شماری میں حصہ نہ لیں لیکن جب قرارداد پر مجموعی طور پر رائے شماری ہو تو قرارداد کے خلاف رائے دیں۔

ظفراللہ خاں :۔ آپ کو تو یہاں کی روایات کا خوب تجربہ ہے اگر ریزولیشن کی شقوں پر علیحدہ علیحدہ رائے شماری کے نتیجے میں سب شقیں منظور کر لی گئیں تو پوری قرارداد آسانی سے منظور ہو جائے گی۔ اکثر ممالک شقوں پر رائے شماری میں حصہ نہیں لیتے وہ جب دیکھتے ہیں کہ قرارداد کو خاصی تائید حاصل ہے تو وہ مجموعی قرارداد پر رائے شماری میں تائیدی رائے دیدیتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت ہوگی اگر ساری شقیں منظور ہو گئیں تو پوری قرارداد ضرور منظور ہو جائے گی۔ اس مرحلے پر مخالفت بے سود ہوگی۔

سر بی این راؤ :- تو پھر تم کیا چاہتے ہو ؟

ظفر اللہ خاں :- حکومت ہند کے شقوں پر رائے شماری میں حصہ نہ لینے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ برطانیہ اور فرانس کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ورنہ جیسے آپ نے کہا ہے قرارداد کے تو وہ مخالف ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو پہلی دو شقوں پر رائے شماری میں حصہ نہ لیں بلکہ اگر برطانیہ اور فرانس کی خوشنودی ہی منظور ہو تو بیشک ان دو شقوں کی تائید میں رائے دیں لیکن تیسری شق کے خلاف رائے نہ دینا تو ظلم ہوگا۔ اٹلی کی آپ کو کوئی خوشامد بھی نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ اگر تیسری شق منظور ہو گئی تو ساری قرارداد منظور ہو جائے گی اور آپ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اسلئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ پہلی دو شقوں کے متعلق آپ جو چاہیں کریں لیکن تیسری شق کے خلاف ضرور رائے دیں۔

سر بی این راؤ :- (کچھ سوچنے کے بعد) اس طریق سے نتیجہ تو میری حکومت کے منشاء کے مطابق ہی ہوگا بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔

ادھر ہائیٹی کے نمائندے نے بھی تیسری شق کے خلاف رائے دینا منظور کر لیا۔ اجلاس شروع ہو گیا۔ ہماری کوشش اجلاس کے دوران میں بھی جاری رہی لیکن بارآور نہ ہوئی۔ تقریروں کا سلسلہ کچھ لمبا ہو گیا۔ سہ پہر کا اجلاس ملتوی ہوا شام کے کھانے کے بعد پھر اجلاس شروع ہوا۔ آخر گیارہ بجے شب کے بعد رائے شماری کی نوبت آئی۔ مغربی بر اعظم مطمئن نظر آتی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں قرارداد کے منظور ہونے کا پورا یقین ہے۔ ہم جو قرارداد کے مخالف تھے خائف و پریشان تھے۔ میری دعائیں زیر لب جاری تھیں کیونکہ طبیعت میں بہت اضطراب تھا۔ رائے شماری شروع ہوئی۔ پہلی شق منظور ہو گئی، دوسری شق منظور ہو گئی، تیسری شق پر ہم نے نام بنام رائے شماری کا مطالبہ کیا ہر ملک کا نام باری باری پکارا جاتا اور اس ملک کا نمائندہ "ہاں" یا "نہ" یا رائے زنی سے اجتناب کا اعلان کرتا۔ ممالک کے نام پکارے جانے کے سوائے سناٹے کا عالم تھا کرنل عبدالرحیم خاں جو ان دنوں اقوام متحدہ میں ہمارے متقل نمائندے تھے ایک کاغذ پر ہر جواب کو لکھتے جا رہے تھے۔ جب سب اراکین ممالک کی طرف سے جواب مل چکے تو کرنل صاحب نے جلد جلد اپنے لکھے ہوئے جوابات کو شمار کیا اور میرے کان میں کہا تائیدی آراء ۳۳ مخالف ۱۷ رائے دینے سے اجتناب کرنے والے ۸ پہلے تو میری طبیعت افسردہ ہوئی کہ یہ شق بھی منظور ہو گئی کیونکہ ہمارا اندازہ تھا کہ ۱۷ مخالف آراء نامنظوری کے لئے کافی نہیں ہوں گی۔ لیکن جب میں نے ۳۳ اور ۱۷ کا موازنہ کیا تو میری طبیعت میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ۳۳ موافق آراء ۱۷ مخالف آراء کے دگنے سے کم تھیں۔ اب ہم انتظار میں تھے کہ صاحب صدر کی زبانی نتیجے کا اعلان ہو۔ آسٹریلیا کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ایوٹ صدر تھے اور مسٹر ٹرگوے لی سیکرٹری جنرل تھے۔ امور متعلقہ اسمبلی کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر اینڈریو کارڈیر تھے۔ موخر الذکر دونوں اصحاب صاحب صدر کے دائیں بائیں تشریف فرما تھے۔ تینوں سر جوڑے رائے شماری کے پرچے کا غور سے مطالعہ کر رہے تھے۔ صاحب صدر خود قرارداد کے زوردار

حامی تھے۔ سیکریٹری جنرل ہمیشہ ہر معاملے میں مغربی ریاستوں کے موئید ہوا کرتے تھے۔ اسسٹنٹ سیکریٹری جنرل اگرچہ امریکن اور آزاد رائے رکھنے والے تھے لیکن طبعاً اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے صاحب صدر اور سیکریٹری جنرل کے معاون تھے اور رائے شماری کے لئے نام لپکارنا اور جواب دہرانا انہی کا کام تھا۔ ہر نمائندے کا جواب اس لئے دہرایا جاتا تھا کہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ یہ تینوں اصحاب رائے شماری کے پرچے کا بار بار تجزیہ کر رہے تھے کہ شاید کسی طرح سے کہیں سے ایک تائیدی رائے اور مل جائے اور مشکل حل ہو جائے۔ لیکن حساب پر ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ حاضر اراکین کی تعداد ۵۸ تھی جن میں سے ۸ نے رائے دینے سے اجتناب کیا باقی ۵۰ اراکین نے رائے دی جن میں سے ۱۷ مخالف تھے منظوری کے لئے کم از کم ۳۴ آراء کی ضرورت تھی اور موافق آراء صرف ۳۳ تھیں! مزید ایک اور کہاں سے آتی۔ ناچار صاحب صدر نے نہایت افسردگی کے لہجے میں نتیجے کا اعلان کیا کہ شق نمبر ۳ چونکہ نامنظور ہوئی اسلئے قرارداد سے خارج کی گئی ہے۔ ہماری طرف سے خوشی کا اظہار تو لازم تھا ہی لیکن معلوم ہوتا ہے میرے اعصاب پر پہلے چند دنوں کی پریشانی اور اضطراب کا بوجھ تھا۔ میری طبیعت قابو میں نہ رہی اور میں جوش سے اپنے سامنے کے ڈیسک کو زور زور سے متواتر پیٹنے لگا۔ کرنل عبدالرحیم نے آہستہ سے مجھے کہا چودھری صاحب کیا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مغربی طاقتوں کی چھاتی پیٹ رہا ہوں! یہ کہتے ہی میری طبیعت ضبط میں آگئی اور میں اپنی اس جذباتی حرکت پر منفعل ہوا۔ کیونکہ صاحب صدر میری طرف تیوری چڑھائے دیکھ رہے تھے۔ کئی دن تک میرے دونوں ہاتھ اس ڈیسک کوبی کی وجہ سے متورم رہے۔ قرارداد کی چوتھی شق یہ تھی کہ یہ تینوں ممالک دس سال کے عرصے میں لیبیا کے تقسیم شدہ علاقوں کو ایک متحد آزاد ملک کی حیثیت اختیار کرنے کے لئے تیار کریں۔ جب صاحب صدر نے اس شق پر آراطلبی کی تو میں نے وضاحت چاہی کہ تینوں ملکوں سے کونسے تین ملک مراد ہیں؟ چونکہ قرارداد کی صرف دو شقیں ہی منظور ہوئی تھیں اور ان میں صرف دو ملکوں یعنی برطانیہ اور فرانس کا ذکر تھا صاحب صدر نے فرمایا کوئی رکن ابھی ترمیم پیش کر دے گا کہ تین کی جگہ دو کا لفظ رکھ دیا جائے۔ میں اس امر پر بھی کچھ کہنے کو تھا کہ ارجنٹائن کے نمائندے ڈاکٹر آرسی نے بولنے کی اجازت طلب کی اور اجازت ملنے پر کہا کہ قرارداد کی بقیہ شقوں پر رائے شماری کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ جب ٹریپولی کی نگرانی اٹلی کے سپرد نہیں کی جارہی تو لاطینی امریکن ریاستیں باقی سب شقوں کے خلاف رائے دیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرارداد کی بقیہ سب شقیں رد ہوئیں اور جب پہلی دو شقوں پر مجموعی طور پر رائے شماری ہوئی تو وہ بھی رد کر دی گئیں۔ اور اس طرح جہاں تک لیبیا کا تعلق تھا بیون سفورزا پیکٹ کا خاتمہ ہو گیا۔

اجلاس ختم ہونے پر میں کراچی واپس آگیا۔ کچھ دنوں بعد اطالوی سفیر متعینہ پاکستان مجھ سے ملنے آئے

اور اپنے وزیر خارجہ کا ایک خصوصی پیغام میرے نام لائے۔ کونٹ سفورزا نے کہلا بھیجا ہمیں قرارداد کے رد ہو جانے پر کوئی رنج نہیں ہم عرب ممالک کی دوستی اور خوشنودی کے خواہاں ہیں اور اسمبلی کے آئیوالے سالانہ اجلاس میں لیبیا کی فوری آزادی کی تائید کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کے سالانہ اجلاس اسمبلی میں یہ قرارداد منظور ہو گئی کہ یکم جنوری ۱۹۵۱ء سے لیبیا آزاد ہو گا۔ اس قرارداد کے نفاذ کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے اراکین میں مصر اور پاکستان دونوں شامل تھے۔ چنانچہ قرارداد کے مطابق یکم جنوری ۱۹۵۱ء کو لیبیا کی آزاد حکومت قائم ہو گئی۔ فالحمد للہ۔

ایریٹریا کا ابی سینیا سے الحاق | اب ایریٹریا اور اطالوی سومالی لینڈ کا سوال در پیش تھا۔ ایریٹریا کی رائے عامہ دریافت کرنے کے لئے پانچ اراکین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس میں پاکستان بھی شامل تھا۔ اس کمیٹی کے تین اراکین نے رپورٹ کی کہ ایریٹریا کا ابی سینیا کے ساتھ الحاق کیا جائے۔ دو اراکین نے جن میں سے ایک پاکستان تھا رپورٹ کی کہ ایریٹریا کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو ایریٹریا کے مغربی حصے کا الحاق سوڈان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایریٹریا کے مغربی حصے کے قبائل سوڈان کے ملحقہ علاقے کے قبائل کا ہی حصہ ہیں۔ اس کمیٹی میں پاکستان کی نمائندگی میاں ضیاء الدین صاحب نے کی اور اپنے فرائض کو نہایت مستعدی اور قابلیت کے ساتھ ادا کیا۔ فجزاہ اللہ۔ جب یہ مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث آیا تو پاکستان نے ایریٹریا کے ابی سینیا کے ساتھ الحاق کے خلاف پُر زور احتجاج کیا۔ ایریٹریا کی آبادی کی ایک بڑی کثرت نے اس الحاق کی مخالفت کی تھی۔ ایریٹریا ساحلی علاقہ ہے اور اس کی آبادی کی کثرت مسلمان ہے۔ پڑھا لکھا طبقہ عربی بولتا ہے۔ الحاق میں ابی سینیا کا تو سراسر فائدہ ہی تھا لیکن ایریٹریا کا الحاق میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ اسمبلی میں کثرت الحاق کی تائید میں تھی اور ان کی طرف سے ایک بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ ابی سینیا کو اٹلی کے ہاتھوں بہت نقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہونی چاہیئے! ہماری نگہ میں یہ دلیل معقولیت سے بالکل خالی تھی۔ کرے اٹلی اور بھرے ایریٹریا! لیکن الحاق کی تجویز کو دو تہائی آراء کی تائید حاصل ہو گئی اور تجویز منظور ہو گئی۔ میں نے پُر زور انتباہ کیا کہ الحاق ایک استروں کی مالا ہے جو ایریٹریا کے گلے میں ڈالی جا رہی ہے اور اس کا ایک ہی نتیجہ ہو گا کہ ایک دن ایریٹریا ابی سینیا میں جذب کر لیا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ابی سینیا کی کثرت پہاڑی آبادی کی ہے جو AMHARIC نسل کی ہے۔ ساحلی میدانی علاقوں کی آبادی مسلمان ہے۔ ایریٹریا کو ابی سینیا میں شامل کرنے سے مسلمان عنصر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اتحادیوں نے بطور معاوضہ کے سومالیہ کا ایک صوبہ OGADEN بھی ابی سینیا میں شامل کر دیا تھا اس سے بھی مسلمان عنصر میں کچھ اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اب ابی سینیا کی آبادی میں ان کی کثرت ہے لیکن ابی سینیا میں مردم شماری کے قابل اعتماد اعداد و شمار میسر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے اختیارات بہت کچھ AMHARIC سرداروں کے ہاتھ میں ہیں۔ ابی سینیا کے شہنشاہ اگرچہ ایک بیدار مغز اور ترقی پسند فرمانروا ہیں لیکن اندرونی معاملات میں ان کے اختیارات

پر ان سرداروں کی طرف سے بہت سی قیود عائد ہیں۔ فی زمانہ براعظم افریقہ میں حق خود اختیاری اور جمہوریت کی ہوائیں تیزی سے چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ اگرچہ بہت سے قضیے اور مشکلات درپیش ہیں اور اس براعظم کو ابھی بہت سے مراحل سے گذرنا ہے لیکن افریقن اقوام اور قبائل بیدار ہو رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ آخر افریقہ کے سب علاقوں میں "حق بحقدار رسید" والا معاملہ ہو کر رہے گا و اللہ خیر حافظاً و ھو علی کل شیئٍ قدیر۔

سومالیہ کی آزادی | سومالیہ کا علاقہ اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جغرافیائی ہیئت کی وجہ سے اسے افریقہ کا سینگ کہتے ہیں۔ یورپین طاقتوں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی۔ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی کی شکست کے نتیجے میں اطالوی سومالی لینڈ کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کے سپرد ہوا۔ سومالی رائے عامہ طبعاً فوری آزادی کی طلبگار تھی۔ حکومت کی باگ ڈور ابھی تک اطالوی ہاتھوں میں تھی اور اٹلی کی شدید خواہش تھی کہ اطالوی سومالی لینڈ کی نگرانی اور اس علاقے کو آزادی کیلئے تیار کرنے کی ذمہ داری اٹلی کے سپرد کی جائے۔ برطانیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ نگرانی کا نظام قائم ہونے کی صورت میں برطانوی سومالی لینڈ کو بھی اس نظام میں منسلک کر دیا جائے گا تاکہ اطالوی اور برطانوی سومالی علاقے متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں آزاد ہوں اسمبلی میں بحث کے دوران ایک قابل اور مضبوط سومالی وفد سومالی حقوق کے تحفظ اور حمایت کے لئے موجود تھا جس سے ہمیں ہر قسم کی اطلاع میسر آتی رہی۔ سومالی آبادی تمام تر مسلمان ہے اور ہمارے عرب ممالک کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ عرب ممالک طبعاً سومالی علاقوں کی آزادی کے حامی تھے۔ پاکستان بھی کلیتہً آزادی کا حامی تھا۔ آزاد افریقن ممالک میں سے مصر تو آزادی کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ ابی سینیا کی ہمدردی بھی اٹلی کے ساتھ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ باقی صرف لائبیریا رہ جاتا تھا۔ لائبیریا نے سمالی لینڈ کی آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح ساتھ دیا اور لائبیریا کے قابل نمائندے مسٹر ہنری کوپر ہر لحاظ سے ہمارے لئے ایک مضبوط ستون ثابت ہوئے۔ فجزاہ اللہ۔ اٹلی نے اپنے موقف کی تائید میں اپنے پٹھوؤں کا ایک نام نہاد سومالی وفد اپنی سرپرستی میں کمیٹی کے روبرو پیش کیا لیکن اس وفد کی مساعی اٹلی کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ اس وفد کی تمام تر کوشش یہ ثابت کرنے میں صرف ہوتی رہی کہ سومالی علاقے ابھی آزادی کے قابل نہیں ہمیں اصل سومالی وفد سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس نام نہاد وفد کے اراکین دارالحکومت موگادیشو کے بلدیہ میں ملازم ہیں اور ہر بات میں اٹلی کی تعریف کرنے اور اطالوی اقدامات کو سراہنے پر مجبور ہیں۔ میں نے اس اطلاع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نہج پر ان سے استفسار شروع کیا:۔

سوال:۔ اطالوی اقتدار کے زمانے میں حکومت نے آپ کے ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے کوئی اقدام کیا؟

جواب:۔ بیشک ہر ممکن اقدام کیا۔

سوال:۔ اس عرصے میں آپ کے ملک نے کتنی ترقی کی؟

جواب :۔ ہمارے ملک نے ہر شعبے میں انتہائی ترقی کی ہے ۔

سوال :۔ سومالی آبادی کی تعلیم کا کیا انتظام ہے ؟

جواب :۔ اسکول کالج ہر قسم کی درسگاہیں اور تربیتی ادارے قائم ہیں ۔

سوال :۔ سومالی آبادی کا تعلیمی معیار کیسا ہے ؟

جواب :۔ نہایت اعلیٰ ہے ۔

سوال :۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سومالی آبادی کا تناسب کیا ہے ؟

جواب :۔ کثرت سومالیوں کی ہے ۔

سوال :۔ آپ کے ہاں اعلیٰ عدالتیں قائم ہیں ؟

جواب :۔ ضرور قائم ہیں ۔

سوال :۔ اعلیٰ ترین عدالت میں کتنے جج سومالی ہیں ؟

جواب :۔ کثرت سومالیوں کی ہے ۔

سوال :۔ آپ کے ہاں شفاخانوں کا کیا معیار ہے ؟

جواب :۔ نہایت اعلیٰ معیار ہے ۔

سوال :۔ ان شفاخانوں میں کتنے ڈاکٹر سومالی ہیں ؟

جواب :۔ کثرت سومالیوں کی ہے ۔

سوال :۔ آپ کے جوابات سنکر مجھے بہت خوشی ہوئی ۔ جیسے آپ نے کہا ہے اطالوی نظام نے بیشک آپ کے ملک اور آپ کی قوم کی بہت خدمت کی ہے اور اسے ہر شعبے میں اعلیٰ معیار تک پہنچا دیا ہے ۔ اب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب آپ اسقدر ترقی کر چکے ہیں اور ہر شعبے میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں تو اب کونسی کمی باقی ہے جس کی وجہ سے آپ سمجھتے ہیں کہ ابھی آپ کا ملک آزادی کے قابل نہیں ؟

جواب :۔ ہمیں ابھی حکومت کا کوئی تجربہ نہیں ۔

ان کے اس جواب سے ان کی "نمائندگی" کی حیثیت کیفیٹی پر واضح ہو گئی ۔ اسمبلی میں بحث کے دوران میں اطالوی وزیر خارجہ کونٹ سفورزا مجھے ملے اور فرمایا تم نے یہ تو اندازہ کر لیا ہو گا کہ سومالیہ کی فوری آزادی کی کوئی امید نہیں ۔ لازماً نگرانی کا کوئی انتظام کیا جائے گا ۔ ہماری انتہائی خواہش ہے کہ اطالوی سومالیہ کی نگرانی ہمارے سپرد کی جائے ۔ اس سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کر سکیں کہ ہم اپنے ماضی قریب کو پورے طور پر خیر باد کہہ چکے ہیں اور ہم پسماندہ علاقوں کی آزادی اور ان کی بہبودی کے دل سے موئید اور خواہاں ہیں ۔ سومالیہ کی نگرانی سے ہم کوئی مادی فائدہ تو اٹھا نہیں سکتے ۔ اس ذمہ داری کو

نبھانے کیلئے ہمیں خرچ بھی کرنا پڑے گا اور بہت سے تجربہ کار افراد کی خدمات بھی اس کام کیلئے مہیا کرنا ہوں گی۔ ہمیں سومالیا کے حالات کا علم اور تجربہ رکھنے والے افسر خاصی تعداد میں میسر ہیں جو سومالی زبان بھی جانتے ہیں۔ ادھر سومالیا کے تعلیم یافتہ طبقے میں سے اکثر اطالوی زبان سے بھی واقف ہیں۔ اس طرح ہمیں ہر دیگر ملک کے مقابلے میں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ لیبیا کے معاملے میں ہم اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس معاملے میں ہماری خواہش کو ہمدردی کی نظر سے دیکھو گے۔

ظفر اللہ خاں :۔ میں تو صرف آپ کی خواہش اپنی حکومت تک پہنچا سکتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس معاملے میں پاکستان کا وہی موقف ہو گا جو عرب ممالک کا ہو گا وہ سومالیہ کے پڑوسی ہیں اور سومالیا کی آبادی کو عرب ممالک کے ساتھ بہت ربط ہے۔ مناسب ہو گا اگر آپ عرب نمائندوں کے ساتھ بھی بات چیت کریں۔

کونٹ سفورزا :۔ میں نے ان میں سے بعض کے ساتھ بات کی ہے مثلاً لبنان کے نمائندے ڈاکٹر چارلس ملک نے ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا ہے اگر تم عرب نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرو تو بہت ممکن ہے کہ کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو جائے۔

میں نے ڈاکٹر چارلس ملک سے بات کی انہوں نے مجھے اور عرب نمائندوں کو اس معاملے پر غور کرنے کیلئے نیویارک کی ہارورڈ کلب میں بلایا۔ بعد غور یہ فیصلہ ہوا کہ سمجھوتے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ سومالیہ کا نظم و نسق تو نگرانی کے دوران میں اٹلی کے سپرد ہو جائے لیکن اٹلی کے ساتھ دو نگران ملک اور شامل کر دیئے جائیں۔ جو اٹلی کے قائم کردہ نظام کی نگرانی کریں۔ مجھے ہدایت ہوئی کہ تم اٹلی کو اس تجویز پر رضامند کرنے کیلئے کونٹ سفورزا کے ساتھ بات چیت کرو۔ کونٹ سفورزا نے پہلے تو کچھ لیت و لعل کی لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ ہم کسی اور تجویز پر رضامند نہیں ہوں گے تو انہوں نے فرمایا میں اپنے رفقائے وزارت کے ساتھ مشورہ کئے بغیر اس معاملے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں کل روم واپس جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچنے کے دو تین دن کے اندر ہم کچھ فیصلہ کر سکیں گے۔ ہمارا سرکاری نمائندہ تمہیں ہمارے فیصلے کی اطلاع کر دے گا۔ میرا اپنا رجحان اس تجویز کے حق میں ہے اور میں اپنے رفقاء کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تین چار دن کے اندر اطالوی نمائندے نے مجھے اطلاع دی کہ کونٹ سفورزا کی طرف سے عرب ممالک کی تجویز کی منظوری کی اطلاع آگئی ہے۔ لیکن جب ہم نے اس تجویز کے مطابق قرارداد کا مسودہ تیار کیا اور ساتھ ہی اراکین اسمبلی کی تائید حاصل کرنے کے لئے سعی شروع کی تو ایک اور مشکل پیش آئی اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کونسل کی تشکیل اس طرح پر ہے کہ جو ممالک کسی علاقے کے نگران ہیں وہ سب اس کونسل کے رکن ہیں۔ ان کی تعداد کے برابر تعداد غیر نگران ملکوں میں سے اسمبلی کونسل کی رکنیت کے لئے انتخاب کرتی ہے۔ گویا کونسل کے اراکین میں نصف تعداد نگران ملکوں کی ہے اور نصف غیر نگران ملکوں کی۔ ہماری تجویز تھی کہ سومالیا کی نگرانی تین ملکوں کے سپرد ہو جن میں سے ایک یعنی اٹلی سومالیا کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہو۔ جو نگران ممالک

کونسل کے پہلے سے رکن تھے۔ ان کی طرف سے سوال اٹھایا گیا کہ تین ممالک اگر بطور نگران نامزد کئے جائیں تو وہ تینوں کونسل کے رکن ہوں گے اور تین غیر نگران ملکوں کو بذریعہ انتخاب کونسل کی رکنیت میں شامل کیا جائے گا۔ گویا سومالیہ کی نگرانی کے سلسلے میں کونسل کی رکنیت میں چھ اراکین کا اضافہ ہوگا۔ جن میں سے نظم ونسق کا انتظام تو صرف ایک ملک یعنی اٹلی کے سپرد ہوگا۔ اور حقیقی معنوں میں صرف اٹلی ہی نگران ملک ہوگا اور عملاً پانچ غیر نگران کونسل میں شامل ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں کونسل کی تشکیل بالکل بدل جائے گی اور نصف نگران اور نصف غیر نگران ممالک کا توازن قائم نہیں رہے گا۔ کیونکہ غیر نگران ملکوں کی تعداد نگران ملکوں کی تعداد سے بہت بڑھ جائے گی۔ اقوام متحدہ کے قواعد کے تحت اس وقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ سومالیہ کا نگران تو اٹلی کو ہی مقرر کیا جائے لیکن دو ممالک اٹلی کی کارگذاری کی نگرانی کریں اور اس کے متعلق ہر سال رپورٹ پیش کیا کریں۔ چنانچہ اس کے مطابق قرارداد منظور ہوگئی اور اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ عرب ممالک بھی اس انتظام پر رضامند تھے اور سومالی وفد بھی مطمئن تھا۔ اٹلی نے اس فرض کو دیانتداری سے ادا کیا اور مقررہ میعاد کے اندر سومالیہ نے آزاد ہو کر اندرونی نظم ونسق بھی سنبھال لیا اور اقوام متحدہ کی رکنیت بھی حاصل کر لی۔

سوڈان کی آزادی | ۱۹۴۷ء کے نومبر میں امریکہ جاتے ہوئے مجھے ایک رات خرطوم ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ امریکہ سے مجھے انگلستان جانا پڑا اور انگلستان سے واپسی کے سفر کے دوران میں مارچ ۱۹۴۸ء میں مجھے پھر دو دن خرطوم ٹھہرنا پڑا۔ اس مختصر وقت میں جو کچھ مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا اس کا مجھ پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اور میرے دل میں سوڈان کے سادہ دیندار اور مخلص لوگوں کی عزت، احترام اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ واپسی کے سفر میں مجھے السید عبدالرحمٰن المہدی اور السید میرغنی صاحبان کی ملاقات کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ جب اقوام متحدہ میں سوڈان کی آزادی کا مسئلہ زیر غور آیا تو پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھی اور اپنے ذاتی رجحان کی وجہ سے بھی میں نے اس میں گہری دلچسپی لی۔ آئینی لحاظ سے سوڈان کی حیثیت دیگر نوآبادیات سے کچھ مختلف تھی۔ عملاً تو سوڈان کا تمام نظم ونسق برطانیہ کے ہاتھ میں تھا لیکن تاریخی اور آئینی لحاظ سے سوڈان کے علاقے پر برطانیہ اور مصر کو مشترکہ طور پر اختیارات حاصل تھے۔ سوڈان کی آزادی کے مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آزادی کے بعد سوڈان اور مصر کے درمیان رابطے کی نوعیت کیا ہوگی؟ انہی ایام میں مصر اور برطانیہ کے درمیان سوئیز سے برطانوی افواج کی واپسی کے مسئلے پر بھی گفتگو جاری تھی۔ یہ دونوں مسائل ابھی ابتدائی مراحل میں تھے کہ مصر میں انقلاب کے نتیجے میں شاہ فاروق تخت سے علیحدہ کر دیئے گئے اور مصر میں جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔

۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سالانہ اجلاس پھر پیرس میں ہوا۔ مصر کی وفدی حکومت کے وزیر خارجہ کے ساتھ میرے مراسم حد درجہ دوستانہ تھے۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں ہی میری گفتگو سوئیز سے برطانوی افواج

کی واپسی کے مسئلے پر برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن سے بھی ہوتی رہی۔ اس مسئلے میں پاکستان مصر کا پورے طور پر مؤید تھا اور مسٹر ایڈن کو بھی مصری مطالبے کے ساتھ ایک حد تک ہمدردی تھی گو انہیں ابھی یہ اطمینان نہیں تھا کہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر چرچل اس مطالبے کو پورے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ سوڈان کے دو وفد بھی پیرس میں موجود تھے اور دونوں کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی۔ میری کوشش تھی کہ (۱) سوڈان کے سب نمائندے برطانیہ سے پوری آزادی حاصل کرنے پر متفق ہو جائیں (۲) وہ اس امر کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیں کہ سوڈان اور مصر کے درمیان تعاونی تعلقات کا قیام اور استحکام دونوں کی بہبودی کے لئے لازم ہے۔ (۳) ان تعلقات کی عملی شکل کا فیصلہ وہ براہ راست مصر کی حکومت کے ساتھ کریں۔

گفتگو کے دوران میں سوڈان کے وفود کے اراکین بعض آئینی مسائل کی وضاحت بھی کراتے رہے۔ مثلاً مجھ سے پوچھا گیا کہ اگر سوڈان مصر کے ساتھ تخت و تاج کا اتحاد قبول کرے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تو نہ ہوگا کہ سوڈان مصر کا محکوم ہو گیا ہے۔ میں نے انہیں مثالیں دیکر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اگر آئین میں صاف طور پر درج ہو جائے کہ سوڈان کے آزاد ہونے پر شاہ مصر ہی شاہ سوڈان بھی ہوں گے لیکن شاہ سوڈان کی حیثیت میں وہ اپنی سوڈانی وزارت کے مشورے پر عمل کرنے کے پابند ہوں گے تو اس خدشے کا ازالہ ہو جائے گا۔ اور اگر سوڈان اس آئینی پابندی کو اور مضبوط کرنا چاہے تو آزادی حاصل ہونے پر وہ اقوام متحدہ کا رکن بھی بن جائے۔ اور مصر اور سوڈان کے درمیان جو آئینی معاہدہ ہو اسے اقوام متحدہ میں داخل کر دیا جائے۔ ساتھ ہی میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مصر کے وزیر خارجہ سے بھی مل کر اپنے شبہات اور خدشات کے متعلق اطمینان کر لیں۔ وزیر خارجہ مصر نے متعدد بار مجھ سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ تمہاری مساعی کے نتیجے میں فضا بہت حد تک صاف ہو گئی ہے اور اب سوڈان اور مصر کے درمیان جلد سمجھوتا ہو جائے گا۔

مصری انقلاب کے بعد ان دونوں مسائل کے متعلق گفت و شنید انقلابی کونسل نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ میں مصر سے برطانوی افواج کی واپسی کے سلسلے میں دو تین بار قاہرہ اور لندن گیا قاہرہ میں پاکستانی سفارت خانہ تو تھا لیکن ان ایام میں سفیر کوئی نہیں تھا۔ سید طیب حسین صاحب بعہدہ مدیر اوّل سفارت خانے کے سربراہ تھے۔ جب بھی مجھے قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا انقلابی کونسل کے اراکین کی طرف سے سید طیب حسین صاحب پر پورے اعتماد کا اظہار ہوتا رہا اور انکی مساعی کے متعلق ممنونیت اور تشکر کے جذبات تمام اراکین کونسل کی طرف سے جو گفتگو میں شریک ہوتے ظاہر ہوتے رہے یہاں تک کہ ہر بار مجھے مشورہ دیا جاتا رہا کہ سید طیب حسین صاحب کو مصر میں پاکستانی سفیر مقرر کر دیا جائے۔ برطانوی نمائندوں کے ساتھ اس مسئلے پر گفت و شنید کا سلسلہ لمبا ہوتا گیا۔ کبھی گفت و شنید کا سلسلہ بند بھی ہو جاتا۔ جب بھی یہ صورت پیدا

ہوئی تو دوبارہ گفت و شنید کا سلسلہ پاکستانی سفارت خانے میں ہی جاری ہوا۔ قاہرہ میں جب بھی میری گفتگو انقلابی کونسل کے اراکین کے ساتھ ہوئی اس میں کرنل عبدالجمال ناصر صاحب شامل ہوتے رہے۔ ان ایام میں حکومت کے رئیس ابھی جنرل نجیب تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت بھی حاصل ہوتی رہی۔ وہ نہایت با اخلاق متواضع منکسر المزاج اسم با مسمّٰی ہستی ہیں۔ میرے ساتھ ہمیشہ بڑے تلطف اور احسان کے ساتھ پیش آتے رہے۔ فجزاہ اللہ۔ ریاستہائے متحدہ کی طرف سے بھی اس معاملے میں مصر کی پوری تائید کی گئی اور ان کی مدد موثر بھی ثابت ہوئی۔ ان ایام میں امریکی سفیر متعینہ قاہرہ مسٹر کافری تھے۔ میں جب بھی اس سلسلے میں قاہرہ گیا برطانوی سفیر سر رالف سٹیفنسن اور مسٹر کافری سے ملتا رہا۔ برطانوی سفیر صاحب سے تو محض برطانوی موقف کا علم حاصل ہوتا لیکن مسٹر کافری بڑی صفائی سے بات کرتے اور ان سے تمام حقیقت معلوم ہو جاتی ۱۹۵۲ء کے انتخاب میں جب جنرل آئزن ہاور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے اور ری پبلکن پارٹی برسر اقتدار آئی تو مجھے اندیشہ ہوا کہ مسٹر کافری کو جو ڈیموکریٹک پارٹی کے تھے شاید قاہرہ سے واپس بلا لیا جائے۔ اگرچہ ایسے معاملے میں دخل اندازی جائز نہیں ہوتی لیکن میں نے شروع ۱۹۵۳ء میں جب امریکی وزیر خارجہ سے واشنگٹن میں اس خدشے کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کے قاہرہ سے چلے آنے سے ممکن ہے اس مسئلے کے حل میں تعویق ہو جائے تو مسٹر ڈلس نے فرمایا جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے میرا ارادہ مسٹر کافری کو قاہرہ سے واپس بلانے کا نہیں۔ مجھے اس سے اطمینان ہوا۔

آخر سب مراحل طے ہو کر وزیر اعظم برطانیہ کی رضامندی کا مرحلہ باقی رہ گیا۔ میں لندن میں مسٹر ایڈن سے ملا تو انہوں نے مشورہ دیا تم خود بھی وزیر اعظم مسٹر چرچل سے ملو وہ تمہاری رائے کی قدر کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وزیر اعظم کو علم ہے کہ جملہ مشیران مجوزہ سمجھوتے کے حق میں ہیں۔ جس دن میری ملاقات وزیر اعظم سے تھی اس سے پہلی شام جنرل سر برائن رابرٹسن نے جو سوئیز کے علاقے کے برطانوی کمانڈر انچیف تھے اور رخصت پر سکاٹ لینڈ آئے ہوئے تھے۔ مجھے ٹیلیفون پر فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے تم کل وزیر اعظم سے ملنے والے ہو۔ تمہاری اس ملاقات سے پہلے ضروری ہے کہ ہم آپس میں بات چیت کر لیں میں آج رات کی ایکسپریس سے لندن آرہا ہوں۔ کل صبح سٹیشن سے سیدھا تمہارے پاس آجاؤں گا۔ دوسری صبح وہ تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا یہ نہایت اہم معاملہ ہے اور اب آخری اور سب سے نازک مرحلے پر ہے اس لئے ہر مناسب احتیاط اور تدبیر لازم ہے۔ میں تین باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں اوّل یہ کہ وزیر اعظم پر یہ ہرگز ظاہر نہیں ہونا چاہئے کہ میری تمہاری کوئی گفتگو اس مسئلے پر ہوئی ہے۔ دوسرے تم مناسب طریق سے ان کی طبیعت پر یہ تاثر چھوڑنا کہ مصری انقلاب ایک مستقل حقیقت ہے عارضی ابال نہیں جو آج اٹھا اور کل بیٹھ جائے گا۔ تیسرے تم انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کرنا کہ انقلابی کونسل جو بھی معاہدہ ہوا اسے پورے طور پر نبھائے گی۔ میں نے وزیر اعظم سے ملاقات کے دوران

میں نے جنرل رابرٹسن کے مشورے پر عمل کیا۔ وزیراعظم چرچل نے صبر اور تحمل سے میری بات سن لی جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پہلے ہی معاہدے کی موافقت پر آمادہ ہو چکے تھے۔ ورنہ اگر ان کی طبیعت ابھی تک مخالفت کی طرف مائل ہوتی تو وہ حسب عادت پورے جوش سے اس کا اظہار کر دیتے۔ اس معاملے میں مسٹر ایڈن شروع سے ہمدردانہ رویہ اختیار کئے رہے اور آہستہ آہستہ انہوں نے وزیراعظم کو بھی رضامند کر لیا۔ نہر سوئیز کے مصری تصرف میں آجانے کے بعد جو مخالفانہ بلکہ معاندانہ رویہ مسٹر ایڈن نے اختیار کیا اس میں اسبات کا بھی بہت دخل تھا کہ افواج کے اخراج کے بعد مصر کے ساتھ جیسے دوستانہ تعلقات کی امید ان کے ذہن میں تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ جس سے انہیں شدید صدمہ ہوا۔ ملک اور پارٹی کی نگاہ میں سوئیز کے علاقے سے برطانوی افواج کے اخراج کی ذمہ داری مسٹر ایڈن پر تھی۔ اگر برطانوی افواج سوئیز کے علاقے میں موجود ہوتیں تو نہر سوئیز پر مصری حکومت اپنا تصرف قائم نہ کر سکتی۔ ملک اور پارٹی کا ردعمل یہ تھا کہ مسٹر ایڈن نے برطانوی افواج کے اخراج پر رضامند ہو جانے سے شرق اوسط میں برطانوی طاقت اور وقار کو صدمہ پہنچایا جس کے نتیجے میں مصر نہر سوئیز کو اپنے واحد تصرف میں لے آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں برطانیہ ہر پہلو سے کمزور ہو چکا تھا اور اس کمزوری کی وجہ سے بہت حد تک اپنا رعب بھی کھو چکا تھا۔ دوسری جنگ کے بعد جو حالات دنیا بھر میں رونما ہو رہے تھے اور آزادی کی جو رو چل رہی تھی ان کے مدنظر مصر کے اصرار پر برطانوی افواج کا سوئیز کے علاقے سے اخراج ناگزیر تھا۔ مسٹر ایڈن کی ہمدردانہ روش سے یہ مسئلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ ورنہ کشمکش کی صورت پیدا ہوتی تو برطانیہ کی سبکی ہوتی اور نتیجہ پھر بھی وہی ہوتا۔ بعد کے واقعات اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں اس وقت کے لحاظ سے بھی دو باتیں کسی قدر معنی خیز تھیں۔

اوّل :۔ برطانوی افواج کے اخراج کا مطالبہ شاہ فاروق کے عہد میں وفدی وزارت نے کیا تھا۔ یہ اقدام انقلاب کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ انقلاب سے پہلے کیا جا چکا تھا۔ انقلابی کونسل کے لئے اس پر زور دینا لازم تھا کیونکہ ان افواج کی سوئیز کے علاقے میں موجودگی مصر کی کامل آزادی کے رستے میں رکاوٹ تھی جس کا دوسری عالمی جنگ کے بعد کے حالات میں دور کیا جانا لابد تھا۔

دوسرے :۔ برطانیہ کی فوجی طاقت کے انحطاط ہی کا نتیجہ تھا کہ خود سوئیز کے علاقے کے کمانڈر انچیف جنرل رابرٹسن شدت سے آرزومند تھے کہ یہ مسئلہ مصالحانہ گفت و شنید سے ہی سلجھ جائے اور کسی قسم کے تصادم کی صورت پیدا نہ ہو۔ ورنہ فوجی روایات کے تو یہ امر بالکل خلاف تھا کہ وہ اس مسئلے کے سیاسی تصفیے میں اسقدر گہری دلچسپی لیتے۔

سوڈان کی آزادی کا مسئلہ جب اقوام متحدہ کی اسمبلی میں زیر بحث آیا تو قرار پایا کہ سوڈان کے گورنر جنرل کی ایک مشاورتی کونسل بنائی جائے جس کے پانچ رکن ہوں۔ ایک پاکستانی جو مشاورتی کونسل کا صدر ہو ایک برطانوی

ایک مصری اور دو سوڈانی۔ پاکستانی رکن کی ذمہ داری بحیثیت صدر نہایت اہم تھی اسلئے میری تجویز تھی کہ اس منصب کے لئے پاکستان کی خارجہ سروس کے سب سے سینئر اور ممتاز رکن مسٹر اکرام اللہ کو جو شروع سے پاکستان کے خارجہ سیکریٹری تھے منتخب کیا جائے۔ مصر کے وزیر خارجہ اس زمانے میں محمود فوزی صاحب تھے جو مصری انقلاب سے قبل اقوام متحدہ میں مصر کے مستقل نمائندے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ ان کی طرف سے مجھے پیغام موصول ہوا کہ انہیں اکرام اللہ صاحب کے تقرر پر پورا اطمینان نہیں کیونکہ مشاورتی کونسل کے برطانوی نمائندے سر گریفٹی سمتھ ہوں گے جو پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر رہ چکے ہیں اور ان کے اور مسٹر اکرام اللہ کے درمیان دوستانہ مراسم ہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مسٹر اکرام اللہ ان کی رائے سے متاثر ہوں گے۔ میں نے اپنے جواب میں انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد ہے۔ مسٹر اکرام اللہ کے تعلقات تمام سفرائے متعینہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ تھے۔ وہ سر گریفٹی سمتھ کو خوب جانتے ہیں اور یہ امر اسبات کی ضمانت ہونا چاہئیے کہ وہ سر گریفٹی کی کسی ناواجب چال کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن محمود فوزی صاحب مطمئن نہ ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ سید طیب حسین صاحب کو قاہرہ میں پاکستانی سفیر بھی مقرر کر دیا جائے اور ساتھ ہی سوڈان کے گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کا رکن اور صدر بھی نامزد کر دیا جائے وہ بیک وقت ان دونوں مناصب کے فرائض کو بخوبی سرانجام دے سکیں گے! مجھے مصری وزیر خارجہ کے اس اقدام پر بہت حیرت ہوئی۔ ایک تو انہیں صاحب تجربہ سیاستدان ہونے کی حیثیت سے معلوم ہونا چاہئیے تھا کہ پاکستانی سفارتوں کے لئے موزوں انتخاب کرنا پاکستانی حکومت کا کام ہے اور ایک دوسری حکومت کا اس میں دخل اندازی کرنا واجب نہیں۔ میں نے مصری اور پاکستانی باہمی دوستانہ تعلقات اور محمود فوزی صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی دوستانہ مراسم کے پیش نظر ان کے پہلے پیغام کو ایک غیر رسمی شخصی مشورہ سمجھ کر اسی حیثیت میں جواباً ان کے اطمینان کی کوشش کی تھی۔ اگر میں ان کا پہلا پیغام ملنے کے باوجود اکرام اللہ صاحب کی نامزدگی کا اعلان کر دیتا تو یہ ناواجب بات نہ ہوتی۔ وزیر خارجہ صاحب کی خدمت میں صرف معذرت کا پیغام بھیج دینا کافی ہوتا کہ مجھے اطمینان ہے کہ جس خدشے کا آپ نے اظہار کیا ہے اسکی کوئی بنیاد نہیں۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ جہاں تک ہو سکے سوڈان کی مکمل آزادی کا مرحلہ پاکستان مصر اور سوڈان کے باہمی تعاون سے بخیر و خوبی سرانجام پائے۔ انہوں نے میری تواضع سے غالباً یہ نتیجہ نکالا کہ میں اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں ان کی ہدایت پر عمل کرنا منظور کر لوں گا۔ میں نے دوسرے پیغام کے جواب میں انہیں اطلاع دیدی کہ گو محمد اکرام اللہ صاحب کی نسبت انکی رائے سے مجھے اتفاق نہیں لیکن مجھے ان کے تقرر پر اصرار نہیں اور میں نے میاں ضیاء الدین صاحب کو جو اس وقت ٹوکیو میں سفیر پاکستان تھے مشاورتی کونسل کا رکن نامزد کر دیا۔ تھوڑا عرصہ بعد مجھے قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وزیر خارجہ مصر سے ملاقات ہوئی میں نے ان کی خدمت میں گذارش کی کہ حکومت پاکستان متمنی ہے کہ سوڈان کی مکمل آزادی جلد سے جلد عمل میں آئے اور مصر اور سوڈان کے درمیان دوستانہ رابطہ قائم ہو جائے۔

اس غرض کے حصول کے لئے گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کے پاکستانی رکن کو ہدایت دی گئی ہے کہ (۱) سوڈان کی جلد سے جلد مکمل آزادی کے عمل میں لانے کی ہر ممکن سعی کی جائے اور ہر مرحلے پر اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے۔ (۲) سوڈانی اہل الرائے اصحاب کو مناسب طریق پر یاد دہانی جاری رہے کہ سوڈان اور مصر کے اکثر مفاد مشترک ہیں اور دونوں کی اکثر اقدار مشترک ہیں اسلئے لازم ہے کہ ان کے درمیان دوستانہ رابطہ قائم ہو اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہمی مفاد کے فروغ دینے کے لئے تعاون کریں (۳) مصر اور سوڈان کے درمیان رابطے کی کیا شکل ہو یہ مسئلہ سوڈان اور مصر کا آپس میں طے کرنے کا ہے۔ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ پاکستانی نمائندے کو اس سے بالکل الگ رہنا چاہیئے اور اس کے متعلق کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ان کی رائے میں یہ ہدایات مناسب ہیں؟ انہوں نے فرمایا مناسب ہیں۔ میں نے عرض کیا اگر کسی وقت آپ کو یہ معلوم ہو کہ ان ہدایات پر عمل نہیں ہو رہا یا ان کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے تو آپ اپنے سفیر متعینہ کراچی کی معرفت مجھے مطلع فرما دیں میں فوراً توجہ کروں گا اور اگر کسی اصلاح کی ضرورت ثابت ہوئی تو مناسب اصلاح کی جائے گی۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اگر کسی مرحلے پر آپس میں مشورے کی ضرورت پیش آئے تو میں قاہرہ حاضر ہونے میں تامل نہیں کروں گا۔ محمود فوزی صاحب نے میری گذارشات پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔

میاں ضیاء الدین صاحب نے اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔ الحمدللہ کہ سوڈان کی مکمل آزادی بخیر و خوبی جلد عمل میں آگئی۔ پہلے انتخاب میں حزب الاتحاد کو اکثریت حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں توقع تھی کہ سوڈان اور مصر کے درمیان آئینی اتحاد کی کوئی صورت نکل آئے گی لیکن یہ توقع بر نہ آئی۔ اس کی ایک وجہ جو اُسوقت سننے میں آئی یہ بھی تھی کہ عین انہیں ایام میں جنرل نجیب کو صدر ریاست کے منصب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جنرل نجیب کی والدہ سوڈانی تھیں اور جنرل نجیب سوڈان میں بہت ہردلعزیز تھے۔ سوڈان والوں کو ان پر بہت اعتماد تھا لہٰذا ان کی علیحدگی ان پر بہت شاق ہوئی واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن یہ امر باعث امتنان ہے کہ مصر اور سوڈان کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں اور یہ حقیقت مصری اور سوڈانی ارباب حل و عقد کے حزم اور دوربینی پر دال ہے۔

تونس اور مراکش کی آزادی کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لانے کی کوشش

۱۹۵۱ء کے اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں جو پیرس میں ہوا ہم نے تونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ اسمبلی کے ایجنڈے پر لانے کی کوشش کی لیکن ہماری تجویز تین چار آراء کی کمی کی وجہ سے مسترد ہو گئی۔ زیادہ افسوس اسبات کا تھا کہ لاطینی امریکن ممالک میں سے جو عموماً آزادی کے گن گانے کے عادی ہیں بہت کم ممالک نے ہمارا ساتھ دیا اور خود ریاستہائے متحدہ امریکہ نے نہ صرف خلاف رائے دی بلکہ ان کے نمائندے مسٹر ارنسٹ گروس نے ہماری تجویز کے خلاف تقریر کر کے بعض ممالک کے نمائندوں کو بہکا دیا۔ مجھے اس سے سخت صدمہ ہوا اور میں نے جوابی تقریر میں کہا کہ ایک طرف اقوام متحدہ کا میثاق ہم پر یہ ذمہ داری

ڈالتا ہے کہ ہم اپنے تنازعات کا تصفیہ پُرامن طریقوں سے کریں اور دوسری طرف جب ہم اقوام متحدہ کے ذریعے ایک تنازعہ کے فیصلے کے طالب ہوتے ہیں تو اسے ایجنڈے میں درج کرنے کی بھی مخالفت کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا سوا اس کے کہ جس قوم کی آزادی کا مسئلہ یہاں زیرِ غور نہیں لایا جا سکتا وہ تنگ آمد بجنگ آمد کا طریق اختیار کرے گی۔ اگر اقوام متحدہ کی اس غیر ہمدردانہ روش سے مایوس ہو کر تونس اور مراکش کے وطن پرست جنگ کی ٹھان لیں گے تو ناحق انسانی خون گرایا جائیگا۔ اگرچہ اس کشمکش کا انجام تو ایک ہی ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ یہ ملک آزاد ہو کر رہیں گے۔ لیکن اس صورت میں جو مصائب جانبین کو برداشت کرنے پڑیں گے ان کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر امریکی نمائندے پر ہوگی جو یوں تو انصاف، مساوات، اور حریت کے مدعی ہیں لیکن جن کا آج کا رویہ ان کے تمام دعاوی کو جھٹلاتا ہے۔ فرانسیسی وزیر خارجہ نے ہماری تجویز کی مخالفت میں یہاں تک کہہ دیا کہ نہایت افسوس ہے ایک طرف تو سب ملکوں کے نمائندے حکومت فرانس کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف اس معاملے میں ہمارے خلاف رائے دینے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر روبیر شومان وزیر خارجہ فرانس ایک قابل اور باوقار سیاستدان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے منہ سے ایسی بودی بات سنکر مجھے حد درجہ تاسف ہوا۔ آراشماری کے بعد اس دن کا اجلاس برخاست ہو گیا۔ میرے دل کی حالت میرے چہرے سے ضرور ظاہر ہوتی ہوگی کیونکہ اجلاس کے ہال سے نکلتے ہی "نکارگوا" کے نمائندے نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا ظفر اللہ خاں یہ رائے شماری شکست نہیں واضح فتح ہے۔ یاد رکھو یہ اجلاس پیرس میں ہو رہا ہے۔ یہاں کے قیام کے دوران میں کسی مسئلے پر فرانس کے خلاف رائے دینا لاطینی امریکنوں کے لئے ناممکن ہے۔ پیرس تو ہماری بیویوں کا قبلہ ہے۔ فرانس کے خلاف رائے دیکر ہم اپنے گھروں میں کیسے فساد برپا کر لیں۔ تمہاری تجویز تین چار آراء کی کمی سے پیرس میں مسترد ہو جانے کے معنی ہیں کہ آئندہ سال نیویارک کے اجلاس میں یہ تجویز بلا مخالفت منظور ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ۱۹۵۲ء کے سالانہ اجلاس میں اگرچہ فرانس نے مخالفت تو کی لیکن یہ دونوں مسئلے ایجنڈے میں شامل ہو گئے اور زیر بحث آئے۔ جب ان مسائل پر بحث ہوتی تو فرانسیسی نمائندے احتجاجاً اجلاس سے اٹھ کر چلے جاتے لیکن کسی دوسرے کمرے میں بیٹھ کر تقریریں سنتے رہتے عرب ممالک کی خواہش تھی کہ فلسطین اور لیبیا کی آزادی کے مسئلے کی طرح تونس اور مراکش کی آزادی کے مسئلہ کو اسمبلی میں بالتفصیل پیش کرنے کی خدمت بھی پاکستان ہی سرانجام دے۔ یہ کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ شمالی افریقہ کے محکوم علاقوں یعنی تونس، الجزائر اور مراکش کے مقابلے میں لیبیا نسبتاً پسماندہ تھا۔ جب لیبیا آزاد ہو گیا تو مغرب کے باقی علاقوں کا آزاد کیا جانا لازمی تھا ان کی آزادی کے رستے میں روکاوٹیں تو ڈالی جا سکتی تھیں لیکن آخر کار ان کا آزاد ہونا یقینی تھا۔

پیرس میں فرحت عباس صاحب اور دیگر قائدین الجزائر کی آزادی کے متعلق گفتگو

۱۹۵۱ء کے اجلاس کے دوران محمد اقبال شیدائی صاحب کے توسط سے بعض الجزائری قائدین جن میں فرحت عباس صاحب اور دو تین دیگر اراکین پارلیمنٹ بھی شامل تھے مجھ سے ملے اور فرمایا تم تونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ اسمبلی

کے ایجنڈے میں شامل کئے جانے کی سعی کر رہے ہو الجزائر کو ان کے ساتھ کیوں شامل نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ شمالی افریقہ کی آزادی کی رو ایک طبعی رو ہے آخر کار ضرور کامیاب ہو کر رہے گی۔ لیکن یہ کامیابی تدریج حاصل ہوگی جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ان علاقوں میں سے لیبیا نسبتاً پسماندہ علاقہ تھا لیکن وہ سب سے آخر میں مغربی تسلط کے ماتحت آیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی کی شکست کے نتیجے میں خود مغربی طاقتیں لیبیا کی آزادی کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی اسمبلی میں زیر بحث لانے پر مجبور ہو گئیں۔ ان کے عزائم تو نیک نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے لیبیا کی فوری آزادی کی صورت پیدا کر دی۔ لیبیا کے آزاد ہو جانے کے بعد تونس، الجزائر اور مراکش کی آزادی لازمی ہے۔ لیکن جہاں تک اقوام متحدہ کی تائید کا سوال ہے تونس اور مراکش کی آزادی کیلئے رستہ نسبتاً صاف ہے۔ الجزائر کے رستے میں بظاہر ایک آئینی روک حائل ہے۔ تونس اور مراکش میں فرانسیسی مداخلت کی بناء معاہدات پر ہے۔ فرانس کی طرف سے بیشک یہ کہا جا رہا ہے کہ فرانس اور تونس کے تعلقات اور فرانس اور مراکش کے تعلقات فرانس کے داخلی معاملات ہیں اور اقوام متحدہ کے میثاق کے رو سے اقوام متحدہ ان میں دخل دینے کی مجاز نہیں لیکن یہ عذر بالبداہت ناقابل پذیرائی ہے۔ یہ تعلقات بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے سے قائم ہوئے تھے۔ فرانس یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ آج بھی تونس اور مراکش الگ الگ ممالک ہیں جن کی طرف سے ان کے حکمرانوں نے بعض اختیارات فرانس کے سپرد کئے ہوئے ہیں۔ اب ان ملکوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ جن معاہدات کی رو سے یہ اختیارات فرانس کے سپرد کئے گئے تھے انکی غرض پوری ہو چکی ہے۔ وہ معاہدات اپنا مقصد پورا کر کے ساقط ہو چکے ہیں اور فرانس کی موجودگی ان علاقوں میں مداخلت بیجا اور ناواجب ہے اس لئے آئینی لحاظ سے اقوام متحدہ کے ان مسائل پر غور کرنے اور ان کے متعلق مناسب اقدام کرنے کے رستے میں کوئی روک حائل نہیں۔ الجزائر کا مسئلہ گو حقیقتاً تو مراکش اور تونس کے مسائل کی مانند ایک ملک اور قوم کی آزادی کا مسئلہ ہے لیکن فرانس کی طرف سے اس مسئلے میں ایک آئینی پیچیدگی پیدا کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے بظاہر الجزائر کا مسئلہ تونس اور مراکش کے مسائل سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ گو فرانس نے الجزائر پر اپنا اقتدار فوج کشی کے ذریعے قائم کیا اور اس طرح الجزائر کو فرانس کی نوآبادی بنا لیا لیکن اس باہمی تعلق کی آئینی شکل یہ بنالی کہ الجزائر کو فرانس کا ایک صوبہ قرار دیدیا۔ اس آئینی مفروضے کی آڑ لیکر فرانس کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ الجزائر اور فرانس کا باہمی تعلق فرانس کا داخلی مسئلہ ہے اور اقوام متحدہ کے میثاق کے رو سے اقوام متحدہ اس میں دخل اندازی کی مجاز نہیں۔ علاوہ ازیں فرانسیسیوں کو الجزائر کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق ہے۔ فرانسیسی تونس اور مراکش کی آزادی کے تصور کو تو ممکن ہے برداشت کر لیں لیکن الجزائر کے فرانس سے علیحدگی کا تصور ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔ ان وجوہ سے میری دانست میں الجزائر کی آزادی کے مسئلے کو تونس اور مراکش کی آزادی کے مسائل کے ساتھ اقوام متحدہ میں زیر بحث نہیں لانا چاہئے۔ جب تونس اور مراکش کو آزادی دینے کے لئے بین الاقوامی حلقوں کی تائید حاصل ہو جائے گی تو پھر الجزائر کی آزادی کے سوال کو کامیابی کی امید کے ساتھ زیر بحث لانا اتنا مشکل نہیں رہے گا۔ اگرچہ میرا احساس ہے کہ الجزائر

کی آزادی کی کشمکش زیادہ لمبی ہوگی اور حصول آزادی کیلئے الجزائر والوں کو قربانی بھی زیادہ دینا پڑے گی۔

تونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ | جب تونس کا مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث آیا سید احمد شاہ صاحب بخاری کی جو اس وقت اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے تھے رائے تھی کہ اقوام متحدہ کے میثاق کے فقرہ نمبر ۲ کی شق نمبر ۷ ضرور رستے میں حائل ہوگی۔ میری دلیل کو وہ چنداں وزن نہیں دیتے تھے لیکن دوران بحث کوئی ایسی مشکل اس سوال کی وجہ سے پیدا نہ ہوئی اور بخاری صاحب بھی نہ صرف مطمئن ہوگئے بلکہ بڑی مضبوطی سے اس موقف کی تائید کرتے رہے کہ تونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ ہے فرانس کا داخلی مسئلہ نہیں۔ جب فرانسیسی وفد نے یہ دیکھا کہ پاکستان تونس اور مراکش کی حمایت میں پیش پیش ہے تو تونس کے مسئلے پر بحث کے دوران میں ان کی طرف سے ایک بہت دیدہ زیب پمفلٹ اراکین اسمبلی میں تقسیم کیا گیا جس میں اعداد و شمار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ تونس رفاہ عام کے ہر شعبہ میں پاکستان سے کہیں آگے ہے۔ ایک صبح یہ پمفلٹ اجلاس شروع ہونے کے وقت ہر ملک کے نمائندے کے میز پر پایا گیا۔ میں نے جلد جلد اس کی ورق گردانی کی اور اسے ایک طرف رکھ دیا اس پمفلٹ میں چونکہ تونس کا مقابلہ صرف پاکستان سے کیا گیا تھا۔ اس لئے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آزادی کے باوجود پاکستان میں رفاہ عام کے شعبوں میں ترقی کی رفتار تونس سے بہت سست ہے اور تونس کی ترقی کی رفتار فرانس کے زیر اقتدار ہونے کی وجہ سے ہے۔ جب میں یہ پمفلٹ دیکھ چکا تو آغا شاہی صاحب نے جو میرے ساتھ کمیٹی میں معاون تھے اسے اٹھا لیا اور اس کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد گھبراہٹ میں مجھ سے فرمایا کہ پاکستان کے یہ اعداد و شمار جو اس پمفلٹ میں دیئے گئے ہیں آزادی سے پہلے کے ہیں۔ آزادی کے بعد پاکستان میں بہت سے شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے جسے اس پمفلٹ میں ظاہر نہیں کیا۔ ہم آج ہی اس کا جواب تیار کرلیں گے۔ آپ کتنی جلدی جواب دینا چاہتے ہیں؟ میں نے ذرا لاپرواہی کے لہجے میں کہا کوئی جلدی نہیں۔ انہوں نے محسوس کیا شائد میں پمفلٹ کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ تھوڑے عرصے بعد پھر کہا۔ میں جا کر اعداد و شمار کی پڑتال شروع کروں؟ میں نے پھر اسی لہجے میں کہا آپ زحمت نہ کریں۔ انہوں نے چند منٹ صبر کرنے کے بعد پھر کہا صاحب اس کا جواب تو ضرور ہونا چاہئے۔ میں نے پھر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دیکھا جائے گا۔ اس پر وہ خاموش تو ہو گئے لیکن ان کا اطمینان نہ ہوا۔ آخر جب میری طرف سے جواب کا وقت آیا تو جہاں تک اس پمفلٹ کا تعلق تھا میں نے کہا ہمیں افسوس ہے کہ ان مسائل پر بحث کے دوران فرانسیسی مندوبین اسمبلی کے اجلاس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور انکی طرف سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاتی اسلئے ہمیں ان کے نقطہ نظر سے آگاہی نہیں ہوتی لیکن ہم ممنون ہیں کہ آج انہوں نے کسی حد تک ہماری لاعلمی کے ازالے کی سعی اس پمفلٹ کے ذریعے کی ہے جو اراکین اسمبلی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض اراکین ابھی ان اعداد و شمار کا تجزیہ نہ کرپائے ہوں جو اس پمفلٹ میں درج ہیں اور اس لئے ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے قابل نہ ہوں لہٰذا میں ان کی اطلاع کے لئے ہر صفحے کا خلاصہ انہیں سنا دیتا ہوں۔ چند منٹوں میں

ہر شعبے کا خلاصہ کمیٹی کے روبرو پیش کر دینے کے بعد میں نے کہا ہم بحث کی خاطر یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ تونس رفاہ عام کے ہر شعبے میں پاکستان کی نسبت کہیں آگے ہے۔ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ تونس نے "باردو" کے معاہدے کی رو سے بعض اختیارات اس غرض سے فرانس کے سپرد کئے تھے کہ فرانس ان اختیارات کو استعمال کر کے تونس کے داخلی شعبوں میں مناسب اصلاح کر دے تونس کا کہنا ہے کہ فرانس معاہدے کے مقاصد کو پورا کر چکا ہے اس لئے اب وہ اختیارات جو فرانس کو تفویض کئے گئے تھے تونس کو واپس ہونے چاہئیں۔ فرانس کی طرف سے اس پمفلٹ میں یہ ثبوت مہیا کیا گیا ہے کہ تونس نے شعبوں میں اسقدر ترقی کی ہے کہ وہ پاکستان سے بھی کہیں آگے نکل گیا ہے۔ ہم اسے درست تسلیم کرتے ہوئے فرانسیسی فاضل نمائندوں سے صرف ایک سوال کرتے ہیں کہ اگر حقیقت یہی ہے جو پمفلٹ میں ظاہر کی گئی ہے تو کیا وجہ ہے کہ پاکستان تو آج سے پانچ سال قبل آزاد ہو چکا ہے اور تونس جو پاکستان کی نسبت اس قدر ترقی یافتہ ہے ابھی آزادی کے قابل نہیں سمجھا جاتا؟

غرض نہ تونس کے متعلق نہ مراکش کے متعلق فرانس کوئی ایسی دلیل پیش کر سکنے کے قابل تھا جس کی بنا پر ان ممالک کو آزادی کے قابل نہ گردانا جاتا لیکن اقوام متحدہ میں فرانس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسمبلی میں اس مسئلے پر ٹال مٹول ہوتا رہا۔ ایک بار فرانس نے جھنجھلا کر سلطان مراکش کو جلا وطن کر دیا اور ان کے مقابل پاشا آف مراکش کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن اس اقدام کے خلاف ملک بھر میں ایسے جوش کا احتجاج ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں سلطان فاتحانہ حیثیت میں واپس لوٹے اور پاشا آف مراکش نے دربار میں گھٹنوں کے بل چل کر ان کی اطاعت کا اعلان کیا اور اپنے قصور کی معافی طلب کی۔ جب اسمبلی میں یہ قصہ خاطر خواہ طور پر سلجھ نہ سکا تو یہ مسائل مجلس امن کے زیر غور آئے۔ اس عرصے میں پاکستان مجلس امن کا رکن ہو چکا تھا اور پاکستان کے قابل نمائندے سید احمد شاہ صاحب بخاری نے ان ملکوں کی آزادی کی حمایت کو نہایت احسن طور پر نبھایا۔ فجزاہ اللہ۔

السید احمد بالافریج کے پاکستانی پاسپورٹ کا معاملہ | اسی دوران میں السید احمد بالافریج جو مراکش کے حزب استقلال کے سیکرٹری تھے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں صف اول میں پیش پیش تھے اور جن کے میرے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے مجھے نیویارک میں ملے ان کے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہونے والی تھی اگر وہ پاسپورٹ کی تجدید یا توسیع کے لئے پیرس یا رباط جاتے تو انہیں اندیشہ تھا کہ انہیں ضرور نظر بند کر دیا جائے گا اور وہ نیویارک واپس نہ آسکیں گے انہوں نے مجھ سے اس مشکل کا تذکرہ کیا۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ پریشان نہ ہوں کیونکہ اس مشکل کا حل آسان ہے۔ میں نے انہیں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کا بلا تنخواہ مشیر برائے اقوام متحدہ مقرر کر دیا اور ان فرائض کی سرانجام دہی کے لئے انہیں پاکستانی پاسپورٹ دیدیا۔ میرے کراچی واپس آنے کے چند دن بعد فرانسیسی سفیر ہز ایکسیلنسی موسیو اوزح مجھے ملنے آئے اور فرمایا میری حکومت نے مجھے ہدایت دی ہے کہ میں انکی طرف سے السید احمد بالافریج کو پاکستانی پاسپورٹ دیئے جانے کے خلاف احتجاج کر دوں۔

ظفراللہ خان :۔ فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے ۔

موسیو اذرج :۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کا یہ اقدام خود آپ کے اپنے قومیت کے قانون (NATIONALITY ACT) کی خلاف ورزی ہے ۔

ظفراللہ خاں :۔ اچھا ؟ وہ کیسے ؟

موسیو اذرج :۔ میں آپ کی توجہ ایکٹ کی متعلقہ دفعہ کی طرف مبذول کراتا ہوں ۔ دیکھئے اس میں لکھا ہے کہ پاکستانی قومیت حاصل کرنے کے لئے پاکستان میں پانچ سال کی رہائش لازمی ہے اور احمد بالافریج تو پانچ سال چھوڑ پانچ منٹ بھی پاکستان میں نہیں ٹھہرے انہوں نے تو کبھی پاکستان میں قدم بھی نہیں رکھا ۔

ظفراللہ خان :۔ جناب سفیر صاحب مجھے یاد پڑتا ہے کہ دفعہ کے متن کی عبارت کے بعد باریک حروف میں کچھ استثنائی عبارت بھی ہے وہ بھی پڑھ دیجئے ۔

موسیو اذرج :۔ ہاں ہاں کچھ ہے ۔ بیشک لکھا ہے کہ حکومت کو اختیار ہے کہ خاص حالات میں رہائش کی شرط کو ترک کر دے ۔ لیکن یہاں کونسے خاص حالات ہیں ؟

ظفراللہ خاں :۔ جناب سفیر صاحب آپ یہ دریافت کرنے کے مجاز نہیں !

موسیو اذرج :۔ لیکن کیا میں ایک دوست کی حیثیت سے بھی دریافت نہیں کر سکتا ؟

ظفراللہ خاں :۔ پہلے آپ اپنی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے احتجاج ختم کر لیجئے ۔ دوستی بعد میں آئیگی ۔

موسیو اذرج :۔ دیکھئے مجلس امن کے اجلاس میں جب السید احمد بالافریج آپ کے مستقل نمائندے کے پیچھے کرسی پر آ بیٹھتے ہیں تو ہمارے نمائندوں پر یہ امر گراں گذرتا ہے ۔ فرض کریں اگر کشمیر کا مسئلہ مجلس کے زیر غور ہو اور شیخ عبداللہ بحیثیت آنریری مشیر فرانسیسی مستقل نمائندے کے پیچھے آکر بیٹھ جائیں تو آپ کا کیا احساس ہو گا ؟

ظفراللہ خاں :۔ اگر ایسا ہو تو ممکن ہے میری طبیعت پر یہ بات اس سے زیادہ گراں گذرے جتنا السید احمد بالافریج کی اجلاس میں موجودگی آپ کے نمائندوں پر گذرتی ہے ۔ لیکن میں اس کے بارے میں آپ سے احتجاج کا مجاز نہیں ہوں گا ۔

موسیو اذرج :۔ لیکن بحیثیت دوست کے ؟

ظفراللہ خاں :۔ تو کیا احتجاج ختم ہوا ؟

موسیو اذرج :۔ بہت اچھا ۔ احتجاج ختم ہوا ۔

ظفراللہ خاں :۔ اچھا تو اب دوستی کی بات کریں ۔ میں بحیثیت دوست کے تسلیم کرتا ہوں کہ السید احمد بالافریج کی موجودگی مجلس کے اجلاس میں آپ کے نمائندوں کے لئے دقت کا موجب ہوتی ہے ۔ میں اس کا یہ حل تجویز کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کو ہدایت دیدوں گا کہ وہ مجلس کے اجلاس میں السید احمد بالافریج کو اپنے ساتھ نہ لیجایا

کریں ۔

موسیوادرج :۔ آپ ایسا کریں تو میں نہایت ممنون ہوں گا اور میری حکومت بھی شکرگذار ہوگی۔ میں بہت شکریئے کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔

ظفراللہ خاں :۔ ذرا ٹھہریئے میں ایک بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ السید احمد بالافریج نیویارک میں مجھ سے ملے اور کہا میرے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہونے والی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں پاسپورٹ کی توسیع یا تجدید کے لئے پیرس یا رباط گیا تو مجھے نظربند کر دیا جائے گا۔ اور میں واپس نہ آسکوں گا۔ آپ کی آج کی گفتگو سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ان کا خدشہ بجا تھا۔ اور میں نے اچھا کیا کہ انہیں پاکستانی پاسپورٹ دیدیا۔ اچھا سفیر صاحب خدا حافظ!

تونس اور مراکش کے قضیئے اسمبلی اور مجلس امن کے بحث مباحثوں کے چکر سے گذر کر آخر اپنی انتہا کو پہنچے اور یہ دونوں ملک فرانس کے پنجے سے آزاد ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں تو ان ملکوں کی آزادی کے حامی اراکین اس مسئلہ کو اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوسکے تھے لیکن دس سال بعد ۱۹۶۱ء میں سیّد مونجی سلیم جو اس وقت اقوام متحدہ میں تونس کے مستقل نمائندے تھے اور بعد میں تونس کے وزیر خارجہ ہوئے اقوام متحدہ کی اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔

الجزائر کی آزادی | الجزائر کو اپنی آزادی کیلئے ایک لمبا عرصہ جدوجہد کرنا پڑی اور جب فرانس امن اور مصالحت کے طریق سے کسی فیصلے پر آمادہ نہ ہوسکا تو لاچار ہتھیار بندی کا مرحلہ پیش آیا۔ تونس اور مراکش کی آزادی کے نتیجے میں الجزائر کی آزادی لازم ہوچکی تھی۔ فرانس کی ضد اور ہٹ دھرمی نے الجزائری محبان وطن کو سرفروشی اور جام شہادت کے نوش کرنے کا چیلنج دیا جسے الجزائر کے ہر طبقے کے مجاہدین نے بصد شوق قبول کیا اور ایسی ہمت، جرأت، شجاعت، صبر اور استقلال سے آزادی کی مہم کو چلایا کہ ساری دنیا کی طرف سے آفرین کا خراج پیش ہوا۔ آخر خود فرانس میں انقلابی حالات رونما ہوئے اور جنرل ڈیگال برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے بہت دلیری اور فراست سے الجزائر کے قضیئے کو طے کرنے کی ٹھانی اور باوجود داخلی اور خارجی مشکلات کے فرانس کو الجزائر کی آزادی تسلیم کرنے پر آمادہ کر کے الجزائر کو اس کا بنیادی حق دینے اور فرانس کو ایک ایسی مشکل سے رہائی دلانے کی صورت پیدا کر لی جو فرانس کے لئے سوہان روح بن رہی تھی فجزاہ اللہ۔

شمالی افریقہ کے ان چار ممالک کو اس جدوجہد میں جس نے مختلف شکلیں اختیار کیں پاکستان کی پوری تائید اور گہری ہمدردی حاصل رہی اور نہ صرف اقوام متحدہ میں بلکہ جہاں بھی اور جیسے بھی ممکن ہوا پاکستان کی طرف سے اپنی دوستی اور اخوت کا عملی ثبوت پیش ہوتا رہا۔ فرانس کی حکومت پاکستان کے موقف اور پاکستان کے اقدامات سے واقف تھی اور اگرچہ پاکستان نے کوئی موقعہ ان ممالک کی آزادی کی جدوجہد کو کامیاب کرنے کا ہاتھ سے نہیں دیا لیکن فرانس کی حکومت کی نگاہ میں پاکستان کا وقار بڑھتا ہی گیا۔

۱۹۵۱ء کے اکتوبر میں سر بی این راؤ جو اس وقت اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندہ تھے بین الاقوامی عدالت کے جج منتخب ہوئے ان کی ججی کی ۹ سالہ میعاد ۶ فروری ۱۹۵۲ء کو شروع ہوئی لیکن ابھی دو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ان کی وفات ہو گئی۔ ان کی جگہ پر کرنے کے لئے جو انتخاب ہوا اس میں پاکستان کی طرف سے مجھے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں پیرس میں پاکستانی سفیر محمد اکرام اللہ صاحب تھے وہ اس سلسلے میں مسٹر پارودی سے ملے جو اس وقت فرانسیسی وزارت خارجہ کے جنرل سیکرٹری تھے جب انہوں نے سفیر صاحب سے میرا نام سنا تو فرمایا جناب سفیر صاحب ظفر اللہ خاں کی نسبت مجھ سے مزید کچھ کہنے سننے کی آپ کو حاجت نہیں۔ میں اسے ان دنوں سے خوب جانتا ہوں جب کشمیر کا مسئلہ مجلس امن میں پیش ہوا تھا۔ میں اس وقت اقوام متحدہ میں فرانس کا مستقل نمائندہ تھا میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ظفر اللہ خاں غلط بات نہیں کہتا اور ہمیشہ انصاف کو مدنظر رکھتا ہے۔ میرے خیال میں وہ بین الاقوامی عدالت کی ججی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ میں کچھ دن بعد اس معاملے کے متعلق حکومت کے تائیدی فیصلے کی اطلاع آپ کو دیدوں گا۔

الجزائر کی جدوجہد کے دوران ایک مرحلے پر سلطان مراکش نے السید احمد بن بیلا اور ان کے چار رفقائے جہاد کو اپنے ہاں بلایا اور ان کے ساتھ الجزائر کے قضیئے کے متعلق گفت وشنید کی جس کی غرض یہ تھی کہ شاید فرانس کے ساتھ سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ رباط میں گفت وشنید کے بعد پانچوں اصحاب تونس کے صدر ریاست السید حبیب بورقیبہ کی دعوت پر ایک فرانسیسی طیارے میں عازم تونس ہوئے۔ الجزائر کے اوپر پرواز کے دوران الجزائر کی فرانسیسی حکومت نے پائیلاٹ کو لاسلکی پیغام کے ذریعہ ہدایت دی کہ وہ فوراً نیچے اتر آئے اور نیچے اترنے پر السید بن بیلا اور ان کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا اور انہیں نظر بند کر دیا۔ جب اس احمقانہ حرکت کی اطلاع صدر حبیب بورقیبہ کو ہوئی تو انہوں نے فرانسیسی حکومت کو سخت انتباہ کیا اور اس درازدستی کے ازالے کا مطالبہ کیا۔ آخر بہت ردوکد کے بعد قرار پایا کہ اس قضیئے کا فیصلہ تین ثالثوں کے سپرد کیا جائے جن میں سے ایک کو فرانس نامزد کرے دوسرے کو تونس اور تیسرا فریقین کے باہمی اتفاق سے نامزد ہو اور وہی ثالثی بورڈ کا صدر بھی ہو۔ میں اس زمانے میں بین الاقوامی عدالت کا رکن تھا۔ فرانس اور تونس نے اپنا اپنا رکن نامزد کرنے کے بعد اس امر پر اتفاق کیا کہ تیسرا ثالث اور ثالثی بورڈ کا صدر مجھے نامزد کیا جائے۔ جب فریقین کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا تو میں نے کہا کہ میں تو خوشی سے یہ خدمت اپنے ذمے لینے کو تیار ہوں لیکن یہ درخواست عدالت کے صدر کی خدمت میں آنی چاہیئے تاکہ وہ اراکین عدالت سے مشورہ کرنے کے بعد مناسب جواب دیں۔ جب عدالت کے صدر پریذیڈنٹ گرین ہیک ورتھ کی خدمت میں فرانسیسی اور تونسی سفراء نے اپنی اپنی حکومت کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا تو صاحب صدر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم یہ خدمت اپنے ذمے لینے کو تیار ہو۔ میں نے کہا مجھے تو کوئی عذر نہیں لیکن آپ دیگر اراکین عدالت سے مشورہ کر لیں۔ مشورے کے بعد صاحب صدر

نے مجھے بتلایا کہ بعض اراکین کو اس وجہ سے تامل ہے کہ ممکن ہے اس قضیئے کا کوئی پہلو کسی وقت عدالت کے سامنے آئے اور تمہارے لئے یہ امر دقت کا موجب ہو لیکن جملہ اراکین کی رائے ہے کہ آخری فیصلہ تم پر چھوڑا جائے۔ اس پر میں نے بلا تامل کہدیا کہ آپ فریقین سے کہدیں کہ میں یہ خدمت اپنے ذمے لینے سے قاصر ہوں۔ اگرچہ میں یہ خدمت تو نہ کر سکا لیکن مجھے اس بات پر اطمینان ضرور ہوا کہ فرانس اور تونس دونوں کا اعتماد مجھے حاصل ہے

شہیدِ ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب پاکستان کے پہلے وزیر اعظم!

مجھے نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا پہلا موقعہ ۱۹۳۷ء ۱۹۳۸ء میں ملا جب مئی ۱۹۳۷ء سے ستمبر ۱۹۳۸ء تک وہ حکومت برطانیہ کے ساتھ نئے تجارتی معاہدے کی شرائط طے کرنے کے لئے میرے غیر سرکاری مشیروں میں شامل تھے۔ مجھے ہر مرحلے پر ان کے مشورے سے بہت مدد ملی۔ میرے ذہن پر ان کی صائب رائے اور حسن تدبیر نے گہرا اثر چھوڑا۔ بعد میں جب وہ مسلم لیگ کی طرف سے ضمنی انتخاب میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو ان کی شمولیت سے اسمبلی میں مسلم لیگ کی نمائندگی کو بہت تقویت پہنچی۔ اسمبلی میں ان کی پہلی ہی تقریر ان کے روشن مستقبل پر شاہد تھی اور ہر طرف سے انہیں خراج تحسین پیش کئے جانے کا موجب ہوئی۔ میں نے بھی ان کی نشست پر جا کر انہیں مبارکباد پیش کی۔

وزارت خارجہ کے زمانے میں قریب چار سال مجھے نواب زادہ صاحب کا رفیق کار رہنے کا فخر حاصل رہا۔ اس عرصے میں پاکستان کی حفاظت، پاکستان کی عزت اور پاکستان کی بہبودی ہی ان کے مقاصد حیات تھے۔ اور ہر امر کو وہ انہی کسوٹیوں پر پرکھتے تھے۔ مزاج نہایت سنجیدہ تھا، محنت کے عادی تھے، فیصلے میں جلدی نہیں کرتے تھے، سب پہلوؤں پر غور و تدبر اور اپنے رفقاء کے ساتھ مناسب مشورے کے بعد نتیجے پر پہنچتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی معاملے میں چھوٹا ہو یا بڑا ہمارے درمیان کبھی اختلاف ہوا ہو۔ ایک شام ان کے ہاں ایک استقبالیہ دعوت تھی، میں ان کی پشت کی جانب کھڑا ایک مہمان کے ساتھ بات چیت میں مشغول تھا۔ وہ ایک طاقت عظمیٰ کے سفیر کے ساتھ گفتگو فرما رہے تھے۔ دوران گفتگو فرمایا معاملہ میرے زیرِ غور ہے۔ بقول میرے وزیر خارجہ کے وزیر اعظم پوسٹ بکس کی طرح ہے اپنی چٹھی ڈال دیجئے اور کچھ صبر کیجئے ممکن ہے تاخیر ہو لیکن جواب ضرور ملے گا۔ سفیر صاحب سے فارغ ہوئے تو میں نے ان سے کہا آپ نے سفیر صاحب سے میری طرف منسوب کر کے جو کچھ فرمایا وہ ہے تو میرا ہی ریمارک لیکن آپ تک کیسے پہنچ گیا؟ مسکرائے اور فرمایا کسی طرح پہنچ گیا اور ہے بھی ٹھیک!

۲۸ ر اگست ۱۹۵۱ء کی شام کو مجھے طلب فرمایا اور کہا سان فرانسسکو میں جاپانی معاہدہ صلح کی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے تم نے تجویز کیا تھا کہ مسٹر حسن اصفہانی سفیر پاکستان متعینہ واشنگٹن کو بھیجنا مناسب ہوگا آج وزیر اعظم ہند کا جو بیان اس معاہدے کے متعلق اخبار میں ہے تم نے پڑھا ہے؟ میرے اثباتی جواب پر فرمایا

اب تمہارا خود سان فرانسسکو جاکر معاہدے کی تائید کرنا لازم ہوگیا ہے۔ یہ کانفرنس شروع ستمبر میں ہونیوالی تھی میں ۲۹ اگست کو نوابزادہ صاحب سے رخصت ہوکر امریکہ کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ افسوس یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی
کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شمولیت کے لئے چلا گیا۔ اجلاس کے دوران ایک روز صبح صبح پریس کے ایک نمائندے نے ٹیلیفون پر یہ وحشتناک خبر سنائی کہ راولپنڈی میں کسی شخص نے وزیراعظم پاکستان کو گولی سے زخمی کر دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ابھی میری طبیعت اس خبر کے صدمے سے بحال نہ ہونے پائی تھی کہ اس نمائندے نے دوسری بار ٹیلیفون پر بتایا کہ وزیراعظم صاحب انتقال فرما گئے ہیں۔ میرے منہ سے فوراً جواباً نکلا:۔

THIS IS DREADFUL NEWS. THE HAND THAT RELEASED THAT BULLET HAS LET LOOSE A HOST OF MISERIES ON PAKISTAN

(یہ بڑی اندوہناک خبر ہے۔ جس ہاتھ نے وہ گولی چلائی اس نے پاکستان کے لئے کئی قسم کے مصائب کا دروازہ کھول دیا ہے۔) یغفراللہ ویجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرا خدشہ صحیح تھا۔ نوابزادہ صاحب کی وفات کے بعد پاکستان کئی لحاظ سے بتدریج گرتا چلا گیا اور آج پاکستان کو جن مشکلات کا سامنا ہے، ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وزیراعظم صاحب کی اچانک وفات کے نتیجے میں آئینی طور پر وزارت کا خاتمہ ہوگیا اور میں فوراً کراچی روانہ ہوگیا۔ میرے پہنچتے تک خواجہ ناظم الدین صاحب کا تقرر وزارت عظمیٰ پر اور ملک غلام محمد صاحب کا گورنر جنرل کے عہدے پر ہوچکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب نے مجھے ارشاد فرمایا ہم چاہتے ہیں تم مثل سابق وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالو۔ میں نے شکریئے کے ساتھ ان کے ارشاد کی تعمیل کی اور دو دن کے بعد ان کی ہدایت کے مطابق اسمبلی کے اجلاس میں شمولیت کیلئے واپس چلا گیا۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان کے لئے یہ واقعہ فاجعہ کس قدر صدمے اور کرب کا موجب ہوا ہوگا ان کا دل ہی جانتا ہے۔ کسی اور کے لئے یہ اندازہ کرنا محال ہے۔

۱۹۵۲ء کے دوران میں مجھے احساس ہوا کہ محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کی طبیعت افسردہ سے افسردہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے وسط اگست میں وزیراعظم صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں بیگم صاحبہ کو اقوام متحدہ کی اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں پاکستانی وفد کی رکنیت قبول فرمانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں۔ وزیراعظم صاحب نے بخوشی منظوری دیدی۔ اور میں نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں تجویز کا ذکر کیا ان کا فوری ردعمل حوصلہ افزا نہ تھا۔

میں نے اس موقعہ پر تو زور نہ دیا لیکن چند دن بعد پھر یاد دہانی کی۔ بیگم صاحبہ نے کوائف دریافت فرمائے اور کسی قدر دلچسپی کا اظہار کیا لیکن ان کی طبیعت پوری طرح مائل نہیں ہوئی۔ میرے تیسری دفعہ حاضر خدمت ہونے پر انہوں نے بہت تامل کے بعد رضامندی دیدی۔ نیویارک میں ان کے لئے بعض سہولتوں کا انتظام کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے فرائض کو پوری توجہ سے بوجہ احسن سرانجام دیا۔

ترکی، لبنان اور شام کا سفر | ۱۹۵۱ء کے اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں مجھے وزیراعظم صاحب کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی کہ ترکی اور شرق اوسط کی حکومتوں کے ساتھ مناسب طریق پر سلسلہ جنبانی کروں کہ ان سب کے وزرائے عظام بشمول پاکستان سال میں ایک بار آپس میں مل لیا کریں تاکہ ایک دوسرے سے جان پہچان ہو جائے اور ہر ایک کے حالات اور مشکلات سے آگہی ہو کر باہمی مشورے اور تعاون کے امکانات پیدا ہوں۔ اور مغربی طاقتوں کے غلبے کے نتیجے میں جو بُعد آپس میں پیدا ہو گیا ہے وہ رفع ہو کر ہمدردی اور اخوت کے احساسات پیدا ہوں۔ یہ کوئی سیاسی منصوبہ نہیں تھا نہ اس کی تہ میں کوئی دھڑے بندی مقصود تھی۔ میرا ذاتی ردعمل اس کی تائید میں تھا کہ اگر ان ممالک کے ارباب حل وعقد سال میں ایک دو بار مل بیٹھنے اور باہمی تبادلہ خیال کرنے پر آمادہ ہو سکیں تو اس اقدام سے خوش آئند نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن میرا احساس تھا کہ سیاسی الجھنوں میں گرفتار سیاسی قائدین اس سادہ سی تجویز کو یا تو کسی گہری سیاسی سازش کی خشت اوّل سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرنے سے اجتناب کریں گے اور یا اسے بیکار اور بے نتیجہ سمجھ کر ٹال دیں گے۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے پر میں نے وزیراعظم صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں کراچی واپس ہوتے ہوئے ترکی، لبنان اور شام میں ٹھہرنے اور اس تجویز کے متعلق ردعمل معلوم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سفر میں محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ڈرائش) جو پاکستانی فارن سروس کے رکن تھے اور جن کا تقرر اقوام متحدہ میں پاکستان کے نائب مستقل نمائندے کے منصب پر ہو چکا تھا میرے ہمراہ تھے۔ پیرس سے روانہ ہو کر ہم استنبول ٹھہرے۔ ہوائی جہاز کے استنبول کے مطار پر اترنے کے وقت فجر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا میں نے ترکی پروٹوکول افسر سے جو ہمارے استقبال کو آئے ہوئے تھے کہا کہ اگر کہیں نماز پڑھنے کے لئے جگہ مل جائے تو ممنون ہوں گا۔ انہوں نے فرمایا مسجد قریب ہی ہے وہیں چلتے ہیں۔ مسجد تھی تو ایک گاؤں میں لیکن عمارت پرانی اور شاندار تھی اور مسجد آباد تھی۔ فجر کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ امام صاحب ایک دیہاتی کو قرآن کریم کا سبق دے رہے تھے۔ میں نے اور محمد اسد صاحب نے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ ترکی میں پہنچتے ہی ایک خوشنما آباد مسجد میں نماز ادا کرنے کا موقعہ میسر آنے پر میں نے بہت خوشی محسوس کی اور یہ احساس استنبول کے قیام میں اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ترکی کے انقلاب اور اتاترک کی اصلاحات کے بعد اسلامی ممالک میں عام تاثر تھا کہ ترکی میں دینی اقدار کا احترام نہیں کیا جاتا۔ میرے مشاہدے نے اسے بالکل غلط بلکہ ایک اتہام ثابت کیا۔ میں نے استنبول میں سب مساجد کو آباد اور نمازوں کے اوقات میں نمازیوں سے بھرا پایا بعد میں ہیگ کے قیام میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ ترک مزدور جو ہالینڈ کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں عیدین

کے مواقع پر بڑی کثرت سے اور بڑے فاصلے طے کرکے نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہوتے ہیں۔ حج کے موقعہ پر بھی میں نے کئی ہزار ترکوں کو مناسک حج ادا کرتے دیکھا ہے۔ ان کی تکبیر "اللہ اکبر" میرے کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ تلفظ کا فرق ممکن ہے لاطینی رسم الخط کے اختیار کرنے کا نتیجہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

استنبول کے قیام کے دوران میں تاریخی عمارات، محلات اور مقامات کی زیارت سے دل کو سرور حاصل ہوا۔ استنبول کی اب وہ شان نہیں جو دارالحکومت ہونے کے زمانے میں تھی۔ ایک افسردگی سی در و دیوار سے ٹپکتی ہے جو زائر کے دل کو بھی افسردہ کرتی ہے۔ استنبول سے انقرہ گئے۔ حکومت کی طرف سے ہر طرح کی تواضع کا سلوک ہوا۔ رہائش کا انتظام سرکاری مہمان خانے میں تھا جو نہایت پُرفضا مقام پر واقع ہے اور جہاں سے انقرہ کا بہت خوشنما منظر نظر آتا ہے۔ برفباری کا موسم تھا مہمان خانے میں ہر قسم کی آسائش میسر تھی۔ باہر کی طرف نظر کرنے سے اندرونی آسائش کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔

ترکی انہی دنوں NATO میں بطور رکن شامل ہوا تھا اور وزیر خارجہ NATO کے اجلاس میں شرکت کے لئے لزبن تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ وزیر اعظم عدنان مندریس (غفراللہ لہ) نے پہلی ملاقات ہی میں بڑی شفقت سے فرمایا کہ وزیر خارجہ کے انقرہ میں موجود نہ ہونے کو میں حسن اتفاق سمجھتا ہوں کیونکہ ایک تو وہ انگریزی نہیں جانتے تمہیں ترجمان کے واسطے سے گفتگو کرنا ہوتی۔ دوسرے انکی عدم موجودگی کی وجہ سے تمہیں سب گفتگو میرے ساتھ کرنا ہوگی جسے میں اپنے لئے خوشی اور فخر کا موجب سمجھتا ہوں میں انگریزی میں اچھی طرح سے بات کر لیتا ہوں اسلئے کسی ترجمان کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تم جب چاہو اور جتنے وقت کے لئے چاہو پوری آزادی سے میرے ساتھ بات چیت کرو۔ چنانچہ میرے انقرہ کے قیام کے دوران میں پانچ دفعہ ہماری ملاقات ہوئی اور ہر دفعہ وزیر اعظم صاحب نہایت دوستانہ رنگ میں پورے انشراح صدر سے بات چیت کرتے رہے۔ میں نے وزرائے عظام کی سالانہ ملاقات کی تجویز کا ذکر کیا تو انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ دو موضوع ایسے تھے جن پر میں نے کسی قدر تفصیل سے وزیر اعظم کی خدمت میں گذارش کی۔ ایک تو یہ کہ ترکی کا یورپ کی طرف ہی متوجہ رہنا اس کے لئے باعث قوت نہیں۔ انہیں ایشیا کی طرف اور خصوصاً مشرق اوسط اور قریب کے اسلامی ممالک کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے اور ان کے ساتھ رابطہ بڑھانا اور مضبوط کرنا چاہیئے۔ دوسرے عرب ممالک اور ترکی کے درمیان اگر کوئی غلط فہمی ہو تو اسے دور کر کے مخلصانہ اور دوستانہ رابطہ قائم ہونے چاہئیں۔ وزیر اعظم صاحب نے ان دونوں مقاصد کے ساتھ اتفاق کا اظہار کیا۔ یہ اظہار محض رسمی یا ٹالنے کی خاطر نہیں تھا۔ ہمسایہ عرب ممالک کے ساتھ باہم تعلقات کے متعلق تو تفصیلی گفتگو فرمائی۔ دونوں طرف کے نقطہ نگاہ پر اظہار رائے کیا۔ غلط فہمی کے اسباب پر تبصرہ فرمایا۔ بعض ضمنی مشکلات کا ذکر بھی کیا۔ آخر فرمایا میری حکومت کو عرب ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے کی طرف خاص توجہ ہے۔ ہمیں اس بارے میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی ہے ہم اپنی سعی کو جاری رکھیں گے اور میں امید کرتا ہوں کہ بتدریج ہمارے تعلقات زیادہ مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر حاضری اور دعاء

میں نے ذکر کیا کہ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر حاضر ہو کر دعاء کرنے کی خواہش ہے۔ فرمایا سب انتظام ہو جائے گا۔ موٹر سے آنے جانے میں زیادہ وقت لگے گا بہتر ہے ہوائی جہاز میں جاؤ۔ صبح جا کر سہ پہر کو واپس آ سکتے ہو۔ چنانچہ ہوائی جہاز کا انتظام کر دیا گیا۔ ہم قونیہ حاضر ہوئے۔ مولانا کے مزار پر فاتحہ کہہ کر اور دعا کر کے ایک دیرینہ آرزو پوری کی فالحمد للہ۔ قونیہ کے میئر صاحب نے ازراہ شفقت دوپہر کے کھانے کی دعوت کی اور ایک قلمی نسخہ فیہ ما فیہ کا عنایت فرمایا۔ فجزاہ اللہ۔

انقرہ سے ہم بیروت گئے، بیروت سے دمشق اور وہاں سے کراچی واپس ہوئے۔ بیروت اور دمشق میں بھی وزرائے خارجہ نے وزرائے عظام کی سالانہ ملاقات کو پسندیدگی کی نگہ سے دیکھا لیکن انقرہ، بیروت، دمشق تینوں جگہ ردعمل رسمی سا تھا۔ جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اگر اس تجویز پر عمل شروع ہو جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس سے کوئی فائدہ مترتب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ پاکستانی سفراء کے ذریعے معلوم ہوا کہ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے اس تجویز کو سراہا گیا ہے۔ عراق کی حکومت اسے ایک مفید اقدام خیال کرتی ہے۔ مصر کی حکومت کی رائے ہے کہ اگر ہندوستان کو شامل کیا جائے تو تجویز کے مفید ہو جانے کا امکان ہے۔ میں نے اپنے تاثرات کی رپورٹ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ خواجہ صاحب نے اس کے متعلق کوئی مزید ہدایت نہ فرمائی اور یہ تجویز اس سے آگے نہ چلی۔

۱۹۵۲ء کے اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں حکومت مصر اور حکومت عراق کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی کہ نیویارک سے پاکستان واپس جاتے ہوئے میں قاہرہ اور بغداد ٹھہروں۔ میں نے دونوں دعوتیں شکریئے کے ساتھ قبول کیں۔ قاہرہ جانے کا تو مجھے متعدد بار پہلے بھی اتفاق ہو چکا تھا لیکن بغداد جانے کا موقعہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ السید فاضل جمالی صاحب وزیر خارجہ عراق کے ساتھ میرے مخلصانہ مراسم تھے اور وہ پہلے بھی مجھے بغداد آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ آدھا ہفتہ بھر یا کم از کم چار پانچ دن بغداد میں قیام کروں لیکن میں دو دن سے زیادہ کا وعدہ نہ کر سکا۔

قاہرہ میں قیام۔ جنرل نجیب کی نجابت

قاہرہ کے مطار پر ہوائی جہاز سے اترنے سے قبل طبی پڑتال پر ہمیشہ کچھ وقت صرف ہوتا ہے۔ جب ہوائی جہاز ٹھہر گیا تو ہم ڈاکٹر صاحب کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے۔ اتنے میں مسافروں میں کچھ ہلچل ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ایک باوقار شخص فوجی وردی میں ملبوس مختصر سی بید کی چھڑی دائیں بغل کے نیچے دبائے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے محمود فوزی صاحب وزیر خارجہ کو بڑے ادب سے آتے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ عالی منزلت جنرل نجیب صدر انقلابی کونسل نے بنفس نفیس پیشوائی کے لئے آنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے فجزاہ اللہ۔ میرے قیام قاہرہ کے دوران میں ہر تقریب پر جنرل نجیب مجھے خود اپنے ہمراہ لے جاتے اور اپنے ساتھ ہی واپس لاتے۔ میں اس تکلیف

فرمائی پر احتجاج کرتا لیکن وہ مسکرا کر فرماتے میں ایسا کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ چونکہ ان سے خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی میں نے ایک موقعہ پر ان سے کہا برطانوی سفیر کہتا ہے:۔

GENERAL NAJIB WILL NOT LAST LONG AS THE HEAD OF GOVERNMENT. HE IS NOT RUTHLESS ENOUGH

(جنرل نجیب زیادہ دیر حکومت کے سربراہ نہیں رہیں گے کیونکہ وہ سخت گیر نہیں)

جواب میں فرمایا جب بغیر گردنیں کاٹنے کے کام چل سکتا ہے تو گردنیں کاٹنے کی کیا ضرورت ہے؟

بغداد میں قیام | قاہرہ سے میں بغداد گیا۔ ہوائی جہاز سے اترتے ہی آغا مصطفےٰ سفیر پاکستان نے مجھے ایک تار دیا جس میں وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے مجھے ہدایت تھی کہ دو مارچ سے پہلے کراچی نہ پہنچوں۔ مجھے اس سے تعجب ہوا اگر ارشاد ہوتا کہ تمہیں باہر گئے عرصہ ہو گیا ہے جلد واپس آؤ تو یہ سمجھ میں آنیوالی بات تھی لیکن یہ ارشاد کہ اپنی غیر حاضری میں کم سے کم اور دو دن کا اضافہ کرو میری سمجھ میں نہ آیا۔ سفیر صاحب سے دریافت کیا آپ اس معمہ کے حل کرنے میں کچھ مدد فرما سکتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا میں خود حیران ہوں اور نہیں جانتا یہ کیا راز ہے! میں نے ان سے کہا کہ وزیر خارجہ عراق میرے بغداد میں دو دن سے زیادہ ٹھہرنے پر مصر تھے لیکن میں نے ان کے اصرار کے باوجود صرف دو دن ٹھہرنے کا وعدہ کیا۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ میں وزیر اعظم کے ارشاد سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک شدید دیرینہ آرزو پوری کر لوں اور دو دن بغداد ٹھہرنے کے بعد آپ اور میں نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ حاضر ہو آئیں۔ سفیر صاحب نے فرمایا میں نے پہلے ہی وزیر خارجہ کی خدمت میں گذارش کر دی ہے کہ آپ بغداد کے قیام کے بعد نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جائیں گے۔

السید نوری سعید وزیر اعظم سے تبادلہ خیالات | بغداد میں السید نوری سعید وزیر اعظم سے ملاقاتیں ہوئیں اور بلا تکلف تبادلہ خیالات ہوا۔ وزیر خارجہ کے دولتکدے پر دیگر زعماء کے علاوہ مجتہد العصر السید محمد الصدر سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ آپ علاوہ عالم متبحر ہونے کے عراقی پارلیمنٹ کے ایوانِ اعلیٰ کے صدر بھی تھے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ وہ فارسی اور اردو میں بھی ویسے ہی بلا تکلف کلام فرماتے تھے جیسے عربی میں۔ ان کی والدہ ماجدہ مدراس سے تھیں۔

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر حاضری اور دعاء | بغداد کے قیام کے دوران میں میں نے کاظمین میں حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر حاضر ہو کر دعاء کرنے کی سعادت حاصل کی اور نقیب اشرف صاحب کی خدمت میں ان کی فرودگاہ پر حاضری کا شرف بھی حاصل کیا۔

نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت اور راجہ صاحب محمود آباد کی مہمان نوازی | نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کے سفر میں رات ہم نے راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں گذاری۔ راجہ صاحب کے ساتھ یہ

میری پہلی ملاقات تھی میں ان کے بلند اخلاق کا گہرا نقش لئے ان سے رخصت ہوا۔ بعد کی ملاقاتوں میں یہ نقش اور بھی گہرا ہوتا گیا۔ بغداد واپسی کے دوران میں بابل کے کھنڈرات دیکھ کر عبرت حاصل کی۔

۱۹۵۳ء کے فسادات اور مارشل لاء | ۲ر مارچ ۱۹۵۲ء کی شام کو کراچی واپس پہنچا تو وزیر اعظم صاحب کے برقی ارشاد کا عقدہ حل ہوا۔ ۱۹۵۲ء کے جماعت احمدیہ کراچی کے سالانہ جلسے میں مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر کا عنوان "اسلام زندہ مذہب ہے" انتخاب کیا۔ جب جلسے کا دن قریب آیا تو بعض عناصر کی طرف سے جلسے کے خلاف اور خصوصاً میرے تقریر کرنے کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ جلسے کے دن تک یہ مخالفت بظاہر ایک منظم صورت اختیار کر گئی۔ میں نے تقریر کی دوران تقریر میں کچھ فاصلے سے شور و شغف کے ذریعے جلسے کی کاروائی میں خلل ڈالنے کی کوشش جاری رہی۔ کچھ آوازے بھی کسے گئے۔ تقریر کے بعد میں اپنے مکان پر واپس آگیا۔ جہاں تک علم ہے گو کسی قدر بدمزگی تو پیدا کی گئی لیکن الحمدللہ کوئی فساد نہیں ہوا۔

وقتاً فوقتاً جماعت احمدیہ کے جلسوں یا دیگر سرگرمیوں کے خلاف مختلف مقامات پر جوش کا مظاہرہ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ جہاں کہیں ایسی صورت پیدا ہوتی رہی جماعت کا ردعمل بفضل اللہ امن پسندی کا رہا۔ جماعت کی طرف سے کبھی خلاف وقار یا موجب اشتعال کاروائی یا حرکت ظہور میں نہیں آئی۔ نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ دو چار روز میں مخالفت کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اس موقعہ پر خلاف معمول ایک تو متعدد عناصر نے مل کر مخالفت کا ایک محاذ قائم کر لیا۔ اور دوسرے مخالفت کا جوش ٹھنڈا پڑنے کی بجائے زور پکڑتا گیا اور بعض دوسرے مقامات پر بھی تائیدی مظاہرے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس محاذ کی طرف سے ایک فہرست مطالبات کی تیار کی گئی اور کثرت سے عوام کے دستخطوں کے ساتھ بذریعہ ڈاک حکومت کو پہنچائی جانے لگی۔ مطالبات کی تعداد تو کوئی نصف درجن تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے دو کو اہم شمار کیا جاتا ہے۔

اوّل یہ کہ جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ دوسرے ظفراللہ خاں کو وزارت خارجہ سے علیحدہ کیا جائے کیونکہ وہ احمدی ہے۔ حقیقت میں دوسرا مطالبہ پہلے مطالبے ہی کا جزو تھا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے نیویارک چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا تو مجھے کوئی ذاتی علم نہیں کیونکہ اس نوع کی بہت کم کوئی خبر مجھے امریکہ پہنچی۔ لیکن واپسی پر معلوم ہوا کہ یہ تحریک بہت زور پکڑ چکی ہے۔

میری طرف سے خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم کی خدمت میں وزارت سے استعفٰی کی پیش کش اور ان کا اسے قبول کرنے سے انکار! | امریکہ جانے سے پہلے بھی اور امریکہ سے واپسی کے بعد بھی میں نے خواجہ ناظم الدین صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ اگر میرے وزارت خارجہ سے علیحدہ ہو جانے سے

آپ کیلئے سہولت ہو جاتی ہے تو میں آپ کی خدمت میں اپنا استعفےٰ پیش کر دیتا ہوں۔ لیکن خواجہ صاحب نے اسے پسند نہ فرمایا بلکہ کہا کہ تمہارے استعفےٰ دینے سے مشکل حل نہیں ہو گی بلکہ اور بڑھے گی۔ جو صورت حالات پیدا کر دی گئی تھی وہ ہر چند مجھ پر گراں تھی لیکن اَقامۃ فی اقام اللّٰہ (جہاں اللہ تعالیٰ کھڑا کرے وہاں قائم رہنا) کا مقدس ارشاد اور فرض کی ادائیگی کا احساس ترک خدمت کے رستے میں روک تھے۔

جب حکومت کو ڈاک کے ذریعے کثرت سے مطالبات بھجوانے سے مقصد حاصل نہ ہوا تو محاذ کی طرف سے فیصلہ کیا گیا کہ حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے راست اقدام کیا جائے اور جمعہ کی نماز کے بعد مساجد سے مطالبات کی تائید میں جلوس نکالے جائیں۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ جوش کراچی اور لاہور میں تھا۔ راست اقدام کی صورت میں اس امر کا بہت امکان تھا کہ مظاہرین اور پولیس کا تصادم ہو جائے یا امن عامہ میں خلل واقعہ ہو۔ اس صورت حالات پر قابو پانے کی تدبیر کے متعلق کابینہ میں اختلاف تھا۔ کثرت رائے اس طرف مائل تھی کہ پیش آمدہ حالات اور ان خطرات کے پیش نظر جو صاف دکھائی دے رہے تھے محاذ کے لیڈران کو حراست میں لے لیا جائے۔ لیکن خود وزیر اعظم صاحب اور ان کے بعض رفقاء اس اقدام کے اس بناء پر مخالف تھے کہ لیڈران محاذ میں بعض علماء بھی شامل تھے جن کا وزیر اعظم صاحب بہت احترام کرتے تھے۔ اس طرح یہ مسئلہ ایک پیچیدہ صورت اختیار کر گیا تھا۔ کابینہ میں اس اختلاف کے رونما ہونے کی وجہ سے وزیر اعظم صاحب نے مجھے وہ برقی ارشاد ارسال فرمایا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے ان کی مراد تھی کہ راست اقدام کی تاریخ سے پہلے میں کراچی نہ آؤں۔ کراچی پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ راست اقدام کی روک تھام کے متعلق تو کابینہ کی کثرت رائے کے مطابق فیصلہ ہو گیا اور کراچی میں کوئی پریشان کن صورت پیدا نہ ہوئی لیکن لاہور کے حالات رو بہ اصلاح ہونے کی بجائے بگڑتے جا رہے ہیں۔ کراچی پہنچنے کے دوسرے دن گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب نے مجھے طلب فرمایا۔ وہ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر سعودی عرب تشریف لیجانے والے تھے اور سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ فرمایا مجھے کل سفر پر روانہ ہونا ہے تفصیلی بات چیت کا موقعہ نہیں تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں کڑی سے کڑی مصیبت برداشت کر لوں گا لیکن اصول کو ہاتھ سے نہیں دوں گا۔ مجھے ابھی پورے حالات سے آگاہی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے الفاظ سے اندازہ ہوا کہ حالات بہت سنجیدہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بعد میں جلد جلد اطلاعات آنے لگیں کہ لاہور میں صورت حالات بہت نازک ہو گئی ہے۔

ان دنوں صوبہ پنجاب کے گورنر آئی۔ آئی۔ چندریگر صاحب تھے اور وزیر اعظم میاں ممتاز محمد خاں صاحب دولتانہ تھے۔ کابینہ کے اجلاس میں لاہور کے حالات پر غور ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں گورنر صاحب پنجاب نے ٹیلیفون پر وزیر اعظم صاحب کو بتلایا کہ لاہور میں حالت خطرناک ہو گئی ہے۔ اور ان کا اور چیف منسٹر کا مشورہ ہے کہ محاذ کے مطالبات قبول کرنے کا فوری اعلان ہونا چاہیئے کیونکہ ان کی رائے میں حالات پر قابو پانے کا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ لاہور کے کئی اداروں پر عوام کا قبضہ ہو گیا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ ان کی یہ گفتگو بھی سنی جا رہی ہے اور ممکن ہے اب وہ وزیر اعظم کے

ساتھ ٹیلیفون پر گفتگو بھی نہ کر سکیں۔ گورنر صاحب کی اطلاع سے وزیر اعظم صاحب نہایت پریشان ہوئے اور کچھ سراسیمگی کے لہجے میں اپنے رفقاء سے فرمایا صاحبان اب کہیئے آپ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے تو اس شورش کے بارے میں کچھ گذارش کرنا ہی نہ تھا مبادا میرا مشورہ کسی رفیق پر گراں ہو یا کسی غلط فہمی کا موجب ہو۔ وزیر اعظم صاحب کے اس استفسار پر ڈاکٹر ایم اے مالک صاحب اور سردار بہادر خاں صاحب نے کسی قدر جوش سے کہا یہ کیسی حکومت ہے جو ملک میں امن قائم رکھنے کے بھی قابل نہیں۔ چودھری محمد علی صاحب اور اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ امن عامہ کے قیام کے لئے مضبوط اقدام کی ضرورت ہے۔ میاں مشتاق احمد خاں گورمانی صاحب راست اقدام کی تحریک کے شروع ہی سے سخت مخالف تھے انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا گورنر صاحب کی طرف سے دوبارہ ٹیلیفون پر حالت اضطراب میں کہا گیا کہ مطالبات کو قبول کرنے کا فوراً اعلان ہونا چاہیئے ورنہ لاہور کا اکثر حصہ آج شام تک نظر آتش ہو کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ وہاں صرف احمدیوں کے مکان اور جائدادیں جلائی جا رہی تھیں۔ کابینہ کی رائے ہوئی کہ جب گورنر صاحب اور ان کی کابینہ اسقدر بے بس ہو چکے ہیں تو معلوم کرنا چاہیئے کہ کیا فوج ان حالات کو ضبط میں لا سکتی ہے؟ سکندر مرزا صاحب کو جو اس وقت وزارت دفاع کے سیکریٹری تھے اور اجلاس میں موجود تھے ہدایت دی گئی کہ فوجی لاسلکی سلسلہ پیغامات کے ذریعہ جنرل اعظم خاں صاحب سے معلوم کریں کہ صحیح صورتِ حالات کیا ہے اور دریافت کریں کہ کیا انہیں امن قائم کرنے میں کسی دقت کے پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ جب سکندر مرزا صاحب کابینہ کی ہدایت کے مطابق جنرل اعظم خاں صاحب سے بات کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو وزیر اعظم صاحب بھی کابینہ کے اجلاس سے چند منٹ کے لئے تشریف لے گئے۔ باقی وزراء سکندر مرزا صاحب کی واپسی کے انتظار میں آپس میں بات چیت میں مصروف رہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد سکندر مرزا صاحب نے واپس آکر اطلاع دی کہ جنرل اعظم خان کہتے ہیں کہ حالات تو ویسے ہی ہیں جیسے گورنر صاحب کی اطلاع سے ظاہر ہے۔ لیکن اگر انہیں ہدایت دیجائے تو فوج ایک گھنٹے کے اندر امن قائم کر سکتی ہے۔ سکندر مرزا صاحب نے فرمایا میں نے جنرل اعظم سے کہدیا ہے کہ وہ مناسب اقدام کریں۔ وزراء سکندر مرزا صاحب کی اطلاع سے مطمئن ہو گئے۔ اتنے میں وزیر اعظم صاحب کابینہ کے اجلاس میں واپس آگئے۔ اور سکندر مرزا صاحب نے ان کی خدمت میں بھی گذارش کر دی کہ انہوں نے جنرل اعظم کو ہدایت دیدی ہے کہ وہ امن قائم کرنے کے لئے مناسب اقدام کریں۔

جیسے جنرل اعظم خاں صاحب نے اندازہ کیا تھا فوج کے شہر میں داخل ہوتے ہی عوام کی مفسدانہ سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور حالات بہت جلد قابو میں آگئے۔ جماعت احمدیہ کو اس عرصے میں ہر قسم کی اذیت کا نشانہ بنایا گیا، طرح طرح کے دکھ دیئے گئے، مال، جائیدادیں تلف ہوئیں، جانوں پر آبنی دو افراد کو زندہ نذر آتش کیا گیا، لیکن بحمد للہ جماعت صبر، تحمل، استقامت اور ثابت قدمی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہی۔

محاذ اپنے مطالبات حکومت سے منوانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مغربی پاکستان کے دو بڑے شہروں کراچی اور لاہور میں جو محاذ کی سرگرمیوں کے مرکز تھے امن عامہ اوّل الذکر شہر میں حکومت کے بروقت اقدام کے نتیجے میں قائم رہا اور موخر الذکر شہر میں صوبائی حکومت کی کمزوری کے نتیجے میں فتنہ فساد کا شکار ہونے کے بعد فوج کے ہاتھوں بحال ہوا۔ لیکن محاذ کی سرگرمیوں کے نتیجے میں نظام حکومت کو ناقابل تلافی ضعف اور نقصان پہنچا۔ رعب اور وقار نظام حکومت کے دو مضبوط ستون ہیں۔ جب یہ ستون کھوکھلے یا کمزور ہو جائیں تو نظام حکومت جلد یا بدیر بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ فتنہ و فساد کا اس حد تک بڑھ جانا کہ امن عامہ کے قیام یا بحالی کے لئے فوج پر انحصار کرنا پڑے اور نظام حکومت فوج کے سپرد کرنا پڑے حکومت کی طرف سے عملاً بے بسی کا اعتراف ہوتا ہے اور یہ تدبیر بار بار عمل میں نہیں لائی جا سکتی میں نے متعدد بار کابینہ کے اجلاس میں توجہ دلائی کہ حکومت کو اس انتباہ سے فائدہ اٹھا کر نظام حکومت کی مضبوطی کی تدابیر پر غور کرنا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر پھر کبھی نظام حکومت فوج کے سپرد کرنے کی نوبت آئی تو وہ سپردگی عارضی نہیں ہو گی۔ فوج کا ردعمل ضرور یہ ہو گا کہ اگر سول حکام نظام حکومت کو قائم رکھنے اور عمدگی سے چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے فوج کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں تو کیوں نہ فوج براہ راست حکومت کی ذمہ داری سنبھالے اور ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے۔

گورنروں کی کانفرنس وزیر اعظم صاحب بھی پیش آمدہ حالات سے یقیناً متاثر ہوئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے رفقاء میں سے بھی کسی نے یا بعض نے انہیں مشورہ دیا ہو کیونکہ انہوں نے گورنروں کی ایک کانفرنس طلب فرمائی جس میں اس وقت کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب اور چیف کمشنر بلوچستان خان قربان علی خاں صاحب کو بھی طلب فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ ملک کی حالت اور اصلاحی تدابیر پر مشورہ کیا جائے۔

ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل کچھ عرصے سے پریشان چلے آ رہے تھے ۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں انہوں نے وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کو دوپہر کے کھانے پر بلایا اور اختتام طعام پر جب خدام فارغ ہو کر کمرے سے رخصت ہو چکے تو آپ نے فرمایا صاحبان میں نے آپ کو آج اسلئے تکلیف دی ہے کہ میں چند امور بطور مشورے کے آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل کابینہ کے اندر وہ باہمی اعتماد اور یک جہتی نہیں جن کے بغیر امور سلطنت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام نہیں دیئے جا سکتے۔ آپ میں سے بعض فرداً فرداً مجھ سے ملتے ہیں اور ملاقات کے دوران میں اپنے بعض رفقاء کے متعلق شکوے کرتے ہیں ان کے فرائض کی سرانجام دہی کے متعلق تنقید کرتے ہیں اور بعض دفعہ ان کے متعلق نا ملائم الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے ملک میں حکومت پر اعتماد کم ہو رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وزراء کا عوام کے ساتھ رابطہ اور میل جول نہیں۔ اسلئے وہ عوام کی ضروریات اور مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے اس ضمن میں گورنر جنرل صاحب نے مشورہ بھی دیا اور کچھ ہدایات بھی دیں۔ خصوصیت سے وزیر اعظم صاحب سے فرمایا کہ آپ اس امر پر غور فرمائیں کہ کیا کابینہ میں ایسی تبدیلی مناسب نہ

ہو گی جس کے نتیجے میں کابینہ یکجہتی اور مضبوطی کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دے سکے۔

گورنر جنرل صاحب کے اس انتباہ پر وزیر اعظم صاحب کی طرف سے کوئی رد عمل نہ ہوا۔ ان دنوں مجھے احساس ہوا کہ گورنر جنرل صاحب اور وزیر اعظم صاحب کے درمیان باہمی کامل اعتماد نہیں۔ جس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں اصحاب کی طبائع میں بہت فرق تھا۔ وزیر اعظم صاحب نے اپنے وقت میں گورنر جنرل کے منصب کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے تھے۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک آئینی گورنر جنرل کے منصب کیلئے بہت موزوں تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب ایک سنجیدہ مزاج، محنتی، مدبر، دور بین اور دور اندیش سیاستدان تھے۔ ہر فیصلہ مناسب مشورے اور غور اور تدبر کے بعد صادر فرماتے تھے۔ گورنر جنرل صاحب کے لئے کوئی امر پریشانی کا باعث نہیں ہوتا تھا۔ کابینہ کے فیصلوں کی اطلاع انہیں ملتی رہتی تھی اور امور حکومت میں انہیں کسی قسم کی دخل اندازی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شومئی قسمت سے نواب زادہ صاحب کی اندوہناک وفات سے یہ توازن گورنر جنرل اور وزیر اعظم کے درمیان قائم نہ رہا نئے گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب باوجود جسمانی عوارض اور صحت کی کمزوری کے فعّال طبع تھے اور نئے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین صاحب کی طبع عافیت پسند تھی۔ طبائع کے اختلاف کی وجہ سے یکجہتی مشکل تھی۔ آہستہ آہستہ اعتماد بھی کم ہونا شروع ہو گیا۔ وزیر اعظم صاحب نے مشاورتی کانفرنس طلب کرنے کے متعلق گورنر جنرل صاحب سے مشورہ کیا نہ ان کے ساتھ ذکر ہی کیا کہ کانفرنس طلب کی جا رہی ہے۔ جب گورنر جنرل صاحب کو علم ہوا کہ گورنر صاحبان کی کانفرنس بلائی جا رہی ہے اور انہیں اطلاع تک نہیں تو انہوں نے وزیر اعظم صاحب سے دریافت کیا اور وزیر اعظم صاحب نے اس امر کی تصدیق فرمائی۔ جس پر گورنر جنرل صاحب نے فرمایا کہ گورنر صاحبان کی کانفرنس کی صدارت گورنر جنرل کو کرنی چاہیئے۔ وزیر اعظم صاحب نے کہا ہم تو گورنر صاحبان کو اطلاع دے چکے ہیں کہ ہم ملک کے حالات پر ان سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہم نے دعوت دی ہے تو لازم ہے کہ کانفرنس کی صدارت بھی ہم کریں۔ اس پر گورنر جنرل نے فرمایا بہت اچھا لیکن کانفرنس کے لئے گورنر جنرل ہاؤس ہی موزوں ہے۔ آپ بیشک کانفرنس کی صدارت فرمائیں ہم بھی موجود رہیں گے تاکہ ہمیں بھی ملک کے حالات سے اور کانفرنس کے مشورے سے آگاہی ہو۔ میرا قیاس ہے کہ انہی ایام میں گورنر جنرل صاحب کے ذہن میں کابینہ میں تبدیلی کا منصوبہ معین صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے وزیر اعظم صاحب کے اس اقدام نے کہ انہوں نے گورنر صاحبان کی کانفرنس طلب فرمائی اور گورنر جنرل صاحب سے اس کا ذکر تک نہ کیا گورنر جنرل صاحب کے عزم کو پختہ کر دیا ہو۔ میری طبیعت پر اس وقت یہ تاثر تھا کہ گورنر جنرل صاحب اس بات سے آزردہ ضرور ہوئے کہ کانفرنس طلب کی گئی اور ان سے ذکر تک نہ کیا گیا۔ کانفرنس تین دن جاری رہی۔ مختلف آراء کا اظہار ہوا۔ کمانڈر انچیف صاحب نے بڑی وضاحت سے فرمایا کہ حکومت کا رعب اور احترام بہت کم ہو گیا ہے حکومت کی مضبوطی کے لئے مناسب اقدام ہونا چاہیئے۔ خان قربان علی خاں صاحب نے فرمایا گول مول باتیں ہو رہی ہیں صاف بات یہ

ہے کہ کابینہ نئے سرے سے تشکیل ہونی چاہیئے۔ اس پر وزیر اعظم صاحب نے کچھ برافروختہ ہو کر دریافت فرمایا یہ کس کی رائے ہے؟ کیا سرکاری افسران کی؟ خان قربان علی خاں صاحب نے بھی کچھ اسی لہجے میں جواب دیا بیشک سرکاری افسران کی لیکن ان کے علاوہ گورنر صاحبان کی وزراء کی اور ہر ایک کی! سب یہاں موجود ہیں آپ دریافت فرمالیں۔ کانفرنس میں اظہار رائے تو بیشک ہوا لیکن کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کانفرنس کے اجلاس بدھ کے روز ختم ہونے کے بعد جمعہ کی صبح کو جب حسب معمول وزیر اعظم صاحب گورنر جنرل صاحب کی ملاقات کے لیئے تشریف لے گئے تو گورنر جنرل صاحب نے ان سے فرمایا میں چاہتا ہوں آپ کابینہ کا ایک اجلاس میری رہائش گاہ پر کل صبح دس بجے کریں میں اس اجلاس میں ایک اہم امر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر وزیر اعظم صاحب نے فرمایا میں آج شام مسلم لیگ کے انتخابات کے سلسلے میں حیدرآباد جا رہا ہوں کل شام واپس آجاؤں گا یا تو یہ اجلاس پرسوں صبح ہوسکتا ہے اور یا پھر آج چار بجے بعد دوپہر ہو جائے۔ گورنر جنرل صاحب نے فرمایا آج ۴ بجے مناسب ہوگا۔ اسی صبح کابینہ کا اجلاس بھی تھا۔ وزیر اعظم صاحب نے اجلاس کے شروع ہی میں فرمایا صاحبان گورنر جنرل صاحب آج سہ پہر چار بجے کابینہ کا اجلاس اپنی رہائش گاہ پر چاہتے ہیں۔ وہ کسی اہم امر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سب صاحبان ۴ بجے وہاں تشریف لے آئیں۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب شاہ عراق کی تاجپوشی کے جشن میں بحیثیت قائد وفد پاکستان شمولیت کے لئے بغداد تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے ضروری ٹیکے کروائے تھے جس کے نتیجے میں وہ کچھ حرارت محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے وزیر اعظم صاحب سے رخصت چاہی کہ وہ اپنی فرودگاہ پر جا کر آرام کریں۔ وزیر اعظم صاحب نے انہیں رخصت دینے کے ساتھ کہا ۴ بجے گورنر جنرل صاحب کے ہاں حاضری نہ بھولیئے۔ سردار صاحب نے فرمایا اگر تکلیف بڑھ گئی تو ضرور حاضر ہوں گا۔ انہی دنوں مسٹر پال ہوفمین جو اس زمانے میں فورڈ فونڈیشن کے صدر تھے دلی سے ہوتے ہوئے کراچی تشریف لائے تھے اور گورنر جنرل صاحب سے ملے تھے۔ وزیر اعظم صاحب کا خیال تھا کہ مسٹر ہوفمین کوئی ایسا پیغام لیکر آئے ہیں جس کا ذکر گورنر جنرل صاحب وزراء صاحبان سے کرنا چاہتے ہیں۔

ناظم الدین کابینہ کی برطرفی

کابینہ کا اجلاس ختم ہونے پر میں مکان پر واپس آگیا اور ۴ بجے گورنر جنرل صاحب کی فرودگاہ پر حاضر ہو گیا۔ وزیر اعظم صاحب سردار عبدالرب نشتر صاحب اور باقی سب وزراء بھی موجود تھے۔ گورنر جنرل صاحب تشریف لائے۔ عام طور پر سوائے رسمی تقریبات کے وہ لباس کے متعلق خاص احتیاط نہیں فرمایا کرتے تھے لیکن اس دن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لباس کے متعلق بھی پوری احتیاط کے ساتھ تیاری کر کے تشریف لائے ہیں۔ بیٹھتے ہی فرمایا صاحبان میں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کی اسلئے تکلیف دی ہے کہ مجھے آپ سے ایک نہایت اہم بات کہنی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال گرمیوں میں میں نے آپ صاحبان کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ ملک میں حکومت پر اعتماد کم ہو رہا ہے اور میں نے مشورہ دیا تھا کہ وزیر اعظم صاحب کابینہ میں یکجہتی اور مضبوطی پیدا کرنے کے لئے مناسب اقدام کریں اور اس غرض کے لئے کابینہ میں تبدیلی پر غور کریں لیکن میری بات پر توجہ نہ کی گئی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے گورنروں کی کانفرنس کے

دوران میں جو کہا گیا آپ سب صاحبان نے سنا۔ میری دانست میں کابینہ کا نئے سرے سے تشکیل ہونا لازم ہے اور اس میں مزید تاخیر نہیں ہوسکتی۔ وزیراعظم صاحب! میں آپ کی کابینہ کا استعفیٰ طلب کرتا ہوں تاکہ نئی کابینہ تشکیل دی جائے۔

وزیراعظم صاحب :۔ میں نہیں سمجھتا ہم کیوں استعفے پیش کریں۔ اسمبلی کا اجلاس چند دن ہوئے ختم ہوا ہے۔ اسمبلی نے کابینہ کے پیش کردہ بجٹ کی منظوری دیدی ہے۔ اسمبلی میں کابینہ کو کثرت کی تائید حاصل ہے۔ آپ کو بیشک کابینہ کو موقوف کرنے کا اختیار ہے۔ کیا آپ ہمیں موقوف کرنا چاہتے ہیں؟

گورنر جنرل صاحب :۔ میں کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں آپ سے استعفیٰ طلب کرتا ہوں۔

وزیراعظم صاحب :۔ اور اگر میں انکار کروں؟

گورنر جنرل صاحب :۔ تو پھر مجھے کوئی اور رستہ تلاش کرنا ہوگا۔ وزیر خارجہ تم کیا کہتے ہو؟

ظفراللہ خاں :۔ میرا قلمدان حاضر ہے۔

گورنر جنرل صاحب :۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب آپ کیا فرماتے ہیں؟

سردار عبدالرب نشتر صاحب :۔ وزیراعظم نے جو کچھ فرمایا ہے ساری کابینہ کی طرف سے فرمایا ہے فرداً فرداً دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔

گورنر جنرل صاحب :۔ تو اچھی بات صاحبان میں آپ حضرات کو موقوف کرتا ہوں مجھے اس امر کا بہت افسوس ہے۔ خدا حافظ!

اتنا فرمایا اور کمرے سے تشریف لے گئے۔ گورنر جنرل صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد ہم سب بھی کمرے سے باہر نکلے کابینہ کا اجلاس دس منٹ جاری رہا ہوگا۔ ہر فرد یقیناً اپنے لئے نہیں لیکن ملک کے لئے ضرور ہراساں تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وزیراعظم صاحب اور فضل الرحمٰن وزیر تجارت آگے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب اور میں ان کے پیچھے تھے اور ہمارے باقی رفقاء ہم سے پیچھے تھے۔ جب وزیراعظم صاحب ڈیوڑھی میں پہنچے تو انہیں دیکھ کر گورنر جنرل کے ایڈی کانگ نے موٹروں کو بلانا شروع کیا ہم سب ڈیوڑھی ہی میں رک گئے۔ میں نے سردار صاحب سے کہا کہ اگر میرے وزارت چھوڑنے سے مشکل حل ہوسکتی تھی تو میں نے تو اپنا قلمدان پیش کر دیا تھا۔ سردار صاحب نے فرمایا۔ معلوم نہیں ان کے ذہن میں کیا ہے۔ اتنے میں موٹریں آنا شروع ہوگئیں وزیراعظم صاحب نے وزیر تجارت کو اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا انہوں نے فرمایا آپ تشریف لے چلیں میں ابھی آتا ہوں۔ میں مکان پر واپس آیا اور وضو کر کے نفل پڑھنے لگ گیا اور دعا میں مصروف ہوا۔ الٰہی یہ وقت ملک اور قوم کیلئے نہایت نازک ہے۔ تو اپنے فضل و رحم سے وہی صورت پیدا کر دے جو تیرے علم میں تیرے بندوں کے لئے سب سے مفید اور بابرکت ہو۔ فارغ ہوا تو دیکھا کہ ملازم کمرے میں کھڑا ہے

میں نے اشارے سے دریافت کیا کیا بات ہے؟ اس نے کہا تین وزیر صاحبان تشریف لائے ہیں۔ میں نیچے گیا تو دیکھا کہ چودھری محمد علی صاحب، میاں مشتاق احمد گورمانی صاحب اور سردار بہادر خاں صاحب دفتر کے کمرے میں میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ چودھری محمد علی صاحب ٹیلیفون پر کسی سوال کے جواب میں بتا رہے تھے کہ اس وقت کمرے میں کون کون صاحب ہیں۔ ٹیلیفون بند کرکے وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ہم سب کو گورنر جنرل صاحب نے طلب فرمایا ہے۔

نئی کابینہ کی تشکیل

ہمارے حاضر ہونے پر گورنر جنرل صاحب نے فرمایا صاحبان میں نے چودھری محمد علی بوگرہ کو نئی کابینہ بنانے کو کہا ہے (وہ ان دنوں امریکہ میں سفیر تھے اور وزارت خارجہ سے بعض امور کے متعلق مشورے کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے) محمد علی بوگرہ صاحب نے ہم چاروں کو وزارت میں شامل ہونے کی دعوت دی اتنے میں سر گلبرٹ لیتھویٹ برطانوی ہائی کمشنر گورنر جنرل کو ملنے کے لئے آئے۔ اور گورنر جنرل صاحب ان سے ملنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ واپس آکر گورنر جنرل صاحب نے بتایا کہ ہائی کمشنر صاحب کہتے ہیں کہ انہیں خواجہ ناظم الدین نے طلب فرمایا اور کہا کہ گورنر جنرل نے کابینہ کو باوجود اس کے کہ کابینہ کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہے موقوف کر دیا ہے ان کا یہ فعل خلاف آئین ہے اور آئین کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ مستوجب معزولی ہیں وہ بحیثیت وزیراعظم ملکہ معظمہ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس فعل کی وجہ سے گورنر جنرل کو ان کے منصب سے علیحدہ کیا جائے۔ ان کی یہ درخواست ملکہ معظمہ کی خدمت میں پہنچا دی جائے۔ میں نے کہا میں پاکستان میں ملکہ برطانیہ کا نمائندہ ہوں یہ معاملہ پاکستان سے متعلق ہے اور ملکہ پاکستان کی خدمت میں عرضداشت پیش کرنے کا ذریعہ پاکستان ہائی کمشنر متعینہ لندن ہیں۔ آپ ان کے ذریعے اپنی گذارش ملکہ پاکستان کی خدمت میں بھیج دیں کیونکہ میں یہ خدمت بجالانے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وزیراعظم صاحب کی خدمت سے رخصت ہو کر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ آپ کو اس گفتگو سے مطلع کردوں۔ اس اثناء میں نئی وزارت کی تشکیل جاری رہی۔ ڈاکٹر اے ایم مالک صاحب کو طلب کیا گیا اور انہیں کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے دعوت قبول فرمائی لیکن فرمایا میں ابھی ابھی خواجہ ناظم الدین کے پاس سے آیا ہوں۔ مناسب ہے کہ میں انہیں جاکر مطلع کردوں کہ میں نے کابینہ میں شامل ہونا منظور کرلیا ہے میں یہ بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ بعض لیبر لیڈروں سے اس مرحلے پر بات چیت کرکے ان کا رد عمل کابینہ کی برطرفی کے متعلق معلوم کروں اور نئی کابینہ کے متعلق انہیں اطمینان دلادوں تاکہ بے خبری میں ان کی طرف سے کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو حکومت کے لئے پریشانی کا موجب ہو۔ چنانچہ وہ تشریف لے گئے اور آٹھ بجے شام تک واپس آنے کا وعدہ کر گئے۔ اے کے بروہی صاحب کو طلب کیا گیا ان کی طرف سے جواب ملا کہ انہیں خواجہ ناظم الدین صاحب نے طلب فرمایا ہے اور وہ ان کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور بتایا کہ خواجہ صاحب نے ان سے دریافت فرمایا کہ آئین کے رو سے گورنر جنرل صاحب کا اقدام کہاں تک درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایکٹ کے

الفاظ کی رو سے تو انہیں اختیار ہے لیکن اگر اسباب پر رائے درکار ہے کہ روایتاً ان الفاظ کی کیا تعبیر کی جاتی رہی ہے تو اس کیلئے انہیں مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لئے کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوں گے۔ بیرسی صاحب کو بھی کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اشتیاق حسین صاحب قریشی کو دوبارہ کابینہ میں شامل کیا گیا۔ خان عبدالقیوم خاں صاحب کانفرنس میں شمولیت کے بعد واپس پشاور تشریف لے جارہے تھے۔ لاہور پہنچنے پر انہیں سٹیشن پر جنرل اعظم خاں نے پیغام دیا کہ وہ فوجی ٹیلیفون پر گورنر جنرل صاحب کے ساتھ بات کریں۔ انہیں بھی وزارت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی جسے انہوں نے منظور کر لیا اور وہ لاہور سے ہی کراچی واپس تشریف لے آئے۔ غرض چار گھنٹے کے اندر ایک کابینہ کی برطرفی اور دوسری کی تشکیل عمل میں آگئی۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کی کابینہ کی برطرفی کا اعلان فوراً ریڈیو پر ہو گیا تھا۔ آٹھ بجے شام چوہدری محمد علی بوگرا صاحب کی کابینہ نے حلف لیا اور نئی کابینہ کا اعلان ہو گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا ایک منذر خواب اور حضورؓ کی طرف سے صدقہ کی تحریک

۱۹۵۳ء کے آخر میں میں ابھی نیویارک ہی میں تھا کہ مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا تار ملا جس میں ارشاد تھا کہ فوراً کچھ صدقہ دیدو اور جب واپسی کے سفر پر روانہ ہونے لگو تو اس وقت بھی صدقہ دے دینا۔ میں نے اسی وقت تعمیل کر دی مجھے اندازہ ہوا کہ حضورؓ نے کوئی منذر خواب دیکھا ہے۔ چند دن بعد حضور کا والا نامہ ملا۔ جس میں حضورؓ نے اپنے ایک خواب کا ذکر فرمایا۔ حضورؓ نے دیکھا کہ خاکسار کا عریضہ حضورؓ کی خدمت میں موصول ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ جس ہوائی جہاز میں خاکسار سفر کر رہا تھا اسے آگ لگ گئی اور جہاز ایک جزیرے پر گرا۔ حضورؓ نے تحریر فرمایا خواب میں مجھے حیرانی بھی ہوئی کہ یہ حادثہ بھی ہوا اور خود ہی یہ تفصیل بھی لکھ رہا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بچالیا ہے۔ نیز یہ تحریر فرمایا کہ دو تفاصیل ذہن میں رہ گئی ہیں ایک یہ کہ جس وقت حادثہ ہوا اس وقت ہوائی جہاز کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف تھا اور دوسرے یہ کہ پائیلاٹ کے نام میں محمد شامل تھا غالباً غلام محمد یا کوئی ایسا نام تھا اور وہ بھی بچ گیا۔ تمہارا واپسی کا سفر تو مغرب سے مشرق کی طرف ہو گا لیکن خواب تعبیر طلب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ میں نے سفر پر روانگی سے پہلے بھی صدقے کا انتظام کر دیا۔

شہنشاہ ایران کی خدمت میں باریابی

واپسی کے سفر میں پہلے تو میں دمشق ٹھہرا، دمشق سے حکومت ایران کی دعوت کی تعمیل میں تہران گیا، تہران میں اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اس زمانے میں آقائے حسین اعلیٰ جو واشنگٹن میں سفیر ایران رہ چکے تھے اور ایک روشن دماغ سیاستدان اور مدبر تھے اور مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے وزیر بارگاہ تھے۔ حاضری کے وقت مجھ سے فرمایا اعلیٰ حضرت تمہیں نیویارک میں مل چکے ہیں اور تمہاری نسبت بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش تمہارے ساتھ علیحدگی میں بات چیت کرنے کی ہے۔ میں تمہیں پیش کرنے کے بعد واپس آجاؤں گا۔ کھانے پر بھی تمہارے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہوگا۔ تم

آزادی سے بات چیت کر سکوگے۔ میری حاضری اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ساڑھے بارہ بجے تھی اور یہ ملاقات دو گھنٹے سے زائد رہی اعلیٰ حضرت بالکل بے تکلفانہ گفتگو فرماتے رہے۔ ان دنوں ڈاکٹر مصدق پر فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا میں نے آج ہی صدر عدالت کے نام مراسلہ بھیجا ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ڈاکٹر مصدق کے خلاف کوئی الزام عائد نہیں کرتا۔ عدالت کے روبرو جو واقعات میری ذات کے متعلق بیان کئے گئے ہیں عدالت اپنے فیصلے پر پہنچنے میں انہیں بالکل نظرانداز کر دے۔ حین امور پر بھی گفتگو رہی نہایت دلچسپ رہی۔

جنرل زاہدی وزیراعظم ایران سے ملاقات | ان دنوں ایران کے وزیراعظم جنرل زاہدی تھے انہوں نے بھی مجھے اپنی ملاقات سے نوازا اور بہت تواضع سے پیش آئے قصر گلستاں میں تختِ طاؤس، ہیرے جواہرات خلعتیں، لباس فاخرہ، مرصع اور غیر مرصع قالین اور فنونِ لطیفہ کے بے شمار دل لبھانے والے شاہکار دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی! دربند ہوٹل کے برآمدے سے برف کا نظارہ نہایت خوشنما تھا۔ اتفاق سے سورج نکل آیا برف اور زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ آقائے عبدالحمید عرفانی جو پاکستانی سفارت خانے میں تمدنی سیکرٹری تھے نہایت تواضع سے پیش آئے اور اپنے حلقہ ہائے علم و رسوخ میں مجھے متعارف کرایا فجزاہ اللہ۔ میاں نسیم حسین صاحب مرحوم (غفر اللہ لہٗ وجعل الجنۃ العلیا مثواہ) ان ایام میں طہران میں پاکستانی سفارت خانے کے سربراہ تھے انکی صحبت بڑی پر لطف رہی۔

اصفہان اور شیراز کا سفر | اصفہان اور شیراز دیکھنے کا اشتیاق تھا سردی کی شدت تھی۔ برفباری ہو رہی تھی حکومت کی طرف سے مشورہ دیا گیا کہ ہوائی جہاز سے سفر آسانی سے اور آرام سے ہو سکے گا اور ہوائی جہاز مہیا کرنے کی پر خلوص پیشکش کی گئی۔ لیکن میں نے موٹر کا سفر اسلئے پسند کیا کہ رستے میں بھی کچھ دیکھنے کا موقعہ میسر آئیگا۔ حکومت کی طرف سے سب انتظام خاطر خواہ طور پر کر دیا گیا۔ میاں نسیم حسین صاحب مرحوم اور آقائے عبدالحمید عرفانی میرے ہمراہ تھے۔ وزارت خارجہ کی طرف سے آقائے صحرائی ہمسفر تھے۔ حکومت کی کار کے علاوہ پاکستانی سفارت خانے کی کار بھی ساتھ تھی۔ یہ سفر بہت لطف میں کٹا۔ قسم تک سڑک بالکل صاف تھی۔ اس سے آگے سڑک پختہ تو تھی لیکن شمالی حصے میں برف کی وجہ سے اور جہاں برف نہیں تھی سنگریزوں کی وجہ سے موٹر چلانے والوں کو احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ مگر ہمیں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہ ہوا۔ فالحمد للہ۔ لب سڑک کے چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں ایرانی دیہاتی معاشرت کی کچھ جھلک بھی نظر آتی تھی۔

اصفہان | اصفہان اپنی طرز کا یکتا شہر ہے۔ محلات کی تو کوئی ایسی خصوصیت نظر نہ آئی۔ چہل ستون بیشک قابل دید ہے لیکن بعض مساجد عجائب روزگار ہیں۔ بیگمات کی مسجد کی کہیں نظیر نہیں ملے گی۔ شہر کا وسطی میدان

اپنی طرز میں گویا وینس کے سان مارکو چوک کی حیثیت رکھتا ہے۔ بازار نہایت خوشنما ہے۔ زندہ رود کا دومنزلہ پُل ایک تاریخی یادگار ہے۔

پارس گارد شاہ خورس کا مقبرہ | اصفہان سے شیراز جاتے ہوئے موسم جلد خوشگوار ہو گیا۔ آقائے عرفانی ایران کی تاریخ اور تمدن کا بسیط فرہنگ ہیں۔ موٹر تیز ہو تی تھی اور عرفانی صاحب "ایرانیات" کے ساتویں آسمان پر اس سے بھی زیادہ سرعت سے محوِ پرواز تھے۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا آپ بتا سکتے ہیں شاہ خورس کی قبر کہاں ہے؟ عرفانی صاحب چونکے اور ایک لحظہ توقف کے بعد دائیں ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ بس یہیں تو ہے کیا آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے خیال کیا عرفانی صاحب یا تو حواس کھو بیٹھے ہیں یا پھر کوئی بڑے جادوگر ہیں کہ میرے دفعتہً شاہ خورس کی قبر کے متعلق پوچھنے پر انہوں نے فوراً اس تاریخی عمارت کو موٹر کی بائیں جانب لا کھڑا کیا ہے۔ موٹر تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا ہاں ہاں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ عرفانی صاحب نے ڈرائیور کو موٹر ٹھہرانے کو کہا اور جب موٹر رک گئی تو ڈرائیور سے کہا واپس چلو۔ کوئی دو فرلانگ واپس ہو کر موٹر ٹھہرائی اور کہا اتر یئے۔ ہم اترے لیکن کسی عمارت یا عمارت کے کھنڈرات کا کہیں کوئی نشان تک نہ تھا۔ البتہ سڑک کے کنارے پر یہاں سے ایک پگڈنڈی نکلتی تھی ایک چھوٹی سی تختی ایک ڈنڈے کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ عرفانی صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا یہ ہے! میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا پارسگارد! میں نے توجہ سے دیکھا تو بیشک تختی پر مدھم سا کچھ لکھا ہوا تھا جسے پارسگارد بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ آخر عرفانی صاحب نے یہ عقدہ کشائی کی کہ پارسگارد شاہ خورس کے مقبرے کا نام ہے جو سڑک سے دو میل کے فاصلے پر ہے اور یہی پگڈنڈی مقبرے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

عرفانی صاحب نے پوچھا آپ چلیں گے؟ میں نے کہا ضرور چلوں گا۔ اگر موٹر جا سکتی ہے تو موٹر پر جائیں گے ورنہ پیدل چلیں گے عرفانی صاحب نے فرمایا موٹر جا سکتی ہے البتہ رستے میں ایک چھوٹی سی ندی ہے کوئی ایسی گہری نہیں لیکن اگر اس میں پانی زیادہ ہوا تو موٹر کو وہاں رکنا پڑے گا۔ مقبرہ ندی کے پار کوئی پون میل پر ہے میں نے کہا چلیئے ندی پر پہنچ کر آگے جانے کی ترکیب کر لیں گے۔ لیکن میں حیران ہو رہا تھا کہ تاریخ کی ایک عظیم مملکت کا بانی، فاتحین کے سلسلے میں ایک نہایت نیک شہرت کا مالک جس کی ذات پر ایران کو بجا طور پر فخر ہے اس کی قبر کی نشان دہی ایک حقیر سی تختی کرتی ہے اور قبر تک پہنچنے کا رستہ ایک پگڈنڈی ہے جو ایک ندی پر جا کر ختم ہو جائے گی! موٹر آسانی سے ندی تک چلی گئی۔ ندی بظاہر پایاب تھی اور پگڈنڈی کا نشان ندی کے اس پار بھی دکھائی دیتا تھا۔ ڈرائیور نے موٹر پانی میں ڈالی اور بغیر کسی مشکل کے ہم ندی کے پار پہنچ گئے اور چند منٹوں میں موٹر ہمیں مقبرے کے احاطے کی تین فٹ اونچی دیوار تک لے گئی۔ دیوار کے اندر صحن بالکل اجاڑ تھا اور مقبرے کی عمارت جو دو منزلہ تھی بالکل خستہ حالت میں تھی۔ اینٹیں گری ہوئی چونا اکھڑا ہوا نہ مجاور نہ پاسبان۔ میں اینٹوں اور پتھروں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر کی منزل تک پہنچا، یہاں بھی ویرانی کا وہی عالم تھا۔ کمرے کے اندر تعویذ کا نشان نظر آتا تھا لیکن

بھیڑوں نے وہاں چھتہ بنا رکھا تھا۔ میں اندر داخل نہ ہوا۔ باہر سے ہی دعا کر کے پھر اینٹوں اور پتھروں کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ میرے ساتھی نیچے میرے انتظار میں رہے۔ یہ اسی شاہ خورس کا مقبرہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں سورہ کہف کے آخری رکوع میں ذوالقرنین کے نام سے آتا ہے! واپسی پر ہماری موٹر ندی کے درمیان ایک پتھر پر اٹک گئی۔ اتنے میں آغائے صحرائی سرکاری موٹر میں ہمارا تعاقب کرتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ کر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جب دیکھا کہ ہماری موٹر رک گئی ہے تو لگے سر کے بال نوچنے کہ اب کیا ہوگا۔ ہونا کیا تھا ہم نے جوتے اور جرابیں اتار لیں پتلونیں اوپر کھینچ لیں جوتے جرابیں ایک ہاتھ میں لئے دوسرے ہاتھ سے پتلونیں تھامے پایاب دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ آغائے صحرائی کی جان میں جان آئی۔ پانچ چھ دہقانوں کو جمع کیا جن کی ہمت سے موٹر ندی سے نکل آئی اور ہم نے شاہراہ پر واپس پہنچ کر اپنا راستہ لیا۔

تخت جمشید | ابھی شیراز اندازاً ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا کہ سڑک بائیں طرف مڑی اور یکا یک ایک حیرت انگیز منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا۔ پہاڑ کے دامن میں سڑک سے ۳۰ یا ۴۰ فٹ کی بلندی پر ایک وسیع ہموار مرتفع میدان تھا جس میں بڑے بڑے بلند ستون تھے اور ان کے ارد گرد وسیع عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات تھے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مقام قرون اولیٰ میں کسی نہ بردست طاقت کا پایۂ تخت ہوگا۔ عرفانی صاحب نے بتایا کہ یہی وہ مقام ہے جو تختِ جمشید کے نام سے اپنے زمانے میں شہرہ آفاق تھا۔ شاہ خورس کی سلطنت ایران سے بحیرہ اسود، درہ دانیال، بحیرہ متوسط اور مصر کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے نے جو ان کا جانشین ہوا اسے اور بھی وسعت دی وہ ایک مہم سے واپس آ رہا تھا کہ ایشیائے کوچک میں ایک مقام پر اس کا گھوڑا بدکا اور اسے گرا دیا گرتے ہوئے اس کا اپنا خنجر اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ اور وہ ہلاک ہو گیا۔ وہ بے اولاد تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی اس کا وارث ہوا جس کی اولاد نے کئی پشتوں تک حکومت کی۔ تخت جمشید انہیں کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ تھا۔ اس خاندان کا آخری حکمران دہ دارا تھا جسے سکندر اعظم نے شکست دیکر اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر نے تخت جمشید کو آگ سے تباہ کرنے کی کوشش کی لیکن اگر یہ صحیح بھی ہو تو سکندر کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ تخت جمشید کے کھنڈرات آج ۲۴۰۰ سال بعد بھی شاہ خورس کے جانشینوں کی عظمت کی موثر یادگار ہیں۔ ہم نے دو تین گھنٹے تخت جمشید کے دیکھنے میں صرف کئے۔ ایرانی محکمہ آثار قدیمہ کے افسر متعینہ تخت جمشید نے ہماری تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ فجزاہ اللہ۔ ان کا عرفانی صاحب کے ساتھ گہرا دوستانہ تھا۔ ہمیں ان سے بہت سی معلومات ہوئیں۔ لیکن ہمیں سخت افسوس رہا کہ ہم تخت جمشید جیسے مقام پر صرف چند گھنٹے ہی ٹھہر سکے۔ تخت جمشید دیکھنے کے لئے کم سے کم تین دن وہاں قیام کرنا لازم ہے لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا۔

شیراز | تخت جمشید سے روانہ ہوئے تو شیراز پہنچنے کے اشتیاق نے جذبات میں تلاطم برپا کر دیا۔ سعدی اور حافظ! رکن آباد اور گلگشتِ مصلیٰ بیساختہ یہ شعر زبان پر آگیا۔

خوشا شیراز و وضع بے مثالش ❊ خداوندا نگہ دار از زوالش!

شہر میں داخل ہونے سے پہلے عرفانی صاحب نے فرمایا سڑک کی دائیں جانب جو آب جو ہے یہی رکن آباد ہے۔ تخیل کو ایک جھٹکا لگا لیکن ہم نے حقیقت پر تخیل کی حکمرانی کو مسلط رکھنے کا فوری فیصلہ کیا اور رکن آباد کی وہی تصویر اپنے ذہن میں رکھی جو چالیس پینتالیس سال سے ذہن میں تھی الحمدللہ کہ تخیل مزید ایسے صدمات سے محفوظ رہا۔ سعدی اور حافظ کے مقبرے جدید لیکن دلکش طرز پر تعمیر کئے گئے ہیں اور دونوں کے گرد خوشنما چمن آراستہ ہیں۔ شہر بھی صاف ستھرا اور آراستہ ہے آب و ہوا سال بھر معتدل اور خوشگوار رہتی ہے۔ ہم دو رات کے قیام کے بعد شیراز کی زیارت سے شاداں اور اسقدر جلد واپس ہو جانے سے افسردہ لوٹے

خداوندا نگہ دار از زوالش!

تہران واپسی پر آقائے عرفانی نے مجھے ایک مختصر انتخاب دیوان مولانا رومؒ اور ایک نسخہ رباعیات بابا طاہر عنایت فرمائے فجزاہ اللہ۔

شاہ حسین اور ان کی حکومت کی طرف سے اردن آنے کی دعوت | تہران میں اردن کے سفیر تشریف لائے اور فرمایا میری حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت موصول ہوئی ہے کہ میں اسکی طرف سے آپ کو یہاں سے دمشق واپس جانے پر اماں آنے کی دعوت دوں۔ میں نے عذر کیا کہ مجھے اب جلد کراچی پہنچنا ہے۔ دوسرے دن وہ پھر تشریف لائے اور فرمایا میں نے تمہارا عذر اماں پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں تمہیں جلالۃ الملک کا ذاتی پیغام پہنچاؤں کہ ان کی خواہش ہے کہ تم اس موقعہ پر اماں ضرور آؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو سوائے تعمیل ارشاد کے کوئی چارہ نہیں میں ضرور حاضر ہوں گا۔

تہران کا مطار اس زمانے میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ رات کے وقت ہوائی جہازوں کے اترنے چڑھنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ تہران سے مشرق کی سمت کوئی پرواز نہیں جاتی تھی۔ مغرب کی سمت سے جو جہاز آتے تھے دن کے وقت تہران پہنچتے تھے اور ایک دو گھنٹے ٹھہر کر دن ہی کو واپس ہو جاتے تھے۔ جسدن مجھے دمشق واپس جانا تھا اسدن خوب برف باری ہو رہی تھی۔ جہاز کے پہنچنے کے وقت کے قریب مطار سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ جہاز مطار کے قریب تو پہنچ گیا ہے لیکن ابھی نہیں کہہ سکتے کہ پائیلاٹ اترنے کا فیصلہ کرے گا یا واپس ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ جہاز اتر چکا ہے تم مطار پر آجاؤ۔ مطار پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ برف اتنی گر رہی ہے کہ جہاز کے پروں پر سے برف صاف کرنے کے ساتھ ہی اور برف جمنا شروع ہو جاتی ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ جہاز آج واپس

ہو گا یا نہیں۔ کوئی پون گھنٹے کے انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ جہاز واپس جا سکے گا۔ مسافروں کو سوار ہونے کی ہدایت ہوئی۔ اور جہاز بخیریت روانہ ہو گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے منذر خواب کی طرف خیال گیا کیونکہ سفر کا یہ حصہ مشرق سے مغرب کی طرف تھا۔ میں دعاء میں مصروف ہو گیا پرواز بالکل ہموار تھی۔ ایران میں تو زمین برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ عراق اور شام کے علاقے میں میدانی حصوں میں برف نہیں تھی۔ دمشق کے قریب پہنچتے پہنچتے تک سورج غروب ہو گیا جب دمشق کے مطار پر اترنے کا وقت آیا تو اعلان ہوا مطار پر دھند کی وجہ سے یہاں اترنے کا امکان نہیں بیروت اتریں گے تیس۳۰ منٹ میں بیروت پہنچ کر خیریت سے اتر گئے۔ فالحمد للہ۔ پاکستانی سفیر متعینہ دمشق محمود حسن صاحب کار پر بیروت تشریف لے آئے ہوئے تھے۔ ہم دو گھنٹوں میں بخیریت دمشق پہنچ گئے۔ میں نے خیال کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحم سے خطرے کو ٹال دیا۔

اردن کا سفر | دوسرے دن سفیر صاحب نے امان اطلاع دی کہ ہم بموجب ارشاد حضرت جلالۃ الملک حاضر ہونے والے ہیں۔ محمود حسن صاحب اردن میں بھی پاکستان کی طرف سے سفیر تھے۔ ہم کار پر روانہ ہو گئے اور چار پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد امان بخیریت پہنچ گئے۔ ہمارے قیام کا انتظام ہوٹل میں تھا ہوٹل کے باہر میں نے ہوٹل کا نام THE PHILADELPHIA HOTEL دیکھا تو سفیر صاحب سے کہا یہ بھی امریکی اثر ہے! وہ مسکرائے اور فرمایا نہیں امان ہی اصل تاریخی PHILADELPHIA ہے امریکہ نے یہ نام یہاں سے لیا ہے۔ دیکھئے وہ ہوٹل کے عین سامنے ایک پرانے رومی تھیٹر کے آثار اب تک موجود ہیں۔

شاہ حسین کی خدمت میں باریابی | جلالۃ الملک حسین ابن طلال بن عبداللہ بڑی محبت اور احترام سے پیش آئے۔ فرمایا ہم سب تہہ دل سے تمہارے ممنون ہیں کہ تم نے قضیہ فلسطین کی ابتداء سے نہایت جرأت اور دانشمندی سے ہمارے حقوق کا دفاع کیا ہے اور جب حال ہی میں اسرائیلیوں نے سخت ظلم اور تعدی سے قبیبہ کا عرب گاؤں ہماری حدود کے اندر بے جا مداخلت کر کے برباد کر دیا تو تم نے خود مجلس امن میں پیش ہو کر اسرائیلیوں کی مکاریوں اور فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا۔ میں نے عرض کیا پاکستان قضیہ فلسطین کو اپنا اور سارے عالم اسلام کا قضیہ سمجھتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جو مدد اور خدمت اس بارے میں ہمارے امکان میں ہو اس سے دریغ نہ کریں۔ جب قبیبہ پر اسرائیلی یورش کا مسئلہ مجلس امن میں زیر بحث آیا تو پاکستان کا فرض تھا کہ حق اور انصاف کی پوری حمایت کرے۔ بیشک مجلس امن کی روایت ہے کہ عموماً ہر رکن کا مقرر کردہ مستقل نمائندہ ہی اس کی طرف سے مجلس امن میں تقریر کرتا ہے۔ لیکن امور خارجہ میں ہر ملک کا اصل نمائندہ تو وزیر خارجہ ہی ہے۔ میں نے قرین مصلحت سمجھا کہ اس مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر میں خود پاکستان کی طرف سے مجلس میں نمائندگی کروں۔ جلالۃ الملک سے میری تین ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر دفعہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک ملاقات میں تو صرف میں حاضر خدمت تھا۔ بلاتکلف عرب

اور عالم اسلام کے اہم مسائل پر گھنٹہ بھر سے زائد گفتگو رہی۔ دوسرے دن شام کے کھانے پر وزراء اور سفراء اور کثیر تعداد شرفاء کی مدعو تھی۔ کھانے کے بعد جلالۃ الملک نے کمال شفقت سے "ستارۂ اردن" کا سب سے اعلیٰ نشان مجھے مرحمت فرمایا اور سفیر صاحب کا بھی اسی طرح پر اعزاز فرمایا۔

قدس کا سفر۔ | ایک دن قبل دوپہر ہم وزیر صاحب معارف کی معیت میں قدس گئے۔ یہ سفر ہوائی جہاز سے ہوا۔ مسجد اقصیٰ اور تمام مقامات مقدسہ کی زیارت سے متشرف ہوئے۔ حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے کا مقام دیکھا اور اس کے عین نیچے SEPULCHRE کا کمرہ دیکھا یہ روائتی مقام ہے واللہ اعلم بالصواب۔ مسجد عمر میں اس مقام پر نفل ادا کئے جہاں امیر المومنین حضرت عمرؓ نے یروشلم آنے پر نماز گذاری تھی۔ یروشلم کے صدر بلدیہ نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور ایک خوبصورت مصری طبع شدہ قرآن مجید از راہ لطف ہدیہ دیا فجزاہ اللہ۔ ایک سہ پہر امان سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر قدیم رومی شہر جرش کے آثار دیکھنے گئے۔

جلالۃ الملک نے بڑے تپاک سے رخصت کیا اور وعدہ لیا کہ وقتاً فوقتاً حاضر خدمت ہوتا رہوں گا۔ اس کے بعد ایک بار لندن میں حاضر ہوا تو فرمایا تم نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ عرض کیا حاضر ہو گیا ہوں۔ فرمایا یہ تو دیار غیر میں ملاقات ہے ہمارے ہاں آؤ تو ہم اسے ایفائے عہد شمار کریں۔ میں ان دنوں بین الاقوامی عدالت کا رکن تھا۔

اردن میں دوسری مرتبہ شاہ حسین کی خدمت میں باریابی | اس دفعہ ڈاکٹر وقار احمد ہمدانی صاحب جو دمشق میں پاکستانی سفیر تھے اور اردن اور شام کے درمیان عارضی ناچاقی کی وجہ سے اردن کی طرف سے دمشق میں قائم بالامور بھی تھے میرے ہمراہ تھے۔ اردن کے حدود میں داخل ہوتے ہی محکمہ استقبال کی طرف سے چائے کا انتظام تھا۔ پریس کا ایک نوجوان لوکل نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے طور پر سوال کیا امان کس غرض کیلئے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا ایک دوست کی ملاقات کے لئے۔ پوچھا کیا جلالۃ الملک کی خدمت میں بھی حاضری کا موقعہ ہو گا؟ میں نے کہا یہاں جو میرے دوست ہیں ان کا نام حسین بن طلال ہے حسن اتفاق سے وہ اردن کے بادشاہ بھی ہیں۔ لیکن میری غرض دوست سے ملاقات ہے۔ دوست کو بادشاہ پر سبقت ہے! وہ نوجوان میرا منہ تکنے لگا! میں نے یہ گفتگو جلالۃ الملک کے حضور دہرا دی۔ بہت خوش ہوئے۔

پیٹرا کی سیر | اس بار میں نے پیٹرا (PETRA) دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فرمایا سب انتظام ہو جائے گا میرے ذاتی ہوائی جہاز میں معن جاؤ وہاں سے آگے کار کا انتظام ہو گا۔ کل شیخ کویت کے برادر اصغر جو ولیعہد بھی ہیں امان آرہے ہیں ورنہ میں خود تمہارے ساتھ چلتا۔ پیٹرا (PETRA) بھی ایک عجوبہ روزگار ہے وتنحتون من الجبال بیوتاً فٰرھین (۲۶:۱۵۰) کی ایک پر شوکت مثال ہے۔ معن سے ایک سڑک وادی موسیٰ سے گذر کر پیٹرا کو جاتی ہے اسی وادی میں پہاڑ سے ایک چشمہ پھوٹتا ہے جو روایتہً وہی چشمہ ہے جو "اضرب بعصاک الحجر" (۷:۱۶۱ ، ۲:۶۱) کے

ارشاد کی تعمیل کرنے پر پھوٹ پڑا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پیٹرا پہنچے تو سامنے ایک سہ منزلہ عمارت نظر آئی جو پہاڑ کی چٹان کو تراش کر تیار کی گئی تھی۔ یہ پیٹرا کا کسٹم ہاؤس تھا۔ ہر تجارتی قافلہ جو پیٹرا میں داخل ہوتا یہاں محصول ادا کرتا چونکہ شہر میں داخل ہونے کا اور کوئی رستہ نہیں تھا محصول کی وصولی نہایت آسان تھی کسٹم ہاؤس کو بائیں ہاتھ چھوڑ کر ہم ایک وسیع میدان میں داخل ہوئے جس کے گرد پہاڑی سلسلہ قلعے کی فصیل کی مانند تھا۔ میدان کے درمیان میں بھی ٹیلوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میدان کی عمارتوں کے کھنڈرات پر مٹی کے انبار جم جانے سے ٹیلے بن گئے ہیں لیکن میدان کے گرداگرد پہاڑیوں سے تراشی ہوئی عمارتیں ابتک محفوظ چلی آتی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کے اندر بھی گئے۔ اور انکی صنعت کاری کے نمونے دیکھ کر حیران ہوئے۔ پہاڑ کا پتھر سرخ رنگ کا ہے لیکن اس میں جا بجا رنگا رنگ لہریں ہیں۔ ایوان عدل کے بڑے ہال کی چھت کہ وہ بھی چٹان تراش کر بنائی ہوئی ہے ایک بوقلموں مرصّع قالین دکھائی دیتی ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی بنائی گئی ہے۔ پیٹرا کے عجائبات کو تفصیلی طور پر دیکھنے کے لئے کئی دن درکار ہیں۔ میدان کے وسط میں ایک ہوٹل ہے۔ مہمانوں کی رہائش کا انتظام خیموں میں ہے۔ جو زائرین پیٹرا میں رات بھر یا اس سے زیادہ عرصہ ٹھہرنا چاہیں وہ یہاں قیام فرما کر پیٹرا کا تفصیلی معائنہ کر سکتے ہیں اور ان میں سے صاحب بصیرت "عاقبة المکذبین" (جھٹلانے والوں کا انجام) پر غور کر کے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ پیٹرا کی وادی سے باہر آنے پر دوپہر کا کھانا ہم نے پیٹرا کے فوجی دستے کے افسران کے ساتھ کھایا اور جنگل میں ان کی پر تکلف ضیافت کے نہایت ممنون ہوئے فجزاھم اللہ

جلالۃ الملک حسین بن طلال کے ساتھ آخری ملاقات جون ۱۹۶۷ء کے نہایت اندوہناک واقعات کے بعد پھر لندن میں ہوئی۔ اسی شام جلالۃ الملک پیرس تشریف لیجانے والے تھے گفتگو کا موضوع طبعاً مشرق اوسط کے المناک حالات تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ریل کا خطرناک حادثہ جس سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر محفوظ رکھا۔

۱۹۵۳ء کے اواخر کے سفر دمشق، تہران، اردن کے خاتمے پر میں کراچی واپس آگیا۔ چند دن بعد جنوری ۱۹۵۴ء میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ لاہور سے ۲۰ جنوری کی شام کو کراچی کے لئے روانہ ہوا۔ میری سیلون گاڑی ۲ ڈاؤن میل کے پشاور سے آنے پر میل کے عقب میں لگادی گئی تھی جب میں پلیٹ فارم پر پہنچا تو اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر صاحب نے فرمایا سیلون ٹرین کے آخر میں ہونے کے سبب آپ ریل کی حرکت زیادہ محسوس کریں گے جس سے آپ بے آرام ہوں گے۔ اگر آپ پسند کریں تو آپ کی گاڑی ٹرین کے درمیان میں لگادی جائے۔ اکثر وزرا صاحبان اپنے سیلون کا درمیان میں ہونا پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا میں آپ کی توجہ کا ممنون ہوں لیکن اس ادل بدل میں کچھ وقت صرف ہوگا جس سے ممکن ہے ٹرین کی روانگی میں کچھ تاخیر ہو جائے میں اپنے آرام کی خاطر دوسرے مسافروں کیلئے باعث تصدیعہ نہیں بننا چاہتا۔ سیلون جہاں ہے وہیں ٹھیک ہے۔ گاڑی کے روانہ ہونے پر زور کا جھٹکا محسوس ہوا جس سے مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ گاڑی چھاؤنی کے

سٹیشن پر ٹھہری وہاں سے روانہ ہوئی تو پھر ویسے ہی زور کا جھٹکا محسوس ہوا۔ گاڑی رائے ونڈ پہنچی تو میں پلیٹ فارم پر اُترا اور دیکھا کہ گارڈ صاحب جن کا ڈبہ میری گاڑی سے آگے تھا پلیٹ فارم پر ہاتھ میں جھنڈی لئے کھڑے ہیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ دونوں بار گاڑی کے چلنے پر سخت دھکا محسوس ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کھڑے ہوئے مسافروں میں سے بعض گر پڑے ہوں گے اور ممکن ہے کسی کو چوٹیں بھی آئی ہوں۔ مجھے تو علم نہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ ممکن ہے ڈرائیور کی بے احتیاطی ہو۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اسے توجہ دلا دیں کہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں اپنے وقت پر سو گیا جب میں فجر کی نماز کے لئے کھڑا ہوا تو گاڑی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے نماز کے دوران میں گاڑی کے رکتے وقت یا پھر چلتے وقت دھکا لگے اور میں گر جاؤں اسلئے بہتر ہے کہ میں نماز بیٹھے ہوئے ادا کروں۔ چنانچہ میں نے بیٹھ کر نماز شروع کر دی۔ میں عام طور پر فجر کی سنتوں میں دوسری رکعت میں الحمد شریف کے بعد سورہ اخلاص پڑھتا ہوں ابھی میں نے بسم اللہ کے بعد "قل" کہا تھا کہ ایسے زور کا جھٹکا لگا کہ اوسان خطا ہو گئے اور میں بائیں طرف گر گیا اور کہنی پر چوٹ آئی ریل گاڑی کھڑی ہو گئی میں سنبھل کر قعدہ کی حالت میں بیٹھ گیا اور ھو اللہ احد کہہ کر نماز جاری رکھی۔ نماز سے فارغ ہونے پر کچھ شور سنائی دیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹا ہی تھا کہ ملازم نے آکر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا گاڑی کو آگ لگ گئی ہے جلدی باہر آئیے۔ میں نے دریافت کیا ہمارے سیلون کو آگ لگی ہے یا ساری ریل گاڑی کو؟ اس نے کہا ساری ریل جل رہی ہے۔ اتنے میں باہر سے آواز سنائی دی انہیں کہو جلدی باہر آئیں۔ میں نے جلدی میں کپڑے پہنے اور باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک محشر بپا ہے۔ مسافر انتہائی سراسیمگی کی حالت میں حیران کھڑے ہیں۔ ہوا تیز چل رہی ہے۔ شعلے آسمان کی طرف لپک رہے ہیں اور تیزی سے ٹرین کے عقب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس اثنا میں گارڈ صاحب آخری دو یا تین گاڑیوں کو جن میں میری گاڑی بھی شامل تھی اور جو ابھی شعلوں کی زد میں نہیں آئی تھیں ٹرین سے الگ کرنے کے متعلق ہدایات دے رہے تھے۔

انجن کے عین پیچھے کے تین ڈبوں میں سے تو کوئی خوش نصیب مسافر ہی بچا ہو گا۔ ان تین میں سے ایک ڈبہ عورتوں اور بچوں کا تھا جن کے اقرباء دوسرے ڈبوں میں تھے۔ جو مسافر انجن سے دُور کے ڈبوں میں تھے وہ خود تو بچ گئے لیکن بعض کے بیوی بچے جل کر راکھ ہو گئے اور ان کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم (۴۴ - ۱۱) والی کیفیت تھی جو بچاوہ اللہ تعالیٰ کے رحم ہی سے بچا تدبیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اتنے میں روشنی ہو گئی جو تین ڈبے علیحدہ کئے گئے تھے انہیں دھکیل کر چھپر اسٹیشن تک پہنچا یا گیا مسافر پیدل کچھ بغیر سہارے کے کچھ دوسروں کے سہارے سٹیشن تک پہنچے جنکو ضربات آئی تھیں یا آگ سے ضرر پہنچا تھا انہیں سٹیشن تک لانے کی تدبیر کی گئی لیکن سٹیشن پر بھی آرام مہیا ہوا نہ تھا اور افراتفری تھی۔ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ کوئی آرام کا سامان یا تیمارداری کیلئے دوا دارو مرہم پٹی میسر نہیں تھا۔ خورد و نوش کیلئے بھی کوئی اشیاء مہیا نہ تھیں۔ اگر کچھ تھا تو چند بچوں بوڑھوں اور عورتوں کے کام آیا ہو گا۔ سٹیشن کے قریب کوئی آبادی نہیں تھی۔ سڑک بھی آٹھ میل کے فاصلے سے گذرتی تھی اور درمیانی حصّے میں سراسر ریت

کے تودے تھے۔ کراچی حادثے کی اطلاع پہنچی لیکن وہاں سے ڈاکٹر مرہم پٹی کا سامان اور مناسب کمک آتے گھنٹوں لگے۔ سڑک کے رستے جو لوگ کراچی آئے ان کی موٹروں کے لئے سڑک سے سٹیشن اور ریل کی پٹری تک پہنچنا مشکل ثابت ہوا۔ بہت سے مسافروں نے اپنے اعزہ و اقرباء کو بذریعہ تار اطلاع دینے کی کوشش کی۔ میں انتظار میں تھا کہ محکمہ ریل کی طرف سے جو انتظام مسافروں کو کراچی پہنچانے کا کیا جائے گا اسی کے مطابق میں بھی کراچی پہنچ جاؤں گا۔ لیکن دوپہر کے تھوڑی دیر بعد سید شجاعت علی حسنی صاحب مرحوم، شیخ اعجاز احمد صاحب اور چوہدری بشیر احمد صاحب موٹر میں پہنچ گئے۔ فجزاھم اللہ۔ میں ان کے ساتھ کراچی آگیا فالحمدللہ۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ یہ حادثہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے خواب کے مطابق پیش آیا اور اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و رحم اور ذرہ نوازی سے میری جاں بخشی فرمائی۔ اور مجھے محفوظ رکھا۔ خواب میں بیشک ہوائی جہاز کے کسی حجز پرے پر گرنے کا ذکر تھا لیکن ہر خواب کسی حد تک تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔ خواب کے دیگر سب قرائن صفائی سے پورے ہوئے۔ سواری گو ریل تھی لیکن خطرہ آگ ہی کی صورت میں پیدا ہوا۔ جس مقام پر یہ المیہ وقوع میں آیا وہاں ریل کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف تھا اور جب حادثے کی تحقیقات شروع ہوکر ڈرائیور کا بیان اخبار میں شائع ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام غلام محمد تھا اور وہ بالکل معجزانہ طور پر سلامت رہا۔ اس کا بیان تھا کہ ڈاک گاڑی اپنی رفتار پر چلی جارہی تھی کہ لائن پر سامنے ایک موڑ آیا جب انجن موڑ کے گرد گھوما تو لیکایک سامنے نیم اندھیرے میں مجھے پٹڑی پر ایک طومار گرا ہوا دکھائی دیا میں نے دہشت میں فوراً بریک لگا دیئے لیکن پھر بھی انجن کی ٹکر اس طومار سے ہوگئی۔ اور اس تصادم کے نتیجے میں انجن پٹڑی چھوڑ کر لڑھکتا ہوا ڈھلوان سے نیچے جاگرا۔ جب میرے اوسان ٹھکانے ہوئے تو میں نے دیکھا کہ میرا فائرمین مرا پڑا ہے میں رینگتا ہوا انجن سے باہر نکلا تو میں نے خود کو صحیح سلامت پایا مگر ساری ریل جل رہی تھی۔ بعد میں تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے ایک پٹرول سے بھرے ہوئے ڈبوں کی ریل گاڑی حیدرآباد کی طرف جارہی تھی ان ڈبوں کو مضبوطی کے ساتھ بند رکھنے کیلئے ان کے گرد لوہے کے ٹیکے ہوتے ہیں جو دونوں طرف سے ڈبے کو اپنی لپیٹ میں لیکر چھت پر جاکر مل جاتے ہیں اور انہیں آپس میں کس دیا جاتا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سب سے آخری ڈبے کا ایک پٹکا کھل کر نیچے لٹک گیا۔ جب تک تو یہ گاڑی پٹری پر سیدھی چلتی رہی یہ پٹکا بھی لڑھکتا ہوا پٹری کے ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا گیا لیکن تیل کی گاڑی موڑ پر مڑی تو اس لٹکتے ہوئے ٹیکے کا سرا پٹری کی لائن کے ساتھ الجھ گیا۔ اب ایک طرف سے انجن کا کھچاؤ اور دوسری طرف سے پٹڑی کی پکڑ۔ اگر ٹپکا کہیں سے کمزور ہوتا تو ٹوٹ جاتا اور انجن گاڑی کو کھینچ لے جاتا۔ لیکن پٹکا مضبوط تھا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے ڈبے پر زور پڑا اور ڈبہ پٹری کو چھوڑ کر نیچے آرہا اور دوسری پٹڑی پر جاگرا جس پر ڈاک گاڑی حیدرآباد کی طرف سے آرہی تھی ڈبے کے گر جانے سے انجن گاڑی کو کھینچنے سے عاجز آگیا اور گاڑی رک گئی۔ چند منٹوں میں ڈاک گاڑی کے انجن کی ٹکر گرے ہوئے ڈبے کے ساتھ ہوئی۔

ڈاک گاڑی کا انجن تو پٹڑی سے لڑھک گیا لیکن اس تصادم سے پٹرول والا ڈبہ ٹوٹ گیا اور پٹرول کو آگ لگ گئی۔ شومئی قسمت سے ہوا تیز تھی اور پٹرول کے ڈبوں کی سمت سے ڈاک گاڑی کی جانب چل رہی تھی۔ ادھر آگ کی تمازت سے تمام بہتا ہوا پٹرول بھڑک اٹھا اور لمحہ بھر میں ایک ڈبے کے بعد دوسرا ڈبہ مشتعل ہوتا گیا۔ پٹرول ڈبوں سے نکل کر پٹڑی کے ساتھ ساتھ بہنے لگا اور آگ کے شعلوں نے تیزی سے بڑھ کر ڈاک گاڑی کے اکثر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مجھے رہ رہ کر بابا طاہر ایرانی کی یہ رباعی یاد آتی رہی۔

شبِ تاریک و سنگستان و من مست ۔ قدح از دستِ من افتاد نشکست !

نگاہ دارندہ اش نیکو نگہداشت ۔ وگرنہ صد قدح نفتادہ بشکست !!

وزارت خارجہ سے استعفیٰ | سر بی این راؤ جو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے اور کچھ عرصے کیلئے کشمیر کے وزیر اعظم بھی رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں بین الاقوامی عدالت کے جج منتخب ہوئے۔ ان کی میعاد ۶ر فروری ۱۹۵۲ء سے شروع ہوئی۔ قضائے الٰہی سے نومبر ۱۹۵۳ء میں وہ فوت ہو گئے اور انکی جگہ خالی ہو گئی۔ جنوری ۱۹۵۴ء میں جب میں اسمبلی کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر کراچی واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی طرف سے اطلاع آئی ہے کہ سر بی این راؤ کی جگہ پر کرنے کے لئے جو انتخاب ہو گا اس کیلئے موزوں امیدواروں کے نام فلاں تاریخ تک بھیج دیئے جائیں میں نے وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں گذارش کی کہ اگر وہ رضامند ہوں تو میرا نام بھیج دیا جائے۔ انہوں نے فرمایا ہمیں تمہاری یہاں ضرورت ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں سے جاؤ۔

فروری ۱۹۵۴ء میں میاں ممتاز محمد خاں صاحب دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں صاحب نے وزیر اعظم صاحب سے مطالبہ کیا کہ میاں مشتاق احمد خاں گورمانی صاحب وزیر داخلہ کو اور مجھے وزارت سے علیحدہ کیا جائے۔ کچھ عرصہ تو وزیر اعظم صاحب نے اس خیال سے کہ یہ مطالبہ سنجیدگی سے نہیں کیا جا رہا اس کو چنداں اہمیت نہ دی لیکن جب یہ دونوں صاحبان مصر ہوئے اور مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی میں اس کا چرچا ہونے لگا تو وزیر اعظم صاحب نے دونوں اصحاب کو کھانے پر بلایا اور ان سے تفصیلی گفتگو کی اور یہ دیکھ کر کہ وہ اپنے مطالبے پر قائم ہیں اور اسے ترک کرنے پر رضامند نہیں ان سے دریافت فرمایا کہ اگر میں بیک وقت دو رفقاء کو علیحدہ کرنا مشکل یا خلاف مصلحت پاؤں تو آپ ان دونوں میں سے کس کی علیحدگی پہلے عمل میں لانا چاہیں گے؟ سردار شوکت حیات صاحب نے فرمایا اس صورت میں وزیر خارجہ کو پہلے علیحدہ کیا جائے کہ یہ اقدام رائے عامہ کے موافق ہو گا۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ صاحب کی رائے تھی کہ اگر دونوں وزراء کو بیک وقت فارغ نہ کیا جا سکتا ہو تو وزیر داخلہ کو پہلے فارغ کیا جائے۔ اور وجہ یہ بیان کی کہ ہم نے مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے اراکین کو اپنے اس مطالبے سے متفق کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی پاکستان کے اراکین کہتے ہیں ہمیں وزیر خارجہ سے کوئی شکایت نہیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کے مفاد کا سوال ہے ہم نے اسے ہمیشہ ہمدرد پایا ہے۔ اگر تم وزیر خارجہ کی علیحدگی

کے مطالبہ کی تائید ہم سے چاہتے ہو تو وزیر داخلہ کی علیحدگی کا بھی مطالبہ کرو اس شرط پر کہ مطالبے کی تائید میں ہم تمہارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ اب اگر وزیر خارجہ کو پہلے فارغ کر دیا گیا تو مشرقی پاکستان کے جو دوست ہمارے ساتھ شامل ہیں وہ خیال کریں گے کہ ہم نے ان کی تائید کے ذریعے اپنا کام تو نکال لیا ہے اور وزیر داخلہ کے فارغ کئے جانے پر زور نہیں دیا اس طرح وہ ہم سے بدظن ہو جائیں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ فریب کیا ہے۔ جب وزیر اعظم صاحب نے یہ کیفیت کابینہ کے اجلاس میں بیان کی تو چودھری محمد علی صاحب وزیر خزانہ نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نپٹنے کا نہیں اس کا فیصلہ اصولی طور پر ہونا چاہیئے۔ آپ ان دونوں صاحبان سے صاف طور پر کہدیں کہ ہم نے خود بھی آپ کے مطالبے پر غور کیا ہے اور اپنے کابینہ کے رفقاء کے ساتھ بھی اس کے متعلق مشورہ کیا ہے۔ جن دو وزیروں کی علیحدگی کا آپ مطالبہ کرتے ہیں انہیں اپنے رفقاء کا اعتماد حاصل ہے اور کابینہ آپ کے مطالبے کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں اگر آپ کو اپنے مطالبے پر اصرار ہے تو آپ بیشک اپنا مطالبہ پارٹی کے روبرو پیش کریں۔ ہم پارٹی کے اجلاس میں آپ کے مطالبے کی مخالفت کریں گے اور یہ واضح کر دیں گے کہ اگر پارٹی کی کثرت مطالبے کی تائید میں ہوئی تو ہم اسے کابینہ کے خلاف بے اعتمادی کا ثبوت سمجھیں گے اور سب کے سب وزارت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس صورت میں پارٹی نئی کابینہ اپنی منشاء کے مطابق تشکیل دیگی اور آپ کا مقصد حل ہو جائے گا۔ کابینہ کے سب اراکین اس تجویز کے حق میں تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ وزیر اعظم صاحب نے اس فیصلہ کے مطابق میاں صاحب اور سردار صاحب کو کہدیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد میں نے اس مطالبے کا کوئی ذکر نہ سنا۔

بظاہر یہ مطالبہ تو ختم ہو گیا لیکن میری طبیعت پر ضرور اس کا اثر باقی رہا کیونکہ ۱۰ اپریل کے دن کابینہ کا اجلاس شروع ہوتے ہی میں نے وزیر اعظم صاحب سے ایک ذاتی گذارش کرنے کی اجازت چاہی اور اجازت ملنے پر عرض کیا پچھلے سال مغربی پاکستان کے بعض حصوں میں جو شورش ہوئی وہ اگرچہ نہایت افسوسناک اور پریشان کن تھی لیکن میری دانست میں اس کے بعد پاکستان کی وزارت خارجہ کی ذمہ داری میرے سپرد رہنے کے نتیجے میں دیگر ممالک میں پاکستان کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سفیران متعینہ پاکستان نے اپنی اپنی حکومت کو اپنا یہ تاثر ارسال کیا ہو کہ وزیر خارجہ کے خلاف جو آواز اٹھائی گئی وہ صرف مغربی پاکستان کے ایک قلیل حصے نے اٹھائی جس میں ایک عنصر تو سیاسی اغراض رکھتا تھا لیکن باقی عناصر اختلاف عقائد کی وجہ سے شامل ہو گئے تھے۔ نئی کابینہ میں وزیر خارجہ کی پوزیشن پہلے کی نسبت کسی لحاظ سے کمزور نہیں۔ میں نے اس وقت بھی خواجہ ناظم الدین صاحب کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ اگر میرے وزارت سے علیحدہ ہونے سے انکی مشکل حل ہو جاتی ہو تو میرا استعفیٰ حاضر ہے لیکن انہیں یہ منظور نہ ہوا۔ اب پچھلے دنوں جو صورت حال پیش آئی وہ خالصتہً سیاسی تھی پارلیمنٹری پارٹی میں ایک فریق ایسا ہے جو میری علیحدگی کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ بیرونی سفارتخانے اس سے مطلع ہیں پچھلے سال کی شورش کے وقت کسی سفیر نے میرے ساتھ کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس سال بعض سفراء نے اس قسم کے جملے استعمال کئے ہیں۔ "امید ہے تم ڈٹے رہو گے"۔ "امید ہے تم استعفیٰ پیش نہیں کرو گے"۔ "تمہارے جانے

سے پاکستان کو نقصان پہنچے گا۔" اس سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ ان سفراء کے اندازے میں میری پوزیشن کمزور ہے اور ممکن ہے مجھے علیحدہ ہونا پڑے۔ اگر یہی تاثرات انہوں نے اپنی اپنی حکومت کو پہنچائے ہیں تو یہ صورت پاکستان کے لئے مضر ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں قریباً ساڑھے چھ سال کا عرصہ وزارت خارجہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں صرف کر چکا ہوں۔ مناسب ہو گا کہ یہ ذمہ داریاں اب مضبوط تر کندھوں پر ڈالی جائیں۔ ان سب اور دیگر متعلقہ امور پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کا مفاد متقاضی ہے کہ میں وزارت خارجہ سے علیحدہ ہو جاؤں مجھے پورا یقین ہے کہ مجھے وزیر اعظم اور اپنے رفقاء کا اعتماد حاصل ہے جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کامل طور پر میرا آزادانہ فیصلہ ہے میں نے اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کسی فرد کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا نہ کسی سے اس کے متعلق مشورہ کیا ہے۔ میں وزیر اعظم صاحب سے اجازت چاہتا ہوں کہ مجھے ۳۰ رجون تک وزارت کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا جائے۔ اس وقت تک وزیر اعظم صاحب کو غور کرنے کا موقعہ مل جائیگا کہ میری علیحدگی پر وہ وزارت میں کیا تبدیلی مناسب خیال فرماتے ہیں۔ سب رفقاء نے افسوس کا اظہار کیا۔ وزیر اعظم صاحب نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ میں جس فیصلے پر پہنچا ہوں اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔ چوہدری محمد علی صاحب نے جن کی نشست میرے ساتھ ہی دائیں جانب تھی فرمایا کیا ہی اچھا ہوتا اگر جنوری میں تمہارا نام بین الاقوامی عدالت کی ججی کیلئے بھیج دیا جاتا۔ میں نے عرض کیا آپ پریشان نہ ہوں ان اللّٰہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔

وزارت خارجہ کا چارج چھوڑنے سے قبل وزیر اعظم کے اصرار پر عالمی بنک سے مذاکرات کے لئے امریکہ کا سفر!

مئی ۱۹۵۴ء کے آخر میں وادئ سندھ کے پانی کی تقسیم کے بارے میں عالمی بنک کے ساتھ کچھ الجھن پیدا ہو گئی اور معاملہ کابینہ میں برائے غور پیش ہوا۔ کابینہ کی رائے ہوئی کہ مجھے واشنگٹن جا کر بنک کے صدر مسٹر یوجین بلیک اور متعلقہ افسران کے ساتھ بات چیت کر کے پیدا شدہ مشکل کو پاکستان کے نظریئے کے مطابق سلجھانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ مجھے اس میں کچھ تامل ہوا۔ وزیر اعظم صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور دریافت فرمایا تمہیں واشنگٹن جانے میں کیوں تامل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے ساتھ بنک کے صدر اور متعلقہ افسران کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں اور وہ تمہارا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس مرحلے پر تمہارا ان سے بات چیت کرنا پاکستان کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا مجھے اس خیال سے تامل ہے کہ گو میں نے وزارت سے علیحدگی کا کسی سے ذکر نہیں کیا لیکن کابینہ میں ذکر ہو چکا ہے اور لازماً اس کی اطلاع امریکی سفیر کو پہنچی ہو گی اور انہوں نے امریکی وزارت خارجہ کو مطلع کر دیا ہو گا اور وہاں سے یہ خبر بنک کو بھی معلوم ہو چکی ہو گی۔ یہ درست ہے کہ میرے تعلقات افسران بنک کے ساتھ دوستانہ ہیں اور جہاں تک گفتگو اور دلائل کا تعلق ہے میں انہیں پاکستان کے موقف کی صحت اور معقولیت کا قائل کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن اگر کوئی ایسی پیچیدگی یا مشکل پیش آ گئی جس کے سلجھانے کیلئے مجھے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے مضبوطی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں خواہ کس قدر مضبوط موقف اختیار کروں افسران بنک مسکرا کر میری بات کو ٹال سکتے ہیں یا

معاملے کو طول دے سکتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہو گا کہ میں جون کے آخر میں رخصت ہو جاؤں گا اور وہ میرے اس اقدام کی وجہ بھی جانتے ہوں گے۔ اگر یہ صورت پیدا ہوئی تو میرا واشنگٹن جانا بجائے تقویت کے کمزوری کا باعث ہو گا وزیر اعظم صاحب نے فرمایا اس وقت تو یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ واشنگٹن میں کیا صورت حالات پیش آئے گی لیکن جو کچھ بھی ہو تمہارا ہی جانا مناسب ہے۔ تم واقعاتی حالات سے بھی خوب واقف ہو اور اتنک تم ہی نیک کے ساتھ حکومت کی نمائندگی بھی کرتے رہے ہو میری ذاتی خواہش بھی یہی ہے کہ تم ضرور جاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ وجہ تامل بیان کر دینے کے بعد اب جو ارشاد ہو میں کابینہ کا رکن ہوتے ہوئے اس کی تعمیل کا پابند ہوں۔ وزیر اعظم صاحب نے فرمایا بہت خوب لیکن جلد جانا ہو گا۔ کب تک روانہ ہو سکتے ہو؟ میں نے کہا کل چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن متعلقہ کاغذات فراہم کر کے میں روانہ ہو گیا۔

نیویارک پہنچا تو سید امجد علی صاحب نے جو واشنگٹن میں پاکستانی سفیر تھے ٹیلیفون پر فرمایا نیویارک کیوں رک گئے ہو۔ واشنگٹن آؤ۔ وہاں تو ہو گے بھی اکیلے ہی۔ آج جمعہ ہے ہفتہ اور اتوار دفتر بند ہوں گے وہاں کوئی کام تو ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا میں کراچی سے افراتفری میں روانہ ہوا۔ متعلقہ کاغذات ساتھ باندھ کر لے آیا ہوں یہاں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔ کاغذات کا اچھی طرح مطالعہ کر لینے کے بعد واشنگٹن آؤں گا اور وہاں آپ سب سے مشورہ کر لوں گا۔ کہنے لگے یہاں بھی بند ہو کر بیٹھ سکتے ہو کاغذات کا مطالعہ یہیں کر لینا۔ میں نے کہا مطالعہ تو وہاں بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک دقت ہے۔ پریذیڈنٹ بلیک کا مکان آپ کے مکان سے ایک مکان چھوڑ کر ہے۔ اگر کل یا پرسوں انہوں نے اتفاق سے مجھے مکان کے باہر دیکھ لیا اور پکڑ کر اپنے ہاں لے گئے اور اس قضیہ کی بات چھیڑ دی اور مجھے اس وقت تک اس معاملہ کی تفصیلات پر عبور نہ ہو چکا ہوا تو میرے لئے دقت ہو گی۔ فرمایا اچھا تمہاری مرضی لیکن سوموار کو شام کے کھانے سے پہلے ضرور پہنچ جانا۔ میں نے چیف جسٹس وارن اور ان کی بیگم کو کھانے پر بلایا ہے۔ تمہاری ان سے پہلے ملاقات نہیں اور وہ تم سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایوان مندوبین کے صدر سپیکر مارٹن اور مسز مارٹن اور اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ کرنل بائی روڈ بھی ہوں گے۔ دیر نہ کرنا۔ میں بر وقت پہنچ گیا اور دعوت میں شامل ہوا۔ چیف جسٹس اور ان کی بیگم صاحبہ سے تعارف ہوا وہ بڑے تپاک سے ملے۔ دوسرے دن مسٹر یوجین بلیک سے ملا۔ ان سے اور بنک کے متعلقہ افسران کے ساتھ چند ملاقاتوں کے نتیجے میں وہ الجھن جو پیدا ہوئی تھی بفضل اللہ رفع ہو گئی۔

بین الاقوامی عدالت کی رکنیت کیلئے میری نامزدگی۔

اسی اثناء میں معلوم ہوا کہ سر بی این راؤ کی وفات سے جو نشست بین الاقوامی عدالت میں خالی ہوئی اس کے پر کرنے کیلئے جو نام مختلف ممالک کی طرف سے بھیجے گئے تھے ان میں میرا نام بھی شامل ہے۔ ہندوستان نے سر بی این راؤ کی جگہ مسٹر جسٹس پال کو نامزد کیا تھا۔ میں نے سید امجد علی صاحب سے درخواست کی کہ وہ معلوم کریں کہ مجلس امن کے اراکین میں سے کتنے ہندوستانی امیدوار کے حق میں رائے دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ سید امجد علی صاحب نے دو تین دن کے اندر معلوم کر لیا کہ پانچ

اراکین ہندوستان سے وعدہ کر چکے ہیں اور ہم کی طرف سے کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ کراچی واپس پہنچنے پر میں نے یہ کیفیت وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں بیان کر دی۔ انہوں نے فرمایا یہ بہت اچھی صورت نکل آئی ہے امید ہے اب انتخاب تک تو تمہیں وزیر خارجہ رہنا منظور ہو گا اور تم ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو وزارت چھوڑنے پر اصرار نہیں کرو گے۔

سیٹو کانفرنس میں پاکستان کی طرف سے نمائندگی

ستمبر ۱۹۵۴ء کے شروع میں سیٹو (S.E.A.T.O) کا اجلاس منیلا میں ہوا۔ پاکستان کی طرف سے ورکنگ پارٹی میں آغا ہلالی صاحب اور رشید ابراہیم صاحب شامل ہوئے اور ان دونوں نے اور ان کے عملے نے بہت محنت اور تدبر سے کام کیا۔ کانفرنس کے شروع ہونے تک معاہدے کے مسودے میں اکثر وہ امور شامل کر دیئے گئے تھے جن پر پاکستان کو اصرار تھا لیکن سب سے اہم بات جس پر پاکستان کو اصرار تھا شامل نہیں کی گئی تھی۔ پاکستان اس بات پر مصر تھا کہ معاہدے کے فریق ممالک میں سے کسی کے خلاف اگر کسی طرف سے بھی جارحانہ اقدام کیا جائے تو باقی فریق ممالک پر فوری ذمہ داری عائد ہو گی کہ ان میں سے ہر ایک اس ملک کی مدد کرے اور اس کے ساتھ شامل ہو کر اس جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرے اور اسے ناکام کرے۔ معاہدے کے مسودے میں جارحانہ اقدام کی دو صورتیں بیان کی گئی تھیں۔ ایک ایسا جارحانہ اقدام جو کسی اشتراکی ملک کی طرف سے کیا جائے۔ دوسرا ایسا جارحانہ اقدام جو کسی اور ملک کی طرف سے کیا جائے۔ اوّل الذکر صورت میں تمام فریق ممالک نے ایسے جارحانہ اقدام کو روکنے اور متعلقہ ملک کے دفاع کی ذمہ داری کو فوری طور پر بغیر کسی مزید شرط کے پورا کرنا تھا۔ موخر الذکر صورت میں فریق ممالک کی ذمہ داری یہ تھی کہ ان کے نمائندے فوراً جمع ہوں اور صورت حالات کا جائزہ لیکر باہمی مشورے سے طے کریں کہ جارحانہ اقدام کو روکنے اور متعلقہ فریق ملک کے دفاع کیلئے کیا طریق اختیار کیا جائے۔ پاکستان کا مطالبہ تھا کہ ہر قسم کے جارحانہ اقدام کو بلا تمیز اس امر کے کہ وہ اقدام کسی اشتراکی ملک کی طرف سے ہے یا کسی غیر اشتراکی ملک کی طرف سے ایک ہی درجہ دیا جائے اور دیگر فریق ممالک کی ذمہ داری قرار دی جائے کہ وہ جارحانہ اقدام کی روک تھام اور متعلقہ فریق ملک کے دفاع اور حفاظت کیلئے موثر تدابیر عمل میں لائیں۔ میں نے مسٹر جان فوسٹر ڈلس امریکی وزیر خارجہ کے ساتھ اس بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے فرمایا ہمارے آئین کے مطابق صدر مملکت کوئی ایسا معاہدہ سینیٹ (SENATE) کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتے۔ اشتراکی جارحانہ اقدام کے مقابلے کیلئے تو سینیٹ (SENATE) نے صدر مملکت کو پہلے ہی اختیار دے دیا ہوا ہے اسلئے ہم معاہدے میں یہ ذمہ داری صراحتہً لے سکتے ہیں۔ لیکن کسی غیر اشتراکی ملک کے جارحانہ اقدام کے مقابلے کیلئے صدر مملکت کو سینیٹ کی رضامندی حاصل کرنی آئینی طور پر ضروری ہے اسلئے ہم معاہدے کی رُو سے یہ ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ صرف اتنی ذمہ داری لے سکتے ہیں کہ فوری طور پر باہمی مشورہ ہو کہ صورت پیش آمدہ کے مقابلے کیلئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں اور پھر جو عمل ضروری سمجھا جائے اس کے لئے سینیٹ (SENATE) کی رضامندی حاصل کی جائے۔ میں نے کہا کہ پاکستان کی حکومت کی رائے میں یہ صورت تسلی بخش

نہیں اسلئے میں معاہدے پر دستخط نہیں کر سکتا۔ اس صورت کے پیش نظر حکومت پاکستان ہی فیصلہ کرے گی کہ پاکستان معاہدے میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چونکہ پاکستان کانفرنس میں برابر شریک رہا تھا اور باقی سب امور کے متعلق ہمارا نقطۂ نگہ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اس اہم ترین مسئلے کے متعلق جو صورت تھی وہ ہمارے لئے تسلی بخش نہ تھی اور آخری اجلاس جس میں معاہدے پر دستخط کئے جانے تھے شروع ہونیوالا تھا اور حکومت کی ہدایت حاصل کرنے کے لئے وقت نہیں تھا میں نے صرف یہ ذمہ داری لی کہ معاہدے کا مسودہ حکومت پاکستان کو بھیج دیا جائے گا اور وہ اپنے آئینی ضابطے کے مطابق معاہدے میں شمولیت یا عدم شمولیت کا فیصلہ کرے گی۔ چنانچہ مسودہ پر اسبات کو واضح کرنے کیلئے میں نے حسب ذیل عبارت لکھ دی:۔

SIGNED FOR THE PURPOSE OF TRANSMISSION TO THE GOVERNMENT OF PAKISTAN FOR IT TO TAKE ITS DECISION IN ACCORDANCE WITH ITS CONSTITUTIONAL PROCEDURES

اور وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں تفصیلی رپورٹ بھی ارسال کر دی۔ کانفرنس کے ختم ہوتے ہی میں ہانگ کانگ، ٹوکیو، سان فرانسسکو کے رستے نیویارک چلا گیا جہاں اقوام متحدہ کی اسمبلی کا سالانہ اجلاس شروع ہونے والا تھا میری اطلاع کے مطابق جب SEATO میں شمولیت کا سوال کابینہ میں پیش ہوا تو آراء میں بہت اختلاف تھا لیکن بہت ردّ و کد کے بعد شمولیت کے حق میں فیصلہ ہوا۔

بین الاقوامی عدالت کی رکنیت کے لئے میرا انتخاب۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو بین الاقوامی عدالت کی ججی کا انتخاب عمل میں آیا قواعد کے مطابق کامیابی کے لئے مجلس امن کی چھ آراء اور اسمبلی کی ۳۱ آراء درکار تھیں مجلس امن کے اراکین میں سے تین چھوٹے ممالک نے شروع ہونے تک ہندوستان سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا ان میں سے پانچ نے ہمارے حق میں رائے دینے کا وعدہ کر لیا چھٹے رکن برازیل کو آخر تک تامل رہا انکی رائے تھی کہ اگر کوئی نشست کسی جج کی فوتیدگی سے خالی ہو تو اسے فوت شدہ جج کے ملک کے امیدوار سے پُر کرنا چاہیئے۔ اور اس موقف کے ماتحت انہوں نے اپنی رائے مسٹر جسٹس پال کے حق میں دی۔ میں نے اپنے سب سفارت خانوں کو ہدایت دی تھی کہ جس حکومت کی طرف سے ہندوستانی امیدوار کو رائے دینے کا وعدہ ہو چکا ہو اسے ہرگز خلاف وعدہ رائے دینے کی ترغیب نہ دی جائے۔ ترکی کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ اقوام متحدہ میں ان کے مستقل نمائندے سلیم سارپر صاحب تھے۔ ان کے اور میرے درمیان نہایت گہرے دوستانہ روابط تھے۔ ترکی مجلس امن کا رکن تھا اور ان چھ ملکوں میں شامل تھا جو شروع ہونے تک ہندوستانی امیدوار کے حق میں رائے دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس لئے ہماری طرف سے اس بارے میں ترکی سے کچھ نہ کہا گیا۔ جب سلیم سارپر صاحب کو میری نامزدگی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی وزارت خارجہ کو لکھا کہ جب ہم نے مسٹر جسٹس پال کے حق میں رائے دینے کا وعدہ کیا تھا اس وقت ہمیں یہ علم نہ تھا کہ کوئی اور امیدوار ان کے مقابل پر کھڑا ہوگا۔ اب ظفر اللہ خاں کو اس نشست کے لئے ان کے مقابل

نامزد کیا گیا ہے۔ جہاں تک موزونیت کا سوال ہے ظفر اللہ خاں ہر لحاظ سے ترجیح کا مستحق ہے اسلئے ہمیں چاہیئے کہ ہم حکومت ہند سے کہدیں کہ پیش آمدہ صورت میں ہم ظفر اللہ خاں کے حق میں رائے دیں گے۔ چنانچہ ترکی حکومت نے یہی فیصلہ کیا اور انتخاب سے خاصہ عرصہ پیشتر انہوں نے اپنے فیصلے کی اطلاع حکومت ہند کو کردی۔ اس طرح بفضل اللہ ہمیں مجلس امن میں کثرت رائے حاصل ہوگئی۔ اسمبلی کے اجلاس میں رائے شماری ہونے پر میرے حق میں ۳۳ اور مسٹر پال کے حق میں ۲۹ آراء شمار ہوئیں اور اس طرح میں منتخب ہو گیا فالحمد للہ۔ وزیر اعظم بوگرہ صاحب ان دنوں امریکہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ انتخاب کا نتیجہ معلوم ہونے پر مصر ہوئے کہ میں اسمبلی کے اجلاس کے خاتمہ تک نیو یارک ہی ٹھہروں اور اسمبلی میں پیش ہونے والے امور کے متعلق غیر سرکاری طور پر پاکستانی وفد کے اراکین کی راہنمائی کروں۔ میں نے عرض کیا کہ ذاتی طور پر یہ انتظام میرے لئے مشکلات پیدا کرنے والا ہے۔ کراچی میں مجھے سرکاری مکان فی الفور خالی کرنا ہے۔ میری اہلیہ لاہور میں ہیں۔ مکان خالی کرنے اور سامان کی حفاظت ملازمین کے سپرد کرنی ہوگی۔ انہوں نے فرمایا یہ کوئی دقت نہیں۔ ہم ہدایت کردیتے ہیں کہ تمہاری کراچی واپسی تک مکان خالی نہ کرایا جائے۔ چنانچہ وہیں سے یہ ہدایت بھیجدی گئی لیکن محکمہ متعلقہ نے عذر کیا کہ جج منتخب ہونے کے بعد میں حکومت پاکستان کا تنخواہ دار نہیں رہا اور اس لئے قواعد کے مطابق سرکاری مکان پر قبضہ رکھنے کا مجاز نہیں۔ یہ عذر معقول تھا۔ چنانچہ مکان فوری طور پر خالی کرایا گیا جس کے نتیجے میں میری کئی ذاتی اشیاء جن میں سے بعض قیمت کے لحاظ سے اور بعض جذباتی لحاظ سے عزیز تھیں ایسی لاپتہ ہوئیں کہ ان کا سراغ نہ مل سکا۔
ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد میں کراچی واپس آیا اور ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر جنوری ۱۹۵۵ء کے آخر میں بین الاقوامی عدالت کے صدر مقام ہیگ پہنچ گیا۔

بین الاقوامی عدالت کی رکنیت

بین الاقوامی عدالت کا سال ۶ رفروری کو شروع ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء کے شروع میں جب عدالت قائم کی گئی تو پہلا اجلاس ۶ رفروری کو ہوا تھا۔ عدالت کے ججوں کی تعداد ۱۵ ہے۔ ہر تیسرے سال عدالت کے پانچ جج ریٹائر ہوتے ہیں اور انکی جگہ اقوام متحدہ پانچ نئے جج منتخب کرتی ہے۔ نئے ججوں کے عدالت میں شامل ہونے کے بعد پندرہ جج ان اپنے میں سے تین سال کیلئے صدر عدالت اور نائب صدر عدالت کا انتخاب کرتے ہیں۔ فروری ۱۹۵۵ء میں عدالت کے پندرہ جج ان حسب ذیل ممالک کے تھے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس، چین، کنیڈا، پاکستان، مصر، ناروے، پولینڈ، یوگوسلاویہ، ارجنٹائن، میکسیکو، یوراگوے، السلواڈور۔ ان میں سے ریاستہائے متحدہ کے جج ہیکورتھ صدر اور مصر کے جج عبدالحمید بدوی پاشا مرحوم نائب صدر منتخب ہوئے۔ جج بدوی سے میری ملاقات ۱۹۴۵ء میں قاہرہ میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ مصر کے وزیر خارجہ تھے۔ جب تک وہ عدالت میں جج رہے میرے ساتھ دونوں میاں بیوی کا سلوک نہایت مشفقانہ رہا۔ برطانیہ کے جج لاٹر پاخٹ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کے سالانہ اجلاس کے دوران پیرس میں ہوئی تھی ان دنوں ریاست حیدر آباد کا معاملہ مجلس امن میں پیش تھا اور پروفیسر لاٹر پاخٹ ریاست حیدر آباد کے مشیر قانونی

کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے۔ کلنیڈا کے جج ریڈ سے بھی پہلے سے واقفیت تھی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں جج منتخب ہو جانے کے بعد غالباً نومبر ۱۹۵۴ء میں مجھے ایک دو تقریبوں کے سلسلے میں مانٹریال جانے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک تقریب امپیریئل پارلیمنٹری ایسوسی ایشن میں تھی۔ اس کے صدر جج ریڈ تھے۔ میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا میں آج کے مقرر کی پبلک زندگی کا توجہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں اس کی سب سے بڑی خوبی جو میں نے نوٹ کی وہ اس کی INTEGRITY ہے۔ یہ انکا کریمانہ الطاف تھا۔ انکی دعوت پر میں آٹووا گیا۔ ان کے دولت خانہ پر مسز ریڈ سے بھی ملاقات ہوئی۔ جج ریڈ نے بہت سی مفید باتیں عدالت کے متعلق بتلائیں۔ اپنی بقیہ سہ سالہ میعاد کے دوران میں بھی میرے ساتھ ان کا سلوک بڑا مشفقانہ رہا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ انہیں عدالت سے ریٹائر ہوئے قریباً ۱۴ سال ہو چکے ہیں۔ دونوں میاں بیوی بفضل اللہ بقید حیات ہیں۔ گاہے گاہے ان سے خط و کتابت بھی ہوتی ہے۔ عدالت کے باقی ججوں اور عدالت کے عملے میں سے کسی سے پہلے میری واقفیت نہ تھی۔ ایک نئے مقام پر رہائش اختیار کرنے اور ایک نئے ادارے میں کام شروع کرنے سے متعلق بعض دقتیں پیش آئیں لیکن رفتہ رفتہ سب امور بفضل اللہ تعالیٰ تسلی بخش طور پر طے ہو گئے۔ کچھ دن ہوٹل میں قیام رہا اور پھر ایک مکان میں رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں ہونیوالے انتخاب کی بناء پر میں چھ سال سے زائد عرصہ کے لئے میں اس عدالت کا رکن رہا۔ اس عرصہ میں جو تنازعات عدالت کے سامنے آئے ان میں سے بعض کا مختصر ذکر ممکن ہے دلچسپی کا باعث ہو۔

جنوب مغربی افریقہ کے منڈیٹ کے مسائل | پہلی عالمی جنگ کے بعد لیگ آف نیشنز کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ایک مسئلہ جو لیگ کو حل کرنا پڑا وہ مفتوح ممالک (جرمنی اور ترکی) کی نوآبادیات کے مستقبل کا تھا۔ جرمنی کی نوآبادیات میں جنوب مغربی افریقہ بھی شامل تھا۔ لیگ آف نیشنز نے سب نوآبادیات کیلئے MANDATES کا نظام تجویز کیا اس نظام کے ماتحت جنوب مغربی افریقہ کا نظم و نسق جنوبی افریقہ کے سپرد کیا گیا اس نظام کے مطابق منڈیٹ کی شرائط کی تعمیل کی نگرانی لیگ کی کونسل کے سپرد تھی اور کونسل کا صرف متفقہ فیصلہ قابل نفاذ تھا۔ چونکہ جنوبی افریقہ بھی اس کونسل کا رکن تھا اسلئے جہانتک جنوب مغربی افریقہ کی نگرانی کا تعلق تھا عملی صورت یہ تھی کہ کونسل جنوبی افریقہ کی مرضی کے خلاف کوئی ہدایت جاری نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد لیگ آف نیشنز کا خاتمہ ہو گیا اور اقوام متحدہ کا ادارہ قائم ہوا جس کے ماتحت غیر خود مختار علاقوں کو حق خود اختیاری کیلئے تیار کرنے کی ذمہ داری ٹرسٹی شپ کونسل کو سپرد کی گئی۔ منڈیٹ والے علاقوں میں سے بہت سے تو آزاد ہو کر اقوام متحدہ کے رکن بن گئے۔ جو باقی رہ گئے ان کے نگران ملکوں نے ٹرسٹی شپ کونسل کی نگرانی کو تسلیم کرکے امانت نامے بحق اقوام متحدہ تحریر کر دیئے لیکن جنوبی افریقہ نے مغربی افریقہ کی نسبت اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کونسل کی نگرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جنوبی افریقہ کا موقف یہ تھا کہ اول تو لیگ آف نیشنز کا منشاء ہی یہ تھا کہ جنوب مغربی افریقہ کا علاقہ آخر کار جنوبی افریقہ میں شامل کر لیا جائے

اور ثانیاً لیگ آف نیشنز کے ختم ہونے کے ساتھ ہی مینڈیٹ بھی ختم ہو گیا اور جنوب مغربی افریقہ کی نسبت اقوام متحدہ کو کسی قسم کی نگرانی کا اختیار حاصل نہیں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بین الاقوامی عدالت سے رائے طلب کی کہ جنوب مغربی افریقہ کی نسبت جو مینڈیٹ لیگ آف نیشنز نے جنوبی افریقہ کے سپرد کیا تھا وہ جاری ہے یا نہیں اور اگر جاری ہے تو نگرانی کا اختیار کس ادارے کو حاصل ہے۔ فریقین کے تحریری بیانات اور زبانی بحث پر غور کرنے کے بعد عدالت نے رائے دی کہ مینڈیٹ جاری ہے اور نگرانی کا اختیار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو حاصل ہے۔ اسمبلی کو چاہیئے کہ اس اختیار کے استعمال میں جہاں تک ہو سکے اس ضابطہ پر عمل کرے جس پر لیگ آف نیشنز کی کونسل عامل تھی۔ جب یہ معاملہ عدالت میں آیا اس وقت میں عدالت کا رکن نہیں تھا۔ عدالت کی اس رائے کے اظہار کے بعد جنوبی افریقہ کے موقف اور رویئے میں تو کوئی تبدیلی نہ ہوئی لیکن ان کی طرف سے یہ نیا عذر اسمبلی میں پیش کیا گیا کہ لیگ آف نیشنز کی کونسل تو بالاتفاق ہدایات جاری کرنے کی مجاز تھی۔ اس لئے عدالت کی رائے کے مطابق جنرل اسمبلی بھی بالاتفاق ہی ہدایات جاری کرنے کی مجاز ہے یعنی اگر کسی امر میں جنوبی افریقہ کو اسمبلی کی کثرت سے اختلاف ہو تو اس کے متعلق اسمبلی کوئی ہدایت جاری کرنے کی مجاز نہیں۔ اس پر اسمبلی نے دوبارہ عدالت سے رائے طلب کی کہ جنوب مغربی افریقہ کے متعلق نگرانی کے اختیارات استعمال کرنے میں اسمبلی کس ضابطے کے مطابق فیصلہ کرنے کی مجاز ہے یعنی کیا اسمبلی لیگ آف نیشنز کی کونسل کے اس قاعدے کی پابند ہے کہ فیصلہ اتفاق رائے سے ہو یا اقوام متحدہ کے میثاق کے فقرہ نمبر ۱۸ کی پابند ہے جس کے مطابق اہم امور میں اسمبلی دو تہائی کثرت سے فیصلہ کر سکتی ہے۔ عدالت کی رائے یہ ہوئی کہ اسمبلی بہر صورت اقوام متحدہ کے میثاق کی پابند ہے اور رائے شماری اسی قاعدے کے مطابق ہو سکتی ہے جو میثاق کے فقرہ نمبر ۱۸ میں درج ہے۔ یہ رائے عدالت نے ۷ جولائی ۱۹۵۵ء کو صادر کی۔ اس معاملے کی سماعت اور فیصلے میں میں شامل تھا۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جنوب مغربی افریقہ کے نظم و نسق کی پڑتال کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اور جنوبی افریقہ کی حکومت کا فرض قرار دیا تھا کہ جنوب مغربی افریقہ کی آبادی کی طرف سے جو عرضداشتیں اس کمیٹی کی توجہ کیلئے پیش کی جائیں وہ کمیٹی کو بھیج دی جائیں۔ جنوبی افریقہ نے جنوب مغربی افریقہ میں کمیٹی کا داخلہ بند کر دیا تھا اور عرضداشتوں کا بھیجنا بھی بند کر دیا۔ اس پر کمیٹی نے جنوب مغربی افریقہ کے باشندوں میں سے جو کوئی کمیٹی تک پہنچتا اور زبانی عرضداشت کرنا چاہتا ان کی زبانی عرضداشتوں کو جنوب مغربی افریقہ کے علاقے سے باہر سننا شروع کر دیا۔ جنوبی افریقہ کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ کمیٹی صرف تحریری عرضداشتوں پر غور کرنے کی مجاز ہے۔ زبانی عرضداشتوں کی سماعت اور ان پر غور کرنے کی مجاز نہیں۔ اس پر اسمبلی نے پھر بین الاقوامی عدالت سے رائے طلب کی کہ حالات پیش آمدہ میں جنوب مغربی افریقہ کمیٹی زبانی عرضداشت سننے کی مجاز ہے یا نہیں۔ عدالت نے تحریری بیانات اور زبانی بحث کی سماعت کے بعد رائے دی

کہ جب جنوبی افریقہ کی حکومت نے کمیٹی کو تحریری عرضداشتوں کا بھیجنا بند کر دیا ہے تو کمیٹی اپنے فرائض کی ادائیگی کیلئے کوئی مناسب متبادل طریقہ اختیار کرنے کی مجاز ہے۔ اس رائے کا مسودہ تیار کرنا میرے اور جج ریڈ کے سپرد کیا گیا۔ میں نے عدالت کی آراء اور فیصلہ جات کے مسودات کی تیاری کے متعلق بہت کچھ جج ریڈ سے سیکھا۔ جس کا بعد میں مجھے بہت فائدہ ہوا۔ یہ رائے عدالت نے یکم جون ۱۹۵۶ء کو صادر کی۔

یونیسکو UNESCO کے چار امریکن افسران کا تنازعہ | اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو کے عملے میں متعدد افسران عارضی اسامیوں پر متعین تھے جن کی ملازمت کے معاہدات کی اگرچہ سال بسال تجدید ہوتی تھی لیکن یہ روایت قائم ہو چکی تھی کہ سال کے دوران میں جس افسر کا کام تسلی بخش رہا ہو اس کے معاہدہ ملازمت کی تجدید کر دی جائے گی بشرطیکہ جس منصوبے کے سلسلے میں وہ کام کر رہا ہے وہ جاری ہو۔ ریاستہائے متحدہ کے صدر کی طرف سے ایک بورڈ اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا کہ بین الاقوامی اداروں میں امریکی کارکنان کی ملک سے وفاداری کی تحقیق کر کے رپورٹ کرے۔ اس بورڈ کی طرف سے یونیسکو کے چار امریکی افسران کو جو عارضی اسامیوں پر متعین تھے لکھا گیا کہ وہ بورڈ کے مجوزہ اعلانِ وفاداری کی خانہ پُری کر کے بورڈ کو بھیج دیں۔ ان افسران نے اس مراسلے کی تعمیل سے گریز کیا اس پر بورڈ کی طرف سے ان کے نام نوٹس جاری کئے گئے کہ وہ بورڈ کے روبرو حاضر ہو کر جواب دہی کریں۔ افسران نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ بورڈ نے اس تمام کیفیت کی رپورٹ یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل صاحب کی خدمت میں بھیج دی۔ ڈائرکٹر جنرل صاحب خود امریکن شہری تھے۔ انہوں نے چاروں افسران کو مطلع کر دیا کہ ان کا اعلان وفاداری کی خانہ پُری کرنے اور وفاداری بورڈ کے سامنے حاضر ہونے سے انکار کرنا ایک بین الاقوامی ادارے کے افسر کے معیار کے مطابق نہیں اسلئے آئندہ سال کیلئے ان کے عارضی ملازمت کے معاہدے کی تجدید نہیں کی جائیگی۔ اس پر چاروں افسروں نے یونیسکو کے محکمانہ اپیل بورڈ کے پاس ڈائرکٹر جنرل کے اس حکم کے خلاف اپیل کی۔ اپیل بورڈ نے قرار دیا کہ اعلان وفاداری کی خانہ پُری اور وفاداری بورڈ کے سامنے جوابدہی ان افسران کے فرائض میں شامل ہے لہٰذا ڈائرکٹر جنرل کا حکم واجب ہے۔ افسران نے اس حکم کے خلاف انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (I.L.O) کے محکمانہ ٹریبونل میں اپیل دائر کی اس ٹریبونل نے قرار دیا کہ ڈائرکٹر جنرل کا فیصلہ افسران متعلقہ کی شرائط ملازمت کے خلاف ہے اسلئے قابل نفاذ نہیں۔ اس پر یونیسکو کے انتظامی بورڈ نے بین الاقوامی عدالت سے رائے طلب کی کہ کیا I.L.O کے ٹریبونل کی یہ قرارداد کہ ڈائرکٹر جنرل کا حکم افسران متعلقہ کے شرائط ملازمت سے تعلق رکھتا ہے صحیح ہے۔

عدالت میں ایک الجھن یہ پیدا ہوئی کہ یونیسکو ایک بین الاقوامی ادارے یعنی اقوام متحدہ کی ایجنسی ہونے کی حیثیت میں بین الاقوامی عدالت میں پیش ہونے اور زبانی بیانات داخل کرنے کا مجاز تھا لیکن افسران متعلقہ بحیثیت افراد عدالت میں پیش ہونے یا بیانات داخل کرنے کے مجاز نہ تھے۔ اسلئے عدالت کے روبرو فریقین کو مساوات کا درجہ حاصل نہ تھا اور چونکہ بین الاقوامی عدالت میں مشاورتی رائے کی کارروائی بھی جوڈیشنل حیثیت رکھتی ہے اسلئے ایک فریق کی غیر حاضری میں عدالت

کسی رائے کے اظہار کی مجاز نہ تھی اور عدالت کو کسی رائے کے اظہار سے پرہیز کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب یونیسکو کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ہم نے جو تحریری بیان عدالت میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں داخل کیا ہے اسکی نقل افسران متعلقہ کو بھیج دی تھی اور انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر وہ بالارادہ کوئی بیان عدالت میں داخل کرنا چاہیں تو وہ ہمیں بھیج دیں۔ ہم عدالت میں داخل کر دیں گے چنانچہ ہمیں جو بیان انہوں نے بھیجا وہ عدالت میں داخل کر دیا ہے اور عملاً فریقین میں مساوات قائم رہی ہے۔ ہم اپنی طرف سے زبانی بحث نہیں کرنا چاہتے اس لئے زبانی بحث کے لحاظ سے بھی مساوات قائم رہی کہ نہ ہم بحث کریں نہ افسران کی طرف سے بحث ہو۔ عدالت کی کثرت نے اس موقف کی صحت کو تسلیم کیا اور قرار دیا کہ اس معاملے میں کسی زبانی بحث کی سماعت کی ضرورت نہیں۔ پانچ ججوں نے کثرت رائے سے اختلاف کیا جنمیں میں بھی شامل تھا۔ میں نے اپنی اختلافی رائے میں لکھا کہ عدالت نے اس معاملے میں جو ضابطہ اختیار کیا ہے اس سے ثابت ہے کہ عدالت کے روبرو فریقین کو مساوات حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ مساوات نہیں کہ ایک فریق براہ راست تو عدالت میں کوئی دستاویز یا بیان پیش نہ کر سکے اور اس کا فریق مخالف اس کی طرف سے جو بیان وہ پیش کرنا چاہے عدالت میں پیش کر دے۔ دوسرے عدالت نے زبانی بحث سننے سے اس لئے پرہیز نہیں کیا کہ زبانی بحث کے دوران میں مسئلہ زیر بحث پر مزید روشنی ڈالی جانیکی توقع یا امکان نہ تھا۔ یہ پرہیز محض اس وجہ سے اختیار کیا گیا کہ اگر یونیسکو کی طرف سے زبانی بحث کی سماعت کی جاتی تو عدالت اس معاملے پر رائے دینے کی مجاز نہ رہتی اسلئے میری رائے میں فریقین کو عدالت کے روبرو مساوات حاصل نہیں اور عدالت کو مشاورتی رائے کے اظہار سے انکار کر دینا چاہیئے۔

جب عدالت کے اراکین کی کثرت رائے سے یہ قرار پایا کہ فریقین کو عدالت کے روبرو مساوات حاصل ہے اور اسلئے عدالت کو مشاورتی رائے دینی چاہیئے تو اس امر پر تبادلہ خیالات کیا گیا کہ کیا I.L.O کے ٹریبیونل کا فیصلہ صحیح ہے۔ اس مرحلہ پر یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ کیا وہ پانچ جج جنکی رائے یہ تھی کہ عدالت کو اظہار رائے سے انکار کر دینا چاہیئے اب اصل استصواب پر رائے دینے کے مجاز ہیں۔ ہماری طرف سے یہ کہا گیا کہ گو ہماری رائے میں عدالت کو اظہار رائے سے انکار کر دینا چاہیئے تھا لیکن چونکہ کثرت رائے کی یہ ہے کہ عدالت رائے دینے کی مجاز ہے لہٰذا ہم کثرت کی رائے کے پابند ہیں اور اب مسئلہ زیر بحث پر اپنے باقی رفقاء کی طرح اظہار رائے کا حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ کثرت رائے سے ہمارے اس موقف کی صحت کو تسلیم کیا گیا اور ہم پانچوں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری آراء کو شامل کر کے عدالت کی کثرت کی یہ رائے ہوئی کہ I.L.O کی ٹریبیونل کو افسران کی اپیل کی سماعت اور اس پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار تھا۔ عدالت سے صرف اسی مسئلے پر رائے طلب کی گئی تھی اور عدالت کے سامنے یہ سوال زیر بحث نہیں تھا کہ I.L.O کی ٹریبیونل کا فیصلہ واقعات پر صحیح ہے یا نہیں۔ عدالت کی تجویز کا نتیجہ یہ ہوا کہ I.L.O کی ٹریبیونل کا فیصلہ قائم رہا اور افسران متعلقہ کی دادرسی ہوگئی عدالت کی یہ رائے ۲۳ راکتوبر ۱۹۵۶ء کو صادر ہوئی۔

حکومت فرانس اور حکومت ناروے کا تنازعہ | انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ناروے کے بعض نیم سرکاری اداروں نے بین الاقوامی مالی حلقوں کے ذریعہ فرانس کے بعض سرمایہ داروں سے قرضہ جات

حاصل کئے اور یہ عہد کیا کہ سود اور اصل کی اقساط کی ادائیگی سونے کی شرح کے مطابق کی جائے گی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد سب اکثر ممالک کی حکومتوں نے اپنے اپنے سکوں کو سونے کے معیار سے آزاد کر دیا تو ناروے کی حکومت نے بھی ایسا ہی اقدام کیا اور اس کے نتیجے میں ساتھ ہی یہ قانون بھی نافذ کیا کہ ہر قرضے کی واپسی اور سود کی ادائیگی رائج الوقت ملکی سکے میں ہوگی خواہ قرضہ کے معاہدے میں ادائیگی کی شرط اس سے مختلف ہی ہو گویا جہاں جہاں سونے کی شرح کے مطابق ادائیگی کا معاہدہ تھا ناروے کے مقروض اس شرط سے آزاد کر دیئے گئے۔ فرانسیسی قرضخواہوں نے مطالبہ کیا کہ انکے قرضہ جات کی ادائیگی سونے کی شرح کے مطابق کی جائے۔ یہ مطالبہ ناروے کی طرف سے رد کر دیا گیا اور کہا گیا کہ بین الاقوامی دستور کے مطابق قرضے کی ادائیگی مقروض کے ملکی قانون کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔ آخر فرانس کی حکومت نے اپنے ملکی قرض خواہوں کی حمایت میں یہ معاملہ بین الاقوامی عدالت میں پیش کر دیا اور عدالت سے استدعا کی کہ قرار دیا جائے کہ ناروے کے مقروض ادارے تمسکات کے اصل اور سود کی ادائیگی معاہدے کی شرائط کے مطابق کرنے کے پابند ہیں یعنی سونے کی شرح کے مطابق جس کے نتیجہ میں کئی گنا فرق پڑتا تھا۔

ناروے کی طرف سے ابتدائی عذر کیا گیا کہ بین الاقوامی عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہیں۔ دوسرا ابتدائی عذر یہ تھا کہ فرانس کی طرف سے ابتداء ہی میں اور اس تنازعہ کے عدالت میں آنے سے بھی چند سال قبل جو دستاویز بین الاقوامی عدالت کا اختیار سماعت قبول کرتے ہوئے داخل کی گئی تھی اس میں یہ استثناء درج ہے کہ جس تنازعے کے متعلق حکومت فرانس قرار دے کہ تنازعہ فرانس کے نجی قانون سے متعلق ہے اور بین الاقوامی قانون سے اس کا تعلق نہیں اس تنازعے کی سماعت کا اختیار بین الاقوامی عدالت کو نہیں ہوگا۔ اگرچہ ناروے کی طرف سے جو دستاویز عدالت کا اختیار سماعت قبول کرتے ہوئے داخل کی گئی تھی اس میں ایسی کوئی استثناء درج نہیں لیکن باہمی مساوات کے اصول کی رُو سے ناروے کی دستاویز میں فرانس کے بالمقابل ناروے کی طرف سے یہ استثناء درج سمجھی جانی چاہیئے۔ ناروے کی حکومت نے قرار دیا ہے کہ یہ تنازعہ ناروے کے ملکی قانون سے متعلق ہے بین الاقوامی قانون سے متعلق نہیں۔ لہٰذا بین الاقوامی عدالت کو اس تنازعہ کی سماعت کا اختیار نہیں۔ عدالت نے ناروے کے اس عذر کو قابل پذیرائی قرار دیکر فیصلہ کیا کہ عدالت کو اس تنازعہ کی سماعت کا اختیار نہیں۔ اس فیصلہ کی تیاری کیلئے عدالت نے مجھے اور جج دیناسکی کو منتخب کیا۔ فیصلہ ۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو صادر ہوا۔

حکومت سوئٹزرلینڈ اور حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ کا تنازعہ

دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے ایک تجارتی کمپنی کو دشمن ملک کی کمپنی قرار دیکر اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے حصص فروخت کرنے کا حکم دیدیا۔ کمپنی نے اس بنا پر کہ کمپنی سوس ہے جرمن نہیں امریکی عدالت میں مناسب چارہ جوئی کی۔ مقدمے کے دوران میں مدعا علیہ کی طرف سے کمپنی کے رجسٹرات اور دستاویزات طلب کرنے کی درخواست دی گئی۔ امریکی عدالت نے حکم دیا کہ مطلوبہ دستاویزات و رجسٹرات پیش کئے جائیں۔ تاریخ مقررہ پہ مدعی کمپنی نے عذر کیا کہ ان میں سے بعض دستاویزات تو کمپنی کے قبضے اور اختیار میں نہیں اور باقی دستاویزات کو سوس قانون ملک سے باہر لانے کی اجازت نہیں دیتا اسلئے مدعی

تعمیل حکم عدالت سے قاصر ہے۔ عدالت نے یہ عذر ناقابلِ پذیرائی قرار دیا اور عدم تعمیل حکم پر دعویٰ خارج کر دیا۔ مدعی کمپنی نے اس حکم کے خلاف امریکی سپریم کورٹ میں مرافعہ داخل کیا اس مرحلے پر حکومت سوئٹزرلینڈ نے ریاستہائے متحدہ کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں دعویٰ دائر کیا اور استدعا کی کہ عدالت قرار دے کہ مدعی کمپنی سوس کمپنی ہے اور جو اقدام کمپنی کے خلاف کیا گیا وہ ناجائز ہے۔ ساتھ ہی سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے درخواست دی کہ عدالت اس امر کا اظہار کرے کہ جب تک عدالت کا فیصلہ صادر نہ ہو امریکی حکومت کمپنی کے حصص فروخت کرنے سے باز رہے۔

عدالت کے قواعد کے مطابق اس درخواست کی فوری سماعت ہوئی۔ سماعت کے دن اطلاع ملی کہ کمپنی کا مرافعہ امریکی سپریم کورٹ میں منظور ہو کر عدالت ماتحت کا حکم جس کی رُو سے کمپنی کا دعویٰ خارج کیا گیا تھا منسوخ ہو گیا ہے اور سپریم کورٹ نے عدالت ماتحت کو ہدایت دی ہے کہ کمپنی کا دعویٰ بحال کر کے مطابق ضابطہ کارروائی جاری کی جائے۔ اس کارروائی کے دوران امریکی حکومت پر پہلے ہی پابندی تھی کہ تا فیصلہ حصص فروخت نہ کئے جائیں۔ اندریں حالات بین الاقوامی عدالت نے قرار دیا کہ حکومت سوئٹزرلینڈ کی درخواست پر عدالت کی طرف سے کسی اظہار کی ضرورت نہیں۔ یہ حکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو صادر ہوا۔

سوئٹزرلینڈ کے دعویٰ کے جواب میں امریکی حکومت نے عذرات ابتدائی دائر کئے کہ عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہیں ان میں سے ایک عذر یہ تھا کہ کمپنی کا دعویٰ امریکی عدالت میں زیر سماعت ہے، کمپنی امریکی عدالت میں اپنے دعویٰ کی پیروی کر رہی ہے، کمپنی کے دعویٰ کی کامیابی کی صورت میں حکومت سوئٹزرلینڈ کے لئے کوئی وجہ مخاصمت باقی نہیں رہے گی۔ جب تک یہ امر امریکی عدالت میں زیر غور ہے سوئٹزرلینڈ کی حکومت بین الاقوامی عدالت میں چارہ جوئی کی مجاز نہیں فریقین کی بحث سننے کے بعد عدالت نے قرار دیا کہ امریکی حکومت کا یہ عذر قابل پذیرائی ہے اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت کا دعویٰ قبل از وقت ہونے کی وجہ سے قابل سماعت نہیں۔ یہ حکم ۲۱ مارچ ۱۹۵۹ء کو صادر ہوا۔ بعد میں دونوں حکومتوں کے درمیان اس قضیئے کا رضامندی سے فیصلہ ہو گیا۔

حکومتِ پرتگال اور حکومتِ ہندوستان کا تنازعہ

۲۲ دسمبر ۱۹۵۵ء کو پرتگال کی حکومت نے حکومت ہند کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ ان کے مقبوضہ ساحلی علاقے دمن اور اس کے متعلقہ دو پرتگیزی علاقوں بنام دادر و نگر حویلی (جو اندرون ہند میں واقع ہیں) کے درمیان حکومت ہند نے پرتگیزی سلسلہ آمد و رفت ناجائز طور پر بند کر دیا ہے۔ اور استدعا کی کہ عدالت قرار دے کہ دمن دادرا اور نگر حویلی کے درمیان پرتگیزی افواج، پولیس، افسران و رعایا کو معہ اسلحہ و سازوسامان تجارت آمد و رفت کا حق حاصل ہے اور حکومت ہند کا اس میں خلل انداز ہونا بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے اور مزید استدعا کی کہ حکومت ہند کو ہدایت دی جائے کہ وہ اپنی ناجائز دخل اندازی سے باز رہ کر پرتگال کی شکایت اور حق تلفی کا ازالہ کرے۔ حکومت ہند کی طرف سے اس کے جواب میں چھ ابتدائی عذرات کئے گئے کہ عدالت کو اس قضیئے کی سماعت کا اختیار حاصل نہیں۔ فریقین کی بحث سننے کے بعد عدالت نے عذرات میں سے چار کو نورد کر دیا اور باقی دو پر واقعات کی بحث کے موقعہ پر مزید بحث سماعت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی تیاری کیلئے عدالت نے مجھے اور

سرلاٹر پافٹ کو منتخب کیا اور یہ فیصلہ ۲۶ رنومبر ۱۹۵۷ء کو صادر ہوا۔

حکومت ہند کی طرف سے واقعاتی جواب دعویٰ، حکومت پرتگال کی طرف سے جواب الجواب اور حکومت ہند کی طرف سے تردید جواب الجواب داخل ہوئے۔ ہندوستان کی طرف سے عذر کیا گیا کہ پرتگال کو دمن، دادرا اور نگر حویلی پر صرف "حقوق جاگیرداری" حاصل ہیں "اختیار حکومت" حاصل نہیں۔ پرتگال جن حقوق آمدورفت کا دعویدار ہے ان میں سے کوئی حق بھی اسے حاصل نہیں جس حد تک پہلے آمدورفت کا سلسلہ ان علاقوں کے درمیان رہا ہے وہ حکومت ہند کی رضامندی اور اجازت سے رہا ہے استحقاقاً نہیں رہا۔ دادرا اور نگر حویلی کے باشندے اپنی آزادی کا اعلان کر چکے ہیں اس اعلان پر ہندوستانی نواحی علاقوں میں دادرا اور نگر حویلی کی آبادی کی تائید میں اور پرتگیزی حکومت کے خلاف بہت جوش ہے۔ اندریں حالات دمن اور ان دونوں علاقوں کے درمیان پرتگیزی آمدورفت اشتعال کا موجب ہو سکتی ہے اور پرتگیزی افسران کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے حکومت ہند کا اقدام اس حالت میں بین الاقوامی قانون کے مطابق ہے اس کے خلاف نہیں۔

فریقین کی بحث سماعت کرنے کے بعد عدالت نے باقی ابتدائی عذرات کا فیصلہ بھی ہندوستان کے خلاف کیا اور قرار دیا کہ عدالت کو اس قضیے کے متعلق اختیار سماعت حاصل ہے۔ مزید قرار دیا کہ (۱) پرتگال کو دمن، دادرا اور نگر حویلی پر "اختیار حکومت" حاصل ہے (۲) پرتگال کو فوج، مسلح پولیس، اسلحہ کے متعلق حق آمدورفت حاصل نہیں۔ البتہ سول افسران، رعایا اور تجارتی مال وغیرہ کی آمدورفت کا حق حاصل ہے (۳) حالات پیش آمدہ میں جن کا ادعا حکومت ہند کی طرف سے کیا گیا ہے اور جن کا انکار حکومت پرتگال کی طرف سے نہیں کیا گیا حکومت ہند کا حملہ آمدورفت معطل کر دینا بین الاقوامی قانون کے خلاف نہیں اس فیصلے کی تیاری بھی عدالت نے میرے اور جج بادے واں کے سپرد کی۔ یہ فیصلہ ۱۲ را پریل ۱۹۶۰ء کو صادر ہوا۔

انتخاب بطور نائب صدر بین الاقوامی عدالت | ۱۹۵۸ء کے انتخابات میں ناروے کے جج کلاسٹیڈ صدر عدالت منتخب ہوئے اور مجھے نائب صدر منتخب کیا گیا۔

حکومت ہالینڈ اور حکومت سویڈن کا تنازعہ | ۱۹۰۲ء میں لیگ آف نیشنز میں ایک کنونشن نابالغان کی ولایت کے متعلق مرتب ہوئی جس میں قرار دیا گیا کہ جو نابالغ اپنی قومیت کے ملک سے باہر رہائش رکھتا ہو اس کی ولائت کا سوال اس کی قومیت کے ملک کے قانون کے مطابق طے ہوگا۔ ہالینڈ اور سویڈن دونوں نے اس کنونشن کی پابندی منظور کی۔ اس کنونشن کے فقرہ نمبر ۷ کی رو سے نابالغ کی رہائش کے ملک کے متعلقہ محکمہ جات کا اختیار اس حد تک تسلیم کیا گیا تھا کہ فوری ضرورت کے پیش آجانے پر متعلقہ محکمہ جات نابالغ کی ذات اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے مناسب کارروائی کر سکتے ہیں۔ ایک ہولنڈی شہری بنام یوحنس بول نے جو ایک بحری جہاز کے کپتان تھے ایک سویڈش خاتون سے شادی کی اور سویڈن میں ہی بس گئے۔ اس شادی کے نتیجے میں ایک دختر ۱۹۴۵ء میں سویڈن میں پیدا ہوئی۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کو اس کی والدہ فوت ہو گئیں۔ بیوی کی وفات کے بعد کپتان بول نے اپنی رہائش ہالینڈ میں منتقل کر لی۔ ہولنڈی عدالت نے کپتان بول کو اس بچی کا ولی مقرر کر دیا۔ اس اثناء میں سویڈن کے

بہبودی اطفال کے محکمہ نے سویڈن کے ۱۹۲۴ء کے ایک قانون کے مطابق جو سب اطفال پر حاوی تھا اس بناء پر کہ کپتان بول کی بچی اعصابی عارضے میں مبتلا ہے بچی کی حفاظت بچی کے نانا اور نانی کے سپرد کر دی۔ کپتان بول نے سویڈن کی عدالت میں اپنی ولایت کے حقوق تسلیم کئے جانے کے متعلق کارروائی کی۔ سویڈن کی عدالت نے کپتان بول کو بچی کا ولی تسلیم کیا اور بچی کی جائداد اس کے سپرد کر دی۔ جب کپتان بول نے بچی کی حفاظت طلب کی تو محکمہ بہبودی اطفال نے اس بناء پر اس کی درخواست رد کر دی کہ بچی اعصابی عارضے کی وجہ سے ۱۹۲۴ء کے قانون کے ماتحت ابھی حفاظتی انتظام کی محتاج ہے۔ کپتان بول نے محکمے کی اس تجویز کے خلاف سویڈن کی عدالتوں میں چارہ جوئی کی لیکن محکمے کی تجویز برقرار رہی۔

جولائی ۱۹۵۷ء میں حکومت ہالینڈ نے حکومت سویڈن کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ سویڈن کے محکمہ بہبودی اطفال اور سویڈن کی عدالتوں کا موقف ۱۹۰۲ء کی ہیگ کنونشن کے خلاف ہے اور استدعا کی کہ عدالت قرار دے کہ ہیگ کنونشن کی شرائط کے مطابق کپتان بول ہولینڈی قانون ولایت کے ماتحت اپنی بچی کا ولی ہے اور بحیثیت ولی بچی کی حفاظت کا حقدار ہے۔ سویڈن کی حکومت کی طرف سے جواباً کہا گیا کہ سویڈن کا بہبودی اطفال کا قانون ولایت کے قانون میں عارض نہیں اور جب تک بچی کی بہبودی کے مدنظر اس کا اپنے ننہیال میں رہنا اس کی صحت کے لحاظ سے ضروری سمجھا جائے اس کا باپ بحیثیت اس کا ولی ہونے کے بچی کی حفاظت کا حقدار نہیں۔ اندریں حالات محکمہ بہبودی اطفال کا اور سویڈن کی عدالتوں کا موقف ۱۹۰۲ء کی ہیگ کنونشن کے خلاف نہیں۔ بین الاقوامی عدالت نے سویڈن کے جواب کو صحیح قرار دیا اور فیصلہ کیا کہ سویڈن کا ۱۹۲۴ء کا قانون حقوق ولایت میں دخل نہیں دیتا۔ یہ بہبودی اطفال کا عام قانون ہے جو سب بچوں پر حاوی ہے اور ہیگ کنونشن کی زد سے باہر ہے۔ ججوں کے باہم تبادلہ خیالات کے دوران میں میں نے جینی جج ویلنگٹن کو کو اپنے اس نظریے کا مؤید پایا کہ کنونشن کے فقرہ نمبر ۷ میں فوری ضرورت کا استثنا کیا گیا ہے محکمہ بہبودی اطفال کا اقدام فوری ضرورت کے ماتحت تھا۔ طبی رائے میں وہ ضرورت ختم نہیں ہوئی ابھی جاری ہے۔ جب تک محکمے کا اطمینان نہ ہو کہ جس ضرورت کے ماتحت بچی کی حفاظت اس کے نانا اور نانی کے سپرد کی گئی تھی وہ ضرورت ختم ہو چکی ہے محکمہ اپنی تجویز کو قائم رکھنے پر حق بجانب ہے۔ جج ویلنگٹن کو نے اپنے فیصلے کی بناء کنونشن کے فقرہ نمبر ۷ پر رکھی اور میں نے ان کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا۔ عدالت کا فیصلہ ۲۸ نومبر ۱۹۵۸ء کو صادر ہوا۔

حکومت اسرائیل اور حکومت بلغاریہ کا تنازعہ | حکومت اسرائیل کے مطابق اسرائیلی ہوائی کمپنی کا ایک طیارہ ۲۷ جولائی ۱۹۵۵ء کی صبح کو ویانا سے اسرائیل کو پرواز کرتا ہوا خرابی موسم یا کسی اور وجہ سے سہواً اپنے رستے سے ذرا ہٹ کر بلغاریہ کے کرۂ ہوائی میں سے پرواز کر رہا تھا کہ بلغاریہ کی ہوائی فوج نے طیارے کو گولی کا نشانہ بنا کر نیچے گرا دیا۔ طیارے کو گرتے ہوئے آگ لگ گئی۔ اس کے عملے کے سات افراد اور اکیاون مسافر سب کے سب لقمہ اجل ہو گئے۔ حکومت اسرائیل نے بلغاریہ کی ہوائی فوج کی اس حرکت پر بلغاریہ کی حکومت کے پاس احتجاج کیا اور متعلقہ افراد کی سزا اور طیارے کے عملے اور مسافروں کی تلفی کے معاوضے کا مطالبہ کیا۔ حکومت بلغاریہ کا ابتدائی موقف تو ہمدردانہ تھا لیکن آخر حکومت اسرائیل کی تسلی نہ ہو سکی اور اس کی طرف سے حکومت

بلغاریہ کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں اپنا مطالبہ منوانے کیلئے دعویٰ دائر کر دیا گیا۔ حکومت بلغاریہ نے ابتدائی عذرات داخل کئے کہ عدالت کو اس قضیئے کی سماعت کا اختیار نہیں۔ حکومت اسرائیل کا موقف تھا کہ حکومت بلغاریہ نے ۲۹ رجولائی ۱۹۲۱ء کو بین الاقوامی عدالت کی پیشرو عدالت کا اختیار سماعت قبول کرنے کی دستاویز داخل کی تھی۔ جب ۱۴ ردسمبر ۱۹۵۵ء کو بلغاریہ اقوام متحدہ کا رکن بن گیا تو بین الاقوامی عدالت کے STATUTE کے مطابق بلغاریہ کی دستاویز مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۹۲۱ء موجودہ بین الاقوامی عدالت کے اختیار سماعت کو قبول کرنے کی دستاویز کے مترادف ہو گئی۔ اور اس دستاویز کے مطابق عدالت کو اختیار سماعت حاصل ہے۔ اس موقف کے متعلق حکومت بلغاریہ کا کہنا تھا کہ جو ممالک بین الاقوامی عدالت کی پیشرو عدالت کے ختم ہو جانے یعنی ۱۸ راپریل ۱۹۴۶ء سے قبل اقوام متحدہ کے رکن بن چکے تھے انکی دستاویز تو موجودہ بین الاقوامی عدالت کے اختیار سماعت کو منظور کرنے کی دستاویزات شمار ہوں گی لیکن جو ممالک تاریخ مذکورہ تک اقوام متحدہ کے رکن نہیں ہوئے ان کی دستاویزیں ۱۸ راپریل ۱۹۴۶ء کو پیشرو عدالت کے ختم ہونے پر ساقط ہو گئیں اور اس تاریخ کے بعد کسی ملک کے اقوام متحدہ کا رکن بن جانے پر ایسی ساقط شدہ دستاویزات کا احیاء نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ بلغاریہ ۱۴ ردسمبر ۱۹۵۵ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا اسلئے بلغاریہ کی دستاویز مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۹۲۱ء جسکے رو سے بلغاریہ نے موجودہ عدالت کی پیشرو عدالت کے اختیار سماعت کو منظور کیا ہوا تھا ۱۸ راپریل ۱۹۴۶ء کو ساقط ہو گئی۔ یہ ساقط شدہ دستاویز عدالت کو اختیار سماعت نہیں دے سکتی۔ عدالت نے یہ عذر تسلیم کیا اور اس کے مطابق ۲۶ رمئی ۱۹۵۹ء کو فیصلہ صادر کیا۔

حکومت بلجیم اور حکومت ہالینڈ کا تنازعہ | بلجیم اور ہالینڈ کی سرحد پر واقع کچھ زمین کے متعلق اختلاف تھا کہ بلجیم میں شامل ہے یا ہالینڈ میں۔ ۷ مارچ ۱۹۵۷ء کو دونوں حکومتوں کے مابین ایک اقرارنامہ لکھا گیا کہ اس اختلاف کے فیصلے کیلئے بین الاقوامی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ اقرارنامہ ۲ نومبر ۱۹۵۷ء کو عدالت میں داخل کیا گیا۔ فریقین کے تحریری بیانات، زبانی بحث اور عدالت میں پیش کردہ دستاویزات پر غور کرنے اور خصوصاً متعلقہ دستاویزات اور نقشہ جات کی چھان بین کے بعد عدالت کو اختلاف کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ اور عدالت پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ متنازعہ زمین بلجیم میں شامل ہونی چاہیئے۔ عدالت نے فیصلہ تیار کرنیکے لئے مجھے اور سر پرسی سپنڈر کو منتخب کیا۔ فیصلہ ۲۰ رجون ۱۹۵۹ء کو صادر ہوا۔

IMCO کی بحری حفاظتی کمیٹی کے اراکین کے انتخاب کا تنازعہ | ۶ رمارچ ۱۹۴۸ء کو ایک کنونشن کے مطابق INTER GOVERNMENTAL MARITIME CONSULTATIVE ORGANISATION (IMCO) کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس ادارے کی اسمبلی کے فرائض میں بحری حفاظتی کمیٹی کے اراکین کا انتخاب کرنا بھی شامل ہے کنونشن میں درج ہے کہ بحری حفاظتی کمیٹی کے ۱۴ اراکین ہونگے جنہیں IMCO کی اسمبلی اپنے ان اراکین میں سے منتخب کریگی جنہیں بحری آمد و رفت کی حفاظت میں گہری دلچسپی ہو۔ ان میں کم سے کم آٹھ اراکین تو وہ ممالک ہوں گے جو جہازوں کی ملکیت کے لحاظ سے فہرست ممالک میں پہلے آٹھ ہوں باقی چھ اراکین ان دیگر ممالک سے منتخب کئے جائیں گے جنہیں جہازوں کا کثیر عملہ بہم پہنچانے یا کثیر تعداد مسافروں

کی مہیا کرنے یا جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے بحری آمدورفت کی حفاظت میں گہری دلچسپی ہو۔ اسمبلی میں بحری حفاظتی کمیٹی کا انتخاب ۱۵ جنوری ۱۹۵۹ء کو عمل میں آیا۔ لائیڈز کے بحری جہازوں کے رجسٹر ۱۹۵۸ء کے مطابق جہازوں کی ملکیت کے لحاظ سے لائبیریا دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر اور پاناما آٹھویں نمبر پر تھا لیکن اسمبلی نے ان دونوں ملکوں کا انتخاب نہ کیا۔ انتخاب کے اختتام پر لائبیریا نے تجویز پیش کی کہ اسمبلی بین الاقوامی عدالت سے استصواب کرے کہ آیا انتخاب اراکین بحری حفاظتی کنونشن کے مطابق عمل میں آیا ہے یا نہیں۔ اسمبلی نے ۱۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو یہ تجویز منظور کر لی اور IMCO کے سیکریٹری جنرل نے ۲۳ مارچ ۱۹۵۹ء کو یہ درخواست عدالت میں بھیج دی۔ تحریری بیانات داخل شدہ اور زبانی بحث کے دلائل پر غور کرنے کے بعد عدالت کی رائے ہوئی کہ کنونشن متعلقہ کے فقرہ نمبر ۲۸ (الف) کا منشاء یہ ہے کہ کم سے کم آٹھ سب سے بڑے مالکانِ جہاز ممالک کا انتخاب بحری حفاظتی کمیٹی کے اراکین کے طور پر لازماً ہونا چاہیئے۔ لہٰذا لائبیریا اور پانامہ کو منتخب نہ کرنا فقرہ نمبر ۲۸ (الف) کی خلاف ورزی ہے۔ یہ رائے ۸ جون ۱۹۶۰ء کو صادر کی گئی۔

وسطی امریکہ کے دو ممالک ہانڈوراس اور نکاراگوا کی حکومتوں کے مابین تنازعہ

وسطی امریکہ کے پڑوسی ممالک ہانڈوراس اور نکاراگوا کی درمیانی حدفاصل متعین کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے درمیان ۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو ایک معاہدہ ہوا جس کے رو سے ایک مشترکہ کمشن اس غرض کیلئے قائم کی گئی کہ وہ معاہدے کی شرائط کے مطابق دونوں ملکوں کی حدفاصل متعین کرے۔ معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کمشن اپنے کام کی تکمیل بالاتفاق نہ کر سکے تو جو حصہ کام کا باقی رہ جائے وہ ثالث کے سپرد کیا جائے۔ ثالثی فیصلے کے دونوں ممالک پابند ہوں گے۔ اس کمشن نے اپنا کام بحرالکاہل کی جانب سے شروع کیا اور حدفاصل کا اکثر حصہ بالاتفاق متعین کر لیا بحر اوقیانوس کے قریب دو صد میل دورے کمشن کے اراکین کے درمیان اختلاف ہو گیا بالآخر اکتوبر ۱۹۰۴ء میں بقیہ حدفاصل کی تعین کا کام بطور ثالث ہسپانیہ کے بادشاہ الفانسو سیزدہم کے سپرد کیا گیا۔ بادشاہ نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو ثالث بننا منظور کر لیا۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور متفقہ ضابطے کے مطابق اپنا اپنا کیس بادشاہ کے سامنے پورے طور پر پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اپنا ثالثی فیصلہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو صادر کیا یہ فیصلہ زیادہ تر ہانڈوراس کے ادعا کے موافق تھا۔ نکاراگوا کے صدر نے اس فیصلے کی اطلاع ملنے پر ہانڈوراس کے صدر کو مبارکباد کا تار دیا جس میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ یہ قضیہ جو دو پڑوسی ملکوں کے درمیان اختلاف کا موجب تھا ثالثی کے پرامن طریق سے طے پا گیا۔ دونوں ملکوں کی طرف سے شاہ الفانسو کی خدمت میں بھی مبارکباد کے پیغام ارسال کئے گئے۔ نکاراگوا کے وزیر خارجہ نے ملکی پارلیمنٹ میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ثالثی فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا اور پارلیمنٹ نے ثالثی فیصلہ کی تصدیق کر دی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ثالثی فیصلے کے عملی نفاذ میں تاخیر ہوتی گئی۔ آخر مارچ ۱۹۱۲ء میں نکاراگوا کی حکومت نے فیصلہ ثالثی کے نفاذ سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ کئی وجوہ سے فیصلہ ثالثی قابلِ پذیرائی نہیں۔ دونوں ملکوں کی طرف سے اس قضیئے کے تصفیہ کے لئے مختلف اوقات میں سعی کی گئی لیکن قضیہ طے ہونے میں نہ آیا۔ آخر ۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو دونوں

ملکوں کے درمیان ایک اقرارنامہ ہوا کہ اس قضیئے کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت کے سپرد کیا جائے۔ یکم جولائی ۱۹۵۸ء کو سفیر ہانڈوراس متعینہ ہالینڈ نے اپنی حکومت کی ہدایت کے ماتحت اقرارنامہ مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء کی بناء پر عدالت میں درخواست دائر کی کہ اس قضیئے کا فیصلہ مطابق ضابطہ مندرجہ اقرارنامہ مذکور کیا جائے۔ تحریری بیانات اور زبانی بحث میں نکاراگوا کی طرف سے عذر کیا گیا کہ شاہ الفانسو کا تقرر بطور ثالث معاہدہ ۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء کی شرائط کے مطابق نہیں کیا گیا تھا۔ شاہ الفانسو کے ثالثی منظور کرنے سے پہلے معاہدہ مذکور کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ فیصلہ ثالثی کی تجویز مطابق ضابطہ مندرجہ معاہدہ مذکور نہیں ہوئی۔ فیصلہ ثالثی اسقدر مبہم اور متضاد ہے کہ عملاً اس کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ بدیں وجوہات فیصلہ ثالثی قابل پذیرائی نہیں اور نکاراگوا اس فیصلے کا پابند نہیں۔ ہانڈوراس کی طرف سے ان تمام عذرات کی تردید کی گئی اور استدعا کی گئی کہ عدالت قرار دے کہ فیصلہ ثالثی قابل پذیرائی ہے اور نکاراگوا پر اس کے عملی نفاذ کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے عدالت نے بعد غور قرار دیا کہ کہ شاہ الفانسو کا تقرر بطور ثالث مطابق شرائط ۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء عمل میں آیا تھا۔ اور نہ صرف شاہ الفانسو کی منظوری معاہدے کی میعاد کے اندر دیگئی تھی بلکہ فیصلہ ثالثی بھی معاہدے کی میعاد کے اندر صادر کیا گیا تھا۔ فیصلہ ثالثی کی تجویز مطابق ضابطہ مندرجہ معاہدہ مذکور ہوئی اور فیصلے کے اندر کوئی ایسا ابہام یا تضاد نہیں جس کی وجہ سے فیصلے کے عملی نفاذ کے رستے میں کوئی مشکل پیدا ہوتی ہو۔ علاوہ ازیں جب حکومت نکاراگوا نے شاہ الفانسو کی ثالثی کو قبول کر لیا اور ثالثی کی کارروائی کے دوران اپنی طرف سے پوری پیروی کی تو بعد میں نکاراگوا کی طرف سے یہ عذر مسموع نہیں ہو سکتا کہ شاہ الفانسو کے تقرر بطور ثالث میں کسی قسم کی خامی یا نقص رہ گیا تھا۔ اور فیصلہ ثالثی صادر ہونے کے بعد نکاراگوا کا اس فیصلے کو قبول کرنا اور مارچ ۱۹۱۲ء تک اس کے متعلق کسی قسم کا عذر نہ کرنا نکاراگوا پر فیصلے ثالثی کی پابندی عاید کرتا ہے۔ اس فیصلے کی تیاری کیلئے بھی عدالت نے مجھے اور چینی جج ولنگٹن کو کا انتخاب کیا۔ یہ فیصلہ ۱۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو صادر ہوا۔

بین الاقوامی عدالت کے چھ سالہ عرصہ رکنیت میں بعض دوسرے اراکین عدالت

بین الاقوامی عدالت میں میری رکنیت میرے منتخب ہونے کے ساتھ ہی ۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو شروع ہو گئی تھی۔ یوں تو انتخاب ۹ سال کی میعاد کے لئے ہوتا ہے لیکن میرا انتخاب بی این راؤ کی وفات کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان کی میعاد رکنیت ۵ فروری ۱۹۶۱ء کو ختم ہونی تھی لہٰذا میری رکنیت کی میعاد بھی اسی تاریخ تک تھی۔ اس دوران میں عدالت کے اراکین میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ چین کے جج شو مو جولائی ۱۹۵۶ء میں اپنی میعاد ختم کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے اور انکی میعاد کے باقی عرصے کیلئے ان کی جگہ چینی جج ولنگٹن کو منتخب ہوئے۔ جب فروری ۱۹۵۸ء میں ان کی میعاد ختم ہوئی تو وہ دوبارہ ۹ سال کیلئے منتخب ہو گئے۔ جج شو مو کا موقف بالکل غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور قانون کے مطابق ہوتا تھا۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کی جو امریکہ میں تھے خودکشی کی اندوہناک خبر ملی۔ یہ صدمہ انکی صحت پر بہت اثر انداز ہوا۔ انکی وفات اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔ جج ولنگٹن کو چین کے ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے قبل کے زمانے سے اپنے ملک کی خدمت کرتے آئے تھے۔

۱۹۱۹ء میں پیرس کی صلح کانفرنس میں وہ اپنے ملک کے وفد کے لیڈر تھے۔ لیگ آف نیشنز اور پھر اقوام متحدہ کی تشکیل میں وہ شامل رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ امریکہ میں چین کے سفیر مقرر ہوئے اور بین الاقوامی عدالت کی رکنیت کیلئے منتخب ہونے تک دس سال سے زائد عرصہ انہوں نے یہ اہم خدمت انجام دی۔ بین الاقوامی عدالت میں اپنی میعاد کے آخری تین سال عدالت کے نائب صدر رہے اور ۵ رفروری ۱۹۶۷ء کو ریٹائر ہوگئے۔ جج شوموا اور جج ولنگٹن کو دونوں کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم تھے۔ برطانیہ کے جج لاٹرپاخٹ بھی ۱۹۶۰ء میں فوت ہوگئے اور انکی جگہ برطانیہ کے سر جیرلڈ فٹزمارس منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ قبل سان سالوے ڈار کے جج گریرو بھی فوت ہوگئے تھے۔ انکی جگہ پانامہ کے جج الفارو منتخب ہوئے۔ سان سالوے ڈار وسطی امریکہ کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ جج گریرو وہاں کے سیاستدان تھے اپنے ملک کی خدمت سے سفیر کبیر کے عہدہ سے پوری تنخواہ بطور پنشن حاصل کرکے ریٹائر ہوئے اور پھر لیگ آف نیشنز کی بین الاقوامی عدالت کے جج اور بعد میں اس عدالت کے صدر ہوئے۔ اس عدالت کے ختم ہونے پر وہاں سے پنشن یاب ہوئے اور موجودہ بین الاقوامی عدالت کے جج منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تین سال عدالت کے صدر اور پھر ۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک تین سال نائب صدر رہے۔ ۱۹۵۵ء میں میعاد ختم ہونے پر دوبارہ منتخب ہوئے اور دوسری میعاد ختم ہونے سے قبل ۱۹۶۰ء میں فوت ہوگئے۔

پولینڈ کے جج ونیارسکی، مصر کے جج عبدالحمید بدوی، یوگوسلاویہ کے جج زوریے پیچ اور کینیڈا کے جج ریڈ کی میعاد بھی ۵ رفروری ۱۹۵۸ء کو ختم ہوئی۔ ان میں سے جج ونیارسکی اور جج عبدالحمید بدوی تو پھر منتخب ہوگئے اور زوریے پیچ اور ریڈ کی جگہ یونان کے جج سپیروپولوس اور آسٹریلیا کے سر پرسی سپینڈر منتخب ہوگئے۔

میرے چھوٹے بھائی عبداللہ خاں کی وفات | بین الاقوامی عدالت کی رکنیت کے دوران ۱۹۵۹ء میں مجھے اپنے بھائی عبداللہ خاں کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ وہ کراچی میں ایڈیشنل کلیمز کمشنر تھے اور جماعت احمدیہ کراچی کے امیر بھی تھے۔ طبیعت کے حلیم، متواضع، صابر اور کم گو تھے۔ ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا اور بہت ہیں جو ان سے فیضیاب ہوئے کئی سالوں سے ان کی صحت اچھی نہ تھی اور وفات سے پہلے تین سال تو انہوں نے پیہم درد و کرب میں گذارے لیکن اس سارے عرصے میں اپنے فرائض منصبی کی کماحقہٗ سرانجام دہی، بنی نوع انسان کی گہری ہمدردی اور سلسلہ عالیہ احمدیہ کی مخلصانہ خدمت میں کسی قسم کی سستی یا کوتاہی سرزد نہ ہونے دی نہ ہی کبھی حرف شکایت زبان پر آنے دیا عبداللہ خاں فرمانبردار بیٹا، اطاعت گذار بھائی، مونس و غمخوار خاوند، شفیق باپ، وفادار اور قابل اعتماد دوست تھا۔ اس کا دل نور ایمان سے منور تھا۔ میرے ساتھ اسے گہری محبت تھی، میں نے اس کا پیارا چہرہ آخری مرتبہ ۱۵ر فروری ۱۹۵۹ء کی سہ پہر کو کراچی کے مطار پر دیکھا جب میں نے اسے لاہور جانے کیلئے رخصت کیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد اسی رات اس کے سینے میں شدید درد اٹھا اور ساتھ ہی بخار بھی ہوگیا۔ کچھ دن بعد اس حالت میں کچھ افاقہ تو ہوا لیکن دراصل پھر طبیعت سنبھلی نہیں۔ کمزوری بڑھتی گئی اور دبے ہوئے عوارض ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔ آخر ایں جانِ عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست

روز ہے رنجش بہ بینم و تسلیم وے کنم۔ کاانہ لی عہد وفا کیا۔ اس کی وفات کے وقت میں ہیگ میں تھا۔ میرا جسم دُور تھا لیکن میری روح اس کے گرد بیقرار رب العالمین کے حضور اس کی صحت یابی کیلئے زاری میں تھی۔ عبداللہ خاں اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتا ہوا اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا اور ہم بھی اپنے اپنے وقت پر وہیں جانیوالے ہیں اور وہاں پھر جدائی نہ ہوگی۔

۱۹۶۰ء میں ہونیوالے انتخاب اراکین عدالت میں ناکامی

امریکہ کے جج ہیکورتھ، ناروے کے جج کلیسٹاڈ، یوراگوے کے جج آرمانڈ اُوگاں روس کے جج کوجیونیکوو کی اور میری میعاد ۵ رفروری ۱۹۶۱ء کو ختم ہونیوالی تھی۔ جج ہیکورتھ کا نام امریکہ کی طرف سے تو نہیں لیکن بعض اور ممالک کی طرف سے دوبارہ انتخاب کیلئے پیش کیا گیا۔ جج کلیسٹاڈ اور جج ارمانڈ اُوگاں کے نام ان کے اپنے ممالک کی طرف سے اور بعض دیگر ممالک کی طرف سے بھی دوبارہ انتخاب کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ یہی صورت میرے متعلق بھی تھی۔ یہ انتخابات ۱۹۶۰ء کے اسمبلی کے سالانہ اجلاس کے دوران میں ہونیوالے تھے۔ انتخاب سے کچھ عرصہ قبل آغا شاہی صاحب نے اور خان بہادر سید اطاعت حسین صاحب نے نیویارک سے مطلع کیا کہ مقابلہ سخت ہے ہماری طرف سے پوری کوشش ہو رہی ہے لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ کامیابی یقینی ہے ان صاحبان کی پریشانی کے پیش نظر میں نے خان بہادر صاحب کو لکھا کہ ہمیں اپنے محدود نقطہ نگاہ سے اندازہ ہے کہ یہ نیک اقدام ہے اسلئے ہمیں اس کے لئے مناسب کوشش کرنی چاہیئے۔ سو آپ کوشش کر رہے ہیں اور میں آپ کا اور آغا شاہی صاحب کا ممنون ہوں نتیجہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے حق میں کون امر بہتر اور زیادہ مفید ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے آپ مناسب کوشش کرتے رہیں لیکن پریشان نہ ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس خدمت کے لائق سمجھے گا اور یہ خدمت مجھ سے لینا چاہے گا تو مقابلہ خواہ کسقدر سخت ہو وہ اپنے فضل سے کامیابی عطا فرمائے گا۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی اور خدمت لینا چاہے گا تو کوئی اور رستہ کھول دیگا۔

ہیگ میں ایک نہایت مخلص مومنہ ہولنڈی خاتون عزیزہ والسٹر تھیں میں نے ان کی خدمت میں دعا کیلئے گذارش کی تھی۔ جب انتخاب کے نتیجے کی اطلاع عدالت میں موصول ہوئی تو ڈاکٹر اکوار ونے ڈپٹی رجسٹرار میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اور کہا افسوس ہے جن پانچ ججوں کے نام دوبارہ انتخاب کیلئے پیش تھے ان میں سے کوئی بھی منتخب نہیں ہوا۔ ان کے جاتے ہی میں مسز عزیزہ والسٹر کی خدمت میں ٹیلیفون پر ان کی دعاؤں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں اطلاع دی کہ انتخاب میں کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے سنتے ہی فرمایا "مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى"۔ دوسرے دن مسجد میں نماز جمعہ کے بعد انہوں نے مجھ سے فرمایا کل سے انتخاب کی خبر سننے کے بعد میری طبیعت میں بڑے زور سے یہ خیال آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے کوئی اور اہم خدمت لینا چاہتا ہے۔

امریکہ کی ڈینور یونیورسٹی سے پروفیسری کی پیشکش

انتخاب کے نتیجے کی اطلاع کے دو دن بعد مجھے ڈاکٹر جوزف کوربل کی طرف سے (جو کشمیر کے قضیئے سے متعلق اقوام متحدہ کی قائم کردہ کمیشن کے رکن رہے تھے اور جنوری ۱۹۴۹ء میں

کمشن سے علیحدہ ہو کر اور اپنے وطن چیکوسلاواکیہ سے منتقل ہو کر امریکہ کی ڈینور یونیورسٹی میں سوشل سائنس فونڈیشن میں پروفیسر مقرر ہوئے تھے اور اب فونڈیشن کے ڈائرکٹر کے عہدے پر سرفراز ہیں) تار موصول ہوا کہ ڈینور یونیورسٹی کے لئے بہت اعزاز کا باعث ہوگا اگر تم بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ کی پروفیسری قبول کرنے پر آمادہ ہو سکو۔ تمہاری رضامندی کی اطلاع کا انتظار ہے۔ میں ان کی طرف سے اس پیش کش سے بہت متاثر ہوا انہیں شکریے کا تار دیا اور لکھا کہ جواب بذریعہ ڈاک بھیج رہا ہوں۔ خط میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد گذارش کی کہ میں بعد غور خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ انکی قابل قدر پیش کش کو قبول کر سکوں اوّل تو میں عملی میدان میں کارکن رہا ہوں علمی ماحول سے زیادہ واقف نہیں اور پروفیسری کے فرائض سرانجام دینے کیلئے جسقدر محنت اور عرق ریزی ضروری ہوگی نہ کر سکوں گا۔ اسلئے باوجود اس گہرے احساس کے کہ یونیورسٹی کا پرسکون علمی ماحول میرے لئے ایک نعمت ہوگا اور باوجود ڈینور اور اس کے مضافات کی زوردار کشش کے میں ان کی پیش کش کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

رفقائے عدالت سے تعلقات | عدالت میں میرے تعلقات اپنے رفقاء کے ساتھ سارا عرصہ نہایت خوشگوار رہے۔ جج ریڈ (کینیڈا) اور جج شوموُ (چین) کے علاوہ پریذیڈنٹ ہیکورتھ (امریکہ) اور جج کارڈوا (میکسیکو) کے ساتھ تو گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ وائس پریذیڈنٹ عبدالحمید بدوی آخر تک میرے ساتھ کمال شفقت سے پیش آتے رہے لیکن وہ بڑے سنجیدہ مزاج تھے۔ مجھے ہمیشہ ان کا ادب ملحوظ رہتا تھا اسلئے ان سے بے تکلفی کی نوبت نہ آنے پائی۔

فرانس کے جج بادے واں (JUDGE BASDEVANT) | عدالت کے سابق صدر جج بادے واں میل جول میں مجھ سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوتی تھی۔ لیکن اوّل اوّل بعض قرائن سے مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھے کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی تو جانتے تھے لیکن اس زبان میں بات کرنے میں انہیں حجاب تھا اور میں فرانسیسی میں بات کرنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ اسلئے گفتگو کا موقعہ بھی کم ہوتا تھا علمی لحاظ سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ بین الاقوامی قانون کے میدان کے شہسوار تھے اور اس میدان کے ہر نشیب و فراز سے اسی درجہ واقف تھے جس درجہ بقول شیخ سعدی بغداد کے گلی کوچوں سے تازی گھوڑا اور مجھے اس میدان میں پیادہ روی کا بھی زعم نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ان کے رویہ میں خفیف سی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید میرا پہلا احساس ان کے رویئے کے متعلق صحیح نہیں تھا اور یا اب خوشگوار تبدیلی کے متعلق جو احساس ہے وہ صحیح نہیں۔ لیکن آخر یہ احساس پختہ ہونے لگا کہ اگر شروع میں انہیں میرے متعلق کوئی شبہ تھا تو اب وہ دور ہو رہا ہے یا دور ہو چکا ہے۔ میری نصف میعاد گذر جانے تک یہ حالت ہو گئی تھی کہ عدالت کے پرائیویٹ اجلاسوں میں جب کسی مسئلے پر میں اظہار خیال کرتا تو وہ توجہ سے سنتے۔ کبھی کبھی مسکراتے ہوئے اظہار خوشنودی کے طور پر تصدیق میں سر ہلاتے اور بعض اوقات فرانسیسی میں بہت خوب بہت خوب کہکر حوصلہ افزائی فرماتے۔ ان کے رویئے کی تبدیلی کا عقدہ اس وقت کھلا جب ۱۹۶۰ء کے آخر میں عدالت کے پانچوں جج جن میں بھی

شامل تھا دوبارہ عدالت کی رکنیت کیلئے منتخب نہ ہوسکے۔ وہ ان دنوں بیمار تھے۔ بیماری شدت اختیار کر گئی تھی۔ کچھ عرصہ تو تشویش میں گذرا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے صحت عطا کی۔ انتخاب کا نتیجہ معلوم ہونے پر بستر علالت سے ہی مجھے خط لکھا جس میں میرے دوبارہ منتخب نہ ہونے پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جب عدالت کی رکنیت کیلئے تمہارا انتخاب ہوا تو اقوام متحدہ میں تمہاری سرگرمیوں کو جانتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ عدالت میں پیش ہونیوالے تنازعات کے فیصلوں میں تم قانونی (جوڈیشل) نہیں بلکہ سیاسی (پولیٹیکل) نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھوگے۔ زیر سماعت تنازعات پر ججان کی باہمی گفتگو سے جلد واضح ہوگیا کہ میرا اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ تم ایک صاحب تجربہ قانون دان اور جج ہو۔ ہر فیصلہ طلب کیس کا احتیاط سے مطالعہ کرتے ہو اور صرف انہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہو جو اس کیس کے قانونی فیصلے کیلئے ضروری ہوں۔ اکثر اوقات تمہاری رائے مجھے اپنی رائے قائم کرنے میں ممد ہوئی۔ اور تنازعہ زیر سماعت پر ججان کی باہمی گفتگو کے دوران میں بڑے شوق سے اس وقت کا انتظار کرتا تھا جب تم اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروگے۔ یہ اعتراف انکی عظمت کا ثبوت تھا۔ وہ ۱۸ سال عدالت کا رکن رہکر ۵ فروری ۱۹۶۲ء کو پنشن پر گئے اور تین سال بعد وفات پاگئے۔

ناروے کے جج کلیسٹاڈ | ناروے کے جج کلیسٹاڈ بھی بڑے سنجیدہ مزاج تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ جچی تلی بات کرتے تھے۔ عدالت کا اجلاس شروع ہونے سے دس منٹ قبل اپنے کمرے میں آتے اور اجلاس ختم ہوتے ہی اپنے گھر کی راہ لیتے ان کے کسی رفیق کو ان کے ساتھ بے تکلفانہ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جب جج ہیکورتھ پریذیڈنٹ ہوئے تو انہوں نے عدالت کے پرائیویٹ اجلاسوں میں ججوں کی نشست کی ترتیب بدل دی جس کے نتیجے میں میری نشست جج کلیسٹاڈ کے بائیں ہاتھ مقرر ہوگئی۔ میں اگر کبھی ان کے ساتھ کوئی بات کرتا تو وہ دو لفظی جواب دیکر خاموش ہو جاتے اور بات آگے نہ چلتی۔ میرے پہلے تین سالوں یعنی ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء کے دوران میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے مجھے صرف ایک بار خود مخاطب کیا۔ ان دنوں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو لندن سے وزرائے عظام کی کانفرنس سے فارغ ہوکر وطن لوٹتے ہوئے ہیگ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہندوستانی سفیر کبیر متعینہ ہالینڈ نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دعوت دی ہوئی تھی۔ عدالت کے اراکین بھی مدعو تھے دعوت کے وقت مجھے کہیں اور جانا تھا اسلئے دعوت قبول نہ کرسکا۔ عدالت کے ایک پرائیویٹ اجلاس کے دوران جج کلیسٹاڈ نے مجھ سے دریافت کیا تم ہندوستانی سفیر کی دعوت میں جاؤگے؟ میں نے کہا مجھے تو فلاں جگہ جانا ہے اسلئے میں نے معذرت کردی ہے۔ اس پر فرمایا میں تو ہرگز ایسے شخص کے اعزاز کے اظہار میں شامل نہیں ہوں گا جسے اپنے قول کا پاس نہیں۔

۱۹۵۸ء کے شروع میں جب جج کلیسٹاڈ صدر عدالت اور میں نائب صدر منتخب ہوئے تو ہمیں آپس میں ملنے جلنے کا زیادہ موقعہ ملنے لگا۔ صدارت کے فرائض کی سرانجام دہی کیلئے انہیں عدالت میں زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہوتا۔ انتخاب کے فوراً بعد ہم سب صدر کے کمرے میں جمع تھے۔ مجھے فرمایا تمہارے نائب صدر منتخب ہونے کی مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ ان کے یہ کہنے سے مجھے اطمینان ہوا کیونکہ وہ منہ سے کوئی رسمی بات نہیں نکالتے تھے۔ ایک دن عالمی عدالت کے رجسٹرار لوپیز اولیوان صاحب نے مجھے اپنے ہاں کھانے

کی دعوت دی کھانے کے بعد جب ہم علیحدہ بیٹھے تو کہا۔ صدر عدالت بہت سنجیدہ طبع اور کم گو ہیں لیکن بہت تیز احساس رکھتے ہیں۔ خون کے دباؤ کا بھی عارضہ ہے عدالت کے پرائیویٹ اجلاس میں جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے جسے وہ اپنے پر بے جا نکتہ چینی سمجھتے ہیں تو انہیں بڑی پریشانی ہوتی ہے بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ ایسے موقعہ پر اجلاس سے نکلتے ہی انہیں معائنے کیلئے اپنے ڈاکٹر کے ہاں جانا پڑا۔ تمہاری نشست ان کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ جب کوئی ایسی بات ہو تو تم ان کی تسلی اور اطمینان کے لئے ان سے کچھ کہہ دیا کرو اس سے انہیں بہت حوصلہ ہوگا۔ پریذیڈنٹ ہیکورتھ بڑے خنک مزاج تھے۔ اپنی رائے سے اختلاف یا اس پر نکتہ چینی کو خاموشی سے سن لیتے تھے۔ اعتراض معقول ہوتا تو فراخ دلی سے قبول کر لیتے تھے ورنہ نرم الفاظ میں ٹال دیتے تھے۔ رجسٹرار صاحب سے گفتگو کے بعد میں نے خیال رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ صرف ایک صاحب کی نکتہ چینی یا اختلاف کا اظہار بہت ناگوار ہوتا ہے اور ان کا چہرہ سرخ ہونے لگتا ہے۔

یہ ردِّ عمل اس وجہ سے نہ تھا کہ صدر عدالت اپنی رائے سے اختلاف یا اس پر نکتہ چینی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ دراصل ان صاحب کا طریق گفتگو ایسا تھا جس سے ترشح ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عقل کل اور مخزن علوم سمجھتے ہیں اور مخاطب کو جاہل مطلق۔ ایسے موقعہ پر مجھ سے اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ ان صاحب کی بات کا خود جواب دینے کی کوشش کروں اور اگر ان کی بات واجب نہ ہو تو اسے ٹالنے کی کوشش کروں۔ رفتہ رفتہ صاحب صدر نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کرنا شروع کیا میرے ساتھ ان کا رویہ کمال شفقت کا رنگ اختیار کر گیا۔ جب ان کی صدارت کے عرصے میں پہلا فیصلہ مرتب ہو چکا تو انہوں نے مجھے فرمایا پبلک اجلاس میں فیصلہ تمہیں پڑھ کر سنانا ہوگا۔ میں نے کہا قواعد کی رو سے تو یہ فرض آپ کے ذمے عاید ہوتا ہے۔ کہا ٹھیک ہے لیکن ایک مجمع کے سامنے لمبی دستاویز پڑھ کر سنانا میری طبیعت پر بوجھ ہوگا تم نائب صدر ہو اسلئے میں تمہیں پڑھنے کو کہوں گا۔ چنانچہ ان کی صدارت کے سارے عرصے میں یہی طریق رہا کہ فیصلہ پڑھ کر سنانے کیلئے مجھے ہی ارشاد فرماتے۔ ان کی میعاد بھی ۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو ختم ہو گئی وہ پندرہ سال عدالت کے رکن رہے۔ انہیں موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا پیانو بجاتے تھے لیکن جب اکیلے ہوں۔ کسی کی موجودگی میں نہیں بجاتے تھے۔ موسیقی کمپوز بھی کرتے تھے اور اس کے بعض حصے اپنی موجودگی میں سالزبرگ (آسٹریا) کے آرکیسٹرا کے بجائے ہوئے ریکارڈ کر دلاتے تھے۔ اپنے وطن کی سرد آب و ہوا سے گھبراتے تھے۔ سردیوں کی لمبی راتیں اور برفانی ہوائیں انکے لئے پریشانی کا موجب تھیں۔ عدالت سے فراغت کے بعد ان کا ارادہ اٹلی میں فلارنس کے نواح میں رہائش اختیار کرنے کا تھا چنانچہ میعاد ختم ہونے سے قبل ہی فلارنس کے قریب ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا اور ۱۹۶۱ء کے شروع میں وہاں منتقل ہو گئے۔ سوءِ اتفاق سے اس سال وہاں موسم نہایت ناخوشگوار ثابت ہوا۔ مسلسل بارش کا سامنا ہوا۔ دق آکر جلد وہاں سے آسلو چلے گئے۔ اس کے بعد سردیوں کے موسم میں کچھ عرصے کیلئے فرانس کے جنوب میں کسی مقام پر ٹھہرنے کا انتظام کر لیتے لیکن مستقل رہائش آسلو (OSLO) میں ہی رکھی۔ فروری ۱۹۶۲ء میں مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کیلئے آسلو (OSLO) جانے کا اتفاق ہوا۔ حسنِ اتفاق سے وہ ان

دونوں اسلوبی میں تھے۔ ایک شام میں نے انکی خدمت میں گذاری۔ مسز کلیسٹا ڈ نے بتایا آج تمہارے آنے سے بہت بشاش ہیں۔ ورنہ اب عام طور پر خاموش اور افسردہ رہتے ہیں۔ فلیٹ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ بہت شاذ کسی سے ملتے ہیں۔ موسیقی کے ساتھ بھی وہ پہلا سا لگاؤ نہیں۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں میرے اقوام متحدہ کا صدر منتخب ہونے کی خبر ملنے پر مجھے اپنی اور اپنی اہلیہ کی طرف سے مبارکباد کا خط لکھا جو محبت اور اخلاص کے جذبات سے پُر تھا۔ جج کلیسٹا ڈ ایسے فرشتہ سیرت انسان کی طرف سے ایسی محبت اور شفقت کا اظہار میرے لئے بڑی خوشی اور اطمینان کا موجب ہوا۔ وہ ۲۳ مئی ۱۹۶۵ء کو رحلت فرما گئے۔ وہ میرے مشفق محسن تھے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت کا سلوک فرمائے۔ میں نے انکی بیگم صاحبہ کو تعزیت کا خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں کہا تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ انہیں تمہارے ساتھ کسقدر اخلاص کا تعلق تھا۔ تمہارا ایک خط انہوں نے اپنی بائیبل کے سرورق کے ساتھ چپکایا ہوا تھا۔

محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خاں ۱۹۵۴ء میں جب میں وزیر خارجہ تھا میں نے محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خاں کو آمادہ کیا کہ وہ ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کا منصب منظور فرمائیں۔ انکی رضامندی حاصل ہونے کے بعد چودھری محمد علی صاحب لوگرا وزیر اعظم اور ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل کی منظوری سے ان کا تقرر عمل میں آیا اور ستمبر ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اپنے منصب کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جون ۱۹۶۱ء تک بیگم صاحبہ اس منصب پر فائز رہیں۔ اس کے بعد انہیں اٹلی میں پاکستانی سفیر مقرر کیا گیا اور وہ روم تشریف لے گئیں۔ میں بھی بین الاقوامی عدالت کا رکن منتخب ہو کر جنوری ۱۹۵۵ء میں ہیگ آ گیا اور فروری ۱۹۶۱ء تک وہاں رہا۔ چونکہ اس سارے عرصے میں بیگم صاحبہ ہیگ میں پاکستانی سفیر تھیں اسلئے میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بڑی قابلیت اور بڑے وقار کے ساتھ سرانجام دیا۔ ہالینڈ میں ان کا نام نامی اور پاکستان کا نام مترادف ہو گئے تھے اور اس ملک میں اب تک انہیں نہایت احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ ملکہ ہالینڈ کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ ہالینڈ کے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں میں مقبول تھیں ان کے متعلق عام رائے تھی کہ ملکہ جولیانہ کے بعد وہ ملک کی سب سے ہردلعزیز خاتون ہیں۔ ہالینڈ کی سب یونیورسٹیوں میں بھی ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی استقبالی دعوتوں میں التزام کے ساتھ باری باری یونیورسٹیوں کے چیدہ چیدہ طلباء کو مدعو کرتی تھیں۔ اور ان کی مہمان نوازی کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ جو طلباء دور سے آتے تو رسمی دعوت کے بعد ان کیلئے کھانے کا انتظام بھی فرماتیں۔ ایسی مادرانہ شفقت کا اظہار ایک مشفق خاتون ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ ان انتظامات میں ان کی ذاتی سیکرٹری مس کیتھرین مائسلز ان کی دست راست تھیں۔ میرے ساتھ شفقت اور تواضع کا جو سلوک بیگم صاحبہ نے اور ان کی وجہ سے پاکستانی سفارت خانے کے جملہ افسران اور عملے کے افراد نے روا رکھا اس کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ فجزاھم اللّٰہ الحسن الجزاء۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے مجھے ارشاد تھا کہ ہر ہفتے اور اتوار کی سہ پہر کو ۵ بجے در دولت پر حاضر ہوں اور دونوں دن شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ کھانے پینے کے سلسلے میں میری ہر طبی احتیاط اور طبعی رغبت کا پورا لحاظ رکھا جاتا۔ اسلئے مجھے ہیگ کے قیام کے

دوران میں ذرہ بھر بھی بے وطنی کا احساس نہ ہوا۔ یہ سب بیگم صاحبہ کی شفقت اور تواضع کا کرشمہ تھا۔ میرے دل سے ہر روز ان کے لئے دعا بلند ہوتی ہے۔ یہ کوئی رسمی جملہ نہیں بلکہ لفظاً اور معناً حقیقت ہے۔

بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی اسلامی غیرت کی دو مثالیں

میرے دل میں محترمہ بیگم صاحبہ کی قدر و منزلت ان کی اسلامی غیرت کے احساس کی وجہ سے بھی ہے ایک دن دوپہر کے وقت ٹیلیفون پہ ارشاد فرمایا کہ سہ پہر کے اجلاس کے لئے عدالت واپس جاتے ہوئے یہاں سے ہوتے جانا اور تاکید فرمائی کہ تین بجے سے پہلے ہی آجانا۔ میں پونے تین بجے حاضر ہو گیا۔ حاضر ہونے پر دیکھا کہ بہت اضطراب کی حالت میں ہیں ایک ٹائپ شدہ دو ورقہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھے دیتے ہوئے فرمایا پڑھو! وہ ہیگ کے ایک روزنامے کے افتتاحیہ کا انگریزی ترجمہ تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈونیشیا کی حکومت اپنی ہر کمزوری اور خامی کا الزام ہالینڈ کے سر تھوپتی ہے۔ اتنا نہیں سوچا جاتا کہ ملک کی بھاری کثرت اسلام جیسے دقیانوسی مذہب کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے جو ان کی ترقی کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ پہلے اس سبب کا علاج کریں پھر ہم پہ یہ الزام عائد کریں۔ فرمایا اس کا جواب لکھو۔ کب تک تیار کر لوگے میں نے کہا کل تیار ہو جائے گا۔ جواب تیار ہو جانے پر میں نے اطلاع کی تو فرمایا ہمارا تعلقات عامہ کا افسر ان دنوں چھٹی پر ہے۔ تمہارے تیار کردہ جواب کا ہولنڈی زبان میں جلد ترجمہ ہونے کا کیا انتظام کیا جائے۔ میں نے کہا آپ فکر نہ کریں میں مسز زمرمان (ایک مسلمان ماہر ترجمہ ہولنڈی خاتون) سے جلد ترجمہ کرا لوں گا۔ چنانچہ ترجمہ جلد تیار ہو گیا اور تجویز ہوئی کہ مکرم حافظ قدرت اللہ صاحب امام مسجد مبارک ہیگ ہالینڈ جوابی مضمون لیکر خود اخبار کے ایڈیٹر سے ملیں اور اسکی اشاعت کا مطالبہ کریں۔ حافظ صاحب مضمون لیکر گئے۔ ایڈیٹر نے جواب پڑھ کر فرمایا ہم ضرور کل ہی شائع کر دیں گے لیکن جواب ذرا طویل ہے سارے جواب کی گنجائش پرچے میں نہیں ہوگی۔ ہم ضروری حصوں کو خلاصے کے طور پر ترتیب دے لیں گے۔ انہوں نے اپنا وعدہ بڑے عمدہ طور پر پورا کر دیا۔ فجزاہ اللہ۔ بیگم صاحبہ نے مضمون کی نقول تمام سفارت خانوں میں بھجوا دیں۔

ایک دن پھر بڑے اضطراب کی حالت میں طلب فرمایا۔ معلوم ہوا ان کے ایک پاکستانی مسلمان نوجوان ملازم نے جو کراچی میں ان کے ہاں کا ہی پروردہ تھا اور جس کے والد نے اس کے ہیگ آنے سے پہلے کراچی میں اس کی شادی بھی کر دی ہوئی تھی ہالینڈ میں شادی کی ٹھانی ہے اور لڑکی کے اصرار پر عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہے اور اس نیت سے ایک پادری کی شاگردی میں گرجا کی رسوم وغیرہ سیکھ رہا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑے جوش میں تھیں اور مصر تھیں کہ سفارت خانے کا سرکاری عملہ بھاگ دوڑ کر کے غروب آفتاب سے پہلے اس ملازم کو پاکستان جانیوالے ہوائی جہاز پر سوار کر کے رپورٹ کرے۔ یہ رپورٹ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچی تو کہیں جا کر ان کی طبیعت قابو میں آئی۔ اس وقت تک بار بار یہی کہتی رہیں۔ لیاقت علی خاں کے گھر میں پلا ہوا شخص اور عیسائی ہونے پر رضامند ہو جائے!

ہیگ میں مسجد احمدیہ

ہیگ میں مسجد احمدیہ کا ہونا میرے لئے بڑی روحانی تسکین کا موجب تھا۔ یہ مسجد بفضل اللہ لندن کی احمدیہ مسجد کی طرح جماعت احمدیہ کی خواتین کی مالی قربانیوں کی مثالی یادگار ہے۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے اور عمارت کے مکمل ہو جانے پر اس کے افتتاح کی سعادت بھی محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ذرہ نوازی سے مجھے نصیب ہوئی۔ میرے قیام کے عرصہ میں حافظ قدرت اللہ صاحب امام اور مولوی محمد ایوب صاحب سوماٹری نائب امام تھے۔ ان دونوں مخلصین کا نیک نمونہ میرے لئے مشعل راہ تھا۔

محترمہ عزیزہ والٹر ایک ولندیزی نومسلمہ خاتون

محترمہ عزیزہ والٹر ولندیزی نومسلمہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے نہایت پارسا مخلص اور صالح خاتون تھیں۔ رمضان شریف میں روزہ افطار کرنے اور مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ۴۵ منٹ کا سفر بس میں کر کے مسجد میں حاضر ہو کر خواتین کی معیت میں تراویح کے نفل ادا کرتیں۔ مستجاب الدعوات اور صاحب رویا و کشوف تھیں۔ خوشنویسی کا شوق تھا قرآن کریم کی آیات خوبصورت قطعات میں سبز زمین پر سفید الفاظ کی شکل میں تیار کرتیں لیکن اللہ تعالیٰ کا نام سنہری حروف میں دکھاتیں۔ ہیگ کی مسجد میں بہت سے قطعات انکے تیار کردہ آویزاں ہیں۔ مسجد کی دیواروں پر بھی ان کے ہاتھ سے احکام قرآن خوبصورت نقش کئے ہوئے ہیں۔ میرے مکان کیلئے بھی چند قطعات تیار کئے اور مصر رہیں کہ یہ بطور ہدیہ کے ہیں۔ جب میں نے اصرار کیا کہ میں بھی آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا دمشق جاؤ تو کچھ نمونے خوشنویسی کے میرے لئے لیتے آنا۔ چنانچہ میں نے ان کی خواہش کے مطابق چند نمونے ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ میرے دوبارہ عدالت میں شامل ہونے کے وقت زندہ تندرست تھیں لیکن طبیعت سے کچھ ضعف کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ جمعہ کی نماز میں شمولیت میں ناغہ ہونے لگا۔ عمر اسی سال کے قریب ہو چکی تھی یا ممکن ہے اس سے زائد ہو آخر، اگست ۱۹۶۸ء کو محبوب حقیقی کی رحمت کے سایہ تلے رحلت کر گئیں۔ ان کے اخلاص، ان کے ایمان کی بشاشت، عبادات سے شغف ان کے عشق الٰہی۔ ان کی پیشانی کے نور سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ درگاہ الٰہی سے انہیں یہی دعوت موصول ہوئی ہوگی یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ ہم میں سے جو کوئی بھی انہیں جانتا تھا اس نے انکی رحلت پر ضرور دعا کی ہوگی۔ "داخلش کن از کمال فضل در بیت النعیم"

بین الاقوامی عدالت کی رکنیت کے عرصہ میں عمرہ ادا کرنے کی سعادت

میں نے بچپن میں سنا تھا کہ میرے دادا جان چودھری سکندر خانصاحب مرحوم نے حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس وقت سے میرے دل میں اس فریضہ کی ادائیگی کا اشتیاق تھا۔ انگلستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد وطن واپس جاتے ہوئے نومبر ۱۹۱۴ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ ٹکٹ جون ۱۹۱۴ء میں ہی خرید لئے گئے تھے۔ اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی جس سے یہ پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں پھر ارادہ کیا کہ جنوری ۱۹۴۰ء میں اس فریضے کی ادائیگی کی جائے۔ جہازی

کمپنی سے پروگرام طے ہو گیا لیکن ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ سے یہ پروگرام بھی منسوخ کرنا پڑا۔ قیام پاکستان کے بعد اقوام متحدہ کی اسمبلی کے سالانہ اجلاسوں کے دوران میں سعودی عرب کے وزیر خارجہ عالیجاہ امیر فیصل (حال جلالۃ الملک فیصل) کے ساتھ نیازمندی کے روابط پیدا ہونے پر میں نے ان سے حج کیلئے مکہ معظمہ حاضر ہونے کے متعلق مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا تم آؤ تو ہم سب انتظام کر دیں گے لیکن حج کے ایام میں موسم اسقدر گرم ہوتا ہے کہ باوجود ہر قسم کی سہولت کے ہم لوگوں کیلئے بھی اس کی برداشت مشکل ہو جاتی ہے ہمارا مشورہ ہے کہ چند سال انتظار کرو جب تک حج کے ایام میں موسم کسی قدر اعتدال پر آجائے۔ ۱۹۵۸ء میں عدالت کا اجلاس شروع فروری کی بجائے اوائل اپریل میں منعقد ہونا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس تاخیر سے فائدہ اٹھا کر میں عمرے کا پروگرام بناؤں۔ ممکن ہے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحم سے حج کی توفیق بھی عطا فرمائے اور اس فرض کی ادائیگی کیلئے مناسب سہولت بھی میسر فرما دے۔ ان ایام میں خواجہ شہاب الدین صاحب جدے میں پاکستانی سفیر تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنے ارادے کی اطلاع کر دی ان دنوں کراچی سے کوئی پرواز براہ راست جدے نہیں جاتی تھی۔ کراچی سے جدے جانے کے لئے دہران یا بیروت سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ بیروت سے جانے میں سہولت رہے گی۔ چنانچہ میں ۱۷ر مارچ ۱۹۵۸ء کو جدے پہنچ گیا۔ خواجہ شہاب الدین صاحب کمال شفقت سے مطار پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ مصر ہوئے کہ میں ان کے ہاں پاکستانی سفارت خانے میں قیام کروں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے میرے عمرہ کیلئے حاضر ہونے کا ذکر جلالۃ الملک سعود کی خدمت میں کیا تھا جس پر جلالۃ الملک نے فرمایا کہ وہ ہمارا مہمان ہو گا۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ مہمان تو آپ کا ہی ہو گا اور سب انتظام بھی آپ ہی کی طرف سے ہو گا لیکن آپ کی اجازت سے اگر اس کی رہائش ہمارے ہاں ہو تو ہم اس کے طبی پرہیز اور عادات سے واقف ہونے کے باعث اس کے خورد و نوش کا انتظام اس کی ضرورت کے مطابق کر سکیں گے۔ اس پر جلالۃ الملک نے اس شرط پر اجازت دیدی کہ باقی سب انتظام سفر وغیرہ کا اور مکہ معظمہ میں قیام کا سعودی محکمہ ضیافت کی طرف سے ہو گا۔ خواجہ صاحب کے ہاں مجھے ہر سہولت میسر رہی ان کی مہمان نوازی مشہور ہے اور میں کراچی میں بھی اس سے متمتع ہوتا رہا تھا۔ جدے میں بھی وہی کیفیت تھی۔ ان کی بیگم صاحبہ محترمہ کی طرف سے بھی میں نہایت تواضع کا مورد رہا۔ فجزاہم اللہ خیراً

مکہ معظمہ میں خانہ خدا پر حاضری کی سعادت | ۱۸ر مارچ بعد نماز فجر مکہ معظمہ کیلئے روانہ ہوا۔ سفارتخانہ کے سپرنٹنڈنٹ میرے ہمراہ تھے۔ اس سفر میں دل میں جذبات کا جو ہیجان تھا اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے۔ البتہ ظاہری مناسک کا خلاصہ بیان ہو سکتا ہے۔ ہر دل اپنی کیفیات اور اپنے ظرف کے مطابق باقی کا قیاس کر سکتا ہے۔ جدہ سے نکلتے ہی تلبیہ کا ورد شروع ہوتا ہے۔ حرم کی حدود سے تھوڑے فاصلے پر پہلے حدیبیہ کا مقام آتا ہے۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا۔ اور جہاں قریش کے نمائندے سہیل کے ساتھ آخری شرائط صلح طے پا کر معاہدہ لکھا گیا تھا۔ یہاں اب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں میں نے دو نفل ادا کئے۔ حدود حرم کے نشان کے طور پر سڑک کے دونوں طرف ستون ایستادہ ہیں یہاں سے شروع ہو کر

مختلف مقامات پر دعا مستحب ہے۔ مکہ معظمہ کی آبادی کے قریب مقام مدعی ہے۔ مکہ معظمہ جاتے ہوئے کعبہ شریف کی چھت پہلے پہل اس مقام سے نظر آیا کرتی تھی۔ اب درمیان میں مکانات بن جانے کی وجہ سے وہاں سے نظر نہیں آتی۔ شہر مکہ معظمہ کے نظر آنے پر بھی دعا مستحب ہے اور پھر شہر میں داخل ہوتے وقت بھی۔ میرا قیام فندق مصر میں ہوا۔ سامان رکھتے ہی مسجد حرام حاضر ہوئے۔ خانہ کعبہ کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں طواف کی سعادت حاصل ہوئی۔ طواف کی تکمیل پر مقام ملتزم پر کھڑے ہو کر در کعبہ کی دہلیز پر ہاتھ رکھے کامل محویت اور گداز کی حالت میں دعاء کی توفیق عطاء ہوئی۔ فالحمد للہ اسی حالت میں محسوس ہوا کہ کعبہ شریف کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کعبہ شریف کے اندر داخلہ نصیب ہوا۔ پہلے اس مقام پر کھڑے ہو کر جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نفل ادا کئے تھے دو نفل ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور اس کے بعد باقی تینوں جانب باری باری رخ کر کے نفل ادا کئے اور مولانا رومؒ کے مصرعہ "در درون کعبہ رسم قبلہ نیست" کی حقیقت عملاً تجربے میں آئی۔

سعودی خاندان نے یہاں جدے سے مکہ معظمہ، جدے سے مدینہ منورہ، مکہ معظمہ سے منیٰ، مزدلفہ، عرفات کی پختہ سڑکیں صرف زر کثیر سے تعمیر کروا کر حجاج کے لئے انگنت مشکلات اور صعوبتوں کا خاتمہ کر دیا ہے اور حج بیت اللہ اور حرمین کی زیارت بے حد آسان کر دی ہے اور منیٰ اور عرفات کے مقامات پر بافراط تازہ میٹھے پانی کے ذخیرے مہیا کر دیئے ہیں وہاں صفا و مروا کے درمیان مقام سعی کو مسقف کر کے اور حرم کے صحن کو وسعت دیکر اور اس فرش کو ہموار کر کے حجاج بیت اللہ کے لئے بہت سی سہولتوں کا سامان کر دیا ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرۃ۔ میرے عمرہ کیلئے حاضر ہونے سے تھوڑا عرصہ قبل کعبہ شریف کی پرانی چھت کے چار فٹ یا ساڑھے چار فٹ نیچے نئی چھت ڈالی گئی تھی۔ پرانی چھت کے متعلق اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کمزور ہو رہی ہے۔ جب میں کعبہ شریف کے اندر نوافل سے فارغ ہوا تو مجھے بتایا گیا کہ حسن الخنیزر صاحب کی زیر نگرانی کعبہ شریف کے صحن کی توسیع اور چھت کی تعمیر کا کام ہو رہا ہے وہ اس وقت کعبہ شریف کی دونوں چھتوں کے درمیان تشریف فرما ہیں اور مجھے شرف ملاقات سے مشرف کرنے پر رضامند ہیں۔ چنانچہ میں کعبہ شریف کی اندرونی سیڑھی کے رستے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور چند منٹ بین السقفین الکعبہ ٹھہرنے کا شرف حاصل کیا۔ کعبہ شریف سے نکل کر مقام ابراہیم پر نفل ادا کئے۔ زمزم کا پانی خوب سیر ہو کر پیا صفا اور مروا کے درمیان سعی کے دوران میں حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ، حضرت اسمٰعیل علیہم السلام کی کمال فرمانبرداری اور انتہائی قربانیوں کی یاد تازہ کی اور دل میں خشیت اور گداز کی کیفیات کو محسوس کیا۔ سعی کی تکمیل کے بعد حطیم کے اندر اور حطیم اور رکن یمانی کے درمیان نفل ادا کئے اور قیام گاہ پر واپس آیا۔ ظہرین کے بعد منیٰ، مزدلفہ اور عرفات حاضر ہوئے۔ جبل رحمت پر دعاء کی اور سید ولد آدم افضل الرسل خاتم النبیین محبوب خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر الٰہی فرمان کے مطابق بہت بہت درود اور سلام بھیجنے کی سعادت حاصل کی۔ عرفات کی مسجد میں نفل ادا کئے اور مکہ معظمہ کو واپس ہوئے۔ بعد مغرب طواف اور نوافل کی سعادت

حاصل کی ۱۸ ر کی رات مکہ معظمہ میں قیام رہا۔ ۱۹ ر کی صبح کو تیسری بار حرم کعبہ میں طواف اور نوافل کی ادائیگی کا موقعہ نصیب ہوا۔ مکہ معظمہ سے جدے کیلئے روانہ ہوئے تو خیال آیا کہ منیٰ جاتے ہوئے جبل نور پر تو کچھ فاصلے سے نگاہ پڑ گئی تھی (حرا کا مقام جبل نور پر ہے) اگر ہو سکے تو غار ثور کو بھی خواہ دور ہی سے ہو دیکھا چاہیئے۔ سپرنڈنٹ صاحب کو غار ثور کا مقام معلوم نہیں تھا اور کار کے شوفر کو ثور کے لفظ سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ آخر جب میں نے اپنی ناقص عربی میں بتایا وہ غار جس میں ہجرت کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے عارضی قیام فرمایا تھا تو شوفر مسکرایا اور سر ہلا کر ظاہر کیا کہ وہ مطلب سمجھ گیا ہے۔ وہ ہمیں پہاڑ کے دامن تک لے گیا غار میں داخلے کا مقام وہاں سے نظر آتا تھا لیکن وہ سڑک سے بہت بلندی پر تھا سورج کی تمازت تیز ہو چکی تھی اسلئے ہم نے نیچے سے دیکھ لینا ہی غنیمت سمجھا اور جدے کی جانب روانہ ہو گئے

جلالۃ الملک سلطان سعود سے شرف ملاقات

دوسرے دن معلوم ہوا کہ جلالۃ الملک نے مجھے ریاض طلب فرمایا ہے چنانچہ میں ۲۱ ر مارچ کو ریاض حاضر ہوا۔ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے حالات میں پڑھا تھا کہ جب کویت سے نکل کر انہوں نے ریاض کو تسخیر کیا اس وقت ریاض ایک کچی دیوار سے گھرا ہوا قصبہ تھا جس پر اپنے چند جانباز ہمراہیوں کے ساتھ رات کے وقت دیوار پھاند کر سلطان عبدالعزیز نے قبضہ کیا تھا۔ لیکن وہ ریاض اور تھا اور ان کے فرزند جلالۃ الملک سعود کا دارالحکومت ریاض اور تھا۔ جو ریاض میں نے دیکھا وہ ریگستان کے درمیان امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہروں کی مانند ایک شہر جسکو دیوار سے گھرے ہوئے قصبے کے ساتھ کسی قسم کی نسبت نہیں تھی۔ یہی صورت بعد میں کویت میں دیکھی ۱۹۳۴ء میں جب میں نے کویت میں ایک رات بسر کی تو کویت بھی ایک کچی مٹی کی دیوار سے گھرا ہوا قصبہ تھا۔ ۲۸ سال بعد جب مجھے پھر کویت میں ٹھہرنے کا موقعہ ہوا تو کویت گودڑ میں سے لعل بن کر برآمد ہو چکا تھا۔ اگرچہ ریاض ٹیکساس (امریکہ) کے شہروں کا مقابلہ کرتا ہے لیکن ٹیکساس کے شہروں کی کوئی عمارت بھی ریاض کے محلات شاہی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ جلالۃ الملک بہت تواضع سے پیش آئے اور بڑی ذرہ نوازی کا سلوک روا رکھا۔ فجزاہ اللہ۔ امیر فیصل ان ایام میں ناسازئ طبع کے باعث باہر ریگستان میں تھے اسلئے ان کی خدمت میں حاضری کا موقعہ نہ مل سکا۔

عبدالوہاب عزام صاحب سے ریاض میں ملاقات

ریاض میں عبدالوہاب عزام صاحب سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔ وہ پاکستان میں سفیر مصر کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ بہت علم دوست تھے۔ انہوں نے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے فارسی کلام میں سے منتخبات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ جب میں ریاض حاضر ہوا وہ وہاں کے دارالعلوم کے ریکٹر (RECTOR) تھے اور مختلف شعبوں کی ترتیب اور تنظیم میں منہمک تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور تھوڑا عرصہ بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

۲۲ ر مارچ کو میں ریاض سے جدے واپس آیا اور بعد مغرب طواف اور نوافل کے لئے پھر حرم حاضر ہوا۔ ۲۳ ر کی سہ پہر کو مدینہ منورہ حاضر ہونے کا ارادہ تھا لیکن اسدن یوم پاکستان کی تقریب میں خواجہ صاحب نے وسیع پیمانے پر شام کے

کھانے کی دعوت کا انصرام فرمایا تھا اور میری شمولیت پر انہیں اصرار تھا۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ اسلئے مدینہ شریف کا سفر بعد مغرب شروع ہو کر نصف شب سے ڈیڑھ ساعت بعد ختم ہوا۔ فالحمد للہ۔ سڑک پختہ بننے سے پہلے اونٹ کی سواری سے یہ سفر ۱۳ دن سے لیکر ۱۷ دن میں کٹتا تھا۔

مدینہ منورہ میں در حبیب خدا پر حاضری کی سعادت | مدینہ منورہ میں شاہی مہمان خانے میں قیام ہوا سفارت خانے کے تجارتی سیکرٹری میرے ہمراہ تھے۔ ۲۴ کی صبح مسجد نبوی میں حاضر ہو کر روضۂ مبارک پر دعاء کی اور ممبر نبوی اور روضۂ مبارکہ کے درمیان نفل ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسجد نبوی سے جنت البقیع حاضر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ، علیمہؓ، (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ) عثمان بن مطعونؓ، ابراہیمؑ (فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عبدالرحمٰن بن عوفؓ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہؓ رضوان اللہ علیہم کے مزاروں پر دعاء کا موقعہ نصیب ہوا۔ میدان احد سے واپسی پر مسجد قبلتین میں نفل ادا کئے پھر مسجد قبا گئے اور وہاں نفل ادا کئے واپسی پر مسجد نبوی میں روضۂ اطہر پر دعاء کی اور مسجد میں نفل ادا کئے بعد مغرب پھر مسجد نبوی میں حاضر ہو کر روضۂ اقدس پر دعا کی اور نفل ادا کئے۔ مدینہ منورہ میں ایک زائر کے دل و دماغ پر کن جذبات کا ہجوم ہوتا ہے ان کا اظہار اسد ملتانی مرحوم نے اس شعر سے کرنے کی کوشش کی ہے جو انہوں نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں کہا:۔

ہر راہ کو دیکھا ہے محبت کی نظر سے ٭ شائد کہ وہ گذرے ہوں اسی راہ گذر سے

اور سچ تو یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں تمام وقت ہی اور خصوصاً روضۂ اطہر کے قرب میں دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ ۲۵ کی صبح کو نماز فجر کے بعد ہم جدہ واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ رستے میں بدر کے مقام کے قریب رک کر جنگ کا مقام دیکھا۔ یہ جنگ جس میں قریش کی طرف سے ایک ہزار تجربہ کار جنگ آزمودہ بہادر ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح نبرد آزما تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی صرف ۳۱۳ افراد جن کے جسموں پر پورا لباس نہ تھا، ہاتھوں میں پورے اسلحہ نہ تھے اور بعض میں سے کچھ تو فن حرب سے واقف تھے اور کچھ بالکل ناتجربہ کار لڑکے تھے۔ اپنے نتائج کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں سب سے قاطع اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ ظاہر بین آنکھ طرفین میں کسی قسم کی نسبت نہیں پاتی تھی۔ لیکن حقیقت بین نگہ میں یہ مقابلہ ایک طرف مادی طاقت پر گھمنڈ اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ پر یقین کامل تھا یہ کفر اور ایمان کے درمیان فیصلہ کن جنگ تھی۔ اگر اس دن بفرض محال کفر غالب آتا تو جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت احدیت میں مناجات کرتے ہوئے عرض کیا تھا اللہ جل شانہٗ کی عبادت روئے زمین سے تا ابد مٹ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ کیونکر منظور ہو سکتا تھا۔ وہ تو برسوں پہلے اپنے رسولؐ اور محبوبؐ سے فرما چکا تھا اور وعدہ کر چکا تھا سیھزم الجمع ویولون الدبر چنانچہ جیسے اللہ تعالیٰ نے جو علیم و قدیر ہے فرمایا تھا ویسے ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ کے قول کو ہی سرفرازی ہوئی۔ چند گھنٹوں کے اندر قریش کا غرور و تکبر بدر کے میدان میں خاک و خون میں ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔ دوپہر کے کھانے تک ہم بفضل اللہ بخیریت جدہ واپس پہنچ گئے۔ ۲۶ کی صبح کو میں آخری بار عمرہ ادا

کرنے کے لئے بیت اللہ کے صحن میں حاضر ہوا۔ مکہ معظمہ سے واپسی پر جدے سے بیروت کے ہوائی سفر پر روانہ ہوا۔ سفر کے دوران میں دل میں پیہم جذبات کا ایک تلاطم بپا رہا اور آنکھوں سے آبشار جاری رہی اور زیر لب حسرت قلب کا اظہار ان پرسوز الفاظ میں ہوتا رہا۔

من اگر مے داشتم بال و پرے ٭ مے پریدم سوئے کوئے او مدام

ایک امریکی ادارے کی خواہش پر انگریزی میں ISLAM-ITS MEANING FOR MODERN MAN کی تصنیف

۱۹۶۰ء میں میں نے ڈاکٹر روتھ نندا اینشن جو RELIGIOUS PERSPECTIVES کی ایڈیٹر انچیف ہیں کے اصرار پر اس نام کے سلسلۂ تصنیفات میں اسلام پر ایک مختصر کتاب تیار کرنا منظور کر لیا اس کتاب کا مسودہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے عدالت کی اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں مکمل ہو گیا اور سال کے اختتام سے قبل نظر ثانی اور اصلاح کے بعد میں نے اسے ڈاکٹر اینشن کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ انہیں کتاب کا مسودہ اسقدر جلد ملنے کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ اور تھوڑے عرصہ بعد مسودے کے متعلق بہت اطمینان اور پسندیدگی کا خط لکھا۔ تین چار ماہ بعد انہوں نے لکھا کہ ہارپر اینڈ رو ناشران کے اسلامیات کے ماہر مشیر نے مسودے کو بہت پسند کیا ہے ڈاکٹر اینشن نے طباعت کے پروگرام میں جس نمبر پر اس کتاب کی باری رکھی تھی اس کے انتظار میں قریب ایک سال گذر گیا اپنی باری پر ۱۹۶۲ء کے آخر میں یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ ناشران نے ڈاکٹر اینشن کے مشورے کے ساتھ اس کا نام ISLAM – ITS MEANING FOR MODERN MAN تجویز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس سعی کو میری توقع سے بہت بڑھ کر قبولیت بخشی فالحمد للہ۔

جب اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ججوں کے انتخاب کا نتیجہ معلوم ہو گیا تو میں نے اپنے آئندہ پروگرام پر غور شروع کیا میں نومبر ۱۹۳۶ء سے ذیابیطیس کے عارضے میں مبتلا چلا آرہا ہوں۔ ۱۹۴۱ء کے اپریل سے انسولین کا ٹیکہ لازم ہو گیا ہوا ہے۔ گرمی ذیابیطیس کے عارضے کے لئے مضر اثر رکھتی ہے۔ سردی اسکے لئے فائدہ مند ہے مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک وطن میں گرمیوں کا موسم میدان میں گذارنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کے سات سالوں میں متواتر سردیوں کے موسم کا زیادہ حصہ بیرون ملک امریکہ یا یورپ میں گذارنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ البتہ گرمیوں کا موسم کراچی میں بسر کرنا پڑتا تا۔ کراچی میں گرمیوں میں درجہ حرارت پنجاب کے برابر تو نہیں ہوتا لیکن پھر بھی تکلیف ضرور محسوس ہوتی ہے اور مجھے ۱۹۴۷ء سے پہلے پندرہ سال تک میدانی موسم گرما کا سامنا نہ ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک گرمیوں کا موسم کراچی میں گذارنے کا میری بیماری پر اتنا اثر ہوا کہ میرے انسولین کے ٹیکے کی مقدار ۲۰ یونٹ سے بڑھتے بڑھتے ۲۸ یونٹ تک پہنچ گئی۔ ہیگ میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد یہ مقدار کم ہونا شروع ہوئی۔ کچھ تو گرمی سے بچاؤ رہتا تھا اور کچھ زندگی کا اسلوب بہت سادہ اور باقاعدہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی ذیابیطیس کے مریض کے لئے بہت فائدے کا موجب ہوتا ہے۔ ٹیکے کی مقدار کم ہوتے ہوتے ۱۹۶۰ء کے آخر تک چھ یونٹ پر آ گئی تھی۔ دس یونٹ سے کم کا ٹیکہ تو عام طور پر تجویز ہی نہیں کیا جاتا۔ اسقدر انسولین کی اگر ضرورت نہ رہے تو پھر توقع کی جاتی ہے کہ مریض کھانے پینے کی

پرہیز سے ہی انسولین کے ٹیکے کے بغیر شکر کا اعتدال خون میں قائم رکھ سکے گا۔ لیکن مجھے ڈاکٹر جوسلن نے مشورہ دیا ہوا تھا کہ تم جو لوٹ پر ٹھیک چل رہے ہو یہ مقدار جاری رکھو اور باقاعدہ ٹیسٹ کرتے رہو ممکن ہے کسی وقت زیادہ مقدار کی ضرورت محسوس ہو۔ ان حالات میں میری سب سے پہلی ضرورت تو یہ تھی کہ رہائش کے متعلق ایسا انتظام تجویز کیا جائے جس میں مجھے گرمی کی شدت کا سامنا نہ ہو۔ مغربی پاکستان میں لاہور اب مقام ہے جہاں موسم کے لحاظ سے بھی اور ذہنی دلچسپیوں کے لحاظ سے بھی سردیوں کا موسم اور ماحول نہایت خوشگوار ہوتے ہیں لیکن گرمی کی شدت ہوتی ہے۔ میری طبیعت کے رجحان کے پیش نظر ربوہ میرے لئے لاہور سے بھی بڑھ کر دلچسپی کا مرکز ہے۔ ۱۹۵۶ء میں میں نے وہاں ایک رہائشی مکان بھی تعمیر کروا لیا تھا۔ لیکن ربوہ میں گرمی کی شدت لاہور سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مغربی پاکستان میں مستقل رہائش اختیار کرنے کیلئے اپنی صحت کے نقطۂ نظر سے لازم تھا کہ گرمیوں کا موسم گذارنے کیلئے کسی پہاڑی مقام پر مکان کا انتظام کیا جائے۔ ان سب حالات کے پیش نظر میری طبیعت اس طرف مائل ہوئی کہ گرمیوں کے موسم کیلئے انگلستان میں رہائش کا انتظام کیا جائے۔ عدالت سے میں جس قدر پنشن کا حقدار ہو چکا تھا وہ میری سادہ اور محدود ضروریات کیلئے کافی تھی۔ ہیگ کا فلیٹ فروخت کر کے کیمبرج میں ایک موزوں فلیٹ کی خرید کا انتظام ہو گیا۔ اور ۱۹۶۰ء کے آخر میں میں نے اپنی رہائش ہیگ سے کیمبرج منتقل کر لی۔ کیمبرج میں سامان وغیرہ درست کر چکنے کے بعد میں حسبِ سابق دسمبر میں پاکستان آ گیا۔

وزیر خارجہ پاکستان کی طرف سے سومالیہ میں اقوام متحدہ کے نمائندے کے عہدہ کی پیشکش

کراچی پہنچنے پر مسٹر مرشد جائنٹ سیکرٹری وزارت خارجہ میری جائے قیام پر تشریف لائے اور فرمایا وزیر خارجہ شیخ منظور قادر کل راولپنڈی تشریف لے گئے ہیں اور جانے سے پہلے مجھے فرما گئے ہیں کہ میں انکی ایک تجویز کا آپ سے ذکر کر کے اس کے متعلق آپ کی رضامندی حاصل کر لوں۔ دریافت کیا تو فرمایا سومالیہ میں اقوام متحدہ کے نمائندے کا تقرر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے زیر غور ہے۔ سومالیہ کی حکومت مصر ہے کہ اس عہدے کیلئے کسی موزوں پاکستانی کا انتخاب کیا جائے۔ سیکرٹری جنرل کو اس سے اتفاق ہے۔ ان کی طرف سے نام طلب کئے جانے پر وزیر خارجہ نے ایک نام ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن سیکرٹری جنرل نے لکھا ہے کہ زیادہ سینئر شخص مطلوب ہے۔ عملاً اقوام متحدہ کے نمائندے کی حیثیت اور اس کے اختیارات وزیر اعظم کے ہوں گے۔ مشاہرہ، مکان و دیگر سہولتیں اعلیٰ معیار پر ہوں گی۔ وزیر خارجہ نے سیکرٹری جنرل کو لکھا ہے کہ عنقریب ہم ایسے شخص کا نام تجویز کریں گے جسے آپ ہر لحاظ سے موزوں سمجھیں گے۔ ان کے مدنظر آپ ہیں۔ انہیں آپ کا انتظار تھا کہ آپ آ جائیں تو آپ کی رضامندی لیکر آپ کا نام سیکرٹری جنرل کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ مجھے فرما گئے تھے کہ میں آپ سے ذکر کر کے آپ کی رضامندی لے لوں۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں وزیر خارجہ صاحب کی خدمت میں ٹیلیفون پر گذارش کر دوں کہ آپ رضامند ہیں۔ میں نے کہا لیکن میں تو رضامند نہیں۔ اس پر مسٹر مرشد کچھ پریشان ہوئے اور فرمایا وزیر خارجہ تو بالکل مطمئن تھے کہ آپ ضرور رضامند ہوں گے اور مجھے ہدایت دی تھی کہ آپ کی رضامندی کی اطلاع ان کی خدمت میں کرنے کے

ساتھ ہی سیکریٹری جنرل کو بھی آپ کے نام کی اور رضامندی کی اطلاع کر دی جائے۔ ان کو تو آپ سے انکار کی توقع نہیں اب میں ان کی خدمت میں کیا گذارش کروں۔ میں نے کہا دیجئے جو میں نے کہا ہے انہوں نے فرمایا وہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ نے انکار کی کوئی وجہ بھی بیان کی یا نہیں۔ میں نے کہا آپ نے فرمایا ہے کہ اس عہدے کے اختیارات وزیر اعظم کے ہوں گے۔ سومالیہ ایک نو آزاد ملک ہے حکومت کے تمام صیغہ جات کی تنظیم، مالیات کی ترتیب اقتصادیات کی تحکیم سب کچھ نئے سرے سے سرانجام دینا ہو گا۔ یہ کام ایسے شخص کا ہے جو انتظامی امور میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں میں چھ سات سال سے حکومت اور اس کے صیغہ جات سے بالکل الگ تھلگ رہا ہوں، میری عمر قریباً ۶۸ سال کی ہے۔ سومالیہ نہایت گرم علاقہ ہے میری طبیعت سخت گرمی کی برداشت نہیں رکھتی اور ذیابطیس کے عارضے کے سبب گرمی میری صحت کے لئے نہایت مضر ہے اسلئے میں اپنے آپکو اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اہل نہیں سمجھتا۔ مرشد صاحب نے فرمایا وزیر خارجہ کو تو یہ معلوم کر کے صدمہ ہو گا کہ آپ رضامند نہیں۔ میں نے کہا میں وزیر خارجہ صاحب کا نہایت ممنون ہوں کہ اس تعلق میں انہوں نے مجھے یاد رکھا لیکن میں نے اپنی نا اہلیت اور نا قابلیت کی وجوہ آپ کی خدمت میں گذارش کر دی ہیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کی رائے کے تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں ؟ میں نے کہا نہیں۔

کراچی ہی میں معلوم ہوا کہ محمد اکرام اللہ صاحب بعارضۂ قلب بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں میرے ان کے ساتھ پچیس سال سے زائد عرصہ کے دوستانہ مراسم تھے عیادت کیلئے حاضر خدمت ہوا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد رخصت طلب کرنے پر فرمایا۔ ڈاکٹر دل نے کہا ہو گا پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرنا؟ میں نے کہا کچھ ایسی ہی ہدایت تھی۔ فرمایا ڈاکٹر تو اُلّو ہیں وہ کیا جانیں تمہارے جیسے دوستوں کی ملاقات کسقدر اطمینان اور سکون کا باعث ہوتی ہے میرے لئے تو یہی ایک کارگر نسخہ ہے اب آرام سے بیٹھ جاؤ اور اٹھنے کا نام نہ لینا۔ دوران گفتگو میں کہا بین الاقوامی عدالت کیلئے تمہارے دوبارہ انتخاب کے معاملے میں ہمارے لوگوں سے بڑی کوتاہی ہوئی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی ہم کامیاب نہ ہوتے۔ میں نے کہا خان بہادر سید اطاعت حسین صاحب اور آغا شاہی صاحب تو بہت تندہی سے کوشش کرتے رہے۔ فرمایا کرتے رہے ہوں گے لیکن اقوام متحدہ میں ہمارے مستقل نمائندے نے خود کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اس کے برعکس اس کا رویہ مخالفانہ تھا۔ اکرام اللہ صاحب میرے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے اس کوتاہی پر متاسف تھے لیکن مجھے افسوس نہ تھا نہ فکر مجھے یقین تھا کہ۔ کارسازِ ما بہ فکر کارِ ما ❊ فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حکومت اسپین کو ان کے ایک تنازعہ میں جو بین الاقوامی عدالت میں تھا قانونی مشورہ

۱۹۶۱ء میں سردیوں کا موسم گذرنے کے بعد میں پاکستان سے کیمبرج چلا گیا۔ کیمبرج پہنچنے کے کچھ دن بعد مجھے ہسپانوی وزارت کے مشیر قانونی سینیور کاسٹر دیال کا تار ملا کہ وہ مجھ سے بارسیلونا ٹریکشن کمپنی کے کیس میں جس میں بلجیم اور سپین شریک تھے اور جو بین الاقوامی عدالت میں دائر تھا مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش پر میں میڈرڈ گیا اور انہیں ضروری مشورہ دیا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب صدر پاکستان کی طرف سے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کے عہدہ کی پیشکش

جولائی میں فیلڈ مارشل آنریبل صاحب امریکہ تشریف لے جاتے ہوئے لندن میں قیام فرما ہوئے۔ مجھے طلب

فرمایا۔ حاضر ہونے پر بعض دیگر امور کے تذکرے کے بعد فرمایا ہم چاہتے ہیں آپ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے کے طور پر کام کریں۔ میں نے عرض کیا خواجہ سعید حسن صاحب کو اس منصب پر نیویارک گئے ابھی ایک سال ہی گذرا ہے اور وہ عارضہ قلب سے کچھ پریشان بھی ہیں اس لحاظ سے نیویارک ان کیلئے نہایت موزوں جگہ ہے کیونکہ وہاں اعلیٰ سے اعلیٰ طبی مشورہ اور مدد فوراً میسر آسکتے ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ انہیں وہاں سے ہٹا کر میرے لئے جگہ پیدا کی جائے۔ دوسرے آپ کو یہ خیال نہیں ہونا چاہیئے کہ میں عدالت سے علیحدہ ہو گیا ہوں اسلئے میرے لئے ضرور کوئی جگہ مہیا کی جانی چاہیئے۔ مجھے جو پنشن عدالت سے ملتی ہے وہ میری محدود ضروریات کیلئے کفایت کرتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی احتیاج نہیں۔ فرمایا نہیں نہیں ان دونوں باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ خواجہ سعید حسن کی ہمیں پاکستان میں ضرورت ہے اور اقوام متحدہ کیلئے آپ نہایت موزوں ہیں تفاصیل وزیر خارجہ سے طے کرلیں۔ وہ آپ کے ساتھ بعض آئینی امور پر بھی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی امریکہ سے واپسی پر ملاقات ہوئی تو فرمایا ہم نے کل سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ سے آپ کے مجوزہ تقرر کا ذکر کیا تھا انہوں نے بہت اطمینان کا اظہار فرمایا۔ وزیر خارجہ نے فرمایا آپ دو چار دن کیلئے راولپنڈی آجائیں تاکہ وہاں جملہ امور کے متعلق مشورہ کرلیا جائے۔ چنانچہ میں حاضر ہو گیا اور بعد مشورہ کیمبرج واپس پہنچ کر دو تین دن میں تیاری کر کے ۱۲/اگست ۱۹۶۱ء کو نیویارک پہنچ گیا اور اپنے نئے منصب کا چارج لے لیا۔

اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی

جب میں نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے کی حیثیت سے چارج لیا تو آغا شاہی صاحب نائب مستقل نمائندے کے منصب پر فائز تھے لیکن ان کے وزارت خارجہ میں واپس جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا میری درخواست پر سال کے آخر تک ان کے نیویارک میں رہنے کے احکام صادر ہو گئے۔

السید منجی سلیم سفیر تونس کا اسمبلی کے سولہویں اجلاس کے لئے صدر اسمبلی منتخب ہونا

اسمبلی کا سالانہ اجلاس ستمبر میں شروع ہونے والا تھا۔ صدارت کے لئے السید منجی سلیم سفیر تونس متعینہ اقوام متحدہ کا نام لیا جارہا تھا۔ آغا شاہی صاحب نے بتایا کہ سفیر انڈونیشیا متعینہ واشنگٹن بھی صدارت کے امیدوار تھے لیکن مسٹر اوتھانٹ سفیر برما متعینہ اقوام متحدہ نے انہیں اس شرط پر امیدواری سے دستکش ہو جانے پر رضامند کر لیا ہے کہ آئندہ سال کی صدارت کے لئے افریقی ایشیائی ممالک ان کی تائید کریں گے۔ چنانچہ اجلاس شروع ہونے پر السید منجی سلیم بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے۔ یہ اجلاس اسمبلی کا سولہواں سالانہ اجلاس (۶۲ – ۱۹۶۱ء) تھا پندرھویں سالانہ اجلاس (۶۱ – ۱۹۶۰) کے صدر مسٹر فریڈرک بولینڈ سفیر آئرلینڈ متعینہ اقوام متحدہ تھے۔

لائبیریا اور ابی سینا کے جنوبی افریقہ کے ساتھ جنوب مغربی افریقہ کے قضیہ میں نامزد جج مقرر کئے جانے کی پیشکش

نیویارک پہنچے ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ مسٹر ارنسٹ گروس مجھے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ جب کشمیر کا قضیہ پہلے پہل مجلس امن میں زیر بحث آیا تو یہ سینیٹر وارن آسٹن کے نائب کے طور پر مجلس امن میں امریکہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ اور ان دنوں میرے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے اب چند سالوں سے وہ وکالت کی پریکٹس کرتے تھے اور جنوب مغربی افریقہ

کے متعلق جو کاروائی لائبیریا اور ابی سینیا نے بین الاقوامی عدالت میں جنوبی افریقہ کے خلاف دائر کر رکھی تھی اس میں درخواست کنندہ ممالک کی طرف سے ایجنٹ بھی تھے اور وکیل بھی۔ جنوبی افریقہ نے ابتدائی عذرات داخل کئے تھے کہ عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہیں اور درخواست کنندہ ممالک جنوبی افریقہ کے اس نظم و نسق پر جو جنوبی افریقہ کی حکومت نے جنوب مغربی افریقہ میں جاری کر رکھا ہے اعتراض کرنے کے مجاز نہیں۔ اس مرحلے پر درخواست کنندہ کے سامنے اپنی طرف سے ایک جج نامزد کرنے کا سوال تھا۔ مسٹر گروس نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم ان ممالک کی طرف سے جج نامزد کئے جانے پر رضامند ہو؟ میں نے کہا ذاتی طور سے تو مجھے کوئی عذر نہیں لیکن مجھے حکومت پاکستان سے دریافت کرنا ہوگا کہ وہ مجھے مطلوبہ عرصے کیلئے یہاں سے غیر حاضر ہونے کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ مسٹر گروس نے کہا میں دونوں افریقی حکومتوں کو اپنی تجویز بھیج دوں گا اور انکی پسندیدگی کی اطلاع ملنے پر تم سے کہوں گا کہ تم پاکستان کی اجازت حاصل کرو۔ اس اثناء میں اقوام متحدہ کی اسمبلی کا سالانہ اجلاس شروع ہوگیا۔ جنوب مغربی افریقہ کی آزادی کا مسئلہ بھی ایجنڈے میں شامل تھا۔ میں نے پاکستانی وفد سے کہہ دیا کہ بین الاقوامی عدالت میں جنوب مغربی افریقہ کے قضیئے کے متعلق ابی سینیا اور لائبیریا کی طرف سے جنوبی افریقہ کے خلاف کیس دائر ہے اس میں درخواست کنندہ ممالک کے نامزد کردہ جج کی حیثیت میں میرے شامل ہونے کا امکان ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ جنوب مغربی افریقہ کی آزادی کے مسئلے پر جب ہمارے وفد کے اجلاس میں مشورہ ہو تو میں اس میں شامل نہ ہوں۔ یہ مسئلہ اسمبلی کی چوتھی کمیٹی کے ایجنڈے میں شامل کیا گیا تھا اور اس کمیٹی کے اجلاس میں زیر بحث آیا۔ پاکستان کی طرف سے ڈاکٹر وقار احمد ہمدانی صاحب نے نمائندگی کی اور حکومت کے موقف کا مناسب طریق پر اظہار کیا۔ میں نے نہ اپنے وفد کے اجلاس میں اس مسئلے پر بحث کے دوران میں کوئی حصہ لیا اور نہ چوتھی کمیٹی کے کسی اجلاس میں شرکت کی۔ کچھ عرصہ بعد مسٹر گروس نے اطلاع دی کہ لائبیریا اور ابی سینیا دونوں حکومتوں نے میری نامزدگی کی تجویز کو بہت پسند کیا ہے اور کہا اب تم حکومت پاکستان سے دریافت کر لو کہ وہ تمہیں اس ذمہ داری کے اٹھانے اور مطلوبہ عرصے کیلئے ہیگ حاضر رہنے کی اجازت دینے پر رضامند ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں نے یہ معاملہ وزیر خارجہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور انکی طرف سے حکومت کی رضامندی کی اطلاع موصول ہوگئی۔ اسکی اطلاع میں نے گروس کو کر دی۔ مسٹر گروس نے دونوں حکومتوں کی طرف سے میرا نام بین الاقوامی عدالت کو بھیج دیا ہوگا اور عدالت کی طرف سے ضابطے کے مطابق جنوبی افریقہ کی حکومت کو بھی اس نامزدگی کی اطلاع بھیج دی گئی ہوگی۔ جہاں تک مجھے علم ہے جنوبی افریقہ کی طرف سے اس نامزدگی پر کوئی عذر نہ کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے صدر بین الاقوامی عدالت جج وینارسکی کی طرف سے ایک مراسلہ موصول ہوا جس کا مفہوم یہ تھا کہ لائبیریا اور ابی سینیا کی طرف سے تمہاری نامزدگی کی اطلاع ملی تھی جس پر تمہارے سابق رفقاء کو بہت خوشی ہوئی کہ انہیں پھر ایک بار کچھ عرصہ کے لئے تمہاری رفاقت حاصل ہوگی۔ لیکن ان میں سے بعض کی خواہش ہے کہ عدالت کے قانون کی دفعہ نمبر ۱۷ کے فقرہ نمبر ۲ کے پیش نظر تمہیں ڈاکٹر وقار احمد ہمدانی کی ان تقاریر کی طرف توجہ دلائی جائے جو انہوں نے جنوب مغربی افریقہ کے مسئلے پر اسمبلی کی چوتھی کمیٹی کے اجلاسوں میں کیں اور جن کا حوالہ نیچے درج ہے اور تم سے دریافت کیا جائے کہ واقعات اور قانون کی رو سے تمہارا دفعہ نمبر ۱۷ کے فقرہ نمبر ۲ کے اطلاق کے متعلق کیا تاثر ہے۔ میں نے جواب میں واقعات کی توضیحی تشریح

لکھ دی جس کا خلاصہ اوپر درج ہے اور قانون کے متعلق لکھا کہ دفعہ ۱۷ کے فقرہ نمبر ۲ کی عبارت یہ ہے۔

"NO MEMBER OF THE COURT MAY PARTICIPATE IN THE DECISION OF ANY CASE IN WHICH HE HAS PREVIOUSLY TAKEN PART AS AGENT, COUNSEL OR ADVOCATE FOR ONE OF THE PARTIES, OR AS A MEMBER OF A NATIONAL OR INTERNATIONAL COURT, OR OF A COMMISION OF ENQUIRY, OR IN ANY OTHER CAPACITY"

یعنی جس جج نے عدالت میں دائر ہونے والے کیس میں کسی مرحلے پر شرکت کی ہو وہ اس کیس میں حصہ نہیں لے سکتا میری دانست میں اس سے مراد یہ ہے کہ شرکت ذاتی بلاواسطہ ہو یہ مراد نہیں کہ اگر وفد کے کسی رکن نے شرکت کی ہو تو وفد کے تمام اراکین پر فقرے کا اطلاق ہو گا۔ دوسرے اس کیس میں شرکت کی ہو جو عدالت کے روبرو پیش ہے یہ مراد نہیں کہ جو مسائل عدالت میں متنازعہ کیس سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے کسی مسئلے کی بحث میں خواہ وہ بحث کسی ادارے میں ہوئی ہو حصہ لیا ہو۔ میں نے چونکہ ان مسائل کی بحث میں کہیں بھی حصہ نہیں لیا اسلئے مجھ پر اس فقرے کا اطلاق نہیں ہو سکتا اگر اس حصے کی یہ تشریح کی جائے کہ ڈاکٹر ہمدانی صاحب کی تقریروں کے نتیجے میں میں اس فقرے کی زد میں آتا ہوں تو اس صورت میں عدالت کے نصف درجن اراکین بھی اس زد میں آتے ہیں۔ چنانچہ ان چھ اراکین عدالت کے متعلق میں نے وضاحت کی کہ انکی شرکت ان مسائل کی بحث میں میری بالواسطہ شرکت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے کم نہیں ہے۔ اس کا جواب صاحب صدر کی طرف سے یہ موصول ہوا کہ میں نے تمہارا جواب عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ عدالت کی یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ یہ امر تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر تم اجلاس میں شامل ہونا چاہو تو شامل ہو سکتے ہو۔ میں نے فوراً جواب میں لکھا کہ عدالت کو اس امر کا فیصلہ خود کرنا چاہئے تھا۔ مجھ پر چھوڑ دینے سے میرے لئے یہ دقت پیدا کر دی گئی ہے کہ میں یا تو شامل ہونے سے انکار کر دوں یا یہ موقف اختیار کر لوں کہ اگرچہ بعض ججوں کی رائے میں میرا شامل ہونا دفعہ ۱۷ فقرہ نمبر ۲ کی خلاف ورزی ہے لیکن میں فیصلہ کرتا ہوں کہ یہ فقرہ میری شمولیت کے رستے میں عارض نہیں اور میں اجلاس میں شامل ہوں گا۔ ان حالات میں میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ میں شمولیت کیلئے فارغ نہیں ہو سکتا۔

اسمبلی کا سولہواں اجلاس اس سے ماقبل کے پانچ چھ اجلاسوں کی طرح دسمبر کے تیسرے ہفتے میں ختم نہ ہو سکا اور کرسمس کی تعطیل کے بعد جنوری میں جاری رہا۔ اجلاس ختم ہونے کے جلد بعد آئندہ اجلاس کی صدارت کے متعلق چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ افریقی ایشیائی ممالک میں یہ روحیل رہی تھی کہ سال ماقبل کے سمجھوتے کے مطابق علی سالسترو امی جو امیدوار ہونگے لیکن ۶۲ء کے شروع میں انڈونیشیا کی حکومت کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ علی سالسترو امی جو کو سالانہ اجلاس کیلئے فارغ نہیں کیا جا سکے گا۔ اس پر میں نے پہلے عرب نمائندگان کو جمع کیا اور مشورہ دیا کہ اراکین اقوام متحدہ کی کل تعداد میں اب

نصف کے قریب افریقن اور ایشیائی ہیں اور جلد یہ تعداد نصف تک پہنچ کر نصف سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ اس لئے بالکل مناسب اور جائز ہے کہ ہم اسمبلی کی صدارت میں نصف کے حقدار شمار کئے جائیں۔ لیکن ہمیں چاہیئے کہ ہم موجودہ افریقن صدر کا سال ختم ہوتے ہی سال مابعد کی صدارت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ باقی ممالک کے نمائندگان کے ساتھ یہ سمجھوتہ کریں کہ ہر دوسرے سال صدارت کیلئے ایشیائی یا افریقی صدر جس کی ہم تائید کریں منتخب ہوا کریگا۔ درمیانی سال میں جسے باقی ممالک پسند کریں وہ منتخب ہو جایا کرے۔ میرے عرب رفقاء نے اس تجویز کو پسند کیا اور مزید مشورے کے بعد طے پایا کہ آئندہ سال کی صدارت کے لئے ہم لاطینی امریکن ممالک کو پیشکش کریں کہ ہم ارجنٹائن کے نمائندے سفیر آمادیو کی تائید کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ لاطینی امریکن ہم سے وعدہ کریں کہ وہ ہر دوسرے سال جس امیدوار کو ہم اپنے میں سے صدارت کے لئے پیش کریں اس کی تائید کیا کریں گے۔ سفیر امادیو نہایت شریف الطبع انسان تھے۔ سولہویں اجلاس میں اوّل کمیٹی کی صدارت نہایت کامیابی سے کر چکے تھے اور ہر سمت سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ لاطینی امریکن ممالک کے نمائندوں نے یہ تجویز منظور کر لی اور سفیر امادیو بھی رضامند ہو گئے۔ ابھی اس سمجھوتے پر ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ ارجنٹائن میں سیاسی انقلاب ہو کر حکومت بدل گئی۔ نئی حکومت نے سفیر امادیو سے درخواست کی کہ وہ اپنے منصب پر بدستور قائم رہیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور مستعفی ہو کر وطن واپس چلے گئے۔ لاطینی امریکن نمائندوں کے ساتھ ابھی کسی اور امیدوار کے متعلق ہماری کوئی فیصلہ کن بات نہیں ہو پائی تھی کہ پروفیسر ملالاسیکرا سفیر سیلون متعینہ اقوام متحدہ و کنیڈا نے آئندہ اجلاس کی صدارت کیلئے اپنے امیدوار ہونے کا اعلان کر دیا۔ پروفیسر ملالاسیکرا کی اقوام متحدہ میں تعیناتی چند ماہ قبل ہی عمل میں آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ماسکو میں سیلون کے سفیر رہ چکے تھے اور بدیں وجہ مشرقی یورپین ممالک کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ غالباً انہیں ان ممالک کی طرف سے تائید کا وعدہ بھی مل چکا تھا۔ سیلون کے تعلقات ایشیا کے بدھ ممالک کے ساتھ طبعاً نہایت گہرے تھے۔ پروفیسر صاحب کو بدھ ممالک کی تائید پر بھی بھروسہ ہو گا۔ انہوں نے شروع ہی میں اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ ۲۵ ، ۳۰ ممالک کی طرف سے انہیں تائید کے وعدے موصول ہو چکے ہیں۔ ان کے بعض انفرادی موئیدین کا کہنا تھا کہ اب اگر کوئی اور امیدوار میدان میں آئے بھی اور بقیہ ریاستوں میں سے نصف کی تائید حاصل بھی کر لے تو بھی پروفیسر صاحب کے حق میں ۲۵ ، ۳۰ آراء کی زیادتی قائم رہے گی۔ اور ان کا منتخب ہونا یقینی ہے۔

قضیۂ کشمیر پھر مجلس امن میں پیش کیا گیا | اس اثناء میں مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ قضیۂ کشمیر کو مجلس امن میں زیر بحث لانے کی غرض سے مناسب اقدام کرو۔ اس سلسلہ میں سب سے اوّل اور سب سے اہم مرحلہ مستقل اراکین مجلس کو آمادہ کرنے کا تھا کہ وہ مجلس کا اجلاس طلب کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ پانچ مستقل اراکین مجلس میں سے اس زمانے میں روس کی طرف سے تو تائید کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں کشمیر کے مسئلے پر وہ مسٹر کرشنا مینن کے اشارے پر چلتے تھے ان کے اس رویئے کا باقی اراکین پر بھی اثر ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بحث مباحثے کے بعد اگر کوئی تجویز بعض اراکین کی طرف سے پیش بھی کی جائے تو روس اس کی مخالفت کرے گا اور ایک مستقل رکن کی مخالفت کی وجہ سے تجویز ساقط ہو جائے گی اسلئے بحث مباحثے سے کیا حاصل؟

چینی نمائندے پر زور دینے کی ضرورت اسلئے نہیں تھی کہ وہ امریکہ کے اشارے پر چلتے تھے۔ ان کا پاؤں امریکی ہاتھی کے پاؤں میں تھا اسلئے پہلا مرحلہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو آمادہ کرنے کا تھا۔ امریکہ کے مندوب اوّل گورنر ایڈلائی سٹیونسن تھے۔ برطانیہ کے سر پیٹرک ڈین اور فرانس کے سفیر روجر سیدو لیکن امریکی نمائندگان میں سے کشمیر کا مسئلہ سفیر پلمپٹن سے متعلق تھا۔ میرے ان سب اصحاب کیساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ سفیر پلمپٹن سے جب میں نے پہلی بار یہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا ہم اپنی وزارت خارجہ سے ہدایت طلب کریں گے مجھ کو اس مرحلے پر اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں تھی لیکن جو امر مایوس کن تھا وہ ان کا بے رخی کا لہجہ تھا جس سے خدشہ ہوا کہ وہ آسانی سے ماننے کے نہیں۔ سر پیٹرک ڈین نے پوری دلچسپی کا اظہار کیا موجودہ صورت حالات کے متعلق دریافت فرمایا اور کہا ہم لندن سے دریافت کریں گے لیکن ہماری رائے میں کوئی دقت پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ سفیر سیدو نے حسب توقع دلچسپی بھی ظاہر کی اور ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔ اور تائید کا یقین دلایا۔ اس مرحلے پر ابھی یہی سوال تھا کہ مسئلہ کشمیر کو زیر بحث لانے کیلئے مجلس امن کا اجلاس طلب کیا جائے۔ کسی خاص تجویز پر ابھی تبادلہ خیالات کا موقعہ نہیں تھا۔ میں غیر مستقل اراکین ممالک کے نمائندگان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ان سب کی طرف سے اجلاس طلب کئے جانے پر آمادگی کا اظہار ہوا۔ چند دن بعد سفیر پلمپٹن صاحب سے پھر ملاقات ہوئی انہوں نے دریافت کیا روس کا رویہ کیا ہوگا۔ میں نے کہا روس کا رویہ کوئی راز کی بات نہیں وہ تو سرے سے اجلاس طلب کئے جانے کے ہی خلاف ہوں گے۔ لیکن یہ مسئلہ ضابطے کا ہے اگر سات اراکین مجلس (اسوقت اراکین مجلس کی تعداد گیارہ تھی ابھی اس تعداد میں اضافہ نہیں ہوا تھا) اجلاس طلب کرنے کے حق میں ہوں تو کسی مستقل رکن کی مخالفت اجلاس طلب کئے جانے کے رستے میں روک نہیں ہو سکتی۔ فرمایا یہ ٹھیک ہے لیکن روس اگر ہر ایک تجویز کی مخالفت پر مصر رہا تو اجلاس طلب کرنے کا کیا فائدہ؟ میں نے کہا اگر باقی دس اراکین کسی تجویز کی تائید کریں اور وہ تجویز صرف روس کی مخالفت کے سبب ساقط ہو جائے تو ایک تو باقی دنیا پر اس قضیئے کی موجودہ صورت اور ہندوستان کی بے جا ضد آشکارا ہو جائے گی اور دوسرے تجویز کے الفاظ ایسے ہو سکتے ہیں کہ باوجود روس کی مخالفت کے کسی اقدام کی گنجائش نکل سکے اس گفتگو کے دو تین روز بعد اقوام متحدہ ہی میں سفیر پلمپٹن سے ملاقات ہونے پر میں نے دریافت کیا کہ وزارت خارجہ سے کوئی ہدایت حاصل ہوئی ہے کہ نہیں۔ انہوں نے کہا وزارت خارجہ کی رائے ہے اور ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ مجلس امن کا اجلاس طلب کرنے سے کوئی نتیجہ خیز صورت پیدا نہیں ہوگی۔ بہتر ہو کہ دونوں حکومتیں براہ راست آپس میں گفتگو کی صورت پیدا کریں۔ میں نے کہا براہ راست گفتگو کے متعلق ہندوستان کا موقف واضح ہو چکا ہے کہ جنگ کی حد بندی کی لائن کو مناسب اصلاح کے ساتھ مستقل حد تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان کسی صورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ سفیر پلمپٹن بولے اس سے زیادہ کی تم کیا توقع رکھ سکتے ہو؟ میں سمجھ گیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ میں نے اسی دن دفتر پہنچنے پر گورنر ایڈلائی سٹیونسن سے ملاقات کے لئے وقت مانگا اور ساتھ یہ بھی کہلوا دیا کہ سفیر پلمپٹن بھی ملاقات کے وقت موجود ہوں۔ ملاقات دوسری صبح کے لئے مقرر کی گئی ملاقات کیلئے حاضر ہونے پر معلوم ہوا کہ سفیر پلمپٹن تو موجود نہیں ہوں گے کیونکہ انہیں نیویارک سے باہر کہیں جانا تھا لیکن گورنر سٹیونسن ملاقات کے لئے تیار ہیں۔ ان کے ساتھ میرا مدت سے

دوستانہ تھا۔ نہایت شریف طبع اور بلند اخلاق کے انسان تھے۔ ہماری آپس میں بے تکلفی تھی۔ میں نے کہا ملاقات کے دوران میں سفیر ہلمپٹن کی موجودگی کی خواہش میں نے اسلئے کی تھی کہ کل انہوں نے مجھ سے کہا۔ "جنگ کی حد بندی کو مستقل سرحد تسلیم کئے جانے سے بڑھ کر تم اور کیا توقع رکھ سکتے ہو؟" میں چاہتا تھا یہ امر واضح ہو جائے کہ کیا انہوں نے فی الواقعہ ایسا کہا تھا یا میں نے ان کے الفاظ کو غلط سنا اور اگر میں نے صحیح سنا تو کیا یہ انکی ذاتی رائے ہے یا امریکی حکومت کا یہی موقف ہے۔ بہر صورت میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی کی رپورٹ حکومت کو بھیجنے کا پابند ہوں اور کل کی گفتگو کی رپورٹ کے سلسلے میں اس وضاحت کا خواہشمند ہوں آپ سے ملاقات کی غرض یہ تھی کہ میں تصدیق کر لوں کہ کیا امریکی حکومت کشمیر کے مسئلے کے مجلس امن میں زیر بحث آنے کے خلاف ہے؟

گورنر سٹیونسن نے فرمایا سفیر ہلمپٹن کے الفاظ تم نے صحیح سنے ہوں گے۔ میں تمہارے متعلق یہ قیاس نہیں کر سکتا کہ تمہیں ایسے معاملات میں غلط فہمی ہو۔ لیکن یہ سفیر ہلمپٹن کا ذاتی خیال ہو گا۔ حکومت کا یہ موقف نہیں۔ ہمیں مجلس امن کا اجلاس طلب کرنے میں بالکل تامل نہیں۔ پاکستان جیسی حکومت کی خواہش ہی ہم پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ انکی خواہش کے مطابق عمل کیا جائے۔ میرے لئے یہ امر رنج کا موجب ہے کہ تمہیں اس معاملے میں کوئی پریشانی ہوئی۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ ابتدائی مرحلہ تو جلد حل ہو گیا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ جب اجلاس طلب کر لیا گیا تو امریکہ کی طرف سے بعد میں کسی قسم کا تساہل نہیں ہوا۔ ہندوستان کی ہٹ دھرمی اور روس کی طرف سے ہندوستان کی تائید کے مقابل پر کسی موثر کارروائی کی تو امید کی نہیں جا سکتی تھی۔ جو کچھ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ہندوستان کا موقف یہ تھا (۱) مہاراجہ کشمیر نے ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کیا اور کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک ہو گیا ہے (۲) پاکستان نے قبائلی جتھوں کو ہندوستان کے خلاف انگیخت کر کے ہندوستان کے خلاف جارحانہ اقدام کیا (۳) وزیراعظم ہندوستان نے کبھی استصواب رائے عامہ (PLEBISCITE) کی اصطلاح کشمیر کے لئے استعمال نہیں کی (۴) پاکستان نے کشمیر کمشن کی تجویز کے مطابق اپنی افواج کے ریاست سے انخلاء کی ذمہ داری لی تھی اسے پورا نہیں کیا اسلئے پاکستان رائے شماری کا مطالبہ کرنے کا حقدار نہیں (۵) بہر صورت اس نزاع کو پیدا ہوئے بہت لمبا عرصہ گذر گیا ہے اور حالات بہت بدل گئے ہیں۔ اسلئے ہندوستان اب رائے شماری کا پابند نہیں رہا۔ (۶) ہندوستانی پارلیمنٹ کشمیر کو ہندوستان کا جزو لاینفک قرار دے چکی ہے اسلئے یہ نزاع طے ہو گیا ہے اور اب کوئی نزاع باقی نہیں۔ ان تمام عذرات کے تفصیلی جوابات پہلے کئی بار دیئے جا چکے تھے اور پھر دیئے گئے۔ اراکین مجلس خوب جانتے تھے کہ سب عذرات بے بنیاد ہیں۔ مسٹر کرشنا مینن بھی اس حقیقت سے خوب واقف تھے۔ مثال کے طور پر ان کے تیسرے عذر کے جواب میں میں نے دس سرکاری دستاویزات سے پنڈت جواہر لال نہرو صاحب وزیراعظم ہندوستان کے بیانات پڑھ کر سنائے جس میں انہوں نے قضیۂ کشمیر کے طے کرنے کا طریق استصواب رائے عامہ تسلیم کیا تھا اور کہا اور بھی مثالیں ہیں۔ لیکن امید ہے اراکین مجلس کا بلکہ میرے فاضل حریف کا بھی اطمینان ہو گیا ہو گا۔ کہ محترم وزیراعظم ہند نے بارہا استصواب رائے عامہ کی اصطلاح کا استعمال کشمیر کے متعلق کیا ہے۔ لیکن جواب الجواب میں پھر مسٹر کرشنا مینن نے اسبات کا اعادہ کیا کہ وزیراعظم

نے کبھی اس اصطلاح کا استعمال کشمیر کے متعلق نہیں کیا۔ مسٹر کرشنا مینن جانتے تھے کہ جو مثالیں میری طرف سے پیش کی گئی ہیں ان سے اراکین مجلس سمجھ چکے ہیں کہ مسٹر کرشنا مینن کا پہلا بیان غلط تھا لیکن انہوں نے بجائے یہ بات تسلیم کرنے کے یا اس موضوع پر خاموش رہنے کے پھر اپنے غلط بیان کا باصرار اعادہ کیا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اراکین مجلس جانتے ہیں کہ انکی بات غلط ہے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ غلط بات کے بار بار اعادے سے بعض لوگ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ شاید یہ بات صحیح ہی ہو! ان سب امور کا واقعاتی اور محکم جواب دینے کے بعد میں نے اراکین مجلس کی خدمت میں گذارش کی کہ فاضل نمائندہ ہندنے جو عذرات بھی پیش کئے ہیں وہ واقعاتی ہیں یا قانونی۔ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں کشمیر کمشن کے پیش کردہ دونوں تجاویز ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء اور ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کو قبول کر چکی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کہتا ہے کہ ان تجاویز پر عمل درآمد نہ ہونے کی ذمہ داری پاکستان پر۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ یہ ذمہ داری ہندوستان پر ہے۔ دونوں طرف سے جو عذرات اور دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان کا تصفیہ عدالتی طریق سے کیا جا سکتا ہے۔ میں حکومت پاکستان کی طرف سے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہندوستان ہمارے ساتھ اس امر پر اتفاق کرے کہ مجلس امن کی طرف سے بین الاقوامی عدالت سے یہ رائے طلب کی جائے کہ فریقین کے تمام عذرات اور دلائل تحریری اور تقریری پڑھ اور سنکر ان پر غور کرنے کے بعد عدالت اپنی رائے صادر کرے کہ موجودہ حالات میں کمشن کی دونوں تجویزوں کے ماتحت دونوں حکومتوں پر کیا کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ پھر جو رائے عدالت صادر کرے دونوں حکومتیں اسے تسلیم کرکے اس کے مطابق عمل کریں۔ پاکستان یہ طریق تصفیہ اختیار کرنے پر آمادہ اور رضامند ہے۔ ہندوستان بھی اپنی رضامندی اور آمادگی کا اظہار کر دے۔ اس طرح بالکل پرامن طریق سے اس قضیئے کا تصفیہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان اس طریق کو اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر مجلس کے پانچ غیر مستقل اراکین نے اس تجویز پر اتفاق کیا کہ فریقین آپس میں مسلمہ اصولوں کے مطابق اس قضیئے کا تصفیہ کرنے کے بارے میں گفت و شنید کریں لیکن مسٹر کرشنا مینن اس پر بھی رضامند نہ ہوئے اور روس نے تجویز کے مخالف رائے دیکر اسے مسترد کر دیا۔

کشمیر کا قضیہ مجلس امن کے روبرو اوّل اوّل ہندوستان نے جنوری ۱۹۴۸ء میں پیش کیا تھا۔ جب اراکین مجلس فریقین کے بیانات سنکر حقیقت سے آگاہ ہو چکے اور ہندوستان کی طرف سے جو جال ان کے سامنے بچھایا گیا تھا اس میں الجھنے سے انہوں نے انکار کیا اور اس تمام قضیئے کا تصفیہ ان اصولوں کی بنا پر کرنا چاہا جسے فریقین اپنے بیانات میں تسلیم کر چکے تھے تو ہندوستان نے راہ فرار اختیار کی اور قدم بہ قدم اپنے مسلمہ اصولوں سے پیچھے ہٹنا شروع ہو گیا۔ ان دنوں میرے متعلق وزیر اعظم ہند شکوہ کیا کرتے تھے کہ میں نے اپنی ”دروغ بافیوں اور فریب کاریوں“ سے بین الاقوامی حلقوں میں ان کے روئے روشن کو سیاہ کر دیا ہے۔ جھوٹ اور فریب سچ کی روشنی پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔ اگر بین الاقوامی حلقوں میں وزیر اعظم ہند کا سیاسی چہرہ غبار آلود ہو گیا ہے تو وہ غبار ان کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے سترھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے میری نامزدگی

جب پروفیسر ملا اسپیکر اکی امیدواری صدارت کے سلسلے میں مغربی ممالک کے نمائندگان میں سے بعض نے کہنا شروع کیا کہ اگر ایشیا آئندہ سالانہ اجلاس کی صدارت کا خواہاں ہو تو اس میں مضائقہ نہیں تو السید عبد المنعم الرفاعی سفیر اردن متعینہ

اقوام متحدہ جو اس مہینے کے دوران میں افریقن ایشیائی گروپ کے صدر تھے مجھ سے ملنے کیلئے تشریف لائے اور فرمایا تمہارا تجویز کہ افریقن صدر کے فوراً بعد ایک ایشیائی کا صدر منتخب ہونے کیلئے امیدوار ہونا مناسب نہیں درست تھی اور ہم سب اس کی تائید میں تھے لیکن وہ تجویز سفیر آمادیو کے اپنے منصب سے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے درمیان میں رہ گئی اور اب پروفیسر ملالاسیکرا کے امیدوار ہونیکا کچھ چرچا ہونے لگا ہے۔ میں نے افریقن ایشیائی نمائندگان میں سے بعض کے ساتھ فرداً فرداً بات کی ہے وہ پروفیسر ملالاسیکرا کی تائید میں نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اگر آئندہ اجلاس کی صدارت کسی ایشیائی کو ملنی ہے تو ہمیں کسی زیادہ معروف ایشیائی شخصیت کو اس منصب کے لئے پیش کرنا چاہئے اور اکثروں کی نظریں تمہاری طرف اٹھتی ہیں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں تمہیں امیدوار ہونے پر آمادہ کروں۔ میں نے عذر کیا۔ لیکن وہ مصر ہوئے اور فرمایا میں تمہارا عذر تسلیم نہیں کرتا۔ میں مزید مشورہ افریقن ایشیائی نمائندگان سے کرنے کے بعد چند دنوں میں پھر تم سے بات چیت کروں گا۔ جب دوبارہ تشریف لائے تو فرمایا اب تمہارے انکار کی گنجائش نہیں۔ پروفیسر ملالاسیکرا کو تو ہمارے گروپ کی کثرت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک دو اور ایشیائی مندوبین بھی اپنی امیدواری کا اعلان کرنیکی تیاری کر رہے ہیں۔ افریقن ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی کثرت تمہارے حق میں ہے۔ تم جلد فیصلہ کرو تا ہم اپنی تائیدی مساعی شروع کریں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اس معاملے میں کچھ تردد نہیں کرنا پڑے گا آخر میں نے اتنا مان لیا کہ میں حکومت پاکستان سے استصواب کروں گا میرے استصواب پر حکومت کی طرف سے جواب آیا کہ اگر حالات سازگار ہیں تو ضرور اپنے نام کا اعلان کردو۔ میں نے حکومت کے ارشاد کی تعمیل کی۔ پروفیسر ملالاسیکرا نے اپنا ارادہ ترک نہ کیا لیکن افریقن ایشیائی ممالک کے نمائندگان میں سے کسی اور صاحب نے اپنے امیدوار ہونے کا اعلان نہ کیا مقابلہ پروفیسر صاحب اور میرے درمیان ہی رہا۔

ٹرینیڈاڈ کے جشن آزادی میں بطور نمائندہ پاکستان شرکت

اسی اثناء میں مجھے حکومت کی طرف سے ہدایت ملی کہ ٹرینیڈاڈ اور ٹوبیگو کے جشن آزادی میں پاکستان کی نمائندگی کروں۔ میں ارشد الزمان صاحب کو جو ہمارے سفارتخانے میں وزارت اطلاعات کے نمائندے تھے بطور سیکرٹری ساتھ لیکر ٹرینیڈاڈ گیا اور جشن آزادی میں شرکت کی۔ ٹرینیڈاڈ کوئی بڑا جزیرہ نہیں اور ٹوبیگو اس کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن اس چھوٹے سے ملک کی حکومت نے اپنی بساط کے مطابق جشن کا نہایت عمدہ انتظام کیا تھا اگرچہ پروگرام آٹھ دنوں کا تھا لیکن سب تقریبات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام پائیں۔ ٹرینیڈاڈ کا جزیرہ نہایت خوشنما ہے۔ ٹوبیگو کی بڑی تعریف سنی تھی لیکن اسے بہت مرطوب پایا۔ رطوبت کا درجہ اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ البتہ جن اصحاب کو سمندر میں غسل کرنے اور تیراکی کا شوق تھا ان کے لئے رطوبت باعث پریشانی نہیں تھی۔ ٹرینیڈاد کے دارالحکومت پورٹ آف سپین میں مہمانوں کی رہائش کا انتظام نئے تعمیر شدہ ہلٹن ہوٹل میں تھا جو نہایت آرام دہ تھا۔ یہ ہوٹل گویا پہاڑ کی ایک جانب لٹکا ہوا تھا۔ سڑک کی سطح پر سب سے اوپر کی منزل تھی جس میں ملاقات وغیرہ کے وسیع دالان تھے اس سے نچلی منزل پر دو تین بڑے بڑے کھانے کے کمرے تھے اور باہر تیرنے کا تالاب تھا۔ نیچے اتر کر آٹھ دس منزلیں سونے کے کمروں کی تھیں۔ عام

قاعدے کے خلاف خوابگاہ میں جانے کیلئے لفٹ میں نیچے کا بٹن دبانا پڑتا تھا شروع شروع میں تو غلطی بھی ہو جاتی تھی مثلاً ہمارے سونے کے کمرے نیچے کی چوتھی منزل پر تھے جب باہر جانا ہوتا تو سونے کے کمرے سے نکل کر لفٹ میں داخل ہو کر نیچے جانے کا بٹن دبا دیا جاتا اور ہم سونے کے کمروں کی آٹھویں دسویں منزل میں پہنچ جاتے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اس ہوٹل کو اوپر نیچے ہوٹل (UPSIDE DOWN HOTEL) بھی پکارا جاتا تھا۔ ہر خوابگاہ کی بڑی کھڑکیاں وادی کی طرف کھلتی تھیں۔ یہ نظارہ بہت خوشنما تھا۔ ہوٹل میں ہر مذاق کے مطابق نہایت اچھا کھانا مہیا کیا جاتا تھا۔ درجہ حرارت ضبط میں ہونیکی وجہ سے ہوا تمام وقت خوشگوار تھی۔ ہر مندوب کیلئے سارے عرصۂ قیام کیلئے علیحدہ کار کا انتظام تھا سیکرٹری کیلئے الگ کار تھی ہر مندوب کے ساتھ ایک حفاظتی افسر اور ایک یونیورسٹی کا طالب علم بطور افسر رابطہ سارا وقت ڈیوٹی پر رہتے تھے۔ موخر الذکر تو شام کے وقت رخصت ہو جاتا تھا لیکن حفاظتی افسر رات کو بھی خوابگاہ کے باہر برآمدے میں ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ حکومت میں جو پارٹی ان دنوں برسر اقتدار تھی اس میں مسلم اراکین بھی شامل تھے۔ دو وزیر مسلمان تھے وہاں کی مسلم آبادی ہندوستانی نژاد ہے۔ ان میں سے بعض خاندان وہاں تین پشت سے آباد ہیں اور جزیرے کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سی بولتے ہیں۔ اپنے وطن کی زبان بھول چکے ہیں۔ میں نے ایک حفاظتی افسر سے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے کہا انور علی۔ مزید گفتگو سے معلوم ہوا وہ بارہ بہن بھائی ہیں۔ چھ بہن بھائی ان سے بڑے تھے اور سب شادی شدہ تھے۔ سب سے بڑی بہن کے بھی بارہ بچے تھے۔ میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو انور علی صاحب مسکرائے اور کہا میرے والدین ۵۵ سال سے کم عمر کے ہیں اور انکے پوتوں پوتیوں، نواسوں، نواسیوں کی تعداد ۵۲ ہے! ارشد الزمان صاحب نے بتایا کہ انکی سرکاری موٹر کے مسلم شوفر کی عمر ۴۵ سال ہے اور آٹھ بچے ہیں! ٹرینیڈاڈ سے واپسی پر ہوائی جہاز میں میرے پہلو میں ایک نوجوان عیسائی میونسپلٹی کے افسر بیٹھے تھے ان سے میں نے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا ہم بھی بارہ بہن بھائی ہیں۔ انور علی صاحب مستعد اور اچھی قابلیت کے نوجوان تھے لیکن دین سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ ان کے ایک بڑے بھائی کسی قریب کے جزیرے میں پولیس میں بھرتی ہو کر عیسائی ہو چکے تھے۔ میں نے اقوام متحدہ کے جنرل سروسز کے ڈائرکٹر سے کہہ کر انور علی کو اقوام متحدہ کی فیلڈ سروس میں مقرر کروا دیا اور ان کی تعیناتی اردن میں ہو گئی۔ وہاں جانے سے پہلے انہوں نے شادی کر لی۔ وہاں عربی بھی سیکھ لی اور دین سے واقفیت بھی حاصل کر لی۔

انجمن اسلامیہ ٹرینیڈاڈ کی طرف سے دعوت اور اسلام پر تقریر کا اہتمام | مولوی کمال الدین صاحب کی تحریک پر جو ٹرینیڈاڈ کی حکومت میں وزیر تھے انجمن اسلامیہ نے میری دوپہر کے کھانے کی دعوت کی اور اسلام پر تقریر کا انتظام بھی کیا۔ فجزاھم اللہ۔

ٹرینیڈاڈ میں جماعت احمدیہ کے مبشر سے ملاقات | ٹرینیڈاڈ میں احمدی مبشر صاحب سے بھی میری دو تین بار ملاقات ہوئی ان کی رہائش پورٹ آف سپین سے باہر تھی۔ میں ان کے مکان پر بھی حاضر ہوا۔

ٹرینیڈاڈ کے وزیر اعظم اور چینی نسل کے گورنر جنرل ٹرینیڈاڈ کے وزیر اعظم صاحب مسٹر ولیمز سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ نہایت قابل انسان ہیں۔ گورنر جنرل صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا وہ چینی نسل کے تھے نہایت خوش خلق اور صاحب تدبیر۔ ہر شخص انکی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ ٹرینیڈاڈ جیسے جزیرے میں جہاں ہر نسل، ہر رنگ، ہر مذہب کے افراد بستے تھے ایسی شخصیت کا پہلے گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہونا اہل جزیرہ کی خوش قسمتی پر دال تھا۔ ارشد الزماں صاحب اور میں دونوں اس سفر سے خوش خوش لوٹے۔ فالحمدللہ۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ امر نمایاں ہوتا گیا کہ اسمبلی کے سترھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ہی ڈالی جائے گی۔ ڈاکٹر ہمدانی صاحب نے ایک روز مجھ سے ذکر کیا کہ سفیر یوسٹ نے جو اقوام متحدہ کے امریکی وفد میں تیسرے نمبر پر تھے ان سے دریافت کیا کہ کیا پاکستان مسئلہ کشمیر کو اسمبلی کے اجلاس میں زیر بحث لانا چاہتا ہے؟ اور کہا ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے تو ہم فیصلہ کر سکیں کہ صدارت کیلئے کس امیدوار کی تائید کریں۔ ہمدانی صاحب نے پوچھا میں انہیں کیا جواب دوں؟ میں نے کہا آپ انہیں کچھ جواب نہ دیں میں خود جواب دوں گا۔ کچھ دنوں بعد ہمارے مشن میں ایک استقبالی تقریب تھی۔ سفیر یوسٹ بھی تشریف لائے۔ میں نے ان سے دریافت کیا آپ نے ڈاکٹر ہمدانی سے کشمیر کے مسئلے کے متعلق یہ سوال کیا تھا؟ کہنے لگے ہاں کیا تھا کیونکہ اس سوال کا جواب معلوم ہونے پر ہم صدارت کے ووٹ کے متعلق فیصلہ کر سکیں گے۔ میں نے کہا اس وقت تک مجھے اس مسئلے کے متعلق میری حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملی لیکن جونہی حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت موصول ہوگی اس کے متعلق فوری اقدام کرنا میرا فرض ہے آپ صدارت کے ووٹ کے متعلق فیصلہ کرنے وقت یہ فرض کرلیں کہ کشمیر کا مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث لایا جائے گا۔ اگر آپ کا مفروضہ صحیح ہوا تو آپ کو پریشانی نہ ہوگی اور اگر یہ مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث نہ لایا گیا تو بھی آپ کے لئے کسی دقت کا سامنا نہ ہوگا۔ سفیر یوسٹ میرا جواب سنکر کھسیانی سی ہنسی ہنس دیئے۔ مجھے ڈاکٹر ہمدانی صاحب سے ان کا سوال سنکر کچھ حیرت ہوئی تھی کہ یہ لوگ اتنے بھولے ہیں اور دوسروں کو اپنے سے بھی زیادہ بھولا سمجھتے ہیں!

۱۹۶۲ء کے اجلاس اسمبلی میں صدر اسمبلی کا انتخاب اقوام متحدہ کے قواعد کے ماتحت اسمبلی کا سالانہ اجلاس عموماً ستمبر کے تیسرے منگل کے دن ۳ بجے بعد دوپہر شروع ہوتا ہے۔ اسمبلی چاہے تو تاریخ اور وقت میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اجلاس قواعد کے مطابق مقررہ دن کو شروع ہوا۔ انتخاب صدر کے لئے رائے شماری ہوئی تو میری تائید میں ۷۲ آراء تھیں اور پروفیسر ملالاسیکرا کی تائید میں ۲۷ لیکن میرے حق میں چار پرچیوں پر بجائے میرے نام کے پاکستان درج تھا اسلئے وہ چار آراء شمار نہ کی گئیں۔ اور میرے حق میں آراء کی تعداد ۷۲، قرار پائی۔ اسمبلی میں جو انتخابات ہوتے ہیں ان میں سے بعض کیلئے پرچی پر امیدوار کا نام درج کرنا ہوتا ہے اور بعض کیلئے رکن ملک کا نام مثلاً صدر اسمبلی کے انتخابات میں امیدوار کا نام درج ہونا چاہیئے اور نائب صدروں کے انتخاب میں رکن ملک کا۔ اگر پرچی ڈالنے سے پہلے صدر اچھی طرح وضاحت نہ کردے کہ پرچی پر کیا اور کسطرح اندراج کرنا ہے تو نئے اراکین ممالک کے نمائندے بعض دفعہ لاعلمی کی وجہ سے غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اور وہ ووٹ شمار سے خارج ہو جاتا

ہے۔ میں نے اپنی صدارت کے دوران میں یہ التزام رکھا کہ ہر انتخاب سے پہلے ان امور کی خوب وضاحت کردی جاتی جس کے نتیجے میں سترھویں سالانہ اجلاس کے دوران میں جسقدر انتخابات ہوئے ان میں ایک ووٹ بھی کسی ایسی خامی کی وجہ سے شمار سے خارج نہ ہوا۔ انتخاب کے نتیجے کا اعلان ہونے ہی منتخب شدہ امیدوار اپنی نشست چھوڑ کر کرسیٔ صدارت پر منتقل ہو جاتا ہے اور مختصر الفاظ میں اراکین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد نائب صدروں اور اسمبلی کی کمیٹیوں کے صدروں کے انتخاب کی کارروائی عمل میں لاتا ہے ان انتخابات کی تکمیل ہونے پر اسمبلی کی جنرل کمیٹی ترتیب دیجاتی ہے۔ اس کمیٹی کے اراکین صدر اسمبلی۔ ۱۹ نائب صدر صاحبان اور ۷ کمیٹیوں کے صدر ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹی اجلاس کے ایجنڈے کو ترتیب دیتی ہے اور ایجنڈے میں شامل کردہ مسائل کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ بعض مسائل کے متعلق کمیٹی سفارش کرسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی کمیٹی میں زیر بحث آنے کے براہ راست اسمبلی کے اجلاس میں زیر بحث آئیں۔ جنرل کمیٹی کی رپورٹ اسمبلی میں پیش ہوتی اور اسمبلی ایجنڈے کی آخری منظوری دیتی ہے دورانِ اجلاس جب بھی ایجنڈے کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوتا ہے تو اس پر پہلے جنرل کمیٹی میں غور ہوتا ہے اور جنرل کمیٹی کی رپورٹ پر اسمبلی فیصلہ کرتی ہے۔ اسمبلی کے سالانہ اجلاس کے متعلق یہ روایت محکم طور پر قائم ہو چکی ہے کہ مجلس امن کے مستقل اراکین یعنی امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کا کوئی نمائندہ صدر منتخب نہیں کیا جائیگا۔ نائب صدارت کیلئے ان اراکین میں سے ہر ایک کا نمائندہ ضرور منتخب کیا جاتا ہے۔ گویا ان اراکین کو جنرل کمیٹی میں لازماً نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ میں اسمبلی سے متعلقہ امور کے انچارج نائب سیکریٹری مسٹر اینڈریو کورڈئیے (MR ANDREW CORDIER) تھے جو ابتدائے اقوام متحدہ سے اس منصب پر فائز چلے آرہے تھے۔ وہ اسمبلی کے سولہویں اجلاس کے بعد مستعفی ہو کر کولمبیا یونیورسٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے ادارے میں ڈین کے منصب پر فائز ہو گئے تھے وہ ہر اجلاس میں صدر کے بائیں ہاتھ بیٹھتے تھے اور اجلاس کے دوران میں جس بات پر صدر کے فیصلے کی ضرورت ہوتی اس پر صدر کو مشورہ دیتے تھے۔ وہ اپنے علم قابلیت اور تجربے کی وجہ سے ممتاز حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ صدر کیلئے ان کی موجودگی بہت تقویت کا موجب ہوتی تھی۔ وہ اسمبلی کی نبض شناسی میں خوب ماہر ہو چکے تھے۔ کسی مشکل کے پیدا ہونے سے پہلے ہی بھانپ لیتے تھے کہ یہ صورت پیدا ہونیوالی ہے اور صدر کو مشورہ دیتے تھے کہ کونسا طریق اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ میں پہلا صدر تھا جسے ان کا مشورہ میسر نہیں تھا۔ ایسے تجربہ کار نائب سیکریٹری جنرل کے تجربے سے محروم ہو جانا میرے لئے وجہ پریشانی تھا۔ میں نے اسمبلی کے قواعد و ضوابط کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہوا تھا اور صدر کو ہر قدم پر قواعد کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے۔ جو اراکین اسمبلی چند ایک کمیٹیوں کی صدارت کر چکے ہوں انہیں صدارت کے فرائض کے متعلق خاصہ تجربہ ہو جاتا ہے۔ کمیٹی اول کی صدارت تو گویا اسمبلی کی صدارت کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے اور مجھے اسمبلی کی کسی کمیٹی کی صدارت سرانجام دینے کا موقعہ نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں صدارت شروع کرنے سے پیشتر نماز میں نہایت عاجزی سے اپنے مولا کے حضور التجا کی۔ اے اللہ یہ منصب خالص تیری عطا ہے۔ تو اپنے اس عاجز بندے کی خامیوں سے خوب واقف ہے۔ مجھے اس منصب کے فرائض کی سرانجام دہی میں جو مشکلات پیش آئیں تو اپنے خاص فضل سے انہیں خود ہی حل فرمائیو اور ہر مرحلے پر اس عاجز کی رہنمائی فرمائیو۔

گربہ کشتن روز اول | جنرل اسمبلی کے دو اجلاسوں میں ایجنڈا کی ترتیب اور تقسیم کی کاروائی بفضل اللہ مکمل ہو گئی اور اراکین اور پریس کو اندازہ ہو گیا کہ سترھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کس نہج پر چلے گی۔ جنرل کمیٹی کے پہلے ہی اجلاس میں چینی مندوب کی تقریر کے شروع میں روسی مندوب مسٹر سمیانوف نے دفعتاً شکایت کی جناب صدر میرے کانوں میں بھنبھناہٹ سی محسوس ہو رہی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جارہا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید روسی زبان میں ترجمے کے نظام میں کوئی نقص ہو گیا ہے اور اسمبلی کے عملے کو ہدایت دی کہ نقص کو رفع کرنے کی طرف فوراً توجہ کی جائے۔ لیکن مسٹر سمیانوف کی شکایت جاری رہی۔ یہ صاحب روسی مستقل مشن متعینہ اقوام متحدہ کے اراکین میں سے نہیں تھے۔ بلکہ روسی وفد کے رکن کی حیثیت سے ماسکو سے تشریف لائے تھے۔ بظاہر بلند درجہ کی شخصیت معلوم ہوتے تھے وزراء میں سے ہوں گے یا روسی اشتراکی پارٹی پریذیڈیم کے رکن ہونگے۔ دو تین منٹ بعد اقوام متحدہ کے عملے میں سے ایک صاحب نے آکر میرے کان میں کہا ترجمے کے نظام میں تو کوئی نقص نہیں۔ غالباً روسی مندوب یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ چینی مندوب کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسلئے ان کی تقریر کو بھنبھناہٹ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اس پر میں نے کہا محترم روسی مندوب جنرل کمیٹی کی تشکیل سے خوب واقف ہیں۔ میری گذارش ہے کہ وہ کمیٹی کی کاروائی کی طرف توجہ کریں اور غیر متعلق امور پر اپنا اور کمیٹی کا وقت صرف نہ کریں۔ میں نے دیکھا کہ سفیر موروزوف نے جو اقوام متحدہ میں روسی نائب مستقل نمائندہ تھے اور سمیانوف صاحب کے عین پیچھے بطور ان کے مشیر کے بیٹھے تھے آگے کی طرف جھک کر ان کے کان میں کچھ کہا جس پر سمیانوف صاحب خاموش ہو گئے اور بھنبھناہٹ کا مزید شکوہ ترک کر دیا۔ جب کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا تو سفیر موروزوف نے پھر مسٹر سمیانوف کے کان میں کچھ کہا جس پر وہ میری طرف بڑھے اور اپنے ترجمان کے ذریعے معذرت کی اور میری طرف ہاتھ بڑھایا میں نے بڑے تپاک سے ان سے ہاتھ ملایا اور چند مناسب الفاظ انکی دلجوئی کے طور پر کہے۔ ساتھ ہی میرا دل اللہ تعالیٰ کے شکر سے لبریز ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ اجلاس میں اپنا رویہ ترک نہ کرتے تو بدمزگی ہوتی۔ اس صورت میں وہ اور ان کے رفقاء کمیٹی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر جاتے اور اخباروں میں طرح طرح کی سرخیوں سے اس معاملے کو ہوا دی جاتی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں روک دیا اور معذرت پر آمادہ کیا اور یہ خفیف سا معاملہ بخیر و خوبی نپٹ گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ غالباً سفیر موروزوف نے انہیں مشورہ دیا ہو گا کہ اس صدر کے ساتھ اس قسم کے مذاق سے کام نہیں چلے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دوسرے سال ۱۹۶۳ء کے سالانہ اجلاس میں بھی سمیانوف صاحب روسی وفد میں شامل تھے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ ایک مشرقی یورپین ملک کے مندوب کی طرف سے اقوام متحدہ ہی میں دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ میں بھی مدعو تھا سمیانوف صاحب بھی شامل تھے۔ کھانے کے اختتام پر میزبان نے ایک دو رسمی جام صحت تجویز کئے۔ ان کے نوش کئے جانیکے بعد سمیانوف صاحب کھڑے ہوئے اور کہا جناب میں بھی ایک جام صحت تجویز کرنا چاہتا ہوں جو ایک اعلیٰ پائے کی ہستی کی صحت اور خوشحالی کا جام ہے۔ میں نام تو آخر میں بتاؤں گا پہلے میں اس کی صفات کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی۔ باقی مہمانوں نے ان کے الفاظ سے کیا اندازہ کیا میں نہیں جانتا لیکن مجھے خیال ہوا کہ وہ شاید حروف شفیف

کا نام لیں گے آخر میں انہوں نے فرمایا جس ہستی کی صفات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ پچھلے سال کے سالانہ اجلاس کا پریذیڈنٹ ظفراللہ خاں ہے۔ سب مہمان ضرور حیران ہوئے ہوں گے اگرچہ انہوں نے اخلاقاً جام صحت کا خیر مقدم رسمی جوش اور تالیوں سے کیا اور بڑی خوشی سے نوش بھی کیا۔ میرا دل پھر آستانہ الٰہی پر کمال عجز اور انکسار سے جھکا کہ تیری بخشش اور عطا کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ تو نے اس عاجز پر تقصیر پُر معاصی کی کیسی کیسی ذرہ نوازی فرمائی۔ سمیانوف صاحب کی غرض تو غالباً پہلے سال کی جھنجھناہٹ کے شکوے کی مزید معذرت ہی ہو گی۔ لیکن انہوں نے جو فیاضانہ طریق اس کے اظہار کا اختیار کیا وہ انکی شرافت نفس کا مظہر تھا۔ فجزاہ اللہ۔

ایجنڈے کے ترتیب پا جانے کے بعد اسمبلی کے باقاعدہ اجلاس شروع ہو گئے۔ میں نے پہلے ہی دن مندوبین کی خدمت میں گذارش کی کہ اگر اسمبلی اور کمیٹیوں کے اجلاس اعلان شدہ اوقات پر جن کی منظوری آپ جنرل کمیٹی کی رپورٹ کو قبول کر کے دے چکے ہیں شروع ہوا کریں تو اسمبلی کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل میں بہت سہولت ہو جائے گی اور کئی لحاظ سے آپ کیلئے بھی یہ طریق سہولت کا باعث ہو گا۔ اقوام متحدہ کے ابتدائی چند اجلاسوں میں یہ طریق رہا کہ جناب صدر دس منٹ تک مندوبین کا انتظار کرتے اور اس مختصر وقفے کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع کر دیتے تب تک تمام اراکین کے نمائندے ایوان اجلاس میں جمع ہو چکتے رفتہ رفتہ یہ رسم پڑ گئی کہ مندوبین اسمبلی کی عمارت میں تو پہنچ جاتے لیکن ایوان اجلاس میں آنے کی بجائے ایوانِ مندوبین میں بیٹھے تمباکو نوشی وغیرہ کے شغل میں مصروف رہتے یا آپس میں ادھر ادھر کی باتوں میں وقت صرف کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتظار کا وقفہ دس منٹ سے بڑھتے بڑھتے سولہویں سالانہ اجلاس تک قریباً چالیس منٹ تک پہنچ چکا تھا صبح کے اجلاس کا اعلان شدہ وقت تو ساڑھے دس بجے کا تھا لیکن اجلاس کی کارروائی گیارہ بجے کے بعد شروع ہوا کرتی اسی طرح سہ پہر کے اجلاس کا اعلان شدہ وقت ۳ بجے تھا۔ لیکن کارروائی ساڑھے تین بجے کے بعد شروع ہوتی۔ میں نے عین اعلان شدہ وقت پر کارروائی شروع کر دینے کا طریق اختیار کیا۔ جب مندوبین نے دیکھا کہ صدر پابندی وقت پر مصر ہے تو رفتہ رفتہ انہوں نے بھی وقت پر اجلاس میں آنا شروع کر دیا۔ اس سالانہ اجلاس کے دوران جب پہلے دن بارش ہوئی تو صبح کے اجلاس کے شروع میں حاضری معمول سے کم تھی۔ اس کے باوجود میں نے اجلاس کی کارروائی شروع کر دی سہ پہر کے اجلاس کے اختتام پر میں نے مندوبین سے گذارش کی کہ آج صبح کے اجلاس کے شروع میں بارش کی وجہ سے حاضری توقع سے کم تھی۔ اب موسم خزاں کی طرف بڑھ رہا ہے بارش برف اور تیز ہواؤں کا سامنا ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اجلاس کی کارروائی دیر سے شروع ہو۔ ایسے موسم میں وقت پر پہنچنے کیلئے آپ اپنے دولتکدوں یا اپنے دفاتر سے ذرا جلدی روانہ ہو جایا کریں آپ نے ازراہ کرم ایک ستر سالہ بوڑھے کو اسمبلی کا خادم اول منتخب کیا ہے۔ جیسے آپ اس سے بجا توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض کو مستعدی سے سرانجام دے ویسے ہی وہ آپ جیسے چست نوجوانوں سے بجا توقع رکھتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ میں صبح ساڑھے سات بجے اپنے پاکستانی دفتر میں پہنچ جاتا ہوں اور وہاں سے سوا دس بجے یہاں صدر کے

کمرے میں پہنچ جاتا ہوں جو امر میرے لئے آسان ہے وہ آپ سب کیلئے آسان تر ہونا چاہئے۔ میں نے یہ گذارش ہنستے ہنستے کی اور مندوبین نے ہنستے ہنستے سنی لیکن اس کے دہرانے کی ضرورت پھر کبھی پیش نہ آئی۔

اسمبلی کے صدر کے استعمال کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ تو اسمبلی کے ایوان کے صدارتی پلیٹ فارم کے عقب میں ہے جسے عارضی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ صدر اسمبلی کا اصل دفتر ایک وسیع کمرے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت کی ۳۸ ویں منزل پر ہے۔ وہ صدر اسمبلی کے دفتری کام کے علاوہ ملاقاتوں اور افسران عملہ سے مشورہ کرنے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ میرا انتخاب ہونے پر یہ کمرہ مجھے دکھایا گیا کہ اجلاس میں آنے سے پہلے آپ اپنا دفتری کام یہاں کیا کریں گے۔ میں نے کہا میں تو ایک سادہ طبع انسان ہوں ان تکلفات کا عادی نہیں نہ انکی ضرورت کا قائل ہوں۔ مزید براں اراکین ممالک کے مندوبین سے الگ تھلگ ہو کر اس بلند برج میں بیٹھ جانے سے تو مجھے ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کے مواقع میسر نہ آئیں گے اور میں ان کے تاثرات سے آگاہ نہ ہو سکونگا میں تو جیسے پہلے اسمبلی کی عمارت میں آتا ہوں ویسے ہی آیا کروں گا اور اپنے دفتری کام کیلئے ایوان اجلاس کے عقب والا چھوٹا کمرہ استعمال کروں گا کہ وہ میری ضروریات کیلئے کافی ہے۔ اور میرے ملنے والوں کو بھی اس میں سہولت رہے گی۔ میرے ساتھ پانچ منٹ کی گفتگو کیلئے انہیں دس منٹ سیکرٹریٹ کی اڑتیسویں منزل تک اور گفتگو کے بعد مزید دس منٹ وہاں سے اتر کر اسمبلی میں پہنچنے کیلئے صرف کرنے کی حاجت نہ ہوگی۔ ایوان اجلاس کے عقب والے کمرے میں وہ بلا تکلف بلا اطلاع میرے وہاں موجود ہونے کے اوقات میں جس وقت چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ عملے کے افسران سے بھی وہیں مشورہ ہو جایا کریگا۔ وہ بھی خواہ مخواہ کی زحمت سے بچ جایا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ میرے زمانہ صدارت میں اڑتیسویں منزل والا شاندار سوئٹ غیر مستعمل رہا۔

صدر اسمبلی اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی طرف سے ہر سیشن میں مندوبین کو وسیع پیمانے پر استقبالیہ دعوت دیئے جانے کا دستور ہے جس کا خرچ دونوں میزبان نصف نصف برداشت کرتے ہیں۔ صدر ہر منگل کے دن اقوام متحدہ کے مطعم میں کمیٹیوں کے صدروں اور انکے ساتھ کام کرنیوالے عملے کے افسران کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شریک ہوتا ہے۔ اور اس ہفتہ وار مجلس میں کمیٹیوں کے کام کے متعلق مناسب مشورہ کیا جاتا ہے۔ میں نے کمیٹیوں کے صدروں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اپنے ایجنڈوں کی ہفتہ وار تقسیم کے نقشے تیار کر لیں اور جب دیکھیں کہ کسی ہفتے میں کام کی رفتار سست پڑ رہی ہے تو کمیٹی کو توجہ دلادیں اور کہدیں کہ ہفتے کا کام ختم کرنے کی خاطر کمیٹی کے اجلاس شام کو بھی مقرر کرنا ہوں گے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے بہت فائدہ ہوا اور بہت کم شام کے اجلاس کرنا پڑے۔ اسمبلی کا آخری اجلاس تو شام کو رکھنا لازم ہوتا ہے اور نصف شب تک چلتا ہے۔ لیکن سترھویں اجلاس کی بفضل اللہ یہ خصوصیت رہی کہ نہ تو ہفتے کی صبح کو کوئی اجلاس کرنا پڑا اور نہ کسی دن شام کا کوئی اجلاس سوائے آخری دن کے۔ اس سے بھی مندوبین کو بہت سہولت رہی کہ انہیں ایجنڈے کے مسائل پر غور اور مشورہ کرنے اور متفرق امور کی طرف توجہ کرنے کے مواقع متواتر میسر آتے رہے۔

اقوام متحدہ کی اسمبلی کے پریس نمائندگان کی سالانہ دعوت | اسمبلی کا دستور ہے کہ ہر دوسری جمعرات کے دن صدر اسمبلی اقوام متحدہ میں کام کرنیوالے پریس کے نمائندگان میں سے پندرہ بیس نمائندگان کی دوپہر کے کھانے پر دعوت کرتا ہے۔ اس

طرح پریس کیساتھ تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔ پریس کے نمائندگان ہر سیشن کے دوران میں ایک بار صدر کے اعزاز میں شام کے کھانے پر ایک جشن منعقد کرتے ہیں جس میں کھانے کے بعد موسیقی اور ناچ اور تماشا ہوتا ہے۔ یہ تقریب نیم شب بعد دو بجے تک جاری رہتی ہے۔ ایک روز میری سیکریٹری نے کہا کہ اقوام متحدہ کے صحافیین کی انجمن کے صدر نے دریافت کیا ہے کہ فلاں شام تمہیں اس جشن کیلئے موزوں رہے گی میں نے کہا ان سے کہدیں مجھے اس تقریب کیلئے کوئی شام بھی موزوں نظر نہیں آتی۔ وہ کچھ حیران تو ہوئیں لیکن میرا پیغام پہنچا دیا۔ دوسرے دن صحافیین کی انجمن کے صدر ملاقات کیلئے تشریف لائے اور فرمایا مسٹر پریذیڈنٹ کیا یہ ٹھیک ہے کہ آپ ہمارے جشن کے لئے کوئی شام فارغ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا درست ہے۔ وہ بولے کہ یہ تقریب تو ہر سال ہوتی ہے اور ہر صدر صاحب تشریف لاتے رہے ہیں کیونکہ یہ تو ہوتی ہی صدر کے اعزاز میں ہے۔ میں نے کہا ہر صدر اپنی اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ میں اپنے پیش رو صدر صاحبان کے طریق کی پابندی لازم نہیں سمجھتا۔ انہوں نے پوچھا آخر آپ کے ہماری دعوت قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ؟ میں نے کہا وجہ یہ ہے کہ اس تقریب کا ہر پہلو مغربی تہذیب اور معاشرت کی تصویر ہے جسکی طرف میری طبیعت کو کچھ بھی رغبت نہیں بلکہ ایسی تقریبوں میں ہونے والے بعض اشغال سے میری طبیعت منغض ہوتی ہے۔ اور گو میں خود ان میں شرکت نہ کروں پھر بھی وہ میری طبیعت پر گراں ہونگے لہذا کیا ضرورت ہے کہ میں ایک رات کا آرام ایسی تقریب کی خاطر قربان کروں اور اپنی عادات اور عبادات کے اوقات میں اس کے نتیجے میں خلل اور بے قاعدگی پیدا کروں؟ انہوں نے کہا لیکن آپ شام کے کھانے کی دعوتوں میں تو جاتے ہیں۔ میں نے کہا جاتا ہوں لیکن دس بجنے سے چند منٹ قبل اجازت لیکر چلا آتا ہوں۔ انہوں نے کہا تو اچھا پھر ہم بھی ایسا ہی انتظام کر لیں گے۔ کھانا ختم ہوتے ہی میں آپ کا جام صحت تجویز کروں گا اور آپ اس کا جواب دیکر بیٹک چلے آئیں۔ میں نے کہا اس صورت میں میں بڑی خوشی سے شامل ہوں گا۔

ایک روز اسمبلی پہنچنے پر میں نے ایجنڈے پر سرسری نگاہ ڈالی تو احساس ہوا کہ جو ایجنڈا میں نے طے کیا تھا اس میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔ میں نے مسٹر ملانیا سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک وفد کی طرف سے کسی دقت کی بنا پر ایک تبدیلی کی خواہش کی گئی تھی اسلئے ایجنڈے میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی۔ میں نے کہا آپ نے مجھ سے کیوں نہ ذکر کیا؟ انہوں نے فرمایا اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے اور مجھے علم ہے کہ آپ جلد سو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ اگر آپ تک انکی خواہش پہنچائی جائے تو آپ ضرور اسے منظور کر لیں گے۔ میں نے کہا یہ تو درست ہے اور جو تبدیلی ہوئی اس پر مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن اصولاً یہ طریق صحیح نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ میں جلد سو جاتا ہوں اور آپ صاحبان کو دیر تک کام کرنا پڑتا ہے جسکی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ لیکن رات کو ٹیلیفون میرے بستر کے پاس ہی ہوتا ہے۔ جب ضرورت ہو آپ بلا تکلف رات کی کسی ساعت میں میرے ساتھ بات کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کبھی میرے آرام میں مخل نہیں ہوں گے نہ میری آواز میں نیند کا اثر محسوس کریں گے اور بات ختم ہونیکے نصف منٹ کے اندر میں پھر گہری نیند سو رہا ہوں گا۔

روس اور دیگر مشرقی یورپین ممالک کا تعاون

روس اور دیگر مشرقی یورپین ممالک نے صدارت کے انتخاب میں پروفیسر ملا لاسیکرا کی تائید کی تھی بلکہ ان کی تائید کے بھروسے پر ہی پروفیسر صاحب نے امیدوار بننے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ان سب ممالک کی طرف سے بھی میرے ساتھ ابتدائے اجلاس سے ہی پورا تعاون ہوتا رہا۔ اجلاس کے دوران میں روسی مشن متعینہ اقوام متحدہ کے سربراہ سفیر زورین تھے۔ وہ بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ جب کبھی کہیں اسمبلی کی عمارت کے اندر گذرتے ہوئے مجھ سے علیک سلیک کا اتفاق ہوتا تو بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے اور میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر فرماتے "ہمارے محترم صدر، ہمارے غیر جانبدار صدر"

روس کے وزیر خارجہ کی طرف سے روس آنیکی دعوت

وزیر خارجہ گرومیکو سے مدت سے نیاز حاصل تھا۔ جب سترھویں اجلاس کے دوران میں وہ نیویارک آئے تو سفیر زورین کے ہمراہ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ متفرق گفتگو ہوتی رہی گفتگو کے دوران میں انہوں نے پوچھا۔ کبھی ہمارے ملک جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ میں نے کہا حال میں تو نہیں لیکن انقلاب سے چار سال پہلے جب میں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو سینٹ پیٹرز برگ جانیکا اتفاق ہوا تھا اتفاق سے وہ سال رومانوف خاندان کے سہ صد سالہ جشن کا سال بھی تھا۔ فرمایا اس پر تو قریب نصف صدی گذر چکی ہے۔ چاہیئے کہ اب آکر ہمارا ملک دیکھیں میں آپکو دعوت دیتا ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ موقعہ ہوا تو حاضر ہوں گا۔ کچھ دن بعد سفیر زورین پھر تشریف لائے اور فرمایا وزیر خارجہ ماسکو واپس چلے گئے ہیں اور جاتے ہوئے مجھے تاکید کر گئے ہیں کہ میں آپ کو انکی دعوت کی یاد دہانی کرادوں۔ میں نے کہا اجلاس کے ختم ہونے پر تو سردی کی شدت ہوگی اسلئے وہ وقت تو میرے روس کے سفر کیلئے مناسب نہیں ہوگا۔ کہا موسم بہار میں یا گرمیوں میں جب بھی آپ پسند کریں تشریف لے جائیں۔

شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک کی طرفسے وہاں آنے کی دعوت

سترھویں سالانہ اجلاس کے دوران میں اقوام متحدہ کی رکنیت میں چھ اراکین کا اضافہ ہوا ان میں سے الجزائر کا آزاد ہوکر اقوام متحدہ میں شامل ہونا ہم سب کیلئے خاص طور پر خوشی کا موجب ہوا۔ الجزائر کے صدر احمد بن بیلا نے اس موقعہ پر جو استقبالیہ تقریب منعقد کی اسے میرے نام سے منسوب کیا۔ چودھری محمد علی بوگرا مرحوم پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے نیویارک میں موجود تھے اور اس دعوت میں شامل تھے۔ ان سے صدر بن بیلا نے دوستانہ شکوہ کیا کہ شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک لیبیا، تونس، الجزائر، مراکش کی آزادی کی جدوجہد میں ظفراللہ خاں نے نمایاں حصہ لیا ہے وہ ہم سب کو بہت عزیز ہیں اور ہم سب کی بڑی خواہش ہے کہ وہ ہمارے ہاں آئیں لیکن وہ ابھی تک رضامند نہیں ہوئے۔ وزیر خارجہ نے وہیں مجھے طلب فرمایا اور صدر بن بیلا کا شکوہ بیان کرکے دریافت کیا کہ تم کیوں نہیں جاتے ہو۔ میں نے کہا میں حکومت پاکستان کا ملازم ہوں حکومت کے ارشاد کے بغیر یہاں سے ہل نہیں سکتا۔ فرمایا اچھی بات اس کا انتظام ہو جائے گا۔

الجزائر کے پہلے وزیر خارجہ محمد خمیستی صاحب

الجزائر کے پہلے وزیر خارجہ محمد خمیستی نہایت نیک خصلت محب وطن نوجوان تھے جو اپنے ملک اور قوم کی خدمت میں ایک مدت تک قید و بند کے مصائب جھیل چکے تھے۔ فرانس میں جو الجزائری نوجوان مختلف تعلیمی

ادارہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے انکی تنظیم میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا اور طالبعلمی کے زمانکی سرگرمیوں کی پاداش میں ایک عرصہ فرانسیسی قید خانوں کی تاریک کوٹھریوں میں گذار چکے تھے۔ میرے ساتھ تعارف ہوتے ہی انہوں نے حد درجہ اخلاص کا اظہار کیا۔ اور بہت جلد ہمارے درمیان گہرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ صدر بن بیلا کے الجزائر واپس تشریف لیجانے پر انہوں نے الجزائری وفد کی قیادت کیلئے کچھ عرصہ نیویارک قیام کیا۔ انگریزی بہت کم جانتے تھے۔ اپنے فرائض کی کما حقہا بجا آوری کی خاطر اس کوشش میں تھے کہ انگریزی میں بول چال کی مہارت پیدا کرلیں۔ چونکہ وہ انگریزی کم جانتے تھے اور میں فرانسیسی کم جانتا تھا اسلئے انہوں نے اپنے ایک رفیق کو ترجمانی کیلئے بلا لیا تھا۔ لیکن ترجمانی کا کم ہی موقعہ ہوا۔ شائد زبان نہ جاننا بجائے روک کے ممد ہوگیا بعض اوقات اظہار جذبات میں الفاظ روک بن جاتے ہیں۔ الفاظ کا میسر نہ آنا بجائے روک کے دوئی اور حجاب کو رفع کرنے کا موجب بن گیا کھانے کی میز پر مجھے اپنے دائیں ہاتھ بٹھایا۔ نشست ایک قسم کے صوفے پر ساتھ ساتھ تھی۔ بیٹھتے ہی میرا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور میرے رخصت ہونے تک ایک لحظہ کیلئے بھی ہاتھ کی گرفت کو ڈھیلا نہ ہونے دیا۔ دیکھنے میں دبلے پتلے تھے لیکن پنجہ فولادی محسوس ہوتا تھا۔ کھانا شروع ہوا تو میں نے ان کا دائیاں ہاتھ آزاد کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ کو جنبش دی کہ انہوں نے میرے ہاتھ کو اور زور سے جکڑ لیا سارا وقت ہنستے ہوئے چہرے سے بات چیت جاری رکھی گو گفتگو کے بعض حصے قید خانے کی مصائب کی تشریح پر بھی حاوی تھے۔ اس درجہ اخلاص و محبت کی وضاحت کے طور پر فرمایا تم آج سے چند دن پہلے میری ہستی سے بھی آگاہ نہیں تھے اور میں مدرسے میں طالب علمی کے زمانے سے تمہارا مداح اور مشتاق ہوں۔ جب میں جرائد میں تمہاری تقریروں کا اقتباس پڑھا کرتا تھا تو میرے وہم میں بھی یہ امکان نہیں آتا تھا کہ ایسے بطل جلیل کے ساتھ کبھی میری ملاقات ہوگی۔ اب موقعہ میسر آیا ہے تو میرے لئے نہایت مسرت کا موجب ہوا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں بھی میرے ساتھ اخلاص ہے۔

میں تو دائیں ہاتھ سے کھانے میں مصروف تھا گو انکی بات پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ زیادہ تر گفتگو کی طرف متوجہ تھے اور بائیں ہاتھ سے کبھی کچھ کھا بھی لیتے تھے شائد ان کے ہلکے پھلکے جسم کو غذا کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں تھی! میں نے ان کے اخلاص کے سمندر کے جوش کو کم کرنے کیلئے کہا محمد تمہیں تو بن دیکھے اس تصور کے ساتھ اخلاص ہے جو میری تقریروں کے نتیجے میں تم نے اپنے ذہن میں خود بنا لیا تھا۔ ابھی ہماری پہلی ملاقات پر چند دن ہی گذرے ہیں تم اسی تصور پر قائم ہو جو تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے جب میری خامیوں اور کمزوریوں پر تمہیں آگاہی ہوگی تو تصور کی جگہ حقیقت لے لیگی۔ پھر تمہارے اخلاص میں یہ جوش نہیں رہے گا۔ بخلاف اس کے مجھے جو بھی وابستگی تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری ان خوبیوں کی وجہ سے ہے جس کا میں نے مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے اسلئے میرے اخلاص میں ثبات ہے! وہ بہت ہنسے اور کہا میں جانتا ہوں تم بڑے قابل وکیل ہو تمہاری یہ دلیل محض وکیلانہ ہے۔ اچھا تو ہمارے ہاں آؤگے نا؟ میں نے کہا اب تو آپ کے صدر صاحب کا بھی فرمان ہے اور ہمارے وزیر خارجہ صاحب کا ارشاد بھی ہے۔ امید ہے انشاء اللہ جلد کوئی موقعہ میسر آجائیگا انہوں نے بڑے تپاک سے رخصت کیا۔ اور نیویارک سے روانہ ہونے سے پہلے پھر جلد آنے کی تاکید کی۔

پریذیڈنٹ کینیڈی سے ملاقات

مسٹر انیڈرلوکوری لاہور میں امریکی قونصل جنرل متعین رہے تھے اور میرے ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ ۱۹۶۲ء میں واشنگٹن میں سینئر ڈپلومیٹس کے سیمینار کے ڈائرکٹر تھے۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ نومبر کے مہینے میں میں ان کے سیمینار میں تقریر کروں۔ میں نے انکے ارشاد کی تعمیل کی حامی بھرلی۔ امریکی وفد متعینہ اقوام متحدہ کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ صدر اسمبلی اپنی صدارت کے دوران میں اگر واشنگٹن جائے تو صدر ریاستہائے متحدہ سے ضرور ملاقات کرتا ہے چنانچہ واشنگٹن جانے پر میں صدر کینیڈی کی ملاقات کیلئے وائٹ ہاؤس گیا۔ صدر کینیڈی بڑے بااخلاق تھے بڑے تپاک اور بے تکلفی سے پیش آئے۔ ملاقات کسی خاص موضوع پر گفتگو کے لئے نہیں تھی مختلف امور پر گفتگو رہی۔ ان دنوں ہندوستان اور چین کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں فرمایا ہم ایک لحاظ سے تو چین کے ممنون ہیں کہ انہوں نے مسٹر کرشنا مینن سے ہماری خلاصی کروائی۔ میں نے کہا مسٹر پریذیڈنٹ! مسٹر کرشنا مینن کے ساتھ بھی انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ کچھ حیران ہو کر کہا تم یہ کیوں کہتے ہو؟ میں نے کہا اس لیئے کہ مسٹر کرشنا مینن کی خو بُری نہیں۔ وہ جو کچھ ترش کلامی کرتے ہیں سوچ سمجھ کر اور عمداً کرتے ہیں۔ پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہے۔ میں نے کہا مجھے ان کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے اور میں ذاتی تجربے سے کہتا ہوں مثلاً جب وہ میزبان ہوتے ہیں تو اپنے مہمانوں سے نہایت تواضع سے پیش آتے ہیں۔ خود تو کچھ کھاتے نہیں سارا وقت میزوں کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مہمانوں کی ضروریات کی طرف توجہ کرتے ہیں ان کے ساتھ شفقت سے کلام کرتے ہیں اور خیریت وغیرہ دریافت کرتے ہیں۔ پریذیڈنٹ کینیڈی نے پوچھا تو پھر یہ دوسرا بھیس کیوں بدل لیتے ہیں؟ میں نے کہا وہ امریکنوں کی بعض کمزوریوں کو بھانپ گئے ہیں اور اپنے ملک کی خدمت کرنے کیلئے امریکنوں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے ذرا چونک کر اور مسکراتے ہوئے پوچھا وہ کونسی کمزوریاں ہیں؟ میں نے کہا ایک تو یہ کہ آپ لوگ مخالفانہ تنقید سے خوش ہوتے ہیں۔ فرمایا یہ تو ٹھیک نہیں کیونکہ ہم تو محبت کے بھوکے ہیں۔ میں نے کہا یہ امریکنوں کی دوسری کمزوری ہے۔ مسٹر کرشنا مینن جانتے ہیں کہ آپ محبت کے خریدار ہیں اور وہ ہر مرحلے پر اپنی محبت کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ اس پر وہ بہت ہنسے اور فرمایا آج سہ پہر تم ہمارے سینئر ڈپلومیٹس کو خطاب کر رہے ہو؟ انہیں بھی یہ ضرور بتا دینا۔

صدر کینیڈی سے ملاقات میں قضیۂ کشمیر کا ذکر

پھر بڑی سنجیدگی کے لہجے میں فرمایا ظفراللہ میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے پندرہ سال میں ایسا عمدہ موقعہ کشمیر کے قضیئے کے فیصلے کا میسر نہیں آیا جیسا اس وقت میسر ہے تمہیں معلوم ہے کہ گورنر ہیری مین اور برطانیہ کے مسٹر ڈنکن سینڈیز ہندوستان مشورے کیلئے جا رہے ہیں۔ میں نے گورنر ہیری مین کو تاکید کی ہے کہ وہ ہر ممکن کوشش کریں کہ اس قضیئے کا مناسب تصفیہ ہو سکے۔ میں نے کہا مسٹر پریذیڈنٹ یہ قضیہ تصفیے کی طرف اس وقت حرکت کریگا جب وزیراعظم نہرو تصفیئے پر آمادہ ہوں گے۔ انہوں نے فرمایا گورنر ہیری مین کی یہی کوشش ہوگی کہ طرفین کو تصفیئے پر آمادہ کریں۔

گورنر ہیری مین

دس بارہ سال کے عرصہ میں گورنر ہیری مین سے متعدد بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے کبھی انہیں پاکستان کے متعلق ہمدردی کے جذبات کا حامل نہ پایا۔ دوسرے وہ طبعاً نہایت خشک مزاج تھے اور کسی بات کے متعلق بھی وہ کوئی گرمجوشی

محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے سپرد عام طور پر وہی کام کیا جاتا تھا جس میں کمال احتیاط اور سست روی کی ضرورت ہو اور جذبات کا دخل مقصود نہ ہو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب صدر کینیڈی مجھے رخصت کرنیکے لئے میرے ہمراہ ساتھ کے کمرے میں تشریف لائے تو گورنر ہیری مین ان سے رخصت ہونیکے لئے اس کمرے میں تشریف فرما تھے۔ انہیں مخاطب کرتے ہوئے صدر کینیڈی نے فرمایا گورنر میں ابھی ابھی ظفر اللہ سے کہہ رہا تھا کہ قضیۂ کشمیر کے تصفیے کا یہ نہایت عمدہ موقعہ ہے اور آپ اس کے متعلق پوری کوشش کریں گے۔ گورنر ہیری مین نے بالکل بے اعتنائی سے کہا میں وزیر اعظم نہرو اور صدر ایوب دونوں سے بات کروں گا۔ میں نے کہا گورنر محض بات کرنے سے معاملہ آگے نہیں چلے گا۔ صدر ایوب وزیر اعظم نہرو کی اس قضیئے کے حل سے بے اعتنائی پر آزردہ ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ وزیر اعظم نہرو اس قضیئے کا عملی حل تلاش کئے جانے کی طرف توجہ دیں۔ گورنر ہیری مین نے ایک مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان کے ہاتھوں قضیۂ کشمیر حرکت میں نہیں آئیگا۔ میں صدر کینیڈی کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا۔

مسٹر جان راکفیلر کی خوش فہمی | کچھ دن بعد ایک اتوار کے دن مسٹر اور مسز جان راکفیلر نے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی انہیں بھی تصفیہ کشمیر کی فکر تھی۔ لیکن وہ میاں بیوی بھولے امریکنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا طریق حل بہت سادہ تھا۔ فرمایا ہندوستان اس وقت مشکل میں ہے اور چین کے ہاتھوں آزردہ ہے۔ اگر ہندوستان کی اس مشکل کے وقت صدر ایوب کوئی ایسا اقدام کریں جس سے ہندوستانیوں کو اور خصوصاً وزیر اعظم نہرو کو پاکستان کی ہمدردی اور دوستی کا یقین ہو جائے تو امید کی جاتی ہے کہ ان کے رویئے میں ضرور خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور کشمیر اور دیگر قضیوں کا فیصلہ آسان ہو جائے گا۔ ان کی خوش فہمی پر مجھے حافظ شیرازی کا یہ مصرع یاد آتا رہا۔ "معذور دارمت کہ تو اورا نہ دیدہ ای"۔

مسز راکفیلر کی بیان کردہ مسٹر کرشنا مینن کی بد شگفتیاں | ہندوستان کے تذکرے میں مسٹر کرشنا مینن کا ذکر بھی لازم تھا۔ مسز راکفیلر نے کہا ہم نے ایک دن مسٹر کرشنا مینن کو بھی یہیں کھانے پر بلایا تھا۔ جب وہ آئے تو ہم نے دروازے پر ان کا استقبال کیا اور میں نے معذرت کی کہ انہیں اتنی دور شہر سے باہر آنا پڑا۔ انہوں نے فرمایا بیشک بہت دور آنا پڑا۔ مسز راکفیلر نے ایک واقعہ اور سنایا۔ کہا پچھلے سال ہم نے انہیں نیویارک میں اپنے ہاں THANKS GIVING DAY کے ڈنر پر بلایا۔ ان کی تشریف آوری پر میں نے خوشی کا اظہار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ اس شکر گذاری کی تقریب میں شامل ہو سکے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا WHAT HAVE YOU TO BE THANKFUL FOR ?۔

سترھویں اجلاس کا خصوصی امتیاز | سترھویں اجلاس کو شروع ہوئے جب تین چار ہفتے گذر گئے تو مجھے خیال آیا کہ ابھی تک کسی مندوب نے ضابطے کا کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ یہ امر اس لحاظ سے اطمینان کا موجب تھا کیونکہ ایک تو ضابطے کے سوالوں پر بحث میں بہت وقت صرف ہو جاتا اور پروگرام میں ہرج واقع ہوتا۔ دوسرے زیادہ ضابطے کے سوالوں کا اٹھایا جانا صدر اسمبلی کی کارکردگی پر اعتراض سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلے سالوں میں ہر اجلاس میں صبح شام تین چار بلکہ اس سے بھی زیادہ دفعہ ایسے سوال اٹھائے جانے کا معمول ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مجھے امید ہونے لگی کہ ممکن ہے اس سالانہ اجلاس میں کوئی ضابطے کا سوال نہ اٹھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ

کے فضل اور اسکی ذرہ نوازی سے ایسا ہی ہوا - یہ امر سترھویں سالانہ اجلاس کا خصوصی امتیاز رہے گا۔

سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا اسمبلی سے خطاب | اس اجلاس کے دوران میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں جو ان دنوں صدر پاکستان تھے امریکہ تشریف لائے اور نیویارک کے قیام کے دوران میں اسمبلی کو بھی خطاب فرمایا۔

سترھویں اجلاس کا اختتام | سیشن کے ابتداء میں ایجنڈے کو ترتیب دینے کے ساتھ جنرل کمیٹی سیشن کے ختم ہونے کی تاریخ بھی تجویز کرتی ہے یہ تاریخ عموماً ۲۱ یا ۲۲ دسمبر یا اس کے قریب قریب ہوتی ہے۔ سات سال سے یہ معمول چلا آرہا تھا کہ مجوزہ تاریخ پر اجلاس ختم نہ ہوتا اور کرسمس کی تعطیلات کیلئے ملتوی ہوکر جنوری میں جاری رہتا۔ اب جو اختتام اجلاس کی مجوزہ تاریخ قریب آنے لگی تو قیاس آرائیاں شروع ہوئیں کہ کرسمس کی تعطیلات کے بعد جنوری میں کس تاریخ کو اجلاس دوبارہ شروع ہوگا مجھ سے سوال کیا جاتا تو میں اسے ٹال دیتا۔ آخری ہفتے سے پہلے ہفتے میں ایک دو کمیٹیوں نے اپنا ایجنڈا ختم کرکے اپنا کام مکمل کرلیا آخری ہفتے کے وسط تک ایک دو اور کمیٹیوں نے اپنا کام ختم کرلیا۔ اس پر پریس کے نمائندگان میں کچھ ہل چل شروع ہوئی کہ شاید سیشن مجوزہ تاریخ تک ختم ہو جائے۔ کام کی رفتار سے تو اندازہ ہونا چاہیئے تھا کہ مجوزہ تاریخ تک اسمبلی اپنا ایجنڈا ختم کرکے کام پورا کرے گی لیکن یہ ایک ایسی اچنبھے کی بات معلوم ہوتی تھی کہ کسی کو اس اندازے پر اعتماد نہیں تھا۔ آخر جب مجوزہ تاریخ سے ایک دن قبل اس دن کے ایجنڈے میں آخری اندراج "اعلان صدر در بارہ تکمیل اجلاس" دیکھا گیا تو پریس بھی اور مندوبین بھی حیران ہوئے کہ یہ کیسے ممکن ہوا - اس وقت بھی سب کا اندازہ یہ تھا کہ اب اجلاس ختم ہونیکو تو ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ مجوزہ تاریخ سے بھی ایک دن پہلے ختم ہو جائے۔ مجوزہ تاریخ کی نصف شب تک تو ضرور چلے گا لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے کمال فضل اور ذرہ نوازی سے وہی ہوا جسکی کسی کو توقع نہیں تھی۔

پروفیسر ملا لاسیکرا کی شرافت | جب ایجنڈا ختم ہو چکا تو الوداعی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دستور کے مطابق آٹھ دس ملکوں کی طرف سے ایک منتخب شدہ مندوب آخری تقریر کیا کرتا تھا جس کا اکثر حصہ صدر اور عملے کی کارگذاری کو سراہنے پر صرف ہوتا تھا - اب کی بار بھی یہی ہوا۔ لیکن ماحول نہایت سنجیدہ اور پر اطمینان تھا۔ عام احساس تھا کہ باہمی تعاون اور توجہ سے اور اپنے اوقات کا صحیح استعمال کرکے ہمنے اجلاس کو کامیابی سے انجام کو پہنچایا ہے۔ میرے متعلق جو کچھ کہا گیا وہ محض رسمی نہ تھا بلکہ محبت اور اخلاص کا مظہر تھا۔ اسمبلی کا معمول ہے کہ سیشن کے شروع میں بھی ہر مندوب جو اپنے ملک کی طرف سے پہلی بار تقریر کرتا ہے صدر کو اس کے انتخاب پر مبارکباد دیتا ہے اس مرحلے پر بھی پروفیسر ملا لاسیکرا نے کمال نوازش سے میرے متعلق فرمایا کہ اگر انہیں شکست ہوئی ہے تو ایک ایسی ہستی کے مقابل ہوئی ہے جسکو اقوام متحدہ میں خاص احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ آخری تقریر میں بھی انہوں نے فرمایا چونکہ میرا تقرر ایک اور مقام پر ہو چکا ہے اور میں یہاں سے جا رہا ہوں لہٰذا اس موقعہ پر اقوام متحدہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اقوام متحدہ میں اپنے عرصہ قیام کے دوران میں کیا سیکھا۔ یہ کہہ کر انہوں نے

اقوام متحدہ اور سترھویں اجلاس پر ایک مختصر تبصرہ کیا۔ جس میں باری باری ایک ایک موضوع پر اظہار خیال کیا آخر میں فرمایا سب سے بڑھ کر یہاں مجھے ایک ایسی ہستی کو دیکھنے اور جاننے کا موقعہ ملا اور اس تمہید کے ساتھ میرے متعلق ازراہ شفقت ایسے تعریفی کلمات فرمائے جو ان کی شرافت طبع اور کریم النفسی کے شاہد تو ضرور تھے لیکن میری جو تصویر انہوں نے اپنے الفاظ میں کھینچی اس میں میرے لئے اپنے خدوخال کو شناخت کرنا ممکن نہ تھا۔ ابھی مقررین کی فہرست میں تین نام باقی تھے کہ روس کے سفیر زورین نے بھی اپنا نام بھیج دیا۔ سارے اشتراکی ممالک کی طرف سے بلغاریہ کے مندوب مناسب الفاظ میں اظہار خیال کر چکے تھے لیکن سفیر زورین شائد اس پر مطمئن نہ ہوئے تھے اور انہوں نے روس اور اشتراکی ممالک کی طرف سے دوبارہ صدر کی خدمات اور بالخصوص اس کی غیر جانبداری کو سراہا۔ آخر یہ فہرست ختم ہوئی میرا ارادہ اپنے الفاظ کو مندوبین اور عملے کے تعاون کے شکریے تک محدود رکھنے کا تھا لیکن ایوان کا ماحول کچھ زائد کا متقاضی تھا۔ میں نے خوشحال اور تنگ حال ممالک کے درمیان اقتصادی تفاوت کی طرف توجہ دلا کر اس بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی شدید ضرورت پر زور دیا۔ میری آواز بہجوم جذبات کی وجہ سے نرم اور دبی ہوئی تھی شائد اس وجہ سے اور بھی توجہ سے سنی گئی۔ ایوان میں کامل خاموشی تھی۔ لیکن جب میں نے آخری الفاظ میں اپنے رفقاء کو خدا حافظ کہکر تقریر کو ختم کیا تو بالکل ایسے محسوس ہوا۔ جیسے کسی طوفانی سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ اور مندوبین کا ایک جمگھٹا صدارت کے پلیٹ فارم پر جمع ہوگیا۔ بعض افریقی اور ایشیائی مندوبین نے مجھے معانقے سے نوازا اور بہت سوں نے شکریہ اور آفرین کے الفاظ کہے۔ میں منہ سے کچھ کہنے کے قابل نہ تھا لیکن دل بار بار پکار رہا تھا سبحان لک روحی وجنانی، سبحانک لک روحی وجنانی۔

حکومت پاکستان کی طرف سے شمالی اور مشرقی افریقہ کے ممالک کے سفر کی ہدایت۔

دوسری صبح دفتر پہنچنے پر وزیر خارجہ کا تار ملا کہ فوراً مشورے کے لئے راولپنڈی آؤ میں نے تعمیل ارشاد میں رخت سفر باندھا اور اسی شام روانگی کی تیاری کر لی۔ راولپنڈی حاضر ہونے پر وزیر خارجہ نے فرمایا جن امور پر مشورے کی ضرورت ہے وہ تو وزارت سے کر لو لیکن میری غرض تمہیں یہاں بلانے سے یہ تھی کہ یہاں سے واپسی کے سفر میں تم مشرقی اور شمالی افریقہ کے ممالک سے ہوتے ہوئے جاؤ ان سب کے ساتھ بلاشبہ ہمارے تعلقات خوشگوار اور دوستانہ ہیں۔ لیکن تمہارے جانے سے اور بھی مضبوط ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان میں سے نئے آزاد ہونیوالے ممالک کے ارباب حکومت ذاتی طور پر تمہارے نہایت ممنون ہیں اور تمہارے جانے سے انہیں خوشی ہوگی۔

محمد علی صاحب بوگرا کی علالت اور وفات

میرے راولپنڈی پہنچنے سے کچھ دن قبل وزیر خارجہ صاحب کو دل کی کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ طبی مشیران نے کام سے قطعی روک دیا ہوا تھا۔ وہ خود تو لمبی ملاقاتوں کے خواہشمند تھے لیکن میں نے ان کی صحت اور طبی ہدایات کے پیش نظر خود ہی یہ احتیاط کی کہ ہر ملاقات میں پندرہ منٹ سے زیادہ ان کی خدمت میں حاضر نہ رہتا انہوں نے یقین بھی دلایا کہ اب وہ بفضل اللہ پوری صحت میں ہیں۔ لیکن چونکہ ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ چلنے پھرنے اور بات چیت

میں احتیاط رکھیں اسلئے میں نے طبی ہدایت کی خلاف ورزی مناسب نہ سمجھی۔ یہ ملاقاتیں ہماری آخری ملاقاتیں ثابت ہوئیں انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم سے میری پہلی ملاقات آٹووا میں ہوئی تھی جب وہ وہاں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ دو تین بار اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں نیویارک تشریف لائے تھے۔ آٹووا سے جب سفیر ہو کر واشنگٹن آگئے تو باہمی ملاقات کے زیادہ مواقع میسر آنے لگے۔ وہ نہایت شریف طبع اور بہت متواضع تھے۔ پہلی ملاقات سے ہی ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے اور میں انکی پیہم نوازشوں کی وجہ سے ہمیشہ ان کا ممنون رہا۔ فجزاہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور کمال فضل اور رحمت کا سلوک فرمائے آمین۔

سمالیہ | واپسی کے سفر میں میں کراچی سے عدن کے رستے پہلے مگدیشو گیا جو سمالیہ کا دارالحکومت ہے ان دنوں وہاں اظفر صاحب سابق چیف سیکرٹری مشرقی پاکستان اقوام متحدہ کے نمائندہ اور ایم ایل قریشی صاحب حکومت کے اقتصادی مشیر تھے ان دونوں افسروں کی خدمات حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ کی درخواست پر عارضی طور پر دی ہوئی تھیں اور وہ حکومت سومالیہ کے مشیر تھے۔ دونوں اپنے اخلاص، محنت اور سمالیہ کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کی وجہ سے سمالیہ کی حکومت اور عوام میں نہایت قدر و منزلت رکھتے تھے جس سے مجھے بہت خوشی اور اطمینان ہوا۔ مگدیشو میں قیام کے دوران میں میں نے سومالی پارلیمنٹ کو خطاب کیا۔ متعدد اداروں کو دیکھا۔ وزیراعظم وزیر خارجہ اور وہاں کے دیگر قائدین سے ملاقاتیں اور مذاکرے ہوئے۔ صدر مملکت نے شام کے کھانے کی تقریب میں سومالیہ کا سب سے اعلیٰ نشان بطور اعزاز عطا فرمایا۔ ایک وقت میں سومالیہ کا سارا علاقہ بڑی کثرت سے مویشیوں کا چارہ پیدا کرتا تھا اور سارے ملک میں وسیع چراگاہیں تھیں مویشیوں کی کثرت کی وجہ سے دودھ بافراط میسر آتا تھا یہاں تک کہ عمارتوں کی تعمیر میں چونا بجھانے کیلئے پانی کی بجائے دودھ استعمال ہوتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ دودھ سے بجھایا ہوا چونا عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا موجب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لُو کی شدید تپش کے اثر سے مجھے BRONCHITIS کی تکلیف ہوگئی۔ ایک معمر اطالوی ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئے۔ وہ اپنے فن میں ماہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے جو علاج تجویز کیا اس سے مجھے جلدا فاقہ شروع ہو گیا۔ فالحمد للہ۔ ایک احتیاط جو انہوں نے بتائی یہ تھی کہ باہر گرم ہوا میں جانا بند کر دیا جائے اور اونی گرم لباس پہنا جائے۔ اس ہدایت کا دوسرا حصہ مجھے کچھ عجیب معلوم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ لُو سے حفاظت کیلئے یہ احتیاط ضروری ہے۔ مگدیشو سے نیروبی روانہ ہونے تک بیماری کی تکلیف تو بہت حد تک رفع ہو گئی تھی البتہ احتیاط کی ضرورت باقی تھی۔

کینیا | نیروبی میں پاکستانی کمشنر سردار عبدالغفور صاحب تھے جو سردار عبدالرب نشتر صاحب مرحوم کے برادر اصغر ہیں انہوں نے مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور انہوں نے اور انکی بیگم صاحبہ محترمہ نے کوئی دقیقہ مہمان نوازی اور تواضع کا اٹھا نہ رکھا۔ مجھے ان کے ہاں ہر لحاظ سے نہایت آرام میسر رہا۔ فجزاھم اللہ خیراً۔ موگادیشو میں سخت تپش کا سامنا تھا۔ نیروبی مرتفع علاقے میں واقعہ ہے میرے پہنچتے ہی وہاں بارش بھی ہوئی اور ہوا میں خاصی خنکی ہو گئی اس وجہ سے BRONCHITIS کی جو شکایت باقی تھی اس نے انفلوئنزا کی صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر سید محمد اسلم صاحب نے بہت شفقت اور توجہ سے علاج کیا اور اللہ تعالیٰ

کے فضل سے یہ تکلیف بھی رفع ہوگئی۔ میرے نیروبی پہنچنے کے دن سہ پہر کو سردار عبد الغفور صاحب کی طرف سے استقبالی تقریب کا انتظام تھا جس میں مسٹر میلکم میکڈانلڈ بھی جنہیں گورنری کا چارج لئے ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے تشریف لائے۔ وہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے صاحبزادے ہیں جو گول میز کانفرنس کے زمانے میں وزیر اعظم برطانیہ تھے وہ کچھ عرصہ برطانیہ کی وزارت میں بھی رہے تھے۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں میرے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب وہ جنوب مغربی ایشیاء میں برطانوی کمشنر تھے تو دو ایک بار ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ نیروبی میں ملتے ہی فرمایا فرصت ہو تو کل کسی وقت گورنمنٹ ہاؤس آؤ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ میں گیا تو گفتگو زیادہ تر کینیا کی آزادی کے آخری مراحل کے متعلق رہی۔ میں نے کہا اگر آپ جیسا تجربہ کار اور ہمدرد سیاستدان بھی اس گتھی کو جلد نہ سلجھا سکا تو پھر یہ کسی سے بھی سلجھ نہیں سکے گی۔ فرمایا برطانیہ کی طرف سے تو کوئی مشکل نہیں ساری مشکلات اندرونی اور شخصی یا قبائلی ہیں۔ میرے پیش رو ہفتہ میں وزارت کا ایک اجلاس ان مسائل کے تصفیہ کیلئے وقف کیا کرتے تھے۔ میں نے طے کیا ہے کہ ہر ہفتے میں کم سے کم وزارت کے تین اجلاس ان مشکلات کے حل کیلئے ہوا کریں۔ اور اس پر سب فریقین کو رضامند کر لیا ہے کہ جو مسائل آپس کی گفتگو میں باہمی رضامندی سے طے نہ ہو سکیں وہ سیکرٹری آف اسٹیٹ نوآبادیات کی خدمت میں ان کے آنے پر پیش کر دیئے جائیں اور وہ جانبین کے ساتھ مشورہ کرکے جس فیصلے پر پہنچیں اسے تسلیم کر لیا جائے اور آئین میں اس کے مطابق تجویز کر دیجائے۔ میں امید کرتا ہوں اس طور سے اب تمام مسائل اول تو بالاتفاق حل ہو جائیں گے اور اگر کوئی باقی رہ گیا تو مجوزہ طریق سے طے ہو جائے گا چنانچہ ان کی مخلصانہ مساعی کے نتیجے میں کینیا کی آزادی کا بھی جلد فیصلہ ہو گیا۔

مسٹر جمو کنیاٹا اور مسٹر ٹام مبویا اور دیگر قائدین کینیا سے ملاقاتیں

نیروبی کے قیام کے دوران میں میں وزیر اعظم آنریبل مسٹر جمو کنیاٹا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ دوران گفتگو میں فرمایا جماعت احمدیہ یہاں بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ جب میں قید تھا ان کے نمائندگان مجھے جیل میں ملا کرتے تھے۔ مجھے انہوں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ بھی دیا تھا۔ جسے میں نے چار بار تو جیل میں پڑھا اور اب پانچویں بار پڑھ رہا ہوں جب مجھے کسی مسئلے پر اصولی ہدایت کی تلاش ہوتی ہے تو قرآن کریم سے میسر آجاتی ہے۔ میں نے اسلام کے متعلق اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا۔ فرمایا مجھے ضرور بھیجنا میں شوق سے پڑھوں گا چنانچہ نیویارک واپس پہنچنے پر میں نے ایک نسخہ انکی خدمت میں ارسال کر دیا۔ کینیا کے دیگر وزراء اور قائدین کے ساتھ بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق ان سب میں مسٹر ٹام مبویا قابلیت کے لحاظ سے افضل تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سردار عبد الغفور صاحب نے فرمایا میرے برادر اکبر سردار عبد الرب نشتر تمہارا ذکر بہت احترام سے کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جب میں پنجاب کا گورنر تھا اور فالج کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا تو ظفر اللہ خاں متواتر مہینوں میری بحالئ صحت کیلئے دعا کرتا رہا۔ میں نے کہا یہ درست ہے ہمارے ہاں قابل خادمان قوم کی افراط نہیں اور سردار صاحب مرحوم کا وجود اس لحاظ سے بہت قیمتی تھا۔ باوجود اختلاف عقائد کے ہمارے باہمی تعلقات نہایت دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا۔ اور میں انہیں بہت قدر

کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان کی آخری بیماری کی اطلاع مجھے ہیگ سے کراچی آنے پر ملی اور میں شیخ اعجاز احمد صاحب اور چوہدری بشیر احمد صاحب کے ہمراہ انکی بیمار پرسی کیلئے ہسپتال حاضر ہوا۔ بیماری کی تمام تفصیل مجھے سنائی اور رخصت کرتے وقت میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں کچھ دیر لئے رہے اور فرمایا میرے لئے دعا کرنا۔ اس بیماری میں بھی میں انکے لئے متواتر دعاء کی توفیق پاتا رہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ صادر ہوا کہ اب وہ اپنے مولا کے حضور حاضر ہو جائیں اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔ آمین۔

نیروبی بہت خوشنما شہر ہے اور آب و ہوا نہایت معتدل ہے دیسیوں اور پردیسیوں سب کو موافق آتی ہے۔

ٹانگانیکا نیروبی سے میرا ارادہ دارالسلام سے ہوتے ہوئے ٹبورا جانے کا تھا جو ٹانگانیکا کے مغربی علاقے کا انتظامی مرکز ہے۔ وہاں احمدیہ مشن بھی قائم ہے اور مسجد احمدیہ کی بہت دیدہ زیب عمارت ہے۔ اس مسجد کے بنانے کا فیصلہ زمانہ جنگ میں کیا گیا تھا۔ ان دنوں کچھ اطالوی جنگی قیدی ٹبورا میں نظر بند تھے۔ ان میں سے بعض فن تعمیر کے ماہر تھے۔ مسجد کی تعمیر کیلئے ان کی خدمات میسر آگئیں اور انہوں نے شوق اور اخلاص سے ایک خوبصورت عمارت خرچ کے مجوزہ اندازے کے اندر تعمیر کر دی۔

شیخ عمری عبیدی ان دنوں مغربی علاقے کے کمشنر ایک احمدی دوست شیخ عمری عبیدی مرحوم تھے۔ جب شیخ عمری عبیدی صاحب کو میرے دارالسلام آنے کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے لکھا تم ٹبورا میں ہمارے پاس ٹھہرنے کیلئے دو دن ضرور نکالو۔ اس وقت تک میرے اس سفر کے پروگرام کا خاکہ تیار ہو چکا تھا جس میں نیروبی اور کمپالہ کے درمیان صرف تین دن میسر آ سکتے تھے۔ شیخ عمری عبیدی کے اخلاص اور تقویٰ کی وجہ سے میرے دل میں ان کا حد درجہ احترام تھا۔ اور میری شدید خواہش تھی کہ کسی صورت انکی ملاقات کا موقع میسر آ سکے۔ شیخ عمری عبیدی نہایت مخلص نوجوان تھے۔ وہ تنزانیہ کے صدر مملکت مسٹر جولیس نائریرے کے ہم مکتب تھے۔ اور اسی زمانے سے ان کا آپس میں گہرا دوستانہ تھا۔ سلسلہ احمدیہ میں شامل ہونے کے بعد وہ دینی تعلیم کی تکمیل کیلئے ربوہ آئے اور ڈیڑھ سال جامعہ احمدیہ میں تحصیل علم میں گذارا اور زندگی خدمت دین کیلئے وقف کر دی۔ دارالسلام واپس جانے پر احمدیہ مشن ہاؤس میں ہی رہائش اختیار کی۔ نوعمری میں عبادات اور خدمت دین کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ عربی اور انگریزی میں خاصی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ دارالسلام کے سب حلقوں میں ان کا بہت احترام تھا۔ پاکستان سے واپسی کے ایک دو سال کے اندر ہی وہ دارالسلام کے پہلے افریقی صدر بلدیہ منتخب ہوئے۔ اور پہلے سال کی میعاد گذرنے پر بلا مقابلہ دوسرے سال کیلئے پھر میئر منتخب ہوئے۔ لیکن اس اونچے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے معیار زندگی کی سادگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ملک کی آزادی پر جب پارلیمنٹ کا پہلا انتخاب ہوا تو بلا مقابلہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور تھوڑا عرصہ بعد مغربی علاقے کے کمشنر کے منصب پر فائز ہوئے۔ میں ابھی نیروبی ہی میں تھا کہ ان کا پیغام ملا کہ وہ ایک کانفرنس میں شرکت کیلئے دارالسلام آ رہے ہیں اور کچھ دن وہیں ٹھہریں گے لہٰذا میرے لئے ٹبورا جانے کی ضرورت نہ رہی۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ صدر مملکت نے آپ کے قیام کا انتظام اپنے پاس سٹیٹ ہاؤس میں فرمایا ہے اور دارالسلام سے کمپالہ جانے کا انتظام حکومت کی طرف سے کر دیا جائیگا۔

صدر نائیریرے کے ہاں قیام | دارالسلام میں تین دن بڑی دلچسپی میں گذرے۔ دو تین تقریریں بھی ہوئیں سب سے دلچسپ صدر نائیریرے کی صحبت رہی اور سب سے دل خوش کن شیخ عمری عبیدی کی رفاقت۔ دارالسلام کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔ لیکن سٹیٹ ہاؤس پرانا جرمن گورنمنٹ ہاؤس ہے جس کی تعمیر نہایت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی۔ کمرے فراخ اور ہوا دار ہیں دیواریں چوڑی اور چھت بلند۔ کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام بھی ہے ہر طرح کا آرام میسر آیا۔ صدر نائیریرے ایک بیدار مغز اور قابل سیاستدان ہیں سخت سے سخت بات نرم سے نرم الفاظ میں ادا کر دینے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ جن اداروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ان سے میں نے اندازہ کیا کہ ٹانگانیکا اپنی مشکلات کا حل دانشمندی اور حزم سے تلاش کر رہا ہے۔ صدر نائیریرے نے مہمان نوازی اور تواضع کا ہر پہلو سے خیال رکھا۔ ان کی اپنی طبیعت بالکل سادہ ہے کسی قسم کا تکلف یا تصنع نہیں کرتے۔ فرمایا جب ہم نے سٹیٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کی پہلے پہل مجھے اور میری بیوی کو اتنے وسیع رہائشی کمروں سے ملاقات اور کھانے کے کمروں کا رستہ معلوم کرنا دشوار ہوتا تھا! آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے ذاتی استعمال کیلئے صرف دو کمرے رکھیں گے جن میں اپنی ضروریات اور عادات کے موافق سادہ سامان رکھیں گے۔ اب وہ دو کمرے گویا ہمارا گھر ہیں اور باقی سٹیٹ ہاؤس مہمان خانہ ہے جس میں ہم اپنے آپ کو بھی مہمان سمجھتے ہیں۔

شیخ عمری عبیدی نے ایک روز فرمایا جیسا تمہیں علم ہے میں نے اپنی زندگی خدمت دین کے لئے وقف کی ہوئی ہے ربوہ سے دارالسلام واپس آنے پر میں پہلے میئر منتخب ہوا پھر پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اب علاقائی کمشنر ہوں۔ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ میری یہ سرگرمیاں میرے وقف کی روح کے خلاف تو نہیں۔ تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ میں دعا کے ذریعے ہدایت تو طلب کر رہا ہوں۔ چند دن ہوئے میں نے ایک خواب بھی دیکھا۔ جس کا شاید اس بات سے بھی کچھ تعلق ہو۔ لیکن وہ خواب بیان کرنے سے پہلے میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ اس معاملے میں میری رائے تو کوئی وقعت نہیں رکھتی اگر آپ کو اس سلسلے میں کوئی پریشانی ہے تو آپ حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ کی خدمت میں عرض کریں اور جو ارشاد حضور کا ہو اس پر عمل پیرا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ نے مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے اسلئے اپنا ذوقی تاثر گذارش کر دیتا ہوں جو یہ ہے کہ آپ اس معاملے میں کمال اخلاص اور دیانت کے ساتھ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں اگر آپ کا حقیقی مقصد خدمتِ دین ہے اور یہ مواقع جو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے مہیا فرمائے ہیں ان کے فرائض کو کمال دیانتداری کے ساتھ سرانجام دیتے ہوئے آپ پھر بھی ہر موقعہ کو خدمت دین کا ذریعہ بناتے ہیں تو آپ کی پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ مواقع اور یہ مناصب اپنی ذات میں آپ کیلئے کشش بن رہے ہیں تو پھر آپ کو بیشک فکر ہونی چاہیئے۔ اس پر انہوں نے اپنا خواب سنایا جس میں انہوں نے دیکھا کہ صدر نائیریرے ایک سڑک پر سے گذر رہے ہیں۔ شیخ عمری عبیدی صاحب سڑک کے کنارے پر اور لوگوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ صدر انکی طرف متوجہ ہوئے اور گو الفاظ میں کچھ نہیں فرمایا لیکن ایک پنسل انکو عطا کی۔ میں خواب کی تعبیر تو سمجھ گیا لیکن ان سے اتنا ہی کہا خواب مبشر ہے تعبیر ظاہر ہو جائے گی۔ میں افریقی ریاستوں کا دورہ ختم کر کے نیویارک واپس چلا

تھا۔ سفر کے دوران میں ہوائی جہاز میں لندن ٹائمز میں سرخی دیکھی۔ "ٹانگانیکا کی وزارت میں تبدیلیاں"۔ فوراً شیخ عمری عبیدی صاحب کا خواب یاد آیا اور بڑے شوق سے خبر کی تفصیل پڑھی۔ چھ سات وزارتوں میں تبدیلی کا اعلان تھا۔ اعلان کے مطابق شیخ عمری عبیدی صاحب کو وزیر انصاف مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے مبارکباد کا خط لکھا اور لکھا کہ یہ آپ کے خواب کی تعبیر ہے۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ چوہدری محمد شریف مبشر گیمبیا نے بھی یہی تعبیر کی ہے گو میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ میرے سپرد کوئی ایسی خدمت کی جائے گی جس کا مقصد سواحلی زبان کو رواج اور وسعت دینا ہو لیکن ایک رنگ میں میرا اندازہ بھی صحیح ثابت ہوا ہے کیونکہ جناب صدر نے میرے ساتھ میرے منصب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اس وزارت کا کام تو ایسا بوجھل نہیں ہے امید ہے آپ ساتھ ساتھ سواحیلی زبان کو فروغ دینے کی طرف بھی توجہ کر سکیں گے۔ اقوام متحدہ کی اسمبلی کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں شیخ عمری عبیدی صاحب تنزانیہ کے وفد کے رئیس تھے۔ دوران اجلاس میں اسمبلی میں بھی اور اسمبلی سے باہر بھی ملاقات کے مواقع میسر آتے رہے اس وقت یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ آخری ملاقاتیں ہیں۔ کچھ عرصہ بعد قاہرہ میں افریقی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی۔ شیخ عمری عبیدی صاحب صدر نائریرے کے ہمراہ اس کانفرنس میں شرکت کیلئے قاہرہ تشریف لے گئے۔ وہیں بیمار ہو گئے۔ صدر نائریرے نے بہترین علاج کی خاطر جرمنی کے دارالحکومت بون بھجوا دیا۔ مرض کی علامات کچھ ایسی پیچیدہ تھیں کہ پختہ تشخیص تو نہ ہو سکی لیکن غالب قیاس تھا کہ خوراک کی خرابی مرض کا اصل باعث ہے۔ بون سے دو محبت نامے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مجھے ارسال فرمائے۔ دوسرے محبت نامے کے ملنے کے چند دن بعد پیشتر اس کے کہ میرا جواب انکی خدمت میں پہنچے تنزانیہ کا یہ مہر تاباں قبل از وقت ہی غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ العلیا مثواہ ؎

گرچہ جنسِ نیکواں ایں چرخ بسیار آورد ❊ کم بزائید مادرے با ایں صفا دُرِ یتیم

اے خدا بر تربت او بارشِ رحمت ببار ❊ داخلش کن از کمالِ فضل در بیت النعیم

اپنے ملک اور اپنی قوم بلکہ تمام مشرقی افریقہ میں شیخ عمری عبیدی کو جو عزت کا مقام حاصل تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب اس نوجوان شہید قوم و ملت کا جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا تو اس کے تابوت کو اٹھانیوالوں میں صدر تنزانیہ جولیس نائریرے، وزیر اعظم کینیا جمو کینیٹا اور ڈاکٹر اوبوٹے وزیر اعظم یوگنڈا شامل تھے۔

یوگنڈا | دارالسلام سے میرا پروگرام کمپالہ جانے کا تھا جس کے لئے ٹانگانیکا کی حکومت کی طرف سے ایک ESSNA ہوائی جہاز مہیا کر دیا گیا جس میں یہ سفر آرام و سرعت سے طے ہوا۔ فجزاہم اللہ خیراً۔ ہر چند کہ دیکھنے میں جہاز کی حیثیت ایک روایتی اڑن کھٹولے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن پرواز نہایت پرسکون اور ہموار تھی۔ پائیلاٹ ایک یورپین صاحب تھے چونکہ میرے علاوہ اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میری نشست ان کے قریب تھی لیکن انکی توجہ اپنے کام کی طرف تھی اور میں اپنے خیالات میں محو تھا۔ جب جہاز نے وکٹوریہ نیانزا کے اوپر پرواز شروع کی (کہ یہ بھی ایک چھوٹا سا سمندر ہی ہے) تو میری

توجہ اردگرد کے منظر نے اپنی طرف کھینچ لی۔ ساتھ ہی ایکا ایک بادل چھا گیا ہوا تیز ہو گئی اور اولوں کا طوفان شروع ہو گیا۔ اولے زور سے طیارے کی چھت سے ٹکراتے تھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے چاند ماری ہو رہی ہے۔ میں نے تسبیح و تحمید شروع کی کہ اللہ تعالیٰ کا کیسا فضل اور اسکی کیسی قدرت ہے کہ طوفان کی شدت میں ایک چھوٹا سا طیارہ بالکل ہموار اپنی منزل کی طرف پوری رفتار سے محو پرواز ہے۔ طیارے نے بلندی سے اترنا شروع کیا ساتھ ہی مطلع بالکل صاف ہو گیا جھیل کا کنارہ نظر آتے ہی ہمارے اڑن کھٹولے نے ایسے سکون اور اطمینان سے خشکی کے ساتھ معانقہ کیا جیسے ایک بچہ کھیل کود سے توجہ ہٹا کر ماں کی گود میں پناہ لیتا ہے۔ فالحمد للہ۔

کمپالہ کا مطار انٹے بے میں ہے جو کمپالہ سے ۲۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ ان دنوں یوگنڈا کے گورنر جنرل کی رہائش انٹے بے میں تھی اور حکومت کے چند دفاتر بھی وہیں تھے لیکن ایوان پارلیمنٹ اور حکومت کے اکثر دفاتر کمپالہ میں تھے مطار پر گورنر جنرل کے سیکرٹری اور ڈاکٹر لعل دین احمد صاحب معہ احباب جماعت اور چند دیگر معززین موجود تھے۔ گورنر جنرل کے سیکرٹری نے گورنر جنرل صاحب کی طرف سے خوش آمدید کہا اور پیغام دیا کہ ہم نے تو تمہاری رہائش کا انتظام اپنے ہاں کیا تھا لیکن ڈاکٹر لعل دین احمد صاحب مصر ہیں کہ تم ان کے ہاں ٹھہرو اب جیسے تم چاہو فیصلہ کرو۔ میں نے گورنر صاحب کی خدمت میں بعد شکریہ کہلا بھیجا کہ ڈاکٹر لعل دین احمد کے ساتھ میرے برادرانہ تعلقات قریب نصف صدی سے ہیں۔ ان کا دولت خانہ میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے اپنا گھر مزید براں مجھے اپنا وقت زیادہ تر کمپالہ میں گذارنا ہو گا اس لحاظ سے بھی کمپالہ میں ٹھہرنا سہولت کا موجب ہو گا۔ میں آپ کی سہولت کے مطابق آپکی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوں گا۔ سیکرٹری صاحب نے فرمایا آپ کا فیصلہ چونکہ کمپالہ میں ٹھہرنے کا ہے لہذا گورنر جنرل صاحب کی کار آپ کے قیام کے عرصے میں آپ کی جائے قیام پر حاضر رہے گی اور گورنر جنرل صاحب کو بہت خوشی ہو گی اگر آپ کل کھانے پر تشریف لائیں۔ میں نے ان کی تواضع کا شکریہ ان کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ ڈاکٹر لعل دین احمد صاحب کے ہاں مجھے ہر قسم کا آرام اور سہولت میسر رہی۔ انکے بچوں اور ان کی بیگم صاحبہ نے مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا میرے انکے ہاں قیام کی وجہ سے مہمانوں کی ریل پیل رہی لیکن یہ سب چہل پہل ان سب کی خوشی میں ایزادی کا موجب ہوئی۔ فجزاھم اللہ فی الدارین خیراً۔

یوگنڈا کے صوبہ بوگانڈا کے بادشاہ سر فریڈرک متیسا سے ملاقات

ان ایام میں یوگنڈا آئینی لحاظ سے ایک فیڈریشن تھا۔ فیڈریشن کا سب سے بڑا صوبہ بوگانڈا تھا۔ کمپالہ فیڈریشن کا دارالحکومت بھی تھا اور بوگانڈا کا بھی۔ بوگانڈا کے بادشاہ سر فریڈرک متیسا تھے ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے اس علاقے پر حکمرانی کرتے چلے آئے تھے۔ سر فریڈرک کیمبرج کے تعلیمیافتہ تھے اور خوش خلق نوجوان تھے اپنے ملک اور اپنی قوم میں ان کا درجہ صرف بادشاہ ہی کا نہ تھا بلکہ مذہبی حیثیت میں بھی وہ اپنی قوم کے سربراہ اور رہنما تھے۔ مجھے انکی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملا۔ ان دنوں کمپالہ سے قریب ۸۰ میل کے فاصلے پر دیہات میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ پہلے برطانوی حکومت نے انہیں ان کے اختیارات

سے محروم کر کے انگلستان میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ بڑی وجہ شکایت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی پہلی شادی کے کچھ عرصہ
بعد اپنی بیوی کی حقیقی بہن کے ساتھ بھی شادی کر لی تھی اور بیک وقت دونوں بیویوں کے ساتھ ان کے ازدواجی
تعلقات تھے۔ یہ صورت انکی قومی روایات کے خلاف نہیں تھی۔ دونوں بیویاں اپنی اپنی جگہ خوش تھیں ان کی خوشدامن
جن کے ساتھ مجھے کچھ عرصے بعد کولالمپور میں ملنے کا اتفاق ہوا اور جو خود ایک تعلیمیافتہ قابل، روشن ضمیر خاتون تھیں اس
دوہرے رشتے پر مطمئن تھیں لیکن یہ صورت حکومت برطانیہ کیلئے ناگوار تھی۔ خصوصاً اس لئے کہ سر فریڈرک اپنے آپ کو عیسائی
کہتے تھے اور کلیسا کو ان کی پیدا کردہ صورت حالات قابل قبول نہ تھی۔ ادھر سر فریڈرک کو کلیسا اور برطانوی حکومت کا موقف
سراسر غیر معقول اور غیر واجب نظر آتا تھا۔ انہوں نے عیسائیت کو ایک فیشن کے طور پر قبول کر لیا تھا لیکن باوجود عیسائیت
اور کیمبرج کی ڈگری کے ان کی تمام اقدار صدیوں پرانی قبائلی اقدار تھیں اور ان کے خیال میں ان کی پہلی بیوی کی موجودگی میں
اس کی بہن کے ساتھ شادی کرنا بالکل ان اقدار کے مطابق تھا۔ جب انہیں ان کے اختیارات سے محروم کر کے انگلستان بھیج دیا
گیا تو ان کے قبیلے میں اس پر بہت بے چینی پیدا ہوئی اور حکومت کو بہت مشکلات کا سامنا ہوا۔ جب یہ بے چینی بجائے فرو ہونے
کے بڑھتی چلی گئی تو آخر برطانوی حکومت نے سر فریڈرک کو وطن واپس آنے کی اجازت دیدی اور ان کے اختیارات بھی بحال کر دیئے
گئے۔ افریقن حالات اور افریقن معیار کے لحاظ سے سر فریڈرک ایک بیدار مغز حکمران تھے۔ اپنی مملکت کیلئے انہوں نے پارلیمنٹ قائم
کی تھی۔ کمپالہ کی پہاڑیوں میں ایک پہاڑی پر انہوں نے ایوان پارلیمنٹ اور حکومت کے دفاتر تعمیر کرائے تھے۔ یہ عمارات عالیشان
تھیں اور ہر نوع کے آرام اور آرائش کے سامانوں سے آراستہ تھیں۔ مجھے ایوان پارلیمنٹ دیکھنے اور ان کے بعض وزراء سے
ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ ان کے وزیر تعلیم انہی کے عزیزوں میں سے ایک نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن دماغ نوجوان تھے جنہیں اپنے
ملک اور قوم کی ترقی کی دھن تھی تعلیم کے ہر پہلو سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔ سر فریڈرک خود تو رسماً عیسائی تھے مگر ان کے یہ عزیز
علیٰ وجہ البصیرت مسلمان تھے اور اسلامی امور میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب میں معہ کچھ رفقاء کے سر فریڈرک کی خدمت میں حاضر
ہوا تو وہ بہت تواضع سے پیش آئے۔ کوئی نصف گھنٹہ کی ملاقات کے بعد میں نے اجازت طلب کی تو فرمایا میری بڑی خواہش
ہے کہ آپ سب دوپہر کا کھانا یہیں میرے ساتھ کھائیں۔ میرے پروگرام میں اتنی گنجائش تو نہیں تھی لیکن شاہی فرمان سے انکار
بھی مناسب نہ تھا۔ ٹیلیفون پر پروگرام میں ردوبدل کر دیا گیا۔ کھانے کے انتظار میں سر فریڈرک مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں
ہمیں نسبتاً بے تکلفی سے گفتگو کا موقعہ مل گیا۔ انکی طبیعت میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں تھا۔ عادات اطوار بالکل سادہ تھے
زبان کے لہجے اور تلفظ پر کیمبرج کی چھاپ تھی بہت دھیمی اور نرم آواز میں بولتے تھے۔ یہ سب کچھ تو بیسویں صدی کے انگلستان
اور کیمبرج کا اثر تھا۔ لیکن جب ان کا کوئی عزیز یا ملازم کمرے میں داخل ہوتا تو دروازے سے ہی ہاتھ پاؤں پر رینگ کر ان تک پہنچ کر اپنی
گذارش کرتا۔ یہ صدیوں پرانی قومی روایت تھی اور ہماری موجودگی میں اس پر عمل کئے جانے سے کیمبرج کے تعلیم یافتہ نوجوان کے
چہرے پر خجالت کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہماری گفتگو ان کی ذاتی دلچسپیوں تک محدود رہی باوجود ان کی قومی روایتوں کے اور ان کی

زباں زد عام مغربیت در بارہ بادہ نوشی کے (جس کا میری موجودگی میں تو ان کی طرف سے کوئی اظہار نہ ہوا) مجھے انکی شخصیت قابل قدر نظر آئی اور بعض لحاظ سے ان کی بے بسی کی وجہ سے ان کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوئی۔ چند سال بعد نئے آئین کے بارے میں ان کا ڈاکٹر اوبوٹے کے ساتھ اختلاف ہو گیا اور وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اب ناچار انگلستان میں مقیم ہیں۔

کمپالہ اپنے مقام و توقع کے لحاظ سے ایک خوشنما مقام ہے۔ آب و ہوا معتدل ہے۔ جو ادارے دیکھنے کا اتفاق ہوا، مثلاً کالج، ہسپتال، ایوان وفاقی پارلیمنٹ وغیرہ ان سے اور بازاروں، سڑکوں، باغات سے مجھے اندازہ ہوا کہ یوگنڈا اثنا راہ ترقی پر گامزن ہو چکا ہے اور جلد جلد ترقی کی طرف قدم اٹھا رہا ہے۔ مسلمان طبقہ کو بھی آبادی کے دوسرے طبقوں کی مانند اپنی تعلیمی، ثقافتی اور اقتصادی ترقی کی طرف توجہ ہے۔ نو تعمیر شدہ جامع مسجد جو ایک پہاڑی پر واقع ہے نہایت خوشنما ہے۔ قریب ہی اسلامیہ سکول کی عمارات ہیں جہاں بظاہر عمدہ پیمانے پر بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان دونوں مقامات کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

بلدیہ کمپالہ کی طرف سے اعزازی ڈنر | کمپالہ کے بلدیہ کی طرف سے شام کے اعزازی کھانے کی تقریب کا انتظام کیا گیا جس کی صدارت صدر بلدیہ میئر پٹیل نے کی۔ اپنی تقریر کے دوران میں انہوں نے فرمایا قریباً ۲۷، ۲۸ سال ہوئے میں نے بمبئی یونیورسٹی میں بی اے کا امتحان دیا تھا۔ زبانی سوالات جو مجھ سے پوچھے گئے انہیں سے دو مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ ایک سوال تھا محبت کسے کہتے ہیں۔ دوسرا سوال تھا ظفر اللہ خاں کون ہے۔ پہلے سوال کا جواب تو میں نے یہ دیا کہ مجھے ابتک محبت سے واسطہ نہیں پڑا اسلئے میں نہیں بتا سکتا محبت کسے کہتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب میں نے صحیح دیا کہ ظفر اللہ خاں مرکزی حکومت ہند کا وزیر ہے۔ گو اس وقت مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میری اور ہمارے آج شام کے محترم مہمان کی کبھی ملاقات بھی ہو گی۔ آج ۲۷، ۲۸ سال کے بعد مشرقی افریقہ کے اس خوبصورت شہر میں یہ اتفاق ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں میئر پٹیل کی میزبانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں امید کرتا ہوں کہ اتنے عرصے کے بعد جہاں یہ اتفاق ہو گیا ہے کہ میئر صاحب کی اور میری باہم ملاقات ہو گئی ہے وہاں اس درمیانی عرصے میں میئر صاحب کو محبت سے بھی گہرا واسطہ پڑ چکا ہو گا اور آج وہ پہلے سوال کا جواب بھی ذاتی تجربے سے دینے کے قابل ہو چکے ہوں گے۔ بلدیہ کا ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میئر صاحب کئی منٹ تک مہمانوں کے قہقہوں کا نشانہ بنے رہے!

وزیر اعظم ڈاکٹر اوبوٹے کی طرف سے استقبالی دعوت | وزیر اعظم ڈاکٹر اوبوٹے نے فیڈرل پارلیمنٹری ایوان کے باغیچے میں استقبالی دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں گورنر جنرل، وزرائے کرام، رؤسائے شہر اور دیگر معززین نے شرکت کی۔

یوگنڈا کے جنوب مغرب میں روانڈا کا ملک آزاد ہو کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کر چکا تھا آزادی سے پہلے جو قبیلہ روانڈا میں برسر اقتدار تھا وہ اقلیت میں تھا۔ آزادی حاصل ہونے پر سب اختیارات اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئے اور اکثریت نے اقلیت کو مبتلائے مصیبت کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں اقلیت کی ایک خاصی تعداد یوگنڈا میں منتقل ہو گئی۔ یوگنڈا کی حکومت نے

انہیں سرحد کے قریب کے علاقوں میں بسانے کا انتظام کیا اس منصوبے کے سلسلے میں حکومت کو اقوام متحدہ کی ایجنسیوں خصوصاً عالمی ادارۂ صحت اور اقوام متحدہ کے پناہ گزینوں کے محکمہ کے ہائی کمشنر سے مدد اور تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حکومت کی خواہش پر میں نے سرحدی علاقے میں جا کر اس منصوبے کے بعض شعبوں کو دیکھنا بخوشی منظور کر لیا۔ اس سفر میں ڈاکٹر لعل دین احمد صاحب بھی میرے ہمراہ تشریف لیگئے رستے میں ایک رات ہمنے مساکہ میں بسر کی۔ یوگنڈا میں جن سڑکوں پر سفر کرنیکا مجھے اتفاق ہوا وہ سب پختہ اور نہایت اچھی حالت میں تھیں۔ مساکہ میں ہمارا قیام "مساکہ ان" میں ہوا جو ایک خوشنما۔ نہایت صاف اور بہت آرام دہ جائے قیام ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر احمد دین صاحب مساکہ میں رہائش رکھتے ہیں انکا مکان INN کے قریب ہی ایک مرتفع مقام پر واقعہ ہے جہاں سے ارد گرد کا وسیع خوشنما منظر دور تک نظر آتا ہے۔ مغرب کی نماز ہمنے انکے مکان کے پہلو میں کھلے ہوئے صحن میں ادا کی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مساکہ میں مسجد احمدیہ تعمیر ہو چکی ہے۔ فالحمدللہ۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ دن کا اکثر حصہ پناہ گزینوں کے آباد کرنے کے منصوبے کے مختلف شعبوں کو دیکھنے میں صرف ہوا۔ یورپین اور افریقن افسروں اور کارکنوں کی مستعدی، ہمدردی اور اخلاص سے میں بہت متاثر ہوا۔ سہ پہر کو مساکا واپسی ہوئی۔ یہاں برصغیر ہند و پاکستان نژاد آبادی کی طرف سے استقبالی دعوت کا انتظام تھا۔ ان سب اصحاب سے ملکر بہت خوشی ہوئی شام کو کمپالہ واپسی ہوئی۔ جمعہ کے دن نماز اور دوپہر کے کھانے کیلئے میں جنجہ گیا۔ یہ قصبہ کمپالہ سے ۴۰ - ۴۵ میل کے فاصلے پر جانب شرق جھیل وکٹوریا نیانزا کے کنارے پر واقع ہے۔ یہیں سے دریائے نیل جھیل سے نکل کر شمال کی جانب بہتا ہے۔ جماعت احمدیہ یوگنڈا کا مرکز اور صدر مقام بھی یہیں ہے۔ مسجد احمدیہ اور مشن ہاؤس جھیل کے بالکل قریب واقعہ ہیں اور دریائے نیل کا مخرج بھی وہاں سے دور نہیں۔ نماز کے بعد بلدیہ کی طرف سے استقبالی دعوت کا انتظام تھا۔ اس تقریب میں صدر بلدیہ اور معززین شہر سے ملاقات ہوئی۔ دریائے نیل کے مخرج پر کھڑے ہوئے ان خیالات کا ہجوم رہا کہ اس مقام کی تلاش میں سینکڑوں جانیں قربان ہوئیں اور شمال اور مشرق اور مغرب کی طرف سے جنگلوں اور دلدلوں کو عبور کرتے ہوئے بڑے بڑے قافلے مہینوں بھوک پیاس اور طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار رہے۔ اور اب بڑے آرام اور آسائش میں سفر کرتے ہوئے زائرین انٹیبے کے مطار پر پہنچنے کے دو گھنٹے کے اندر جنجہ پہنچ جاتے ہیں اور نیل کے مخرج کے منظر کا اپنے اپنے ذوق کے مطابق حظ اٹھاتے ہیں۔

کمپالہ کی مسجد احمدیہ کے افتتاح کی سعادت | بلدیہ کی استقبالی تقریب کے بعد میں کمپالہ واپس لوٹا۔ یہ سڑک بھی نہایت اچھی حالت میں ہے جائے قیام پر وضو کر کے مسجد احمدیہ میں حاضر ہوا یہ مسجد بھی شہر کی آبادی کے اندر ہی ایک ممتاز مرتفع مقام پر واقعہ ہے عمارت پاکیزہ، صاف ستھری، ہوادار اور خوشنما ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں یوگنڈا کی جماعت احمدیہ نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن اخراجات مہیا کرنے اور دیگر متعلقہ مساعی میں سب سے بڑھ کر اور نمایاں حصہ ڈاکٹر لعل دین احمد صاحب نے لیا۔ فجزاہ اللہ فی الدارین خیراً مسجد کی تکمیل میرے کمپالہ جانے سے تھوڑا عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ مسجد کی افتتاح کی سعادت اللہ تعالیٰ کے کمال فضل اور ذرہ نوازی سے مجھے حاصل ہوئی۔ وللہ الحمد۔ آخر اکتوبر ۱۹۶۷ء میں بھی مجھے جمعہ کا دن کمپالہ میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ درمیانی عرصہ میں مسجد کے ملحق نئے کمرے تیار کر کے ایک سکول بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ جو بفضل اللہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ طلباء کی تعداد عمارت کی توسیع

کی متقاضی تھی۔

کمپالہ سے میرا پروگرام خرطوم جانیکا تھا۔ اس سفر کا آسان ترین طریق نیروبی کے رستے جانیکا تھا۔ اس وجہ سے مجھے ایک پہر اور شام نیروبی میں گذارنے کا موقعہ مل گیا۔ کمشنر صاحب نے یہ سارا وقت بھی مختلف تقریبات کیلئے مخصوص کر دیا ہوا تھا۔ سہ پہر تو مسجد احمدیہ میں احباب جماعت کی صحبت اور نمازوں میں گذری۔ مغرب کے بعد مسلم لیگ کی طرف سے کھانے کی دعوت تھی۔ رات کو پنجابی ادبی انجمن کے جلسے میں تقریر تھی۔ نصف شب کو خرطوم روانگی تھی۔

نیروبی کی پنجابی ادبی انجمن میں پنجابی میں تقریر | پنجابی ادبی انجمن اپنے انگریزی نام THE PUNJABI LITERARY SOCIETY کے مطابق بالکل اسم بامسمیٰ ثابت ہوئی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ پنجابی ادبی انجمن اس ملک میں مزدور انگریزی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ بات میرے لئے اچنبھا تھی کہ نظموں میں اکثر ردیف قافیے بھی انگریزی الفاظ میں تھے۔ صرف میں نے ٹھیٹ پنجابی میں خطاب کیا دو تین گھنٹے بہت پُرلطف صحبت رہی۔ نومبر ۱۹۶۷ء میں پھر مجھے دو دن نیروبی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ اس موقعہ پر اس سوسائٹی کے سیکرٹری سردار رنجن سنگھ صاحب مسجد احمدیہ میں تشریف لائے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک پنجابی نعت اپنی کہی ہوئی پڑھ کر سنائی جس سے سب حاضرین بہت متاثر ہوئے اور میں تو آبدیدہ ہوگیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ سامان تو نیروبی پہنچتے ہی کار میں رکھ لیا ہوا تھا۔ پنجابی ادب سے فراغت پاتے ہی مطار کی راہ لی اور عین وقت پر پہنچ گئے۔ دوسرے دن صبح فجر سے کچھ پہلے بفضل اللہ بخیریت خرطوم پہنچ گیا۔

سوڈان | میں اس سے پہلے خرطوم آچکا تھا لیکن یہ مارچ ۱۹۴۳ء یعنی بیس سال پہلے کی بات تھی۔ خرطوم میں دو دن بہت مصروفیت میں گذرے۔ اگرچہ ابھی جنوری کا آخر تھا لیکن دوپہر کے وقت گرمی کی شدت کا احساس ہوتا تھا۔ صدر ریاست کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ وزراء قائدین اور معززین کیساتھ استقبالی دعوت میں ملاقات کا موقعہ ہوا۔ سوڈان کے تعلقات پاکستان کے ساتھ ہمیشہ بہت دوستانہ رہے ہیں۔ سوڈان کے ارباب حل و عقد میاں ضیاء الدین صاحب کے نہایت ممنون ہیں کہ انہوں نے گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے سوڈان کی بہت مخلصانہ خدمات سرانجام دیں۔

قاہرہ میں صدر مملکت کرنل جمال عبدالناصر و دیگر قائدین سے مذاکرات | خرطوم سے میں قاہرہ آیا۔ صدر مملکت کرنل جمال عبدالناصر صاحب السید علی صابری صاحب اور وزیر خارجہ السید محمود فوزی صاحب سے ملاقات اور تبادلہ خیالات ہوا۔ صدر مملکت حسب سابق نہایت تواضع سے پیش آئے۔ ملاقات کے آخر میں رخصت کرنے کیلئے باہر کار تک تشریف لائے اور عرب دستور کے موافق پیار کے ساتھ رخصت کیا۔ السید علی صابری صاحب نہایت سنجیدہ مزاج سیاستدان ہیں۔ حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ السید محمود فوزی صاحب کیساتھ ۱۹۴۷ء سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب وہ اقوام متحدہ میں مصر کے مستقل نمائندے تھے۔ بالکل بے تکلفی سے بات چیت ہوتی رہی۔

ٹریپولی | قاہرہ سے میں ٹریپولی گیا۔ لیبیا، تونس، الجیریا اور مراکش کی آزادی کی کشمکش میں پاکستان نے نمایاں

حصہ لیا تھا اور ان ممالک میں پاکستان کے متعلق ہر طبقے میں نہایت مخلصانہ جذبات ہیں جن کا اظہار میرے قیام کے دوران میں ہر مقام پر ہوتا رہا۔ فجزاھم اللہ خیراً۔ ان چاروں ممالک میں حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کے علاوہ انکے آثار قدیمہ اور تاریخ اسلام کے آثار اور ان سے متعلق مقامات میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے۔

ڈاکٹر السیّد فاضل جمالی | طرابلس میں میرے نہایت عزیز دوست ڈاکٹر السیّد فاضل جمالی سابق وزیر خارجہ عراق کے صاحبزادے سے بھی ملاقات ہوئی وہ اقوام متحدہ کے کسی شعبہ کے متعلق وہاں کوئی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ ملتے ہی میں نے دریافت کیا آپ کے والد کہاں ہیں؟ کہا تونس میں ہیں آپ کو وہاں ملیں گے۔ ان سے بالتفصیل ان کے والد صاحب کے متعلق حالات معلوم کئے۔ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے وقت السیّد فاضل جمالی عراق کے وزیر خارجہ تھے۔ انقلاب میں وہ بھی زیر عتاب آئے۔ محبوس ہوئے الزامات عائد کئے گئے۔ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔ بعض دفعہ یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے ہیں۔ اس تمام عرصے میں میں انکی مخلصی کیلئے عاجزانہ دعا کرتا رہا۔ آخر ایک لمبے عرصے کے بعد یکبنہ خبر ملی کہ رہا کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے صاحبزادے سے معلوم ہوا کہ رہائی کے تھوڑا عرصہ بعد صحت کی بحالی کی خاطر کچھ مدت کیلئے سوئٹزرلینڈ تشریف لیگئے تھے ابھی وہیں تھے کہ جامع تونس کی طرف سے فلسفہ اسلام کی پروفیسری کی پیش کش ہوئی جو انہوں نے منظور کر لی۔ یہ کوائف ان سے معلوم ہوئے وہ میرے اطمینان کا باعث ہوئے اور ان کے نتیجے میں میرا تونس پہنچنے کا شوق اور بھی تیز ہو گیا۔

تونس | تونس پہنچنے تک رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ تونس، الجزائر اور مراکش میں افطاری اور رمضان کی شام جشن کا رنگ نہیں رکھتیں۔ عموماً افطاری اور شام کا کھانا اور وہ بھی نسبتاً سادہ بیک وقت جلد ختم ہو جاتے ہیں اور مساجد نمازیوں سے بھر جاتی ہیں۔ فالحمدللہ۔

السیّد فاضل جمالی سے ملاقات | تونس میں جس مہمان خانے میں میرا قیام تھا وہ فرانسیسی اقتدار کے زمانے میں ایک محل تھا۔ میں نے پہنچتے ہی السیّد فاضل جمالی کے ہاں ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے میرا نام سنتے ہی فرمایا کہاں ٹھہرے ہو؟ میں ابھی آتا ہوں میں نے عرض کیا اس وقت تو میرا حاضر ہونا ہی مناسب ہے آپ یہاں کے داروغے کو ٹیلیفون پر گھر کا پتہ بتادیں وہ شوفر کو سمجھا دیں گے اور میں جلد سے جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ہماری ملاقات طبعاً پُرتپاک تھی۔ میں نے شروع ہی میں دریافت کیا آپ کو میرے پیغام پہنچتے رہے تھے؟ فرمایا پہنچتے رہے اور میرے لئے تسکین کا موجب ہوتے تھے۔ میں تمہاری دعاؤں کا نہایت ممنون ہوں۔ میرا زندہ رہنا اللہ تعالیٰ کے خاص احسان سے ہی ہوا کئی بار شام کو اطلاع ملتی کہ دوسری صبح جن مجرموں پر سزائے موت کا حکم عمل میں لایا جائیگا ان میں میرا نام بھی شامل ہے لیکن جب دوسری صبح مقتل جانیوالوں کے نام پڑھے جاتے تو ان میں میرا نام نہ ہوتا۔ رہائی سے قبل مجھے جنرل قاسم کے روبرو پیش کیا گیا انہوں نے بتایا جب بھی تمہارا نام فہرست میں آتا تھا میں خود اپنے ہاتھ سے اسے کاٹ دیتا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑا عرصہ بعد وہ بیچارے خود بھی اسی قسم کی موت کا شکار ہو گئے جسے انہوں نے شروع کیا تھا۔ میں نے کہا یہ سارا عرصہ آپکے مخلصین کے لئے بڑی پریشانی میں گذرا الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور جان بخشی ہوئی۔ جب فوجی عدالت میں آپکے خلاف

کاروائی جاری تھی تو میں بہت توجہ سے اخبارات میں کاروائی کی رپورٹ پڑھتا تھا۔ یہ امر میرے لئے موجب مسرت تھا کہ آپنے اپنے بیانات میں کسی قسم کے عذر کی آڑ لینے کی کوشش نہ کی اور جرأت سے یہ موقف اختیار کیا اور اس پر قائم رہے کہ میں نے اپنی وزارت کے زمانے میں وہی پالیسی اختیار کی جسے میں اپنے ملک کیلئے فائدہ مند سمجھتا تھا اور اسی پر عمل پیرا رہا۔ السیّد فاضل جمالی نے فرمایا یہ سارا عرصہ میرے لئے بھی پریشانی کا زمانہ تھا لیکن اب میں غور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ بہت فائدہ مند بھی ہوا۔ ایسے وقت میں جب بظاہر موت سامنے کھڑی تھی میری توجہ عارضی باتوں سے ہٹ کر دائمی اقدار کی طرف لگی رہی۔ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ متواتر جاری رکھا اور بہت کچھ اس الٰہی ہدایت نامے سے حاصل کیا جو زندگی کی روزانہ کشمکش کے درمیان میں حاصل نہ کر سکتا۔ اب اس مطالعہ اور تفکر کا فائدہ یہاں میرے طلباء کو پہنچ رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہاں کے حالات کو آپ نے کیسے پایا؟ فرمایا سیاست کو تو میں چھوڑ چکا ہوں۔ اس میدان میں اب مجھے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں۔ جب صدر بورقیبہ نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تو میں نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ ممکن ہے اسلامیات کے بعض حصوں کے متعلق مجھے ان کے خیالات کے ساتھ اتفاق نہ ہو۔ انہوں نے فرمایا ہماری طرف سے تم پر کوئی قیود نہیں ہوں گی جو تمہارے خیالات اور اقدار ہوں تم بیشک الکا آزادی سے اظہار کرو۔ سو میں قرآن کریم کی بیان کردہ اقدار اور قرآن کریم کی حکمت اور فلسفے پر ہی زور دیتا ہوں۔ دوسرے دن شام کو میں نے السیّد فاضل جمالی کو افطاری اور شام کے کھانے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول فرمایا۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ دوسری شام جاری رہا۔ السیّد فاضل جمالی گرمیوں کے موسم میں کچھ عرصے کیلئے سوئٹزرلینڈ تشریف لے جاتے ہیں۔ انکی خیریت کی خبر چوہدری مشتاق احمد باجوہ صاحب امام مسجد محمود زیورک کے ذریعے پہنچتی رہتی ہے۔

صدر بورقیبہ سے ملاقات | تونس میں محترم صدر بورقیبہ صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا۔ ان سے ایک مرتبہ نیویارک میں ملاقات کا اتفاق ہو چکا تھا۔ عرب امریکن دوستانہ سوسائٹی کی طرف سے انکے اعزاز میں دعوت تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔ جب میں پہنچا تو وہ اپنے امریکن مشتاقین کے حلقے میں گھرے بیٹھے تھے۔ دور سے مجھے دیکھا تو جلدی سے میری طرف تشریف لے آئے۔ اب تونس میں بھی ویسی ہی شفقت اور عنایت سے پیش آئے۔ میں نے انکی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا تونس تو تمہارا اپنا گھر ہے۔ السیّد منجی سلیم وزیر خارجہ سے جو اسمبلی کی صدارت میں میرے پیش رو تھے ملاقات ہوئی اور اسمبلی کی صدارت اور دیگر مشترکہ دلچسپی کے امور کا تذکرہ رہا۔ حکومت کی طرف سے وسیع پیمانے پر افطاری کی دعوت ہوئی۔ تونس کے آثار قدیمہ کے عجائب گھر کو بہت دلچسپ پایا۔ تونس کے باہر آثار قدیمہ کے دیکھنے کا بھی انتظام کیا گیا۔ تونس شہر اور اس کے مضافات میں جہاں سے گذرنے کا اتفاق ہوتا عام آبادی کی طرف سے اخلاص و محبت کا گرمجوشی کے ساتھ اظہار ہوتا۔ میں یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید میں مصروف ہو جاتا جس نے اپنے فضل اور رحم سے اپنے ایک عاجز بندے کی محبت دور دراز علاقوں کے لوگوں کے دلوں میں ڈال دی۔

الجزائر کے وزیر خارجہ محمد خمیستی | تونس سے میں الجزائر گیا۔ طیارے سے اترتے ہی وزیر خارجہ نے بڑے تپاک سے معانقہ کیا وہ پہلے ہی نحیف الجثہ تھے معانقہ سے محسوس ہوا محض مشت استخوان ہیں۔ چہرہ بھی زرد تھا۔ میں نے دریافت کیا یہ کیا ہوا آپ تو بہت نحیف معلوم ہوتے ہیں؟ فرمایا میں پیرس گیا تھا وہاں کئی دن بیمار رہا۔ میں نے کہا آپ کو اپنی صحت کے متعلق بہت احتیاط

کرنی چاہیئے۔ آپ کے فرائض بھی اہم ہیں اور مصروفیت بھی بہت ہے۔ فرمایا میری صحت کی فکر نہ کریں الجزائر زندہ رہے میں زندہ رہا یا نہ رہا۔ اس کے بعد پھر نیویارک کے کھانیوالی شام کی کیفیت ہو گئی۔ میرا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر میرے بازو کو اپنے بازو کے نیچے دبا لیا اور مطار کی عمارت کی طرف بڑھے۔ اسی ہیئت میں سفرائے عظام کے ساتھ ایک ایک کر کے میرا تعارف کرا دیا۔ پھر میرے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھے اور ریڈیو پر میرا تعارف کرایا آہستہ آہستہ فرانسیسی میں بول رہے تھے۔ میں ہر جملے کا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ خوش آمدید کے ساتھ کہا آپ پہلے یہاں نہیں آئے لیکن آپ کا نام اس ملک میں خوب معروف ہے۔ اس کے بعد جو کچھ اخلاص اور شوق نے انکی زبان پر جاری کیا کہہ گئے۔ مطار سے شہر تک عوام کی طرف سے جا بجا خوش آمدید کا اظہار ہوتا رہا۔ میرے قیام کیلئے ایک فرانسیسی طرز کے ولا کا انتخاب کیا گیا۔ وزیر خارجہ نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ میری تمام ضروریات کا انتظام خاطر خواہ طریق پر کیا جا چکا ہے فرمایا اب آپ نماز ادا کریں اور کچھ آرام کر لیں۔ میں گھنٹہ بھر کے بعد آؤں گا اور آپ کو اپنے ہاں لے چلوں گا آج شام آپ ہمارے ہاں بسر کریں گے۔ کھانا وہیں کھائیں گے۔ میں نے عمداً کسی اور کو نہیں بلایا۔ آپ کا سرکاری پروگرام صبح سے شروع ہو گا۔ آج شام آپ خالص ہمارے مہمان ہونگے۔ انکی رہائش شہر کے ایک گنجان بارونق بازار کی دکانوں کے اوپر چوتھی منزل کے ایک معمولی فلیٹ میں تھی۔ فلیٹ میں ضروری سامان تو موجود تھا لیکن تمام ماحول متوسط درجے کی سادگی کا تھا۔ انکی شادی کو ابھی چار ماہ ہی گذرے تھے۔ فاطمہ خمیستی کا نام بھی الجزائر کی آزادی کی جدوجہد میں معروف ہے۔ فاطمہ کی پہلی شادی دو تین سال قبل ایک قومی فدائی سے ہوئی تھی جن سے انکے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے شادی کے تین سال کے اندر ان کے میاں نے ملک اور قوم کی خدمت میں آخری قربانی پیش کر دی۔ محمد خمیستی ان کے دوسرے خاوند تھے لیکن مکان پر پہنچتے ہی جس خوشی اور اشتیاق سے دونوں بچے محمد سے لپٹ گئے وہ اس امر کی واضح شہادت تھی کہ بچے انہیں اپنا باپ ہی سمجھتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر اور بچوں کو سلا کر فاطمہ بھی نشست کے کمرے میں تشریف لے آئیں۔ ٹیلی وژن پر میرے مطار پہنچنے کا منظر بھی دکھایا گیا۔ اس کے دوران میں میں نے کہا فاطمہ دیکھا محمد نے مجھے اس طرح پکڑ رکھا ہے کہ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔ فاطمہ نے کہا آپ کے یہاں آنے کا انہیں بہت اشتیاق تھا اور بڑی شدت سے آپ کی آمد کے منتظر تھے۔ میں نے کہا مجھے تو انہیں دیکھ کر بہت پریشانی ہوئی ہے۔ دبلے تو پہلے بھی تھے لیکن اب تو نحیف نظر آ رہے ہیں۔ انہیں اپنی صحت کی بھی کچھ فکر ہونی چاہیئے۔ وہ بولیں میں تو بہتیرا کہتی ہوں لیکن یہ احتیاط نہیں کرتے۔ کام بھی اتنا ہے کہ انہیں آرام کیلئے وقت نہیں ملتا۔

صدر مملکت کی دعوت افطار | صدر مملکت نے افطاری کی دعوت پر طلب فرمایا۔ شام کا کھانا رمضان شریف میں افطار کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان سب ممالک میں رمضان کی پابندی بڑی شدت سے کی جاتی ہے۔ اس دعوت پر وزرائے کرام اور معززین سے ملنے کا موقعہ میسر آ گیا۔

اطفال الشہداء کیلئے دارالاقامہ | علاوہ دیگر اداروں کے مجھے اطفال الشہداء کے دارالاقامہ کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس ادارے کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ رہائش گاہ فرانسیسی اقتدار کے زمانے کا ایک وسیع ولا VILLA ہے جو بڑے پر فضا مقام پر واقعہ ہے اس کے چاروں طرف خوشنما باغ ہے۔ یہ دارالاقامہ ۸ - ۹ سال سے ۱۲ - ۱۳ سال تک کی عمر کی

بچیوں کی درسگاہ اور رہائش گاہ ہے۔ بچیوں کا لباس صاف ستھرا اور نہایت زیبا تھا۔ بچیوں کے چہرے بشاش اور پُر اعتماد تھے ان بچیوں کو نہ تو یتامیٰ کا نام دیا گیا تھا نہ ان کے دوسرے حالات ان حالات سے مشابہ تھے جن میں عموماً ہمارے ملک میں یتامیٰ کو زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ غرض اطفال الشہداء کا تمام نظام گویا اطفال الرؤسا کے معیار پر تھا۔ ہم رہائشی کمروں میں سے ایک ایسے کمرے میں بھی داخل ہوئے جس میں رہنے والی بچیاں اس وقت اپنے سبق سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کے اندر کسی شغل میں مصروف تھیں جونہی دروازہ کھلا اور بچیوں نے ہمیں دیکھا اپنا شغل چھوڑ کر ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ لپٹ گئیں جو نسبتاً کم عمر تھیں وہ گلے کا ہار بن گئیں۔ یہ بے ساختہ ردِ عمل اس بات کا شاہد تھا کہ ان بچیوں کیلئے مکان رہائش اور سامانِ خورد ونوش اعلیٰ پیمانے پر تھے۔ ان کے ساتھ محبت کا سلوک ہوتا تھا۔ جس کا ثبوت ان کے چہروں، خد و خال، لب و چشم، حرکات و سکنات سے عیاں تھا۔ الجزائر کی آزادی کی ابھی ابتدا تھی۔ حکومت اور عوام کو پیچیدہ مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا۔ کئی خلا تھے جو پُر کئے جانے کے منتظر تھے۔ کئی ضروریات تھیں جو پوری نہیں کی جاسکتی تھیں۔ لیکن اس ایک ذمہ داری کو جو قوم پر ان جانبازوں کی طرف سے عائد تھی جنہوں نے اپنی جانیں قوم کی خاطر قربان کردی تھیں قوم سو فیصدی سے بڑھ کر پورا کررہی تھی زندہ قوم کا یہی تو ایک نشان ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اطفال الشہداء کی مناسب نگہداشت اور تعلیم و تربیت کیلئے ایک باقاعدہ محکمہ ہے اور اس قسم کے ادارے ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ الجزائر کی ان مساعی حسنہ کو اپنی قبولیت سے نوازے اور وافر اجر اپنی طرف سے عطا فرمائے۔ آمین۔

میرے قیام کے دوران میں وزیر خارجہ ایک سہ پہر کا کچھ حصہ فارغ کر سکے اور ہم شہر سے باہر سمندر کے کنارے موٹر میں سیر کے لئے گئے۔ محترمہ فاطمہ تمیمی بھی ہمارے ساتھ تھیں سیر کے آخر میں ہم نے کچھ وقت ایک پرانے رومی شہر کے کھنڈرات میں گذارا۔ یہ شہر سمندر کے ایک راس پر واقع تھا۔ محل وقوع نہایت دلکش تھا۔ وہی نصف گھنٹہ جو یہاں میسر آیا وزیر خارجہ نے اپنے فرائض کی پریشانیوں سے نسبتاً آزادی کی حالت میں گذارا۔ یوں انکی طبیعت تو افسردگی کی طرف مائل نہ تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنس دیتے تھے لیکن وہ ہنسی ایسی ہی تھی جیسے بادلوں میں سے سورج کی کرن پھوٹ پڑے اور فوراً ہی بادل پھر اس کرن کو ڈھانپ لیں۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں تو ابھی سات ماہ سے زائد کا وقفہ ہے لیکن درمیان میں ممکن ہے میرے نیویارک آنیکا موقعہ ہو مطار پر اسی تپاک سے رخصت کیا جس سے آنے پر استقبال کیا تھا۔

مراکش | الجزائر سے میں مراکش گیا۔ رباط میں میرے قیام کا انتظام شاہی مہمان خانے میں تھا۔ میرے دیرینہ کرم فرما السید احمد بالافریج وزیر اعظم تھے لیکن اس منصب نے ان کی طبیعت کی سادگی، سنجیدگی اور شیرینی میں ذرہ بھر فرق نہیں ہونے دیا تھا۔ انکی سرکاری رہائش گاہ بڑی پر شوکت تھی۔ مجھے شام کے کھانے پر مدعو فرمایا۔ مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وقت رخصت آیا تو فرمایا مہمانوں کو رخصت ہو لینے دو۔ پھر ہمیں بھی آپس میں بات چیت کا موقعہ ملے۔ جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو فرمایا جلالۃ الملک کو تمہارے آنے سے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ حسرت بھی ہے کہ تم ان کے والد کی زندگی میں نہ آسکے۔ مرحوم سلطان کی بڑی خواہش تھی کہ تم یہاں آتے اور وہ خود اپنی طرف سے اور تمام مراکش کی طرف سے ان خدمات کا شکریہ ادا کرتے جو تم نے مراکش کی آزادی کے سلسلے میں کیں افسوس وہ جوانی میں ہی رحلت فرما گئے اور انکی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

ہمیں قصر ابیض (CASABLANCA) جانے کا موقعہ ہوا جو مورش اور مغربی طرز کا مرکب خوشنما شہر ہے۔ فیض کا نام مدرسے کے ایام سے سنا ہوا تھا۔ دیکھنے کا شوق تھا۔ یہ آرزو بر آئی۔ فیض مراکش کا قدیم دارالحکومت ہے اور آج بھی مراکش میں دینیات کا مرکز ہے۔ قدیم شہر کا محل وقوع دفاع کے لحاظ سے نہایت محفوظ ہے۔ شہر دو بلندیوں کی گود میں واقع ہے شہر کی آبادی اس قسم کی ہے کہ اس میں کسی ایزادی یا تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ پرانا شہر جوں کا توں موجود ہے۔ البتہ قریب کے میدانی حصے میں ایک نئی طرز کا شہر آباد ہو چکا ہے جس میں ایزادی ہوتی رہتی ہے۔ قدیم فیض کے تمام بازار مسقف ہیں گلیاں تنگ ہیں شہر کے اندر آمد ورفت پا پیادہ ہو سکتی ہے۔ البتہ بار برداری کیلئے خچر اور گدھے استعمال ہوتے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں کچھ دیر گذارنے کے بعد طبیعت میں کھلی ہوا میں جانیکی خواہش محسوس ہوتی ہے اہالیان شہر عادی ہو جانیکی وجہ سے شائد یہ خواہش محسوس نہ کرتے ہوں یوں مکانوں کے صحن کشادہ ہیں اور ان میں داخل ہوتے ہی سینے سے وہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے جو بازاروں اور گلیوں میں محسوس ہوتا ہے۔ شہر کی اپنی نرالی طرز کے علاوہ یہاں کا دینی کتب خانہ قابل دید ہے بہت سے نادر قلمی نسخے اس میں جمع ہیں فیض کے علمائے کرام کا فتویٰ سارے ملک میں قابل پذیرائی ہے۔

شاہ مراکش کے دربار میں حاضری | جلالۃ الملک کے دربار میں حاضری میرے لئے باعث فخر تھی۔ محل کے صحن میں فوجی اعزازی دستہ (گارڈ آف آنر) صف بستہ تھا ایوان دربار کی ایک جانب فرش کی سطح باقی ایوان سے کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اس اونچے حصے کے وسط میں ایک مرصع کرسی جلالۃ الملک کیلئے بچھی ہوئی تھی۔ ایوان کی سطح پر اونچے حصے سے کوئی بیس فٹ ہٹ کر جلالۃ الملک کے بائیں ہاتھ کی جانب ایک کرسی میرے لئے بچھی ہوئی تھی سارے ایوان میں اور کوئی نشست کا سامان نہ تھا۔ میرے مقابل جلالۃ الملک کے دائیں ہاتھ کی جانب وزیر اعظم، وزرائے کرام اور عمائدین سلطنت دست بستہ صف آراستہ تھے۔ جلالۃ الملک کی تشریف آوری پر میں تعظیم کیلئے کھڑا ہو گیا۔ باقی حاضرین ایوان تو پہلے ہی کھڑے تھے اور سارا وقت کھڑے رہے۔ جلالۃ الملک نے مجھے بیٹھنے کا ارشاد فرمایا۔ ترجمانی کا فرض جن صاحب کے سپرد کیا گیا تھا وہ پاکستان میں مراکش کے سفیر رہ چکے تھے مجھے ان سے نیاز حاصل تھا۔ وہ قصر ابیض اور فیض بھی میرے ہمراہ تشریف لیگئے تھے انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کے سربراہ سے کہا تھا کہ جلالۃ الملک سلطان مراکش کے دربار میں ترجمانی ان کے لئے ایک مشکل کام ہے اور وہ نہایت خائف ہیں لہذا مجھ سے درخواست کی جائے کہ میں آہستہ بات کروں تاکہ ترجمہ کرنے میں انہیں مشکل نہ ہو ان کا پیغام مجھے پہنچا دیا گیا۔ جلالۃ الملک نہایت سادہ لباس میں تھے جہانتک میں قیام مراکش کے دوران میں اندازہ کر سکا وہاں سب مردوں کا لباس سادہ اور ایک ہی طرز کا تھا۔ اس لحاظ سے بھی اور باقی امور میں بھی مراکش میں کوئی طرز تکلف کی میری نظر سے نہیں گذری۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ملاقات کے دوران میں سلطان کے چہرے پر ایک مشفقانہ تبسم تھا۔ جب کوئی خاص جملہ تلطف کا فرماتے تو یہ تبسم اور بھی نمایاں ہو جاتا۔ کلام آہستہ آہستہ اور بالکل سادہ الفاظ میں فرماتے جسے میں پوری طرح سمجھ لیتا۔ ترجمے کی حاجت نہ رہتی لیکن ترجمان کے ذمے جو فرض عاید کیا گیا تھا انہیں بہر صورت اسے ادا کرنا تھا اور میرا یہ کہنا کہ سلطان کے کلام کی ترجمانی کی ضرورت نہیں خلاف آداب دربار ہوتا۔ بے چارے ترجمان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ جلالۃ الملک جو کچھ تین منٹ میں فرماتے ترجمان صاحب اس کا خلاصہ نصف منٹ میں انگریزی میں کہہ دیتے۔ سلطان میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتے میرے جواب سے سمجھ جاتے کہ میں نے انکی بات سمجھ لی

تھی۔ اسی طرح جو کچھ میں گذارش کرتا جناب ترجمان اس کا مختصر سے مختصر خلاصہ عربی میں کہہ دیتے اس پر پھر سلطان مسکرا دیتے۔
چونکہ ملاقات کا عرصہ کوئی پون گھنٹے کے قریب رہا۔ اس قسم کی ترجمانی نے اسے ایک قسم کے ناٹک کا رنگ دیدیا۔ ملاقات کے آخر میں جلالۃ الملک نے ایک افسر کو اشارہ کیا وہ ایک بکس لے آئے اور سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے فرمایا ظفراللہ خاں تم نے جو خدمت مراکش کی اور میرے خاندان کی انجام دی ہے اس کا بدلہ تو ہم کسی صورت میں ادا نہیں کر سکتے لیکن مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم یہ نشان (جو مراکش کا اعلیٰ ترین نشان ہے) میری طرف سے میری خوشنودی اور دوستی کی یادگار کے طور پر قبول کر لو۔ ترجمان صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر جان چھڑائی کہ "بادشاہ تمہیں یہ نشان بطور اعزاز عطا فرماتے ہیں"۔ میں نے دو تین منٹ میں جلالۃ الملک کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور گذارش کی کہ میں اگر مراکش یا اس کے لوگوں یا شاہی خاندان کی کوئی خدمت سرانجام دے سکا تو وہ میرا فرض منصبی تھا اور میرے لئے باعث راحت بھی تھا۔ ہر چند کہ میں ایک عاجز انسان اپنے آپ کو ان الطاف و اکرام کا جن کا میں یہاں پیہم مورد رہا ہوں اور اب اس اعزاز کا جو جلالۃ الملک بخشنا چاہتے ہیں مستحق نہیں سمجھتا لیکن اس تمام شفقت اور اخلاص کے شکریے میں اسے قبول کرتے ہوئے اپنی طرف سے کمال اخلاص کا ہدیہ خدمت اعلیٰ میں پیش کرتا ہوں۔ ترجمان صاحب نے اس گذارش کا ترجمہ صرف اتنا کر کے پیچھا چھڑایا کہ "میں اپنے تئیں اس کا مستحق تو نہیں سمجھتا لیکن آپ دیتے ہیں تو میں لے لیتا ہوں"۔

اسی سال جلالۃ الملک امریکہ تشریف لائے اور نیویارک کے قیام کے دوران میں اقوام متحدہ میں بھی جلوہ افروز ہوئے۔ افریقی ایشیائی نمائندگان کو خطاب کرنا قبول فرمایا۔ حسن اتفاق سے افریقی ایشیائی گروپ کی اس مہینے کی صدارت پاکستان کے ذمے تھی میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اعلیٰ حضرت کا تعارف کرایا اور بوجہ شدتِ جذبات عمداً مروجہ تعریفی کلمات کے استعمال سے پرہیز کیا۔ جلالۃ الملک نے اپنے خطاب کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی۔ "صاحبان میرے لئے یہ تقریب ایک خاص خوشی کی حامل ہے کیونکہ آج مجھے یہ موقعہ ملا ہے کہ میں اس معزز ہستی کا جس کے سپرد اس وقت افریقی ایشیائی گروپ کی صدارت ہے اہالیانِ مراکش کی طرف سے اور اپنی طرف سے علی الاعلان اس خدمت کے لئے شکریہ ادا کروں جو ہمارے سخت مشکل وقت میں وہ بجا لائے۔ میں نے ان جذبات کا اظہار ان سے رباط میں بھی کیا تھا لیکن آج آپ سب کے سامنے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ جب مراکش کا قضیہ اقوام متحدہ میں پیش تھا اس وقت ہمارے حقیقی ہمدرد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے لیکن جب ہم ظفراللہ خاں کی تقریروں کا خلاصہ ریڈیو پر سنتے تھے یا اخباروں میں پڑھتے تھے تو ہمارے دل اس یقین اور اطمینان سے پُر ہو جاتے تھے کہ ہمیں ضرور کامیابی ہوگی۔ کیونکہ ہماری وکالت ایسے ماہر اور قابل شخص کے ہاتھوں میں ہے۔" ان کریمانہ الفاظ کے بعد سلطان نے آدھ گھنٹے کے قریب فی البدیہہ بغیر کسی نوٹ یا یادداشت کے افریقی ایشیائی نمائندگان سے ان کے فرائض سے متعلق نہایت دلچسپ خطاب فرمایا۔ اس سے مجھے نہایت اطمینان ہوا کہ حاضرین کو سلطان حسن کی ذات کے متعلق صحیح اندازہ کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ جلالۃ الملک کا خطاب سادہ، عبارت آرائی سے مبرا اور موقعہ محل کے لحاظ سے نہایت موزوں اور موثر تھا۔ جلالۃ الملک کا قیام پلازا ہوٹل میں تھا۔ اذن ملنے پر میں حاضر خدمت ہوا کمرے کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو مدھم روشنی میں سمجھا کوئی خادم شاہ استقبال کے لئے کھڑا ہے۔ لیکن جب اپنا نام سنا اور مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا ہوا دیکھا تو چونکا کیونکہ شاہ بنفسِ نفیس منتظر کھڑے تھے ان کے لباس کی انتہائی سادگی اور ان کا بے تکلفانہ ڈیوڑھی میں تشریف لے آنا

غلط فہمی کا باعث ہوئے۔ مسکراتے ہوئے فرمایا آج ترجمان کی ضرورت نہیں میں سادہ انگریزی میں اپنا مطلب بیان کر لیتا ہوں اور اگر تم ذرا آہستہ آہستہ بولو گے تو مجھے تمہاری بات سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ فرمایا تمہارے یہاں آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ آج میں بے تکلفی سے بات چیت کر سکوں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے والد کی وفات بالکل اچانک ہوئی۔ انکی ناک میں معمولی سی پھنسی تھی۔ محل میں ہی اسے کاٹ کر صاف کرنے کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر بھی ماہر تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے والد کا دل کمزور تھا کلوروفارم برداشت نہ کر سکے اور روح جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے وہ میرے والد بھی تھے دوست بھی تھے۔ ولی بھی تھے۔ اتالیق بھی تھے۔ ان کی وفات بادشاہ کی وفات نہیں تھی ولیعہد کی وفات تھی اس دن میری زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ بادشاہ کی جگہ تو میں بیٹھ گیا لیکن اس منصب کیلئے میں اپنے آپ کو بالکل خالی پاتا تھا۔ میں نے پختہ عزم کر لیا کہ انکے نقشِ قدم پر چلوں گا اور جس مقصد کیلئے وہ میری تربیت فرماتے رہے اس کے حصول کیلئے کوشاں رہوں گا۔ میں نے کہا اب ہم سب دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ولی عہد عطا فرمائے اور آپ اسکی ویسے ہی تربیت فرمائیں جیسے سلطان مرحوم نے آپکی تربیت فرمائی۔ بڑی خوشی اور امنگ کے لہجے میں کہا ہاں ہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے ہاں امید واری ہے دو تین ماہ میں اللہ تعالیٰ کرم فرمائے تو تمہاری دعاء قبول ہو کر ہم سب کیلئے خوشی کا موجب ہو۔ میں تمہیں اپنی بچی کی تصویر دکھاؤں؟ میں نے عرض کیا مجھے بہت خوشی ہو گی۔ بڑے شوق سے ساتھ کے کمرے میں تشریف لے گئے اور کوئی درجن بھر تصویریں اٹھا لائے جب سب دکھا چکے تو فرمایا میں باپ کی طرح تمہارا احترام کرتا ہوں ان میں سے جونسی تصویر چاہو اپنے لئے انتخاب کر لو۔ پوتی کی تصویر دادا کے پاس بھی ہونی چاہیئے۔ میں نے ایک تصویر کا انتخاب کیا جس میں شہزادی (اس وقت کم و بیش ایک سال کا سن ہو گا) فرش پر بیٹھی ہیں اور اپنے ابا کی تصویر دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے ہیں۔ فرمایا تمہارا انتخاب بہت موزوں ہے تصویر میں بیٹا بھی ہے پوتی بھی ہے۔ غرض جیسے حاضر ہونے پر فرمایا تھا بالکل آزادانہ اور بے تکلفی سے بات چیت ہوتی رہی اور قریب گھنٹہ بھر رموز مملکت سے طبیعت کو فارغ کر کے محترم باپ کی یاد، نورِ چشم کے ذکر اور اللہ تعالیٰ کے متوقع فضل کے اندازے سے اطمینان و سرور حاصل کرتے رہے۔ میں خوش تھا کہ میرے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو انکے سرورِ قلب کا باعث ہوئی رخصت کرنے وقت فرمایا۔ اب تم رباط تو آتے رہو گے نا؟۔ میں نے سنا ہے اب تم پھر عالمی عدالت کی رکنیت میں شامل ہونیوالے ہو۔ عدالت میں تو ہر سال تعطیل ہوتی ہے۔ تعطیل کا عرصہ ہمارے پاس گذارو تو ہمارے لئے بڑی خوشی کا باعث ہو گا۔ تو وعدہ کرو۔ میں نے عرض کیا احمد بالافریج کے ساتھ اسکے متعلق بات چیت کر لونگا سلطان نے نہایت تپاک کیساتھ رخصت کیا اور باوجود میری منت کے کہ ڈیوڑھی سے باہر تشریف نہ لائیں سیڑھیوں تک تشریف لائے اور لفٹ میں سوار کرا کے جب لفٹ حرکت میں آ گیا تو دعائیہ طور پر ہاتھ اٹھا کر الوداع کہا۔ فجزاہ اللہ خیراً۔

السید احمد بالافریج سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا سلطان نے مجھے تاکید کی تھی کہ عالمی عدالت کی تعطیل میں تمہارے ہر سال مراکش آنے کے متعلق تمہارے ساتھ طے کر لوں مراکش میں مختلف مقامات پر ہر قسم کی آب و ہوا میسر ہے تم چاہو تو ایک دو مقامات میں قیام کرو۔ چاہو تو سیر و تفریح کیلئے چلے جاؤ۔ رہائش کیلئے ہوٹل پسند کرو تو ہر جگہ ہوٹل بھی موجود ہیں اور اگر کہیں کچھ عرصہ مطالعہ یا تحریر وغیرہ کے کام کیلئے ٹھہرنا چاہو تو مکان کا انتظام ہو جائیگا۔ جلالۃ الملک کو ہر طرح سے تمہاری خوشی منظور ہے۔ میری کیفیت "اوضاع ملک دیکھ اور اطوار گدا دیکھ" کی سی تھی جزاھم اللہ خیراً۔

وزیر خارجہ گرومیکو کی طرف سے روس آنے کی دعوت کی تجدید

۱۹۶۲ء کے آخر میں روس کے سفیر زورین نائب وزیر خارجہ کے منصب پہ متعین ہو کر ماسکو تشریف لےگئے تھے ان کے جانشین کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے۔ مارچ یا اپریل ۱۹۶۳ء میں ایک روز ان کا پیغام ملا کہ وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو کا ایک پیغام پہنچانے کیلئے تشریف لانا چاہتے ہیں۔ تشریف آوری پر اپنی نوٹ بک سے پیغام کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ "تم نے سرما کے گذر جانیکے بعد کسی وقت روس آنا منظور کیا تھا۔ اب موسم اعتدال پر آرہا ہے چند ہفتوں تک ہمارے ہاں موسم خوشگوار ہو جائیگا تمہارا آنا ہمارے لئے خوشی کا موجب ہوگا اگر تم یہ اطلاع دے سکو کہ تم کب تک آنیکا ارادہ رکھتے ہو، کتنا عرصہ قیام کرنا چاہتے ہو، کہاں کہاں جانا چاہتے ہو کیا دیکھنا چاہتے ہو تو ہم اس کے مطابق انتظام کر دیں گے اور پروگرام تیار کر دیں گے۔" میں نے شکریہ ادا کیا اور گذارش کی میں جون کے مہینے میں اندازاً آٹھ دس دن کیلئے حاضر ہو سکوں گا۔ لینن گراڈ، ماسکو، سمرقند، تاشقند، دیکھنے کی خواہش ہے۔ ایک سیکرٹری میرے ساتھ ہوگا۔

ادارۂ خوراک و زراعت کی کانفرنس منعقدہ روم میں صدر اسمبلی کی حیثیت سے شرکت

انہی دنوں ڈاکٹر بی آر سین ڈائرکٹر جنرل ادارۂ خوراک و زراعت نے دنیا سے بھوک رفع کرنے کے سلسلے میں روم میں ایک کانفرنس منعقد فرمائی۔ اور مجھے بحیثیت صدر اسمبلی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ میں اس میں شرکت کیلئے روم گیا کانفرنس میں بہت سے مشاہیر شریک تھے میری نشست سرجولین ہکسلے کے پہلو میں تھی۔ میں نے کانفرنس سے ایک خطاب کے دوران میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "ایاکم والفقر یکاد الفقران یکون کفراً" بیان کی سرجولین نے بڑی حیرانی سے دریافت کیا کیا پیغمبر اسلام آج سے قریب چودہ سو سال قبل یہ ہدایت دے چکے ہیں اور ایک سفید کاغذ میرے سامنے رکھ کر ارشاد فرمایا کہ عربی کے الفاظ اور ان کا انگریزی ترجمہ یہاں لکھ دو میں نے تعمیل ارشاد کی۔

پوپ جان ۲۳ (XXIII)

کانفرنس کے دوران میں تقدس مآب پاپائے اعظم جان ۲۳ نے کانفرنس میں شرکت کرنیوالے اصحاب کو قصر واٹیکن میں شرف باریابی سے نوازا۔ ڈائرکٹر جنرل سین نے سپاسنامہ پڑھا۔ پاپائے اعظم نے اپنا جواب انگریزی میں دیا پھر اپنی نشست چھوڑ کر مندوبین کی پہلی صف کے ساتھ مصافحہ کیا اور قریب دس پندرہ منٹ تک مختلف اصحاب کے ساتھ بے تکلف گفتگو فرماتے رہے۔ وہ نہایت سادہ طبع منکسر مزاج تھے۔ دو تین بار رخصت کے الفاظ کہہ کر دروازے کی طرف قدم اٹھایا اور پھر لوٹ کر بات چیت شروع کر دی گویا جلد رخصت کر دینا انکی طبع پر گراں ہے۔ چند سال قبل جب ان کا انتخاب بطور پاپائے اعظم ہوا تھا تو بعض حلقوں کی طرف سے اس تاثر کا اظہار کیا گیا تھا کہ ان کے انتخاب کا مقصد یہ ہے کہ تھوڑے عرصے کیلئے کلیسا کی قیادت ایک عمر رسیدہ شخصیت کے سپرد کر دیجائے اور وہ اپنا عرصۂ قیادت خاموشی سے بسر کرے۔ ان کے بعد یہ سرعت کے ساتھ بڑھتی ہوئی ذمہ داری کسی مضبوط شخصیت کے سپرد کرنے پر اتفاق ہو سکے گا۔ اس وقت بھی یہی اندازہ تھا کہ ان کے بعد موجودہ پاپائے اعظم پال ششم کا انتخاب ہوگا جو اس وقت میلان کے اسقف اعظم تھے لیکن پاپائے اعظم جان ۲۳ باوجود پیرانہ سالی اور منکسر مزاجی کے بڑی مضبوط شخصیت کے مالک ثابت ہوئے۔ ان کی گشتی چٹھی امن عالم (PACEM IN TERRIS) کے موضوع پر ایک بنیادی ٹھوس اور فکر انگیز

دستاویز تسلیم کی گئی ہے اور عالم عیسائیت کے اتحاد کی غرض سے ان کا کلیسا کی مشاورتی کونسل کا طلب فرمانا ایک ایسا انقلابی اقدام تھا جس کے نتائج کا صحیح اندازہ بھی کئی سال تک نہیں کیا جاسکتا لیکن اتنا تو ابھی سے واضح ہے کہ کلیسا کی تاریخ بلکہ مذہب کی تاریخ میں یہ اقدام ایک نئے باب کی ابتداء بن چکا ہے۔ خود پاپائے اعظم کی حیثیت اور ان کے اختیارات کا مسئلہ ایک انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔

مجلسِ امن کے مستقل اراکین کا حقِ ویٹو | اقوام متحدہ کی سیاسی امور میں کمزوری کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مجلس امن کے مستقل اراکین یعنی امریکہ، روس، چین، برطانیہ اور فرانس کو ویٹو کا حق حاصل ہے یعنی مجلس امن میں کسی تجویز پر اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کسی تجویز کے مخالف رائے دے تو وہ تجویز ساقط ہو جاتی ہے۔ جب مغربی ممالک نے دیکھا کہ ویٹو کے حق کا نتیجہ عملاً یہ ہے کہ جو تجویز روس کو پسند نہ ہو وہ مجلس امن میں منظور نہیں ہو سکتی تو انہوں نے اس کا مداوا یہ تجویز کیا کہ جب کوئی تجویز اس وجہ سے مجلس امن میں ناکام رہ جائے تو وہ تجویز اسمبلی میں پیش کر کے اسمبلی سے اس کا فیصلہ طلب کیا جاسکتا ہے۔ روس کی طرف سے مجلس امن میں ویٹو کا حق ایک سو سے زائد دفعہ استعمال ہو چکا ہے اور دوسرے مستقل اراکین مجلس امن کو بہت کم اس قاعدے کی آڑ لینے کی ضرورت پڑی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو تجویز ان اراکین کو منظور نہیں ہوتی اس پر رائے شماری کے وقت یہ اراکین غیر جانبدار رہتے ہیں۔ اس صورت میں چین بھی عموماً امریکہ کا ساتھ دیتا ہے اور غیر مستقل اراکین میں سے بعض اور بھی مغربی اراکین کا ساتھ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تجویز کی تائید میں جتنی اثباتی آراء کی تعداد ضروری ہے وہ حاصل نہیں ہوتی اور تجویز اس وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ ویٹو کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آتی مغربی اراکین تو اکثر اس طریق سے ان تجاویز کو رد کرا دیتے ہیں جو انہیں پسند نہ ہوں لیکن اہم اخلاقی امور کی صورت میں روس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ صرف تین چار غیر مستقل اراکین رائے کا اظہار کرتے ہیں اسلئے کسی ناپسندیدہ تجویز کو روکنے کے لئے روس کے پاس صرف ویٹو کا ہتھیار ہی رہ جاتا ہے۔ دوسرے مجلس امن اور اسمبلی کے اختیارات میں تفاوت ہے۔ میثاق کے رُو سے اسمبلی سوائے چند مستثنیات کے ہر مسئلے پر بحث کر سکتی ہے لیکن بحث مباحثے کے بعد صرف سفارش کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے برعکس مجلس امن میثاق کے رو سے قضیہ زیر بحث کے متعلق سفارش کر سکتی ہے اور اگر قضیہ زیر بحث امن عالم کے لئے موجب خطرہ ہو تو حکم بھی دے سکتی ہے۔ اگر کوئی تجویز مجلس امن میں ویٹو کی وجہ سے ساقط ہو جائے اور معاملہ زیر بحث اسمبلی کے روبرو پیش کیا جائے تو اسمبلی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کر سکتی اور صرف سفارش کے طور پر ہی اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے۔ ایک معاملے میں اسمبلی کو مجلس امن کے مقابل پر ضرور تفوق حاصل ہے اور وہ یہ کہ اقوام متحدہ اور اس کے تمام اداروں کا بجٹ منظور کرنا اسمبلی کے اختیار میں ہے۔ جب اسمبلی کسی مسئلے کے متعلق سفارش کرے کہ سیکرٹری جنرل یوں عمل کرے یا فلاں اقدام کرے اور پھر اس عمل یا اقدام کے اخراجات بھی بجٹ میں شامل کر کے انکی منظوری دیدے تو یہ سفارش بھی عملاً بمنزلہ حکم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب یہ طریق اختیار ہونے لگا تو ایک حد تک ویٹو کی دیوار میں شگاف کر کے راستہ نکل آیا اور اس حد تک اسمبلی کے اختیارات میں عملاً اضافہ ہو گیا۔ مغربی اراکین مجلس امن کے علاوہ سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ بھی اس طریق کی تائید میں تھے شرق اوسط میں اور بعد میں کانگو میں قیام امن کی کاروائی

اسی طور پر عمل میں آئی۔ اخراجات کی منظوری اسمبلی نے دیدی۔ روس اور فرانس نے اعتراض کیا کہ ایسی کارروائی کی ہدایت صرف مجلس امن ہی دے سکتی ہے اور اسمبلی کو ایسی ہدایت دینے کا اختیار نہیں مجلس امن کی ہدایت کے بغیر جو کارروائی عمل میں لائی گئی وہ ناجائز تھی اور اس کے اخراجات بجٹ کا حصہ قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ اس عذر کی بنا پر دونوں ملکوں نے اور انکی تائید میں بعض دیگر ممالک نے ان اخراجات کا حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈاگ ہیمرشولڈ کی وفات کے بعد مسٹر اوتھانٹ کا انتخاب بطور سیکرٹری جنرل

کانگو کا قضیہ اسقدر طول پکڑ گیا کہ طے ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ڈاگ ہیمرشولڈ اس قضیئے کے مناسب حل میں بہت دلچسپی لے رہے تھے چنانچہ اسی جدوجہد میں سولھویں سالانہ اجلاس کے شروع میں ہی انہوں نے اپنی جان بھی گنوا دی ان کی جگہ مسٹر اوتھانٹ سفیر برما کا پہلے عارضی اور سال بھر بعد پوری میعاد کیلئے تقرر عمل میں آیا۔ مسٹر اوتھانٹ کانگو کی مشاورتی کمیٹی کے صدر تھے پاکستان بھی اس کمیٹی کا رکن تھا اور اس سلسلے میں آغا شاہی صاحب کو مسٹر اوتھانٹ کے ساتھ متواتر کام کرنے کا موقعہ ہوا۔ اور آغا شاہی صاحب نے ان کے حزم اور حسن تدبیر کے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کی۔ جب ڈاگ ہیمرشولڈ کی وفات کا اندوہناک حادثہ وقوع میں آیا اور اقوام متحدہ میں ان کے جانشین کے انتخاب کے متعلق مشورے شروع ہوئے تو آغا شاہی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں مسٹر اوتھانٹ کا ذکر اقوام متحدہ میں ریاستہائے متحدہ کے نمائندے گورنر ایڈلائی سٹیونسن سے کیا جائے۔ میں مسٹر اوتھانٹ سے واقف تھا اور انکے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا لیکن اقوام متحدہ میں میرے تقرر کو ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا اور مسٹر اوتھانٹ کے ساتھ میری واقفیت ابھی اتنی گہری نہیں تھی جتنی آغا شاہی کی تھی۔ چنانچہ میں نے سیکرٹری جنرل کے تقرر کے سلسلے میں ان کا ذکر گورنر سٹیونسن سے کیا تو انہوں نے دریافت کیا تمہارا اپنا اندازہ انکی قابلیت اور استعداد کے متعلق کیا ہے؟ میں نے اپنا اندازہ بیان کر دیا اور کہا کہ میں آغا شاہی صاحب کو اسلئے ساتھ لے آیا ہوں کہ انہیں مسٹر اوتھانٹ کیساتھ کانگو کی مہم میں بطور رفیق کار کے کام کرنے کا موقعہ ملا ہے اور انکی رائے ان کے متعلق نہایت اعلیٰ ہے۔ گورنر سٹیونسن نے آغا شاہی صاحب سے تفصیلاً دریافت کیں اور اس کے نتیجے میں مسٹر اوتھانٹ کا نام زیر غور آنا شروع ہوا اور آخر ان کا تقرر ہو گیا۔ اس عرصے میں میں نے مسٹر اوتھانٹ سے صرف ایک مرتبہ بات کی اور وہ بھی صرف یہ کہنے کیلئے کہ آپکے تقرر کا تو غالب امکان ہے لیکن ممکن ہے ایک فریق یا دوسرا فریق آپ سے کوئی شرائط تسلیم کرانے کی کوشش کرے لیکن کسی قسم کی شرائط قبول نہ کرنا۔ انہوں نے فرمایا مجھے اس منصب کے حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں اور میں کسی فریق کی کوئی شرائط ماننے کو تیار نہ ہوں گا۔ اس اثنا میں قیام امن کیلئے تجویز کردہ مساعی جاری رہیں اور روس اور فرانس اور بعض دیگر ممالک کا ان کے اخراجات کا حصہ ادا کرنے کا انکار بھی جاری رہا۔ یہ بقایاجات بڑھتے گئے اور وہ وقت قریب آگیا جب بعض بقایادار ممالک کے ذمے اس بقائے کی رقم ان کے بجٹ کے حصے سے دگنی ہو جاتی جس صورت میں میثاق نمبر ۱۹ کے رو سے ان کا اسمبلی میں رائے دینے کا حق معطل ہو جاتا ساتھ ہی اقوام متحدہ کو پیش آمدہ اخراجات کیلئے روپیہ مہیا کرنے کیلئے قرضے کا انتظام کرنا پڑا۔ اس سارے مسئلے پر غور کیلئے اسمبلی کا ایک خاص اجلاس طلب کیا گیا۔

وزیرِ خارجہ الجزائر محمد خمیستی کی دردناک وفات۔ اس اجلاس کے انعقاد سے قبل ایک دردناک واقعہ ظہور میں آیا جو میرے لئے نہایت اندوہناک تھا۔ ایک روز صبح صبح ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ محمد خمیستی وزیرِ خارجہ الجزائر کو مجلس آئین ساز سے نکلتے ہوئے کسی فاترالعقل نے گولی کا نشانہ بنایا پستول ان کے ماتھے پر رکھ کر چلایا گیا۔ گولی دماغ میں جاکر بیٹھ گئی۔ فاطمہ خمیستی جو خود بھی مجلس آئین ساز کی رکن تھیں ان کے ہمراہ تھیں اور یہ حادثہ ان کے دیکھتے دیکھتے ہوا۔ پہلی خبر یہی تھی کہ بیہوش ہیں۔ سانس لے رہے ہیں جسم کا نچلا حصہ فالج زدہ ہے جس میں حرکت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ تین چار دن بعد محترمہ فاطمہ کا خط ملا۔ لکھا تھا میں اندازہ کر سکتی ہوں تمہیں کسقدر قلق ہو گا۔ محمد بس سانس لے رہے ہیں باقی سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر حالت میں کچھ تبدیلی ہوئی تو اطلاع دیتی رہوں گی قریب چھ ہفتے وہ اسی حالت میں پڑے رہے اور انکی روح آستانۂ الٰہی پر فریادی رہی۔ بانہ گردد بایر آئید حبیبت فرمان شما؟ آخر اذن ملا قصد سوئے ما کن۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اے خدا بر تربتِ او بارشِ رحمت ببار ٭ داخلش کن از کمالِ فضل در بیت النعیم

انکی بے ہوشی کا عرصہ تو دعاؤں میں گذرا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے کمال فضل سے تندرستی عطا فرمائے کہ وہ ہر شئے پر قادر ہے اور اس کے لئے کوئی بات انہونی نہیں اور جب آخری خبر ملی اس وقت سے آجتک ان کے لئے جیسے دیگر احبا اعزہ اور بزرگان کیلئے دعائے مغفرت میں بفضل اللہ کبھی ناغہ نہیں ہوا گو اب یہ دعائیہ فہرست کافی لمبی ہو گئی ہے۔ اسمبلی کے اٹھارویں سالانہ اجلاس میں محترمہ فاطمہ خمیستی مراکش کے وفد کی رکن تھیں ان سے ملاقات کا موقعہ ہوتا رہا ان کی زندگی کی داستان بھی کسقدر دردناک ہے۔ پہلے میاں دو معصوم بچے چھوڑ کر جامِ شہادت نوش کر گئے دونوں بچے ابھی معصوم ہی تھے کہ دوسری شادی کے چھ ماہ کے اندر انکی آنکھوں کے سامنے یہ جانکاہ حادثہ پیش آیا اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے دل کی مرہم اور ان کا مونس و غمخوار اور وارث ہو۔ آمین۔

اقوامِ متحدہ کی اسمبلی کا خاص اجلاس اور اس کی صدارت یہ خاص اجلاس جو شروع جون ۱۹۶۳ء میں طلب کیا گیا اسمبلی کا چوتھا خاص اجلاس تھا۔ اسکی صدارت بھی میرے سپرد ہوئی۔ پہلے ہی اجلاس میں وہ مسئلہ جس پر غور کیلئے خاص اجلاس طلب کیا گیا تھا اسمبلی کی پانچویں یعنی مالی اور انتظامی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔

U.S.S.R کا سفر حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ نے میری درخواست پر سلمان علی صاحب مدیر اوّل پاکستانی سفارت خانہ ہیگ کو میرے ساتھ روس جانے کی اجازت دیدی۔ سلمان علی صاحب کچھ عرصہ ماسکو میں متعین رہ چکے تھے اور وہاں کے حالات سے واقف تھے اور کسی حد تک روسی زبان بھی جانتے تھے۔ ہماری طبائع میں بھی ربط تھا۔ ان کی رفاقت میرے لئے بہت سہولت اور آرام کا باعث ہوئی۔ فجزاہ اللہ خیراً۔

لینن گراڈ سابق پیٹرزبرگ ہم پہلے لینن گراڈ گئے یہاں دو رات قیام رہا گو سیر کیلئے ایک دن ہی میسر آیا میں نے عمداً ایسا ہی تجویز کیا تھا۔ کیونکہ یہاں کوئی سرکاری تقریب یا ملاقات نہیں تھی۔ اور سارا دن سیاحت کیلئے میسر تھا۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں عین پچاس سال قبل تین چار دن اس شہر میں گذار چکا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں جرمن افواج نے مہینوں

لینن گراڈ کا محاصرہ کئے رہی تھیں اور شہریوں کو بہت مشکلات کا سامنا رہا تھا۔ محاصرے کے دوران میں شہر پر شدید گولہ باری
ہوتی رہی۔ خوراک کی یہاں تک قلت ہو گئی تھی کہ آخری چوہا بھی کھایا جا چکا تھا لیکن محصورین کی ہمت اور استقامت میں کوئی کمی
نہ آئی۔ لینن گراڈ کے شہری اپنے شہر پر بجا فخر کرتے ہیں۔ جنگ کے بعد شہر کی نو تعمیر اور مرمت اس طور پر کی گئی ہے کہ شہر پہلے
سے بڑھ کر خوشنما نظر آتا ہے۔ لینن گراڈ کے رہنے والے ہر لحاظ سے اپنے شہر کو ماسکو پر فوقیت دیتے ہیں اور ماسکو اور ماسکو
کے رہنے والوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جو نوجوان خاتون محکمہ زائرین کی طرف سے ہماری رہنمائی کیلئے مقرر کی گئی تھیں
انہیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ہم نے پروگرام میں ماسکو کیلئے تو چار دن رکھے ہوئے ہیں اور لینن گراڈ کیلئے صرف ایک دن
میں نے یہ کہہ کر کچھ ان کی تسلی کرنا چاہی کہ میں پچاس سال قبل ان کے شہر میں چار دن گذار چکا ہوں۔ اور اب پھر پہلے لینن گراڈ
آیا ہوں۔ لیکن ان کا شکوہ قائم رہا۔

HERMITAGE کا عجائب گھر اور شاہی جواہرات وغیرہ دیکھنے کے بعد ہم دریا پار گئے اور لینن گراڈ کی مسجد کو اندر
سے دیکھا۔ پچاس سال قبل جب میں پیٹرز برگ آیا تھا تو مسجد کی عمارت مکمل ہو چکی تھی لیکن اس وقت تک مسجد کا افتتاح نہیں
ہوا تھا۔ مسجد کے امام صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی وہ اپنے مکان میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۳ء میں دیکھے ہوئے
مقامات کو ۱۹۶۳ء میں پہلے سے بہتر حالت میں پایا۔ ایک نیا مقام جو ہم نے دیکھا وہ لینن گراڈ سے باہر خلیج فنلینڈ کے ساحل کے قریب
ایک بہت بڑا کھیلوں کا میدان ہے اس کی متعلقہ عمارتیں اور باغیچے وغیرہ بہت خوشنما ہیں۔ پرانے دیکھے ہوئے مقامات میں سے ہم
پیٹرھوف کا محل نہ دیکھ سکے جو شہر سے چند میل باہر ہے اور وہاں تک جانے کیلئے وقت نہ تھا۔ نکولا و اسلوچ ڈیگلنگ تاجر جواہرات
جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں میری اور میرے رفیق سردار محمد اکبر صاحب کی کھانے کی دعوت کی تھی۔ اور کھانے کے بعد ہمیں نیوا کے جزائر کی سیر کو لے گئے
تھے کی یاد میں میں ان کے فلیٹ کی عمارت کو ایک نظر دیکھ آیا۔

ماسکو | ماسکو میں ہم چار دن ٹھہرے۔ یہاں کے پروگرام سے ہم نے ایک فیکٹری کا معائنہ ترک کر کے اس کی بجائے مشرقی ثقافتی
ادارے میں جانے کا انتظام کیا۔ اس ادارے کے ایک ڈائریکٹر پروفیسر غفوروف پاکستان آ چکے ہیں۔ وہ خود اور انکے رفقاء بڑی تواضع سے
پیش آئے۔ چند کتب اور دو البم ایرانی، مغلئی اور چینی MINIATURES کے ہمیں عطا فرمائے۔ جامع ماسکو میں بھی ہمارا وقت
بہت دلچسپی میں گذرا۔ جامعہ کی عمارت نہایت عالیشان ہے۔ سائنس کا شعبہ خصوصیت سے ہماری توجہ کا جاذب ہوا۔ طلباء کی اقامت
گاہ دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ایک طالب العلم یا دو طالب العلموں کے ہر چھوٹے سے کمرے کیساتھ ہی غسل خانے اور بیت الخلا کا انتظام تھا
دارالاقامہ میں کمرے کی فیس اور کھانے کے اخراجات بہت مناسب تھے۔ غیر ملکی طلباء کی خاصی تعداد تھی۔ درسگاہوں اور دارالاقامہ
میں صفائی کا معیار اعلیٰ تھا۔ وائس چانسلر نے جامعہ کا تمغہ ازراہ نوازش عطا فرمایا۔ تجارتی اور صنعتی نمائش گاہ بھی ہمارے لئے بہت
دلچسپی کا موجب ہوئی۔ ماسکو کی زمین دوز ریل کا ہر سٹیشن گویا کسی نہ کسی صوبے کا ثقافتی عجائب گھر ہے۔ سیڑھیاں اور پلیٹ فارم
حد درجہ صاف تھے۔ مسافر پوری احتیاط رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ردی کا ٹکڑا یا تمباکو کی راکھ گرنے نہ پائے۔ گاڑیاں بھی صاف

ستھری تھیں ہمیں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ماسکو کی زمین دوز ریل میں سفر کرنا مسافروں کیلئے ایک ثقافتی اور تربیتی تجربہ ہے۔ ہر سٹیشن کی ڈیوڑھی میں ایک چوکھٹ کے اندر زمین دوز ریل کے پورے نظام کا نقشہ لگا ہوا ہے۔ جو مسافر اپنی منزل مقصود کا رستہ معلوم کرنا چاہے وہ اپنے مقصود اسٹیشن کے نام کا بٹن دبا دے۔ بٹن کے دبتے ہی نقشے پر ایک لائن روشن ہو جاتی ہے۔ جس سے اس اسٹیشن سے لیکر مسافر کے مقصود اسٹیشن کا رستہ واضح ہو جاتا ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ گاڑی کون کونسے اسٹیشنوں پر کھڑی ہو گی اور کس اسٹیشن پر اسے گاڑی تبدیل کرنا ہو گی۔

مزدوروں کا رہائشی قصبہ | ہم نے مزدوروں کا ایک رہائشی قصبہ بھی دیکھا۔ پہلے تو قصبے کے دفتر میں قصبے کا ایک چھوٹا سا نمونہ ملاحظہ کیا۔ ایک مقام کا نام موٹر خانہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اس موٹر خانے سے موٹریں اور بسیں مطابق ضرورت کرائے پر مل جاتی ہیں۔ قصبے کے مطعم میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ مطعم میں صفائی کا پورا انتظام تھا۔ کھانا عمدہ اور مرغوب تھا۔ اور ہر شے کی قیمت بہت واجبی تھی۔ رہائش کیلئے فلیٹ تھے جو صاف ستھرے ہوادار اور پر آسائش تھے۔ ہر فلیٹ میں دو یا تین سونے کے کمرے۔ غسل خانہ، مطبخ وغیرہ بجلی کی روشنی گرم اور سرد پانی کا انتظام تھا۔ ان دنوں ماسکو میں پاکستانی سفیر میاں ارشد حسین صاحب تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کے عرصہ قیام میں انہیں یہاں کے عام معیار زندگی میں کوئی فرق محسوس ہوا ہے؟ انہوں نے فرمایا بہت فرق ہوا ہے۔ تین سال کے عرصہ میں لباس، خوراک اور رہائش کا معیار متواتر اونچا ہوتا گیا ہے۔ ہماری رہائش ماسکو کے ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ سلمان علی صاحب ہر روز یہ احتیاط کرتے کہ ناشتے کے وقت دوپہر کے کھانے کے متعلق ہدایت دیدیتے اور دوپہر کے کھانیکے وقت شام کے کھانیکے متعلق اس کے نتیجے میں ہمیں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی۔ ہوٹل میں کھانے کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ پیشتر اطلاع دینے کے نتیجے میں کھانا عین وقت پر اور ہدایت کے مطابق تیار ملتا تھا۔ ہوٹل میں ہر وقت مہمانوں کی کثرت اور متواتر آمد و رفت کی وجہ سے چہل پہل رہتی تھی۔ ہوٹل کی وسیع ڈیوڑھی تو ایک بڑا ریلوے جنکشن معلوم ہوتی تھی۔ رہائش کے کمرے بہت آرام دہ تھے اور تمام ضروری سامانوں اور سہولتوں سے آراستہ تھے۔ کریملن کی اکثر عمارتیں پرانی وضع کی ہیں۔ قومی تھیٹر کی عمارت بالکل نئی طرز کی نہایت فراخ اور بہت عالیشان ہے۔ کریملن کی تمام عمارتوں میں سے وہ حصہ میری خاص دلچسپی کا موجب ہوا جو لینن کی رہائش گاہ تھا تین چار نہایت مختصر کمرے تھے جن کا سامان بالکل سادہ تھا اور جن میں کوئی شے بلا ضرورت نہیں تھی ان میں محض زینت یا زیبائش کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ آرام کے عام سامان بھی مفقود تھے۔ ماسکو سے ۳۰-۴۰ میل باہر بھی ایک بنگلہ ان کی رہائش گاہ تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دو تین سال جب انکی صحت کمزور ہو چکی تھی انہوں نے وہاں گذارے۔ ہم اسے بھی دیکھنے گئے۔ بنگلے کے گرد باغ تھا۔ جب موسم اعتدال پر ہوتا تو لینن اپنی فراغت کے اوقات کا اکثر حصہ باغ میں گذارتے۔ اس بنگلے کا سامان کریملن کے کمروں کے سامان کی نسبت کسی قدر زیادہ آرام دہ تھا لیکن یہاں بھی سادگی غالب تھی۔ دونوں مقامات پر انکی طرز زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ میل جول کے طور طریق جو معلوم ہوئے ان سے طبیعت پر یہی اثر تھا کہ لینن کے دل میں عامۃ الناس کے لئے گہری ہمدردی کا جذبہ تھا۔ تمام اشتراکی قائدین میں سے ان کا نام ابھی تک نہ صرف عزت و احترام بلکہ محبت سے لیا جاتا ہے۔

وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو کی طرف سے دعوتِ طعام

وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو نے ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ جس میں میاں ارشد حسین صاحب بھی موجود تھے۔ فہرست طعام اردو میں تھی۔ گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی۔ ترجمانی کی ضرورت نہ پڑی۔ مہمانوں میں نائب وزیر خارجہ سابق سفیر زورین بھی شامل تھے ہمارے ماسکو کے قیام کے دوران میں مسٹر زورین خصوصیت سے میرے ساتھ شفقت اور تواضع کا سلوک کرتے رہے۔

سفیر ارشد حسین کی طرف سے وزیر خارجہ کی دعوت طعام

میاں ارشد حسین صاحب نے فرمایا کہ انکی طرف سے وزیر خارجہ اور ان کے عہدیداروں کو دعوت دینی مناسب ہے چنانچہ انہیں سفارتخانے میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی گئی۔ میاں صاحب نے بتایا کہ یہاں کے دستور کے مطابق عمائدین حکومت دعوت نامے کا جواب دعوت کے دن دیتے ہیں کہ وہ دعوت میں آسکیں گے یا نہیں دعوت کے دن صبح صبح اطلاع ملتی ہے کہ فلاں مہمان آسکیں گے اور فلاں نہیں آسکیں گے۔ میزبان کو پوری تیاری کرنا پڑتی ہے بعض دفعہ آخری دن اطلاع ملتی ہے کہ مہمانوں میں سے کوئی بھی نہیں آسکے گا۔ میاں صاحب کی دعوت کے دن صبح اطلاع ملی کہ وزیر خارجہ اور باقی سب مہمان کھانے پر آئیں گے۔ البتہ وزیر خارجہ کھانے کے بعد کسی اور تقریب میں جانیکے لئے جلد رخصت طلب کریں گے۔ کھانے پر گفتگو بالکل آزادانہ رہی۔ وزیر خارجہ کے رخصت ہونے کے بعد باقی مہمان قریب نصف گھنٹہ تک ٹھہرے۔

مسٹر خروشیف سے ملاقات

جب ارشد حسین صاحب سلمان علی صاحب اور میں مسٹر خروشیف کی ملاقات کیلئے کرملن جانیکے لئے روانہ ہوئے تو میں نے میاں صاحب سے دریافت کیا کہ اندازاً کتنا وقت ملاقات رہے گی تاکہ میں اس اندازے کے مطابق گفتگو ختم کرنیکے لئے تیار رہوں اور گفتگو کو طول دیکر مسٹر خروشیف کیلئے بار خاطر نہ ہوں۔ میاں صاحب نے فرمایا میری ملاقات ان کے ساتھ اب تک تو مختلف تقریبوں کے دوران میں ہوتی رہی ہے۔ کرملن میں ملاقات کیلئے جانے کا تو میرے لئے پہلا موقعہ ہے۔ اندازے سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نصف گھنٹہ مناسب ہوگا پچیس منٹ کی گفتگو کے بعد رخصت طلب کر لینا۔ میرا مسٹر خروشیف سے ملاقات کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس سے پہلے کبھی انہیں دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے پر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھے اور ہم تینوں سے مصافحہ کیا۔ بعد میں جو فوٹو ہمیں بھیجے گئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصافحہ کرتے وقت ہم دونوں کے چہرے بڑے سنجیدہ تھے۔ میں انکی خدمت میں محض اس احساس کے تحت حاضر ہوا تھا کہ میں ان کا مہمان تھا اور میرا فرض تھا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کروں۔ کسی خاص موضوع پر گفتگو کا ارادہ نہیں تھا لیکن کمرے میں پہنچتے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا جس کے نتیجے میں گفتگو کی ابتداء اس طور پر ہوئی۔

ظفراللہ۔ جناب صدر وزارت آج دنیا میں دو ہی شخص ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ امن عالم کو اپنی مٹھی میں تھامے ہوئے ہیں ان دو میں ایک آپ ہیں۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ امن عالم کے برقرار رکھنے کیلئے آپ کیا کر رہے ہیں؟

مسٹر خروشیف۔ اس وقت امن عالم کیلئے سب سے مشکل اور پیچیدہ مسئلہ مشرقی جرمنی کا ہے اگر وہ مناسب طریق پر سلجھایا جاسکے تو امن عالم کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ ہم اسے مناسب اور معقول طریق پر سلجھانے کیلئے آمادہ ہیں لیکن

افسوس ہے کہ فریق ثانی اسے حل کرنے پر آمادہ نہیں ۔

ظفراللہ ۔ اگر اہم اور مشکل مسائل کے حل کرنے میں بظاہر ٹھوس رکاوٹیں حائل ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ نسبتاً آسان مسائل جن پر اتفاق کا امکان نظر آتا ہو کے حل کرنے کی طرف توجہ دی جائے ۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آپس میں اعتماد اور اعتبار بڑھے گا اور زیادہ مشکل مسائل پر معنی خیز تبادلہ خیالات ہو سکے گا ۔ مثلاً میرا اندازہ ہے کہ NUCLEAR TESTS کی حد بندی کے متعلق فیصلہ کرنے کیلئے فریقین اسقدر قریب آچکے ہیں کہ تھوڑی سی مزید کوشش سے اتفاق کی صورت پیدا ہونیکی امید کی جاسکتی ہے ۔

مسٹر خروشیف مشرقی جرمنی کے مسئلے کی اہمیت پر زور دیتے رہے ۔ میں نے گذارش کی کہ ایسے اہم مسائل کے حل میں جو بڑی طاقتوں میں موجب افتراق ہیں پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ مصالحت کرانے کیلئے کوئی اقدام کر سکے البتہ اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کسی معقول تجویز کی تائید میں اپنی آواز بلند کرے ۔ خروشیف صاحب نے فرمایا پاکستان چھوٹا ملک نہیں ۔ دس کروڑ انسان ہیں پانچ کروڑ عمال ہیں ۔ چھوٹا ملک کیسے ؟ میں نے عرض کیا بیشک دس کروڑ انسان ہیں اور پانچ کروڑ نہ سہی لیکن ڈھائی کروڑ تو عمال ضرور ہیں مگر تربیت فن اور ادارہ ؟ اس سوال و جواب سے گفتگو کا رخ پاکستان کی طرف پھر گیا ۔ خلاصہ مسٹر خروشیف کی گفتگو کا یہ تھا ۔ پاکستان کے وزیر صنعت (ذوالفقار علی بھٹو صاحب) یہاں آئے ۔ انہوں نے جو کچھ چاہا دیکھا ۔ جو معلومات وہ چاہتے تھے انہوں نے حاصل کیں ۔ جن امور کے متعلق انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا ہم نے صفائی اور وضاحت سے انہیں جو کچھ وہ چاہتے تھے بتا دیا ۔ ہمارا اندازہ تھا کہ بعض منصوبوں کے متعلق ممکن ہے وہ ہمارے تعاون اور ہماری مدد کے خواہشمند ہوں ۔ ہم نے کسی حد تک یہ اظہار بھی کر دیا تھا کہ ہم کس قسم کی مدد کس حد تک کر سکتے ہیں لیکن جب وہ واپس چلے گئے تو پاکستان کی طرف سے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہ ہوا ۔ اور سب کچھ یخ بستہ ہو کر رہ گیا (اس مرحلے پر انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی نگہ سے مجھ پر اپنا یہ تاثر ظاہر کرنا چاہا کہ ممکن ہے پاکستان کی حکومت تو ہمارے ساتھ روابط بڑھانے کی خواہشمند ہو لیکن دوسری طرف سے اس قسم کے اقدام کو پسندیدگی کی نگہ سے نہ دیکھا گیا ہو اور اس لئے بات وہیں کی وہیں رہ گئی) میں نے گذارش کی کہ مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے تو کچھ کہنے کی کوئی ہدایت نہیں لیکن میرا تاثر یہ نہیں کہ کوئی صورت یخ بستگی کی ہے ۔ انہوں نے اپنے تاثر کا تکرار کیا تو میں نے عرض کیا کہ اگر واقعہ میں یخ بستگی ہے تو جہاں تک میرا مقدور ہے میں اسے پگھلانے کی کوشش کروں گا ۔ اس پر وہ پھر مسکرائے اور فرمایا مجھے تمہاری بات پر پورا اعتبار ہے اور تمہاری کے لفظ پر پورا زور دیا ۔ اس وقت تک گفتگو اور لہجے میں بھی کچھ آزادی اور گرمجوشی پیدا ہو گئی تھی ۔ جن تصویروں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ان میں سے دوسری تصویر میں بھی ہم دونوں کے چہرے بہت سنجیدہ نظر آتے ہیں ۔ لیکن تیسری تصویر میں دونوں چہرے بشاش اور مسکراتے نظر آتے ہیں ۔ جب نیویارک واپسی پر میرے رفقائے کار نے دریافت کیا مسٹر خروشیف کے ساتھ ملاقات کیسی رہی تو میں نے تصویریں ان کے سامنے رکھ دیں اور کہا ان سے اندازہ کر لیجئے ۔

جب اس گفتگو میں قریباً نصف گھنٹہ گذر گیا تو میں اس کوشش میں رہا کہ مناسب موقعہ آنے پر شکریئے کے ساتھ رخصت طلب کروں لیکن اب گفتگو کی عنان مسٹر خروشیف کے ہاتھ میں تھی اور جب رخصت طلب کرنیکا موقعہ ملا تو ملاقات ۵۵ منٹ تک طول پکڑ چکی تھی ۔ ایک گھنٹے سے کچھ کم عرصے کی ملاقات کے نتیجے میں ایک ایسی شخصیت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا ممکن نہیں ۔ البتہ میرا

اس وقت کا یہ تاثر تھا کہ پرائیوٹ ملاقات میں خروشیف صاحب صفائی سے بات کرتے تھے اور محض پروپیگنڈا کی خاطر کچھ نہیں فرماتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو رپورٹ انہیں میرے متعلق پہنچائی گئی ہو اس کے نتیجے میں انہوں نے میرے ساتھ صفائی سے بات کی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاشقند ازبکستان | ماسکو سے ہم تاشقند گئے جو ازبکستان کا دارالحکومت ہے۔ ہمارا سفر ائیر فلوٹ کے طیارے سے تھا چونکہ روس کا اپنا علاقہ اور اس کے زیر اقتدار ملحقہ علاقے مشرقی برلن سے لیکر ولاڈی واسٹاک تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان علاقوں کے درمیان سفر کرنیکیلئے طویل مسافت طے کرنی پڑتی ہے لہذا سفر زیادہ تر ہوائی جہازوں سے ہوتا ہے۔ ہوائی جہازوں کے کرائے اندرونی سفر کیلئے بین الاقوامی کرایہ کی نسبت بہت سستے ہیں روسی ہوائی جہازوں کی رفتار تو بہت تیز ہے لیکن آرام اور صفائی کا معیار اس درجے کا نہیں جو غیر اشتراکی ہوائی کمپنیوں میں رائج ہو چکا ہے۔ لیکن مقابلۃً کرایہ اتنا سستا ہے کہ ملکی مسافر آرام میں خفیف سا تفاوت غالباً محسوس بھی نہیں کرتے۔

روس کی حکومت کی تشکیل عرفاً وفاقی طریق پر ہے ملک کا موجودہ سرکاری نام UNION OF SOCIALIST SOVIET REPUBLICS ہے یعنی متحدہ اشتراکی جمہوریتیں ۔ ان جمہوریتوں کی تعداد سولہ ہے۔ یہ جمہوریتیں اپنے اندرونی نظام کے لحاظ سے آزاد شمار کی جاتی ہیں ان میں سے دو یعنی یوکرین اور بائیلو روس تو اقوام متحدہ کی رکن بھی ہیں۔ ازبکستان کی جمہوریت کا علاقہ بہت وسیع ہے مشرق میں فرغانہ وسط میں تاشقند مغرب میں سمرقند اور بخارا کے علاقے سب اس میں شامل ہیں وسطی ایشیا کی چھ جمہوریتیں روسی متحدہ جمہوریتوں میں شامل ہیں ان سب میں بڑی ازبکستان ہے ان چھ جمہوریتوں کی زبانوں میں بہت حد تک اشتراک ہے انکی بنیاد ترکی ہے اور ان میں عربی فارسی ترکی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ تاجیکی زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۹۲۵ء تک ایک اردو جاننے والے کیلئے تاجیکی یا ازبکی زبان کا سیکھنا نہایت آسان تھا کیونکہ اس وقت تک ان زبانوں کا رسم الخط فارسی تھا۔ ۱۹۲۵ء کے قریب اس کی بجائے لاطینی رسم الخط کو رواج دیا گیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران میں لاطینی رسم الخط کو ترک کر کے روسی رسم الخط کو رائج کیا گیا جس کے نتیجے میں ان جمہوریتوں کی زبانوں اور فارسی اور اردو کے درمیان ایک روک پیدا ہو گئی گو میرے تاشقند اور سمرقند کے سفر کے وقت بھی اکثر تعلیم یافتہ ازبکی اشخاص فارسی زبان میں کچھ نہ کچھ مہارت ضرور رکھتے تھے۔ ان جمہوریتوں کی اصل آبادی مسلمان ہے نام بھی اسلامی ہیں گو آخری حصے کو روسی شکل دیدی جاتی ہے۔ مثلاً مفتی اعظم تاشقند کا اسم گرامی ضیاء الدین ولد بابا خان ہے لیکن بولنے اور لکھنے میں ضیاء الدین بابا خانوف بولا اور لکھا جاتا ہے۔ آپ تاشقند کے مفتی اعظم بھی ہیں اور وسطی ایشیاء کے اسلامی ثقافتی بورڈ کے صدر بھی ان سے پہلے ان کے والد مرحوم مفتی تاشقند تھے اور توقع کی جاتی ہے کہ ان کے بعد ان کے فرزند اکبر ان کے جانشین ہوں گے۔ تاشقند میں بھی ہم حکومت ہی کے مہمان تھے اور ہمارے میزبان ازبکستان کے وزیر خارجہ جناب عظیموف تھے۔ ہمارے تاشقند پہنچنے پر انہوں نے مطار پر ہمارا استقبال کیا ہمارا قیام تاشقند ہوٹل میں تھا شام کے کھانے کے وقت معلوم ہوا کہ ہوٹل کے مطعم میں مروجہ کھانے تیار ملیں گے لیکن اگر ہم ہوٹل کی چھت پر کھلی ہوا میں بیٹھنا پسند کریں

تو وہاں نقطہ نان کباب اور چپری میسر ہوں گے۔ ہم نے طبعاً چھت کی کھلی ہوا اور نان کباب کو بصد شوق ترجیح دی۔ تجربہ سے ہمارا انتخاب نہایت درست ثابت ہوا۔ دوسری شام ہم نے چار نوجوان پاکستانی ڈاکٹروں کو جو تاشقند میں مزید فنی تعلیم کے لئے آئے ہوئے تھے کھانے کی دعوت دی اور ان کے ساتھ ہوٹل کی چھت پر ہی کھانا کھایا۔ ان نوجوان ہم وطنوں میں سے دو مغربی پاکستان سے تھے اور دو مشرقی پاکستان سے۔ انہیں تاشقند آئے ابھی تین چار ماہ ہی گذرے تھے اور ابھی زبان سیکھ رہے تھے گو اس میں خاصی مہارت حاصل کر چکے تھے انہوں نے بتایا کہ معاشرتی لحاظ سے تو ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنے وطن ہی میں ہیں۔ میل جول رہنے سہنے، کھانے پینے میں ہمیں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں کے لوگ بہت خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ ہمیں اپنے گھروں میں بلاتے ہیں اور ہر طرح خاطر مدارات سے پیش آتے ہیں اب تو زبان کی روک بھی رفع ہو چکی ہے۔ ہم یہاں ہر طرح سے خوش ہیں۔
ایک پروٹوکول کے روسی افسر ماسکو سے ہمارے ساتھ آئے تھے وہ پاکستان میں کچھ عرصہ رہ چکے تھے اور اردو جانتے تھے۔ ازبکی وزارت خارجہ کے ایک پروٹوکول افسر تاشقند میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ نوجوان مسلمان تھے اور جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہمارے ساتھ آزادی سے بات چیت کرتے تھے گو میں ان کے ساتھ کسی ایسے موضوع پر بات چیت کرنے سے پرہیز کرتا تھا جو ان کے لئے پریشانی کا موجب ہو سکے۔ تاشقند اور سمرقند کے حالات کا اندازہ ہم نے اپنی دید اور تجربے سے ہی کیا۔ میل جول میں ہم نے بھی وہی تاثر لیا جو ہمارے پاکستانی ڈاکٹروں نے لیا تھا۔ تاشقند اور سمرقند کی عمارتیں اور آبادی وہی منظر پیش کرتی ہیں جو وسط ایشیا کے اکثر شہر پیش کرتے ہیں۔ مساجد اور مقابر کی وضع قطع بھی وہی تھی۔ سڑکیں اور بازار بھی ویسے ہی تھے۔ لباس عموماً یورپین طرز پر تھا۔ ملتے اور رخصت ہوتے وقت السلام علیکم و علیکم السلام کا عام رواج تھا۔

مفتی ضیاء الدین بابا خانوف | ہم نے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کی۔ انہوں نے کمال نوازش سے ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ ہم نے عذر کیا کہ ہمارے دوپہر کے کھانے کا انتظام تاشقند سے تیس میل باہر ایک کولخوز میں ہے اگر مفتی صاحب اجازت دیں تو ہم تین بجے بعد دوپہر کولخوز سے واپسی پر ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ مفتی صاحب کی اجازت کے مطابق ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ مفتی صاحب ان کے نائب مخدوم اسمٰعیلوف صاحب اور انکے رفقاء نے کمال تواضع سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ کچھ عرصہ تو تبادلہ خیالات اور معلومات کے حاصل کرنے میں صرف ہوا۔ پھر مفتی صاحب اور مخدوم اسمٰعیلوف صاحب نے ہمیں جامع مسجد لائبریری۔ اور مختلف ادارے دکھائے۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ اگرچہ کسی مذہب کو بھی کھلے بندوں دینی تبلیغی سرگرمیوں کی اجازت نہیں لیکن اسلامی مدارس میں دینی درس و تدریس پر کوئی پابندی نہیں۔ عبادات پر بھی خواہ مساجد میں ہوں خواہ گھروں میں کوئی پابندی نہیں۔ البتہ آبادی کا نوجوان حصہ عبادات میں شغف نہیں رکھتا جو معمر طبقے میں اب تک ہے۔ رسم الخط میں تبدیلی کی وجہ سے عربی میں قرآن کریم کی تلاوت بھی اب وسیع پیمانے پر نہیں ہوتی۔ لیکن عربی رسم الخط میں قرآن کریم ملتا ہے اور طباعت اور اشاعت پر کوئی پابندی نہیں مفتی صاحب نے لائبریری میں قرآن کریم کے تین نسخے جو نہایت خوبصورت عربی رسم الخط میں چھپے ہوئے تھے ہمیں دکھلائے جو پچھلے چند سالوں میں مصر میں طبع کروائے گئے تھے۔ وسط ایشیا کے روسی علاقوں سے دینی

اور فقہی مسائل پر استفسارات متواتر مفتی صاحب کی خدمت میں اور ان کے ادارے میں پہنچتے رہتے ہیں جن کے جوابات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ نکاح اور طلاق وغیرہ کا سب انتظام اور انصرام ان کے ادارے کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ آخر میں مفتی صاحب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا چائے نوش کر لیں۔ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ میز ہر قسم کی لذیذ طیبات سے لدی ہوئی ہے۔ پلاؤ، قورمہ کباب، نان، مختلف انواع کے حلوہ جات، چائے، قہوہ سب تازہ تیار شدہ موجود تھے۔ مہمان کوئی ایک درجن کے قریب تھے۔ کھانا چالیس افراد کو کفایت کر سکتا تھا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ چونکہ ہم دوپہر کو حاضر نہیں ہو سکتے تھے مفتی صاحب نے فتویٰ جاری فرمایا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ساڑھے چار بجے سہ پہر ہوگا میرے لئے بڑی مشکل تھی کیونکہ کولخوز میں بھی کھانا لذیذ تھا اور میرے لئے پرہیز بھی لازم تھا۔ لیکن مفتی صاحب کی دلشکنی بھی مجھے گوارا نہ تھی پرہیز کو خیر باد کہتے ہی بنی۔ میز پر سے جس شے کا بھی انتخاب کیا اسے حد درجہ لذیذ پایا۔ کھانے کے دوران میں گفتگو میں بھی تنوع پیدا ہو گیا۔ مفتی صاحب کی ایک بات سے مجھے کچھ حیرانی ہوئی۔ انہوں نے فرمایا قریب دو سال ہوئے جب میرا بڑا فرزند شمس الدین یہاں سکول کے آخری درجے میں تھا تو میں نے ارادہ کیا کہ اس کے سکول سے فارغ ہونے کے بعد اسے دینی تعلیم کی تکمیل کیلئے پاکستان بھیج دوں چنانچہ اس غرض کیلئے ہم نے یہاں سے اپنے سفارتخانے کی معرفت ایک خط حکومت پاکستان کو بھیجا لیکن اس کا کوئی جواب ہمیں آج تک نہیں ملا۔ چنانچہ جب شمس الدین نے یہاں اسکول کی تعلیم ختم کر لی تو میں نے اسے الازہر بھیج دیا وہاں پہلا سال ختم کر کے اب وہ تعطیلات میں گھر آیا ہے اسے تمہاری ملاقات کا بہت اشتیاق ہے۔ مفتی صاحب کے طلب فرمانے پر شمس الدین ضیاء الدینوف ساتھ کے مکان سے تشریف لے آئے بڑے تپاک سے ملے اور ہمارے ساتھ تصویر اتروانے کی خواہش ظاہر کی جسے فوراً پورا کر دیا گیا۔ اسوقت تو مجھے خیال ہوا کہ ممکن ہے مفتی صاحب کا والانامہ پاکستان کی حکومت تک پہنچا ہی نہ ہو۔ لیکن نیویارک واپسی کے کچھ عرصہ بعد میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کا والانامہ تو وزارت خارجہ میں پہنچ گیا تھا لیکن وزارت کی طرف سے اس کا کوئی جواب بھیجنا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا تھا واللہ اعلم بالصواب۔ مفتی صاحب اور مخدوم اسمٰعیلوف نہایت سنجیدہ طبع، ملنسار، متواضع، عالم اور بزرگ تھے۔ مخدوم اسمٰعیلوف نے فرمایا کہ وہ ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ پاکستان بھی گئے تھے۔ ہم وسط ایشیا کے اسلامی ثقافتی مرکز سے جناب صدر اور نائب صدر کے نہایت شکرگذار اور ممنون واپس لوٹے۔

تاشقند کے قریب ایک کولخوز | مجھے کولخوز دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ جس کولخوز میں ہمیں لے جانیکا انتظام کیا گیا تھا وہ تاشقند سے قریب تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کولخوز کی نائب صدر صاحبہ نے کولخوز کے دفتر میں ہمارا استقبال کیا۔ ان کے میاں تاشقند میں مدرس تھے۔ محترمہ نہایت سنجیدہ مزاج خاتون تھیں اور کولخوز کی تمام سرگرمیوں کے متعلق پوری واقفیت رکھتی تھیں۔ دفتر میں ہمارے سوالوں کے جواب دینے اور ہمیں ضروری معلومات بہم پہنچانے کے بعد ہمیں مدرسہ، شفاخانہ تعاونی ادارات وغیرہ دکھانے کیلئے ہمارے ساتھ ہو لیں۔ گاؤں میں سے گذرتے ہوئے ہم نے دریافت کیا کیا ممکن ہے کہ ہم کسی رہائشی مکان کے اندر جا کر طرز رہائش کا اندازہ کر سکیں۔ انہوں نے بلا تردد فرمایا۔ بیشک۔ چنانچہ قریب ہی کے ایک مکان کے اندر ہمیں لے گئیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گاؤں کے فراخ رستوں پر ہم نے بہت کم لوگ آتے جاتے دیکھے جس سے ظاہر تھا کہ ہر کوئی کھیتوں میں اپنے کام میں مصروف ہے۔ گھر کے اندر بھی ہمیں ایک نسبتاً معمر خاتون ہی نظر آئیں

گاؤں کے رستوں میں سے کسی گھر کے اندر نظر نہیں جاتی تھی۔ دونوں طرف اونچی کچی دیواریں تھیں۔ جب ہم دروازے سے داخل ہوئے تو ہمارے عین سامنے ایک گھنا باغیچہ تھا۔ جس سے ذرا ہٹ کر سبزی کا کھیت تھا۔ رہائشی مکان ہمارے دائیں ہاتھ تھا اور بیرونی دیوار کے متصل اور متوازی بنا ہوا تھا۔ صحن وہی تھا جس میں ہم داخل ہوئے تھے۔ صحن کی دائیں جانب ہم ایک برآمدے میں داخل ہوئے جس کی تین دیواریں شیشے کی تھیں اور فرش چٹائی کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے دالان تھا۔ دالان کے بازو میں یکے بعد دیگرے کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب فرش چٹائی کے تھے۔ سب کمرے روشن اور صاف تھے۔ گھر کا سامان سادہ تھا۔ مکان میں جو خاتون تھیں ان کی زبان تو ہم جانتے نہیں تھے۔ ان کے چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ سے ہم نے اندازہ کیا کہ ہمارا بلا اطلاع آنا ان پر گراں نہیں گذرا۔ انہوں نے فوراً ایک بخارچے سے قہوہ دانی اور پرچ پیالیاں نکالیں اور قہوہ تیار کر کے پیش کیا جو ہم نے بڑے شوق اور شکریئے کے ساتھ نوش کیا۔ باغیچے کے درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔ سبزیوں کے کھیت کو ہم نے نزدیک سے نہیں دیکھا لیکن یہ ظاہر تھا کہ یہ زمین کا ٹکڑہ جو صاحب مکان کی ذاتی ملکیت شمار ہوتا تھا نہایت محنت سے کاشت کیا ہوا ہے ہم نے اندازہ کیا کہ گاؤں کے اندر باقی ایسے ٹکڑے بھی ویسی ہی محنت اور تندہی سے کاشت کئے ہوئے ہوں گے اس ٹکڑے کا ایک انچ بھی بے مصرف نہیں تھا۔ کالخوز کے دفتر کی سادہ عمارت کے سامنے بھی ایک مختصر باغیچہ ایک نہر کے کنارے پر تھا جس کا سایہ تمازت آفتاب کی وجہ سے بہت خوشگوار محسوس ہوا۔ عین نہر کے کنارے پر دوپہر کے کھانے کی میز لگائی گئی تھی۔ نہر خاصی گہری معلوم ہوتی تھی۔ اور پورے زور سے بہہ رہی تھی۔ اس کا پاٹ کوئی بیس پچیس فٹ کا ہو گا۔ محترمہ نائب صدر صاحبہ نے جو اعداد و شمار ہمیں بتائے اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اس گاؤں میں ایک اوسط کنبے کا حصہ گاؤں کی مشترکہ آمد میں پاکستانی سکے میں پندرہ سے بیس ہزار روپے سالانہ بنتا ہے۔ سکول کی تعلیم شفاخانے کی خدمات، زچگی میں ڈاکٹر، دایہ وغیرہ کے مصارف اس آمد سے علیحدہ تھے۔ کولخوز کی مشترکہ آمد میں سے ہونہار بچوں کو کالج اور دو تین کو یونیورسٹی میں بھی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ ماسکو کے پروٹوکول افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ کولخوز ازبکستان کی چند نہایت اعلیٰ اور کامیاب کولخوزوں میں شمار ہوتی ہے۔ زمین بہت زرخیز ہے اور آبپاشی کیلئے پانی بافراط میسر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جنوبی سوڈیٹوں کے علاقوں میں آبپاشی کے وسائل ابھی تک محدود ہیں گو رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسے جیسے مزید وسائل آبپاشی بروئے کار آتے جائیں گے ان علاقوں کی خوشحالی بڑھتی جائے گی۔ اگر ضرورت کے مطابق پانی میسر آجائے تو یہ تمام علاقے باغ ارم بن سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں جب اشتراکی تعاونی نظام ان علاقوں میں جاری کیا گیا تھا تو سب سامان اور سارا عملہ روس سے لایا گیا تھا لیکن اب آپ دیکھتے ہیں کہ سارے شعبوں کا انتظام ان لوگوں کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور یہ انہیں کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

تاشقند کے نواح میں ہم نے ہڈیوں کی تپ دق کے نوجوان مریضوں کا سینی ٹوریم بھی دیکھا۔ اس میں طبیب اعلیٰ ایک ازبکی خاتون تھیں جن کے تحت کئی ازبکی مرد اور عورت ڈاکٹر اور دایہ کا کام کرتے تھے۔ اس سینی ٹوریم کے بنگلے اس طور پر بنائے گئے تھے کہ ضرورت اور موسم کے مطابق ان میں ہوا، سورج کی روشنی، گرم اور سرد درجہ حرارت کا انتظام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ دیواریں سب لکڑی کے تختوں کی تھیں۔ جس نسبت دیوار کو ہٹانا ضروری ہوتا اس طرف کے تختے ضرورت کے مطابق سرکا دیئے جاتے۔ سارے بنگلے باغ کے اندر بنے ہوئے تھے۔

مریض تمام وقت تازہ ہوا اور خوشگوار ماحول میں رہتے تھے۔ ہم سوتی اور اونی کپڑوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ بھی دیکھنے گئے اس میں چودہ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اور سارا عملہ مینجنگ ڈائریکٹر سمیت ازبکی تھا۔

تاشقند کے ثقافتی ادارے کی ڈائریکٹر ایک ازبکی عالمہ خاتون تھیں۔ ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں ان کے ساتھ گھنٹہ بھر فارسی میں بہت دلچسپ گفتگو رہی اکثر وقت گفتگو کا موضوع شہنشاہ ظہیرالدین بابر اور ان کے آثارات رہے۔ شہنشاہ ظہیرالدین بابر کا مولد فرغانہ تھا اور اس لحاظ سے بھی وہ ازبکی شمار کئے جاتے ہیں۔ علاوہ جہانگیری اور جہانبانی کے کارناموں کے ادب شاعری میں بھی انکا درجہ ازبکی نگاہوں میں بہت بلند ہے۔ تزک بابری تو عرصہ سے عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن محترمہ ڈائریکٹر نے بتایا کہ ان کا پورا دیوان ازبکی میں چھپا ہوا ہے اور ان کی بہت سی غزلیں ازبکی میں آج بھی نوجوانوں کو ازبر ہیں۔ تزک بابری کا ایک نسخہ ازبکی زبان اور روسی رسم الخط میں چھپا ہوا انہوں نے مجھے عنایت بھی فرمایا۔

سمرقند | تاشقند سے ہم ایک دن کیلئے سمرقند بھی گئے صبح تاشقند سے روانہ ہو کر شام تک لوٹ آئے اسکی تاریخی یادگاروں کے باعث میں نے سنہری سمرقند کو ویسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر پایا جیسے اس کی شہرت ہے انہی یادگاروں کی زیارت کا شوق ہی مجھے کشاں کشاں ازبکستان لے گیا تھا۔ کئی وجوہ سے امیر تیمور کے مدفن پر ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے کی آرزو تھی جو بحمد للہ بر آئی۔ سنا ہوا تھا اور آنکھوں سے دیکھا کہ انکی قبر ان کی ہدایت کے مطابق ان کے استاد اور مرشد کے پائنتی ہے اور "آں مسلماناں کہ میری کردہ اند در شہنشاہی فقیری کردہ اند" کی تصدیق کرتی ہے۔ سمرقند اور سمرقند کے نواح میں باقی سب اسلامی یادگاریں مدرسے، خانقاہیں، رصد گاہیں دیدۂ عبرت نے آنسوؤں کے پردے میں سے دیکھیں اور ہر مقام پر دل پر حسرت سے درگاہِ رب العالمین میں التجائیں بلند ہوتی رہیں کہ اے قادرِ مطلق اب تو اپنے کمال فضل سے ہماری شب تیرہ کو روز روشن سے بدل اور اسلام کے سورج کو نصف النہار تک بلند فرما آمین یا ارحم الراحمین۔ سمرقند میں ہمارے میزبان وہاں کے صدر بلدیہ تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ان کے دولتکدے پر تناول کیا۔ پلاؤ، قورمہ، نان، کباب، حلوہ جات، پھل اور مشروبات یہاں بھی میسر تھے۔ کھانے سے فراغت ہونے پر صدر بلدیہ نے دریافت فرمایا۔ اب کیا پروگرام ہے؟ بہتر ہو کچھ آرام کرلیں۔ میں نے گذارش کی کہ نماز کا وقت ہے۔ اس پر میزبان نے وضو کے لئے غسل خانے کی طرف رہنمائی کی اور جب تک ہم وضو کر کے نماز کیلئے تیار ہوئے مصلے قبلہ رخ بچھا دیئے فجزاہ اللہ۔ سمرقند تجارت کی منڈی ہونے کے لحاظ سے بھی ایک بارونق شہر ہے۔ جو کچھ ہم نے بازاروں میں دیکھا اس کے علاوہ ہم نے قراقلی کی منڈی بھی دیکھی سمرقند قراقل کی تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے پھر وہی کیفیت ہوئی

عقل بازارے بدید و تاجری آغاز کرد ✦ عشق دیدہ زآنسوئے بازار او بازار نا

سمرقند کی بلدیہ آثار قدیمہ کی دیکھ بھال اور مرمت اور صفائی پر بہت روپیہ صرف کرتی ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ آثار زائرین کی انتہائی دلچسپی کا موجب ہیں اور ان کے دیکھنے کو کثرت سے زائرین سمرقند آتے ہیں۔

ازبکی وزارت خارجیہ کے پروٹوکول افسر کے ساتھ ان چند دنوں میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ انہوں نے بتایا میری نسبت

ہو چکی ہے چند ماہ بعد شادی ہو گی۔ میری بڑی خواہش ہے تم شادی میں شریک ہو سکو۔ اپنے والد محترم کے متعلق بتایا کہ اب ضعیف العمر ہیں لیکن صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت عربی رسم الخط والے مصحف سے ہی کرتے ہیں گو میں خود عربی رسم الخط نہیں جانتا میں نے رخصت ہوتے وقت قرآن کریم کا ایک نسخہ جو بہت خوبصورت عربی رسم الخط میں مصر میں چھپا تھا اور غالباً صدر بلدیہ قدس نے مجھے بطور ہدیہ عطا فرمایا تھا ان کے سپرد کیا کہ میری طرف سے اپنے والد محترم کو بطور ہدیہ پیش کر دیں۔

ماسکو واپسی | تاشقند سے واپسی پر ہمارا ارادہ ماسکو میں صرف ایک دن ٹھہرنے کا تھا۔ میں نے وزیر خارجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر انکی تواضع اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے دریافت فرمایا جو کچھ دیکھنے کی تمہیں خواہش تھی دیکھ لیا؟ میں نے کہا دیکھ لیا اور بہت دلچسپ پایا۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے سپٹنک SPUTNIK کا ایک چھوٹا سا ماڈل اپنی طرف سے مجھے بطور ذاتی یادگار کے عطا فرمایا۔

وارسا پولینڈ | دوسرے روز ہم پولینڈ کے دارالحکومت وارسا جانیوالے تھے۔ اس دن برفباری ہو رہی تھی۔ مطار پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جس جہاز پر ہمیں سفر کرنا تھا وہ ابھی وارسا سے روانہ نہیں ہو سکا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے مطار پر ہی کھایا۔ کافی انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پرواز منسوخ ہو گئی ہے لیکن پولینڈ کی حکومت نے ہمارے لئے خاص طیارہ روانہ کر دیا ہے۔ اس تاخیر کے نتیجے میں ہمارا وارسا کا قیام جو پہلے ہی مختصر تھا اور بھی مختصر ہو گیا۔ ہمیں بھی اس کا افسوس تھا لیکن وارسا پہنچنے پر وہاں کے وزیر خارجہ صاحب کو بہت پریشان پایا کیونکہ اس دن کا ہمارا پروگرام مجبوراً منسوخ کرنا پڑا تھا۔ انہیں اپنی پولینڈی کمپنی سے شکایت تھی کہ انہوں نے پرواز میں تاخیر ہو جانے کی انہیں بروقت اطلاع نہ دی ورنہ وہ فوراً خاص طیارہ بھجوا دیتے۔ ہم نے ان کے خاص طیارہ بھجوانے کا شکریہ ادا کیا لیکن اپنی ہوائی لائن سے انکی آزردگی کم نہ ہوئی۔ ہم وارسا میں ایک مزید دن قیام نہ کر سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے ہمارے پراگ کے پروگرام میں گڑبڑ ہوتی۔ جس کے نتیجے میں ہمارے پراگ کے میزبان آزردہ ہوتے۔ ہم نے وارسا میں جتنا بھی وقت ملا اس کا پورا استعمال کیا میں نے ۱۹۳۷ء کے وارسا اور ۱۹۶۳ء کے وارسا میں بہت فرق پایا۔ وارسا کا نیا ثقافتی مرکز بہت قابل دید ہے وہاں دو گھنٹے بڑی دلچسپی میں صرف ہوئے۔ ایک اس مقام پر ہی بہت کچھ اور دیکھنے کے قابل تھا لیکن ہم وقت کی تنگی کی وجہ سے مزید نہ ٹھہر سکے۔ حکومت کے ارکین اور عملے کی طرف سے ہمارے ساتھ نہایت تپاک اور تواضع کا سلوک ہوا سرکاری دعوتوں میں پاکستان کے متعلق اور ذاتی طور پر میرے متعلق نہایت اخلاص کا اظہار کیا گیا جس کے متعلق میرا احساس تھا کہ محض لفظی نہیں۔ وزیر خارجہ نے مجھے اپنی طرف سے اسلامی فقہ کی ایک تصنیف کا پرانا قلمی نسخہ دیا جس کے متعلق میں اس وقت تو صحیح اندازہ نہ کر سکا لیکن پاکستان پہنچنے پر معلوم ہوا کہ نوادر میں سے ہے۔

فجزاہ اللہ احسن الجزاء

پراگ چیکوسلواکیہ | وارسا سے ہم چیکوسلواکیہ کے دارالحکومت پراگ گئے۔ یہاں بھی ہمارے ساتھ ویسے ہی تپاک اور تواضع کا سلوک ہوا جیسے وارسا میں ہوا تھا۔ پراگ سے باہر بیس پچیس میل پر ایک تاریخی محل ہے جو ایک پہاڑی کی بلندی پر ہے۔ ہم اسے دیکھنے گئے۔ جو افسر ہماری رہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ گئے تھے ان سے اس محل کے متعلق بہت سی دلچسپ تاریخی تفاصیل

معلوم ہوئیں۔ وزیر خارجہ نے شہر سے باہر دریائے مولڈاؤ (MOLDAU) کے کنارے ایک بلند مقام پر واقع مطعم میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ یہ سارا سفر بہت دلچسپ تھا اور میں اپنے دل میں اپنے میزبانوں کے لئے ممنونیت کے جذبات لئے ہوئے واپس آیا۔ فالحمدللہ۔

زیورک میں مسجد محمود کا افتتاح | پراگ سے میں زیورک گیا۔ وہاں جماعت احمدیہ نے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اسکی ذرہ نوازی سے مجھے اس مسجد کے افتتاح کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس مسجد کا نام مسجد محمود ہے۔

اسمبلی کے اجلاس خاص کا اختتام | زیورک سے نیویارک واپس آیا۔ اس اثناء میں جو مسئلہ اسمبلی کے خاص اجلاس نے اسمبلی کی پانچویں کمیٹی کے سپرد کیا تھا اس پر کمیٹی مذکور کی رپورٹ موصول ہو گئی اور وہ اسمبلی کے اجلاس میں زیر بحث آئی جس کے بعد یہ اجلاس خاص اختتام پذیر ہوا۔

کینیڈا کی سیر | انہی ایام میں شیخ اعجاز احمد صاحب جو ان دنوں اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک و زراعت سے متعلق تھے اور اس ادارہ کی ایک کانفرنس کے سلسلہ میں واشنگٹن آئے ہوئے تھے کانفرنس کے اختتام پر تین چار ہفتوں کی چھٹی لیکر نیویارک آئے اور میرے پاس ٹھہرے۔ ان کے قیام کے دوران میں ہم تین چار روز کیلئے مونٹریال، آٹووا، ٹورانٹو اور نیاگرا کی سیر کو گئے آٹووا میں کینیڈا کے وزیر خارجہ مسٹر پال مارٹن نے پارلیمنٹ ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جس میں وزیر اعظم مسٹر لیسٹر پیرسن نے بھی شرکت کی۔ دعوت سے چند دن پہلے انہوں نے گردن کی دائیں جانب سے ایک غدود نکلوانے کیلئے آپریشن کرایا تھا۔ مجھ سے فرمایا کہ غدود تو کینیڈین سرجن نے نکالی لیکن زخم ایک پاکستانی سرجن نے سیا۔ ہنس کر کہا اسی سے اندازہ کر لو کہ ہمیں پاکستان پر کسقدر اعتماد ہے۔ کھانے کے بعد پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہونیوالا تھا۔ ہم اجلاس کی کاروائی دیکھنے کیلئے زائرین کی گیلری میں چلے گئے۔ پارلیمنٹ کے سپیکر صاحب سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ اجلاس کی کاروائی شروع کرنے سے قبل انہوں نے میرے گیلری میں موجود ہونے کا اعلان پارلیمنٹ میں کیا جس پر اراکین نے اظہار خوشنودی کے طور پر زور زور سے اپنے ڈیسک بجائے اور خوش آمدید کے نعرے لگائے۔ ہم ٹورانٹو اور نیاگرا ہوتے ہوئے واپس نیویارک آ گئے۔

عالمی عدالت کی رکنیت کیلئے میرا دوبارہ انتخاب | اقوام متحدہ کے ۶۳ء کے سالانہ اجلاس میں عالمی عدالت کیلئے پانچ ججوں کا انتخاب ہونا تھا کیونکہ فروری ۶۴ء میں صدر عدالت اور چار ججوں کی میعاد ختم ہونیوالی تھی ریٹائر ہونیوالوں میں صدر عدالت تو فرانس سے تھے اور ایک جج برطانیہ سے تھے۔ چونکہ یہ دونوں ممالک مجلس امن کے مستقل رکن ہیں لہٰذا دو ججوں کا انتخاب انہی دو ملکوں سے ہونا تھا۔ باقی تین ریٹائر ہونیوالے جج لاطینی امریکن ملکوں سے تھے۔ عالمی عدالت کے قیام کے وقت اقوام متحدہ کے اراکین کی کل تعداد اکیاون تھی جن میں سے بیس لاطینی امریکن ممالک تھے۔ عالمی عدالت کے پندرہ ججوں کے انتخاب کے متعلق یہ مفاہمت تھی کہ پانچ تو مجلس امن کے مستقل اراکین ممالک یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، فرانس روس اور چین سے منتخب ہوں گے۔ اور دس باقی ممالک سے۔ چونکہ ابتداء میں باقی ممالک میں بیس لاطینی امریکن ممالک تھے لہٰذا باقی

دس ججوں میں سے چار جج لاطینی امریکن ممالک سے منتخب ہوتے۔ ۶۳ء تک یہ نسبت قائم رہی۔ ۶۳ء تک اراکین اقوام متحدہ میں ایشیائی اور افریقی عنصر نصف سے تجاوز کر چکا تھا لیکن عدالت کی رکنیت میں چینی جج کے علاوہ صرف ایک ایشیائی اور ایک افریقی جج تھا۔ جب ۶۳ء کے انتخاب کا وقت آیا تو ایشیائی اور افریقی ممالک کی طرف سے کہا گیا کہ اقوام متحدہ میں انکی تعداد کو دیکھتے ہوئے انہیں عدالت کی رکنیت میں مزید حصہ ملنا چاہیئے اور تین لاطینی امریکن ججوں کے ریٹائر ہونے پر ایک جج لاطینی امریکہ سے، ایک افریقی ممالک سے اور ایک ایشیائی ممالک سے منتخب ہونا چاہیئے۔ ایشیائی ممالک سے ایک تو مجھے نامزد کیا گیا اور دوسرے امیدوار جو نامزد ہوئے وہ لبنان سے تھے۔ ایشیائی سیٹ کیلئے مقابلہ میرے اور لبنانی امیدوار کے درمیان تھا۔ مقابلہ سخت تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے معجزانہ رنگ میں مجھے کامیابی عطا کی۔ الحمد للہ۔

جزائر فیجی اور نیوزیلینڈ کا سفر

۱۹۶۵ء کے اوائل میں جب میں وطن سے سالانہ سرمائی تعطیل کے بعد ہیگ واپس جانے کیلئے کراچی پہنچا تو میرے عزیز دوست سید شجاعت علی حسنی صاحب مرحوم نے جو ان دنوں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر تھے ویلنگٹن (نیوزیلینڈ) میں سنٹرل بنک نیوزیلینڈ کی سرپرستی میں قائم ہونیوالے ایک سیمینار (SEMINAR) میں مجھ سے مالیات کی پالیسی اور اصولوں پر ایک عام فہم تقریر کرنے کی خواہش کی۔ انہوں نے بتلایا کہ اس غرض کیلئے مجھے وسط نومبر میں نیوزیلینڈ جانا ہوگا۔ جب وہاں بہار کا موسم ہوگا۔ نیوزیلینڈ میں سنٹرل بنک کے گورنر میرے میزبان ہوں گے اور انہیں توقع ہوگی کہ میں ہفتہ دس دن کی فراغت نکال کر جاؤں تاکہ علاوہ ویلنگٹن کے بعض دوسرے مقامات بھی دیکھ سکوں۔ مجھے دنیا کے اس حصے میں پہلے جانیکا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نیوزیلینڈ کے متعلق سنا اور پڑھا ہوا تھا کہ وہاں کے بعض مقامات قابل دید ہیں۔ میں نے انکی تجویز کو قبول کر لیا۔

اکتوبر ۶۵ء میں مجھے بعض امور کی سرانجام دہی کیلئے امریکہ جانا ہوا۔ وہاں سے فراغت پاکر میں سان فرانسسکو سے نیوزیلینڈ کے سفر پر روانہ ہوا۔ ہوائی جہاز دوسری صبح قبل فجر جزائر فیجی کے بین الاقوامی مطار ناندی پہنچا۔ میرا ارادہ چند دن جزائر فیجی میں ٹھہرنے کا تھا۔ ہم سان فرانسسکو سے جمعرات کے دن روانہ ہوئے تھے۔ دوسرے دن ناندی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہفتے کا دن ہے۔ درمیان میں سے جمعہ کا دن غائب ہو گیا! مطار پر شیخ عبدالواحد صاحب مبشر سلسلہ احمدیہ اور ناندی کے چند احباب تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں ان کے ہمراہ شہر چلا گیا اور آئندہ چھ دن یعنی ہفتہ ۵ر نومبر سے جمعہ ۱۱ر نومبر تک انکے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق انکی خدمت میں حاضر و مشغول رہا۔ اس عرصے میں مختلف مقامات پر حاضری کا موقعہ ہوا لیکن زیادہ وقت جزائر کے صدر مقام سووا (SUVA) میں گذرا۔

۱۹۶۵ء میں جزائر فیجی کی مجموعی آبادی تین لاکھ کے لگ بھگ تھی جن میں سے نصف سے کچھ زائد ہندوستانی اور پاکستانی نژاد تھے اور نصف سے کچھ کم جزائر کے اصل باشندے تھے۔ اول الذکر عنصر میں مسلمان، ہندو، سکھ شامل تھے اس عنصر میں مسلمانوں کی نسبت بیس فیصدی تھی۔ جزائر فیجی میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک مخلص اور مستعد جماعت احمدیہ سرگرم عمل ہے جو جزائر کی

آبادی میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا وصال | ۹ نومبر کی شام کو پبلک جلسہ تھا۔ اسی سہ پہر ربوہ سے بذریعہ تار خبر ملی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی بیماری تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں ہوائی کمپنی کے دفتر میں گیا اور وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مجھے ربوہ پہنچنے کیلئے تین دن درکار ہوں گے۔ وہاں سے میں احمدیہ مشن ہاؤس گیا تا کہ شیخ عبدالواحد صاحب اور احباب کے ساتھ مشورہ کر کے اپنا پروگرام طے کر دوں۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ حضورؓ کے وصال کی اطلاع آ چکی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شیخ صاحب تو مارے غم و اندوہ کے حواس باختہ ہو رہے تھے۔ جو کچھ میں تجویز کرتا گیا وہ سر کے اشارے سے رضامندی ظاہر کرتے گئے۔ بعد مشورہ طے پایا کہ چونکہ میں ربوہ کسی صورت جنازے میں شامل ہونے یا خلیفہ کے انتخاب میں شریک ہونے کیلئے بروقت نہیں پہنچ سکتا اس لئے سفر کے پروگرام میں کوئی تبدیلی کرنا عبث ہو گا۔ اس کے علاوہ آخری وقت پر شام کے جلسے کی منسوخی بھی مناسب نہیں شیخ صاحب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ جلسے میں شامل ہو سکتے۔ اور جزائر کی جماعتوں کو اطلاع کرنے اور ان کے استفسارات کا جواب دینے کیلئے بھی مشن ہاؤس میں انکی موجودگی لازم تھی۔ اگرچہ میری اپنی حالت بھی ایسی تھی کہ طبیعت پر ضبط دشوار ہو رہا تھا لیکن جلسہ میں میری حاضری ضروری تھی اسلئے میں جلد تیار ہو کر بروقت جلسے میں پہنچ گیا اور خود ہی قرأت سورہ فاتحہ کے بعد اس سانحہ کا اعلان کر کے اور اسکے پیش نظر جناب صدر سے اجازت چاہی کہ جلسے کی کاروائی میری تقریر تک محدود رہے اور ابتدائی تعارفی تقریر اور آخری صدارتی تقریر اور نظم کا پڑھنا ترک کر دیا جائے۔ جناب صدر نے بلا تامل اسی کے مطابق جلسے کی کاروائی سرانجام دی۔ میرے لئے اس موقعہ پر تقریر کا نبھانا بہت مشکل امر تھا لیکن جیسے بن پڑا جو مضمون ذہن میں تھا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے بیان کیا گیا۔

وہ رات میرے لئے سخت کرب کی رات تھی۔ پچھلے پہر میں نے ایک خواب دیکھا جس کی واضح تعبیر تھی کہ خلیفہ کا انتخاب ہو گیا ہے۔ منتخب ہونیوالے خلیفہ کی عمر ۵۶ سال ہے اور انکی طبیعت میں بہت رشد، حیا اور حلم ہے۔ صبح ہونے پر میں نے موجود احباب سے یہ ذکر کر کے اپنا اندازہ بیان کیا کہ صاحبزادہ حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفہ منتخب ہوئے ہیں۔ حضور کی عمر کے متعلق صرف میرا اندازہ تھا کہ ۵۶ سال ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کی ولادت سنہ ۱۹۰۹ء کی ہے یعنی آپ کی عمر انتخاب کے وقت پورے ۵۶ سال تھی۔ ۱۱ر نومبر کی سہ پہر کو میری روانگی ناندی کے مطار سے تھی۔ احباب سے رخصت ہو کر جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا اور پرواز شروع ہوئی تو دل مچلا اور گویا جذبات نے اعلان کر دیا کہ اب تک تو ہمیں ضبط کی زنجیر میں جکڑے رکھنا مصلحت کا مطالبہ تھا لیکن اب اگر ہمیں رخصت نہ دی گئی تو ہمیں طوفان کی شکل میں خروج کرنا ہو گا۔ اب بہتر قرین مصلحت یہی تھا کہ دل اور آنکھوں کو خاموش اظہار کی اجازت دیدی جائے تا جذبات کا سمندر یک لخت تلاطم میں نہ آئے۔

آک لینڈ تک چار گھنٹے کا سفر تھا۔ پچھلے ساٹھ سال کا عرصہ سینما کی تصویر بنکر آہستہ آہستہ میری نظروں سے گذرنے لگا مجھے ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء میں پہلی بار حضور رضی اللہ عنہ کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ میں شہر سیالکوٹ کے اس مقام کی نشاندہی کر سکتا ہوں

جہاں میری آنکھوں نے پہلی بار وہ جلوۂ نور مشاہدہ کیا۔ حضورؓ کی عمر اس وقت پندرہ سال اور آٹھ ماہ تھی۔ میں حضورؓ سے چار سال چھوٹا ہوں۔ اگر مجھے فن مصوری میں کچھ بھی درک ہوتا تو میں اس وقت کی حضورؓ کی نہایت صحیح شبیہہ اتار سکتا۔ میرے دل میں وہ شبیہہ پوری طرح محفوظ ہے۔ اس وقت حضورؓ سرخ رنگ کی ترکی کلاہ پہنے تھے۔ عمامہ پہننا حضورؓ نے کچھ عرصہ بعد شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سالانہ جلسے کے موقعہ پر اور ستمبر کے مہینے میں ہر سال زیارت کے مواقع نصیب ہوتے تھے۔ لیکن ابھی ذاتی شناسائی کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے آخری قیام لاہور کے دوران میں بھی صاحبزادہ صاحب کی زیارت کے مواقع نصیب ہوتے رہے لیکن باوجود اس کے کہ میرے دوستانہ مراسم شیخ محمد تیمور صاحب اور چوہدری فتح محمد سیالؓ صاحب کے ساتھ قائم ہو چکے تھے اور یہ دونوں اصحاب صاحبزادہ محمود احمد صاحب کے حلقہ احباب میں شامل تھے مجھے کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ انکی وساطت سے باریابی کی کوشش کرتا۔ حجاب مانع تھا۔ "دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا" ہی کی کیفیت رہی۔

۱۹۱۰ء میں جب صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو میرے انکے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ اس کے بعد جب کبھی میں قادیان جاتا تو صاحبزادہ صاحبؓ مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے۔ جب میں آخر اگست ۱۹۱۱ء میں حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کی خدمت میں انگلستان کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حاضر ہوا تو اس موقعہ پر صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے فرمایا کہ صاحبزادہ میرزا محمود احمد صاحبؓ سے بھی رخصت ہوتے جاؤ۔ چنانچہ انکی وساطت سے اجازت ملنے پر میں نے پہلی بار حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے ازرہ شفقت چند نصائح فرمائیں اور ارشاد فرمایا کبھی کبھی خط لکھتے رہیں۔ خاکسار گاہے گاہے تعمیل ارشاد میں چند سطریں خدمت عالی میں ارسال کرتا۔ حضورؓ مشفقانہ ارشادات سے نوازتے۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے وصال پر بیعت کا تحریری عہد تو خاکسار نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں انگلستان سے ہی پیش کر دیا۔ شروع نومبر ۱۹۱۴ء میں وطن واپسی پر خاکسار سیالکوٹ میں اپنے والدین کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے قادیان حاضر ہوا اور حضورؓ کے دست مبارک پر بیعت سے فیضیاب ہوا۔ اسی وقت سے حضورؓ نے خاکسار کی تربیت اپنے مبارک ہاتھوں میں لے لی۔ شروع ۱۹۱۵ء میں (غالباً مارچ کا مہینہ تھا) حضورؓ نے ارشاد فرمایا ایسٹر کی تعطیلات میں جماعت احمدیہ دہلی کا جلسہ قرار پایا ہے اس میں اردو، عربی، انگریزی میں تقریریں ہونگی اور سوال و جواب بھی ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں تم اس جلسے میں ضرورت مذہب پر انگریزی میں تقریر کرو۔ خاکسار نے کچھ پریشانی کے عالم میں عرض کی حضور خاکسار تو اس میدان میں محض نابلد ہے۔ فرمایا ہم نوٹ لکھوا دیتے ہیں ان پر غور کرکے مضمون پھیلا لینا۔ ہم دعا بھی کریں گے۔ انشاء اللہ کوئی دقت نہیں ہوگی۔ چنانچہ بفضل اللہ ایسا ہی ہوا۔ فالحمد للہ آئندہ کیلئے یہ طریق دستور ہوگیا۔ حضورؓ تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اپنے دور کے استاد تھے ہی حضورؓ نے از راہ صد نوازش والطاف خاکسار کو اپنی خاص شاگردی کا فخر عطا فرمایا۔ اور دن بدن حضورؓ کی توجہ اور شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اگست ۱۹۱۶ء میں خاکسار سیالکوٹ سے نقل مکان کرکے انڈین کیسز کے نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے لاہور آگیا۔ ابھی لاہور چیف کورٹ

میں پریکٹس شروع کرنیکا منصوبہ بھی ذہن میں نہیں آیا تھا کہ آخر نومبر میں حضورؓ کا ارشاد موصول ہوا کہ پٹنہ ہائی کورٹ میں مونگھیر کی مسجد سے متعلق تنازعہ کی اپیل زیر سماعت آنیوالی ہے اس کی پیروی کے لئے جاؤ۔ کسقدر بھروسہ تھا آپ کو اپنے رب کی قدرتوں اور اس کی عنایات پر کہ ان فرائض کی سرانجام دہی کیلئے جو اس ذاتِ باری نے آپکے ذمے عاید کئے تھے اگر آپ بظاہر ایک کند آنے کا بھی انتخاب کر لیں گے تو وہ قوی اور غالب حکمت کا مالک آقا اس کند آنے کو حریفوں کے مقابلے میں تیز کردیگا چنانچہ اس بارہ بھی اور بارہا نمایاں طور پر ایسا ہی ہوا۔ فالحمد للہ۔ پٹنہ ہائی کورٹ میں خاکسار کے مقابلے میں میدانِ وکالت کے بڑے بڑے شہسوار زیر قیادت مسٹر مظہر الحق صاحب پرے جمائے ہوئے تھے۔ سید فخر الدین صاحب گورنمنٹ پلیڈر، مسٹر یونس مولوی طاہر اور کوئی نصف درجن دیگر اصحاب اور انکی تائید میں اتنے ہی علمائے کرام۔ خاکسار کے ساتھ فقط مولوی خورشید حسنین صاحب وہ بھی محض عدالت کے قواعد کی پابندی کی خاطر ورنہ اپنے دفتر میں ایک سرسری مشورے کے علاوہ وہ پیروی میں شریک نہ ہوئے اور دوران سماعت صرف حاضری دینے کیلئے چند منٹ تشریف فرما رہے۔ لیکن جہاں تک واقعاتی اور قانونی تیاری کا تعلق تھا وہ جیسے بیان ہو چکا ہے جناب سید وزارت حسین صاحب نے ایسے مکمل طور پر کی ہوئی تھی کہ مجھے بفضل اللہ نہ کوئی دقت پیش آئی نہ زحمت اٹھانا پڑی نہ پریشانی لاحق ہوئی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

ایسا ہی مدراس ہائی کورٹ میں مسٹر سی مدھون نائر گورنمنٹ پلیڈر کے مقابلے میں جو بعد میں گورنمنٹ ایڈووکیٹ، جج ہائی کورٹ اور پھر لندن میں پریوی کونسل کے جج ہوئے۔ امرتسر میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور جناب مولانا ثناء اللہ صاحب مختار خاص مدعیہ کے مقابلے میں پنجاب چیف کورٹ میں حضورؓ کے اور حضورؓ کے برادران کے ایک نجی دیوانی مقدمے میں جس کا گہرا سیاسی اثر جماعت کے مفاد پر پڑتا تھا۔ جناب لالہ ستیارام جیسے کہنہ مشق وکیل کے مقابلے میں حضورؓ نے خاکسار ہی کا انتخاب فرمایا۔ اس آخری اپیل کی پیروی کیلئے حضورؓ کی خدمت میں بہت سے احباب نے مخلصانہ مشورہ پیش کیا کہ معاملے کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر جناب میاں محمد شفیع صاحب یا مسٹر پیٹمین کو وکیل کیا جائے۔ لیکن حضورؓ نے فرمایا جو کام محبت اور اخلاص کر سکتے ہیں وہ محض لیاقت نہیں کر سکتی۔ اور حضورؓ نے ان لائق اور آزمودہ کار اصحاب میں سے ایک کی بجائے اپنے کودک نادان کا انتخاب ہی برقرار رکھا۔ فداہ ابی وامی۔

مدراس ہائی کورٹ میں پیشی کے وقت میری عمر ۲۸ - ۲۹ سال تھی لیکن باقی سب مندرجہ بالا مقدمات کی پیروی ایسے وقت میں میرے سپرد کی گئی جب میں ابھی ۲۵ سال کی عمر کو نہیں پہنچا تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگیو وزیر ہند برصغیر کے آئیندہ دستور کے متعلق رائے عامہ کا اندازہ کرنے کیلئے دلی تشریف لائے اور بشمول وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ مختلف طبقات کے نمائندگان کے اظہار رائے کی سماعت کی۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے جو ایڈریس حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے رقم فرمایا اس کا انگریزی ترجمہ کرنا خاکسار کے سپرد ہوا اور جماعت کے وفد کے پیش ہونے پر خاکسار نے پڑھ کر سنایا۔ حضور کی علیحدہ ملاقات وزیر ہند سے ہوئی اس موقعہ پر ترجمانی کی خدمت کے سرانجام دینے کے لئے حضور نے خاکسار کا انتخاب فرمایا۔ خاکسار کو سیاسی امور میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور انتخابات سے طبیعت گریز کرتی تھی۔

حضور نے اپنے ارشاد کے ماتحت اس میدان میں داخل کیا جسکی تفصیل گذر چکی ہے۔ غرض ہر مرحلے پر ہدایت اور رہنمائی فرمائی۔

جیسے جیسے ہر مرحلہ میری نظر سے گذرتا گیا میرا یہ احساس تیز تر ہوتا گیا کہ میں کسقدر خوش قسمت تھا کہ حضورؓ کی توجہ اور شفقت کا پیہم

مورد رہا۔ میں نے مرغ بے جان کی طرح اپنے آپ کو حضورؐ کے ہاتھ میں دیدیا اور حضورؐ ہر لحظہ ماں باپ سے بڑھکر مشفق مربی رہے۔ میں نے اپنے متعلق اتنی فکر نہیں کی جتنی حضورؐ میرے متعلق کرتے رہے۔ آک لینڈ پہنچنے تک میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے پروگرام کے مطابق ہی پاکستان پہنچوں گا جلدی نہیں کروں گا جس سے میری غرض زیادہ تر یہ تھی کہ اتنے عرصے میں میرے جذبات اور میری طبیعت قابو میں آجائے۔ پاکستان پہنچنے پر اول تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ میں طبیعت پر ضبط قائم رکھ سکوں گا لیکن یہ احساس فریب ثابت ہوا۔ حضورؐ کے وصال کو آج چھ سال ہونے آئے ہیں لیکن میری طبیعت کی وہی کیفیت ہے۔

نیوزیلینڈ | آک لینڈ مطار پر پہنچنے پر مطار پر ہی سنٹرل بنک کے ایک افسر مجھے مل گئے اور مجھے ہوٹل لے گئے۔ طیارے سے بھی آک لینڈ کا منظر بجلی کی روشنی میں دل لبھانے والا تھا اور ہوٹل کو جاتے ہوئے کار میں سے بھی بہت خوش کن نظر آتا تھا۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم دونوں کار میں جنوب کی جانب روانہ ہو گئے موسم صاف اور سہانا تھا دن کی روشنی میں بھی آک لینڈ ویسا ہی خوشنما نظر آیا جیسے رات کے وقت بجلی کی روشنی میں اندازہ ہوا تھا۔ نیوزیلینڈ کے متعلق دو باتیں میرے ذہن میں تھیں جنہیں دیکھنے کا مجھے شوق تھا ایک ملک کے اصل باشندے یعنی MAORIS اور دوسرے قدرتی دخانی چشمے جو زمین کے اندر سے زور سے ابلتے ہیں اور جن کی بھاپ بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ ہمارے پہلے دن کے سفر کی منزل یہی مقام تھا اور یہیں ایک بستی MAORIS کی بھی تھی۔ بھاپ کو کام میں لانے والے کارخانے اور مشینوں کو دیکھ چکنے کے بعد منیجر صاحب ہمیں کارخانے سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے پر لے گئے۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی ساتھ تھیں جب ہم کار سے اترے تو ان خاتون نے فرمایا میں تو اس سے آگے جانے سے گھبراتی ہوں آپ لوگ آگے بڑھ کر جو اندازہ ہو سکتا ہے اس کا تجربہ کر لیں۔ کار سے اترتے ہی محسوس ہوا کہ پاؤں تلے کی زمین تھرا رہی ہے اور تھوڑی دور آگے زمین کے اندر سے پانی اور آگ اور بھاپ کے جوش سے مسلسل مہیب گڑگڑاہٹ کا شور اٹھ رہا ہے۔ آگے بڑھے تو پاؤں تلے کی زمین کی حرکت بالکل ایسے محسوس ہوئی جیسے ہم ایک سرکش بچھیرے کی پیٹھ پر کھڑے ہیں جو سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ بھاپ کی گرج کی آواز نہایت خوفناک اور غضبناک انداز میں سنائی دیتی۔ ہر آدھ منٹ کے وقفے پر ہمارے کھڑے ہونے کی جگہ سے چند گز کے فاصلے پر ایک دہشتناک چنگھاڑ کے ساتھ ایک دخانی ستون زمین کے اندر سے آسمان کی طرف بلند ہوتا۔ یہ تمام منظر گویا جہنم کے غیظ و غضب کا نمونہ تھا۔

نیوزیلینڈ کے دونوں جزیروں میں جہاں بھی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا ہر جگہ ہوٹلوں کو بہت آرام دہ اور دلکش پایا۔ یہ ہوٹل نیوزی لینڈ کی خصوصیت ہیں اور مسافروں کیلئے باعث راحت ہیں۔ دو راتیں رستے میں ٹھہر کر ہم تیسرے دن دوپہر کو بخیریت ولنگٹن پہنچ گئے یہ تمام سفر بہت آرام سے کٹا اور بڑی دلچسپی کا موجب رہا ویلنگٹن میں علاوہ سیمینار کی تقریر کے گورنر جنرل صاحب نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ سنٹرل بنک کے گورنر نے شام کے کھانے کی دعوت دی سپریم کورٹ کے جج صاحبان بھی شریک دعوت تھے۔ عدالت اپیل میں ان میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کا موقعہ ہوا۔ وزیر اعظم مسٹر ہولی اوک نے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور وزراء اور ممتاز نمائندگان کے ساتھ ملاقات کا موقعہ ہوا۔

ویلنگٹن سے فارغ ہو کر جنوبی جزیرے کی سیر کا موقعہ ملا۔ علاوہ دیگر مقامات کے ہیلی کاپٹر پر ایک GLACIER پر اترنے

کا بھی اتفاق ہوا۔ جنوبی جزیرے کا ممتاز شہر QUEENSTOWN ہے۔ یہاں کے مطار سے قطب جنوبی کے علاقے میں مقیم سائنسدانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھا جاتا ہے۔ میں جنوبی جزیرے سے ولنگٹن واپسی کے لئے مطار پر منتظر تھا اور کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور فرمایا تم ظفر اللہ خان ہو؟ میرے اقرار کرنے پر فرمایا یہ عجیب حسن اتفاق ہے۔ میں انڈونیشیا کا ایک طالب علم ہوں یہاں QUEENSTOWN کی یونیورسٹی میں مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے آیا ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوکان میں اسلام پر تمہاری کتاب دیکھی اور اسے خرید کر ان دنوں اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ کتاب اس وقت بھی میرے پاس ہے اس پر دستخط کر دو۔ میں نے خوشی سے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔ انہوں نے بڑی سادگی سے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں اس کتاب کے لکھنے کی بہت بہت نیک جزا دے۔ میرے دل سے ان کیلئے دعا نکلی اور اللہ تعالیٰ کی ذرہ نوازی پر میرا دل سجدے میں گر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عاجز بندے کو اکیلے پن کی گھڑی میں کسقدر دلکش ہدیئے سے نوازا۔ سبحان لک روحی و جنانی۔ ویلنگٹن سے میں سڈنی گیا۔ یہاں کی بندرگاہ کا منظر مشہور عالم ہے۔ ہوائی جہاز سے تو ایسا ہی محسوس ہوا لیکن زمین پر سے کوئی ایسی غیر معمولی شان دکھائی نہ دی۔ اگر پانی پر جانے کا موقعہ ہوتا تو شاید اور کیفیت ہوتی سڈنی میں چند گھنٹے قیام کے بعد ہوائی جہاز سے CANBERRA چلا گیا سڈنی بڑی آبادی کا شہر ہے۔ لیکن کوئی شان یا عظمت نظر نہ آئی۔ میرا قیام اتنا مختصر تھا کہ اس کے نتیجے میں صحیح اندازہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کینبرا خوشنما شہر ہے۔ نقشہ بہت وسیع ہے، سڑکیں فراخ ہیں، پس منظر خوبصورت ہے۔ ہریاول اور کشادگی دل کو بھاتی ہے لیکن مکھیوں کی بہتات ہے جو بہت موٹی ہیں۔ کینبرا میں میرا قیام پاکستانی ہائی کمشنر ڈاکٹر اے ایم مالک صاحب کے ہاں تھا جو میرے نہایت عزیز دوست ہیں میں نے ان کے ہاں بہت آرام پایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں بہترین جزا عطا فرمائے آمین۔ کینبرا کے قیام کے دوران میں جناب وزیر اعظم سر رابرٹ مینزیز سے ملاقات ہوئی جن کے ساتھ عرصہ سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ سر جیمز پلمسول سے بھی ملا جو اس زمانے میں اقوام متحدہ میں آسٹریلیا کے مستقل نمائندے تھے جب میں وہاں پاکستان کا مستقل نمائندہ تھا۔ گورنر جنرل لارڈ کیسی سے میرے دوستانہ تعلقات ۱۹۳ء سے ہیں۔ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر بلایا اور ڈیڑھ دو گھنٹے پرانی یادیں تازہ کرنے میں گذارے۔ تین دن کینبرا ٹھہرنے کے بعد میں صبح وہاں سے روانہ ہوا۔ سڈنی جہاز تبدیل کر کے اسی رات بفضل اللہ کراچی پہنچ گیا۔

حج بیت اللہ شریف کی سعادت

چونکہ عالمی عدالت میں میرا تقرر ۶ رفروری ۱۹۶۴ء سے عمل میں آنا تھا میں نے اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر کے منصب کا چارج ۵ رفروری ۶۴ء کو چھوڑ دیا۔ عدالت میں دوبارہ تقرر کے دیگر فوائد کے علاوہ ایک نعمت عظمیٰ جو حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ مارچ ۱۹۶۷ء میں میری حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنیکی دیرینہ آرزو محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ذرہ نوازی سے بر آئی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ حسن اتفاق سے عزیز انور احمد اور عزیزہ امینہ کا ساتھ بھی میسر آگیا جن کی رفاقت کی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا۔ فجزاھم اللہ خیراً۔

ہم کراچی سے ۱۰ رمارچ ۱۹۶۷ء جمعہ کے دن فجر کے وقت روانہ ہوئے اور دس بجے قبل دوپہر بخیریت جدہ پہنچ گئے۔ تشریفات ملکیہ کی طرف سے ہماری رہائش کا انتظام جدہ پیلیس ہوٹل میں کیا گیا تھا جو امریکن طرز کا نہایت عمدہ آرام دہ ہوٹل ہے۔

اسی دن ہم مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر بفضل اللہ عمرہ سے مشرف ہوئے اور پھر جدہ واپس آ گئے۔ ۱۱ کو جدہ میں ٹھہر کر تشریفات ملکیہ کے ساتھ پروگرام طے کیا۔ پاکستانی سفارت خانے میں حاضر ہو کر سفیر کبیر اور ان کے افسران سے نیاز حاصل کیا۔ ان میں سے دو صاحبان شیخ اعزاز نیاز صاحب افسر حج اور سید اشتیاق حسین صاحب مدیر ثالث وزارت خارجہ میں میرے رفیق کار رہ چکے تھے۔ اب بھی پہلے سی تواضع کے ساتھ پیش آئے اور انتظامات حج کے سلسلے میں ہمارے آرام کا موجب ہوئے۔ فجزاھم اللہ خیراً۔ ۱۲ کو ہم جدہ سے کار پر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور ۱۵ تک وہاں قیام کیا۔ ہماری جائے قیام مسجد نبوی سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اس سہولت کی وجہ سے ہمیں بفضل اللہ سب اوقات میں مسجد میں حاضری اور نوافل کی ادائیگی کا موقعہ میسر آ جاتا تھا۔ البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک اور حضورؐ کے منبر کے درمیان نوافل ادا کرنے والوں کا ہر وقت اسقدر ہجوم رہتا تھا کہ ہمیں خدشہ ہوا کہ ان ایام میں اس مبارک مقام پر نفل ادا کرنے اور دعا کرنے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے خاص کرم اور بندہ نوازی سے یہ موقعہ بھی بفراغت میسر آ گیا۔ غیر معمولی ہجوم کی وجہ سے مسجد کی صفائی کے متعلق خاص انتظام کرنا پڑتا ہے اسلئے مسجد نصف شب سے لیکر تین گھنٹے کیلئے بند کر دی جاتی ہے اور اس دوران میں خدام مسجد کی صفائی مستعدی کے ساتھ مکمل کر لیتے ہیں۔ ۱۳ کی شام کو نمائندہ تشریفات نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ نصف شب کے وقت تشریف لا کر ہمیں مسجد کے اندر لے چلیں گے اور جسقدر عرصہ ہم چاہیں نوافل اور دعا میں صرف کر سکیں گے۔ چنانچہ دونوں رات ہمیں یہ موقعہ نصیب ہوتا رہا۔ فالحمد للہ۔ ۱۵ کو مدینہ منورہ سے جدہ واپسی ہوئی ۱۶ کو ہم پھر مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور عمرہ اور مناسک ادا کئے۔ ۱۷ کو مکہ معظمہ منتقل ہو گئے۔ ۱۸ کی شام کو جلالۃ الملک فیصل کی طرف سے استقبالیہ دعوت تھی۔ عزیز الوزاحمد اور میں بھی مدعو تھے۔ جلالۃ الملک نے اپنی تقریر میں قضیہ یمن کا ذکر فرمایا اور صراحت فرمائی کہ ان کا موقف یہ ہے کہ جو عناصر بھی بیرون یمن سے یمن میں داخل ہوئے ہیں وہ یمن سے نکل جائیں اور یمن کی رعایا بغیر کسی بیرونی تداخل کے آزادانہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے مزید فرمایا ہم اعلان کرتے ہیں اور آپ سب کو اس پر گواہ ٹھہراتے ہیں کہ یمنی رعایا جو فیصلہ بغیر کسی بیرونی تداخل یا کسی جبر کے کرے گی ہم اس کے پابند ہوں گے۔ خواہ فیصلہ ہماری نگہ میں پسندیدہ ہو یا نہ ہو۔ جناب اسمٰعیل ازہری صاحب صدر سوڈان دعوت استقبالیہ میں خصوصی مہمان تھے۔ انہوں نے بھی حاضرین کو خطاب فرمایا۔ طعام سے فراغت پر میں نے عزیز الوزاحمد کو جلالۃ الملک کی خدمت میں پیش کیا۔ مکہ معظمہ منتقل ہونے پر ہم صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب کی قیام گاہ پر انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب کراچی سے اسی پرواز میں جدہ تشریف لائے تھے جس پر ہم نے سفر کیا تھا۔ جدہ پہنچتے ہی آپ مکہ معظمہ حاضر ہو گئے تھے۔ آپنے ان احباب جماعت احمدیہ کی فہرست تیار کرائی جو فریضہ حج کی ادائیگی کیلئے آئے ہوئے تھے۔ اس فہرست کی تکمیل پر معلوم ہوا کہ اس سال بفضل اللہ ایک سو سے زائد احمدی احباب نے فریضہ حج کی سعادت حاصل کی فالحمد للہ۔ ان میں ایشیا افریقہ یورپ سے آنیوالے احباب شامل تھے۔ ممکن ہے کوئی دوست امریکہ سے بھی تشریف لائے ہوں لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام الحرم ہوٹل میں تھا جہاں سے کعبہ شریف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے بفضل اللہ دن اور رات کے ہر حصے میں طواف اور نوافل کی توفیق پائی لیکن کسی وقت بھی زائرین کے ہجوم میں کمی محسوس نہ ہوئی۔ ایرانی اور ترکی حجاج کثیر تعداد میں تھے۔ ان کے قافلے وطن سے ہی پورے نظم کے

ساتھ خشکی کے راستے سفر کر کے آتے ہیں اور اسی طریق سے واپس جاتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں انکی اپنی قیام گاہیں پہلے سے مقرر ہیں۔ اس انتظام کے نتیجے میں ترکی اور ایرانی حجاج کو بہت سہولت رہتی ہے۔ طواف کے دوران میں بھی ان کے حجاج اکٹھے رہتے ہیں۔ ایرانی حجاج کی ٹولی تو طواف کے دوران میں بازو میں بازو ڈالکر ایک مضبوط زنجیر بنا لیتی ہے جس سے انہیں تو سہولت رہتی ہے اور خواتین اور ضعفاء کو درمیان میں رکھنے سے انکی حفاظت بھی ہو جاتی ہے لیکن یہ طریق بعض دفعہ دوسرے حجاج کیلئے اذیت کا موجب ہوتا ہے۔ حجر اسود، مقام ملتزم اور مقام ابراہیم کے درمیان جگہ محدود ہونے کی وجہ سے ہجوم کا یہاں زور ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ طواف کے دوران میں اور خصوصیت سے حجر اسود کے قریب دھکا پیل نہ ہونی چاہیئے تاکہ کسی کی اذیت کا موجب نہ ہو۔ ترکی حجاج نسبتاً اطمینان سے طواف کرتے دیکھے گئے۔ ان کی پہچان ان کے تلفظ سے بھی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر تکبیر میں اللہ اکبر کا تلفظ الدا اکبر کرتے سنائی دیتے ہیں ممکن ہے یہ لاطینی رسم الخط کا نتیجہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۲۰ر کی صبح کو حجاج مکہ معظمہ سے طلوع آفتاب کے بعد روانہ ہو کر منیٰ پہنچے لاریوں اور موٹروں کی کثرت کی وجہ سے بہت اژدہام تھا۔ کثیر تعداد حجاج کی مکہ معظمہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ اور منیٰ سے واپس مکہ معظمہ تمام مناسک حج پیدل ادا کرتی ہے۔ حج کے ایام شروع ہونے کے ساتھ ہی ہر سمت سے آنیوالے حجاج بیت اللہ کی طرف سے تلبیہ شروع ہو جاتی ہے۔

لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ لک والملک۔ لا شریک لک۔ احرام باندھنے کیساتھ ہی تین بار تلبیہ کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر گوشے سے جونہی کوئی حاجی حج کے ارادے سے عازم ارض حجاز ہوتا ہے وہ تلبیہ کی آواز بلند کرنا شروع کر دیتا ہے اور ایام حج میں تو متواتر تلبیہ کا ورد ہوتا ہے۔ اب یہ بھی انتظام ہے کہ ان ایام میں مکہ معظمہ سے ریڈیو پر متواتر تلبیہ کا ورد ہوتا ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے واپسی کے سفر میں کار کے ریڈیو پر متواتر تلبیہ کا ورد سنائی دیتا تھا اور ادارہم بھی تلبیہ کرنے میں شامل رہتے تھے۔ اگر ریڈیو بند کر دیا جاتا یا کسی وقت ریڈیو پر تلبیہ کا ورد سنائی نہ دیتا تو ہم اپنے طور پر تلبیہ میں مصروف رہتے اور یہی حالت بقیہ ایام حج میں تھی۔ لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک۔ لا شریک لک۔ جب مسنون دعاؤں اور مناجات میں ذہن اور زبان مصروف نہ ہوتے تو تلبیہ کے کلمات زبان پر جاری رہتے اور دل و دماغ پر ایک ولولے کی کیفیت طاری رہتی۔ ریڈیو پر تلبیہ کا ورد اس قدر شیریں لہجے میں ہوتا تھا اور تلبیہ کے کلمات دل میں ایسی والہانہ کیفیت پیدا کر دیتے تھے کہ آنکھیں متواتر پرنم رہتی تھیں۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں طبیعت زیادہ تر درود شریف کی طرف مائل رہتی تھی۔ علاوہ مسنون صلوٰۃ اور سلام کے یہ عاجز اکثر اوقات حضرت مسیح الموعود علیہ الصلوٰۃ السلام کے اپنے الفاظ میں حضورؑ کی طرف سے حضورؐ کے آقا اور محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں مصروف رہتا تھا۔ یارب صل علیٰ نبیک دائماً فی ہذہ الدنیا وبعثٍ ثانی۔ ایام حج میں بھی ان الفاظ میں درود بھیجنے کی سعادت متواتر حاصل ہوتی رہی دکان ھذا من فضل ربی۔ مکہ معظمہ سے منیٰ جاتے ہوئے ان تمام کیفیات میں شدت پیدا ہو گئی دل پگھلا ہوا، زبان ذکر سے تر اور آنکھیں جاری تھیں۔ دائیں بائیں آگے پیچھے جوان، معمر، مرد، عورت، گورے کالے شمال اور جنوب سے مشرق اور مغرب سے دنیا کے کناروں سے کشاں کشاں لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک لبیک۔

ان الحمد والنعمۃ لک والملک ۔ لاشریک لک ۔ کا ورد کرتے ہوئے سوار اور پیدل شاداں و فرحاں وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا (۹۸ : ۳) کے فرمان کی تعمیل میں اور اذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلیٰ کل ضامرٍ یاتین من کل فجٍ عمیق کی پرشوکت پیشگوئی کو سال بسال قرناً بعد قرنٍ پورا کرتے ہوئے بصد شوق اور بہزار نیاز مندی بڑھتے چلے جارہے تھے۔ سب چہرے بشاش، سب آنکھیں روشن سب لبوں پر مسکراہٹ ، بلاامتیاز بندہ و بندہ نواز بلاتفریق محمود و ایاز ایک ہی آقا کے غلام کفن باندھے ہوئے گویا میدان حشر کی جانب کھچے چلے جارہے تھے لیکن خوف و ہراسانی میں نہیں بلکہ اپنے رب کی رحمت کی امید میں اس کے غفران پر تکیہ کئے ہوئے چہرے مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ (۴۰ - ۳۹ : ۸۰) منیٰ میں کچھ حجاج کا قیام مکہ معظمہ کی طرح عمارتوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر حصے کا قیام معلمین کے زیر انتظام خیموں میں ہوتا ہے۔ تشریفات کے مہمانوں کا انتظام مہمان خانوں میں تھا جہاں سب سہولتیں میسر تھیں۔ کھانا ہوٹل کی نسبت زیادہ لذیذ تھا۔ اگرچہ مارچ کا مہینہ تھا لیکن موسم میں ابھی سے خاصی گرمی تھی۔ منیٰ میں تمازت آفتاب سے محفوظ رہنے کیلئے چھتری کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ پہلے زمانوں کی نسبت پانی آسانی اور فراوانی سے میسر آتا تھا۔ فالحمدللہ۔ پینے کیلئے ٹھنڈے مشروبات منیٰ ہی میں نہیں عرفات اور مزدلفہ میں بھی ملتے تھے معلمین کے انتظام کے ماتحت کیمپوں اور خیموں میں حجاج کے قیام اور طعام کا انتظام مختلف درجوں کا تھا۔ اکثر معلمین اپنے مہمانوں کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے کی سعی کرتے ہیں لیکن بعض اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ بعض حکومتوں کی طرف سے اپنے حجاج کیلئے اس حکومت کے عمال کی براہ راست نگرانی میں سب انتظام کیا جاتا ہے۔ مثلاً ترکی اور ایرانی حکومتوں کے علاوہ انڈونیشیا کی حکومت بھی اپنے حجاج کیلئے اپنے عمال کی زیر نگرانی انتظام کرتی ہے جس سے ان کے حجاج کو بہت سہولت رہتی ہے۔ پاکستانی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ، منیٰ وغیرہ میں طبی امداد کا انتظام ہوتا ہے اور خود پاکستانی سفیر کبیر اور ان کے افسران اور عملے کے اصحاب حجاج کو ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے میں سعی کرتے ہیں اور ایک خاصی تعداد حجاج کی ان کی مہمان بھی ہوتی ہے۔ منیٰ میں ایک وسیع عمارت میں پاکستانی سفارتخانے کا دفتر اور مہمان خانہ قائم ہوتا ہے۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ لیکن بعض امور ابھی مزید توجہ کے محتاج ہیں۔ مثلاً میری دانست میں سفارتخانے کی طرف سے معلمین کے انتظام کی مزید نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک مفید اقدام یہ ہو سکتا ہے کہ جن معلمین کی طرف سے حجاج کی سہولت کیلئے خاطر خواہ انتظام نہ کیا جاتا ہو ان کے متعلق حکومت کو رپورٹ کیجائے اور ہر سال حکومت بروقت پاکستان میں اعلان کردیا کرے کہ فلاں معلم کی طرف سے حجاج کے آرام کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاتا تاکہ حجاج اپنے آپ کو ایسے معلمین کے سپرد کرنے میں احتیاط کریں۔

عرفات کو جاتے ہوئے منیٰ میں ایک دن رات قیام ہوتا ہے۔ پانچ نمازیں یہاں ادا ہوتی ہیں۔ عزیزہ انور احمد اور میں عصر کی نماز کے بعد جب اپنی قیام گاہ پر واپس آئے تو عزیزہ امینہ نے کہا آج گرمی کی شدت تکلیف دہ محسوس ہو رہی ہے۔ اس پریشانی میں میں نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی ہے معلوم نہیں ایسی دعا جائز بھی ہے یا نہیں۔ میرے دریافت کرنے پر بتلایا میں نے کچھ اس رنگ میں دعا کی ہے الٰہی ہم تیرے عاجز بندے ہیں اور تیری رضا کے حصول کیلئے تیرے فرمان کی تعمیل میں بیت اللہ کے حج کیلئے

حاضر ہوئے ہیں۔ جہاں تونے فرمایا ہے طواف کرو۔ ہم نے طواف کیا ہے، جہاں تونے فرمایا ہے سعی کرو ہمنے سعی کی ہے، جو جو تیرے فرمان ہیں وہ سب تیری عطاکردہ توفیق سے بجالائیں گے لیکن ہم آخر تیرے مہمان ہیں گرمی کی شدت ہو رہی ہے کل ہم سب عرفات کے میدان میں حاضر ہوں گے تجھے سب قدرت ہے تو رحم فرما اور کل کا دن ٹھنڈا کر دے۔ میں نے کہا ایسی دعا بیشک جائز ہے اللہ تعالیٰ مالک ہے لیکن اپنے بندوں کی ناز برداری بھی کرتا ہے کیا عجب کہ تمہاری دعا کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو بھا جائے اور وہ ویسا ہی کر دے۔ دوسری صبح فجر سے قبل میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ عزیزہ امینہ سے کہا تو تمہاری دعا کو شرف قبولیت بخشا گیا۔ تمام دن موسم خوشگوار رہا اور بادِ نسیم جاری رہی۔ ظہر اور عصر کے بعد بادل تو چھٹ گئے لیکن ہوا میں پھر بھی خنکی رہی ایک دوبار دن میں کچھ بوندا باندی بھی ہوئی۔

۱۲ر کی صبح کو طلوع آفتاب کے بعد منیٰ سے عرفات روانہ ہوئے یہ حج کا دن تھا اس دن حجاج کی بڑی کثرت تھی لیکن عرفات پہنچنے اور وہاں سے اسی شام مزدلفہ واپس پہنچنے کا انتظام بہت اچھا تھا۔ گرد و غبار تو لازم تھا لیکن اتنا نہیں جس کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ بحمدللہ موسم خوشگوار تھا۔ تشریفات کی طرف سے یہاں بھی انتظام قابل ستائش تھا۔ ہر خیمے کے باہر مہمانوں کے نام درج تھے۔ اگرچہ تشریفات کے مہمانوں کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی لیکن یہاں بھی میدان میں ہر سہولت میسر تھی۔ اگرچہ حجاج ہونے کی حیثیت سے ہر مہمان کمال سادگی سے یہ مبارک دن ذکر الٰہی، استغفار، درود، تلاوت قرآن کریم اور مناسک کے بجالانے میں صرف کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن تشریفات کی طرف سے مہمان نوازی کے نظام کا تجربہ نہایت خوشکن تھا اور بیساختہ جلالۃ الملک اور ان کے کارکنوں کے حق میں دلوں سے مخلصانہ دعائیں بلند ہوتی تھیں۔ تشریفات کی مہمان نوازی عام مہمان نوازی کی مانند نہیں تھی اس کے بہت سے پہلو تھے اور ہر پہلو کے متعلق بہت خاطر خواہ انتظام تھا۔ جدہ پہنچنے پر استقبال، جدے میں ہر مہمان کی سہولت اور خواہش کے مطابق قیام و طعام اور وسائل آمد و رفت کا انتظام، مدینہ منورہ جانے آنے کے سفر کا انتظام اور وہاں کے قیام و طعام کا انتظام۔ اسی طرح منیٰ، عرفات، مزدلفہ میں تمام ضروری انتظامات، منیٰ میں واپسی، طواف وداع، جدہ میں واپسی اور جدہ سے رخصت تک سب ضروری انتظامات۔ یہ سب کچھ ایسی عمدگی سے سرانجام دیا جاتا ہے کہ کسی خاص تکلف کا احساس نہیں ہوتا اور ہر ضرورت بر وقت پوری ہوتی ہے اور ہر سہولت میسر ہوتی ہے۔ ایک مقام پر مہمانوں کی ایک بڑی تعداد کیلئے تمام انتظامات کا انصرام کوئی ایسا مشکل منصوبہ نہ سہی مختلف مقامات پر چند مہمانوں کے لئے تفصیلی انتظام کوئی اتنا بڑا کارنامہ نہ سہی لیکن ہزاروں مہمانوں کیلئے مختلف مقامات پر ان کی ضروریات اور عادات کے مطابق خاطر خواہ اور ہر پہلو سے آرام دہ اور تسلی بخش انتظام حسن کارکردگی کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ تھا۔ جس کا ایام حج میں دو ہفتوں سے زائد عرصہ کے دوران میں ہمیں اور باقی سب مہمانوں کو دل خوشکن تجربہ ہوا۔ اور ہر مرحلے پر ہمارے دل میزبانوں کے شکر اور احسان کے احساس سے لبریز رہے۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

عرفات کے دن ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کی جاتی ہیں اور امام خطبہ دیتا ہے جس کا سننا مسنون ہے اب ریڈیو پر نشر کئے جانے

کی وجہ سے تمام حجاج آسانی سے اسے اپنی قیام گاہوں میں بھی سن سکتے ہیں۔ لیکن غروب آفتاب سے قبل عرفات سے روانگی جائز نہیں۔ چونکہ صاحب المعالی السید اسمٰعیل الازہری صدر سوڈان مہمان خصوصی تھے اسلئے ان کی عرفات سے روانگی گویا حجاج کیلئے عرفات سے روانہ ہونے کی اجازت کے مترادف تھی۔ تشریفات کے مہمانوں کی سواریاں بھی مہمان خصوصی کی سواری کے پیچھے ایک ترتیب سے قطار بند ہو چکی تھیں۔ اس انتظام کے نتیجے میں سب مہمان عرفات سے روانگی کے نصف ساعت کے اندر بسہولت مزدلفہ پہنچ گئے۔ یہاں ایک وسیع احاطہ قناتوں کے حلقے میں مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں پہنچتے ہی سب لوگ مغرب اور عشاء کی نمازوں کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ یہ دونوں نمازیں بھی جمع کی جاتی ہیں۔ ریگستانی میدانوں میں غروب آفتاب کے ساتھ ہی گرمی ختم ہو جاتی ہے اور رات جلد خنک ہو جاتی ہے۔ ہمیں پاکستان ہی میں متنبہ کر دیا گیا تھا کہ مزدلفہ کی رات کی سردی سے بچاؤ کیلئے کمبل ساتھ ہونے ضروری ہیں۔ چنانچہ ہم نے جدہ سے اپنے طور پر یہ انتظام کر لیا تھا لیکن مزدلفہ پہنچنے پر گدیلے تکئے اور کمبل تشریفات کی طرف سے موجود پائے۔ ہمارے پاس جو کمبل تھے وہ بھی بعض مہمانوں کی آسائش کا باعث ہوئے فالحمد للہ۔

نمازوں سے فارغ ہوتے ہی کھانا تیار تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد نوافل کا وقت میسر آ گیا نصف شب کے بعد مزدلفہ سے منیٰ روانگی شروع ہو گئی۔ اس اثناء میں مجھے غالباً گرد و غبار کے اثر سے زکام اور گلے میں خراش کی تکلیف شروع ہو گئی۔ ہمارا ارادہ تو تمام شب مزدلفہ میں گذارنے کا تھا لیکن ہمارے مرافقین نے جو تشریفات کی طرف سے ہماری رہنمائی اور سہولت کیلئے منیٰ سے ہمارے ساتھ تھے اصرار شروع کیا کہ منیٰ کی واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔ میرے اطمینان کیلئے وہ مجھے مہمانوں کے احاطہ سے باہر سڑک پر لے گئے اور میں نے دیکھا کہ سڑک پر منیٰ جانے والے حجاج اور ان کی سواریوں کا ہجوم ہے۔ چنانچہ مہمانوں کے احاطے میں واپس آکر ہمنے مطلوبہ تعداد سے کچھ زائد کنکریاں چن لیں اور منیٰ واپس جانیکے لئے تیار ہو گئے۔ سڑک پر اس وقت بھی خاصا ہجوم تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ بعد میں بتدریج بڑھتا گیا اور دن کے وقت تو سواریوں کی رفتار اس قدر دھیمی ہو گئی کہ مشکل سے ایک گھنٹے میں ایک کلومیٹر طے ہوتا۔ ہمارے وہ دوست جنہوں نے جدے میں ہمیں مزدلفہ کیلئے کمبل عنایت کئے تھے اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ اپنی کار میں تھے وہ کہیں عصر کے وقت منیٰ پہنچے۔ ۲۲ ؍ مارچ کو رمی سے فارغ ہو کر قربانی کا انتظام تھا۔ ۲۳ ؍ کو جلالۃ الملک کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور مکہ معظمہ حاضر ہو کر طواف وداع کی سعادت حاصل کی۔ فریضہ حج کی ادائیگی کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ساتھ ہی دل میں یہ حسرت لئے ہوئے منیٰ واپس لوٹے کہ کم سے کم ایک بار پھر حج بیت اللہ کی توفیق میسر آئے۔ پہلی بار کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری بار کوتاہیوں اور غفلتوں میں ضرور کمی ہو گی۔ اور بفضل اللہ مناسک کے کماحقہا ادا کرنے اور کسب خیر کے مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان ہو گا واللہ المستعان وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

۲۴ ؍ کو منیٰ سے جدہ لوٹے عزیز انور احمد اور عزیزہ امینہ تو اسی شام روانہ ہو گئے میں ۲۶ ؍ کی صبح کو جدے سے روانہ ہو کر اور بیروت سے طیارہ تبدیل کر کے سہ پہر کو لنڈن پہنچ گیا۔ فالحمد للہ

حج کے سفر کے دوران میں کئی بار یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ پچھلے چند سالوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے حج کا سفر

نہایت آسان ہو گیا ہے۔ میرے دادا جان چوہدری سکندر خاں صاحب نے قریب ستر سال قبل حج کیا تھا اور حسن اتفاق سے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ڈائری جس میں انہوں نے اپنے حج کے سفر کے حالات درج کئے تھے مجھے مل گئی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں میرے والدین نے حج کا فریضہ ادا کیا اور ان کے سفر کے حالات کسی قدر ان سے سننے کا اتفاق ہوا۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند سال قبل تک یہ سفر کسقدر صعوبتناک تھا۔ ہمارے وطن سے حجاز کا سفر عموماً بمبئی یا کراچی تک ریل کے ذریعے اور وہاں سے جدّے تک بحری جہازوں سے ہوتا تھا جدّے پہنچنے سے پہلے کامران کے جزیرے میں قرنطین کی مدت گذارنا ہوتی تھی جس کی میعاد دس دن سے لیکر دو ہفتے تک ہوتی تھی۔ جدّے میں جہاز سے اترنا اور واپسی کے وقت پر جہاز پر سوار ہونا کشتیوں کے ذریعے ہوتا تھا کیونکہ اس وقت تک ابھی جدّے میں باقاعدہ بندرگاہ کی سہولتیں نہ تھیں جدّے اور مکہ معظمہ میں پینے کا پانی قیمتاً ملتا تھا اور عرفات میں بعض دفعہ پانی کی قلت کے نتیجے میں کچھ حجاج پیاس کی شدت کی تاب نہ لا کر جان بحق ہو جاتے تھے۔ ایک سال ایسی خبر شائع ہونیکے وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں لندن میں حاضر تھا۔ حضورؓ نے بھی یہ خبر اخبار میں ملاحظہ فرمائی اور فوراً قادیان تار دیا کہ میرے والدین کی (جو اس سال حج بیت اللہ کے لئے گئے ہوئے تھے) خیریت معلوم کر کے حضورؓ کو اطلاع دی جائے۔ چند دن بعد قادیان سے بذریعہ تار اطلاع ملی کہ میرے والدین بفضل اللہ واپس پہنچ گئے ہیں۔ فالحمدللہ۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور سعودی حکومت کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں جدّہ، مکّہ معظمہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، سب مقامات پر میٹھے پانی کی فراوانی ہے اور اس لحاظ سے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں۔ پہلے وقتوں میں جدّے سے مکہ معظمہ کا سفر اونٹوں پر دو راتوں اور ایک دن میں طے ہوتا تھا۔ کل فاصلہ قریب چالیس میل ہے۔ گرمی کے موسم میں درمیانی دن حجاج کیلئے سخت تکلیف کا موجب ہوتا تھا۔ پڑاؤ کے مقام پر کوئی سایہ نہیں تھا حجاج کوئی چادر وغیرہ تان کر اس کی اوٹ میں دن بسر کرتے تھے۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر جدّے کے رستے ہی طے کیا جاتا تھا۔ تیز قافلے دس سے تیرہ دن میں یہ سفر طے کرتے تھے اور عام قافلے تیرہ سے سترہ دن میں۔ میرے دادا جان اور ان کے تین رفقاء نے یہ سفر جدے سے ینبوع تک دو دن سے بھی کم عرصے میں بحری جہاز کے ذریعے طے کر لیا اور ینبوع سے مدینہ منورہ تک تین دن صرف ہوئے۔ واپسی پر بھی یہی طریق اختیار کیا اور اس زمانے کے حالات کے مطابق ان کا یہ سفر بہت سہولت سے طے ہو گیا۔ اب پختہ سڑکیں تیار ہو جانے کے نتیجے میں جدّے سے مکہ معظمہ کا سفر لاری میں دو گھنٹے میں اور کار میں ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے اور جدے سے مدینہ منورہ تک کا سفر کار میں چھ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ اب تو مکّہ معظمہ سے براہ راست بھی ایک سڑک مدینہ منورہ کی سڑک کو رابغ پر جا کر مل جاتی ہے جس سے اور بھی وقت بچ جاتا ہے۔ جدّے سے مدینہ منورہ کا سفر ہوائی جہاز کے ذریعے ایک گھنٹے سے کم عرصہ میں طے ہو جاتا ہے۔ وطن سے روانہ ہونے سے قبل ضروری ٹیکسوں اور مناسب دیگر طبی احتیاطوں کے نتیجے میں قرنطین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ غرض ہر قسم کی سہولتیں میسر آجانے کی وجہ سے مکہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کا سفر بڑے آرام سے دو ہفتوں میں طے پا جاتا ہے۔ اور اگر وقت کی تنگی ہو تو اس سے کم میں بھی اس سفر کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ صحت پر بھی کوئی ایسا مضر اثر نہیں پڑتا۔ میرے دادا جان نے اندازاً ستاون سال کی عمر میں حج کا فریضہ ادا کیا تھا۔ واپسی کے سفر میں ان کے ایک رفیق سفر کو تو کراچی میں ہی پیچش کی شکایت

شروع ہو گئی۔ اور گاؤں پہنچنے کے چند دن بعد اسی تکلیف کے نتیجے میں ان کی وفات ہو گئی۔ میرے دادا جان کو بھی گوجرانوالہ پہنچنے تک پیچش کی شکایت شروع ہو گئی اور وہ چند ماہ اسی تکلیف میں مبتلا رہے۔ اس کے بعد بفضل اللہ افاقہ ہو گیا۔ لیکن سال بھر بعد انہیں پھر پیچش اور تپ کی تکلیف شروع ہو گئی اور چند دن کی بیماری کے بعد فوت ہو گئے۔ غفر اللہ لہٗ وجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔ میرے والد صاحب حج سے بہت نحیف حالت میں واپس وطن پہنچے۔ حجاز میں سفر کی صعوبت کے علاوہ بحری سفر بھی ان کیلئے تکلیف کا باعث ہوا۔ جاتے اور آتے دونوں وقت موسمی ہواؤں کا زمانہ تھا جس کی وجہ سے سمندر میں تلاطم ہوتا ہے اور اکثر طبائع کیلئے جہاز کی حرکت بہت تکلیف اور پریشانی کا موجب ہوتی ہے۔ جناب والد صاحب بحری سفر کا اکثر حصہ مرض البحر میں مبتلا رہے۔ وطن واپسی پر صحت اور تندرستی بفضل اللہ کسی قدر بحال ہو گئی لیکن ایک سال بعد ۱۹۲۵ء کے ستمبر میں کشمیر جاتے ہوئے کوہ مری کے مقام پر بخار تیز ہو گیا اور چند دن بڑی تکلیف میں گذرے۔ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور طبیعت پھر بحال ہو گئی۔ فالحمد للہ۔ اگست ۱۹۲۶ء میں وجع ذات الجنب کا حملہ ہوا۔ باوجود احتیاط اور مناسب علاج کے تکلیف بڑھتی گئی آخر ۲ ستمبر کی شام کو مغرب کے بعد جب جمعرات کا دن گذرنے کے بعد جمعہ کے دن کا آغاز ہوا ہی تھا لاہور میں خاکسار کے مکان پر والدہ صاحبہ کی رویا کے عین مطابق پورے ہوش میں اور کامل بشاشت کے ساتھ جان ناتوان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غفر اللہ لہٗ وجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔

عالمی عدالت کی صدارت کے لئے میرا انتخاب

عالمی عدالت کے پندرہ ججوں میں سے پانچ کی نو سالہ میعاد ہر تیسرے سال ۵ ر فروری کو ختم ہوتی ہے۔ اس میعاد کے ختم ہونے سے قبل اقوام متحدہ میں ان پانچ ججوں کی نشستیں پُر کرنے کیلئے انتخاب ہوتا ہے۔ جب نئے جج اپنے فرائض ۶ ر فروری سے سنبھال چکتے ہیں تو عدالت کا پہلا کام صدر کا انتخاب ہوتا ہے۔ صدارت کے عہدے کی میعاد تین سال ہے۔ یہ انتخاب خفیہ رائے شماری کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اس انتخاب کیلئے ۱۸ ر فروری کا دن تجویز ہوا۔ صدارت کیلئے دو اور ججوں کے ساتھ میرا نام بھی تجویز ہوا تھا۔ انتخاب کیلئے آٹھ آراء کی تائید ضروری ہے۔ انتخاب کی کارروائی دو دن ہوتی رہی۔ آخر کار مطلوبہ کثرت سے زائد آراء میرے حق میں پائی گئیں اور بفضل اللہ میں صدر منتخب ہوا۔ فالحمد للہ۔ میں ایک ضعیف عاجز پُر تقصیر انسان ہوں۔ اپنے اندر کوئی خوبی نہیں دیکھتا۔ میرے دوسرے دونوں رفیق جن کے اسمائے گرامی انتخاب کی کارروائی میں سامنے آتے رہے کئی اعتبار سے مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو خود ہی جانتا ہے کوئی اور ان کا احاطہ نہیں کر سکتا وہ فضل کرنا چاہے تو کوئی روک نہیں بن سکتا اور اگر اس کا فضل شامل حال نہ ہو تو کوئی کوشش کوئی تدبیر کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا اس وقت تک اس عدالت کے آٹھ صدر رہ چکے ہیں۔ دو لاطینی امریکن۔ ایک شمالی امریکن۔ چار یورپین۔ ایک آسٹریلین۔ میں پہلا ایشیائی صدر ہوں۔ اور ایشیائی بھی وہ جو مغربی تہذیب اور ثقافت کی اقدار سے بیزار ہے اور جس کی یہ بیزاری اس کے عمل سے ظاہر ہے۔ لیکن اگر اس کی مشیت نے ایک ناکارہ ہی کا انتخاب چاہا تو:۔

نیست از فضل و عطائے او بعید ❊ کور باشد ہر کہ از انکار بہ دید

قادر است و خالق و رب مجید ❊ ہر چہ خواہد مے کند عجزش کہ دید؟

اس کی قدرتوں کی انتہا نہیں۔ اس انتخاب سے ۳۶ سال قبل میری والدہ صاحبہ مرحومہ نے ایک مبشر خواب دیکھا تھا جو ان کی وفات کے ۳۴ سال بعد اس انتخاب سے پورا ہوا۔ فالحمد للہ۔ جس رات انہوں نے خواب دیکھا اسی صبح کو مجھ سے بیان کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سیالکوٹ کے مکان کے فلاں کمرے میں ہوں اور اس کمرے کی کھڑکی کے باہر ایک نہایت دل لبھانے والا کرۂ نور آہستہ آہستہ کھڑکی کی ایک جانب سے دوسری جانب حرکت کر رہا ہے۔ جب کھڑکی کے عین وسط میں پہنچا تو ایک پُر شوکت آواز آئی "ہو گا چیف جسٹس ظفر اللہ خان نصر اللہ خان کا بیٹا"۔ اور خفیف سے وقفے کے بعد پھر اسی طرح یہ الفاظ دہرائے گئے۔ "ہو گا چیف جسٹس ظفر اللہ خان نصر اللہ خان کا بیٹا"۔ والدہ صاحبہ بفضل اللہ صاحبِ رویا و کشوف تھیں اور ہم سب کئی بار دیکھ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے انہیں اس رنگ میں نوازتا ہے۔ وہ خود بھی جانتی تھیں کہ رویا اور کشوف تعبیر طلب ہوتے ہیں اور ان کی اصل حقیقت اپنے وقت پر ہی جا کر آشکار ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں میں ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کا سینئر جج تھا اور اگر تقسیم ملک کے بعد میں ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرتا تو غالب قیاس یہی تھا کہ آزادی کا اعلان ہونے پر سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ہوتا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے تقسیم ملک کے طریق کار کا اعلان کیا اور اس پر میں نے فیڈرل کورٹ کی ججی سے استعفیٰ دیدیا جو ۱۰ر جون سے عمل پذیر ہوا۔ اسی سال دسمبر کے تیسرے ہفتے میں جب میں اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت سے واپس لوٹا تو قائداعظم کی ہدایت کے ماتحت بھوپال جانے سے پہلے نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا۔ انہوں نے جن امکانات کا ذکر فرمایا ان میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ بھی تھا لیکن ساتھ ہی انہوں نے فرمایا قائداعظم چاہتے ہیں کہ تم وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالو پاکستان کی سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس میاں عبدالرشید صاحب مقرر ہوئے جب ان کی میعاد اختتام کے قریب پہنچی تو انہوں نے از راہ نوازش پہلے ٹیلیفون پر اور پھر بالمشافہ مجھے رضامند کرنے کی کوشش کی کہ میرا نام بطور اپنے جانشین کے تجویز کریں۔ لیکن میں بوجوہ رضامند نہ ہوا۔ ۱۹۶۳ء کے عدالتی انتخابات میں جب مجھے دوبارہ عالمی عدالت کی رکنیت کیلئے منتخب کیا گیا اس وقت عدالت کے اراکین میں سے کئی دوبارہ منتخب شدہ اور دوسرہ بارہ منتخب شدہ تھے لیکن ان کے انتخابات بلافصل ہوئے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک رکن اپنی میعاد ختم کر کے عدالت سے علیحدہ ہو چکا ہو اور وہ علیحدگی کے بعد وقفہ سے پھر منتخب کر لیا جائے۔ یہ صورت اتنک صرف میرے متعلق ہی پیدا ہوئی ہے۔ عدالت کی رکنیت پر دوبارہ فائز ہونے پر میرا درجہ میرے پرانے رفقاء کے لحاظ سے پھر سب سے نیچے تھا۔ اب جو غور کرتا ہوں تو میرا عدالت کی صدارت پر منتخب ہونا ضرور ایک اچھا بات ہے اور اس بشارت کو پورا کرنیوالی ہے جو انتخاب سے ۳۶ سال پہلے میری والدہ صاحبہؒ کو دی گئی تھی۔ والدہ صاحبہؒ نے خواب میں جو الفاظ سنے ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت مرکوز تھی۔ آواز بطور تسلی اور تصدیق کے آواز پُر شوکت تھی۔ پھر وہی الفاظ دہرائے گئے۔ اور

الفاظ کی ابتدا ہی میں لفظ "ہوگا" ظاہر کرتا ہے کہ حالات خواہ موافق نظر آئیں یا نہ یہ ہمارا فیصلہ ہے اور ہو کر رہے گا۔ پھر میرے نام کے ساتھ والد صاحب مرحوم کا نام "نصر اللہ خان" شامل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بخشش اس کی نصرت کا نشان ہوگی انسانی کوشش کا اس میں دخل نہیں ہوگا۔ فسبحان اللہ و بحمدہٖ۔

حرفِ آخر

اگر یہ عاجز کوئی خدمت سرانجام دے سکا تو وہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی ذرہ نوازی اور اس کی عطا کردہ توفیق سے ہوا اور بزرگان اور احباب کی دعائیں اس میں مد ہوئیں اور جہاں جہاں میں وہ کچھ نہ کر سکا جو کرنے کے لائق تھا اور کرنا چاہتا تھا تو اس کی وجہ خاکسار کی کوتاہی اور غفلت تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحم سے معاف فرمائے اور درگذر کرے۔ آمین۔

قرآن کریم میں اس کا ارشاد ہے کہ اس کا عفو بہت وسیع ہے اور وہ شفیق اور ودود مالک اور مقتدر ہستی گرفت میں جلدی نہیں کرتی۔ میں جب اپنے گریبان کے اندر نگاہ ڈالتا ہوں تو بجز تقصیر اور معصیت کے کچھ نہیں دیکھتا اور نہایت ترساں اور لرزاں حالت مجھ پر وارد ہوتی ہے اور جب اس کے عفو اور رحم کا اندازہ کرتا ہوں تو کچھ ڈھارس بندھتی ہے۔ اس کے فضلوں اور انعاموں کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں اور ان کا شمار نہیں کر سکتا۔ سجدت لک روحی و جنانی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل ہونا اپنے لئے سعادتِ عظمیٰ شمار کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ یہ سعادت فیوض آسمانی کے دروازوں کے کھلنے کا موجب تھی۔ ہستی باری تعالیٰ پر زندہ اور محکم ایمان اور عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم اس ناچیز نے حضور علیہ السلام سے حاصل کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شفقت اور توجہ ایک بہت بڑا انعام تھی۔ آپ کا ارشاد "میاں ہم نے تمہارے لئے بہت بہت دعائیں کی ہیں" کسقدر انعامات اور فیوض کی خوشخبری تھا۔ آپ کا اس ناچیز کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھے ہوئے محبت ناموں میں "لطف اللہ باشی ارشد و ارجمند باشی۔" کے دعائیہ القاب کے ساتھ یاد فرمانا اور ہمت بڑھانا میرے لئے بہت خوشی اور انبساط کا موجب تھا۔ پھر نصف صدی سے زائد عرصہ کے دوران حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حسن الطاف و اکرام، حسن شفقت و محبت، حسن توجہ اور احسان کا پیہم مورد یہ عاجز رہا اس کا اندازہ بھی خاکسار کے لئے ممکن نہیں۔ ان سب عنایات میں سے بعض کی کچھ جھلک ان اوراق میں نظر آئی ہوگی۔ اس نصف صدی کے دوران میں خاکسار محسوس کرتا تھا کہ میری زندگی ایسے ہی محفوظ ہے جیسی ایک طفلک نادان و بےبس کی زندگی اس کی ماں کی گود میں محفوظ ہوتی ہے۔ میری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو حضورِ اقدس کی توجہ کے فیضان سے متمتع نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا انعام تھا جس کے کما حقہا شکر کی استطاعت بھی یہ عاجز نہیں رکھتا۔

اس عاجز کی زندگی آیتنا کم کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا کی مثال بنی جا رہی ہے۔ میری ہستی

کا ہر ذرہ زبان بن جائے اور ہر لحظہ باری تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں صرف رہے تو یہ شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی سے التجا ہے کہ دہ شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ بارہا میرے عاجز دل سے یہ صدا نکلتی ہے الٰہی تو نے اپنے پُر تقصیر پُر معاصی غافل بندے کو بہت لاڈلے غلام کی طرح رکھا ہے۔ تو اپنی خاص رحمت اور لطف سے آخر تک ایسا ہی رکھنا اور انجام کار اپنی رحمت کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھنا۔ آمین یا ارحم الراحمین۔
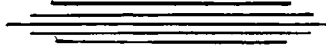
سید نذیر احمد خوشنویس
"خاتون پاکستان" آفس نمبر ۵ گارڈن کراچی
۱۴ اگست ۱۹۷۱ء

اشاریہ

نوٹ:۔ جن ناموں کے آگے (ض) کا نشان ہے ان ناموں کے صفحات نمبر ضمیمہ میں دیکھیں۔

ا

ب

پ

ز

س

س

ش

ص

ض

ط

گ

ل

ن

و

ضمیمہ اشاریہ